

پبلی کیشنز ڈویژن کی کتابیں

مشعلِ آزادی : ساغر نظامی قیمت : ۴۰ روپے
ہندوستان کی جنگِ آزادی کی منظوم داستان (حصہ اوّل) ۳۲۰ صفحات پر مشتمل جس میں، ۱۸۵۷ء تک کے واقعات شامل ہیں۔ دیدہ زیب کتابت وطباعت عمدہ، مجلد گرد پوش۔

بھارت خلائی دور میں : قیمت : ۱۲ روپے
خلائی سائنس کی دل چسپ داستان، سری ہری کوٹہ کی سیر، رازہائے سربستہ کا انکشاف، نہایت آسان زبان، خلائی کوششوں کا ہلکے پھلکے انداز میں بیان۔ ۱۴۰ صفحات کی کتاب، کاغذ عمدہ، تصاویر سے مزین۔

سبق آموز کہانیاں : قیمت : ۲۰ روپے
مصنفہ: کسم کمار / ترجمہ: اختر الواسع
بچوں کے لیے آسان اور دل چسپ زبان میں لکھی گئی ۱۸ کہانیاں۔

رنگ برنگے پھول : قیمت : ۱۰ روپے
بچوں کے شاعر شفیع الدین نیر، شفیع سیوہاروی، افسر میرٹھی، اسمٰعیل میرٹھی، تلوک چند محروم اور دیگر بہت سے شعرا کی آسان زبان میں لکھی ہوئی نظمیں۔

پھولوں کی وادی : رفعت سروش قیمت: ۱۶ روپے
منظوم ڈرامہ۔ جو نہ صرف اعلیٰ تخلیقی اظہار کی بدولت ہمارے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا باعث بنتا ہے بلکہ ہمیں بہتر شہری بننے کا درس بھی دیتا ہے۔

دھنواں راجہ : مترجم: شوناتھ سکہ قیمت : ۱۳ روپے
بچوں کے لیے سادہ اور سلیس زبان میں لکھی گئی یہ لوک کہانیاں ہماری عوامی زندگی کی گوناگونی کی آئینہ دار ہیں۔ کتابت وطباعت دیدہ زیب صفحات ۱۲۶

امر شہید گنیش شنکر ودیارتھی قیمت: ۱۱ روپے
مصنفہ: مالتی شنکر / مترجم: رام پرکاش راہی
ہندوستان کی عظیم ہستیاں سیریز کے تحت چھپی یہ کتاب، گنیش شنکر ودیارتھی کی کہانی رنگین اور دل کش تصویروں کی زبانی۔ دیدہ زیب کتابت وطباعت۔

مہاتما گاندھی کی کہانی : قیمت : ۱۰ روپے
مصنف: ایس۔ڈی۔ساونت، ایس۔ڈی۔باڈکر
بچوں کے لیے ایک اور مفید و دل چسپ کتاب۔ گاندھی جی کی کہانی —— رنگین و دل کش تصویروں کی زبانی۔

مرقعِ اقبال : (جگن ناتھ آزاد) رعایتی قیمت: ۲۵ روپے
علامہ اقبال کی زندگی کے اہم واقعات، شجرۂ نسب اور نادر تصاویر بطور تحریر پر مبنی کا البم۔

یہ ہندوستان : (شیلادھر) رعایتی قیمت: ۵ روپے
اس باتصویر کتاب میں سادہ اور سہل زبان میں بچوں کو ہندوستانی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ تاریخی، معاشی اور سماجی حالات سے آگاہ کیا گیا ہے۔ رنگین تصاویر۔

دنیا کی منتخب لوک کتھائیں : (بچوں کے لیے) قیمت: ۱۱ روپے
مصنف ہمانشو جوشی / مترجم: رام پرکاش راہی
یہ کتھائیں عوامی زندگی کا انمول اور لافانی سرمایہ ہیں۔ اس کتاب میں ۱۴ ملکوں کی کہانیاں شامل ہیں۔

جواہر لال کی کہانی تصویروں کی زبانی : قیمت: ۳ روپے ۵۰ پیسے
محبوب رہنما اور ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو کی زندگی کے دل چسپ واقعات۔ رنگین تصاویر میں بچوں کے لیے بہترین تحفہ۔

ہم ایک ہیں : (عرش ملسیانی) قیمت: ۱۰ روپے
ہندوستان کی ثقافتی وسماجی گوناگونی اور یک رنگی کا دل چسپ بیان۔ قومی زندگی کی توانائی کی داستان۔

پھلوں اور سبزیوں کو محفوظ رکھنے کے طریقے : قیمت : ۱۰ روپے ۵۰ پیسے
گھریلو ضرورتوں کے جام، جیلی، مارملیڈ، مربے اور اچار وغیرہ بنانے کے طریقے تصویروں کے ذریعے بتائے گئے ہیں، جن سے بڑی آسانی سے آپ گھر بیٹھے اپنی من پسند چیزیں بنا سکتے ہیں۔

پریم چند —— فکر وفن : از: قمر رئیس قیمت : ۸ روپے
پریم چند کی تخلیقات کا مطالعہ، فکر وفن کی گہرائیوں کا جائزہ۔ عصری حقیقتوں کی ترجمانی، قارئین اور طلبا کے لیے تحفہ۔

"آج کل" (اردو) کے سالانہ خریداروں کو ۱۰ فی صد کی رعایت۔ محصول ڈاک ہمارے ذمے۔ دس روپے سے کم قیمت کی کتابیں بذریعے وی پی نہیں بھیجی جائیں گی۔ پوسٹل آرڈر بھیجیے یا وی پی طلب کیجیے۔

کتابیں ملنے کا پتہ : بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اردو کا مقبولِ عام معتبر ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر
راج نرائن راز

سب ایڈیٹر
خورشید اکرم

جلد : ۴۸ شمارہ : ۱

اگست ۱۹۸۹ء شراون بھادر شک ۱۹۱۱

قیمت : دو روپے فون: ۳۸۷۰۶۹

سرورق : ایم۔ ایم۔ ملک

اندرونِ ملک زرِ سالانہ : ۲۰ روپے
دو سال کے لیے : ۳۶ روپے
تین سال کے لیے : ۴۸ روپے

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :
چیف ایڈیٹر: آجکل اردو
پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اسسٹنٹ بزنس منیجر، آر۔ ایس منہاس

ترسیلِ زر کا پتہ :
بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن
پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترتیب

صارفین کا تحفظ

مُشتری ہُشیار باش

م۔ک۔مہتاب



● شہری رسدات کے وزیرِ مملکت جناب شکھو رام، جناب م۔ک۔مہتاب سے بات چیت کرتے ہوئے۔

اس قدیم فارسی محاورے کا مطلب ہے کہ صارف یا خریدار کو اپنے مفاد کی خود حفاظت کرنی چاہیے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب حکومتی نظام میں عوام کو کوئی سماجی تحفظ حاصل نہیں تھا۔ اور تجارتی نظام میں تاجر کی اجارہ داری تھی۔ لیکن دَورِ جدید میں ہر ترقی پسند معاشرے میں فلاحی حکومتیں عوام کو اشیائے صرف اور خدمات کی خرید میں لوٹ کھسوٹ سے بچانے کے لیے ضروری قانونی اور تعزیری قدم اٹھاتی ہیں اور حکومتِ ہند بھی گزشتہ کئی برسوں سے اس پالیسی پر گامزن ہے۔

یہ خیالات تھے حکومتِ ہند کے شہری رسدات کے وزیرِ مملکت جناب سکھو رام کے جن سے میں کچھ روز ہوئے یہ معلوم کرنے کے لیے ملا تھا کہ حکومت نے گزشتہ چند برسوں میں صارفین کے تحفظ کے لیے کیا کچھ کیا ہے؟

عام طور پر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ مال یا خدمتیں فروخت کرنے والے اصول پرست نہیں ہوتے۔ انہیں خریدار کے مفاد سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ منافع کمانا ہی اُن کے پیشے کا واحد اصول اور مقصد ہے۔ قلت ہو یا فراوانی دام بڑھا کر یا معیار گھٹا کر عوام کی جیب پر ڈاکہ ڈالا جاتا ہے۔

وزیرِ رسدات نے کہا کہ حکومتِ ہند اس نہایت اہم مسئلے سے پوری طرح آگاہ تھی۔ تاجروں کو ذمہ داری کا احساس کرانے اور غلط روی سے باز رکھنے کیلیے کئی قسم کی قانونی بندشیں بندیاں بھی کی گئیں۔ اس سلسلے میں جو اہم قانون بنائے گئے ہیں، اُن میں اشیائے ضروریہ کا قانون، ادویہ اور اشیائے آرائش کا قانون، خوراک میں ملاوٹ کی روک تھام کا قانون، ناپ تول کے معیاروں کا قانون، ہندوستانی معیاروں کے دفتر کا قانون ۱۹۸۶ء، تجارت میں اجارہ داری کی روک تھام کا قانون اور چور بازاری و اشیائے صرف کی بہم رسانی کو برقرار رکھنے کا قانون بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

لیکن ان قانونی بندشوں کے بعد بھی دیکھا گیا ہے کہ ملک میں صارفین کو ضروری تحفظ حاصل نہیں ہے۔ اوّل تو یہ قوانین احتیاطی اور تعزیری نوعیت کے ہیں۔ اُن سے متعلقہ مقدمات کے فیصلوں میں سالہا سال لگ جاتے ہیں۔ متمول تاجر اور کارخانہ دار بھاری خرچہ کر کے وکیلوں کی خدمات حاصل کر لیتے ہیں۔ اور سزا سے بچ نکلتے ہیں یا جرمانہ ادا کرنا معمولی بات سمجھتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان قانونی پابندیوں سے بے شک صنعت کار یا تاجر کو کوئی سزا مل جائے لیکن صارف یا خریدار کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اُسے جو نقصان پہنچتا ہے اس کی کسی طور بھی تلافی نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ راجیو گاندھی سرکار میں جب حکومت کی پالیسیوں پر نظرِ ثانی کی گئی تو صارفین کے تحفظ کے اہتمام میں بھی انقلابی تبدیلیاں لانے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ ۱۹۸۶ء میں صارفین

کے تحفظ کا ایک جامع قانون بنایا گیا جس میں صارفین کا ہر لحاظ سے تحفظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ قانون بنانے سے قبل امریکہ، برطانیہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں صارفین کے تحفظ کے قوانین اور انتظامات کا گہرائی سے مطالعہ کیا گیا۔ ملک میں سماجی و اقتصادی حالات کی روشنی میں مذکورہ ممالک کے قوانین کی خوبیوں کو نئے قانون میں شامل کیا گیا۔

فرق کیا؟

وزیر رسدات نے بتایا کہ سابقہ قوانین اور نئے قانون میں فرق یہ ہے کہ نیا قانون پہلے قوانین کی جگہ رائج نہیں کیا گیا بلکہ یہ قانون صارفین کے تحفظ کا ایک اضافی اہتمام ہے۔ یہ ایک بہت ہی جامع قانون ہے۔ اس کا اطلاق سرکاری، نجی اور مشترکہ کاروبار کے ہر شعبے میں ہوتا ہے۔ امدادِ باہمی کے سیکٹر کو بھی اس قانون کے دائرہ کار میں لایا گیا ہے۔ وزیرِ اعظم کی ایما پر سرکاری خدمتوں کو بھی اس قانون کے تحت لایا گیا ہے — جیسے کہ ٹیلی فون، تار، ڈاک، بنکوں، ریلوں اور ائیر لائنز کی خدمتیں بھی اس قانون کے اطلاق سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ یہ قانون کسی کے خلاف نہیں بلکہ ہر شہری کے فائدے کے لیے ہے۔ پہلے قوانین میں تاجر یا صنعت کار کو سزا دی جا سکتی تھی، صارف کو کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا، لیکن اس جامع قانون کے ذریعے ہر صارف اپنے نقصان کے لیے معاوضہ حاصل کر سکتا ہے۔ ناقص خدمتوں، مقررہ سے زیادہ قیمتوں کی وصولی اور نامناسب تجارتی طریقوں پر بھی اس قانون کا اطلاق ہوتا ہے۔

دیگر قوانین کا طریقۂ کار بہت طویل اور بوجھل ہے جب کہ صارفین کے تحفظ کے قانون کے قواعد بہت آسان اور سادہ ہیں اور ضابطے کی کارروائی بہت قلیل المدت ہے۔ ہر شکایت کا فیصلہ ۹۰ دن کے اندر اندر کیا جانا لازمی ہے۔ جہاں نمونوں کی جانچ پڑتال کرانی ہو، وہاں زیادہ سے زیادہ پانچ ماہ میں فیصلہ کرنے کی مہلت دی گئی ہے۔

جہاں سابق قوانین خاص خاص مسائل کے بارے میں ہیں وہاں صارفین کے تحفظ کا قانون جامع نوعیت کا ہے۔

نئے قانون کی خصوصیات:

وزیر رسدات نے بتایا کہ نئے قانون کا اطلاق ہر قسم کے سامان اور خدمتوں پر ہوتا ہے۔ ماسوائے اُن کے جنہیں مرکزی حکومت نے مستثنیٰ کر دیا ہو۔ قانون کے تحت مرکز اور ریاستوں میں صارفین کے تحفظ کے لیے کونسلیں قائم کی جا رہی ہیں، جن کا بڑا کام یہ ہوگا کہ عوام کے سلامتی، معلومات حاصل کرنے اور صارفین کو سامان اور خدمتوں کے بارے میں پوری طرح آگاہ کرنے نیز نقصان کی صورت میں تلافی کے بارے میں حقوق کی حفاظت کریں۔ شری سکھ رام نے بتایا کہ ملک کی ۲۸ ریاستوں اور مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں میں ایسی کونسلیں قائم کر دی گئی ہیں جنہوں نے کام شروع کر دیا ہے۔ قانون کے تحفظ قومی ریاستی اور ضلعی سطح پر نیم عدالتی نوعیت کے ادارے بھی قائم کیے گئے ہیں جہاں صارفین آسانی سے پہنچ سکتے ہیں اور بنا خرچ انصاف حاصل کر سکتے ہیں۔

ضلع کی سطح پر ادارے کا نام ڈسٹرکٹ فورم رکھا گیا ہے اور اسے ایک لاکھ روپے تک کے معاوضے یا نقصان کی شکایت سننے کا اختیار دیا گیا ہے۔ ایک لاکھ سے دس لاکھ تک کی مالیت کے دعوے یا شکایات سننے کا اختیار ریاستی سطح کے کمیشن کو دیا گیا ہے اور دس لاکھ سے زائد مالیت کے دعووں کو سننے کا اختیار مرکزی کمیشن کو دیا گیا ہے۔ ضلع اور ریاست کی سطح کے فورم اور کمیشن ریاستی سرکاروں نے اور مرکزی کمیشن مرکزی سرکار نے قائم کیے ہیں۔ ان اداروں نے عوام کی شکایات سننے کا کام شروع کر دیا ہے۔ ان اداروں تک رسائی کے لیے کسی وکیل یا سفارش کی ضرورت نہیں ہے۔ صارفین ایک سادہ کاغذ پر درخواست بھیج کر فورم یا کمیشن سے داد رسی کر سکتے ہیں۔ ریاستی کمیشن تین افراد پر مشتمل ہے۔ جس کا صدر ہائی کورٹ کا ایک جج ہوتا ہے اور ایک رکن کوئی خاتون ہوتی ہے۔ ضلع فورم کے فیصلے کے خلاف اپیل ریاستی کمیشن میں کی جاتی ہے۔ قومی کمیشن کا صدر سپریم کورٹ کا ایک جج ہے۔ اس کے چار ارکان ہیں، جن میں ایک عورت ہے۔ ریاستی کمیشن کے فیصلے کے خلاف اپیل قومی کمیشن میں کی جا سکتی ہے۔ اور قومی کمیشن کے فیصلے کے خلاف اپیل سپریم کورٹ میں کی جا سکتی ہے۔

نئے قانون پر عمل درآمد:

وزیر رسدات نے نئے قانون پر عمل درآمد کے بارے میں بتایا کہ بہت سے قانون بنتے ہیں، لیکن صحیح ڈھنگ سے لاگو نہیں ہوتے۔ اس خامی سے بچنے کے لیے صارفین کے تحفظ کے قانون کو فی الفور نافذ کر دیا گیا ہے۔ مرکزی حکومت نے صارفین کے تحفظ کے لیے ۱۲۶ ارکان پر مشتمل ایک کونسل قائم کی ہے۔ اس کونسل کے تین اجلاس ستمبر ۱۹۸۷ء، اپریل ۱۹۸۸ء اور ستمبر ۱۹۸۸ء میں ہو چکے ہیں — حال ہی میں کونسل کا چوتھا اجلاس بھی دہلی میں ہوا۔ ان جلسوں میں صارفین کے تحفظ کی تحریک کو عوامی اور خاص طور پر دیہات کی سطح پر پھیلائے جانے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ ان میٹنگوں میں عوام کی تعلیم اور آگاہی کے لیے ریڈیو اور ٹی وی کے استعمال اور جگہ جگہ اشیاء کے نمونوں کی جانچ کے لیے لیبارٹریاں قائم کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ کونسل کی سفارش پر ایک پبلسٹی کمیٹی قائم کر دی گئی ہے۔

حکومت صارفین کے تحفظ کے پروگرام کو اعلیٰ ترین ترجیح دے رہی ہے۔ چنانچہ اس پروگرام کو بیس نکاتی پروگرام مجریہ ۱۹۸۶ء میں [illegible] نکتے کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ یہ ایک [illegible] تحریک

بن چکی ہے جس کا مقصد فروخت کنندہ کے مقابلے میں صارف کے مفاد کا تحفظ اور فروغ ہے۔ کیوں کہ ٹیکنالوجی اور سائنس کی ترقی کے سبب صارف کی اقتصادی اور سماجی زندگی میں اتنی زیادہ تبدیلیاں آگئی ہیں کہ انواع واقسام کے سامان کے معیار اور قیمتوں پر نگاہ رکھنا آہستہ آہستہ اُس کے بس سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے وزیر موصوف نے کہا کہ اب یہ حکومت کی ذمہ داری ہی تھی کہ وہ صارفین کے تحفظ کا انتظام کرے اور اسی لیے یہ جامع قانون لاگو کیا گیا۔

جہاں حکومت نے صارفین کے مفادات کے تحفظ کے لیے یہ کارروائی کی ہے، وہاں سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ صارفین کو آگاہ کیا جائے کہ اُن کے حقوق کی حفاظت کے لیے کیا کچھ کیا گیا ہے اور وہ اس سے کس طرح فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

رضاکار اداروں کا کردار:

عوام کو اس قانون کے بارے میں تعلیم دینے یا آگاہ کرنے کے لیے صارفین کے رضاکار ادارے بہت مدد دے سکتے ہیں۔ وہ اُنہیں نئے قانون کے علاوہ موجودہ قوانین کی دفعات اور تحفظات سے بھی آگاہ کر سکتے ہیں۔ اس وقت مُلک میں صارفین کے قریب ۲۸۰ ادارے کام کر رہے ہیں۔ یہ تعداد بہت کم ہے۔ پھر ان میں سے زیادہ تر اداروں کی سرگرمیاں شہروں اور قصبوں تک ہی محدود ہیں جب کہ زیادہ آبادی دیہات میں رہتی ہے جہاں تعلیم کم ہے اور صارف کو نقصان پہنچنے کا احتمال زیادہ ہے۔

وزیر رسلات نے بتایا کہ حکومت نے صارفین کی تحریک کو مقبول بنانے کے لیے بہت سے اقدام کیے ہیں۔ سیمینار، کانفرنسیں اور نمائشیں لگائی جا رہی ہیں۔ ٹی وی اور ریڈیو کی خدمات سے بھی فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ اشیاء کے معیار اور صارفین کے موضوع پر ایک سیمینار کیا گیا ہے۔ تجارت اور صنعت کے نمائندوں سے کانفرنس منعقد کی گئی ہے۔ صارفین کے تحفظ سے متعلقہ ریاستی وزراء کی ایک کانفرنس دہلی میں منعقد کی گئی۔ ریاستی سرکاروں کو ریاستی اور اضلاع کی سطح پر صارفین کے تحفظ کے لیے سیمینار اور کانفرنسیں کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے۔ جس کے لیے اُنہیں مالی مدد بھی دی جا رہی ہے۔

ریاستی سرکاروں کے افسروں کے ساتھ اشیائے ضروریہ کی دستیابی اور بہم رسانی کا جائزہ بھی متواتر لیا جا رہا ہے۔

ٹی وی اور ریڈیو پر صارفین کی آگاہی کے پروگراموں میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ ٹی وی سے ہر ہفتہ "صارفین کے تحفظ" کے نام سے ایک پروگرام دکھایا جا رہا ہے۔ محکمہ مرکزی رسلات نے صارفین کے تحفظ کے بارے میں چھوٹی فلمیں بھی بنائی ہیں۔ جو ٹی وی پر دکھائی جا رہی ہیں۔ صارفین کے تحفظ کے لیے ڈرامے تیار کیے گئے ہیں۔ جو دیہات میں دکھائے جا رہے ہیں۔ ملاوٹ کی روک تھام اور ڈبہ بند مال کی خریداری کے بارے میں کتابچے شائع کر کے تقسیم کیے جا رہے ہیں۔

ایوارڈز:

مرکزی حکومت نے صارفین کے تحفظ کی تحریک کو مقبول بنانے کے لیے نوجوانوں کے لیے قومی ایوارڈز کی ایک اسکیم بھی شروع کی ہے اس کے تحت میرٹ سرٹیفکیٹوں کے علاوہ ۲۰ ہزار، ۱۵ ہزار اور ۱۰ ہزار روپے کے تین نقد انعامات رکھے گئے ہیں جو ان نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو جن کی عمر ۱۵ سے ۲۵ برس کے درمیان ہو، دیے جائیں گے۔ جنہوں نے صارفین کے تحفظ کے لیے خاص طور پر دیہی علاقوں میں کام کیا ہو۔

رضاکار اداروں کے لیے جو صارفین کے تحفظ کے لیے کام کریں گے، ہر سال قومی ایوارڈز دیے جائیں گے، جن کی مالیت ۵۰ ہزار، ۴۰ ہزار اور ۳۰ ہزار روپے ہوگی۔

صارفین کو آگاہ کرنے کے لیے ایک ماہانہ رسالہ بھی نکالا جائے گا۔ ہر سال ۱۵ مارچ کا دن صارفین کے تحفظ کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے، جب جگہ جگہ جلسے اور سیمینار منعقد ہوتے ہیں۔

شری سکھ رام نے بتایا کہ اس قانون میں ہر شخص کے لیے دادرسی کا جو اہتمام ہے اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کارخانہ دار اور صنعت کار خود بخود سیدھے راستے پر آجائیں گے۔ وہ اچھی کوالٹی کا مال تیار کریں گے جس سے ملک میں برآمد ہونے والے مال کی مقدار میں بھی اضافہ ہوگا۔

وزیر موصوف نے بتایا کہ صارفین نے نئے قانون کے تحت انتظام کا فائدہ اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ مثلاً دہلی کی ایک عورت نے ڈرائی کلینر کے خلاف شکایت کی کہ اُس نے اُس کی ساڑی کا رنگ اُڑا دیا ہے اور ضلع فورم نے اُسے نئی ساڑی کی قیمت دلا دی۔ ایک شخص نے ایک تعلیمی ادارے کے خلاف شکایت کی کہ اُس کے بچے کو داخلہ نہیں ملا لیکن فیس لے لی گئی۔ اُسے فیس واپس دلائی گئی۔ دہلی میں مارچ ۱۹۸۹ء تک ضلع فورم میں ۵۳۰ شکایات بھیجی گئیں جن میں سے ۲۳۲ کا فیصلہ کر دیا گیا ہے۔ بہار میں ۲۶۸ درخواستیں موصول ہوئیں جن میں سے ۱۷۵ کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ راجستھان کے چھ ضلع فورمز کے پاس جنوری ۱۹۸۹ء تک ۲۴۴ درخواستیں بھیجی گئیں جن میں سے ۱۰۰ کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ آندھرا پردیش میں ۲۷۹ میں سے ۹۰ درخواستوں کا فیصلہ ہو چکا ہے۔

اس طرح اب نیا قانون لاگو ہو جانے کے بعد صارفین کی یہ شکایت باقی نہیں رہی کہ اُن کی کون سنتا ہے۔ اُن کا کام ایک سادہ کاغذ پر چند سطریں لکھ کر فورم یا کمیشن کا دروازہ کھٹکھٹانا ہے اور انہیں ساٹھ دن کے اندر اندر انصاف کے ساتھ ساتھ معاوضہ بھی مل سکتا ہے سوال اب صرف یہ ہے کہ عوام کو اس قانون کے مندرجات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ آگاہ کیا جائے۔ اس کام میں عوامی تعاون ہی قانون کی کامیابی کا ضامن ہو سکتا ہے۔ ○

عبدالقوی دسنوی



مولانا ابوالکلام آزاد پہلی بار قیدِ فرنگ میں
سیاسی سفر کی ایک اہم منزل

رانچی کی نظر بندی کے بعد جب مولانا ابوالکلام آزاد ۲۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہا کیے گئے تو وہ شاید یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اب ان میں جرأت و ہمت اور بڑھ گئی تھی۔ وہ جنگِ آزادی میں اور زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہتے تھے۔ اُدھر گاندھی جی نے ان کے حالات اور قربانیوں، کوشش کر اور اس راہ میں ان کی ہمت اور حوصلے سے آگاہ ہو کر خود ان سے ملنے کے لیے رانچی کا سفر کیا تھا، لیکن ملاقات کی اجازت نہ ملنے کی وجہ سے واپس لوٹ گئے تھے۔ اب جب مولانا آزاد کلکتہ واپس آ گئے تو گاندھی جی نے ان سے دوبارہ ملنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ۱۸ جنوری ۱۹۲۰ء کو کلکتہ میں مولانا آزاد سے گاندھی جی کی پہلی ملاقات ہوئی۔ یہی وہ پہلی ملاقات تھی جس نے مولانا آزاد اور گاندھی جی کو ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا۔ چنانچہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مختلف جلسوں میں شریک ہوئے۔

ستمبر ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی کی رہ نمائی میں کانگریس کا خصوصی جلسہ کلکتہ میں ہوا۔ جس میں خلافت اور عدم تعاون کے پروگرام پر اظہارِ خیال کیا گیا۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ خلافت کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے عدم تعاون کا پروگرام ضروری ہے۔ چنانچہ لالہ لاجپت رائے، سی۔ آر۔ داس اور بپن چندر پال کی مخالفت کے باوجود عدم تعاون کی تحریک کا ریزولیشن پاس ہو گیا تھا۔

اس کے بعد گاندھی جی نے ہندوستان کے مختلف حصوں کا دورہ کیا، جس میں مولانا آزاد اکثر ان کے ساتھ رہے۔ مارچ ۱۹۲۱ء میں مولانا آزاد اور گاندھی جی نے پنجاب کا دورہ کیا۔ شاہی مسجد میں مولانا نے نہایت ولولہ انگیز تقریر کی۔ ۲۵، ۲۶ جون ۱۹۲۱ء کو مولانا جمعیۃ العلماء بہار و اڑیسہ کے جلسہ کی صدارت کی پھر ۲۵ اگست ۱۹۲۱ء کو مجلسِ خلافت آگرہ کی صدارت کی اور نہایت اہم خطبہ پڑھا، جس کے مطالعہ سے مولانا کے اندازِ فکر اور سیاسی تدبّر کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہ وہ وقت تھا جب جنگِ آزادی کی لڑائی تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ ان رہ نماؤں کے ہر قدم صبحِ آزادی سے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں خلافت تحریک کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کو قوت مل رہی تھی۔ عدم تعاون کے خیال نے ہندوستانیوں میں بائیکاٹ کا احساس جگانا شروع کر دیا تھا۔ سول نافرمانی کا جذبہ بیدار ہونے لگا تھا اور پرنس آف ویلز کی ہندوستان آمد کے خلاف مظاہرہ کی تیاری شروع ہو گئی تھی۔ مولانا آزاد ان سیاسی حالات میں نہ صرف شریک تھے۔ بلکہ اس جنگِ آزادی کے میدان میں پوری تیاری اور اعتماد کے ساتھ اتر گئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ سارے ہندوستان میں بیداری لائیں۔ لیکن الہلال اور البلاغ بند ہو چکے تھے۔ دوبارہ نکالنے کی صورت پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ ممکن تھا کہ کسی طرح نکالنے میں کامیاب ہو جاتے لیکن وہ ان رسائل کو جن معیار پر نکال چکے تھے، اس سے نیچا تو نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے مجبوراً مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں ایک ہفتہ وار "پیغام" جاری کیا۔ اس ہفتہ وار کا پہلا شمارہ ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء کو منظرِ عام پر آیا جس کے پونے تین مہینے میں یعنی ہر دسمبر ۱۹۲۱ء تک کُل تیرہ شمارے الگ الگ وقتوں میں بحیثیت روزنامہ منظرِ عام پر آئے۔

صدر شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال ۲۰۰۱ ۴۶

۱ ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد (مترجم محمد مجیب) ص ۴۶

اس ہفتہ وار میں شائع شدہ مولانا آزاد کی تقریریں عام طور پر عام فہم زبان میں ہونے کے باوجود نہایت پُر اثر، پُرجوش اور بے باکی کی مظہر ہیں۔ خاص طور سے پہلے صفحات پر بعض اہم اعلانات دلوں میں ایک خاص کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ ۳۰ ستمبر۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۱ء کے پہلے صفحہ کی تحریر ملاحظہ کیجیے:

عزم و عمل کی دعوت
قانون شکنی کی طرف پہلا قدم
مجلس جمعیۃ العلماء کا فیصلہ
ضبط شدہ فتویٰ چھاپا جائے اور اشاعت جاری رہے
ورکنگ کمیٹی نے سول ڈس اوبیڈینس کی راہ کھول دی
جمہوریت ہند کے قیام کی طیاریاں

پرنس آف ویلز کی ۱۷ نومبر ۱۹۲۱ء کو ہندوستان آمد پر ہڑتال کا اعلان اس طرح ۴ نومبر ۱۹۲۱ء کے پیغام کے پہلے صفحہ پر کیا گیا ہے:

پرنس آف ویلز کی آمد
ہندوستان کی خودداری اور اسلام کی محبت کی آزمائش
۱۷ نومبر امتحان کا دن ہے
جمعیۃ العلماء مرکزی خلافت کمیٹی، آل انڈیا خلافت کمیٹی کا متفقہ فیصلہ
کہ سیاحت کو پوری طرح بائیکاٹ کیا جائے
۱۷ نومبر کو ہر جگہ کامل ہڑتال رہے

پیغام کے ۱۸ نومبر ۱۹۲۱ء کا سرورق ملاحظہ کیجیے:

کیا ہندوستان تیار ہے
سول ڈس اوبیڈینس کے شرائط جو کانگریس نے عائد کی ہیں ایسی مشکل نہیں ہیں کہ
ان پر عمل نہ ہو سکے
یہ وقت حیل و حجت کا نہیں اگر لوگ واقعی اس کے لیے تیار ہیں تو
اس کے ثبوت میں
کھدر پہن لیں اور ایک ہفتہ کے اندر چرخہ چلانا سیکھ لیں
اور
پھر قربانی کے لیے میدان میں نکل آئیں

ان تحریروں سے مولانا آزاد کے انداز فکر اور عملی سیاست کا پتہ چلایا جا سکتا ہے جس کے نتیجے میں فرنگی حکمراں کی نگاہیں اور مولانا آزاد کی تحریر و تقریر اور نقل و حرکت پر جمی رہنے لگی تھیں۔

[illegible]

۲۱ دسمبر ۱۹۲۱ء کو کلکتہ میں جمعیۃ العلماء کا جلسہ ہونے والا تھا جس میں شرکت کے لیے مولانا آزاد پنجاب کے دورہ کو ختم کرکے لاہور روانہ ہوئے۔ جہاں ۸ نومبر ۱۹۲۱ء کو پہنچے۔ یہیں بمبئی کے کانگریس کے ہنگامی جلسے کی خبر آئی۔ چنانچہ آزاد ۱۲ نومبر کو بمبئی کے لیے روانہ ہو گئے جہاں ایک ہفتہ قیام کے بعد کلکتہ کا رُخ کیا۔ کلکتہ پہنچتے ہی مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایڈیٹر ہفتہ وار پیغام کی گرفتاری کی خبر ملی جس کے متعلق مولانا آزاد نے ۲ دسمبر ۱۹۲۱ء کو اپنے ان تاثرات کا اظہار کیا:-

"میں خوش ہوں اور سچے دل سے اپنے عزیز رفیق کو مبارکباد دیتا ہوں وہ بے گناہ ہیں اور ان کی گرفتاری ان کے لیے پاک شہادت ہے انہوں نے جس سچی اور بے تکلف بہجت و بشاشت کے ساتھ اپنی گرفتاری کا استقبال کیا اور جس اطمینان اور استقامت کے ساتھ اس وقت قید خانے میں ہیں، خدا تعالیٰ وہ جوہر ہر مسلمان کو عطا کرے!

البتہ اپنے دل کی اس خلش کو دور نہیں کر سکتا۔ کہ رفیقان راہ ایک ایک کرکے قید ہو رہے ہیں اور میں اب تک چھوٹ گیا ہوں" [1]

لیکن یہاں خود آپ کی گرفتاری کی خبر اس طرح گرم تھی کہ اگر مولانا آزاد بدایوں کے جلسہ میں شریک ہونے کے لیے کلکتہ سے روانہ ہو گئے تو گرفتاری نہیں ہوگی۔ مولانا لکھتے ہیں:

"آج ۸ دسمبر ۱۹۲۱ء کی صبح ہے۔ کل شام کو مجھے قابل وثوق ذرائع سے اطلاع مل گئی کہ گورنمنٹ بنگال نے وائسرائے کے مشورے کے بعد میری اور مسٹر سی۔ آر۔ داس کی گرفتاری کا فیصلہ کر لیا ہے میری نسبت گورنمنٹ بنگال کا ارادہ یہ ہے کہ اگر میں گیارہ تک کلکتہ سے باہر نہ گیا تو مجھے گرفتار کرے گی۔ لیکن اگر میں بدایوں کے جلسے جمعیۃ العلماء کے لیے چلا گیا تو پھر اس کے سر سے بلا ٹل جائے گی اور صرف مسٹر داس گرفتار کر لیے جائیں گے۔" [2]

مولانا آزاد نے گرفتاری سے بچنے کی کوشش نہیں کی بلکہ گرفتاری

---

[1] ہفتہ وار پیغام ۲ دسمبر ۱۹۲۱ء ص ۱۵
[2] ہفتہ وار پیغام ۱۶ دسمبر ۱۹۲۱ء ص ۴

کو ایک کہا اور بدایوں کے جلسے میں شرکت کے بجائے کلکتہ میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں مولانا نے وضاحت کرتے ہوئے تحریر کیا ہے :

"میرا پہلا کام یہ تھا کہ لوگوں کے ایمان اور استقامت دونوں کی نسبت اطمینان حاصل کر لوں۔ یہ اطمینان مجھے پانچ تک حاصل ہو گیا۔ اب میں نے سوچا کہ کلکتہ سے باہر جاؤں یا نہ جاؤں؟ بدایوں کے جلسہ جمعیت میں جانا بھی نہایت ضروری تھا۔ ۶ تک میں متذبذب رہا۔ میں نے مہاتما گاندھی جی کو لکھ دیا کہ بقیہ کاموں کے لیے مسٹر سی۔ آر۔ داس کافی ہوں گے۔ میں بدایوں ہو کر بمبئی آتا ہوں، لیکن ۶ کی شام کو یکایک حالات نے دوسری شکل اختیار کی۔ میں نے محسوس کیا کہ گورنمنٹ کی تمام طاقت کلکتہ میں سمٹ آئی ہے اور مقابلے کا فیصلہ کن میدان یہیں پیدا ہو گیا ہے۔ پس میرے لیے ضروری ہو گیا کہ تمام کاموں کو ترک کر کے کلکتہ کے لیے وقف ہو جاؤں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب میں یہیں رہوں گا۔"[4] اور یہ بھی تحریر کیا:

"یہ سچ ہے کہ گورنمنٹ بنگال مجھے گرفتار کرنے سے بچنا چاہتی ہے اور منتظر ہے کہ میں کلکتہ سے باہر چلا جاؤں ..... لیکن افسوس ہے کہ گورنمنٹ کی تمام خواہشوں کی طرح یہ خواہش بھی میری خواہش سے متضاد ہے۔"

اور جب حکومت نے مولانا آزاد کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا تو انہیں خوشی ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں :

"گورنمنٹ نے میری گرفتاری کا فیصلہ کر کے مجھے ایک بہت بڑے بوجھ سے نجات دے دی۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ میرے لیے اب جیل سے باہر رہنا کس قدر تکلیف دہ ہو گیا ہے۔ جو چلے جاتے ہیں انہیں کیا معلوم کہ پیچھے رہ جانے والوں کے دلوں پر کیا گزرتی ہے۔ محمد علی، شوکت علی، لالہ لاجپت رائے، پنڈت موتی لال سب کا سفر پورا ہو گیا اور میں اب تک منزل کے انتظار میں تھا۔ اب منزل میرے سامنے ہے اور میرا دل خوشی سے معمور ہے کہ ایک گھڑی

مگر مقصد میدان اپنے پیچھے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"[5]

اور مولانا نے نہایت صلابت اور حوصلہ کے ساتھ گاندھی جی کو یہ پیغام بھیجا:

"میں آپ کو آپ کی کامیابی پر سب سے زیادہ مبارکباد دیتا ہوں۔ اس مبارکباد کے لیے آپ مجھے جلد باز نہ سمجھیں۔ میں اس قبل وقت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اس کی مبارکباد دینے میں کوئی دوسرا مجھ سے بازی نہ لے جائے۔"[6]

اور قوم کو باخبر کیا:

"ہماری تمام فتحمندی کی بنیاد چار سچائیوں پر ہے اور میں اس وقت بھی ملک کے ہر باشندے کو ان ہی کی دعوت دیتا ہوں۔

۱۔ ہندو مسلمان کا کامل اتفاق

۲۔ امن

۳۔ نظم

۴۔ قربانی اور اس کی استقامت۔

مسلمانوں سے میں خاص طور سے التجا کروں گا کہ اپنے اسلامی شرف کو یاد رکھیں اور آزمائش کی اس فیصلہ کن گھڑی میں اپنے تمام ہندوستانی بھائیوں سے آگے نکل جائیں۔ اگر پیچھے رہے تو ان کا وجود چالیس کروڑ مسلمانانِ عالم کے لیے شرم و ذلت کا ایک دائمی دھبہ ہو گا۔"[7]

مسلمانوں کو خاص طور سے تاکید کی :

"میں مسلمانوں سے خاص طور پر دو باتیں اور بھی کہوں گا۔ ایک یہ کہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ پوری طرح متفق رہیں اور اگر ان میں سے کسی ایک بھائی یا کسی ایک جماعت سے کوئی نا طاقتی کی بات بھی ہو جائے تو اُسے بخش دیں .... دوسری بات یہ ہے کہ مہاتما گاندھی پر پوری طرح اعتماد رکھیں اور جب تک وہ کوئی ایسی بات نہ چاہیں (اور وہ کبھی نہیں چاہیں گے) جو اسلام کے خلاف ہو۔ اس وقت تک پوری سچائی اور مضبوطی کے ساتھ ان کے مشوروں پر کاربند رہیں۔"[8]

---

[4] ہفتہ وار پیغام کلکتہ ۲۰ دسمبر ۱۹۲۱ء ص ۴

[5،6،7،8] ہفتہ وار پیغام کلکتہ ۱۶ دسمبر ۱۹۲۱ء ص ۵

اس ۸ر دسمبر کے پیغام میں مولانا نے مرکزی خلافت کمیٹی، حکیم اجمل خاں اور جمعیت العلماء کے نام بھی پیغام بھیجے لیکن گورنمنٹ بنگال کو ان الفاظ میں انکار کر کہا:

"۲۴ر کی ہڑتال ضرور ہوگی اور خلافت اور کانگریس
رضاکاروں کا سلسلہ ہماری گرفتاری کے بعد بھی
طاقت کے ساتھ جاری رہے گا"۔[9]

اسی کے ساتھ عزیزانِ ملک و ملت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

مجھے چار سال نظر بند رہنے کے بعد دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہا
کیا اور دو سال کے بعد اب پھر جیل خانے جا رہا ہوں۔
اللہ آپ سب کا مددگار ہو اور راہ خدمتِ حق پر مستقیم
رکھے۔[10]

۲ر دسمبر ۱۹۲۱ء سے مولانا ابوالکلام آزاد اور سی۔ آر۔ داس کی گرفتاری کی خبریں مشتہر ہو رہی تھیں۔ ہر گھڑی ان کے گرفتار ہونے کے امکان تھے۔ ۸ر ۹ر دسمبر کو واضح طور سے محسوس کیا گیا کہ مولانا کے بدایوں جانے کے متعلق معلومات حاصل کی جا رہی ہیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ مولانا اس اعلان کے باوجود وہ بدایوں کے ۱۰ر اور ۱۱ر دسمبر کے جلسے میں شریک نہیں ہو رہے ہیں اس پر یقین نہیں کیا جا رہا تھا۔ ادھر رضاکاروں کی گرفتاری برابر عمل میں آ رہی تھی اور ۱۰ر دسمبر کی صبح تک ان کی ایک ہزار سے زیادہ گرفتاری ہو چکی تھی۔

۱۰ر دسمبر کو مولانا آزاد نے اہلِ ہند کو یہ پیغام دیا۔ "جس منزل کا انتظار تھا وہ آگئی"۔

"کیسی مبارک گھڑی ہے جو آگئی!
خوف و ہراس کے بادل چھٹ گئے، امید کی روشنی
پھیل گئی۔ فتح و مراد کا سورج نکل رہا ہے اور خدا کی
رحمت و نصرت بے نقاب ہو کر سامنے آگئی ہے۔
افسوس ان پر جو اب بھی نہ دیکھیں! انتظار کی رات
بڑی ہی تاریک تھی، لیکن دیکھو امید کی صبح کیسی کیسی
دلفریب اور جمال افزا ہے! افسوس ان پر جو اب بھی
کروٹ نہ لیں!"

کیا تم افق کی طرف نہیں دیکھتے؟ یہ سچ ہے کہ سورج
ابھی نہیں نکلا، لیکن اس کی روشنی تو اپنی طرح نکل
آئی ہے اور ہم سورج کو صرف اس کی روشنی میں دیکھ
سکتے ہیں۔ آؤ غفلت کا بستر ہمیشہ کے لیے
تہ کر دیں۔ خدا کا پاک نام لیں اور راہِ مقصد میں
آخری کوچ شروع کر دیں۔ رات صاف ہے اور منزل
سامنے نظر آ رہی ہے۔ ہمت، صبر، قربانی اور استقامت
کے چند ایام میں صدیوں کا سفر طے ہو جائے گا:

رہرو تشنہ لب نہ گھبرانا
اب لبِ چشمۂ بقا تو ہے

اصبروا، وصابروا، ورابطوا، لعلکم تفلحون۔ ابوالکلام"[11]

۱۰ر دسمبر کو ساڑھے چار بجے ڈپٹی کمشنر اسپیشل برانچ مسٹر گولڈی اور ایک یورپین انسپکٹر پولیس مولانا کو دریافت کرنے ان کے گھر آئے۔ مولانا اس وقت اوپر کی منزل پر تھے اور فضل الدین احمد سے خطوط کے جواب لکھوا رہے تھے۔ مولانا نے انہیں وہیں بلا لیا۔ مسٹر گولڈی نے مولانا کو سلام کیا اور کہا کہ وہ انہیں لینے آئے ہیں۔ فضل الدین احمد کے دریافت کرنے پر کہ کیا وہ وارنٹ لے کر آئے ہیں، مسٹر گولڈی نے انکار میں جواب دیا۔ بغیر وارنٹ کے بھی مولانا جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ مولانا اندرون خانہ گئے اور پانچ منٹ میں جانے کے لیے تیار ہو کر آ گئے۔ مولانا سے کہا گیا کہ اپنے آرام کے لیے کوئی چیز لینا چاہیں تو لے لیں۔ لیکن مولانا نے صرف ایک گرم چادر اوڑھ لی۔ بس کوئی اور چیز نہیں لی۔ جاتے وقت مولانا نے تاکید کرتے ہوئے کہا۔

"کلکتہ اور باہر کے تمام احباب اور قومی کارکنوں
کو میرا پیغام پہنچا دیا جائے کہ تمام لوگ اپنے اپنے
کاموں میں پوری مستعدی کے ساتھ مشغول رہیں
مجھ سے ملنے کے لیے کوئی شخص نہ آئے۔ نہ اپنی جگہ
اور اپنے کام کو چھوڑے۔ گرفتاری کو ایک معمولی
اور متوقع واقعہ کی طرح محسوس کرنا چاہیے مجھے بڑا ہی
رنج ہوگا اگر کسی کارکن نے میری ملاقات کے لیے
اپنا ایک گھنٹہ بھی ضائع کیا"۔[12]

اس کے بعد مولانا یورپین پولیس انسپکٹر کے ساتھ کار میں روانہ ہو گئے۔ لیکن یہ سارا عمل اس قدر سادگی کے ساتھ ہوا کہ کسی کو وہم و گمان بھی نہ ہوا کہ مولانا جیل جا رہے ہیں۔

---

[9] ہفتہ وار پیغام کلکتہ ۱۶ر دسمبر ۱۹۲۱ء ص ۸
[10] ہفتہ وار پیغام کلکتہ ۱۶ر دسمبر ۱۹۲۱ء ص ۸
[11] ہفتہ وار پیغام کلکتہ: ۱۶ر دسمبر ۱۹۲۱ء ص: ۱
[12] قولِ فیصل: ابوالکلام آزاد ص ۴۳

مولانا پہلے پولیس اسٹیشن لائے گئے۔ وہیں سی آر داس بھی پہنچے
پھر ایک موٹر کار میں دونوں سوار ہوتے اور پریذیڈنسی جیل لائے گئے، جہاں
مولانا نے نماز مغرب ادا کی۔ بعد میں سپرنٹنڈنٹ جیل نے انہیں بلایا گیا۔ پھر
دونوں یورپین وارڈ بھیجا دیے گئے اور الگ الگ کمروں میں بند کر دیے گئے۔
جن میں ایک صراحی، تام چینی کٹورا، اسٹول اور ٹیبل[1] تھے۔ بیس ساڑھے
سات بجے مولانا نے عشا کی نماز پڑھی اور دو چار گھونٹ پانی پی کر بغیر
کھانا کھائے سو گئے۔ دوسرے دن صبح کرنل ہملٹن جو سپرنٹنڈنٹ تھے،
جیلر کے ساتھ آئے۔

جیل ہی میں حکم آچکا تھا کہ انہیں کسی سے ملنے نہ دیا جائے۔
عزیزوں سے بھی ملنے کی اجازت نہ تھی، اخبار دینے کی بھی ممانعت
تھی صرف بستر اور کھانا گھر کا لیا گیا۔

اس مقدمہ کی کل سات پیشیاں ہوئیں:

○ پہلی پیشی ۱۳ دسمبر کو ہوئی۔ مجسٹریٹ نے کہا دفعہ ۱۷ کے تحت آپ دونوں گرفتار رکھے گئے۔ مقدمہ کی تاریخ ۱۳ دسمبر قرار دی جاتی ہے۔

○ دوسری پیشی ۲۳ دسمبر ۲۱ بجے شام میں ہوئی۔ مجسٹریٹ سپرنٹنڈنٹ آفس میں آیا۔ یہیں عدالتی کارروائی یہ ہوئی کہ مقدمہ ۲۲ جنوری ۱۹۲۲ء کے لیے ملتوی ہوگیا۔

○ تیسری پیشی ۵ جنوری کے بجائے ۶ جنوری کو ہوئی۔ مولانا پریذیڈنسی کورٹ میں لائے گئے اور اسی سے کارروائی شروع ہوئی۔ ساڑھے بارہ بجے مولانا آزاد کا مقدمہ مسٹر سونہو چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا۔ اس پیشی کے بعد مقدمہ ۱۱ جنوری تک کے لیے ملتوی ہوگیا۔

○ چوتھی پیشی ۱۱ جنوری کو پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت میں ہوئی پھر مقدمہ ۱۷ جنوری تک ملتوی کر دیا گیا۔

○ پانچویں پیشی ۱۷ جنوری کو پریذیڈنسی سول جیل میں ہوئی۔ مولانا نے اردو میں ۲۶ صفحات پر مشتمل بیان پیش کیا۔

○ چھٹی پیشی ۲۴ جنوری کو ہوئی۔ مولانا کا بیان عدالت میں لیا گیا اور ساتویں پیشی کے لیے ۳۱ جنوری کی تاریخ طے پائی۔ لیکن ساتویں پیشی ۳۱ جنوری کے بجائے ۹ فروری

---

[1] قولِ فیصل: ابوالکلام آزاد ص ۴۷

تک ملتوی کر دی گئی۔

تحریری بیان کے بعض اہم حصے:

مولانا آزاد نے اپنا تحریری بیان دیتے ہوئے صاف صاف اپنی اس بات کا اظہار کیا کہ:-

"میرا ارادہ نہ تھا کہ کوئی تقریری یا تحریری بیان پیش کروں۔ یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہمارے لیے نہ تو کسی طرح کی امید ہے نہ مطلب ہے نہ شکایت ہے۔
یہ ایک موڑ ہے جس سے گزرے بغیر ہم منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لیے تھوڑی دیر کے لیے اپنی مرضی کے خلاف دم لینا پڑتا ہے"[2]

مولانا کا یہ بھی خیال تھا کہ:-

"عدالت کا اختیار ایک طاقت ہے اور وہ انصاف اور ناانصافی دونوں کے لیے استعمال کی جاسکتی ہے منصف گورنمنٹ کے ہاتھ میں وہ عدل اور حق کا سب سے بہتر ذریعہ ہے لیکن جابر اور مستبد حکومتوں کے لیے اس سے بڑھ کر انتقام اور ناانصافی کا کوئی آلہ بھی نہیں[3]"

اور ـــــ

تاریخ عالم کی سب سے بڑی ناانصافیاں میدانِ جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں میں ہوئی ہیں"

عدالت میں تحریری بیان دینے کی وجہ مولانا نے یہ بتلائی تھی:

"بہرحال میرا ارادہ نہ تھا کہ بیان دوں، لیکن ۶ جنوری کو جب میرا مقدمہ پیش ہوا تو میں نے دیکھا گورنمنٹ مجھے سزا دلانے کے معاملے میں نہایت عاجز اور پریشان ہو رہی ہے۔ حالانکہ میں ایسا شخص ہوں جس کو اس خواہش اور خیال کے مطابق سب سے پہلے سب سے زیادہ سزا ملنی چاہیے[4]"

مولانا آزاد نے اقرار جرم کرتے ہوئے جو تحریری بیان دیا اس کا خلاصہ یہ ہے:

ہندوستان میں بھی یہ مقابلہ شروع ہوگیا ہے۔
اس لیے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ اگر یہ لڑکے بھی
کے نزدیک آزادی اور حق طلبی کی جدوجہد جرم ہے تو

---

[2] قولِ فیصل: ابوالکلام آزاد ص ۶۷

[3] قولِ فیصل: ابوالکلام آزاد ص ۸۱-۸۳-۸۴

وہ اُن لوگوں کو سخت سزاؤں کا مستحق خیال کرے جو انصاف کے نام سے اس کی غیر منصفانہ ہستی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نہ صرف اس کا مجرم ہوں بلکہ ان لوگوں میں ہوں جنہوں نے اس جرم کی اپنی قوم کے دلوں میں تخم ریزی کی ہے اور اس کی آبیاری کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی ہے۔ میں مسلمانانِ ہند میں پہلا شخص ہوں جس نے ۱۹۱۲ء میں اپنی قوم کو اس جرم کی عام دعوت دی اور تین سال کے اندر اس غلامانہ روش سے اُن کا رُخ پھیر دیا جس میں گورنمنٹ کے پُرتبخ فریب نے مبتلا کر رکھا تھا۔ پس اگر گورنمنٹ مجھے اپنے خیال میں مجرم سمجھتی ہے اور اس لیے سزا دلانا چاہتی ہے تو میں پوری صاف دلی کے ساتھ تسلیم کرتا ہوں کہ یہ کوئی خلافِ توقع بات نہیں ہے جس کے لیے مجھے شکایت ہو۔"؎

مولانا آزاد نے اپنے اس تحریری بیان میں حسبِ ذیل سرخیوں کے تحت اپنی بات کی وضاحت کی ہے اور اپنے جرم کا اقرار کیا ہے:

گرفتاری کا اصل باعث۔ گورنمنٹ کا فیصلہ اور شکست۔

اجتماعِ عیدین۔ نئی قانونی تشریحات۔ قانون کا ڈراما۔ میری تقریریں۔

"میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے نہ صرف انہی دو موقعوں پر بلکہ گزشتہ دو سال کے اندر اپنی بے شمار تقریروں میں یہ اور اسی مطلب کے لیے اس سے زیادہ واضح اور قطعی جملے کہے ہیں۔ ایسا کہنا میرے اعتقاد میں میرا فرض ہے۔"

موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے:

یقیناً میں نے کہا ہے: "موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے" لیکن اگر میں یہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں! میں یہ نہیں جانتا کہ کیوں مجھ سے یہ توقع کی جائے کہ ایک چیز کو اس کے اصلی نام سے نہ پکاروں؟ میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں۔"

"میں یقیناً کہتا رہا ہوں کہ ہمارے فرض کے سامنے دو راہیں ہیں: گورنمنٹ ناانصافی اور حق تلفی سے باز آ جائے۔ اگر باز نہیں آ سکتی تو مٹا دی جائے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ یہ تو انسانی عقائد کی اتنی پرانی سچائی ہے کہ صرف پہاڑ اور سمندر ہی اس کے ہم عمر کہے جا سکتے ہیں۔ جو چیز بُری ہے، اسے یا تو درست ہو جانا چاہیے یا مٹ جانا چاہیے۔ تیسری بات کیا ہو سکتی ہے؟"

میرا یہ اعتقاد کیوں ہے؟:

"... میرا یہ اعتقاد اس لیے ہے کہ میں ہندوستانی ہوں، اس لیے ہے کہ میں مسلمان ہوں، اس لیے ہے کہ میں انسان ہوں۔"

○ شخصی اقتدار بالذات ظلم ہے۔

"میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور ہر قوم کا پیدائشی حق ہے۔ کوئی انسان یا انسانوں کی گھڑی ہوئی بیوروکریسی یہ حق نہیں رکھتی کہ خدا کے بندوں کو اپنا محکوم بنائے۔ محکومی اور غلامی کے لیے کیسے ہی خوش نما نام کیوں نہ رکھ لیے جائیں، لیکن وہ غلامی ہی ہے اور خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے۔ پس میں موجودہ گورنمنٹ کو جائز حکومت تسلیم نہیں کرتا اور اپنا ملکی، مذہبی اور انسانی فرض سمجھتا ہوں کہ اس کی محکومی سے ملک و قوم کو نجات دلاؤں۔"

اسلام اور بیوروکریسی:

"میں مسلمان ہوں اور بحیثیت مسلمان ہونے کے بھی میرا مذہبی فرض یہی ہے۔ اسلام کسی ایسے اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کرتا جو شخصی ہو یا چند تنخواہ دار حاکموں کی بیوروکریسی ہو۔ وہ آزادی اور جمہوریت کا مکمل نظام ہے جو نوعِ انسانی کو اس کی چھینی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لیے آیا تھا۔"

○ اسلام ایک جمہوری نظام ہے ○ قومی اور مسلم بیوروکریسی بھی ظلم ہے ○ مسلمانوں کا قومی وظیفہ۔

"ایک مسلمان سے یہ توقع رکھنی کہ وہ حق کا اعلان نہ کرے اور ظلم کو ظلم نہ کہے بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے یہ کہا جائے کہ وہ اسلامی زندگی سے دستبردار ہو جائے۔"

○ شہادۃ علی الناس ○ کتمانِ شہادت ○ امر بالمعروف

؎ قولِ فیصل' ابوالکلام آزاد ص ۸۵-۸۹

نہی عن المنکر

"اسی لیے اسلام کے واجبات و فرائض میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ یعنی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔"

"قرآن سچے مسلمانوں کی پہچان یہ بتلاتا ہے: وہ حق کے اعلان میں کسی سے نہیں ڈرتے نہ دنیا کی لالچ ان پر غالب آ سکتی ہے، نہ کوئی خوف۔ وہ طمع بھی رکھتے ہیں تو صرف خدا سے اور ڈرتے بھی ہیں تو صرف خدا سے"۔

○ ارکان اربعہ ○ اسلامی توحید اور امر بالمعروف:

"جن مسلمانوں کے مذہبی فرائض میں یہ بات داخل ہے کہ موت قبول کر لیں مگر حق گوئی سے باز نہ آئیں اُن کے لیے دفعہ نمبر ۱۲۴۔ الف کا مقدمہ یقیناً کوئی بڑی ڈراؤنی چیز نہیں ہو سکتا۔ جس کی زیادہ سے زیادہ سزا سات برس کی قید ہے۔"

○ اسلام میں کوئی دفعہ ۱۲۴ نہیں فتنہ تاتار اور فتنہ یورپ ○ حجاج اور ریڈنگ

○ انقلاب حال:

"میں سچ کہتا ہوں۔ مجھے اس کی رائی برابر بھی شکایت نہیں کہ سزا دلانے کے لیے مجھ پر مقدمہ چلایا گیا ہے۔ یہ بات تو بہر حال ہونی ہی تھی لیکن حالات کا یہ انقلاب میرے لیے بڑا ہی درد انگیز ہے کہ ایک مسلمان سے کتمان شہادت کی توقع کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ ظلم کو صرف اس لیے ظلم نہ کہے کہ دفعہ ۱۲۴۔ الف کا مقدمہ چلایا جائے گا"۔

"میں اس درد انگیز اور جاں کاہ حقیقت سے انکار نہیں کرتا اس انقلاب حالت کے ذمہ دار خود مسلمان ہی ہیں۔ اُنہوں نے اسلامی زندگی کے تمام خصائص کھو دیے اور اُن کی جگہ غلامانہ زندگی کے تمام رذائل قبول کر لیے ان کی موجودہ حالت سے بڑھ کر دنیا میں اسلام کے لیے کوئی فتنہ نہیں"۔

○ یا آزادی یا موت:

"....مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیے یا آزاد رہنا چاہیے۔ تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں"۔ اسی لیے میں نے آج سے بارہ سال پہلے "الہلال" کے ذریعے مسلمانوں کو دعوت دلایا تھا کہ آزادی کی راہ میں قربانی و جان فروشی اُن کا قدیم اسلامی ورثہ ہے۔ اُن کا اسلامی فرض یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام جماعتوں کو اس راہ میں اپنے پیچھے چھوڑ دیں۔ میری صدائیں بے کار نہ گئیں۔ مسلمانوں نے اب آخری فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے ملک کو غلامی سے نجات دلائیں گے۔

مسئلہ خلافت و پنجاب:

اگر ظلم نہیں تو کیا عدل ہے:

جرم کا قدیم اور ناقابلِ شمار ارتکاب:

"میں اقرار کرتا ہوں کہ میری کوئی تقریر گزشتہ دو سال کے اندر ایسی نہیں ہوئی ہے جس میں یہ تمام باتیں میں نے بیان نہ کی ہوں"۔

آخری اسلامی تحریک۔

خلافت کانفرنس کلکتہ: موالات اور قومی ملازمت —

"میں نے اسی ایڈریس میں اس اسلامی حکم کی بھی تشریح کر دی تھی جس کی بنا پر مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے کہ موجودہ حالت میں گورنمنٹ سے "ترکِ موالات" کریں۔ یعنی کو آپریشن اور اعانت سے ہاتھ کھینچ لیں۔ یہی "ترکِ موالات" ہے جو آگے چل کر "نان کو آپریشن" کی شکل میں نمودار ہوا اور مہاتما گاندھی نے اس کی سربراہی کی"۔

میری زندگی سرتا سر ۱۲۴۔ ہے:

"میں نے گزشتہ دو سال کے اندر تنہا اور مہاتما گاندھی کے ساتھ تمام ہندوستان کا بار بار دورہ کیا۔ کوئی شہر ایسا نہیں ہے جہاں میں نے خلافت، پنجاب، سوراج اور نان کو آپریشن پر بار بار تقریریں نہ کی ہوں۔ اور وہ تمام باتیں نہ کہی ہوں جو میری ان دو تقریروں میں دکھلائی گئی ہیں"۔

نان وائلنس۔ نان کو آپریشن:

"ہم نے آزادی اور حق طلبی کی اس جنگ میں "نان وائلنس" "نان کو آپریشن" کی راہ اختیار کی ہے۔ ہمارے مقابلے میں طاقت اپنے تمام جبر و تشدد اور خوں ریز وسائل کے ساتھ کھڑی ہے۔ لیکن ہمارا اعتماد صرف خدا پر ہے

اور اپنی غیر مختتم قربانی اور غیر متزلزل استقامت پر۔
مہاتما گاندھی کی طرح میرا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ
کسی حال میں بھی ہتھیار کا مقابلہ ہتھیار سے نہیں
کرنا چاہیے۔ اسلام نے جن حالتوں میں اس کی اجازت
دی ہے میں اسے فطرۃ الٰہی اور عدل و اخلاق کے
مطابق یقین کرتا ہوں، لیکن ساتھ ہی ہندوستان
کی آزادی اور موجودہ جدوجہد کے لیے مہاتما گاندھی
کے تمام دلائل سے متفق ہوں اور ان دلائل کی سچائی
پر پورا اعتماد رکھتا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ ہندوستان
نان وائلنس جدوجہد کے ذریعے فتحمند ہوگا اور اس
کی فتحمندی اخلاقی و ایمانی فتحمندی کی ایک یادگار
مثال ہوگی۔"

سی۔ آئی۔ ڈی کے رپورٹرز :

○ اردو مختصر نویسی ○ مشرقی لٹریچر اور سرکاری وسائل علم۔

"یہی وجہ ہے کہ اب ہم اس گورنمنٹ سے اور کچھ
نہیں چاہتے صرف یہ چاہتے ہیں کہ جس قدر بھی
جلد ممکن ہو۔ وہ اپنے سے بہتر اور حق دار کے لیے
اپنی جگہ خالی کر دے۔"

موجودہ حالات قدرتی ہے :

بغاوت :

قانون "قضا و بالحق"

سرکاری وکیل، پولیس اور مجسٹریٹ :

"میں مجسٹریٹ کی نسبت بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں
زیادہ سے زیادہ سزا جو اس کے اختیار میں ہے
بلا تامل مجھے دے دے مجھے شکایت یا رنج
کا کوئی احساس نہ ہوگا۔ میرا معاملہ پوری مشینری
سے ہے۔ کسی ایک پرزے سے نہیں ہے میں جانتا
ہوں کہ جب تک مشین نہیں بدلے گی پرزے اپنا
فعل نہیں بدل سکتے۔

میں اپنا بیان اٹلی کے قتیل صداقت "گارڈ نیو
برونو" کے لفظوں پر ختم کرتا ہوں جو میری ہی طرح
عدالت کے سامنے کھڑا کیا گیا تھا۔

"زیادہ سے زیادہ جو سزا دی جا سکتی ہے بلا تامل
دے دو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ سزا کا حکم لکھتے ہوئے

جس قدر جنبش تمہارے دل میں پیدا ہوگی، اس کا
عشر عشیر اضطراب بھی سزا سن کر میرے دل کو نہ
ہوگا۔"

مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ تاریخی بیان نہ صرف اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اس سے مولانا آزاد کے اس زمانے کی ہمت جرأت، بے باکی اور سیاسی شعور کا علم ہوتا ہے بلکہ جنگ آزادی کے سلسلے میں مولانا کے فکر و عمل سے واضح طور سے آگاہی ہوتی ہے بلاشبہ جہاں وہ پکے مسلمان تھے، وہاں سچے ہندوستانی بھی تھے۔ وہ گاندھی جی کو اپنا رہنما تصور کرتے تھے، لیکن بہت سے سیاسی معاملات میں اپنا نقطۂ نظر مختلف بھی رکھتے تھے۔ ہندوستانیوں کے درمیان وہ اتحاد و اتفاق کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور کسی قیمت پر اس سے دستبردار ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ آخر دم تک وہ اپنے اس نظریہ پر قائم رہے۔

گاندھی جی نے مولانا کے اس اہم بیان کو پڑھ کر اپنے ان خیالات کا اظہار کیا :۔

"... مولانا کے بیان میں بہت بڑی ادبی خوبصورتی
ہے۔ وہ نہایت وسیع روانی کے ساتھ پرجوش بھی
ہے۔ وہ نہایت دلیرانہ ہے۔ اس کا لہجہ غیر متزلزل ہے
اور غیر آشتی طلب UNCOMPROMISING
ہے مگر ساتھ ہی سنجیدہ اور متین بھی ہے۔ تمام
بیان میں اوّل سے آخر تک ایک پرجوش اثر پایا جاتا
ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا خلافت اور نیشنلزم پر
مولانا ایک پُر اثر خطبہ دے رہے ہیں۔"

۹ر فروری ۱۹۲۲ء سے پہلے مولانا آزاد نے حسب ذیل امور کا زبانی یا اخبارات کے ذریعے اعلان کیا :۔

۱۔ "۹ر فروری کو کوئی شخص عدالت کی کارروائی دیکھنے کے لیے نہ آئے۔ نہ کسی قسم کا ہجوم سڑک پر ہو۔"

۲۔ یہ یقینی ہے کہ انہیں سزا کا حکم سنایا جائے گا۔ پبلک کو چاہیے کہ پورے صبر و سکون کے ساتھ اس کی منتظر اور متوقع رہے۔ کوئی ہڑتال نہیں ہونی چاہیے نہ کسی طرح کا غیر معمولی مظاہرہ کرنا چاہیے۔"

۳۔ ۹ر کو لوگ جیل کی طرف بھی ہجوم نہ کریں اور نہ انہیں دیکھنے کے لیے جدوجہد کریں۔ صرف اپنی معمولی روزانہ جدوجہد جاری رکھیں اور جہاں تک ممکن ہو اس کی سرگرمی بڑھائیں۔"

اور ۷ر فروری ۱۹۲۲ء کو مولانا آزاد نے اخبار میں یہ پیغام شائع کرایا :۔

محمود سعیدی

جوش ملیح آبادی: کچھ یادیں کچھ باتیں

۲۲ فروری ۱۹۸۲ء کی بات ہے۔ ان دنوں میں ماہ نامہ "نگار" نئی دہلی کے شعبۂ ادارت سے وابستہ تھا۔ سہ پہر کا وقت ہوگا۔ میں رسالے کی کاپیاں پریس بھیجنے کی تیاری میں تھا کہ حیات لکھنوی کا فون آیا۔ حیات صاحب عزیز لکھنوی مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ جن سے جوش ملیح آبادی نے شعر گوئی کی ابتدا میں اپنے کلام پر اصلاح لی تھی۔ حیات صاحب نے گلوگیر آواز میں کہا: "آپ کے لیے اور پوری اردو دنیا کے لیے ایک بہت بری خبر ہے۔ آج صبح اسلام آباد کے ایک اسپتال میں جوش صاحب کا انتقال ہوگیا۔" اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ جوش ملیح آبادی جو طالب علمی کے دنوں سے آج تک ذہنی افق پر ایک غیر زوال پذیر سورج کی طرح روشن رہے تھے۔ اپنی عالم تاب روشنی سمیٹ کر قبر کے تنگ و تاریک گوشے میں جا سوئیں گے، اس کا تصور بھی محال تھا، لیکن پھر تھوڑی ہی دیر میں غالب اکیڈمی کے سکریٹری ذہین نقوی کا فون آیا، امیر قزلباش کا فون آیا اور بھی کئی فون آئے۔ سب نے یہی خبرِ بد سنائی یا اس کی تصدیق چاہی۔ اس خبر کو جھٹلانے کو جی چاہتا تھا۔ تبھی سڑک سے "ایوننگ نیوز" کا ہاکر آواز لگاتا گزرا۔ لپک کر اخبار خریدا۔ اخبار میں بھی یہ ناقابلِ یقین خبر موجود تھی۔ اب کانوں کی گواہی میں آنکھوں کی گواہی بھی شامل ہوگئی تھی۔ ماننا پڑا کہ یہ خبر سچ ہے۔

شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ ایک گرجتی گرجتی آواز جو لگ بھگ پون صدی تک مردہ دلوں میں زندگی کی رو دوڑا دینے کو مضطرب رہی تھی، خوابیدہ ذہنوں کو بیداری کا پیغام دیتی رہی تھی، خود ہمیشہ ہمیش کے لیے خاموش ہوگئی تھی۔ ان کے شیرازی ہمنوا حافظ نے صدیوں پہلے کہا تھا:

عاقبت منزلِ ما وادیٔ خاموشان است
حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز

جوش صاحب کی زندگی بھی اور شاعری بھی اس شعر کا مصداق رہی۔ وہ ذہنی اور فکری جمود کے خلاف عملاً بھی صف آرا رہے اور نظریاتی طور پر بھی۔ وہ ہمعصر سماجی اور سیاسی علوم سے زیادہ قریبی شناسائی نہیں رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ مارکسی فلسفے سے بھی، جس کے وہ مبلغ بنے۔ ان کی وابستگی رومانی قسم کی تھی۔ لیکن انہوں نے طبیعت باغیانہ پائی تھی۔ جو ٹھہراؤ پر تبدیلی کو ترجیح دیتی تھی۔ ان کی شاعری، ان کی باغی شخصیت اور انقلابی مزاج کی ترجمان تھی۔ ایک زمانے میں ان کی جلوت و خلوت کے شریک اسرار الحق مجاز نے ان پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا:

سینۂ انقلاب چھلنی ہے
شاعرِ انقلاب کیا جانے

لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کی آواز میں وہ ہمہمہ وہ جوش و خروش تھا جس کی ضرب سے گنبدِ افلاک کے سائے میں غفلت کی سیج سجانے والوں کا تو کیا ذکر، ایک بار تو آسودگانِ تہِ خاک کی نیندیں بھی ٹوٹ جائیں۔

جوش صاحب نے جب شعر و ادب کے کوچے میں قدم رکھا تو وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ ان کی مشہور نظم "طلوعِ اسلام" اور سورۂ رحمٰن کا منظوم ترجمہ انہی دنوں کی یادگار ہے، لیکن آگے چل کر کچھ تو اس وقت کے علمائے دین کی بے جا قدامت پرستی کے ردِ عمل کے طور پر اور

اردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کچھ تو شاید علامہ اقبال کی ضد میں جنہیں شاعر کے ساتھ ساتھ حکیم الامت بھی کہا جانے لگا تھا۔ وہ اسلامی عقیدے سے منحرف ہو گئے اور اس انحراف پر بھی فخر کرنے لگے۔ جوش صاحب اقبال کی شاعرانہ عظمت کے معترف تھے لیکن اس سے انہیں اُلجھن ہوتی تھی کہ اقبال کی شاعرانہ فتوحات کے تذکرے میں لوگ ان کے مذہبی عقائد کا حوالہ دینے لگتے تھے۔ اقبال کے ہاں عشق و جنون کے لفظ اقدار کے ہم معنی ہیں۔ وہ اقدار جو عقیدے کے بطن سے جنم لیتی ہیں اور انسان کو زندگی کرنے کے آداب سکھاتی ہیں۔ جوش صاحب نے عشق و جنون کے اس تصور کو حیات و کائنات کی حقیقت سے بے خبری کا نام دیا اور اس کا تمسخر اُڑایا۔ وہ عشق و جنوں کے مقابلے پر عقل و خرد اور ایمان کی جگہ الحاد کے داعی بن کر سامنے آئے جو ایک منفی رویہ تھا۔ پھر یہ کہ اس خود ساختہ منصب کے لیے بھی جو ذہنی اور فکری صلاحیتیں درکار تھیں، وہ ان سے محروم تھے۔ ان کے تفکر و تعقل کے دعووں میں وہ زور آخر تک پیدا نہ ہو سکا جو کسی کو متاثر کر سکتا ——۔ یہاں ایک دلچسپ واقعے کا ذکر بے محل نہ ہوگا جو میں نے کئی لوگوں سے سنا ہے۔ دلی میں ایک بزرگ تھے۔ مولانا عبدالسلام نیازی۔ ترکمان دروازے کے اندر شمس العارفین شاہ ترکمان بیابانی کی درگاہ کے پاس ایک معمولی سے مکان کے بالائی حصے میں رہتے تھے۔ شاہد احمد دہلوی نے خواجہ حسن نظامی کا جو خاکہ لکھا ہے، اس میں ان کا بھی ذکر آیا ہے۔ جید عالم تھے۔ طبیعت قلندرانہ پائی تھی۔ پوری زندگی گوشہ نشینی میں گزاری، مگر دلی میں ان کے علم و فضل کا شہرہ عام تھا۔ خود کہیں نہ جاتے، لیکن لوگ دُور دُور سے چل کر ان کے پاس آتے تھے۔ دلی کے زمانۂ قیام میں جوش صاحب بھی اکثر ان کے ہاں پہنچ جاتے۔ مولانا موڈ میں ہوتے تو ان سے کلام سنانے کی فرمائش کرتے اور مزے لے لے کر سنتے۔ ایک بار جوش صاحب کو نہ جانے کیا سوجھی۔ کہنے لگے کہ "مولانا! میری ولادت تو مسلم گھرانے میں ہوئی ہے، لیکن مجھے ذاتِ باری تعالیٰ پر کچھ شکوک ہیں۔ میں انہیں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ آپ نے غالب کا وہ مصرعہ تو سنا ہی ہوگا،

ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

مولانا عبدالسلام نیازی کے چہرے کا رنگ اچانک متغیر ہو گیا۔ جوش صاحب سے بے تکلف تو تھے ہی، بولے: "ارے بدبخت! تجھ سے پہلے جو ملحدین گزرے ہیں، انہیں ان کے علم کی زیادتی نے گمراہ کیا، تو جو کرسئ جہالت پر بیٹھ کر وجودِ حق تعالیٰ کا انکار کر رہا ہے، اس کا کیا جواز ہے؟" جوش صاحب مولانا کے مزاج سے واقف تھے، بُرا نہیں مانے، مسکرا کر کہا: "مولانا میری معروضات تو سن لیجیے۔" مولانا کچھ دیر جوش صاحب کی باتیں سنتے رہے۔ پھر قہقہہ لگا کر بولے "تیرا دماغ شیطان کی سنڈاس ہے"۔

جوش صاحب کو میں نے پہلی بار اپنے آبائی شہر ٹونک میں دیکھا تھا۔ وہ ٹونک کے آخری نواب محمد اسماعیل علی خاں تاج کی دعوت پر وہاں پہنچے تھے۔ نواب صاحب کو حکومتِ ہند کی وزارتِ مالیات سے اپنا کوئی کام نکلوانا تھا اور یہ کام معمولی نہیں تھا۔ بسمل سعیدی صاحب اُن دنوں ٹونک ہی میں مقیم تھے۔ اُنہوں نے نواب صاحب کو مشورہ دیا کہ آپ جوش ملیح آبادی صاحب کو ٹونک بلا کر ان کی خوشنودی حاصل کریں اور پھر ان سے کہیں کہ وہ وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے کہہ کر آپ کا کام کرا دیں —— پنڈت جی ان کا بہت لحاظ کرتے ہیں یقین ہے کہ ان کے کہے کو نہ ٹالیں گے۔ نواب صاحب نے یہ مشورہ مان لیا اور جوش صاحب ان کے مہمان بن کر ٹونک پہنچے۔ بیگم جوش بھی ساتھ تھیں۔ دونوں کو مہندی باغ کی پہاڑیوں کے بنگلہ نمبر ۲ میں ٹھہرایا گیا۔ اور ایک نئی بیوک کار جو نواب صاحب نے اُنہی دنوں خریدی تھی، ان کی پیشوائی میں دے دی گئی تاکہ وہ اُسی میں نذر باغ پیلیس آئیں جائیں۔ یہ نوابی محل تھا، جہاں صبح و شام جوش صاحب کے اعزاز میں محفلیں منعقد ہونے لگیں۔ ان محفلوں میں میں بھی والد مرحوم صاحبزادہ احمد خاں نازش کے ساتھ شریک ہوتا —— میں جب تک شعر کہنے لگا تھا، مگر ابھی یہ ہمت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ بزرگوں کے سامنے اپنے شعر پڑھ سکوں۔ جوش صاحب اپنی گرجدار آواز میں تحت اللفظ شعر سناتے اور محفل پر چھا جاتے۔ داد کا وہ شور برپا ہوتا کہ ذرا فاصلے پر بیٹھے ہوئے سامعین کو وہ اشعار سننا مشکل ہو جاتا۔ ہم پر یہ ہاؤ ہو ہو رہی ہوتی۔

ایک صبح میں اور میرا مرحوم جواں مرگ دوست خیر محمد خاں گوہر جوش صاحب سے ملنے بنگلہ نمبر ۲ پر جا دھمکے۔ ملاقات کی خواہش کے اظہار کے ساتھ اپنے نام لکھ کر اندر بھجوائے۔ تھوڑی دیر بعد جوش صاحب باہر آ گئے اور لگ بھگ آدھے گھنٹے تک ہم سے باتیں کرتے رہے۔ ہم دونوں نے الگ الگ ان کی بیاض سے بہت سی رباعیاں ان کاپیوں میں نقل کیں جو ہم اسی نیت سے اپنے ساتھ لے گئے تھے اور جوش صاحب سے ان پر دستخط کروا لئے۔ ہمیں یہ توقع نہیں تھی کہ اتنا مشہور و معتبر شاعر ہم دو گمنام نوجوان شاعروں کے ساتھ ایسی شفقت سے پیش آئے گا۔ ہم بہت شاداں و فرحاں واپس ہوئے۔

جوش صاحب ایک ہفتہ ٹونک میں مقیم رہے۔ اس موقع پر نواب صاحب نے ان کی خاطر و مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور ایک بڑی رقم بطور نذرانہ پیش کی۔ بیگم جوش کو نواب صاحب کی بیگم نے زیورات کا جڑاؤ طلائی سیٹ بھی پیش کیا جس کی قیمت ان دنوں میں

جب مہنگائی اتنی نہیں بڑھی تھی، ایک لاکھ سے کم نہ ہوگی۔

ٹونک ریل سے جڑا ہوا نہیں ہے۔ دلّی آنے کے لیے نوائی یا پھر اور آگے بڑھ کر جے پور سے ٹرین لینا ہوتی ہے۔ جوش صاحب کی رخصت کا وقت آیا تو انہوں نے نواب صاحب سے کہا کہ اتنے دن جن لوگوں نے مجھے آپ کی شاندار بیوک کار میں گھومتے پھرتے دیکھا ہے، وہی اب بس کے ذریعے یہاں سے رخصت ہوتا دیکھیں گے تو میں سبکی محسوس کروں گا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں کار نوائی تک لے جاؤں۔ نواب صاحب نے بخوشی اجازت دے دی اور بسمل سعیدی صاحب اور عیش ٹونکی صاحب کو بھی دہلی تک کے لیے ساتھ کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ یہ دونوں جوش صاحب کو رخصت کرنے جائیں اور دہلی پہنچتے ہی انہیں پنڈت نہرو سے ملنے پر آمادہ کریں۔

نوائی پہنچ کر جوش صاحب نے نواب صاحب کو فون کیا کہ ہم یہاں تاخیر سے پہنچے —— ٹرین نکل چکی تھی۔ اب کار کو جے پور تک لے جانے کی اجازت اور دیجیے۔ نواب صاحب کیا انکار کرتے۔ انہوں نے کہا: "جوش صاحب، اگر آپ چاہیں تو کار کو دہلی تک لے جا سکتے ہیں۔ وہاں سے بسمل سعیدی اور عیش اسی میں واپس آجائیں گے۔"

دہلی پہنچ کر جوش صاحب کو کچھ اور ہی سوجھا۔ دوسرے تیسرے دن انہوں نے نواب صاحب کو فون کیا اور کہا کہ جب سے دہلی آیا ہوں، آپ ہی کی کار میں گھوم پھر رہا ہوں۔ پنڈت جی سے ملنے بھی اسی کار میں بیٹھ کر گیا تھا۔ اس کی بسمل اور عیش بھی گواہی دیں گے کہ یہاں سبھی حلقوں میں یہ شہرت پھیل گئی ہے کہ یہ کار آپ نے مجھے تحفتاً عنایت کی ہے۔ تاہم آپ کہیں تو میں کار واپس کر دوں۔ نواب صاحب کا جواب تھا، نہیں، کار آپ رکھ لیں۔ اس طرح جوش صاحب کو اپنی اس پرانی از کار رفتہ موٹر گاڑی سے نجات ملی جس کا ذکر اظہار ملیح آبادی کی ایک نظم میں اس طرح آتا ہے۔

ایسی بگڑی ہے عقل یاروں کی
جوش صاحب کی جیسے موٹر کار

جوش صاحب نے پنڈت نہرو سے سفارش کر کے نواب صاحب کا وہ کام ضرور کرا دیا جس کے نہ ہونے سے انہیں پریشانی لاحق تھی۔ یہ کام جس عجلت اور آسانی سے سرانجام پایا اس سے جوش صاحب کے ساتھ پنڈت جی کے تعلق خاطر کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ اور ان کی شرافت نفس کا بھی۔ جوش صاحب جب پنڈت جی سے ملنے گئے تو بسمل سعیدی صاحب ان کے ساتھ تھے۔ ملاقات پنڈت جی کے دفتر میں طے ہوئی تھی۔ پنڈت جی مصروف تھے۔ بسمل صاحب کا بیان ہے کہ جوش صاحب نے علیک سلیک کے بعد فوراً ہی عرض مدعا کیا۔ پنڈت جی کی زبان سے نکلا کہ جوش صاحب، یہ کام تو وزارت مالیات سے متعلق ہے۔ ان دنوں وزیر مالیات غالباً کیسکر صاحب تھے۔ پنڈت جی نے انہیں سے ملنے کا مشورہ دیا لیکن جوش صاحب کے تیور بگڑ گئے۔ بولے: "ہاں صاحب ہم تو احمق ہیں کہ آپ کے پاس چلے آئے۔ ہمیں یہ معلوم ہی نہیں کہ ہمیں کیا غرض ہے کہ کس کے پاس جانا چاہیے۔" یہ کہہ کر پنڈت جی کے روکتے روکتے اٹھے اور باہر اس ارادے کے ساتھ نکلے کہ کیسکر صاحب سے ملنے نہیں جائیں گے۔ بسمل صاحب کہتے تھے کہ ان کے اور عیش صاحب کے اصرار پر وہ کیسکر صاحب کے دفتر چلنے پر آمادہ ہوئے اور وہاں پہنچے تو دیکھا کہ وزیر موصوف ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ دیکھتے ہی بولے: "جوش صاحب خیر تو ہے۔ ایسا کیا کام آ پڑا۔ ابھی ابھی پنڈت جی کا فون آیا تھا کہ جوش صاحب تمہارے پاس آ رہے ہیں۔ پٹھان غصے میں ہے۔ جو کہے وہ کر دینا۔"

پنڈت جی کی شرافت نفس اور جوش صاحب سے ان کے تعلق خاطر کے دو واقعے اور بھی میری یادداشت میں ہیں۔ ایک کا ذکر جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے اپنی خود نوشت سوانح "یادوں کا جشن" میں کیا ہے۔ یہ آزادی کے کچھ ہی مدت بعد کا واقعہ ہے۔ کنور صاحب ان دنوں دلّی میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔ ان کی کوشش سے لال قلعہ میں جشن جمہوریت کی اوّلیں تقریبات منعقد ہوئیں۔ تقریبات کا ایک حصہ مشاعرہ تھا۔ جس میں پنڈت جی نے شرکت کا وعدہ کر لیا تھا اور منتظمین سے کہا تھا کہ وہ مشاعرہ شروع ہونے کے وقت آ جائیں گے اور آدھے گھنٹے رک کر واپس چلے جائیں گے۔ پنڈت جی آئے۔ مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ جوش صاحب کلام سنانے آئے تو نشے کی ترنگ میں تھے۔ انہوں نے شراب بندی کے خلاف رباعیاں پڑھیں اور بیچ بیچ میں پنڈت جی کو مخاطب بھی کرتے رہے۔ رباعیاں کافی سخت تھیں اور برملا گاندھی جی کے عقائد اور کانگریس کی پالیسی کی تکذیب کرتی تھیں۔ کنور صاحب نے لکھا ہے کہ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ جوش صاحب کی یہ جرأت رندانہ پنڈت جی کی برہمی مزاج کا سبب بنے گی اور اس برہمی کی زد میں مشاعرے کے منتظمین بھی آئیں گے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ پنڈت جی تھوڑی دیر کے لیے مشاعرے سے اٹھ کر گئے پھر واپس آ گئے۔ اور مشاعرے کے اختتام تک بیٹھے رہے۔ ان کی پیشانی پر ہلکی سی شکن بھی نہ تھی۔ جوش صاحب کی نشے کی ترنگ کچھ کم ہوئی تو انہوں نے بھی کنور صاحب سے اس اندیشے کا ذکر کیا کہ شاید پنڈت جی خفا ہو گئے ہوں۔ کل صبح مل کر ان سے معذرت خواہی کی جائے۔ لیکن کنور صاحب نے انہیں مطمئن کر دیا کہ اس کی ضرورت نہیں۔

دوسرا واقعہ وہ ہے جس کا ذکر ان دنوں کے ملک بھر کے اخبارات میں بھی آیا تھا اور جس کی گونج پارلیمنٹ میں بھی سنائی دی تھی۔ جوش صاحب پاکستان جا چکے تھے۔ ہفتے دو ہفتے کے لیے دلّی آئے اور اپنے ایک قدردان کشن لال جی کے ہاں ٹھہرے، جو دہلی میں شراب کے مشہور تاجر تھے۔ انہوں نے

جوش صاحب کو اُکسایا کہ وہ کسی طرح پنڈت جی کو ان کے یہاں لے آئیں۔ پنڈت جی کو جوش صاحب نے رات کے کھانے پر مدعو کیا اور وہ کچھ تامل کیے بغیر کشن لال جی کے گھر پہنچ گئے۔ دوسرے دن اخباروں نے واویلا کیا کہ ملک کے وزیر اعظم کو ایک شراب فروش کی دعوت میں شریک نہیں ہونا چاہیے تھا۔ پارلیمنٹ میں بھی یہ سوال اُٹھا۔ پنڈت جی نے جواب دیا کہ وہ کسی شراب فروش کی دعوت میں نہیں گئے۔ ایک دوست کی دعوت قبول کی اور وزیر اعظم کی حیثیت سے نہیں، اپنی نجی حیثیت میں۔ ایسے وضع دار لوگ اب مشکل سے پیدا ہوں گے۔

اور عیش ٹونکی کا ذکر آیا ہے۔ بسمل سعیدی صاحب کہتے تھے کہ نواب صاحب ٹونک کی کار بھیجنے کی ترکیب جوش صاحب کو انہی نے سجھائی تھی۔ بعد میں جوش صاحب نے انہیں کراچی بلوالیا اور اپنی سعی و سفارش سے ان کے معاشی حالات بہتر بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ عیش صاحب کثیر العیال تھے اور ٹونک میں نواب صاحب کی طرف سے انہیں جو وظیفہ ملتا تھا، وہ ان کی اور ان کے خاندان کی کفالت کے لیے بہت ناکافی تھا۔ کراچی پہنچ کر ان کی مالی حالت اچھی ہو گئی تھی اور انہوں نے وہاں جائیداد بھی خرید لی تھی۔ جوش صاحب جب جب دلّی آتے، عیش بھی ان کے ساتھ ہوتے اور انہی کے ساتھ قیام کرتے۔ یہاں جوش صاحب کے لیے جو محفلیں آراستہ کی جاتیں ان میں بھی وہ مدعو کیے جاتے۔ جوش صاحب ۴، ۶ پیگ پینے کے بعد گفتگو میں غیر محتاط ہو جاتے تھے۔ پاکستانی حکام اور وہاں کے عوام سے انہیں کچھ شکایتیں تھیں۔ وہ بھی ان کی زبان پر آجاتیں۔ آخری بار جوش صاحب دلّی سے رخصت ہوئے تو ہمیشہ کی طرح عیش ان کے ہمسفر تھے۔ لیکن کراچی پہنچ کر جوش صاحب کو ان کی طرف سے یہ بدگمانی پیدا ہو گئی کہ وہ حکومتِ پاکستان کے مخبر ہیں اور اسی لیے ان کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہتے ہیں۔ میں نے بسمل صاحب کے پاس جوش صاحب کا ایک خط دیکھا تھا، جس میں اُنہوں نے عیش صاحب کو ان کی اس حرکت پر خاصے سخت سست الفاظ میں یاد کیا تھا۔ لیکن جب میں کراچی گیا اور عیش صاحب سے یہ ذکر آیا تو اُنہوں نے اسے محض جوش صاحب کی بدگمانی قرار دیا۔

بسمل صاحب بھی جوش صاحب کے مقربین میں تھے، لیکن میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ ان کی قربت و موانست ادپری تھی۔ اندر سے ان کے دل ایک دوسرے سے صاف نہیں تھے۔ میں نے جوش صاحب کے کسی مجموعے میں ایک رباعی پڑھی تھی جس کا آخری شعر یاد رہ گیا ہے:

تھا وہ منافقت عیاذاً باللہ
بسمل بسمل، غریب ٹونکی بسمل

اسی طرح ایک بار میں بسمل صاحب کی بیاض کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ ایک رُباعی پر میری نظر ٹھہری جو یہ تھی:

الحاد کے زینے سے اُتر لیتا ہے جوش
دامانِ مُرادیوں بھی بھر لیتا ہے جوش
زردار مسلمان کی خلوت میں کبھی
اللہ کا اقرار بھی کر لیتا ہے جوش

بسمل صاحب نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں اس رُباعی کو عام نہ کروں لیکن اب کہ وہ اور جوش صاحب دونوں ہی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ میں یہ رُباعی قارئین تک پہنچانے کی جسارت کر رہا ہوں۔ ان کی روحیں مجھے معاف کریں۔

جوش صاحب نے ابتداءً کچھ غزلیں بھی کہی تھیں۔ لیکن اپنے استاد عزیز لکھنوی کے ایما پر اُنہوں نے غزل گوئی ترک کر دی۔ غزل کے ساتھ ان کی طبیعت کو مناسبت تھی بھی نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی نظموں میں تغزل کے بعض عناصر نظر آتے ہیں۔ ان کی شہرت ایک نظم نگار کی حیثیت سے ہوئی۔ آگے چل کر وہ رُباعیاں بھی کہنے لگے اور اس صنف میں بھی ایک خاص امتیاز پیدا کیا۔

جوش صاحب کی نظم نگاری کی بہت دھوم مچی اور اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ ان کی جو نظمیں باغیانہ گھن گرج کی حامل ہیں یا جن نظموں میں اُنہوں نے اپنے عہد کے بوسیدہ سماجی اداروں اور ان اداروں کے پروردہ مجہول کرداروں پر طنز و تعریض کے نشتر چلائے ہیں۔ بظاہر تقدس اور پاکیزگی کا دم بھرنے والوں کی بدباطنی اور سفید پوشوں کی سیاہ کاریوں کو بے نقاب کیا ہے یا جن نظموں میں اُنہوں نے کسی خارجی صورتِ حال یا منظر کی لفظی تصویریں بنائی ہیں، وہاں وہ بہت کامیاب ہیں۔ لیکن اختر اورینوی نے اپنے ایک مضمون "جوش بحیثیت صناع" میں ان کی نظموں کی ایک بڑی خامی کی گرفت کی ہے۔ ان کی رائے ہے اور اس سے کسی کو اختلاف بھی نہیں ہو سکتا کہ نظم کی بنیادی صفت خیال کا تسلسل اور اس کا ارتقاء ہے اور جوش صاحب کی اکثر نظمیں اس کسوٹی پر پوری نہیں اُترتیں۔ وہ ایک ہی بات کو لفظ بدل بدل کر کہتے چلے جاتے ہیں اور ان کے یہاں نظم کا نقطۂ آغاز ہی اس کا نقطۂ اختتام بن کر رہ جاتا ہے۔ اختر صاحب نے ان کی نظموں کی ایک اور خامی کا بھی ذکر کیا ہے اور جن لوگوں نے کلامِ جوش کا مطالعہ تنقیدی نظر سے کیا ہے وہ یہاں بھی ان سے اتفاق کریں گے۔ جوش صاحب کو لفظوں کا بادشاہ کہا گیا۔ جس کے دربارِ سخن میں لفظ دست بستہ صفیں باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ اُنہیں لفظوں کی تلاش میں کہیں جانا نہیں پڑتا۔ یہ سچ ہے لیکن قدرت کی اسی دین نے اُنہیں لفظوں کے استعمال میں بے احتیاط اور بے اعتدال بھی بنا دیا۔ وہ لفظوں کے ریلے میں بہتے

چلے جاتے ہیں اور فکر و خیال کی ڈور ان کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ اختر صاحب نے ان کی کئی مشہور نظموں کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ نظمیں قدرتِ بیان سے زیادہ محض شاعر کی قوتِ بیان کی مظہر ہیں۔ ایک قادر الکلام شاعر کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اسے بات کہاں سے شروع کر کے کہاں ختم کر دینی ہے ـــ جوش صاحب کی جن نظموں سے اختر صاحب نے بحث کی ہے، وہ ایک مرحلے پر اپنے منطقی نقطۂ اختتام کو پہنچ جاتی ہیں، لیکن جوش صاحب اپنی ترنگ میں انہیں آگے بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس طرح نظموں کا تاثر پارہ پارہ ہو کر بکھر جاتا ہے۔

اختر اورینوی کے بعد خلیل الرحمٰن اعظمی نے بھی اپنے ایک مضمون میں جو علی گڑھ کے سہ ماہی "فکر و نظر" میں جوش صاحب کی زندگی ہی میں شائع ہو گیا تھا۔ ان کی شاعرانہ کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے۔ نئے نقادوں میں سلیم احمد غالباً واحد نقاد ہیں جو جوش صاحب کی کھلے دل سے پذیرائی کرتے ہیں۔ اور صرف ان کی قوتِ بیانیہ ہی نہیں، ان کی فکری صلاحیتوں کے اثبات پر بھی زور دیتے ہیں۔

جوش صاحب کا موضوعِ سخن زیادہ تر ہمعصر زندگی کے خارجی مظاہر ہیں۔ باطنی کیفیات کی طرف وہ بہت کم متوجہ ہوئے ہیں۔ اپنی عشقیہ نظموں میں بھی وہ ایک ظاہر پرست ہی نظر آتے ہیں جو حسن کی ظاہری اداؤں سے متاثر ہوتا ہے اور ان سے لمحاتی لطف اندوزی کا متمنی ہے۔ عشق ان کا ایک شغل ہے، مزاج نہیں۔ اسی لیے ان کے عشق میں وہ رکھ رکھاؤ، وہ شائستگی کم سے کم ہے جو اسے ایک تہذیبی قدر کی عظمت عطا کرتی ہے۔

جوش صاحب کی ہجویہ، طنزیہ، منظریہ اور کچھ باغیانہ نظموں کے بعد ان کے کلام کا جو حصہ ان کی شاعرانہ اہمیت کو عہد بہ عہد تسلیم کراتا رہے گا۔ وہ ان کی رباعیاں ہیں۔ ان کی رباعیوں میں بڑی حد تک فکر کی سنجیدگی بھی ہے، خیال کی گہرائی بھی اور احساس کی لطافت بھی۔ ایجاز و اختصار کا وہ حسن بھی ان کی رباعیوں میں دیکھا جا سکتا ہے جس سے ان کا بیشتر کلام عاری ہے، لیکن شاید یہ ان کا اختیار رہا ہو، رباعی کی ہیئت کا نافذ کردہ جبر ہو۔

جوش صاحب کو ٹونک کے بعد میں نے دہلی کے کچھ مشاعروں میں بھی سنا۔ نظم پڑھنے سے پہلے وہ بالعموم چند رُباعیاں ضرور پڑھتے تھے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ صرف رباعیاں ہی سناتے۔ حافظہ ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ بیاض دیکھ کر پڑھتے۔ ان کی ایسی ہی ایک بیاض مجھے جناب ساحر ہوشیارپوری نے عنایت کی ہے۔ جس میں ۹۴ رباعیاں درج ہیں، لیکن ان میں چار رُباعیاں ایسی ہیں جو مکرر درج ہو گئی ہیں۔ انہیں خارج کر دینے کے بعد رُباعیوں کی تعداد ۹۰ رہ جاتی ہے۔ کچھ رُباعیاں جوش صاحب نے پوری پوری لکھی ہیں۔ لیکن کچھ رباعیوں کے مصرعے پورے لکھنے کی بجائے بطور یادداشت آدھے آدھے لکھ کر چھوڑ دیے ہیں۔

ایک واقعہ اور یاد آیا۔ ان رباعیوں میں ۳۳ ویں نمبر پر جو رباعی درج ہے:

افسوس شراب پی رہا ہوں تنہا
غلطاں بہ سبو تمام خونِ فنہا
ٹھٹھری ہوئی ساغر میں نظر آتی ہے
صہبا رضی اللہ تعالیٰ عنہا

جوش صاحب نے ٹونک کی ایک محفل میں پڑھی تو وہاں کے ایک بزرگ شاعر صولت صاحب نے کہا: "میاں چوتھا مصرعہ یوں پڑھو صہبا لعن اللہ تعالیٰ عنہا" جوش صاحب بُرا نہیں مانے اور ان کا دل رکھنے کو یہ مصرع اسی طرح دُہرا دیا۔ ان کی شاعری کی طرح جوش صاحب کے کردار کو بھی خاصا مطعون کیا گیا ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے تو اپنے رسالے "ساقی" کا ایک خاص نمبر ہی ایسا شائع کر دیا تھا جس میں جوش صاحب کے کردار پر خاصی لے دے کی گئی تھی۔ ان کی بے دینی، ان کی مے پرستی اور ان کی جنسی بے اعتدالیوں کے بہت سے قصے اس نمبر میں بیان کیے گئے تھے۔ یہ بھی کہا گیا کہ وہ پیسے کے لالچی تھے اور اس لالچ میں نہ صرف اخلاقی اصولوں بلکہ انسانی رشتوں کے احترام کو بھی کلیتہً نظر انداز کر سکتے تھے۔ جہاں تک ان کی مے پرستی اور شاہد بازی کا تعلق ہے انہوں نے اس ضمن میں اپنی آپ بیتی "یادوں کی برات" میں خود اتنا کچھ بیان کر دیا ہے جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں انہوں نے کچھ ایسے واقعے بھی شامل کر دیے ہیں جو محض ان کے خواب و خیال میں وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ جہاں تک پیسے کے لالچ کا تعلق ہے وہ خود اس کا اقرار نہیں کرتے، لیکن جن حالات میں وہ ہندوستان کو خیرباد کہہ کر پاکستان گئے، وہ ان کے حبِّ زر کی طرف ہی اشارہ کرتے ہیں اور اوپر میں نے نسیم سعیدی صاحب کی جو رباعی نقل کی وہ بھی اسی کی موید ہے۔

جوش صاحب کے کردار میں جو بھی اخلاقی کمزوریاں رہی ہوں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ منافق نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی کئی کمزوریوں کو اپنے لیے سرمایۂ امتیاز سمجھ کر ان کا نہ صرف بہ بانگِ دہل اعتراف کیا ہے بلکہ ان کی تشہیر بھی کی ہے۔ یہ ان کی سادگی اور بھولپن کی علامت ہے اور شاید ان کی یہی سادگی اور بھولپن ان کے بہت سے گناہوں کی بخشش کا وسیلہ بن جائے۔

○ ○

عتیق اللہ

کیتھارسس کی منطق

طبِ یونانی میں کیتھارسس کے معنی اسہال Purgation یا جسم سے ناگوار و زائد اخلاط جنہیں مواد، صفرا، بلغم اور خون کے نام سے جانا جاتا ہے، کو نکال باہر کرنے کے ہیں۔

ارسطو کے نظامِ فن میں یہ لفظ اخلاق اور اخلاق کے ساتھ مابعد الطبیعیاتی، نفسیاتی و جمالیاتی معنی کو محیط ہے کہ المیہ اخلاط اربعہ میں توازن پیدا کر کے نفسی توافق کو راہ دیتا ہے۔

نفسی معالجے کی رُو سے یہ عمل ان جذبات کے اظہار کے ذریعے کرب اور تناؤ سے نجات دلاتا ہے، جو کہ پوشیدہ، مقید اور لاشعوری ہوتے ہیں۔

ان تمام تصورات کے خلاف برکووز اور بانڈورا اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جارحیت کا اخراج اور زیادہ جارحیت کی ترغیب دیتا ہے۔

مسیحی تصور کی رو سے انسان ازلی گناہ گار ہے۔ عیسیٰؑ نے مصلوب ہو کر اس کا کفارہ ادا کیا ہے۔ اس معنی میں عیسیٰؑ تمام انسانیت کا نجات دہندہ ہے —— عیسائیوں میں اعتراف، مسلمانوں میں روزہ اور ادائیگیٔ حج اور ہندوؤں میں مقدس یاترا، نفس کشی، فاقہ اور جسم کو حقیقتِ اولیٰ کی عرفان کی راہ میں کثیف جان کر، اذیت دینے کے عمل اور جدید نفسیات میں جبلتوں کو ارتفاع سے گزارنے کے عمل وغیرہ کے پس پشت کسی نہ کسی نہج یا اساسی حرکت کے طور پر کیتھارسس ہی کا تصور کام کر رہا ہے۔

یونانی اساطیری ہیروؤں کے بارے میں یہ تصور عام تھا کہ انہیں انتہائی صبر آزما حالات سے اس لیے گزارا جاتا ہے کہ ان کی قربانیوں کی پشت پر اصلاح و تزکیے کا ایک روحانی فلسفہ بھی کام کر رہا ہے۔ ان کی ہلاکت فنا کے ہم معنی نہیں ہے بلکہ ان کی موت تطہیر کا ایک مرحلہ ہے جس کے بعد ایک بلند مرتبے کے ساتھ ان کا ظہورِ ثانی ہوتا ہے۔

اپالو (یونانی سورج دیوتا) کے بارے میں مشہور ہے کہ ڈیلفیا کے خوں خوار اژدہے کو مارنے کے بعد اس نے سات سال جلاوطنی میں بسر کیے اور اڈمیٹس کی غلامی میں روز و شب مشقت کرتا رہا۔ جب سزا کے دن گزر گئے اور اس نے مکمل طور پر اپنا تزکیہ کر لیا تب کہیں ڈیلفی میں داخل ہوا۔

اپالو نے ان تمام خوں آلود قوانین سے انحراف کیا، جن میں غلطکاروں کو محنت و مشقت کے ذریعے کفارہ ادا کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ اس قسم کے پرانے قوانین انسدادِ جرم کے بجائے نئے مجرموں کو تحریک دیتے ہیں۔ اپالوئی اعتراف و تزکیے کی رسم نے ڈیلفی کے باشندوں میں خود احتسابی کے جذبے کو راہ دی۔ وہ گاہے بہ گاہے از خود تنقیدی اور کفارے کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ اس طور پر تزکیے کے مختلف مذہبی شعائر کا اساسی تعلق اپالو کی تقریبات سے ہے۔

ارسٹوفینز کے ڈرامے 'بادل' میں سردار طائفہ کا یہ بیان توجہ طلب ہے:

"گناہ کے خواہش مند کو متنبہ کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ ہم اسے روکتے ہیں، اس کو ڈھیل دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنی آوردہ مصیبتوں میں پھنس جاتا ہے تو اس کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے اور وہ دیوتاؤں کا احترام کرنا سیکھ جاتا ہے۔"

ان کلمات میں بھی تزکیہ و تنقید یا بہ الفاظِ دیگر اصلاح کا پہلو مضمر ہے۔

۲۵۲/اے۔جی، شالیمار باغ، دہلی ۵۲

پروفیسر مرے کا خیال ہے کہ نوروز کی تقریب پر ڈایونسس کا جشن منایا جاتا تھا اور ڈایونسس (جسے ابتلا و آزمائش کے ایک طویل عرصے سے گزرنے کے بعد تزکیہ نصیب ہوتا ہے) کے حضور یہ دعا مانگی جاتی تھی کہ وہ گزشتہ برسوں کے گناہوں سے نجات دلائے اور اپنے عبادت گزاروں کو اتنا صاف و مطہر کر دے کہ اگلے سال ان سے وہ گناہ دوبارہ سرزد نہ ہوں اس طرح یہ جشن تطہیر و تنقیہ کی علامت تھا۔

قرونِ وسطیٰ میں رومن کیتھولک چرچ نے All fools day اور Boy Bishop جیسے تہواروں کا اہتمام کیا تھا اور یہ تہوار مذہبی سخت گیری سے نجات کا ذریعہ خیال کیے جاتے تھے۔ یُنگ کہتا ہے کہ ایسے تہوار پروٹسٹنٹ کلیسا میں ممنوع قرار دیدیے گئے۔ نتیجتاً اب صرف جنگ ہی انسان کی وحشیانہ بربریت کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ جوں جوں انسانی تہذیب، ارتقاء کی منزلیں سر کرتی جا رہی ہے توں توں اس کے اندر جنگی جنون میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

تزکیہ کا وہ تصور جو مذہب و اخلاق سے وابستہ ہے یا وہ نظریہ جو طب کی اصطلاح کے قریب المعنی ہے، ارسطو اپنی تعبیر میں ان سے بہت دُور نہیں۔ مذکورہ بالا ہر دو تصور میں اصلاح کا پہلو کبھی مخفی و مضمر ہے۔ ارسطو خود بھی ایک طبیب تھا اور اس کا باپ اپنے زمانے کے مسلمہ طبیبوں میں سے ایک تھا۔ اس لیے بیشتر ناقدین اس خیال سے متفق ہیں کہ ارسطو کے ذہن میں کسی نہ کسی طور پر کیتھارسس کا طبی مفہوم موجود تھا اور ممکن ہے اس نے افلاطون کے اس خیال کے رد کے لیے کہ فن غیر صحت مندانہ طور پر ان جذبات کو متحرک کرتا ہے، جنہیں کچل دینے ہی میں فرد اور معاشرے کی بھلائی ہے، کیتھارسس کی اصطلاح مستعار لی ہو۔

ارسطو یہ تو نہیں کہتا کہ فن عین علاج ہے لیکن ملٹن (دیکھیے: Samson Agonistes کا پیش لفظ) جو کہ اس خیال کا حامی ہے کہ ترشی اور نمک کا اثر دُور کرنے کی غرض سے نمک ہی استعمال کیا جاتا ہے ——— کیتھارسس کو یہ علاج بالمثل کے قبیل کی چیز خیال کرتا ہے۔ ہومیوپیتھی طریقِ علاج اس نظریے پر استوار ہے۔ ملٹن کے علاوہ نشاۃ ثانیہ کے بیشتر نقادوں کے تصورات بھی اسی خیال کی توثیق کرتے ہیں۔

افلاطون کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر ارسطوئی خیال کی توضیح کی جائے تو وہ ایک قریب تر معنی میں اصلاح اور تربیت اخلاق پر استوار ہے ——— افلاطون کے نزدیک فن اور بالخصوص المیہ مخربِ اخلاق ہے۔ جب کہ فن کو اپنی ہر صورت میں اخلاق کے منصب پر فائز ہونا چاہیے۔ ارسطو نے استدلال میں بیشتر اوقات اخلاقی کشمکش میں مبتلا دکھائی دیتا ہے۔ ورنہ تو کلی طور پر اپنے عہد کی متداول اخلاقیات و نظام عقائد سے منہ موڑ سکتا تھا۔

اور نہ اس کا یہ منشا تھا کہ ادب و فن اپنے ہر نتیجے میں اخلاق کے جبر سے وابستہ ہو کر رہ جائے۔

ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ یورپ میں افلاطون و ارسطو سے لے کر اٹھارہویں صدی تک ادب یا اخلاق کا یہی تصور مستولی تھا ——— قدیم رومی نقاد ہوریس، ارسطو جس کا استاذِ معنوی تھا۔ ادب کے اصلاحی مقصد کا زبردست مؤید تھا۔ ڈاکٹر جانسن کے نزدیک اصلاح ادب کا مقصدِ اولیٰ ہے اور ارسطو کی اصطلاح میں اسی تصور کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یہاں تضبیط و موزونیت کے تصور پر بھی غور کر لیا جائے تو بے محل نہ ہوگا۔ قدیم یونان اور اس کے بعد بھی زندگی اور فن کے تعلق سے تضبیط و موزونیت، شائستگی اور ہم آہنگی کے اصولوں کی اہمیت بنیادی تھی ——— افلاطون نے بھی فن کے ہر صیغے کے لیے تضبیط پر ان معنوں میں زور دیا ہے کہ تضبیط اس کے یہاں اخلاقی ہم آہنگی سے متعلق صفت ہے۔ رقص و موسیقی سے بھی وہ اسی نوع کی بڑی بڑی توقعات وابستہ کرتا ہے۔ اس کی ترجیحات کا میلان ہمیشہ اعتدال، موزونیت، اخلاقی ہم آہنگی اور روح کی سرافرازی اور تضبیط کی سمت ہے۔ خود ارسطو اکثر اخلاق و اقدار کی روشنی میں المیہ ہیرو کے اوصاف، عمل اور میلان کا جائزہ لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ حتیٰ کہ وحدت Unity تضبیط اور جذباتی توازن اور اعتدال پر ترجیح اس کے اخلاقی منصب ہی کی گواہ ہے۔

ارسطو نے Rhetorics میں خوف اور رحم کے جذبات کی مزید وضاحت کی ہے۔ وہ ان دونوں جذبوں کو نوعی اعتبار سے اذیت ناک بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے خوف، ایذا کی ایک نوع یا وہ شورش ہے جو بدی کے واقع ہونے کے اندیشے سے جنم لیتا اور جو اپنی نوعیت میں ایذا رساں اور تخریبی ہوتا ہے۔ یعنی آدمی حال کے لمحے میں تو کسی تکلیف میں مبتلا نہیں ہے، لیکن قریب الوقوع شر کے اندیشے سے وہ متوحش ہوتا ہے۔ ارسطو کے نزدیک رحم بھی خوف ہی کی طرح ایذا کی ایک نوع ہے۔ رحم کے جذبے میں حرکت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کسی ایسے شخص کو ہم مصیبت میں گرفتار دیکھتے ہیں، جو اس کا اہل نہیں ہے یا جسے خواہ مخواہ مصیبت میں پھنسا دیا گیا ہے۔ اس کے شکار ہم بھی ہو سکتے ہیں اور ہمارے دوست بھی۔ ارسطو بہر حال اسے اندیشے سے باہر قرار نہیں دیتا کہ جب کوئی افتاد ہمارے کسی عزیز پر پڑتی ہے تو اسے دیکھ کر ابتدا میں رحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور جس کی انتہا اندیشے اور اندیشے کے خوف پر ہوتی ہے۔ ہم مصیبت زدہ پر ترس کھاتے ہیں اور کسی حد تک اس کے غم و محن میں شریک ہو جاتے ہیں۔ مصیبت زدہ شخص خوف زدہ ہوتا ہے اور ہمارے رحم کے جذبے کی تہ میں خوف بھی تہ نشین ہوتا ہے۔ ہم دوسرے پر رحم کرتے یا ترس کھاتے

ہیں اور یہ سوچ کر خوف میں مبتلا ہوتے ہیں کہ اُن حالات میں کبھی ہم بھی پھنس سکتے ہیں۔ ارسطو خوف اور رحم کے جذبات کو منسلق و ملزوم بتاتا ہے جس انسان میں خوف پیدا نہیں ہوتا اس میں جذبۂ رحم کی بھی گنجائش نہیں ہوتی۔ خوف ایک ایسا عنصر ہے جو رحم کا متنیٰ بھی ہے اور خوف رحم کو ایک معنیٰ عطا کرتا ہے۔ وہ ایک طاقت ور جذبے کی طرح رحم کی کوکھ سے جنم لیتا اور بالآخر خوف کی جگہ لے لیتا ہے۔

بوطیقا میں بھی ارسطو کہتا ہے کہ رحم اس شخص کو مصیبت میں گرفتار دیکھ کر رونما ہوتا ہے جو اپنے کسی فطری عیب، اتفاقی غلطی یا لاعلمی کی وجہ سے بدانجام کو پہنچتا ہے (کوکہ کئی یونانی اور مابعد کے المیے اس زمرے میں نہیں آتے) المیہ ہیرو اگر طبعاً بد ہے تو اس کا زوال جذبۂ ہمدردی کو متحرک نہیں کر سکتا اور اس کے برخلاف وہ نیک ہے تو اس کی بدحالی اخلاقی اعتبار سے گمراہ کن اور نادرست کہلائے گی۔ اس لیے ارسطو اس بات پر زور دیتا ہے کہ المیہ ہیرو نیک تو ہو لیکن مثالی نیک نہ ہو۔ اس کے زوال کا باعث وہ خود ہو۔ یعنی وہ ایسی غلطی کا مرتکب ہو جو اس سے بھول میں سرزد ہو گئی ہو۔ اس طور پر ارسطو المیہ ہیرو کے انجام کا ایک اخلاقی جواز بھی مہیا کر دیتا ہے۔ نیز رحم اور خوف کے جذبات کے تزکیہ اور اخراج کا جواز بھی۔

سامعین اپنے دکھوں کو المیہ ہیرو کے دکھوں کے ساتھ وابستہ کر کے دیکھتے ہیں۔ ہمارے اندر خوف کا جذبہ اُسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب ہمارے یعنی سامعین اور المیہ ہیرو کے درمیان کچھ اقدار مشترک ہوں عظیم ہستیوں کی عظیم بربادیوں کے پس پشت انہیں ایک ناقابلِ فہم بیکراں اور ہمہ گیر الوہی قوت کارفرما نظر آتی ہے۔ تخریب و تعذیب کی علتیں غیر واضح سہی لیکن جزا و سزا ان کے نزدیک برحق ہے۔ اور انسانی اختیارات محدود۔

المیہ ہیرو ہی نہیں، ڈرامے میں رُونما ہونے والے واقعات کی ساخت بھی تزکیے سے گزرتی ہے (جی۔ ایلس) المیہ میں ایک مخصوص نظامِ ہیئت اور واقعاتی ارتقا کے ذریعے خوف و دردمندی جیسے پریشان کن جذبات کا اخراج کر دیا جاتا ہے اور جس کے بعد ذہنی، جذباتی اور ارادی زندگی میں ایک تناسب پیدا ہو جاتا ہے۔ اس نوع کے جذبات میں رونما ہونے والا ہیجان دوسروں کے جذبات میں بھی تبدیلیوں کا موجب بنتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ جذبات مطہّر اور نفیس ہی نہیں ہو جاتے بلکہ ان کی قلبِ ماہیت بھی ہو جاتی ہے۔ شیکسپیر کا المیہ کنگ لیر اس کی بیّن مثال ہے۔

جذباتی برانگیختگی کے بعد سامعین اپنے ادراکات کو از سرِ نو ترتیب دیتے ہیں۔ تنقیہ ان تصورات میں تبدیلی کا بھی محرک ہوتا ہے جو انہیں نے

ذات اور کائنات سے وابستہ کر رکھے ہیں۔ اس طرح ذات اور غیر از ذات، انا اور انائے دیگر سے وہ بالکل ایک نئے معنی میں متعارف ہوتے ہیں۔ کرب کا طاقت ور ذہنی اور مؤثر تجربہ آنسوؤں میں تحلیل ہو کر آدمی کو ذات کی تلاش اور ارتقا کی ترغیب دیتا اور ایک بے ضرر طمانیت کا تجربہ بھی مہیا کرتا ہے۔

جذباتی برانگیختگی کے موجب ڈرامے میں رونما ہونے والے حقیقی واقعات نہیں ہوتے بلکہ عمل کی نمائندگی ہوتی ہے۔ تزکیہ ایک ایسا حظ مہیا کرتا ہے جس سے ہماری نقل، تناسب یا آہنگ کی جبلتوں کو تسکین ملتی ہے اور عمل کی نمائندگی بقول ہمفری ہاؤس ہمارے خوف و رحم کے جذبات کو اُبھار کر فن کے تعاون سے انہیں شائستہ و نفیس بنا دیتی ہے۔ اس طرح المیہ ہم اپنے ذہن اور روح کی گہرائیوں میں محسوس کرتے اور ایک ایسی جمالیاتی مسرت سے دوچار ہوتے ہیں جسے اپنے اثر کے لحاظ سے مخصوص و منفرد ہی کہا جا سکتا ہے۔ ان معنوں میں ارسطو کا تصور تزکیہ ایک جمالیاتی تصور اور ایک اصولِ فن ہے۔

ایک عام تصور یہ بھی ہے کہ غنا و موسیقی جہاں ایک طرف مختلف النوع سوئے ہوئے جذبوں کو آہستہ آہستہ یا یک لخت اجاگر کر دیتے ہیں، وہاں کئی نامعلوم احساسات کو چھیڑ کر ہمیں ذہن کے اس حصے کی طرف ڈھکیل دیتے ہیں جسے یادوں کا مخزن کہا جاتا ہے۔ یہ محض آوازوں کی ایک متوازن ترکیب ہوتی ہے جس سے کبھی علاج معالجہ کا کام بھی لیا گیا ہے۔ اور کبھی یہ صورت انسانی حیرتوں میں اضافے کا موجب بنتی ہے۔ عہدِ قدیم میں موسیقی و غنا سے بعض امراض کا باقاعدہ علاج کیا جاتا تھا۔ یہ عمل بہرحال موسیقی کی غیر معمولی اور سحر انگیز قوتوں کے منافی نہیں ہے۔ موجودہ ادوار بھی ایسی مثالوں سے عاری نہیں ہیں کہ جب موسیقی ہی دوا دارو کی نعم البدل ثابت ہوئی ہے۔

موجودہ ڈرامہ ہلکے گہرے رنگوں، روشنیوں، عکس و سایہ، فنی اسٹیج کی مجموعی فضا، منظر بندی، علامتی اشاروں، آوازوں، حرکت و سکنت اور موسیقی و غنا جیسے مشتملات کو اس طور پر بروئے کار لاتا ہے کہ ہر تاثر اپنے میں ایک منتہا کی صورت محسوس ہوتا ہے۔ قدیم ڈراما اپنے محدود وسائل کی بنا پر موسیقی و غنا کو خاص طور پر کام میں لاتا تھا۔ ارسطو نے منظر بندی سے پیدا ہونے والے خوف آگیں تاثر کو ادنیٰ قرار دیا ہے، لیکن منظر بندی اور موسیقی کے تاثرات کے ذریعے جو لطف حاصل ہوتا ہے اسے وہ مخصوص کہتا ہے۔ (بوطیقا: باب: ۲۶) گویا موسیقی ایک سطح پر پہنچ کر عمل ہی کا ایک لاینفک جزو بن جاتی ہے۔

ارسطو سیاسیات میں رقم طراز ہے کہ موسیقی کا مطالعہ تعلیم و تربیت، تنقیہ و تطہیر اور ذہنی طمانیت یا حظ کے حصول کے مقاصد کی تکمیل کرتا ہے۔ مذہبی موسیقی انسان کے مخفی اور پُرجوش جذبات کو اُبھار کر ان کی تسکین ہی کم نہیں کرتی بلکہ حظ بھی عطا کرتی ہے۔

ارسطو اخلاقی راگوں کو اہمیت دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ جوش آگیں راگوں سے بھی حظ اٹھایا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ خوف اور دردمندی کے جذبات کم و بیش تمام لوگوں میں موجود ہوتے ہیں اور اس نوع کی موسیقی کے ذریعے ہیجانی جذبات ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں یا ان کا اخراج ہو جاتا ہے۔ اس ذیل میں بھی ارسطو کا اشارہ فاسد جذبات یا ان جذبات کی طرف ہے جو ناخوش گوار ہیں یا جنہیں زائد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یونان قدیم میں موسیقی بڑی حد تک تہذیب و تمدن کے مترادف تھی۔ مذہبی اداروں میں موسیقی کے ذریعے جذبات کا اخراج کیا جاتا تھا۔ اور اس سلسلے میں موسیقی کے ساتھ ہی رقص اور سرود کے ذرائع بھی کام میں لیے جاتے تھے۔

خود ورزش Gymnastic کو دماغی کام کے لیے اس لیے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ جسم و دماغ میں توازن و ہم آہنگی قائم رہے۔ گویا ذہنی و جسمانی نفاست کے حصول کی غرض سے مذکورہ بالا فنون و اعمال کو بھی بروئے کار لایا جاتا تھا۔

خود افلاطون کے ذہن میں فن کی طرح موسیقی کا ایک مثالی تصور تھا۔ اس کے خیال کے مطابق موسیقی روح کو تضبیط کا درس دیتی ہے۔ اس لیے اس کے اثرات کا دائرہ انسانی روح کی عمیق گہرائیوں تک ہے۔ موسیقی روح کو سرفراز کرتی اور نیک جذبات پیدا کر کے انسان کو صالح بناتی ہے۔ افلاطون کا یہ خیال بھی دل چسپی سے خالی نہیں کہ :

> "موسیقی محض موسیقی کی خاطر نہیں ہونی چاہیے بلکہ اسے ریاضی، تاریخ اور سائنس ایسے دقیق مضامین کو خوش گوار بنانے کے لیے بھی استعمال کرنا چاہیے"

نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں:

> "موسیقی محض اس لیے گراں قدر نہیں کہ یہ اخلاق و جذبات میں نفاست پیدا کرتی ہے بلکہ یہ تو صحتِ جسمانی کی بقا اور بحالی کی ضامن بھی ہے۔ کچھ بیماریاں ایسی بھی ہیں جو فقط نفسیاتی طور پر ہی دور ہوتی ہیں۔ مثلاً ناگن دیوی کے کنعانی پجاری اختناق الرحم کی مریض عورتوں کا علاج شہنائی کے وحشی قسم کے نغموں ہی سے کرتے تھے۔ یہ پجاری ان عورتوں کے جذبات کو ابھار کر انہیں رقصِ مسلسل پر اکساتے تھے۔ چنانچہ جب وہ رقص کرتے کرتے تھک کر چور ہو جاتیں تو نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑتیں اور سو جاتیں اور جب بیدار ہوتیں تو شفایاب ہو چکی ہوتی تھیں۔ ایسے طریقوں سے انسانی خیال کے غیر شعوری منابع تک پہنچ کر ان کی تشفی کی جاتی ہے"۔
>
> تاریخ جمالیات: حصہ اول

بعض نفسیاتی معالجوں نے بھی کیتھارسس کی اصطلاح اپنے مخصوص معنی میں استعمال کی ہے۔ بیش تر معالجوں کے نزدیک کیتھارسس ایک ایسا عمل ہے جو ماضی کی گم شدہ یا دبی ہوئی ادراک سے وابستہ احساسات کو عود کر لاتا ہے۔ اس عمل کے ذریعے دبی کچلی ہوئی نفسی قوت کا خروج نہیں ہوتا بلکہ ایک گونہ طمانیت بھی حاصل ہوتی ہے۔ فینی شیل کے خیال کے مطابق جب انا پر گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے تو جذبات کا دھارا پھوٹ نکلتا ہے۔ اسے یہ تسلیم ہی نہیں کہ جذبات کا مکمل اظہار ممکن ہے۔ ڈارون، میکڈوگل اور میکڈا آرنلڈ جذبات اور عمل کو ایک دوسرے سے وابستہ خیال کرتے ہیں۔ میکڈا آرنلڈ جذبات کو عمل کے رجحانات ہی سے تعبیر کرتی ہیں کہ جذبات اصلاً عمل ہی کا حصہ ہیں اور یہ کہ جذبات کے مطابق عمل کرنے کے نتیجے میں جسمانی تناؤ میں کمی واقع ہوتی نیز فرحت بھی حاصل ہوتی ہے۔ بہرحال میکڈا آرنلڈ بھی فرحت یا سکون سے قبل برانگیختگی یا جذباتی تحرک کے نظریے کو تسلیم کرتی ہیں۔

یہاں رینل فیگوے کے اس تصور کا ذکر دل چسپی سے خالی نہ ہوگا جس کی رو سے وہ حظ جو ہمیں کسی المیے کے ذریعے ملتا ہے، خباثت سے مملو ہوتا ہے۔ اس کا سبب ہماری اپنی طبیعت کی بدی و کینہ توزی کا عنصر ہے۔ فیگوے کے نزدیک ہر انسان کے خلق میں کچھ نہ کچھ غیر مہذب دور کی بربریت کا عنصر بھی تہ نشست ہوتا ہے۔ اسی لیے شعوری یا غیر شعوری طور پر دوسروں کی بدنصیبی کو دیکھ کر اسے خوشی ہوتی ہے صرف دشمنوں کے مصائب ہی نہیں، ان لوگوں کی مصیبتیں بھی اس کے لیے طمانیت کا باعث ہوتی ہیں۔ جن سے اس کی کبھی کوئی نزاع نہیں رہی ہے

ظاہر ہے فیگوے کا یہ نظریہ انتہائی قنوطی ہے۔ جب کہ عام تجربہ یہ بتاتا ہے کہ المیہ میں مصیبت کے شکار ہیرو سے ہمیں ہمیشہ ہمدردی ہوتی ہے۔ انسانی مصائب کو دیکھ کر انسان نے ہمیشہ اپنے اندر خوف کے جذبات کو بیدار محسوس کیا ہے اور جس کے پہلو بہ پہلو دردمندی کا وہ جذبہ بھی عود کر آتا ہے جس میں ایک مسرت اور شرکت کا احساس تہ نشین ہوتا ہے۔ ○ ○

غیر مطبوعہ مضامین نظم و نثر کی واپسی کے لیے مناسب سائز کا ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ ارسال فرمائیں۔
(ادارہ)

یہ صبح زندہ رہے گی

گزشتہ سے پیوستہ

قتیل شفائی سے رات کے کھانے پر ہوئی ملاقات یادگاری ملاقات تھی — قتیل شفائی میرے بہت ہی عزیز دوستوں میں سے ہے۔ میری اور اس کی دوستی کی تو سلور جوبلی بھی منائے ہوئے دس سال سے اوپر ہو چکے ہیں — ہماری دوستی کا آغاز کب اور کیسے ہوا، اب تو یہ بھی یاد نہیں۔ لیکن ہماری دوستی کو مضبوط کرنے میں کنور مہندر سنگھ بیدی کا ایک اہم رول ہے۔

جب ہم قتیل کے گھر "سمن آباد" جا رہے تھے تو مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا تھا، جسے میں نے اپنے ساتھ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے راجندر ملہوترہ کو سنایا بھی۔

انبالہ کا انڈو پاک مشاعرہ تو پچھلے دس سال سے ہو رہا ہے اور پاکستان کے سبھی نامور شعراء اس مشاعرہ میں شرکت کر رہے ہیں — راجندر ملہوترہ پرانی دوستی کے ناطے مجھے ہر سال دعوت نامہ تو بھجوا دیتا تھا لیکن اس نے مجھے مشاعرہ میں شرکت کے لیے کبھی نہیں کہا تھا۔ ایک آدھ بار تو میں دعوت نامہ جیب میں ڈالے انبالہ گیا بھی تھا محض اپنے دوستوں سے ملنے کے لیے۔

اس مشاعرے کی روایت یہ ہے کہ دس ساڑھے دس بجے سے پہلے کبھی شروع نہیں ہوا۔ چنانچہ میں شام کا کچھ حصہ اپنے دوستوں سے ملنے اور کچھ حصہ جاگ سنگھ سوڈھی کے ساتھ اس کے ہوٹل "اسٹینڈرڈ" میں گزارنے کے لیے وقف رکھتا — میں اور سوڈھی کوئی گیارہ بجے کے بعد مشاعرے کے پنڈال میں جاتے اور گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر آ جاتے۔

یہ قصہ شاید سات برس پرانا ہے۔ اس برس میں مشاعرہ سننے انبالہ نہیں گیا تھا۔ مشاعرے کے اگلے دن اخبار میں چھپی خبر سے معلوم ہوا کہ قتیل نے بھی مشاعرے میں شرکت کی تھی اور بہت ہی اچھے اشعار سنائے تھے۔ انبالہ نہ جانے کا افسوس ہوا۔ جاتا تو قتیل سے ملاقات ہو جاتی۔ لیکن صبر کر کے بیٹھ گیا۔ اکثر آفس سے گھر لیٹ آتا ہوں۔ دفتری لوگ جن میں اکثریت افسروں کی ہے، صبح دیر سے آفس جاتے ہیں اور شام کو دیر سے گھر لوٹتے ہیں۔ اُن سے اُن کے ماتحت بھی ناراض رہتے ہیں اور گھر والے بھی — میرا شمار بھی انہی لوگوں میں ہے۔ فرق اتنا ہے کہ بہت سے دفتری لوگ گھر آنے کے بعد بھی گھر نہیں بیٹھتے، ادھر اُدھر اڑتے پھرتے ہیں، لیکن میں شام کو گھر آ کر پھر کہیں نہیں جاتا۔ ہاتھ منہ دھو کر اور کپڑے بدل کر آرام کرتا ہوں اور پڑھتا لکھتا ہوں۔ جس دن کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ بھی ایسا ہی ایک دن تھا۔ دن بھر میٹنگیں ہوتی رہی تھیں اور فائلوں میں ملازموں کے معاملات نپٹا تا رہا تھا۔ بہت تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ میرے افسانوں کا تازہ مجموعہ "اداس شام کے آخری لمحے" چھپ کر آیا ہی تھا۔ چائے پی کر لیٹ گیا اور کتاب کے صفحے پلٹنے لگا۔ اس عمل میں اونگھ بھی گیا۔ میری یہی کیفیت تھی جب دروازے پر لگی گھنٹی گونجی۔ میری بیٹی کملیش نے دروازہ کھولا۔ سامنے قتیل کھڑا تھا اور اس کے ساتھ ساقی نارنگ بھی تھا۔

"ذاکر صاحب گھر ہیں؟"

"اندر آؤ انکل۔ باہر کیوں کھڑے ہو؟"

کملیش نے ان دونوں کو اندر ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اُسے میرے کمرے میں قتیل کی آمد کی اطلاع دینے کے لیے نہیں آنا پڑا۔ میں نے اُس کی آواز سن لی تھی اور خود ہی ڈرائنگ روم میں آ گیا تھا۔ قتیل نے مجھے گلے لگا لیا اور کہا۔

"تسی انبالے نہیں آئے۔ سوچیا میں ہی چنڈی گڑھ چلاں۔"

"تہواڈا بہت بہت شکریہ۔"

پھر اس نے ساقی نارنگ سے میرا تعارف کرایا۔ میں پہلی بار ساقی سے ملا تھا اس شام۔

اب تو حیر ساقی بھی میرا بہت پیارا دوست ہے۔
قتیل کوئی دو گھنٹے میرے ساتھ رہا۔ بلکہ کملیش سنگھ نے تو اس کا اچھا خاصا انٹرویو لے لیا۔ اسی سے اگلے روز جب وہ انٹرویو انڈین ایکسپریس میں شائع ہوا تو چنڈی گڑھ کے دوستوں کو قتیل کے آنے کی خبر ہوئی۔ جب تک دوستوں نے ٹیلی فون پر قتیل کے بارے میں پوچھا وہ چنڈی گڑھ سے جا بھی چکا تھا۔ جب یہ واقعہ میں نے راجندر ملہوترہ کو سنایا تو اس نے کہا۔

"قتیل صاحب، مجھے انبالہ سے یہ کہہ کر آئے تھے کہ وہ چنڈی گڑھ صرف مجھے ملنے جا رہے ہیں۔ اس دن میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ آپ کو اپنے مشاعرے میں شرکت کے لیے ضرور کہا کروں گا۔"

"شکریہ اس کے لیے۔ اس برس تو آپ دعوت نامہ بھجوائیں گے نا؟"

"آپ تو مالک ہیں۔ کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ اب مشاعرہ آپ کا ہے میرا نہیں۔"

راجندر ملہوترہ نے مجھے لاجواب کر دیا۔

ٹھیک اسی طرح جیسے سات سال پہلے قتیل نے میرے گھر کی کال بیل بجائی تھی۔ آج میں اس کے گھر کی کال بیل دبا رہا تھا اور دروازہ کھول کر سامنے مسکراتے شگفتہ چہرے والا آدمی قتیل شفائی ہی تھا۔ میرا بہت ہی پیارا دوست اور وہ مجھے گلے مل رہا تھا اور شکایت کر رہا تھا کہ میں لاہور پہنچتے ہی اس سے ملنے کیوں نہیں آیا تھا اور اس کے پاس کیوں نہیں ٹھہرا تھا۔

اور پھر وہ مجھے اپنی باہوں کے گھیرے میں لیے ڈرائنگ روم میں آ گیا اور ان سب دوستوں سے ملوایا جو وہاں پہلے ہی سے آ چکے تھے اور میری اتنی تعریف کی کہ میرے ہونٹوں پر مہرِ سکوت لگ گئی۔ نیاز حسین لکھویرا اور سعادت سعید تو وہاں تھے ہی۔ ان کے علاوہ جن لوگوں سے پہلی بار ملاقات ہوئی، ان میں مرتضیٰ برلاس، حمیدا اختر اور کچھ نئے لکھنے والے بھی تھے۔ گفتگو کے دوران قتیل نے بتایا کہ وہ ان دنوں اپنی سوانح حیات لکھ رہا تھا جس کا تقریباً آدھا حصہ مکمل بھی کر چکا تھا۔ آج کل بہت سے ادیب اپنی سوانح عمریاں لکھ رہے ہیں۔ کچھ لکھ بھی چکے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب کوئی قلمکار اپنی سوانح حیات لکھنی شروع کر دے تو سمجھ لیجیے کہ اس کا تخلیقی عمل یا تو رک گیا ہے یا بالکل ختم ہو چکا ہے۔

کسی بہت بڑے آدمی کی خود نوشت حالاتِ زندگی میں عام آدمی کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔ ان لوگوں میں نپولین، ہٹلر، ٹالسٹائے، گاندھی، نہرو، برنارڈ شا، ٹیگور، نی ریرے یا کچھ اس سطح کے لوگ شامل ہیں۔ ورنہ خود نوشت حالاتِ زندگی لکھنے والے اتنے سچے اور کھرے کہاں ہو سکتے ہیں کہ اپنے بارے میں سب کچھ بنا کسی تامل یا لاگ لپیٹ کے کہہ سکیں؟ پھر اس پائے کے لوگ ہیں بھی کتنے جنہیں زندگی سے جوجھنے کے وہ معرکہ خیز مواقع ملے ہوں اور پھر قلمکار جو کچھ لکھتا ہے اس میں وہ براہِ راست یا بالواسطہ طور پر شامل ہوتا ہی ہے۔ اس کے بعد کیا رہ جاتا ہے جو وہ اپنی سوانح عمری کے طور پر لکھے۔ بہرحال یہ میرا ذاتی نظریہ ہے جس سے کم سے کم وہ ادیب تو ہرگز متفق نہیں ہوگا جو اپنی سوانح عمری لکھ چکا ہے یا لکھ رہا ہے۔ قتیل شفائی کی کتاب چھپے گی تو اس پر الگ سے بات کروں گا۔

راجندر ملہوترہ نے قتیل کو اگلے برس کے انڈو پاک مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی۔ لیکن اس نے حامی نہیں بھری۔ جب میں نے بھی درخواست کی تو اس نے کہا کہ وہ اس سلسلے میں مجھ سے تفصیلی بات کرے گا۔ میں نے بھی اس وقت زور نہیں ڈالا۔ سوچا کہ بات کرنے کے ابھی کئی مواقع ملیں گے۔

جب ہم قتیل شفائی کے گھر سے باہر نکلے تو آدھی رات ہو چکی تھی۔ شاعر اور ادیب تو راتوں کو جاگنے والی مخلوق ہے۔ جوں جوں رات بڑھتی جاتی ہے [illegible] زیادہ تلملاہٹ اور زیادہ پُرجوش ہوتی جاتی ہے۔ نیند تو ان کے کواڑوں پر اس وقت دستک دیتی ہے جب اُفق کے دامن پر لرزتی پہلی کرن اپنا گلال چھڑکنے لگتی ہے۔

اگلے دن کی مصروفیات کا آغاز احمد ندیم قاسمی کے ساتھ ملاقات سے ہوا۔

میری ابتدائی ادبی تربیت میں نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی، خواجہ غلام السیدین اثر صہبائی، قیس شیروانی اور رسالہ ملک راج صراف کا ہاتھ رہا ہے۔ اگر ان بزرگوں کی صحبتیں مجھے شروع ہی میں نصیب نہ ہوتیں تو ادب کی بنیادی قدروں سے شناسائی بہت دیر میں ہوتی۔ اچھا شعر، اچھی نثر، اچھی تنقید اور اچھی صحافت کیا ہوتی ہے ان کی شُدبُد مجھے انہی بزرگوں کی قربت سے ہوئی۔ اور جب میں نے باقاعدہ لکھنا شروع کیا اور پڑھنے والے مجھے سرسری طور پر پہچاننے لگے تو دو قلمکاروں سے میری وابستگی ہوئی: احمد ندیم قاسمی اور اُپیندر ناتھ اشک۔ اشک سے بھی پہلے احمد ندیم قاسمی سے میرا رابطہ قائم ہوا۔ اگر میں ۱۹۴۶ء میں گورنمنٹ اسکول نوشہرہ میں ملازمت اختیار نہ کرتا اور اگر محمد بخش (ندیم قاسمی کا بڑا بھائی) میرا رفیقِ کار نہ ہوتا اور اگر احمد ندیم قاسمی بیماری کی وجہ سے لاہور چھوڑ کر اپنے گاؤں انگہ نہ چلا آتا تو شاید مجھے ندیم کی قربت نصیب نہ ہوتی۔ میں اپنے ادبی سفر کے جس موڑ پر اس وقت کھڑا تھا، ندیم کی دوستی نے مجھے بڑا سہارا دیا۔ ایک اتوار کو جب میں محمد بخش کے ساتھ ندیم سے ملنے انگہ گیا تو اسے پہلی بار دیکھ کر احساس ہوا کہ وہ ایک ادیب اور شاعر سے زیادہ ایک تھانے دار قسم کا آدمی تھا۔ یہ شاید ایکسائز کے محکمے کی ملازمت کا اثر تھا جسے وہ اب چھوڑ چکا تھا۔ بہت برسوں بعد جب میں نے اے حمید کا احمد ندیم قاسمی پر لکھا ہوا مضمون پڑھا تو میں نے فوراً اپنی رائے بدل ڈالی۔ وہ تو ایک بچے کی طرح نازک سا لگتا تھا، جس کے چہرے پر ایک بڑے زخم کا نشان آج بھی موجود [illegible]

اور قزاقی والا تاثر ایک دم خارج تھا۔ اندر سے وہ نہ تو تھانے دار تھا اور نہ قزاق۔ ایک حساس اور غم گزیدہ دیہاتی جوان تھا۔ جس کے دل پر اس زخم سے زیادہ گہرے زخم موجود تھے۔ چہرے کا زخم تو بھر گیا تھا، لیکن دل کے زخم ابھی ہرے تھے۔ احمد ندیم قاسمی سے دوستی اور محبت کا یہ رشتہ چالیس برس گزر جانے کے بعد بھی اتنا ہی مضبوط ہے۔ ہندوستان سے کوئی ادیب لاہور جاتا ہے تو ندیم اس سے میرا حال ضرور پوچھتا ہے اور اپنا محبت بھرا اسلام بھیجتا ہے۔ ادھر سے جب میرا کوئی دوست لاہور جاتا ہے تو میں بھی انہیں محبت کا پیغام اُسے ضرور بھیجتا

راجندر ملہوترہ اور میں کوئی دس بجے کے قریب کلب روڈ پر واقع اس پہلودار عمارت کے سامنے پہنچ ہیں گاڑی سے اُترے جس میں "مجلس ترقی ادب" کا دفتر واقع ہے کئی کمروں سے گزر کر ہم احمد ندیم قاسمی کے دفتر میں داخل ہوئے۔ اس وقت عبداللہ قریشی بھی دفتر میں موجود تھے جو "اقبالیات" کے جانے پہچانے ماہر ہیں۔ مجھے دیکھ کر ندیم کرسی سے اُٹھا اور مجھے باہنوں میں لے لیا۔ وہی محبت، وہی اپناپن، وہی شفقت۔ وقت اور فاصلہ ذرا بھی اثر انداز نہیں ہوا تھا۔

" مجھے آپ کا پیغام مل گیا تھا۔ دراصل میں آج کل "فنون" کے دفتر میں نہیں جاتا۔ کچھ ہی روز میں دفتر وہاں سے منتقل ہو رہا ہے۔ کہو کیسے ہو ذاکر؟"

"کرم ہے آپ کا"

پھر ہم دونوں نے ایک دوسرے کے بال بچوں کا حال پوچھا۔ میں نے محمد بخش کے بارے میں خاص طور پر پوچھا۔ معلوم ہوا کہ وہ آج کل فیصل آباد میں ہیں۔

پھر اس نے اپنے بزرگ قسم کے ملازم کو چائے لانے کے لیے کہا اور عبداللہ قریشی کے کام کے بارے میں بتاتا رہا۔

میں نے "مجلس ترقی ادب" کے بارے میں واقفیت حاصل کرنا چاہی۔ اس نے ایک چھپا ہوا کتابچہ بھی دے دیا۔ اور بتایا کہ ۱۹۵۸ء میں دراصل حکومتِ پاکستان نے اس ادارے کی تشکیلِ نو کی تھی۔ اس سے پہلے ۱۹۵۰ء میں حکومتِ پنجاب کے محکمۂ تعلیم نے اس ادارے کو اردو زبان کی بقا اور اس کے ارتقاء کے لیے قائم کیا تھا اور اس کا نام بھی "مجلسِ ترجمہ" رکھا تھا۔ آٹھ سال کے بعد ادارے کا نام بدل دیا گیا اور اس کے اغراض و مقاصد اور آئین کو نئے سرے سے ترتیب دیا گیا۔ خان محمد علی خاں وزیرِ تعلیم کو صدر اور جسٹس ایس اے۔ رحمٰن کو نائب صدر بنایا گیا۔ سید امتیاز علی تاج اس ادارے کے پہلے ناظم تھے۔ احمد ندیم قاسمی ۱۹۷۴ء سے بحیثیت ناظم مجلسِ ترقی ادب سے وابستہ تھا۔ کتابوں کا ذکر آیا تو اس نے بتایا کہ تقسیم کے دوران دیال سنگھ کالج کی لائبریری لوٹ لی گئی تھی اور کتابیں ترازو میں تول کر بک رہی تھیں۔ کتابوں کی بے حرمتی جس طرح اس زمانے میں ہوئی، تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ قاسمی نے ان دنوں ترازو میں تلتی ہوئی کتابوں کو خریدا تھا۔

پھر اس نے فنون کا خاص نمبر پیش کیا اور کہا کہ پرچے کے لیے کچھ بھیجوں۔ پرچہ دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ جتنے اچھے پرچے پاکستان سے نکلتے ہیں۔ کاش ان جیسے دو ایک پرچے ادھر بھی نکلیں۔

سعادت سعید ٹھیک ۱۱ بجے پہنچ گیا تھا مجھے لینے کے لیے۔ دراصل لاہور کے سارے پروگرام تو وہی طے کر رہا تھا۔ اس کے آ جانے کے بعد میں نے احمد ندیم قاسمی سے اجازت چاہی اور اس نے ایک بار پھر مجھے گلے سے لگا کر پیار بھری دعا دی۔

راجندر ملہوترہ نے اُٹھتے اُٹھتے ندیم سے انبالہ کے مشاعرے میں شرکت کی درخواست کی۔ اس کا جو فوری ردِعمل تھا، وہ کوئی حوصلہ افزا نہیں تھا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ملہوترہ نے پوچھا "ذاکر صاحب کیا خیال ہے۔ قاسمی انبالہ آئے گا کہ نہیں؟"

"سو فی صد نہیں" میں نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"اس کا جواب میرے پاس نہیں"

دونوں گاڑیاں ہماری گاڑی اور سعادت سعید کی گاڑی اس پہلودار عمارت کے مین گیٹ سے باہر نکل آئیں جو گیٹ سے زیادہ مین روڈ کو اس عمارت سے ملانے کا ایک وسیلہ تھا۔

پھلوں کا تازہ رس میری ایک بہت بڑی کمزوری ہے۔ اس پر اب تک قابو نہیں پا سکا۔ ایک دن انارکلی میں انار کا سرخ سرخ رس مل گیا تھا۔ دو تین روز کی کسر ایک ہی دن میں پوری کر لی۔ راجندر ملہوترہ، نیگی اور گوپال شرما شاپنگ کے چکر میں تھے۔ چنانچہ ہم الگ ہو گئے۔ میں سعادت سعید کی گاڑی میں بیٹھ گیا اور وہ تینوں دوسری گاڑی میں جانے کس طرف نکل گئے۔ ان سے کہہ دیا کہ اگر وہ چاہیں تو سنگ میل پبلشرز کے یہاں لنچ کے وقت پہنچ جائیں۔ ان کے جانے کے بعد میں نے سعادت سے کہا کہ وہ کسی فروٹ جوس کی دوکان پر چلے۔

"یار یہاں انار کا جوس تو بڑا ہی اچھا ہے"

"جی ہاں۔"

"تمہیں بھی پسند ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی ایک طرف گھما دی۔ فروٹ جوس کی دوکان سے ذرا دور ہی پر گاڑی پارک کرنی پڑی تھی۔ اگر گاڑی کہیں غلط جگہ پر پارک کی جائے تو کرین کی مدد سے گاڑی کو اٹھوا کر نزدیک کے پولیس اسٹیشن پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہاں جائیے اور جرمانہ ادا کر کے گاڑی لے آئیے۔ ایک بات ضرور تھی کہ کرین سے گاڑی کو

بڑی احتیاط سے اٹھایا جاتا تھا۔ گاڑی کو گھر دریچ تک نہیں لگتی تھی۔ شاید اسی لیے پاکستان میں گاڑیوں کی غلط پارکنگ نہیں ہوتی۔ انار کا سرخ تازہ جوس پی کر طبیعت خوش ہوگئی۔ ہم لوگ جتنے روز لاہور میں رہے، میں تو دن میں ایک بار انار کا رس ضرور پیتا تھا۔ پگھلا ہوا سرخ شنگرف۔ لگتا تھا جیسے خوب صورت اور شبنم سے دُھلی حیات پی رہا تھا۔

جب ہم سنگ میل پبلشرز کے یہاں پہنچے تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ سنگ میل پبلشرز مجھے ایک بہت اچھا ادارہ لگا۔ وہاں سے بہت اچھی کتابیں چھپ رہی تھیں۔ اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی اشاعت کا کام کر رہا تھا وہ ادارہ۔ میں نے ادارے کی مطبوعات کو دیکھنے میں خاصا وقت لگایا۔ ابھی سارے مہمان نہیں آئے تھے اس لیے میں اس وقت کو اچھی طرح صرف کرنا چاہتا تھا۔ یہ وہی ادارہ تھا، جس سے قتیل شفائی میری کتابیں شائع کرنے کی بات کر رہا تھا۔ میں ابھی میزوں پر ترتیب سے سجی کتابوں کو دیکھ ہی رہا تھا کہ کشور ناہید آگئی۔ مجھے یہاں دیکھ کر خوش ہوگئی۔

"ذاکر صاحب، آپ آگئے۔ بہت اچھا ہوا۔ آپ جتنی بھی کتابیں چاہیں چن لیں۔ پیک ہو جائیں گی۔"

"یہاں لوگ خوب صورت کتابیں چھاپ رہے ہیں۔ ہندوستان میں اتنی خوب صورت کتابیں نہیں چھپ رہیں۔"

"شکریہ۔" ادارے کے مالک نے کہا جو ہمارے قریب ہی کھڑا تھا۔

"مجھے اب اپنی کتابیں دوستوں کو پیش کرتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی ہے۔"

"ایسی بات نہیں۔ یہیں تو آپ اپنی کتابیں ضرور دیجیے۔"

ہم گفتگو میں محو تھے اور سعادت سعید دوستوں سے ٹیلی فون پر میری ملاقاتیں طے کرنے میں لگا ہوا تھا۔

پھر اور دوستوں کا آنا شروع ہوگیا۔

جن نئے دوستوں سے سنگ میل پبلشرز کے یہاں ملاقات ہوئی، ان میں انیس ناگی اور انتظار حسین تھے۔ انتظار حسین نے آنکھ کا آپریشن کرا رکھا تھا، اس لیے نیلے شیشے کی عینک استعمال کر رہا تھا۔ آج کل وہ گھر سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ صرف میری وجہ سے یہاں آیا تھا۔ انتظار حسین آج کے فکشن میں ایک نہایت ہی معتبر نام ہے۔ اس سے تفصیل سے گفتگو کرنے کی خواہش تھی۔ انیس ناگی سروسز کا آدمی ہونے کے باوجود ایک بہت اچھا شاعر، ایک متوازن نقاد، ایک منجھا ہوا ناول نگار، ایک اچھا افسانہ نگار اور اعلیٰ پایہ کا مترجم بھی ہے۔ اس سے بھی ملنے کی خواہش تھی۔ اس کے ساتھ تو بعد میں ایک بھرپور شام گزارنے کا بھی موقع ملا تھا۔ اور دوست جو لنچ پر آئے، ان میں احمد راہی اور منو بھائی دو ایسے قلم کار تھے، جن سے اب تک ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ باقی دوست جو وہاں آئے، ان سے سرسری ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ انتظار حسین اور میں اپنی اپنی پلیٹیں سنبھالے ہال کے کونے میں کھڑے ہوگئے اور باتیں کرنے لگے۔ وہ فکشن کا آدمی تو ہے ہی لیکن پچیس برس تک "مشرق" اخبار سے بھی وابستہ رہا ہے۔ ادبی رجحانات اور پاکستان اور ہندوستان کے ادیبوں کی باتیں ہوتی رہیں۔ ہمیں الگ کھڑے دیکھ کر سعادت سعید بھی ہمارے قریب آگیا۔ اس نے بتایا کہ انتظار حسین کو لکھنوی اساتذہ کے کئی اشعار یاد تھے جو شاید میں نے نہیں سنے ہوں گے۔ جو اشعار میرے اصرار پر اس نے سنائے اُن میں سے مجھے دو شعر یاد ہیں:

دوپٹے کو سینے پہ کُو دہرا نہ اوڑھو
نمودار چیزیں چھپانے سے حاصل؟

بادام دو جو بھیجے ہیں دونے میں ڈال کے
مطلب یہ ہے کہ بھیج دو آنکھیں نکال کے

کشور ناہید نے کتابوں کا پیکٹ بندھوا دیا اور قتیل شفائی نے سنگ میل پبلشرز والوں سے بات کر کے مجھے کہا کہ میں اسے اپنے افسانوں کے مجموعے دے دوں۔ وہ خود اشاعت کی ذمہ داری سنبھال لے گا۔

احمد راہی سے تو بعد میں پاک ٹی ہاؤس میں بھی ملاقات ہوئی۔ لیکن منو بھائی سے دوبارہ ملاقات نہ ہو سکی حالانکہ اس سے ملنے کی میری بڑی خواہش تھی۔ یہ شخص بڑی پہلو دار شخصیت کا مالک ہے۔ اُسے صرف ایک بار ملنے سے تو اس کی شخصیت کی ایک آدھ پرت کو ہی چھوا جا سکتا ہے۔ رات کو حسن رضوی نے "طباق" میں کھانے پر بلا رکھا تھا۔ پنجاب کے روایتی پس منظر میں ہوٹل کا یہ پنجابی نام اچھا لگا۔ ہوٹل بھی اچھا خاصا اور کھانا بھی اچھا تھا۔ ہم چاروں تو تھے ہی، میری مراد راجندر ملہوترہ، چندن نیگی، گوپال شرما اور اپنے آپ سے ہے۔ سعادت سعید بھی تھا۔ حسن رضوی کا بیٹا (اب مجھے اس کا نام یاد نہیں) بھی موجود تھا۔ اور بڑی سیانی باتیں کر رہا تھا۔ سرمد صہبائی جو ایک فلم پروڈیوسر اور ڈائریکٹر بھی ہے، دیر سے آیا تھا۔ مجھے فلم کے لوگوں کا تجربہ ہے۔ ان کے پیشے کے تقاضے ایسے ہیں کہ وہ وقت کے پابند ہو ہی نہیں سکتے۔ اس زمرے میں دوسرے لوگ ہیں سیاسی لیڈر۔ وہ بھی وقت کے پابند نہیں ہوتے۔ یہ وہ لوگ ہیں، جن کے بارے میں اکبر الہ آبادی نے کہا تھا:

رنج لیڈر کو بہت ہیں، مگر آرام کے ساتھ

سرمد صہبائی ایک پرکشش شخصیت کا مالک ہے، لیکن بڑا انکسار اور رکھ رکھاؤ ہے اس میں۔ سرمد سے مل کر واقعی خوشی ہوئی۔ حالانکہ حسن رضوی تو بے چارہ اس انتظار میں اب خود بھی پریشان ہونے لگا تھا اور ارادہ کرنے لگا تھا کہ کھانے کا آرڈر دے دیا جائے، لیکن سرمد صہبائی کے آتے ہی سارا گلہ جاتا رہا۔ آؤ لا عالم ہو گیا۔ ہمیں محبت اور اپنے پن کا

اظہار اس نے کیا۔ میں اس سے بے حد متاثر ہوا۔ سرور سجّی کی مشہور فلم "مولا جٹ" تھی، جس کے بہت چرچے تھے۔ جنہوں نے وہ فلم دیکھی ان کا خیال تھا کہ پنجابی فلموں میں یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ حال ہی میں اس نے ایک فلم اردو میں "بازارِ حسن" کے عنوان سے مکمل کی تھی اور اس کی بھی خاصی تعریف ہو رہی تھی۔ سنیل دت کے حوالے سے فلمی دنیا سے میری دلچسپی کے بارے میں ہندوستان کے دوست تو جانتے ہیں، لیکن لگا کہ پاکستان میں بھی میرا یہ ہلکا پھلکا تعارف موجود تھا۔ سرور سجّی ایک نئی فلم کے لیے کہانی کی تلاش میں تھا۔ میں نے اپنی دو ایک کہانیوں کا ذکر کیا تو اس کی دلچسپی مجھ میں اور بڑھ گئی۔ سرور سجّی ایک ذہین ڈائرکٹر ہے۔ کہانی کا مرکزی خیال ہی کہانی کی جان ہے۔ یہ بات وہ پوری طرح جانتا ہے۔ اس نے نور الحسن رضوی سے کہا کہ ایک شام اس کے اسٹوڈیو میں گزاری جائے۔ وہ مجھ سے ایک طویل ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ اگلے دن ہمیں بہاولپور جانا تھا۔ اور وہاں سے کراچی جانے کا پروگرام تھا۔ اس لیے یہ طے ہوا کہ چودھویں نومبر کی شام ہم لوگ سرور سجّی کے ہی مہمان ہوں گے۔ کیوں کہ اس کے بعد ہمیں جہلم جانا تھا۔

رخصت ہونے سے پہلے 'طہان' کے باہر ہم کچھ دیر اور محوِ گفتگو رہے اور اس کے بعد حسن رضوی اور سرور سجّی نے بڑی محبت سے ہم سب کو گاڑی میں بٹھایا اور جب تک ہماری گاڑی اسٹارٹ نہ ہوئی وہ دونوں سجیلے بانکے نوجوان مسکرا مسکرا کر اور ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں الوداع کہتے رہے۔ ان کے اس رفاقتی اظہار میں حسن رضوی کا پیارا سا بیٹا بھی شامل تھا۔

گلبرگ پہنچے تو میاں صاحب انتظار کے بعد سونے چلے گئے تھے۔ تسکین علی اور رضا دونوں بھائی ہمارا راستہ دیکھ رہے تھے۔ ہم واپس پہنچے تو ان کے چہرے کِھل اٹھے۔

"معلوم ہوتا ہے ہمارے لیے آپ کے پاس بالکل وقت نہیں ہے ڈاکٹر صاحب" علی نے بڑی معصومانہ مسکراہٹ چہرے پر لا کر شکایت کی۔

"اس کا کیا جواب دوں؟"

"جواب ہے ہی نہیں آپ کے پاس"۔ رضا نے ہنستے ہوئے چٹکی لی۔

ڈاکٹر صاحب یہاں [illegible] سے اٹھنے کا نام نہیں لیتے" ملہوترہ نے بھی میرا دفاع پیش نہیں کیا۔

"اتنے بیگانوں میں ایک اپنا بھی ہونا چاہیے"۔

میرے اس جملے پر سب ہنسنے لگے اور آدھی رات کے آس پاس سویا ہوا ماحول ایک دم جاگ اٹھا۔

اور پھر ملہوترہ سونے چلا گیا اور علی اور رضا ہمیں پان کھلانے کے لیے لبرٹی مارکیٹ چل پڑے۔ کوٹھی کا بڑا سا آہنی گیٹ چوکیدار نے پل بھر کے لیے کھولا اور پھر بند کر دیا۔ جیسے گیٹ کے دونوں پٹ خاموش، دھندلی چاندنی میں اونگھتی رات کے دو حصے تھے۔ ایک حصہ اندر کی طرف تھا اور دوسرا حصہ باہر کی طرف لبرٹی مارکیٹ کی طرف اشارہ کرتا ہوا۔ ہم اس وقت رات کے دوسرے حصے سے ملنے جا رہے تھے — جہاں تاریکی اور اجالا گلے مل رہے تھے۔

[جاری ہے]



محمد منشاء الرحمٰن خاں منشا

جگہ جگہ سے شکستہ ہیں، خم ہیں دیواریں
نہ جانے کتنے گھروں کا بھرم ہیں دیواریں

چھتوں کا ذکر ہی کیا ان کو لے اُڑی ہے ہوا
کہ حادثات کے زیرِ قدم ہیں دیواریں

برستی بارشوں میں ہوں گی موجبِ خطرہ
ابھی تو دُھوپ میں ابرِ کرم ہیں دیواریں

ہمارے خیمے طنابوں کے بل پہ قائم ہیں
چھتیں تو خوب میسّر ہیں کم ہیں دیواریں

قدیم شہروں میں ہر سُو قدم قدم بکھری
پرانی راہ گزاروں میں ضم ہیں دیواریں

یہ فرطِ گریہ و زاری کا ہے اثر منشا
زمیں مکانوں کی گیلی ہے نم ہیں دیواریں

۱۱۔ اسٹار کی ٹاؤن، ناگپور (مہاراشٹر)



شاہد کلیم

وفا، خلوص کی سوغات معتبر ٹھہری
فقیہہِ شہر کی ہر بات معتبر ٹھہری

ورق ورق پہ منوّر ہیں اپنے افسانے
ہماری پچھلی ملاقات معتبر ٹھہری

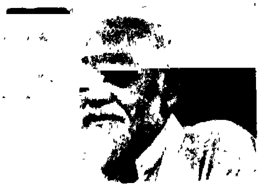
سلگتی ریت پہ سبزہ اُگا دیا میں نے
کہیں تو خون کی برسات معتبر ٹھہری

ہر ایک شخص تھا ڈوبا ہوا گناہوں میں
ہمارے شہر کی ہر رات معتبر ٹھہری

مثالِ مہر سرِ راہ میں چمک اٹھا
سیاہیوں میں مری ذات معتبر ٹھہری

سفر سے لوٹ کے آیا نہ پھر کوئی شاہد
ہر اک صدائے طلسمات معتبر ٹھہری

دودھ کٹورا، آرہ ۸۰۲۳۰۱ (بہار)



خلش بڑودوی

پھنسے تھے جا کے ہمیں خود وہ جال روشن تھا
پھر اس کے بعد ہمارا مآل روشن تھا

اندھیرے وقت کے سینے میں گھر بنا نہ سکے
کہ میرے دل میں تمہارا خیال روشن تھا

جوانی ہم کو اُڑھائے رہی سیہ چادر
سفیدی آئی تو پھر بال بال روشن تھا

اب ایسے چہرے سے کیا اُس کے سامنے جاتے
دمک رہی تھی اذیت ملال روشن تھا

دکھا رہا تھا ہتھیلی میں چاند وہ سب کو
ہر ایک شخص پہ اُس کا کمال روشن تھا

جواب کے سبھی الفاظ تھے اندھیرے میں
کچھ اس ادا سے ہمارا سوال روشن تھا

رگوں میں سرد لہو کا ملال کیا کرتے
کہ اس عروج کا ہم پر زوال روشن تھا

خلش سبھی نے مرے دل کا درد جان لیا
کسی سے کیسے چھپاتا کہ حال روشن تھا

یاقوت پورہ، بڑودہ ۳۹۰۰۰۶ (مہاراشٹر)

غزلیں



مرتضیٰ علی شاد

کہاں تک فکرِ جسم وجاں، خیالِ بام و در رکھیے
اگر لُٹنا مقدر ہے تو چوراہے پہ گھر رکھیے

اُسے آسان ہے حدِّ تعیّن سے گزر جانا
وہ دیوانہ ہے اُس کے دست و بازو کی خبر رکھیے

میں لفظوں میں نئی تفہیم کی دنیا بساتا ہوں
بلا سے آپ مجھ پر تہمتِ عیب و ہنر رکھیے

وہ دروازہ کسی آواز پر کھلتا نہیں لیکن
بڑی سفّاک ہیں، سرکش ہواؤں پر نظر رکھیے

کبھی شہرِ غزل تھی، اب ہے سنگ و خشت کی بستی
یہاں پتھر برستے ہیں، بچا کر اپنا سر رکھیے

شعبۂ اقتصادیات، سیفیہ کالج، بھوپال ۴۶۲۰۰۱

دوستوں کی مفلسی نے اُس کو شرمایا بہت
وہ "سنہرے دیس" سے لوٹا تو پچھتایا بہت

تتلیاں، جگنو، پرندے، رنگ، دریا اور تو
یہ تماشا خواہشوں نے مجھ کو دکھلایا بہت

صبح سے پہلے اندھیرے کم تو کیا ہوتے مگر
رات بھر ننھے چراغوں نے ستم ڈھایا بہت

جانے ماضی کے دریچے سے ہوا کیا کہہ گئی
دیر تک دیوار و در نے ہم کو سمجھایا بہت

مصلحت اُس کی ضرورت، میری مجبوری بھی ہے
وقت کی شرطوں پہ جینا سب کو راس آیا بہت

کم نگاہی کا مداوا بے نیازی بھی تو ہے
کل بھری محفل میں ہم نے اُس کو تڑپایا بہت

لوٹ کر گھر آئے تو کچھ بھی نہ تھا گھر کی طرح
آج اِک ٹوٹا گھروندہ ہم کو یاد آیا بہت

کوئی چہرہ گرد میں لپٹا ہوا دیکھا تو ہے
ہم نے خود کو تو نہ دیکھا، آئینہ دیکھا تو ہے

سامنے دیوار کی مانند ہے اپنی انا
ورنہ ہم نے اُس گلی کا فاصلہ دیکھا تو ہے

نور کا سیلاب، خوشبو کا جزیرہ، اور میں
رات کے پچھلے پہر اک خواب سا دیکھا تو ہے

جانے کیا رشتہ ہے اب تک اُس کے میرے درمیاں
اِک ورق سا طاق میں رکھا ہوا دیکھا تو ہے

لاکھ دروازے کھُلے رکھیں تو کیا، اس شہر کے
اب کسی گھر میں نہیں آتی ہوا، دیکھا تو ہے

سچ کی قسمت میں صلیبیں ہوں کہ زہرابِ ستم
سر کٹا دینا ہے کارِ حق سرا، دیکھا تو ہے

میر کا دیوان، اپنی زندگی، غالب کا گھر
شاد کی نسبت سے تم نے بارہا دیکھا تو ہے

نصر ملک

بردہ فروش

"مائیبرٹ! اس سے ملو یہ فاطمہ ہے ہماری نئی ملازمہ!"

لانڈری کے فورمین پاؤل نے اس سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔ اس نے بھی میری مسکراہٹ کا جواب اگرچہ مسکراہٹ ہی سے دیا لیکن میں نے محسوس کیا کہ ہاتھ ملاتے ہوئے مائیبرٹ نے اس گرم جوشی کا کوئی اظہار نہیں کیا تھا جو روایتی طور پر ڈینش ایسے موقعوں پر کرتے ہیں ——— "کیا تم یہاں کام شروع کرنے والی ہو؟" اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں، یہ آج سے تمہارے ہی ساتھ کام کرے گی۔ اسے مشین چلانے اور اس میں کپڑے ڈال کر دھونے وغیرہ کے بارے میں، میں نے بتا دیا ہے۔ میرے خیال میں یہ سمجھ بھی گئی ہے کہ اسے کیا کرنا ہے ——— کیوں فاطمہ؟" پاؤل بولے جا رہا تھا۔ اور مائیبرٹ مجھے دیکھنے کے ساتھ ساتھ اپنا کام بھی کرتی جا رہی تھی ——— "تمہیں فاطمہ کے ساتھ کام کرنے میں دشواری نہیں ہوگی۔ یہ ڈینش اچھی طرح جانتی ہے ——— لو اب دونوں کام کرو میں چلتا ہوں۔" فورمین نے یہ کہہ کر میرا شانہ تھپتھپایا اور وہاں سے چلا گیا۔

"کیا تم پاکستان سے ہو؟" فورمین کے جانے کے بعد مائیبرٹ نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں میں پاکستانی ہوں۔" میں نے مختصر سا جواب دیتے ہوئے اس سے پوچھا کہ مجھے کیا کرنا ہے؟

"پاؤل نے تمہیں بتا ہی تو دیا ہے۔ بس اس مشین پر کھڑی ہو جاؤ اور وقفے وقفے سے اس میں ضرورت کے مطابق کپڑے ڈالتی جاؤ، صابن ڈالتے وقت خیال رکھنا کہ وہ مقررہ مقدار سے زیادہ نہ ہو اور باہر نہ گرے اور بس ——— کپڑے دھل کر خود بخود باہر آ جائیں گے۔ تم انہیں ان خالی ٹوکریوں میں ڈال کر ایک طرف رکھتی جانا ——— استری کرنے والی عورتیں آئیں گی تو اٹھا کے لے جائیں گی۔ میری طرح تمہارا کام صرف یہی ہے کہ مشین کھڑی نہ ہونے پائے۔ بس کپڑے ڈالتی جانا اور صابن کا خیال رکھنا ——— آؤ میں تمہاری مدد کرتی ہوں۔" مائیبرٹ اتنی تنک چڑھی نہیں تھی جتنا کہ میں نے اُس سے ہاتھ ملاتے وقت اس کے بارے میں سوچا تھا۔ اُس نے مشین میں کپڑے ——— اور خاص مقدار میں صابن ڈال کر ایک بٹن دبا دیا۔ "یہ لو اب مشین سنبھالو اور ہاں بارہ بجے کھانے کا وقفہ ہوتا ہے۔ تب تم یہ سرخ بٹن دبا کر مشین روک دینا۔ کیا تم نے لانڈری کی کینٹین دیکھی ہے؟" اُس نے بغور مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، پاؤل نے مجھے دکھا دی تھی۔" میں نے جواب دیا۔ اس کی تیز نگاہیں ابھی تک میرے سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"میں اپنی مشین پر چلتی ہوں۔ کوئی مشکل پیش آئے تو مجھے بلا لینا۔" وہ مجھے اسی طرح دیکھتی ہوئی اپنی مشین کی طرف چلی گئی۔ میری اور اس کی مشین کے درمیان بمشکل کوئی دو میٹر کا فاصلہ ہوگا۔

بارہ بجنے میں ابھی کچھ منٹ باقی تھے کہ مائیبرٹ اپنی مشین بند کر کے میرے پاس آ گئی۔ "تم کھانا کھانے نہیں جاؤ گی؟" اس نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ لیکن ابھی تو بارہ نہیں بجے۔ آٹھ دس منٹ رہتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں، لیکن اب تم مشین بند کر کے ہاتھ وغیرہ صاف کر لو۔ میں کینٹین جا رہی ہوں ——— کھانے کا وقفہ صرف آدھ گھنٹے کا ہوتا ہے۔"

وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی کینٹین کی طرف چل دی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے بھی اپنی مشین بند کر دی۔ ہاتھ دھوئے اور اپنا کھانے کا ڈبا اٹھا کے کینٹین کی طرف چل دی۔

میں کینٹین میں داخل ہوئی تو کوئی بیس بائیس

Vaerebrovej 20/4-3
2880 Bagsvaerd, Denmark

کارکن عورتیں میزوں پر بیٹھی اپنا اپنا کھانا کھا رہی تھیں۔ مرد محض چار پانچ ہی تھے۔ میں نے مائیبرٹ کو تلاش کرنے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ ایک کونے والی میز پر اکیلی بیٹھی پہلے ہی مجھے ہاتھ سے اشارہ کر رہی تھی۔ میں آگے بڑھ کر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنا کھانے والا ڈبہ کھول کر سامنے رکھ لیا۔

"کیا یہ پاکستانی کھانا ہے؟" اس نے میرے کھانے کے اوپر قدرے جھک کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، میں نے خود بنایا تھا۔ کیا تم کھاؤ گی؟ اس میں شاید مرچیں زیادہ ہو سکتی ہیں۔" میں نے اسے پیش کش کی۔

"نہیں نہیں۔ میں اپنا کھانا کھا چکی ہوں۔" وہ اپنے سامنے پڑے ہوئے ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"تم اگر کھانا چاہو تو یہ ہم دونوں کے لیے کافی ہے۔" میں نے ذرا تکلف سے کام لیتے ہوئے اپنی پیش کش کو دُہرایا۔ مجھے معلوم تھا کہ سخت مرچوں والے کھانوں سے ڈینش ویسے ہی دامن بچاتے ہیں۔

"تم زور دیتی ہو تو میں تمہارا کھانا چکھ لیتی ہوں۔ کھاؤں گی اور کسی دن۔" اس نے یہ کہتے ہوئے میری آدھی چپاتی اُٹھالی۔ اور اس کے ایک لقمے میں میرے کھانے کے ڈبے سے پورا ایک کوفتہ اُٹھا لیا — اور ابھی منہ میں رکھنے ہی والی تھی کہ میں کانپ گئی۔ اوہ خدایا! وہ ابھی کلبلا اُٹھے گی — یہ کمبخت مرچیں۔

میں ابھی اسی ڈر میں ہی تھی کہ اس نے نوالہ منہ میں رکھ کر میری طرف یوں دیکھا گویا کہہ رہی ہو ایک کوفتہ اور لے لوں۔ "فاطمہ! تم اچھا کھانا بناتی ہو۔" مائیبرٹ بولی۔ "اگر میں اپنا کھانا نہ کھا چکی ہوتی تو تمہارا ایک کوفتہ اور ضرور لیتی۔"

اُسے یہ کیسے پتہ چلا کہ میں کوفتے کھا رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں خیال آیا۔ شاید کسی پاکستانی گھرانے کو جانتی ہو۔ میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ وہ بولی۔ "میں اب چلتی ہوں۔ تم آجانا۔" وہ اپنا کھانے کا ڈبہ اُٹھا کر چل دی اور میں بھی کھانا کھانے کے بعد اپنی مشین پر پہنچ گئی۔

چھٹی ہوئی تو لانڈری سے نکلتے ہوئے میں مائیبرٹ کے پیچھے پیچھے ہولی۔ وہ بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی۔ مجھے اپنے پیچھے آتے دیکھ کر وہ رُک گئی تھی۔ اور جب میں اس کے قریب پہنچی تو بولی:

"کیا تمہیں بھی بس پکڑنی ہے؟"

"ہاں، تم کون سی بس لوگی؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"سولہ نمبر والی۔" اس نے جواب دیا۔

"وہی تو میں نے بھی لینی ہے۔" میں نے کہا۔ اور ہم دونوں بس اسٹاپ کی طرف چلنے لگیں۔

بس کے اڈے پر ہمیں کچھ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ بس آئی تو ہم دونوں اس میں سوار ہوگئیں۔ بھیڑ بھی زیادہ نہیں تھی۔ ہم ایک ہی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ وہ رستہ بھر مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ پاکستانیوں کے بارے میں اس کی معلومات کافی وسیع تھی۔ اس نے میری شلوار اور خاص کر قمیض کے گلے اور نمونے کی کافی تعریف کی تھی۔ مائیبرٹ کا اسٹاپ مجھ سے دو اسٹاپ پہلے پڑتا تھا۔ اس کا اسٹاپ آیا تو وہ کل کام پر ملنے کا وعدہ کر کے خدا حافظ کہتی ہوئی بس سے نکل گئی۔

میں جب گھر پہنچی تو عابد مجھ سے پہلے ہی موجود تھا۔ وہ بھی ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا اور رات کو "پارٹ ٹائم" ٹیکسی بھی چلاتا تھا۔ میرے دروازہ کھولنے کی آہٹ سن کر اُس نے ڈرائنگ روم ہی سے پوچھا۔ "کام پر آج پہلا دن کیسا رہا؟"

"کام تو بس کام تھا۔" میں نے جواب دیا اور اپنے کپڑے بدلنے کے لیے سونے والے کمرے کی طرف مڑ گئی۔

"میں سبزی لے آیا ہوں۔ سخت بھوک لگی ہوئی ہے۔ آج بہت کام کرنا پڑا۔ ذرا جلدی سے کھانا بنا لو۔ میں ٹیلی ویژن پر خبریں دیکھ لوں گا۔" عابد ڈرائنگ روم ہی سے مجھے حکم دے رہا تھا۔

میں کپڑے بدل کر ڈرائنگ روم میں آگئی تھی اور ابھی کرسی پر بیٹھنے ہی والی تھی کہ اُس نے مجھے چائے کا پانی رکھ دینے کو کہا۔ مرتی کیا نہ کرتی۔ یہ تو روزمرہ کا معمول تھا۔ ہماری شادی کو پانچ برس ہونے والے تھے۔ اُسے اپنی تھکاوٹ کا تو احساس رہتا تھا اور مجھ سے فیکٹریوں میں کام کرانا ہماری مجبوری اور پھر حکم چلانا اس کا ایسا حق تھا جو اس نے خود ہی حاصل کر رکھا تھا۔

دوسرے دن میں کام پر جانے لگی تو یہ سوچ کر کہ شاید مائیبرٹ کھالے، میں نے اپنے ڈبے میں دوگنا کھانا رکھ لیا۔

میں بس میں سوار ہوئی تو دو اسٹاپ بعد مائیبرٹ بھی اسی بس میں سوار ہوتی دکھائی دی۔ وہ بیٹھنے کے لیے جگہ تلاش کر رہی تھی کہ میں نے اُسے آواز دے کر متوجہ کیا۔ "اِدھر آجاؤ۔"

"ہیلو فاطمہ — صبح بخیر۔" وہ میرے پہلو میں بیٹھتے ہوئے بولی۔ "کہو، کیسی ہو؟"

"بس ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔

مائیبرٹ اور میں دوسرے مسافروں کی طرح آدھی اونگھ رہی تھیں اور کبھی کبھی آپس میں ایک آدھ بات بھی کر لیتی تھیں۔

لانڈری میں جا کر ہم دونوں نے اپنی اپنی مشینیں چلا کر کپڑے دھونے شروع کر دیے اور بارہ بجے ہم دونوں اکٹھی ہی کینٹین گئیں اور ایک ہی میز پر کھانا کھانے بیٹھ گئیں — "کیا آج تم میرے ساتھ کھانا نہیں کھاؤ گی؟" میں نے اپنا کھانے کا ڈبہ کھولتے ہوئے مائیبرٹ سے پوچھا۔

"لاؤ تم بھی کیا کہو گی۔" اُس نے اپنا ڈبہ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "آج کیا لائی ہو؟"

مائیبرٹ بڑے مزے سے کھانا کھا رہی تھی اور میری حیرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں آج چپاتیوں کے ساتھ بھنڈیاں لائی تھی اور خدا گواہ مائیبرٹ

کھانے میں مجھ سے تیز تھی — "کیا تمہیں پاکستانی کھانے پسند ہیں ؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ہاں تھے ۔" اس نے لقمہ اٹھاتے ہوئے مختصر سا جواب دیا اور بولی ۔" ہم باتیں زیادہ کر رہی ہیں ۔ دیکھو، وقت کم رہ گیا ہے ۔"

کھانے کے بعد ہم دونوں پھر اپنی اپنی مشینوں پر چلی گئیں ۔ اور پھر کام ختم کرتے ہی گھر جانے کے لیے بس سٹاپ کی طرف چل دیں ۔ اب ہمارا یہ معمول بن گیا تھا ۔ ہم اکٹھی کام پر آتیں اور واپس بھی اکٹھی ہی جاتیں ۔ وہ مجھے کافی دلچسپ اور پیاری لگنے لگی تھی ۔

مجھے لانڈری میں کام کرتے ہوئے ایک ماہ ہونے کو آیا تھا ۔ ایک روز میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں کے گرد قدرے سیاہ حلقے سے نظر پڑے — میں نے پوچھا تو وہ بولی "پچھلی کئی راتوں سے ٹھیک طرح سے سو نہیں پا رہی ہوں ۔" میں نے سوچا شاید اس کا اپنے خاوند یا یار سے جھگڑا رہتا ہوگا — عابد مجھے ڈینش لڑکے لڑکیوں کے اکثر قصے سناتا رہتا تھا ۔ "یہ لوگ ایک دوسرے کے لیے ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے جوتا — جب چاہا بدل لیا اور تکلیف دینے لگے تو اٹھا کر پھینک دیا ۔ اور نیا لے آئے ۔" میں نے مائیبرٹ سے زیادہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا — اپنا دکھ وہی جانتا ہے جو جھیلتا ہے ۔

میں نے ایک مرتبہ مائیبرٹ کو اپنے گھر مدعو کرنا چاہا تو اس نے مجھے اپنے ہاں آنے کی دعوت دے دی "میں اکیلی رہتی ہوں ۔ تم ایک دن میرے ہاں کیوں نہیں آجاتی ہو ؟"

"اچھا، اگر تمہاری خواہش یہی ہے تو میں ایک دن تمہارے ہاں ضرور آؤں گی ۔" میں نے اس کی دعوت قبول کرتے ہوئے کہا ۔

آج جمعہ تھا اور عابد کو فیکٹری کے کام کے بعد شام کو ٹیکسی چلانا تھی ۔ میں نے سوچا کل "ویک اینڈ" ہے ۔ کیوں نہ گھر جاتے ہوئے آج مائیبرٹ کے ہاں ہوتی جاؤں — آخر دعوت تو اس نے دے ہی رکھی تھی ۔ میں نے مائیبرٹ سے بات کی تو اس نے فوراً ہی ہاں کہہ دی "کیوں نہیں ۔ اس سے بہتر اور کیا ہوگا ۔"

کام ختم کرنے کے بعد ہم نے حسب معمول بس پکڑی اور مائیبرٹ کے گھر کی طرف روانہ ہو گئیں ۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ رستے میں کچھ چپ چاپ سی تھی ۔ بس سے اتر کر ہمیں کچھ زیادہ دیر چلنا نہیں پڑا تھا ۔ مائیبرٹ کا فلیٹ نیرو برو گیڈ میں ایک پرانی عمارت کی تیسری منزل پر تھا ۔ جوں ہی ہم سیڑھیاں چڑھ کر اس کے فلیٹ میں داخل ہوئیں ۔ مائیبرٹ نے بڑے خلوص سے میرا اوورکوٹ اتروا تے ہوئے مجھے خوش آمدید کہا ۔ اور ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی : "چلو، بیٹھو، میں پانی گرم کرتی ہوں — تم چائے پیو گی یا کافی ؟"

"چائے ۔" میں نے جواب دیا اور آگے بڑھ کر ڈرائنگ روم میں پڑے ایک صوفے پر بیٹھ گئی ۔

اب میں نے جو کمرے کا جائزہ لیا تو حیران ہو گئی ۔ ٹیلی ویژن کے اوپر رکھی ہوئی ایک فریم شدہ رنگین تصویر میں ایک پاکستانی جوڑا دکھائی دے رہا تھا ۔ میں اٹھ کر ابھی اسے قریب سے دیکھ ہی رہی تھی کہ مائیبرٹ چولہے پر پانی رکھ کر آگئی — "کیا دیکھ رہی ہو ؟" اس نے پوچھا ۔

"ارے مائیبرٹ ! اس تصویر میں شلوار قمیض پہنے ہوئے تو تم ہی ہو — سچ بتاؤ یہ مونچھوں والا کون ہے ؟ ہے نا کوئی پاکستانی ؟"

اب تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ سالی کا کوئی یار ہوگا ۔

"یہ تھا میرا شوہر اکرم ۔" وہ میرے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئی ۔

"کیا مطلب تمہارا شوہر تھا ؟" میں نے پوچھا ۔ مجھے اپنے خاوند عابد کی بتائی ہوئی باتیں یاد آنے لگی تھیں

"میں تمہیں بتاتی ہوں فاطمہ ۔" اس نے ٹیلی ویژن کے اوپر رکھی ہوئی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔" یہ ہماری شادی کے چند دن بعد کی تصویر ہے ۔ یہاں اسی گھر میں میری ایک سہیلی نے اتاری تھی ۔" باورچی خانے میں چائے کا پانی ابلنے لگا تھا ۔"میں آکر بتاتی ہوں ۔" وہ چائے بنانے کے لیے اٹھتی ہوئی بولی ۔

اس نے چائے کا ٹرے میز پر رکھ کر پیالیوں میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا ۔ "کتنی چینی لو گی ؟"

"بس ایک چمچہ کافی ہے ۔" میں نے کہا ۔

"ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی ۔" مائیبرٹ نے چائے میں چینی ملاتے ہوئے کہنا شروع کیا — اکرم اور میں پانچ سال پہلے ایک کلب میں ایک دوسرے سے ملے تھے ۔ مجھے وہ رات آج بھی اچھی طرح یاد ہے جب اکرم کلب میں داخل ہوا اس نے اپنے لیے آتے ہی وسکی کا ایک جام خریدا اور بار کے قریب ہی کھڑا ہو کر اس کی چسکیاں لینے لگا ۔ میں بھی اپنی ایک سہیلی کے ساتھ وہیں کھڑی تھی ۔ ہم بیئر پی رہی تھیں ۔ موسیقی اپنے زوروں پر تھی ۔ کلب میں لڑکے لڑکیاں ہر بات سے بے خبر "یہ رات ہماری ہے" کی دھن پر یوں محو رقص تھیں کہ گویا انہیں صبح کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی غرض نہیں تھی — میری اور اکرم کی جونہی نگاہیں چار ہوئیں، اس نے مسکراتے ہوئے مجھے رقص کی دعوت دے دی اور میرے سر کی ہلکی سی اقراری جنبش پر اس نے میری کمر میں اپنا بازو ڈال کر اپنی وسکی کا گلاس ایک میز پر رکھ دیا اور میرے ساتھ رقص کرنے لگا ۔ جب تک موسیقی جاری رہی ہم رقص کرتے رہے اور پھر موسیقی کے وقفے میں ہم ایک میز پر جا بیٹھے ۔ ہمارے ساتھ میری سہیلی بھی تھی ۔ اکرم نے اپنا تعارف کرایا ۔ اس کی باتیں پر لطف تھیں ۔ وہ ہمیں طرح طرح کے مذاق سناتا اور ہنساتا رہا ۔ اس نے ہمارے بیئر پینے کو بھی اپنے مذاق کا نشانہ بناتے ہوئے ہمارے لیے بھی وسکی کا آرڈر دے دیا ۔ "اب تم سکول گرلز تو ہو نہیں ۔" مجھے اچھی طرح یاد ہے اس نے چھیڑتے ہوئے کہا تھا — مجھے وہ بہت

اچھا لگا اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ بھی مجھ میں کافی دل چسپی لے رہا تھا۔ وہ لوہے کے ایک کارخانے میں ملازم تھا لیکن اپنے لباس، بات چیت، رکھ رکھاؤ کے انداز سے وہ مجھے کسی بیمہ کمپنی کا ایجنٹ دکھائی دیتا تھا۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے لیے یوں دل چسپی کا اظہار کرتے ہوئے دیکھ کر میری سہیلی نے مجھے کہنی ماری اور "تمہارے بھاگ جاگے" کہہ کر اس نے ہم سے رخصت چاہی۔ اُسے اپنی بوڑھی ماں کے یہاں جانا تھا۔ ویسے بھی کلب اب بند ہونے والی تھی۔ اکرم اور میں ابھی بیٹھے ہی ہوئے تھے کہ میں نے اپنا جام ختم کرتے ہوئے اس سے اجازت لینا چاہی لیکن اس کے اصرار پر ایک جام اور پینے کے لیے رک گئی اور پھر جب ہم دونوں نے اپنے اپنے جام ختم کیے تو اکرم نے مجھے اپنے ساتھ آنے کی دعوت دے دی۔ میں نے قدرے تکلف کا اظہار کیا تو میرے ساتھ میرے ہاں آنے کا خیال پیش کر دیا۔ "اس میں تو تمہیں اعتراض نہیں ہوگا"۔ اُس نے مجھا ہاتھ سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔ میں نے قدرے توقف کے بعد اُسے محض چائے کی پیالی کے لیے اپنے ساتھ آنے کی دعوت دے دی۔

فاطمہ اگر تم بُرا نہ مانو تو میں ایک سگریٹ سُلگا لوں۔ مائیبرٹ نے ایک کونے میں پڑی ہوئی سگریٹ کی ڈبیہ اور ماچس اٹھاتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ میں نے اسے پہلے کبھی سگریٹ پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ "کبھی کبھی یہ بہت تسکین دیتے ہیں"۔ اس نے سگریٹ سُلگا کر ایک لمبا کش لیتے ہوئے کہا

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی"۔ مائیبرٹ پھر بولی۔ "اکرم کو میں نے چائے کی پیالی کی دعوت دی تھی۔ لیکن مجھے اگلی صبح اُسے ناشتہ بھی کرانا پڑا۔ ہم نے وہ سارا دن شہر میں اکٹھے گھومتے گزارا اور پھر شام کو اگلے "ویک اینڈ" کے دوران اُسی کلب میں ملنے کا وعدہ کر کے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ ہمارا ویک اینڈ ملاقاتوں کا سلسلہ کوئی دو تین ماہ جاری رہا۔ اس دوران میں کبھی میں اور کبھی اکرم ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے رہے۔ کبھی وہ میرے ہاں رات بسر کرتا تو کبھی میں صبح سویرے اُس کے ہاں بستر کی سلوٹیں ٹھیک کر رہی ہوتی۔ وقت بڑی خوش اسلوبی سے گزر رہا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے تھے"۔ مائیبرٹ نے اپنی بات سناتے ہوئے غالباً پہلی بار چائے کی چُسکی لی تھی جب کہ میں اپنی چائے کی پیالی کبھی کی خالی کر چکی تھی۔ اُس نے میری پیالی میں چائے ڈالتے ہوئے پوچھا کہ اگر مجھے بھوک لگ رہی ہو تو وہ کچھ سینڈوچ بنا لے۔

"نہیں کھانے کی اتنی جلدی بھی کیا ہے"۔ میں نے چائے میں چینی ملاتے ہوئے اپنی بات جاری رکھنے کو کہا۔

"ہاں! ایک دن اکرم نے مجھے اپنے ساتھ شادی کرنے کی دعوت دے دی۔ میں نے اس بارے میں کچھ سوچنے کے لیے اس سے مہلت مانگی تو وہ مان گیا۔ اسی عرصے میں وہ میرے گھر پر کئی مرتبہ میری ماں سے بھی مل چکا تھا۔ میرا باپ میرے بچپن ہی میں اگرچہ میری ماں کو چھوڑ گیا تھا، لیکن وہ زندگی بھر مجھ سے پیار کرتا رہا۔ اس کی موت بھی ایک عجیب پُر درد کہانی ہے۔ بے چارہ ہر وقت نشے میں دھت رہتا تھا۔ اگرچہ اُس نے ایک اور عورت کے ساتھ رہنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اُسے اس بات کا دُکھ سرطان کی طرح کھاتا رہا کہ میری ماں نے اُسے گھر سے کیوں نکال دیا تھا۔ ہاں تو میں تمہیں اکرم کے بارے میں بتا رہی تھی"۔ مائیبرٹ نے ایک سگریٹ اور سُلگایا اور —— دھوئیں کے مرغولے بناتے ہوئے بولی۔ "اکرم کی طرف سے اب شادی کا اصرار بڑھنے لگا تھا۔ اور اس نے یہ بھی تجویز پیش کر دی کہ ہم دونوں اکٹھے ہی ایک مکان میں کیوں نہ رہیں —— اکرم نے ویلسٹر برو کے علاقے میں ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا۔ اور میرے پاس یہی فلیٹ تھا جس میں اب میں رہ رہی ہوں۔ ایک ساتھ رہنے والی اکرم کی بات میں نے مان لی اور وہ میرے ہاں منتقل ہو گیا۔ دن میں وہ اپنے کام پر چلا جاتا اور میں اپنے کالج —— ہمارا وقت اچھا گزر رہا تھا —— ویک اینڈ میں ہم شہر گھومنے چلے جاتے اور جمعہ و ہفتہ کی راتیں مختلف کلبوں میں رنگ رلیاں مناتے رہتے"۔

مائیبرٹ اب مسلسل بولے جا رہی تھی اور مجھے یوں لگا کہ وہ اپنی کہانی سُنانے کے لیے بے چین ہے اور شاید اُسے اپنی بپتا کے اظہار کا آج ہی موقع ملا ہے۔ خود میری دل چسپی بھی تجسس کی حد تک بڑھ گئی تھی۔

اکرم مجھے پاکستان میں اپنے خاندان کے متعلق بتاتا رہتا تھا۔ میرے خیال میں وہ ایک اچھے گھرانے سے تھا۔ وہ خود بھی تو یہی کہا کرتا تھا۔ اُس کا باپ ایک جاگیردار تھا اور ماں کو گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ اس کے دو بھائی اور ایک بہن بھی تھی۔ وہ سب سے چھوٹا تھا۔ ایک دن میری ماں ہمارے گھر آئی تو باتوں باتوں میں اُس نے ہمیں بھی شادی کر لینے کی ترغیب دینی شروع کر دی۔ اب تو اکرم اور مچل گیا۔ میں بھی کالج میں اپنے امتحان سے فارغ ہو چکی تھی۔ ہم نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا اور پھر ایک اتوار کے روز 'اکرم' میں، میری ماں اور میری چند جاننے والی کالج کی سہیلیاں گرجا گھر پہنچ گئیں۔ جہاں پادری نے اکرم اور مجھے میاں بیوی کے بندھن میں باندھتے ہوئے ایک دوسرے پر قانونی ازدواجی حقوق دے دیے۔ ہم نے اس کے سامنے ایک دوسرے سے زندگی بھر وفا اور پیار کرنے کا عہد کیا اور ہنسی خوشی گھر واپس آ گئے"۔

مائیبرٹ کہتے کہتے رُک گئی۔ "دیکھو فاطمہ، مجھے اب بھوک لگ رہی ہے۔ آؤ، پہلے ایک "سینڈوچ" کھا لیں —— باقی قصہ پھر سُناتی ہوں۔ کہیں تم بور تو نہیں ہو رہی ہو؟" وہ اُٹھی اور فریج سے سینڈوچ نکال کر گرم کرنے لگی۔

"سُنو مائیبرٹ میرے لیے کھانا نہ بنانا۔ میں گھر جا کر کھاؤں گی۔ عابد بھی آج لیٹ آئے گا۔ وہ ٹیکسی چلا رہا ہے۔ اور پھر مجھے ابھی کوئی خاص بھوک بھی نہیں"۔ میں نے کہا۔ اتنی دیر میں وہ سینڈوچ گرم بھی کر لائی تھی —— "ہاں تو سُنو!

اس نے سینڈوچ کا نوالہ لیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"شادی سے پہلے میں جتنا بھی عرصہ اکرم کے ساتھ رہی، میں مانعِ حمل گولیاں استعمال کرتی رہی۔ لیکن ——— پھر اکرم ہی کے کہنے پر ان کا استعمال ترک کر دیا۔ ہم دونوں ہی کو "والدین" بننے کی بڑی خواہش تھی جو ہماری شادی کے ٹھیک دس ماہ ——— بعد پوری ہو گئی ——— وہ کرسمس کی رات تھی۔ شہر میں چراغاں کا سماں تھا۔ لوگوں نے اپنے اپنے گھروں میں رنگ برنگے قمقمے اور موم بتیاں روشن کر رکھی تھیں اور گرجا گھروں میں خصوصی عبادتوں کے لیے گھڑیال بج رہے تھے۔ ایک بجے کے قریب مجھے بچے کی پیدائش کے آثار محسوس ہونے لگے۔ میں نے اکرم کو بتایا تو وہ ایک طرح سے اُچھل پڑا ——— "میرے دیس پاکستان کا بانی محمد علی جناح بھی تو آج ہی پیدا ہوا تھا۔ اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا تھا۔ وہ یہ بھول ہی گیا تھا کہ آج عیسیٰ مسیح کا جنم دن تھا۔ اکرم کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ ہم نے ٹیکسی منگوائی اور ہسپتال کے لیے روانہ ہو گئے۔ علی الصبح نورِ سحر کی نمود کے ساتھ ہی میں نے ایک بچی کو جنم دیا اور اکرم جب اُسے دیکھنے کے لیے میرے کمرے میں آیا تو میں نے اپنے پہلو میں پڑی ہوئی بچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُسے باپ بن جانے پر مبارک باد دی۔ "ہم اس کا نام مریم رکھیں گے۔" میں نے کہا۔ "یہ عیسیٰ ابنِ مریم ہی کا تو جنم دن ہے۔ وہ کچھ لمحوں کے لیے خاموش رہا اور پھر بولا۔ "ہاں مریم خوب صورت نام ہے۔" میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ اداس سا لگ رہا تھا۔ مجھے یاد ہے اُسے بیٹے کی بڑی خواہش تھی۔ مگر اس میں میرا کیا قصور تھا۔ وہ کچھ گھنٹے میرے پاس رہا اور پھر شام کو جب مجھے ملنے آیا تو اس کے ساتھ ایک مُلّا بھی تھا۔ اس مُلّا نے بچی کے کان میں کوئی راگ الاپنا شروع کیا۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں تو اکرم نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ ایک اسلامی رسم ہے جو پوری کرنی ضروری ہے۔ مُلّا نے اپنا کام ختم کیا اور ایک طرح سے مجھے گھورتا ہوا چلا گیا۔ اکرم یوں تو میرے پاس سارا دن ہسپتال میں رہا۔ لیکن مجھے اس کے چہرے پر وہ خوشی دکھائی نہیں دی تھی۔ جو ایک باپ کے چہرے پر ہونی چاہیے تھی ——— "

مائیبرٹ اپنی بات سُنا رہی تھی اور میز پر پڑا ہوا اس کا دوسرا سینڈوچ کبھی کا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اور میری اپنی بھوک تو کبھی کی مر چکی تھی۔

مائیبرٹ نے ایک اور سگریٹ سلگایا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "تین دن بعد جب اکرم اور میں مریم کو ساتھ لے کر ہسپتال سے گھر پہنچے تو گھر کا ماحول ہی عجیب تھا ——— ڈرائنگ روم میں بیئر کی خالی بوتلیں یہاں وہاں بکھری پڑی تھیں۔ اور باورچی خانے میں دھونے والے برتنوں کا ڈھیر لگا تھا۔ اکرم شاید بھانپ گیا تھا "معاف کرنا مائیبرٹ۔" اُس نے کہا اور صفائی کرنے میں لگ گیا۔ ننھی مریم کو بستر پر لٹا کر اپنی تھکاوٹ کے باوجود میں بھی گھر کی صفائی میں اس کی مدد کرنے لگی۔ شام ہو گئی تھی۔ ہم نے مل کر کھانا بنایا اور کھانے کے بعد میں مریم کو دودھ پلانے لگی تو اکرم یہ کہہ کر بستر پر چلا گیا کہ "صبح اُسے جلدی کام پر جانا ہے۔" میں نے بھی کوئی توجہ نہ دی۔ اب اکرم اپنے ویک اینڈ کے مشاغل بھول گیا تھا۔ اور میں اس میں اس اچانک تبدیلی پر حیران تھی۔ اکرم نے شام کو دیر سے گھر آنا اور صبح جلدی کام پر جانا شروع کر دیا تھا۔ اور ہاں اُس نے اب گھر پر شراب پینا بند کر دیا تھا۔ وہ مُلّا جو اکرم کے ساتھ ایک بار ہسپتال آیا تھا۔ کبھی کبھار ہمارے ہاں آتا جاتا رہتا تھا۔ اور سنیچر اور اتوار کے روز تو وہ ہمارے ہاں آ کر یوں گھنٹوں بیٹھا رہتا جیسے اُسے واپس ہی جانا نہیں ہوتا تھا۔ نہ جانے وہ اکرم کے ساتھ کیا باتیں کرتا رہتا کہ اس کے جانے کے بعد اکرم نہ صرف اداس اداس رہتا بلکہ اکثر بستر پر لیٹا چھت کو گھورتا رہتا۔ اور اگر میں اسے خوش کرنے کے لیے کوئی بات بھی کرتی تو وہ مجھ سے اُلجھ جاتا۔ ایک دن کسی بات پر وہ مجھ سے یہاں تک اُلجھ بیٹھا کہ اُس نے مجھے تھپّڑ دے مارا۔ مریم اب دو سال کی ہو چکی تھی اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے مریم کو بیچ میں لاتے ہوئے اپنے دل کی بات کھول دی۔ "مریم کی پرورش اسلامی طریقے سے ہوگی۔ ہم مسلمان ہیں۔" گویا وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ میں نے بات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ "میں نہ تو مسیحیت پر یقین رکھتی ہوں اور نہ ہی کسی اور مذہب پر۔ اور جس طرح کا وہ خود مسلمان ہے اُسے اس مسلمانی کو برقرار رکھنے کا مکمل اختیار ہے۔"

مائیبرٹ نے پہلو بدلا اور ٹھنڈی چائے کی چسکی لیتے ہوئے پھر بولی۔ "ایک شام اکرم نے مجھے ایک طرح سے حکم دیا کہ کل سے مریم "کنڈر گارٹن" نہیں جائے گی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس شام وہ مُلّا بھی ہمارے ہاں آیا ہوا تھا۔ میں نے اس کے سامنے اکرم کے ساتھ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن دوسری صبح جب میں مریم کو کنڈر گارٹن لے جانے کے لیے تیاری کرنے لگی تو وہ ایک طرح سے مجھ پر جھپٹ پڑا ——— "کمینی۔ میں نے کل جو کہہ دیا تھا کہ مریم کنڈر گارٹن نہیں جائے گی۔" وہ بچی کو میرے ہاتھوں سے چھینتے ہوئے غرّایا ——— "لیکن کیوں؟" میں نے بھی ذرا تیز لہجے میں کہا۔ تو اُس نے مجھے ایک ٹانگ جھاڑ دی۔ "تمہیں وہی کرنا ہوگا جو میں کہوں گا۔ تم خود گھر پر اس کی نگہداشت اور پرورش کرو گی۔ اب اگر تم نے اسے کنڈر گارٹن میں لے جانے کی کوشش کی تو سن پہچان لو کہ میں پاکستانی ہوں، پاکستانی ——— ڈنیش نہیں ہوں۔" اس نے ایک طرح سے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔ میں نے اس سے پہلے اُسے اس طرح آپے سے باہر نہیں دیکھا تھا۔" مائیبرٹ کا چہرہ سُرخ ہونے لگا تھا ———

"فاطمہ تم کیا سوچتی ہوگی کہ میں کیا قصہ سنانے لگ گئی ہوں۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں، مائیبرٹ مجھے بتاؤ پھر کیا ہوا؟" میں نے ایک طرح سے اسے کریدتے ہوئے کہا تو وہ بولی "میں اگرچہ مریم کو اس کے بعد کینڈ گارٹن تو نہ لے جا سکی لیکن سوچتی رہی کہ اکرم کو دن بدن کیا ہوتا جا رہا ہے اب اس نے اپنی ملازمت بھی چھوڑ دی تھی اور محض بے روزگاری الاؤنس پر ہمارا گزارا ہو رہا تھا — اب وہ گھر پر ہی رہنے لگا تھا۔ بات بات پر الجھنا اور جھگڑے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا اب اس کی عادت بنتی جا رہی تھی۔ میں نے پاکستانی کھانے بنانا بھی اسی سے سیکھا تھا۔ وہی کھانے جو اسے بہت پسند ہوا کرتے تھے، اب وہ ان میں نقص نکالا کرتا تھا۔ میرے لیے یہ ماحول سوائے گھٹن کے اور کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ میں اگر مریم کو ساتھ لے باہر جانے لگتی تو وہ منع کر دیتا یا پھر خود بھی ساتھ ہو لیتا۔ وہ مریم کو کسی طرح خود سے دور نہیں ہونے دیتا تھا اور بے شک اُسے بہت پیار کرنے لگا تھا۔ اب وہ اردو کے بھی کچھ جملے بولنے لگی تھی اور اکرم کی اس بات کی بہت خوشی تھی۔" مائیبرٹ اب مسلسل بولے جا رہی تھی اور میں مجسمہ بنی سنتی جا رہی تھی — ہم دونوں ہی چائے اور کھانا بھول چکی تھیں۔ ہاں مائیبرٹ اب سگریٹ پہ سگریٹ پھونکے جا رہی تھی۔ اکرم کے ساتھ اگرچہ میرا گزر مشکل ہوتا جا رہا تھا، لیکن میں پھر بھی کوشش کرتی رہی کہ کسی طرح ہمارے پیار کے گزرے ہوئے دن لوٹ آئیں۔ مجھے یہ بھی ڈر رہتا تھا کہ اکرم نہ جانے کب میرے پیار کے اظہار کو بھی غلط سمجھ لے — وہ مُلّا اب اگرچہ ہمارے ہاں تو کبھی کبھار ہی آتا تھا۔ لیکن اکرم اُسے دن میں کم از کم ایک بار ضرور فون کیا کرتا تھا — ایک بار وہ آیا تو اکرم نے زور دیتے ہوئے اسے رات کے لیے بھی ٹھہرا لیا۔ — مجھے اس سے کچھ نفرت سی ہو گئی تھی۔ وہ اکرم سے باتیں کرتا ہوا مریم کو گود میں لے لیتا اور کنکھیوں سے مجھے دیکھتا رہتا — وہ اس رات تو ہمارے

ہاں رہا، لیکن صبح سویرے ہی ناشتہ کیے بغیر چلا گیا — اس کے جانے کے بعد اکرم مجھ پر برس پڑا کہ میں دیر تک سوتی رہی اور معزز مہمان ناشتہ کیے بغیر چلا گیا۔ میرا کہنا تھا کہ میں سوئی ہی کب تھی جو بیدار ہوتی۔ وہی چند منٹ اور صبر نہ کر سکا اور چلتا بنا —" اسی روز اکرم مریم کو ساتھ لے کر جانے لگا تو میں پوچھ بیٹھی وہ کہاں جا رہا ہے۔ اس نے کوئی جواب دیے بغیر مریم کو ساتھ لیا اور چلا گیا — وہ دونوں شام کو واپس آئے تو میں نے اکرم سے پوچھا کہ وہ کہاں تھے؟ مجھے ننھی مریم پر ترس آ رہا تھا اور فاطمہ سچ پوچھو تو پہلی بار میرے دل میں اکرم کے لیے بھی نفرت پھوٹ پڑی تھی — "میں ذرا پاکستانی سفارت خانے چلا گیا تھا" اس نے مجھے بتایا۔ — "مجھے اپنے پاسپورٹ کے سلسلے میں کام تھا۔" میں نے کچھ زیادہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ اور بات اِدھر اُدھر ہو گئی۔"

مائیبرٹ نے پیکٹ سے سگریٹ نکالا اور اُسے سلگانے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ سگریٹ سلگا کر اس نے ایک لمبا کش لیا اور بولی۔ "ایک دن میری ماں نے مجھے فون کیا — وہ بڑی سخت بیمار تھی اور مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ میں نے اکرم سے بات کی تو اُس نے مجھے ماں کے ہاں جانے کا مشورہ دیا۔ میری ماں ہلسنگور میں رہتی تھی۔ میں نے مریم کو بھی ساتھ لے جانا چاہا تو اکرم نے یہ کہہ کر "ماں کی تیمارداری کروگی یا مریم کو سنبھالوگی" مریم کو میرے ساتھ جانے سے روک دیا۔ جب اُسے راضی کرنا ممکن نہ رہا تو میں اکیلی ہی ماں کے پاس چلی گئی — مجھے دیکھ کر وہ خوش تو ہوئی، لیکن اُسے افسوس تھا کہ مریم کیوں ساتھ نہیں آئی تھی۔ میری ماں کافی کمزور تھی اور بستر سے اُٹھنے میں بھی اُسے مشکل کا سامنا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ اگر میں رات اُسی کے ہاں ٹھہر سکوں۔ میں نے اکرم کو فون کر کے ماں کی خواہش کے بارے میں بتایا تو اس نے فوراً ہی اجازت دے دی۔ "تمہیں ماں کی دیکھ بھال کرنی ہی چاہیے۔ مریم کا فکر نہ کرو — میں اس کا خوب خیال رکھوں گا۔ اور ہاں دیکھو کل ویک اینڈ ہے اور ویسے بھی ہمیں کچھ کرنا تو ہے نہیں۔ تم ہفتہ اور اتوار وہیں ماں کے پاس رہو — اتوار کی شام کو واپس آ جانا —" وہ بہت ہی مہربان لگ رہا تھا اور اس کی آواز میں شیرینی بھی تھی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اُسے مریم کا خیال رکھنے کو کہتے ہوئے خود اتوار کی شام واپس لوٹ آنے کا بتایا۔ — فاطمہ! یہ میری بدقسمتی کا فیصلہ تھا — کاش میں ماں کے پاس نہ رُکتی۔" یہ کہتے ہوئے مائیبرٹ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے — "اتوار کے روز میں نے اکرم کو فون کر کے بتانا چاہا کہ میں واپس گھر آ رہی ہوں لیکن جب میں نے فون کیا تو وہاں کوئی جواب دینے والا نہ تھا۔ میں نے سمجھا وہ باپ بیٹی کہیں باہر گئے ہوں گے۔ میں نے اپنی ماں کو خدا حافظ کہا اور ریل گاڑی پکڑ کر واپس گھر آ گئی — دروازے پر گھنٹی بجائی تو بھی کوئی جواب نہیں تھا — میں نے دروازہ کھولا اور گھر میں داخل ہوئی تو وہاں کا نقشہ دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے — پورے گھر میں سامان اِدھر اُدھر بکھرا پڑا تھا — ننھی مریم کا کمرہ تو یوں لگ رہا تھا گویا وہاں چور صفائی کر گئے تھے۔ میں پاگلوں کی طرح اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور اکرم و مریم کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ پولیس کو فون کروں یا نہ کروں۔ ابھی کوئی دس پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ دروازے پر گھنٹی بجی۔ میں نے سمجھا اکرم اور مریم ہوں گے۔ دیوانہ وار آگے بڑھ کر میں نے دروازہ جو کھولا تو میرے سامنے وہی مُلّا کھڑا تھا جو اکرم کے پاس آتا رہتا تھا۔ میں نے اس کی صورت دیکھتے ہی اُسے اندر نہ بلانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ "اکرم گھر پر نہیں ہیں" میں نے اُسے بتایا — "ہاں، مجھے معلوم ہے" وہ بولا۔ "میں تمہیں یہی تو بتلانے آیا ہوں کہ اکرم اور مریم کل ہفتہ کے روز پاکستان چلے گئے تھے۔" زمین میرے پاؤں تلے سے کھسک رہی تھی اور میں

ایک طرح سے چکرا کر دروازے کی دہلیز سے لگ گئی تھی۔ "اچھا میں چلتا ہوں۔" اس نے کہا اور اس سے پہلے کہ میں اس سے پوچھتی کہ مجھے بتلائے بغیر اکرم مریم کو ساتھ لے کر کیسے چلا گیا اور اس نے یہ سب کچھ کیوں کیا۔ لیکن مجھے یہ سب کچھ پوچھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ وہ مُلّا تیزی سے سیڑھیاں اُتر کر جا چکا تھا۔

فاطمہ "۔ مائیبرٹ نے رُکتی ہوئی سانس اور بڑھتی ہوئی ہچکیوں کے ساتھ مجھے مخاطب کرتے ہوئے میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"مریم کو مجھ سے جدا ہوئے دو سال ہونے کو ہیں۔" میں نے محسوس کیا اُس کے ہاتھ برف کی مانند ٹھنڈے تھے۔ ایش ٹرے میں پڑا ہوا اس کا ٹکڑا ویسے ہی دھواں دے رہا تھا۔ "میں نے اکرم اور مریم کو تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ لاہور کا رہنے والا تھا۔ میں ایک مرتبہ لاہور بھی جا چکی ہوں۔ وہاں نہ تو پولیس نے میری مدد کی اور نہ ہی کسی اور نے۔ میں دفتروں، پولیس کے تھانوں اور گلیوں میں مہینہ بھر خوار ہو کر واپس لوٹ آئی۔ اکرم جاتے ہوئے اپنے تمام نشان مٹا گیا تھا۔ اور وہ تصویر جو شیلف پر ٹرافی کے ساتھ پڑی ہوئی دیکھ رہی ہو، بس یہی ایک باقی ہے۔ یہ سونے کے کمرے میں الماری کے اوپر دھری رہتی تھی۔ شاید اسی لیے اکرم کے ہاتھوں بچ گئی ——— وہ تو مریم کا فوٹو البم بھی ساتھ لے گیا ہوا ہے ——— میں اکرم کے سوا یہاں کسی اور پاکستانی کو جانتی ہی نہیں۔ اُس نے مجھے کبھی کسی سے ملایا ہی نہیں تھا۔ وہ تو بس اپنی ہی دنیا کا تھا۔ میں نے اب یہاں کئی پاکستانی دکانوں اور دوسرے پاکستانیوں کو بھی یہ تصویر دکھائی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی تو اسے پہچانتا نہیں ———" مائیبرٹ اب زار و قطار رو رہی تھی اور اُس کے آنسو میرے ہاتھوں پر گرنے لگے تھے۔ "فاطمہ! وہ مُلّا جو ہمارے گھر میں آیا کرتا تھا، میں اس کی تلاش میں ہر جمعہ کے روز کئی بار مسلمانوں کی مسجد بھی گئی ہوں۔ لیکن مریم کے "اغوا" کے بعد میں نے اُسے کبھی دیکھا ہی نہیں ——— تمہیں بتاؤ، میں کیا کروں، کدھر جاؤں؟" مائیبرٹ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم میری مدد نہیں کر سکتی ہو۔ تم تو کئی پاکستانیوں کو جانتی ہو گی۔ کسی سے پتہ کر دیکھو۔ شاید اس مُلّا ہی کے بارے میں کچھ اتہ پتہ چل جائے۔" مائیبرٹ کے پھر آنسو گرنے لگے تھے۔ اور خود میرے ہونٹ بھی کانپ رہے تھے۔ میں اُسے کس طرح بتاتی کہ جس آگ میں وہ جل رہی ہے، ممتا کی وہی چتا مجھے بھی تو جلا رہی ہے ——— عابد نے بھی ہمارے دونوں بچوں کو پاکستان بھجوایا ہوا تھا۔ اُس کے خیال میں ہماری ساری کمائی یہاں ڈنمارک میں ان کے اخراجات پورے کرنے پر اُٹھ جاتی تھی۔

میری خاموشی کو توڑتے ہوئے مائیبرٹ بولی ——— "فاطمہ! میرا یقین ہے کہ تم میری ضرور مدد کر سکتی ہو۔" میرا وہاں دم گھٹنے لگا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے میرے اپنے بچوں کی تصویریں آ گئی تھیں اور اس سے پہلے کہ میرے آنسو ان تصویروں کو دُھندلا دیتے میں نے مائیبرٹ کو تسلی دیتے ہوئے اس سے اجازت چاہی ——— اپنا اوورکوٹ اُٹھایا اور گھر لوٹ آئی۔

عابد مجھ سے پہلے گھر آ چکا تھا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا دن بھر کی کمائی ہوئی اپنی رقم گن رہا تھا۔ مجھے وہ اب ایک "بردہ فروش" لگ رہا تھا۔ جو اپنے ہی بچوں کو فروخت کر آیا ہو۔ ○

بقیہ: مولانا ابوالکلام آزاد

"..... ان کے مقدمہ کی نسبت کوئی غلط توقع لوگ نہ باندھ لیں۔ یہ قطعی ہے کہ انہیں سزا دی جائے گی۔ لوگوں کو چاہیے کہ پورے نظم و سکون کے ساتھ اس کے سُننے کے لیے طیار رہیں۔"

اس پیغام کا حیرت انگیز اثر ہوا جس کی کسی کو اُمید نہ تھی۔ مجسٹریٹ نے ۹ فروری بارہ بجے فیصلہ سنایا:

"میں ملزم کو حسبِ دعویٰ استغاثہ مجرم پاتا ہوں اور زیرِ دفعہ ۱۲۴۔ الف تعزیراتِ ہند ایک سال قیدِ بامشقت کی سزا دیتا ہوں۔"

یہ دَور جس قدر مولانا آزاد کی زندگی میں اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ ہندوستان کی سیاست اور جنگِ آزادی کے لیے اہم ہے۔ ہندوستان ذہنی غلامی کی زنجیروں، مذہبی اختلافات کے گمراہ کن حالات اور خوف و ہراس کے ماحول سے نکل کر اتحاد، اتفاق، حب الوطنی اور آزادی کے نئے تصوّر میں داخل ہو رہا تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی جڑیں مضبوط ہو رہی تھیں۔ خلافت کانفرنس بڑی طاقت اور توانائی کے ساتھ ابھری تھی۔ سارے ملک میں ایک نیا جوش و ولولہ، ہمت و حوصلہ، خود شناسی اور خود اعتمادی کا دَور دورہ تھا۔ وطن کے لیے ایثار و قربانی، ہم وطنوں کے لیے اخلاص اور بھائی چارگی اور رہنماؤں کے لیے احترام و اعتماد کا جذبہ ہر طرف پھیل رہا تھا۔ ایسے سازگار ماحول کو کارساز بنانے میں خصوصیت سے ہمارے دو عظیم رہنماؤں گاندھی جی اور ابوالکلام آزاد کی بلند آواز، بلند ہمت، یقین محکم، اولوالعزمی، بے خوفی، جاں نثاری اور وطن پرستی نے بڑا اہم کام کیا اور حب الوطنی کو نئی طاقت اور جنگِ آزادی کو نئی قوت عطا کی ——— ان رہنماؤں کی وجہ سے غلام ہندوستان کے بسنے والوں میں جواں ہمتی، نئی توانائی وطن کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے ہر طرح کے مصائب اور مشکلات کو جھیل جانے اور ان سے مسکراتے ہوئے گزر جانے کا عزم اور حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ یہی اس دَور کی سب سے بڑی جیت تھی جو تیز رفتاری سے آزاد ہندوستان کے حصول میں مددگار رہی تھی اور ہر قدم آگے کی طرف بڑھا رہی تھی اور منزل کو پا لینے کا یقین پیدا کر رہی تھی۔ ○○

ایس۔ایس۔چاولہ



عشقِ صادق

نیلو کی یہ بات سُن کر ـــــ

دل تو چاہتا تھا کہ میں فوراً اُٹھ کر چل دوں۔ لیکن رات بھر کے لیے رُک گیا۔ اگلی صبح میں پہلی بس سے لاہور واپس آ گیا تھا۔ اس نے پیستان ختم کی اور ہم کھانے کے لیے اندر چل دیے تھے۔ اُردو کا ایک رسالہ میرے ہاتھ میں تھا۔

میں میسور سے بنگلور آ رہا تھا۔ بس منڈیا میں رُکی۔ وہاں بس رُکتی تو نہیں تھی، مگر پتہ چلا کہ ٹرانسپورٹ ڈپارٹمنٹ کے ایک بہت بڑے افسر کے لیے بس روکی گئی ہے۔

یہ بڑی باوقار شخصیت تھی۔ وہ میرے ساتھ والی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ چھ سات اہل کاروں نے ہاتھ جوڑ کر اُن سے رُخصت لی۔

بس پھر روانہ ہو گئی۔ اس نے مجھ سے پوچھا: "کیا آپ اُردو پڑھ لیتے ہیں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ بولا: "کیا میں یہ رسالہ دیکھ سکتا ہوں؟"

میری آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ میں نے رسالہ اس کی طرف بڑھا دیا اور بس کے جھولے میں جھولتا نیند کی آغوش میں سما گیا۔

ڈیڑھ گھنٹے کے بعد بس رُکی۔ آنکھ کھُلی تو دیکھا لوگ ناریل کا پانی بڑے شوق سے پی رہے تھے۔ وہ حضرت میرے لیے ایک ناریل لے آئے۔ میں نے پیسے دینے چاہے تو بولے: "یہ میرا علاقہ ہے۔ اگر میں کچھ خرچ کروں گا تو آپ سے ضرور لے لوں گا۔" اس نے اپنا نام محمد سلیم بتایا تھا۔ بس چلی تو باتیں شروع ہو گئیں۔ اس نے کہا: "میں نے رسالہ پر آپ کا لکھا ہوا نام پڑھا ہے۔ کیا آپ اردو میں لکھتے بھی ہیں۔"

میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ اُس نے کہا: "سردار صاحب، میں آپ کو اپنی کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ مگر بس میں نہیں۔ کیا آپ بنگلور میرے گھر چل سکیں گے۔ کھانا بھی ساتھ ہی کھا لیں گے۔ آپ میری کہانی ضرور لکھیے، مگر میرا نام نہیں آنا چاہیے۔"

میں نے کہا: "میں تھوڑی دیر کے لیے ہوٹل میں جانا چاہوں گا تاکہ معلوم کر سکوں کہ میرے نام وہاں کوئی ضروری پیغام تو نہیں آیا رکھا۔ ہم دونوں پہلے ہوٹل آئے۔ پھر اس کے گھر چلے گئے۔ کیا خوب صورت بنگلہ تھا۔ اس کی بیگم ایک کالج میں پرنسپل تھی۔ ایک لڑکا ڈاکٹری کے فائنل ایئر میں تھا اور دوسرا لڑکا ڈاکٹری کے دوسرے سال میں تھا۔ اس کی بیٹی ابھی اسکول پڑھ رہی تھی۔ کھانے میں ابھی دیر تھی۔ بنگلور کا موسم بہت خوش گوار تھا۔ ہم لان میں بیٹھ گئے ـــــ اُنہوں نے اپنی کہانی شروع کی۔

اُن دنوں میرا چڑھتی جوانی کا زمانہ تھا۔ باپ بے حد امیر تھا۔ بے فکری تھی۔ زندگی کا ہر لمحہ سرسبز و شاداب، میں پڑھائی ضرور کرتا تھا۔ مگر زیادہ دلچسپی اسپورٹس میں تھی۔ اُنہی دنوں جوانی کی باڑھ کنارے توڑ کر بہہ نکلی۔ دل، دماغ اور جسم کا ہر انگ چاہتا تھا کہ کسی کو چاہا جائے۔ کسی کو اپنا بنا لیا جائے۔ نظریں صرف کسی اپنے کو دیکھنے کے لیے اشتیاق سے اُٹھتی تھیں۔ ناکام ہو کر نیچی ہو جاتی تھیں۔

ایسے میں میری نظر نیلم پر پڑی۔ وہ اپنے رشتہ داروں ہی میں تھی۔ اس کے والد ایک سرکاری دفتر میں کلرک تھے۔ نیلم کو پہلے بھی کئی بار دیکھا تھا۔ اب کی بار اُسے چھ ماہ کے بعد دیکھا تھا۔ اب کے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے اُس کے جسم کے ہر حصہ میں پارہ بھر گیا ہو۔ وہ ہر دم تھرکتا رہتا تھا۔ حُسن اور جوانی کا میل غضب ڈھا رہا تھا مجھے ایسا لگا جیسے راہی کو منزل مل گئی ہو۔ دل کو قرار آ گیا تھا۔

نیلم کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے ہر دم رہتی تھی۔ کسی اور کام میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔

جب میں بے بس ہوگیا تو میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں نیلو کو ایک بار ضرور اپنے دل کی داستان سناؤں گا۔ اب میں موقع کا منتظر تھا کہ کب وہ مجھے گھر میں اکیلی ملے۔ اور ایک بار مجھے یہ موقع مل ہی گیا۔ میں نے اپنے درد دل کی داستان شروع کر دی۔ وہ حیران آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا نیلو میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔

اُس نے کہا لوٹی (یہ میرا پیار کا نام ہے) یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔ اگر کسی نے ہمیں دیکھ لیا تو مصیبت آ جائے گی۔ میں نے کہا نیلو، میں نے تو اپنی چاہت کا اظہار کر دیا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ جو بھی خط میں تمہیں لکھوں، اُس کا جواب تم ضرور دو گی۔ اگر تم وعدہ کرو تو میں چلا جاؤں گا ورنہ میں یہیں پر تمہارے سامنے خودکشی کر لوں گا۔ میں نے ایک رام پوری چاقو نکال کر اُسے کھول کر اپنے پیٹ پر رکھ لیا۔ اُس نے کہا۔ اچھا بابا، میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں تمہارے خط کا جواب دے دیا کروں گی۔ اگر یہ خط پکڑے گئے تو تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا کیونکہ تم امیر ماں باپ کے بیٹے ہو۔ میں غریب والدین کی بیٹی مُفت میں ماری جاؤں گی۔ میں نے کہا کہ میں کوئی ایسا راستہ نکالوں گا کہ ہماری خط و کتابت ہمیشہ ہی راز میں رہے گی۔ بہت سوچ کے بعد میں نے اپنی کئی کتابوں کی دوہری جلدیں بنوائیں۔ جن میں خط آسانی سے چھُپ سکتا تھا۔

اس کے خطوط سے میں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ نیلو بھی مجھے بے حد چاہتی ہے۔ نیلو کو اپنانے کے لیے میں اب پڑھائی دل لگا کر کرنے لگا تھا۔ تاکہ میں پڑھ لکھ کر کچھ بن سکوں اور پھر نیلو کا ہاتھ تمام عمر کے لیے تھام لوں۔"

انسان کچھ سوچتا ہے مگر قسمت میں لکھا کچھ اور ہوتا ہے۔ اچانک ملک کی فضا بگڑ گئی۔ ایک مُلک دو ملکوں میں بٹ گیا۔ نیلم کے والدین اور کئی رشتہ داروں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ پاکستان چلے جائیں گے۔ اُن کے پاکستان جانے سے دو دن پہلے میں اور نیلو ملے تھے۔ آنسوؤں کی برسات کے سائے تلے ہم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے وفادار رہیں گے۔ زندگی بھر کے لیے۔ ہم ایک دوسرے کو کبھی نہیں بھولیں گے۔ جیسے زلزلہ آنے سے شہر تباہ ہو جاتا ہے۔ بس ایسی ہی حالت میری نیلم کے چلے جانے کے بعد تھی۔ دل ٹوٹ گیا تھا۔ زندگی کا ہر رنگ بکھر گیا تھا۔ میں جینے سے بیزار ہو گیا تھا۔ ایسی حالت کئی ماہ تک رہی۔ پھر وقت نے آہستہ آہستہ زخم بھرنے شروع کر دیے تھے۔

میں نے پڑھائی ختم کر دی۔ اچھی نوکری مل گئی۔ شادی کے لیے رشتے آنے لگے۔ میری رائے پوچھی جانے لگی۔ میں منہ پھاڑ کر تو نہیں کہہ سکتا تھا، مگر ایک رشتہ دار کے ذریعے میں نے اپنے دل کی بات اپنے والدین تک ضرور پہنچا دی تھی۔

اُنہوں نے میری بات پر غور کیا۔ بڑی ہمدردی جتائی اور کہا کہ لڑکی ہر طرح سے اچھی ہے۔ مگر دونوں ملکوں کے حالات ایسے نہیں۔ آنا جانا بے حد مشکل ہے۔ ایسے میں شادی کی بات کیسے ہو سکتی ہے۔ ہاں اگر وہ لوگ پاکستان نہ جاتے تو وہ نیلم کو ضرور اپنی بہو بنا لیتے۔ اپنے گھر میں تو آپ من مانی کر سکتے ہیں، جہاں ملکوں کا معاملہ ہو، وہاں ذاتی چاہت تو سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہے۔

پھر میری شادی ہو گئی۔ بچے آئے۔ میں زندگی میں ترقی کرتا چلا گیا۔ میرے دل میں بس ایک خلش تھی کہ میں ایک بار نیلو کو مل سکوں۔ میری نیلو اب کیسی ہو گی؟ کیا اُس کی شادی ہو گئی ہو گی؟ اتنی خوب صورت لڑکی کا شوہر کیسا بانکا، خوب صورت سجیلا نوجوان ہوگا۔ اس کو ضرور اچھا گھر ملا ہوگا۔ اس کے کتنے بچے ہوں گے؟ خیالات کا یہ سلسلہ کبھی اتنا زور پکڑ لیتا کہ میرا دل تڑپ اُٹھتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ کیوں نہ میں ایک چکر پاکستان کا لگا آؤں۔ اپنے رشتہ داروں کو بھی مل آؤں اور نیلو کو بھی ایک بار دیکھ آؤں۔

اور جب میں اپنی خواہش پر قابو نہ پا سکا تو میں نے پاکستان جانے کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ ویزا بھی کسی طرح حاصل کر لیا۔ بیوی بچوں نے پاکستان سے کافی سامان لے آنے کی مانگ کی تھی۔ میں امرتسر پہنچا۔ وہاں سے گاڑی پکڑی اور لاہور پہنچ گیا۔ کئی رشتہ دار اسٹیشن پر موجود تھے۔ دو دنوں کے بعد مجھے پتہ چلا کہ نیلو آج کل سیالکوٹ میں ہے۔ رشتہ داروں کی مدد سے سیالکوٹ کا ویزا حاصل کیا۔ میں نے بس پکڑی اور سیالکوٹ پہنچ گیا۔ نیلو کا گھر اناج منڈی کے قریب تھا۔ کافی سال بیت گئے تھے مگر آٹے اور چاول کی مل کا نام آج بھی سردار سجن سنگھ کی مل ہی کے نام سے مشہور تھا۔ اس مل کے سامنے ایک چھوٹی سی گلی جاتی ہے۔ اس گلی میں تھوڑی دُور جا کر دائیں ہاتھ ایک چھوٹی سی گلی نکلتی ہے جس کی نالی میں دن کے وقت گرم پانی کسی فیکٹری سے نکل کر ملتا رہتا ہے۔ اس گلی کے سامنے کے مکان میں کبھی سردار رام سنگھ آہلو والیہ اور ان کی بیوی شریمتی رام پیاری اپنے خاندان سمیت رہتے تھے۔ دونوں خدا کی بندگی کرنے والے انسان تھے۔ سو آج بھی اس مکان کی نشاندہی ان کے نام سے ہو سکتی تھی۔ یہ مکان بہت پرانا اور آج کے حساب سے چھوٹا سا تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک چھوٹی سی بچی نے دروازہ کھولا۔

میں نے پوچھا کہ یہ مکان جاوید میاں کا ہے؟ اُس نے ہاں میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے ابا اور امی گھر پر ہیں ——

اُس نے کہا کہ امی گھر پر نہیں ہیں۔ میں نے دالان کے اندر قدم رکھ دیے اور کہا کہ جاؤ امی کو بلا لاؤ۔ میرا دل راکٹ کی تیزی سے دھڑک رہا تھا، جس کو ملنے کے لیے میں اتنے برسوں سے بے تاب تھا۔ اب وہ میرے سامنے آنے والی تھی۔ اب وہ کیسی لگتی

ہوگی۔

سوکھے جسم، پچکے گال، گالوں پر لالی کی بجائے گہرا پیلا پن، بکھرے بال، میلے معمولی لباس میں نیلو میرے سامنے کھڑی تھی۔ جیسے تیز رفتار چلتی گاڑی پٹری سے اُتر کر بکھر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی میرا دل نیلو کو دیکھ کر ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کہا۔ نیلو! کیسی ہو؟ اُسے پہچاننے میں دیر لگی تھی۔ مگر آواز سُن کر وہ بولی۔ "لوٹی۔ یہ آپ ہو۔ خدا کا شکر ہے اور آج کا دن مبارک ہے کہ تمہارے درشن ہوئے ہیں۔ اپنوں کو تو ملے مدتیں ہو گئیں۔ ہم ڈرائنگ روم میں آئے۔ یہاں پر تین پرانے طرز کی کرسیاں تھیں اور ایک بے ڈھنگی سی لکڑی کی میز تھی۔ نیلو نے کہا آپ ذرا بیٹھیں۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔ میں نے کہا کہ مجھے چائے کی خواہش نہیں۔ وہ چلی گئی۔ دس منٹ کے بعد جب وہ دوبارہ آئی تو اُس نے کپڑے بدل لیے تھے۔ بال سُلجھ گئے تھے۔ مگر وہ اپنی کمزوری کو کیسے چھپاتی؟

باتیں شروع ہوئیں۔ وہ ایک اسپورٹس فیکٹری میں کلرکی کرتے ہیں۔ اپنے علاقے کے ہی ہیں۔ پاکستان آکر ہمیں بہت مشکلیں اُٹھانی پڑی تھیں۔ تب ماں باپ نے ایک اچھا میٹرک پاس لڑکا دیکھا۔ جاوید کے خاندان کو جہیز کا لالچ نہ تھا۔ شادی ہو گئی۔ جاوید میاں میرا بڑا دھیان رکھتے ہیں۔ بہت پیار کرتے ہیں۔ پھر نیلو نے تھوڑی سی شوخی سے کہا کہ یہ اُن کے پیار کا نتیجہ ہے کہ آج میں سات بچوں کی ماں ہوں۔ میرے جسم کی تمام طاقت ان بچوں کو پیدا کرنے اور اُن کی پرورش کرنے میں لگ گئی ہے۔ تم اپنی سناؤ۔ میں نے کہا کہ میں تو صرف تمہیں ملنے آیا ہوں اب۔

مجھے ڈر تھا کہ بڑے بچے اسکول سے نہ آ جائیں یا جاوید میاں نہ پہنچ جائیں اور میں دل کی بات نہ کر سکوں سو میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا کہ نیلو، کیا تم نے مجھے کبھی یاد کیا ہے؟

وہ شرما گئی۔ اس نے کہا کہ میں آپ کو بھولی کب تھی۔ میری ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ تمہیں کسی نہ کسی بہانے یاد کرتی رہوں۔ بار ہا دل میں تڑپ اُٹھی کہ کاش ایک بار میں تمہیں پھر مل سکوں۔

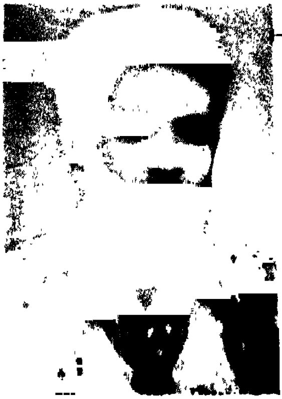
یہ سُن کر میں کتنا خوش ہوا تھا۔ اُس نے کہا کہ میں اپنے کسی بچے کا نام سلیم نہ رکھ سکتی تھی۔ میں بے بس تھی۔ بچوں کے نام رکھتے وقت میری ایک نہ چلی۔ سب بچوں کے نام میرے میاں یا اُن کے گھر والوں نے رکھے ہیں۔

گھر میں بچے آتے گئے۔ آمدنی اس حساب سے نہ بڑھی تھی۔ ہاتھ ہمیشہ تنگ رہتا تھا مگر میں نے بھی ضد پکڑ لی تھی کہ گھر میں ایک کتّا ضرور رکھنا ہے۔ اب نہ معلوم کتنے کتّے آئے اور چلے گئے۔ کئی مر گئے۔ مگر ایک کتّا ہمیشہ میرے پاس رہا اور تمہاری یاد میں، میں نے ہر کتے کا نام لوٹی رکھا۔ ایسے لوٹی کو ہمیشہ اپنے پاس رکھا، پیار کیا اور ایسے تم ہمیشہ میری نظروں کے سامنے رہے اور تمہارا نام بار بار میرے لبوں پر آتا رہا۔

نیلو نے تو اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھ دیا تھا۔ مگر یہ میرے تصور میں بھی نہ تھا کہ میرا اتنے برسوں میں پروان چڑھا ہوا ایک شیشے کی طرح گر کر ایسے ہزاروں ٹکڑوں میں بٹ جائے گا۔ بکھر جائے گا۔

سی امام سعوں

ساتھی



ہال میں داخل ہوتے ہی نجمہ نے گھر کا ماحول بدلا ہوا پایا۔ ورنہ آج سے پہلے جب بھی وہ باپ سے ملنے آئی تھی، گھر کو کباڑ خانہ ہی پایا تھا، کوئی سامان تو اُسے قرینے سے رکھا ہوا ملتا نہ صوفوں کے تکیوں پہ باپ کے کپڑے، کرسی کے کنارے پہ بھی دھول، ٹیلی ویژن کی بالائی سطح پر گرد، قمیصوں کے بٹن ندارد، پتلونوں کی سلائی ادھر اُدھر سے اُدھڑی ہوئی، بیڈ روم اور کچن کا حال اور بھی بُرا۔ تکیوں پر تیل کے دھبے اور باپ کی گردن کا میل، چادریں میلی کچیلی۔ غرض قرینے سے کوئی سامان اُسے گھر میں نظر نہ آتا۔ بکھری بکھری ان اشیا پر نظر پڑتے ہی اُسے اپنے دونوں بھائیوں پر غصہ آنے لگتا۔ جب وہ اپنی حدود سے گزر رہا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے۔ باپ کے لیے اس کے دل میں بے پناہ ہمدردی کا جذبہ اُمڈتا۔ بھیگی آنکھوں سے باپ پہ ایک نگاہ ڈالنے کے بعد وہ دوپٹہ کمر کے گرد لپیٹتی اور گھر سنوارنے میں جُٹ جاتی۔ باپ چند لمحوں تک تو اُسے غور سے دیکھتا پھر ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے اس سے کہتا۔

"رہنے دے بچہ... تو... تو مجھ سے ملنے آتی ہے یا...

"بس پاپا.... ایک منٹ..... میں ایک منٹ میں سب ٹھیک کر دوں گی، پھر... پھر آپ کو چائے پلاؤں گی۔ چائے.... لبریز اور لب سوز۔

لبریز اور لب سوز کی ادائیگی کے لمحاتی وقفے میں باپ اور بیٹی کی نگاہیں ضرور ملا کرتی تھیں اور فوراً ہی دونوں کو کچھ یاد بھی آ جایا کرتا تھا۔ نجمہ محسوس کرتی وہ مئی کی جلتی دھوپ میں کھڑی ہے اور اس کا باپ اپنے گھٹنوں میں شدید درد محسوس کرنے لگتا تھا۔ نگاہوں کے اس لمحاتی تصادم کے بعد دونوں ہی کی آنکھوں سے گنگا جمنا بہہ نکلتی باپ سر جھکائے تھکا ماندہ صوفے کی طرف بڑھا کرتا تھا اور نجمہ کچن میں کھٹر پٹر شروع کر دیتی۔ شکر اور چائے کی برنیاں، چمچے، فرائی پان، سنے ہوئے برتن اُس کے ہاتھ طوفانی رفتار سے چلتے۔ دم سے برتنوں اور واش بیسن کو چمکانے کے بعد وہ چولہے پر چائے کا پانی چڑھا دیتی۔ پانی کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی کھولتی..... اور دو منٹ بعد وہ باپ کے روبرو چائے کی ٹرے لیے کھڑی ہوتی۔ لبوں پہ ایک مجروح تبسم سجائے۔

"چائے.... پاپا.... لبریز اور لب سوز۔

اس تبدیلی پر بھی وہ حیران ہو گئی۔ آج لبریز اور لب سوز کے درمیانی وقفے میں اس کے دل میں تو یقیناً اتھل پتھل ہوئی تھی۔ لیکن باپ کے رویے میں آج اُس نے واضح تبدیلی محسوس کی تھی۔ بس ایک پل کے لیے اُس نے باپ کی آنکھوں میں کسی سائے کو لہراتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور اس کے بعد اُس نے باپ کی آواز سُنی تھی۔ بیٹھو۔

"بیٹھو۔"

باپ سامنے صوفے پر بیٹھ کر گرم گرم چائے کی پیالی ہونٹوں کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔

"شکر اور طاہر.....

بات مکمل نہ ہو سکی تھی کیونکہ گرما گرم چائے سے اُس کے ہونٹ جل اُٹھے تھے۔ اُس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے باپ کی طرف دیکھا، وہ غور سے اُسی کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے دوبارہ باپ کی آنکھوں میں جھانکا۔ شاید وہ اُسی سائے کو تلاش کر رہی تھی جو پل بھر پہلے اُسے نظر آیا تھا لیکن اب..... اب تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ بس وہ اُسے دیکھ رہا تھا۔ دیکھتا رہا۔ پھر اپنے شوہر کی خیریت دریافت کرتے ہوئے وہ اپنے لہجے کو گنگنانے لگا

"وہ دونوں کبھی آتے رہتے ہیں"

"پہنچوں۔"

ایڈریس تو تفصیل "سیزن لوک" ۴۴ نیپین سی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۶

باپ نے لفافے پرسے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا اور صوفے پر کچھ اور پھیل گیا۔

" پاپا..... میں..... میں کچھ.....

اُس نے اپنا وہ مدعا بیان کرنے کی کوشش کی، لیکن فوراً ہی اپنی رشتے کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اُس نے ارادہ بدل دیا۔

"کچھ پوچھنا چاہتی ہو؟"

باپ نے سوال کیا تھا سیدھا سا ــــ

یا ــــ لوہے کی گرم سلائی اُس کے کانوں میں اُتار دی تھی۔ وہ فیصلہ نہ کرسکی۔ ذہن کے کونے کھدرے میں بھائیوں، بھاوجوں اور چھوٹی بہن کا وجود کن کھجورے کی طرح ہاتھ پَیر مارنے لگا۔ باپ کے سپاٹ انداز میں پوچھنے پر وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔ ایک دفعہ پھر اُسے اپنے بھائی بہن اور بھاوجوں پہ غصہ آیا۔ ان ہی کے اصرار پر تو آج وہ میکے آئی تھی۔

دو روز قبل جب اُس کے دونوں بھائی اور چھوٹی بہن اُس کے گھر اکٹھا ہوئے تھے اور بھائی بھاوجوں نے اُسے نئی صورتِ حال سے آگاہ کیا تھا تب بلا تاخیر اُس نے بھائیوں کو بے نقط سنائی تھی۔ اُس نے واضح طور پر جتا دیا تھا کہ اس نئی صورتِ حال کی تمام تر ذمہ داری تم لوگوں پر عائد ہوتی ہے۔ پہلے تو وہ سب سر جھکائے بڑی بہن کی لتاڑ سنتے رہے تھے پھر دفاع کی کوشش شاکر کی بیوی نے کی تھی۔

"آپ سمجھنے کی کوشش کریں باجی.....

اب زمانہ بدل گیا ہے۔"

"کیا بدلا ہے؟"

اُس نے چبھتے ہوئے انداز میں فوراً پوچھا تھا۔

"یہ زمین۔ وہ آسمان۔ میں۔ سلمیٰ یا پاپا۔

کیا بدلا ہے؟"

"مگر

"کچھ نہیں بدلا۔ بدلا ہے تو یہ خبیث اور یہ..... اسے تم نے بدلا ہے تم نے سُن رہی ہو نا۔"

"باجی تم تو بات کا بتنگڑ بنا رہی ہو۔"

چھوٹی بہن سلمیٰ نے بات کا رُخ بدلنے کی خاطر مداخلت کی تھی تو نجمہ نے اُسے بھی لتاڑ دیا تھا۔

"چُپ رہ۔ آج ان سوروں کی وکالت کر رہی ہے۔ تب سہمی سہمی سی دیکھا کرتی تھی۔ کیوں سلمیٰ۔" سہم کر چُپ ہوگئی تھی۔ ایک کے بعد ایک کئی مناظر اس کی آنکھوں میں گھوم گئے تھے۔ ماں کا جنازہ، طاہر کا ڈر و کنا، پھر اُس کا گلڈو لتا پکڑ کر چلنا۔ نجمہ کے رشتوں کی آمد اور اس پر نجمہ کا باپ سے اُلجھنا۔

"نہیں کرتی مجھے شادی۔ ابھی چھوٹا ہے ہی کتنا سا؟ اس کی دیکھ ریکھ کون کرے گا؟"

"میں کرلوں گا۔"

"آپ اکیلے کیا کیا کریں گے۔ نہیں پاپا۔ ابھی نہیں دو چار سال اور رُک جائیں۔ پہلے شاکر کا بیاہ ہوگا۔ اس کی دُلہن گھر سنبھال لے گی تب۔ تب کچھ سوچیے گا۔"

وقت کا گھوڑا دُلکی چلتے تھوڑی دُور ہی تو گیا تھا کہ بھابی جان آگئی تھیں اور کتنی تیزی سے ان کی بدولت گھر کی فضا مسموم ہوگئی تھی اور ایک دن بھابی جان، بھائی جان کو اپنے گھر لے گئی تھیں۔

"ٹھیک ہے باجی۔ ان کی غلطی تھی لیکن اب پاپا کو اس عمر میں شادی..... میرا مطلب ہے کچھ.....

"ان کی شادی پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔" طاہر نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیا تھا۔

"پھر۔"

"سُنا ہے اُنہوں نے کم سن لڑکی سے شادی کی ہے۔"

شاکر نے ایک ایک لفظ پہ زور دے کر نجمہ کے چہرے پر نظریں مرکوز کر دیں۔ اس انکشاف پر نجمہ کی تیوریاں چڑھی ہی تھیں کہ شاکر کی بیوی نے منہ کھولا۔

"یہ عمر اور کم سن لڑکی۔"

"تم اپنی زبان بند رکھو۔"

نجمہ اُس پر بھڑک اُٹھی۔ چند لمحے قہر آلود نظروں سے اُسے گھورتی رہی پھر زہریلے انداز میں اُس سے مخاطب ہوئی۔

"اس بڑھاپے میں انہیں شادی پر کس نے مجبور کیا؟ تم نے۔ نہ تم اسے الگ رہنے پہ اُکساتیں نہ یہ سوّر الگ ہوتا اور نہ پاپا تنہا ہوتے۔ میں جاتی رہی ہوں وہاں۔ کیسا اُجاڑ اُجاڑ سا لگتا تھا وہ گھر..... اور اب..... تم سب پاپا کے خلاف ایک محاذ قائم کر رہے ہو۔

"میں ایک بات پوچھوں باجی؟"

"ہاں پوچھو۔"

بیٹی سے نظریں چُراتے ہوئے باپ نے آہستگی سے کہا اور اس سے پہلے کہ نجمہ کچھ معلوم کرتی، دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ صوفے سے اُٹھی، دروازہ کھولا۔ دروازے کے اُس پار اُس کے بھائی بہن کھڑے تھے۔ سلام دعا کے بعد اُنہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں نجمہ سے باتیں کریں۔ پھر نگاہیں نیچی کیے باپ کے سامنے جا بیٹھے۔ باپ نے سب کی خیریت دریافت کی۔

"سب ٹھیک ہے پاپا..... آپ۔"

"میں.....

اُس نے لفافے پرسے نگاہیں ہٹا کر سب کو دیکھا۔ سلمیٰ اور نجمہ کے علاوہ سب کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

"تم نجمہ..... تم کچھ.....

نجمہ گڑبڑا گئی۔ اُس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ باپ سے کس طرح پوچھے کہ اُس نے شادی کیوں کی۔ کی تو کم سن لڑکی سے کیوں کی؟ وہ جانتی تھی کہ اُس کے پاپا اپنے شاکر اور اس کی بیوی کے چلے جانے کے بعد ایک دم بجھ گئے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر اُسے بے اختیار ہولڈر میں لگا ہوا وہ بلب یاد آجاتا جس کے تار ٹوٹ جاتے ہیں۔ بظاہر سالم نظر آنے والا بلب۔ ہلانے ڈلانے سے تار ملتے ہیں تو روشنی ہو جاتی ہے اور ایک ذرا سی آہٹ، ہوا کا ایک جھونکا تاروں کو پھر جدا کر دیتا ہے۔ باپ کے چہرے پہ مسکان کی روشنی اُس کے اور سلمیٰ کے دم سے تھی۔ اس وقت بھی بے اختیار اُسے ہولڈر میں ٹنگے بلب کی یاد آگئی، لیکن وہ محسوس

کر رہی تھی کہ تار ابھی نہیں ملے۔ آخر . . . . آخر وہ کس طرح پوچھے ؟

شاکر، طاہر، ان کی بیویوں میں اتنی جرأت کہاں تھی۔ کیوں کہ یہ مسئلہ تو ان کی ہی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

"آپ ".....

شاکر نے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے لیکن نظریں چار نہ کرتے ہوئے ہمت بٹور کر پوچھا۔

"سُنا ہے آپ نے شادی کر لی ہے"۔

جواب میں خاموشی پاکر سب ہی نے کنکھیوں سے باپ کو دیکھا۔ وہ شاکر کو دیکھ رہا تھا۔

"ہم نے یہ بھی سُنا ہے کہ آپ نے کسی کم سن . . . . .

اس مرتبہ باپ نے نجمہ کی طرف دیکھا دونوں کی نگاہیں ملیں۔ نجمہ نے دیکھا اس کے پاپا زیر لب مسکرا رہے تھے۔ چند لمحوں تک وہ مسکراتے رہے پھر اپنے نواسے کے گلے تھپتھپانے لگے۔ پل بھر میں نجمہ نے ایک فیصلہ کیا اور شاکر سے بولی۔

"اس گھر سے باہر نکلنے کے بعد تمہاری مت ماری گئی ہے"۔

باپ پھر مسکرایا تھا اور اس مرتبہ اس نے نواسے کو گدگدایا بھی تھا۔ نواسہ کھِل کھِلا کر ہنسا تو سب نے انکھیوں کے جھروکے سے نانا اور نواسے کو دیکھا۔

"نجمہ انہیں سب کو چار پلاؤ۔ لب ریز اور لب سوز"۔

کافی دیر بعد باپ کی آواز ہال میں گونجی۔ سلمیٰ نے سب کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں اور اس سے پہلے کہ اس کی آنکھوں سے بارش شروع ہوتی، وہ اُٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ شاکر، طاہر اور ان کی بیویوں نے اُسے کچن کی طرف جاتے دیکھا اور سر جھکا کر غور و فکر کی گلیوں میں کھو گئے — وہ چاروں ہی اپنے میں اخلاقی جرأت کی شدید کمی محسوس کر رہے تھے اور کمی کا احساس محض اس جُرم کے ردِ عمل کے طور پر پیدا ہوا تھا۔ جو ذاتی مفاد کی خاطر ان سے سرزد ہوا تھا۔ اپنے اپنے طور پر جینے کی خواہش اب ان سب کو بے مطلب اور مہوس سی لگ رہی تھی۔ چونکہ انفرادی طور پر وہ ایسی صورتِ حال سے دوچار ہونے کی توقع ہی نہ رکھتے تھے۔ لہٰذا اپنی الگ تھلگ دنیائیں آباد کرنے کی آرزو میں انھوں نے اُس ہستی کو، اُس کی تنہائی کو فراموش کر دیا تھا۔ جو آج بھی ان کی رگوں میں قوّت بن کر دوڑ رہی تھی۔

بس نجمہ اور سلمیٰ ندامت کے احساس سے مبرّا تھیں۔ کیوں کہ گھر کے بکھرے ہوئے شیرازے کی ذمّہ دار وہ دونوں نہیں تھیں۔ شاکر، طاہر اور ان کی بیویوں نے ایک دوسرے کو بھر من جھروکے سے دیکھا اور اس کے بعد نجمہ کو اپنی نظروں کا مرکز بنا کر سب کے سب اُسے دیکھنے لگے۔

سامنے صوفے پر خاموشی کا قفل اپنے ہونٹوں پہ ڈالے ان کا باپ اپنے لڑکوں اور ان کی دُلہنوں کو دیکھ رہا تھا۔ سب ہی اپنے اپنے طور پر سوچ وچار میں کھوئے ہوئے تھے کہ چپلوں کی کھٹ پٹ کی آواز نہیں سُنائی دی۔ سب سے پہلے نجمہ نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد شاکر، طاہر اور آخر میں بہوؤں نے۔ دروازے کے درمیان ایک ضعیفہ کھڑی تھیں۔ اپنا پوپلا سا منہ کھولے۔ ان کے باپ سے بھی سن میں کچھ نکلتی ہوئی سی۔

"آؤ آؤ۔ رُک کیوں گئیں۔ دیکھو تو۔۔ کون کون آیا ہے۔۔

بہت دنوں بعد نجمہ نے باپ کی آواز میں زندگی کی رمق محسوس کی۔ اپنے پاپا کا یہ لہجہ اُس نے بہت پہلے سُنا تھا۔

"اوہ نجمہ بٹیا ہے۔ شاکر او طاہر میاں بھی ہیں اور دلہنیں بھی۔

ضعیفہ نے ہاتھوں میں موجود تھیلیاں زمین پر رکھنے کے بعد قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ دوسرے ہی پل وہ نجمہ کے سامنے کھڑی تھیں۔ دونوں کی نظریں ملیں تو نجمہ غیر ارادی طور پر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ضعیفہ کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ اور ان کے دانتوں سے محروم مسوڑھوں پر نظر پڑتے ہی اس کے دل میں ہلچل مچی۔ اپنے جذبات پر قابو پانے کی اُس نے بھرپور کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ پہلے وہ سُسکی لینے لگی پھر بے اختیار ضعیفہ سے لپٹ گئی۔ ضعیفہ نے ایک ہاتھ سے اُس کی کمر تھپتھپاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اُس کے آنسو پونچھے تب نجمہ کی نگاہ باپ کے چہرے پر پڑی۔ اُس نے عرصہ بعد باپ کے چہرے پر زندگی سے معمور مسکراہٹ کو رقصاں دیکھا تو بے ساختہ اُسے ہولڈر میں ٹنگا وہ بلب یاد آ گیا جس کے تار ٹوٹ چکے تھے، لیکن اب جُڑے ہوئے سے نظر آ رہے تھے۔

○ ○

دلیپ سنگھ



ایمان کی یہ ہے

مرزا وحیدالدین سے میری ملاقات ادیبوں کے ایک جلسے میں ہوئی۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ بڑے مقبول ادیب ہیں۔ میں نے جب پوچھا کہ ادب کی کس صنف سے اُن کا تعلق ہے تو کہنے لگے "میں قصیدہ گو ہوں"۔ یہ سنتے ہی میری ہنسی چھوٹ ہنسی چھوٹ گئی۔ میں نے کہا۔ حضور میرا خیال تھا کہ قصیدہ گوئی کے دن لد گئے ہیں۔ وہ زمانے گئے جب ایک نواب تخت پر بیٹھ کر اپنے درباری شاعر کو اپنی تعریف کے پُل باندھتے ہوئے دیکھتا تھا۔ اور شرمندہ ہونے کی بجائے اُسے خلعت اور جاگیر انعام میں دیتا تھا۔ شاعر جتنا بڑا جھوٹ بولتا تھا، اتنا ہی بڑا انعام پاتا تھا۔ ایسا نواب جس کی پوری ریاست کا رقبہ چار ایکڑ سے زیادہ نہ تھا۔ اپنے قصیدہ گو سے یہ سُن کر کہ وہ والیٔ دوجہاں ہے' یہ سمجھتا تھا کہ شاعر سچ بول رہا ہے۔ اب جب بادشاہت ہی نہ رہی تو کیسی قصیدہ گوئی اور کس کی قصیدہ گوئی۔

مرزا ہنسا اور کہنے لگا کہ آپ مغالطے میں ہیں۔ بادشاہت کے زمانے میں لے دے کے کُل دو ایک شخص ہوتے تھے جن کی شان میں قصیدے کہے جا سکتے تھے۔ ایک بادشاہ سلامت خود اور دوسرا اُن کا ولی عہد۔ ملکۂ معظمہ کا قصیدہ کبھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کیوں کہ اُس کا صرف حُسن ہی تعریف کے لائق ہوتا تھا اور بادشاہ سمجھتا تھا کہ اُس کے حُسن کا قصیدہ کہنے کا حق صرف اُسی کو ہے۔ لیکن آج کل ایسے لوگوں کی بھرمار ہے جو اپنا قصیدہ سننے کے خواہشمند ہیں۔"

میں نے پوچھا "مثلاً؟" کہنے لگے "مثلاً وہ جن کے ہاتھوں میں انعامات تقسیم کرنے کی طاقت ہے؛ وہ جو آپ کو مشاعروں میں بلا سکتے ہیں؛ وہ جو آپ کی کتابیں چھپوانے کا بندوبست کروا سکتے ہیں؛ وہ جو آپ کی کتابیں خریدنے کا حکم صادر کر سکتے ہیں؛ وہ جو آپ کو ایک ایسے ملک میں اپنا کلام سنانے کے لیے بھیج سکتے ہیں جہاں کوئی آپ کا شعر تو کجا، آپ کی زبان بھی نہیں سمجھتا۔ وہ جب آپ کے لیے اتنے اہم کام کر سکتے ہیں تو آپ کیا اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ ان کی شان میں ایک عدد قصیدہ ہی لکھ دیں۔

مجھے اچانک محسوس ہوا کہ مرزا کی بات میں وزن ہے۔ تھوڑا سا افسوس بھی ہوا کہ میرا دھیان ادب کی اس فائدہ مند صنف کی طرف کیوں نہیں گیا۔ لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ ایسے لوگوں کی شخصیت میں کہاں ایسی صفات ہوتی ہیں، جن پر قصیدے لکھے جا سکتے ہیں۔

بادشاہت کے دنوں میں قصیدہ گو شاعر کسی بادشاہ کو لنگڑاتے ہوئے دیکھ کر یہ کہہ سکتا تھا کہ آپ کی رگوں میں یقیناً تیمور لنگ کا خون ہے۔ یا جب شاعر نے دیکھا کہ بادشاہ سلامت کی ایک آنکھ کسی حادثے کا شکار ہو گئی ہے تو قصیدہ گو کہہ دیتا تھا کہ تیری ایک آنکھ ہی میں جلال اس قدر ہے کہ کوئی تیری نگاہ کی تاب نہیں لا سکتا۔ اگر دوسری رہتی تو خدا جانے رعایا پر کیا گزرتی یا جب شاعر کو پتہ چلتا تھا کہ بادشاہ سلامت اپنے سگے بھائی کا محل ہڑپ کرنا چاہتے تھے تو وہ کہہ اُٹھتا تھا کہ آپ کا فتوحات کا جذبہ سکندرِ اعظم جیسا ہے۔ کسی نواب نے اپنی بیوی اور اس کی باندی کے معمولی سے جھگڑے میں فیصلہ باندی کے حق میں دے دیا تو قصیدہ گو کہہ اُٹھا کہ آپ کا انصاف عدلِ جہانگیری کی یاد دلاتا ہے۔ لیکن ایک عام آدمی کی تعریف میں کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ ایسے آدمی کی قصیدہ گوئی کوئی کیا کرے۔ جسے دیکھ کر خدائے برتر سے شکوہ کرنے کو جی چاہے کہ کچھ لوگوں کی تشکیل میں اس نے غیر ضروری عجلت سے کام لیا ہے۔

میں نے پوچھا: "مرزا، کیا ہمارے زمانے میں ایسے ممدوحوں کا ملنا ممکن ہے، جن پر قصیدہ لکھنے کو جی چاہے؟" کہنے لگے "نہیں ہے۔" میں نے

۵۹/۴ - راجندر نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۰

پوچھا تو کبھی آپ اپنے قصیدوں میں کیسے کیا ہیں۔ کہنے لگے تو گویا آپ میری قصیدہ گوئی کا راز جاننا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا اگر آپ اس راز کو اپنے ساتھ قبر میں لے کر جانا چاہتے ہوں تو بے شک نہ بتائیے۔ مرزا نے قہقہہ لگایا اور کہا "چلیے صاحب، بتائے دیتے ہیں، آپ بھی کیا یاد کریں گے۔"

مرزا نے بتایا۔ یہ صحیح ہے کہ آج کل کے ممدوح میں اول تو سرے سے کوئی قابلِ ذکر خوبی ہوتی ہی نہیں اور اگر کوئی ایک آدھ ہے بھی تو مرزا کو فرصت نہیں کہ وہ ممدوح کے اندر جھانک کر اُسے تلاش کرتے پھریں۔ اُن کا طریقۂ کار یہ ہے کہ وہ کوئی بھی من گھڑت خوبی اپنے ممدوح کے ساتھ چسپاں کر دیتے ہیں۔ لیکن کچھ اس استادی کے ساتھ کہ ممدوح سمجھنے لگتا ہے کہ یہ خوبی اس میں ہے۔ ممدوح کی خوبی اس قدر اہمیت نہیں رکھتی جتنا اُسے چسپاں کرنے کا طریقہ۔ ممدوح پھر زندگی بھر اس خوبی کو اپنے ساتھ چسپاں کیے رکھتا ہے۔

ایک ممدوح کے بارے میں اُنہوں نے لکھ دیا تھا کہ وہ بڑا مہمان نواز ہے۔ جب تک اُس کے دسترخوان پر کوئی مہمان نہ ہو وہ کھانا نہیں کھاتا۔ اب کیا تھا۔ ممدوح بے چارہ صبح سویرے گھر سے نکل کر مہمان کی تلاش میں سڑک کے کنارے جا کھڑا ہوتا۔ مہمان ملے تو وہ کھانا کھائے گا۔ دوپہر تک بڑی مشکل سے کوئی مہمان ملتا تھا جسے بہلا پھسلا کر وہ گھر لے آتا تھا۔ ویسے تو بڑی شفقت سے اُسے کھانا کھلاتا تھا، لیکن کھانا اس کا اس طرح کا ہوتا تھا جیسے عام طور پر بیماروں کو کھلایا جاتا ہے۔ مہمان بھلا ایسا کھانا کیوں کھائے گا۔ اگر دال روٹی ہی کھاتی ہے تو اپنے گھر میں کیا بُرائی ہے۔ چنانچہ ممدوح کو دیکھتے ہی لوگ کھسکنا شروع ہو جاتے تھے۔ مہمانوں کی جب قلت ہونے لگی تو ممدوح قصیدے کی عزت بنائے رکھنے کے لیے خود فاقے کرنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ مرزا کا قصیدہ ہی اُس کی موت کا سبب بنا۔ باوجود انتہائی کوشش کے ہفتہ بھر اُسے مہمان نصیب نہ ہوا اور مجبوراً اُسے فاقہ کرنا پڑا۔ اور اس طرح جنت کے دروازے اُس پر وا ہو گئے۔

مرزا نے کسی ممدوح کے بارے میں لکھ دیا کہ حالانکہ وہ اسی برس کے ہو گئے ہیں، لیکن آج بھی وہ چلتی ریل گاڑی پر اس طرح پھدک کر سوار ہوتے ہیں کہ انہیں دیکھ کر نوجوان شرما جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ممدوح نے کبھی ریل گاڑی پر سفر کیا ہی نہیں تھا۔ اس قصیدے کو سننے کے بعد نہ صرف اُس نے ریل گاڑی پر بغیر مطلب کے سفر کرنا شروع کر دیا بلکہ وطیرہ بنا لیا کہ کھڑی ریل گاڑی پر سوار نہیں ہوں گا۔ پلیٹ فارم پر جا کر گاڑی کے چلنے کا انتظار کرتا اور جب چل پڑتی تو پھدک کر اس پر سوار ہو جاتا۔ میں نے اس واقعے کی تصدیق کرنا چاہی لیکن اس میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ مجھے پتہ چلا کہ ممدوح چلتی گاڑی پر سوار ہونے کے سلسلے میں ایک ایسے سفر پر نکل گیا جہاں سے کوئی واپس نہیں لوٹتا۔

مرزا نے ایک ممدوح کے بارے میں لکھ دیا کہ اُس کے خاندان کا سلسلہ حاتم طائی سے ملتا ہے۔ اس تحریر کو پڑھنے کے بعد ممدوح صبح سویرے گھر سے مٹھی بھر آٹا رومال میں باندھ کر چیونٹیوں کے بل تلاش کرنے کے لیے نکل جاتا ہے۔ جہاں کہیں چیونٹیاں نظر آئیں وہ ان کے لیے روزی کا ڈھیر لگا دیتا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ شہر میں چیونٹیوں کی تعداد میں جو قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے، اس کا سہرا مرزا کے ممدوح کے سر ہے۔ ممدوح کی اس عادت کا ضمنی نتیجہ یہ نکلا کہ خواتین اُسے دیوانہ سمجھنے لگیں۔ اور کوئی اس سے شادی کرنے کو رضامند نہ ہوتی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اس کے سر پر کوئی دوسرا سہرا نہ سجایا جا سکا۔

مرزا کی تقریر سننے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ وہ ممدوح میں خوبیاں تلاش نہیں کرتے بلکہ خوبیوں سے اُسے مزین کرتے ہیں۔ کچھ اسی طرح سے کہ ممدوح حیران ہو کر اپنے اوپر لعنت بھیجنا شروع کر دیتا ہے۔

اور فلاں فلاں خوبی اُسے قدرت نے عطا کر رکھی تھی۔ لیکن اسی قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ خود ممدوح کو ان خوبیوں کا علم نہیں ہونے دیا۔

میرے ایک سوال کے جواب میں مرزا نے بتایا کہ وہ اپنے قصیدے زیادہ تر نثر میں لکھتے ہیں۔ کیونکہ آج کل کے ممدوح کی جملہ خوبیوں کو نظم میں سمیٹنا مشکل ہو گیا ہے۔ اور کوزے میں دریا بند کرنا اُنہیں کبھی نہیں آیا۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ ممدوح کو نثر آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ اگر قصیدہ ممدوح کی سمجھ میں نہ آئے تو پھر کون سا انعام اور کیسا انعام۔

میں نے کہا مرزا ایک بات بتلائیے۔ آپ کا ضمیر کبھی کبھی اس بات کے خلاف پروٹسٹ نہیں کرتا کہ آپ ایک ایسے آدمی کی تعریفوں کے پُل باندھ رہے ہیں، جس میں تعریف کے لائق کچھ ہے نہیں۔ کہنے لگے 'صاحب' یہ تو ایک طرح کا کاروباری کام ہے جب آپ نے سہرا لکھنے کو اپنا پیشہ بنا لیا تو پھر اس بات سے آپ کا کیا سروکار کہ دولہا کی شکل و صورت کیسی ہے اور عمر کتنی ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ضمیر کو بھی اب نوٹ گننا آ گیا ہے۔ اس پر جب چار پانچ ہزار روپوں کا بوجھ پڑتا ہے تو اس کی آواز اگر مکمل طور پر دب نہیں جاتی تو اتنی مدھم ضرور ہو جاتی ہے کہ میرے کانوں تک پہنچ نہیں پاتی۔

میں نے کہا مرزا آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس قیمتی راز سے آگاہ کیا، لیکن میں اس سے فائدہ اٹھانے کا اہل نہیں ہوں کیونکہ میرا رشتہ تو قاری سے ہے۔ اگر اُسے میری کتاب پسند آئے تو وہ اُسے خریدے گا۔ اس کا قصیدہ کہنے سے مجھے کچھ فائدہ ہونا ممکن نہیں۔ مرزا کہنے لگے میں نے آپ کو نسخہ دیا ہے۔ اس کو کس طرح استعمال میں لانا ہے۔ یہ تو آپ پر منحصر ہے۔

مرزا نسخہ بتا کر چلے گئے۔ میں اپنی جگہ تہیہ کیے بیٹھا ہوں کہ اُن کے نقشِ قدم پر نہیں چلوں گا لیکن پتہ نہیں کیوں آج کل سہرا اہلِ ثروت ——— بقیہ صفحہ ۴۸ پر



نام کتاب : پریم چند ـــــ کچھ نئے مباحث
مصنف : مانک ٹالا
قیمت : ۱۰۰ روپے
ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس،
۹۔ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

یہ مشہور افسانہ نگار مانک ٹالا صاحب کی پریم چند پر تازہ ترین تصنیف ہے جب کہ اس سے قبل وہ "پریم چند اور تصانیف پریم چند ـــ کچھ نئے تحقیقی گوشے" لکھ کر اہلِ نظر سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ زیرِ نظر نئی کتاب میں مانک ٹالا صاحب نے پریم چند کی بعض نادر تحریروں کو جمع کیا ہے جو نایاب ہو چکی ہیں۔ گرچہ پریم چند کی شخصیت، ماحول اور کمالات کے سمجھنے میں ان سے مدد ملتی ہے۔ ان تحریروں میں متعدد قومی یک جہتی کی ان کوششوں پر مشتمل ہیں جو پریم چند نے موجودہ صدی کی پہلی چوتھائی کے آخر میں اور اس کے بعد ابھرنے والی فرقہ پرستی کے خلاف کی تھیں۔ اس سلسلے میں اسلام، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے متعلق پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ بہت نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر پریم چند کی حسب ذیل کاوشیں ان کی حق پسندی اور انسان دوستی پر دلالت کرتی ہیں :

منشی پریم چند کا ایک اہم اداریہ :
"قرآن میں فرقہ وارانہ اتحاد کے عناصر"
پریم چند کی ہندی کہانی :
"نبی کا نیتی نرواہ"۔
قومی یک جہتی اور پریم چند :
"اسلام کا دیش ورکش کے پس منظر میں"

مندرجہ بالا ابواب کے علاوہ مانک ٹالا صاحب نے دو اور ابواب میں "پریم چند اور آریہ سماج" اور "پریم چند کا آریہ سماجی تہذیبی شعور" جیسے مضامین لکھ کر واضح کیا ہے کہ آریہ سماج سے تعلق کے باوجود پریم چند نے نہ صرف یہ کہ فرقہ پرستی کو راہ نہیں دی بلکہ ہندو فرقہ پرستوں کے خلاف وہ اپنا قلم تلوار کی طرح استعمال کرتے رہے جس کے سبب شُدھی اور سنگھٹن کے حلقوں میں ان کے خلاف بہت واویلا مچایا گیا۔ دراصل پریم چند بنیادی طور پر ایک مذہبی آدمی ہونے کے باوجود اور اپنے مخصوص عقائد پر اصرار کرتے ہوئے بھی فرقہ پرست نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو مذہب کے ماننے والوں میں بھی جو لوگ اسلام دشمنی اور مسلم آزاری کرتے تھے، پریم چند کی ان سے لڑائی رہتی تھی۔ وہ آریہ سماجیوں کی انتہا پسندی پر بھی تنقید کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ چنانچہ مانک ٹالا صاحب نے "ہنس"، نومبر ۱۹۳۱ء سے پریم چند کے ایک اہم بیان کا اقتباس دے کر پریم چند کی حقیقت پسندی اور رواداری کا ایک دستاویزی ثبوت فراہم کر دیا۔ اس بیان کے آخری جملے یہ ہیں :

"اسلام تلوار کے زور سے نہیں
بلکہ اپنے خصائل کے ظہور کی طاقت
پر پھیلا۔ اس لیے پھیلا کہ اس کے
یہاں سبھی انسانوں کے حقوق برابر
ہیں۔"

پریم چند کا یہ موقف ان کی وسیع تر اصلاح پسندی کے بالکل مطابق ہے۔ مانک ٹالا صاحب نے پریم چند جیسے عظیم فن کار کے متعلق ان حقائق کا انکشاف کر کے ملک و قوم اور زبان و ادب کے ساتھ ساتھ علم و فن نیز تہذیب و انسانیت کی ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ خود پریم چند کے بہتر مطالعے کے لیے یہ خدمت بہت معاون و موثر ثابت ہو سکتی ہے اور اردو و ہندی افسانہ و ناول کے بانی کا یہ بہتر مطالعہ عصرِ حاضر میں اس کے ادب کی اہمیت و افادیت پر بھی روشنی ڈالے گا۔

پریم چند کے فکر و فن پر مانک ٹالا صاحب کے تحقیقی و تنقیدی مطالعات پریم چند پر ان کے اختصاص کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب اور وسیع تر انسانی و اخلاقی اقدار سے ان کی وابستگی کے نہایت قابلِ قدر نمونے ہیں۔ مانک ٹالا صاحب نے زیرِ بحث موضوعات پر اپنے عالمانہ استدلال و نفیس نکات صاف و صریح اور شائستہ و شگفتہ انداز میں پیش کیے ہیں۔ فی الواقع ان کی علمی تحقیق سے واضح ہوتا ہے کہ اب تک پریم چند کو بعض علمائے ادب نے جس رنگ میں پیش کیا، فن کا حقیقی رنگ اس سے بہتر ہے۔ مانک ٹالا صاحب کے مباحث پریم چند کے متعلق کچھ ایسے نئے گوشے سامنے لائے ہیں۔ جن کے پیشِ نظر اس عظیم فن کار کے کام کی بہتر قدر شناسی کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے۔

نام کتاب : دوگز زمین
مصنف : عبدالصمد
قیمت : ساٹھ روپے
ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶

عبدالصمد صاحب نے بالکل کلاسیکی انداز کا ناول "دوگز زمین" لکھ کر اہلِ نظر کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ اس لیے کہ معدودے چند خامیوں کے باوجود یہ تخلیق اپنی مخصوص صنفِ ادب کی ہیئت کے تمام تقاضوں کو پورا کرتی ہے اور عصرِ حاضر کے اردو ناولوں میں ایک قابلِ ذکر اضافہ ہے۔ اس میں وسیع پیمانے پر ماجرا کی ترتیب اور کردار نگاری معقول طریقے سے کی گئی ہے۔ شروع سے آخر تک قصے کی دلچسپی اور اس کے اگلے مرحلوں کے متعلق قاری کا تجسس برقرار رہتا ہے۔ تمام واقعات وحادثات فطری و منطقی طور پر رونما ہوتے اور کہانی کو زیادہ پُر اثر بناتے ہیں۔

ناول کا نام حقیقی بھی ہے، علامتی بھی۔ یہ خاکِ وطن بھی ہے۔ خاکِ مزار بھی، اور زر، زمین، زن کے مشہور مثلث کا ایک ناویہ بھی۔ قصہ بہار شریف کی ایک مردم خیز بستی سے شروع ہوتا ہے۔ اور ہندوستان سے مشرقی پاکستان، پھر بنگلہ دیش، اس کے بعد مغربی پاکستان اور عرب تک پھیل جاتا ہے۔ جنگِ آزادی کے خاتمے پر بہاری مسلمانوں کے حالِ زار کی یہ پہلی بھرپور داستان ہے۔ جو ایک صنفِ ادب میں نہایت مؤثر انداز سے بیان کی گئی ہے۔ مصنف نے حالات کا بہت اچھا اور گہرا مطالعہ و تجزیہ عمرانیات، سیاسیات اور نفسیات کی روشنی میں کیا ہے۔ ساتھ ہی وہ معاشی اسباب و عوامل اور اخلاقی اصول و اقدار کو بھی مدِ نظر رکھتے ہیں۔

عبدالصمد صاحب سیاسیات کے عالم اور استاد ہیں۔ اُنہوں نے سیاسی حقائق کو گزشتہ پُرست کے محسوس کرداروں اور حقیقی واقعات کی شکل میں پیش کیا ہے۔ بظاہر ایک خاندان اور اس کے نشیب و فراز کی داستان رقم کی گئی ہے۔ اور مختلف نسلوں کے افراد کو مختلف حالات میں اپنا رول ادا کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے، مگر مجموعی تاثر کے اعتبار سے یہ متوسط طبقے کے کسی بھی مسلم خاندان کی کہانی پچھلے پچاس سال کے عرصہ میں ہوسکتی ہے۔ البتہ اس قصے کا پس منظر بہار ہے۔ زیرِ نظر ناول پہلی بار ۱۹۴۶ء کے فسادات کا ایک ادبی مطالعہ پوری آگہی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

ناول کے کرداروں میں سب سے نمایاں اختر حسین ہیں، جو ایک قوم پرور مسلمان زمیں دار، وکیل اور سیاست داں ہیں۔ وہ کانگریس کے ٹکٹ پر ایم۔ ایل۔ اے بھی ہوئے اور وزیر بھی بنائے گئے۔ لیکن اُنہوں نے ہمیشہ ذاتی مفادات پر اجتماعی مفادات کو ترجیح دی اور اپنے اخلاقی اصولوں پر سختی سے قائم رہے۔ جس کے سبب اُنہیں بدگمانیوں اور نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسرا اہم کردار بی بی صاحبہ ہیں، جو ایک نہایت باوقار، سلیقہ شعار اور دردمند خاتون ہیں۔ ان کا جو نفسیاتی مطالعہ تقسیم ہند اور تقسیم خاندان کے پس منظر میں ناول نگار نے کیا ہے، وہ بہت شاندار اور شاہکار ہے۔ یہ خاتون سیاسی و معاشرتی انتشار کی شکار ایک غم خوار ماں کی زبردست علامت بن گئی ہیں۔ ان دو کرداروں کے علاوہ حامد، فیاض، اصغر حسین، سرور حسین، جامو، بدرالاسلام اور نثار جیسے اشخاص بھی اپنی اپنی جگہ حافظے میں محفوظ رہنے والے ہیں۔ ان سے چھوٹے کردار بھی اپنی اپنی قابلِ ذکر شخصیت رکھتے ہیں۔ فن کار نے قصہ نویسی اور کردار نگاری دونوں میں فنی مہارت اور چابک دستی کا ثبوت دیا ہے۔ زبان سلیس، رواں، شستہ اور شگفتہ ہے گرچہ بعض چھوٹی چھوٹی غلطیاں بھی ہیں، مگر وہ بیان کی رو میں بہت زیادہ محسوس نہیں ہوتیں۔ بہرحال مجموعی اور عمومی طور سے "دوگز زمین" کا مطالعہ ایک گزرے ہوئے زمانے اور معاشرے کے آداب و اطوار کو سمجھنے میں معاون ہوتا ہے اور اُسے پڑھتے ہوئے وقت کے بدلتے ہوئے تیور کی جھلکیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ پرانے دور اور سماج کی بعض خوبیاں بھی نظر آتی ہیں اور نئے دور کی بعض خامیاں بھی۔ یہ دونوں باتیں سیرت و اخلاق کی ہیں۔ اس سلسلے میں خاص کر اگلے وقتوں میں ہندو مسلم اتحاد کی بہت حسین نقاشی کی گئی ہے۔ ناول کی مزید خوبی یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کی نئی نسلوں کو ماضی کے ملبے سے اُبھرنے اور سنگین تجربات سے سیکھ کر پہلے سے کچھ زیادہ ہمت و جرأت کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے یا کم از کم آگے بڑھنے کا تہیہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ گرچہ کمی یہ ہے کہ ان کی بہتر کردار سازی کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا گیا ہے۔

عبدالمغنی

نام کتاب : موضوعات (مجموعہ مقالات)
مصنف : ڈاکٹر ارتضیٰ کریم
قیمت : ستر روپے
ناشر : زلالہ پبلی کیشن، آئی/۱۱۳، اے، دلشاد گارڈن، شاہدرہ، دہلی ۳۲
مندرجات : ضرورت تنقید "میرے بھی صنم خانے" ایک مطالعہ "طلسم ہوش رُبا" اور داستان کی تنقید، عجائب القصص اور "باغ و بہار" ترقی پسند تنقید اور اردو فکشن، ترقی پسند تحریک اور بہار کا اردو افسانہ، اردو مثنویوں کی کہانیاں۔ خواجہ احمد عباس : بلا عنوان۔ احمد ندیم قاسمی، فیض کا تنقیدی رویہ، ترقی پسند تحریک کی وراثت۔ حسرت موہانی : فن اور فکر۔ نظیر اکبرآبادی اور اردو غزل۔
یہ نئے عنوانات نہیں، لیکن پہلے یہ مرتبہ بات بھی نہیں جو انہیں تنقیدی یا تحقیقی سطح سے بعیت انوکھ

باتوں کا وزن اور وقار نہ ملتا ہو۔ محنت سے لکھے یہ غیر رسمی انداز کے جان دار مقالے ہیں، جن میں مقالہ نگار کی اپنی فہم و نظر کارفرما ہے۔ اور مبلغ علم نمایاں۔ ان میں خیالات کی تازہ کاری توجہ چاہتی ہے۔ موضوعات کا تیسرا مقالہ: "عجائب القصص" اور "باغ و بہار" نہایت اہم ہے جو اردو نثر کے اہل نظر کو دعوتِ قلم دیتا ہے۔

دلی والے میر امن کی "باغ و بہار" کو گلستانِ اردو کا ایک گل سرسبد کہنا غلط نہیں۔ اردو کے ارتقا میں اُسے ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ باغ و بہار کی انفرادیت نہ صرف اس کی غیر معمولی مقبولیت بلکہ اس کا متنازع تصنیفی وجود ہے جو اس کی مزید شہرت کا باعث ہے۔

ایک زمانہ تھا جب یہ مقبولِ عام کتاب حضرت امیر خسرو کی طبع زاد تخلیق قرار دی جاتی تھی۔ تحقیق نے اس خیال کی تغلیط کر دی۔ اب ڈاکٹر ارتضیٰ نے یہ بات چھیڑی ہے کہ باغ و بہار کی نمائندہ نثر اور سادہ اسلوب میر امن کی اپنی اختراع نہیں۔ اصلاً یہ کتاب دہلی تا پالم کے نابینا بادشاہ شاہ عالم ثانی کی تصنیف "عجائب القصص" کا دوہرایا ہوا نسخہ ہے جس کی املا اس مصنف نے میر امن دہلوی سے کرائی تھی۔

مقالہ نگار کا بیان ہے کہ اس لحاظ سے میر امن کو عام فہم اردو نثر اور سادہ و سہل اسلوب مملکت میں ایک "بے تاج بادشاہ" بنا کر زندہ رکھنا عجائب القصص اور اس کے نابینا مصنف کے ساتھ "اردو تنقید" کا بخل اور بے نیازی" ہے۔

ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے ان کتابوں کے زمانۂ تصنیف پر گفتگو کرتے ہوئے اسلوبیاتی تنقید سے حسبِ تنقید مصرف لیا ہے اور کئی دلائل پیش کیے ہیں۔ اس کتاب کے دیگر مقالات بھی ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

محمد حسنین

نام کتاب: شاد کا عہد اور فن (حصہ دوم)
مصنف: نقی احمد ارشاد
قیمت: تیس روپے
ملنے کا پتہ: ڈاکٹر سید نثار احمد، ایم۔ آئی۔ جی۔ ۳۴۸۔ ککر باغ، پٹنہ ۲۰۔

داغ اور امیر کا کلام زبان و بیان کی بعض نفاستوں کے باوصف غزل کے ابتذال و انحطاط کا نمونہ ہے۔ غزل اپنے موضوعات و لفظیات کے اعتبار سے کچھ ایسی سطح پر آ گئی تھی کہ اس کا اس تعریضی سے نکلنا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔ حالی نے اسی غزل کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ لیکن داغ اور امیر کی غیر معمولی مقبولیت کے دور ہی میں اردو غزل میں ایک ایسی آواز اُبھری جس نے اپنی متانت، علوئے تخئیل اور لطافتِ اظہار کے باعث اپنی انفرادیت کا سکہ بٹھا لیا۔ یہ آواز شاد عظیم آبادی کی تھی۔ عام طور پر حسرت موہانی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اردو غزل کا احیا کیا اور اسی لیے وہ رئیس المتغزلین کہے جاتے ہیں۔ لیکن حسرت سے پہلے اور حسرت سے بہتر طور پر اردو غزل کو جس نے توانائی عطا کی، وہ شاد عظیم آبادی تھے۔ حسرت کے یہاں کہیں کہیں وہ عامیانہ پن بھی ملتا ہے جو مثال کے طور پر داغ اور امیر کے یہاں ہے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک سوقیانہ شاعری کی بھی ایک جگہ ہے۔ لیکن شاد کے یہاں سطحیت، گراوٹ اور پھکڑ پن کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ دراصل اردو غزل کا احیا شاد عظیم آبادی سے ہوتا ہے۔ اور وہ صحیح معنوں میں نئی غزل کے بانی ہیں۔

حسرت نے بہت سی غزلیں شاد کی زمینوں میں کہی ہیں۔ یہی حال اقبال کا بھی ہے۔ اقبال نے اپنے ابتدائی دور میں داغ کی شاگردی اختیار کی اور ان کے رنگ میں کچھ غزلیں کہیں، لیکن شاید اپنے استاد کا رنگِ کلام انہیں مرغوبِ خاطر نہیں ہوا اور وہ دوسرے شعرا کی طرف متوجہ ہوئے۔ نقی احمد ارشاد نے اپنی تازہ کتاب "شاد کا عہد اور فن" (حصہ دوم) میں "بانگِ درا" کی دو اور "بالِ جبریل" کی پانچ ایسی غزلوں کی نشاندہی کی ہے جو شاد کی نکالی ہوئی زمینوں میں کہی گئی ہیں۔ شاد کا فارسی کلام بھی اقبال کی شعر گوئی کے آغاز سے پہلے تواتر کے ساتھ شائع ہوا کرتا تھا اور اقبال کی نظر سے گزر چکا تھا۔ شاد نے اپنے ایک خط میں دعویٰ کیا ہے کہ اقبال نے کیمبرج میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں اول الذکر سے فارسی میں کچھ لکچر لکھوا کر منگوائے تھے۔ قاضی عبدالودود نے شاد کے اس بیان کو چیلنج کیا تھا۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ قاضی عبدالودود نے ۱۹۲۲ء میں "دیوانِ شاد" کی اشاعت کا بندوبست کیا تھا۔ اسی زمانے میں شاد سے ان کے اختلافات ہوئے۔ شاد تو اپنا غم و غصہ ۱۹۲۷ء میں اپنے ساتھ لے گئے۔ لیکن قاضی عبدالودود اوائل ۱۹۸۴ء سے پہلے اس بندِ غم سے نجات نہ پا سکے۔

نقی احمد ارشاد نے اپنی کتاب کے قابلِ لحاظ صفحات قاضی عبدالودود کے ان اعتراضات کو رد کرنے میں صرف کیے ہیں جو مؤخر الذکر نے شاد پر عائد کیے تھے۔

قاضی عبدالودود کی بابت شاد نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا:

"میری مختصر غزلیں غلط سلط چھپوا کر
ایک شخص کمال متمتع ہوا۔ شاید
اس نے تین سو خرچ کیے تھے، اگیارہ
سو نفع کر چکا۔"

اس کا بدلہ لینے کے لیے قاضی عبدالودود نے شاد عظیم آبادی کو دروغ گو ثابت کرنے کی غرض سے محمد مسلم کی کتاب "شاد کی کہانی شاد کی زبانی" اور "مکتوباتِ شاد" کے حوالے سے رسالہ "تحریر" دہلی میں ایک طویل مضمون لکھا، جس میں شاد کی غلط بیانیوں کی بہت سی مثالیں دیں۔ یہی مضمون قاضی عبدالودود نے اپنے مجموعۂ مقالات "اشتر و سوزن"

یں بھی شامل کیا۔ اس مضمون کی اچھی خاصی شہرت ہوئی۔ نقی احمد ارشاد نے قاضی صاحب کے اعتراضات کے جوابات دلیلوں کے ساتھ دیے ہیں۔ انہوں نے اس زمانے کے سیاسی اور سماجی حالات کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا ہے اور اُن کی روشنی میں شاد کے بیانات کی تصدیق کی ہے یعنی احمد ارشاد یوں تو شاد کے پوتے ہیں، لیکن انہوں نے اپنے محاکمے میں رشتے کے تقدس کو حاوی نہیں ہونے دیا ۔ انہوں نے شاد کی بعض مبالغہ آرائیوں کا بھی کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ "شاد کا عہد اور فن" حصہ دوم۔ مصنف کے عمیق مطالعے اور تحقیقی لعبیرت کا آئینہ دار ہے۔ افسوس ہے کہ کتاب کے آخر میں "کتابیات" کی کوئی فہرست نہیں ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا کہ نقی احمد ارشاد نے مواد کی فراہمی میں کن کن کوچوں کی سیر کی ہے۔

نقی احمد ارشاد نے اقبال کے اس فارسی عقیدے کی بھی نشاندہی کی ہے۔ جو شاد کی فارسی نظم کے تتبع میں کہا گیا تھا۔ اس کتاب سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شاد عظیم آبادی نے اپنا پہلا مسدس ۱۹ سال کی عمر میں حالی کے پہلے مسدس "مدوجزرِ اسلام" سے چار سال پہلے لکھا۔ اس وقت حالی کی عمر ۴۲ سال تھی۔ نقی احمد ارشاد نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ شاد قومی یک جہتی کے علمبردار تھے۔ اس لیے انہوں نے ایک مثنوی "نویدِ ہند" ۱۸۷۸ء میں تصنیف کی۔ اس مثنوی میں حکومت کا دھیان مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کی طرف رجوع کیا گیا تھا تاکہ ان کی پستی اور تنزلی دُور ہو اور ہندو مسلمان آپسی جھگڑوں کو ختم کر کے تعلیم و ترقی کی طرف راغب ہوں۔ یہی مثنوی نظرِ ثانی کے بعد ۱۹۱۲ء میں "مادرِ ہند" کے نام سے شائع ہوئی۔

نقی احمد ارشاد نے اپنے تحقیقی کام کو کہیں بوجھل نہیں ہونے دیا۔ "شاد کا عہد اور فن" حصہ دوم یقیناً ایسی کتاب ہے جسے اردو ادب کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے ہر فرد کے پاس ہونا چاہیے۔ اس کتاب کا پہلا حصہ کئی سال پہلے چھپ کر خراجِ تحسین وصول کر چکا ہے۔ ہر حصے کی اپنی الگ اہمیت ہے۔

مظہر امام

نام کتاب: مثنویاتِ غالب (اصل فارسی مع اردو ترجمہ)
مترجم: پروفیسر ظ۔ انصاری
قیمت: ساٹھ روپے
ناشر: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

یہ کتاب غالب پر پروفیسر ظ۔ انصاری کے برسوں کے ضخیم تحقیقی کام کا ایک حصہ ہے۔ کیا اچھا ہو کہ وہ غالب کے فارسی کلام پر اپنا باقی کام بھی منظرِ عام پر لے آئیں۔

اس کتاب میں ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے غالب کی اُن تمام گیارہ کی گیارہ فارسی مثنویوں کا نثری اردو ترجمہ پیش کیا ہے۔ جو کلیاتِ غالب طبع ۱۸۶۳ء میں شامل ہیں۔ کتاب میں غالب کی مثنویوں کا اصل فارسی متن بھی شامل ہے۔ یہ کتاب غالب کے اُن تصورات و نظریات کو اردو داں حلقوں سے روشناس کراتی ہے جو فارسی میں ہونے کے باعث اردو کے عام حلقوں تک رسائی حاصل نہ کر سکے تھے۔

غالب کی فارسی مثنویوں کا یہ اردو ترجمہ غالبیات میں ایک ایسا خوش گوار اضافہ ہے جو غالب شناسوں کے لیے دلچسپی اور افادیت کی شے ثابت ہوگا۔

اس مفید کام کے لیے ادبی حلقے پروفیسر ظ۔ انصاری اور غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے شکر گزار ہیں۔ کتاب اپنے صوری حسن کے اعتبار سے بھی معیاری کتابت و طباعت کا دل نشین نمونہ ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی حسنِ طباعت کے لحاظ سے خاصے کی شے ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ بمبئی کی فلمی دنیا کے مشہور و مقبول کہانی کار و مکالمہ نگار وجاہت مرزا چنگیزی نے بھی غالب کی مشہور فارسی مثنوی "ابرِ گہربار" میں شامل منقبتی حصے کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے جو خود مترجم کی تحریر میں میرے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے۔ راقم الحروف جناب وجاہت مرزا چنگیزی کے اس ترجمے کو جلد ہی شیعہ کالج میگزین لکھنؤ میں شائع کرا رہا ہے۔

نام کتاب: فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات
مصنف: ڈاکٹر عبیدہ بیگم
قیمت: ساٹھ روپے
تقسیم کار: نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، نزد گل مرگ ہوٹل، امین آباد، لکھنؤ

یہ ضخیم کتاب دراصل ڈاکٹر عبیدہ بیگم کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر انہیں گورکھپور یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند ملی تھی۔

فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی تاریخ اور اس کی ادبی خدمات پر مفصل تحقیقی کام کو کامیابی کے ساتھ سرانجام دینا آسان نہ تھا۔ لیکن ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے اس کام کو دشواریوں کے باوجود جس سلیقے سے مکمل کیا ہے۔ اس کے لیے وہ مبارک باد کی مستحق ہیں۔ اس اہم اور مشکل کام کی سرانجام دہی کے لیے ادبی حلقے گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے بھی ممنون ہیں۔ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے:

۱۔ پہلا باب: فورٹ ولیم کالج کے اغراض و مقاصد
۲۔ دوسرا باب: فورٹ ولیم کالج کے مصنفین۔
۳۔ تیسرا باب: فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات۔
۴۔ چوتھا باب: فورٹ ولیم کالج کی نثر کا اسلوب۔
۵۔ پانچواں باب: اردو نثر پر فورٹ ولیم کالج کے اثرات۔

ان پانچ ابواب کے بعد مصادر اور فورٹ ولیم کالج کے اہلِ قلم کی کتابوں کی فہرستیں بھی شامل ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب فورٹ ولیم کالج اور اس کے اہلِ قلم کے متعلق متعدد ایسے گوشوں پر روشنی ڈالتی ہے جس سے ادبی حلقے پوری طرح باخبر نہ تھے۔

تقریباً سوا سات سو صفحوں کی اس ضخیم کتاب کا فروگذاشتوں سے سو فی صد پاک رہنا ممکن نہیں۔ تفصیل میں جائے بغیر یہاں کتاب کی فروگذاشتوں میں سے محض چند مثالوں پر اس غرض سے روشنی ڈالی جا رہی ہے کہ آئندہ اشاعت میں ان کی تصحیح کر لی جائے۔

کتاب (ص ۱۰۵ نیز ص ۶۹۸) میں بہ تکرار تذکرۂ بزمِ سخن کے مؤلف کا نام سید حسن علی خاں سلیم لکھا گیا ہے۔ بزمِ سخن مطبع مفیدِ عام آگرہ طبع ۱۸۸۱ء کے سرورق (نیز ص ۶۱) پر اس کے مؤلف کا صحیح نام سید علی حسن خاں سلیم درج ملتا ہے۔

کتاب (ص ۱۲۹) میں سورج مل جاٹ کے دہلی پر مختلف حملوں کے بیان کے ماتحت ایک حملے کا سال ۱۸۵۳ء بھی درج کیا گیا ہے جو بظاہر کتابت کا سہو ہے۔

کتاب (ص ۱۱۳ نیز ۱۴۲) میں والئ اودھ نواب آصف الدولہ کا دورِ حکومت بہ تکرار ۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۹ء قرار دیا گیا ہے۔ حالاں کہ آصف الدولہ کا دورِ حکومت ۱۷۹۷ء میں اُن کی وفات پر ختم ہو گیا تھا۔

کتاب (ص ۲۲۲) میں میر امّن کی کتاب باغ و بہار کی پہلی اشاعت کا سال ۱۸۰۴ء بھی محلِ نظر ہے۔ ایسی ہی چند فروگذاشتوں کے باوجود یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک اہم اور مفید کام ہے۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب اپنی افادیت کی بنیاد پر ادبی حلقوں میں خاطر خواہ مقبولیت حاصل کرے گی۔

کاظم علی خاں

●

نام کتاب : تلاشں (افسانے)
مصنف : مشتاق احمد نوری
صفحات : ۱۴۴ ۔ قیمت : ۳۰ روپے
ملنے کا پتہ : مکتبہ غوثیہ، نیو کریم گنج، گیا

ساتویں دہائی کے آس پاس اردو افسانہ نگاری کے میدان میں جو نام سامنے آئے اُن میں ایک اہم نام مشتاق احمد نوری کا ہے۔ اس مجموعہ میں کل سولہ افسانے ہیں۔ افسانوں سے قبل بازگشت کے عنوان سے افسانہ نگار نے اپنی پیدائش سے کتاب تک کے حالات اور واقعات کا لیکھا جوکھا بالکل افسانوی لیکن موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ بازگشت کو پڑھنے کے بعد نوری کے قلم کی جولانی اور زبان و بیان پر ان کی گرفت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس پورے مجموعہ میں کسی بھی سکۂ رائج الوقت ناقد یا مبصر کی رائے قاری پر مسلط نہیں کی گئی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کسی ناقد کی بیساکھی کے سہارے کے بغیر قاری تک پہنچنا چاہتا ہے جو یقیناً اس کی خود اعتمادی کا ثبوت ہے۔

اس مجموعہ میں نوری کے ۸۵ء تک کے افسانے ہیں۔ جن میں کچھ ابتدائی افسانے بھی ہیں۔ جن میں سیدھے سادے مگر موثر انداز میں حیات و کائنات اور حسن و عشق کی باتیں ہیں۔ چند افسانے ایسے ہیں جو جدیدیت کے علمبردار ہیں۔

'وہ ایک لمحہ' 'جادوگر' 'کمرے کا تنہا روشن دان' اس زمرے میں رکھے جا سکتے ہیں لیکن نوری نے جدیدیت کی اندھی تقلید نہیں کی ہے۔ اُنھوں نے اپنی انفرادیت اور افسانوی خصوصیت کو برقرار رکھا ہے۔ ان افسانوں میں کئی ابعاد تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

شہر کا خدا، زرد صلیب، پھندہ، اشرف المخلوقات، تاریک اُجالے وغیرہ میں نوری نے عہدِ حاضر کے درد و کرب، گھٹن، بے بسی اور مفاد پرستی کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ افسانوی شکل دی ہے۔ ان کہانیوں میں فن پر ان کی گرفت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ان افسانوں کے تمام کردار بالکل حقیقی، جیتے جاگتے ...... اور اپنے عہد اور سماج سے، جوجھتے ہوئے نظر آتے ہیں' ان افسانوں سے نوری نے یقیناً اردو افسانے کے معیار اور حسن میں اضافہ کیا ہے اور جدید افسانے کو ایک وقار بخشا ہے۔

اس کے علاوہ بقیہ افسانے جیسے اپاہج نیتی' چہرہ چہرہ، خوابوں کا کبنوس، لمحوں کے اسیر، ایک مٹھی غم وغیرہ میں کم و بیش انسان کی محبت' اس کی مجبوری، وفا اور بے وفائی کے قصے زمانے کے حالات سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ان رومانی افسانوں میں صرف کوری رومانیت نہیں ہے بلکہ سوز و گداز کے ساتھ وہ تلخ سچائی بھی ہے جس سے آج کا فرد دوچار ہوتا ہے۔

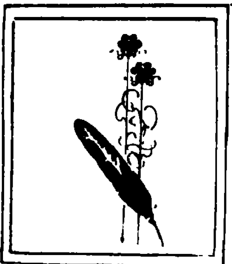
سید احمد قادری

بقیہ: ایمان کی یہ ہے

اور اہلِ اقتدار شخص کے چہرے کے ارد گرد مجھے ایک ہالا سا نظر آنے لگا ہے اور میرا قلم خود بخود کہنے لگتا ہے:

تجھے دیکھا جو خادم نے کہا ایمان کی یہ ہے...

○ ○



اُردو کا مقبول عام
مصوّر ماہ نامہ

آج کل
نئی دہلی

چیف ایڈیٹر: راج نرائن راز

سب ایڈیٹر: خورشید اکرم

جلد: ۴۸ شمارہ: ۲

ستمبر ۱۹۸۹ء بھادرہ۔ اشون شک سمت ۱۹۱۱

قیمت: دو روپے فون: ۳۸۷۰۶۹

سرورق: ایم۔ ایم۔ مُلک

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر: آج کل (اُردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ:
بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

پروڈکشن آفیسر: آر۔ ایس۔ منجال

اندرونِ ملک زرِ سالانہ: ۲۰ روپے
دو سال کے لیے: ۳۶ روپے
تین سال کے لیے: ۴۸ روپے

ترتیب

تعلیمِ بالغاں اور قومی یکجہتی

کوئی بھی ملک محض ایک جغرافیائی اظہار نہیں ہوتا بلکہ وہ اُن مَردوں، عورتوں اور بچّوں پر مشتمل ہوتا ہے جو مختلف ماحول میں رہتے ہیں۔ یہ فطری بات ہے کہ اُن کی عادات و اطوار اور خصوصیات مختلف ہوں گی۔ ان میں سے کچھ عادات و اطوار اور خصوصیات نسلی ہوتی ہیں اور کچھ دنیا میں رہ کر حاصل کی جاتی ہیں۔ اس طرح کے فرق بہت ہی زیادہ طبقات میں منقسم اس سماج میں اور بھی نمایاں ہو جاتے ہیں، جہاں انسانی تعلقات کا انحصار ذات پات فرقہ اور عقیدے کی محدود اور مصنوعی بنیادوں پر ہوتا ہے ایسے مختلف النوع سماج میں مختلف طبقات کے درمیان آویزش اور کشیدگی ناگزیر ہے — اپنے گوناگوں مذہبی، ثقافتی، لسانی اور نسلی طبقوں پر مشتمل بھارتی سماج اس مختلف النوع سماج کی بہترین مثال ہے۔ تب ہم کس طرح اتنے زیادہ متنوع سماج میں ہم آہنگی پیدا کر سکتے ہیں۔ ہم کس طرح اختلافِ رائے، مفادات کے ٹکراؤ اور آویزش کو اتفاقِ رائے، مفادات کی ہم آہنگی، اشتراکِ عمل اور میل جول میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ کس طرح ہم سماج کے اُن مختلف طبقوں میں یکجہتی پیدا کر سکتے ہیں جو ثقافتی اور جذباتی طور پر یکساں سماجی نظام کے عادی نہیں ہیں۔ ان سوالوں کے جوابات پیچیدہ ہیں اور مشکل بھی۔ یکجہتی مختلف چیزوں کو ایک بنانے کا عمل نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم اس عمل کو سائنس میں سمجھتے ہیں۔ یہ مختلف حقیقتوں کو ملانے کا عمل بھی نہیں ہے۔ مختلف چیزوں اور حقیقتوں کو ملانا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی پسندیدہ — اختلافات اور اختلافِ رائے ایک جمہوری سماجی نظام کی بنیادیں ہیں۔ ہم کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں، اختلافات دور نہیں کیے جا سکتے۔ مسئلہ بقائے باہم، ہم آہنگی اور مفاہمت کا ہے۔ اگر ہم میں مفاہمت اور خیرسگالی کا جذبہ ہو تو ہم آہنگی اور امن قائم رہے گا۔

کوئی بھی مُلک ایک سماجی ادارہ ہوتا ہے اور یہ اُس مُلک کی ذمّہ داری ہے کہ وہ بظاہر مختلف شناخت رکھنے والے طبقوں میں قوانین اور ضوابط کے ذریعے ہم آہنگی پیدا کرے۔ ہمارے آئین کے مطابق ہمارے مُلک میں شہریوں کا کوئی بھی برتر، برسرِ اقتدار طبقہ نہیں ہے — ہمارے آئین میں طبقوں، ذاتوں اور فرقوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ شہری حقوق کے معاملے میں قانون کے سامنے سب شہری برابر ہیں۔ قانون کے سامنے برابری کا مطلب یہ ہے کہ قانون کو تمام شہریوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنا چاہیے۔ نیز پیدائش یا ذات پات وغیرہ کی بنیاد پر کسی بھی فرد کو کوئی خصوصی رعائت نہیں ہونی چاہیے۔ البتّہ درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کے اراکین اس سے مستثنیٰ ہیں کیوں کہ وہ برسوں تک عدم مساوات اور تعصبات کا شکار رہے ہیں، اسی لیے آئین میں ان پر خصوصی توجّہ دی گئی ہے۔

ہمارے عوام مسلسل جہالت، ناخواندگی اور غربت کا شکار ہیں۔ تخریب پسند قوتیں علاقے، مذہب، زبان، ذات پات اور فرقہ کے نام پر سر اُبھار رہی ہیں۔ سماج کے بعض کمزور طبقوں کی سماجی اور اقتصادی ترقی کے لیے قانون سازی اور انتظام سے متعلق متعدد اقدامات کے باوجود یہ طبقے سماجی تفریق اور اقتصادی استحصال کا شکار ہیں۔ جنس کی بنیاد پر خواتین کے ساتھ تفریق کیے جانے کے خلاف نیز ان کے اختیارات کو فروغ دینے کے لیے کیے گئے متعدد ترقی پسندانہ اقدام کے باوجود خواتین تفریق کا شکار ہیں۔ سیکولرزم ہمارے آئین کا ایک واضح آدرش ہے۔ اس کے باوجود فرقہ پرستی سماج کے لیے ناسور بنی ہوئی ہے — مذہب کے نام پر بہت سی مہلک لڑائیاں لڑی جا رہی ہیں۔ ان حالات کے لیے ذمّہ دار بہت سی وجوہات میں سب سے اہم وجہ جہالت اور ناخواندگی ہے۔

ایسی صورتِ حال میں بالعموم تعلیم اور بالخصوص تعلیمِ بالغاں کا کیا کردار ہو سکتا ہے اس کا جواب قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء میں تلاش کیا جا سکتا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ ہمارے قومی نقطۂ نظر کے مطابق تعلیم لازمی طور سے سب کے لیے ہے۔ تعلیم ہماری ہمہ جہت مادّی اور روحانی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ تعلیم سے ہمارے نقطۂ نظر کو جِلا ملتی ہے اور قومی اتحاد، سائنسی

مزاج نیز ذہن اور جذبہ کی آزادی میں مدد ملتی ہے اور اس طرح ہمارے آئین میں سیکولرزم اور جمہوریت کے جو نصب العین رکھے گئے ہیں ۔ اُن کے حصول میں پیش رفت ممکن ہے۔ نئی پالیسی میں عدم مساوات کو دور کرنے اور سب کو تعلیم کے یکساں مواقع فراہم کرنے پر خصوصی زور دیا گیا ہے ۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے پالیسی کی سطح پر اور عملی پروگرام میں بہت سے اقدامات شامل کیے گئے ہیں ۔

ہم ایک ایسے سماج میں رہتے ہیں جو نیم خواندہ ہے اور جو خواندگی کی ضرورت اور اہمیت کو نہیں سمجھتا ۔ یہ سماج خواندگی کو اتنی اہمیت نہیں دیتا جتنی کہ وہ روزگار اور آمدنی کو اہمیت دیتا ہے ۔ بچوں کو اسکول بھیجنے کے معنی سمجھے جاتے ہیں مزید معاشی مواقع کا نقصان ۔ والدین گھر کی آمدنی کم کرنا نہیں چاہتے ۔ اسی لیے وہ تعلیم کے حق میں نہیں ہوتے ۔ بعض پسماندہ طبقوں کے ذہن میں بہت سے وہم، تعصبات، خود ساختہ عقائد اور فرسودہ خیالات سے بھرے ہوئے ہیں جو ان طبقوں اور ان کے بچوں کے تعلیم حاصل کرنے کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں ۔ اکثر سماجی ماحول اور اسکول کے ماحول میں فرق ہوتا ہے ۔ یہ فرق قبائلی علاقوں میں بچوں کو اسکول نہ بھیجے جانے کی ایک اہم وجہ بن جاتا ہے ۔

اگر تعلیم کو صحیح معنوں میں کسی فرد کی آزادی اور نجات کا ایک ذریعہ بننا ہے تو اس کو سب سے پہلے اُس تصور سے بچانا چاہیے جسے پالو فریرے نے تعلیم کا منفعت بخش تصور کہا ہے ۔ اس قسم کا تصور تعلیم کو جمع کرنے کا ایک ایسا عمل بنا دیتا ہے جس میں استاد جمع کرنے والا اور طلبا جمع ہونے والے بن جاتے ہیں ۔

اگر تعلیم کو اتحاد کے سیاق و سباق میں بامعنی بننا ہے تو اس کو اس قسم کے منفعت بخش تصور سے آزاد ہو جانا چاہیے ۔

نئی تعلیمی پالیسی کا پہلا مرحلہ پسماندہ اور غریب افراد کی نشاندہی کرنا ہے اور ان میں خود آگہی پیدا کرنا ہے ۔ دوسرا مرحلہ اُن کو ضروری ذرائع فراہم کرنا ہے تاکہ وہ اپنے اندر خود اعتمادی خود داری اور خود کفالت اور اپنی مدد آپ کرنے کا عزم پیدا کر سکیں ۔ اور نامساعد حالات کا مؤثر طریقے سے مقابلہ کر سکیں ۔ تیسرا مرحلہ اُن کو منظم ہونے کی اہمیت سمجھانا نیز تنظیموں کے مختلف فورموں کے فوائد اور نقصانات سے آگاہ کرنا ہے ۔ چوتھا اور آخری مرحلہ غیر منظم افراد کی تنظیم بنانے کے عمل میں مدد کرنا نیز اس سارے عمل کو اس کے منطقی نتیجے تک پہنچانے کے کام میں مدد کرنے کے لیے ایک معاون ایجنٹ کے طور پر کام کرنا ہے علم کی ترسیل کو میکانیکی بنانے کی بجائے افراد میں اپنے مسائل حل کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے اس سے ان کی تخلیقی صلاحیت کو فروغ ملے گا ۔ ان کی ہنرمندی، خوش تدبیری اور اختراع پسندی سامنے آئے گی ۔

بالغوں کو تعلیم دینے والے استاد کی شخصیت اور تعلیم بالغاں کے تئیں اس کا نقطۂ نظر اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ تعلیم حاصل کرنے والے شخص کی صلاحیت اور رجحان اہم ہے ۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ تعلیم حاصل کرنے والے بالغ میں جھجک اور حجاب ہوتا ہے ۔ وہ اپنے خول میں بند ہوتا ہے اور اپنی بعض دشواریوں اور کمزوریوں کی وجہ سے دوسروں کے سامنے آزادی کے ساتھ اپنی بات نہیں کہہ پاتا ۔ لہٰذا یہ بات تعلیم دینے والے شخص کی شخصیت اور اس کے تدبر پر منحصر ہے کہ وہ بات چیت اور تبادلۂ خیالات کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے والے بالغوں کو اپنے اعتماد میں لے اور اُن کی حوصلہ افزائی کرے تاکہ وہ رفتہ رفتہ اپنی دشواریوں اور خامیوں کا اظہار کر سکیں ۔ اس نفسیاتی بازآبادکاری کے عمل سے وہ اپنے آپ کو اپنے ساتھیوں کے برابر محسوس کر سکیں گے ۔

اس قسم کے مشکل اور غیر رسمی کام میں کامیاب ہونے کے لیے ایک استاد کا عزم مصمم ہونا چاہیے ۔ اور اُسے ان حالات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہونا چاہیے جن میں خود اسے اور تعلیم حاصل کرنے والے شخص کو رہنا ہے ۔ جن متوقع حالات کا بُرا اثر نے تعلیمی پروگرام یا عمل پر پڑتا ہے اُن کی نشاندہی کی جانی چاہیے ۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کا تعلیمی پروگرام روایتی اداروں اور سرکاری اداروں کے ذریعے نہیں چلایا جا سکتا ۔ اس پروگرام کو چلانے کی ذمہ داری پیشہ ور رضاکار اداروں، سماجی کارکنوں نیز ان افراد اور اداروں کو لینی چاہیے جنہیں اس پروگرام کو چلانے کے سلسلے میں مالی وسائل کے لیے باہری ذرائع پر انحصار نہ کرنا پڑے ۔ تعلیم بالغاں کے ایک ایسے پروگرام کو جن میں واقعتاً سب کی شرکت ہو، مکمل طور پر خود کفیل اور مساوات پر مبنی ہونا چاہیے ۔ تب ہی یہ پروگرام صحیح معنوں میں بامعنی اور مؤثر ثابت ہو سکتا ہے نیز قومی یک جہتی کا مؤثر ذریعہ بن سکتا ہے ۔ (لکشمی دھر مشرا)

سیف الدّین کچلو : مجاہد اور مصلح

جبر و استبداد اپنے ساتھ ظلم و ستم کے کیسے کیسے بھیانک نمونے لے کر آتا ہے۔ لیکن عجیب بات ہے : اپنے پیچھے شجاعت اور قوتِ مدافعت کی کیسی کیسی سنہری داستانیں چھوڑ جاتا ہے۔ کہتے ہیں جب تک آدمی خطرے سے دوچار نہیں ہوتا، اس میں مدافعت کی قوتیں بیدار نہیں ہوتیں اور یہ صحیح ہے۔

ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ انگریز سرکار کے خطرے کے خلاف قوتِ مدافعت کیسے کیسے نام اور کیسے کیسے روپ بدل کر نمودار ہوتی ہے۔ منگل پانڈے سے لے کر مہاتما گاندھی تک اور پہلی جنگ آزادی کی کوشش سے لے کر بھارت چھوڑو تحریک تک ایک طویل سلسلہ ہے؛ ایک طرف دار و رسن کا دوسری طرف رقصِ جنوں کا۔ ظلم جیسے جیسے بڑھا، مدافعت میں متناسب اضافہ ہوا۔ جہاں زبان کھولنے پر سروں کا خراج لیا جا رہا ہے وہیں کوئی مغنّی صدائیں لگا رہا ہے: ع :

کتنے بھی چلو بڑھتے ہی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت

جس نے اس صدا پر کان دھرے، اس زندگی سے اوب گیا جو اس کے اندر ہی اندر اس کی سانسوں کو گھونٹ رہی تھی۔ کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک اور بنگال سے لے کر پنجاب تک، آزادی کی آرزو میں موت سے مقابلہ کرنے والے سینکڑوں نام اُبھرے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جن کی روشن جبینوں کی تابندگی کو وقت کی دھول کبھی ختم نہ کر سکے گی۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو ایسا ہی ایک نام ہے۔

سیف الدین کچلو ۱۸۸۸ء پنجاب کے ضلع امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد اصلاً کشمیری تھے۔ لیکن ان کا خاندان پنجاب میں آبسا تھا۔ ان کے والد عزیز الدین کچلو جہاں دیدہ آدمی تھے۔ انہوں نے سیف الدین کی پڑھائی لکھائی پر خاصی توجہ صرف کی۔ ان کی اسکول تک کی تعلیم امرتسر میں ہوئی۔ بعد کی تعلیم آگرہ اور علی گڑھ میں پائی۔ کیمبرج یونیورسٹی سے بی۔ اے، لندن سے بار ایٹ لا اور جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی۔ وطن لوٹ کر وکالت شروع کی۔ وکالت جمی تو سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصّہ لینا شروع کیا۔ یہ وہ دور تھا۔ جب انگریزوں نے ہندوستانیوں کے لیے جزا اور سزا دونوں کے دروازے کھول رکھے تھے، جنہیں جزا خوش آئی، اپنی زندگی ہی میں مر گئے جو سزاؤں سے سرفراز ہوئے وہ مر کر امر ہو گئے۔ سیف الدین کچلو بڑے نصیبوں والے محبِ وطن تھے۔ انہیں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی مساعی کا ثمرہ آزادی کی پہلی کرن دیکھنے اور خوشحالی کی راہ پر بڑھتے ہوئے ہندوستان میں سانس لینے کی سعادت ملی اور جب ۹ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو وہ اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے تو دلوں سے نہیں۔

سیف الدین کچلو ایک آدمی بظاہر عام آدمیوں جیسا رنگ، قد و قامت، ہاڑ کاٹھ ویسا جیسا کسی بھی آدمی کا ہوتا ہے۔ مگر اُن کے کام، کارنامے بس انہیں کا حصہ تھے۔

سیف الدین کچلو بہت نرم گفتار تھے لیکن جب جوش میں آتے تو ان کی شعلہ بار تقریر برف میں آگ لگانے کی تاثیر رکھتی تھی۔ سیاسی زندگی کی ابتدا ہی میں انہوں نے اپنی تقریروں سے انگریز سرکار کے ایوانوں میں کھلبلی مچا دی تھی — ۱۹۱۵ء میں کلکتہ میں حبِ وطن کے جذبوں سے سرشار تقریر کرنے پر بنگال کی حکومت نے انہیں نہ صرف بنگال بدر کیا، بلکہ بنگال میں اُن کی واپسی پر پابندی بھی لگا دی۔ مگر ان کی آواز کو دبانا مشکل تھا۔ وہ جہاں بھی گئے۔ اپنی تقریروں سے دلوں میں آزادی کی جوت جگا دی۔ انگریز سرکار سخت پریشان۔ ۱۹۱۹ء میں اُن کے عوامی جلسوں کو خطاب کرنے پر پابندی لگا دی گئی تو زباں بندی ہوئی تو زنجیر بولنے لگی۔ اُن کی سیاسی سرگرمیوں سے انگریز سرکار عاجز آگئی تھی اُنہیں بار بار جیل میں ڈالا۔ اذیتیں پہنچائیں صعوبتیں دیں۔

زندگی کے تقریباً چودہ سال زنداں کی نذر ہوئے، لیکن آس کی ڈور کبھی نہیں ٹوٹی اٹل یقین کہ آزادی ہمارا حق ہے۔ ہمیں آزادی ملے گی۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو شروع ہی سے انڈین نیشنل کانگریس سے جڑ گئے تھے۔ اپنی انتھک کوششوں سے عوام میں بیداری کی لہر پیدا کی۔ وہ ۱۹۲۴ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے۔ کچھ دنوں کے لیے وہ دلّی اور پنجاب پردیش کانگریس کمیٹیوں کے صدر بھی

منتخب ہوئے۔ کانگریس کے ساتھ ساتھ کل ہند خلافت تحریک میں بھی سرگرم حصّہ لیا۔ کل ہند خلافت کمیٹی کے صدر منتخب کیے گئے۔

پنجاب کے لوگوں کے دلوں میں اُن کے تئیں کتنی عقیدت تھی، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اپنے ساتھیوں میں وہ جلیاں والا باغ کے ہیرو کہلاتے تھے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جلیاں والا باغ کی اس میٹنگ کی صدارت کچلو کو کرنی تھی، جس میں انگریز سرکار نے نہتے ہندوستانیوں پر گولیاں برسائی تھیں۔ اور جو بلاشبہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کا اہم موڑ تھا۔ لیکن میٹنگ سے کچھ دن پہلے سرکار نے اُنہیں گرفتار کرلیا۔ سرکار کے اس اقدام کا ردِّ عمل یہ ہوا کہ منتظمین جلسہ نے اسٹیج پر سیف الدین کچلو کی ایک بڑی سی تصویر آویزاں کردی۔ سچ ہے جو دلوں میں بستے ہیں، اُن کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔

وہ مسلمان کی ترقی چاہتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ دلیش کے لیے تبھی کچھ کیا جاسکتا ہے جب اپنے فرقہ کی اصلاح و بھلائی کے کام انجام دیے جائیں۔ مسلمانوں میں بیداری لانے اور ملی مفاد کے تحفظ کے لیے اُنہوں نے انبالہ کے اہم مسلم رہنما غلام نیرنگ کے ساتھ مل کر تحریک تنظیم شروع کی۔ اپنے خیالات کی ترسیل و تبلیغ کے لیے اُنہوں نے امرتسر سے اردو روزنامہ "تنظیم" کا اجراء کیا۔ جس نے مسلمانوں میں بیداری کی ایک نئی لہر دوڑادی۔

وہ ہندو مسلم رواداری اور یگانگت کے زبردست حامی تھے۔ ان کے قول اور فعل میں کسی قسم کی انتہا پسندی نہیں تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ از اوّل تا آخر صفِ اوّل کے قوم پرست رہنما شمار کیے جاتے رہے۔ وہ مُلکی سیاست پر کسی ایک طبقہ یا فرقہ کے تسلّط کو نہیں مانتے تھے۔ وہ کسانوں، مزدوروں اور محنت کشوں کو ملک کے مستقبل کا معمار مانتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ جب تک انگریز ہمارے ملکی وسائل کا استعمال اپنی معاشیات کو مضبوط کرنے کے لیے کرتے رہیں گے۔ اس دیش کے لوگوں کا استحصال ہوتا رہے گا۔ اُنہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے لاہور سیشن (۱۹۱۹ء) کے اس رزولیوشن کی پُرزور حمایت کی تھی، جس میں پوری آزادی کی مانگ کو انڈین نیشنل کانگریس کا آخری نشانہ قرار دیا گیا تھا۔

چوتھی دہائی ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم موڑ لے کر آئی۔ مُلک کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کی تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ مسلم لیگ اپنے لیے ایک الگ ملک کی مانگ کے لیے رائے عامّہ کو اپنے حق میں کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔ اس زمانے میں دوسرے بہت سارے قوم پرست اور دُور اندیش مسلم رہنماؤں کی طرح سیف الدین کچلو نے بھی اس تحریک کی سخت مخالفت کی۔ وہ ملک کی تقسیم کی مانگ کو کسی بھی صورت میں جائز تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس لیے اُنہوں نے تقسیم کے خلاف مسلمانوں میں رائے عامّہ ہموار کی۔ تقسیم کو وہ قوم پرستی کی پسپائی اور فرقہ پرستی کی جیت خیال کرتے تھے۔

سیف الدین کچلو کے مزاج میں ایک عجیب بے کلی تھی۔ کانگریس کے لیے برسوں کام کرنے کے باوجود آزادی کے بعد وہ قومی اور بین اقوامی سطح پر کانگریس کی پالیسیوں سے منحرف ہوتے چلے گئے۔ زندگی کی آخری دو دہائیوں میں اُنہیں اشتراکی نظریۂ حیات میں ہر دُکھ کا مداوا نظر آنے لگا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں وہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہوگئے۔ سیف الدین کچلو فطرتاً امن پسند آدمی تھے۔ مگر اُنہوں نے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصّہ انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے میں صرف کیا۔ کیوں کہ وہ جنگ کے تعمیری مفہوم کو سمجھتے تھے۔ وہ عالمی امن تحریک کے سرگرم رکن رہے۔ پانچویں دہائی کے اوائل میں کل ہند شانتی پریشد کے صدر منتخب کیے گئے اور لگاتار آٹھ برس تک اس عہدے پر فائز رہے۔

امنِ عالم کے لیے اُنہوں نے جو کوششیں کیں اُنہیں ساری دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ سیف الدین کچلو پہلے ہندوستانی تھے جنہیں عالمی امن کے لیے قابلِ قدر خدمات انجام دینے پر اسٹالن امن انعام ملا تھا۔

(خورشید اکرم)

بقیہ: نئی کتابیں

دونوں سطحوں پر روایت کی بازگشت ہوکر رہ گئے ہیں اور شاعر کی انفرادیت دب سی گئی ہے۔ مقصدیت جب خطیبانہ صورت اختیار کرلیتی ہے تو قاری کے ذوقِ جمال پر گراں گزرنے لگتی ہے۔

کلاسیکی رنگ کی شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے 'لفظ لفظ آئینہ' ایک تحفہ ہے۔ ابہام گوئی، علامت نگاری، استعارہ سازی پیکر تراشی کے اس دور میں ایک صاف ستھرے شعری مجموعے کی اشاعت کسی غنیمت سے کم نہیں۔

بھوپیندر پری ہار عزیز



غیر طلبیدہ مضامین نظم و نثر کی واپسی کے لیے مناسب سائز کا ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ ارسال فرمائیں۔
(ادارہ)

کالی داس گپتا رضا



عارف اور فرزندیِ غالب

غلام حسین خاں مسرور پ ۱۷۸۶/۸۷ء د $\frac{۱۸۵۴}{\text{اکتوبر}}$
محمد اسد اللہ بیگ خاں غالب پ $\frac{۱۷۹۷ء}{۲۷ دسمبر}$ د $\frac{۱۸۶۹ء}{۱۵ فروری}$
زین العابدین خاں عارف پ ۱۸۱۷/۱۸ء د $\frac{۱۸۵۲}{\text{اپریل}}$[1]

غالب، میاں داد خاں سیاح کو ۵ اگست ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"تمہارے ہاں لڑکے کا پیدا ہونا اور اس کا مر جانا معلوم ہو کر مجھ کو بڑا غم ہوا۔ بھائی اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ ۷۴ برس کی عمر میں سات بچے پیدا ہوئے، لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہیں ہوئی ...."[3]

امراؤ بیگم غالب سے دو سال چھوٹی تھیں۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان ساتوں بچوں کی ولادت اور وفات ۱۸۴۹/۵۰ء سے پہلے ہو چکی تھی۔ ذکرِ غالب کے پانچویں ایڈیشن کے ص : ۱۲۶ پر درج ہے :

۲۔ "....جب مرزا غالب کا اپنا کوئی بچہ زندہ نہ رہا، تو انہوں نے زین العابدین خاں (عارف) کو متبنےٰ کر لیا ....
مگر افسوس کہ انہیں عارف کی جوانا مرگی کا داغ اٹھانا پڑا۔ اس جواں صالح کا ...... عین عالمِ شباب میں نکسیر سے بکثرت خون ضائع ہو جانے اور اسہال کے مرض سے اپریل ۱۸۵۲ء (جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ) میں انتقال ہوا۔ انتقال کے وقت عمر صرف ۳۶ برس کی تھی۔"

خسرو مرزا لکھتے ہیں :

۳ "بس ان (غالب) کا رجحان محبت، بوجہ لاولدی، اولادِ بنیادی (بیگم، دختر الٰہی بخش خاں معروف، زوجہ غلام حسین خاں مسرور) سے ایسا والہانہ ہوا کہ انہوں نے زین العابدین خاں عارف کو اپنا بیٹا بنا لیا ....[5]"

"..... زین العابدین عارف ..... کو مرزا غالب نے متبنّیٰ بنایا اور ان کی اولاد کو اپنے گھر کا فرد سمجھا۔[6] ...."

غالب کے عارف کو متبنّیٰ بنا لینے کی بات اوروں نے بھی کہی ہے مگر ان میں سے کوئی ایسا نہیں جس نے غالب یا عارف کو دیکھا ہو اور جو ان کے ہم عصر ہیں وہ اس بات کا قطعاً ذکر نہیں کرتے۔ چنانچہ مولوی کریم الدین گلدستۂ نازنیناں میں عارف کے ترجمے میں لکھتے ہیں ۔

۴۔ "عارف تخلص نواب زین العابدین خاں بہادر، بیٹے نواب غلام حسین خاں بہادر، خلف الرشید جناب نواب

۱۔ کریم الدین تذکرۂ طبقاتِ شعرائے ہند (ص ۴۱۹) میں لکھتے ہیں کہ غلام حسین خاں مسرور والد زین العابدین خاں عارف ..... میں نے ان کو دیکھا۔ قریب ساٹھ برس کے ان کی عمر ۱۲۶۱ھ میں تھی ...." اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مسرور ۱۲۰۱ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔ ۱۲۰۱ھ مطابق ہے ۸۷/۱۷۸۶ء کے۔ (۲) اسی تذکرہ کے ص : ۴۰۰ پر درج ہے : "اس سال میں کہ ۱۲۶۳ھ میں عمر اُس (عارف) کی قریب ۳۰ برس کی ہے کہ یہ اشعار شاعر مذکور کے ہیں ...." گویا ولادت ۱۲۳۳ھ میں ہوئی تھی۔ (۳) یہ غالب کا سہو ہے (یہ خط اردوئے معلیٰ پہلا ایڈیشن ۱۸۶۹ء کے ص ۲۰/۲۱ پر درج ہے)۔ (۴) سنِ ولادت ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷/۱۸ء) قرار پاتا ہے۔ انتقال اپریل ۱۸۵۲ء میں ہوا۔ اس طرح عارف نے عمرِ عزیز کے ۳۵ سال بھی پورے نہیں کیے۔ (۵ و ۶) اصحاب الغالب : ص : ۶۴ - ۸۰ مطبوعہ فروری ۱۹۶۹ء (۷) یہ تذکرہ اواخر ۱۸۴۴ء میں تالیف ہوا اور ۲۹ جولائی ۱۸۴۵ء کو مؤلف ہی کے مطبع رفاہِ عام سے شائع ہوا۔

---

۴۳ - اے، جل درشن، چھٹی منزل، نیپین سی روڈ، بمبئی ۳۶

فیض اللہ بیگ سہراب جنگ کے، اور خواہرزادہ اور شاگرد
نواب اسداللہ خاں غالب معروف بہ مرزا نوشہ کے۔
.... اصلاح شاہ نصیر سے لیتے تھے لیکن بعد
ایک مدت کے جب کہ نواب اسداللہ خاں بہادر واردِ شہر ہٰذا
ہوئے نسبتِ تلمذ بھی ان سے حاصل کی اور طرز و طرحِ اوّل
کو طرح دی .... ان روزوں میں اس عاجز (کریم الدین
مولفِ تذکرہ) کے مکان پر محفلِ مشاعرہ جو منعقد ہوتی ہے
.... یہی صاحب (عارف) میر مشاعرہ ہیں ....
.... دیوان .... معرضِ طبع میں آیا چاہتا ہے ......!

انہیں مولوی کریم الدین نے تین سال بعد ایک اور تذکرہ تالیف کیا جس کا نام طبقاتِ شعرا[1] سے بند رکھا۔ یہ تذکرہ ۱۸۴۷ء میں مکمل ہوا اور ۱۸۴۸ء میں چھپا۔ اس کے **صفحات ۳۹۹ تا ۴۰۱ پر عارف کا ترجمہ درج ہے۔ لکھتے ہیں:**

۵۔ "**عارف تخلص،** نام زین العابدین خاں خواہرزادہ[2] نواب اسداللہ
خاں مرزا نوشہ غالب کے ....
جن ایام میں کہ میرے چھاپہ خانہ میں مشاعرہ ہوا کرتا تھا، یہی شاعر
میرِ مجلس اور میرِ مشاعرہ مقرر تھا ..... اب ان ایام میں بسبب
حدّتِ ذہن اور تیزیِ فکرِ سخن کے سوکھ کر مثل کانٹے کے ہو گیا
ہے، بہت دبلا پتلا سا قد ہے۔ داڑھی بھر کر نہیں نکلی۔
ٹھوڑی ہی پر کچھ بال ہیں .... اس
سال میں کہ ۱۲۶۳ھ ہیں عمر اس کی قریب تیس برس کے ہے ..."

اسی تذکرے کے ص ۴۱۹ پر عارف کے والد غلام حسین خاں مسرور کا ترجمہ بھی ہے، ملاحظہ کیجئے۔

۶۔ "**مسرور۔** نواب غلام حسین خاں بہادر مسرور، والد
نواب زین العابدین عارف کے۔ میری ان
کی ملاقات ایک دفعہ اس طور پر ہوئی تھی کہ نواب زین العابدین
عارف یعنی ان کے بیٹے، جو میرے بہت دوست اور مہربان
ہیں، ان کی بیماری کی خبر کو ان کے گھر گیا تھا۔ اس جاسے میں نے
ان کو دیکھا، قریب ساٹھ برس ان کی عمر ۱۲۶۱ھ میں تھی ......
..... جن ایام میں میرے مکان پر مشاعرہ ہونا شروع ہوا انہوں
نے بھی ایک دفعہ ایک غزل اپنے خلف الصدق عارف
مذکور کے ہمدست روانہ کی تھی ...."

مرزا قادر بخش صابر تذکرۂ گلستانِ سخن میں جو انہوں نے ۱۸۵۵ء میں تالیف کیا تھا، لکھتے ہیں۔

۷۔ "عارف تخلص، نواب زین الدین خاں مرحوم، خلفِ رشید
نواب غلام حسین خاں مسرور مسرور تخلص، شاگرد مرزا اسداللہ
خاں غالب .... سن بارہ سو اڑسٹھ ہجری میں نہضتِ سفر باندھ
کر گلشنِ جناں کی طرف راہی ہوا ...."

حالی۔ یادگارِ غالب میں 'اولاد' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

۸۔ "مرزا صاحب کے اولاد کچھ نہ تھی۔ ابتدا میں سات بچے پے
در پے ہوئے، مگر کوئی زندہ نہیں رہا۔ اس لئے ایک مدت سے
وہ اور ان کی بی بی تنہا زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر غدر کے چند سال
پہلے جب کہ ان کی بی بی کے بھانجے زین العابدین خان عارف
کا انتقال ہو گیا .... تو مرزا اور ان کی بی بی
نے چھوٹے لڑکے حسین علی خاں کو جو اس وقت بہت کم عمر تھا،
اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا ....
جب زین العابدین خاں کی والدہ کا انتقال ہو گیا تو حسین علی
خاں کے بڑے بھائی باقر علی خاں کو بھی مرزا نے اپنی سرپرستی میں
لے لیا ...."

اب اس سے پہلے کہ غالب کے مختلف خطوں کے ذریعے یا دوسرے شواہد و دلائل سے جائزہ لیا جائے کہ غالب اور عارف کے تعلقات حقیقت میں کیا تھے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی ان تین تحریروں کا ذکر کر دیا جائے جن سے ظاہرا اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ عارف واقعی غالب کے متبنیٰ تھے۔

پہلی ۔۔ غالب کے مرثیۂ عارف کا ایک شعر دیکھیے۔

۹۔ "تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور"

دوسری۔ عارف کے انتقال سے تقریباً دو مہینے بعد ۱۸ رجب ۱۸۵۲ء کو لکھتے ہیں۔

۱۰۔ "**منشی صاحب، یہ تو تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم**
میرا فرزند تھا اور اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے
ہیں، میرے پاس آ رہے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں ..."

۱۱۔ تیسری ۔۔ غالب کا وہ قطعہ جو غالب کے کلیاتِ نظمِ فارسی کے ص ۴۶ پر درج ہے یہ مجموعۂ کلام پہلی بار ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ غالب نے متعلق غالب کی تحریر اوپر دی گئی دونوں تحریروں سے پہلے کی ہے۔ دس اشعار کے اس قطعے سے چند اہم شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ [illegible] امراؤ بیگم کے خواہرزادے یعنی بھانجے تھے۔
۲۔ خواہرزادہ زوجہ نواب اسداللہ خاں مرزا نوشہ غالب کے، سو بھتیجے۔

۱۔ خسرو مرزا لکھتے ہیں "بقول نانی اماں معظم زمانی بیگم صاحبہ (زوجہ باقر علی خاں کامل خلف عارف) مرثیہ، مرزا غالب، جنازہ (عارف) کے ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے تھے اور لوگوں کو رلاتے تھے۔" (اصبہار الغالب ص ۴۷) یہ کہانی محض بیانِ ماتم میں شدت لانے کے لئے گھڑی گئی ہے۔
۲۔ اردوئے معلیٰ ص ۷۶۔ پہلا ایڈیشن ۱۸۶۹ء۔ خط بنام تفتہ

آں پسندیدہ خوئے عارف نام [۱] کز رخش شمع دودمان منست

....

آنکہ در بزم قرب و خلوت انس غم گسار دمزاجدانِ منست

....

بتولاے نامِ علی ست چوں بنا شد چنیں کہ جانِ منست

اے کہ میراث خوارمن باشی اندرآورد کہ آں زبانِ منست

....

۲

غالب کے کلام پرنظم ونثر میں پہلے پہل عارف کا ذکر ان کے ایک فارسی خط بنام آزردہ میں آیا ہے۔ یہ خط پنج آہنگ کے مخطوطہ محررہ ۱۸۴۳ء میں شامل ہے۔ لہٰذا یہ جب کا ذکر ہوا جب عارف کی عمرابھی ۱۸ سال سے بھی کم تھی [۲] ۔ اس کا مفہوم یہ ہے۔

۱۲۔ آپ نے مشفقی مرزا اسد بیگ کے لئے جو چارہ سازی کی۔ اس پر رشک آیا۔ اقبال نشاں مرزا زین العابدین خاں کی سفارش کا جو جواب مجھ تک پہنچا ہے۔ اس نے زخموں پر نمک پاشی کی۔ اب جیسے تیسے مکرمی مرزا حاصل بیگ کا کام کردیں۔

پنج آہنگ میں ایک خط [۳] مورخہ ۲۲ مارچ (۱۸۴۳ء) بنام شیفتہ شامل ہے۔ عارف کی عمر اس وقت ۲۵ سال کے قریب ہوگی۔ مفہوم حسب ذیل ہے۔

۱۳۔ جمعہ کی رات کو بزم سخن آراستہ ہوئی مگر چونکہ میں نے غزل نہیں کہی تھی اس لئے اس میں شامل ہونے سے گریز کر رہا تھا کہ ضیاءالدین خاں نے زین العابدین خاں عارف اور غلام حسن خاں محو [۴] کو ہاتھی دے کر میرے یہاں بھیج دیا اور یہ دونوں مجھے اپنے ساتھ ہی لے کر چلے ....

میرے دوستوں میں (از یارانِ بندہ) سے مرزا زین العابدین خاں عارف اور جواہر سنگھ جوہر نے طرحی زمین میں دو غزلیں پڑھ کر نغز گوئی اور ندرتِ فکر کو آسمان تک پہنچادیا ....

پنج آہنگ ہی میں ایک خط [۵] بنام ضیاءالدین احمد خاں ہے جو غالب نے دلی سے آگرہ بھیجا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ضیاءالدین احمد خاں آگرہ کسی کام سے گئے ہوئے ہیں۔ خط پنج آہنگ کی اشاعت اول (۱۸۴۹ء) میں شامل ہے۔ لہٰذا ۱۸۴۹ء سے پہلے کا ہے۔ مگر ۱۸۴۷ء یا اس کے بعد کا ہے کیونکہ بقول کریم الدین [۶]، عارف لڑکپن سے ۱۸۴۷ء تک دلی ہی میں رہے تھے کہیں کا سفر نہیں کیا تھا اور کہ ان دنوں ضیاءالدین احمد خاں اور عارف کی گاڑھی چھنتی تھی۔ خط کے اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ اس سفر میں عارف، ضیاءالدین احمد خاں کے ساتھ تھے۔

۱۴۔ عالیا از ہمدمانِ شمابہ اقبال نشان مرزا زین العابدین خاں دعای رسانم ....

اب چند خطوط [۶] مطلے سے دیکھیے:

ص ۵۷ مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۸۵۹ء بنام تفتہ

۱۵۔ وہ عزیزداری جس کو اہلِ دنیا قرابت کہتے ہیں، اس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے.......... اگر دیکھو تو مجھ کو اس شخص (عبدالرحمٰن) سے جس کے برابر علاقہ عزیزداری کا نہیں۔ از راہِ حسنِ اخلاق اگر عزیز کہہ دیا تو کیا ہوتا ہے.... زین العابدین خاں عارف میری سالی کا بیٹا، یہ شخص اس کی سالی کا بیٹا۔ اس کو جو چاہو سمجھ لو ....

ص ۳۹۲ مورخہ ۲۲ جون (۱۸۶۵ء) بنام امین الدین احمد خاں:

۱۶۔ بھائی غلام حسین خاں مرحوم کے متبنّیٰ ہو کر زین العابدین و حیدر حسن اور ان کی اولاد کو کبھی منہ نہ لگایا.........

۳

خمخانۂ جاوید [۷] میں درج ہے

۱۷۔ عارف۔ نواب زین العابدین خاں۔ نواب غلام حسین خاں...... مسرور مرحوم کے خلف الصدق۔ نواب ضیاءالدین احمد خاں نیر رخشاں کے بھانجے، مرزا غالب کے شاگرد رشید اور سسرال کے رشتہ سے ان کے بھی بھانجے تھے...... عارف ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ۳۵ سال تک دنیا کی ہوا کھائی۔ ۱۲۶۸ھ میں عالم قدس کو سدھارے۔ حالتِ نزع میں جب حضرت غالب عیادت کو تشریف لائے تو بستر پر پڑے پڑے یہ شعر پڑھا ؎

آنکھوں میں دم ہے مثل چراغ سحر ہوں میں
لو لگ رہی ہے جان کو کیا انتظار ہے "

مولوی کریم الدین [۸] لکھتے ہیں:

۱۸۔ نواب ضیاءالدین خان بہادر سے کمال ارتباط اور صحبت اس (عارف) کو رہتی ہے ....

کلیاتِ عارف میں عارف کا ایک ۷ شعر کا قطعہ ہے جو غالب سے مخاطب ہو کر کہا گیا ہے۔ لکھا ہے۔

۱۔ خط کا شروع اور آخر یہ ہے "نسخۂ حاجات، اگرایں بندہ ...... نماند۔ عمر و دولت بحساب افزوں باد۔

۲۔ . . . "جان نہ از تن سپاس دخواہد...... ابر نظرہ فشاں بود بود ہوا تنگرگ بار۔

۳۔ خط کا شروع اور آخر یہ ہے "برادر، اشک آلود غالب نامراد ...... بہ میر کرم علی صاحب سلام۔ والسلام خیر ختام۔"

۴۔ مولف تذکرہ گلدستۂ نازنیناں اور طبقات شعرائے ہند۔ دیکھیے طبقات شعرائے ہند ص ۴۰۰-۴۰۱)

۵۔ پہلا ایڈیشن۔ ۱۸۴۹ء اکمل المطابع دہلی۔

۶۔ جلد پنجم ص ۵۰۹

۷۔ تذکرہ طبقات شعرائے ہند مولفہ ۱۸۴۷ء، ص ۴۰۰

قبلۂ جان و دل ترا فدوی — مجھ کو کہوے برا، یہ طاقت ہے ؟
سدا نشہ نام ہے تیرا — ایک بزرگی کا کچھ نہایت ہے
ورد نامِ بزرگ کا تیرے — اس میں کچھ شک نہیں عبادت ہے
حق نے سب پر کیا تجھے غالب — تجھ سے رُوکش ہو کس کی طاقت ہے ؟
مجھ کو زیبا ہے جتنا ناز کروں — مجھ پہ جب یہ تری عنایت ہے
نظرِ منشیٔ فلک کی مجھے — کچھ نہ پروا ہے کچھ نہ حاجت ہے
عرض کرتا ہوں شکوۂ حسّاد — گرچہ میری خلافِ عادت ہے
وہ سبب میں بیان کرتا ہوں — ان کی جس وجہ یہ شرارت ہے
فیضِ صحبت سے تری تیرا غلام — جو بہ لائقِ امامت ہے
سُنی اس زمرۂ خوارج میں — ہدفِ ناوکِ ملامت ہے
نیّر و محو ہیں مرے دشمن — آسماں کی انہیں نیابت ہے
بات ان کی سنے ہے تیغ سی — دل میں ان کے زبس قساوت ہے
ان کی کیا کیا صفت کروں تحریر — ایک آفت ہے اک قیامت ہے
ایک جلتا ہے رشک سے دائم — بس کہ حُرقت اُسے نہایت ہے
دوسرا محوِ کینہ جوئی ہے — یہ ہمیشہ سے اس کی عادت ہے
زور کرتے ہیں ناتوانوں پر — زُور سے، گرچہ بھاگنا غنیمت ہے
ہیں وہ سارے جہاں کے جھوٹے — قول میں ان کے کب صداقت ہے !

۴

(۱، ۹ (۸) سے ظاہر ہے کہ غالب کے سات اولادیں ہوئیں، لڑکے بھی لڑکیاں بھی۔ غالب یہ بھی بتاتے ہیں کہ ۴۷ برس کی عمر میں ہوئیں۔ جس سے صرف یہ مراد ہے کہ آج (۲۹ اگست ۱۸۶۷ء) تک یا دوسرے لفظوں میں جب تک امراؤ بیگم بچہ پیدا کرنے کے اہل رہیں۔ یعنی تقریباً پچاس برس یا ۱۸۴۹ء تک) ان کی سات اولادیں ہوئیں۔ اس بیان سے حالی کے قول کی نفی ہو جاتی ہے کہ غالب کے ابتدا میں سات بچے پے درپے ہوئے"۔ بالفرض یہ بچے پے درپے بھی پیدا ہوئے ہوں اور ابتدا ہی میں پیدا ہوئے ہیں تو بھی ایسے حالات میں غالب کو متبنٰے کرنے کا خیال پچاس پچپن سال کی عمر سے پہلے نہیں ہو سکتا کیونکہ بیوی بانجھ نہیں اور اس کی بچہ پیدا کرنے کی عمر ابھی باقی ہے۔ غالب ۱۸۴۷ء میں پچاس سال کے اور ۱۸۵۲ء میں پچپن سال کے ہوئے۔ اور اسی سال اپریل ۱۸۵۲ء میں ۲۵ سال کی عمر میں عارف کا انتقال ہوا۔ لہٰذا غالب کا عارف کو باقاعدہ گود لینا ایک مفروضے کے سوائے کچھ بھی نہیں۔ اس کے علاوہ :

۱ (۲) میں مولوی کریم الدین لکھتے ہیں کہ عارف یعنی ان (مسرور) کے بیٹے جو میرے بہت دوست اور مہربان ہیں، ان کی بیماری کی خبر کو ان کے گھر گیا تھا، اس جاے میں نے ان (مسرور والدِ عارف) کو دیکھا۔ قریب ساٹھ برس ان کی عمر ۱۲۶۱ھ میں تھی .... میرے مکان پر مشاعرے (میں) انہوں نے بھی ایک دفعہ ایک غزل اپنے خلف الصدق عارفِ مذکور کے بدست بھجوا نہ کی تھی۔

۳ (۱۷) میں ہے کہ "حالتِ نزع میں، جب حضرتِ غالب، (عارف کی) عیادت کو تشریف لائے تو بستر پر پڑے پڑے (عارف نے) یہ شعر پڑھا ؎

آنکھوں میں دم ہے مثلِ چراغِ سحر ہوں میں
لو لگ رہی ہے جان کو کیا انتظار ہے

ان ہر دو بیانات سے ظاہر ہے کہ عارف جو مسرور کے خلف الصدق تھے کبھی غالب کے ساتھ ان کے گھر میں نہیں رہے۔ وہ مرتے دم تک اپنے گھر یا اپنے باپ کے ساتھ رہے۔ اگر وہ غالب کی فرزندی میں ہوتے تو غالب کے ساتھ غالب کے گھر میں رہتے۔

۱ (۱۰) میں غالب کا تفتہ کو لکھنا کہ "زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا" محض اس کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ غالب، عارف کو بے حد عزیز رکھتے تھے اور مثلِ فرزند کے سمجھتے تھے ورنہ عارف سے اپنا حقیقی رشتہ انہوں نے تفتہ ہی کے نام ایک اور خط میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

۲ (۱۵) "مجھ کو اس شخص (عبدالرحمٰن) سے خس برابر علاقہ عزیزداری کا نہیں۔ از راہِ حسنِ اخلاق اگر عزیز کہہ دیا تو کیا ہوتا ہے۔ زین العابدین خاں عارف میری سالی کا بیٹا۔ یہ شخص (عبدالرحمٰن) اس کی سالی کا بیٹا۔ اس کو جو چاہو سمجھ لو۔"

۵

نواب الٰہی بخش خاں معروف کی دو صاحبزادیاں تھیں۔ بنیادی بیگم[1] اور امراؤ بیگم۔ بنیادی بیگم کا نکاح نواب غلام حسین مسرور سے ہوا اور امراؤ بیگم کا مرزا غالب سے۔ بنیادی بیگم اور مسرور میں زیادہ دن نہ بنی تاہم اس تھوڑی سی مدت میں ان کے دو صاحبزادے پیدا ہوئے۔ زین العابدین خاں (عارف) اور حیدر حسن خاں۔ جب میاں بیوی میں علٰحدگی ہو گئی تو مسرور نے ایک مکان بنیادی بیگم کے نام ہبہ کر دیا اور وہ دونوں بچوں کے ساتھ اس میں رہنے لگیں (مسرور نے بعد میں ایک عورت سنگی بیگم سے نکاح کر لیا تھا، غلام حسن خاں محو اسی دوسری بیوی کے بطن سے تھے۔ محو بھی غالب سے اصلاح لیتے تھے۔) چند وجوہات کی بنا پر غالب، عارف کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ کیوں ؟ یہ ملاحظہ کیجئے۔

(ا) دونوں بھائیوں میں زین العابدین خان زیادہ ہوشیار اور لائق تھے، اور بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ حیدر حسن خاں کو شعر و سخن سے شغف نہ تھا۔ دوسرے ان کی شادی ان کی خالہ بنیادی بیگم کی حقیقی چچازاد ہمشیرہ ماہ رُخ بیگم (دختر نواب احمد بخش خاں) سے ہوئی تھی۔ اس طرح ماہ رُخ بیگم زوجہ حیدر حسن خاں، بنیادی بیگم کی بہو بھی تھیں اور سگی چچازاد بہن بھی۔ وہ

۱۔ ذکرِ غالب (پانچواں ایڈیشن ص ۱۳۶) میں بنیادی بیگم کو بڑی صاحبزادی اور امراؤ بیگم کو چھوٹی صاحبزادی لکھا ہے مگر تلامذۂ غالب (بار دوم ص ۳۹۱) میں بنیادی بیگم کو چھوٹی صاحبزادی لکھا ہے۔

بنیادی بیگم کی اطاعت کما حقہٗ نہیں کرتی تھیں۔ ساس بہو میں جھگڑا رہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ غالب نے بنیادی بیگم ہی کا (جسے وہ مظلوم سمجھتے تھے) ساتھ دیا ہوگا اور حیدر حسن خاں کے رویئے کو ناپسند کیا ہوگا۔

ب) عارف، غالب کے شاگرد تھے؟

ج) ۱ (۱۱) میں دیئے گئے اشعار غالب کے کلیاتِ نظمِ فارسی میں شامل ہیں۔ جو ۱۸۴۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس قطعہ میں یہ شعر خاص اہمیت کا حامل ہے

بتولا فدائے نامِ علی ست

چون نباشد چنیں کہ جانِ من ست

یہ قطعہ عارف کے نام ہے اور قیاس ہے کہ ۱۸۴۰ء میں یعنی شاگردیٔ غالب کے پہلے مرحلے کے بعد کہا گیا ہوگا۔ اس شعر میں غالب نے بڑے ناز سے کہا ہے کہ عارف نہایت عقیدت سے حضرت علیؓ کے نام پر فدا ہے اور ایسا کیوں کر نہ ہوتا وہ میری جان ہے (اس لیے ہر حال میں میری پیروی ہی کرتا)

د) ۳ (۱۹) یہ قطعہ عارف کا فکر کردہ ہے جو غالب کو مخاطب ہو کر کہا گیا ہے۔ اس قطعے کے کئی شعر اہمیت کے حامل ہیں یہاں صرف ایک شعر درج کیا جاتا ہے۔ باقی اشعار پر آگے چل کر بحث ہوگی ؎

فیضِ صحبت سے تیرے تیرا غلام

جو بدِل قائلِ امامت ہے

یعنی اے غالب! تیرا غلام (یعنی عارف) جو تیرے فیضِ صحبت سے بدل و جاں امامت کا قائل ہو چکا ہے۔ یعنی شیعہ بن چکا ہے ...... یہ شعر گویا غالب کے مندرجہ بالا فارسی شعر کی تصدیق و تائید ہے۔

(ہ) ۱ (۹) کے تحت درج شدہ پہلا مصرع دیکھیے:

"تم ماہِ شبِ چاردہم تھے میرے گھر کے"

بظاہر اس کا مطلب یہی ہے کہ تم میرے گھر کے چودہویں کے چاند تھے مگر عین ممکن ہے کہ غالب نے اس ترکیب کی آڑ میں اپنے اور عارف کے مذہب کی طرف اشارہ کیا ہو۔ سب جانتے ہیں کہ "چاردہ معصوم" شیعوں کی مخصوص اصطلاح ہے۔

اب اس بحث کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ غالب عارف کو کیوں بمنزلِ فرزند سمجھتے تھے اگرچہ وہ ان کے باقاعدہ متبنّٰی نہ تھے۔

۶

(ا) جب عارف اپریل ۱۸۵۲ء میں انتقال کر گئے تو ان کے چھوٹے بیٹے مرزا حسین علی خاں (شاداں و خیالی) صرف دو برس کے تھے۔ چونکہ ان کی والدہ یعنی زوجہ عارف چند ماہ پہلے انتقال کر چکی تھیں اس لئے غالب کی بیوی امراؤ بیگم انہیں اپنے پاس لے آئیں۔ عارف کی والدہ بنیادی بیگم اور امراؤ بیگم سگی بہنیں تھیں۔ حسین علی خاں کے بڑے بھائی باقر علی خاں (باقر و کامل) جو حسین علی خاں سے تین برس بڑے تھے۔ عارف کی وفات کے بعد اپنی دادی بنیادی بیگم ہی کے پاس رہے تھے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد وہ بھی غالب ہی کے پاس آ گئے۔ مندرجہ بالا روایت اب عام طور پر تسلیم کر لی گئی ہے۔ لیکن غالب کے خط بنام تفتہ محررہ ۱۸ جون ۱۸۵۲ء سے کچھ اور شبہ ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"(عارف) کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں میرے پاس آ رہے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں ...... مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے۔ مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے۔ ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں کہیں پانی لڑھاتے ہیں، کہیں خاک اڑاتے ہیں۔ میں تنگ نہیں آتا۔"[1]

اب مسئلہ یہ ہے کہ عارف نے اپریل ۱۸۵۲ء (۱۸ جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ) میں وفات پائی۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ یکم اپریل ۱۸۵۲ء (۱۰ جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ) کو مرے تو غالب کے مندرجہ بالا خط تک انہیں انتقال کیے صرف دو ماہ سترہ دن ہوتے ہیں۔ اس خط کی روشنی میں لگتا ہے کہ اس عرصے میں دونوں بچے غالب کے سایۂ عاطفت میں آ چکے تھے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ ایسا عارضی طور پر ہوا ہوگا کیونکہ باقر علی خاں مستقل طور پر اپنی دادی بنیادی بیگم کے انتقال کے بعد ہی غالب کے پاس لائے گئے تھے اور بنیادی بیگم کا انتقال ۱۴ جون (۲۹ رمضان) ۱۸۵۵ء کو ہوا تھا۔[1]

(ii) ۴ (۱۹) کے تحت قطعۂ عارف کی نثر کچھ اس طرح ہوگی (اے غالب) اے قبلۂ جان و دل! تیرا فدوی (یعنی عارف) تجھ کو کس طرح برا کہہ سکتا ہے۔ تیرا نام اسد اللہ (یعنی شیرِ خدا) ہے۔ جس کی بزرگی کی کوئی انتہا نہیں۔ تیرے نام کا ورد۔ عبادت کے برابر ہے۔ تجھے (اے شیرِ خدا) خدا نے سب پر غالب کیا ہے اس لیے کس کی مجال جو تجھ سے سرکشی ہو۔ بلکہ مجھے تو جتنا ناز کروں زیبا ہے کہ تو مجھ پر مہربان ہے۔ مجھے منشیٔ فلک[2] کی نظرِ کرم کی ضرورت ہی

۱۔ اصحابِ غالب ص ۵۰

۲۔ عارف پہلے شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے انہوں نے ایک دیوان بھی "مطلعِ مہرِ سعادت" کے نام سے مرتب کر لیا تھا جو سراسر شاہ نصیر کے اسلوب کا آئینہ دار تھا۔ بعض تذکرہ نویسوں کا کہنا ہے کہ جب مرزا غالب نے دلی کو اپنا مستقر بنا لیا تب عارف نے شاہ نصیر کی شاگردی ترک کر کے غالب کی شاگردی اختیار کر لی، مگر یہ قطعی غلط ہے کیونکہ جب .... غالب مستقل طور پر دلی آئے ہیں اس وقت عارف کے وجود میں آنے میں ابھی لگ بھگ پانچ سال باقی تھے۔ بعض کا خیال ہے کہ جب شاہ نصیر عازمِ دکن ہوئے۔ تب عارف نے غالب سے استفادہ شروع کیا۔ یہ بھی درست نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ نصیر نے دکن کے کئی سفر کیے۔ آخری سفر میں حیدرآباد دکن میں ۱۸۳۸/۳۹ء میں انتقال کیا۔ اس وقت عارف بیس اکیس برس کے تھے۔ میری رائے میں عارف نے شاہ نصیر کی وفات کے بعد ہی غالب سے اصلاحِ کلام کے لیے رجوع کیا۔ وہ پہلے بھی غالب کے عزیز تھے مگر اب غالب اور عارف گویا یکجان ہو گئے۔ حتیٰ کہ غالب کی تقلید میں عارف شیعہ بھی ہو گئے۔

۱۔ مکتوب بنام منشی نبی بخش حقیر ۲۳ جون ۱۸۵۵ء۔ گویا باقر علی خاں مستقلاً غالب کے پاس ۱۴ جون اور ۲۳ جون ۱۸۵۵ء کے درمیان کسی روز لائے گئے تھے۔ عین ممکن ہے کہ ۱۴ جون ہی کو آ گئے ہوں۔

۲۔ عطارد۔ نظامِ شمسی میں سے ایک ستارے کا نام۔ جو تقش میں اسے "تیر" کہتے ہیں۔ اسے علم اور عقل کا نگہبان کہتے ہیں۔ فارسی میں منشیٔ فلک کو دبیرِ فلک بھی کہتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ پر)

شہزاد منظر

قاضی عبدالودود اور افسانوی ادب

قاضی عبدالودود کا نام لیتے ہی ذہن میں ایک جید عالم، بے باک اور جرات مند محقق و نقاد کا تصور ابھرتا ہے اور کسی کے تصور میں بھی نہیں آتا کہ اس شخص کا کسی زمانے میں تخلیقی ادب (خصوصاً افسانے سے) کوئی تعلق بھی تھا اور اگر یہ کہا جائے کہ قاضی عبدالودود نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نویسی سے کیا تو بعض لوگوں کے نزدیک یہ انکشاف کا درجہ حاصل کرلے گا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ قاضی صاحب نے سب سے پہلے افسانہ ہی لکھا اور اس کے بہت عرصے کے بعد تخلیق و تنقید کی جانب توجہ دی۔

انھوں نے ۱۹۳۶ء میں یعنی ۴۲ برس کی عمر میں بانکی پور (پٹنہ) سے ماہنامہ "معیار" کا اجرا کیا۔ اس کے کل پانچ یا چھ شمارے شائع ہوئے۔ یہ رسالہ اپنی نوعیت کا بالکل انوکھا اور معیار کے اعتبار سے بہت بلند پایہ جریدہ تھا۔ قاضی صاحب انہیں دنوں بیمار پڑ گئے تھے اور ان کے لیے "معیار" کو جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔ ان کی علالت کا سلسلہ ۱۹۲۴ء میں یورپ کے قیام کے دوران شروع ہو چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے پھیپھڑے میں خرابی تشخیص کی تھی، جس کے باعث انھیں چھ مہینے سوئٹزرلینڈ میں رہنا پڑا۔ اپنی اسی علالت کے باعث وہ ۱۹۴۷ء تک سکون اور دل جمعی کے ساتھ کام نہ کرسکے۔ میں جس دور کا ذکر کر رہا ہوں، وہ مارچ سے اگست ۱۹۳۶ء تک کا زمانہ ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب انھوں نے خود کو محض تحقیق کے لیے وقف نہیں کیا تھا اور وہ تخلیقی ادب خصوصاً افسانہ، ناول اور ڈرامے (حتیٰ کہ جاسوسی ادب) تک سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ قاضی صاحب "معیار" کے بند ہونے کے بعد اور صحت یاب ہو کر جب ادب کے میدان میں دوبارہ آئے تو انھوں نے پھر تخلیقی ادب کی جانب مڑ کر نہیں دیکھا اور اس طرح ایک تخلیقی فن کار محض محقق بن کر رہ گیا۔

عابد رضا بیدار کا بیان ہے کہ قاضی صاحب کا پہلا افسانہ "آگرہ اخبار" میں شائع ہوا[1]۔ اگر بیدار صاحب افسانے کے عنوان اور آگرہ اخبار میں ان کے افسانے کی تاریخ اشاعت کے بارے میں بھی تفصیل بیان کردیتے تو اردو ادب پر بہت بڑا احسان ہوتا۔ بہرحال اردو ادب خصوصاً افسانوی ادب کے محققین کے لیے قاضی عبدالودود کی افسانہ نگاری اور افسانوی ادب سے ان کی دلچسپی ایک دلچسپ موضوع ہے۔

قاضی صاحب کا پہلا افسانہ

ہمیں قاضی صاحب کا جو پہلا طبع زاد افسانہ ملتا ہے، وہ ان کے اپنے رسالہ "معیار" کے جولائی۔ اگست ۱۹۳۶ء میں "ہونہار نوجوان" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اسے انھوں نے کیمبرج میں زیر تعلیم ایک پنجابی نوجوان (خورشید احمد) کو مثال بنا کر لکھا تھا۔ اس افسانے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ زندگی میں ایسے لوگ ہی ترقی کرتے ہیں جو دوسروں کو استعمال کرنے اور استحصال کرنے کا گر جانتے ہیں۔

قاضی صاحب کا زیر بحث افسانہ اگرچہ کوئی غیر معمولی افسانہ نہیں اور نہ فنی اعتبار سے بہت اہم اور قابل ذکر افسانہ ہے تاہم ان کے عہد میں لکھے جانے والے افسانوں کے معیار کے پیش نظر اسے برا نہیں کہا جاسکتا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ سو فی صد اوریجنل ہے۔ اس دور میں مغربی افسانوں سے خیال اخذ کرکے افسانے لکھنے کا رواج عام تھا، لیکن قاضی صاحب نے ایسا نہیں کیا۔ ان کا افسانہ جیسا بھی ہے، ان کا اپنا افسانہ تھا اور پھر ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ قاضی صاحب بنیادی طور پر افسانہ نگار نہیں تھے،

۱؎ ۳۶، واحد اسکوائر، بلاک ۱۶، گلشنِ اقبال، کراچی۔ ۴۷

[1] ملاحظہ ہو "قاضی عبدالودود کا معیار ۱۹۳۶ء" مرتبہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ۱۹۸۶ء

لیکن انھیں تخلیقی ادب سے دلچسپی تھی جو بعد میں قائم نہیں رہی۔

یہ افسانہ ان کے ذاتی تجربے پر مبنی ہے اور اس کا مرکزی کردار ورما ایک سچا کردار ہے۔ زبان و بیان بہت رواں دواں اور شگفتہ ہے اور کردار نگاری اور منظر کشی بھی خوب ہے۔ اگر قاضی صاحب کے دوسرے افسانے پیش نظر ہوتے تو ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں زیادہ بہتر نتیجہ اخذ کرنا ممکن ہوتا۔ ان کے صرف ایک افسانے کے بارے میں صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے۔

قاضی صاحب کے افسانے سے بحث کرتے ہوئے ان کے دَور کے اردو افسانے کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اس وقت پریم چند کو افسانے لکھتے ہوئے ۲۹ سال[1] اور سجاد حیدر یلدرم کو لکھتے ہوئے ۳۶ سال اور "انگارے" (۱۹۳۳ء) کو شائع ہوئے صرف تین سال ہوئے تھے۔ اس دَور کے بزرگ افسانہ نگاروں میں نیاز، سلطان حیدر جوش اور مجنوں گورکھپوری اور نوجوانوں میں اختر حسین رائے پوری، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور اوپندر ناتھ اشک افسانے لکھ رہے تھے۔ اسی سال انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل پڑی تھی اور اردو کے افسانہ نگار رابندر ناتھ ٹیگور، آسکر وائیلڈ، تاسائی، چیخوف اور موپساں سے گہرے طور پر متاثر تھے۔ اردو میں اگرچہ طبع زاد افسانے لکھنے کا رواج شروع ہو چکا تھا، لیکن اس وقت تک (جب "معیار" منظر عام پر آیا) تراجم کا دَور بھی جاری تھا، اسی لیے "معیار" میں غیر ملکی افسانے خصوصاً چیخوف، موپساں، ایوان بونین، منفلوطی، ایمبروز بیرس، میترلنگ، مولیئر، جیکبس اور ولیم ہارڈی کے تراجم ملتے ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ "معیار" میں قاضی عبدالودود کے سوا کسی دوسرے مصنف کا طبع زاد افسانہ نہیں ملتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دَور میں طبع زاد افسانے لکھنے کی روایت یا تو زیادہ مستحکم نہیں ہوئی تھی یا پھر قاضی صاحب کی نظروں میں کوئی دوسرا افسانہ نگار نہیں جچ رہا تھا لیکن اس دور کے رسائل مثلاً 'ادبی دنیا'، شاہکار، ادبِ لطیف، نیرنگِ خیال اور مساوات کے سالناموں اور افسانہ نمبروں پر قاضی صاحب کے تبصروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دَور میں طبع زاد افسانے خاصی تعداد میں لکھے جا رہے تھے۔

مغربی ادب

قاضی صاحب نے اس دور میں نہ صرف طبع زاد افسانے لکھے، بلکہ اس عہد کے بعض مغربی مصنفوں مثلاً مولیئر، کیتھرین یار، مورس میترلنگ، ولیم گرہارڈی اور ڈ۔ و۔ جیکبس کے افسانوں اور ڈراموں کے ترجمے بھی کیے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے لیے انھوں نے کبھی تماشائی، کبھی عطارد اور کبھی معلّم کا قلمی نام اختیار کیا[3]۔ قاضی صاحب نے "معیار" میں جن مغربی شہ پاروں کا ترجمہ کیا ان میں سے بعض مصنف اگرچہ آج زیادہ معروف نہیں ہیں اور نہ عالمی ادب میں ان کی حیثیت مسلّم ہے، تاہم یہ مصنفین اس دَور میں مشہور اور قابلِ ذکر تصور کیے جاتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ آنے والے دَور نے انھیں فراموش کر دیا لیکن اس سے قاضی صاحب کی پسند اور ذوق کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے میکسم گورکی اور رڈیارڈ کپلنگ کی موت پر جو شذرہ تحریر کیا اس کے مطالعے سے بھی ان مغربی ادیبوں سے ان کی دلچسپی اور ان کی تنقیدی بصیرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

میکسم گورکی

قاضی صاحب نے روس کے انقلابی ادیب گورکی پر جب قلم اٹھایا تو یہ وہ دَور تھا جب برطانوی حکومت نے ہندوستان میں اشتراکیت کی روک تھام کے لیے ہر قسم کے اشتراکی لٹریچر حتیٰ کہ ٹیگور کے "مکتوبات روس" اور پنڈت نہرو کے سفرنامہ روس تک پر پابندی عائد کر رکھی تھی اور تالستائی کا چرچا عام ہونے کے باوجود لوگ گورکی کے نام سے زیادہ واقف نہیں تھے اور سعادت حسن منٹو نے اس وقت تک عالمگیر اور ہمایوں کا "روسی ادب نمبر" مرتب نہیں کیا تھا اور نہ اختر حسین رائے پوری نے میکسم گورکی کی مشہور و معروف آپ بیتی کا اردو میں ترجمہ کیا تھا[4]۔ قاضی صاحب نے میکسم گورکی کی وفات پر شذرہ لکھتے ہوئے گورکی کے صرف سوانح بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انھوں نے روس کے مخصوص تناظر میں گورکی اور چیخوف کی افسانہ نگاری کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا۔ انھوں نے لکھا:

> "روس کے شہرۂ آفاق افسانہ نویس گورکی نے ۱۸ جون ۱۹۳۶ء کو انتقال کیا۔ اس کی پیدائش شہر شرقی نوگوروڈ میں ۲۶ مارچ ۱۸۶۸ء کو ہوئی۔ اس کا باپ رنگریز تھا۔ گورکی کے بچپن ہی میں اس کے والدین انتقال کر گئے۔ نو سال کے سن میں اس نے جوتے کی ایک دکان میں کام کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد اس نے باورچی کا پیشہ اختیار کیا۔ کچھ دنوں تک جہاز کا کام کیا اور پھر مالی کا کام کرنے لگا۔ جب وہ پندرہ سال کا ہوا تو اس نے شہر قازان کے ایک اسکول میں نام لکھوایا لیکن

---

[1] ۔[2] پریم کا پہلا افسانہ "انمول رتن" ۱۹۰۷ء میں اور سجاد حیدر یلدرم کا پہلا افسانہ "نشے کی پہلی ترنگ" ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا۔

[3] قاضی صاحب رسالے کا معیار قائم رکھنے اور غیر معیاری تحریروں سے رسالے کو پاک رکھنے کے لیے اپنا نام بدل بدل کر افسانے اور مضامین لکھتے تھے۔

[4] گورکی کی آپ بیتی کی پہلی جلد ۱۹۴۱ء، دوسری جلد ۱۹۴۲ء اور تیسری جلد ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی

بعض مجبوریوں کے باعث وہ تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ اب وہ نانبائی کا کام کرنے لگا۔ غرض گورکی نے ہمیشہ اسی قسم کی زندگی بسر کی۔ اسے باورچیوں، مالیوں، بھنگیوں، فقیروں، چوروں اور بدمعاش کے حالات پر غور کرنے کا کافی موقع ملا۔ گورکی نے اپنے ناولوں میں اسی قسم کے لوگوں کی زندگی کی مصوری کی ہے۔ اس نے اپنے کرداروں کے حالات بڑے فطری طریقے سے بیان کیے ہیں۔ اس کی تصانیف پڑھنے سے روس کے غنڈوں، بھنگیوں اور گنواروں کی زندگی کا نقشہ ہماری آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔

گورکی نے اس عہد میں جنم لیا جب روس میں ادبی اور سیاسی جدوجہد کا فقدان تھا۔ ترگنیف اور دوستوسکی کے انتقال کے بعد روسی ادب کا میدان سنسان ہوگیا۔ یہ کیفیت جنگ روس و جاپان کے زمانے تک قائم رہی، اسی بے حسی کے عہد میں روس نے چیخوف اور گورکی جیسے ادیب پیدا کیے۔ چیخوف اور گورکی کے افسانوں میں بہت نمایاں فرق ہے۔ چیخوف نے متوسط طبقے کی زندگی کو اپنا موضوع بنایا۔ اس کے کرداروں میں ہمیں عموماً طلبہ، مدرس، تجار، مجسٹریٹ، حاکم وغیرہ نظر آئیں گے۔ اس نے روس کے عہد بے حسی کا خاکہ کھینچا ہے۔ اس زمانے میں روسیوں کی یہ حالت تھی کہ انہیں کسی بات کی مطلق پرواہ نہ تھی۔ ان کی بے حسی عروج پر تھی۔ ان کی زندگی کا کوئی مقصد نہ تھا۔ چیخوف کے افسانوں اور ڈراموں کے کردار، اسی قسم کے بے حس لوگ ہیں۔ گورکی کے افسانوں میں کچھ اور ہی رنگ نظر آتا ہے۔ کشمکش حیات کے فطری مناظر، سماج کے باغیوں کا حوادث سے دست و گریبان رہنا، گورکی، روسی افسانے میں ایک نئے طرز کا موجد ہے۔ اس نے روسی زندگی کے ایسے پہلو پر توجہ کی جس پر اس سے قبل کے افسانہ نگاروں نے مطلقاً غور نہیں کیا تھا۔"

قاضی صاحب نے گورکی کی افسانہ نگاری اور ناول نویسی سے بحث کرتے ہوئے لکھا:

"گورکی کی ادبی زندگی دو ادوار میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ پہلے دور میں ۱۸۹۹ء تک اس نے صرف مختصر افسانے لکھے۔ ۱۹۰۰ء سے اس نے ناول اور ڈرامے لکھنے شروع کیے۔ اپنے ناولوں میں اس نے روسی زندگی کے نقشے کھینچے اور معاشرتی مسائل سے بحث کی۔ ۱۹۰۵ء میں اس نے روس کی انقلابی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔"

قاضی صاحب نے گورکی کی فنی خامیوں کی بھی نشان دہی کی لیکن ساتھ ہی اس کی ادبی عظمت کا بھی اعتراف کیا:

"اس کے اکثر ناولوں میں تعمیری خامیاں ہیں، لیکن اس نے روسی زندگی کی کامیاب مصوری کی ہے۔ اور اس کی ادبی عظمت محض ان خامیوں کی وجہ سے کم نہیں ہو سکتی۔ مختصر افسانوں اور ناولوں کے مقابلے میں اس کے ڈرامے بالکل ناکام ہیں۔ اس نے اپنے حالاتِ زندگی کئی جلدوں میں لکھے ہیں اور ایک روزنامہ بھی لکھا ہے۔ یہ دونوں اس کی بہترین تصانیف میں ہیں۔"

(یادِ رفتگان ماہنامہ "معیار" پٹنہ، جولائی ۱۹۳۶ء صفحہ ۲۷۷)

روسی ادب

قاضی صاحب "معیار" میں "عالم ادب" کے مستقل عنوان سے اردو اور دنیا کی مختلف زبانوں کی ادبی صورتِ حال پر تبصرے کیا کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے "معیار" کے مئی ۱۹۳۶ء کے شمارے میں اس دور کے روسی ادب کے بارے میں جو کچھ لکھا، وہ آج بھی دلچسپی اور ادبی اہمیت کا حامل ہے۔ واضح رہے کہ یہ ۱۹۳۶ء کا ذکر ہے جب سرمایہ دار ممالک عالمی کساد بازاری کے شکار تھے اور دنیا کے مختلف ممالک میں ترقی پسند اور بائیں بازو کے رجحانات تیزی کے ساتھ مقبول ہو رہے تھے۔ فرانس، برطانیہ حتیٰ کہ امریکہ تک میں ریڈیکل ازم نے ادیبوں اور دانشوروں کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایسے وقت میں روس میں ادب کی (خصوصاً مغربی ادب کی) صورتِ حال کیا تھی۔ اس کا اندازہ قاضی صاحب کے زیر بحث تذکرے سے بخوبی ہوتا ہے۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں:

"انگریزی کے جدید و قدیم ادب سے روسیوں کی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ ابھی حال میں شیکسپیئر کے چھ تماشے دکھائے گئے تھے اور ڈکنس کا "پکوک پیپرس" بھی تمثیل کی شکل میں پیش کیا گیا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں اہل قلم کی ایک کانگریس بہ مقام ماسکو منعقد ہوئی تھی، جس میں بالشوی مصنفوں کے علاوہ ممالک غیر کے وہ اہل قلم بھی شریک ہوئے تھے جو ان کے ہم خیال ہیں۔ اس کانگریس

میں متعدد مقرروں نے اس پر زور دیا کہ ادب کے شاہکار پیش کرنے کے لیے راسخ العقیدہ بولشوی ہونا ضروری نہیں اور روسی افسانہ نگار اور شاعر بورژوا مصنفوں کے طریق کار کا مطالعہ کر کے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں میکسیم گورکی، نکولائی بکارین اور کارل راڈک کی تقریروں سے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ بالشوی حکومت بھی انقلاب کے ابتدائی زمانے کے ادبی مسلک کو ناپسند کرتی ہے۔

بالشویوں کے نقطۂ نظر کے تغیر کا اس سے بہتر ثبوت نہیں مل سکتا کہ ۱۹۳۴ء میں اولڈس ہکسلے کے پوائنٹ کونٹر پوائنٹ کا ترجمہ روسی زبان میں شائع ہوا۔ اس کتاب کا لہجہ مایوسانہ ہے اور ایک لمحے کے لیے بھی کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ بالشوی عقائد کی تبلیغ میں اس سے مدد مل سکتی ہے۔ وِلز کی، روسی انقلاب پسند ہمیشہ تضحیک کیا ہے، لیکن ابھی حال میں اس کی چھ کتابوں کا ترجمہ شائع ہوا ہے۔ انگریز اور امریکی مصنفین کی اور کتابیں جو حال میں چھپی ہیں ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں "ون مور ریور" از گولز وردی، "ہیرو کی موت" اور "کرنل کی بیٹی" از رچرڈ ایڈنگٹن، "سورج بھی طلوع ہوتا ہے" از آرنسٹ ہیمنگوے "ایرواسمتھ" از سنکلیر لیوس، "فورٹی سکنڈ پیریلل" از جون ڈون پاسوس "افسانہ نویس کا افسانہ" از اِشروڈ اینڈرسن"

(ماہنامہ "معیار" پٹنہ، مئی ۱۹۳۶ء صفحہ ۱۹۰-۱۹۱)

کپلنگ

ایک زمانہ تھا جب متحدہ ہندوستان میں ریڈیارڈ کپلنگ کا طوطی بولتا تھا اور ۱۹۳۰ء کے عشرے میں تو وہ انگریزی کا سب سے بڑا اور مقبول مصنف تصور کیا جاتا تھا اور نوبل انعام کے حصول نے اس کی شہرت میں چار چاند لگا دیے تھے۔ اور اس کی مقبولیت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا تھا۔ کپلنگ مشہور ادیب ضرور تھا، لیکن وہ عظیم ادیب نہیں تھا۔ اسی لیے اس کا اس دور کے ہندوستانی ادیبوں پر کوئی خاص اثر نظر نہیں آتا جبکہ آسکر وائلڈ، برنارڈ شا اور دوسرے مغربی ادیبوں کے ہندوستانی مصنفین پر اثرات نمایاں ہیں۔ کپلنگ سے ہندوستانیوں کی دلچسپی کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ ہندوستان میں پیدا ہوا تھا۔ ہندوستان کے لوگ اس سے متاثر تھے اور اس نے ہندوستان کے پس منظر میں کئی افسانے اور ناول لکھے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ہندوستان ہی کے ایک مشہور اخبار "سول اینڈ ملٹری گزٹ" سے وابستہ تھا۔ اسی لیے ہندوستانی اس مصنف کو عزیز رکھتے تھے، لیکن کپلنگ کی نظر میں ہندوستان اور اس کے عوام کی کیا قدر و منزلت تھی؟ اس سے تمام لوگ واقف ہیں۔ قاضی صاحب نے کپلنگ کی سامراج پرستی اور ہندوستان دشمنی پر اس وقت نکتہ چینی کی جب ساری دنیا میں اس کی شہرت اور مقبولیت کا ڈنکا بج رہا تھا۔ قاضی صاحب نے صاف لفظوں میں اس کے "اپنے زمانے کا سب سے بڑا کہانی لکھنے والا" تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ قاضی صاحب نے کپلنگ کی وفات پر جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی ان کے تنقیدی کھرے پن کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اس کی وفات فردِ واحد کی موت نہیں بلکہ ایک دَور کے خاتمے کا اعلان ہے۔ کپلنگ انگلستان کے مقبول ترین مصنفین میں ہے اور ایک زمانہ تھا کہ نوجوان اس کا کلمہ پڑھتے تھے۔ اب بھی اس کے ماننے والوں کی تعداد کم نہیں، لیکن نوجوان اس کے نقشِ قدم کو دلیلِ راہ نہیں سمجھتے اور ذہنی حیثیت سے اس کی وقعت گزشتہ سال کی جنتری سے زیادہ نہیں۔ تاہم اس کے متعلق جون مینس فیلڈ، ملک الشعراء انگلستان کے اس قول سے اختلاف مشکل ہے کہ عہدِ وکٹوریہ کے شاندار کارناموں کی قصیدہ خوانی اس سے بڑھ کر کسی شاعر نے نہیں کی اور برطانوی خلافتِ ارض کا ترانہ اتنے بلند سُروں میں کسی نے نہیں گایا۔ اہل ہند کو اس سے بجا شکایت ہے کہ اس نے ہندوستان کی نئی نسل کو سمجھنے کی بالکل کوشش نہیں کی اور ان کی آرزوؤں کی ہمیشہ تضحیک کرتا رہا تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی تحقیر کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اور ان کے مفروضہ نکمے پن کا ذکر مزے لے لے کر کرتا ہے۔ "دی ہیڈ اوف دی ڈسٹرکٹ" کا مطالعہ اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہوگا کہ کپلنگ میں وہ غیر جانبداری نہیں پائی جاتی جو اعلیٰ درجے کے صنعت کاروں کے لیے ضروری ہے اور اسی وجہ سے ہی پول مورآن کے اس قول کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں کہ کپلنگ اپنے زمانے کا سب سے بڑا کہانی لکھنے والا ہے۔"

("عالم ادب" ماہنامہ "معیار" پٹنہ، مارچ ۱۹۳۶ء صفحہ ۱۰۵-۱۰۶)

جاسوسی ادب

یہ بات دلچسپ ہے کہ قاضی صاحب کو اس دور میں نہ صرف سنجیدہ

افسانے اور ناول سے دلچسپی تھی، بلکہ وہ جاسوسی ناولوں کا بھی بڑی دلچسپی سے مطالعہ کرتے تھے اور جاسوسی ادب اور جاسوسی مصنفوں کے بارے میں بھی کافی معلومات رکھتے تھے، چنانچہ وہ "ادب لطیف" کے افسانہ نمبر (۱۹۳۶ء) کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سر کونن ڈوائل ایک خاص طرزِ افسانہ نویسی کے بانی ضرور ہیں اور انہیں حیرت انگیز مقبولیت بھی حاصل ہوئی ہے، لیکن ہومز کی سراغ رسانی کی بنیاد علمی نہیں۔ اس قسم کی سراغ رسانی اگر ہے تو ڈاکٹر تھورن ڈائک میں ہے جو آسٹن فریمین کے افسانوں کا ہیرو ہے۔ ڈوائل کے بہت سے افسانے اردو میں ترجمہ ہو چکے ہیں، مترجمین کو اب فریمین وغیرہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ ناقدانہ مضامین میں ایک بہت دلچسپ ہے۔ اس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ شیخ سعدی دنیا کے پہلے افسانہ نگار ہیں۔ ایسی باتیں کسی رسالے میں دیکھ کر طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ لیکن ادب لطیف کے ایڈیٹر صاحب نے غضب کیا کہ اسی پرچے میں ایک کہانی "دنیا کی قدیم ترین کہانی" کے عنوان سے چھاپ دی اور ایک دوسرا مضمون شائع کر دیا جس میں دنیا کے سب سے پہلے افسانہ نگار لقمان حکیم بتائے گئے ہیں۔"

("مطبوعات جدیدہ" ماہنامہ "معیار"، پٹنہ، جون ۱۹۳۶ء، صفحہ ۶، ۷)

قاضی صاحب کی جانب سے مترجمین کو کونن ڈائل کی جگہ دوسرے مقبول جاسوسی افسانہ نگاروں کے افسانوں کے ترجمے کا مشورہ دینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اس دور میں جاسوسی ادب کا اچھا خاصا مطالعہ کر رکھا تھا۔

ماخوذ افسانے

میں جس عہد کا ذکر کر رہا ہوں اس وقت اردو میں تراجم اور ماخوذ افسانوں کا دور ختم نہیں ہوا تھا اور یلدرم، نیاز، ل احمد اکبر آبادی سے لے کر مجنوں گورکھپوری تک غیر ملکی افسانوں کی بنیاد پر افسانے اور ناول لکھ چکے تھے، البتہ انھوں نے ان افسانوں اور ناولوں کا عنوان اور مقام بدل کر اسے مشرف بہ اُردو کر لیا تھا۔ قاضی عبدالودود نے اپنے رسالہ "معیار" میں ایسے افسانوں اور افسانہ نگاروں پر کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ وہ "ادب لطیف" کے افسانہ نمبر (۱۹۳۶ء) پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"افسانے تعداد میں ۱۴ ہیں، ان میں سے ۲ انگریزی سے ماخوذ ہیں اور ان کے مصنفوں کے نام بھی بتائے گئے ہیں۔ تین افسانوں کے متعلق یہ اعتراف تو کیا گیا ہے کہ دوسری زبانوں سے ترجمہ کیے گئے ہیں، لیکن مصنفوں کے نام بتانے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ دوسرے افسانوں کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ طبع زاد ہیں۔ ان میں سے کم از کم ایک انگریزی سے ماخوذ ہے۔ اسلم صاحب نے ایک تمہید اپنی جانب سے بڑھا دی ہے۔ کل نام بدل دیے ہیں اور ایسی باتیں جو خاص انگریزی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں، حذف کر دی ہیں، لوگ اسے سرقہ کہیں گے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ کسی کو اسلم صاحب پر اعتراض کرنے کا حق نہیں۔ کیا ہمارے یہاں ابتدا ہی سے یہ رسم جاری نہیں؟ کیا شاہ گلشن نے ولی دکنی کو یہ ہدایت نہیں کی تھی کہ ریختے میں فارسی کے مضامین باندھو اور کیا ہمارے شعرا آج تک اس ہدایت پر عمل پیرا نہیں؟ افسانہ نگاروں کے لیے ایک دوسرا معیار کیوں قائم کیا جائے؟"

سحرِ بنگال

آج یہ کوئی راز نہیں کہ سن ۳۰ء کی دہائی میں فضل حق قریشی، طاہرہ دیوی شیرازی کے نام سے ماہنامہ "ساقی"، دہلی میں افسانے لکھتے تھے اور اس دور کے بڑے بڑے ادیب اس فرضی ادیبہ کے عشق میں مبتلا ہو کر انہیں بے بلے عشقیہ خطوط لکھا کرتے تھے۔ بہ ظاہر یہ کہا گیا تھا کہ یہ کوئی بنگالی نژاد بیوہ عورت ہے جس کا شوہر شیراز کا رہنے والا تھا اور جس نے بہت اچھی اردو سیکھ لی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ سارے افسانے نہ صرف اس دور کے موقر ادبی رسالہ "ساقی" میں شائع ہوئے بلکہ انھیں "سحر بنگال" کے نام سے مجموعے کی صورت میں شائع بھی کر دیا اور جس میں کسی خوبصورت بنگالی حسینہ کی تصویر بھی شائع کر دی گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ادبی حلقوں کو مصنفہ طاہرہ دیوی شیرازی کے وجود کا یقین ہو گیا اور نیاز فتح پوری جیسے جید عالم، ادیب اور ماہنامہ "نگار"، لکھنؤ کے مدیر اس سے بالمشافہ ملاقات کرنے کے لیے کلکتے پہنچ گئے۔ جس وقت یہ سارا تماشہ ہو رہا تھا۔ اس وقت قاضی صاحب نے "سحر بنگال" پڑھتے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ کوئی خاتون نہیں ہو سکتی بلکہ اس پردۂ زنگاری میں کوئی اور بول رہا ہے۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں:

"عورتوں کا مردانہ نام اختیار کر کے کتابیں

لکھنا کوئی نئی بات نہیں، جورج ایلیٹ اور ژورژ ساں کے اصلی نام سے لوگ عام طور پر واقف نہ ہوں لیکن مغربی ادب سے سرسری شناسائی رکھنے والا بھی یہ جانتا ہے کہ یہ عورتیں تھیں، جو مردانہ نام سے اپنی کتابیں شائع کیا کرتی تھیں .... اس کی مثال بہت کم ملتی ہے کہ کسی مرد نے زنانہ نام اختیار کرکے کتاب شائع کی ہو اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ہندوستان کے ریختی گو شاعروں نے زنانہ تخلص رکھے، لیکن اپنا کلام خود ہی پڑھتے رہے۔ تاریخ ادبیات میں پیئر لوئی شاید پہلا شخص ہے، جس نے اپنے نتائج فکر ایک عورت کی طرف منسوب کر دیے۔ پیئر لوئی نے اپنی نظموں کا مجموعہ "نغمہائے بیلتیس" کے نام سے شائع کیا تو اپنی حیثیت صرف مترجم کی بیان کی اور اصلی مصنف ایک قدیم یونانی شاعرہ کو قرار دیا۔ پیئر لوئی کا بیان اپنی جگہ پر اتنا مضبوط تھا کہ عامۃ الناس کا کیا ذکر ہے، علمائے یونانیات بھی دھوکا کھا گئے۔ اس کتاب کے ۴۰ سال بعد اردو میں سحرِ بنگال شائع ہوئی ہے۔ سر ورق پر مصنف کی حیثیت سے طاہرہ دیوی شیرازی کا نام ثبت ہے۔ دیباچے میں ان کی داستانِ حیات بیان کی گئی ہے اور اہلِ شک کی طمانیتِ قلب کے لیے مصنفہ کی تصویر بھی کتاب میں شامل ہے، لیکن ان اہتمامات کے باوجود طاہرہ دیوی شیرازی کو عالمِ آب و گِل کی ہستی سمجھنا ضرورت سے زیادہ سادہ لوحی کا ثبوت دینا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ کتاب کسی عورت کی بساط سے باہر ہے یا کسی بیرونی کو اردو پر قدرت نہیں ہو سکتی۔ دُور کیوں جائیے۔ ہمارے زمانے میں اور خود بنگالے ہی میں سروجنی نائیڈو موجود ہیں، جن کو ایک بیرونی زبان انگریزی پر ایسی قدرت حاصل ہے کہ بہت سے انگریزوں کے لیے باعثِ رشک ہو سکتی ہے۔ طاہرہ دیوی شیرازی کے وجودِ خارجی کو تسلیم نہ کرنے کی اصل وجہ ہمیں یہ معلوم ہوتی ہے کہ مولف خود بھی اس کے زیادہ خواہش مند نہیں کہ طاہرہ دیوی شیرازی، ان کی مخلوقِ ذہنی سے زیادہ سمجھی جائیں اور وہ سحرِ بنگال کی تصنیف کے شرف سے محروم کر دیے جائیں۔ ان کے لیے بہ آسانی ممکن تھا کہ طاہرہ دیوی کی داستانِ حیات میں ایسی باتیں درج کرنے سے، جو بعید الاحتمال ہوں، گریز کرتے، لیکن ایک ایسی بنگالی نژاد ہندو عورت، جو شانتی نکیتن کی تعلیم یافتہ، بنگلا، ہندی، اردو، فارسی، انگریزی، فرانسیسی سے صرف واقف ہی نہیں، بلکہ ان زبانوں میں مضمون نگاری کی بھی قدرت رکھتی ہو، سب سے بڑھ کر یہ ایک ایسے مسلمان کی بی بی ہو جو ۱۹۳۱ء میں عہدۂ سفارت پر فائز ہو کر ایران گیا ہو اور جو اب افسانہ نگاری سے بیوی کا غم غلط کر رہا ہو، افسانوں کے صفحات میں مل سکتی ہے، لیکن مادی دنیا میں اس کے وجود سے انکار کرنے کے لیے بہت زیادہ متشکک ہونے کی ضرورت نہیں۔"

(مطبوعات جدیدہ، ماہنامہ "معیار" پٹنہ، مارچ ۱۹۳۶ء صفحہ ۸۲ تا ۸۵)

"سحرِ بنگال" میں چند افسانے ترجمہ اور باقی ماندہ افسانے طبع زاد تھے، لیکن مولف نے سوائے ایک کے کسی افسانے کے اصل مصنف کے نام کی نشاندہی نہیں کی تھی۔ یہ اس دور کا عام رواج تھا، لیکن قاضی صاحب کے لیے تبصرہ کرتے ہوئے یہ مشکل درپیش تھی کہ کسے طبع زاد تصور کیا جائے اور کسے ترجمہ۔ اس لیے کہ ادب میں طبع زاد افسانے اور اس کے ترجمہ کی یکساں اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ اس بارے میں لکھتے ہیں:

"مولف نے دیباچے میں اعتراف کیا ہے کہ "پیشِ نظر مجموعے میں چند افسانے طبع زاد ہیں اور باقی ماخوذ یا ترجمہ" لیکن جہاں تک ترجموں کا تعلق ہے، صرف ایک ہی افسانے کے مصنف کا نام بیان کیا ہے، باقی افسانوں کے متعلق مولف کی طرف سے ناظرین کو حق حاصل ہے کہ انہیں طبع زاد سمجھیں یا ترجمہ۔ مولف کو شاید احساس نہیں ہوا کہ ان کی اس فروگزاشت کی وجہ سے اس کتاب کے متعلق ناقدانہ حیثیت سے کچھ لکھنا کس قدر دشوار ہو گیا ہے۔ ہم کسی افسانے کی تعریف بھی کرنا چاہیں تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مولف کو اچھا افسانہ لکھنے کی داد دیں یا اچھا ترجمہ کرنے کی۔ ادبیات میں مصنف اور مترجم کا مرتبہ ایک نہیں ہو سکتا اور وقت آ گیا ہے کہ ہمارے اہلِ قلم ان دونوں میں جو فرق ہے اسے محسوس کرنے کی کوشش

کریں ۔" (ایضاً)

قاضی صاحب نے اپنے تبصرے میں مصنف کی "عریاں نگاری" پر بھی کڑی نکتہ چینی کی ہے اور واضح کیا ہے کہ اس قسم کی تحریر کوئی عورت نہیں لکھ سکتی۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں :

"دوسری بات جو اس کتاب میں کھٹکتی ہے وہ "دختر کفش دوز" کی عریاں نگاری ہے۔ اگر مولف نے اپنے نام سے یہ کتاب شائع کی ہوتی تو یہ بات چنداں قابلِ گرفت نہ ہوتی، لیکن ایک عورت کی زبان سے (خواہ وہ مولف کے بحرِ تخیل کی موج ہی کیوں نہ ہو) اس "خفیف اختلاف" کا بیان جو صنفِ نازک کو صنفِ کرخت سے جدا کرتا ہے۔ عضویات کی بحث میں ہو تو ہو ادبیات میں قطعی بے محل ہے۔ شاید مولف کی نگاہ اس پہلو پر بالکل نہیں پڑی کہ یہ وہی بات ہے جسے سبزی فروش اپنی زبان میں "چھڑک کر بیچنا" کہتے ہیں۔
(ایضاً صفحہ ۸۴)

قاضی صاحب کی تحریروں میں طنز ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔ خواہ تحقیق ہو یا تخلیق۔ وہ تنقید کرتے کرتے مصنف پر طنز و تشنیع کی بارش کرنے لگتے تھے، چنانچہ وہ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اس دور کے مشہور مصنف اور مدیر شاہد احمد دہلوی (مدیر "ساقی") اور نیاز فتح پوری (مدیر "نگار") کو بھی نہیں بخشتے ہیں۔ وہ ان کا نام لیے بغیر لکھتے ہیں :

"سحرِ بنگال" کے دیباچے میں دو رائیں بھی نقل کی گئی ہیں۔ "خوابِ رنگین" کے متعلق ایک ذمہ دار رسالے کے مرتب، جو خود بھی ترجمے کا کافی تجربہ رکھتے ہیں، فرماتے ہیں "اگر آج موپاساں زندہ ہوتا تو یہ فیصلہ نہ کر سکتا کہ ترجمہ کون سا ہے اور اصل کون سا" موپاساں تو آج زندہ نہیں، لیکن اس کے افسانے زندہ ہیں، پیر اسے ژاں کا دیباچہ بھی موجود ہے، جس میں زبان اور اسلوبِ بیان کے متعلق موپاساں نے اپنے خاص مسلک کی توضیح کی ہے۔ "خوابِ رنگین" کی رنگین بیانی کی ایک خاص نقطۂ نظر سے تعریف کی جا سکتی ہے، لیکن ہمیں بہت شبہ ہے کہ اگر موپاساں اردو سے واقف ہوتا تو اسے اپنے نام سے منسوب کرنے کی اجازت دیتا "ہم جلیس" کی ترکیب موپاساں کی زبان پر نہیں ہو سکتی تھی .....
.... دوسری رائے "سکون کی جستجو" کے متعلق ایک بزرگ کی ہے جو اردو کے مشہور انشا پرداز اور ایک رسالے کے "رئیس التحریر" ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ اس افسانے میں جس اعلیٰ پیرائے میں تجزیۂ نفس (سائیکو انیلسز) کیا ہے، ادبِ اردو میں اس کی مثال ملنی محال ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ افسانہ اچھا ہے اور اگر طبع زاد ہے تو اس کی تصنیف سے مولف کے بہت سے ادبی گناہوں کا کفارہ ہو گیا ہے، لیکن اس افسانے کو قابلِ تعریف سمجھنا اور بات ہے اور اس کو تجزیہ نفسی (سائیکو انیلسز) کے نمونے کے طور پر پیش کرنا اور بات ہے۔ اگر سائیکو انیلسز یہی ہے تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی تحصیل کے لیے ویانا اور زورچ جانا بے سود ہے اور پھر لکھنؤ ہے بھی کس قدر قریب۔ سائیکو انیلسز کے متعلق فرائڈ، ایڈلر اور ژُنگ نے جو کچھ سکھایا ہے اسے حرفِ غلط کی طرح صفحۂ خاطر سے محو کیجیے اور اس ہمہ داں بزرگ کے آگے زانوئے ادب تہ کیجیے جس کے دماغ کی ہمہ گیری کے سامنے عمرو عیار کی زنبیل بھی بے حقیقت ہے ۔"
(مطبوعات جدیدہ" ماہنامہ "معیار" پٹنہ، مارچ ۱۹۳۶ء، صفحہ ۸۵)

حجاب امتیاز علی

حجاب امتیاز علی وہ مصنفہ ہیں جو نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے سے لکھ رہی ہیں اور آج بھی ان کا قلم مسلسل اور باقاعدگی سے رواں ہے۔ قاضی صاحب نے جب اپنا رسالہ "معیار" نکالا، وہ اس وقت بھی نہ صرف لکھ رہی تھیں بلکہ ایک نامور مصنفہ کی حیثیت سے ادب میں تسلیم کی جا چکی تھیں۔ قاضی صاحب نے ان کے افسانوں اور اس کی رومانی اور مصنوعی فضا کے بارے میں آج سے ۵۳ سال قبل جو کچھ لکھا تھا وہ آج بھی درست نظر آتا ہے۔ قاضی صاحب "نیرنگ خیال" (مدیر حکیم یوسف حسن) کے سالنامہ ۱۹۳۶ء میں حجاب امتیاز کے افسانے پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"افسانوں میں اہمیت حجاب امتیاز علی صاحبہ کے "تحفے" کو دی گئی ہے۔ موصوفہ کے اکثر افسانوں میں اَن بیاہی لڑکیوں اور ناتجربہ کار لڑکیوں کا عشق دکھایا جاتا ہے۔ اشخاصِ افسانہ عالمِ محسوس سے تعلق نہیں رکھتے، بلکہ اس خیالی دنیا کے باشندے ہوتے ہیں جس کی سیر کرنے کی موصوفہ خوگر ہیں اور تو اور ان کے مخلوقاتِ ذہنی کے

نام بھی ساری دنیا سے الگ ہوتے ہیں! اجنبی محاورات کے تراجم، اس پر مستزاد موصوفہ کی تصانیف میں جو رومانی اجنبیت (اکزوٹزم) نظر آتی ہے۔ وہ پیئر لوتی کی یاد دلاتی ہے، لیکن پیئر لوتی کبھی جاپان، کبھی ترکی، کبھی حبش کی سیر کراتا ہے۔ موصوفہ نے صرف ایک "ملک"، پر اور وہ بھی ایسا جو دنیا کے موجودہ نقشوں میں نہیں مل سکتا، قناعت کرلی ہے۔ دوسرا بڑا فرق یہ ہے کہ پیئر لوتی الفاظ سے مصوری کرتا ہے۔ موصوفہ کو نہ تو وہ قدرت زبان پر حاصل ہے اور نہ انھوں نے اتنی حسن شناس نظر پائی ہے:

("مطبوعات جدیدہ" ماہنامہ معیار، پٹنہ، اپریل سنہ ۱۹۳۶ء، صفحہ ۱۱۲)

خواجہ غلام السیدین

قاضی صاحب نے اپنے رسالہ "معیار" میں اس دَور کے جن دو "نوواردانِ ادب" کے فن سے بحث کی ہے، ان میں ایک خواجہ غلام السیدین اور دوسرے فیاض محمود ہیں، جو بعد میں اپنے دَور کے اہم مصنف ثابت ہوئے۔ اول الذکر نے بعد میں خود کو ایک معروف ماہر تعلیم کی حیثیت سے منوایا اور موخر الذکر نے ایک مشہور افسانہ نگار کی حیثیت سے۔ فیاض محمود نے "ادبی دنیا" لاہور سے لکھنا شروع کیا تھا اور ان کے افسانے اور تنقیدی مضامین ادبی رسالوں میں شائع ہونے لگے تھے۔ قاضی صاحب نے سنہ ۳۶ء میں ان کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا وہ آج بھی قابلِ ذکر ہے۔ آج کی نسل ان دونوں شخصیات کے علمی و ادبی کارناموں سے زیادہ واقف نہیں ہے، لیکن جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ علم و ادب کی دنیا میں ان کا مرتبہ کتنا بلند ہے۔ اس لیے یقیناً ان دونوں کی افسانہ نگاری کے بارے میں قاضی صاحب کا تبصرہ باعثِ دلچسپی ہوگا۔ قاضی صاحب "مطبوعاتِ جدیدہ" کے عنوان کے تحت سالنامہ "شاہکار" (لاہور) سنہ ۳۶ء کے افسانوں سے بحث کرتے ہوئے خواجہ غلام السیدین کی افسانہ نویسی کو پُرشکوہ الفاظ میں سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

"طبع زاد افسانوں میں خواجہ غلام السیدین کا "قانونی مجرم" خصوصیت کے ساتھ قابلِ داد ہے۔ خواجہ غلام السیدین نے غالباً افسانہ نویسی کے میدان میں ابھی حال ہی میں قدم رکھا ہے، لیکن ان کا انداز کہنہ مشقوں کا ہے"

قاضی صاحب نے "ہمایوں" لاہور کے جنوری سنہ ۳۶ء کے "سالگرہ نمبر" پر تبصرہ کرتے ہوئے فیاض محمود کے بارے میں لکھا:

"فیاض محمود کی ادبی زندگی کی عمر چند سال سے زیادہ نہیں، لیکن ان کے ناقدانہ مضامین سے ان کو نکتہ رسی اور افسانوں کے اصولِ فن سے باخبری کا پتہ چلتا ہے۔ اگر وہ زبان میں صفائی پیدا کریں تو ادبِ اردو میں اپنے لیے مستقل جگہ نکال سکتے ہیں"

(مطبوعات جدیدہ، ماہنامہ "معیار" پٹنہ، اپریل سنہ ۱۹۳۶ء)

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ افسانوی ادب پر قاضی عبدالودود کی یہ تنقیدیں اردو میں فکشن کی تنقید کی اولین مثالوں میں سے ہیں۔ اس وقت افسانے پر تنقید کی باقاعدہ ابتدا نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے کہ خود اردو افسانہ گھٹنوں کے بل چل رہا تھا، البتہ "زمانہ" کانپور اور "ساقی" دہلی میں سنہ ۳۰ء کی دہائی میں اس دور کے بعض ناولوں پر ایک آدھ مضمون یا تبصرے کی مثالیں ملتی ہیں۔ قاضی صاحب نے افسانے پر اگرچہ باقاعدہ کوئی مضمون نہیں لکھا لیکن انہوں نے اپنے رسالہ "معیار" کے تبصروں اور شذرات میں جن تنقیدی آرا کا اظہار کیا وہ اس دور کے تناظر میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

بقیہ: مکتوبات

قیمتی سرمایہ

"آج کل" نے سندھی ادب پر ایک خصوصی شمارہ نکال کر اردو زبان کے قارئین پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ جذباتی ہم آہنگی کی فضا کو بنائے رکھنے، باہمی افہام و تفہیم کے عمل میں بہر طور معاون بنے رہنے اور مختلف زبان و ادب کے قیمتی سرمایہ سے استفادہ حاصل کرنے کے لیے تمام ہندوستانی زبانوں کے قارئین کا یہ اخلاقی فرض بنتا ہے کہ وہ ہر زبان کے ادب کا بنظرِ غائر مطالعہ کریں۔ ہم قارئین اس کے لیے "آج کل" کے ممنون و مشکور ہیں۔ مجموعی طور پر سندھی ادب نمبر ایک بیش بہا انمول ادبی خزانہ ہے۔

ممتاز صنم، کلکتہ

جیرامداس فلک



عروض کی مبادیات

گزشتہ کچھ عرصے میں نظامِ عروض سے متعلق دو اہم کتابیں : کلیدِ عروض اور مسلماتِ فن شائع ہوئی ہیں ۔ ان کے مصنف ڈاکٹر اوم پرکاش اگروال زار علامی ہیں ۔ ان کتابوں میں نظامِ عروض کے مختلف نکات اور پہلوؤں کا تفصیل سے احاطہ کیا گیا ہے نیز بعض نئے مباحث اُٹھائے گئے ہیں ۔ یہ کتابیں علمِ عروض میں اس اعتبار سے اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں کہ بعض فنّی امور اور اصول اس سے بیشتر ایسی تفصیل کے ساتھ زیرِ بحث نہیں آئے ۔ زار صاحب کا یہ مطالعہ عروضی نظام کی تفہیم میں توسیع کا باعث ہوگا

زار علامی صاحب کے بعض معروضات البتہ اہلِ علم سے مزید توجہ چاہتے ہیں ۔ مثلاً کلیدِ عروض میں کسوٹی اجزائے ارکان سوالم و مزاحفات میں سبب خفیف ۔ سبب وقف وتد مجموع ، وتد مفروق ، وتد وقف ، وتد اضافی فاصلہ صغریٰ ، فاصلہ کبریٰ ، فاصلہ وقف اور فاصلہ اضافی تحریر کیے ہیں ۔ (صفحہ ۲۰) زحافاتِ مفرد (صفحہ ۵۵) پر تسبیغ کے تحت لکھا ہے ۔ رکن کے آخر سے سبب خفیف کو سبب اضافی میں بدلنا ۔ کسوٹی اجزائے ارکان میں سبب اضافی کا کوئی ذکر نہیں ۔ اذالہ کے تحت لکھا ہے کہ رکن کے آخر سے وتد مجموع کو وتد اضافی میں بدلنا ۔ کسوٹی میں وتد اضافی میں چوتھا حرف متحرک دکھایا گیا ہے ۔ جیسے فعُولُ ۔ علاتُ ۔ مفاعِ ۔ لیکن اذالہ میں وتد مجموع پر اضافہ شدہ چوتھا حرف موقوف ہوتا ہے ۔ نہ کہ متحرک ۔ اسی طرح تسبیغ میں تیسرا اضافہ شدہ حرف موقوف ہوگا ۔ نہ کہ متحرک جیسا کہ سبب اضافی کا تقاضا ہے ۔

کلیدِ عروض (صفحہ ٦٢) پر تسبیغ و اذالہ و رفع کے تحت لکھا ہے کہ آئینِ عروض کا تقاضا یہ ہے کہ جب کسی رکن کو مزاحف یا مکرر مزاحف کیا جائے تو سالم رکن کی حیثیت ملحوظ رکھنا چاہیے ۔ نہ کہ وہ صورت جو مزاحف ہونے کے بعد نظر آتی ہے ۔ فاعلاتن میں (سبب خفیف + وتد مجموع + سبب خفیف) مخبون مسکّن مفعولن بنا ۔ اسے مرفوع نہیں کر سکتے کہ وسطی وتد مجموع نے زحاف سے متاثر ہو کر یہ صورت بنائی ہے اور اصل رکن میں دو سبب خفیف متوالی نہیں ۔ متفاعلن کے بارے میں لکھا ہے کہ متفاعلن ۔ مضمر ہو کر مس تف علن بنتا ہے جو مرفوع ہو کر فاعلن ہو سکتا ہے ۔ جب اصل رکن میں دو سبب خفیف متوالی نہیں ہیں بلکہ فاصلہ صغریٰ ہے تو اس پر رفع کا عمل کیونکر ہو سکتا ہے ؟

مرکب زحافات کے تحت (صفحہ ۵۷) پر لکھا ہے کہ نحر عروض و ضرب سے مخصوص ہے اور صلم + حذف سے مرکب ہے ۔ صلم کی تعریف (صفحہ ۵۵) پر لکھی ہے کہ رکن کے آخر سے وتد مفروق گرا دینا اور حذف کی تعریف (صفحہ ۵۴) پر لکھی ہے کہ رکن کے آخر سے سبب خفیف گرا دینا ۔ نحر کا عمل مفعولاتُ میں صلم + حذف کے تحت لاتُ اور عُو کے سقوط سے کیا گیا ہے ۔ جب کہ دونوں زحاف رکن کے آخر کو ساقط کرتے ہیں ۔ یہاں صلم کا عمل تو ہو سکتا ہے کیوں کہ آخر میں وتد مفروق ہے ۔ حذف کا عمل نہیں ہو سکتا ۔ کیوں کہ آخر میں سبب خفیف نہیں ہے ۔ اسی طرح ہتم (صفحہ ۵۸) مرکب ہے ۔ حذف + قصر سے ۔ اور دونوں زحاف رکن کے آخری سبب خفیف پر عمل کرتے ہیں ۔ لیکن اس کا عمل مفاعی لُن میں آخری سبب خفیف اور وسطی سبب خفیف پر کیا گیا ہے اور اس سے فعولُ حاصل کیا ہے جو آئینِ زحافات کے خلاف ہے ۔ اسی طرح (صفحہ ۵۸) پر جدع جو صلم + قصر کا مرکب لکھا ہے ۔ اس کے تحت مفعولاتُ سے فاع حاصل کرنا بھی از روئے عروض غلط ہے

عملِ غلط زحافات (صفحہ ۸۱) کے تحت لکھا ہے کہ مُس تفع لُن سے

C-105 F ، ایم آئی جی فلیٹ ، گورو تیغ بہادر انکلیو ، دہلی ۱۱۰۰۹۳

تفعِ (محذوف) اور پھر مس تفعِ سے مس تف (مکشوف) یہاں تک درست
ہ۔ کشف کا عمل رکن کے آخر کے وتد مفروق میں دوسرے حرفِ متحرک کو
نے کی شکل میں ہوتا ہے۔ یہاں وتد مفروق وسط میں واقع ہوا ہے، جس پر
مل نہیں ہو سکتا۔

کلیدِ عروض (صفحہ ۴۷) پر مس تف علن سے احذ + محذوف
بحت فع حاصل کیا ہے۔ حذف کا عمل ہو ہی نہیں سکتا کیوں کہ رکن
ہ آخر میں وتد مجموع ہے۔ سبب خفیف نہیں۔ فع حاصل ہو سکتا ہے لیکن
فع اور حذذ کے زحافات سے۔ حذذ اور حذف سے حاصل کرنا سراسر غلط ہے۔

صفحہ ۹۵ پر لکھا ہے کہ آیاتِ وجدانی میں حضرت یگانہ چنگیزی
ا ایک غزل شائع ہوئی ہے یہاں بطورِ مثال اس غزل کا صرف ایک شعر
نیا جاتا ہے۔ ؎

دل ایک ہی فتنہ ہے لیکن بیدار نہیں تو کچھ بھی نہیں
ہاتھ میں کس بل لاکھ سہی تلوار نہیں تو کچھ بھی نہیں

دونوں مصاریع الگ الگ بحروں کے ارکانِ مزاحفہ پر مشتمل ہیں۔ لہٰذا شعر ناموزوں ہو گیا۔ مصرعِ اولیٰ بحرِ متدارک میں ہے۔ مسلّماتِ فن (صفحہ ۲۸) پر خزم کے تحت لکھا ہے کہ اس زحاف کی تعریف یہ ہے (اضافۂ یک تا چہار حروف در صدر و در ابتدا کمتر بیرونِ ارکانِ وزنِ شعر لیکن بمعنی لازم) یعنی کسی مصرع کے شروع میں ایک سے چار حروف وزنِ شعر کی حد سے زیادہ کر لینے کو خزم کہتے ہیں۔ یہ حروف تقطیع میں شمار نہیں ہوتے۔ میرزا نوشہ نے تفتہ سکندرآبادی کی ترغیب پر ایک رباعی اس سلسلے میں بطورِ تمثیل تخلیق کی تھی جو اس طرح ہے ؎

دکھ جی کو پسند ہو گیا ہے غالبؔ
(دل) رک رک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ

یہاں دل ابتدا میں خزم کی مثال ہے۔

یگانہ چنگیزی کے شعر میں بھی دل مصرعِ اولیٰ میں خزم کی مثال ہے تقطیع ملاحظہ ہو:

(دل) اک | و فتنہ | ہے لے | کن بے | دار | نہیں تو | کچھ بھ | نہیں
فاع | فعولن | فعلن | فعلن | فاع | فعولن | فاع | فعَل

ہاتھ | م کس بل | لاکھ | سہی تل | وار | نہیں تو | کچھ بھ | نہیں
فاع | فعولن | فاع | فعولن | فاع | فعولن | فاع | فعَل

دونوں مصاریع بحرِ متقارب میں ہیں اور شعر موزوں ہے۔
مسلّماتِ فن (صفحہ ۸۳) پر لکھا ہے کہ خزم کا اطلاق غالبؔ کی اس رباعی پر ضرور ہوتا ہے۔

کلیدِ عروض (صفحہ ۱۴۵) پر بحرِ بسیط کے تحت لکھا ہے کہ یہ بحر دائرۂ مختلفہ سے اخراج پائی ہے۔ ارکان حسبِ ذیل ہیں: مس تف علن۔ فاعلن۔ مس تف علن۔ فاعلن۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ بحر۔ بحرِ رجز مثمن سالم مرفوع مفاعلن ہے (صفحہ ۱۴۸) پر لکھا ہے کہ لہٰذا بحرِ رجز کے ہوتے بحرِ بسیط بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ (صفحہ ۱۵۰) پر بحرِ وسیع کے تحت لکھا ہے کہ یہ بحر دائرۂ مختلفہ سے اخراج پائی ہے اور علامہ عشق آبادی (سحر عشق آبادی) کی ایجاد کردہ ہے (صفحہ ۱۵۱) پر لکھا ہے کہ از روئے عروض یہ بحر بالکل درست ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ بحر۔ بحرِ بسیط کے ارکان کی برعکس صورت ہے۔ بحرِ رجز کے ہوتے اگر بحرِ بسیط بے معنی ہے تو بحرِ وسیع چہ معنی دارد؟ (صفحہ ۳۴) پر بحرِ وسیع کے تحت لکھا ہے کہ بحرِ وسیع کی مزاحف صورتیں اپنی جگہ مسلّم ہیں۔ ان کا نہ بحرِ رجز سے تعلق ہے اور نہ بحرِ مدید ہے۔ لہٰذا اس بحر کی اپنی جداگانہ حیثیت ہے۔ بحرِ وسیع کی مزاحف صورتوں کا بحرِ رجز سے غیر متعلق ہونے کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی۔

کلیدِ عروض (صفحہ ۲۸) پر دائرۂ منعکسہ کے تحت بحرِ جمیم مسدس کا وزن یہ لکھا ہے: فاعلاتن۔ مس تفع لن۔ مس تفع لن۔ لیکن مسلّماتِ فن (صفحہ ۱۷) پر محقق طوسی کا سہو کے تحت نمبر ۹ بحرِ جمیم مسدس کا یہ وزن لکھا ہے۔ فاعلاتن۔ مس تفع لن۔ فاعلاتن۔ کلیدِ عروض میں یہ وزن بحرِ خفیف مسدس کا لکھا ہے۔ یہ کس کا سہو ہے۔

دائرے

مسلّماتِ فن (صفحہ ۱۱) بطلان کے تحت لکھا ہے کہ "چونکہ ہر دائرہ کی ابتدا ایسے رکن سے ہوتی ہے جس کے شروع میں وتد مجموع واقع ہوتا ہے" یہ محض غلط فہمی ہے۔ کیوں کہ (۱) کسی عروضی کتاب کا حوالہ نہیں دیا گیا جس سے اس پابندی کی تصدیق ہوتی ہو۔ ترجمہ حدائق البلاغت (صفحہ ۱۱۳) پر دائرۂ مؤتلفہ بحرِ کامل سے شروع کیا گیا ہے۔ جس کے ارکان یہ ہیں: متفاعلن متفاعلن۔ متفاعلن۔ متفاعلن۔ رکن متفاعلن میں پہلے فاصلۂ صغریٰ ہے اور پھر وتد مجموع ہے۔ اسی طرح دائرۂ مشتبہ (صفحہ ۱۱۶) پر بحرِ سریع سے شروع ہوتا ہے جس کے ارکان یہ ہیں: مس تف علن۔ مس تف علن مفعولات ہیں۔ رکن مس تف علن سببِ خفیف سے شروع ہوتا ہے۔ ترجمہ حدائق البلاغت کا جو نسخہ پیشِ نظر ہے۔ اس میں سحر عشق آبادی نے جہاں ضروری سمجھا ہے، وہاں اپنی رائے دی ہے اور حسبِ ضرورت تصحیح بھی کی ہے۔ لیکن ان دائروں کی تشکیل کے بارے میں نہ تو رائے دی ہے اور نہ تصحیح کی

ہے اور نہ کہیں ایسا لکھا ہے کہ دائرے وتد مجموع سے شروع ہونے چاہئیں۔

(۲) اس پابندی کے جواز میں کوئی معقول وجہ بھی بیان نہیں کی گئی جس سے اس کو لازمی سمجھا جائے۔ مسلماتِ فن (صفحہ ۲۵) پر لکھا ہے کہ بحور نکالنے کے لیے دائرے وضع کیے اور اسی بحر کو حقیقی قرار دیا جو کسی دائرہ سے حاصل ہوئی۔" یہ بھی غلط فہمی ہے۔ مسلماتِ فن (صفحہ ۱۲) پر لکھا ہے کہ اوّل۔ دائرہ مختلفہ مثمنہ :۔ اس دائرہ کے ابتدائی وزن میں ارکان کی ترتیب و تکرار میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ پہلے رکن خماسی آئے اور اس کے بعد رکن سباعی۔ دائرے کی ابتدا بحر طویل فعولن۔ مفاعی لن۔ فعولن۔ مفاعی لن سے کی گئی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابتدائی وزن کی تشکیل کس فارمولے کے تحت کی گئی ہے پہلے رکن خماسی آئے یا سباعی آئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیوں کہ اسی دائرہ میں بحرِ عریض بھی شامل ہے جس کے ارکان یہ ہیں۔ مفاعی لن۔ فعولن مفاعی لن۔ فعولن۔ یہ دائرہ سحر عشق آبادی کا مرتب کردہ ہے اور کلیدِ عروض (صفحہ ۳۰) پر درج ہے۔ اس دائرے کو بحرِ عریض سے بھی شروع کیا جا سکتا ہے اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خماسی یا سباعی ارکان کی تقدیم و تاخیر سے کوئی اصول یا فارمولہ مرتب نہیں ہوتا۔ مسلماتِ فن (صفحہ ۵۸) پر دائرہ مختلفہ جدید کے تحت لکھا ہے۔

ہمارے عروضیوں نے مرکب بحور تین دائروں سے وضع کی ہیں :

۱۔ دائرہ مختلفہ

۲۔ دائرہ متوافقہ یا مشتبہ

۳۔ دائرہ منعکسہ

جب ان دائروں کو غور سے دیکھا جاتا ہے تو ہمارے سامنے مندرجہ ذیل حقائق آتے ہیں :

ا۔ دائرہ مختلفہ مسدسہ کی ابتدا فعولن۔ مفاعی لن۔ مفاعی لن یعنی بحر طویل سے کی گئی ہے اور تیسرا رکن دوسرے رکن کے مطابق رکھا گیا ہے۔

ب۔ دائرہ مشتبہ مسدسہ کی ابتدا مفاعی لن۔ فاع لاتن۔ مفاعی لن یعنی بحر مضارع سے کی گئی ہے جس میں تیسرا رکن۔ رکن اوّل کے مطابق رکھا گیا ہے

ج۔ دائرہ منعکسہ جو (عبداللہ قریشی کی ایجاد ہے) کی ابتدا : مفاعی لن۔ فاع لاتن۔ فاع لاتن یعنی بحر سریع سے کی گئی ہے اور تیسرا رکن مطابق رکن دوم رکھا گیا ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کے پیشِ نظر اگر ہم (مصنف مسلمات فن) مفاعی لن۔ فاع لاتن۔ بحر مضارع مسدس کی ترتیب کی طرح فعولن۔ مفاعی لن۔ فعولن کی ترتیب سے ایک نیا دائرہ وضع کریں اور نئی بحریں ایجاد کریں تو عروض کا وہ کون سا قاعدہ یا دفعہ ہے جو ہمیں (مصنف مسلماتِ فن) ایسا کرنے سے روکتا۔

مسلماتِ فن (صفحہ ۱۴) پر لکھا ہے کہ دائرہ مختلفہ مسدسہ کو جب غور سے دیکھا جاتا ہے تو ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے۔

نمبر ا۔ تمام بحروں میں اگر پہلا رکن خماسی آیا ہے۔ تو دوسرا رکن سباعی ہے (اور تیسرا رکن سباعی آیا ہے۔ فلک) یا اگر پہلا رکن سباعی آیا تو دوسرا رکن خماسی آیا ہے اور تیسرا رکن سباعی ہو کر آیا ہے۔

دائرہ مختلفہ جدید (مسلماتِ فن صفحہ ۵۸) مندرجہ بالا ترتیب (نمبر I) کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تشکیل دیا جانا چاہیے تھا۔ لیکن یہ دائرہ مشتبہ مسدسہ میں شامل بحرِ مضارع یعنی مفاعی لن۔ فاع لاتن۔ مفاعی لن کی طرح تشکیل دیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا تینوں دائروں کا تیسرا رکن سباعی ہے۔ کسی بھی دائرہ پر مشتمل سالم مسدس بحریں خماسی رکن پر ختم نہیں ہوتیں۔ ان حقائق کی روشنی میں دائرہ مختلفہ کی تشکیل سراسر غلط ہے۔

مسلماتِ فن (صفحہ ۹۲) پر لکھا ہے کہ کسی کلام کا موزوں یا ناموزوں ہونا بحر کے تعین پر منحصر ہے اور بحر کا تعین ہمیشہ مطلع سے ہوتا ہے۔ آئیے اب میر کی غزل کے اشعار دیکھیں۔

نمبر I ؎ تجھ عشق میں تو مرنے کو تیار بہت ہیں
یہ جرم ہے تو ایسے گنہگار بہت ہیں

یہ وزن بحر ہزج مثمن اخرب۔ مکفوف۔ مکفوف۔ محذوف میں ہے۔

نمبر II ؎ اک زخم کو میں ریزہ الماس سے چیرا
دل پر ابھی جراحتِ نو کار بہت ہیں
مفعول۔ فاع لات۔ مفاعیل۔ فعولن
(یہ مصرع کسی بحر میں نہیں)

نمبر III ؎ کچھ انکھڑیاں ہی اس کی نہیں اک بلا کہ بس
دل زینہار دیکھ خبردار بہت ہیں
مفعول۔ فاع لات مفاعیل۔ فعولن
(یہ مصرع کسی بحر میں نہیں)

مصرعِ اولیٰ بحر مضارع مثمن اخرب۔ مکفوف۔ مکفوف۔ محذوف میں ہے۔ چونکہ بحر بدل گئی۔ لہٰذا غزل ناموزوں۔

کسی کلام کا موزوں یا ناموزوں ہونا بحر کے تعین پر منحصر ہے اور بحر کا تعین ہمیشہ مطلع سے ہوتا ہے۔ میر کی غزل کو بحرِ ہزج میں بتایا گیا ہے۔ یہ تعین سراسر ہے۔ اس لیے میر کی غزل کو ناموزوں کہنا بے بنیاد ہے۔ اس غزل کے دو اشعار اور بھی ہیں۔

نمبر IV ـ بیگانہ خو رقیب سے وسواس کچھ نہ کر
فریاد سے ہنک زباں سے تو کچھ یار بہت ہیں
مفعول ـ فاع لات ـ مفاعیل ـ فاع لن
مفعول ـ فاع لات ـ مفاعیل ـ فعولن

نمبر V ـ کوئی تو زمزمہ کرے میرؔ آسا دل خراش
یوں تو قفس میں اور گرفتار بہت ہیں
مفعول ـ فاع لات ـ مفاعیل ـ فاع لان
مفعول ـ فاع لات ـ مفاعیل ـ فعولن

یہ غزل مولوی عبدالباری آسی کی مرتب شدہ کلیاتِ میرؔ کے صفحہ ۱۱۱ پر درج ہے۔

اس غزل کی موزونیت دیکھنے سے پہلے ضروری ہے کہ مصنف مسلماتِ فن کا مضمون صوتی اکائیاں (قسط ۴) مطبوعہ "پیغام" سونی پت، مورخہ ۲۶ر جولائی ۱۹۸۲ء دیکھ لیا جائے۔ اس میں صفحہ ۳ پر لکھا ہے کہ ان اوزان میں جن کے عروض وضرب میں متحرک الآخر رکن واقع ہو۔ شعر کہنے کے لیے سلیقہ کی ضرورت ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

آج وہ کہاں ہے کل جو تھا فسانہ — وہ بھی تھا زمانہ یہ بھی ہے زمانہ

تقطیع :-

آج وہ کہاں ہَ کل جَ تا فسانہ — وہ بِ تھا زمانہ یہ بِ ہے زمانہ
فاع فاع لات فاع فاع لاتُ فاع فاع لات فاع فاع لاتُ

مصنف مسلماتِ فن نے جو وزن فاع ـ فاع لات ـ فاع ـ فاع لات وضع کیا ہے۔ اس کے سالم ارکان ـ مفعولات ـ مفعولات ـ مفعولات ـ مفعولات ہیں۔ کلیدِ عروض (صفحہ ۲۳) پر اس کی مقلوب صورتیں یہ درج ہیں۔ (۱) فاع لاتن (۲) مس تفع لن ـ دائرے جو بنائے گئے ہیں۔ ان میں اصل صورت اور ان کی مقلوب صورتیں شامل ہیں۔ یعنی فاعلن (۴ بار) اور فعولن (۴ بار) دوسرے دائرے میں مس تفع لن (۴ بار) کے ساتھ مفاعی لن (۴ بار) اور فاعلاتن (۴ بار) کی بحریں شامل ہیں۔ اسی طرح متفاعلن (۴ بار) اور مفاعلتن (۴ بار) پر مشتمل دائرہ بنایا گیا ہے۔ لیکن مندرجہ بالا وزن کے لیے نیا دائرہ بنانا پڑے گا۔ جو مفعولات (۴ بار) ـ فاع لاتن (۴ بار) ـ مس تفع لن (۴ بار) کی بحروں پر مشتمل ہوگا۔ مسلماتِ فن کا کہنا ہے کہ ہر دائرہ وتدِ مجموع (ص: ۱۱) سے شروع ہوتا ہے ـ لیکن ان تینوں ارکان میں وتدِ مجموع سے شروع ہونے والا کوئی رکن نہیں ـ لہٰذا یہ مفروضہ بالکل غلط ثابت ہوتا ہے۔ اس دائرے سے نکلنے والی تین بحروں میں سے پہلی بحر مفعولات (۴ بار) کے مزاحف ارکان سے مندرجہ بالا وزن فاع ـ فاع لات ـ فاع ـ فاع لات حاصل ہوتا ہے۔ یہ وزن فاع لاتن کے مزاحف ارکان سے بھی حاصل ہو سکتا ہے لیکن اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ مفعولات سے حاصل ہونے والے مزاحف ارکان کے نام یہ ہیں : فاع (مطوی اصلم) ـ فاع لاتُ (مطوی) ـ فاع (مطوی اصلم) ـ فاع لاتُ (مطوی)

دائرے کا نام مجتلبہ مفروقی رکھا جا سکتا ہے اور بحر کا نام بحرِ لطیف ہو سکتا ہے۔

میرؔ کی غزل ان حقائق کی روشنی میں دیکھیے۔ مفعولات کے مزاحف ارکان یہ ہیں ـ

مفعول	مفاعیلُ / فاع لاتُ	ـ فعولُن / فاع لُن / فعولان / فاع لان
مرفوع	مجزون / مطوی	ـ مکشوف مخبون ـ مکشوف مطوی ـ موقوف مخبون ـ موقوف مطوی
صدر وابتدا	حشوین	عروض وضرب

مندرجہ بالا زحافات سے پتہ چلتا ہے کہ حشوین میں مفاعیلُ اور فاع لاتُ دونوں کا اجتماع جائز ہے۔ اسی طرح عروض وضرب میں فعولُن فاع لُن ـ فعولان اور فاع لان کا اجتماع جائز ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ غزل مفاعی لُن کے مزاحف ارکان پر مشتمل نہیں بلکہ مفعولات کے مزاحف ارکان پر مشتمل ہے اور تمام وکمال غزل موزوں ہے اور اس کو ناموزوں کہنا غلط فہمی پر مبنی ہے۔ یہ مزاحف ارکان کلیدِ عروض (صفحہ ۷۶) پر درج ہیں۔

ہر دائرے کا ابتدائی وزن جس فارمولے کے تحت وضع ہوتا ہے۔ اسی فارمولے سے باقی اوزان وضع کیے جانے چاہئیں۔ اس فارمولے کو دریافت کرنا ضروری ہے۔

خلیل بن احمد نے ارکانِ عشرہ کی باہمی ترکیب و تکرار سے بحریں وضع کیں۔ ان سے مفرد اور مرکب بحریں عالم وجود میں آئیں۔ جہاں تک مفرد بحروں کا تعلق ہے ان میں تکرار کا اصول کارفرما ہے۔ جیسے مفاعی لن (۴ بار) مس تف علن (۴ بار) فاعلاتن (۴ بار) مفاعلتن (۴ بار) متفاعلن (۴ بار) فعولن (۴ بار) فاعلن (۴ بار) جہاں تک مرکب بحروں کا تعلق ہے (۱) خماسی اور سباعی ارکان کو ملا کر بحریں تشکیل دی گئیں (۲) مجموعی اور مفروقی ارکان کو ملا کر بحریں بنائی گئیں۔

خماسی اور سباعی ارکان میں چونکہ ایک سبب خفیف کا فرق رہتا ہے اس لیے اس کو چھوڑ کر باقی سبب اور وتد کی ترتیب یکساں ہونی چاہیے۔ یہ سبب خفیف رکن کے شروع اور درمیان میں بھی ہو سکتا ہے اور آخر میں بھی۔ جیسے یہ بحریں (۱) فعولن ـ مفاعی لن ـ فعولن ـ مفاعی لن (۲) مفاعی لن ـ فعولن ـ مفاعی لن ـ فعولن (۳) مس تف علن ـ فاعلن ـ مس تف علن ـ فاعلن ـ (۴) فاعلن ـ مس تف علن ـ فاعلن ـ مس تف علن (۵) فاعلاتن ـ فاعلن ـ فاعلاتن ـ فاعلن (۶) فاعلن ـ فاعلاتن ـ فاعلن ـ فاعلاتن ـ

سبب اور وتد کی ترتیب یکساں ہونے کے علاوہ سبب اور وتد کے انسلاکات سے جو صورتیں ممکن ہوں، ان کی بحریں بنائی جا سکتی ہیں۔ فعولن اور فاعلن ـ مفاعی لن اور مس تف علن اور فاعلاتن کی صورتیں

ممکن ہیں۔ فعولن اور مفاعی لن کی ترکیب سے دو بحریں وضع ہوں گی — مس تف علن اور فاعلاتن کے ساتھ فاعلن آئے گا کیوں ان کی وتد اور سبب کی ترتیب ملتی ہے۔ دو، دو بحریں ان سے تشکیل پائیں گی۔ اس طرح کل ۶ بحریں ہو جائیں گی۔

دوسری مرکب بحریں مجموعی اور مفروقی ارکان کی ترکیب سے وضع ہوں گی۔ ان میں بھی وہی اصول کارفرما رہے گا۔ یعنی سبب اور وتد کی ترتیب یکساں ہوگی۔ وتد مجموع اور وتد مفروق بالمقابل آسکتے ہیں۔ مفاعی لن کی مس تف علن اور فاعلاتن دو صورتیں ممکن ہیں۔ مفعولات کی فاع لاتن اور مس تفع لن دو صورتیں ممکن ہیں۔ سبب اور وتد کی ترتیب کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مفاعی لن اور فاع لاتن سے دو بحریں تشکیل پائیں گی۔ اسی طرح مس تف علن اور مفعولات سے دو اور فاعلاتن اور مس تفع لن سے دو بحریں وضع ہوں گی۔ اس طرح یہ ۶ بحریں ہو جائیں گی۔ سبب اور وتد کی ترتیب کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہی صورتیں ممکن ہیں۔ دوسری صورت میں ترتیب قائم نہیں رہے گی۔

جہاں تک مسدس سالم بحروں کا تعلق ہے ان میں بھی یہی اصول کام کرنا چاہیے۔ مفرد مثمن بحروں سے صرف ایک رکن کم کرنے سے مسدس بحریں بن جاتی ہیں اور سبب و وتد کی ترتیب بھی مثمن بحروں کی طرح مسدس بحروں میں یکساں ہوتی ہے۔

مسلمات فن (صفحہ: ۱۱-۱۳) پر دائرہ متفقہ مسدسہ کی تین بحروں اور دائرہ منعکسہ کی تین بحروں کو سالم بحروں کے طور پر مسترد کیا گیا ہے۔ وجہ یہ دی گئی ہے کہ دائرہ مختلفہ مسدسہ میں پہلے دو رکن میں اگر پہلا خماسی ہو تو دوسرا سباعی اور اگر پہلا سباعی ہو تو دوسرا خماسی ہو۔ یہ خماسی اور سباعی کی ترتیب من گھڑنت ہے۔ تینوں ارکان کا موازنہ کیا جانا چاہیے۔ مثلاً فعولن ۔ مفاعی لن ۔ مفاعی لن کو سالم اور صحیح بحر مانا جائے۔ لیکن مفاعی لن ۔ مفاعی لن ۔ فعولن کو نہ مانا جائے۔ یہ بے تکی بات ہے۔

بحرِ طویل مسدس

بحرِ عمیق کا وزن فاعلن ۔ فاعلاتن ۔ فاعلاتن ٹھیک سمجھا جائے۔ لیکن فاعلاتن ۔ فاعلاتن ۔ فاعلن کو ٹھیک نہ مانا جائے۔ اسی طرح بحرِ وسیع کا وزن فاعلن ۔ مس تف علن ۔ مس تف علن کو جائز ۔ لیکن مس تف علن ۔ مس تف علن ۔ فاعلن ناجائز۔ اسی طرح دائرۂ منعکسہ کی تینوں بحریں بھی خارج نہیں ہونی چاہئیں۔ خماسی اور سباعی ارکان کی ترتیب، بحروں کی تشکیل کا فارمولہ نہیں بن سکتی۔ یہ خام خیالی ہے۔ دائرہ مختلفہ جدید کو اگر خماسی اور سباعی کی ترتیب کے پیشِ نظر دیکھا جائے تو یہ دائرہ بالکل غلط ہے۔ کیوں کہ ساری مسدس بحروں کا آخری یعنی تیسرا رکن سباعی آتا ہے لیکن جدید دائرے میں تیسرا رکن خماسی آرہا ہے۔ اس لیے یہ دائرہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ اگر سبب اور وتد کی ترتیب کو مدِ نظر رکھا جائے تو مسلماتِ فن (صفحہ ۵۸-۵۹) پر دائرہ مختلفہ جدید کی تمام چھ بحریں صحیح ہیں۔

دائرہ منعکسہ کے تحت بھی سبب اور وتد کی ترتیب اور انسلاکات کے امکانات کے پیشِ نظر ساری بحروں کی صورتیں ممکن ہیں، اس لیے ان میں سے کسی کو بھی مسترد کیا جانا کسی بھی طرح مناسب نہیں۔ مثلاً بحرِ مریم میں مفاعی لن شروع میں واقع ہوا ہے۔ دوسرا اور تیسرا رکن فاعلاتن ہیں۔ بحرِ قلیب میں فاعلاتن پہلے اور دوسرے رکن کے طور پر واقع ہوئے ہیں۔ مفاعی لن آخری رکن ہے۔ اسی طرح سلیم اور کبیر برعکس ہیں۔ حمیم اور بدیل برعکس ہیں۔

اہیم، صغیر اور حمید میں مفاعی لن ۔ فاعلاتن اور مس تف علن درمیان میں واقع ہوئے ہیں۔ مفروقی ارکان پہلے اور تیسرے رکن کے طور پر واقع ہوئے ہیں۔ سبب اور وتد کی ترتیب اور ارکان کے مقامات کی ممکن صورتیں ہی بحروں کی تشکیل کا فارمولہ ہے — ارکان کی مقلوب صورتیں سبب اور وتد کے انسلاکات کی ممکن صورتیں ہیں۔ ارکان کی تشکیل پر بھی ایک نظر ضروری ہے۔ ان کی تشکیل سبب۔ وتد اور فاصلہ پر مبنی ہے۔ ان کو اصولِ سہ گانہ کہتے ہیں اور ان سے ارکانِ عشرہ کی صورتیں نکلتی ہیں۔

ہر لفظ کا ایک معیاری تلفظ ہے۔ اس تلفظ کو مدِ نظر رکھ کر سبب ۔ وتد اور فاصلہ کی اصطلاحیں وضع کی گئی ہیں

سببِ خفیف : دو حرفی لفظ جس کا پہلا حرف متحرک اور دوسرا حرف ساکن ہو۔ مثلاً: دِل ۔ ہم ۔ تم ۔

وتد مجموع : سہ حرفی لفظ جس کا پہلا اور دوسرا حرف متحرک ہوں اور تیسرا ساکن ہو۔ مثلاً : نظر ۔ کرم ۔ وطن ۔

وتد مفروق : سہ حرفی لفظ جس کا پہلا اور تیسرا حرف متحرک ہوں اور درمیانی حرف یعنی دوسرا حرف ساکن ہو۔ مثلاً : لالہ ۔ ہالہ ۔ عطف و اضافت سے بھی وتد مفروق بنتا ہے۔ شام و سحر ۔ نورِ سحر ۔ (شام اور نور)

حروفِ علت (ا ۔ واؤ ۔ ی) کے آخر میں سقوط سے بھی وتد مفروق حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً دیکھا ۔ دیکھو اور دیکھی کے آخری حروفِ علت گرانے سے وتد مفروق کی صورت رہ جاتی ہے

وتد متوسط: سہ حرفی لفظ جس کا پہلا حرف متحرک ۔ دوسرا حرف ساکن اور تیسرا حرف موقوف ہوں۔ مثلاً: نام ۔ کام ۔ راز ۔ ساز ۔ طور ۔ غور ۔ لوز ۔ مور ۔ شہر ۔ زور ۔ شور وغیرہ۔

یہ الفاظ جب صدر وابتدا یا حشوین میں واقع ہوتے ہیں تو وتد مفروق کا وزن اختیار کرلیتے ہیں۔ عروض وضرب میں بطور وتد متوسط رہتے ہیں۔ ان الفاظ پر یہ پابندی نہیں ہے کہ صدر و ابتدا میں نہیں آسکتے ۔ حالانکہ یہ موقوف الآخر الفاظ ہیں۔ سالم ارکان میں یہ وتد شامل نہیں ہے ، لیکن مزاحف ارکان میں شامل ہے۔ ان مزاحف ارکان پر پابندی لگادی گئی ہے کہ صدر وابتدا میں نہیں آسکتے ۔ صرف عروض و ضرب میں واقع ہوں گے ۔ جب الفاظ پر یہ پابندی نہیں ہے تو ارکان پر یہ پابندی کیوں ؟ الفاظ کے تلفظ کو مدِ نظر رکھ کر سبب ۔ وتد اور فاصلے بنائے گئے ہیں ۔ وتد متوسط کے تلفظ والے الفاظ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے موقوف الآخر ارکان ایسے الفاظ کا مفروقی اور موقوفی چلن اپنا سکتے ہیں ۔ ان الفاظ کے تلفظ اور اس کی تبدیلی کو اولیت حاصل ہے ۔ ارکان کی حیثیت ثانوی ہے ۔

فاصلہ صغریٰ: چار حرفی لفظ جس کے پہلے تین حروف متحرک ہوں اور چوتھا حرف ساکن ہو۔ مثلاً: حَرَکَت ۔ بَرَکَت

سبب ۔ وتد اور فاصلہ کے انسلاکات سے ارکان کی صورتیں نکلتی ہیں ۔ جتنی صورتیں ممکن تھیں اتنے ارکان بنا لیے گئے ہیں ۔ مثلاً :

وتد مجموع والے :- مفاعی لن ۔ مس تف علن ۔ فاعلاتن ۔ فعولن ۔ فاعلن ۔

وتد مفروق والے :- فاعلاتن ۔ مفعولات ۔ مس تفع لن

فاصلہ صغریٰ والے :- مُفَاعَلَتُن ۔ مُتَفَاعِلُن ۔

مس تف علن اور فاعلاتن مجموعی رکن ہیں ۔

مس تفع لن اور فاع لاتن مفروقی رکن ہیں ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مجموعی ارکان کے ہوتے ہوئے مفروقی ارکان کیوں بنائے گئے ۔ جب کہ حرکات وسکنات میں کوئی فرق نہیں ۔

ان مفروقی ارکان کا یہ فائدہ ہوا کہ مرکب سالم بحریں (مثمن) حاصل ہو گئیں اور سبب اور وتد کی ترتیب بھی یکساں رہی اور ان سالم بحروں سے مزاحف بحروں کا بھی اضافہ ہوا ۔

بحروں کی تشکیل

ممکن ارکان بنا لینے کے بعد ممکن بحروں کی تشکیل کی گئی ۔ بحروں کی تشکیل میں تکرار اور سبب ۔ وتد فاصلہ کی ترتیب کی یکسانیت کا خیال رکھا گیا ہے ۔ تکرار میں ترتیب کی یکسانیت از خود موجود ہے ۔ امکانات میں ارکان کے مقامات تبدیل کیے گئے ہیں اور بحریں بنائی گئی ہیں ۔

مسدس بحروں میں دو طرح کا التزام ہے : (۱) ایک رکن شروع یا آخر میں ہے باقی دو ارکان ساتھ ساتھ واقع ہوئے ہیں (۲) ایک رکن درمیان میں واقع ہوا ہے ۔ دو ارکان طرفین میں یعنی پہلے اور تیسرے مقام پر واقع ہوئے ہیں ۔ ساتھ ساتھ آنے والے ارکان مختلف ارکان نہیں ہیں ۔ بلکہ ایک ہی رکن کی تکرار ہے ۔ اسی طرح طرفین میں آنے والے ارکان بھی مختلف نہیں ہیں ۔ بلکہ ایک ہی رکن دو جگہ واقع ہوا ہے ۔

مرکب مثمن بحروں میں یہ التزام نہیں ہے کہ ایک ہی رکن کی تکرار دو ۔ دو ارکان تک محدود ہو اور پھر ان کے مقامات بدل کر بھی بحریں بنائی جائیں ۔ مثلاً نمبر(۱) مفاعی لن ۔ مفاعی لن ۔ فعولن ۔ فعولن (۲) فعولن ۔ فعولن ۔ مفاعی لن ۔ مفاعی لن (خماسی اور سباعی ارکان) (۳) مفاعی لن ۔ مفاعی لن ۔ فاع لاتن ۔ فاع لاتن (۴) فاع لاتن ۔ فاع لاتن ۔ مفاعی لن ۔ مفاعی لن ۔ (مجموعی اور مفروقی ارکان) ایک ہی رکن کی تکرار حشوین میں ہو اور دوسرا رکن صدر وابتدا اور عروض وضرب میں واقع ہو ۔ مثلاً :

(۱) فعولن ۔ مفاعی لن ۔ مفاعی لن ۔ فعولن (۲) مفاعی لن ۔ فعولن ۔ فعولن ۔ مفاعی لن (خماسی اور سباعی ارکان) (۳) مفاعی لن ۔ فاع لاتن ۔ فاع لاتن ۔ مفاعی لن (۴) فاع لاتن ۔ مفاعی لن ۔ مفاعی لن ۔ فاع لاتن (مجموعی اور مفروقی ارکان)

ایسی بحروں کی تشکیل نظر انداز کردینے کی کوئی معقول وجہ کسی بھی عروض کی کتاب میں بیان نہیں کی گئی ۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ ابتدائی وزن کا فارمولہ ہی بحروں کی تشکیل کا فارمولہ ہے ۔ بحروں کی تشکیل میں دائروں کا کوئی دخل نہیں ۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ دائروں کی تشکیل اب مختلف طریقوں سے کی جانے لگی ہے اور کوئی ایک جیسا طریقہ رائج نہیں رہا ۔ اس لیے ان پر انحصار نہیں کیا جاسکتا ۔ بحروں کی تشکیل کا فارمولہ دریافت ہونے کے بعد دائروں کے سہارے کی ویسے بھی کوئی ضرورت نہیں رہتی ۔

کشمیری لال ذاکر

(ساتویں قسط)

یہ صبح زندہ رہے گی

گزشتہ سے پیوستہ

بھاول پور سے نوشی گیلانی کے کئی ٹیلی فون آچکے تھے اور لاہور کے دوستوں نے اس پیار سے گھیر رکھا تھا کہ وہاں سے نکلنا مشکل ہو رہا تھا۔

ملہوترہ سے یہ طے ہوا کہ ہم پانچ دن کے لیے لاہور سے نکلیں اور بھاولپور اور کراچی ہو لیں۔ ایک دن کے لیے پھر لاہور واپس آجائیں گے اور باقی دوستوں سے مل لیں گے۔ چنانچہ جوں توں کر کے ایک دن اور بڑھایا کہ سعادت سعید جن دوستوں سے ملاقاتیں طے کر چکا ہے، ان سے تو مل لیا جائے۔ پھر حامد حسین حامد نے تو دوپہر کے کھانے کا بھی تو اہتمام کر رکھا تھا۔ اس طرح لاہور نے مجھے ایک دن اور روک لیا اور اپنی محبت اور اپنے خلوص کی کشش رکھا کھینچ دی میری راہ میں۔

یوں تو ہر دیوار اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے اور اُسے پھلانگ کر آگے نکل جانا مشکل ہوتا ہے، لیکن تعلقات کی دیواریں تو بڑی مضبوط اور بڑی اونچی ہوتی ہیں۔ اُنہیں پھلانگنا تو کبھی کبھی ناممکن ہو جاتا ہے اور اب یہی دیواریں میرا راستہ روک رہی تھیں۔ اور میں نے ان کے سامنے ہار مان لی تھی۔ کبھی کبھی چُپ چاپ ہار مان لینے سے کتنا سکھ ملتا ہے۔ اس کا احساس وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ہار ماننے کے لیے صلح ناموں کی تشکیل نہیں کرتے۔ صرف دھڑکنوں کی زبان سنتے ہیں اور آنکھوں کی گفتگو سمجھتے ہیں۔

اُردو ادب کے ارتقا میں امرتسر کا بڑا اہم رول رہا ہے۔ اگر ہم پچھلے پچاس ساٹھ برس میں تخلیق ہوئے ادب پر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ نثری، شعری، تنقیدی بلکہ صحافتی ادب پر بھی امرتسریوں کی بڑی گہری چھاپ ہے، جہاں اردو ادب کے کئی دوسرے اسکول ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، وہاں ایک اسکول امرتسر کا بھی ہونا چاہیے۔ میں نے آج کی ملاقاتوں کی ابتدا ایک امرتسری دوست ہی سے کی۔ نام عبدالمتین تخلص، عارف۔ شروع شروع میں وہ اپنا نام عبدالمتین عارف لکھا کرتا تھا۔ پھر وہ کوچہ وکیلاں، کٹرہ جیمل سنگھ کا باشندہ عارف زیادہ اور عبدالمتین کم ہو گیا اور اس طرح اس کا ادبی نام عارف عبدالمتین ہو گیا۔ جس زمانے میں اس سے میرے تعلقات استوار ہوئے وہ عارف عبدالمتین ہو چکا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میرے اور اس کے تعلقات اس وقت مضبوط ہونا شروع ہوئے جب "تقسیم" کا سانحہ ہو چکا تھا اور بڑے بڑے مضبوط رشتے ٹوٹ گئے تھے۔ عبدالمتین نے ادبِ لطیف اور سویرا کی ادارت کرنے کے بعد "جاوید" نام سے اپنا ایک پرچہ نکالنا شروع کیا تھا۔ اس کا سائز عام پرچوں جیسا نہیں تھا اس میں ایک انفرادیت اور خاص قسم کا رکھ رکھاؤ تھا۔ کچھ شمارے نکالنے کے بعد اس نے "جاوید" کے سالنامے کا اعلان کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب لکھنے والوں کے ذہن پر ابھی تک "تقسیم" کا سانحہ اثر انداز تھا ـــ اور فسادات پر افسانے لکھے جا رہے تھے۔ عارف عبدالمتین نے مجھے سالنامے کے لیے افسانہ بھیجنے کو کہا۔ میں نے "قفس سے آشیاں تک" کے عنوان سے افسانہ بھی بھیج دیا اور اپنا فوٹو بھی۔ افسانہ فسادات پر نہیں بلکہ عورت کی سماجی حیثیت کے مسئلے پر تھا۔ سالنامہ چھپتے ہی عارف عبدالمتین نے گنتی کے کچھ پرچے ہندوستان بھیج دیے۔ ان کو جن کی تخلیقات اس پرچے میں شامل تھیں اور کچھ ان کو جن سے اس کے ذاتی مراسم تھے۔ بس یہی پرچے تھے جو پریس سے باہر نکل سکے۔ اس کے بعد حکومت نے پریس پر چھاپہ مار کر باقی تمام پرچے ضبط کر لیے۔ اس لیے کہ اس پرچے میں سعادت حسن منٹو کا افسانہ "ٹھنڈا گوشت" چھپا تھا۔ جس پر مقدمہ چلا اور اس کے

بعد شاید "جاوید" کی اشاعت بند کر دی گئی۔ "جاوید" کا سالنامہ غالباً پاکستان کے کسی ادیب تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ کوچہ وکیلاں کے دونوں دوست، منٹو اور عارف ادب کے ایک ایسے موڑ پر کھڑے تھے جس کے آگے صرف کوئے ملامت تھا اور کچھ نہیں۔

جب آپ کسی ایسے شہر میں بہت دنوں کے بعد جائیں جس سے آپ کی ڈھیر ساری وابستگیاں رہ چکی ہوں اور آپ پر اچانک یہ انکشاف ہو کہ وہ گلیاں، وہ محلے، وہ بستیاں، وہ کوچے جو آپ کے قدموں کی چاپ سے آشنا رہ چکے ہیں، ایک دم بدل گئے ہیں: ان کے خدوخال بدل گئے ہیں، ان کا چہرہ مہرہ بدل گیا ہے؛ یہاں تک کہ ان کے نام بھی تبدیل کر دیے گئے ہیں تو آپ کو بڑا گہرا صدمہ ہوتا ہے۔ آپ کا جانا پہچانا شہر ایک دم اجنبی ہو گیا ہے۔ آپ کہاں جائیں گے، کس کے گھر کا پتہ ڈھونڈیں گے، کس کے کواڑ پر دستک دیں گے؟ لگتا ہے، جیسے آپ کسی دوسری ہی بھری پُری دنیا میں آ گئے ہیں۔ جہاں کوئی آپ کو نہیں پہچانتا۔ ایک بھری پُری دنیا میں شدید تنہائی کا احساس بڑا کرب آمیز ہوتا ہے۔ آپ فوراً پلٹ جانا چاہتے ہیں لیکن یہ بھی ممکن نہیں۔ آپ تو سب راستے مسدود کر کے یہاں آئے ہیں۔ اب لوٹ کر کہاں جائیں گے۔ اور اگر کبھی ایسا ہو کہ اس شہر کا کچھ بھی نہ بدلا ہو، سب کچھ ویسا ہی ہو جیسا آپ چھوڑ کر گئے تھے۔ وہی محلے، وہی کوچے، وہی بستیاں، وہی لوگ، وہی چہرے تو آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ ہر گلی کے پتھر کو چوم لیں، ہر بستی کو سلام کریں اور ہر شخص کو گلے سے لگا کر اس کی سلامتی کی دعائیں کریں۔

لاہور جا کر مجھے کچھ ایسا ہی احساس ہوا۔ مجھے محسوس ہوا میں ادھر ادھر گھومتا پھرتا بہت عرصے کے بعد اپنے شہر میں لوٹ آیا ہوں۔ بستیوں کے نام وہی ہیں۔ گلیاں اور محلے ویسے ہی ہیں۔ چہرے بھی وہی ہیں۔ لگتا تھا کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ سب کچھ ویسے کا ویسا تھا۔ وقت اور فاصلے نے کہیں بھی تو اپنا نقش نہیں چھوڑا تھا۔

جب سعادت سعید اپنی گاڑی میں مجھے کرشن نگر کی گلیوں میں گھما رہا تھا تو مجھے لگ رہا تھا جیسے یہ ساری گلیاں ویسی کی ویسی ہیں۔ جیسی میں چھوڑ کر گیا تھا۔ جب یوں گھماتے ہوئے اس نے چشتیہ ہائی اسکول کی عمارت کے قریب اپنی گاڑی روک دی تو میں نے پوچھا۔

"گاڑی کیوں روک دی سعادت؟"

"آگے نہیں جا سکے گی۔"

"کیوں؟"

"آگے آپ کے دوست کا گھر ہے جس میں مرمت ہو رہی ہے۔"

میں سعادت کا جواب سن کر ہنس پڑا۔ اور پھر ہم گاڑی سے اترے اور گلی میں سے گزرتے ہوئے ایک گھر کی ڈیوڑھی میں آ کھڑے ہوئے۔ سعادت نے دستک دی۔ ایک بچّی نے دروازہ کھولا۔

"عارف صاحب گھر پر ہیں؟"

"جی ہاں۔"

یہ کہہ کر اس بچّی نے ہمیں اندر آنے کو کہا اور پھر مرمّت کے عمل سے گزرتے ہوئے صحن میں قدم بڑھاتے ہوئے اس نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔

"ابا سے کہنا کشمیری لال ذاکر آئے ہیں۔"

"جی اچھا۔" بچّی نے مجھے سلام کیا اور ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی۔ عارف عبدالمتین کوئی دس پندرہ منٹ کے بعد آیا۔ تیار ہونے میں اتنا وقت تو لگ ہی جاتا ہے۔ وہ دروازے کے اندر داخل ہوا۔ گورا چٹّا چہرہ لیکن خاصا ڈھیلا ڈھالا۔ اس نے فوراً ہی مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ اور بولا:

"کیا میں واقعی ذاکر سے مل رہا ہوں۔"

"جی ہاں" میں نے کہا۔

"تم تو کئی دنوں سے لاہور میں ہو۔ میں نے تو کئی آدمی تمہارے تعاقب میں لگا رکھے ہیں۔"

"میں خود آ گیا ہوں۔"

"تعاقب کرنے والوں میں سے تو ایک بھی نہیں آیا۔" اس نے اپنے گورے امرتسری چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

"میں جو آ گیا ہوں عارف صاحب۔" سعادت بولا۔

دراصل سعادت خود میرا تعاقب کرنے والوں میں سے ایک تھا۔ جس جس دوست سے اس کی ٹیلی فون پر بات ہوتی یا ملاقات ہوتی اسی سے وعدہ کر لیتا کہ وہ مجھے اس سے ضرور ملوائے گا۔ عارف بھی انہیں میں سے ایک دوست تھا۔

عارف ایک طویل عرصے تک گورنمنٹ ایم۔ اے۔ او کالج لاہور میں پڑھانے کے بعد کچھ عرصہ پہلے ریٹائر ہو چکا تھا اور ان دنوں جناح اسلامیہ کالج آف کامرس میں کام کر رہا تھا۔ اس کے نو شعری مجموعے اردو میں اور دو مجموعے پنجابی میں چھپ چکے تھے اور ان دونوں کتابوں پر اُسے پاکستان رائٹرز گلڈ سے انعام بھی ملے تھے۔ اس نے اپنی غزلیات کا تازہ ترین مجموعہ "حرفِ دعا" جو اس نے اپنے ہی ادارے عارف عبدالمتین اکیڈمی سے شائع کیا تھا، مجھے بڑی محبت سے پیش کیا اور اس کے پہلے صفحے پر یہ عبارت لکھی:

محبت اور خلوص کے جلو میں
برادرِ گرامی قدر جناب کشمیری لال ذاکر صاحب
کی نذر۔
اس دیرینہ پیار کے احساس کے ساتھ۔

جس کی پیمائش الفاظ کے بس میں نہیں!

اپنی کتاب دیتے ہوئے اس نے ایک بار پھر مجھے گلے سے لگا لیا۔

میں نے بڑی خوب صورتی سے چھپی کتاب کے اوراق اِدھر اُدھر سے پلٹنے شروع کر دیے۔ کیوں کہ وہ غالباً چائے کے لیے کہنے کو اندر چلا گیا تھا۔ عمر کے ساتھ اس میں ڈھیلا پن تو ضرور آ گیا تھا، لیکن قدموں کا جماؤ پورا تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکلا تو لگا اس کی چال میں خاصی مضبوطی تھی۔ میں نے اس کی غیر حاضری میں "حرفِ دعا" کی کچھ غزلوں کو سرسری طور سے دیکھا تو یہ اشعار مجھے بہت پسند آئے۔ پہلی ہی غزل پیاری تھی:

میں حرفِ دعا کا سلسلہ ہوں
عالم کی نجات چاہتا ہوں
نقطہ ہوں، مگر میں دائرے سے
وسعت کا خراج مانگتا ہوں

ایک اور غزل کے شعر:

چراغ ہوں میں کبھی طاق پر سجا مجھ کو
ہوا بجھائے تو دامن سے تو بچا مجھ کو
سفینہ ہوں تو رہوں ساحلوں سے کیوں منسوب
تو زندگی کے سمندر میں بھی بہا مجھ کو

ایک اور غزل:

تو آئینہ ہے ترے روبرو کروں خود کو
یہ آرزو ہے کسی طرح دیکھ لوں خود کو
تری صدا میں سمٹ جاؤں زیر و بم بن کر
تو مجھ سے بات کرے اور میں سنوں خود کو

اور پھر مجموعے کی آخری غزل:

مجھے پرکھ مجھے نمرود کی خدائی دے
مرے خدا مجھے اظہار کی صفائی دے
تو آسمان سے نہ کر مجھ پہ نعمتوں کا نزول
حلال رزق کی صورت مجھے کمائی دے

چائے کے دوران میں نے اُسے اپنے پروجیکٹ کے بارے میں بتایا۔ سعادت سعید نے ذرا زیادہ وضاحت کے ساتھ بات کی تو عارف نے یقین دلایا کہ وہ اس سے اپنی پوری پوری وابستگی رکھے گا۔

میں نے اس کے تازہ تخلیقی کام کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کا ایک شعری مجموعہ "دھوپ کی چادر" زیرِ طبع تھا۔ وہ شاعری میں ایک نیا تجربہ کر رہا تھا۔ وہ تھا یک مصرعی نظم کا تجربہ۔ اس مجموعے میں اس نے اسی قسم کی نظموں کو یک جا کیا تھا۔ یک مصرعی نظم کے دو نمونے بھی اس نے پیش کیے۔ پہلی نظم کا عنوان تھا: "محروم":

میرے بستر سے تو اپنے کان کا بُندا اٹھا

دوسری نظم کا عنوان تھا: "اپنے مرقد کا کتبہ"

زیرِ زمیں گیا ہے وہ اپنی تلاش میں

اردو ادب میں واقعی یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ میں نے عارف عبدالمتین کو اس کے لیے مبارکباد پیش کی۔ جی تو چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ اور وقت گزاروں۔ لیکن جسٹس جاوید اقبال سے وقت طے ہو چکا تھا۔ ملاقات ان ہی کے چیمبر میں تھی۔ اس لیے عارف سے اجازت لی۔ وہ اپنے زیرِ مرمت صحن میں سے میرے ساتھ ساتھ گھر کی ڈیوڑھی تک آیا اور پھر گلی سے باہر کار تک بھی اُس نے ہمارا ساتھ دیا۔ سعادت سعید نے جب گاڑی اسٹارٹ کی تو وہ دیر تک چشتیہ ہائی اسکول کی عمارت کے سامنے کھڑا ہاتھ ہلاتا رہا۔

جسٹس جاوید اقبال سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

اس سے پہلے میں ان سے کبھی نہیں ملا تھا۔ بلکہ میں نے تو ان کی تصویر بھی نہیں دیکھی تھی۔ ان کی جو تصویر میں نے علامہ اقبال کے حوالے سے اپنے ذہن میں بنا رکھی تھی، وہ بھی بہت پرانی تھی۔ بہت سال پہلے کی۔ اتنے برسوں میں تو خود میری اپنی تصویر بھی بدل چکی ہے اور میرے دوستوں کی بھی۔ مجھے جاوید اقبال سے ملنے کی خواہش دو وجہوں سے تھی۔ ایک وجہ تو ان کا شاعرِ مشرق علامہ اقبال کا فرزند ہونا تھا۔ دوسری وجہ سید مظفر حسین برنی سے ان کی خط و کتابت اور برنی صاحب سے اکثر ان کا ذکر۔ برنی صاحب کئی برسوں سے علامہ اقبال پر کام کر رہے ہیں۔ جب تک وہ چندی گڑھ میں تھے، ان سے اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں اور علامہ اقبال کے سلسلے میں طویل گفتگو بھی۔ ان دنوں برنی صاحب اقبال کے خطوط اکٹھا کر رہے ہیں۔ اس لیے ان کا اصرار تھا کہ میں جسٹس جاوید اقبال سے ضرور ملوں۔ راجندر ملہوترہ کسی دوسری جگہ سے آ رہا تھا۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ ہم دونوں ہائی کورٹ کے باہر ملیں گے اور پھر جاوید اقبال سے ملاقات کے لیے چلیں گے۔ سعادت سعید کے ساتھ گاڑی میں آتے ہوئے مجھے علامہ اقبال کا یہ شعر بار بار یاد آ رہا تھا، جو اس نظم میں سے تھا جو نظم انھوں نے جاوید صاحب کو اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے پہلے خط کے جواب میں لکھی تھی۔ جب وہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن گئے ہوئے تھے

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

نظم کا عنوان ہے: "جاوید کے نام" اور یہ نظم بالِ جبریل میں موجود ہے۔ میرا جی چاہ رہا ہے میں آپ کو بھی اپنے جذبات میں شریک کروں۔

"جاوید کے نام"

(لندن سے اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلا خط آنے پر)

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اُٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

مِرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

ہائی کورٹ کی عمارت میں گاڑی پارک کر کے سعادت اور میں راجندر ملہوترہ کا انتظار کر رہے تھے۔ جبھی سعادت نے ہائی کورٹ کے برآمدے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"جاوید اقبال صاحب اپنے چیمبر کی طرف جا رہے ہیں۔"

"تو انہیں یاد تھا کہ اس وقت راجندر ملہوترہ اور مجھے ان سے ملاقات کے لیے آنا تھا۔"

"تو اب کیا کریں؟" میں نے پوچھا۔

"ہم جاوید صاحب کے چیمبر میں چلتے ہیں۔ ملہوترہ صاحب وہیں آ جائیں گے۔"

تجویز مناسب تھی چنانچہ سعادت اور میں ہائی کورٹ کی عمارت کے برآمدے میں سے گزرتے ہوئے جاوید صاحب کے چیمبر کی طرف قدم بڑھانے لگے۔ چیمبر کے باہر جسٹس جاوید اقبال صاحب کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ جاوید صاحب چیمبر میں اکیلے تھے۔ ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔ میز کے سامنے ایک نہایت ہی پُرکشش شخصیت کچھ لکھنے میں معروف تھی۔

سعادت نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ جاوید صاحب نے نظر اُٹھا کر دیکھا اور سعادت سے ہاتھ ملایا۔

"آپ کشمیری لال ذاکر ہیں؟"

"جی۔"

میرے جواب پر اُنہوں نے مجھ سے بھی ہاتھ ملایا۔

"تشریف رکھیے۔ راجندر ملہوترہ بھی تو آپ کے ساتھ آنے والے تھے۔"

"جی ہاں، ہمیں الگ الگ جگہوں سے آنا تھا۔ وہ بھی آتے ہی ہوں گے۔" پھر جاوید اقبال صاحب نے اپنے پی اے کو کچھ ضروری ہدایات دیں۔ کیوں کہ وہ اس سے اگلے دن اسلام آباد جانے والے تھے۔

"لاہور میں کب تک قیام رہے گا؟"

"کل چار پانچ روز کے لیے جائیں گے اور پھر کراچی سے لوٹ کر ایک آدھ دن لاہور میں رُکیں گے۔"

"کچھ روز کے لیے میں بھی باہر جا رہا ہوں۔ آپ واپس آ جائیں تو آپ سے طویل ملاقات کا پروگرام بنائیں گے۔"

"شکریہ۔" میں نے جواب دیا اور پھر میں نے ان سے کچھ ذاتی قسم کے سوالات کیے اور ان سے ان کے ادبی کام کی تفصیلات کے بارے میں بھی پوچھا۔ معلوم ہوا کہ لنکنز اِن Lincon's Inn لنڈن سے ۱۹۵۶ء میں بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کر کے لاہور آ گئے تھے۔ اور لاہور ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کر دی تھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی لا کالج میں پارٹ ٹائم ریڈر کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ۱۹۷۱ء میں وہ لاہور ہائی کورٹ میں جج کے عہدے پر مامور ہوئے اور پھر ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۶ء تک چیف جسٹس رہنے کے بعد ۱۹۸۶ء میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے جج بن گئے۔ یہ تفصیلات جان کر مجھے خوشی ہوئی لیکن حیرت اس بات پر ہوئی کہ اپنی اتنی معروف زندگی کے باوجود جاوید اقبال صاحب نے علامہ اقبال کی فلاسفی پر دنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں لیکچر دیے تھے۔ اُنہوں نے ان کی شاعری اور فلسفے کی گہرائیوں کو خواص و عوام تک پہنچانے میں بڑا اہم رول ادا کیا تھا۔ "ماہ لالہ فام" کے عنوان سے اپنے تنقیدی مقالوں کو شائع کر کے اس سلسلے میں اُنہوں نے بہت بڑا کام کیا تھا۔

سوانح عمریوں کے بارے میں بات ہوئی تو جاوید اقبال صاحب نے افسوس کا اظہار کیا کہ اردو زبان میں اس شعبے میں بہت کم کام ہوا تھا۔ لے دے کے دو ہی قابلِ قدر سوانح حیات کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ "حیاتِ جاوید" اور "یادگارِ غالب" کا۔ اردو ادب میں یہ واقعی بہت بڑی کمی تھی۔ اسی سلسلے میں میرے ایک سوال کے جواب میں اُنہوں نے بتایا کہ انہوں نے علامہ اقبال کی "سوانح حیات" "زندہ اردو" کے نام سے ۱۹۸۹ء میں مکمل کی تھی، جو تین حصوں پر مشتمل ہے۔ ظاہر تھا کہ وہ قابلِ قدر ادبی کام کر رہے تھے۔

گفتگو کے دوران کبھی کبھی سیاست کی بات بھی ہو جاتی۔ اُنہوں نے اپنے نظریات اور خیالات کا بڑا کھل کر اظہار کیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اتنی بے باکی سے بات کرنے والا شخص کبھی نہ کبھی تو حکومت کے زیرِ عتاب ضرور آیا ہو گا۔ ایک بار تو سوچا کہ اس کے بارے میں سوال نہ ہی کروں لیکن زیادہ دیر اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکا اور پوچھ بیٹھا۔

"جاوید صاحب، کیا آپ کا برسرِ اقتدار لوگوں سے کبھی اختلاف نہیں ہوا؟"

وہ مسکرا کر بولے:

"اختلاف تو ہوا۔ صدر ایوب خاں تو مجھے گرفتار بھی کرنا چاہتے تھے۔"

میں نے اس کی وضاحت مناسب نہ سمجھی اور پھر علامہ اقبال کے بارے ہی میں سوال پوچھنے لگا۔

"کیا آپ نے علامہ اقبال کی سوانح حیات میں اُنہیں والد کی حیثیت سے بھی جانچنے کی کوشش کی ہے؟"

"بھرپور کوشش کی ہے ذاکر صاحب۔"

"ان کے خطوط پر پاکستان میں کتنا کام ہوا ہے؟"

"کافی کام ہوا ہے۔"

"کیا ان کے ابھی ایسے خطوط بھی ہیں جو شائع نہیں ہوتے؟"

"ابھی کئی ایسے خطوط باقی ہیں۔"

مزید گفتگو ہوتی رہی اور سعادت دو ایک بار اٹھ کر چیمبر کے باہر بھی گیا۔ لیکن ملہوترہ کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ میں تو گفتگو کو اس لیے بڑھائے جا رہا تھا کہ وہ بھی آجائے۔ لیکن جب وہ کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک نہیں آیا تو میں نے مناسب سمجھا کہ ان سے اجازت لی جائے۔

جاوید صاحب نے بڑی محبت اور خلوص سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ ہندوستان واپس جانے سے پہلے ان سے ایک ملاقات ضرور ہونی چاہیے۔

جب سعادت اور میں کار میں بیٹھے تو میں نے سعادت سے کہا کہ مجھے بھی علامہ کے ایک خط کا علم تھا۔ جو انہوں نے ۱۹۳۵ء میں خواجہ غلام السیدین کو لکھا تھا۔ انہوں نے سیدین صاحب کو لکھا تھا کہ انہیں دو بچوں کے لیے ایک استانی کی ضرورت تھی جس پر وہ ان کے اخلاق اور دینی تربیت کے لیے اعتبار کر سکیں۔ ہم دونوں استانی کی ان کوالیفکیشنز کا ذکر کر کے دیر تک ہنستے رہے جو علامہ اقبال نے اپنی طرف سے لکھ کر بھیجی تھیں۔ اس وقت تو خط میں لکھی موٹی موٹی باتیں یاد تھیں، لیکن اب میں وہ پورا خط درج کر رہا ہوں جو علامہ نے ۸ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو سیدین صاحب کو لکھا تھا۔ یہ خط "پیامِ اقبال" میں موجود ہے۔ جس کے مصنف محمد بدیع الزماں ہیں۔ اور جو اپنے نام کے آگے ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنا ضروری سمجھتے ہیں:

"دو بچوں کے لیے استانی کی ضرورت ہے۔ جس پر ان کے اخلاق اور دینی تربیت کے لیے اعتبار کر سکوں۔ مندرجہ ذیل باتیں ضروری ہیں۔ نمبر ۱ بیوہ اور بے اولاد ہو۔ نمبر ۲۔ عمر میں کسی قدر مسن ہو تو بہتر ہے۔ نمبر ۳ کسی شریف گھر کی ہو جو گردش زمانہ سے اس قسم کا کام کرنے پر مجبور ہو گئی ہو۔ نمبر ۴ دینی اور اخلاقی تعلیم دے سکتی ہو یعنی قرآن اور اردو پڑھا سکتی ہو۔ عربی اور فارسی جانتی ہو تو اور بھی بہتر ہے۔ نمبر ۵۔ سینا پرونا وغیرہ بھی جانتی ہو۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ اس سے باورچی کا کام لیا جائے گا ـــــ!

مندرجہ بالا امور کو ملحوظ رکھ کر حالات دریافت کیجیے"۔

ہائی کورٹ کی عمارت سے نکلے تو سعادت نے کہا:

"ملہوترہ صاحب تو آئے نہیں۔ اب کہاں چلیں"۔

"حامد حسین حامد کی دکان پر چلو۔ دوپہر کا کھانا اس کے گھر پر ہے۔ وہ تینوں سوار وہیں پہنچیں گے"۔

جب ہم حامد حسین حامد کی دکان پر پہنچے تو تھوڑی دیر کے بعد تینوں سوار بھی آگئے۔ وہ ایک گھڑی کی مرمت اور ایک ٹرانسسٹر کی خریداری کے سلسلے میں مصروف رہے تھے ـــــ ملہوترہ کو رنج تھا کہ وہ جاوید اقبال صاحب سے نہیں مل سکا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب، آپ تو میری مجبوری سمجھتے ہیں"۔

"اب تو سعادت بھی سمجھنے لگا ہے"۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

پھر حامد حسین ہمیں تنگ گلیوں میں سے گزارتا ہوا (جو اصلی لاہور ہے) اپنے گھر لے آیا، جسے اس نے بڑی محنت سے سجا سنوار رکھا تھا۔ کھانا اتنا پرتکلف اور اتنا لذیذ تھا کہ میں نے کھانے پر کم اور اس کی تعریف میں زیادہ وقت گزارا ہے۔ میں دوپہر کا کھانا ویسے بھی اکثر نہیں کھاتا ہوں۔ لیکن اچھے کھانے کی تعریف کرنے سے کبھی نہیں چوکتا۔

واپسی پر ان تنگ گلیوں سے گزرنا مجھے بہت ہی اچھا لگا۔ ایسی تنگ گلیاں تو اب پرانے شہروں کی پرانی بستیوں ہی میں ملتی ہیں، جو آج کے ماڈرن دور میں بیس بیس منزلہ عمارتوں اور کھلی سپاٹ سڑکوں کے ساتھ گہرا تضاد پیش کرتی ہیں۔ ایسے شہر دنیا کے ہر حصے میں موجود ہیں۔ اور ان شہروں کی ان بستیوں میں زیادہ تر وہ لوگ رہتے ہیں جنہیں عوام کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور یہ ایسا دور ہے جس میں لفظ عوام کی تشریح بھی بڑی پہلودار ہو گئی ہے۔

ہر بڑا شہر کسی شخصیت یا روایت یا کسی اہم واقعے سے جڑا ہوتا ہے اور اسی تعلق سے اس شہر کی شناخت ہو جاتی ہے۔ لیکن ہوشیارپور ایک ایسا شہر ہے جس کے بارے میں مجھے ایسا کوئی پس منظر نہیں ملا۔ (اگر آپ کو ملے تو مجھے ضرور بتلائیے) خیال آیا کہ شاید اس بستی کے لوگ ضرورت سے زیادہ ہوشیار ہوتے ہوں گے۔ شاید اسی لیے اس کا نام ہوشیارپور ہو گیا ہو۔ پھر میں نے ان تمام دوستوں کا جائزہ لیا جن کا تعلق اس شہر سے ہے، لیکن ان میں سے اکثریت ان کی تھی جو محبت اور خلوص والے تو تھے، لیکن ہوشیار نہیں تھے۔ ذہین تو ضرور تھے اور علم و ادب سے بھی ان کو لگاؤ تھا، لیکن ہوشیاری والی خصوصیت ان میں نہیں تھی بلکہ بے نیازی کا جذبہ زیادہ غالب تھا۔ جب ملہوترہ نے طفیل ہوشیارپوری سے ملاقات کی بات اٹھائی تو میں نے فوراً حامی بھر لی۔ طفیل سے میرے تعلقات بھی بہت پرانے تھے۔ پچھلے برس جب ایک مشاعرہ میں انبالہ آیا تو بے حد محبت اور خلوص سے ملا۔ دیرینہ تعلقات میں آپ سے آپ دھیرے دھیرے جو بے تکلفی آ جاتی ہے۔ اس کا بھی طفیل

نے جی بھر کر استعمال کیا اور اس کا یہ انداز مجھے اچھا بھی لگا۔ اس نے مجھے کشمیری لال ہی کہہ کر مخاطب کیا۔ نام کے ساتھ ذاکر نہیں جوڑا اور "تم" کہہ کر بات کی۔ اپنے پرانے تعلقات کا حق جتا رہا ہو جیسے۔ جن دوستوں سے مجھے لاہور میں ملنا تھا ان میں طفیل ہوشیار پوری بھی شامل تھا۔ میں نے اس سے ملاقات کراچی سے واپس آنے تک اُٹھا رکھی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ملہوترہ اس سے ٹیلی فون پر بات کر چکا تھا اور وقت بھی مقرر کر چکا تھا۔ طفیل کا تقاضا تھا کہ کھانا اس کے یہاں کھایا جائے، لیکن میں نے اسے کہا تھا کہ شاید یہ ممکن نہ ہو، اس لیے دوپہر کے کھانے کے بعد ہم اس کے دفتر ہی میں اس سے مل لیں گے۔ وہ بڑی مشکل سے راضی ہوا تھا۔

"تو چلیے، وہیں چلتے ہیں۔" میں نے ملہوترہ کی بات کا جواب دیا۔

"مرزا ادیب سے بھی تو ملنا ہے آپ کو۔" سعادت نے کہا۔

"بس طفیل سے ملنے کے بعد وہیں چلیں گے۔ آپ ملنا چاہیں گے مرزا ادیب سے۔ میرا بڑا پرانا دوست ہے۔"

"یہاں تو آپ کے سبھی پرانے دوست ہیں۔ آپ ہی چلے جانا۔" ملہوترہ نے کہا۔ لگتا تھا وہ ابھی اپنی مجبوریوں سے آزاد نہیں ہو سکا تھا۔

ہم نے رائل پارک کی پرانی سی عمارت (جو شیخ بلڈنگ کے نام سے مشہور ہے) کے سامنے گاڑیاں پارک کیں تو ملہوترہ نے میرا بازو پکڑ کر مجھے سڑک کی طرف گھماتے ہوئے کہا۔

وہ سامنے کی عمارت لکشمی انشورنس کی عمارت ہے۔ کئی برسوں تک اس عمارت کی اوپر والی منزل کی پیشانی پر پتھر پر بنی لکشمی کی مورت ہوا کرتی تھی۔ اب اسے اکھاڑ دیا گیا ہے۔ پھر وہ مجھے ساتھ لگتی سڑکوں اور عمارتوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ جن کے خدوخال تو زیادہ نہیں بدلے تھے، لیکن ملکیت کے حقوق بدل چکے تھے۔

جب ہمارا قافلہ شیخ بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو میں بلڈنگ کے کمروں پر لگے بورڈوں کو پڑھتا جا رہا تھا۔ سبھی بورڈ فلم کمپنیوں کے تھے۔ جتنی پرانی سیڑھیاں تھیں اتنے ہی پرانے کمرے بھی تھے۔ ہاں بورڈ نئے تھے اور کمروں میں رکھا فرنیچر کچھ نیا تھا۔ کمروں میں بیٹھنے والے لوگ زیادہ تر اب نئی نسل ہی کے نمائندے تھے، جس کمرے کے سامنے ہم رکے۔ اس کے باہر ماہ نامہ "محفل" کا بورڈ آویزاں تھا۔ اور سامنے میز کے ساتھ لگی کرسی پر ایک پرانی نسل کا بزرگ بیٹھا تھا اور میز پر جھکا شاید کچھ لکھ رہا تھا۔ یہ طفیل ہوشیار پوری تھا۔

ہم کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے کرسی سے اُٹھ کر مجھے گلے سے لگا لیا اور کہا:

"کشمیری لال، میں تم سے بہت ناراض ہوں۔ میرے ساتھ کھانا بھی نہیں کھا سکتے تھے تم۔"

وہی محبت، وہی خلوص، وہی بے تکلفی۔

ابھی تو مجھے لاہور واپس آنا ہے طفیل صاحب۔"

"تو کھانا کھاؤ گے نا میرے یہاں؟"

"ضرور کھاؤں گا۔"

"میرے جواب پر ملہوترہ نے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ میں اس کی رمز سمجھ گیا لیکن بولا کچھ نہیں۔ ساحر لدھیانوی کہا کرتا تھا کہ انکار کر کے دوست کا دل کبھی نہ دُکھاؤ۔ وعدہ پورا نہ ہو تو بعد میں معافی مانگ لو۔ میں نے اس وقت ایک اللہ دوست کی نصیحت پر عمل کر کے اس دوست سے جھوٹ بولا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جو تھوڑا سا وقت اس بزرگ دوست کے ساتھ گزرنا ہے اسے خوش گوار بنایا جائے۔

طفیل نے یہ بھی بتایا کہ کوئی صاحب "محفل" کے لیے میرے افسانوں پر ایک مضمون لکھ رہے تھے۔ جسے وہ عنقریب شائع کرنے والا تھا۔ مجھے ان صاحب کا نام اس وقت یاد نہیں آ رہا۔

پھر ملہوترہ اور طفیل رام جوایا خنداں جہلمی (مرحوم) کے بارے میں بات کرتے رہے۔ طفیل خنداں کی بہت تعریف کر رہا تھا۔ ملہوترہ چاہتا تھا کہ خنداں کا کلام شائع کیا جائے، لیکن اسے خنداں کا کلام مل نہیں رہا تھا۔ ملہوترہ کے کہنے پر طفیل نے خنداں جہلمی کے کچھ اشعار بھی سنائے مجھے صرف دو شعر یاد رہے ہیں۔

ہر اک داغِ محبت کو فروزاں کر رہا ہوں میں
مقدر کی سیاہی میں چراغاں کر رہا ہوں میں
قریبِ مرگ ہوں خنداں مگر لب پر تبسم ہے
ابھی تک احترامِ دردِ پنہاں کر رہا ہوں میں

طفیل اپنے بیٹے سے جواب "محفل" کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ "محفل" کے گزشتہ شمارے پیش کرنے کو کہا اور خود اپنی غزلیات کا مجموعہ "شعلۂ جام" مجھے عنایت کیا۔ میں نے کرسی سے اٹھ کر اس خوب صورت کتاب کو طفیل کے ہاتھوں سے لے لیا۔ اور کچھ لمحے اس کی ورق گردانی میں کھو گیا۔ ملہوترہ اور طفیل اگلے سال کے انڈو پاک مشاعرے میں مدعو کیے جانے والے شاعروں کے بارے میں بات کرتے رہے۔

کتاب کے اوراق پلٹے تو دیکھا کہ مقدمہ عبادت بریلوی نے لکھا تھا اور مجھے یاد آیا کہ عبادت سے ملنا تو رہ ہی گیا تھا۔ عبادت بریلوی میرا ان دنوں کا دوست تھا جب وہ دہلی میں دلی کالج میں پڑھایا کرتا تھا۔ پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد کچھ دیر تو اس سے خط و کتابت رہی اور پھر یہ سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ میں نے سعادت سے کہا۔

"یار عبادت سے تو ملنا رہ ہی گیا۔"

"آپ نے بتایا ہوتا تو میں ملاقات کا وقت طے کر لیتا۔ کچھ بھی مشکل نہیں ہوتی۔"

"کراچی سے واپسی پر دیکھوں گا۔"
"آپ نے کئی دوستوں سے واپسی پر ملنے کو کہہ رکھا ہے۔ کس کس سے مل پائیں گے اصغر؟"
"کیا بتاؤں۔ 'کارِ جہاں دراز' والی بات ہے۔"
سعادت مسکرا دیا اور میں "شعلۂ جام" کو پھر سے دیکھنے لگا۔ عبادت بریلوی نے طفیل کے جن اشعار کا اپنے مقدمے میں حوالہ دیا تھا، وہی پڑھنے لگا۔ عبادت واقعی سوجھ بوجھ والا آدمی تھا۔ اس کے نقل کیے ہوئے شعروں میں سے کچھ شعر تو مجھے بھی بہت اچھے لگے:

مری قسمت ہی میں تشنہ لبی ہے
تری آنکھوں پہ کیوں الزام آئے

کوئی بھولی ہوئی صورت کوئی بسری ہوئی یاد
کچھ نہ کچھ دل کے دھڑکنے کا سبب ہوتا ہے

چھوڑ کر آوارۂ منزل مجھے
تو نے میرے ہمسفر اچھا کیا

وہ زمانہ بھی کیا زمانہ تھا
موسمِ گل سے دوستانہ تھا

پھر سماعت میں کھلے پھول ترے نغموں کے
پھر ترا شعلۂ آواز بہت یاد آیا

چاندنی جب ترے آنگن میں اترتی ہوگی
تجھ سے اے دوست مرا ذکر تو کرتی ہوگی

طفیل سے جدا ہونے کے بعد جب ہم شیخ بلڈنگ کی شکستہ سیڑھیوں سے اتر رہے تھے تو میں سوچ رہا تھا کہ طفیل لاٹھی کے سہارے کتنی مشکل سے یہ سیڑھیاں چڑھتا ہوگا۔ اسی مشکل سے تو اس بے نیاز شاعر نے اپنی عمر کی سیڑھیاں بھی طے کی تھیں۔ اور اب بلندی پہ کھڑا وہ نیچے کی ڈھلان دیکھ رہا تھا۔ جہاں پھر اسے لاٹھی کی ضرورت ہوگی۔ وہ لاٹھی اس کی یادوں کے خوب صورت لمحے بھی ہو سکتے تھے اور اس کے بیٹے کے توانا بازو بھی۔

[جاری ہے]

بقیہ : عارف اور فرزندیِ غالب

پروا ہے نہ حاجت۔ اگرچہ یہ میری عادت نہیں تاہم میں حاسدوں کی شکایت کیا چاہتا ہوں اور وہ سبب بیان کیا چاہتا ہوں جو وجہِ شرارت بنا ہوا ہے۔

(اے غالب) تیرا غلام (یعنی عارف) جو تیرے فیضِ صحبت سے ول، دہاں) سے امامت کا قایل ہو گیا ہے (یعنی شیعہ ہو گیا ہے) وہ اِن خارجیوں[1] کے زمرے میں تیرِ ملامت کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ نیّر اور محوّ میرے دشمن ہیں اور وہ اپنے آپ کو خدا کا قائم مقام سمجھتے ہیں۔ وہ اتنے سنگدل ہیں کہ ان کی بات پتھر کی طرح لگتی ہے۔ ان کی صفت یہ ہے کہ ایک کو آفت کہا جائے اور دوسرے کو قیامت۔ اگرچہ ایک (نیّر) انتہائی معزز انسان ہے مگر دایم رشک سے آتش بجاں ہے اور دوسرا (محو) کینہ جوئی میں محو ہے جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتا آیا ہے — وہ کمزوروں پر زور کرتے ہیں، لعنت ہے ایسی شجاعت پر۔ اور جہاں پھر کے جھوٹے ہیں ان کے کسی قول میں صداقت نہیں۔"

قطعے کا مطلب تو واضح ہے یہاں صرف یہ اضافہ کرنا ہے کہ یہ جھگڑا عارف کے تبدیلِ مسلک کے فوراً بعد اٹھ کھڑا ہوا ہوگا۔ غالب کو بھی شاید لپیٹ میں لے لیا گیا ہوگا۔ اس لئے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ قطعہ ۱۸۴۱ء کے لگ بھگ کا فکر کردہ ہے۔

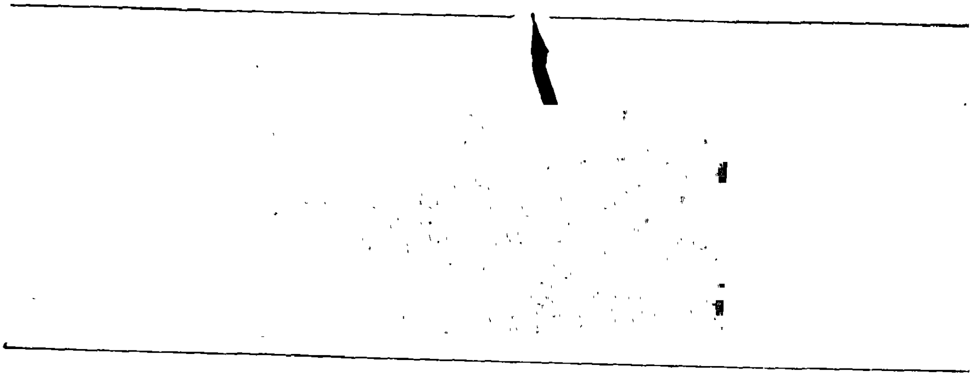
معلوم ہوتا ہے کہ طبیعتیں دو ایک سال ہی کے بعد کافی حد تک صاف ہو گئی تھیں۔ اس سلسلے میں نامۂ غالب بنام شیفتہ (۲ د ۱۲۳) مورخہ ۲۲ مارچ ۱۸۴۳ء، اور نامۂ غالب بنام ضیاء الدین احمد خاں نیّر (۲ د ۱۴۱) تمولۂ پنج آہنگ اشاعت اوّل ۱۸۴۹ء پیش کیے جا سکتے ہیں۔ پہلے میں نیّر، عارف اور محو کو ہاتھی دے کر غالب کے گھر بھیجنے اور مشاعرے میں شامل کرنے کا ذکر ہے اور دوسرے سے پتا چلتا ہے کہ نیّر، عارف کی ہمراہی میں آگرہ گئے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ کریم الدین (۳ د ۱۰) ۱۸۴۷ء میں لکھتے ہیں کہ "نواب ضیاء الدین خاں بہادر (نیّر) سے کمال ارتباط اور صحبت اس (عارف) کو رہتی ہے"۔ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ دلوں میں کچھ نہ کچھ چبھن ضرور رہ گئی تھی ورنہ غالب، عارف کے مرنے پر یہ نہ کہتے:

مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ شہو کے معنی اس محبت کے کرب کی وجہ سے ہوں جو دل و جاں سے غالب کو عارف سے تھی۔

۱۔ خارجی مسلمانوں کے اس فرقے کو کہتے ہیں جو اہلِ بیت اور خصوصاً حضرت علی کو برا کہتا ہے۔ اور ان سے محروم رکھتا ہے۔ قطعے میں عارف نے یہاں خارجیوں کے تعلق سے قطعہ کہا ہے جس سے مراد سنت پر عامل سنی ہے۔

۲۔ ضیاء الدین احمد خاں نیّر درخشاں، ڈاکٹر برابر ۱۸۲۱ تا ۱۸۸۵ء۔ غلام حسن خاں محو ولادت تقریباً ۱۸۲۲ء - ۱۸۶۶ء تک زندہ تھے۔



فضل تابش

اِس کمرے میں خواب رکھے تھے کون یہاں پر آیا تھا
گم سُم روشندانو بولو، کیا تم نے کچھ دیکھا تھا

اندھے گھر میں ہر جانب سے بدروحوں کی یورش تھی
بجلی جلنے سے پہلے تک وہ سب تھیں، میں تنہا تھا

مجھ سے چوتھی بنچ کے اوپر کل شب جو دو سائے تھے
جانے کیوں ایسا لگتا ہے اک تیرے سائے سا تھا

سُورج اونچا ہو کر میرے آنگن میں بھی آیا ہے
پہلے نیچا تھا تو اونچے میناروں پر بیٹھا تھا

ماضی کی نیلی چھتری پر یادوں کے انگارے تھے
خواہش کے پیلے پتّوں پر گرنے کا ڈر بیٹھا تھا

دل نے گھنٹوں کی دھڑکن لمحوں میں پوری کر ڈالی
ویسے انجانی لڑکی نے مجھ سے "بس" کا پوچھا تھا

اس کو چھو کر دیکھ تو لوں ہاتھ جلتا ہے جلے
ورنہ شبنم، آگ، سبزہ عمر بھر کے وسوسے

روشنی باہر کھڑی کیوں سر پٹکتی ہی رہے
مت نکل گھر سے مگر کچھ کھڑکیاں تو کھول دے

خون میں ڈوبی ہوئی سڑکوں پہ کچھ لکھا نہ تھا
پھر بھی سب ہی نے سبھی داغوں کے چہرے پڑھ لیے

رحم سے بھیگی ہوئی پلکیں سہی جاتی نہیں
تُو بھی اے ہمراہیٔ شب مجھ کو تنہا چھوڑ دے

سر اُٹھا کر جینے والے یہ تری قسمت نہیں
پھل ہمیشہ ہی جھکی شاخوں کے حصّے میں رہے

آسمانوں سے آگ برسے گی
بے حسی کا جواب مانگے گی

قہقہے چو طرف سے گھیریں گے
آنسوؤں کی برات اُترے گی

رقصِ بسمل گلی گلی ہو گا
ہر صدا بے جواب لوٹے گی

تم بھلے دُور تک چلے جاؤ
مَوت اس سے بھی آگے جائے گی

جانے والوں پہ اس طرح نہ ہنسو
یہ ہنسی دیر تک رُلائے گی

اس کے در سے بھی کچھ نہ ملنا ہے
آرزو خالی ہاتھ آئے گی

ہم بھی لفظوں کے مرد ہیں تابشؔ
ہم سے دنیا نہ بدلی جائے گی

مدھیہ پردیش اردو اکادمی، پروفیسرز کالونی، بھوپال، مدھیہ پردیش

غزلیں

اقبال متینؔ

دیارِ گل مری بے تابیوں کو رنگ تو دے
نہ دے لہو مرے دل کو، جبیں کو سنگ تو دے

اُٹھوں تو محفلِ یاراں سے یاد بن کے اُٹھوں
رہوں تو کچھ بھی نہ دے صرف اک ترنگ تو دے

چھپا لوں جتنے بھی غم ہوں دہکتے سینے میں
مرے خدا مجھے جینے کی کچھ اُمنگ تو دے

میں ہار ہار کے جیتا رہا ہوں تیرے بغیر
تو میرے پاس نہ آ، حوصلۂ جنگ تو دے

مجھے مٹا کے مرے ساتھ کی تمنّا کر!!
میں آئینہ ہوں تو صیقل نہ کر یہ زنگ تو دے

میں تیرے پاس ورق در ورق نکھرتا رہا
تو دُور دُور سے وارفتگیٔ ننگ تو دے

زمانہ بھر مجھے رُسوا کرے ہے، مجھ کو بھی
کمان ابروئے جاناں کا اک خدنگ تو دے

سنور سنور کے نکھرتا رہا متینؔ ترا
اسے بھی زندگی کرنے کا کوئی ڈھنگ تو دے

۹-۱۵-۳۷/۱ والمیکی نگر، نظام آباد (اے پی) ۵۰۳۰۰۱

عنبرؔ بہرائچی

ایک آہٹ کا کرشمہ قلب پر ایسا ہوا
مور پنکھی بادلوں کا صف بہ صف آنا ہوا

دم بہ دم خوش رنگیوں کی یہ سہانی بارشیں
ایک چہرہ میرے احساسات پر چھایا ہوا

چند لمحوں کے لیے آنگن میں شہنائی بجی
پھر وہی وحشت، وہی خوں بار سناٹا ہوا

کب ہوئی مایوس کرنوں سے بھلا بستی مری
ایک کہرا تھا اگرچہ ہر طرف پھیلا ہوا

یہ سفر پُرہول صحرا کی فضا، تنہائیاں
اک ہیولا سا مجھے شاباشیاں دیتا ہوا

اب کہاں، وقتِ سحر گل گشت کی وہ لذتیں
دوب کا سرسبز میداں ریت میں ڈوبا ہوا

اک نئی وحشت قبیلے کی رگوں میں بھر گئی
ہر نفس اپنی انا کے دشت میں بھٹکا ہوا

یوں ہوا عنبرؔ کہ جب طوفاں سبھی چُپ ہو گئے
خشک پتّوں پر سُہانا رنگ تھا بکھرا ہوا

ٹائپ ۴، بی ۳۴۳، نیو بلاک کھارطہ کالونی جونپور (یوپی)

نازؔ قادری

لرز رہی تھی فضا خوف ناک منظر تھا
ہوائیں تیز تھیں سہما ہوا کبوتر تھا

طلسمِ خوف ہر اک آنکھ میں منوّر تھا
طلوعِ صبح کا منظر عجیب منظر تھا

میں ذکر کیا کروں اب دشمنوں کے تیروں کا
کہ دوستوں کی انی پر بھی میرا ہی سر تھا

جہاں سے ملتا تھا لوگوں کو منزلوں کا سراغ
وہ راستہ مری گمراہیوں کا محور تھا

میں اپنے آپ سے آگے نکل سکا نہ کبھی
مرا وجود مرے راستے کا پتھر تھا

کبھی بھی دل کی حکایت زباں پہ لا نہ سکا
کہ اس کے ہونٹوں پہ خاموشیوں کا دفتر تھا

وہ سامنے تھا، مگر پا سکا نہ میں اس کو
کہ میرے ساتھ تو مجبوریوں کا لشکر تھا

تمام عمر رہا ساتھ بے گھری کا عذاب
کہ اپنے شہر میں رہ کر بھی نازؔ بے گھر تھا

مہدی حسن روڈ، مظفر پور (بہار) ۸۴۲۰۰۲

غزلیں

شاہد لطیف

کہاں حیاتِ ہزار ساماں، کدھر مکاں تھا
میں اِک طلسمِ سفر میں برسوں سے رائیگاں تھا
مجھے خبر تھی بہار اُترے گی آنگنوں میں
میں زندگی کے اُجاڑ موسم کا رازداں تھا
کہاں کہاں عافیت سروں پر سجی ہوئی تھی
تمازتوں میں دُعا کا سایہ کہاں کہاں تھا
نظر ہراساں کہاں ٹھہرتی، پناہ لیتی
تمام سمتوں میں دھوپ جیسا ہی سائباں تھا
ٹپک رہا تھا جو چشمِ تعبیر آشنا سے
وہ ایک آنسو، ہزار خوابوں کی داستاں تھا

ایم۔ ۶، رشید کمپاؤنڈ، کاؤسا، ممبرا، ضلع تھانے ۴۰۰۶۱۲ مہاراشٹر

سی۔ ایل۔ شرما تراش

حضور! آپ کی آواز سی لگے ہے مجھے
یہ تال سم تو کسی ساز سی لگے ہے مجھے
ہر اِک ادا: کہ نیا رُوپ ہو: اجنتا کا
ہر اِک نگہ: غلط انداز سی: لگے ہے مجھے
میں سوچتا ہوں: عنایت ہے یا چھلاوہ ہے
ادا کوئی ہو: دغا باز سی لگے ہے مجھے
لو چھین سے چونک اُٹھا عالمِ خیال اپنا
تراشؔ طرزِ ستم ساز سی لگے ہے مجھے

۹۴۔ الف۔ لاجپت نگر ۔ I ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۴

دوہے

شکیب نیازی

کبھی یہ سُورج مِتر تھا میرا کبھی تھا چندا میت
دیکھی تیری چھبی تو بھُولا ان دونوں کی پریت

چاند اُگے تو دہشت جاگے سُورج سے ڈر جاؤں
تیری یاد نہ ڈھارس دے تو جیتے جی مر جاؤں

چاند، ستارہ، دیپک، جگنو، بادل، سایہ، دھُوپ
کوئی میری آنکھ سے دیکھے گوری تیرے رُوپ

چمک اُٹھی ہیں آنکھیں اس کی دہک اُٹھے ہیں گال
جب بھی میں نے اس سے پوچھا پردیسی کا حال

پریم کرے تو ندیا جیسا جس کا ایک ہی رنگ
جس ساگر سے جوڑ لے ناتہ بہے اسی کے سنگ

اس سے پہلے کس نے کی تھی یوں میری توقیر
تیرا نام جپا تو دنیا سمجھی سنت فقیر

کب تک تیرے پاس نہ آؤں کب تک رکھوں دھیر
روز ہی موٹی ہوتی جائے پیروں کی زنجیر

کون ورہ کی پیڑا سمجھے کون بندھائے دھیر
میرے دل سے دھرتی تک ہے خون کی ایک لکیر

شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

پھر کیا ہوا

"پھر کیا ہوا چاچا؟"

کبیر نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے بوڑھے موتی سے پوچھا جو کہانی کہتے کہتے اس جگہ پہنچ کر رُک گیا تھا، جہاں محل کے پچھواڑے غلاظت میں راجہ نے ایک خوب صورت پھول دیکھا تھا اور جب اُس نے پھول توڑنا چاہا تھا تو پھول نے کہا تھا: "سات بھائی چمپا جاگو رے (سات بھائی چمپا اُٹھو) اور جوں ہی راجہ نے پلٹ کر دیکھا، سات پھولوں سے بیک وقت آواز آئی: "کینو بون پارول ڈاکو دے" (کیوں بہن پارول ہمیں بلا رہی ہو) لیکن بوڑھے موتی نے کبیر کے سوال کو نظر انداز کر دیا تھا۔ کیوں کہ وہ اس کہانی میں اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ جو پچھلے اٹھارہ برس پہلے شروع ہوئی تھی جس میں ایک گھر دو حصوں میں بٹ گیا تھا اور جس میں حاتم علی کی بیوہ کلثوم اپنی شناخت کھو بیٹھی تھی۔

کلثوم جب بیوہ ہوئی تو اس وقت بائیس سال کی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے پر رونق تھا، جسم کسا ہوا تھا اور سانولے پن میں ملاحت کی آمیزش سے وہ بڑی پرکشش دکھائی دیتی تھی۔ گاؤں کے بوڑھے جوان سبھی اُسے دیکھتے رہ جاتے۔ جدھر سے نکل جائے بس بہار آجاتی تھی۔ گویا کرشن چورا کی سُرخیوں سے پھوٹ کر نکلنے والی وہ شعلہ تھی جس کی تپش میں سارا گاؤں سُلگ رہا تھا، مگر وہ کسی کو ایک آنکھ بھی نہیں لگاتی تھی۔ دانتوں تلے ساڑھی کا پلو دبائے، نظریں نیچی کیے، بھری کمر پر گھڑا اُٹھائے بس گزر جاتی تھی۔ ایک دن مانک نے ہمت کر کے اس کی کلائی پکڑ لی اور اٹھا کر لطفو کے کھیت کے پاس واقع آم بگان میں لے گیا۔ جہاں اُس نے کلثوم سے کہا کہ وہ حاتم علی کو چھوڑ دے اور اس کا گھر بسا لے۔ کلثوم بپھر گئی۔ پانی سے بھرا مٹکا اس کے سر پر دے مارا اور چلی آئی۔ لیکن مانک میں اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ اُسے روک لیتا۔ اس کے ساتھ دست درازی کرتا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ حاتم علی ایک سچا نڈر مکتی جودھا Freedom Fighter ہے جو عزت کی خاطر مرنے مارنے سے نہیں ڈرتا۔ جب اُسے پتہ چلے گا تو اس کا خون پی جائے گا۔ اس لیے وہ گاؤں چھوڑ کر شہر چلا گیا۔

اور جب کلثوم گھر پہنچی تو اُس نے حاتم علی کو غصہ میں لال پیلا پایا۔ وہ صحن میں ٹہل رہا تھا جیسے ہی اُس نے کلثوم کو دیکھا، اُس کی گردن پکڑ لی اور دھکا دیتا ہوا اُسے اپنے کمرے میں لے آیا، جہاں اُس نے کلثوم کو جی بھر کر پیٹا۔ بڑی بڑی گالیاں دیں۔ رنڈی، فاحشہ، ماگی اور جانے کیا کیا ناموں سے پکارا۔ وہ سر جھکائے گالیاں سنتی رہی۔ مار کھاتی رہی، لیکن شوہر کا ہاتھ تک نہیں پکڑا البتہ اپنی پاک دامنی کا یقین دلانے کے لیے طرح طرح کی قسمیں کھائیں مگر حاتم علی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ کیوں کہ اُس نے سُن رکھا تھا کہ جھوٹ لیتے والے قسموں کا سہارا لیتے ہیں۔ اسی لیے اس نے کلثوم کو گھر سے نکال دیا اور اپنی بوڑھی ماں کو منع کر دیا کہ اس رنڈی کو گھر میں ہرگز نہ گھسنے دے۔ وہ منھ کالا کر کے آئی ہے۔ اب پارسائی جتا رہی ہے۔ مگر ماں بھی تو عورت ذات تھی۔ کلثوم کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کا من پسیج گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ کلثوم چاہے جو کچھ بھی ہو اپنے مرد کی انا کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتی۔ اُسے نیچا نہیں دکھا سکتی۔ اسی لیے حاتم علی جب طیش میں آکر مانک کی کھوج میں نکل گیا تو ماں نے کلثوم کو سینے سے لگا لیا۔ اور کہا: "مت رو میری بیٹی، مت رو۔ حاتم کا غصہ پل بھر کا ہے۔ وہ مٹی کا آدمی ہے۔ دیکھنے میں سخت پر من کا ہے بڑا نرم۔ وہ تجھ سے اسی طرح پیار کرے گا جس طرح کرتا آیا ہے۔"

سینیئر اسٹاف کارسپانڈنٹ 'بنگلہ دیش ٹائمز' موتی جھیل، ڈھاکا (بنگلہ دیش)

لیکن ماں کے برعکس شام ہوتے ہی جب حاتم علی تھکا ہارا گھر لوٹا تو کلثوم کو دیکھ کر ہاں پر برس پڑا۔ "جی ماں گھر کی چوکھٹ پر بدنامی کی کیلیں ٹھونکتے وقت تمہیں اپنے سفید بالوں کا خیال تک نہ آیا" پھر اس نے کلثوم کو بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔

"چھنال کہیں کی۔ دن یار کے ساتھ گزارا آئی ہے اب رات بھتار کے ساتھ کاٹے گی۔ نکل یہاں سے رنڈی" اور اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ بانس کی کھونٹی سے ٹکرا گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے اُس نے حاتم علی کے پاؤں پکڑ لیے اور گردن اونچی کر کے بولی —

"تو اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دو"

"تا کہ میں جیل چلا جاؤں" حاتم علی نے کلثوم کو پیچھے کی طرف دھکیلتے ہوئے برجستہ جواب دیا اور کمرے سے نکل جانا چاہا مگر وہ حاتم علی کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی اور دیوار سے رام داؤ کھینچتے ہوئے بولی "تم نہیں مار سکتے تو میں خود مار لوں گی اور پھر جونہی اُس نے رام داؤ ہوا میں لہرایا حاتم علی نے بجلی کی کوندے کے ساتھ لپک کر کلثوم کے ہاتھ سے رام داؤ چھین لیا اور کرخت لہجے میں بولا "پاگل ہو گئی ہو کیا"

"ہاں ہاں میں پاگل ہو گئی ہوں" کلثوم نے آنکھیں بڑی بڑی کرتے ہوئے کہا۔ "جس کا شوہر اپنی بیوی پر شک کرے اُس کا دماغ کیوں نہ بگڑے۔ میں پاگل ہو گئی ہوں۔ ہٹ جاؤ" پھر حاتم علی کے ہاتھ سے رام داؤ چھین لینا چاہا۔ اسی لمحہ حاتم علی کا زوردار طمانچہ اس کے گال پر پڑا۔ وہ تیورا کر حاتم علی کے بالوں سے بھرے چوڑے چکلے سینے پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور حاتم علی ساری رات کلثوم کی پلکوں سے موتیوں کو چنتا رہا۔

اب رُت بدل چکی تھی۔ بیساکھ کی طوفانی ہوا کے ساتھ جو بارش ہوئی تھی اس سے فضا میں نمی آ گئی تھی۔ وہ دونوں بستر پر لیٹے مستقبل کا خواب بُن رہے تھے اور ہر اُس کمرے کو کھول کھول کر جھانک رہے تھے جن کے دروازے مقفل نہ تھے۔ جونہی اُنہوں نے ساتواں در کھولا تھا، اُن کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ اُن کے سامنے چاولوں کے دانے ہیرے موتیوں کی مانند چمک رہے تھے۔ حیران ہو کر اُنہوں نے چاول کے دانوں سے اپنی مٹھیاں بھر لینی چاہیں، مگر سلکے دانے پھسل کر گر پڑے اور اُن کی مٹھیاں خالی کی خالی رہ گئیں۔ اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی تھی کوئی اس کا نام لے کر پکار رہا تھا۔ حاتم علی نے چاہا کہ دروازہ کھول کر دیکھے کہ اُسے کون بلا رہا ہے۔ کلثوم نے روک دیا۔ کیوں کہ خفیہ تنظیمیں جو سن اکہتر کی آزادی سے مطمئن نہ تھیں، طبقاتی کشمکش کے نام پر چُن چُن کر محب وطن اور مکتی جدھاؤں کو قتل کر رہی تھیں اور اپنے حامیوں کی موت کا انتقام لے رہی تھیں۔ وہ تذبذب میں پڑا سوچ رہا تھا کہ دروازہ کھولے یا نہ کھولے کہ کسی نے اب کے زور سے کھٹکھٹایا اور کرخت آواز میں اس کا نام لے کر پکارا۔ خودبخود اس کے قدم دروازے کی طرف اُٹھ گئے۔ اور جیسے ہی اُس نے دروازہ کھولا تھا سنسناتی ہوئی گولیاں اس کے سینے میں پیوست ہو گئیں۔ رات کا چیختا ہوا سناٹا کھیتوں کو اپنی بانہوں میں سمیٹے سمکتا ہوا سو گیا —

حاتم علی خون میں لت پت پڑا تھا۔ کلثوم کی کلائیاں سُونی ہو گئیں تھیں اور ماں کی آنکھوں کا نور جاتا رہا تھا۔ اس کے ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ بھی حاتم علی کے ساتھ اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔

اب کلثوم تنہا تھی۔ اکیلی حاتم علی کی یاد لیے زندہ تھی۔ سارا سارا دن روتی، مانک کو کوستی اللہ سے دعائیں مانگتی کہ اُسے کتّے کی موت دیدے لیکن ایسا نہیں ہوا کیوں کہ گناہ کی عمر لمبی ہوتی ہے۔ لہٰذا ٹھیک چہلم والی رات کو جب کلثوم اپنے شوہر حاتم علی کے کمرے میں اگربتی جلا کے پارہ پڑھ رہی تھی تو مانک گھس آیا اور کلثوم سے بولا: "کہا تھا نا اُس حرام زادے کو چھوڑ میرا گھر بسا، لیکن تو نہ مانی۔ خیر سالا جان سے گیا تو سالی اب میری بانہوں میں آ" پھر کلثوم کو بڑی تیزی سے کھینچ کر اپنے سینے سے چمٹا لیا اور بھینچنے لگا۔ کلثوم چیخ رہی تھی۔ منت سماجت کر رہی تھی۔ اللہ رسول کا واسطہ دے رہی تھی مگر مانک تھا کہ اُسے دبوچے چلا جا رہا تھا اور وہ ہچکی چلی جا رہی تھی جیسے اس کے جسم سے ہوا نکل رہی ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔

جب صبح اُسے ہوش آیا تو اس کا بدن دُکھ رہا تھا۔ رات کی ایک ایک بات، ایک ایک واقعہ، اس کے ذہن میں اُبھرنے لگا۔ اُس کا سب کچھ لُٹ چکا تھا۔ وہ بلک بلک کر رونے لگی پھر وہ اُٹھی اور ندی کی طرف بھاگی، لیکن رحمت اللہ اور دلاور نے اُسے خودکشی کرنے سے باز رکھا اور اپنی ناؤ پہ لے آئے۔ جہاں اُسے کھانے کو بھات اور پہننے کو ساڑی دی اور کہا "بھابی، حاتم علی ہمارا دوست ہی نہ تھا بلکہ کمانڈر بھی تھا، ہم نے ایک ساتھ دشمن سے جنگ کی تھی۔ تب کہیں جا کر ہمیں آزادی ملی ہے"

لیکن کلثوم نے نہ بھات کو ہاتھ لگایا اور نہ ساڑی کو۔ کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں وہ سن اکہتر سولہ دسمبر کے بعد کے مکتی جدھا ہیں جو گاؤں گاؤں لوگوں کو کھاتے پیتے لوٹ رہے تھے۔ ان میں نہ رشتے کی پہچان تھی اور نہ آدمیت۔ ان کا ایمان بس دولت اکٹھا کرنا تھا۔ جب اُنہوں نے کلثوم کو خاموش بیٹھا دیکھا تو وہ بولے "وقت اور عزّت ایک بار چلی جائے تو واپس نہیں آتی۔ اس لیے بھوکوں مرنے سے بہتر ہے کہ آدمی کھا پی کر جیئے ہنس بول کے جیے۔" پھر کلثوم کی مزاحمت کے باوجود اُنہوں نے بھی اس سے وہی کچھ کیا جو مانک کر چکا تھا۔ پھر ناؤ گھاٹ بدلتی رہی، ماتھی بدلتی رہی۔ گھر کے دروازے اندھیروں میں کھلنے لگے اور سرگوشیاں سُنائی دینے لگیں پھر رفتہ رفتہ یہ سرگوشیاں گاؤں گاؤں پھیل گئیں اور ایک دن گاؤں میں پنچایت بیٹھی۔ "اس سالی کو جلدی گاؤں سے نکالو ورنہ بہو بیٹیاں خراب ہو جائیں گی۔" جیرمین پنچوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ اور کلثوم چپ چاپ پوٹلی اُٹھائے ریلوے اسٹیشن کی طرف چلی گئی اور تمام الزامات کو اپنے وجود پر اس طرح اوڑھ لیا جیسے جنگِ آزادی کے زمانے میں کسی کیمپ سے ملا ہوا کمبل ہو جس کے اندر

مکتی جدھا اپنے پچھتاوے کی سیاہی کو لپیٹ کر سو جایا کرتے تھے۔ وہ چاہتی تو ان کی لنگیاں کھول کر انہیں ننگا کھدیتی جو رات کے اندھیرے میں اس کے دروازے تھپتھپایا کرتے تھے۔ ان مکتی جدھاؤں کے چہرے سے داڑھیاں نوچ لیتی جنہوں نے رشتے کی پہچان کھو دی تھی مگر اس نے ایسا نہیں کیا کیوں کہ بڑے بوڑھوں سے سن رکھا تھا کہ خدا کے نزدیک وہی سرخرو ہوتا ہے جو کسی کے گناہ کو معاف کر دے، اُسے ذلیل کرنے کے بجائے اس کے ساتھ پیار محبت سے پیش آئے۔

"پھر کیا ہوا چاچا"

اس بار کبیر نے حقے پر نئی چلم چڑھاتے ہوئے پوچھا۔ مگر بوڑھا مونی خاموش اپنے خیالوں میں گم اندھیروں کے پار کھیتوں کو تک رہا تھا جس میں ہوائیں کسی اژدہ بل کی مانند سانسیں لے رہی تھیں۔ جوں کہ گاڑی لیٹ تھی۔ کلثوم ویٹنگ روم میں جاکر بیٹھ گئی اور حاتم علی کے بارے میں سوچنے لگی۔

حاتم علی ایک مکتی جدھا تھا۔ دیش کے آزاد ہوتے ہی کھلنا سیکٹر سے اپنے چھاپہ ماروں کا دستہ لیے باگرہاٹ کے اندر گھسا تھا اور وہیں اپنا پہلا کیمپ ڈالا تھا، جہاں ان لوگوں کو پکڑ پکڑ لاتا تھا جنہوں نے مکتی باہنی کی مدد کرنے کے بجائے دشمنوں کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ انہیں کمک پہنچائی تھی اور اُن کے اڈوں کا پتہ بتایا تھا۔ ان میں وہ لوگ شامل تھے، جن کا تعلق کسی سیاسی پارٹی اور مفاد پرست تاجروں سے تھا۔ جنہوں نے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے مختلف ناموں سے رضاکاروں کا دستہ بنایا تھا۔ جو مکتی باہنی کے چھاپہ ماروں اور آزادی کے حامیوں کو قتل کرتے پھر رہے تھے۔ ایک دن حاتم علی اور اس کے ساتھی ایک بارسوخ شخص نوازش علی کو اس جرم میں پکڑ لائے کہ اس نے دشمن کو کھانا کھلا کر اور پانی پلا کر اس اعلان کی خلاف ورزی کی تھی جو ان کے نیتا نے لاکھوں انسانوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ چونکہ نوازش علی مذہبی آدمی تھا اور اپنے اللہ پر بھروسہ کرتا تھا۔ حاتم علی کے روبرو کھڑا تھا اور اس کے فیصلے کا منتظر تھا

اتنے میں کلثوم اپنی ماں کے ساتھ روتی بیٹتی کیمپ کے اندر داخل ہوئی اور حاتم علی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے بولی۔ "میرے بابا کو چھوڑ دو وہ بے قصور ہیں۔"

کلثوم پر نظر پڑتے ہی حاتم علی اس کے سانولے حسن میں کھو گیا۔ اُس کے ہونٹوں کی لکیروں اور آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوب گیا خیالوں میں اس کے بالوں سے کھیلنے لگا، ندی کے کنارے گھروندے بنانے لگا۔ اور ہر گھروندے میں کلثوم کو سجانے لگا۔ مگر ندی کی لہریں اُنہیں بہا لے گئیں۔ وہ چونک پڑا۔ اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ نوازش علی کو جانے دو۔ کلثوم نے حاتم علی کا شکریہ ادا کیا اور اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔

کھانا کھا کے حاتم علی نے نوازش علی سے اس کی بیٹی کا ہاتھ مانگا۔ نوازش علی نے پہلے ذرا تامل سے کام لیا پھر کہا۔ "مجھے تو کوئی اعتراض نہیں بلکہ خوشی ہے۔ چاہو تو ابھی کلثوم کو دلہن بنا کر لے جا سکتے ہو۔ لیکن لوگوں کے منھ کیسے بند کرو گے۔ جب وہ یہ کہیں گے کہ تم نے ایک لال Collaborator کی بیٹی سے شادی کی ہے۔" نوازش علی کی باتیں بڑی چبھتی ہوئی تھیں۔ وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ کیوں کہ دلال کی بیٹی سے شادی کرنا گویا آزادی کو رسوا کرنے کے مترادف تھا۔ وقت کو کھینچ کر پیچھے کی طرف لے جانے کے عمل میں شامل تھا۔ مگر ہم سب کو ایک ہی گھر کی چھت کے نیچے رہنا ہے۔ رفتہ رفتہ سارے اختلافات خود بخود دور ہو جائیں گے۔ اس نے سوچا۔ پھر اس کی پیشانی پر کچھ دیر پہلے جو شکنیں پڑی تھیں وہ کافور ہو گئیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے نوازش علی سے کہا۔ "چاچا، اس کی فکر مت کیجیے۔ بس آپ بسم اللہ کہہ دیجیے۔"

دوسرے دن گنبد والی مسجد کے امام قاضی فرید نے دونوں کا نکاح پڑھوایا اور اسی رات کلثوم کی بڑی بڑی آنکھوں اور گداز ہونٹوں کو چومتے ہوئے حاتم علی نے جانے اس کے کان میں ہولے سے کیا کہا کہ وہ شرماتی لجاتی سمٹی سمٹائی اس کی باہوں میں چھوئی موئی ہو گئی اور وہ کہکشاں کو روندتا ہوا پریوں کے دیس میں نکل گیا۔ حاتم علی اور کلثوم ایک ہو گئے اور وقت نے اُن کے زخم بھر دیے۔

"پھر کیا ہوا چاچا"

اس بار کبیر نے بوڑھے مونی کی طرف حقہ بڑھاتے ہوئے پوچھا، لیکن بوڑھے مونی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیوں کہ وہ حقہ کا کش لگاتے ہوئے اس کہانی کی تفصیل میں کھو چکا تھا جس کا آغاز اٹھارہ برس پہلے ہوا تھا۔

کلثوم ویٹنگ روم میں بیٹھی اپنے ماضی کو کرید رہی تھی کہ اس کے خیالات منتشر ہو گئے۔ ایک سست رفتار مال گاڑی اسٹیشن سے گزر گئی تھی۔ وہ اب ویٹنگ روم کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی جہاں شام کے سائے کھیتوں اور درختوں پر آسیب کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ سحر زدہ اور اس کو بیدار کرنے کی بجائے دلوں پر مردہ خور گدھوں کی مانند لپٹے ہوئے تھے۔ اور فضا کو مہیب اور بھیانک بنا رہے تھے۔ اتنے میں ایک قلی آیا اور سوئچ آن کر کے چلا گیا۔ پھر ویٹنگ روم ہلکی روشنی میں پُراسرار بن گیا اور وہ سوچ میں ڈوب گئی۔

کلثوم اسی گاؤں میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے ٹیڑھے میڑھے راستوں سے بخوبی واقف تھی۔ وہ ہر گھر پہچانتی تھی اور اس کے اندر کے ہر چہرے سے آشنا تھی۔ حتیٰ کہ گاؤں کے آخری سرے پر واقع جو قبرستان اور مسجد تھی وہ انہیں بھی جانتی تھی۔ اُسے یاد تھا کہ جب وہ سکھیوں کے ہمراہ ندی سے پانی لانے جاتی تو بانس کے جنگلوں میں پھدکتی ہوئی فاختاؤں کو دیکھ کر اس کے من میں بھی نیلے آسمان میں اُڑنے کا خیال پیدا ہوتا تھا۔ ندی کی بے کراں وسعتوں اور قل قل کرتی لہروں کو دیکھ کر اس قدر خوش ہوتی تھی کہ اس میں غوطہ پر غوطہ لگاتی تھی۔ مانجھی کے منھ سے بھٹیالی اور مرشدی گیت سن کر اُسے محبت پر اعتبار اور خدا کی عظمت کا احساس

ہوتا تھا۔ گویا اُسے اپنے گاؤں سے بے پناہ محبت تھی۔ پھر وہ اس گاؤں کو کیسے چھوڑ دے۔ جس میں اس کے پُرکھے دفن ہوں۔ جہاں تاریخ و ثقافت کی آبیاری کے لیے اس کے آباؤ اجداد خون دیتے چلے آئے تھے۔ اور اب ایک نیا گھر بنایا تھا تاکہ کوئی کسی کا استحصال نہ کرے لیکن یہ عہد پورا نہ ہو سکا خواب کی تعبیریں اُلٹی ہوگئیں۔ وہ گھر کلثوم کو پناہ نہ دے سکا۔ اس کے سر کو ڈھانپ نہ سکا کیونکہ اُنہوں نے گھر کی صرف چہار دیواریاں اُٹھائی تھیں، چھت نہیں ڈھالی تھی۔ اس پر سورج چمک رہا تھا۔ اور بارش کے پانی گر رہے تھے ـــ اور کلثوم ان پانیوں میں اتنی بھیگ چکی تھی کہ اس کا بدن سر سے پاؤں تک ایک لفظ آرہا تھا۔

کلثوم سوچتے سوچتے ویٹنگ روم سے باہر نکل آئی تھی اور ویران پلیٹ فارم پر کھڑی میلہ نگسکی ریل لائنوں کو تک رہی تھی جو کسی مُردہ سانپ کی مانند پڑی تھیں۔ یہ لائنیں بھی کتنی بے بس ہوتی ہیں۔ جو گھومتی گھماتی ایک اسٹیشن کو چھوتی دوسرے اسٹیشنوں کی طرف جاتی ہیں مگر اس کی اپنی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ اگر اس نے گاؤں چھوڑ دیا تو اس کا بھی یہی حال ہوگا۔ وہ زمین، درختوں، ندیوں اور انسانوں سے کٹ کر رہ جائے گی۔ ان سے الگ تھلگ ہو جائے گی۔ پھر اُسے اپنے آپ سے ڈر لگنے لگے گا۔ ساری دنیا سے خوف آئے گا۔ حالات سے جنگ کرنے کا حوصلہ نہیں رہے گا ـــ اس کی حیثیت مٹی کے ان تودوں کی مانند ہوگی جو راستے میں پڑے ہر آنے جانے والوں کی ٹھوکریں کھاتے رہتے ہیں ـــ

"مُجھے ایسی زندگی نہیں چاہیے۔" کلثوم نے زیرِ لب بڑبڑایا اور پلیٹ فارم سے نیچے اُتر کر ریل لائن پر چلنے لگی۔

آسمان پر ستارے لرز رہے تھے اور چاند کسی یرقان زدہ چہرے کی مانند ایک کونے میں اٹکا ہوا تھا۔ پلیٹ فارم کی بتیاں یوں ٹمٹما رہی تھیں جیسے کلثوم کے کانوں میں Immitation کی بالیاں جھول رہی تھیں۔ اُس نے چلتے چلتے کان کی لو کو چھُوا اور ناک پر جمے ہوئے پسینے کو پونچھا پھر مُڑ کر اسٹیشن کی طرف دیکھا جہاں سگنل کی سُرخ بتیاں حافظ نورالدین کی آنکھوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ جو رات کی پچھلی پہر چلہ کشی کرتا تھا۔ تاکہ گاؤں کو جن بھوت سے آزاد کر کے چاندپور والے منشی غفور کی اکلوتی بیٹی حُسنی بانو کو اپنی چوتھی بیوی بنالے۔ وہ چلتے چلتے اسٹیشن سے کافی دُور نکل آئی تھی۔ اب تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔ سو وہ ریل لائن پر بیٹھ گئی اور جھاڑیوں میں یوں گھورنے لگی جیسے وہاں چیئرمین کی آنکھیں اُگی ہوں۔ وہ چیئرمین سے واقف تھی۔ پہلی بار اُسے پنچایت والے دن دیکھا تھا۔ لیکن وہ یہاں کیا کر رہا ہے۔ شاید اپنی تشفی کے لیے کہ میں گئی یا نہیں۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پر وہ جائے گی کہاں شہر میں کون بیٹھا ہے اس کی مدد کے لیے۔ سب تو اپنے اپنے ہی میں ہوں گے۔ وہ بے بسی کے عالم میں رو پڑی اور پھر بڑبڑائی۔ مر جاؤں گی پر گاؤں نہیں چھوڑوں گی۔ یہ مٹی میری ہے۔ اس میں میرے سات پُرکھوں کی قبریں ہیں۔ اس میں میرا بچپن ہے۔ میری جوانی ہے۔ کیسے اس زمین کو چھوڑ دوں، گاؤں سے ناتا توڑوں۔"

کلثوم نے بیٹھے بیٹھے مُڑ کر اسٹیشن کی جانب دیکھا جہاں گھُپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ سارے لیمپ بجھ گئے تھے۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور دو چار قدم گئی ہوگی کہ جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ ایک سایہ نمودار ہوا اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ کلثوم ڈر گئی اور اپنی کانپتی آواز میں پوچھا: "کون ہو تم؟"

"میں تمہیں لینے آیا تھا۔" سایہ نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے آنے کا مقصد ظاہر کیا۔

"کیوں؟ گاؤں والوں نے تو مجھے نکال دیا ہے، میں ایک فاحشہ ہوں۔"

"نہیں۔ تم برہمپتر کے پانیوں کی طرح اُجلی ہو۔ تم ایک تاریخ ہو ہماری آزادی کی۔ تم میرا مقدر بن چکی ہو۔ میں تمہیں پانا چاہتا ہوں۔"

"یہ ممکن نہیں۔ جاؤ یہاں سے۔" کلثوم نے سائے کو جھڑک دیا اور اسٹیشن کی طرف چل پڑی۔ اور سایہ بھی پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اور بولا

"میں تم سے محبت کرتا ہوں کلثوم۔ تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔" کلثوم چلتے چلتے رُکی اور بولی۔

"بکواس بند کرتے ہو یا نہیں۔" پھر تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے یوں چلنے لگی جیسے اُس کے اندر ہوائیں سنسنا رہی ہوں۔ سایہ بھی اُس کے ساتھ چل رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا۔

"مجھ سے مت بھاگو۔ تم اس گاؤں کی امانت ہو کلثوم۔ مجھے معاف کردو۔"

اب وہ بے تحاشا دوڑ رہی تھی۔ اُس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ مگر اس کے باوجود آوازوں کی زنجیریں اس کے پاؤں کو جکڑنے کے لیے اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ اس کا دم پھول رہا تھا۔ سایہ پیچھے رہ گیا تھا۔ اچانک اُس نے دیکھا کوئی دیوہیکل شے اندھیرے سے نکل کر اس کی طرف بڑھ رہی ہے مارے خوف کے اس کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ وہ اپنی پوری قوت سے چیخی اور تیزی سے اندھیرے میں چھلانگ لگا دی۔ ایک تیز رفتار مال گاڑی پٹری پر کھٹ کھٹ کرتی ہوئی گزر گئی۔

بوڑھے موفی نے اطمینان کا سانس لیا اور بولا ہی آنکھیں کھولیں۔ کبیر نے اپنا وہی سوال دُہرایا:

"پھر کیا ہوا چاچا۔"

شفیع مشہدی



کپڑے کا گھوڑا

"سامنے جنات ماموں کھڑے تھے۔"

شکھی میاں پُراسرار انداز میں خاموش ہو گئے۔ "کیا سچ مچ کے جنات ماموں؟" راشد نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

دوسرے بچے جنات کا نام سنتے ہی سہم گئے تھے اور شکھی میاں کے قریب آ گئے تھے۔ تجسس، خوف اور دلچسپی کی ملی جلی کیفیت سے دوچار بچوں کی آنکھیں شکھی میاں کے لبوں پر مرکوز تھیں۔ سخت گرمی کے باوجود نیم کے پیڑ کے نیچے بچوں نے شکھی میاں کے گرد حلقہ بنا رکھا تھا۔ شکھی میاں پُراسرار انداز میں خاموش حقے کے کش لے رہے تھے۔ سناٹے میں حقے کی گڑگڑاہٹ اور نیم کے پتوں کی ہوا سے سرگوشی نے ماحول کو سحر آلود بنا دیا تھا۔ راشد، احمد، روشن، شہاب اور دوسرے بچے آگے کی کہانی سننے کو بے چین تھے۔

"پھر کیا ہوا؟ شکھی نانا؟" شہاب نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"سناتے ہیں بابو۔ ذرا حقہ تو پی لیں۔" شکھی میاں نے حقے کا کش لیتے ہوئے کہا۔ دھواں کچھ کم ہو گیا تھا۔ وہ برآمدے میں بیٹھے بندھیا دائی کا انتظار کرنے لگے۔ "اری کمبخت کیسا حقہ بھرا تھا" ترت پھس ہو گیا۔" انہوں نے ایک موٹی سی گالی بھی دے ڈالی۔ شکھی میاں کی بیوی بندھیا دائی جسے بچے بندھیا نانی کہا کرتے تھے چل کر بولیں "ٹھیک ہی تو بھرا تھا۔ اتنی دیر سے قصہ کہانی لیے بیٹھے ہو۔ شرم نہیں آوے ہے تمہیں، بچوں کو بنا دے ہیں..." کہتی ہوئی وہ قریب آئیں اور شکھی میاں کی چلم بدلی۔ شکھی میاں نے فاتحانہ انداز میں اور زور سے کش لیا۔ گڑگڑاہٹ کی تیز آواز فضا میں گونجی۔ دھوئیں کا مرغولہ اٹھا اور شکھی میاں کی آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی۔ نیم کا پیڑ جھومنے لگا۔

"ہاں تو ہم کیا کہہ رہے تھے۔" انہوں نے بچوں سے پوچھا۔

"جنات ماموں سامنے کھڑے تھے۔" روشن نے لقمہ دیا۔

"ہاں ہم نک پھوپھا بابو کے یہاں سے شہنائی بجا کر لوٹ رہے تھے۔"

"نک پھوپھا بابو کون تھے نانا؟"

"دیکھو تمہیں بیچ میں مت ٹوکا کرو ــــ نک پھوپھا بابو کو نہیں جانتے۔ بہت بڑے رئیس تھے۔ گیاجی کے اُتر میں ان کی بہت بڑی کوٹھی ہے۔ کیا رئیس آدمی تھے۔ اشرفی لٹاتے تھے اور ہم کو تو ایسا مانتے تھے کہ بس پوچھو مت۔" شکھی نانا بہک رہے تھے۔ راشد نے ٹوکا۔ "شکھی نانا کہانی سنائیے نا۔" اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ نک پھوپھا بابو کا قصہ سنانے لگے تو جنات والا قصہ غائب ہو جائے گا۔

"ہاں بھائی تو ہم بارہ بجے رات کو شہنائی بجا کر لوٹ رہے تھے۔ پھلگو کے کنارے والی سڑک پر ڈرتے ڈرتے جا رہے تھے۔ بالکل سناٹا تھا۔ ہم جانتے تھے کہ جن اور بھوت کا وقت ہے۔ ہم تیز تیز جا رہے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے اُجلے کپڑوں میں ایک بہت لمبا آدمی چلا آ رہا ہے۔

"کتنا لمبا...؟" ایک چھوٹے بچے نے لرزتے ہوئے پوچھا۔

"بہت لمبا سمجھو کہ اس تاڑ کے پیڑ کے برابر۔" شکھی میاں نے دور کھڑے تاڑ کی طرف اشارہ کیا۔ "اتنا لمبا!"

"شکل کیسی تھی؟" راشد نے پوچھا۔

اندھیرے میں ہم شکل کیسے دیکھتے، چپ چاپ سنو۔ نہیں تو ہم نہیں سنائیں گے۔" شکھی میاں نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "تو ہم کیا دیکھتے ہیں کہ جنات ماموں ہمارے سامنے کھڑے ہیں۔ بھیا ہماری تو گھگھی بندھ گئی۔ مگر ہم تو کئی بار مل چکے تھے، اس لیے

310-C نیو آفیسرز ہوسٹل، بیلی روڈ، پٹنہ۔ ۱

ہم نے کہا: "سلام علیکم جنّات ماموں"۔ بچوں کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور سُکھی میاں کی کہانی جاری تھی۔ جیسے ہی ہم نے سلام علیکم کہا وہ خوش ہوگئے۔ بولے وعلیکم السلام، تُو اتنی رات کو کہاں سے چلا آرہا ہے۔ ہم نے گڑگڑا کر کہا۔ حضور، معاف کر دیجئے۔ ہم شہنائی بجا کر آرہے ہیں۔ اتنا سُننا تھا کہ وہ ہنس دیے۔ بولے کہ ذرا ہم کو بھی سُناؤ سُکھی میاں۔ پھر بچوں کے خوف زدہ چہروں کی طرف دیکھ کر مسکرائے، کھانسے اور پھر گویا ہوئے۔ "ہمارا تو ڈر کے مارے بُرا حال تھا۔ مگر سوچا کہ موقع اچھا ہے سُکھی میاں۔ آج جنّات ماموں کو خوش کر ہی دو۔ پھر جو ہم نے بھیروں راگ چھیڑا تو جنّات ماموں جھومنے لگے۔ جیب سے نکال کر دو اشرفی ہم کو دیے اور ایک ڈبّہ متھرا کا پیڑا۔"

"متھرا کا پیڑا؟" ایک بچّہ ذرا بے یقینی کے ساتھ بولا۔

"ہاں، تب اور کیا۔ اتنا اچھا، تازہ اور خاص متھرا کا پیڑا۔ وہ ترت منگائے تھے متھرا سے۔"

"متھرا تو بہت دُور ہے سُکھی نانا۔" راشد نے کہا۔

"ارے جنات ماموں کے لیے کیا دُور ہے۔ اُڑ گئے اور اُڑ کر آ گئے۔"

"تو آپ نے پیڑا کھایا؟" احمد نے پوچھا۔

"کھایا اور خوب کھایا۔ بندھیا نے بھی کھایا۔" سُکھی میاں بولے۔ سارے بچوں کی نگاہیں بندھیا نانی کی طرف اُٹھ گئیں۔ وہ بیٹھی کھلونے بنانے کے لیے لال کپڑے سے کچھ سی رہی تھیں۔ "بندھیا نانی، تم نے پیڑا کھایا تھا، جنات ماموں والا؟" شہاب نے پوچھا۔

"ہم نہیں کھاتے یہ سب۔ یہی لائے تھے، یہی کھائے ہوں گے۔" اُنہوں نے جل کر جواب دیا۔ اور سُکھی میاں سے بولیں۔ "کا ہے ای سب جھوٹ کہانی سُنا کر بچوں کو ڈراؤ ہو۔ کچھ اللہ رسول کی بات کرو۔ مرنا ہے کی نہیں۔"

"ارے مرنا تو ہے ہی سُسری تو کیا جانے۔ یہ بابو سب ہمری آنکھ کی روشنی ہیں۔" سکھی میاں نے ایک بھدّی سی گالی بیوی کو دی۔

"اچھا اچھا بہت ہوا۔ اب چلو کام کرو۔ گھوڑا سی دیا ہے۔ ان میں بھوسی بھرو۔ کل میلے جانا ہے بیچنے کو۔"

"سُکھی نانا میرا گھوڑا کب بنا کر دیں گے؟" راشد نے پوچھا۔

"جب آپ کی شادی ہوگی۔" کہہ کر سکھی میاں ہنسنے لگے۔ وہ راشد کو ہمیشہ یہی جواب دیا کرتے تھے۔

پھر سارے بچّے مل کر لال کپڑے سے بنے گھوڑے کے خول میں بھوسی بھرنے لگے۔ بچے بڑے زور شور سے بھوسی بھر رہے تھے اور سُکھی میاں اُنہیں چڑیل کی کہانی سنانے کا وعدہ کرکے ان سے خوب کام لے رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے دس بارہ گھوڑے بھوسی بھر کر کھڑے کر دیے گئے۔ بندھیا نانی نے ان کے منہ سیے اور سکھی میاں نے کالے دھاگے سے آنکھیں بنائیں۔ زین کسی، لگام لگائے اور دو گھنٹے میں سب گھوڑے مکمل ہو کر چمچمانے لگے۔ اتنے خوب صورت گھوڑے بنانے والا شہر میں کوئی دوسرا نہ تھا۔ جب سے سُکھی میاں کی سانس ٹوٹنے لگی تھی اُنہوں نے گھوڑے بنانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ ویسے بھی بینڈ باجے کا زمانہ آگیا تھا اور شہنائی کی مانگ کم ہو گئی تھی ——— ایک زمانہ تھا کہ نوابوں، رئیسوں اور زمینداروں کے یہاں شادی میں صرف شہنائی کی پوچھ تھی۔ اس لیے سکھی میاں شہنائی نواز کی بھی بے حد مانگ تھی۔ چُست پاجامہ، دوپلی ٹوپی، مخمل کی واسکٹ، جس پر زری کا کام ہوتا۔ بغل میں شہنائی۔ اپنے دو طبلچیوں کے ساتھ جب اکڑتے ہوئے چلتے تو اچھے اچھے بانکوں کو پسینہ آجاتا تھا۔ سُکھی میاں کی شہنائی کی تان ایسی مشہور تھی کہ لوگ دم بخود رہ جاتے۔ ایک مرتبہ انجمن نواب نے خوش ہو کر اپنی زری والی اچکن انعام میں دے ڈالی تھی سُکھی میاں کو۔ وہ اس اچکن کو اس طرح سنبھال کر رکھتے تھے جیسے قارون کا خزانہ ہو۔ کہیں شہنائی بجانے کے لیے جاتے ہوئے جب وہ اس کو پہنتے تو ان کا سینہ کچھ اور تن جاتا۔ وہ اپنے طبلچی بدّو میاں کو گھور کر یوں دیکھتے کہ اس کا ہاتھ طبلے پر کچھ اور زور سے چلنے لگتا۔

وقت کے ساتھ ساتھ رواج بھی بدلتے ہیں۔ اب ماڈرن بینڈ کے سامنے سُکھی میاں کی شہنائی بے رونق ہوتی جارہی ہے۔ دمے نے شہنائی کی تان توڑ دی تھی۔ رئیسوں اور نوابوں کے یہاں اب سکھی میاں کی گزر نہیں تھی۔ یہاں محلے میں کسی کے گھر شادی ہوتی تو لوگ بلا لیتے۔ کھانا کھلا دیتے تھے اور کچھ انعام دے دیتے تھے۔ سکھی میاں کی شہنائی مذاقِ محفل بن گئی تھی ———

سبحانی میاں کے بیٹے کی بارات دروازے لگتے وقت سُکھی میاں کو جوش آگیا تھا اور تھوڑی دیر کے لیے وہ یہ بھول گئے تھے کہ اب ان کی سانسوں میں دم نہیں رہا ہے۔ نواب صاحب کی دی پرانی گرد آلود اچکن پہنے ہوئے اُنہوں نے شہنائی کی تان کھینچی تو سارے لوگ متوجہ ہو گئے ——— بدّو میاں بھی گھبرا کر زور سے طبلے پر تال دینے لگے اور سوچنے لگے کہ باسی کڑھی میں اُبال کیسے آگیا۔ لیکن ابھی تان آدھی ہی اُٹھی تھی کہ سکھی میاں کی سانس نے دم توڑ دیا۔ شہنائی ایسی بے سُری ہو گئی کہ لوگ ہنسنے لگے۔ سُکھی میاں کی آنکھیں اُبل آئیں۔ سانس مشکل سے لی جانے لگی اور لوگوں کو ہنستے دیکھ کر ان کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ بڑی مشکل سے سانس پر قابو پاتے ہوئے اُنہوں نے شہنائی کو الگ کیا۔ گرد و پیش پر نظر ڈالی اور شہنائی بدّو میاں کو تھماتے ہوئے سر جھکا کر

دیے۔ لوگوں نے آوازیں دیں۔ سبحان میاں نے روکا کہ کھانا کھا کر جائیں، مگر سُکھی میاں خالی خالی نظروں سے سب کو دیکھتے ہوئے واپس آگئے۔ خلافِ توقع بندھیا نانی نے خالی ہاتھ واپس آتے دیکھا تو پوچھ بیٹھیں کہ کیا ہوا؟ چلے کیوں آئے۔ شہنائی کہاں ہے۔ سکھی میاں نے یوں گھور کر دیکھا کہ بڑھیا سہم کر بیٹھ گئی اور جلدی سے حقہ لاکر سامنے رکھ دیا۔ اس مرتبہ سکھی میاں پر کھانسی کا ایسا دورہ پڑا تھا کہ ہفتوں بستر سے اُٹھ نہ سکے تھے۔ سبحانی میاں کے بیٹے کی شادی میں جو اُداسی ان کی آنکھوں میں گھر کر گئی تھی وہ کبھی دُور نہیں ہو سکی تھی۔ اُنہوں نے گھوڑے بنانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ آمدنی بے حد کم ہوگئی۔ بڑھاپے، بیماری اور غریبی تینوں نے بیک وقت حملہ کر کے سکھی میاں کی کمر توڑ دی تھی۔ اب اُن کے لیے خوشی کے لمحات وہی ہوتے تھے، جن میں وہ حویلی سے آئے ہوئے بچوں کو بٹھا کر جنات ماموں اور چڑیل کی کہانیاں سناتے تھے۔ بچوں کی آنکھوں میں چمک دیکھ کر ان کی اداس آنکھوں میں بھی چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ بچوں کو کہانیاں سُنانا، کپڑے کے رنگ برنگے گھوڑے بنانا میلے اور ہاٹ بازار لے جاکر اُنہیں بیچنا۔ حقہ گڑگڑانا، کھانستے رہنا اور بندھیا نانی کو موٹی موٹی بھدی گالیاں دینا۔ یہی تھی سُکھی میاں کی زندگی۔

سُکھی میاں کی کوٹھری کے سامنے

وہ نیم کا پیڑ اسی طرح کھڑا تھا اور راشد اس پیڑ کے نیچے کھڑا سکھی میاں کے ویران برآمدے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ برسوں بعد وہ ہاسٹل سے گھر آیا تھا۔ شام کو اُس نے رام دھنی کے گھر کے سامنے بدو میاں کو عجیب و غریب انداز میں شہنائی بجاتے دیکھا تھا۔ وہ تنہا تھے۔ اُن کے گلے سے طبلہ بندھا ہوا لٹک رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں شہنائی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے اُسے پکڑ کر پھونک رہے تھے اور دوسرے ہاتھ سے طبلے کو تھپتھپا رہے تھے۔ اس طرح آوازوں کا وہ عجیب و غریب امتزاج پیدا ہوا تھا: پیں ..... دھپ ..... پیں ..... ایں ..... ایں دھپ دھپ۔ بدو میاں کی بے سری زندگی کی پوری عکاسی ہو رہی تھی۔ بدو میاں کو یوں تنہا دیکھ کر دفعتاً اُسے سُکھی میاں کا خیال آیا اور وہ خود ان کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ شام نے اپنے پر پھیلا دیے تھے۔ سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ نیم کے پیڑ کے نیچے خاموشی تھی۔ دفعتاً اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے چھوٹے چھوٹے گھوڑے نیم کے پیڑ کے نیچے دوڑ رہے ہوں۔ بچپن کے سارے مناظر اس کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ بھاری قدموں کے ساتھ وہ برآمدے کی طرف بڑھا اور تاریک کوٹھری کی طرف پہنچا۔ سامنے ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر سُکھی میاں ایک لاش کی طرح پڑے ہوئے تھے اور بندھیا نانی چارپائی کی پٹی پر سر ٹکائے اونگھ رہی تھیں۔ آہٹ پاتے ہی وہ چونک پڑیں۔

"کون ہے بابو؟" اس کی لرزتی ہوئی کمزور آواز گونجی۔

"میں ہوں نانی، راشد..... راشو۔"

اس نے اپنا نام بتایا۔

بندھیا نانی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھیں —

"راشو بابو۔ آپ کب آئے میاں۔ یہاں کاہے کو آئے، ہم کو بُلا لیتے۔" اس کے نحیف لہجے میں خوشی کی جھلک تھی طاق پر رکھے مٹی کے دیے کی مدھم لو کوٹھری کی تاریکی کو دور کرنے میں ناکام تھی۔ اُسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ کچھ دیر بعد جب آنکھیں تاریکی سے مانوس ہوئیں تو ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ پلنگ پر پڑا نظر آیا۔ کثیف اور پھٹی ہوئی چادر پر سُکھی میاں بے حس پڑے تھے۔

"سلام سُکھی نانا۔" راشد نے زور سے کہا سُکھی میاں کی آنکھیں کھُلیں۔ ان کی آنکھوں میں اُداسی اور گہری ہو گئی تھی۔ بینائی بھی ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگے۔

"ہم راشد ہیں سکھی نانا..... راشو۔"

"راشو بابو!... چھوٹے بابو! ان کی نحیف آواز میں جان سی آگئی۔ اُنہوں نے اُٹھ کر بیٹھنے کی ناکام سی کوشش کی۔" خدا خوش رکھے۔ بڑے بابو کی طرح بڑا بنائے۔ بڑے بابو یعنی راشد کے والد کا نام لیتے ہوئے ان کی آواز بھر آگئی۔ ایک تیز آہ کھینچ کر بولے۔" بڑے بابو ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ ہمارا سہارا چلا گیا۔ اب تو موت بھی نہیں آتی۔ خدا عمر دراز کرے بڑی دلہن کی آنکھ کا تارا ہیں آپ۔ اللہ خوش رکھے۔ وہ دعائیں دیتے رہے۔ تاریک کوٹھری میں آواز گونجتی رہی۔" سُنا ہے آپ کی شادی ہونے والی ہے بابو؟"

"ہاں نانا۔ آپ جلدی اچھے ہو جائیے شہنائی بجانی ہے نا!"

سُکھی میاں کی بے نور آنکھیں سامنے اُٹھیں جہاں گرد آلود شہنائی کھونٹی سے لٹکی تھی۔ اس کے سامنے اچکن بھی لٹکی ہوئی تھی جس کی زری کالی ہو چکی تھی۔ گرد کی وجہ سے اچکن کا رنگ بھی نہیں دکھائی دیتا تھا۔ راشد کو جھرجھری آگئی۔ سُکھی میاں کی آنکھیں بھی جیسے کھونٹی سے لٹک گئی تھیں۔ اچانک وہ مُڑے۔" بابو، ہم آپ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ کی شادی میں گھوڑا بنا کر دیں گے۔"

راشد کے کانوں میں ان کی باتیں گونجنے لگیں۔ ان کی کہانیاں، ان کے وعدے، جنات ماموں، متھرا کے پیڑے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے کھو سا گیا۔ دفعتاً اُس نے دیکھا کہ سکھی میاں کے ہاتھوں میں ایک پرانا بوسیدہ گھوڑا لرز رہا تھا۔

"لیجیے گھوڑا۔ میرا وعدہ تھا۔ بہت گندہ ہو گیا ہے بابو۔

(بقیہ صـ۴۳ پر)

ی سنگھ رانا شاہین

پَل بھر کا احساس

اُس کو تھانے سے بُلاوا آگیا تھا اور وہ
دسپاہیوں کے ساتھ چلا بھی گیا تھا۔ وہ اور اس کی
ری دونوں ہی سپاہیوں کو دیکھ کر حیران اور پریشان
ہے ہو گئے تھے۔ وہ گالیاں بکنا بھول گیا تھا اور اس
ا بیوی سسکنا رونا بھول گئی تھی۔ وہ دونوں
یب دوسرے کے نزدیک کھسک آئے تھے ۔
ریا سا جیسے دشمن سے ساتھ بچاؤ کرنا چاہتے ہوں۔
ونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اب اس کی
نکھوں میں نشے اور غصے کے لال لال ڈورے نہیں
تھے بلکہ خوف کا پیلا پن اس کے چہرے پر نمایاں تھا۔
ں کی بیوی کی آنکھوں سے اشک سُوکھ گئے تھے۔
ن آنکھوں سے درد اور تھکان کے نشانات
ٹ گئے تھے۔ حیرت زدہ خوف سے وہ کبھی اپنے
وہر کو دیکھتی تو کبھی پولیس کے سپاہیوں کو۔
آج اس کی پیشانی پھر ہو رہی تھی۔ ایک
رپھر بلاوجہ یا وہ وجہ اتنی سنجیدہ نہ تھی کہ نوبت
یہاں تک پہنچی۔ وہ نمبردار کے گھر سے دن بھر کام
رنے کے بعد رات کا کھانا لے کر گھر ذرا دیر سے پہنچی
تی۔ اس دن کھانا وہاں ذرا دیر سے بنا تھا۔ جیسے
ی وہ گھر پہنچی۔ اُس نے اُس کو گالیاں بکنا شروع

کردیں۔ عادتاً اُس نے سُننا جاری رکھا۔ وہ چُپ
رہی۔ کچھ بولی نہیں۔ اس کا ردِ عمل پتھر جیسا ہو گیا
تھا۔ ایسا گویا اُن گالیوں کا اس پر کوئی اثر نہیں
ہو رہا تھا۔ اور ہوتا بھی کیوں؟ وہ گالیاں بلاوجہ
تھیں اور اس طرح کا جھگڑا اُس کی عام عادت
تھی۔ اُس نے سوچا: "کیا ہے کہ سوال جواب کرنے
ہیں۔ بات بڑھ جائے گی۔ اس کو اور زیادہ جھگڑنے
کا موقع اور بہانہ مل جائے گا۔" اس نے اس کی
زیادہ پروا نہ کرتے ہوئے اپنے بچوں کو بلایا اور
اُن میں کھانا بانٹنے لگی۔ بیوی کو اپنی طرف اس قدر
لاپروا دیکھ کر اس کا غصہ مزید بڑھ گیا۔ اُس کی
اَنا کو ٹھیس پہنچی۔ وہ اُٹھا، ایک ڈنڈا اٹھایا
اور بِنا دیکھے ہی بیوی پر دے مارا۔ ڈنڈا ٹوٹ
گیا۔ وہ درد سے چیخ اُٹھی۔ گھٹنے کے نیچے ایک
زخم ہو گیا۔ بچوں سے کھانا چھوٹ گیا۔ وہ سب
رونے لگے۔ اُن کی صرف آواز میں رونا تھا۔ آنکھوں
کا پانی باپ کے ڈر سے کہیں تھم گیا تھا۔ وہ سب
اپنی ماں کے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔

"بے شرم رنڈی، میں یہاں بکواس
کر رہا ہوں اور تجھ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ——؟"
وہ پھنکارتا ہوا باہر چلا گیا۔ آنگن میں
بیٹھ کر گالیوں کا سلسلہ اُس نے پھر شروع کر دیا۔

اول جلول اور غلیظ گالیاں اس کے منہ سے ایسے
نکلتیں جیسے اُس نے ان کو حفظ کر رکھا تھا۔ گالیاں
بکتے بکتے وہ اپنی اور اپنی بیوی کی کئی کئی پیڑھیوں
کی خبر لے لیتا۔ شراب پینا اُس کی عام عادت تھی اور
شراب پی کر جھگڑنا بھی اُس کی فطرت تھی۔ بیوی
تو بے چاری تنگ تھی ہی۔ گاؤں والے بھی تنگ
تھے۔ رات کو دُور دُور تک اُس گھر سے اُٹھنے
والی چیخ پکار اور گالیوں سے لوگوں کی نیند تک
حرام ہو جاتی تھی۔ گاؤں والوں کو پتہ لگ جاتا
تھا کہ آج وہ "سپوت" گاؤں واپس آیا ہے۔ گھر
سے چھ چھ سات سات دن تک غائب رہنا اُس
کے لیے عام بات تھی۔ اُسے بیوی بچوں کے روٹی کپڑے
کی کوئی فکر نہ ہوتی۔ کوئی اُسے سمجھانے کی کوشش
کرتا تو اُسے اس کی فضول باتیں سُننی پڑتیں....
"وہ ذمہ داری میری ہے۔ میں ہی اُسے نبھاؤں گا۔
آپ کو اگر زیادہ فکر ہے تو آپ ہی مہیا کر دیجیے۔"
اُس کی بیوی کو روٹی کپڑا دراصل گاؤں والے
ہی دیتے تھے۔ وہ تو نکھٹو ہے شہر میں پتہ نہیں
کیا کرتا ہے؟ کسی نے اُسے کبھی پیسہ گھر لاتے نہیں
دیکھا۔ لیکن جب بھی گاؤں میں دیکھا نشے میں
دُھت دیکھا۔

"اے۔ تمہارا نام کیا ہے؟" سپاہی نے

رحوک، ہماچل پردیش ۱۷۵۰۲۱

کال نمبر ۲

بارعب آواز میں پوچھا تھا۔

"جی، سیوک رام!" اُس نے ڈری ہوئی آواز میں جواب دیا تھا۔

"چلو تھانے، تمہیں تھانے دار صاحب بلاتے ہیں۔"

"اچھا جی۔ لیکن اسی وقت ...؟"

"ہاں ہاں، اسی وقت۔ چلو اٹھو۔"

اُس نے ہمدردی بھری ایک نگاہ اپنی بیوی پر ڈالی۔ ایسے جیسے قصائی کے ہاتھوں بِک جانے والا بکرا، اپنے باقی بچے ساتھیوں اور مالک کو دیکھتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی بیوی اس حالت میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی ایک نور کی اُمید لے کر اُس نے وہ نگاہ ڈالی تھی۔ اپنی بیوی سے ایک ان بوجھ مدد چاہی تھی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں اپنی بیوی کے لیے شفقت تھی، معذرت تھی اور محبت بھی۔ کچھ ہی لمحے قبل وہ اس کی کئی پیڑھیوں کو گالیاں دے رہا تھا۔ ایک پتھر اُس کے پیٹ پر نہ مارا تھا، اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا تھا اور اس کی گردن کو اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیا تھا۔ لیکن اس وقت وہی سیوک رام بے چارگی سے اس کو دیکھتا ہوا پولیس والوں کے ساتھ چلا گیا تھا۔

وہ عورت اپنے شوہر کی اس بیچارگی کو برداشت نہ کر سکی۔ اس کا دل چلّا اُٹھا۔ وہ اپنا درد بھول کر اپنے شوہر کے بارے میں سوچنے لگی، جسے ابھی ابھی پولیس والے لے گئے تھے۔ وہ ذہنی طور پر بہت پریشان تھی۔ "پتہ نہیں وہاں اس کی کیا حالت ہوگی۔ پتہ نہیں کس نے کر دی یہ شکایت؟ اُس کے ذہن میں کئی سوال اُٹھنے لگے۔ پتہ نہیں وہ رات کو واپس آئے گا بھی یا نہیں۔ پتہ نہیں کتنی مار ماریں گے اُسے وہ؟"

وہ اُٹھی اور بچوں کو ساتھ لے کر نمبردار کے گھر جا پہنچی۔ فریاد کی: "میرے شوہر کو جیسے تیسے واپس لے آیئے۔ اُس کو کچھ ہو گیا تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔ جیسا بھی ہے وہ میرا شوہر ہے۔ میں نے کبھی کوئی شکایت نہیں کی۔ میرے اپنے کرموں کا پھل ہے سرکار۔ اس میں کسی کا کیا قصور۔ دُکھ دینے والا ہی سہی، لیکن ہے تو میرا شوہر آخر۔ کیسا بھی ہے حضور وہ میرا سردار ہے۔ میرا مالک ہے۔ اُسے واپس بُلا دیجیے ...!" نمبردار نے اُسے سمجھا بُجھا کر واپس بھیج دیا۔

گھنٹے بھر بعد سیوک رام گھر واپس آگیا۔ دروازے کے قریب کھڑے ہو کر اُس نے اپنے بیوی بچوں کو دیکھا۔ اُس کی بیوی ابھی تک جاگ رہی تھی۔ دو نو بچے اس کی گود ہی میں سو چکے تھے۔ وہ بھیگی آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھ رہے تھے وہ سر جھکائے ہوئے سوئے ہوئے بچوں کو تھپتھپا رہی تھی۔

کھانا تھالیوں اور کٹوروں میں ویسے ہی پڑا ہوا تھا۔ کسی نے کچھ نہ کھایا تھا۔

اُس نے سوچا: "یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ ایسا کر کے مجھے کیا ملتا ہے؟" اس سوال کا جواب اُسے کبھی نہیں ملا۔ وہ جھنجھلا کر کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کی بیوی نے دیکھا۔ تھوڑی دیر دیکھتی رہی۔ پھر بچوں کو گود سے اُتار کر اس کی کھاٹ کے قریب آ گئی۔

"آ گئے تم؟ اُن لوگوں نے زیادہ تو نہیں مارا؟" اُس نے اس کی بانہہ پکڑ کر پوچھا۔

اُس کا پوچھنا ہی تھا کہ وہ دہاڑیں مار کر رونے لگا۔ اپنی بانہہ چھُڑا کر اُس نے اپنا سر تھام لیا۔ دونوں سوئے ہوئے بچے روتے روتے جاگ گئے۔ پورا خاندان ہی رونے لگا۔ اُس کی بیوی نے سہمتے ہوئے اُس کی بانہہ کو ایک بار پھر پکڑا۔ "کیوں کیا ہوا؟"

لیکن سیوک رام نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ برابر سسکیاں لیتا رہا۔ اس کی بیوی نے اس کے سر کو اپنی گود میں لے لیا اور اس کے بالوں کو سہلانے لگی۔ ●●

بقیہ: کپڑے کا گھوڑا

صاف کرا کے اپنے بیٹے کو دیجیے گا۔" ان کی آواز بھرّا گئی۔ "ہم شہنائی نہیں بجا سکتے بابو۔ کچھ دے نہیں سکتے۔ بس یہی گھوڑا ہے ہمارے پاس"

راشد کی ریڑھ کی ہڈّی میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ اُس نے کانپتے ہاتھوں سے گھوڑا لے لیا۔ تھوڑی دیر کے لیے اُسے ایسا لگا جیسے تاریک کمرے میں وہ کسی جج کے سامنے کھڑا ہو۔ اُس نے اُبلتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ سکھی میاں کا بے جان سا ہاتھ پلنگ پر رکھا ہوا تھا۔ کچھ سوچ کر اس کا اپنا ہاتھ جیب کی طرف گیا۔ اُس نے کچھ نوٹ سکھی میاں کی طرف بڑھائے۔ "سکھی نانا یہ روپے لے لیجیے۔ دوا منگوا لیجیے گا۔"

سکھی میاں کی بند آنکھیں کھُل گئیں۔ ان میں بلا کا درد اُمنڈ آیا تھا۔ روپوں کو گھوڑے کی قیمت سمجھتے ہوئے وہ عجیب سے کرب میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ڈبڈبائی آنکھیں جیسے شکوہ کر رہی تھیں۔ "ہمیں گھوڑے کی قیمت دے رہے ہو بیٹا!"

"نہیں تو ..." راشد لرز گیا۔ "میں تو ......!"

سکھی میاں کے ہاتھوں میں لرزش ہوئی ایک ہاتھ راشد کی طرف بڑھا، لیکن آدھا اُٹھ کر پھر پلنگ پر گر گیا۔ مٹی کے دیے کی لَو نے لپک کر دم توڑ دیا تھا۔ تیل ختم ہو چکا تھا۔ راشد کے کانوں میں بدو میاں کے ساز کی ہیں۔ ... ایں ..... ایں .... ڈھب ڈھب کی بے سُری آواز گونج رہی تھی اور اُس کی سماعت پر کپڑے کے رنگ برنگے گھوڑے سکھی میاں کی چارپائی کے گرد رقص کر رہے تھے۔



نام کتاب : پنج آہنگ میں مکاتیبِ غالب
مرتبہ : کالی داس گپتا رضا
قیمت : ۱۲۰ روپے
ناشر : وِمل پبلی کیشنز، ۳۰۵، چرچ گیٹ چیمبرز
بمبئی ۴۰۰۰۲۰

جناب کالی داس گپتا رضا میرے عزیز دوستوں میں ہیں۔ اب وہ دیگر تصانیف کے علاوہ صرف غالبیات ہی پر اتنی کتابیں تیار کر دے چکے ہیں کہ انہیں آسانی سے ماہرینِ غالبیات کی صفِ اوّل میں جگہ دی جا سکتی ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب اُن کی تازہ ترین تالیف ہے جو بڑے سائز کے ۱۵۹ صفحات پر محیط ہے۔ گپتا صاحب کے دیباچے اور فہرست کے 19 صفحات اس کے علاوہ ہیں۔

"پنج آہنگ" غالب کی مشہور فارسی تصنیف ہے، جس کے چار مطبوعہ ایڈیشن اہم ترین ہیں۔ طبع اول: ۱۸۴۹ء، طبع دوم: ۱۸۵۳ء، طبع سوم: ۱۸۶۸ء (کلیاتِ نثر میں شامل) اور چوتھا ایڈیشن کلیاتِ نثرِ غالب مطبوعہ جنوری ۱۸۷۱ء۔ یہ ایڈیشن مطبع نولکشور سے چھپا تھا۔ اس وقت غالب کا انتقال ہوئے تقریباً ایک سال اور گیارہ ماہ ہو گئے تھے۔

جیسا کہ پنج آہنگ کے نام سے ظاہر ہے، کتاب میں اصلاً پانچ حصص ہیں، جنہیں آہنگ کا نام دیا گیا ہے۔ پانچواں آہنگ مکاتیبِ غالب پر مشتمل ہے اور یہی غالبیات کا اہم ترین باب ہے۔ غالب کے یہ خط تعداد میں ۱۶۹ ہیں۔ چونکہ یہ تعداد ہر مطبوعہ ایڈیشن میں بڑھتی گئی تھی، اس لیے یہ خط از خود تاریخی لحاظ سے چار ادوار میں بٹ گئے ہیں۔ یعنی پہلے مطبوعہ ایڈیشن میں ۱۲۶ خط، دوسرے ایڈیشن میں ۲۵ خطوں کا اضافہ اور تعداد ۱۵۱ — تیسرے ایڈیشن میں ۱۶ خطوں کا اضافہ ہوا اور تعداد ۱۶۷ ہو گئی۔ جب نول کشور نے چوتھا ایڈیشن چھاپا تو اس میں اپنی طرف سے دو خطوں کا اضافہ کر دیا۔ اس طرح اس چوتھے ایڈیشن میں پہلی بار پنج آہنگ کے آہنگِ پنجم میں خطوں کی تعداد ۱۶۹ ہو گئی اور پھر یہی تعداد تسلیم کی گئی۔ زیرِ تبصرہ کتاب اسی آہنگِ پنجم کا عکس ہے۔

رضا صاحب کی طرف سے جو اضافہ ہوا ہے وہ یہ ہے:

۱۔ پہلے خطوں پر نمبر شمار نہ تھے، اب دے دیے گئے ہیں۔ ۲۔ مکاتیب کی فہرست دے دی گئی ہے۔ ۳۔ فہرستِ مکاتیب میں آغازِ خط کی کچھ عبارت بھی درج کر دی گئی ہے، تاکہ مکتوب اور مکتوب الیہ کی نشاندہی میں کوئی شبہ نہ رہے۔

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ عکسی متن پر صفحات وہی رکھے گئے ہیں جو اصل کتاب میں ہیں تاکہ حوالے میں کوئی اُلجھن نہ ہو۔

اس کام کو بہ احسن و خوبی انجام دینے پر رضا صاحب میری طرف سے مبارک باد کے لائق و مستحق ہیں۔
(مالک رام)

نام کتاب: سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے
مصنف : ڈاکٹر برج پریمی
قیمت : ۶۵ روپے
ملنے کا پتہ : ڈاکٹر برج پریمی، ٹیچرس کوارٹرس، حضرت بل، سری نگر ۱۹۰۰۰۶

بازش بخیر، سعادت حسن منٹو چاہتے تھے کہ کسی رسالے کا منٹو نمبر شائع ہو اور اُسے وہ خود ایڈٹ کریں۔ منٹو یہ حسرت لیے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی زندگی میں ان پر کسی رسالے کا کوئی نمبر، کوئی خصوصی شمارہ، کوئی گوشہ، کوئی تفصیلی مطالعہ شائع نہیں ہوا، لیکن ان کے انتقال کے بعد انہیں خراجِ عقیدت پیش کرنے والوں کی کمی نہیں رہی۔ وہ اپنی زندگی ہی میں ایک Legend بن گئے تھے۔ ان کے افسانوں پر مقدمے، ان کی کثرتِ شراب نوشی، اُن پر جنون کے حملے، اُن کا ایک بوتل ٹھرے یا وہسکی کے ادھے کے لیے ایک نشست میں افسانہ لکھ کر ایڈیٹر کے حوالے کر دینا —— یہ ساری باتیں ادبی بیٹھکوں یا چائے خانوں میں موضوعِ سخن ہوا کرتی تھیں۔ منٹو کے مرتے ہی دوستوں، عزیزوں، شناساؤں نے اپنی اپنی یادداشتیں جمع کر دیں۔ مضامین ہی نہیں۔ ابو سعید قریشی اور محمد اسد اللہ کی کتابیں بھی آ گئیں۔ نقوش، افکار، شاعر اور پگڈنڈی نے منٹو کے انتقال کے فوراً بعد منٹو نمبر شائع کر دیے۔ کئی سال تک یہ ہماہمی رہی۔ پھر ٹھنڈے دل سے منٹو کی فن کارانہ حیثیت کے تجزیے شروع ہوئے۔ یہ کام ممتاز شیریں "نوری یا ناری" کے ذریعے کر چکی تھیں۔ دوسروں نے کام کو آگے بڑھایا۔

عام طور پر پریم چند کے بعد اردو افسانے کے عناصر اربعہ کرشن چندر، بیدی، منٹو اور عصمت (اسی ترتیب کے ساتھ) تسلیم کیے جاتے تھے۔ منٹو کی بازیافت اس طرح ہوئی کہ انہیں اردو افسانے کا سب سے بڑا فن کار مانا گیا۔ بیدی اپنی فن کارانہ خصائص کی بنا پر کبھی دوسرے کبھی پہلے نمبر پر لائے گئے۔ کرشن کے لیے تیسرا نمبر بھی مشکوک قرار پایا۔ خیر، اس سے قطع نظر کہ منٹو، پریم چند کے بعد اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں یا نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ایک نہایت بلند پایہ افسانہ نگار ہیں۔ اور انہیں فحش نویس کہہ کر ٹالنے کی جو کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ وہ سب کی سب ناکام ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر برج پریمی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے لکھا ہوا اپنا تحقیقی مقالہ "سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے" کتابی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ یوں بھی منٹو سے برج پریمی کو خاص شغف ہے اور وہ منٹو کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں سے متعلق مضامین کی صورت میں نئی معلومات فراہم کرتے رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کم لوگ منٹو کے ہمہ جہت فنی اور شخصی پہلوؤں پر اتنی نظر رکھتے ہوں گے جتنی ڈاکٹر برج پریمی رکھتے ہیں۔

یہ تحقیقی مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب جو ۱۳۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ منٹو کی سوانح حیات اور ان کی شخصیت کے ترکیبی عناصر سے متعلق ہے۔ اس حصے میں منٹو کی گھریلو زندگی، ان کے مذہبی رویے، سیاسی مسلک، خوراک، لباس، نفاست پسندی اور دوسرے خصائل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی باب میں ان مقدموں کا بھی ذکر ہے جو منٹو کے افسانوں پر چلائے گئے "کھول دو" کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ برج پریمی نے لکھا ہے: اس افسانے کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس پر مقدمہ چلایا گیا یا نہیں"۔ دراصل یہ غلط فہمی "نقوش" کے منٹو نمبر کی پیدا کردہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "کھول دو" پر ابھی تک کوئی مقدمہ نہیں چلا۔ البتہ یہ صحیح ہے (جیسا کہ برج پریمی نے بھی لکھا ہے) کہ اس افسانے کو شائع کرنے کی پاداش میں "نقوش" کی اشاعت پر حکومت پاکستان نے چھ ماہ کے لیے پابندی عاید کر دی تھی۔ منٹو کے سارے مقدموں کی تفصیل "دستاویز" (مرتبہ: بلراج مین را) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

برج پریمی کے تحقیقی مقالے کے دوسرے باب میں اردو کے مختصر افسانے کی تاریخ منٹو سے پہلے تک، سوا سو صفحات میں بیان کی گئی ہے۔ تیسرا باب بھی جو منٹو کی افسانہ نگاری کے مختلف پہلوؤں کا بہت تفصیلی اور عمدہ تنقیدی جائزہ ہے، تقریباً سوا سو صفحات کو محیط ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس مقالے کا سب سے اہم حصہ یہی ہے۔ چوتھے باب میں منٹو کے مضامین، انشائیوں اور خاکوں پر اور پانچویں باب میں ان کے خطوط پر اظہارِ خیال ہے۔ آخری باب میں منٹو کی ان نگارشات سے بحث کی گئی ہے جو ڈرامہ، ناول، تراجم اور صحافت کی ذیل میں آتی ہیں۔ مختصر یہ کہ منٹو کی زندگی، شخصیت اور ان کی ادبی، صحافتی اور فلمی سرگرمیوں کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر برج پریمی نے محققانہ اور ناقدانہ نظر نہ ڈالی ہو برج پریمی کا سارا رویہ علمی اور معروضی ہے۔ یہ تحسین شناسی تو ہے لیکن اسے قصیدہ خوانی سے دور کا بھی علاقہ نہیں۔

چونکہ تحقیقی مقالے کے مختلف ابواب اور ان کے حصے مختلف مواقع پر لکھے جاتے ہیں۔ اس لیے ان میں کچھ باتوں کا اعادہ Repetition ہونا ایک حد تک ناگزیر ہے، مگر مقالے کو کتابی صورت میں پیش کرتے ہوئے نظر ثانی کے وقت اس عیب کو دور کیا جا سکتا تھا۔ مجھے اس کتاب میں یہی ایک کمزوری نظر آئی۔

یہ تحقیقی مقالہ مولف کی عرق ریزی اور محنت کا آئینہ دار ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ منٹو پر لکھی ہوئی دوسری تحریروں سے بے نیاز کر دے گا۔

مظہر امام

نام کتاب: کھلا
مصنف: جوگندر پال
قیمت: ۸۰ روپے
ملنے کا پتہ: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولا مارکیٹ دریا گنج، دہلی

"دھرتی کا لال" سے "کھلا" تک جوگندر پال کا فن ایک رزم گاہ کا سا منظر پیش کرتا ہے۔ اس عرصۂ جنگ میں فریق اول بھی وہی ہے اور فریق ثانی بھی وہی۔ جوگندر پال کا فن اپنے آپ سے الجھنے، اپنی ذہنی سطحوں کو مسلسل کھرچتے رہنے اور اپنے آپ تک پہنچنے کی سعیٔ پیہم سے عبارت ہے۔ پال خود اپنے توسط یا یوں کہیے فرد کے توسط سے کائنات کی سچائیوں کو پانے کی تگ و دو میں مصروف ہے۔ ہر فرد اپنے آپ میں ایک کائنات ہوتا ہے۔ چنانچہ کائنات میں جاری و ساری تمام مثبت رویں اور بننے بگڑنے یا بنتے رہنے اور بگڑتے رہنے کا عمل اپنے طور پر فرد میں بھی وقوع پذیر ہوتا رہتا ہے۔ جوگندر پال اپنے کرداروں کے آئینے میں کائنات کی تخریب و تعمیر کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس کے کردار اپنے طبعی تقاضوں کے تحت فطری انداز میں نمو پاتے رہتے ہیں اور بالآخر اس منزل تک جا پہنچتے ہیں جو ان کے لیے ناگزیر تھی، لیکن زندگی اپنے وسیع تر مفہوم میں نہ افراد و اشکال میں محدود ہوتی ہے نہ زمان و مکان میں اور نہ کوئی منزل اس کی آخری منزل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فن اپنی بلندیوں پر پہنچ کر افراد و اشکال سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے اور زمان و مکان سے بھی اب اس کا واسطہ ایک وجودی تسلسل سے پڑتا ہے اور وہ ماضی، حال اور مستقبل کے دائرے کو توڑ کر "ہونے" یا "Being" کی پہلے اور پچھلی کیفیات کا آئینہ بن جاتا ہے اور چونکہ ہونے کا احساس وقوعے کے بغیر ممکن ہی نہیں، اس لیے پال کے فن میں

ں، واقعہ یا واردات بنیادی اہمیت اختیار لیتے ہیں۔ اس لحاظ سے جوگندر پال کا فن اُن افسانوں سے، جو کردار کے توسط سے واقعہ تک پہنچتے ہیں نہ صرف مختلف ہو جاتا ہے بلکہ اسے اُن کے برعکس کہنا زیادہ مناسب ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ اُس کے کردار ظاہری نشانیوں سے زیادہ باطنی کیفیات کی وجہ سے اپنی انفرادیت کا تشخص کرواتے ہیں۔

عام واقعات یقیناً مقام زمانے اور فرد کے توسط سے اپنی شناخت قائم کرتے ہیں لیکن یہی وقوعے ایک وسیع تر تناظر بھی رکھتے ہیں جن میں وہ اپنی زمانی مکانی اور شخصی خصوصیات سے دست بردار ہو کر ایک لامتناہی تسلسل کا حصہ بن جاتے ہیں جوگندر پال کا فن اسی تسلسل کو گرفت میں لینے کی کوشش کا نام ہے اور چونکہ اس تسلسل میں زمان و مکان کی تقسیم کی طرح زندگی کے مختلف مظاہر کی تقسیم بھی بے معنی ہوتی ہے اس لیے اس کے کردار زمانی و مکانی حصار کے ساتھ نوعی دائرے بھی توڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ پال کے اکثر افسانوں میں پہاڑ، دریا، چرند پرند، انسان اور درندے سب کسی وقوعے میں شامل نظر آتے ہیں کہ اس کی نظر کے سامنے ساری اشکال پارہ درشتی بن جاتی ہیں اور صرف وہ تحرک باقی رہ جاتا ہے جس پر وقوعے کی اساس قائم ہو۔

"میں تمہیں اُن وقتوں کا قصہ سُنا رہا ہوں جب سارے کے سارے ذی جان بے جسم اور بے نام ہوا کرتے تھے۔ کوئی کیڑا تھا نہ پرندہ نہ حیوان نہ انسان۔"

قصہ تو "سہولتی ترجیحات" طلب کرتا ہے اور مرشد کے نزدیک سہولتی ترجیحات برتنا گناہِ کبیرہ ہے تو قصہ کیسے بنے؟ یہی سوال جب میں نے اپنے دوست جوگندر پال سے کیا تو جواب کی ذمہ داری فن کار جوگندر پال پر ڈال کر یوں الگ ہو گیا جیسے وہ عام طور پر اپنے کرداروں کو تخلیق کر کے اُن کے اعمال کی جواب دہی سے بے تعلق ہو جاتا ہے —

فن کار تو فن کار ہوتا ہے۔ اُس کے موڈ اور ذہنی کیفیات کا کیا ٹھکانہ۔ پھر ہمارے نقادوں نے مجھ جیسے عام آدمیوں کے دلوں پر فن کار کی عجب دہشت طاری کر رکھی ہے کہ وہ کائنات سے ماورا ایسی مخلوق ہے جو نہ کسی کے سامنے جواب دہ ہے نہ خود اپنی تحریر و تقریر کا پابند۔ سو میں نے سوچا کہ اب کون فن کارانہ ناز نخروں کو سہتا پھرے۔ کیوں نہ اسے بھی الانگ کر راست فن ہی تک پہنچا جائے۔ پھر یہ بھی سُن رکھا تھا کہ اصل فن وہی ہوتا ہے جس کی سرشت میں عجز و انکسار بھی ہو اور کھلا پن بھی اور جو ہر آنے والے پر اپنے دروازے یوں کھول دیتا ہو جیسے اب تک اسی کا منتظر تھا۔ پال کے فن سے میری روشناسی کا تجربہ ایسا ہی تھا جیسے کسی کو یکایک ایسے گھنے جنگل میں چھوڑ دیا جائے جس کی سرحدیں ہی نہ ہوں۔ سرحدیں کچھ اور نہ سہی کمزور طبیعتوں کو لامتناہیت کے خوف سے تو محفوظ کر دیتی ہیں، لیکن فن کا پہلا مطالبہ بے خوفی اور سہل الحصول کامیابیوں کو ٹھکرانے کی جرأت ہوتا ہے کہ کائناتی اسرار تک پہنچنے کا راستہ حیرت و استعجاب کے ویرانوں سے ہو کر نکلتا ہے اور حقیقت کا پہلا جلوہ اپنے غیر متوقع پن کی وجہ سے اچھے اچھوں کو خوف زدہ کر دیتا ہے۔

جوگندر پال کے ہاں چونکہ مسلسل توڑتے رہنے کی جرأت اور حقائق کو نئے سے نئے رُوپ میں دیکھ سکنے کی تاب ہے۔ اس لیے اُس کا فن وہ منظر نامہ تشکیل دینے پر قادر ہے جس میں لمحۂ موجود وقت کی بے کرانی میں شامل ہو جاتا ہے اور ایک مکانی وقوعہ لامکانیت کا روپ دھار لیتا ہے۔ اسی سبب سے "دادیاں" کی دادی ماں ایک ہی وقت میں کئی کئی زندگیاں جیتی ہے اور "گلزار" کے مرشد و مرید میں کوئی فاصلہ باقی نہیں رہتا اور "کوئی نجات" کا 'میں' زہر پینے والا بھی بن جاتا ہے اور زہر پلانے والا بھی۔

جوگندر پال کا فن جس طرح "میں" اور "تو" کے فاصلوں کو پاٹتا ہے۔ اسی طرح فرد اور کائنات کی دوئی کو بھی ایک وحدت میں ڈھالتا نظر آتا ہے کہ دراصل دوئی ایک واہمہ ہے۔ اور واہمہ نہ ہو تب بھی فرد کی نجات اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ کائنات سے ہم آہنگ نہ ہو جائے خواہ اس کے لیے اُسے اپنے آپ کو بدلنا پڑے یا کائنات کو تبدیل کرنا پڑے۔ ہر فن کار بلکہ ہر حساس انسان تجریدی طور پر یہ ہم آہنگی پیدا کرتا رہتا ہے۔ ہم آہنگی کا یہ تصور عملی زندگی میں اُسے معاشرے سے لحظہ بہ لحظہ متصادم کرتا رہتا ہے۔ اگر فن کار اس تصادم میں اپنی اندرونی شخصیت کو ریزہ ریزہ ہونے سے بچا سکے تو اس کے فن میں اکملیت کی نمود ہونے لگتی ہے۔ بصورتِ دیگر اس کا فن بھی اُس کی شخصیت کی طرح ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے۔ پال کے یہاں ایک ایسی فنی وحدت ملتی ہے جو بظاہر بے میل واقعات کو ایک نظر نہ آنے والے رشتے میں پرو کر مربوط کر دیتی ہے۔ اس کے کردار خارجی دنیا کی حد بندیوں میں سانس لینے کے مقابلے میں اپنے باطن میں اُتر کر زندہ رہنے کو قابلِ ترجیح سمجھتے ہیں کہ یہ فضا اپنی وسعتوں کی وجہ سے اُنہیں زیادہ راس آتی ہے اور ان کرداروں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات بطور واقعہ اتنی اہمیت نہیں رکھتے جتنی اہمیت ان واقعات کے اثرات کو حاصل ہوتی ہے۔ واقعہ تو کردار کے باطن میں تموج پیدا کر کے ختم ہو جاتا ہے لیکن موجیں بہت کچھ اَن کہا اور اَن دیکھا سمیٹ کر دُور دُور کے ساحلوں تک پہنچ جاتی ہیں۔

جوگندر پال کی کہانیوں کے اس مجموعہ کا نام ہی (کھُلا) اس بات کا اشاریہ ہے کہ کہانی کار خانہ بندیوں سے اوپر اٹھ کر ایک ایسی کھُلی فضا میں پہنچ چکا ہے، جہاں فرد اور کائنات، ہیئت اور موضوع "اکائی" میں ڈھل گئے ہیں اور اکائی کی تلاش ہر فن کا مقصود بھی ہے اور جواز بھی۔

بشر نواز

ستمبر ۱۹۸۹ء

نام کتاب : خبر نگاری
مصنف : شافع قدوائی
قیمت : ۳۵ روپے
ملنے کا پتہ : ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ علی گڑھ

اُردو میں تکنیکی اور نیم تکنیکی موضوعات پر کتابوں کی کمی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ اس کا اطلاق علی الخصوص صحافت پر ہوتا ہے، گو کہ اس وقت مُلک کے طول و عرض سے اردو کے تقریباً ۱۴ سو اخبارات شائع ہو رہے ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت کے استاد شافع قدوائی نے انکشاف کیا ہے کہ اردو میں صحافت کے موضوع پر پہلی کتاب اب سے تقریباً ۵۰ برس قبل شائع ہوئی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں صحافت کا شعبہ قائم کیا گیا تھا جو اپنی نوعیت کا پہلا شعبہ تھا۔ اس وقت کے صدر شعبہ چودھری رحم علی ہاشمی نے صحافت پر اُردو میں پہلی کتاب "فنِ صحافت" لکھی تھی۔ اب نصف صدی کے بعد شافع قدوائی نے رپورٹنگ کے فن پر ایک کتاب "خبر نگاری" لکھی ہے —— رپورٹنگ کے لیے مصنف نے بالکل نئی اصطلاح "خبر نگاری" وضع کی ہے۔

مصنف نے کتاب کی ضرورت کا جواز پیش کرتے ہوئے بالکل بجا طور پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ چند باعزت استثنائی مثالوں سے قطع نظر اردو کے بیشتر اخبارات واقعہ کی صحیح تصویر کشی اور قومی اور بین الاقوامی مسائل پر سنجیدہ مباحثے کے بجائے سطحی سنسنی خیز اور اشتعال انگیز مواد پر اپنی توجہ صرف کرتے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں خبر کی تعریف، اجزائے ترکیبی، اقسام اور حصول کے ذرائع سے لے کر رپورٹنگ کے فن، انٹرویو اور فیچر نگاری تک تمام موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ "خبر کیسے لکھی جائے" اور "کیسے نہ لکھی جائے" کی مثالیں قابلِ تعریف ہیں۔ مصنف نے غیر اہم نکات کو بنیادی اہمیت دینے والی بے محل رپورٹنگ کی مثالیں پیش کی ہیں اور پھر ان کی تصحیح کر کے خبر کے اہم اور غیر اہم پہلوؤں کا فرق واضح کیا ہے۔ یہ مثالیں خاصی سبق آموز ہیں۔ اسی طرح طوالت سے گریز کرنے اور اختصار پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ مصنف نے مشکل الفاظ اور ان کے ہم معنی عام فہم الفاظ کی ایک فہرست بھی شامل کی ہے۔ جس کا مقصد یہ باور کرانا ہے کہ صحافی کا اولین مقصد واقعہ کی ترسیل ہے، انشا پردازی کا مظاہرہ نہیں۔ تاہم حیرت انگیز طور پر خود مصنف نے تقریباً پوری کتاب میں مشکل الفاظ استعمال کیے ہیں۔

فنِ صحافت سے متعلق انگریزی کی مشہور کتابوں کے اقتباسات بھی زیادہ ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب کے آخر میں صحافت کی مخصوص اصطلاحات کے اردو ترجمے شامل کیے گئے ہیں۔ اگر مصنف نے تراجم کے بجائے ایک عام صحافی کی خاطر متبادل اردو اصطلاحات وضع کی ہوتیں یا اس سلسلے میں کوشش کی ہوتی تو بہتر ہوتا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اردو صحافت میں داخلے کے خواہش مند حضرات کے لیے "خبر نگاری" بہت سود مند ہے۔

پرکاش چندر

نام کتاب : لفظ لفظ آئینہ
شاعر : آر۔ ڈی۔ شرما تاثیر
قیمت : ۸ روپے ۵۰ پیسے
ملنے کا پتہ : مصنف۔ سیکٹر ڈی، چنڈی گڑھ (یو۔ ٹی)

تاثیر کے کلام میں وہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں جن سے دبستانِ جوش ملسیانی کا شعری منشور عبارت ہے۔ زبان کی صحت اور صفائی، بندش کی چستی، بیان کی سلاست اور بے ساختگی، متروکات کا لحاظ۔ یہ اوصاف تاثیر کے کلام میں نمایاں ہیں۔ وہ سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں۔ اُلجھا ہوا مضمون وہ باندھتے ہی نہیں۔

ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہراساں تھے وہ اپنے سائے تک سے
یہ اہلِ ظلم کی بے چارگی تھی

روتے بچّے کو گُدگُدا دینا
عین کارِ ثواب ہے پیارے

ایک پندار کی دیوار نہ ٹوٹی ہوگی
رشتہ صدیوں کا اسی بات پہ ٹوٹا ہوگا

پریم کمار نظر نے تاثیر کے فن سے متعلق بہت صحیح لکھا ہے۔ "تاثیر جتنے سادہ اور کھرے انسان ہیں، اتنی ہی سچی سُچی اُن کی شاعری ہے۔ ان کے اشعار تہ داری، رمزیت اور معنی آفرینی جیسے بلند بانگ دعوے نہیں کرتے تو نہ سہی، لیکن جذبے کی شدّت اور احساس کی سچائی تاثیر کی شاعری کی بنیادی صفات ہیں۔ ویسے بھی مارا ماری کے دور میں اپنے اظہار کے لیے اتنی صداقت پیدا کر لینا کوئی معمولی بات نہیں"۔ تاثیر ایک مہذب شاعر ہیں۔ ایک اعلیٰ زندگی جینے کا شعور اور سلیقہ اُن کا شعری نصب العین ہے۔ اخلاقی اور سماجی فریضے کا معروضی احساس شاعر کے شعری رویّے اور مسلکِ حیات کو ظاہر کرتا ہے۔

زیرِ تبصرہ مجموعے میں پابند تخلیقات کے علاوہ تین آزاد نظمیں بھی شامل ہیں، جو شاعر کے مخصوص مزاج سے ہٹ کر ہیں۔ شاعر آزاد نظم کی تخلیق میں لَے کی اہمیت سے بخوبی آشنا ہے۔ نظموں کی معنوی وحدت شاعر کے شعری سفر کا ایک خوش آئند پہلو ہے۔

غزلیہ باب میں جہاں کہیں شاعر نے واردات قلبی، غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے رومانی یا جمالیاتی اظہار کی سعی کی ہے، وہاں اس کے ذہنی اور حسیاتی ایتلافات موضوع اور بیان (بقیہ ص ۵۲)

مکتوبات

ڈھیر ساری مبارکباد :

سب سے پہلے آج کل کے سندھی ادب نمبر کی اشاعت پر ڈھیر ساری مبارک بادیاں قبول فرمائیے۔ آج کل نے آپ کی ادارت میں جتنا رسم سا نمبر شائع کیے ہیں وہ اردو زبان و ادب کے وقیع ذخائر میں ایک معتبر اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کی داد میرا قلم تو کیا دے سکتا ہے۔ البتہ وقت کی لوحِ محفوظ ہستی دنیا تک اسے اپنے سینے سے لگا کر رکھے گی اور تشنگانِ علم و ادب اس چشمۂ فیض سے اپنی زبانیں تر کر سکیں گے۔ یہی سب سے بڑی داد، سب سے بڑا انعام اور سب سے بڑا اعزاز آپ کے لیے اور آپ کے تمام معاونین کے لیے جن کے ہاتھوں کی غیر مرئی مہریں اس نمبر کے ہر صفحہ پر ثبت ہیں۔ میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ اس نمبر سے نہ صرف سندھی ادب کی موجودہ صورتحال اور اس کے سمت سفر کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اٹھارھویں صدی سے لے کر عصرِ حاضر تک اس کی عہد بہ عہد ترقی کی مختصر سہی لیکن تاریخی حیثیت سامنے آجاتی ہے۔ مجھ جیسے غیر سندھی داں حضرات کے لیے یہ نمبر رہبر زبان و ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ تقسیم کا المیہ، اپنی زمین سے کٹ کر بکھرنے لوٹنے کا کرب، میدانِ جہد و عمل میں پھر سے سرگرم عمل ہونے کی سعیٔ حاصل اور خاک ہوتی زندگی کی ایک دیارِ غیر میں نئے انداز سے صورت گری جنس کے نہاں خانے میں ہاتھ پیر مارتا، جذبات سے مغلوب اور اقدار سے ناآشنا انسان جو کبھی حیوان سے بدتر ہو جاتا ہے اور کبھی اپنے اسلاف کی پیشانی پر چپکا ہوا ایک بدنما داغ —— کیا کچھ نہیں ہے ان کہانیوں میں جو آپ نے آج کل کے صفحات پر لفظوں کی صورت میں بکھرا دیا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی جب سندھی غزلوں کو اردو کے قالب میں اپنی اصلی حیثیت اور Format میں بندھا ہوا دیکھا۔

[illegible] دہلی

یقین کیجیے نظم ہو یا نثر، کوئی بھی سرسری نظر ڈال کر گزر جانے کی چیز نہیں ہے۔ ظاہر ہے نہ تو سب اچھا ہوتا ہے اور نہ ہی سب کا سب برا۔ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے آج کل کا سندھی ادب نمبر خاصے کی چیز ہے۔ محمود سعیدی صاحب نے اپنے اشہبِ قلم کو ترجمے کے میدان میں جس مشاقی اور طرفہ کاری کے ساتھ دوڑایا ہے، وہ انہیں کا حصہ ہے۔ اس کے لیے انہیں مبارکباد پہنچا دیجیے۔ آپ نے پنجابی ادب اور سندھی ادب سے اپنے مؤقر جریدے کی وساطت سے جس طرح اردو والوں کو متعارف کرایا ہے اُس سے معاصر ادب کی رفتار کا اندازہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی مزید مطالعہ کرنے اور کچھ اور جاننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ ملک کے بدلے ہوئے حالات میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں اس قسم کی کوششیں مؤثر رول ادا کر سکتی ہیں۔ ملک کی پندرہ زبانوں میں ادب کا دھارا کس سمت بہہ رہا ہے، کون سی تحریکات سر اٹھا رہی ہیں اور کون سی اب وقت کے سرد خانے میں دفن ہو چکی ہیں۔ ساری زبانوں کے ادیب و شاعر کن موضوعات پر کس انداز سے سوچ رہے ہیں کیا لکھ رہے ہیں۔ اور ان کی فکر کی جہتیں کیا ہیں وغیرہ وغیرہ۔ تراجم کے ذریعے عام قاری تک پہنچ سکتی ہیں۔

مجھے اُمید ہے آپ آئندہ بھی اس قسم کے چونکا دینے والے کارنامے انجام دیتے رہیں گے۔

ایک بات اور جو مجھ جیسے قلم کار کو متوجہ کرتی ہے وہ پرچہ کی قیمت ہے۔ چار روپے کی حقیر رقم میں اتنی ضخامت کے پرچہ کا دستیاب ہونا دورِ حاضر میں ناممکن ہے۔ لیکن آپ نے ہماری حکومت کی فراخ دلانہ روش کے وسیلہ سے پرچہ کو عام آدمی کی دسترس سے باہر جانے نہیں دیا — یہ ایک مستحسن بات ہے۔

مرتضیٰ علی شاد، بھوپال

خوب :

ماہ نامہ "آجکل" اردو کا سندھی ادب نمبر ملا۔ یہ صوری و معنوی اعتبار سے اپنے آپ میں ایک چیز ہے۔

نظم کا حصہ اپنے آپ میں بہت ہی خوب اور روح و فکر کی دلچسپی کا کافی سامان لیے ہوئے ہے۔ ویسے تو ساری کہانیاں اچھی ہیں، لیکن "داشتہ" "ایک اور دن" "دہشت اور شہر کی آواز" بہت ہی پسند آئیں۔ یہ نمبر عام اردو قاری کے لیے سندھی ادب کے بارے میں ایک صحیفہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ آپ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے بھی ایسے ہی عظیم الشان نمبر نکالیں جس سے آج کل کے قارئین مستفید ہو سکیں اور وسیع القلب و محب وطن بن سکیں۔

اوم پرکاش گپتا، کرنال

اردو کا مقبول عام معتبر ماہ نامہ

آجکل

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر: راج نرائن راز

سب ایڈیٹر: خورشید اکرم

جلد: ۴۸ شمارہ: ۳

اکتوبر ۱۹۸۹ء اشون۔کارتک شک سمت ۱۹۱۱

قیمت: دو روپے فون: ۳۸۷۰۴۹

سرورق: ایم۔ایم۔ملک

اندرونِ ملک زرِ سالانہ: ۲۰ روپے
دو سال کے لیے: ۳۶ روپے
تین سال کے لیے: ۴۸ روپے

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ:
چیف ایڈیٹر: آج کل اُردو
پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

پروڈکشن آفیسر: آر۔ایس۔منچال

ترسیلِ زر کا پتہ:
بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن
پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترتیب

مہاتما گاندھی کی اخلاقی اقدار کی معنویت

انسان نے اپنی زندگی کی ابتدا جنگلوں سے کی تھی۔ اس دور میں ان کی زندگی میں ایک ہی قانون لاگو ہوتا تھا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ جس کے پاس طاقت ہوتی تھی، اس کے پاس اقتدار ہوتا تھا۔ تشدد کے واقعات عام تھے۔ یہ خون خرابہ کبھی کسی شکار کیے ہوئے جانور کی وجہ سے یا کسی عورت یا دیگر مسائل کے سبب ہوا کرتا تھا۔

اس پر تشدد اور خوف و دہشت کی فضا میں زندگی بسر کرتے ہوئے انسان نے یہ محسوس کیا کہ افہام و تفہیم سے کچھ ایسی صورت پیدا کی جائے کہ اس خون خرابہ اور تشدد کا خاتمہ ہو اور لوگ چین و سکون سے زندگی بسر کر سکیں۔

ہمارا خیال ہے کہ شاید یہی وہ مقام ہے، جہاں سے اخلاقیات کی بات شروع ہوئی ہوگی۔

تاریخ شاہد ہے کہ لوگ رفتہ رفتہ گروہوں اور قبیلوں میں رہنے لگے اور قبیلوں کی سطح پر قوانین بننے لگے۔ پھر انسان جیسے جیسے ترقی کرتا گیا، اُسے اخلاقی پہلوؤں کے تحت چند قوانین کی ضرورت پڑتی گئی اور اس طرح انسان نے زندگی میں اخلاقی اقدار کی اہمیت پر توجہ مرکوز کی۔

مختلف مہاتماؤں اور سنت فقیروں نے اپنے اپنے علاقوں اور ملکوں میں اخلاقی اقدار کی تبلیغ کی اور سختی سے اس پر عمل پیرا ہونے کی اہمیت پر زور دیا۔ ان سنت فقیروں نے انسانی زندگی میں اخلاقی اقدار کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے یہ بتایا کہ یہ بنی نوع انسان کے تحفظ اور امن و سکون کے لیے کس قدر ضروری ہے۔

اخلاقی اقدار کے سلسلے میں کچھ لوگ "محبت اور جنگ" میں ہر چیز جائز قرار دینے کی بات کرتے ہیں۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ بھارت میں ایسے موقعوں پر لوگوں نے ہنستے ہنستے جامِ شہادت پیے ہیں۔ مگر ان اقدار کی قیمت پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا ہے۔

بھارت میں برطانوی دورِ حکومت میں ایسا ہی ایک مہاتما پیدا ہوا جس کا پورا نام موہن داس کرم چند گاندھی تھا۔ اس مہاتما نے اخلاقی اقدار کے ذریعے بھارت کو غلامی سے نجات دلانے کا بیڑا اٹھایا اور یہ مردِ مجاہد تنہا ان ہتھیاروں کو لے کر میدانِ جنگ میں کود پڑا تھا۔ گاندھی جی جنگِ آزادی کے ایک ایسے سپاہی تھے، جن کے پاس ہتھیار نہیں تھے۔ ان کا سب سے بڑا ہتھیار، ان کی اخلاقی اقدار اور صاف ستھرا کردار تھا۔

مہاتما گاندھی نے عدم تشدد کا ایک نیا طریقہ اس دنیا کو دیا اور اس نظریے پر اس قدر سختی سے کاربند رہے کہ دشمنوں کے ہزار ظلم و ستم اور جبر و استبداد بھی ان کے قدموں کو ڈگمگا نہیں سکے — اور آخری سانس تک عدم تشدد کے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے انہوں نے برطانیہ جیسی سامراجی طاقت کو اس ملک سے اُکھاڑ کر پھینک دیا۔ اس زمانے میں یہ تصور کرنا بھی دشوار تھا کہ جس برطانوی حکومت کے دائرۂ اقتدار میں سورج غروب نہ ہوتا ہو ایسی طاقت ور حکومت کے خلاف گاندھی جی کے عدم تشدد کے اصول کارگر ثابت ہو سکیں گے۔ آج یہ آزادی اس عدم تشدد کی دین ہے اور پورے برطانوی سامراج کو اس مردِ آہن کے آگے سرنگوں ہونا پڑا تھا۔ عدم تشدد کے ساتھ مہاتما گاندھی نے ایک اچھے کردار اور اعلیٰ صفات کی حامل شخصیت کی اہمیت پر بھی زور دیا تھا اور بھائی چارے اور اخوت و یگانگت کی بات کی تھی۔ اُنہوں نے جیو اور جینے دو کے فلسفہ کی نہ صرف حمایت و پیروی کی بلکہ اُسے بذاتِ خود اپنی زندگی میں اپنا کر دکھایا اور دوسروں کو اسے اپنانے کے طریقے بھی بتائے۔ گاندھی جی نے زندگی کے سماجی اور سیاسی دونوں پہلوؤں کے لیے اخلاقی اقدار کی اہمیت پر زور دیا اور اُسے سماجی نظم و ضبط کے لیے ناگزیر قرار دیا۔

گاندھی جی نے صرف نصیحتیں نہیں کیں بلکہ خود ان پر عمل کر کے بھی دکھایا۔ اُنہوں نے انہیں نظریات کی تشہیر کی جن پر عمل پیرا ہو کر اُنہوں نے خود کامیابی حاصل کی اور یہی وجہ ہے کہ ان کی باتیں آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مہاتما گاندھی سچائی، عدم تشدد، خدا کی ذات سے لگاؤ، بزرگوں کا احترام اور خدمت انسانی ہمدردی اور عوامی فلاح و بہبود کے جذبے سے سرشار تھے۔ وہ اخلاقی اقدار کے پیکر تھے۔ کچھ لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ اخلاقی اقدار کی اہمیت اب پہلے کے مقابلے کچھ کچھ کم ہو گئی ہے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ آج کل کے حالات میں ان اقدار کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ مگر ا

عبدالمغنی

غالب کی فارسی شاعری

ہندستان کا فارسی ادب جسے ایرانی سبکِ ہندی کہتے ہیں، ایران کے فارسی ادب سے کم نہیں ہے۔ یہ بات عصرِ حاضر میں ہندوستان کے انگریزی ادب کے متعلق اس بیان سے بھی زیادہ صحیح ہے کہ ہندوستانی انگریزی اسی طرح معتبر اور معیاری ہے جس طرح امریکی انگریزی۔ واقعہ یہ ہے کہ جب ترک، افغان اور مغل ہندوستان میں آئے تو وہ اپنے ساتھ فارسی کو اسی طرح لے کر آئے جس طرح ان سے کچھ قبل آریہ سنسکرت لے کر آتے تھے۔ لہٰذا ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ میں فارسی کی ترقی اسی انداز سے ہوئی جس انداز سے عہدِ قدیم میں سنسکرت کی ہوئی تھی۔ اس فرق کے ساتھ کہ سنسکرت کو برہمنوں نے اونچی ذات تک محدود رکھا، اس لیے وہ سماج میں زیادہ نہیں پھیل سکی، جب کہ فارسی کے سرپرستوں اور شیدائیوں نے اسے پورے ہندوستانی سماج کے نظامِ حکومت نظامِ تعلیم اور نظامِ تہذیب میں بلاامتیاز ہر شخص، طبقے اور حلقے کے لیے عام کردیا۔ کیا مسلم، کیا غیر مسلم، کیا اُمرا کیا غربا، کیا خواص کیا عوام، سب پر فارسی کی تعلیم اور اس کے ذریعے روزگار و کاروبار کے دروازے صدیوں تک کھلے رہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ فارسی ملک کے تمام باشندوں کی اخلاقی تربیت اور شائستگی کا واحد ذریعہ بن گئی اور فارسی دانی کے بغیر مہذب ہونے کا کوئی تصور باقی نہیں رہ گیا۔ یہ حیثیت ملک میں کسی زبان کو نہ اس سے پہلے حاصل ہوئی نہ اس کے بعد۔ فارسی صدیوں تک فی الواقع ہندوستان میں رابطے کی زبان اور لنگوا فرانکا رہی۔

مغلیہ دور میں فارسی زبان و ادب کی ترقی کا مرکز ایران نہیں، ہندوستان تھا۔ یہاں تک کہ ایران کے علما و ادبا و شعرا بھی عرضِ ہنر اور اظہارِ کمال کے لیے ایران سے نکل کر ہندوستان کا ر[خ] کرنے لگے، اور اکثر یہیں کے ہو رہے۔ یہ صورتِ حال اٹھارہویں صدی تک موجود رہی اور انیسویں صدی میں بھی اس کے آثار با[قی] رہے۔ چنانچہ غالب نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ تعلیم و تہذ[یب] کی اعلیٰ سطح پر فارسی کا ماحول تھا۔ جب کہ اردو کو ریختہ کی شکل میں ادبی رتبے تک میر کے بقول، غالب سے صرف ایک نسل پہلے، میر نے پہنچایا تھا۔ خود اردو شعرا، بالعموم فارسی داں اور فارسی گو تھے دلی کے قلعۂ معلیٰ کی سرکاری زبان بھی عہدِ غالب تک فارسی ہی تھ[ی] یہی وجہ ہے کہ بادشاہ کے دربار سے مرزا غالب کو تاریخ لکھنے [کی] خدمت سپرد کی گئی وہ فارسی زبان ہی میں انجام دینی تھی اور مرزا نے "غدر" ۱۸۵۷ء میں اپنا روزنامچہ بھی فارسی ہی میں تحریر کیا۔ اس کے علا[وہ] خطوط نویسی کے آداب پر ایک رسالہ بھی ان سے فارسی ہی میں تصنی[ف] کرایا گیا۔ "مہر نیمروز" "دستنبو" اور "پنج آہنگ" میں مرزا کی فا[رسی] نثر بھی ان کے کلیاتِ فارسی کی نظم و غزل سے کم اہم نہیں۔ یہ [فارسی] ادب میں نثر کا اعلیٰ نمونہ اسی طرح ہے جس طرح فارسی شاعری مرزا کا کلام ہے۔

مرزا کا کوئی ایرانی استاد فارسی میں تھا یا نہیں اور فارسی لغت [میں] مرزا نے اپنی مہارت کا جو اظہار کیا ہے، اس کا علمی پایہ کیا ہے، ا[س] بحث سے قطعِ نظر، گرچہ اس سلسلے میں غالب کا دعویٰ صحیح معلو[م] ہوتا ہے۔ قابلِ لحاظ امر یہ ہے کہ فارسی ادب میں مرزا کی تخلیقات [نثر] و نظم دونوں میں، کسی ایرانی سے کم نہیں، بلکہ اپنے دور میں وہ اسی ط[رح] جہانِ فارسی کے بہترین سخن ور تھے جس طرح ان سے کچھ پہلے ہندست[ان] ہی کے مرزا عبدالقادر بیدل ہو گزرے تھے۔ بیدل و غالب دونوں

اپنے اپنے وقت میں فارسی کے ملک الشعرا تھے اور ان کے بعد بھی اپنے دور میں اقبال کا یہی منصب و مقام تھا. یکے بعد دیگرے، بہم فارسی ادبیات میں ہندوستان کے تین عظیم سخن وروں سے منسوب عہدِ بیدل، عہد غالب اور عہد اقبال سے تاریخ واقف ہے، خواہ اس معاملے میں ایرانیوں کا عام رویہ جو بھی ہو اور ان میں بھی کم از کم ایران کے ایک ملک الشعرا، بہار نے عصرِ حاضر میں یہ اقرار برملا کیا:

بیدلے چوں رفت اقبالے رسید

اس سلسلے میں موجودہ زمانے کے ہندوستانی علمائے فارسی کا اندازِ فکر زیادہ تر احساسِ کمتری پر مبنی ہے، جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اب ہندوستان میں فارسی کا وہ تعلیمی و تہذیبی کردار باقی نہیں رہا جو کبھی تھا اور کئی صدیوں کے بعد فارسی علم و ادب کا مرکز ایک بار پھر ہندوستان سے ایران منتقل ہو چکا ہے چنانچہ جس طرح زمانۂ قریب کی پچھلی صدیوں میں اہلِ فارس عرضِ ہنر کے لیے ہندوستان کا رُخ کرتے تھے، اب فارسی داں اہلِ ہند حصولِ کمال کے لیے ایران کا رُخ کر رہے ہیں. حالانکہ پچھلے چند برسوں میں ایران کے اندر زبان و بیان کی اصلاح و ترقی کے لیے جو کچھ کیا گیا ہے وہ بہت زیادہ قابلِ فخر نہیں، بلکہ املا و تلفظ کی بعض جدتیں تو محض بدعتیں ہیں جن کے اندر کوئی خوبی نہیں. شاید یہی وجہ ہے کہ دورِ جدید میں ایران سے کوئی ایسا سخن ور نہیں ابھرا جس نے فارسی ادب کے متقدمین یا متاخرین کی طرح جہان فارسی میں قبولِ عام حاصل کیا ہو اور اس مقبولیت کی بنا پر اسے عالمی شہرت ملی ہو. عصرِ حاضر کا ایران ہنوز بیدل، غالب اور اقبال کا جواب پیش کرنے سے قاصر ہے.

بہر حال، غالب اپنی فارسی شاعری کی اہمیت سے آگاہ تھے اور اس کے مقابلے میں اپنی اردو شاعری کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے. وہ کہتے ہیں:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

اس شعر سے غالب کی ترجیح معلوم ہوتی ہے، جس کا احساس کچھ ہی دنوں بعد اقبال کو بھی ہوا:

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است
طرز گفتار دری شیریں تر است

دورِ جدید کے دو عظیم ترین فارسی شعرا کے ان بیانات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب و اقبال کے ادوار تک ہندوستان میں فارسی کا رواج اس حد تک تھا کہ اردو کے دو عظیم ترین شعرا بھی فارسی کے لیے اپنی ترجیح کا اظہار کرنے میں کوئی مضایقہ نہیں سمجھتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ہندوستانی قارئین اس ترجیح کی تردید نہیں کرتے.

مرزا غالب کی "نظم و نثر فارسی" پر "یادگارِ غالب" کے اسی عنوان سے لکھے ہوئے ایک باب میں تبصرہ کرتے ہوئے مرزا کے شاگرد اور معتقد، خواجہ الطاف حسین حالی فرماتے ہیں:

"وہ شخص جس کا قصیدہ انوری و خاقانی کے قصیدوں سے ٹکر کھائے، جس کی غزل عرفی و طالب کی غزل سے سبقت لے جائے، جو رباعی میں عمر خیام کی آواز میں آواز ملائے اور جس کی نثر کے آگے ابوالفضل اور ظہوری کی نثریں پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوں — اس کو بہادر شاہ کی سرکار سے صرف پچاس روپیہ ماہوار ملتا تھا..." (ص۱۷۸)

آگے چل کر حالی بتاتے ہیں کہ "مرزا نے ایک غزل کے مقطع میں اپنے تئیں کم از کم شیخ علی حزیں کا مثل قرار دیا ہے" (ص۱۸۰) پھر حالی کا بیان ہے کہ مومن غالب کے اس دعوے کو بالکل صحیح مانتے تھے. جبکہ نواب مصطفیٰ خاں "شیفتہ" ہمیشہ مرزا کو ظہوری و عرفی کا ہمسایہ کہا کرتے تھے اور صائب و کلیم وغیرہ سے ان کو بمراتب برتر اور بالاتر سمجھتے تھے." (ص۱۸۰)

اردو ہی کی طرح اپنی فارسی شاعری کی ابتدا میں بھی غالب نے بیدل کا تتبع کیا اور طرزِ بیدل میں متعدد غزلیں غالب کے فارسی دیوان کی زینت ہیں. لیکن بالآخر حالی کا خیال ہے کہ "عرفی، ظہوری، نظیری اور طالب آملی وغیرہ کی غزل کا رنگ مرزا کی غزل میں پیدا ہو گیا." (ص۱۸۲) اپنی اس رائے کی تائید میں حالی خود غالب کے فارسی دیوان کے خاتمے پر تحریر کیے ہوئے ان کے بیان کا یہ ترجمہ پیش کرتے ہیں:

"اگرچہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی جویا تھی، لیکن آزادہ روی کے سبب زیادہ تر ان لوگوں کی پیروی کرتا رہا جو راہِ صواب سے نابلد تھے آخر جب ان لوگوں نے جو اس راہ میں پیش رو تھے دیکھا کہ میں باوجود اس کے ان کے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور پھر بے راہ بھٹکتا پھرتا ہوں، ان کو میرے حال پر رحم آیا اور انہوں نے مجھ پہ مربیانہ نگاہ ڈالی، شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو جتائی، طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں تھا اس کو فنا کر دیا، ظہوری نے اپنے کلام کی گیرائی

سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زادِ راہ باندھا اور نظیری نے اپنی خاص روش پر مجھ کو چلنا سکھایا۔ اب اس گروہ والا شکوہ کے فیضِ تربیت سے میرا کلکِ رقاص چال میں کبک ہے تو راگ میں موسیقار، جلوے میں طاؤس ہے تو پرواز میں عنقا۔" (ص ۱۸۳-۱۸۲)

شاعر کا یہ اعتراف ایک سوانحی حیثیت رکھتا ہے، مگر تنقیدی نقطۂ نظر سے غالب نے اپنے کلام میں جس جلوے اور نغمے کا اقرار کیا ہے ان کے پیش روؤں میں اس کا سراغ بیدل اور حافظ کے اشعار میں لگایا جا سکتا ہے۔ غزل میں نظیری کے ساتھ غالب کا جو موازنہ حالی نے کیا ہے اس سے غالب کی برتری واضح ہو جاتی ہے۔ حالی نے غالب کی مثنویوں کا ذکر بھی تحسین کے ساتھ کیا ہے اور سب سے بڑی مثنوی "ابرِ گہربار" کا خصوصی تذکرہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے کچھ نمونے بھی دیئے ہیں لیکن غالب کی فارسی شاعری میں حالی کو سب سے ممتاز صنف قصیدہ نگاری معلوم ہوتی ہے:

"مرزا کے قصائد، جن میں قطعات، توحہ ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس وغیرہ شامل ہیں، کیا بہ اعتبارِ کمیت اور کیا بلحاظِ کیفیت کے ان کے اصنافِ نظم میں سب سے زیادہ ممتاز صنف ہے۔" (ص ۲۶۵)

قصیدے کی اصطلاح حالی نے جس وسیع مفہوم میں استعمال کی ہے اور اس ہیئتِ سخن میں غالب نے جتنے متنوع موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے وہ جدید تنقیدی زاویۂ نگاہ سے موضوعاتی نظم نگاری کے مترادف ہے۔ اس طرح مثنوی کو شامل کر کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالب کی قصیدہ نگاری درحقیقت نظم نگاری ہے جس میں فطرت کے مناظر کی تصویر کشی سے متفکرانہ خیالات کے اظہار تک کی شاعرانہ تخلیقات موجود ہیں اور ان کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ برخلاف اردو کے، فارسی میں مرزا غالب کو تنگ نائے غزل سے نکل کر اپنے بیان کی وسعت کے لیے کسی اور ہیئتِ سخن کی تلاش کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنے شوق کے بہ قدر قصیدے اور مثنوی دونوں میں دادِ سخن بڑی فراوانی کے ساتھ دیتے رہے تھے۔ قدیم انداز کی اس نظم نگاری کے ضمن میں غالب کا موازنہ امیر خسرو کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔

جاپانی ہائیکو سے بدرجہا بہتر صنفِ نظم "رباعی" میں بھی مرزا غالب کی تخلیقات اس درجہ کی ہیں کہ وہ حالی کے بقول خیام کی آوازیں آواز ملاتے ہیں۔

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ غالب کی شاعری متنوع اصنافِ سخن پر مشتمل ایک جہانِ لفظ و معنی ہے، جس کے نقش ہائے رنگ رنگ غالب کی شاعرانہ عظمت کے فراواں نشانات مرتسم کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں شاعر کے زبردست فنی کارنامے کا اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی فارسی غزل کا خصوصی مطالعہ کیا جائے۔ اس لیے کہ جس دور میں غالب نے نغمہ سرائی کی ہے اور ان کا جو ذہن و مزاج معلوم ہے اس کے اعتبار سے تنگ نائے غزل کا ظرف ہی بہ قدرِ شوق نہ ہونے کے باوجود، شاعر کے وفورِ طبیعت کا موزوں ترین آلۂ اظہار رہے، خواہ اس میں نظم کی بعض ہیئتوں کی طرح بہت زیادہ وسعتِ بیان نہ ہو، گرچہ اردو کے مانند فارسی میں بھی غالب غزل کی ہیئت میں اپنے افکار کے پیچ و خم بخوبی نمایاں کر سکتے ہیں۔ اس معاملے پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیا جا سکتا ہے، وہ یہ کہ فارسی میں قصائد کے دفتر کتنے ہی ضخیم ہوں، یہ مثنوی اور غزل کی اصناف ہیں جنھوں نے عالمی ادب میں فارسی کا امتیاز قائم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا روم کی مثنوی (فردوسی کی مثنوی کے ساتھ) اور حافظ کی غزل کو فارسی ادب کے گل ہائے سرسبد تصور کیا جاتا ہے۔ مثنوی میں غالب کا سرمایہ سخن زیادہ نہیں، لہٰذا غزل میں ان کے کمالات پر توجہ مرکوز کرنا مفید ہوگا۔ اس مقصد کے لیے اگر غالب کا موازنہ حافظ کے ساتھ کیا جائے تو بصیرت افروز تنقیدی نکات سامنے آ سکتے ہیں۔

م کی ردیف اور جمع متکلم کے صیغے میں ایک مشہور غزل حافظ کی بھی ہے اور غالب کی بھی۔ دونوں ہی غزلوں میں ذاتی فخر و ناز کے ساتھ کائنات میں انقلاب برپا کرنے کی آرزو ایک پُرکیف، نشاط انگیز اور ولولہ خیز فضا پیدا کرتی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ غالب کی نفس درازی اور مستی حافظ سے بھی بڑھی ہوئی ہے اور حافظ کے کلام میں ضبط و احتیاط نسبتہً زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ کے اشعار میں اختصار و ایجاز کی، جن کی تعداد صرف نو ہے، اور غالب کے اشعار میں اطناب و طول کی، جن کی تعداد پندرہ ہے۔ لہٰذا حافظ کی غزل میں انتخاب کرنے کی ضرورت نہیں اور وہ پوری کی پوری حسبِ ذیل ہے:

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشکافیم و طرحِ نو در اندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

چو دوست است رودِ خوش بزن مطرب سرودِ خوش
کہ دست افشاں غزل خوانیم وپاکوباں سر اندازیم

صبا خاکِ وجودِ ما بآں عالی جناب انداز
بود کآں شاہِ خوباں را نظر بر منظر اندازیم

یکے از عشق می لافد دگر طامات می بافد
بیا کایں داوریہا را بہ پیشِ داور اندازیم

بہشتِ عدن اگر خواہی بیا با ما بہ مے خانہ
کہ از پائے خمت یکسر بحوضِ کوثر اندازیم

شرابِ ارغوانی را گلاب اندر قدح ریزیم
نسیمِ عطر گرداں را شکر در مجمر اندازیم

بیا جاناں منوّر کن ز رویت مجلسِ ما را
کہ در پیشت غزل خوانیم و در پایت سر اندازیم

سخندانی و خوشخوانی نمی ورزند در شیراز
بیا حافظ کہ ما خود را بملکِ دیگر اندازیم

غالبؔ کی غزل کے منتخب اشعار درج ذیل ہیں،

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم

ز چشم و دل بتماشا تمتع اندوزیم
ز جان و تن بمدارا زیاں بگردانیم

بگوشۂ منشینیم و در فراز کنیم
بہ کوچہ بر سرِ رہ پاسباں بگردانیم

اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم
دگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم

اگر کلیم شود ہمزباں سخن نکنیم
دگر خلیل شود میہماں بگردانیم

گل افگنیم و گلابی برہ گذر پاشیم
مے آوریم و قدح درمیاں بگردانیم

ز [illegible] فرو بندیم
[illegible] ز جہاں بگردانیم

بجنگ باج ستانان شاخسارے را
تہی سبد ز درِ گلستاں بگردانیم

بصلح بال فشانانِ صبح گاہی را
ز شاخسار سوئے آشیاں بگردانیم

ز حیدریم من و تو ز ما عجب نبود
گر آفتاب سوئے خاوراں بگردانیم

بمن وصالِ تو باور نمی کند غالبؔ
بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

دونوں شعرا کائنات کے موجودہ نظام بالخصوص اپنے ماحول سے غیر مطمئن، شکوہ سنج اور اس میں تبدیلی کے خواہاں ہیں، لیکن چونکہ وہ جہاں بیں سے زیادہ دروں بیں ہیں، لہٰذا اپنی آرزوئے انقلاب کا اظہار ایک ذاتی جشنِ مسرّت کی شکل میں کرتے ہیں اور اپنے عالمِ خیال میں اپنی طاقت کے احساس سے سرشار ہو کر ایک نئی دنیا بسا لیتے ہیں یا بسا لینی چاہتے ہیں۔ چنانچہ دونوں ہی جو استعارات اپنے تخیل کے ابلاغ کے لیے استعمال کرتے ہیں وہ مے و معشوق کی صحبت میں رقص و نغمہ کی مستی و سرشاری سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ایک قسم کا تغزل ہے جس کے رنگ میں حافظ و غالبؔ کا تعقل ڈوبا ہوا ہے۔ اس تغزل کا آہنگ رجائیت پر مبنی ہے اور اس میں نشاط کا عنصر نمایاں ہے۔ یہ عنصر بعض اوقات اپنی خواب آوری کے باوجود حافظ و غالبؔ دونوں کے عہد اور معاشرے میں انتشار اور اس سے ابھرنے والی مایوسی کا جواب ہے، نا امیدی کے ہجوم میں امید کا پیام ہے، حوصلہ شکن حالات میں ہمت افزائی کی کوشش کی ہے، جبر و ستم اور غم و الم کی یلغار کے مقابلے میں سپر اندازی کے بجائے مزاحمت و مقاومت کا اعلان ہے۔ دونوں غزلوں کی ردیف کے صیغۂ جمع متکلم میں انا کے شاہانہ انداز کا مطلب شاید یہی ہے۔

حافظ اور غالبؔ کے آہنگِ شاعری میں اس مماثلت کا سراغ ان کی معتدبہ غزلیات میں بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ یہ مشابہت اس تنقیدی نکتے پر دلالت کرتی ہے کہ فارسی شاعری کی متعدد اصناف میں اپنے فنی کمالات کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ اس شاعری کی خاص الخاص صنف، غزل، میں غالبؔ نے جو تخلیقی کارنامہ انجام دیا ہے وہ اس پایے کا ہے کہ فارسی ادب میں غالب کا مقام متعین کرنے کے لیے ان کا موازنہ صرف متاخرین سے کرنا کافی نہیں، جیسا حالیؔ نے کیا ہے اور اکثر ناقدین کرتے ہیں۔ بلکہ فارسی ادب کے مشاہیر عالم کی اولین صف میں غالبؔ کی جگہ ان عظیم سخن وروں کے ساتھ ہے جو تاریخِ ادب میں فارسی شاعری کے امتیاز و افتخار کے ضامن ہیں۔ فردوسیؔ، رومیؔ، سعدیؔ اور حافظؔ کے کلام نے فارسی شاعری کی جو سطح مرتفع دنیائے ادب میں قائم کی ہے اسی پر ایک مینارِ فن مرزا اسداللہ خاں غالبؔ نے بھی تعمیر کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان

من موہن تلخ



تین بڑوں کا دور

میرزا یگانہ نے ایک بار کہا تھا: "کتنے خوش نصیب تھے وہ لوگ جنہوں نے میر کا دور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا"۔ میں اس میں اُن لوگوں کو بھی شامل کر لیتا ہوں، جنہوں نے میر، مومن اور غالب کا دور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ انیسویں صدی واقعی دیوقامت شعرا کی صدی تھی، لیکن یہ کہ بیسویں صدی بونوں کی رہی ہو، ایسا بھی نہیں ہے۔ عظیم شعرا بلاشبہ ہم سے ایک صدی پہلے ہو گزرے، لیکن دیوقامت شعرا بیسویں صدی میں بھی ہوئے ہیں۔ اقبال، فراق، جوش اور یگانہ انہیں بیسویں صدی کی ایسی بڑی آوازیں کہا جائے گا، جن پر اردو ادب بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

میں اُن خوش نصیبوں میں سے تو نہیں ہوں جنہیں اقبال کا دور اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا شرف حاصل ہوا ہو، لیکن جوش، فراق اور میرزا یگانہ کو ان دو آنکھوں نے بہت قریب سے دیکھا اور جانا ہے۔ جنوری ۱۹۵۳ء کی بات ہے کہ میں نے ایک غزل اُردو "آج کل" میں برغرضِ اشاعت بھیجی تھی۔ ڈرتے ڈرتے نہیں بھیجی تھی۔ پوری خود اعتمادی کے ساتھ بھیجی تھی۔ میں میر، کبیر، شیکسپیر اور کیٹس کا پجاری تھا۔ بطور شاعر کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب میں تب کچھ زیادہ نام نہ پایا تھا، لیکن اپنے مطالعے کے بل بوتے پر خود کو اردو غزل میں ایک نیا لہجہ سمجھتا تھا۔

لہجے کی بات ان گنت مشکلات پیدا کر دیتی ہے۔ میرزا یگانہ، آتش اور شاد عظیم آبادی کے لہجے کی دین کہے جا سکتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی میر انیس سے متاثر کہے جا سکتے ہیں اور فراق کو تو خیر میر اور مومن کا لاڈلا کہا ہی گیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ میر کی زخمی معصومیت کسی کو نصیب ہوئی ہی نہیں۔ لیکن سنجیدہ شاعری کو سمجھنے اور خود اپنی اپنی توفیق کے مطابق سنجیدہ فکرِ سخن کرنے والے ہر شخص نے میر اور انیس کے لہجے کے اثر کو کسی نہ کسی حد تک قبول کیا ہی ہے اور اس میں جوش، فراق اور یگانہ بھی الگ نہیں ہیں۔ بس یہ اُن کی خوبی رہی کہ اُن بڑی آوازوں کو یوں اپنے لہجے میں رچا بسا لیا کہ خود اپنا ایک نیا لہجہ پیدا کیا۔ فکر کی بلندی اور شعر کی معنویت کے اعتبار سے میں جوش اور فراق کو اقبال اور یگانہ کے ہم پلہ کبھی قرار نہیں دے سکا۔ لیکن ان کا اپنا الگ اسلوب تھا، بات کہنے کا اپنا الگ انداز تھا، اس سے کبھی انکار نہ کیا ہے نہ کر سکتا ہوں۔

تو خیر بات چل رہی تھی کہ میں نے مکمل خود اعتمادی کے ساتھ اُردو "آج کل" میں ایک غزل بھیجی جب کہ نہ میں اس دور کے علاماؤں میں سے کسی کو جانتا تھا نہ جوش ملیح آبادی کے لیے کوئی جانا پہچانا نام تھا۔ جوش تو خیر مجھ سے انجان تھے ہی۔ اُن دنوں نریش کمار شاد اور بلراج کومل جس دھڑلے سے ترقی پسند رسالوں میں نمایاں طور پر چھپ رہے تھے، اُن کے مدیران کے لیے بھی میں ایک اجنبی نام تھا۔ ایک تو نظریاتی طور پر الگ سوچ کا مالک ہونے کے ناطے اور دوسرے اس دور کے مروجہ ادبی طور سے پرے رہنے کی وجہ سے۔ ہاں ذاتی طور پر شاد بھی مجھے جانتے تھے اور کومل بھی۔

غزل بھیجی اور بھول گیا۔ کچھ عرصہ تک جواب کا انتظار بھی کیا پھر دل میں یہ طے کر کے کہ جوش بھی شاید مجھ آواز کے پارکھی نہیں ہیں۔ دماغ سے یہ بات ہی نکال دی کہ میری آواز کو کبھی پہچانا بھی جائے گا۔

بی-۸۷ گل مہر پارک، نئی دہلی ۱۱۰۰۴۹

شاید جوش کے لہجے سے بہت مرعوب تھا اور خود پر کافی بھروسا تھا، اس لیے ہو سکتا ہے کہ میں نے جوش کے بارے میں کوئی غلط نتیجہ نکالنے میں جلد بازی سے کام لیا ہو۔ جلد باز تو خیر میں مزاج ہی سے ہوں۔ ایک رات جو میں انڈیا کافی ہاؤس سے گھر واپس لوٹا تو ایک عدد پوسٹ کارڈ جیسے میرا انتظار کر رہا تھا۔ ایک طرف جلی حروف میں اردو آج کل دیکھ کر سمجھا کہ شاید غزل کی اشاعت سے معذرت ظاہر کی گئی ہے۔ ہاں دیویندر اسّر میرے ساتھ ہی تھے کیوں کہ میرے گھر سے دو بلاک ہی پرے رہتے تھے — پوسٹ کارڈ انہی نے پڑھا۔ لکھا تھا کہ غزل ملی، ضرور شائع ہو گی۔ کبھی ہو سکے تو ملاقات کے لیے ضرور تشریف لائیں — جوش

کبھی ہو سکے کیا؟ میں کون سی نوکری کرتا تھا تب؟ اگلے ہی دن چپل پاؤں میں پہنی اور اگست کی ہواؤں میں لہراتے کرتے پاجامے کے ساتھ جا پہنچا جوش صاحب کے کمرے تک... باہر ہی چپراسی نے روک لیا۔ اب تلخ اس کے پلے نہ پڑے کہ اندر جا کر کیا کہے کہ کون آیا ہے۔ میں نے جو دوسری بار اپنا نام زور سے لیا تو اگلے ہی پل کمرے کی چق اُٹھی اور میرے سامنے کھڑا تھا۔ اُردو شاعری کا لاڈلا — مجاز۔

"کہاں ہیں من موہن تلخ صاحب؟ مجاز کا دھیما لہجہ سیدھے دل میں اُتر گیا۔

"میں ہوں —" بس ایک نظر مجاز نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا اور پھر ایک عجب اپنے پن کے ساتھ چہرے پر دل کو جیت لینے والی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر میرے کندھے پر رکھا: "آؤ تلخ پیارے — آؤ۔"

کمرے کے اندر جاتے ہی زندگی میں پہلی بار ٹھٹکا۔ پہلے کسے آداب کروں۔ اردو ادب کی بڑی آوازوں کو ایک ساتھ اپنے سامنے موجود پا رہا تھا۔ ایک طرف فراق تھے۔ اُن کے برابر یگانہ تھے۔ سامنے بڑی سی کرسی پر جوش بیٹھے تھے۔ شاید ایک ساتھ ہی سب کو آداب کیا تھا۔ اور جو کرسی مجاز کے برابر خالی نظر آئی، اس میں دھنس گیا۔ یہ سوچے بنا کہ جوش ابھی تک میری 'آداب عرض ہے' کا جواب دینے کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ میں پھر اُٹھنے کو ہوا تو 'نہیں نہیں، آپ تشریف رکھیے' کہتے ہوئے جوش صاحب بھی بیٹھ گئے۔

"پان نوش فرمائیں گے؟" کہتے ہوئے جوش صاحب نے جو اپنے پان کے ڈبے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"میں تو آپ کے احترام کی خاطر باہر سے پان کھا کر نہیں آیا۔"

تبھی کمرے کی چق اُٹھی اور ایک بوڑھا ڈاکیہ کمرے میں داخل ہوا۔ اُسے دیکھتے ہی جوش صاحب پھر اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ڈاکیے سے ڈاک وصول کی اور اس کے چلے جانے کے بعد ہی کرسی پر بیٹھے۔

اس پہلی ایک ملاقات کے بعد جوش صاحب سے ایک ہزار ایک بار ملاقات رہی اور تہذیب کے اس پتلے کو میں نے ہمیشہ کسی بھی آنے والے کا کرسی سے اُٹھ کر ہی استقبال کرتے دیکھا تھا۔ یہاں تک کہ پاکستان چلے جانے کے بعد جب وہ پہلی بار واپس وطن آئے اور میڈنز ہوٹل سے کچھ آگے کسی کی کوٹھی میں ٹھہرے تھے تو میں اور ساحر ہوشیار پوری جیسے ہی اُن سے ملنے کے لیے پہنچے تھے تو جوش صاحب اُٹھ کر گلے سے ملے تھے۔ اور اُن کی آنکھوں میں آنسو بھی چھلک آئے تھے۔

کسی بھی نووارد کا کرسی سے اُٹھ کر سواگت کرنے کا اُن کا یہ انداز سب کو اس حد تک متاثر کر چکا تھا کہ ایک مرتبہ جب زور سے ہوا چلنے سے اُن کے کمرے کی چق پیچھے کو ہٹی اور جوش نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا تو فراق نے جملہ کسا تھا: "اُٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ ہوا اندر آئی ہے۔ تمہیں بے ادب کہے گی۔"

"باہر کی ہوا نے مجھے کب بے ادب نہیں کہا۔ بات اندر کی ہواؤں کی ہے فراق۔" جوش نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔

ایک اور بھی ادا تھی جوش کی۔ عین وقت پر جب انہیں کوئی ضروری کاغذ تلاش کرنا ہوتا تھا تو شیروانی کی جیبوں کو ٹٹولتے ہوئے برابر کہتے جاتے تھے — "نہیں ملے گا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا —" اور جب کرتے کی جیبوں تک پہنچتے تو جملہ یوں بدل جاتا: "بس اسی کی کسی آخری جیب سے ملے گا —" اور وہ کاغذ واقعی کرتے ہی کی جیب سے ملتا تھا۔

بات پھر اُس پہلی ملاقات پر آ جائے گی۔ میرے بیٹھنے کے بعد جوش نے سوالیہ نظروں سے مجاز کو دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا: "آپ کی تعریف.....؟" مجاز کیوں کہ کمرے کے دروازے کے برابر بیٹھے تھے، اس لیے باہر سے میری اونچی آواز مجاز ہی نے سُنی تھی۔

"ارے؟" مجاز نے حیران ہو کر کہا: "من موہن تلخ ہیں یہ — جن کی غزل کا ذکر آپ صبح کر رہے تھے۔"

"اچھا.... اچھا! بہت خوشی ہوئی آپ سے ....."

لیکن تب تک فراق اپنی گردن کافی آگے کو کر کے کہہ رہے تھے: "غزل سے تو لگتا ہے کوئی چالیس پچاس کے کھچڑی نما بالوں والے ....."

"ہو گئے تم شروع؟" میرزا یگانہ نے اپنی چھڑی فراق کی گردن کے آگے اُٹھا دی اور بولے:

"خوب کہا ہے تم نے بیٹے: ؎

دوستی کا کوئی فریب ہی دے
اس قدر زندگی میں تنہا ہوں

میں اگر فصل ہوتا تو زمین پر بچھ جاتا۔ میرزا یگانہ کے سامنے میں اُن کے لہجے اور اُن کی فکر کا دلدادہ تھا۔ اسی پہلی ملاقات سے میرے اور میرزا کے تعلقات اتنے گہرے ہوئے کہ میں نے عروض سیکھنے کے لیے باقاعدہ انہیں اپنا استاد تسلیم کیا تھا۔ جب ۱۹۵۸ء میں میرا پہلا مجموعۂ کلام "چراغِ فکر" شائع ہونے والا تھا تو میرزا نے مجھے ایک خط میں (یہ تمام خطوط ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ اردو ماہنامہ "ساقی" کراچی میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور اب مشفق خواجہ کے پاس ہیں) لکھا تھا:

"پہلے مجموعہ کلام کی اشاعت میں اتنی جلد بازی نہ کرو۔ لہجے کو اور نکھر لینے دو۔"

میں نہیں کہہ سکتا کہ میرزا یہ چاہتے تھے کہ میں اُن کے رنگ میں رنگ جاؤں یا کچھ اور، لیکن میں میرؔ، فراقؔ اور یگانہ کے لہجے کے ملے جلے روپ میں اپنا ہی ایک لہجہ پیدا کر رہا تھا۔ اسی سمت میں آگے جانا چاہتا تھا۔ اسی لیے میں نے علمِ عروض پر مہارت حاصل کرنے میں میرزا سے بھرپور استفادہ کیا۔ اُن سے اَن گنت ملاقاتیں رہیں اور خط و کتابت بھی رہی۔ زندگی میں ایک قلق ہی رہا کہ لکھنؤ میں اُن سے آخری ملاقات رنجش پر ختم ہوئی۔ اس کے بعد میرزا کا انتقال ہوا تھا۔ میرزا اپنے مزاج کے بادشاہ تھے اور میرا صرف تخلص ہی تلخ نہ تھا، میں اسمِ بامسمّٰی بھی تھا۔ اور شاید اب بھی ہوں۔ اُنہیں دمے کا شدید دورہ پڑا تھا۔ بیماری کے سبب چڑچڑے بھی بے حد ہو چکے تھے۔ مجھے لگا اُنہیں میرا لکھنؤ چلے آنا ناگوار لگا ہے۔ میں نے اُسے اپنی عزت کا سوال بنا لیا۔ اور ایسا منہ پھیر کر چلا آیا کہ پروفیسر احتشام حسین صاحب کے سمجھانے پر بھی دوبارہ اُن سے ملنے نہ گیا۔ بس، تبھی ایک موسلا دھار والی بارش کی رات کو اُن کے انتقال کی خبر ملی۔ یوں لگا جیسے کسی نے کہہ دیا ہو کہ مینارِ قطب گر گیا ہے۔

میرزا، ڈاکٹر اقبال کا نام بھی سننے کو تیار نہ تھے۔ میں نے اقبال پر ایک نظم کہی تھی جو "شاہراہ" میں چھپی تھی۔ کچھ نہ پوچھیے جو میرزا نے مجھے لتاڑا تھا۔

"ہیں؟" بڑا شاعر انہیں کہتے ہو؟ مدح سرائی اُس کی کی ہے؟ کیا ملا ہے تمہیں اس کی شاعری میں؟ کیا سمجھے ہو؟ کتنا سمجھے ہو تم اس کی شاعری کو؟"

جب میرزا اچھی طرح برس لیے تو میں نے صرف اتنا ہی کہا تھا "اچھا ایک بات بتلائیے آپ میری عزت کس روپ میں کریں گے؟ اپنے تئیں کچھ سوچنے والے انسان کے روپ میں۔ بھلے ہی آپ کو میری سوچ غلط لگے یا ایک ایسے انسان کے طور پر جو اپنا دماغ آپ کے پاس گروی رکھ دے۔"

اتنا سنتے ہی میرزا نے جن نگاہوں سے مجھے دیکھا، مجھے لگا کہ میرے منہ پر طمانچہ پڑا سو پڑا، لیکن پھر اُن کے ہونٹوں کے کونوں پر ہلکی سی مسکان اُبھری اور دھیرے سے بولے: "تم ہی بتاؤ جب ایک آزاد دماغ غلط راستے پر چلتا نظر آئے تو دُکھ ہوگا یا نہیں؟"

میرزا نے اپنی بات پھر بھی اہم ہی قرار دی لیکن مجھے آزاد دماغ سے سوچنے کی تقویت بھی دی۔ یہی میرزا کی عظمت تھی اور یہ کہنا قطعی مبالغہ آمیزی نہ ہوگی کہ آج سرحد کے اس پار اور اس پار جتنے بھی تیکھے لہجے ہیں وہ میرزا یگانہ کی آواز سے بے حد متاثر ہیں۔

جیسے بقول فراقؔ: "میرؔ کی آواز ستر پردوں میں پہچانی جا سکتی ہے۔" اسی طرح فراقؔ ہمارے دور کے ایسے صاحبِ اسلوب شاعر تھے جنہوں نے محبوب کو شکوہ و شکایت کی گولہ باری سے آزاد کیا تھا۔ مجھے فراقؔ کی کمزوریوں سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ عالمی ادب گواہ ہے کہ جینیئس ذاتی زندگی میں ہمیشہ شتر مرغ کی طرح ٹیڑھی چال چلتے رہے ہیں۔

میں فراقؔ کو اس دور کا ایک بڑا شاعر مانتا ہوں۔ وہ بے تحاشا کہتے تھے، اس سے انکار نہیں، لیکن اگر میرؔ اور فراقؔ کی آواز کو صحیح طور پر سمجھنے والے کسی شخص نے فراقؔ کے کلام کا انتخاب کیا تو فراقؔ کی شاعرانہ عظمت سے منکر بھی قائل ہو جائیں گے۔

فراقؔ سے پہلی ملاقات جوشؔ کے آفس ہی میں ہوئی تھی پھر مجازؔ کے ہمراہ اُن سے کئی بار ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک شام باتوں باتوں میں ساحر ہوشیارپوری نے کہا بھی تھا کہ ایک بار ہم کچھ دوستوں نے فراقؔ سے پوچھا تھا کہ تلخؔ کے کلام میں آپ کا رنگ بہت جھلکتا ہے۔ کیا اس نے کبھی آپ سے استفادہ کیا تھا؟ تو فراقؔ نے دونوں ہاتھ ہوا میں گھماتے ہوئے کہا تھا۔ کمبخت جب ملتا ہے تو اس کا دماغ اس سے دو ہاتھ آگے رہتا ہے۔ استفادہ وہ کیا خاک کرے گا؟

خیر ـــــ اس پہلی ملاقات کے بعد میں نے ہفت روزہ "اپنا دیش" دلی سے شروع کیا تھا۔ یہاں مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی جھجک نہیں ہے کہ عروض میں نے میرزا یگانہ سے بھی سیکھا تھا، لیکن اس سے پہلے جیرامداس فلک سے بھی بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ فلک نے میری شاعرانہ زندگی کا ہر دور دیکھا ہے اور بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں اُنہیں عزت سے آج بھی مولانا کہہ کر بلاتا ہوں۔ "اپنا دیش" شروع کیا تو وہ بھی شعبۂ ادارتی کے ایک اہم رکن تھے۔ غزلوں، نظموں، کہانیوں کے لیے سبھی شعرا و ادبا کو خط لکھے گئے۔ سو فراقؔ کو بھی لکھا تھا۔

فراق نے رباعیاں بوا یسی ڈاک بھیجیں اور دو سطری خط بھی [illegible] آپ کی غزلیں بھی پڑھتا [illegible] رباعیاں اپنے [illegible] کے نیچے [illegible] فراق [illegible] گیا تھا

انہی دنوں ایک اتفاق ہوا کہ [illegible] کے [illegible] کی [illegible] بھی اپنے ساتھ [illegible] فراق کا کلام آسانی سے [illegible] میں نے [illegible] رباعیاں [illegible] فراق نے بھی [illegible] کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا [illegible] مصرع میں [illegible] ظاہر ہے [illegible] اور فراق [illegible] پہلے صفحے [illegible] کو [illegible] کر لیا تھا لیکن [illegible] فراق کی رباعیاں کاتب کے حوالے کرتے [illegible] تیار نہ تھا کیونکہ ایک مصرع وزن سے خارج تھا۔

[illegible] بہت پریشان کہ اب کیا کریں۔ میں نے [illegible] کچھ نہیں [illegible] فراق کو خط لکھتا ہوں [illegible] رباعی یونہی چھپے گی تو فراق سے زیادہ بدنامی ہماری ہوگی کہ ہم عروض سے بے بہرہ ہیں۔

[illegible] فراق [illegible] مصرع وزن میں لکھ کر [illegible] اس جواب [illegible] نے فراق کو خط لکھا کہ فلاں مصرع [illegible] اب نہ مجھے مصرع یاد ہے نہ اپنے خط کے جواب میں فراق کا خط میرے پاس ہے کہ وہ [illegible] کے [illegible] رکھ دیا گیا تھا) وزن سے خارج ہے

[illegible] ڈاک فراق کا ایک لمبا چوڑا خط ملا جس میں [illegible] البدل ایک مصرع بھی درج تھا اور یہ جملہ بھی — "[illegible]" [illegible] لکھا تھا — بہرحال میں تین روز کے [illegible] رباعیوں جوش کے دفتر آیا ہے — [illegible] کہ جوش تو عروض جانتے نہیں۔ ان سے بھی رائے لے لیں گے جوش کے آفس جانے سے پہلے میں پھر فلک صاحب سے ملا۔ ان کا آفس جوش کے آفس کے برابر ہی تھا۔ انہیں ساری بات بتائی کہ [illegible] تک [illegible] نہ ہو جائے۔ فلک نے مجھے صحیح قرار دیتے [illegible] بتایا کہ اگر جوش کو بھی چکر دینا چاہو تو اس مصرع میں [illegible] کا حوالہ دو اور اس رکن سے ہم ان [illegible] چلتے ہیں [illegible] میں [illegible] جوش کے دفتر میں پہنچا [illegible] فراق کے برابر [illegible] مصرع جوش [illegible] سمجھی [illegible]

[illegible]

۱۹۸۹

نے ایک مصرع پڑھا جس میں [illegible] اشتیاق کی ترکیب باندھی گئی تھی۔ علامہ کیفی [illegible] گیا [illegible] یعنی [illegible] کا [illegible] ترکیب ہے؟

میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا: "علامہ آپ [illegible] اشتیاق کی ترکیب پر اعتراض ہے یا اس ترکیب کے استعمال پر؟"

اور اس سے پہلے کہ جوش، فراق اور علامہ کیفی مجھ [illegible] دیکھتے میں آگے کہہ چکا تھا — مولانا رومی اپنی مثنوی میں لکھتے ہیں

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق
تا بگویم شرح دردِ اشتیاق

جوش صاحب نے مجھے [illegible] نظروں سے دیکھا اور گردن جھکا لی۔ فراق نے کرسی کی پشت سے [illegible] ٹیک لگا لی۔ لیکن علامہ کیفی اپنی کرسی سے اُٹھے۔ جوش کے کمرے میں المونیم کی ایک سیڑھی سی ہوتی تھی [illegible] اُٹھایا۔ جوش صاحب [illegible] رہ گئے — [illegible] کیا کر رہے ہو [illegible] بلائے دیتا ہوں۔ لیکن علامہ کیفی نے ایک لپک کے ساتھ وہ سیڑھی لگا لی اور [illegible] الماری میں رکھی مثنوی مولانا روم اٹھا لی۔ [illegible] جب وہ شعر پڑھا [illegible] مثنوی بند کی۔ اُٹھے اور میرا ہاتھ چوما [illegible] مجھے اپنی حرکت یا اپنے چھوٹے پن پر ندامت بھی ہوئی لیکن علامہ کیفی مجھے شام کو اپنے گھر پر چائے کی دعوت دے کر اپنے شاگرد کے ساتھ چلے گئے

میں سمجھ رہا تھا کہ علامہ کیفی صاحب غصے میں گئے ہوں گے تو جوش صاحب کو کتنا برا لگا ہوگا۔ وہ [illegible] فراق نے [illegible]

"[illegible] اب کیا مجھ سے کچھ کہنا ہے؟"

"نہیں —" میرے منہ سے صرف اتنا ہی نکل سکا اور فراق نے زور سے انگڑائی لیتے ہوئے کہا تھا:

Even Homer nods

میں دھیرے سے ہنس دیا اور فراق نے پوچھا تھا:

"جوش کہتے ہیں میں نے جو دوسرا مصرع خط میں لکھ بھیجا تھا وہ صحیح ہے۔ پہلا واقعی غلط تھا۔ رباعیاں چھاپ رہے ہو نا؟"

"نہیں بھائی اس لیے مت چھاپو کہ فراق نے بھیجی ہیں [illegible] اگر اچھی ہیں تو چھاپنا۔"

میں [illegible] آنکھوں سے فراق کو [illegible] کیا تھا [illegible] کی [illegible] میں فراق نے ایک جگہ لکھا ہے — "بڑا آدمی [illegible] ہم [illegible]" فراق کے ان الفاظ نے [illegible]

"اگر اچھی ہیں تو چھاپ دینا۔" مجھے کچھ ایسا احساس دلایا کہ میں ان بڑوں کی محفل میں چھوٹا نہیں ہوں۔ جب کہ جوش، فراق اور یگانہ کے سامنے میں تب بھی بہت چھوٹا تھا، آج بھی ہوں۔ آج تو خیر دور ہی چھوٹوں کا ہے۔

فراق، جوش اور یگانہ کی آپسی بے تکلفی، جملہ بازی میں بذلہ سنجی کے کچھ شاہ کار کاش کہ معرض تحریر میں آ سکتے۔ میں ان تینوں کے بیچ بذلہ سنجی کے ان گنت معرکوں کا گواہ ہوں جنہیں رقم [illegible] نہیں کیا جا سکتا۔ بقول فراق "جس ادب کا دامن فحاشی یا پھکڑپن کے لیے تنگ ہے، وہاں بڑا ادب جنم لے ہی نہیں سکتا۔"

اور کیا یہ ان تینوں کا بڑپن نہیں تھا کہ مجاز، ساحر اور فیض کے بعد کی نسل کے ایک نوجوان شاعر کو اپنی محفلوں میں بیٹھنے دیتے تھے، نہ صرف بحث میں حصہ لینے دیتے تھے بلکہ میرے کسے ہوئے جملے کا بھی لطف لیتے تھے۔

جوش اور فراق کی محفل نا و نوش میں بیٹھنے کا کبھی موقع یوں نہیں ملا کہ [illegible] بار ہے سنا تھا کہ گزریں یا مخمور جالندھری کے ساتھ۔ میرزا مجھے بیٹا کہہ کر بلاتے تھے جو اُن کے حضور ایک گھونٹ پی کر بھی جانا میرے لیے حرام تھا۔ ویسے بھی فراق جب اپنے پھکڑپن پر اترنے لگتے تھے تو مجاز نہیں کہہ کر مجھے اپنے ساتھ لے جاتے تھے — "چلو تلخ پیارے، ان کی دکان کھلنے کا ٹائم ہو گیا ہے۔" لیکن ایک دوپہر جب میں اور مجاز بیئر پی کر جوش صاحب کے یہاں پہنچے تھے تو جوش نے مجھے [illegible] کے ساتھ مجھ سے کہا تھا: "اے تلخ! آپ نے بھی دلی کو شروع ہو گئے!"

میں [illegible] گیا تھا۔ اسی شام ایک مشاعرہ تھا۔ مجاز نے بہت اصرار کیا، لیکن میں نے یہ کہہ کر گلاس ہاتھ میں اٹھانے سے انکار کر دیا کہ غزل پڑھنے کے پہلے ابھی نہیں۔ شام ہم دونوں مشاعرے میں پہنچے تو دیر ہو چکی تھی۔ فراق اندر جا چکے تھے [illegible] مجاز آ گئے بڑھ گئے تھے۔ فراق نے مجھ سے دھیرے سے کہا: "آپ کو ہم سنبھلا ہوا شخص سمجھتے ہیں [illegible] کر جو حرکت ہے کچھ جان کر تکلیف ہوئی۔" [illegible] سورج ڈھلنے کے بعد پینے نہیں [illegible] ہو سکے تو مجاز کو بھی سنبھالو۔ بھٹکا ہوا ہے، میں تو بہت مانتے ہیں آپ کو مجاز۔

میں — جی فراق صاحب، کہنے کے علاوہ اور کچھ نہ کہہ سکا تھا۔ فراق میں ایک [illegible] بھی خوبی دیکھی۔ ایک مرتبہ ساحر ہوشیارپوری، فراق اور میں تانگے میں جا رہے تھے۔ میں نے کچھ کہا جس پر فراق نے مجھے گھور کر دیکھا [illegible] فراق اس وقت پر وفیسر تلوک چند محروم کے مہمان تھے۔ اوپر کی منزل میں ساحر ہوشیارپوری [illegible] ہم وہیں جا رہے تھے۔ جب ہم سب نیچے ڈرائنگ روم میں پہنچے تو فراق باہر آنگن کی طرف بڑھتے ہوئے بولے: "تلخ، ایک بات کہنی ہے آپ سے۔" میں اُٹھ کر ان کے برابر پہنچا تو دھیرے سے بولے: "تانگے میں آپ نے جو لفظ بولا تھا اس کا صحیح تلفظ یوں ہے:" [illegible] فراق چاہتے تو مجھے تانگے میں ہی ٹوک دیتے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ تیری [illegible] گئی۔ بالکل یہی بات ایک بار جوش نے بھی کی تھی۔ اردو آج کل میں میری ایک نظم چھپی تھی۔ اس میں میں نے لفظ صِفر کو "نہیں" کے وزن پر باندھا تھا۔ نظم چھپی تو نیچے ایک نوٹ درج تھا کہ صِفر "تلخ" کے وزن پر باندھا جانا چاہیے۔

یہ نوٹ شاید عرش صاحب نے دیا تھا کیوں کہ نظم کی اشاعت کے بعد جب میں جوش صاحب کے آفس میں گیا تو اس وقت وہ اکیلے ہی تھے۔ دعا سلام کے بعد کہنے لگے: "مجھے آپ سے معافی مانگنی ہے۔ لفظ صفر کے بارے میں نیچے نوٹ نہیں دیا جانا چاہیے تھا۔ میری نظر سے وہ کاپی گزر جاتی تو میں آپ کو بلا کر الگ سے بتا دیتا، نیچے تصحیح نہ چھاپتا۔"

میں نے واقعی اردو ادب کی ان تین بڑی آوازوں کو اپنی آنکھ سے دیکھا، سنا اور ان سے ملاقاتوں کی روشنی میں اپنے آپ کو جیتا، جو آج جو سبھی بزعم خود یگانہ بنے بیٹھے ہیں، جس لیے ہم جیسے چھوٹے اپنی پہچان ہی کھو بیٹھے ہیں۔

[illegible]

بقیہ: غالب کی فارسی شاعری

[illegible]

میں امیر خسرو کے بعد مغلیہ عہد کے آخری دور تک عروج سے زوال تک حکومت کے ساتھ تک عبدالقادر بیدل، اسد اللہ خاں غالب، شبلی نعمانی اور محمد اقبال جیسے عظیم شعرا فارسی میں پیدا ہوئے جو اپنے عہد میں بے مثال تھے۔ ان میں بیدل کے بعد اقبال تک فارسی ادب میں فن شاعری کا جو اجتہاد ہوا اور تجدید ہوئی اس میں بیچ کی کڑی غالب ہیں۔ لہٰذا فارسی شاعری کے ارتقا میں ان کا کلام ایک سنگ میل ہے۔

صفدر امام قادری

باغ و بہار اور عجائب القصص: تنقید و تحقیق کے نئے پہلو

باغ و بہار کو عالم وجود میں آئے اگرچہ ایک سو نوّے سال ہو گئے اور اس کے مؤلف میر امّن کو ہزار ہزار شہرتیں بھی ملیں، لیکن دو صدیوں پر پھیلی اس کتاب کو مختلف تنازعات اور وِوادوں سے نکل پانے کا موقع آج تک نہیں مل سکا۔ ہر دور میں کسی نہ کسی زاویے سے باغ و بہار کے قد کو چھوٹا کرنے، اس کی حیثیت کو کم کرنے کی کاوش ہوتی رہی ہے۔ حالانکہ اس کتاب کو جو مقبولیت ملنی تھی وہ ملی اور پورے اردو ادب پر جو اس کے اثرات ہونے تھے، وہ ہوئے۔ یہ صحیح ہے کہ باغ و بہار میر امّن اور فورٹ ولیم کالج کے سلسلے کی تنقید و تحقیق کے ساتھ جو یہ مسائل در پیش رہے، وہ پورے طور سے جان بوجھ کر پیدا کیے گئے نہیں لگتے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ بیشتر مسائل ہماری ذہنی کم مائگی، جانب داری اور سلطنت پرستی یا بعض اوقات سلطنت پرستی کے خلاف سخت ردِّ عمل کی اُپج رہے ہیں اور ہماری ان نفسیاتی بیماریوں کے سبب باغ و بہار اور میر امّن کو کسی نہ کسی طور پر فسانہ بننا پڑا ہے۔

پہلے باغ و بہار کے ماخذ کے سلسلے میں کافی چہ مہ گوئیاں اور قیاس آرائیاں ہوئیں اور اس معاملے میں ہماری تنقید و تحقیق کا جو امتحان میر امّن نے لیا وہ حیرت انگیز ہے۔ اس سلسلے میں جو بحث و مباحثے ہوئے اس کی داستان طویل ہے۔ مختصراً یہ کہ مولوی عبدالحق اور بیشتر معاملات میں حافظ محمود شیرانی نے تحقیق و جستجو سے اس قضیے کو حل کیا اور اس سلسلے کی تمام بحثوں کو حتمی طور پر ختم کر دیا، لیکن اس کے بعد نورالحسن ہاشمی نے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔

"لیکن ایک بات اور بھی ہے۔ میر امّن نے صرف تحسین کی نو طرزِ مرصع ہی کو پیشِ نظر نہیں رکھا بلکہ فارسی نسخہ چہار درویش مصنفہ میر احمد خلف شاہ محمد کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔ کیوں کہ باغ و بہار میں قصّہ کے اجزا کی جو ترتیب ہے، وہ اسی نسخے کے پیشِ نظر ہے۔ البتہ کہانی کہنے کا ڈھنگ اور عبارت نو طرزِ مرصع ہی کی سامنے رکھی ہے۔" [1]

گیان چند جین نے بھی اپنی رائے ذرا فرق کے ساتھ یوں دی کہ میر امّن کے سامنے وہ فارسی نسخہ بھی تھا جس پر میر احمد کا نسخہ مبنی تھا۔ [2] حافظ محمود شیرانی کو بھی اس سلسلے میں غلط فہمی ہوئی اور انہوں نے امیر خسرو والی روایت کو میر احمد سے ماخوذ قرار دے دیا اور اس طرح یہ بھی تسلیم کیا کہ باغ و بہار سے قبل میر احمد کا نسخہ موجود تھا۔ [3] لیکن معاملہ ان تمام حضرات کی قیاس آرائیوں کے خلاف ثابت ہوا۔ عظیم الشان صدیقی نے اس سلسلے میں تحقیق کر کے یہ ثابت کر دیا کہ باغ و بہار کے بعد ہی میر احمد نے قصہ چہار درویش تالیف کی ہے۔ [4] میر احمد کے نسخے کی پہلی اشاعت مطبوعہ ۱۸۷۸ء کے دیباچے میں یہ واضح طور پر لکھا ہوا ہے کہ انہوں نے فارسی کے بہت سارے نسخوں کے علاوہ "باغ و بہار (اردو ترجمہ از میر امّن)" سے بھی استفادہ کیا ہے۔

ادھر چند برسوں میں ایک نئی بات سامنے آئی ہے اور بعض ناقدین و محققینِ ادب متحد اور متحرک ہو کر الگ الگ جہات اور طریقوں سے باغ و بہار کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ یوں تو ڈاکٹر سید عبداللہ نے وجہی کے

گلزار سعادت، بھنور پوکھر، پٹنہ ۴ (بہار)

عبدالحق تک" میں ایک مضمون لکھ کر اور پھر بعد میں محترمہ راحت افزا بخاری کے ذریعے ایڈٹ کرا کے عجائب القصص کو منظرِ عام پر لا کر رکھ دیا تھا۔ لیکن اِدھر تین چار برسوں سے موجودہ دہلوی دبستان کے چند ناقدوں نے ایک طرح سے عجائب القصص کا علم اُٹھا لیا ہے۔ اُن کے حالیہ کاموں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عالم ثانی (آفتاب) اور ان کی ادبی کارگزاری کے سلسلے میں تحقیق و تدوین اور ان کے پوشیدہ گوشوں کو ظاہر کرنا اُن کا مقصدِ اوّلین نہیں بلکہ اردو نثر میں میر امن کا جو مقام ہے اس سے انہیں اُتار کر وہاں شاہ عالم ثانی کو بٹھانا ان کا مقصد ہے۔

تحقیق و تنقید کی اس نئی روش اور نئے مقابلاتی انداز پر ادب کے سنجیدہ قارئین کو ذرا ٹھہر کر سوچنے کی ضرورت ہے۔ عجائب القصص کے بیان میں سب سے پہلے تاریخی اعتبار سے اس کی اوّلیت کی بات اُٹھائی گئی ہے۔ اس کا جو واحد نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے اور جسے راحت افزا بخاری نے ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے، اس کے متن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عالم ثانی نے اسے ۱۲۰۷ھ (۹۳-۱۷۹۲ء) میں لکھوانا شروع کیا۔ جمیل جالبی، سید عبداللہ، امتیاز علی عرشی اور ارتضیٰ کریم نے اس داستان کے ختم ہونے کا سال ۱۷۹۷ء بتایا ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ عجائب القصص ۱۷۹۷ء یا اس سے قبل ہی مکمل ہو چکی تھی۔ اس کے جواز میں ان کے پاس جو دلیل ہے اس کے مطابق نادراتِ شاہی (شاہ عالم ثانی کے فارسی، اردو اور پنجابی کلام کا مجموعہ) ۱۷۹۷ء میں مکمل ہو چکی تھی۔ اس سے ان حضرات نے یہ نتیجہ نکالا کہ گویا اس سے قبل شروع ہوئی تصنیف کی تکمیل کی تاریخ اگر مکمل احتیاط سے بھی طے کی جائے تو وہ ۱۷۹۷ء کا سال ہوگا۔

اس سالِ تکمیل کی تحقیقی صداقت مشتبہ معلوم ہوتی ہے کیوں کہ کسی بھی ذریعے سے عجائب القصص کی تکمیل کا ذکر اور اس کی تاریخ کا علم حاصل نہیں ہو پایا ہے۔ اور یہ قیاس کہ اس کے آغاز (۱۲۰۷ھ) کے بعد اگر نادراتِ شاہی کی شروعات اور ۱۷۹۷ء میں تکمیل ہوتی ہے تو یقیناً اسی درمیانی وقفہ میں عجائب القصص تکمیل کے مراحل سے گزر چکی ہوتی ہے، کوئی منطقی صداقت نہیں رکھتا ہے۔ کیوں کہ تجربے میں اس کے خلاف ہزاروں شہادتیں موجود ہیں۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ کسی ناول کو مصنف نے شروع کیا، بعض حصے اس کے مکمل بھی ہو گئے، لیکن اسی درمیان اس کا ذہن دوسرے کام کی طرف مائل ہو گیا اور موجودہ ناول کے ادھورے کام کو ملتوی کر کے اس نے دوسرا نیا کام شروع کر دیا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ دوسرے کام کو بھی بیچ ہی میں چھوڑ کر کوئی تیسرا کام مصنف نے شروع کر دیا اور وہ بعد میں شروع ہو کر بھی سب سے پہلے مکمل ہو گیا۔

اس لیے جو چیز پہلے شروع ہوئی، اس کے پہلے ختم ہونے کی کوئی گارنٹی نہیں۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ سب سے پہلا کام آخیر آخر میں جا کر مکمل ہو۔ افسانہ نگار، شاعر، تنقید نگار اور کسی بھی تخلیقی فن کار کے ساتھ یہ بات ہو سکتی ہے اور ہوتی رہتی ہے۔

تخلیقی ادب یا کسی اور کام میں آنے والی ممکنہ رکاوٹ کی یہ بات داستان گوئی جیسے ڈھیلے ڈھالے کی صنف میں اور وہ بھی ایک بے حد منتشر عہد میں زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ اس لیے تحقیقی اعتبار سے عجائب القصص کی تکمیل کی تاریخ شاہ عالم ثانی کی موت کی تاریخ کو قرار دیا جانا زیادہ صحیح ہے۔ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء سے قبل انہوں نے ضرور مکمل کر لیا ہوگا۔ یہ بات اس لیے بھی زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کہ عجائب القصص کی جن دو جلدوں کی موجودگی کا علم ہمیں ہے، ان میں قصے کا سفر ابھی جاری ہے۔ دوسری جلد کے اختتام میں کہانی اچانک بیچ میں ہی رُک جاتی ہے۔

رہی بات ذکاء اللہ کے بیان کی کہ شاہ عالم نے چار جلد میں ایک قصہ لکھا ہے، جس کی فصاحت و سلاست میر امن کے چہار درویش سے کم نہیں اس کو زیادہ اہمیت نہیں دیے جانے کی کئی وجہیں ہیں۔ ایک تو ذکاء اللہ کی ادبی حیثیت جو بھی ہو، ان کی تحقیقی حیثیت ایسی ہرگز نہیں کہ ان کے علاوہ کسی دوسری شہادت کے بغیر ان کی بات قابلِ قبول قرار دی جائے۔ محققین کے نزدیک ذکاء اللہ اور محمد حسین کی تحقیقی حیثیتیں مساوی ہی ہیں پھر ذکاء اللہ اور شاہ عالم ثانی کو ایک عہد کے ہوتے تو ہو سکتا تھا کہ ان کی رائے قابلِ قبول ہو، لیکن ذکاء اللہ ثانی بعد کے ہیں۔ اور اپنے عہد میں ذکاء اللہ اس اہم بات کو جان رہے تھے تو اُمید کی جانی چاہیے کہ اور دوسرے کئی محققین، مورخین اور تذکرہ نویس اصحاب ایسے ضرور ہوں گے جن کے علم میں یہ بات ہوتی۔ شاہ عالم ثانی کے عہد میں تاریخ نویسی ایک اہم فن کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ اس لیے اس عہد کے کسی ہندوستانی یا برطانوی مورخ کی نگاہ سے یہ بات کیسے اوجھل رہ پاتی، اس لیے زیادہ ممکن ہے کہ ذکاء اللہ نے چار جلدوں کی بنیاد کسی سنی سنائی روایت کو بنیاد بنا کر کی ہو ورنہ کہیں نہ کہیں تو چار جلدوں کا ذکر ہوتا۔ اس لیے حقیقت میں ان ہی دو جلدوں کو مکمل تصور کرنا چاہیے جو پنجاب یونیورسٹی میں ملیں۔

اسی کے ساتھ آخری جلد کے اختتام میں جو قصے کے عدم تکمیل کا معاملہ ہے، اسے شاہ عالم ثانی کی زندگی سے جوڑ کر دیکھنا چاہیے اور سید عبداللہ کی طرح مزید دو جلدوں کے انتظار میں صبح قیامت کی آمد تک اُمید کے بھروسے بیٹھے رہنے کے بجائے اس بات پر یقین کر لینا

معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سرور جہاں آبادی کے لکھوانے تک بھی ان کی
تکمیل نہیں ہوئی تھی اور ان کی موت کے سبب یہ قصہ ادھورا رہ گیا اسی طرح
... آرائش محفل ... باغ و بہار کے مکمل ہونے کے کوئی بیس
برس بعد عجائب القصص کی ... ضبط تحریر میں آیا تھا۔ اس لیے
باغ و بہار سے قبل عجائب القصص کے لکھے جانے کی بات صحیح نہیں معلوم
ہوتی۔ ... عجائب القصص کے مصنف شاہ عالم ثانی کی تصنیفی
حیثیت ... شاہ عالم ثانی کو ۱۲۰۲ھ ...
مکمل ... ان کی تمام تصنیفات بشمول مثنوی منظوم اقدس
اسی نابینا دور کی ہیں۔ منظوم اقدس بھی نابینا ہونے سے ایک سال قبل
کی تخلیق ہے ... کتاب ہے ... اس پر وثوق سے کچھ کہنا بہت
... کہ جن محققین نے اس کا تذکرہ کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ اس
کا نسخہ ... سوسائٹی بنگال میں ہے۔ لیکن یہ نسخہ وہاں نہیں ہے
اور یہ نسخہ وہاں کبھی تھا کہ نہیں اس سلسلے میں کوئی معلومات نہیں ہیں۔
منظوم اقدس کے وجود کے متعلق کسی دوسری مستند شہادت کے نہ ہونے
کے سبب اسے نایاب بھی کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا کیونکہ بہت
ممکن ہے اس کا وجود فرضی ہو۔ ہم نے سطور بالا میں یہ ذکر کیا ہے کہ شاہ
عالم ثانی کے نام سے منسوب تمام تصنیفات ان کے ایام نابینائی کی ہیں۔
لیکن اس سلسلے میں یہ بات بھی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ تخلیقی اعتبار سے
جو شخص اس قدر زرخیز ذہن کا مالک ہو کہ ... برس میں اس کی ایک
نئی تصنیف سامنے آ جاتی ہو۔ اس کی عمر کے ابتدائی ساٹھ سال تصنیفی
اعتبار سے بالکل بانجھ کیسے ہو سکتے ہیں ... کاتب یا محرر کی مدد
... ہوگی۔ ان کی حیثیت پہلے دہلی سے پالم تک ہی ہو لیکن
تھے تو وہ بادشاہ۔ اس لیے ... کریم نے یہ مان لیا کہ بادشاہ
نے ایک کیا کئی منشی بحال کیے ہوں گے۔ اور ان میں سے ایک ممکن میر امن
دلی واپس ... ہوں گے۔ جو عجائب القصص بادشاہ سے سن سن کر لکھتے رہے
ہوں گے۔ اور وہاں سے کلکتہ جاتے ہوئے اس کا ایک نسخہ ساتھ لیتے
گئے ہوں گے۔ ... کریم نے اپنے اسی مفروضے کو آگے بڑھا کر یہ بھی کہا ہے کہ
میر امن نے اسی انداز میں قصہ چہار درویش کا ترجمہ کیا ہوگا اور اس طرح
عجائب القصص کی عبارت کی نقل باغ و بہار ہے۔ تحقیق کے اس معیار
اور ... کی اس سادہ لوحی پر کسی بحث کی ضرورت اس لیے محسوس نہیں ہوتی کہ
یہ سراسر فرضی بات ہے۔ اور اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔
... کریم نے میر امن کے عظیم آباد جانے اور بادشاہ کی رکاب
... بات کو مرکز میں رکھ کر اس قسم کی قیاس آرائیاں
کی ہیں ... میر امن روزگار کی تلاش میں دلی چھوڑ کر ۱۷۶۰ء
...

... اپنے اہل و عیال کو لے کر عظیم آباد آ گئے تھے کیونکہ عظیم آباد اس وقت
ایک بڑا ادبی مرکز تھا اور وہاں ... ایسے رئیس
کی ایک بڑی جماعت تھی جو دہلی کے شاعروں کی امداد اور خیر خواہی میں
فخر محسوس کرتی تھی۔ اس لیے یہ بات کہ میر امن شاہ عالم ثانی کے آنے تک
... ہوں گے اور شاہ عالم ثانی نے عظیم آباد آتے ہی میر امن کو نوکری
دے دی ہوگی، صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اس سے الگ عظیم آباد میں شاہ
عالم ثانی کوئی بادشاہ بن کر نہیں آئے تھے۔ بلکہ وہ بھی غریب الوطنی کے مارے
تھے۔ اس لیے میر امن کا اپنے اہل و عیال کے ساتھ شاہ عالم کے ہمراہ ...
ہونے کی بات قابل قبول نہیں لگتی ہے۔ زیادہ ممکن یہی معلوم ہوتا ہے کہ
میر امن کو عظیم آباد آتے ہی کسی رئیس کے یہاں پڑھنے پڑھانے کا کوئی معمولی سا
کام مل گیا ہو اور وہ اپنے بیوی بچوں کی پرورش اور پرداخت میں لگ گئے
ہوں گے۔

اس کے علاوہ شاہ عالم ثانی ۱۷۶۱ء سے ۱۷۷۲ء تک ہی عظیم آباد
میں رہے جب کہ میر امن اس کے بعد بھی کوئی پچیس برس اور دیار عظیم آباد
میں اپنے بال بچوں کی پرورش و پرداخت کرتے رہے۔ (اس بات کی
تصدیق ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی کتاب "فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات" سے بھی
ہوتی ہے۔) اگر میر امن شاہ عالم کے منشی تھے تو ان کے اچانک عظیم آباد سے
دہلی لوٹنے کے بعد پھر میر امن کا کیا ہوا؟ اس سوال کا جواب شواہد کے ساتھ
ملنا آسان نہیں ہے۔ ... کریم نے اس مقام پر ایک قیاسی گھوڑا پھر
دوڑا دیا۔ انہوں نے امید ظاہر کی ہے کہ بادشاہ کے ساتھ میر امن بھی
دلی واپس آ گئے ہوں گے۔ یا بعد میں بادشاہ نے انہیں بلا لیا ہوگا کیونکہ
بادشاہ کو ایک ایسے مصاحب کی ضرورت تھی جو شعر و ادب کا دلدادہ
ہو اور تخلیقی کاموں میں ان کی معاونت کر سکے اور دلی ہی سے میر امن
۱۷۹۸ء میں کلکتہ چلے گئے ہوں گے۔ اس قیاس کے مکمل فرضی ہونے کی کئی
وجہیں ہیں۔ پہلی بات کہ میر امن نے اس سلسلے میں کہیں کچھ نہیں لکھا کہ
عظیم آباد کے قیام کے بعد وہ کلکتہ کے علاوہ کسی دوسری جگہ بھی گئے تھے یا ایسی
طویل مدت میں لکھنؤ یا دلی شاہ عالم ثانی کے ساتھ گئے۔ اس لیے ...
۱۷۶۰ء سے ۱۷۷۲ء تک اور پھر ۱۷۷۲ء سے ۱۸۰۰ء تک میر امن عظیم آباد
میں ہی رہے۔ اسے ہی صحیح مانا جانا چاہیے۔ عبیدہ بیگم نے بھی دوسرے ...
شواہد کی عدم موجودگی میں ... یہی فیصلہ دیا ہے۔ ۲۶

اس سلسلے کی دوسری بات بھی قابل غور ہے۔ عام طور پر
تاریخوں اور تذکروں میں میر امن کا ذکر نہیں ملتا یا ایک دو جملے کا سرسری
تعارف ہی مل پاتا ہے۔ اس کے پیچھے ... وجہ یہی ہے کہ میر امن اس
وقت کوئی معروف ادیب یا شاعر نہیں تھے۔ ان کا ادبی قد بہت معمولی تھا۔

یہاں تک کہ فورٹ ولیم کالج کے ملازمین کی بحیثیت ماتحت منشی عمل میں آئی تھی اور ان کی تحریر [illegible] پیش [illegible] کرنی پڑتی تھی جب کہ ان کے مقابلے میں میر شیر علی افسوس اور میر بہادر علی حسینی [illegible] [illegible] کے [illegible] بادشاہ [illegible] شاہ عالم ثانی [illegible] خاص طور سے [illegible] کی بات [illegible] نہیں معلوم [illegible] ایک [illegible] بادشاہ [illegible] اس کے علاوہ [illegible] تھا اس لیے [illegible] شاہ عالم [illegible] شاہ عالم ثانی کے ایک [illegible] کی تصدیق نہیں ہو پاتی کہ بعد

اب ہم خاص طور سے عجائب القصص کی تصنیفی حیثیت کو بحث میں لاتے ہیں۔ شاہ عالم ثانی [illegible] بادشاہ [illegible] اس لیے احاطۂ علم و ہنر کی ایک [illegible] ضرور [illegible] ہو گی [illegible] سے جو [illegible] علم و ہنر کی [illegible] کے مالک ہوں گے [illegible] بادشاہ [illegible] کے کلام پر [illegible] بغیر [illegible] شاعر [illegible] کے شعر [illegible] سے کلام نظم و نثر [illegible] بادشاہ [illegible] یہ بھی بات قرینِ قیاس ہے کہ عجائب القصص [illegible] ان کی [illegible] تالیفات میں [illegible] علم و ادب [illegible] کا کچھ [illegible] عجائب القصص کی [illegible] عبارتوں کی جانب [illegible] خاطر [illegible] ارشاد حضور والا، ”مزاجِ اقدس ارفع و اعلیٰ“ جیسے الفاظ و تراکیب مصنف (شاہ عالم ثانی) کے لیے لکھی گئی ہیں۔ جمیل جالبی اور [illegible] جو توضیح دی ہیں [illegible] نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ نے بھی اسی قسم کے خیال [illegible] بادشاہ [illegible] جاتے ہوں گے اور تحریر [illegible] لکھے جاتے ہوں گے [illegible] بادشاہ [illegible] سے سنتے ہوں گے تو [illegible] جہاں جہاں بادشاہ کا نام آتا ہوگا، وہاں وہاں آدابِ شاہی کے تقاضوں کے پیشِ نظر ایسے القاب اپنی جانب سے شامل کر دیے ہوں گے۔ اس بات میں سچائی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ القاب و آداب [illegible] تک ہی محدود رہیں گے کوئی سناتے وقت مسودے میں یہ اضافے بھی کرتا جائے گا، ایسا نہیں لگتا۔ اس [illegible] بادشاہ [illegible] کی [illegible] قصے میں [illegible] کہ بادشاہ نے ایک [illegible] اسی لیے دیباچے کے [illegible] القاب [illegible] عجائب القصص کی [illegible] یہ [illegible] قابلِ قبول نہیں ہے کہ ایک شخص [illegible] کی اصلاح [illegible] (مصنوعی) کے ماخوذ ہونے کی بات [illegible] بالکل [illegible] یہ کہنا [illegible] کیسے ممکن ہے کہ اسلوب و بیان کی سطح پر اگر کسی [illegible] اس نے [illegible] قبول کیا ہو یا [illegible] کی ہو، تو اس کی وضاحت وہ کیوں نہیں کرے گا۔ [illegible] اس سلسلے میں [illegible] حسین نے بھی اس بات پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ [illegible] نثر باغ و بہار میں کس طرح آگئی۔ انہوں نے [illegible] عجائب القصص کے وجود کی بات لکھی ہے لیکن اس مقالے کے آغاز میں ہم نے عجائب القصص کے باغ و بہار سے قبل کی تصنیف [illegible] پر عاید کردہ اس طرح کے الزامات خود ہی باطل ہو جاتے ہیں۔

جمیل جالبی نے لکھا ہے [illegible] عجائب القصص کی نثر کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں نثر شاعری سے الگ اپنا وجود قائم کر لیتی ہے یہ بات درست نہیں ہے۔ شاید اردو نثر کی تاریخ سے کم آگاہی کے سبب ہی ایسی بات سامنے آئی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اردو نثر کو ایک سلیس اسلوب عطا کرنے کی کوشش [illegible] میں ہی شروع ہو چکی تھی اس کے علاوہ بعض قدیم اردو شاعروں نے بھی زبان کے آسان کرنے اور ترسیل کی سہولت کی بات سوچنا شروع کر دیا تھا۔ قطب مشتری سے لے کر دیوانِ میر تک اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ وجہی نے کہا:

جو بے ربط بولے تو بیتاں بچیس
بھلا ہے جو اک بیت بولے سلیس

میر نے بھی یوں کہا:

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

اور شاہ حاتم نے ’دیوان زادہ‘ کے دیباچے میں لکھا [illegible]

[illegible]
اکتوبر ۱۹۸۹

معذرۃ کہ عام فہم و خاص پسند بود، اختیار نمودہ' اس طرح آسان اور سلیس زبان کی ایک تحریک ہمارے یہاں بہت قبل سے چل رہی تھی۔ اس کے علاوہ ایسا نہیں ہے کہ اس دور کی فارسی نثر صرف عبارت آرائی کے لیے وقف تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ابوالفضل کا رعب اور نثر مرصع لکھنے میں فضیلت محسوس کرنے کی ذہنیت اور روایت موجود تھی، لیکن اس کے پہلو بہ پہلو سعدی کے اسلوب کی اثر پذیری بھی بڑھ رہی تھی۔ اورنگ زیب خود رقعۂ معلیٰ میں اس آسان نثر فارسی کی رسم کے ثبوت موجود ہیں۔ اورنگ زیب کے فارسی خطوط اور لعل جہاں کی عام فارسی کا بہترین نمونہ ہیں اور ان سب سے الگ صوفیائے کرام کی زبان و بیان کی سادگی کے اثرات بھی اس وقت تک ایک بڑے طبقے تک پھیل چکے تھے ــــــ اس لیے یہ بات تحقیقی اور تجزیاتی صداقتوں سے عاری معلوم ہوتی ہے کہ اردو نثر پہلی مرتبہ عجائب القصص ہی میں شاعری سے اپنا الگ وجود قائم کرتی ہے بلکہ عجائب القصص میں کئی بار نثر نے شاعری کے لباس پہنے۔ اور اتارے ہیں جب کہ باغ و بہار اس طرح کے تذبذب کا شکار نہیں ہے۔

عجائب القصص اور باغ و بہار کے موضوعات پر بحث کرتے ہوئے ان کی معاشرتی حیثیت کے تعین کے سلسلے میں ارتضیٰ کریم نے اپنے مقالے عجائب القصص اور باغ و بہار میں لکھا ہے:

"پروفیسر گیان چند صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ باغ و بہار میں معاشرت کے نقشے بڑے مکمل اور مفصل ہیں (اس لیے کہ) اس کا مترجم دلی کی شاہی تہذیب کا ایک رکن ہے۔ یہی بات انہوں نے عجائب القصص کے حوالے سے بھی کہی ہے۔ یہاں اتنا اضافہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ میر امن تو صرف اس شاہی تہذیب کے ایک رکن تھے۔ شاہ عالم ثانی تو خود اس تہذیب کے مرکزہ Nucleus تھے۔ اس کا منبع اور مخرج تھے۔" لہ

یہاں خاص طور سے میر اور غالب کی مثال سامنے رکھنی چاہیے۔ اتفاق کی بات ہے کہ میر اور غالب کوئی مغل بادشاہ نہیں تھے اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان کے رابطے مغلوں سے تھے لیکن یہ Nucleus نہیں ہو کر ایک معمولی رکن تھے اب ایک طرف میر اور غالب کی شاعری کو پیش نظر رکھا جائے اور دوسری جانب شاہ عالم ثانی یا کسی دوسرے مغل بادشاہ کی تصنیفی کارکردگی ہو، فیصلہ کرنا بہت آسان ہے۔ یہ شاہ عالم ثانی کے بس کی بات نہیں تھی کہ میر کی طرح یہ شعر کہتے۔

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انہیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

جب کہ شاہ عالم ثانی نے یہ سب کچھ جھیلا تھا۔ میر تو ایک طرح سے بہت دور کے مشاہد تھے۔ اس لیے اس مثال سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ محض بادشاہ ہونا یا حادثات کے بھنور میں ہونا اس کی تخلیقی کاوشوں کے اعلیٰ اور لافانی ہونے کی وجہ نہیں ہو سکتے۔ واردات میں بہت معمولی شرکت کے باوجود اگر محسوسات کی سطح پر زیادہ سے زیادہ تیر رو تخلیق کار ہے تو وہ میر کی طرح عظیم شاعری کر سکتا ہے اور اس کے برعکس حالات کے شکنجے میں ہر وقت بے حال رہنے کے باوجود کوئی شاہ عالم ثانی آفتاب جیسی معمولی حیثیت کا ادیب اور شاعر بھی ہو سکتا ہے، اس لیے میر امن اور شاہ عالم کی تخلیقات کی بحث میں شاہ عالم کو اس وجہ سے فوقیت دینا غیر منطقی ہے کہ وہ اس تہذیب کے Nucleus تھے۔ ساحل پر کھڑا رہنے والا بھی محسوسات کی جہارتوں سے گھبرائے آب دار پا سکتا ہے۔

بالا کی تفصیلی بحثوں میں ہم نے عجائب القصص کے تاریخی تقدم کی بات کے خلاف بہت سارے جواز پیش کیے ہیں، جو یقین کرنے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن باغ و بہار اور عجائب القصص کے معاملے میں ارتضیٰ کریم نے دونوں کے اقتباسات کا موازنہ کر کے اس غلط فہمی کو پھیلانے کی کوشش کی ہے کہ باغ و بہار کے مصنف نے عجائب القصص کو سامنے رکھ کر نقل نویسی کی ہے یا بعض جگہوں پر معمولی سی رد و بدل کر کے اپنا کام چلا لیا ہے۔ اسی انداز سے میر امن کے فارسی نسخے کے حوالے سے نور الحسن ہاشمی نے بھی ایک بڑی غلط فہمی پھیلائی تھی، جس کو تحقیقی اعتبار سے غلط قرار دیا جا چکا ہے۔ چونکہ عجائب القصص باغ و بہار سے قبل کی تصنیف ہے' اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، اس لیے یہاں بھی عجائب القصص سے نقل کی بات بحث سے خارج ہو جاتی ہے۔ پھر بھی، مختصراً ایسے موازنے کی جانچ پرکھ کر دیکھنے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

انہوں نے دونوں قصوں کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ دونوں میں موضوع اور اسلوب کی یکسانیت ہے۔ اس لیے باغ و بہار کو نقل قرار دینے میں کوئی مضائقہ نہیں حالانکہ بعد میں وہ خود یہی تسلیم کرتے ہیں کہ اس زمانے میں داستان شروع کرنے کے یہی سلیقے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنی کتاب میں بھی ایک جگہ لکھا ہے:-

"میرے نزدیک اردو داستانوں کی اہمیت قصے سے زیادہ ان کی زبان میں پوشیدہ ہے ورنہ داستانوں کی اکثر و بیشتر کہانیاں پلاٹ، کردار اور ماحول کے اعتبار سے یکساں لگتی ہیں۔" لہ

جب مصنف اس بات کو تسلیم کرتے ہیں تو باغ و بہار اور عجائب القصص کے مباحث میں داستان کے موضوع کو گھسیٹنے کی انہیں کون سی ضرورت آن پڑی۔ کیونکہ اگر اس طرح سے تنقیدی مطالعہ پیش کیا جائے تو نو طرزِ مرصع، قصہ مہر افروز و دلبر، نو آئین ہندی وغیرہ داستانوں سے مثال دی جاسکتی ہے کہ عجائب القصص انہیں سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے ــــــ ارتضیٰ کریم نے اسی انداز میں حویلی کی آرائش کا ذکر کیا ہے کہ یہاں بھی میر امن نے عجائب القصص کی رہنمائی میں باغ و بہار کے حصے لکھے ہیں۔ یہاں بھی اسی تنقیدی رویے کا دخل ہے جس میں ابتداً یہ طے کر لیا گیا ہے کہ عجائب القصص کو سامنے رکھ کر ہی میر امن نے باغ و بہار کی تصنیف کی ہے۔ اسی لیے پہلے سے طے شدہ مفروضے کو تقویت پہنچانے کے لیے جو تجزیے کیے گئے ہیں ــــــ ان میں قوتِ استدلال کی سخت کمی ہے۔ "دن عید اور رات شبِ برات" جیسے مقبولِ عام فقرے کو دونوں کتابوں میں شامل ہونے کے سبب میر امن کی تحریر کو نقل بتانا ایک طرح سے زیادتی ہے اسی طرح کی زیادتی کا ایک نمونہ داڑھی یا مونچھ میں سفید بال دیکھ کر ترکِ دنیا کرنے کے فیصلے کے احوال میں ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"شاہ عالم ثانی کے یہاں اگر ایک موئے سفید داڑھی میں نظر آتا ہے تو میر امن کے یہاں مونچھوں میں، اس لیے کہ داڑھی کے ساتھ مونچھوں کا ہی ذکر نفسیاتی طور پر انسان کے ذہن میں اور لب پر آتا ہے ورنہ یہ سفید بال میر امن چاہتے تو سر میں بھی دکھا سکتے تھے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکے۔ اس لیے کہ انہیں تو صرف شاہ عالم ثانی کی عبارت میں معمولی سی لفظی تبدیلی مقصود تھی۔ چنانچہ ترجمہ کرتے وقت نو طرزِ مرصع کی عبارت میں سے 'داڑھی' لفظ کی جگہ 'مونچھ' کو رکھا صرف اس لیے کہ کسی کو شک نہ ہو کہ انہوں نے عجائب القصص سے زبان مستعار لی ہے۔ ورنہ داڑھی کے بجائے مونچھ کہنے سے زبان میں ایسی کون سی سادگی اور روانی آجاتی ہے۔"[12]

تنقید و تحقیق کے اس انداز پر ترس آتا ہے محسوس کہ وہ تمام آداب یہاں ختم کر دیے گئے ہیں جو اس طرح کے کام کے وقت ملحوظ رکھنے ہوتے ہیں۔ یہ دیانت دارانہ تحریر و تقریر کے اصول کے خلاف ہے کہ کسی کو خواہ مخواہ دلیل بتائے جائیں اور جس کے حق میں کچھ کہنا ہے اس پر رحم و فضل کے پھول نچھاور کرتے جائیں۔ 'مونچھ' اور 'داڑھی' کے فرق کو سمجھنے کے لیے فن کار کی دنیا میں اترنا ہوگا۔ ارتضیٰ کریم نے اپنی کتاب عجائب القصص: تنقیدی جائزہ کے آغاز میں ڈاکٹر راہی معصوم رضا کا ایک اقتباس شائع کیا ہے جس کا ایک جملہ یہاں ہمارے کام کا ہے ــــــ قصہ گو چاہے کیسی ہی طلسمی کیوں نہ بنا رہے ہوں۔ اگر طلسمی گرد و غبار صاف کر کے دیکھا جائے تو اس اپنی حقیقی دنیا کے خد و خال صاف نظر آئیں گے۔ اس اصول کی روشنی میں میر امن اور شاہ عالم ثانی کی زندگیوں کو دیکھا جائے تو 'مونچھ' اور 'داڑھی' کے استعمال کے فرق کو سمجھا جاسکے گا۔ مونچھ کم از کم ہندوستان میں ہر عہد میں شجاعت، جلال، مردی اور بہادری کی علامت رہی ہے۔ میر امن آنا دیج کے حالات میں دکھانا چاہتے ہیں کہ آخر کار شجاعت اور جوان مردی پر بھی آتا ہے۔ اس کے دن بھی ختم ہوتے ہیں۔ شاہ عالم ثانی اس زاویے سے کبھی سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ جس آدمی کی زندگی کا ایک دن بھی بہادری اور جوانمردی سے نہیں گزرا۔ وہ مونچھ میں سفید بال کے آنے میں مشیتِ ایزدی اور راز حکمت کہاں تلاش کر سکتا ہے۔ اس لیے شاہ عالم کے نزدیک مونچھیں کسی شے کا باعث کبھی نہیں ہو سکتی تھیں۔ رہا سوال داڑھی کا تو بزرگی اور تقویٰ کی علامت میں سفید بال آجانے کا مطلب پیری کے علاوہ اور کیا ہو سکتا اس لیے معنویت، اثر آفرینی اور محل کے اعتبار سے میر امن کا پلہ بہت بھاری ہے۔ جب کہ شاہ عالم ثانی کے ہاں معاملہ بالکل سپاٹ اور اثر آفرینی سے خالی ہے۔ میر امن نے زندگی کی سچائیوں اور مقابلوں کو سمجھا ہے جو شاہ عالم اپنی زندگی میں کبھی نہیں سمجھ پائے۔ پتہ نہیں کیسے ارتضیٰ کریم صاحب کو مونچھ، داڑھی، سر میں کہیں بھی سفید بال اُگا دینا ایک جیسا ہی لگتا ہے۔ اب آخر میں محققین کی ایک نفسیاتی کمزوری کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جہاں سلطنت اور سرمایہ دارانہ مزاج کے اثرات کے تحت ایسے بہت سارے فیصلے ہوئے ہیں جو اصلاً انصاف سے کافی دور ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم یہاں بعض محققین کا ذکر کرتے ہیں۔ سب سے پہلے جمیل جالبی۔ انہوں نے عجائب القصص کے بارے میں لکھا ہے۔

"شاہ عالم کے سامنے عجائب القصص لکھنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ آدابِ سلطنت اور طریقِ عرض و معروض دریافت ہوں، اسی لیے اس داستان میں اس پہلو پر بہت زور دیا گیا ہے اور اس اعتبار سے اب تک جتنی داستانیں اور مثنویاں لکھی گئی ہیں، ان میں یہ سب سے اہم ہے ..... اس داستان سے مغلیہ درباروں کے جاہ و جلال، اور ان کی معاشرت کی واضح تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس دور کی معاشرت کے لحاظ سے یہ داستان 'کتاب التہذیب' کا درجہ رکھتی ہے۔"[13]

جمیل جالبی کا یہ بیان سلطنت پرستی کی ایک مثال ہے۔ مغلیہ سلطنت

اکبر اور جہانگیر کی عظمتوں کی حامل اس وقت نہیں رہ گئی تھی۔ محمد شاہ اور شاہ عالم ثانی کی حکومتوں کی کارکردگیاں تو تاریخ کے صبر آزما، ناکام اور روبہ زوال دور کی یادیں ہیں۔ ان دونوں جیسا نامقبول مغل حکمراں کوئی دوسرا نہیں ہوا۔ مغل تہذیب سے یہ لوگ روز بروز دور ہوتے چلے گئے تھے۔ خود شاہ عالم ثانی کی ماں لال کنور، اور دادی اودھم بائی طوائفیں تھیں اس سے عوامی قدر و منزلت پر بھی اثر پڑا۔ یہاں تک کہ شاہ عالم ثانی کے والد کی لاش جمنا کے کنارے ریت پر کئی دنوں تک پڑی رہی اور کسی نے اسے اٹھا کر لے جانا اور تجہیز و تکفین کرنا ضروری نہیں سمجھا ـــــ بابر کی صلہ رحمی اور شجاعت کے واقعوں کو ایک جانب رکھیے اور دوسری طرف شاہ عالم کے دور کے واقعات ملاحظہ کیجیے۔ فرق واضح ہو جائے گا۔ بابر نے ایک بیٹے کی جان بچانے کے لیے خود اپنی جان جوکھم میں ڈال دی تھی اور یہاں شاہ عالم ثانی کی دادی کے بارے میں تاریخ میں یہ واقعہ درج ہے: کہ انہوں نے کشتی کو کبھی ڈوبتے نہیں دیکھا تھا ـــ ایک دن بادشاہ سے انہوں نے اس کی خواہش کی۔ بادشاہ نے فوراً لوگوں سے لدی ہوئی ایک کشتی کو الٹ دینے کا حکم دے دیا۔ اس واقعہ کو ایک فارسی شاعر نے اپنی مثنوی کا موضوع بھی بنایا ہے۔

بابر اور شاہ عالم ثانی کے کردار و اطوار کے فرق کو سمجھنا ہو گا جن لوگوں کو غلام قادر خاں کے ساتھ بادشاہ کے سلوک نارَوا کی تفصیلات معلوم ہیں وہ شاہ عالم ثانی اور محمد شاہ میں کچھ زیادہ فرق نہیں کریں گے۔ ہم جنسی اور ناجائز جنسی تعلقات کی روش عام شاہ عالم ثانی کے یہاں کافی شدت اختیار کر چکی تھی۔ غلام قادر کو لڑکپن کے زمانے میں بادشاہ کے سامنے زنانے کپڑے زیب تن کر کے ہی آنے کی اجازت تھی۔ اس کے علاوہ شاہ عالم ثانی کی شخصی کمزوریوں میں ان کا جھوٹا ہونا اور معاملات میں بے ایمان ہونا تاریخی حقیقت ہے۔ وہ معاملات میں اس قدر خراب تھا کہ دو ریاستوں کی جنگ میں فریق اوّل کی امداد طلبی پر اگر اُسے مغلیہ توپ (کہ مغلیہ توپوں کی قوت کا بہت شہرہ تھا۔) بھجوانے کا وعدہ کر دیتا تو دوسری جانب فریق دوم کو فوجی مدد بھی بہم پہنچاتا۔ انگریزوں، مرہٹوں اور روہیلوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے رہنے کے پیچھے حالات کے روز بروز خراب ہوتے جانے کا ہی ایک مسئلہ نہیں تھا بلکہ شاہ عالم ثانی کی بے عقلی بڑی وجہ تھی کیونکہ معاملات کا باریک بینی سے مطالعہ کرنے اور ہوش مندی سے فیصلہ کرنے کا درک اُسے نہ تھا۔ بابر کی عظمتوں والی مغلیہ سلطنت کے زوال کا آخری منظر بادشاہ کے اس دربارِ عام میں دیکھا گیا جہاں غلام قادر خاں نے سبھوں کے سامنے بادشاہ کو تخت سے اُتار کر زمین پر پٹخ دیا اور سینے پر چڑھ کر نیزے سے اس کی دونوں آنکھیں نکال لیں۔ افواج اور انتظامیہ کی خاموشی اور عوام کا احتجاج نہیں کرنا سلطنت اور حاکم کی سب سے بڑی ناکامی کا نمونہ ہے ـــ بعض مورخین نے عینی شاہدوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ آنکھ کھونے کے بعد بادشاہ نے اپنے وزیر سندھیا کے پاؤں پکڑ لیے اور قدموں میں گر کر رونے لگا ـــ اور جمیل جالبی ہیں کہ ایسے بادشاہ کے قصّے کو "کتاب التہذیب" کا درجہ دیتے نہیں تھکتے۔ بعض اوقات تو شک ہوتا ہے کہ ایسی بے چہرہ شخصیت کا حامل شاہ عالم ثانی تصنیف و تالیف کے لیے ایک عرصہ تک خود کو کیسے منہمک رکھ سکا ہو گا۔

سلطنت پرستی کی ایک اور عبرت آمیز مثال مولانا عرشی کی تحریر میں ملتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

> '..... رہ گئی زبان' تو وہ (شاہ عالم ثانی) قلعۂ معلّٰی کے ممتاز رکن تھے۔ ان سے زیادہ نکھری اور پاک و صاف اردو کون لکھ سکتا تھا۔ وہ جو کچھ لکھ گئے ہیں' متروک الفاظ سے قطع نظر کر کے ہمارے لیے سند ہے' ایسی سند جس کے روبرو میر اور سودا کی تحریریں بھی ناقابلِ قبول ہیں۔ چنانچہ آپ ان کے عہد کے شاعروں کے کلام سے مقابلہ کریں تو زبان کے لحاظ سے بڑے سے بڑے شاعر کو بھی ان کا ہم پلّہ نہ دکھائیں گے۔' [14]

یہی مزاج عجائب القصص یا شاہ عالم ثانی کے سلسلے میں کارفرما ہے جو ہماری تنقید و تحقیق دونوں کے لیے شگونِ بد ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ عجائب القصص کو زوالِ ادبیات اردو کی اہم ترین تصنیف قرار دلا دینے کے پیچھے بھی اس طرح کی ذہنیت کام کر رہی ہے۔

حوالے

۱۔ نوطرز مرصّع: عطا حسین خاں تحسین مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ص ۴۳
۲۔ اردو کی نثری داستانیں: گیان چند جین ص: ۱۸۷
۳۔ مقالاتِ شیرانی ص: ۴۰ ـــ ۴۔ ہماری زبان ہفتہ وار' مورخہ ۱۴ اپریل ۱۹۶۴ء
۵۔ عجائب القصص اور باغ و بہار: ارتضیٰ کریم: آج کل نئی دہلی: شمارہ مئی ۱۹۸۹ء
۶۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات: ڈاکٹر عبیدہ بیگم ص: ۱۳۰
۷۔ آج کل نئی دہلی شمارہ مئی ۱۹۸۹ء ص: ۵ ـــ ۸۔ باغ و بہار، میر امن: مرتبہ: ممتاز حسین
۹۔ تاریخ ادب اردو۔ جلد دوم۔ حصّہ دوم: جمیل جالبی ص: ۱۱۱۹
۱۰۔ آج کل نئی دہلی مئی ۱۹۸۹ء ص: ۸
۱۱۔ عجائب القصص: تنقیدی مطالعہ: ارتضیٰ کریم: زلالہ پبلی کیشنز نئی دہلی ص ۴،
۱۲۔ آج کل نئی دہلی مئی ۱۹۸۹ء ص: ۷
۱۳۔ تاریخِ ادبِ اردو جلد دوم حصّہ دوم: جمیل جالبی ص: ۱۹ - ۱۱۱۸
۱۴۔ نادراتِ شاہی: شاہ عالم ثانی مرتبہ امتیاز علی عرشی ص ۴۲ - ۴۱

یہ صبح زندہ رہے گی

گزشتہ سے پیوستہ

شیخ بلڈنگ سے نیچے اتر کر میں اور ملہوترہ اور نیگی اور گوپال سٹر ما پھر جدا ہو گئے۔ مجھے مرزا ادیب کے یہاں جانا تھا اور انہیں ابھی بازاروں کے چکر کاٹنا تھے۔ طے ہوا کہ اب چھ بجے گلبرگ میں میاں صاحب کے گھر ہی ملاقات ہو گی۔ سعادت بے چارا بڑی سعادت مندی سے گردن ہلائے جا رہا تھا اور مسکرائے جا رہا تھا۔ مجھے بڑا ترس آ رہا تھا بے چارے پر۔ میں نے کس مصیبت میں ڈال رکھا تھا اُسے۔ کوئی چار بجے کے قریب ہم مرزا ادیب کے گھر پہنچے۔ وہ ہمارا انتظار ہی کر رہا تھا۔

مرزا ادیب اور میں ایک دوسرے کے لیے نئے نہیں تھے۔ کئی برسوں تک خط و کتابت رہی اور پھر اچانک یہ سلسلہ ٹوٹ گیا اور اب تک ٹوٹا ہوا ہے۔ ہم تصویر سے تو ایک دوسرے کو پہچان سکتے تھے، لیکن ملاقات شاید نہیں ہوئی تھی۔ البتہ جانی پہچان بہت گہری تھی۔ اس لیے اجنبیت کا احساس نہ اُسے تھا نہ مجھے ــ جن دنوں میں نے لکھنا شروع کیا تھا، مرزا ادیب کی دو کتابیں چھپ چکی تھیں۔ "صحرا نورد کے خطوط" اور "صحرا نورد کے رومان" یہ کتابیں جن میں رومانی افسانے تھے۔ میں نے انہیں دلفل پڑھی تھیں۔ مرزا ادیب اپنے نام کے ساتھ بی۔ اے آنرز ضرور لکھتا تھا۔ بہر حال مرزا ادیب سے میرا تعارف بہت پرانا تھا۔ اس کا آخری خط وہ تھا جو اُس نے کچھ سال پہلے "بیسویں صدی" کے افسانہ نمبر میں چھپی میری کہانی "چھوٹا سا غم" پڑھ کر لکھا تھا۔

"تم نے ایک چھوٹا سا غم لکھ کر مجھے ایک بہت بڑے غم سے روشناس کرا دیا ہے۔"

یہ ایک ذرا ذاتی نوعیت کا خط تھا جسے میں نے اب تک سنبھال کر رکھا ہے۔

مرزا ادیب بڑی محبت سے ملا اور ہم دیر تک ایک دوسرے کی ادبی خدمات کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے ڈرامہ نگار کی حیثیت سے اس کی بہت تعریف کی۔ میرا خیال ہے لگ بھگ سترہ برس جو اس نے پہلے آل انڈیا ریڈیو اور بعد میں ریڈیو پاکستان میں گزارے تھے۔ اس کی ڈرامہ نگاری میں ان برسوں کا کافی رول رہا ہے چونکہ مجھے کسی زمانے میں ریڈیو کے لیے بہت ڈرامے لکھنے پڑتے تھے، اس لیے میں محسوس کرتا ہوں کہ ریڈیو کی ملازمت میں ہر ادیب کو اسکرپٹوں کی ایک فیکٹری لگانی پڑتی ہے۔ کچھ عرصہ مجھے بھی ایک ایسی ہی فیکٹری چلانی پڑی تھی۔

مرزا ادیب جلد ہی رومانی افسانوں کی دنیا سے نکل آیا اور بعد میں جو مختصر افسانے اس نے "لاوا" "دیواریں" "جنگل" "ساتواں چراغ" اور "گلی گلی کہانیاں" میں شامل کیے، ان میں بڑا تنوع تھا۔ جب وہ دوسری بار "ادبِ لطیف" کا ایڈیٹر ہوا تو اس نے "ادبِ لطیف" کے ڈرامہ نمبر کے لیے مجھے ایک ڈرامہ بھیجنے کے لیے کہا۔ "کچی دیوار" ڈرامہ میں نے ادبِ لطیف ہی کے لیے لکھا تھا جو بعد میں ہندوستان کی کئی زبانوں میں مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے براڈکاسٹ ہوا اور تین چار بار اسٹیج بھی کیا گیا۔ مرزا ادیب کو میرا یہ ڈرامہ بہت پسند آیا تھا۔ جب وہ رومانی افسانوں کی حدود سے نکل آیا تو اس کی ادبی زندگی میں بڑی پختگی آئی۔ اور بڑا نکھار آیا۔ اسے اس کی پانچ کتابوں پر ایوارڈ بھی ملے۔ "شیشہ و سنگ" پر تو اُسے آدم جی ایوارڈ بھی ملا تھا۔ "صحرا نورد کے خطوط" کے مصنف نے بچوں کے لیے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اور اب بھی لکھ رہا ہے۔ اُس نے ناول، سفر نامے، خاکے، تنقید بھی کچھ لکھا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ "نوائے وقت" اخبار میں وہ کالم بھی لکھتا رہا ہے۔ ان کالموں کا انتخاب "اذکار و افکار" کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ میں نے اپنی کہانیوں کا مجموعہ "میرا آنچل میلا ہے" پیش کیا تو بے حد خوش ہوا اور اُس نے مجھے "گلی گلی کہانیاں" عنایت کی۔ وہ مجھے اپنی خود نوشت سوانح عمری "مٹی

لگا دیا" بھی دینا چاہتا تھا، لیکن اس وقت اس کے پاس کاپی نہیں تھی۔ اُس نے وعدہ کیا کہ وہ مجھے ڈاک سے یہ کتاب بھیج دے گا۔

ہم چائے پیتے رہے اور ڈھیر ساری باتیں بھی کرتے رہے۔ میں نے اپنے پروجیکٹ کا بھی ذکر کیا۔ اس نے اس کی تعریف کی اور اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا۔ مرزا ادیب کے ساتھ لگ بھگ دو گھنٹے کی بھرپور ملاقات رہی۔ جب وہ ہمیں اپنی کوٹھی کے گیٹ تک چھوڑنے آیا تو وہ بہت خوش تھا۔ پھر اس نے مجھے دعائیں دیں اور سعادت سعید سے کہا کہ وہ مجھے لاہور کے سبھی دوستوں سے ملوائے ورنہ بعد میں دوست گلہ کریں گے۔ جب تک سعادت سعید نے گاڑی گھما نہ لی مرزا ادیب گیٹ پر ہی کھڑا رہا —— جب ہم گلبرگ پہنچے تو ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ ملہوترہ، نیگی اور گوپال اپنے اپنے کام ختم کر کے واپس آچکے تھے۔

میاں ریاض کے ساتھ چائے پی پھر ہاتھ منھ دھویا اور ایک بار پھر ایک نئے سفر پر نکل پڑے۔ منزل نیاز حسین لکھویرا کا گھر تھا۔

"تہواڈے پیر دِیچ چکر اے ذاکر صاحب"۔ میاں صاحب نے مجھے گاڑی میں بٹھاتے ہوئے کہا

"چکر نہ ہوندا تے تہواڈے دیدار کس طرح ہوندے"۔ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

میاں ریاض نے حسبِ معمول بڑی شرافت اور انکساری سے ہاتھ جوڑ دیے۔

"کیا شخص ہے میاں ریاض۔" میرے منھ سے نکلا۔

تب تک دونوں گاڑیاں کوٹھی کے گیٹ سے باہر نکل آئی تھیں۔

پہرے دار نے گیٹ بند کر دیا تھا۔

ساڑھے آٹھ بجے کے لگ بھگ ہم لکھویرا کے مکان پر پہنچے۔ قتیل شفائی پہلے پہنچ چکا تھا۔ اس نے شاداب شگفتہ چہرے پر مسکراہٹ کے پھول کھلا کر میرا استقبال کیا اور مجھے گلے سے لگا لیا۔ لکھویرا کے دو دوست اور بھی موجود تھے۔ ان سے بھی اس نے میرا اور ملہوترہ کا تعارف کرایا۔ افسوس ہے کہ مجھے ان کے نام یاد نہیں رہے، لیکن انہوں نے ہم سب کی دھڑا دھڑ تصویریں کھینچیں۔ کچھ تصویریں بعد میں لکھویرا نے مجھے پیش بھی کیں۔

انتخابات کا زمانہ تھا۔ عام گفتگو میں بھی انتخابات کا موضوع زیرِ بحث آجاتا تھا۔ اس موضوع پر بھی بات ہوئی۔ لگتا تھا ادیبوں اور شاعروں کی اکثریت پاکستان پیپلز پارٹی کے حق میں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر بے نظیر بھٹو برسرِ اقتدار آگئیں تو ادیبوں اور شاعروں کو اپنی بات کھل کر کہنے کے بہتر مواقع مل سکیں گے۔ پھر پاکستان میں میری کتابوں کی اشاعت کی بات چھڑی تو لکھویرا نے کہا: وہ ایک پبلشر زاس بارے میں اس سے بات بھی کر چکے ہیں۔ اس کی تجویز تھی کہ میں اپنی کتابوں کا اجازت نامہ ان کی بیگم شمع کو لکھ کر دے دوں تاکہ وہ میری طرف سے پبلشروں سے بات کر سکے۔ قتیل نے بھی حامی بھری۔ چنانچہ کا اس طرح کا اجازت نامہ جیسا کہ میں نے قتیل شفائی کو لکھ کر دیا تھا، شمع کو بھی دے دیا۔

پھر سعادت نے کہا۔

"کیا میں بانو قدسیہ اور بشریٰ رحمٰن کو ٹیلی فون کر کے ان سے ملاقات کا وقت طے کرلوں؟"

"کرلو یار"۔

بشریٰ رحمٰن گھر پر نہیں تھی اس لیے اس سے بات نہیں ہو سکی۔ بانو قدسیہ سے بات ہوئی۔ اس کی دوہتی بیمار تھی اور وہ اسی وقت اُسے اسپتال لے کر جا رہی تھی۔ اس نے اگلے روز ملاقات کا وقت پوچھا۔ لیکن اگلے روز تو ہم بھاولپور جا رہے تھے۔ اس لیے ملاقات کراچی سے واپسی تک کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ بانو قدسیہ کا شوہر اشفاق احمد لاہور سے باہر تھا۔ جب تک وہ بھی واپس آجائے گا۔

کھانے کے دوران لکھویرا نے بتایا کہ وہ اپنا مکان بنوا رہا تھا، جس کے اب فائنل ٹچز رہ گئے تھے۔ دس پندرہ روز میں وہ اپنے مکان میں شفٹ ہو جائے گا۔ اگلی بار جب آپ لاہور آئیں تو میرے پاس ٹھہریے"۔

"کیوں ملہوترہ صاحب؟"

"یہ پیشکش صرف آپ کو ہے"۔

"آپ کو بھی ہے"۔ لکھویرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پھر تو اب کی باتیں کم اور کتوں کی باتیں زیادہ ہوں گی"۔ میں نے جملہ پھینکا۔ کیوں کہ لکھویرا کو بھی کتے پالنے کا شوق تھا۔ اور کچھ دیر پہلے وہ اس موضوع پر ملہوترہ سے بات بھی کر چکا تھا۔

مجھے لاہور کے شاعروں کی ایک بات اچھی لگی کہ جب وہ ان نارمل قسم کی محفلوں کا اہتمام کرتے تھے تو اپنی شاعری سے ایک دوسرے کو بور نہیں کرتے۔ قتیل شفائی خاص طور سے سختی سے اس پر کاربند تھا۔ ایسی محفلوں میں نہ وہ خود شعر سناتا تھا نہ کسی سے سنتا تھا چنانچہ اس مختصر محفل میں بھی سوائے شاعری کے اور سب کچھ کہا گیا اور سنا گیا اور اس سے لطف بھی لیا گیا۔ بہت سے لطیفے بھی ہوئے۔ یہ محفل کافی دیر تک چلی۔

"تو کل آپ بھاولپور جا رہے ہیں"۔

"جی"۔

"میں اپنے چھوٹے بھائی کو ٹیلی فون کر دوں گا۔ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوگا۔ آپ کا قیام کہاں ہوگا"۔ لکھویرا نے پوچھا۔

"یہ تو ملہوترہ صاحب ہی بتا سکتے ہیں"۔

"کیوں ملہوترہ صاحب؟"

"آپ نوشی گیلانی سے ٹیلی فون پر پوچھ لینا"۔

"پوچھ لوں گا"۔

باتیں کرتے کرتے ہم لکھویرا کے مکان سے نکل کر سڑک پر آگئے۔ سب سے پہلے قتیل نے رخصت چاہی۔ اس کے بعد لکھویرا کے دوستوں نے اور سب سے آخر میں ملہوترہ، نیگی، گوپال اور میں نے۔

"آپ کے پاس آنے تک تو سیاسی

حالات بدلنے کے امکان بہت بڑھ چکے ہوں گے۔"

"خدا کرے۔" میں نے لکھو یرا کی بات کا جواب دیا۔

اور پھر ہم سب اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ لکھو یرا اور اس کی بیوی شمع سڑک پر کھڑے ہمیں ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہتے رہے۔

جب ہم گلبرگ پہنچے تو آدھی رات ہو چکی تھی۔ میاں صاحب اور علی اور رضا اور ان کے بچے تو سو چکے تھے، لیکن ہمارے کمرے کھلے دروازوں اور بھرپور روشنیوں سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ملہوترہ اپنے کمرے میں جانے سے پہلے میرے کمرے میں آیا اور بولا۔

"صبح جلدی اٹھ جائیے گا ذاکر صاحب۔ ہم نے ٹرین پکڑنی ہے۔"

"جیسا حکم سرکار۔"

"آپ ہر روز دیر کر دیتے ہیں۔"

"گستاخی کے لیے معافی چاہتا ہوں۔"

"کل معافی نہیں ملے گی۔"

"سزا تو مل سکے گی۔"

"آپ تو لاجواب کر دیتے ہیں ۔۔۔"

ملہوترہ نے بڑی محبت اور شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور "گڈ نائٹ" کہہ کر مسکراتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کبھی کبھی ملہوترہ کی مسکراہٹ بڑی دل کش ہوتی ہے۔

آج میں بہت تھک گیا تھا۔ شاید گوپال کے خراٹوں کی بلغار میں بھی نیند آ جائے۔ ویسے بھی تو آدھی رات ڈھل چکی تھی۔

خیبر میل کے چلنے کا وقت تو دس بجے تھا، لیکن ملہوترہ نے ہمیں نو بجے ہی اسٹیشن پر پہنچا دیا تھا۔ پولیس اسٹیشن پر لاہور چھوڑنے کی جو اطلاع دینا تھی وہ بھی ملہوترہ کل دے آیا تھا۔

ایک گھنٹہ پڑا تھا ابھی خیبر میل کے چلنے کو۔ میں ملہوترہ کو ساتھ لے کر لاہور اسٹیشن کے پلیٹ فارموں پر گھومتا رہا۔ لگ بھگ چالیس سال کے بعد لاہور اسٹیشن کو دیکھا تھا۔ ویسے کا ویسا تھا۔ کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ہندوستان کے ریلوے اسٹیشن بھی تو ویسے ہی تھے ایک جیسے مزاج کے لوگوں کے لیے ہی تو یہ ریلوے اسٹیشن اور ریگاڑیاں بنی تھیں۔ دونوں میں ایک طرح کی عجیب سی مطابقت تھی۔ ٹرینوں کے رنگوں میں البتہ فرق تھا۔ تھوڑا بہت فرق مسافروں کے لیے مہیا کی گئی سہولتوں میں بھی تھا اور رفتار میں بھی۔ نہیں تو پلیٹ فارموں پر ویسے ہی سگریٹ پان بیچنے والے تھے ویسے ہی چائے پانی پلانے والے۔ مسافروں کے بیے ویسے ہی بینچ اور اسی طرح کے ویٹنگ روم اور وہ جو فرق آیا تھا وہ دراصل وقت کے تقاضوں کی وجہ سے تھا۔ میں ملہوترہ کے ساتھ خاموشی سے پلیٹ فارموں پر گھومے جا رہا تھا اور سوچ کے تانوں بانوں میں الجھا ہوا تھا۔ پھر خیبر میل آ گئی اور ہم اپنے ڈبے میں بیٹھ گئے۔ پاکستان میں ٹرین سے یہ میرا پہلا سفر تھا۔

ٹرین لاہور اسٹیشن سے باہر نکل رہی تھی۔ اور میں اس ڈبے کا جائزہ لے رہا تھا، جس میں ہم چاروں بیٹھے تھے۔ ملہوترہ، نیگی، گوپال اور میں۔ ملہوترہ اور میں ایک طرف بیٹھے تھے اور نیگی اور گوپال عین ہمارے سامنے۔ دوسری طرف ملہوترہ کے ساتھ ایک بزرگ، لیکن سوجھ بوجھ والا شخص بیٹھا تھا۔

ملہوترہ نے اس سے پنجابی زبان میں پوچھا۔

"کتھے جا رہے ہو تسی؟"

"ساہیوال۔"

"کی کر دے او؟"

"میں ایک چھوٹا جیا زمیندار آں۔"

ملہوترہ اور وہ بزرگ آدمی پنجابی میں گفتگو کرتے رہے اور میں انہماک سے سنتا رہا۔ رفتہ رفتہ حالاتِ حاضرہ پر بھی بات چیت ہونے لگی۔ لگتا تھا کہ عوام کو انتخابات میں کافی دلچسپی تھی۔ ہفتہ بھر تو رہ گیا تھا انتخابات میں اب۔ لوگ بات چیت سے اپنے ذہن صاف کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لاہور میں جن لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں، اُن میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی جو انتخابات پر اثر انداز ہو سکتے تھے۔ میرا مطلب ہے دیہات سے تعلق رکھنے والے لوگ۔

لاہور میں تو دانشوروں، شاعروں، ادیبوں، پبلشروں، تجارت پیشہ لوگوں اور دوکانداروں سے ہی ملنا جلنا ہوا تھا۔ ان سے بات کر کے صرف ان کے نظریات جاننے کا موقع ملا تھا۔ اس طبقے کی اپنی اہمیت ہے، لیکن یہ اہمیت صرف شہری آبادی تک محدود ہے۔ دیہات کی سماجی اور اقتصادی زندگی کا پس منظر دوسرا ہے۔ اس آبادی میں نوجوانوں اور عورتوں کا بڑا اہم رول ہو سکتا تھا۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ ووٹ ڈالنے کے لیے شناختی کارڈ کا ہونا ضروری ہو گیا۔ جس ووٹر کے پاس شناختی کارڈ نہیں ہوگا اُسے ووٹ ڈالنے کا حق نہیں ہوگا۔ یہ معاملہ اب عدالت میں تھا اور لوگوں کا خیال تھا کہ اگر عدالت نے بھی اپنے فیصلے میں شناختی کارڈ کو ووٹ ڈالنے کے لیے ضروری قرار دے دیا تو پاکستان پیپلز پارٹی پر انتخابات کے دوران بڑا گہرا اثر پڑے گا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ دیہات میں اکثر عورتوں نے اپنے شناختی کارڈ نہیں بنوائے تھے، اس طرح بے نظیر بھٹو کی پوزیشن کمزور پڑ سکتی ہے۔ لگتا تھا پاکستان میں پہلی بار ایک عام آدمی کو حکومت کی تشکیل میں اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگا تھا۔

میں ملہوترہ اور اس کے ساتھ بیٹھے بزرگ کی باتوں کو بڑے غور سے سن رہا تھا۔ اس نے تمام طبقے کے اثر و رسوخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پنجابی کا ایک ٹپہ بولا۔ جس کا مطلب تھا کہ گاؤں کے رہنے والے عوام کو تو سیاسی لوگ صرف اپنی غرض اور وقت کاٹنے کے لیے استعمال کرنے میں خوش

وہ کاروباری طبقے کی حاصل کرنے میں لگے رہتے ہیں۔

کہاں ہین نواں کنگ شاہ دی ہٹی۔
سون ہین نوں احمد جٹ دا دارا

میں نے اس بزرگ کے منہ سے یہ ٹپہ سنا تو پھڑک اٹھا۔ پاکستان میں عوام بھی اب سیاسی چالوں کو سمجھنے لگے تھے۔

"بڑے مزے دار گل کیتی اے تسی چاچاجی"

میں نے جب اس بزرگ کو چاچا کہہ کر پکارا تو وہ زور سے ہنسا۔

"لگدا ہے ہن بھارت تے پاکستان دی دوستی چنگی ہو جائے گی۔"

"خدا کرے۔" میں نے جواب دیا۔

ملہوترہ اور وہ بزرگ باتیں کرتے رہے اور میں ڈبے میں گھوم کر کہیں کہیں سرخ رنگ میں لیکن بدخطی سے لکھی ہوئی تحریریں پڑھنے لگا۔

تحریریں کچھ اس طرح تھیں:

ہم کرتے ہیں اعلان
تیر ہمارا نشان
اللہ ہے مہربان
بے نظیر کا ہے فرمان

جیت ہوگی تیر کی
نصرت بے نظیر کی

کھاواں نال مراداں

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر

پھر میں نے ڈبے میں بیٹھے ہوئے کچھ نوجوان مسافروں سے بات چیت کی، جن میں کچھ طلبا تھے اور کچھ کسی نہ کسی جگہ ملازمت کر رہے تھے ان کی سوچ کا محور بھی بے نظیر بھٹو ہی کی طرف تھا۔ ایسا لگا کہ لوگ نظام میں تبدیلی چاہتے تھے۔ اور اب چونکہ حکومت کا وہ پہلا جیسا دباؤ نہیں تھا، اس لیے غیر سرکاری اور سرکاری طبقے کے لوگ اپنی بات کھل کر کہتے تھے۔ لیکن سب کی نگاہیں عدالت کے فیصلے پر جمی تھیں۔ شناختی کارڈ کے بارے میں عدالت کا فیصلہ۔

ٹرین مختلف اسٹیشنوں پر رکتی رہی۔ مسافر اترتے رہے اور ہر اسٹیشن پر نئے مسافر ڈبوں میں داخل ہوتے رہے۔ نیگی اور ملہوترہ ساہیوال اسٹیشن کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔ دراصل انہوں نے اپنی ایک شاعرہ دوست کو اطلاع کر رکھی تھی کہ وہ خیبر میل سے بھاولپور جا رہے تھے، اس لیے وہ انہیں اسٹیشن پر ملے۔ ساہیوال کا اسٹیشن آیا تو ٹرین رکتے ہی نیگی پلیٹ فارم پر اتر گیا اور ملہوترہ کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا، لیکن ان کی شاعرہ دوست اسٹیشن پر انہیں ملنے نہیں آئی تھی۔ نیگی پلیٹ فارم پر گھوم کر ڈبے میں واپس آگیا۔ ہو سکتا ہے اسے ان کے آنے کی اطلاع نہ ملی ہو۔ میں نے بھی اس کی تائید کی، لیکن اس کی تسلی نہیں ہوئی۔ دونوں ایک دم اداس ہو گئے تھے

خیبر میل شام کو چھ بجے بھاولپور پہنچی۔ اسٹیشن پر نوشی گیلانی، منور جمیل قریشی، اور وقار عزیز موجود تھے۔

ملہوترہ کو دیکھ کر سب کے چہرے کھل گئے۔ پہلے تین چار دنوں سے یہ لوگ ملہوترہ سے ٹیلی فون پر بات کرتے رہے تھے دوبار تاریخیں ملتوی ہو چکی تھیں۔ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں اب بھی تاریخ ٹل نہ گئی ہو۔

"قلم قبیلہ" ادارے کے یہ لوگ اسٹیشن پر موجود تھے۔ ملہوترہ کو دیکھ کر وہ اتنے زیادہ جذباتی ہو گئے تھے کہ شاید انہوں نے میرا نام بھی ٹھیک طرح سے نہیں سنا تھا۔ اگر سنا تھا تو اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا ان پر۔ وہ سب ملہوترہ پر ٹوٹ ٹوٹ پڑ رہے تھے۔ وجہ صرف ایک تھی کہ وہ لوگ انبالہ کے انڈو پاک مشاعرہ میں شرکت کے لیے آرزومند تھے اور ان کی یہ آرزو صرف ملہوترہ پوری کر سکتا تھا۔ ملہوترہ نے ٹرین میں مجھ سے ان کی اس شدید خواہش کا ذکر بھی کیا تھا۔ اسٹیشن سے باہر نکلنے تک ان سب کے ردِ عمل میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ملہوترہ اس پارٹی کا دولہا تھا۔ اور نیگی شہ بالا۔ گوپال اور میں تو بس عام براتی جیسے تھے۔

اسٹیشن سے باہر دو گاڑیاں کھڑی تھیں جن میں ہم لوگوں نے بیٹھ کر جانا تھا۔ اب شاید ملہوترہ کا اپنے وی آئی پی ہونے کا نشہ ہلکا ہو گیا تھا جب منور جمیل نے ملہوترہ کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا تو اس نے مجھ سے کہا۔

"آپ بیٹھیے ذاکر صاحب۔" پھر وہ نوشی گیلانی سے مخاطب ہوا "کشمیری لال ذاکر سے واقف ہیں آپ؟"

"میں نے حال نثار اختر پر لکھا ان کا ایک مضمون پڑھا ہے۔ کیوں کہ میں اختر صاحب پر ریسرچ کر رہی ہوں۔"

"شکریہ۔" میں نے جواب دیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"ریسرچ تو آپ کے افسانوں پر بھی ہو رہی ہے؟" ملہوترہ نے سوال کیا۔

"جی ہاں۔ ہندوستان کی دو یونیورسٹیوں میں۔"

نوشی گیلانی کھڑکی کی طرف ملہوترہ کے ساتھ بیٹھ گئی اور منور جمیل اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ نیگی اور گوپال وقار عزیز کے ساتھ دوسری گاڑی میں بیٹھ گئے۔ راستے میں نوشی گیلانی اپنے ادارے "قلم قبیلہ" کے بارے میں بتاتی رہی۔ جس کی وہ ایک بڑی سرگرم کارکن تھی۔ اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ بھاولپور میں ادبی سرگرمیوں کا محرک منور جمیل قریشی تھا۔ نوشی گیلانی نے بتایا کہ ہمارا پروگرام بڑا ٹائٹ تھا۔ ساڑھے سات

بجے تیں سینٹرل لائبریری جانا تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے ہمارے اعزاز میں ڈسٹرکٹ کونسل ہال میں مشاعرہ تھا اور دس بجے اِرم ہوٹل میں ڈنر تھا۔ ہمارے ٹھہرنے کا انتظام بھی اِرم ہوٹل میں ہی تھا۔

ہوٹل پہنچا تو محسوس ہوا کہ میں بہت تھک گیا تھا۔ ٹرین کا سفر کوئی زیادہ آرام دہ نہیں تھا۔ دھول مٹی بھی بہت پڑی تھی اور دن میں موسم بھی گرم رہا تھا۔ میں نے ٹھنڈے پانی کے ایک ساتھ دو گلاس پیے اور باتھ روم میں گھس گیا۔ چائے نہا کر ہی پیوں گا۔ گوپال دوسرے کمرے میں ملہوترہ، نیگی، منوّر جمیل اور نوشی گیلانی کے ساتھ چائے پینے چلا گیا تھا۔ نہانے کے بعد خاصا تازہ دم ہو گیا تھا میں۔ اکیلے چائے پی اور گوپال کے واپس آنے تک میں تیار بھی ہو گیا۔ "میں تو شلوار قمیص پہنوں گا آج"۔ گوپال نے اعلان کیا ــــــ

"ضرور پہنو۔"
"آپ بھی پہنیے۔"
"آج نہیں۔"
"لیکن ازار بند تو ہے نہیں۔" اُس نے کہا۔

"تم نہاؤ میں منگواتا ہوں۔"

میں نے ہوٹل کے ویٹر کو بازار سے ازار بند لانے کو کہا۔ جب تک وہ واپس آیا۔ گوپال نہا چکا تھا۔ میں ملہوترہ کے کمرے میں چلا گیا، جہاں نوشی گیلانی اور منوّر جمیل سے گفتگو ہوتی رہی۔ گوپال بھی تیار ہو کر وہیں آ گیا۔ ظالم شلوار قمیص میں بڑا جچ رہا تھا۔ وہیں ہوٹل کے کمرے میں نوشی گیلانی نے اپنے کچھ اشعار سُنائے۔ شعر اچھے تھے اور انداز بیان بھی اچھا تھا۔ پروگرام کے مطابق ہم لوگ ساڑھے سات بجے تو نہیں، دس پندرہ منٹ تاخیر سے سینٹرل لائبریری پہنچے۔ اشرف جلال لائبریرین اور ان کا عملہ استقبال کو موجود تھا۔ لائبریری کی عمارت بڑی پُرشکوہ تھی۔ اشرف جلال نے ۱۹۷۲ء میں بطور لائبریرین جوائن کیا تھا۔ عابد فاروق سے بھی وہیں ملاقات ہوئی۔ جو ۱۹۸۴ء تک اسی لائبریری میں بطور اسسٹنٹ لائبریرین رہ چکا تھا۔ لائبریری کے ارتقا، اور اس کی دیکھ بھال میں اشرف جلال اور عابد فاروق دونوں کا ہاتھ تھا۔ وہیں سلیم ملک سے بھی ملاقات ہوئی جسے میرے افسانے پسند تھے اور پاکستان کے رسائل میں وہ میرے افسانے پڑھتا رہتا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میرے کچھ افسانوں کی کاپیاں میرے پاس نہیں تھیں تو سلیم ملک مجھے فوراً اوپر کی منزل پر لے گیا اور الماریاں کھلوا کر مجھے پرانے رسالے دکھانے لگا۔ ان میں تین افسانے ایسے مل گئے جن کی کاپیاں میرے پاس موجود نہیں تھیں۔ اس نے کہا کہ وہ میرے ہندوستان واپس جانے سے پہلے ان افسانوں کی زیراکس کاپیاں مجھے بھجوا دے گا۔ اشرف جلال نے مخطوطات کا شعبہ دکھایا تو ملہوترہ کو فوراً یاد آ گیا کہ سیّد مظفر حسین برنی صاحب نے علامہ اقبال کے غیر مطبوعہ خطوں کی فرمائش کی تھی۔ وہ بولا اگر کوئی غیر مطبوعہ خطوط علامہ کے مل جائیں تو ایک معرکہ سر ہو جائے ــ اشرف جلال نے آخر ایسا ایک خط ڈھونڈ ہی نکالا۔ اس نے فوراً ہی اس خط کی زیراکس کاپی بھی تیار کروا دی۔ سینٹرل لائبریری کو ایک ہی بار پوری طرح دیکھ لینا ممکن نہیں تھا۔ یہ طے ہوا کہ اگلے دن پھر کسی وقت اِدھر کا چکر لگایا جائے گا۔

[جاری ہے]

بقیہ: ملاحظات

یہ ہے کہ آزادی کے بعد گاندھی جی کے اخلاقی اقدار سے لوگوں کی وابستگی اب قدرے کم ہو گئی ہے۔ لوگ مادی اور سائنسی دور کی شان و شوکت اور نام و نمود میں کھو گئے ہیں۔ لوگ اس فریب میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ پیسہ اور دنیاوی اسباب تعیش ہی سب کچھ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آج کا انسان بیماریوں، ذہنی تناؤ، زندگی کے عدم تحفظ کے خدشات، رشتوں، اور ہمسایوں کی دُوری، محبت و یگانگت، ہمدردی و مروت جیسے جذبات کے فقدان کا شکار ہے۔ آج کے اس مادی دَور میں جب کہ دوسرے ممالک ہماری ان اخلاقی اقدار کی اہمیت کے پوری طرح قائل ہو چکے ہیں اور ان کو تیزی سے اپنا رہے ہیں۔ ہم خود اس عظیم وراثت سے بہت دُور ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ انتہائی نامناسب بات ہے اور ہمیں اس کی بھاری قیمت چکانی پڑے گی۔

موجودہ صورتِ حال میں صرف ــــ گاندھی جی کی اخلاقی اقدار ہمارے مسائل کا حل ہیں۔ اپنی سیاسی اور سماجی اور ذاتی زندگی کے پیچیدہ معاملات کو ہم انہیں اقدار کا سہارا لے کر حل کر سکتے ہیں۔ یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ کسی بھی سوئے ہوئے انسان کو جگانا تو آسان ہے مگر جاگے ہوئے انسان کو خوابِ غفلت سے جس میں وہ جان بوجھ کر کھو گیا ہو، نکالنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ اس کے لیے افہام و تفہیم کی بات فضول ہوتی ہے۔

چنانچہ ان تمام امور کے پیشِ نظر یہ واضح ہے کہ آج کے انسان کی سماجی سیاسی اور نجی زندگی میں گاندھی جی کے اصولوں اور ان کی اخلاقی اقدار کی بے حد ضرورت ہے اور انہیں پر عمل پیرا ہو کر ہم آج کی مادی دنیا کے بیشتر مسائل کو حل کر سکتے ہیں اور ہمارا یہی طرزِ عمل اس عظیم ہستی کے تئیں سب سے اچھا خراجِ عقیدت ہوگا

(آشوتوش سنہا)

●●

کیول سوری

ایک نظم

نہ جانے کیسے سرِ شام بات نکلی تھی ـــــــ
"وہ کھیلی کھائی سی عورت ہے کوئی دیوی نہیں
کوئی بھی مرد مکمل نہیں ہے اس کے تئیں
کسی بھی ایک کی ہو کر وہ رہ نہیں سکتی"
تمہارے 'فتوے' کا میں نے جواب کچھ نہ دیا
بغیر وجہ کے تم ایک بار پھر بھڑکے
"تمہیں یہ وہم ہے شاید کہ آفتاب ہو تم
بغیر جس کے سحر لوٹ کر نہ آئے گی
کوئی بھی آنکھ اُجالا نہ دیکھ پائے گی
کسی پہاڑ کی چوٹی کو سر کیا تم نے؟
کہ جس کی دودھیا برفانی رہگزاروں پر
سوا تمہارے کوئی آج تک پہنچ نہ سکا ـــ؟
تمہاری عمر میں اچھی نہیں یہ خوش فہمی ـــــ"
سوا سکوت کے تم کو جواب کچھ نہ ملا
مری خموشی کے کارن یا اپنے غصے سے
پھر رک کے پھر سے مخاطب کیا تھا تم نے مجھے
"تمہاری اُس کی رفاقت کی عمر کتنی ہے ـــ؟
دنوں، مہینوں میں تم کتنا جان لو گے اُسے ـــ؟
ہیں میرے سامنے اُس کے گزشتہ بیس برس
کھلی کتاب کے اوراق روبرو ہیں مرے
ہر اک ورق پہ نظر آ رہے ہیں نام کئی
ہر ایک نام کی آنکھوں میں طنز کے نشتر
تمہارا اغواب محل چور چور کر دیں گے
تمہارے دل کو دکھانا نہیں مرا مقصد
تمہیں خبر ہے کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں
اس احمقانہ سی جذباتیت سے ڈرتا ہوں
مجھے یہ خوف ہے جب خواب منتشر ہوں گے
تمہاری جاگتی آنکھوں سے خون ٹپکے گا"
تمام شام یونہی بولتے رہے تھے تم
سوا سکوت کے تم کو جواب کچھ نہ ملا

اور اب کہ وقت کی دہلیز پر لرزتے ہیں
بکھرتی رات کے یہ چند آخری لمحے
مرے وجود کی اُس تند زہر سے غافل
تمہاری شام کی باتوں نے جو دیا تھا مجھے
بہت ہی میٹھی مدھر نیند سو رہے ہو تم
تمہارے چہرے پہ رقصاں ہے وہ سکون کہ جو
مہاتماؤں کو بس اُس سمے ہی ملتا ہے
وہ مُکت ہوتے ہیں جب کرودھ کی جوالا سے
شراب دے کے کسی کو جو پاپ کرتا ہے
میں سوچتا ہوں کہ اگلے شراب سے پہلے
مرے عزیز میں بس اتنا پوچھ لوں تم سے
اُمید ہوگی روا ایسی ایک عورت سے
جو سوچتی بھی ہو، حساس اور ذہین بھی ہو
کہ ایسے مرد کے دامن کی گرد بن جائے۔
[جو کھودتا ہے کنواں گھر میں ٹھنڈے پانی کا
طلب جو کرتا ہے ہوٹل میں پانی چشمے کا
کمیٹی نل پہ بھی اکثر دکھائی دیتا ہے]
اور اُس کے واسطے قسطوں میں خودکشی کر لے - ؟
مجھے یقیں ہے کسی مہرباں لمحے میں
تم اعتراف کرو گے کہ یہ حقیقت ہے
وہ جس کے ساتھ بھی رہتی ہے جتنے عرصے تک
سوائے اس کے اُسے کچھ نظر نہیں آتا
تلاش کرتی ہے وہ بھیڑ میں کوئی چہرہ
کہ جس پہ مہر و وفا کا گمان ہوتا ہو
وہ تھامتی ہے اگر ایسے مرد کا دامن
تو اپنی روح کی سچائیوں کے امرت کو
سموتی رہتی ہے اُس کے بدن کی نس نس میں
جواب میں اُسے ملتے ہیں جھوٹ کے نشتر
جو اُس کے جسم کی ہر رگ میں زہر بھرتے ہیں
وہ تھوڑی دیر تڑپتی ہے بلبلاتی ہے
پھر اپنی روح کی سچائیوں کے بوتے پر
نئے فریب کی باہوں میں جھول جاتی ہے
مرے عزیز، مرے دوست، میرے خیر اندیش
کہا تھا تم نے تو کچھ سوچ کر کہا ہوگا
"وہ کھیلی کھائی سی عورت ہے کوئی دیوی نہیں"
میں اس میں اتنی سی ترمیم کرنا چاہوں گا
'وہ کھیلی کھائی سہی پر گھریلو عورت ہے ـــــ
تمہارے شوشے برحق، تمہارے فتوے بجا
تمہارے اُنس میں تو شبہ و شک ذرا بھی نہیں
مگر یہ دل ہے جو کمبخت سوچتا ہے یہی
مرے اور اس کے سوا کائنات کچھ بھی نہیں

۲۴/۷ - کمرہ جگش، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ایس۔ سورن

اَنا کا المیہ

اُڑتے لمحوں کے خوبصورت پر
نوچ کر رکھ لیے ہیں بٹوے میں
زعم میں، اپنے میں نے سوچا تھا
وقت کی نبض ڈوب جائے گی
گر پڑے گا وہ اپنے منھ کے بل
وقت کی لاش ڈھونڈنے کے لیے
دور تک میں نے اُس کا پیچھا کیا
اپنی آنکھوں میں شوخ طنز لیے
وقت ہنستا ہے، کھلکھلاتا ہے

ایڈیٹر الیکٹرانکس ٹوڈے - ۲-اے - ناز بلڈنگ، لیمنگٹن روڈ
بمبئی ۴۰۰۰۰۴

شریمتی کانا سنگھ

خَلِش

چندر کرنوں سے ماتھا سجا تھا
جسم خوشبو سے دہکا ہوا تھا
اور آنکھوں میں سورج چمک تھی
تب کہا تھا یہ بالو نے 'بٹیا
بولتے ہیں وہ حد سے زیادہ
جن کو کہنا نہیں کچھ بھی ہوتا'

چندر کرنیں رہیں اب نہ خوشبو
آنکھ سورج بھی جب بجھ چکا ہے
دھیان آتا ہے رہ رہ کے مجھ کو
کوئی ساتھی مجھے ایسا ملتا
جس کے دل میں تو ہوتا بہت کچھ
جو زباں سے مگر کچھ نہ کہتا

گرونانک لا - ۵۰۱ - فیز III بی I سیکٹر ۴۰
ایس - اے - ایس نگر، چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۵۹

بشیر بدر

غزلیں



وہ بجھے گھروں کا چراغ تھا، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو
وہ کہاں گیا، اُسے کیا ہوا، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

مجھے جان کر کوئی اجنبی وہ دکھا رہے ہیں گلی گلی
اسی شہر میں مرا گھر بھی تھا، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

کہیں مسجدوں میں شہادتیں، کہیں مندروں کی علالتیں
یہاں کون کرتا ہے فیصلہ، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

مرے پاس جتنی ہے روشنی ہے یہی چراغ کی زندگی
میں کہاں جلا میں کہاں بجھا، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

مرے قاتلوں کی تلاش میں کئی لوگ جان سے جائیں گے
مرے قتل میں مرا ہاتھ تھا، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

وہ تمام دنیا کے واسطے جو محبتوں کی مثال تھا
وہی اپنے گھر میں تھا بے وفا، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

وہ سمجھ کے دھوپ کا دیوتا مجھے آج پوجنے آئے ہیں
میں چراغ ہوں تری شام کا، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

مری زباں پہ نئے ذائقوں کے پھل لکھ دے
مرے خدا تو مرے نام اک غزل لکھ دے

میں چاہتا ہوں یہ دنیا وہ چاہتا ہے مجھے
یہ مسئلہ بڑا نازک ہے کوئی حل لکھ دے

یہ آج جس کا ہے اُس نام کو مبارک ہو
مری جبیں پہ مرے آنسوؤں سے کل لکھ دے

میں اس ہوا کی طرح بارشوں کے ساتھ چلوں
جو ریگزاروں میں تالاب کے کنول لکھ دے

میں ایک لمحے میں دنیا سمیٹ سکتا ہوں
تو کب ملے گا اکیلے میں ایک پل لکھ دے

میں سحر کی پلکوں کو چوم لوں، یہی اعتبار نہیں ملا
میں گھنے درختوں کی شام ہوں مجھے دن کا پیار نہیں ملا

مری دادی ماں کی کہانیوں کے تمام شہر کہاں گئے
مجھے شاہزادی کے دیس میں کوئی شہسوار نہیں ملا

وہ چراغ ہے مری شام کا وہ ستارہ ہے مرے نام کا
مگر اس کو اپنا میں کہہ سکوں یہی اختیار نہیں ملا

یہ محبتوں کی کہانیاں بھی بہت عجیب و غریب ہیں
تجھے میرا پیار نہیں ملا، مجھے اس کا پیار نہیں ملا

جسے بدنصیبی سمجھ رہے ہیں، اسی پہ شکرِ خدا کرو
مجھے شہر بانو نہیں ملی، تجھے شہریار نہیں ملا

انہیں پتھروں کو تراشنے میں تمام عمر گزار دی
مری انگلیوں کو مرے خدا کوئی شاہکار نہیں ملا

یہ نشست ہو کہ مشاعرہ یہ لطیفہ گوئی کا عہد ہے
سبھی قہقہوں کے شریک تھے کوئی غمگسار نہیں ملا

---

۴۴ - مالی پورہ، پیر گیٹ، بھوپال (ایم - پی)



غزلیں



سید احمد شمیم

زندگی کی شام آئی، صبح کی تمنا کیا
اب سفر اکیلا ہے، ہم سفر کا شکوہ کیا

عمر اک مسافت میں ہوگئی بسر اپنی
زرد، سرد سورج کا ڈوبتا نظارہ کیا

طائرِ قفس سے بھی کوئی یہ ذرا پوچھے
رات کا اندھیرا کیا، صبح کا اُجالا کیا

چاندنی، شفق، تارے، سب فریبِ منظر ہیں
عکس عکس جلوہ کیا، آئینے کا پردہ کیا

بند کر لیے اُس نے ذہن و دل کے دروازے
جسم کی صداقت کیا، روح کا تقاضا کیا

لفظ لفظ جب اپنی آنچ سے پگھلتے ہیں
نادکی تمنا کیا، شہرتوں کا سودا کیا

کیوں شمیم کرتے ہو رائیگاں لہو اپنا
لعل کو گہر تم نے یہ بتاؤ پایا کیا

کریم سٹی کالج، جمشید پور (بہار)

سبز موسم کی ہواؤں کا پتا کچھ بھی نہیں
ماسوائے یادِ رفتہ اب رہا کچھ بھی نہیں

ایسا سناٹا کہ جی ڈرتا ہے اپنے آپ سے
یہ سکوتِ دل کہ دھڑکن کی صدا کچھ بھی نہیں

جس کی موجوں سے بدن میں شورِ طوفاں تھا کبھی
وہ لہو اب مدتوں سے بولتا کچھ بھی نہیں

دامنِ مژگاں پہ شبنم وادیٔ دل میں تپش
چاند کو چھونے کی اتنی سی سزا کچھ بھی نہیں

چاندنی آنچل تو اب بھی کھول دیتی ہے مگر
دل میں پہلی دستکوں کا حوصلہ کچھ بھی نہیں

عکس کو جلوہ کہو، جلوہ کو لکھ دو آئینہ
اِک مگر حرفِ انا کے ماسوا کچھ بھی نہیں

زندگی کس موڑ پر لے آئی ہے مجھکو شمیم
دھند سی پھیلی ہے راہوں کا پتہ کچھ بھی نہیں

مسلم شہزاد

تحریر مرے حق میں سفارش کی طرح تھی
تفسیر مگر قتل کی سازش کی طرح تھی

بس چاند جبیں کا ہی نہ دھوکے کی طرح تھا
چہرے کی شفق بھی تو نمائش کی طرح تھی

شاداب وہ کیا کرتی کہ خود آب و ہوا ہی
سبزے پہ کسی دھوپ کی بارش کی طرح تھی

ویران سی، اب خشک جزیرے کی طرح ہے
وہ جھیل، جو پریوں کی رہائش کی طرح تھی

ناراض تھا میں، پھر بھی کشش تھی تری جانب
ناراضگی بھی لب پہ ستائش کی طرح تھی

ہوتی بھی کہاں میری رسائی کہ تری ذات
ہر آن بدلتی ہوئی خواہش کی طرح تھی

شہزاد رویّہ تھا ترا سرد پر اُس کی
تاثیر سُلگتی ہوئی آتش کی طرح تھی

بزمِ کہکشاں، نرکٹیا گنج، مغربی چمپارن (بہار)

حامد اقبال صدیقی



غزلیں

مجھے سفید و سیاہ سے کیا، کہ اس جہاں کو حباب دیکھوں
طلب مری جب کبھی سر اٹھائے تو نور نازل کتاب دیکھوں

کھلی ہوں آنکھیں تو رنگ رلیاں، پلک جھپکتے ہی روزِ محشر
ہیں میرے اعمال مجھ پہ ظاہر کروں میں خود احتساب دیکھوں

یقین سچا ہے مانتا ہوں، گمان بھی ہے بلا کا شاطر
اس ایک سچ کو تلاش کر لوں، صداقتوں کے نصاب دیکھوں

تمام لشکر ہوا ہے باغی، شکست بھی ہے مقدروں میں
کہاں کہاں میں نگاہ رکھوں، فصیل دیکھوں کہ باب دیکھوں

حقیقتیں تھیں پسند اُس کو تو رت جگوں کی مجھے سزا دی
گلاب صبحوں کی خواہشیں تھیں میں چاہتا تھا کہ خواب دیکھوں

یہ موہ مایا کا جال حامد کبھی ہے راحت، کبھی اذیت
جو روح کو مطمئن میں کر لوں تو جسم و جاں پر عذاب دیکھوں

تصور روز ہی اک آدھ منظر کھینچ لیتا ہے
تحیر خواب کی دنیا سے باہر کھینچ لیتا ہے

مداروں سے نکلنے کی ہم اکثر سعی کرتے ہیں
مگر گردش نصیبوں کا محور کھینچ لیتا ہے

ہمارے دل کا سورج اب گھنی شب میں ابھرتا ہے
کھلے دن کی سبھی کرنیں تو دفتر کھینچ لیتا ہے

بکھر جانے کی حسرت اور رشتوں کی محبت بھی
کبھی رستے بلاتے ہیں، کبھی گھر کھینچ لیتا ہے

بدن سے شاہزادی کے میں ساری سوئیاں چن لوں
مگر حالات کا اک دیو خنجر کھینچ لیتا ہے

ایک عالم حصار میں رکھنا
زندگی اختیار میں رکھنا

ناتراشیدگی ہی بہتر ہے
کیوں مزاجوں کو دھار میں رکھنا

جب نہیں خود پہ اعتماد یہاں
پھر کسے اعتبار میں رکھنا

قربتوں کا حساب کرنا جب
دوریاں بھی شمار میں رکھنا

ہاں خزاں کو نہ بھول جانا تم
خشک پتے بہار میں رکھنا

۲۰۲ - ۲۲۸، دینا ناتھ بلڈنگ، تیسری منزل، روم نمبر ۱۲ / ریتی بالو راؤ مارگ، بمبئی ۴۰۰۰۰۴

غزلیں

آر۔ پی۔ شوخ

اَنا وہ خار کہ خوشبو خصال ہو کر بھی — تھکنِ شب تھے، رہا شغل سحر ہونے تک
وہ مجھ کو چبھتا رہا ہم خیال ہو کر بھی — سر ٹپکنا اِسی دیوار میں دَر ہونے تک

ملا نہ کوئی بھی پہلے سا موسموں کے سوا — اُس کی عادت تھی مرے خون کو پانی کرنا
یہ میں نے دیکھ لیا ماہ و سال ہو کر بھی — رنگ کیا کیا نہ اُڑا آنکھ کے تر ہونے تک

ہیں میری بگڑی ہوئی صورتوں کے شہر آباد — اب دوا ہے نہ دعا ہے، نہ مسیحا گویا
بس ایک میں نہ رہا لازوال ہو کر بھی — ہر خدائی تھی مرا خونِ جگر ہونے تک

تمہاری یاد میں جب اشک لہلہاتے تھے — عمر بھر پھر ہے جُدائی کو محبت کہنا
ہرا بھرا تھا یہ دل پائمال ہو کر بھی — دیکھنا بھی ہے زمانے کی نظر ہونے تک

مری غزل کو بھی نِس دن نئے سنگار کی دُھن — اپنی آہیں ہی سُبک گام نہ ہونے دیں گی
تری طرح ہے سراپا جمال ہو کر بھی — پا بہ زنجیر چلو ختم سفر ہونے تک

ترے بغیر مگر اَے سخن شناس مرے — شہر کا شہر ہُوا اب تو تعاقب میں مرے
میں کیا کروں گا یہاں باکمال ہو کر بھی — تیرا جادو بھی تھا مجھ خاک بسر ہونے تک

ہے اُنگلیوں پہ مری ناخنِ ہُنر جب تک — یہ تو میں تھا کہ تراشا ہے ہر اک زخم سے پھول
سکوں نصیب کہاں اندمال ہو کر بھی — ہاتھ کٹ جاتے ہیں ناخن میں ہُنر ہونے تک

شعبۂ انگریزی، ایم۔ این۔ کالج، شاہ آباد، مارکنڈا (ہریانہ) ۱۳۲۱۳۵

دوہے

روی سہار دواج

مَیلا مَیلا مَن ترا، اُجلا تیرا لباس
لگتا ہے اب آگئی دنیا تجھ کو راس

ساگر کا منتھن کیا، کھوجا موتی ایک
اس موتی کے رُوپ سے چھلکے رنگ انیک

سانجھ بھئے دیپک جلے ہنس مرے گھر آئے
چُگ کر موتی آنکھ کے بھور بھئے اُڑ جائے

آئی تیری یاد کی سج دھج کے کل رات
دامن دامن کر گئی چاندی کی برسات

سُوکھی سُوکھی ٹہنیاں پیلے پیلے پات
کرتا ہے پھر بھی شجر ہریالی کی بات

دیکھا اک شعلہ بدن جاگا من میں پیار
شعلوں سے آنے لگی پھولوں کی مہکار

پت جھڑ سے کھیلی کبھی دیکھی گاہ بہار
رہتی ہمیشہ زندگی موسم سے دو چار

میٹھی بانی کا روی کیا لگتا ہے مول
میٹھی بانی بول کے جیون میں رس گھول

۳۴۳/۱۲، جواہر نگر، نیو ریلوے روڈ، گڑگانوں ۱۲۲۰۰۱

جوگندر پال



نہیں رحمٰن بابو

نہیں رحمٰن بابو، ہمیں رونے کی کتنی ہی چاہ کیوں نہ ہو، ہمارے دیدوں میں پانی نہیں پھوٹتا۔ جسے کھل کے رونا نصیب ہو جائے، اُس کے من کی ساری مَیل دھل جاتی ہے اور بدن پھر سے اُجالوں سے پُر ہو جاتا ہے۔ آسمان بھی اسی لیے ایک پورا موسم جی بھر کے رو لیتا ہے رحمٰن بابو۔ اور برس برس کر اتنا شفاف اور سبک ہو جاتا ہے کہ ساتوں پردوں میں صاف صاف نظر آتا ہے۔

نہیں، ہماری یہ قسمت کہاں؟

ہمیں تو یہی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ کہیں نظر نہ آ جائیں۔ ایک دفعہ شلیطان کو خوف لاحق ہوا کہ کوئی روز و شب اُس کی تاک میں لگا ہوا ہے اور نہ صرف اُس کا کیا بلکہ سوچا ہوا بھی اُس پر عین واضح ہوتا ہے پھر کیا تھا وہ اس کی نظر سے اوجھل ہونے کی خاطر جا بجا دوڑتا پھرا۔ اور جب اپنے اس خوف پر حاوی نہ ہو سکا کہ اس پر بندھی ہوئی ٹکٹکی بدستور بندھی ہوئی ہے تو اس سے رہا نہ گیا اور وہ بھی اس کی تاک میں لگ گیا، اور موقع پاتے ہی اُس کے گلے کو دبوچ لیا۔ جو بھی ہوا رحمٰن بابو، اپنی دانست میں شلیطان گلا تو اپنے شکار کا دبوچے ہوئے تھا۔ مگر دم اُس کا اپنا گھُٹ رہا تھا — نہیں رحمٰن بابو۔ ذرا غور کرو، کیا ہم اسی لیے تو خوف زدہ نہیں، کہ اپنے کیے دھرے کو ہم بخوبی جانتے ہیں۔ نہیں، تم نہیں جانتے کہ کسی ایک کو بھی معلوم ہو جائے، خواہ کرنے والے کو ہی، کہ اُس نے کیا کیا ہے تو ساری دنیا کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس نے کیا کیا ہے۔

تمہیں یقین نہیں آ رہا؟ تو میں تمہیں ایک سچا واقعہ سناتا ہوں۔ ایک دن ہمارے شہر کا بڑا بازار اچانک چور، چور کی صداؤں سے گونجنے لگا۔ ایک شخص جو بے چارہ میری تمہاری طرح صرف نیت کا چور تھا۔ گھبرا کر دُم دبا کے بھاگ کھڑا ہوا اور سارے شہر کے ساتھ ساتھ سچ مچ کا چور بھی — سچ مچ کا چور جھوٹ موٹ کے چور کو پکڑنے کے لیے اتنی سرگرمی دکھا رہا تھا کہ دوڑتے دوڑتے وہ جھوٹ موٹ کے چور سے بھی آگے نکل گیا اور یوں سارا شہر آپ ہی آپ سچ مچ کے چور کے پیچھے لگ گیا — سنو نہیں رحمٰن بابو، سمجھو!

مگر ہم کیا کیا سمجھیں۔ سمجھ سمجھ کے ہی تو ہماری ہنسی اُڑ گئی ہے۔ رونے کا مقام ہو تو قبض کے مریض کے مانند زور زور لگا لگا کے بھی رو نہیں پاتے۔ اور کبھی کبھار ہنس دیں تو خیال گزرتا ہے اپنی رونے کی خواہش پوری کر رہے ہیں — ہنس لو رحمٰن بابو، اگر اسی طرح تمہاری رونے کی تمنا بر آتی ہے تو یہ کیا کم ہے کہ انجانے میں ہی سہی، ذرا سا رو لیتے ہو — زمانے نے کیا پلٹا دکھایا ہے کل میں نے اخبار میں ایک عجیب و غریب واقعہ پڑھا۔ کسی مغربی ملک میں ایک نو مولود رات دن سوتے جاگتے بے اختیار ہنستا رہتا ہے۔ پہلے پہل تو ماں باپ کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا مگر اُسے لگاتار اس عالم میں پا کر اُن کا ماتھا ٹھنکا اور وہ اسے اپنے خاندانی ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ مگر ڈاکٹر آج کل شخص کا علاج نہیں کرتے، اُس کی بیماری کا علاج کرتے ہیں، سو ڈاکٹر نے اُنہیں سپیشلسٹ کے پاس بھیج دیا۔ اور سپیشلسٹ نے اپنا یہ سپیشل رول ادا کیا کہ اُنہیں ایک ماہرِ نفسیات کے ہاں بھیجا۔ شروع میں تو ماہرِ نفسیات کی سمجھ میں بھی کچھ نہ آیا۔ مگر کائیاں آدمی تھا۔ بھانپ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ اُس نے بتایا بچہ اپنے پچھلے جنم میں ایک سوانگ کار تھا۔ اور ڈائرکٹر کی ہدایت پر اپنے آپ کو خوش دکھنے کے لیے ہمیشہ ہنسنے کی مشق کیا کرتا تھا اور یوں عادتاً

۲۰۴ - منڈکنی انکلیو، نئی دہلی

ہنس ہنس کر رونا بھول گیا۔ اتنا بھول گیا کہ رونے کے موقعوں پر بھی قہہ قہہ ہنستا چلا جاتا۔ مرتے وقت وہ اسی اضطراب میں مبتلا تھا اور رونے کی چاہ سے بے قابو ہو کر دھاڑ دھاڑ ہنس رہا تھا اور خدا رحم کرے اسی حالت میں وہاں نرم تو ڑ کر یہاں پیدا ہو گیا۔

"نہیں رحمٰن بابو، ہنسو نہیں ——— نہیں، ہنس لو ——— ہنس ہی تو رہے ہو ——— یا کیا پتہ، تم بھی اس بچے کی مانند رو رہے ہو ——— ہاں، مجھے تم ہو بہو وہی لگ رہے ہو ——— نہیں بابو، اُس نومولود کی عمر دراصل وہی ہے، جس عمر میں اُس نے اپنے پچھلے جنم میں وفات پائی ——— ہاں، بے چارہ پیدا ہی ادھیڑ عمر میں ہوا۔ میری بات کو مذاق میں مت ٹالو بابو، مگر نہیں، من میں گدگداہٹ ہو رہی ہو تو ہنسی روک کے رکھنے سے سر بھاری ہو جاتا ہے اور اسٹھائے نہیں اُٹھتا جس سے آدمی آس پاس سے غافل ہونے لگتا ہے ——— نہیں بابو، باخبر ہوئے بغیر بے خبری کی نعمت عطا نہیں ہوتی۔ ہنستے کھیلتے آنکھیں کھُلی رہتی ہیں، اس لیے کھُل کے ہنس لو ——— نہیں یہ تو ابتدا ہے۔ آگے آگے دیکھنا بچے پیدائش پر ہی اتنے کھوسٹ ہوں گے کہ رونے کے بجائے بے تحاشہ ہنستے چلے جائیں گے۔ کل ہی ٹیلی ویژن پر ایک بچے کی تصویر دکھائی گئی تھی ——— تم نے بھی دیکھی تھی؟ ——— نہیں، زیادہ سے زیادہ پانچ چھ برس کا چھوکرا ہوگا ——— کہتے ہیں ابھی سے علم ریاضی کا ہر مسئلہ چٹکیوں میں حل کر لیتا ہے۔ مانو پیدا ہی اسی لیے ہوا ہو کہ جینے کی بجائے علم ریاضی کے مسائل حل کرتا رہے۔ جینا تو اولین طور پر جینے کے لیے ہے رحمٰن بابو۔ ذرا غور کرو، اگن کچے کچے نہ ہوا اور جھاڑ سہج سہج نہ پکے تو او نچا کیسے ہو اور جیے کیسے؟ سارا جینا اگر پیدا ہوتے ہی ہو لیا تو پھر باقی رہ ہی کیا گیا جس کے لیے کوئی جیتا رہے؟

تم جانتے ہو رحمٰن بابو، گزشتہ سال امریکہ سے میری پوتی اپنے والدین کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ ہاں، یہی کوئی پندرہ سولہ سال کی ہوگی۔ میں اُس سے پہلی بار مل رہا تھا۔ اس لیے بیٹے اور بہو سے بھی زیادہ مجھے اُس سے ملنے کا چاؤ تھا ——— ائیرپورٹ پر میں نے اُسے دیوانہ وار سینے سے لگا لیا اپنے کپڑوں کی تہہ جماتے ہوئے وہ مجھ سے الگ ہوئی تو میں نے اُسے بتایا، میں تمہارا دادا ہوں۔ ——— مجھے معلوم ہے ——— اس نے نہایت متانت سے جواب دیا۔ میں تمہاری پوتی ہوں دادا تو ظاہر ہے تم میرے دادا ہی ہو گے ——— اس بالی عمر میں بھی وہ اتنی منع کوش تھی کہ اس سے کوئی اٹکل پچل بات کر کے میں شرمندہ سا ہو کے رہ جاتا ——— اتنا سوچا مت کرو بیٹی ——— ایک بار نا معلوم کس موڈ میں، میں اُسے رائے دینے کی ہمت کر بیٹھا۔ تمہیں کس نے بتایا ہے گرین پا، کہ میں سوچتی رہتی ہوں؟ سوچنا وچنا سب غیر ضروری ہے ——— نہیں، گرین پا، مجھے کچھ نہ بتاؤ، مجھے سب معلوم ہے اور جینے جاننے سے میں اتنی بور ہو چکی ہوں کہ چپکے سے خودکشی کر لینے کو جی چاہتا ہوں۔

سُن رہے ہو رحمٰن بابو، ہماری اولاد نے بس اتنا ہی جینا ہوتا ہے۔ اُسے سن کر مجھے تو لگا گویا میری دادی مرحومہ گویا ہیں ——— بہت ہو لیا گرین پا، اب مجھے جی کے کرنا ہی کیا ہے؟ ——— میرے ماں باپ کو ——— میری بوڑھی پوتی کے تیور ملاحظہ کرو رحمٰن بابو، فرماتی ہیں ——— میرے باپ ماں کو عیش و عشرت سے فرصت نہیں کہ مجھے ایک نظر دیکھ بھی لیں۔ باقی رہ گئے تم گرین پا، تو تم تو ہی ناسمجھ تم سے کیا اُمید باندھوں؟ مطلب یہ، رحمٰن بابو، کیا پتہ، گرین پا، بالغ ہو کر تم اپنی اولاد سے بھی نالائق نکلو ——— ہہ ہا ہہ ——— ہہ! ——— رحمٰن بابو، ہمارے بچے اس لیے پیدا ہوتے ہی اپنا سارا جینا پورا کر لیتے ہیں کہ انہیں کسی اور کو جینا نہیں ہوتا۔ بس ایک اپنا ہی جینا ہوتا ہے۔ سو وہ تو کوکھ سے برآمد ہوتے ہی جی لیا ——— نہیں رحمٰن بابو، جینے کا سلسلہ تو رابطوں سے بندھتا ہے۔ رابطے نہ ہوں ——— ارے سیدھی سی بات ہے۔ این ٹینا ہی نہ ہو تو بریانڈ نیو ٹیلی ویژن سیٹ ہو یا ٹوٹا پھوٹا ٹین کا ڈبہ، ایک ہی بات ہے۔ نو بہ نو تو کوئی بھی ہوتا ہے جب نئے نئے رابطوں کی بدولت از سرِ نو ہوتا رہے۔ نہیں بابو، آج کل تو بچوں سے مل کر یہی احساس ہوتا ہے کہ ہم ابھی بچے ہیں۔ وہ تو پیدائش پر ہی کہنہ سال تھے اور پچھلے جنموں کا شعور بھی۔ اس ڈر سے ڈھلائے کہ انہیں کوئی جھکہ نہ دے پائے۔

نہیں رحمٰن بھائی، اگر تم چاہتے ہو کہ بچوں کی ہڈیاں کھینچا تانی میں تڑخ نہ جائیں تو ان کے لیے کبھی یہ دعا نہ مانگو وہ راتوں رات بڑے ہو جائیں انہیں سال بہ سال غیر محسوس طور پر بڑا ہونے دو۔ شعور؟ ——— دیکھ تو رہے ہو، ہمارا ایڈیٹس رس کتنا ضرر مند ہوتا ہے۔ بچہ اپنی بے بسی کے باوجود ہمک ہمک کر جوان نہ ہو اور جوان لاشعوری طور پر جھوم جھوم کے بوڑھا، تو انسانی شعور میں اعتبار اور محبت کا خاصہ شامل ہونے سے رہ جاتا ہے ——— ہاں بابو، اسی لیے تو انسان بے تامل نیوکلیائی ہتھیار بناتا چلا جا رہا ہے۔ نہیں، شعور نصاب اور ہدایت کی بازیافت نہیں۔ رحمٰن بابو: صحیح انسانی شعور لازماً واردات کی دین ہے ——— نہیں بابو، تم خواہ مخواہ اللہ میاں سے شکایت کرتے رہتے ہو کہ بڑا ہونے تک ——— تم بڑا نہ ہو پائے اور عین ساٹھویں برس میں ساٹھ کے ہوئے۔ میری نصف عمر پیچھے کا ذکر ہے کہ میرا چھوٹا سالا ولایت سے بیرسٹری کر کے لوٹا۔ وہ ہر وقت سر پر سفید بالوں کا وگ پہنے رکھتا تھا۔ اور چہرے مہرے کا میک اپ کر کے یہاں وہاں دو ایک جھریوں کا تاثر بھی پیدا کر لیتا تھا۔ اگر ہم کبھی اُسے اس کی اصل جوان شکل میں جا لیتے تو اُسے بڑی وحشت ہوتی اور بات چیت سے پہلے وہ اپنے میک اپ روم کی طرف دوڑتا ——— یہ کیا تک ہے بھئی؟ ہم تو تیس میں بیس کے نظر آنے

کی دوا کھاتے رہتے ہیں ــــــ آپ کی بات اور ہوگی۔ مجھے جب محسوس ہوتا ہے کہ میں بوڑھا اور بڑا اخرانٹ ہوں تو مجھے اپنے آپ پر بھروسہ ہونے لگتا ہے ــــــ مگر بھئی، بھروسہ تو اوروں پر کیا جاتا ہے ــــــ رحمٰن بابو، میرا سالا بڑا ہوتے ہوتے اس لیے چھوٹا ہوتا چلا گیا کہ اس کا سارا بھروسہ ایک اپنے ہی دم سے تھا ــــــ نہیں، رحمٰن بابو، فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اوروں پر بھروسہ کریں۔ بچپن میں اگر ہم اپنی بڑائی کو ماں سے اور جوانی میں محبوبہ سے تعبیر نہ کریں تو ہم بڑے ہو کر بھی ادنیٰ اور کوتاہ رہ جاتے ہیں۔ اوائل کی لاعلمی میں ہم جو علم سمیٹتے ہیں، اسی سے ہم میں اواخر کے صدموں کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے اور ہم پر قیام گاہ کا دروازہ کھلتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو ہم بھی ایک جنم سے دوسرے میں بھٹکتے رہیں اور ہر جنم پہ ہم تو بلک بلک کر رو رہے ہوں۔ مگر ہمارے والدین جامے میں پھولا نہ سمائیں کہ ہمارے منہ پر ہنسی کی پھلجھڑیاں چھوٹی ہوئی ہیں۔

نہیں، رحمٰن بابو، ہنسنا محض ہنس دینے سے نہیں ہو جاتا۔ میں نے باقاعدہ علم شماریات کو کام میں لا کے دریافت کیا ہے کہ کوئی نوّے فی صد سے بھی زائد لوگ ہنستے ہوئے اور سب کچھ کر رہے ہوتے ہیں۔ صرف ایک ہنس نہیں رہے ہوتے۔ کوئی ورزش کر رہا ہوتا ہے۔ کوئی حساب کتاب کوئی گڑبڑ رہا ہوتا ہے اور کوئی فکر میں ڈوبا ہوتا ہے، یا رو رہا ہوتا ہے۔ تم حیران ہو گے کہ ان نوّے فی صد میں نصف سے بھی زائد اُن نومولودوں کے مانند آہ و زاری کر رہے ہوتے ہیں۔

میرا ایک دوست ہے رحمٰن بابو۔ بلیتہ ورمسخرہ ہے۔ بے چارہ بڑا دُکھی آدمی ہے۔ بیوی اُسے آخری عمر میں چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ رہنے لگی ہے۔ اُس نے دنیا بھر کے لطیفے ازبر کر رکھے ہیں اور اپنے ہر شو میں اس قدر ہنساتا ہے کہ سننے والوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ اور وہ بھول سے جاتے ہیں کہ وہ تو ہنس رہے تھے۔ اور انجانے ہی انجانے میں شو کے اواخر تک سسکیاں بھرتے رہتے ہیں ــــــ نہیں رحمٰن بابو، انہیں پاگل کیوں سمجھتے ہو؟ ــــــ نہیں، جیسے بھی راحت نصیب ہو جائے۔

میرا ایک اور دوست تھا۔ 'تھا' اس لیے کہ دو سال پہلے اُس کی موت واقع ہو گئی ــــ عبیب بلڈ پریشر کا مریض تھا۔ ڈاکٹر اُسے ہر وقت خوش رہنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ مرتے دم تک وہ طبّی رائے پر اتنی سختی سے کاربند رہا کہ عزیز ترین احباب کوئی بپتا لے کر آ پہنچتے تو انہیں سن کر اتنا خورسند نظر آنے لگتا گویا کوئی بڑی اچھی خبر کانوں میں پڑی ہو۔ اور تو اور، اپنی بیمار بیوی کو بھی اُس نے طویل مدت کے لیے میکے بھیج دیا تاکہ ہائے ہوئے سے سابقہ نہ پڑے اور جب اچانک اُسے ایک دن اپنی بیوی کی موت کا تار ملا تو وحشتِ غم سے پورا منہ کھول کے وہ تا دیر ہنستا رہا۔ حتیٰ کہ اُس کے اسٹاف کو شک گزرنے لگا کہ ہو نہ ہو کوئی گڑبڑ واقع ہو گئی ہے۔

نہیں، بابو، گڑبڑ دراصل یوں واقع ہوئی ہے کہ نئی زندگی کے نئے پن پر اصرار کر کر کے ہم سبھوں نے اپنے خون کا دباؤ بڑھا لیا ہے ــــ ہاں اس قدر بڑھا لیا ہے کہ اپنے طبع زاد جذبوں کی تشناخت پر قدرت کھو بیٹھے ہیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ خوش ہے یا ناخوش، شرمندہ ہے یا مفتخر، محبت کرتا ہے یا نفرت۔ بس جو کوئی جو کچھ بھی کرتا ہے وہ اپنے ڈاکٹروں، استادوں اور پیشواؤں کی ہدایت پر یا ہدایت میسّر نہ آنے پر دیکھا دیکھی کیے جاتا ہے۔ اور اس عمل میں اُسے یہ نہیں سوجھتا کہ اُس کی اپنی خوشی کیا کر لے اور کیا نہ کرنے میں مضمر ہے ــــــ نہیں، بابو، ہمیں اپنے ہونے کی خبر اپنے غم و غصہ، شادمانی، شرمندگی، صعوبت، نفرت یا محبت سے ہوتی ہے۔ مگر ان وابستگیوں کی ذمہ داری قبول کر کے ہم اپنے امن میں خلل پیدا کرنا نہیں چاہتے اور معقول معاوضے پر کاروباری ایجنسیوں کی خدمات حاصل کر لیتے ہیں۔ ہمارے ایجنٹ نہایت مستعدی سے ہماری محبتیں اور نفرتیں نبھا لیتے ہیں۔ ہمارے لڑائی جھگڑے کر لیتے ہیں۔ خوشیاں منا لیتے ہیں اور ہماری طرف سے شرمندہ بھی ہو لیتے ہیں۔

میرے آنکھوں کے ڈاکٹر نے مجھے بتایا رحمٰن بابو، کہ اُس کے پاس ایک مریض آیا اور سراسیمگی سے شکایت کرنے لگا۔ مجھے آئینے میں اپنی شکل نظر نہیں آتی ڈاکٹر ــــ ڈاکٹر اُسے آئینے کے سامنے لے گیا اور مریض کو نفی میں سر ہلاتے ہوئے پا کر اُس کی آنکھیں ٹیسٹ کرنے لگا۔ آنکھوں کو صحیح پا کر ڈاکٹر نے اُس کی پیٹھ تھپکی ــــــ تمہاری آنکھیں بالکل درست ہیں ــــــ مگر مجھے ــــــ ارے بھئی، جاؤ ٹھیک ہو۔ اگر تمہارا وجود شیشے میں جا گھسا تو تم کہاں رہو گے۔ جاؤ! ــــــ مگر ڈاکٹر مجھے اپنے وجود میں بھی اپنا آپ محسوس نہیں ہوتا ــــــ تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں بھائی؟ کسی پرائیویٹ سراغ رساں سے رجوع کرو ــــــ

نہیں بابو، میری سنجیدگی پر شبہ مت کرو۔ جو شخص اپنی فوری وابستگیوں کے احساس سے عاری ہو جائے وہ ہوتا ہی کہاں ہے جو کہیں ہو۔ اوروں کو چھوڑو۔ میں تمہیں آپ بیتی سناتا ہوں۔ ایک دن نا معلوم کیوں کر مجھے اچانک احساس ہوا میں اپنے بچّوں کی ماں سے محبت کرتا ہوں۔ اس غیر متوقع احساس پر میری باچھیں کھل گئیں۔ اور میں خوشی سے لڑکھڑاتا ہوا بے جھجک اپنی بیوی کے بیڈروم میں جا گھسا۔ وہ ناراض ہونے لگی کہ میں دروازہ کھٹکھٹائے بغیر اندر کیوں آ گیا ہوں ــــــ نکلو! بھلی لوک سنو تو ــــــ میں ــــــ میں تم سے بے انتہا محبت کرتا ہوں ــــ وہ ٹھٹھا ہنس پڑی ــــــ

بیٹھو! آؤ کرو محبت ـــــ تم حیران ہو گئے رحمٰن بابو۔ میں نے دماغ پر بہت زور ڈالا۔ مگر مجھے بالکل یاد نہ آ رہا تھا کہ اپنی عورت سے محبت کیسے کی جاتی ہے ـــــ میں اپنا سا منھ لے کر اُس کے بیڈ روم سے نکل آیا اور اپنے بیڈ روم میں پہنچتے ہی سونے کی دو گولیاں حلق سے اُتار لیں۔ اور ہانپتے ہوئے بستر پر چت ہو گیا۔

نہیں رحمٰن بابو، یہ بات نہیں کہ میری بیوی اور میں آپس میں جھگڑتے ہیں۔ جھگڑا بھی ہو تو شاید ہمیں ایک دوسرے کو منانے کی خواہش بے چین کرنے لگے۔ ہماری مشکل شاید یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے کارآمد نہیں رہے۔ تعلقات منظم سہولتوں میں سمٹ آئیں تو جذبوں کی لَو نہیں رہتی ـــــ طلاق؟ ـــــ گزشتہ سال امریکہ سے ہمارا بیٹا یہاں آیا تھا تو اُس نے بھی ہمیں یہی مشورہ دیا تھا ـــــ دیکھو ڈیڈ ـــــ! اور ممی! آپ دونوں اپنی ذمہ داریاں نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے چکے ہیں۔ اب اگر ایک دوسرے کے کام کے نہیں رہے تو مزے سے ایک دوسرے سے الگ ہو جاؤ اور چین سے رہو ـــــ نہیں رحمٰن بابو، مجھے اپنے بیٹے کے مشورے کی صحت پر شک نہیں۔ جب جذبوں کی لَو ہی نہ رہے تو کون بیوی؟ کون باپ؟ کون بیٹا؟ کون کیا؟ ـــــ مگر جب میں سونے کی دو گولیاں لے کر بستر پر دراز ہو جاتا ہوں اور دراز ہوتے ہی سو جاتا ہوں۔ تو خواب میں میری آنکھوں سے پردے اُٹھنے لگتے ہیں۔ اور میں ننھا منا سا میں، اپنی ماں کی کھلی کھلی گود میں ہمکنے لگتا ہوں اور ہمکتے ہمکتے پتہ نہیں کیا سوچ کر ایک دم چیخ چیخ کر رونے لگتا ہوں۔ اور میری ماں مجھے بھینچ بھینچ کر چپ کرانے لگتی ہے۔ اور اچھال اچھال کر گالوں سے گال جوڑ لیتی ہے۔ چھاتی کھول کر میرے منھ میں ٹھونس دیتی ہے۔ اور رحمٰن بابو، کیا بتاؤں ایک پورا موسم برس برس کر مجھے اپنے سات پردوں میں چین آ جاتا ہے۔ اور آکاش کھل جاتا ہے اور میری آنکھ بھی، اور میں اپنے آپ کو بڑا سرل، ٹھیک اور نیلا اور گیلا محسوس کرنے لگتا ہوں اور میرا گدگدایا ہوا جی چاہنے لگتا ہے کہ میں ایک ایک کو مخاطب کرنے کی خواہش کی تسکین کر لوں۔ اور میں بے اختیار اپنے آپ کو پکارنے لگتا ہوں ـــــ رحمٰن بابو! ـــــ رحمٰن بابو! ـــــ رحمٰن ب ـــــ! ـــــ

بقیہ: بی بی کی نیاز

ہذیانی کیفیت کے دوران سید نذر عباس حیدر عرف حیدو میاں نے جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ کارخانے کے لوگوں نے آخری منزل پہنچایا ـــــ امّاں صاحب بُت بنی بیٹھی رہیں نہ روئیں نہ چلّائیں۔ جنازہ اُٹھنے لگا تو پاس جا کر سر پر ہاتھ رکھا، پیشانی چومی اور موٹی موٹی آواز میں بولیں۔

"جا بیٹا جا پیچھے سے آتی ہوں۔ دیر نہیں کروں گی۔"

چوتھے دن وحید میاں کنبے کے ساتھ واپس لوٹے خبر سن کر بہت رنجیدہ ہوئے۔ امّاں صاحب کی کوٹھری میں گئے۔ سمجھ میں نہ آیا۔ کیا کہیں کیا نہ کہیں۔

"امّاں صاحب ـــــ"

"ہاں بیٹا۔"

"بہت افسوس ہوا۔" وحید میاں کی آواز لڑکھڑا گئی۔

"افسوس کیسا بیٹا میں نے تو بی بی کی نیاز مانی تھی۔ اب تم آ گئے ہو تو تم ہی کرا دو پیسے میرے پاس ہیں۔"

وحید میاں نے کچھ کہنے کو منہ کھولا تو جلدی سے بولیں "نا بیٹا نا۔ منّت کی نیاز، مجلس میلاد پرائے پیسوں سے نہیں کیے جاتے۔ یہ میری کمائی کے پیسے ہیں۔"

"پیسوں کی بات نہیں امّاں صاحب۔ میں تو یہ پوچھ رہا تھا ..... وحید میاں ہونقوں کی طرح امّاں صاحب کو دیکھنے لگے جو ٹین کی صندوقچی میں روپے ٹٹول رہی تھیں۔

"ہاں بیٹا کبھی منّت مانی تھی کہ بدنصیب کی مٹّی منزل میرے سامنے ہو جائے تو حضرت بی بی فاطمہ کی نیاز دلواؤں گی۔" اُن کا لہجہ انتہائی پُرسکون تھا۔ گہری آنکھیں براہ راست وحید میاں کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں ـــــ رعشہ زدہ ہاتھوں سے اُنھوں نے چند مڑے تُڑے نوٹ وحید میاں کو تھمائے۔

پڑوس کی مسجد سے جہاں چند دن پہلے بخار میں تپتا حیدو نہ جانے کہاں سے آ کر بیٹھ گیا تھا۔ مغرب کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔ شام کے سائے بلند ہوئے اور بسیرا لیتی چڑیوں کی آوازیں بھی ـــــ وحید میاں پتّے کی طرح تھر تھر کانپنے لگے۔

کُرید

"تمہیں ٹوٹ کر چاہا کہ تم کچھ تو
ن سکو۔ مگر تم جانے کیا سوچ کر نہیں کیا،
ہی گنوا بیٹھے۔"
بات اس سے آگے کبھی نہیں بڑھ سکی۔
ں کہ اتنا کہنے میں ایک سیکنڈ نہیں، ایک
ی گئی۔ اور لگا کہ ساری دشائیں دھوئیں
موگئی ہوں۔ یہ سب کون کہہ رہا تھا۔ کون
رہا تھا۔ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔
آکتاہٹ بڑھتی جا رہی تھی کہ اس سے
بھی ملو، وہ بس اسی انداز میں شروع ہو جاتا:
"تمہیں ٹوٹ کر چاہا کہ تم کچھ تو اپنے
و، مگر تم نہ جانے کیا سوچ کر نہیں کیا، خود
نوا بیٹھے۔"
میری اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی کہ
نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ بات تو صرف اتنی
ی ناکہ وہ دوست۔ شاید نہیں۔ وہ کوئی دور
قاتی بھی تو ہو سکتا ہے:۔
"آپ نے مجھے کتنے پیار سے ڈھکیل
ا۔ بڑا کیا اور بہترین تعلیم بھی دلوائی"
"ٹھیک ہے۔ یہ سب بالکل درست
ہے شاید۔ یعنی تم میرے بیٹے ہو۔ لیکن اس
سے فرق بھی کیا پڑتا ہے۔ کیا تمہیں مجھ سے دلچسپی
ہے اور تم یہ سب کچھ لاویس اینجلز میں بیٹھ کر کیوں
کہہ رہے ہو۔ اب میں تمہیں جواب میں کیا یہ لکھوں
کہ میری بیٹھ ٹیسیں، میری پچھلی پسلیوں میں اتنا
شدید درد ہوتا ہے کہ میں گھنٹوں اٹھ بیٹھ بھی
نہیں سکتا۔
"صاحب، آپ نے دوا نہیں کھائی۔
کون سی ٹکیہ دے دوں؟"
نوکر جاہل ہے اور میرے لیے اس
کو اشارے سے بتانا بھی مشکل ہے کہ یہ دو
اور وہ دو۔
"سر! آپ کی دعاؤں سے اور آپ
کی شفیق نگرانی میں ۔ اور آپ کے قیمتی مشوروں
سے میں نے جو مقالہ تیار کیا تھا۔ اس پر مجھے
پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری مل گئی ہے؟"
"تم میرے شاگرد ہو۔ اس میں خوشی
محنت کی کیا بات! بس اتنا ہے کہ شکریہ کا
جو احساس تمہارے اندر جاگا ہے۔ اس کو جگائے
رکھنا:۔
"سر ایک بات کہوں۔ آپ کو تو اچھی
خاصی تنخواہ ملتی ہے نا۔ آپ نے تو اب تک
اچھا خاصا بینک بیلنس کر لیا ہوگا۔ اس میں سے
کچھ....."
"سن رہے ہیں جی! آج سارے بچے
فاروقی صاحب کے یہاں ریشما کی سالگرہ
پر جا رہے ہیں۔ بچے خالی ہاتھ تو نہیں جائیں
گے نا۔ پچیس روپے کا کوئی ہلکا سا تحفہ خرید لیا
جائے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"
"اچھا سر، اب اجازت دیجیے۔"
میں نے اسے کب دیکھا تھا۔ ذہن پر
کچھ زور ڈالا جائے تو شاید یاد آ جائے۔ گاؤں
کے گھر کے ایک کمرے میں لالٹین کی ہلکی سی مدھم
روشنی میں اس کے چہرے کی ایک جھلک دیکھنے
کی تمنا آج پوری ہو رہی تھی۔ باہر آنگن اور
اوسارے میں قہقہے اور گیت کی ملی جلی
دھنوں کا اُجالا تھا،

موہے نیناں ملائے کے۔ موہے نیناں
ملائے کے۔
گوری بہیاں ہری رنگ چوڑیاں ــــ
موہے نیناں ملائے کے

صبح ہوتے ہوتے روشن دان سے دن کے
اُجالے نے جھانکنا شروع کیا تھا۔ اس نے صرف
اتنا ہی کہا تھا کہ اب صبح ہو چکی ہے۔

۔ شمس الہدیٰ روڈ، کلکتہ ۱۷...،

"تو تم ہی بچوں کو لے کر چلی جاؤ۔ یہ
~~[illegible] میں گھر پہ ہی رہوں گا۔"~~
"نہیں، آپ کو بھی ولیمے کی دعوت
میں جانا ہے۔ آپ کو تو کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔"
"ہاں! ٹھیک یاد دلایا تو یہ پچاس
روپے اور رکھ لو۔ ڈاکٹر ندیم کے لڑکے کے لیے
بھی کوئی مناسب سا تحفہ خرید لینا۔"
"پھر ایک روز یہ بھی ہوا کہ اس نے
بہت عقیدت کے ساتھ اپنی انجنیئرنگ کی
ڈگری میرے پیروں میں لاکر ڈال دی۔"
~~[illegible] آپ نے اپنی ضرورتوں~~
کو کاٹ کاٹ کر مجھے پڑھایا۔ اس لائق بنایا
کہ [illegible] اپنے مستقبل کو سنوار سکتا ہوں۔"
میں نے پھر اکتاہٹ محسوس کی کہ
[illegible] مجھے [illegible] ہے
"[illegible] مجھے غلط نہ سمجھو [illegible]
[illegible] ایسا [illegible] کہ تم [illegible]
[illegible] کس طرح زندگی بننے کی
کوشش کی ہے [illegible]
"[illegible] اپنا فرض نبھایا ہے۔ تمہاری
[illegible] تم نے یہ سب کر کے کوئی
احسان [illegible] ہے [illegible]
[illegible] اور [illegible] کے
[illegible] زندگی [illegible]
[illegible]
[illegible] تم نہایت [illegible] مقصد
[illegible]
کیا ہے تمہارا؟"
"میری باتیں بالکل صاف ہیں۔
میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ دوسروں پر
بھی [illegible] احسان [illegible] کر رہی ہیں۔ کچھ دوسروں
کے بھی تو فرض ہوا کرتے ہیں [illegible]
[illegible]
آخر [illegible] رہا [illegible] گیا۔ اور میں
نے اسے [illegible] دے کر [illegible] کیا لیکن
جب وہ چلا گیا تو مجھے محسوس ہوا کہ [illegible] مجھے

اس کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں کرنا چاہیے تھا۔
~~شاید وہ کہیں سچ ہو۔ لیکن ایسا ہے کہ اگر تیاگ~~
کے بدلے کچھ چاہا جائے تو تیاگ کہاں ہے۔
چلتے رہو، چلتے رہو۔ سبھوں کے لیے چلتے رہو
اور چلتے چلتے وہ راکھ ہو گیا تو اس کو [illegible] نے
ایک روز کریدنے کی کوشش کی۔ میں نے یہ
سوچ کر کہ شاید وہ کہیں [illegible] بچارہ گیا ہو
میں خود ہی اس کے گھر پہنچ گیا۔
دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ پیتل کی نیم پلیٹ
پر اب بھی ڈاکٹر خلیل چودھری ایم۔ آر۔ سی۔ پی
~~(لندن) [illegible] کا کثر نام ابھی تک~~
اپنی چمک نہیں کھویا تھا۔ جب میری دستک پر
بھی اندر سے کوئی جواب نہیں ملا تو میں نے ایک
[illegible] کیا اور دروازہ کھل گیا۔ [illegible]
[illegible] زندگی [illegible] اپنے
[illegible] پھٹے پرانے [illegible] میلے کچیلے کپڑوں
میں [illegible] سامنے تھے۔ اندر کا نام کرسی
بھی اور وہ تھا گویا سب ٹھیک ٹھاک
تھا۔ کمرے کی دیواروں کا پلاسٹر جگہ جگہ سے
اکھڑا ہوا تھا۔ چاروں طرف تاک شلف پر
بے ترتیب کتابوں کا ڈھیر تھا۔ میں سوچ رہا تھا
کہ اس نے کتنا [illegible] دوسروں کی طرح میرا
بھی کبھی یہ اندازہ تھا کہ اس نے لاکھوں کی
جائیداد بنائی ہوگی۔ مگر ایسا کچھ نہیں تھا
بلکہ ہوا یہ تھا کہ اس نے اپنی ساری دولت
[illegible] کے خطوط اور اخبار میں چھپی کچھ
تعریفی تحریریں جمع کر رکھی تھیں۔ یونیورسٹی اس
کی شکرگزار تھی کہ [illegible] بلاک کے مرکزی
[illegible] پر آج بھی سنگ مرمر کی تختی پر یہ عبارت
[illegible] ڈاکٹر خلیل چودھری کے
مالی تعاون سے تعمیر شدہ" اور بنگال میڈیکل
کالج میں ایمرجنسی وارڈ کی تعمیر بھی اسی کے نام کی
رہین منت تھی۔
[illegible]
تو یہ سمجھا اب تک جانے کیا سوچ کر میرے

یہاں آتا رہا تھا۔ شاید بڑوں [illegible] ایک
~~[illegible] اس کی [illegible] کیا کرتا تھا۔ اور ہم~~
بھی کر جاتا تھا۔ ہم دونوں کی عمروں میں کافی فرق
تھا۔ یہی کوئی چالیس سال کا فرق رہا ہوگا۔
اس کے باوجود وہ میرے یہاں آکر اپنی یادوں میں
مجھے شریک کرنے کی کوشش کرتا۔ جیسے میں اس
کا تنہا ہمراز رہا ہوں۔
یہ ٹھیک ہے کہ اس نے کافی دولت کمائی
تھی اور عیش و آرام کی زندگی بھی گزاری تھی۔ کھیل
کر رہا بھی تھا۔ مگر اب وہ اپنی اس آخری زندگی
~~میں بکھرے ہوئے دو تاریک اور گندے کمروں~~
میں سمٹ چکا تھا۔ تنہا تھا۔ اندر سے اور باہر
سے بھی۔ شاید اب اس کو اپنی موت کا ہی ایک آخری
انتظار رہ گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھا بھی نہیں۔
ایسا لگا کہ وہ سارے ردِ عمل کے اظہار کی بھی قوت
کھو چکا ہو۔ اس کو اس حالت میں دیکھ کر اپنے
آپ کو ملامت کرنے کو جی چاہا کہ اس کو [illegible]
گھر خواہ مخواہ میں کیوں آگیا۔ مجھے نہیں آنا چاہیے
تھا شاید۔ میں کچھ دیر تک اس کو دیکھتا رہا۔ پھر
[illegible] اس کو [illegible] رہا۔ پورے [illegible] پر اپنی
سی نظر ڈالی [illegible] میں نے ایک فیصلہ کیا اور
اچانک واپسی کے لیے جیسے ہی مڑا تو ایک ڈوبی
ہوئی سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی:
"اب کیوں آئے ہو؟"
مجھے اس نے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔
اس کے باوجود میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ
گیا۔ اس نے مجھے گھورتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا اور
پھر پوچھا:
"کیوں آئے ہو؟"
"بتانے آیا ہوں کہ لاوڈن [illegible] سے تمہارے
پوتے نے میرے بیٹے کو خط لکھ کر بتایا ہے کہ وہ
چین جاتے ہوئے دلی بھی آئے گا۔ اور دلی میں
اس کا قیام صرف [illegible] کے لیے ہوگا۔ میرا بیٹا
اس سے ملاقات کے لیے کل کی فلائٹ سے دلی

ذکیہ مشہدی

بی بی کی نیاز

[illegible]

مرزا اسلم بیگ آگے آگے اپنی کھڑکھڑاتی سائیکل پر اور پیچھے پیچھے سفید برقعے میں ملفوف وہ خاتون، میاں جان محمد کے رکشے میں۔ گود میں آٹھ ماہ کا دُبلا پتلا مریل بچہ جو معلوم ہوتا تھا کہ ابھی پیدا ہوا ہے اور وہ بھی قبل از وقت۔ چھوٹی سی گوری چٹی تین سالہ بچی بغل میں دبکی ہوئی، تازہ چھدی ناک میں سیاہ ڈورا، کانوں میں چاندی کی ننھی ننھی بالیاں۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں ایک چادر میں بندھا چنگیر، ڈولہ کم گٹھری تھا۔

لکھوری اینٹوں سے بنے اس چھوٹے سے مکان کے نچلے حصے میں صاحب خانہ مرزا نصرت بیگ کا لمبا چوڑا کارخانہ پھیلا ہوا تھا۔ اوپر ان کا کنبہ رہتا تھا۔ اوپر جانے کے لیے گھر کے بغل میں بڑی لمبی اور پتلی راہداری تھی۔ اس کے اختتام پر ایک زینہ تھا اور پھر زینہ۔ اسلم بیگ نے سائیکل روک دی۔ رکشے والا بھی رُک گیا۔ انہوں نے کچھ شہروانی کی جیب سے نکال کر رکشے والے کو پیسے دیے۔ گھبرائی ہوئی خاتون کو راہداری کے دروازے پر لا کھڑا کیا۔ اور بولے "بی بی، میرا کام ختم [illegible]

اب تم اوپر جاؤ، کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ سب تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ [illegible] ہے کہ اماں صاحب کا اشتیاق بے طرح [illegible] پہلے مکان میں پہلا داخلہ۔ اس وقت وہ اماں صاحب نہیں تھیں۔ گوری چٹی، بڑی بڑی روشن آنکھوں والی، دراز قد، گورے رنگ، دُبلی پچیس سالہ خیر النساء بیگم، دختر سید امیر علی مرحوم، زوجہ سید ذوالفقار علی مرحوم۔ [illegible] ذوالفقار علی بھی اٹھائیس برس کی عمر میں دوسرے بچے کی پیدائش کے چھ مہینے پہلے مرحوم و مغفور ہو چکے تھے۔ جہیز میں ان کی سسرال والوں کی بساط خانے کی چوکی کا لی تھی۔ شوہر بھی اسی پر بیٹھا کرتے تھے۔ ان کے مرنے کے بعد خیر النساء بیگم کو ترکے میں کچھ نہ ملا۔ کچھ گوٹا، چکن کی لیس کے بکسے، دوکان، ایک بیمار [illegible] سنگھی، ایک جوئیں نکالنے والی لکڑی کی کنگھی حاصل ہوئے۔ باقی دُکان یعنی نند کے شوہر کے [illegible] کو انہوں نے [illegible] بند کر دیا۔ [illegible] کہ باقی زندگی کیسے گزرے گی۔ [illegible] کوئی سہارا نہیں تھا اور سسرال میں [illegible]

آنکھ اٹھا میں میدانِ کربلا نظر آتا۔ ایسے آڑے وقت میں مرزا اسلم بیگ کی بیوی فرشتۂ رحمت یعنی "مشکل کشا" بن کر سامنے آگئیں۔ یہاں کے ایک دور کے عزیز نصرت بیگ کے یہاں خیر النساء بیگم کی خدمات کی ضرورت تھی۔ شہزادوں کا کام تو بیٹھا گھرانا تھا۔ گھر کی بہو کے یہاں جڑواں بچے پیدا ہوئے تھے لیکن دودھ خشک ہو گیا تھا۔

اوپر پہنچ کر خیر النساء بیگم گود کے بچے اور بیٹی کو مع گٹھری بازوؤں کے گھیرے میں سنبھالے زمین پر بیٹھنے لگیں تو خاتونِ خانہ یعنی مرزا نصرت بیگ کی بیوی نے انہیں ہاتھ پکڑ کر اوپر بٹھا لیا اور بولیں "بی بی، آلِ رسول ہو کر زمین پر بیٹھو گی تو ہمارے گناہ کیسے بخشے جائیں گے۔ پہلے بیٹھو" خیر النساء نے جھجکتے ہوئے آنسو پونچھے [illegible]

[illegible] بی بی۔ خاتون خانہ نے ان کی گود کی طرف غور سے دیکھا۔ [illegible]

[illegible] "جاؤ [illegible]" [illegible] وال [illegible] سوچ [illegible]

"ہم کو کوئی شکایت نہ ہوگی" خاتونِ خانہ نے ملازمہ کی طرف پان بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ کے یہاں عزت آبرو کے ساتھ میرے معصوم یتیم بچوں کی پرورش ہو جائے گی تو تمہارا احسان مند ہوگا، شکایت کیسی۔" انہوں نے بڑے عزم کے ساتھ اپنی ٹھہری آنکھیں اور لانبی پتلی گردن گھما کر ادھیڑ عمر، مہربان خاتون کی طرف دیکھا —— "ہاں ہماری تین شرطیں ہیں۔"

"وہ بھی کہہ ڈالو بی بی۔"

"پہلی بات تو یہ کہ ہم صاحبزادوں کو صرف دودھ پلائیں گے۔ ہم سے گو موت کرنے کو نہ کہا جائے۔ دوسری یہ کہ ہم پردہ دار ہیں، گھر سے باہر جانے اور سودا سلف لانے کا کام ہم نہیں کریں گے۔ گھر کے اندر آپ جو چاہیں، کروائیں، ہمیں سب کام آتے ہیں۔ تیسری بات یہ کہ —— ان کی گردن تھوڑی اور بلند ہو گئی۔ ہم پر وقت پڑا ہے تو نکلے ہیں۔ ہماری سات پشتوں میں بھی کسی عورت نے نوکری نہیں کی تھی۔ ہم دائی یا آیا نہیں ہیں ہمارا نام خیرالنسا ہے۔"

"اچھا خیرالنسا بیگم ——" خاتونِ خانہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "یہ جو بیٹھی ہیں ہماری بہو، خیر سے ہماری بھتیجی بھی ہوتی ہیں۔ اللہ آمین کر کے شادی کے سات برس بعد ان کی گود ہری ہوئی لیکن دودھ پلانے کی سعادت اللہ کو دینا منظور نہ تھی۔ اب اولاد کی اتنی خدمت بھی نہ کریں گی تو ماں کا درجہ کیسے پائیں گی۔ گو موت ان کے ذمے۔ باقی شرطیں بھی ہمیں منظور ہیں۔ سودا سلف لانے کو تو ہم یوں بھی نہ کہتے۔ بلاقن عرصے سے کرتی چلی آ رہی ہے۔"

خیرالنسا بیگم کو ان کی کوٹھری دکھا دی گئی۔ یہ دراصل ایک اچھا خاصا بڑا سا کمرہ تھا۔ جو مکان کی پشت پر الگ تھلگ بنا ہوا تھا ——

تھوڑی دیر بعد گھر کی ملازمہ جو وضع قطع سے بجبر دیہاتی معلوم ہوتی تھی، ان کے لیے کھانے کی سینی لے کر آئی —— پراٹھے، کوفتے، ارہر کی دال، باریک سفید چاول، ایک گلاس بالائی دار دودھ گود کے بچے کے لیے گائے کا دودھ الگ۔ ایسا خوانِ نعمت تو کبھی شوہر کی زندگی میں بھی نہیں سجا تھا۔ لہنگا پھڑکاتی، ناک میں سونے کی چوڑی کا لونگ چمکاتی بلاقن انہیں کینہ توز نظروں سے گھورتی واپس چلی گئی —— وہ کہہ رہے تھے ہم اپنی بہن کو لے آویں۔ مگر سیدانی کا دودھ پلوائیں گی۔ ہونہہ۔ اللہ نے چاہا تو سوکھا ہو جائے گا لڑکوں کو۔"

رات کے کھانے پر خاتونِ خانہ نے دن کی پوری داستان صاحبِ خانہ کے گوش گزار کی۔ وہ بڑا مسرور تھا۔ آج دونوں ننھے پوتوں نے پیٹ بھر کر عورت کا دودھ پیا تھا اور عورت بھی کیسی کھری سیدانی۔ دن بھر ریں ریں کرتے رہتے تھے۔ پانی جیسے دست چلے آتے تھے۔ اور رات کو نیند بھی نہیں آتی تھی۔ آج آرام سے سو رہے تھے۔ صاحبِ خانہ نے کھانا کھا کر ڈکار لی —— سونے کی خلال سے دانت کریدے اور چاندی کے خاصدان سے گلوری نکالتے ہوئے بڑے سنجیدہ لہجے میں بولے: "آپ اماں بیگم کہلاتی ہیں۔ بی بی خیرالنسا سے کہہ دیجیے کہ بچے بڑے ہوں گے تو انہیں "اماں صاحب" کہیں گے۔"

خیرالنسا گھر میں یوں رچ بس گئیں جیسے بطخ پانی میں۔ محفوظ مستقبل اور گھر والوں کے اچھے سلوک کی وجہ سے طبیعت مطمئن تھی۔ غذا اچھی مل رہی تھی کہ دودھ اترے۔ دودھ دھاروں دھار اتر رہا تھا۔ بچہ ایک ہی ہوتا تو چھدو میاں (جو کان چھید کر منت کا دُر پہنائے جانے کے سبب چھدو کہلاتے تھے) کو بھی مل جاتا خیر کوئی فکر نہیں تھی۔ انہیں گائے کا خالص دودھ مل رہا تھا اور وافر مقدار میں مل رہا تھا۔ اس لیے وہ بھی پہلے جیسے سوکھے مارے نظر نہیں آتے تھے۔ خوب موٹے ہو گئے تھے۔ ہاں دس گیارہ ماہ کے ہو جانے کے باوجود وہ بس پڑے رہتے تھے۔ نہ زیادہ روتے نہ غاؤں غاؤں کرتے۔ بیٹھنا بھی نہیں شروع کیا تھا۔ غریب کا بچہ ہے اس لیے سمجھ دار ہے۔ روئے دھوئے گا تو ماں دو اور بچوں کو کیسے سنبھالے گی" خیرالنسا ہنس کر بڑی ممتا کے ساتھ کہتیں۔

بچوں نے بولنا شروع کیا تو خیرالنسا کو اماں صاحب کہلوایا گیا۔ میٹھی توتلی آواز میں جب وہ انہیں اماں صاحب کہتے اور ٹھمک کر ان کی گود میں آتے تو انہیں لگتا کہ جس دیانت داری کے ساتھ انہوں نے اپنے بچوں کو اوپر کا دودھ پلا کر، غیر کے بچوں کو اپنے جسم کا لہو دیا تھا، اس کا صلہ مل گیا ہے۔ رفتہ رفتہ سیاہ بالوں اور اُجلے کپڑوں والی خیرالنسا سبھی کے لیے اماں صاحب بن گئیں۔

بچے ڈھائی سال کے ہوئے تو دودھ بڑھائی کی رسم بڑی دھوم دھام سے کی گئی۔ تیاریاں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک دن بلاقن نے آنکھیں مٹکا کر کہا "اب کھیر النسا کہاں جئیں۔ نہ ہو تو کوئی تو گھر میں جھاڑو برتن کے لیے رکھوا دیا جائے ——"

خاتونِ خانہ ہتھے سے اکھڑ گئیں "ضرورت ہو تو انسان کو دوہ لیا جائے اور اس کے بعد نکال کر باہر کر دیا جائے۔ خیرالنسا یہیں رہیں گی۔ ہاں خود کہیں جانا چاہیں تو اور بات ہے ——" وہ بھلا کہاں جاتیں۔ دودھ پلانے کے علاوہ گھر میں بہتیرے کام تھے۔ گھر کی دونوں خواتین کو انہوں نے ساری فکروں سے آزاد کر دیا۔ تیج تہوار، آئے دن خاندان کے شادی بیاہ، چھٹی چھلے، کارخانے کے عملے کا خیال، کپڑے لتے، باورچی خانہ، دونوں ننھے بچوں کی ساری ضروریات، میاں کا حقہ، چھوٹے میاں کے حکیم کے کشتے، ساس کا خضاب، بہو

کی مہندی ۔ بیٹی فخرالنسا ساتھ ساتھ سائے کی طرح لگی رہتی اور کاموں میں ہاتھ بٹاتی۔ دونوں بچوں نے بھاگنا دوڑنا اور گیند سے کھیلنا شروع کر دیا تھا ۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملے بھی بڑی روانی سے ادا کرنے لگے تھے ، لیکن ان کا ہم عمر چھدو ایک گوشے میں بیٹھا رہتا تھا ۔ کبھی کبھی وہ کھڑکی پکڑ کر کھڑا ہو جاتا اور باہر کی دنیا کو اپنی وحشت زدہ ویران آنکھوں سے تکتا رہتا۔

کوئی چھ مہینے بعد اماں صاحب پر انکشاف ہوا کہ چھدو نارمل بچہ نہیں ہے ۔ اس عمر میں بھی وہ اماں ، بڑی بیگم ، چھوٹی بیگم جیسے الفاظ کے علاوہ بہت کم الفاظ روانی کے ساتھ بول سکتا تھا ۔ جملوں کی ادائیگی میں اسے دقت ہوتی تھی ۔ چلنے میں تھوڑا لڑکھڑاتا تھا اور اس کی سمجھ میں کوئی بھی بات جلدی نہیں آتی تھی۔ بڑی بیگم کی تاکید تھی کہ ان کے پوتوں کو جب ماسٹر صاحب پڑھانے آتے ہیں ، چھدو بھی ان کے پاس بیٹھے ، لیکن چند دنوں بعد ماسٹر صاحب نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ یہ لڑکا پڑھ نہیں سکے گا یا کم از کم ابھی تو نہیں پڑھ سکے گا ۔ مرزا نصرت بیگ نے صاحبزادے کو ہدایت کی کہ چھدو کو کسی ڈاکٹر کو دکھائیں ۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق چھدو پیدائشی ذہنی پسماندگی (Mental Retardation) میں مبتلا تھا ۔ اس میں اصلاح یا بہتری کی گنجائش تقریباً نہیں کے برابر تھی۔

بڑے مرزا صاحب نے اماں صاحب کو پردے کے پیچھے بلایا اور شفقت آمیز لہجے میں بولے ۔

" بی بی ، خبر اچھی نہیں ہے ۔ کلیجہ مضبوط کر کے سنیئے ۔"

پردے کے پیچھے کھڑی خیرالنسا تھر تھر کانپنا کیں پھر دھیرے سے بولیں ۔" ہماری قسمت ۔" اللہ تعالیٰ نے بیٹا دیا تھا ۔ ہم سمجھتے تھے بڑھاپے کا سہارا بنے گا ۔"

" بی بی ، ہمارے خاندان کے چراغوں کو آپ نے نئی زندگی دی ۔ سعید اور وحید نے آپ کا دودھ پیا ہے ۔ بڑھاپے کی فکر آپ نہ کریں ۔ ہاں عزیزی چھدو کی اس ذہنی حالت کا رنج ہونا فطری ہے ۔" وہ چاندی کی موٹھ والی چھڑی ٹیکتے اٹھ کھڑے ہوئے ۔

اماں صاحب اس گھر میں رچ بس کر بھول گئی تھیں ۔ خوش و خرم رہا کرتی تھیں ۔ لیکن اب چھدو کی طرح ایک رنج دل میں آ بسا تھا ، چھدو کے چاروں طرف منڈلاتی رہتی تھیں ۔ ہر کام سے ذرا سا وقت بچا کر اس کے پاس آ جاتیں ۔ رات کو دیر تک اس سے باتیں کرتی رہتیں ۔ حدیث و قرآن سناتیں ۔ اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کی کرامتوں کی باتیں کرتیں ۔ ان کا خیال تھا کہ بچے کا ذہن ان سے روشن ہوگا ۔ جب چھدو سو جاتا تو بھی جاگتی رہتیں ۔ اور اس پر دعائیں دم کرتی رہتیں ۔ ذہن میں بے چینی کا طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ۔ بڑے مرزا نے کہہ تو دیا کہ وحید اور سعید ان کے بڑھاپے کا سہارا بنیں گے ، لیکن چھدو خود ـــــ ؟ خود وہ اپنے لیے کیا کر سکے گا ؟ کیا کبھی اس کا اپنا گھر بار ہوگا ؟ کیا وہ کبھی اپنی روزی روٹی کما سکے گا ؟ اس کے بڑھاپے کا سہارا کون بنے گا ۔ اور اماں صاحب ـــــ مانا گھر میں دو روٹیاں مل رہی ہیں اور عزت بھی اور رہنے کو جگہ بھی ہے ۔ لیکن دل کا کشکول تو پھر بھی خالی ہی ہے ۔ یہ سوچ کر آتی تھیں کہ پرائی چاکری عارضی بات ہے ۔ اللہ نے بیٹے سے نوازا ہے ۔ ایک دن دوبارہ ان کی اپنی مملکت ہوگی ۔ جہاں وہ راج کریں گی ۔ ایک جھونپڑا سہی ، مگر اپنا ۔ بیٹے بہو کی ہنسی اور پوتے پوتیوں کی کلکاریوں سے گونجتا ، وہ سارے خواب مٹی میں مل گئے ۔ روز رات کو مٹی ملے یہ خواب بستر پر کانٹے بکھیر جاتے لیکن پھر کسی پہر نیند آ ہی جاتی اور صبح پھر سے زندگیوں ہی معمول دوڑنے لگتی ۔

چھدو بڑا ہوا تو نیچے جانے لگا ۔ کبھی کبھی اس کے ہاتھ میں پیسے دے دیے جاتے کہ آس پاس کی دکانوں سے کوئی معمولی سا سودا لے آئے یا ٹھیلے والے سے پھل یا سبزی ـــــ اماں صاحب بولتیں تو بیگم صاحب کہتیں ـــــ انائی بیوی پڑھ لکھ نہیں سکتا تو کم از کم دنیا کا علم تو ہونے دو ۔ آنچل تلے چھپا کر رکھو گی تو اور باؤلا ہو جائے گا ۔ بات تو اپنی جگہ صحیح تھی ، لیکن وہ نیچے جاتا تو کارخانے کے کارکن اس کو چھیڑتے ۔ " ابے چھدو ، ذرا زبان تو دکھا " چھدو پھاڑ سا منہ پھیلا دیتا ۔ کوئی کہتا ۔" او میاں چھدو پہلے مرغی ہوئی تھی کہ انڈا ـــــ ذرا بتاؤ تو ۔" چھدو احمقوں کی طرح ہنسنے لگتا اور پہلے مرغی ہوئی تھی کہ انڈا کی گردان کرتا ۔ اور یہ پھبتی اور اماں صاحب کی جان ضیق میں ڈال دیتا ۔ " بتائیے پہلے مرغی ہوئی تھی کہ انڈا ۔ کبھی کبھی تو چھوٹی بیگم بھی منہ پھیر کر مسکرانے لگتیں ۔ ایسے میں اماں صاحب کو بڑی تکلیف ہوتی ۔

ایک دن چھدو بلاقن کے ساتھ نیچے اترا تو کسی کارندے کی رگِ شرارت پھڑکی ۔ کہہ دیا ۔ " اماں یہ تمہاری جورو ہے ۔" جورو کا لفظ چھدو کو نہ جانے کیوں بھا گیا ۔ اکثر وہ بلاقن کی طرف دیکھتا تو کھیسیں نپور کر کہتا جورو ـــــ چھدو کی جورو ـــــ ایک دن بھنا کر بلاقن نے ایک تھپڑ رسید کر دیا ۔ ٹھنڈے مزاج والی مسکین اماں صاحب آندھی طوفان بن گئیں ۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان ایسی آگ بھی اگل سکتی ہے ۔ بلقیس مغلظات پر اتر آئی ، تو خاتونِ خانہ کو دخل انداز ہونا پڑا ۔" اے ہے بلاقن ۔ کمبخت چپ ہو جا ۔ شرم نہیں آتی تجھے ۔ دکھیا باؤلا ہے ۔ اسے اتنی عقل کہاں ۔ کسی نے سکھا دیا ہوگا ۔ بے سمجھے

سمجھ میں آتا ہے [illegible] [illegible]
دیکھا باؤلا ہے یہ الغصہ اللہ اللہ [illegible]
کو چھوڑ کر منتظر ہو گئے [illegible] بھی گزار
بدمزاجی ایک حرام ہو رہتے [illegible]
اور ان کا لڑکا [illegible] بیٹا [illegible] اور ان
انہوں نے کھانا نہیں کھایا [illegible] گھر ہو کر
گلے لگا کر [illegible]

[illegible] گزر گیا کہ
اماں صاحب [illegible] خطاب [illegible] لگا [illegible]
رہا کرتی تھیں [illegible] کے بال بھی جلد سفید
ہونے لگے تھے [illegible] چہرے پہ [illegible]
تھیں [illegible] اور صاحب خانہ [illegible]
جنت [illegible] ان کی جگہ بیٹے [illegible]
بہو نے [illegible] سعید [illegible] جوان ہو گئے
اماں صاحب کی [illegible] کی شادی [illegible]
مرزا صاحب نے اپنی زندگی [illegible]
کے [illegible] شریف [illegible]
تھے [illegible] کی اعلیٰ تعلیم کے
لیے [illegible] دے دی
سبھی اپنی [illegible] اس لیے وحید میاں
کی شادی [illegible] کے [illegible] ارمان
پورا [illegible] کہاں کہاں [illegible]
[illegible] جیسی [illegible]
اور [illegible] ہیں
پھول دلہن خطاب ملا [illegible]

[illegible] پھول دلہن کو معلوم
ہوا کہ اماں صاحب دولہا میاں کی کھلائی
رہ چکی ہیں [illegible] دار نہیں ہیں
انہوں نے اماں صاحب [illegible]
انکار کر دیا [illegible] اماں صاحب [illegible]
کو [illegible] کہاں [illegible]
انہوں نے [illegible] سکیں
نہ سکیں۔ وحید میاں نے سمجھایا [illegible] اماں [illegible]
پر راضی ہو گئیں [illegible] صاحب [illegible]

نہیں تھا [illegible]
[illegible] گھر میں ان کا عمل دخل بڑھا تو [illegible]
چھوڑ کے اندر آنے [illegible] لگا دی گئی [illegible]
[illegible] صبح [illegible] دیکھ لو تو
کھانا نہ ملے [illegible]
" ایسے نہ کہو پھول دلہن۔ [illegible]
ہے بد نصیبی [illegible]
[illegible] آگئی [illegible] بنا بیٹی
تیرے کس [illegible] سید ہوئے تھے"
[illegible] بلقیس [illegible] گھر کی پرانی [illegible]
لگی ملازمہ تھی [illegible] ابھی [illegible] بنا بیٹی ہوں
یا [illegible] رشتے میں [illegible] ولید
ہوتے ہیں۔ میاں نے ان کا [illegible]
ہے پھر وہ [illegible] ولید [illegible]
ارے ہمارا [illegible] ولید [illegible] میری [illegible]
[illegible] دیکھ [illegible] خدا نخواستہ
شیطان [illegible] میرے ولید [illegible]
ہونے لگے [illegible] ہمارے [illegible]
کے [illegible] دوڑ [illegible] گی مردار [illegible] بلقیس [illegible]
اثر نہیں ہوا [illegible] کرتی [illegible]
اماں صاحب کے کلیجے میں [illegible] جیسے [illegible]
بنتے چلے گئے [illegible]

[illegible] حکیم کو تو [illegible]
واسطے کا بیر ہو گیا۔ صورت سے [illegible] ولید
والے [illegible] کی طرف ان کا دھیان پہلے کبھی [illegible]
گیا تھا۔ [illegible]
ہو [illegible] گیا تھا [illegible]
تعلیم [illegible] دنیا والوں کا [illegible]
حالات کی [illegible] کہ [illegible]
مرزا صاحب [illegible] اماں صاحب کو [illegible] پہلے
معقول [illegible] کرتے تھے اور [illegible] کی
کمی نہ [illegible] ایک [illegible]
میں [illegible] کبھی [illegible]
بلیاں [illegible] کی [illegible]

با [illegible] امال صاحب
کی منتوں [illegible] کو آئی نہیں
ہوتا تھا [illegible] اپنی
پھول دلہن کی نظر [illegible]
[illegible] کو دیکھتے [illegible]
ذہن میں آنے لگتا تھا [illegible]
[illegible] ہو [illegible]
اور [illegible] ایک دن باوجود منع کرنے
کے وہ ان کے [illegible] گھس گیا تو جوتی لے کر
پل پڑیں [illegible] اماں صاحب [illegible]
اب [illegible] پھول دلہن کی نظروں سے دور رکھنے
میں مصروف ہو گئیں [illegible]
دیکھتے ہی چیل کی طرح [illegible] اور [illegible]
واپس [illegible]
رہنا ہی [illegible] وحید میاں کی شادی کے بعد
گھر کا کام [illegible]
پھر پھول دلہن [illegible]

وقت کا [illegible] ایک [illegible]
بڑے ہونے لگے [illegible]
صاحب نے [illegible] کی پیدائش
کے بعد [illegible]
بیٹے کے [illegible] اولاد [illegible] وحید میاں [illegible]
یا [illegible]
سے [illegible] ماں کے [illegible]
بھاگ کر "اماں جہاں [illegible]
رضا [illegible] اللہ اور اس کے رسول
نے [illegible] ماں [illegible]
سے کیسے انکار کر سکتی تھیں کہ ان کے دولہا
اماں صاحب کے [illegible] بیٹے تھے۔ اماں صاحب
نے گو موت والی شرط بھلا دی۔ بھلا [illegible]
[illegible] ایک دن بچوں کے
لیے [illegible]
[illegible]
رکھنے والی شرط تھی۔ اب کیا [illegible] ہو گیا

بیٹی کا سسرال سے خط آیا ہے۔ اس کی لڑکی
[illegible]

کے قریب عالم ... چڑھائی پر کچھ ... پہنچا
طوائفیں رہا کرتی تھیں اور کچھ ہیجڑے۔ وہ
[illegible] کی طرح منہ پھاڑے ... کھڑا ہوا تھا
ایک ہیجڑا اس کے ساتھ کچھ فحش مذاق کر رہا
تھا۔ [illegible]

اماں صاحب کی سانس پھولنے لگی تھی۔
[illegible]

چھینٹے شروع کر دیے۔ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں
پونچھتی جاتی تھیں۔

"ابے چھدو اس میں مرچیں زیادہ ڈال دی
ہیں چاٹ والے نے۔ جا اور ... ڈلوا کے لا۔"
بڑے [illegible]
ابے او احمق الذی، مجھے ... چاٹ ... ہے۔
جا ایک پتہ اور بنوا کے لا۔" چھدو نے حکم کی تعمیل کی۔
"ابے میرے لیے مرچیں کیوں کم ڈلوائیں۔
[illegible]
جا پھر دوڑ نیچے۔"

[illegible]

مگر کا زخم بھرنے میں مہینوں لگ گئے [illegible]
[illegible]

وہ کبھی نہیں بھرا۔ ہمیشہ رنج کرتی رہیں۔ یہ میری
وجہ سے گرا میرا چھدو۔ میں نے کبھی ڈانٹا نہیں تھا۔
اس دن ڈانٹ کھانے سے بوکھلا گیا۔"

اماں صاحب اب دن میں ایک [illegible]
[illegible] تھا کہ چھدو
وہاں کہیں پھر تو نہیں پہنچ گیا۔ جب تک گھر
نہ آجاتا، جلے پیر کی بلی کی طرح گھومتی رہتیں۔ جیسے
جیسے اس کی عمر بڑھ رہی تھی وہ اپنا زیادہ وقت باہر
[illegible]
جا رہی تھی۔ اکثر اماں صاحب کو نوالے بنا کر منہ
[illegible]

عظیم اختر



من کہ : سامعِ اردو ایوارڈ یافتہ

ہمارے یہاں اردو اخبارات میں قومی اور بین الاقوامی سیاسی خبریں کم اور تعزیتی، تہنیتی جلسوں، مشاعروں، شعری نشستوں اور شادی بیاہ کی خبریں اور جنسی دوائیوں کے اشتہارات زیادہ چھپتے ہیں۔ جن کو اخبارات کے ہمارے اور آپ جیسے سنجیدہ اور بلند نظر قارئین ایڈیٹر بیچارے کی کالموں کو بھرنے کی مدیرانہ مجبوری اور صحافتی ضرورت سمجھتے ہیں اور سرسری نگاہ ڈالنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ لیکن کبھی کبھی یہ مدیرانہ مجبوری اور صحافتی ضرورت دوسروں کے لیے دردِ سر بن جاتی ہے۔ ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا ــــ صاحبو! ہوا یوں کہ جب میر و غالب اور ذوق و مومن کی اس بستی کی کچھ ادبی انجمنوں اور نیم ادبی تنظیموں نے مشترکہ طور پر ایک خاص تقریب منعقد کر کے ہمارے محلے کے ایک وثیقہ نویس کو "خادمِ اردو" کے اعزاز سے نوازا۔ ایک خوب صورت سی شیلڈ اور گیارہ سو روپے کا چیک نذر کیا اور اخبارات کے مدیرانِ کرام نے اپنے اخبارات کے خالی کالموں کو بھرنے کے لیے اس پروگرام کی تفصیلی خبر اور وثیقہ نویس صاحب کی تصویریں شائع کیں تو ہماری نصف بہتر نے اس پروگرام کی خبر پڑھ کر محاورتاً نہیں بلکہ ہماری آنکھوں کے سامنے سچ مچ اخبار نچاتے ہوئے نہایت ہی غصیلے لہجے میں کہا ــــ "اردو نواز صاحب، آپ نے یہ تصویر دیکھی۔ اس کو کہتے ہیں کچھ کر کے اور بن کے دکھانا۔ دن بھر کچہری میں لوگوں کی درخواستیں اور وثیقے لکھتے ہیں۔ شام ہوتے ہی گھر آ کر بیوی کے ساتھ گھر کا سارا کام کاج کرتے ہیں۔ اردو کا اخبار بھی ہمارے یہاں سے منگا کر پڑھتے ہیں۔ اس پر خادمِ اردو کا خطاب اور گیارہ سو روپے مل گئے۔ شہرت الگ ملی۔ ایک تم ہو کہ اردو کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود بچوں کو اردو میڈیم اسکول میں بھرتی کرا کر کسی گھر کا نہیں رکھا۔ خطوں پر ہمیشہ اردو میں پتے لکھتے ہو جو اللہ جانے پہنچتے بھی ہیں یا نہیں۔ مشاعروں اور سمیناروں سے لے کر شاعروں اور ادیبوں کے تہنیتی اور تعزیتی جلسوں میں شرکت کرتے ہو۔ اخبارات و رسائل میں تمہارے بھیجے ہوئے لطیفے اور پسندیدہ اشعار بھی چھپتے ہیں۔ ہر مہینے بیس پچیس روپے کے اردو رسالے اور کتابیں خریدتے ہو۔ یہ خادمِ اردو کا خطاب اور گیارہ سو روپے تو تم ہی کو ملنے چاہئیں تھے۔ لیکن تم کو پوچھتا ہی کون ہے۔ میں کہتی ہوں اب بھی آنکھیں کھولو اور ہوش کے ناخن لو، بہت ہو چکی اردو نوازی۔ دفتر سے آ کر گھر میں رہا کرو اور وثیقہ نویس صاحب کی طرح گھر کے کام کاج میں میرا ہاتھ بٹایا کرو یا بچوں کو انگریزی پڑھایا کرو۔

صاحبو! اس قسم کی باتوں کو عام طور پر جلن اور حسد پر محمول کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی اپنی نصف بہتر کی ان باتوں کو عورتوں کے روایتی حسد اور جلن پر محمول کر کے ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے اڑا دیا، لیکن جب ہماری نصف بہتر نے ان باتوں کو کئی بار دہرایا۔ اٹھتے بیٹھتے ہماری ادب دوستی اور اردو نوازی پر طنز کرنا شروع کر دیا اور بین السطور ہمیں طعنے دینے لگیں تو یقین مانیے ہمیں بھی احساس ہونے لگا کہ ہماری نصف بہتر کا شکوہ بجا ہے۔ وثیقے نویس صاحب تو صرف وثیقے لکھتے ہیں یا گھر گرہستی کے کاموں میں ایک فرماں بردار شوہر کی طرح اپنی بیگم کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ شاعر ہیں نہ ادیب۔ مشاعروں وغیرہ میں اتفاقیہ طور پر بھی کبھی نہیں جاتے۔ شعر و ادب سے کوئی علاقہ نہیں۔ ادبی لوگوں سے دوستی تو کجا معمولی سی صاحب سلامت بھی نہیں۔ ان کا نام وثیقے کے علاوہ آج تک کہیں اور چھپا ہوا نہیں دیکھا۔

C-105 منشور مارکیٹ کامپلیکس، نئی دہلی
شکیل، نئی دہلی

ے اخبارات ورسائل بھی اُردو میں ہم وس سے پڑھتے ہیں۔ ان کے پیچھے بھی اردو کے ، بچی سے واقف نہیں۔ لیکن اس کے دخادم اردو کے خطاب اور گیارہ سو ، سے نوازدیا گیا۔ جب کہ ہم فنافی الاردو میں کی بقا کے لیے ہم نے خاندان والوں کی بھرپور ت کے باوجود اپنے بچوں کو اردو میڈیم اسکول اخل کر رکھا ہے، جہاں ہمارے بچے ٹاٹ ں پر بیٹھ کر تختیاں لکھتے ہیں۔ ادھر ہم نے ں دن بھر اردو کی موٹی موٹی کتابیں رسالے یں یا خالی وقت میں اپنے دفتر کے ساتھیوں یہ اشعار یا رومانی نظمیں سنا کر اردو کو روزانہ ن ایج فروغ دیتے ہیں۔ اور شام شہر کے ں اور شاعروں کے ساتھ کسی چائے خانے میں گزارتے ہیں تاکہ یں جمود طاری نہ ہو۔ اردو کی بقا اور ترویج ے پچھلے سال سے مشاعروں، سمیناروں قسم کی ادبی نشستوں سے لے کر قوالی اور ائیکی تک کے پروگراموں میں باقاعدگی رکت کر رہے ہیں۔ پچھلے چار دنوں میں کتنے مشاعروں میں شرکت کی۔ اس کا اندازہ تو خود ہمیں بھی نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ آج تک دلی اور اس کے قرب وجوار ہونے والا کوئی بھی چھوٹا بڑا مشاعرہ ہم نے ■۱۱ نہیں کیا۔ ہماری ادب نوازی کا م ہے کہ چھوٹی بڑی ادبی نشستوں اور مشاعروں میں ہمیں بلائے یا نہ بلائے بس اطلاع ملنی ہے، خود ہی پہنچ جاتے ہیں اور آخر وقت رے صبر و سکون سے بیٹھے رہتے ہیں۔ ع شروع میں تو مشاعروں اور ادبی پروگراموں ز منتظمین اور شعراء ہمیں سی آئی ڈی کا ہ سمجھ کر مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے اور ہم سے ند دُور ہی رہتے۔ ہم اگر کسی اچھے شعر پر ی دیتے تو شعراء کرام اس احتیاط سے شکریہ تے کہ گویا رشوت لے یا دے رہے ہوں۔

ممکن ہے ہماری شکل وصورت اور بغل میں دبی ڈائری کو دیکھ کر کچھ لوگ آج بھی ہمیں اس محکمے کا کارندہ سمجھتے ہوں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ادبی لوگوں میں پھیلی ہوئی یہ عام غلط فہمی اب بڑی حد تک دُور ہو گئی ہے۔ اور اب ہم شہر کے علمی اور ادبی حلقوں میں سخن شناس، شعر فہم اور ادب دوست سمجھے جاتے ہیں۔ اکثر ادیبوں اور شاعروں سے دوستانہ مراسم ہیں۔ بہت سے شعراء حضرات ہماری سخن شناسی اور شعر فہمی کے قائل ہیں اور مشاعروں میں غزل پڑھتے ہوئے باقاعدہ ہمارا نام لے کر ہمیں شعر بھی نذر کرتے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے اب تک مشاعروں اور ادبی نشستوں میں سیکڑوں اشعار ہماری نذر کیے جا چکے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمیں کئی سو اشعار اور درجنوں غزلیں ازبر یاد ہیں۔ دعویٰ کرنا تو مناسب نہیں۔ کیوں کہ دعویٰ کرنے سے غرور اور تکبّر کی بُو آتی ہے۔ اور خدا اور رسول کو کسی انسان کا غرور اور تکبّر پسند نہیں۔ اس لیے ہم زور دے کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ بیت بازی کے مقابلے میں ہم سے کوئی جیت نہیں سکتا۔ لیکن کیا کریں ہمارے یہاں بیت بازی کے مقابلے ہوتے ہی نہیں۔ حالانکہ اردو کے تحفّظ اور فروغ کے لیے بیت بازی کا سستا اور فقیری نسخہ سب سے زیادہ کارگر، مفید اور موثر ثابت ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ ہمارے یہاں ہر موقع پر شعر پڑھنے اور آج کی عوامی زبان میں شعر بولنے کا اس قدر رواج ہے کہ ٹرک چھاپ عطار بھی خفیہ امراض کے لیے تیر بہدف دوائیاں بیچتے ہوئے اشعار سناتے ہیں۔ تہنیتی رقعوں، شادی کے دعوت ناموں اور تعزیتی خطوں پر ہی نہیں بلکہ بسوں، اسکوٹروں اور ٹرکوں پر بھی ہر طرح کے اشعار پڑھنے کو ملتے ہیں بلکہ اکثر ٹرکوں اور بسوں پر کسی شاعر کی بیاض کا گمان ہوتا ہے۔ تکیہ کے غلاف کے لیے اشعار تو خواتین کے رسائل میں شائع ہوتے ہی ہیں۔ سُنا ہے شادی کے جہیز میں دیے جانے والے تکیوں پر اگر اشعار نہ ہوں تو اکثر باراتیں واپس لوٹ آتی ہیں۔ اس عوامی ذوق و شوق کو دیکھتے ہوئے اگر صوبائی اور قومی سطح پر بیت بازی کے مقابلے شروع کر دیے جاتے تو یقین مانیے اردو زبان پر کبھی بُرا وقت نہیں آتا۔ بہر حال اب بھی اگر اردو کا کوئی دانشور بیت بازی کا پروگرام یا مقابلے شروع کرا دے تو اس سے نہ صرف اردو کو زبردست تحفظ حاصل ہوگا بلکہ اردو زبان کی تاریخ میں وہ دانشور بابائے اردو کے طور پر یاد کیا جائے گا۔

ممکن ہے کہ ہمارا یہ مضمون پڑھ کر اردو کا کوئی دانشور یا اکیڈمی بیت بازی کے مقابلے شروع کرا دے، اس وقت تو خدا نے اگر چاہا تو ہمیں ان گنت انعامات ملیں گے لیکن یہ تو مستقبل بعید کی باتیں ہیں۔ مسئلہ تو ہماری نصف بہتر کے آئے دن کے طعنے تشعنوں کا تھا۔ چنانچہ ہم بہت سوچ سمجھ کر اس ادبی انجمن کے صدرِ محترم سے ملے جو ہمارے محلّے کے وثیقہ نویس کو اعزاز واکرام سے نوازنے میں پیش پیش تھے اور اب تک بہت سے لوگوں کو ایسے انعامات و ایوارڈز سے نواز چکے ہیں۔ صدرِ محترم نے ہمارا گلہ شکوہ اور مدّعا سُنا۔ ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور دلّی کے ٹھیٹ کرخنداری لہجے میں بولے۔ "بھئی وہ اردو کے آدمی ہیں۔ کچہری میں درخواستیں اور وثیقے اردو میں لکھتے ہیں۔ یہ اردو کی بہت بڑی خدمت ہے۔ ان سے بہتر خادمِ اُردو کے اعزاز کا اور کون مستحق ہو سکتا ہے۔

ہم نے کہا کہ یہ تو اُن کا ذریعۂ معاش ہے۔ ادب سے ان کا کیا تعلق۔ صدر صاحب نے ایک قہقہہ اور لگایا اور بولے۔ "بھئی عظیم صاحب آپ تو بہت ہی سیدھے سادے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ پتہ نہیں کس دنیا میں رہتے ہیں۔ اتنی موٹی سی بات بھی نہیں جانتے کہ اس

لے انعامات اور ایوارڈز وغیرہ قابلیت اور
ٹ پر نہیں دیے جاتے۔ کس کو اتنی فرصت
کہ وہ اس قسم کے ایوارڈز تقسیم کرتا پھرے۔
ں ہماری جیسی انجمنوں کی تو بات ہی چھوڑیے
انجمنوں کے ممبران بھی دوستی اور ذاتی تعلقات
بنیادوں پر شاعروں اور ادیبوں کو نوازتے
ب اور کتابوں پر چھوٹے بڑے انعامات دیتے
یا تو پھر ہم اردو کی خدمت کے نام پر ہر ایرے
رے کو کیوں نوازیں اور اپنی جیب سے پیسے
اکر بے وقوف کیوں بنیں۔ میں جانتا ہوں آپ
ردو کے شیدائی ہیں۔ ادبی پروگراموں کے
قاعدہ سامع ہیں، لیکن صرف شیدائی ہونے
ے کام نہیں چلتا۔ سوال یہ ہے کہ آپ سے ہمیں
یا فائدہ اور آپ ہمارے کیا کام آسکتے ہیں۔
پ ہی بتایئے ہم یا اور کوئی انجمن آپ کو کیوں اور
س لیے ایوارڈ دے۔

صدر صاحب کے ان انکشافات پر ہم
دریائے حیرت میں ڈوب گئے۔ جی چاہا کہ ان پر
اور ان کی ادب دوستی اور ادب نوازی پر لعنت
بھیج دیں لیکن ایوارڈ حاصل کرنے کے شوق میں
ہم پیچھے ہٹنے والے نہیں تھے، اس لیے جھجک کر
بولے: "جب آپ وثیقہ نویس کو نواز سکتے ہیں
جن کی کوئی حیثیت نہیں تو ہمیں بھی کوئی ایوارڈ
دے دیجیے۔ ہم تو بہرحال دفتر میں ٹائپ بابو
ہیں اور میز کرسی پر بیٹھ کر کام کرتے ہیں۔

ہماری بات سن کر وہ چمک کر بولے:
"بھئی آپ کو کیا پتہ وثیقہ نویس صاحب کس قدر
کام کے آدمی ہیں اور ان سے ہمیں کتنا فائدہ پہنچا
ہے۔ ہم ایک ہاؤسنگ سوسائٹی بھی چلاتے ہیں
اور زمین کی خرید و فروخت کا کام بھی کرتے
ہیں۔ ان بے چاروں نے ہمیں زمین دلانے
میں بڑی مدد کی ہے۔ تحصیل کے دفتر سے زمین
کے کاغذات نکلوانا کوئی آسان کام نہیں ہے
لیکن انہوں نے محلے سے مل ملا کر زمین کے کاغذات
نکلوا دیے۔ جس کی وجہ سے ہمیں بڑے موقع کی زمین
کافی سستی مل گئی۔ ایسے کار آمد اور فائدہ بخش
انسان کی خدمات کا اعتراف تو ہونا ہی چاہیے۔
حسنِ اتفاق سے وہ صرف وثیقے اور قبالے ہی
لکھتے ہیں۔ اگر شاعر یا ادیب بھی ہوتے یا کبھی ان
کی کوئی تخلیق ہی شائع ہوئی ہوتی تو یقین مانیے
ہم ان کو اپنے ادارے کا سب سے بڑا اعزاز "افتخارِ
مومن" اور اکیاون سو روپے ہی دیتے، لیکن کیا
کریں مجبوری تھی۔ بہرحال اب ہم ایک دوسری
انجمن کی طرف سے ان کی سماجی اور ملی خدمات
کا اعتراف کرنے جا رہے ہیں۔ ہمیں ابھی ان سے
اور بھی بہت سے کام لینے ہیں۔

ہم نے ان کی بات کاٹ کر کہا کہ ہم بھی
دفتر میں کام کرتے ہیں اور آپ کے بہت کام
آسکتے ہیں۔

صدر صاحب ہماری بات سن کر بولے
"میاں آپ ہمارے کیا کام آئیں گے۔ آپ آج
تک اپنے "کام" نہیں آسکے۔ بیس سال پہلے بھی
ٹائپ بابو تھے اور خیر سے آج بھی ٹائپ بابو
ہی ہیں۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور آپ
ایک انچ بھی نہیں ہلے۔ آپ شریف انسان ہیں
اگر شریف اور معصوم نہ ہوتے تو مشاعرے سننے اور
ادبی نشستوں میں یوں عمر نہ گنواتے بلکہ اب
تک شاعری شروع کر چکے ہوتے۔ یا نقاد و محقق
بن چکے ہوتے۔ بہرحال آپ سے چونکہ پرانے مراسم
ہیں۔ اب آپ کی بات کو ٹالا بھی نہیں جا سکتا۔
شہر کی انجمنیں مجھ سے وابستہ ہیں۔ میں کوشش
کر کے کسی نہ کسی انجمن سے آپ کو ایک ایوارڈ دلوا
دوں گا۔ بس شرط یہ ہے کہ آپ فنکشن کا خرچہ
برداشت کر لیں۔"

صدر صاحب کو موم ہوتا دیکھ کر ہم خوش
تو ہوئے، لیکن یہ خرچہ برداشت کرنے کی بات
سن کر چونکے اور جھجک کر بولے: "فنکشن کا خرچہ
ہم برداشت کر لیں؟ لیکن یہ تو بڑی عجیب
سی بات ہے۔ لوگ کیا کہیں گے؟

صدر صاحب ہماری حیرت کو دیکھ کر بولے
"بھئی دیکھیے آج کے دور میں کچھ بھی نامناسب
اور عجیب نہیں رہا۔ سارے معاملات اس ہاتھ دے
اس ہاتھ لے کی بنیادوں پر چل رہے ہیں۔ تعزیتی
جلسے تو ہم فری کرتے ہیں اور ان شاء اللہ آئندہ
بھی کرتے رہیں گے۔ آخر کار دعوے ہیں۔ لحاظ
اور مروت ابھی زندہ ہے، لیکن اس قسم کے تہنیتی
فنکشن ہم صرف معاوضے کر ہی کرتے ہیں۔
ہر فنکشن پر اچھے خاصے پیسے خرچ ہو جاتے ہیں۔
مہنگائی کے اس دور میں یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم ایوارڈ
بھی دیں اور فنکشن پر اپنی جیب سے پیسے بھی خرچ
کریں۔ اس لیے بس مناسب اور واجبی سا
معاوضہ لیتے ہیں۔ اور ایک عمدہ اور کامیاب
پروگرام کی گارنٹی دیتے ہیں۔ میرے اچھے خاصے
سیاسی تعلقات ہیں، اس لیے ہر پروگرام میں
کسی نہ کسی وی آئی پی کو ضرور بلاتے ہیں اور
سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ہال کے بھرنے
کی ضمانت بھی دیتے ہیں جو شہر کی دوسری انجمنیں
نہیں دے سکتیں۔ یہی نہیں ہم ہر پروگرام کی
پبلسٹی بھی خوب کراتے ہیں اور اخبارات و رسائل
میں تصویریں بھی چھپواتے ہیں۔ پچھلے ماہ ہم
نے کینیڈا سے آئے ہوئے ایک شاعر کی کتاب
کی رسمِ اجرا کا پروگرام کیا تھا۔ اس میں آپ
بھی تو آئے تھے۔ دیکھیے، دو وزرا صاحبان
بھی تشریف لائے تھے۔ کتنا کامیاب پروگرام
رہا اور اخباروں میں کتنی پبلسٹی ملی۔ اس پروگرام
کے سارے اخراجات شاعرِ موصوف نے ہی ادا
کیے۔ یہ تمام چیزیں رازداری سے ہوتی ہیں
اور کبھی ہم کسی کو بتاتے نہیں۔ آپ تو چونکہ اپنے
ہیں، اس لیے برسبیلِ تذکرہ آپ کو بتا دیا ـــ
بہرحال آپ بھی یہ راز اپنے تک محدود رکھیں۔
ہاں تو اگر آپ بھی پروگرام کا خرچہ برداشت
کرنے کو تیار ہوں تو بتایئے تاکہ بات آگے بڑھائی

ئے۔ اور معاملہ فائنل کیا جائے۔ یہ کہہ کر صدر
م نے سوالیہ انداز سے ہمیں دیکھا۔ چند لمحوں
کچھ سوچا اور پھر بولے، "میرے خیال
آپ کے لیے سامعِ اردو کا ایوارڈ زیادہ
رہے گا۔ کیوں کہ عاشقِ اردو، خادمِ اردو،
ستارۂ اردو اور عندلیبِ اردو تو شہر میں
ت ہو گئے ہیں، سامعِ اردو کا ایوارڈ آج
کسی کو نہیں دیا گیا۔ اس میں بلا کی انفرادیت
انوکھا پن ہے۔ اس پروگرام میں کسی منسٹر
ی اداکار کو بھی مدعو کریں گے تاکہ پروگرام
ں وقار پیدا ہو جائے۔ آپ کے افسرانِ
ں کو مدعو کریں گے اور آپ کے گلے میں اُن
، ہارڈ لوائیں گے۔ تاکہ دفتر میں آپ کی
ت بڑھے۔ ممکن ہے اس پروگرام کے
آپ کے افسران آپ سے خوش ہو کر آپ کا
ہ بڑھا دیں۔ بہر حال اب آپ سوچ لیجیے۔
ے کے اس پروگرام پر تقریباً چار ہزار روپے
چ ہوں گے۔ گیارہ سو روپے تو چیک کی
ں میں آپ کو واپس مل ہی جائیں گے۔ اگر
پ چیک کیش نہ کرائیں اور پروگرام کے بعد
ں چیک واپس کرنے کا پکا وعدہ کریں —
رف تین ہزار روپے میں کام چل جائے گا۔
رہم آپ کو ایوارڈ دے دیں گے۔"

صدر صاحب نے اپنی بات ختم کر کے
الیہ نگاہوں سے ہمیں پھر دیکھا۔ ہم ٹھہرے
تری بابو۔ دفعتاً چیل کے گھونسلے میں ماس
اں والی کہاوت یاد آگئی، لیکن ایوارڈ لینے
شوق میں فوراً ہاں کہہ بیٹھے — صاحبو!
نے یہ سوچ کر کہ پیسہ تو آنی جانی شے ہے
ت مشکل سے ملتی ہے اور نام بڑی دیر میں
ہا ہے، اُدھار قرض کر کے اخراجات کی رقم
اکر دی۔ کچھ ہی دنوں میں شہر کی دو تین ادبی
نوں نے ہمیں سامعِ اردو کا ایوارڈ دینے کا
لان کر دیا۔ تاریخ طے ہوئی، دعوت نامے

تقسیم ہوئے اور پروگرام ہوا۔ مدعو وزیر باتدبیر
تو اپنی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے تشریف
نہ لا سکے، لیکن مار دھاڑ کی فلموں کے ایک
سائیڈ ہیرو نے پروگرام کو رونق بخشی۔ بھرے
ہوئے ہال میں ہمارے گلے میں پھولوں کے
ہار ڈالے گئے اور ایک خوبصورت سی شیلڈ
اور گیارہ سو روپے کا چیک پیش کیا گیا —
اُردو کے سنہری مستقبل پر تقریریں ہوئیں۔ دو
تین مقررین نے ہماری ادب دوستی کو سراہتے
ہوئے ہمیں مشاعروں، ادبی پروگراموں کے لیے
دری، چاندنی، گاؤ تکیے اور لاؤڈ اسپیکر کی طرح
لازم و ملزوم قرار دیا۔ ایک مقرر کا خیال تھا
کہ مشاعروں کا ہم جیسا رسیا اور مستقل سامع
کہیں صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ایسے موقع
پر شعرا حضرات کہاں پیچھے رہنے والے تھے۔
دو تین شاعروں نے ہمیں منظوم خراجِ عقیدت
پیش کیا، جن کو سن کر ہمیں اپنی شادی کے
موقع پر پڑھے جانے والے سہرے یاد آگئے۔
پروگرام کے بعد خاص خاص مہمانوں کی چائے
وغیرہ سے تواضع کی گئی، جس کی ادائیگی ہمیں کھڑے
کھڑے اپنی جیب سے کرنی پڑی۔ کیوں کہ یہ آئٹم
طے شدہ پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ بہر حال دوستوں
اور عزیز و اقارب نے ہمیں خوب خوب مبارکباد
دی۔ اگلے دن مقامی اور غیر مقامی اخبارات
میں خبر اور تصویریں شائع ہوئیں۔ ہماری نصف
بہتر اور بچے خوشی سے پھولے نہیں سمائے۔ دفتر
میں کچھ روز ہمارا چرچا رہا، لیکن سامعِ اردو کا
خطاب پا کر پہلا نقصان یہ پہنچا کہ ہمارے
افسرانِ اعلیٰ نے ہمیں ترقی دینے کی بجائے، ہمیں
ایک ایسے سیکشن میں تبدیل کر دیا جہاں رات
کے آٹھ بجے تک سر کھجانے کی فرصت نہیں
ملتی — ہاں تو جناب ہمیں سامعِ اردو کا
ایوارڈ ملے ہوئے عرصہ گزر گیا۔ اس شیلڈ کا رنگ
بھی مدھم پڑ چکا ہے، ہمارے دوست احباب

بھی بھول چکے ہیں کہ ہم اردو کے ایوارڈ یافتہ سامع
ہیں۔ اخبارات و رسائل میں ہمارے فوٹو بھی
چھپے تھے، لیکن یہ ہمیں کل کی سی بات معلوم
ہوتی ہے۔ کیوں کہ ہم ابھی تک وہ قرض قسطوں
میں لوٹا رہے ہیں۔ جو فنکشن کے لیے ہم نے
اپنے دفتری فنڈ سے لیا تھا اور جب تک
وہ قرض ادا نہیں کیا جاتا ہمیں یہ بات کل کی سی
ہی معلوم دے گی۔

اور اب جب ہمارے پاس کسی کے
جشن کا دعوت نامہ آتا ہے، کسی ادیب و شاعر
کی ادبی خدمات کے اعتراف میں کوئی جلسہ
منعقد ہوتا ہے یا کسی کو کوئی ایوارڈ ملتا ہے
تو ہم یہی سوچتے ہیں کہ پروگرام کے منتظمین سے
اس شاعر یا ادیب کا کیا مفاد وابستہ ہو سکتا
ہے اور کیا اس ایوارڈ پانے والے نے بھی ہماری
طرح اُدھار قرض لے کر فنکشن کے اخراجات
برداشت کیے ہوں گے؟؟

●

بقیہ: کُریدَ

جا رہا ہے۔

"میرے پوتے کا نام کیا ہے؟"
اس کے لہجے میں کوئی حسرت نہیں تھی۔

"شاہد۔"

میں نام بتا کر اس کے چہرے کو چند
لمحے کے لیے دیکھتا رہا اور پھر اٹھ کر چلا آیا اور
گھر آ کر سوچنے لگا اور سوچتا رہا اور آج تک
یعنی چالیس سال بعد بھی مجھے اس کا جواب نہیں
مل سکا کہ میں اس کے پاس کیوں گیا تھا اور
اور پھر کیا سوچ کر اس کو مزید کچھ کریدے بغیر گھر
واپس آگیا تھا۔



نام کتاب : فراق کی شاعری
معنف : ڈاکٹر افغان اللہ
قیمت : ۱۲۵ روپے
ملنے کا پتہ : نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد، لکھنؤ

فراق گورکھپوری اس عہد کے ان خوش نصیب شعرا میں سے ہیں جن کی جیتے جی خوب خوب پذیرائی ہوئی۔ اور ان کی موت کے بعد بھی انہیں طرح طرح سے یاد کیا گیا۔ ان کی زندگی اور موت کے درمیان تھوڑا سا فرق اتنا آیا کہ ان کی آنکھ بند ہوتے ہی بعض معتبر لوگوں کی بھی باتیں بدل گئیں۔ کچھ لوگ تو ان کی زندگی میں لب کشائی کی جرأت نہ کر سکے۔ اور موت کے بعد عجیب و غریب انکشافات کرنے لگے۔ کچھ نے زندگی میں کچھ لکھا، موت کے بعد کچھ لکھا۔ اس طرح کے عمل میں کچھ تو نقاد کی بددیانتی کا دخل ہے۔ کچھ فراق صاحب کی نزاعی شخصیت کا بھی۔ فراق صاحب کی زندگی میں، ان کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں اگر بے تکی اور سنکی باتیں کی جاتیں تو فراق کے چاہنے والے تو بعد میں جواب دیتے پہلے فراق صاحب ہی خم ٹھونک کر میدان میں آجاتے۔ ایسی خبر لیتے کہ لکھنے والا پناہ مانگ جاتا اور نہ جانے کتنوں نے پناہ مانگی۔ بہر حال اس عمل اور ردِ عمل میں فراق صاحب کی شخصیت بھی مجروح ہوئی۔ ان تمام باتوں کے باوجود معقول اور صحت مند لوگوں کے درمیان فراق صاحب کی اچھی اور بڑی شاعری پر کسے شبہ اور انکار رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نیاز فتح پوری سے لے کر سید محمد عقیل تک فراق کی شاعری سے متعلق متوازن و متناسب تنقید کا سلسلہ کیوں کر پھیلا ہوتا۔

ڈاکٹر افغان اللہ کا تحقیقی مقالہ کہ جن پر انہیں گورکھپور یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی اسی لمبے سلسلے کی ایک جامع اور مضبوط کڑی ہے۔ سات سو صفحات کے اس مقالے میں ڈاکٹر افغان اللہ نے فراق صاحب کی شخصیت اور شاعری دونوں سے متعلق جو سائنسی اور معروضی نقطۂ نظر اپنایا ہے اور نئے نئے گوشے نکالے ہیں وہ عام قارئین کے بالعموم اور ماہر فراقیات کے بالخصوص توجہ کے مستحق ہیں۔ یہ فراق کی زندگی میں اور موت کے بعد اب تک فراقیات پر لکھی جانے والی سب سے ضخیم کتاب ہے اور شاید بنیادی اور کلیدی بھی۔ راقم مقالہ نے فراق کی شاعری کو محض حرف و صوت اور ردیف و قافیہ تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ ان کا ان کے عہد ان کے جملہ محرکات و عوامل کے وسیع پس منظر میں تحقیق و تنقید کے پورے ادب و آداب کے ساتھ محاسبہ کیا ہے اور نیز ان کے متقدمین و معاصرین سے اشتراک و اختلاف پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔

فراق صاحب نے لمبی عمر پائی۔ ان کی شاعری کم و بیش سات آٹھ دہائیوں پر محیط ہے۔ انہوں نے کئی عہد دیکھے کئی نسلیں دیکھیں۔ ہندوستانی سماج کے نہ جانے کتنے نشیب و فراز دیکھے۔ ایسی صورت میں فراق کے جملہ پیچ و خم اور شاعرانہ کیف و کم کے اس طویل سفر کو ایک مقالے میں سمیٹنا ناممکن نہ سہی تو ایک مشکل کام ضرور ہے۔ اور یہ مشکل کام ڈاکٹر افغان اللہ نے بحسن و خوبی انجام دیا ہے۔ انہوں نے فراق جیسی ممتاز عہد شخصیت اور شاعرانہ رنگا رنگی سہہ جہتی کہ جس میں تغزل و ترنم تو ہے ہی ساتھ ہی تصوف، فلسفہ، رمزیت، اشاریت، ہندوستانیت، وطن کی حرمت و محبت، افرادِ وطن سے جذباتیت، قومی تحریک میں شمولیت وغیرہ وغیرہ جیسی قسمتوں کو سمجھنا، تجزیہ کرنا اور توازن کو برقرار رکھنا یہ ایک بڑا کام تھا، جسے افغان اللہ نے حسنِ ترتیب کے ساتھ انجام دیا۔

ڈاکٹر افغان اللہ نے اپنے اس مقالے کو چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں فراق کی پیدائش، ابتدائی تعلیم و تربیت، خاندان اور ماحول پر معلوماتی باتیں کی ہیں۔ چونکہ فراق اور افغان اللہ دونوں کا وطن گورکھپور ہے۔ اس لیے اس باب میں بعض ایسے جغرافیائی و تاریخی حقائق پیش کیے گئے ہیں جو اس سے قبل پیش نہیں کیے گئے تھے۔ دوسرے باب میں گورکھپور کے ادبی ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے فراق کی ابتدائی شاعری، اساتذہ کے اثرات اور ہندی و انگریزی کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ تیسرے میں اور آخر میں فراق کی غزل گوئی کا مجموعی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کے حسن و عشق، جمال و جلال، حیات و کائنات کے تصورات پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اس لیے یہ باب خاصا طویل ہے۔ تیسرے باب میں نظم نگاری پر بحث کی گئی ہے۔ ابتداً اردو نظم نگاری کا اجمالی جائزہ لینے کے بعد فراق کی نظموں

کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اس امر کا بھی تجزیہ کہ فراق کی نظمیں اردو نظم نگاری میں کس طرح اضافہ کرتی ہیں۔ چوتھے باب میں رُباعیاتِ فراق پر باتیں کی گئی ہیں۔ اردو میں رُباعی کی روایت پر بات کرتے ہوئے فراق کی رُباعیوں میں شرنگار رس پر اچھی باتیں کی گئی ہیں۔ اس باب میں ہندی شعراء کے بارے میں بھی معلوماتی باتیں پیش کی گئی ہیں۔ پانچویں باب میں فراق کے دوہوں اور دیگر تخلیقات کا جائزہ لیا گیا ہے اور چھٹے باب میں فراق کے فکر و فن پر بحث کی گئی ہے اور ان کے شعری ذہن کا جائزہ لے کر فراق کے شاعرانہ مرتبے اور مقام کا تعین کیا گیا ہے ان تمام ابواب کا سنجیدہ اور پُرخلوص مطالعہ افغان اللہ کی بے پناہ محنت و لگن، تلاش تفحص کی غمازی کرتا ہے۔ فراق کے شعری مقام کے سلسلے میں افغان اللہ نے جو رائے پیش کی ہے جو ظاہر ہے کہ ان کی اپنی رائے ہے اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن تحقیق کے سلسلے میں متعدد باتیں جو اس مقالے کے ذریعے منکشف ہوئی ہیں اور جو فراق شناسی کے نئے نئے دریچے کھولتی ہیں ان سے اختلاف کی گنجائش ذرا کم ہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فراق کے سب سے بڑے مبلغ خود فراق تھے اور فراق کے سب سے بڑے دشمن بھی خود فراق تھے۔ اپنی زندگی میں ہی اپنی زندگی اور شاعری کے بارے میں ایسی متضاد اور گمراہ کُن باتیں خود انہوں نے اس طرح پھیلا رکھی تھیں کہ اس کی دُھند میں اصل حقیقت کو تلاش کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اسی طرح فراق کی شاعری کے سرچشمے کہاں کہاں سے پھوٹے ہیں، کہاں سے سیراب ہو کر اور کس کس کو سیراب کرتے ہوئے آئے ہیں؛ یہ سب ایسے مسائل و حقائق ہیں کہ ان کی تلاش ایک جوکھم کا کام ہے۔ ڈاکٹر افغان اللہ نے اپنی تمام تحقیق و تنقید میں کوئی دعویٰ تو نہیں کیا۔ پھر بھی انہوں نے اپنی بساط صلاحیت کے مطابق ان کے تمام محرکات اور عوامل، سرچشموں اور مزاج و خیال کو سمجھنے اور پھر اُسے تفصیل سے پیش کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کہیں کہیں وہ زیادہ ہی تفصیل میں چلے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ مقالہ بوجھل اور بے کیف سا ہو جاتا ہے۔ پھر بھی آخری باب میں جو نتائج برآمد کیے ہیں، ان سے بڑی حد تک اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "فراق کی شاعری کا مجموعی جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالب کے بعد اردو غزل کے سب سے اہم منفرد اور ممتاز شاعر فراق ہی ہیں۔ جو کلاسیکی سلسلے کی آخری کڑی اور جدید غزل کے سلسلے کی پہلی کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں —" کوئی چاہے تو افغان اللہ کے پہلے جملے کو آڑا کر بحث کے سلسلے شروع کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ اب فراق صاحب زندہ نہیں ہیں لیکن افغان اللہ کا پورا خیال پورے جملے سے ادا ہوتا ہے جو ان کے طویل و عریض مقالے کا عطر ہے۔

علی احمد فاطمی

بے چین لمحوں کا تنہا سفر

مصنف: ویریندر پٹواری

قیمت: چالیس روپے

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

یہ کتاب مصنف کے ۲۴ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے افسانوں کے دو اور ڈراموں کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

زیر نظر افسانوں کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ ان کا خالق ذہن ان درجہ بندیوں سے مغلوب ہے جو ادب کے کچھ کم فہموں نے "قصۂ جدید و قدیم" کے زیر اثر قائم کی ہیں۔ یہ ذہن چاہتا ہے کہ اسے "جدید افسانہ نگار" کے طور پر شناخت کیا جائے

قیمت، ایسا کیوں؟ اور پیاسی آنکھیں جیسے افسانے گواہی دیتے ہیں کہ ویریندر کو انسانی سرشت اور معاشرتی صورت حال کی گہرائیوں میں اُترنے کا ہنر آتا ہے اور وہ اس روایت کے اچھے افسانہ نگار بن سکتے ہیں جو منٹو، بیدی، ندیم کی روایت کہی جاتی ہے۔ مگر خود کو "جدید" باور کرانے کی خواہش انہیں اسی انشائیت اور معلق لفاظی تک لے جاتی ہے جہاں نہ تو تجریدی و علامتی افسانہ ہاتھ آتا ہے اور نہ ہی موثر کہانی — یہ مانا کہ علامتی افسانہ بھی اِک اہمیت رکھتا ہے لیکن اگر کسی ادیب کا مزاج سریندر انتظار مین را کی راہ چلنے کا نہیں تو کیا ضروری ہے کہ وہ منٹو، بیدی، ندیم کی روایت کو بھی اختیار نہ کرے جبکہ اس کا مزاج ان سے قربت رکھتا ہو۔

ویریندر پٹواری قابلِ مبارکباد ہیں کہ انہیں احساس اور مشاہدے کو کہانی بنانے کا ہنر آتا ہے — مگر انہیں ان امور پر مزید توجہ دینی چاہیے کہ کہانی کا راوی کون ہو؟ زمانہ کیا ہو؟ کہانی میں مصنف کا براہ راست دخل کیسے ختم کیا جائے؟ اور لفظوں کے استعمال میں زیادہ سے زیادہ کفایت کس طرح برتی جاتی ہے؟

اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی و لسانی پہلو

مصنف: ڈاکٹر یونس اگاسکر

قیمت: اسّی روپے

ملنے کا پتہ: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

یہ کتاب مصنف کے پی ایچ ڈی مقالے پر مشتمل ہے جسے سات مندرجہ ذیل ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے؛

۱۔ کہاوت کیا ہے؟ ۲۔ کہاوت کی اہمیت ۳۔ کہاوت کا آغاز و ارتقا؛ اسباب ۴۔ کہاوتوں کی ترویج و بقا۔ ۵۔ اردو کہاوتوں

کے ابتدائی نقوش۔ ۶۔ اردو کہاوتوں کے سماجی پہلو۔ ۷۔ اردو کہاوتوں کے لسانی پہلو۔

مقالے کی اچھائی اور معقولیت کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے، انتہائی سخت گیر محقق جناب رشید حسن خاں سے داد وصول کی ہے۔ اس داد پر مبصر صاد کرتا ہے، "ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں" خاں صاحب نے "پیش گفتار" میں لکھا ہے:

"میں نے اس مقالے کے اکثر اجزا کو دیکھا ہے (کاش! تمام اجزا پڑھے ہوتے) اور میں نہایت مسرت کے ساتھ (تنہا نہیں!) یہ کہتا ہوں کہ ایک اچھے موضوع پر، بہت محنت اور صبر و تحمل کے ساتھ (ٹیم بنا کر)، کام کیا گیا ہے۔ اردو میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا مفصل مطالعہ ہے جس میں ضرب الامثال کے متعلقات پر سنجیدگی (صاحبہ؟) کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے مجھے اس کی بھی مسرت ہے کہ اس مقالے میں وہ زواید کم سے کم ہیں جن سے اکثر تحقیقی مقالے بے طرح گراں بار ہوتے ہیں۔ مقالہ نگار نے مقالے کی ضخامت کو (لایعنی طور پر؟) بڑھانے کے بجائے اس میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ایک نہایت ضروری اور بحث طلب موضوع پر ایک واقعی اچھا مقالہ لکھا گیا ہے مجھے یقین ہے کہ اس سے اردو کے اچھے طالب علموں کو بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوں گی۔۔۔"

"اردو کے اچھے طالب علموں" سے خاں صاحب کی مراد غالباً وہ لوگ بھی ہیں جو زبان و ادب کی تدریس سے وابستہ ہیں، اگر وہ لوگ اس کتاب کا بہ غور مطالعہ کر لیں تو اپنے شاگردوں پر "کہاوت اور محاورہ" اور "کہاوت اور تلمیح" کا فرق واضح کر سکیں گے۔ ورنہ ان کے شاگرد بھی، اردو کے ایک پروفیسر صاحب کی طرح، تمیز نہ کر پائیں گے کہ "کربلا" استعارہ ہے یا تلمیح۔

ساتویں باب کے بعد، ان کہاوتوں کی فہرست بہ طور ضمیمہ شامل ہے جن سے اس مقالے میں استفادہ کیا گیا ہے۔ "ابتدائیہ" میں مصنف نے اس امر پر اظہار افسوس کیا ہے کہ مقالے کی طوالت کے پیش نظر کہاوتوں کے پس منظر پر مشتمل ضمیمہ اس اشاعت میں شامل نہ ہو سکا۔ اب یہ الگ رسالے کی شکل میں شائع ہوگا۔" لفظ "رسالے" سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ ضمیمہ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ پونے دو سو صفحات کا رہا ہوگا۔ افسوس کہ یونس اگاسکر نے، شاید ناشر یا تقسیم کار کا دباؤ قبول کر کے اک نہایت مکمل و دل نشیں پورٹریٹ کا ایک کان منظر سے حذف کرنے کی اجازت دے دی۔

کہاوتوں کی فہرست، حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دی گئی اور اس کے حصص پر حروف بطور عنوان درج کیے گئے، درست۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ کہاوتوں کے ابتدائی الفاظ کو بھی عنوان کیوں بنایا گیا؟ اس سے تقریباً ہر صفحے پر کئی کئی سطریں ضائع ہوئی ہیں۔

یونس اگاسکر نے اس پُر مشقت کام کے دوران یقیناً محسوس کیا ہوگا کہ اردو میں ایک ایسی جامع فرہنگ امثال کی ضرورت ہے جس میں قدیم و جدید کہاوتیں، ان کے پس منظر اور مشکل و غیر معروف الفاظ کے معنی سمیت، یکجا ہوں۔

کاش! اس کام کا بیڑا یونس اگاسکر ہی اٹھالیں تو کسی اور کے مقابلے، ان کے لیے یہ کام آسان رہے گا۔ اور وہ بھی قابل مبارکباد ہوگا۔

آئینۂ غزل

شاعر: تاج پیامی
قیمت: بیس روپے
ملنے کا پتہ: دارالادب، مہادیو محلہ، آرہ (بہار)

شاعر نے اس مجموعے میں، ۸۷ غزلوں اور ۲۵ متفرق اشعار سے قبل تیس صفحات کا ایک مضمون شامل کیا ہے جس کا عنوان ہے "غزل ایک مہذب ترین صنفِ سخن ہے" مضمون کی ابتدا صنفِ غزل کے آغاز سے متعلق روایتی نظریے کے تفصیلی بیان سے ہوتی ہے۔ بعد ازاں غزل کے بارے میں کلیم الدین احمد کے انتہائی معروف خیال کا مفصل و مدلل ابطال کیا گیا ہے۔ تاج پیامی کا کہنا ہے "غزل معاشرہ ہے اور اس کے اشعار معاشرہ کے افراد۔ ایک معاشرہ اور اس کے افراد میں جو رشتہ ہوتا ہے وہ غزل اور اس کے اشعار میں ہوتا ہے۔" مضمون کا اختتام اس بات پر ہوا ہے "شاعری کا مستقبل نظم سے نہیں صنفِ غزل سے وابستہ ہے کیونکہ غزل ایک مہذب ترین صنفِ شاعری ہے۔"

تاج پیامی کی، بہ لحاظ ردیف مرتب غزلوں کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ یوں تو انہوں نے اس صنف کے روایتی استعارے بھی برتے ہیں مگر ان کی بیشتر شاعری براہ راست اظہار خیال اور خطابیہ بیان پر قائم ہے۔ بہ طور نمونہ چند اشعار:

لکھا ہے اہلِ چمن نے اسیر زنداں کو
ابھی نہ آؤ کہ ماحول سازگار نہیں

سلتے کو دھوپ دھوپ کو سایہ نہ کہہ سکا
شام و سحر ہی کہتا ہوں شام و سحر کو میں

غم کی دنیا کبھی نہیں بدلی
کتنے دنیا میں انقلاب آئے
فکرِ دنیا پہ آ رہی ہیں بہت
دردِ دل پر بھی اک کتاب آئے

نوا سنجی مری اب تک نہ بن پائی گُلِ نغمہ
جہاں میں ہوں وہاں آوازکا صحرا ہی صحرا ہے

تاج پیامی کا مذکورہ بالا مضمون بی اے آنرز اور ایم اے اردو کے طلبہ کو ضرور پڑھنا چاہیے۔

یوگ اور صحت

مصنف : رام اوتار شرما
مترجم و ناشر : حسان عتیق صدیقی
قیمت :
تقسیم کار : ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

یوگ آسن، جسمانی ورزشوں کا وہ مکمل نظام ہے جس کے قیام میں بھارت کے قدیم اطبا، رشیوں اور منیوں کے سیکڑوں سالہ تجربات معاون رہے ہیں۔ صاف ستھری کتابت و طباعت اور آسنوں کی ۵۸ تصاویر سے مزین ۱۰۴ صفحات کی یہ کتاب، اس اہم موضوع پر اردو میں غالباً اولین کوشش ہے۔ ترجمہ نہایت واضح اور رواں ہے۔ اس کتاب کے اعتبار میں یہ بات مزید اضافہ کرتی ہے کہ خود مصنف نے بھی ترجمے میں مدد کی ہے۔ اردو داں طبقے کو اس کتاب سے پورا پورا فیض اٹھانا چاہیے کہ تن درستی ہزار نعمت ہے۔

فضل الحق عثمانی

مجموعۂ کلام : اپنی تصویر
شاعر : اظہر عنایتی
ناشر : اظہر عنایتی، ساکن بمبر شیخ، رامپور
قیمت : پچاس روپے

"خود کلامی" (۱۹۸۰ء) کے بعد "اپنی تصویر" اظہر عنایتی کا دوسرا مجموعۂ غزلیات ہے۔ اظہر اپنی تصویر کے پردے میں اُس تہذیب کے خدوخال دکھانا اور دکھانا چاہتے ہیں، جو اُن کی شخصیت کا لازمی حصہ ہیں۔ اُن کا دَور اقدار کی شکست و ریخت کا دَور ہے۔ وہ اس جدلیاتی ماحول کو اپنے تہذیبی ورثے کے عناصر سے پُرسکون اور خوش گوار بنانا چاہتے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ تہذیبی ورثہ سیکڑوں سال کے خوش گوار تجربوں کا مجموعہ ہے اور ان کے بزرگوں نے اس کی حفاظت اور پاسداری میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں اور آج کا انسان بھی یہ کارنامے انجام دے سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس سے اپنا رشتہ استوار رکھے لیکن آج کا انسان کم حوصلہ ہے۔ اُسے زندگی مہیب نظر آتی ہے۔ وہ دوسروں ہی سے نہیں، خود سے بھی خوف زدہ ہے، لیکن اظہر اُسے اپنے بزرگوں کے پُرعظمت کارنامے یاد دلا کر حوصلہ مندی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔

اظہار پر تو پہلے بھی پابندیاں نہ تھیں
لیکن بڑوں کے سامنے ہم بولتے نہ تھے

یہ کیسے ختم ہو گئیں زباں کی پاسداریاں
وہ دشمنوں پہ اعتبار کرنے والے کیا ہوئے

وہ شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ آج کا انسان اپنے تہذیبی دھارے سے کٹ گیا ہے اور اقدار کی بھیڑ میں گم ہو کر اکیلا رہ گیا ہے۔ اور یہ اکیلا پن ہی اس دَور کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ اس دور کا انسان زندگی کی بوقلمونیوں کے باوجود پہلے سے کہیں زیادہ بے ہیں اور ان آسائشوں کے باوجود جو پہلے سے کہیں بڑھ کر ہیں، زیادہ اُداس ہے اور اس کی اس اداسی کا راز اپنے تہذیبی ورثے سے علیحدگی ہے۔ اسی لیے وہ ان بزرگوں کے مقابلے میں جو کہ گھر کے آنگن نشین تھے، وہ سال نہیں کھلی تھیں بہت کم ہمت اور سہل انگار ہو گیا ہے۔

اظہر عنایتی کی شاعری کے یہ تہذیبی عناصر روایت پرستی یا رجعتِ قہقہری کی ترغیب نہیں دیتے کیوں کہ اظہر اس نکتے سے بخوبی آشنا ہیں کہ وہی قومیں زندہ رہتی ہیں جو اپنے ماضی اور اپنی تاریخ کو یاد رکھتی ہیں اور اس طرح اپنے شناخت اور خوب صورت خدوخال مسخ نہیں ہونے دیتیں۔

راستو! کیا ہوئے وہ لوگ جو آتے جاتے
میرے آداب پہ کہتے تھے کہ جیتے رہیے

میرا گھر ہے پُرانے وقتوں کا
اُس کی آنکھیں نئے زمانے کی

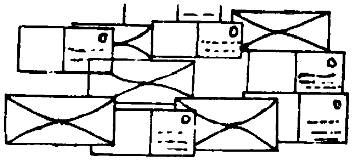
ضدیں تو شان ہوا کرتی ہیں رئیسوں کی
جو چیز بھی سمت نہ جائے وہ شاہزادہ کیا

جھوٹی سیاہیوں سے ہیں شجرے لکھے ہوئے
اب کے حسب نسب کی بھی سچائیاں گئیں

اظہر کی شاعری میں یہ تہذیبی ورثہ صاف نظر آتا ہے۔ وہ نہ صرف اس ورثے کے امانت دار ہیں بلکہ وہ اس کے شیریں لب و لہجے میں گفتگو بھی کرتے ہیں۔ اُن کا لہجہ جدتِ خیال اور تازہ کاری کے دل کش اسلوب کا لہجہ ہے۔ اپنے جذبات کے اظہار میں وہ بوجھل تشبیہوں اور استعاروں کا سہارا نہیں لیتے بلکہ سادگی اور پُرکاری سے پیکر تراشی کرتے ہیں۔ اُن کے شعری مضامین احساسات کے اظہار کے پیمانے اُن کے اپنے ہیں اور غزل کی شاعری میں انفرادی لب و لہجہ ہی شاعر کو منفرد بناتا ہے۔ مجھے اُمید ہے اظہر عنایتی اپنی غزل کے ہر مجموعے میں اپنی شگفتہ غزل شگفتہ [illegible] ہو گئے کیوں کہ وہ شاعر بڑا ہوتا ہے جس کا تہذیبی سرمایہ بڑا ہوتا ہے۔

[illegible]

مکتوبات



مختلف، مشترک

"سندھی ادب نمبر" نظر نواز ہوا۔ خاص طور پر کہانیاں ذوق و شوق سے پڑھیں۔ مطالعے کے اس عمل میں ہر گام پر یہ تلاش رہی کہ یہ کہانیاں اردو کہانیوں سے کہاں کہاں الگ ہیں۔ کتنی مختلف اور کتنی مشترک۔ باوجود اس کے کہ ان کہانیوں میں بعض کہانیاں تو بڑی جٹیلی اور اثر انگیز تھیں۔ مثلاً 'ڈرپوک'، 'ناگ'، 'پرندہ'، 'مجبوری' وغیرہ۔ یہ کہانیاں چھوٹی چھوٹی ہیں اور چھوٹے چھوٹے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ لیکن ان کے موضوعات اور ان کو خوب صورت طور پر برتنے کے انداز نے انہیں اچھی کہانیاں بنا دیا — زیادہ تر کہانیاں بڑے شہر اور متوسط درجے کے انسانوں کے ارد گرد گھومتی ہیں۔ اور اپنا اثر بھی چھوڑتی ہیں۔ لیکن اس طرح کی کہانیاں تو ہم اردو ہندی میں پڑھتے رہتے ہیں۔ سندھی ادب کی کہانیاں پڑھتے وقت ہماری یہ تلاش فطری ہو جاتی ہے کہ ان تمام کہانیوں میں بقول کرت بابانی سندھیت کہاں ہے؟ سندھی کردار کہاں ہے؟ یا میں اپنی زبان میں کہوں کہ سندھی کلچر کہاں ہے۔ اس کا رہن سہن، رفتار و گفتار، محاورے وغیرہ جو ہمیں اس جغرافیائی ذائقے سے آشنا کرائے — جس سے ہم واقف نہیں ہیں اس انتخاب میں تنہا داشتہ کہانی ایسی ہے جس میں ایک ہلکی سی جھلک دکھائی پڑتی ہے۔

اس کہانی میں ایک ہلکی سی جھلک اس لیے دکھائی پڑ گئی کہ کہانی کار حیدر آباد سندھ میں مقیم ہے اور اس کے کلچر سے بہت قریب ہے اس کی کیا وجہ؟ یہ سوال بار بار ذہن میں اٹھتا رہا، لیکن بعد میں جب کرت بابانی اور ہرلیش واسوانی کے مضامین پڑھے تو میرے سوال کا جواب بڑی حد تک مجھے مل گیا۔ دونوں ہی فاضل مضمون نگار نے قلم کاروں کو اپنی زمین سے الگ ہونے کی وجہ تقسیم اور ہجرت بتائی۔ پھر میں نے غور کیا کہ اس انتخاب میں ان مسائل پر ایک کہانی نہیں تھی۔ کیا یہ انتخاب ناقص ہے یا سندھی ادب میں قابلِ ذکر افسانہ نہیں لکھا گیا۔ ہرلیش واسوانی کے مضمون نے اشارے بھی کیے ہیں کہ ان مسائل پر ناول ضرور ملتے ہیں۔ کہانیاں نہیں — اس کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ شاید یہ کہ سندھی کلچر دراصل تجارت کا کلچر رہا ہے۔ اپنی زمین سے اکھڑنے کے بعد جتنی تیزی سے یہ قوم دوسرے علاقوں میں بسی اور پھلی پھولی ہے شاید اتنی دوسری نہیں بس سکی۔ معاشی طور پر یہ ہمیشہ مضبوط رہے۔ تہذیبی و ثقافتی طور پر نسبتاً کمزور۔ اگرچہ ان کے ڈانڈے سندھ گھاٹی کی سبھیتا سے ملتے ہیں۔ بمبئی، احمد آباد، دہلی وغیرہ سے متعلق کہانیاں پڑھ ڈالیے، اندازہ ہی نہ ہوگا کہ کوئی مہاجر کہانی لکھ رہا ہے — ہندوستان کے مشترکہ کلچر کی رو سے یہ ایک اچھی بات ہو سکتی ہے لیکن اس کی اپنی انفرادیت، شناخت کا مسئلہ بہر حال سامنے آتا ہے تو جب یہ شناخت گوبند پنجابی اور گوبند مالہی جیسے پرانے کہانی کاروں کے یہاں نہیں ملتی تو ہم نئے لوگوں سے کیا توقع کریں۔ ہمیں تو ان کی تعریف کرنی چاہیے۔ کہ نہایت تیزی سے انہوں نے اپنے آپ کو ہندوستان کے موجودہ مشترکہ کلچر Assimilate کرا لیا ہے اور اس Assimilation میں ترقی پسندی و روشن خیالی کی ایک دبیز چادر پڑی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

کم از کم اس انتخاب کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ موجودہ دور میں سندھی کہانی کاروں میں عورت پیش پیش ہے۔ اس کی کہانیوں میں زندگی ہے توانائی ہے۔ اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو پس پردہ سندھی تہذیب کی یہ اپنی ایک الگ پہچان ہے۔

شاعری کے بارے میں میں اپنی رائے محفوظ رکھتا ہوں۔ بس اتنا ہی عرض کروں گا کہ شاعری کے ترجمے کا میں بہت زیادہ قائل نہیں — شاعری Close Circuit کا فن ہے جس میں ایک ایک حرف کو اپنی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اس لیے شعری ترجمے میں وہ بات نہیں رہ جاتی یہ میری اپنی رائے ہے جو غلط بھی ہو سکتی ہے — بہر حال آپ کو اور ان مترجمین کو مبارک باد پیش کرتا ہوں، جن کی کاوشوں سے یہ خوب صورت نمبر ہم تک پہنچا اور ہم فیض یاب ہو سکے۔

علی احمد فاطمی، الہ آباد

سنگ میل

"آج کل" کا شاندار کارنامہ 'سندھی ادب نمبر' کی شکل میں پیش نظر ہے۔ 'سندھی ادب نمبر' کے مطالعے کے بعد اطمینان ہوا کہ یہ زبان ابھی نہ صرف زندہ ہے بلکہ اس کا ادبی سرمایہ دیگر ادبی سرمائے سے کم نہیں۔ جدید ہندی کہانی نمبر' اور پنجابی کہانی نمبر کے بعد سندھی ادب نمبر ایک سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔

ڈاکٹر وجیب الرحمٰن، مظفر پور

اُردو کا مقبول عام معتبر ماہ نامہ

آجکل
نئی دہلی

چیف ایڈیٹر
راج نرائن راز

سب ایڈیٹر
خورشید اکرم

جلد : ۴۸ شمارہ : ۴

نومبر ۱۹۸۹ء کارتک ۔ اگرہائن شک سمت ۱۹۱۱

قیمت : دو روپے فون : ۳۸۷۰۶۹

اندرونِ ملک زرِ سالانہ : ۲۰ روپے
دو سال کے لیے : ۳۶ روپے
تین سال کے لیے : ۴۸ روپے

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :
چیف ایڈیٹر : آج کل اُردو
پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱

پروڈکشن آفیسر : آر۔ ایس۔ منگال

ترسیلِ زر کا پتہ :
بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن
پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

جواہر لال نہرو نمبر

ترتیب

ملاحظات :

پنچایتی راج : بھارتی جمہوریت کی رُوح

پنچایتی نظام ایک ایسا تصوّر ہے جو بھارتی تاریخ، تہذیب، روایات اور مزاج میں گہرائی سے پیوست ہے۔ یہ نظام بھارت میں قدیم دَور سے موجود ہے۔ پرانے زمانے سے ہی۔ اعلیٰ سطح پر نظامِ حکومت سے قطع نظر یہ نظام ناگزیر نوعیت کا بنیادی، سیاسی، سماجی و اقتصادی ادارہ رہا ہے۔ طاقتور برطانوی سامراج وادی حکومت، نیز دیگر غیر ملکی حکمران بھی جنہوں نے دو صدی سے زائد عرصے تک بھارت پر حکومت کی، اس نظام کو تبدیل نہیں کر سکے۔ زراعت پیشہ لوگوں کے درمیان اس ادارے کو ایک سماجی عقیدے کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی جسے کوئی بھی چیلنج نہیں کر سکا۔ گاؤں کے پانچ منتخبہ عقل مند بزرگ افراد سے پنچایت کی تشکیل ہوتی تھی جنہیں احتراماً "پنچ پرمیشور" کہا جاتا تھا۔ انصاف کے لیے کسی فرد یا گروپ کی جانب سے انہیں کوئی معاملہ سپرد کیے جانے پر، اُن کے فیصلے کو مقدس حکم سمجھا جاتا تھا۔ "پنچ پرمیشور" کے عنوان سے عظیم افسانہ نگار منشی پریم چند کی تحریر کردہ مشہور مختصر کہانی میں جو تیسری دہائی میں لکھی گئی تھی۔ ایک گاؤں میں پنچایت کے اختیارات نیز بے ایمان اور بد عنوان لوگوں تک کی سیرت تک کو بدل دینے کی اس کی صلاحیتوں کی حقیقت پسندانہ عکاسی کی گئی ہے۔

اس عجیب و غریب نظام کا احیاء ہونے والا ہے جو حقیقتاً بھارت میں نچلی سطح پر سیاسی، سماجی اور اقتصادی ڈھانچہ نیز سب سے بڑھ کر جمہوریت کے تصوّر اور اس کی عملی شکل اور جمہوریت کی روح ہے۔ وزیرِ اعظم شری راجیو گاندھی نے کچھ عرصہ قبل ملک میں پنچایتی نظام کے احیاء، نیز لوکل سیلف گورنمنٹ کے شہری اور نیم شہری اداروں کی تجدید کا عمل شروع کیا ہے۔ انہوں نے اس عزم کا اظہار کیا ہے کہ وہ پارلیمنٹ کے آئندہ مانسون اجلاس میں اس مقصد کے لیے دو قوانین کے بل پیش کریں گے — ملک بھر کے گاؤں میں پنچایتی راج قائم کرنے نیز شہری علاقوں میں مقامی حکومت کے تمام اداروں کو عملی طور پر قانونی حیثیت دینے جانے کے لیے پارلیمنٹ میں دونوں بلوں کے پاس ہو جانے کے بعد جیسی کہ توقع ہے۔ آئین میں ۶۴ ویں ترمیم کو عملی شکل مل جائے گی — درحقیقت موجودہ اقدام ایک پرانی ذمہ داری کی تکمیل ہے۔

پنچایتی راج بابائے قوم مہاتما گاندھی کے مطابق بھارتی عوام کے سوراج کی بنیاد ہے۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ بھارت کی آزادی کی ابتدا نچلی سطح سے ہونی چاہیے۔ اس طرح ہر ایک گاؤں میں جمہوریت یا پنچایت ہو گی جس کو مکمل اختیارات حاصل ہوں گے۔ ہر ایک گاؤں کو خود کفیل اور اپنے معاملات خود نپٹانے کا اہل ہونا چاہیے۔ دیہی سوراج کا میرا تصوّر یہ ہے کہ یہ ایک مکمل جمہوریت ہونی چاہیے۔ جو اپنی اہم ضروریات کی تکمیل کے لیے پڑوسیوں پر منحصر نہ ہو۔ ساتھ ہی اسے دوسرے پر بھی منحصر ہونا چاہیے۔ کیوں کہ ایک دوسرے پر انحصار ایک ضرورت بھی ہے۔ اس طرح پنچایت کے زیرِ انتظام ایک گاؤں کو ایک ایسی جمہوریت بننا ہے جو زیادہ تر خود کفیل ہو اور اپنے معاملات آزادی کے ساتھ نپٹا سکے۔ لیکن لازمی طور سے ضلع اور ملک کا ایک اٹوٹ حصہ بھی ہے۔ یہ نظام جمہوری لامرکزیت کی بہترین مثال ہونا چاہیے۔ گاندھی جی بھارت میں حقیقی جمہوریت کا قیام چاہتے تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ مرکز میں بیٹھے بیس افراد حقیقی جمہوریت قائم نہیں کر سکتے — اس کا قیام نچلی سطح پر ہر ایک گاؤں کے لوگ کریں گے۔ گاندھی جی کے مطابق ایک فرد خود اپنی حکومت کا معمار ہے۔ یہ تصوّر پنچایتی راج کی اساس ہے۔

بھارت کے اوّلین وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کا بھی خیال تھا کہ عوام سے نہ صرف مشورہ کیا جانا چاہیے بلکہ اُنہیں موثر اختیارات بھی سونپے جانے چاہئیں۔ ظاہر ہے کہ مرکزی اعلیٰ سطح سے مقامی سطح کو اختیارات کی منتقلی کے بغیر عوام کو موثر اختیارات دینے کا کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔

ہر چند کہ پنڈت جواہر لال نہرو کی حکومت قومی تعمیرِ نَو کے زبردست منصوبوں اور پراجیکٹوں نیز تیز رفتار ترقی و فروغ کے کام میں منہمک

رہی۔ لیکن پھر بھی اس نے گاندھی جی کے دیہی سوراج کے تصور کو نظر انداز نہیں کیا۔ بہت سی ریاستوں میں جن میں مدھیہ پردیش سرفہرست ہے اپنی اپنی مناسبت سے' دو سطحی یا تین سطحی پنچایتی نظام کا تجربہ کیا۔

کچھ ریاستوں نے قوانین میں اہم ترامیم کی ہیں تاکہ وہ پنچایتی راج ادارے قائم کرسکیں۔ (مدھیہ پردیش قدیم سی پی اور برار) ان میں سرفہرست ہے۔ ریاستی حکومت نے مقامی جھگڑوں میں انصاف دلانے کی غرض، سے "نیائے پنچایت" قائم کرنے کے لیے بھی اقدامات کیے۔ مہاراشٹر میں تین سطحی پنچایتی نظام قائم کیا گیا تھا، جس نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ پنچایتوں کی کارکردگی گجرات، آندھرا پردیش، کرناٹک' تامل ناڈو، ہماچل پردیش اور مغربی بنگال میں بہت اچھی رہی۔ وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے حال ہی میں مغربی بنگال میں پنچایتی راج کی کارکردگی کو کافی سراہا ہے۔

پنچایتی نظام اس وقت ملک کی ۲۷ ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں میں موجود ہے۔ گو کہ ان کی نوعیت نیز اُن کے انتظامی اور مالی اختیارات ایک دوسرے سے مختلف ہیں تاہم پنچایتی راج کی تصویر لامرکزی اختیارات اور فرائض کے ایک معقول طریقے کی عکاسی نہیں کرتی ہے۔ مختلف ریاستوں کے قوانین میں خامیاں اور بے ضابطگیاں ہیں جن کی وجہ سے اختیارات کم ہو سکتے ہیں یا ختم بھی ہو سکتے ہیں اور جن سے مقامی اداروں کے وجود کو خطرہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں بھارت کے آئین کی منظوری حاصل نہیں ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ ہمارے آئین کے بانیوں نے نچلی سطحوں پر جمہوری اداروں کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ آئین کے چوتھے باب کی دفعہ ۴۰ میں جو ریاستی پالیسی کے ہدایتی اصولوں پر مشتمل ہے، کہا گیا ہے۔

گاؤوں کی پنچایتوں کا قیام: ایک ریاست گاؤوں کی پنچایتیں قائم کرنے کے لیے اقدامات کرے گی اور انہیں ضروری اختیارات دے گی تاکہ وہ سیلف گورنمنٹ کے یونٹوں کے طور پر کام کرسکیں" مختلف ریاستی حکومتوں نے اپنی اپنی سیاسی ضرورتوں اور سہولتوں کی مناسبت سے اس ہدایت کی تشریح کی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام ایک مکمل اور یکساں پنچایتی راج سے محروم ہوگئے۔ تاہم بھارت میں مقامی حکومت کا ایک مؤثر لامرکزی نظام وضع کرنے کے بارے میں غور و فکر کا سلسلہ آزادی کے بعد جاری رہا۔ حکومت نے ۱۹۵۷ء میں اس مقصد کے لیے بلونت رائے مہتہ کمیٹی مقرر کی۔ جنتا پارٹی کے عہد میں ۱۹۷۷ء میں مقرر کی گئی اشوک مہتہ کمیٹی نے پنچایتی راج اداروں کو مستحکم بنانے کے لیے آئینی ضابطوں کی خاص طور سے سفارش کی۔ بعد میں تھنگن کمیٹی نے بھی پنچایتی راج اداروں کو آئینی منظوری دینے کی سفارش کی۔ جی۔ وی۔ کے۔ راؤ کمیٹی نے، جو ۱۹۸۵ء میں قائم کی گئی تھی، پنچایتوں کے باقاعدہ انتخابات کو یقینی بنانے کے لیے ایک طریقۂ کار وضع کرنے پر زور دیا۔ ڈاکٹر ایل ایم سنگھوی نے ۱۹۸۶ء میں پنچایتی راج اداروں کے بارے میں قومی ورک شاپ کے لیے ایک نظریاتی خاکہ تیار کیا۔ مرکز ریاست تعلقات کے بارے میں سرکاریہ کمیشن نے بھی اس معاملے کا جائزہ لیا اور سیلف گورنمنٹ کے مقامی ادارے چلانے کی غرض سے پورے ملک کے لیے ایک نمونہ جاتی بل تیار کرنے کی سفارش کی۔ جس کی بنیاد پر ریاستی قانون ساز اسمبلیاں اپنے اپنے ضمنی قوانین وضع کرسکیں۔ وزیر اعظم نے ۱۹۸۷ء میں جوابدہ انتظامیہ کے بارے میں پانچ ورکشاپ سے خطاب کیا تھا اور جولائی ۱۹۸۸ء میں ریاستوں کے چیف سکریٹریوں کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ ان ورکشاپوں اور کانفرنس میں بھی پنچایتی راج کے لیے آئینی ضابطہ کے نظریہ کی حمایت کی گئی تھی۔

لہٰذا آئین میں ۶۴ ویں ترمیم کی تجویز ایک باضابطہ اور مناسب پنچایتی راج قائم کرنے اور اُسے برقرار رکھے جانے کی غرض سے پیش کی گئی ہے۔ لیکن ملک بھر میں یکساں طور پر مکمل عملی مقامی جمہوریت کے قیام کے لیے آئینی بنیادی ڈھانچے کی تکمیل تب ہی ہوگی جب پارلیمنٹ آئندہ اجلاس میں دیہی اور شہری مقامی حکومتی اداروں کے بارے میں دونوں بلوں کو منظوری دے دے گی۔ اس بات کی بجا طور سے اُمید کی جا سکتی ہے کہ نئے دہے کے آغاز میں بھارت میں عملی پنچایتیں اور مقامی حکومت کے دیگر ادارے موجود ہوں گے۔

○ ○ (لیشونت اگکارے)

کچھ "جواہر لال نہرو نمبر" کے باب میں

نومبر ۱۹۸۹ء کا شمارہ "جواہر لال نہرو نمبر" کی صورت میں پیش خدمت ہے۔ یہ نمبر ضخامت کے اعتبار سے گو عام شمارے جتنا ہے، مگر آپ محسوس فرمائیں گے کہ یہ خاصی قدر و اہمیت کا حامل ہے۔ اس نمبر میں ملک کے معتدد اہل قلم اور نہرو شناسوں کے مضامین اس طرح جمع کیے گئے کہ پنڈت نہرو کی زندگی اور کارناموں کا بہ کمال و تمام احاطہ ہو سکے۔

پنڈت جی بڑے باپ کے بڑے بیٹے تھے۔ اعلیٰ تعلیم پائی تھی۔ جیسا کہ انہوں نے ایک جگہ خود لکھا ہے، اُن کے گھر پر مغربی تہذیب کا خاصا دور دورہ تھا۔ لیکن یہ بات جہاں اپنی جگہ اچھا معلوم ہوتی ہے۔ وہاں خوش آئند اور خوش گوار بھی کہ پنڈت جی کے دل میں ہندوستان اور

ہندوستانیوں کا دُکھ درد، اُن کے تئیں گہری ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اسی جذبے سے سرشار ہوکر وہ ظاہرہ زندگی کے سبھی شکھ تج کر جنگِ آزادی میں شریک ہوگئے۔ پنڈت جی اور اُن کے رفیقوں کی سیاسی بصیرت، بے مثل ایثار پسندی اور مقصد کے حصول کے لیے کسی بھی قربانی سے گریز نہ کرنے کا جذبہ اُن کے کام آیا۔ اُن کی اور اُن کے رفیقوں کی ان تھک مساعی کام آئیں۔ مُلک آزاد ہوا۔

پنڈت جی کے نزدیک ملک کی آزادی ملک کی تاریخ کا ایک اہم موڑ تھا۔ ایک پڑاؤ تھا۔ جہاں سانس لیے بغیر آگے کی طرف، ترقی کی طرف۔ معاشی اقتصادی آزادی کی طرف قدم بڑھانا تھا۔

پنڈت جی مُلک کے پہلے وزیرِ اعظم بنے۔ ملک نے ترقی اور خوشحالی کی نئی راہ پائی۔ سیاسی استحکام کے ساتھ ساتھ قوم کو سائنسی مزاج عطا کیا۔ سائنسی ترقی کی راہیں ہموار کیں۔ نتیجتاً ہندوستان نے سائنس کے میدان میں ایسی ترقیاں اور کامیابیاں حاصل کیں کہ شاید و باید۔ ملک میں اقتصادی صورتِ حال بہتر بنی۔ ماضی کے مقابلے میں آج ہمارے رہن سہن کا معیار مختلف اور بہت بہتر ہے۔ ترقی اور خوشحالی کے اعتبار سے ہندوستان کا شمار بعض اعتبارات سے دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کی صفِ اوّل میں ہوتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک کی دنیا میں اس کا ایک اپنا مقام ہے۔ بڑا نام ہے۔ اس کی آواز ہے: انتہائی معتبر، نہایت وزن وقار کی حامل۔ آج اقوامِ عالم میں ہندوستان سر اُٹھا کر چلنے کے لائق بنا ہے۔ یہ بھی دراصل اُن کامیاب مساعی کا ثمرہ ہے جن کی داغ بیل پنڈت جی نے ڈالی تھی۔

موجودہ برس پنڈت جی کی صد سالہ سالگرہ کی تقریبات کے برس کے طور پر منایا جا رہا ہے۔ پنڈت جی جیسے مثالی محبِ وطن اور عوام دوست

کے تئیں ملک کے عوام کا بہترین خراجِ عقیدت یہ ہوگا کہ ہم اُن کی زندگی کو، اُن کے کارناموں کو اپنے لیے مثال بنائیں، اُن کے نقشِ قدم پر چلیں، جذبۂ ایثار سے کام لیں، اپنی تہذیبی رنگارنگی میں یکرنگی کا احترام کریں۔ مل کر رہیں۔ مل کر چلیں۔ مل کر بڑھیں اور ہندوستان کو اپنے لیے اور اقوامِ عالم کے لیے باعثِ افتخار بنائیں۔

توقع ہے کہ "آج کل" کا زیرِ نظر خصوصی شمارہ پنڈت جی کی تعلیمات کو عام کرنے کا موثر وسیلہ ثابت ہوگا۔ اگر اس سے عوام کے ذہن و فکر میں ترقی و بہتری کی ایک کرن بھی پھوٹی تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری یہ سعی کامیاب ہوئی۔

زیرِ نظر شمارہ میں شامل مضامین وزارتِ خارجہ حکومتِ ہند کے انگریزی ماہنامہ "انڈیا پرسپیکٹو" کے شکریے کے ساتھ شائع کیے جا رہے ہیں۔ سرورق کا ڈیزائن بھی رسالہ ہٰذا کا مرحمت کردہ ہے۔ اس کے لیے ہم "انڈیا پرسپیکٹو" کے چیف ایڈیٹر جناب دلیپ سنگھ صاحب کے ممنون و متشکر ہیں۔

کے۔جی۔جوگلیکر

نہرو: یادِ خوش انجام

جواہر لال نہرو کی وفات کو پچیس سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے، لیکن جن لوگوں کو اُن سے ملنے کا موقع نصیب ہوا تھا، ان کے دل میں نہرو کی یاد ابھی تک تازہ ہے جس سے انہیں بڑا فیضان حاصل ہوا۔ اور ان کی زندگی باکمال ہو گئی۔ ہندوستان سیکڑوں اعتبار سے جواہر لال نہرو کے خوابوں کی تعبیر کا شاہد ہے۔ بھاکڑہ کی طرح کی دیو قامت پن بجلی اور سینچائی اسکیمیں جنہیں نہرو ہندوستان کے نئے مندر کہتے تھے۔ فولاد کے کارخانے اور بھاری صنعتیں، جو ان کی وزارتِ عظمٰی کے دور میں قائم ہوئے، قومی تحقیقی رصدگاہیں، تیل صاف کرنے کے اور پیٹرو کیمیکل کارخانے جو آج ہمیں ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، سب اُس شخص کی زندہ یادگاریں ہیں جو ایک نئے ہندوستان، ایک خوشحال، جمہوری اور ترقی پسند قوم کی تشکیل کا خواہاں تھا۔ اور جو ایسے سماجی، سیاسی اور اقتصادی ادارے قائم کرنا چاہتا تھا۔ جن کے ذریعے اس ملک میں بسنے والے ہر مرد اور عورت کے لیے انصاف اور زندگی کی تمام نعمتیں یقینی بن جائیں۔"

جدوجہدِ آزادی میں شامل اپنے تمام ساتھیوں کی طرح جواہر لال نہرو بھی بدیسی راج کا جُوا اُتار پھینکنا چاہتے تھے، لیکن غیر ملکی تسلط کے خلاف ہندوستان کے لوگوں کی جدوجہد نہرو کی نظر میں کوئی ایک الگ تھلگ چیز نہیں بلکہ ساری دنیا میں سامراج، نو آبادیاتی نظام اور استحصال کے خلاف بڑی جدوجہد ہی کا ایک حصہ تھی۔

پچھلے پچاس برسوں میں دنیا کا سیاسی نقشہ بالکل بدل گیا ہے۔ اس لیے یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ دوسری عالمی جنگ سے پہلے ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ملک یا تو پوری طرح غیر ملکی غلبہ میں تھے یا پھر مجبوراً یورپی ملکوں کے حلقہ بگوش تھے۔ جواہر لال نہرو نے ان محکوم قوموں کے لیڈروں کے ساتھ ذاتی تعلقات قائم کیے اور سامراج کے خلاف ایک مشترکہ محاذ بنانے کی کوشش کی اور ان کے کہنے پر انڈین نیشنل کانگریس کے صدر دفتر میں غیر ملکی معاملات کا ایک شعبہ قائم کیا گیا۔ کانگریس اور ان ملکوں کی قومی پارٹیوں کے لیڈروں کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔

دوسری عالمگیر جنگ سے فوراً پہلے کے برسوں میں فسطائیت یورپ میں ایک طاقت بن کر سامنے آئی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اُس وقت جب کہ یورپی جمہوریتوں کے بعض لیڈر ڈکٹیٹروں کے گُن گا رہے تھے۔ نہرو کے ذی حِس دل و دماغ نے فسطائیت کے تشدد اور بھدے پن کے خلاف آواز اُٹھائی چنانچہ ۱۹۳۶ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے لکھنؤ اجلاس میں نہرو نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا تھا:

> "بڑی بڑی طاقتیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں محکوم قوموں کی آزادی کی جدوجہد اور سامراج کی انہیں کچل دینے کے عزم پر جنگ کے سیاہ بھیانک بادل چھا رہے ہیں۔ استحصال کے شکار طبقے آزادی اور مساوات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اطالوی سامراج ایتھوپیا کے بہادروں پر ہلاکت خیز بمباری کر رہا ہے، جاپانی سامراج کی شمالی چین اور منگولیا میں جارحیت جاری ہے، برطانوی سامراج دوسرے ملکوں کے نازیبا طرزِ عمل پر پارسایانہ طور پر نکتہ چینی تو

۴۔ منسٹری اپارٹمنٹس، اے۔ بی۔ پشچم وہار، نئی دہلی ۳

کرتا ہے، لیکن ہندوستان میں اُس کا خود طرزِ عمل ویسا ہی ہے اور اس سب کی پشت پر ایک روبہ زوال معاشی نظام ہے جس کی وجہ سے ان تمام کشمکشوں نے شدت اختیار کر لی ہے ؟

کانگریس نے فیض پور اجلاس میں اپنے صدارتی خطبہ میں نہرو نے نسطائیت اور فسطائی حکومتوں کو برطانوی سرکار کی مضمر حمایت کی اور بھی زیادہ واضح طور پر مذمت کی۔ نہرو نے اسپین کی خانہ جنگی کا ذکر کیا، جہاں ایک جمہوری حکومت پر بھاڑے کے غیر ملکی فوجیوں کی مدد سے فسطائی فوجی بغاوت کی گئی ہے۔ نہرو نے اس موقع پر فلسطین میں برطانوی سامراج کے خلاف عرب جدوجہد کا بھی ذکر کیا۔ اس طرح یہ ظاہر ہوا کہ جواہر لال نہرو ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں ایک نمایاں سرگرم حصہ لیتے وقت اسے دنیا بھر میں خاص طور پر ایتھوپیا، اسپین اور چین میں جاری بڑی جدوجہد کا ایک حصہ تصور کرتے تھے اور یہ بڑی قابلِ غور بات ہے کہ دوسری عالمگیر جنگ کے شروع ہونے کے تین برس بعد نہرو کو چین، اسپین اور ایتھوپیا کے حالات میں ایک عالمی جھلک کے آثار نظر آرہے تھے۔

چنانچہ یہ عین فطری بات تھی کہ جب جواہر لال نہرو نے ہندوستان کی حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو انہوں نے دنیا بھر میں آزادی کے لیے لڑنے والی قوموں کے لیے اپنی دوستی اور مدد کا ہاتھ بڑھایا۔ الجیریا، ملیشیا، اسرائیل کے خلاف عرب مفاد، جنوبی افریقہ میں نسل پرستی کے خلاف جدوجہد، سب ہی کو نہرو کی قیادت میں ہندوستان سے مدد ملی۔

انہوں نے ہندوستان کی خارجہ پالیسی کے اصولوں کو یوں بیان کیا:

"آزاد ہندوستان جس "ایک دنیا" کے لیے کام کرے گا۔ وہ دنیا ایسی ہوگی جس میں آزاد قوموں کے درمیان آزادانہ طور پر باہمی تعاون ہوگا اور کوئی طبقہ یا گروپ دوسرے کا استحصال نہ کر پائے گا۔" نہرو دنیا کے تمام ملکوں کے ساتھ دوستانہ اور باہمی تعاون پر مبنی تعلقات رکھنا چاہتے تھے اور امید کرتے تھے کہ روس اور امریکہ اپنی طاقت اور وسائل "ہر جگہ امن اور انسانی آزادی کے فروغ کے لیے" استعمال کریں گے لیکن عالمی امور میں محویت کے باوجود وہ ایشیائی ملکوں کو جو دوسرے ملکوں کے مقابلے ہندوستان سے زیادہ قریب تھے کبھی نہیں بھولے۔ انہوں نے ایک طرف جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں اور دوسری طرف افغانستان، ایران اور عرب ملکوں کے ساتھ زیادہ قریبی رشتے جوڑنے کی کوشش کی اور پھر نہرو کی وضع کردہ "ناوابستگی کی پالیسی" امن و آزادی کی ایک عالمی تحریک بن گئی۔

سامراج، نوآبادیاتی نظام اور فسطائیت کے ساتھ نہرو کا مکمل بیر صرف سیاسی اور نظریاتی بنا پر نہیں بلکہ اس وجہ سے بھی تھا کہ ان نظاموں کے تحت انسان کا کوئی وقار نہیں ہوتا بلکہ وہ ذلیل و خوار رہتا ہے۔ نہرو کے حساس ذہن کو اسپین، چین اور فلسطین کے حالات سے اتنی ہی چوٹ لگتی تھی جتنی کہ ہندوستان کے اندر کسانوں پر زمینداروں کے مظالم سے ــــــ جس نسل کو ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی دیکھنے کا فخر حاصل ہوا تھا، اس نے متعدد موقعوں پر یہ بھی دیکھا تھا کہ نہرو نے جہاں کہیں بھی ناانصافی ہوتی دیکھی وہ فوراً کمزوروں کی مدد کے لیے کمربستہ ہو گئے۔

چنانچہ ۱۹۴۲ء میں "بھارت چھوڑو" تحریک کے شروع میں عالم حراست میں جواہر لال نہرو نے جب ایک ریلوے اسٹیشن میں پولیس کو کچھ طالب علموں کو پیٹتے ہوئے دیکھا تو وہ ریل کے ڈبے سے تقریباً کود پڑے تھے۔ اس کے کچھ برس بعد جب دہلی میں فساد ہو رہے تھے اور وہ حکومت کے سربراہ تھے۔ کچھ بے قصور آدمیوں کو بچانے کے لیے وہ اپنی ذاتی حفاظت کی مطلق پروا کیے بغیر فسادیوں کے ایک مجمع میں کود پڑے تھے۔

جواہر لال خود بڑے باہمت انسان تھے اور باہمت آدمیوں کے مداح تھے۔ ۱۹۶۰ء میں نیویارک میں جہاں وہ ادارۂ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ایک خاص اجلاس میں شریک ہونے کے لیے گئے تھے، نہرو نے صدر کاسترو سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا، وہ کچھ ہی عرصہ پہلے برسرِ اقتدار آئے تھے اور امریکی لیڈروں کے لیے باعثِ تنفر تھے۔ کیوبا کے جوان لیڈر بہت متاثر ہوئے کہ نہرو نے جن کی زندگی کی شام ہو رہی تھی، صرف ان سے ملاقات کرنے کے لیے نیویارک میں ایک طویل فاصلہ طے کیا۔ اس کے کئی سال بعد مسٹر کاسترو نے بتایا کہ انہوں نے نہرو سے یہ زحمت کرنے پر احتجاج کیا تھا۔ لیکن نہرو کا جواب بہت سیدھا سادہ تھا۔ "میں نے محسوس کیا کہ مجھے آپ سے ملنے آنا ہے۔ کیوں کہ آپ بہت بہادر انسان ہیں"۔ مسٹر کاسترو نے یہ بھی بتایا کہ نہرو کے اس خراج سے اُن کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے ــــــ مشہورِ عالم ایک اور لیڈر نے بھی جواہر لال نہرو کے تعلق سے کہا ہے کہ اگرچہ وہ حکومت کے سربراہ تھے تاہم حزبِ مخالف کے لیڈروں سے ان کے تعلقات مثالی تھے۔ مصر کے مرحوم صدر انور سادات نے مصری پارلیمنٹ میں انہیں ایک تقریر کے دوران ہندوستان کے اُس وقت کے اپنے ایک دورے کا ایک واقعہ بیان کیا جب کہ وہ مصر کے نائب صدر تھے۔ انور سادات نے جب ایک دفعہ ہندوستان کی پارلیمنٹ میں دیکھا کہ مخالف پارٹیوں کے ممبروں نے جواہر لال نہرو کی، جن کا ملک کے باہر اتنا زیادہ احترام کیا جاتا ہے، سخت نکتہ چینی کی تو وہ حیرت میں رہ گئے۔ بعد میں مسٹر انور سادات نے جب نہرو کی سالگرہ کی ایک پارٹی میں ان ہی ممبروں کو نہرو سے بڑی محبت اور احترام سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا تو وہ ایک بار پھر حیرت میں پڑ گئے۔ چنانچہ انور سادات سے نہ رہا گیا اور ان لیڈروں سے انہوں نے اپنے تعجب کا اظہار کیا۔ انہیں جواب ملا۔ "وہ پارلیمنٹ تھی اور ہم وزیرِ اعظم کی نکتہ چینی کر رہے تھے۔ لیکن جواہر لال نہرو کے لیے ہمارے دل میں بڑی قدر و منزلت ہے۔ یہ ان کی سالگرہ ہے اور یہاں

بقیہ صفحہ ۲۶ پر

رویندر کمار

ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی میں نہرو کا بے مثال حصہ

جواہر لعل نہرو ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی میں اس وقت شامل ہوئے تھے جب مہاتما گاندھی کا ستیہ گرہ انگریزوں کے خلاف لڑائی میں ہمارا حربہ اور علامت بن چکا تھا۔ لیکن جواہر لعل نے دس برس کے اندر ہی اس جدوجہد میں ایک سوشلسٹ سماجی و معاشی عنصر داخل کرکے اسے ایک نظریاتی موڑ دے دیا جو ایک انقلابی تبدیلی تھی۔ جواہر لعل کا یہ بھی اصرار تھا کہ ملک کے آئندہ سیاسی نظام کے لیے انسان دوستی پر مبنی سیکولرازم ضروری ہے کیونکہ ان کے خیال میں ملک کے مقدر کا یہی تقاضہ ہے۔

جواہر لعل نہرو نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی آدھی رات کو ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی میں کہا تھا۔ "بہت برس پہلے ہم نے اپنے مقدر سے ایک وعدہ کیا تھا، اب وہ وعدہ پورا کرنے کا وقت آ پہنچا ہے۔ پورا تو نہیں لیکن بہت بڑی حد تک — آدھی رات کے بارہ بجتے ہی جب دنیا سو رہی ہوگی ہندوستان غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر بیدار ہوگا اور ایک نئی زندگی کی سانس لے گا۔ تاریخ میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے (گو کہ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے) جب ہم پرانے خول سے نکل کر ایک نیا چولا پہنتے ہیں، جب ایک عہد ختم ہو جاتا ہے اور جب کسی قوم کی مدت سے کچلی ہوئی روح کو گویائی حاصل ہو جاتی ہے۔"

جواہر لعل نہرو نے یومِ آزادی سے ماقبل شام کی اپنی تقریر میں مقدر سے جس ملاپ کا ذکر کیا تھا وہ اس تحریک آزادی کا نتیجہ تھا جس کی حیثیت بیسویں صدی میں ایک روشن مینارہ کی ہے۔ نہرو اس تحریک میں کیسے آئے؟ کیا تحریک آزادی میں شامل ہونے سے ان کا مطمحِ نظر بالکل بدل گیا؟ اور اگر ایسا ہوا تو پھر نہرو نے اس جدوجہد کے نظریاتی کردار کو کس طرح متاثر کیا جو ہندوستان نے تاریخ عالم کی سب سے بڑی سامراجی طاقت کے خلاف کی۔ یہ ہیں کچھ سوالات جو ہم ہندوستان کی آزادی کے حصول اور بعد میں اس کے ایک خود مختار مملکت کی تشکیل میں نہرو کے حصہ پر گفتگو کرتے وقت خود سے پوچھ سکتے ہیں۔

جواہر لعل نہرو کو Harrow اور کیمبرج میں اپنی طالبِ علمی کے زمانہ میں بھی ہندوستان کے سیاسی واقعات سے گہری دلچسپی تھی۔ اس وقت ان کی ہمدردیاں پوری طرح تحریک آزادی کے زیادہ جانباز مجاہدین کے ساتھ تھیں، یہاں تک کہ ایک دفعہ ان کا اپنے والد پنڈت موتی لعل نہرو سے اس بارے میں سخت اختلاف بھی ہو گیا تھا، کہ جدوجہد آزادی کا کیا رخ ہونا چاہیے۔ چنانچہ جب جواہر لعل ہندوستان واپس آئے اور انہوں نے ۱۹۱۴ء میں الٰہ آباد میں وکالت شروع کی تو انہیں قومی سیاست کی پھسپھسی اور بے اثر نوعیت اور ہندوستانی لیڈروں کی اعتدال پسندی پر بڑی مایوسی ہوئی۔

بہر حال پہلی عالمگیر جنگ کے بعد مہاتما گاندھی کے سامنے آنے سے ملک کی صورتِ حال میں بڑی تبدیلی آئی۔ گاندھی جی نے جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی قیادت کرنے کے دوران سیاسی عمل کا ایک نیا طریقہ دریافت کیا تھا جو اہنسا اور ستیہ گرہ پر مبنی تھا۔

ڈائرکٹر نہرو میوزیم و لائبریری، تین مورتی بھون، نئی دہلی

چنانچہ ۱۹۱۹ء میں گاندھی جی نے انگریزی سامراج کے خلاف لڑنے اور اس سے آزادی حاصل کرنے کے لیے قوم کے سامنے ستیہ گرہ کا حربہ پیش کیا۔ اس حربہ کے استعمال کا موقعہ رولٹ ایکٹ نے فراہم کر دیا۔ اس قانون کا مقصد ہندوستان کے لوگوں کو اُن شخصی اور ملکی حقوق سے محروم کرنا تھا جو مہذب حکومت کی بنیاد ہیں۔ مہاتما گاندھی نے اپنے ہم وطنوں سے کہا کہ وہ ستیہ گرہ کے حربہ کے ذریعے اس غیر اخلاقی قانون کے خلاف احتجاج کریں۔ جواہر لعل، برطانوی سامراج پر غیر متشددانہ حملہ کی گاندھی کی اپیل سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں لکھا ہے کہ "جب میں نے پہلی بار اخباروں میں گاندھی جی کی تجویز پڑھی تو میں نے بہت اطمینان کی سانس لی۔ کیونکہ یہ مسئلہ کا ایک ایسا حل، ایک ایسا طریقۂ عمل تھا جو سیدھا، کھلا ہوا اور غالباً موثر تھا۔"

چنانچہ ۱۹۱۹ء میں اور ۲۲-۱۹۲۰ کے دوران اہنسا پر مبنی مہاتما گاندھی کی برطانوی حکومت کے خلاف تحریکوں میں نہرو نے اپنی شمولیت سے اس ساری نوجوان نسل کی نمائندگی کی جسے مہاتما گاندھی نے تحریک آزادی میں کھینچ لیا تھا۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے اس جدوجہد نے ملک کے مختلف فرقوں اور طبقوں کے ایک شاندار اتحاد کی شکل اختیار کی جس میں ہندو، مسلمان اور سکھ۔ امیر، غریب اور متوسط طبقہ۔ شہروں اور دیہاتوں میں رہنے والے لوگ بھی شامل تھے۔ جواہر لعل کے لیے تحریک ترکِ موالات میں شرکت ایک تجربہ تھا۔

جواہر لعل رفتہ رفتہ الہ آباد کے ارد گرد کے ضلعوں میں ہونے والی زرعی تحریکوں میں شامل ہو گئے جس نے اس نوجوان قوم پرست اور دیہاتوں کے لوگوں کے درمیان ایک گہرا اور اٹوٹ رشتہ پیدا کر دیا۔ جیسا کہ جواہر لعل نے خود لکھا ہے۔ "میں کچھ ساتھیوں کے ساتھ الہ آباد کے اطراف کے دیہی علاقہ میں گیا اور وہاں ہم نے دیہاتوں میں، ریلوے اور پکی سڑک سے بہت دور تین دن گزارے۔ میرا وہاں جانا میرے لیے ایک دریافت تھی۔ ہم نے دیکھا کہ ہمارے سارے دیہات ایک عجیب وغریب جوش وخروش سے لبریز ہیں۔ ہم جب ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جاتے تو لوگ بھاگتے ہوئے اور دوڑتے ہوئے آتے۔ یہ لوگ مرد اور عورتیں ۔ دونوں، چیتھڑے لگائے ہوئے تھے لیکن ان کے چہروں پر ایک اُمنگ اور ان کی آنکھوں میں ایک چمک تھی اور ایسا لگتا تھا کہ انہیں بڑی توقعات ہیں گویا کسی جادو کے ڈنڈے سے ان کی ساری پرانی مصیبتیں ختم ہو جائیں گی۔ میری نظروں میں ہندوستان کی ایک نئی تصویر اُبھرنے لگی۔"

جب مہاتما گاندھی نے ۱۹۲۲ء کے شروع میں تحریک ترک موالات واپس لے لی تو جواہر لعل کو اس ملک گیر تحریک کو ایسے مرحلہ پر واپس لینے پر بہت سخت مایوسی ہوئی، اس لیے کہ تحریک اس وقت تک بہت زور پکڑ چکی تھی، لیکن جیسا قدرت کو منظور تھا، جواہر لعل نے اگلے چند برس سوشلسٹ ادب کے مطالعے میں گزارے کیونکہ وہ اپنے ذہنی افق کی توسیع اور ہندوستان میں قوم پرست تحریک کا ایک نیا ادراک چاہتے تھے ۔۔ ان کے سوشلزم کے اس مطالعہ کو دنیا کے مختلف حصوں کے ان قوم پرست اور سوشلسٹ لیڈروں کے ساتھ تبادلۂ خیالات سے بڑی تقویت ملی جو ۱۹۲۷ء میں Brussels میں منعقدہ نو آبادیاتی استحصال اور سامراج کے خلاف بین اقوامی کانگرس میں شریک ہونے کے لیے جمع ہوئے تھے۔

سوشلزم کی طرف رجوع ہونے سے کافی پہلے ہی جواہر لعل کے ذہن میں یہ شبہات پیدا ہو گئے تھے کہ وہ ان لوگوں کو جنہیں انہوں نے سامراج کے خلاف جدوجہد میں کھینچا ہے آخر کیا دیں گے۔ بہرحال یہ جواہر لعل کی بین الاقوامی سوشلسٹ تحریک کے ساتھ باہمی ارتباط کی دین تھی کہ انہوں نے ہندوستان کے لوگوں خاص طور پر پرجوش دانشور طبقہ کے سامنے کانگرس اور قوم پرست سیاست کی نظریاتی بنیاد کا ایک بالکل نیا تناظر پیش کیا۔ جواہر لعل نے اب یہ محسوس کیا کہ ہندوستان کی قومی سیاست کا پورا ادراک عالمی پس منظر ہی میں ہو سکتا ہے۔ ان کی نظر میں ہندوستان کی یہ تحریک ایشیا اور افریقہ کی مجبور قوموں کی سامراج کی غلامی سے آزادی کی جدوجہد کا ایک لازمی حصہ تھی۔ علاوہ بریں، قوم پرست تحریک محض سیاسی جدوجہد نہیں ہو سکتی، یہ ملک کے کسانوں اور مزدوروں کی ان کا استحصال کرنے والوں (خواہ وہ ہندوستانی ہوں یا غیر ملکی) کے خلاف سماجی اور اقتصادی جدوجہد بھی ہے۔ بالفاظ دیگر ۱۹۲۰ء کے دہے کے آخری سالوں تک جواہر لعل ان دو بنیادی نتیجوں پر پہنچ چکے تھے۔ پہلا یہ کہ سامراج نے ہندوستان کے اندر ایسے خود غرض ہندوستانی مفادات پیدا کر دیتے ہیں جو غریبوں کے استحصال میں اتنے ہی شامل ہیں جتنا کہ برطانوی برسر اقتدار طبقے۔ دوسرا یہ کہ

ں تحریک کو سیاسی نظام کی تبدیلی کے لیے اتنی ہی جد وجہد کرنی
، جتنی کہ سماجی اور معاشی نظام کی از سرِ نو تنظیم کے لیے. بالفعل تحریک
، یہ دونوں پہلو اٹوٹ طور پر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں.

جواہر لعل نے قومی تحریک کے اپنے سوشلسٹ تناظر کو
ہندوستان کے لوگوں، خاص طور پر دانشوروں، مزدوروں اور کسانوں
ے سامنے متعدد پلیٹ فارموں سے رکھا. لیکن ان کے انقلابی تصور
بہترین اظہار ۱۹۲۹ء میں لاہور میں انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ
لاس میں ہوا. جہاں مجمع مندوبین نے ہندوستان کے لوگوں کے
یے مکمل آزادی کے مقصد کو منظور کیا تھا. جواہر لعل نے صدارتی کرسی
ے ملک کی صورت حال کے بارے میں وہاں کہا تھا — "ہندوستان
مطلب کسان اور مزدور ہے — اپنے کاموں میں ہم اسی حد تک
میاب ہوں گے جس حد تک ہم کسان اور مزدور کی ضرورتیں پوری
ریں گے، اور اس کے معیارِ زندگی کو اونچا کریں گے. ہماری قومی تحریک
ی مضبوطی کا پیمانہ یہی ہے کہ ہم اس مقصد پر کتنا قائم رہتے ہیں.
باجاتا ہے کہ کانگریس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ سرمایہ دار اور
زدور نیز زمیندار اور کسان کے درمیان مناسب توازن قائم
کھے. لیکن یہ توازن ابھی تک ایک جانب بہت زیادہ جھکا رہا ہے.
ور اب بھی ایسا ہی ہے، اور آج کی حالت کو جوں کا توں بنائے رکھنا
انصافی اور استحصال کو قائم رکھنا ہے. صورت حال کو درست کرنے
ا واحد طریقہ یہی ہے کہ کسی ایک طبقہ پر کسی دوسرے طبقہ کا غلبہ نہ
رہنے دیا جائے."

جواہر لعل نہرو کا یہ انقلابی تصور، جو انہوں نے
کانگریس اور ساری قوم کے سامنے رکھا، ایک بڑی بحث کا نقطۂ
آغاز بن گیا. جس میں ایک طرف تو وہ تھے جو ہندوستان کی تشکیلِ
نو سرمایہ دارانہ خطوط پر چاہتے تھے. اور دوسری طرف ملک کے مخصوص
تاریخی تقاضوں کے مطابق وضع کردہ سوشلسٹ راستہ اختیار
کرنے کے حامی. اس بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ قومی لیڈروں میں جواہر
لعل کا شمار مہاتما گاندھی کے بعد دوسرے نمبر پر ہونے لگا.
زیادہ اہم بات یہ ہوئی کہ جواہر لعل کی کوشش سے کانگریس کے
اندر ایک 'منصوبہ بند کمیٹی' اور ایک 'محکمۂ
امورِ خارجہ' قائم ہوئے. ان دو اداروں نے ملک کی اقتصادی
ترقی اور خارجہ پالیسی کے لیے خاکے تیار کیے جن پر ملک کی انگریزی
راج سے آزادی کے بعد عمل درآمد ہوتا.

یہ جواہر لعل کی دانشورانہ قیادت کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۳۰ء کے
دہے تک قوم پرست تحریک کے نظریاتی مسلک میں نمایاں
تبدیلی آگئی تھی. نہرو نے لوگوں کے سامنے ایک ایسے جدید صنعتی
سماج کا تصور رکھا جس کا ڈھانچہ جمہوری، سوشلسٹ اور سیکولر
تھا. نہرو کے 'اچھے سماج' کے اس خواب نے نہ صرف اس نسل
کو متاثر کیا جو ۱۹۳۰ء کے دہے میں سنِ بلوغ کو پہنچی تھی بلکہ ۱۹۴۷
کے بعد کے دہوں میں اختیار کی جانے والی ملک کی پالیسی کے
لیے بھی راہ ہموار کی.

چنانچہ ہندوستان کی تحریک آزادی پر جواہر لعل کا
بہت گہرا اثر رہا. نہرو قوم پرست سیاست میں مہاتما گاندھی
کے زیرِ اثر ضرور شامل ہوتے تھے لیکن وہ جلد ہی ستیہ گرہ کے
نظریہ سے تجاوز کر گئے اور انہوں نے لوگوں کے سامنے سماجی تشکیلِ
نو کا ایک تصور پیش کیا جس میں آزادانہ نظام اور سوشلزم کے عناصر
مساویانہ طور پر موجود تھے. یہی تصور ۱۹۵۰ء کے دہے میں ہندوستان
کو ایک جدید سماج بنانے کا خاص محرک بنا. اس لیے یہ کوئی تعجب
کی بات نہیں کہ جن کہ جن محققین نے جواہر لعل کی زندگی کا مطالعہ
کیا ہے، اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نہرو نہ صرف ایک طویل قامت قوم
پرست رہنما تھے بلکہ ایک ایسے جدید صنعتی سماج کے بانی بھی تھے
جس کا ایک ستون عوامی جمہوریت ہے اور دوسرا انسان دوستی
پر مبنی سیکولرازم.

مترجم: خواجہ عبدالخالق

بقیہ: نئی کتابیں

ہیں. ذیل میں مثال کے لیے خوف طوالت کے باعث محض چند ہی نظموں
کے مختصر اقتباسات درج کرنے پر اکتفا کیا جا رہا ہے ..." سوال پیدا
ہوتا ہے کہ کیا اس عبارت کا پہلا جملہ خلیل صاحب کے کسی ہم عصر کی
شاعری کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا؟ اور یہ "خوف طوالت" (دیگر
بہت سے نام نہاد نقادوں کی طرح)، ایسے ہی موقعے پر کیوں پیدا ہوا
کہ جب متن سے آنکھیں چار کرنی ضروری تھیں؟

آخر میں بزبانِ ڈاکٹر اسلام عشرت، یہی کہنا پڑتا ہے —
"... بے حد افسوس کا مقام ہے کہ اعظمی کی شاعری پر کسی نے تفصیلی
کام ابھی تک نہیں کیا ہے."

(شمس الحق عثمانی)

رشید الدین خاں

سیاسی نظام کے معمار نہرو

بعض زندگیاں لافانی ہوتی ہیں۔ وہ موت کے بعد بھی فنا نہیں ہوتیں اپنے کارہائے نمایاں سے حیاتِ جاودانی حاصل کرلیتی ہیں اور لوگوں کے دلوں میں زندہ رہتی ہیں۔ جواہرلال نہرو ایک ایسی ہی شخصیت تھے۔ انھوں نے اس دنیائے فانی کی واجبیت کا احترام کرتے ہوئے انسانی سرگرمیوں کے ہر شعبے میں بہتری لانے کے لیے انتھک کوششیں کیں۔ ان کی اوجِ ثریا تک پہنچنے کی کوششوں کے پیچھے یہ خواہش موجود تھی کہ وہ ایک ایسا نظام چھوڑ جائیں جو ان کے دارِ فانی سے کوچ کرنے کے بعد بھی ملک کی راہوں کو روشن کرتا رہے۔

اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ پنڈت نہرو نہ صرف اپنے ہم وطنوں بلکہ ان تمام لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں جو دنیا کے مختلف حصوں، بالخصوص ایشیا، افریقہ، اوشیانا اور لاطینی میں مصروفِ جدوجہد ہیں۔

نہرو محض ایک فرد نہیں تھے۔ وہ ایک مکمل انسان تھے۔ وہ ایک خاص رجحان اور ایک خاص اندازِ نظر کی ترجمانی کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کو کروڑوں افراد کی زندگیوں میں مدغم کردیا تھا اور اس طرح وہ ہر کس و ناکس کی زندگی میں جیتے تھے۔

جواہرلال نہرو کی زندگی میں ہندوستان کے روشن دماغ اور وسیع النظر آدمی کی وراثت کے تین اہم عناصر کا امتزاج نظر آتا تھا۔ یہ عناصر ہیں نظریہ ویدانت جو سچائی کے بہت سے راستوں کے لیے رواداری اور احترام کا جذبہ رکھتا ہے، ہندوستان کی مشترکہ ثقافت جس میں انڈو مسلم کلچر کی شستگی اور نفاست بھی شامل ہے، قبائلیوں کا سا جوش و خروش نیز شہری ثقافت کی وسیع المشربی۔ آزادی، قوم پرستی، سیکولر سیاست اور جمہوری سوشلزم کے جاندار اصول جو انھوں نے مغربی تہذیب سے مستعار لیے۔ یہ سب چیزیں ہندوستان کی قومی تحریک کے آدرشوں کا ایک اہم حصہ بنیں۔

ایک زیادہ "مکمل" ہندوستانی" کی تلاش میں جواہرلال نہرو نے اپنی شخصیت میں ہندوستانی تہذیب کی نشو و نما کے قدیم، وسطی اور جدید ادوار کی اہم اور مستقل خصوصیات کو سمولیا۔ انھوں نے وراثت میں پورا ہندوستان پانے پر زور دیا اور پایا بھی۔

جواہرلال نہرو ہر طرح کی ظلمت پسندی، علیحدگی پسندی، تنگ نظری اور تعصبات سے یکسر آزاد تھے وہ ذات پات اور فرقہ پرستی کے خلاف پورے جوش و خروش سے لڑے، اُسی طرح جیسے انھوں نے سیاست اور سماجی معاملات میں جاگیردارانہ رجعت پسندانہ اور طبقاتی اندازہائے نظر کی مخالفت کی تھی۔ ان کی نگاہوں میں سماجی و اقتصادی تبدیلی کا ایک مربوط اور صحت مند تناظر تھا جس میں نظریاتی ہم آہنگی تھی۔

ان کی سیاسی طاقت کا راز یہ تھا کہ انھوں نے ہندوستان کے سماجی حالات کی پیچیدگیوں کو پوری طرح سے سمجھ لیا تھا۔ وہ ہندوستان کی سب سے بڑی اور ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تحریک (کانگریس) کو سیاسی بیداری اور حصولِ اقتدار کے ایک ذریعے کے طور پر استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے اندر جمہوری تعمیرِ نو کے لیے قومی تحریک کے جاندار عناصر۔ گوکھلے کی پارلیمانی طرز کے بحث مباحثے کی مہارت، تلک کے سوراج کے تصور، گاندھی جی کی عوامی مقبولیت اسودیشی تحریک، دہشت پسندوں کے پُرجوش جذبۂ حب الوطنی اور مارکسی انقلابیوں کے سماجی و اقتصادی انقلاب کے مطالبے۔

• پروفیسر سینٹر فار پولیٹیکل اسٹڈیز جواہرلال نہرو یونیورسٹی، نیو مہرولی روڈ، نئی دہلی ۶۷

کا ایک خوبصورت امتزاج پیش کرنے کی اہلیت تھی۔ پنڈت نہرو ہندوستانی سیاست میں ایک مختلف اور ممیز رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں۔

انھوں نے جس سیاسی نظام کی تشکیل میں مدد دی اس کی بنیادی طاقت کا دارومدار اس کی جمہوری اور وفاقی طرز کی قومی تعمیر اور سماجی و اقتصادی تبدیلی کے دو بنیادی نصب العینوں کو باہم ملانے کی صلاحیت پر تھا۔ نوآبادیاتی راج کی جگہ لینے والے قومی نظام کے لیے سب سے بڑی شرط یہ تھی عوام اسے قبول کریں کیونکہ اسے عوامی قبولیت کی بنیاد پر ہی سیاسی استحکام حاصل ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ سیاسی استحکام کے بغیر نہ تو حکومت کے لیے سماجی و اقتصادی تبدیلی کا عمل شروع کرنا ممکن تھا نہ عوام اس عمل میں اپنا مناسب اور موثر رول ادا کر سکتے تھے۔

جواہر لال نہرو کو کسی بھی طرح جمہوری راستے سے ہٹایا نہیں جا سکتا تھا۔ ایسی کوئی بھی تجویز ان کی نظر میں ایک بیہودہ تجویز تھی۔ دنیا کی تاریخ میں شاید بہت ہی کم جمہوری رہنماؤں کو عوام کی اس قدر بے پایاں محبت حاصل ہوئی ہو جتنی کہ نہرو کو حاصل تھی اور درحقیقت وہ اس کے مستحق بھی تھے۔ جب وہ اپنی سیاسی زندگی کی نچلی سطح پر تھے تو بھی جمہوریت کے لیے ان کا جذبہ غیر متزلزل تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اچھی طرح سے یہ سمجھ لیا تھا کہ ہندوستان جیسے ملک میں سیاسی اتحاد اور سیاسی استحکام صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے جب جمہوری نظام اور وفاقی ڈھانچے کو ہندوستان کے نئے سیاسی نظام کے دو بڑے ستونوں کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے۔

انھوں نے سیکولر، معقولیت پسند اور جمہوری زندگی، ثقافت و نفاست سے متصف بابصیرت زندگی کے اصولوں پر عمل کیا اور ان اصولوں کی تبلیغ بھی کی۔ انھوں نے ادبی ذوق پایا تھا اور مطالعہ کے بہت شوقین تھے وہ ایک کثیر نویس مصنف، سیاحت کے دلدادہ اور بہت اچھے مقرر تھے۔ فن گفتگو میں بھی انہیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ لیکن وہ دوسروں کی بات بھی بڑے صبر و سکون سے سنتے تھے۔ وہ سیاسی اور ملکی معاملات پر خوب لکھتے اور عوام کے علم میں اضافہ کرتے تھے۔ ان کی تحریریں، تقریریں اور بیانات کئی دہوں تک رائے عامہ کو ہموار کرتے رہے اور قومی زندگی کے بہت سے اہم معاملوں پر عوام کی رہنمائی کرتے رہے۔ ان کی دلچسپیاں متنوع تھیں اور ان دلچسپیوں کا سلسلہ تاریخ، ادب اور ثقافت سے شروع ہو کر طبیعیاتی و حیاتیاتی سائنسوں، ماحولیات اور ٹکنالوجی اور نباتات و حیوانات تک پہنچتا تھا۔ وہ حقوق انسانی کے ایک آفاقی انسان تھے وہ سارے جہاں کے تھے اور سارے جہاں کا درد ان کے دل میں تھا۔ ان کے لیے کوئی غیر نہیں تھا۔

ایک حقیقت جسے زیادہ بڑے پیمانے پر تسلیم نہیں کیا جاتا یہ ہے کہ کانگریس میں نہرو سے قبل کسی اور شخص نے اتنے تسلسل، جامعیت اور زور و شور سے سوشلزم اور سیکولرزم کی وکالت نہیں کی تھی۔ نہرو نے تو ان کی اتنی زیادہ حمایت کی کہ یہ قومی تحریک کے دو متفقہ نصب العین بن گئے۔

نہرو نے ایک بار فرقہ پرستی کی تشریح یوں کی تھی کہ یہ ہندوستان کا فاشزم ہے اس کے معنی صاف ہیں۔ فرقہ پرستی کا دیو ابھی تک ہندوستان میں موجود ہے اور اس کا سایہ لمبا ہوتا جا رہا ہے ہر کم ترقی یافتہ معاشرے میں قومی اتحاد، ثقافتی شناخت اور مذہبی استحکام کے نام پر مذہب، روایت اور رسم و رواج کا استعمال ظالمانہ اور غیر جمہوری تسلط کو مستقل بنانے کے لیے کیا جا رہا ہے نہرو کو ان خطروں کا احساس ہم سب سے پہلے ہو گیا تھا۔

جواہر لال نہرو کے کئی روپ تھے لیکن ہندوستانی، ایشیائی اور عالمی تاریخ پر ان کے جس روپ کا سب سے زیادہ اثر پڑا وہ غالباً ان کا سیاسی نظاموں کے معمار کا روپ ہے۔ وہ نہ صرف ایک ہشیار و بیدار ہندوستان کے معمار تھے بلکہ ایک بیدار اور نجات یافتہ ایشیا اور نوآبادیاتی راج سے آزاد ہونے والی دنیا کے معمار بھی تھے۔ ہماری قومی تحریک میں کسی اور شخصیت نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی اور ایشیا اور افریقہ کے بیشتر حصوں کی عوامی تحریکوں کے باہمی رشتے کو اتنی اچھی طرح نہیں سمجھا جتنا کہ نہرو نے۔ انھوں نے بڑی گہرائی سے ان رشتوں کا ادراک کیا۔

جواہر لال نہرو نے ہندوستان میں ایک وفاقی جمہوری ری پبلک کی تشکیل اور سماجی و اقتصادی انقلاب لانے کے عمل میں سب سے زیادہ تخلیقی رول ادا کیا۔ انھوں نے ہندوستان کی جدید کاری کے لیے صدق دلانہ کوششیں کیں جن کا اظہار قومی تعمیر نو کے چھ رہنما اصولوں کی شکل میں ہوا۔ یہ چھ اصول تھے (۱) زندگی کے تمام شعبوں میں معقولیت پسندی اور سائنسی مزاج پیدا کرنا (۲) سیاست میں سیکولر نظریئے کا اختیار کیا جانا (۳) ثقافت کو فروغ دینا اور اسے عام بنانا (۴) معیشت کی ترقی کے لیے جدید ٹکنالوجی اور سائنسی مہارتوں سے استفادہ کرنا (۵) سماجی انصاف، یکساں اور مربوط اقتصادی ترقی اور ترقی پسند سیاست کے مقاصد کی تکمیل کے لیے سوشلسٹ اصولوں کو ہندوستانی حالات کے مطابق بنانا اور (۶) شراکتی اور وفاقی جمہوریت کو تقویت اور استحکام بخشنا تاکہ بہت سی زبانوں، مذہبوں، ثقافتوں، نسلی گروہوں اور سماجی و اقتصادی طبقوں پر مشتمل اس وسیع و عریض ری پبلک کو سیاسی طور پر متحد رکھا جا سکے۔ ان اصولوں سے حوصلہ پا کر انھوں نے ایک نئے ہندوستان کی تعمیر کے پیچیدہ عمل کو ایک یقینی سمت عطا کی۔ یہی ہے ایک نظام کے معمار کی حیثیت سے ان کا نمایاں رول۔

(ترجمہ: لکشمی چندر)

ڈی۔آر۔ گوئل

ناوابستہ تحریک اور نہرو

ناوابستگی امورِ انسانی کے بارے میں نہرو کے اندازِ فکر کا جزو لاینفک ہے۔ ایک ایسے شخص کے لیے، جسے روحانیت اور سائنس دونوں ہی یکساں عزیز ہوں، یہ ایک قدرتی بات تھی چونکہ نہرو جی ایک حساس دل و دماغ کے مالک تھے اس لیے وہ نوعِ انسانی کا دُکھ درد شدت سے محسوس کرتے تھے۔ اس دُکھ درد کو کم کرنے اور کرۂ ارض پر انسانی زندگی کو بہتر بنانے کی راہ انہیں اسی اندازِ نظر میں دکھائی دی۔ یہ عین مناسب ہوگا کہ نہرو صدی کے اس سال میں اور بالخصوص ناوابستہ تحریک کے سربراہوں کی نویں کانفرنس کے موقع پر ناوابستگی کی پالیسی کے بارے میں ان کے خیالات پر غور کیا جائے کیوں کہ وہی تو ناوابستہ تحریک کے روحِ رواں تھے۔

جواہرلال نہرو شدت سے یہ محسوس کرتے تھے کہ انسانی اور بین اقوامی رشتوں کے لیے پرانا اندازِ نظر ناکافی ہے۔ انہیں اس امر کا بھی احساس تھا کہ لوگوں کے ذہن، بدلتے ہوئے ماحول کے مطابق کتنی سست رفتار سے ڈھلتے ہیں۔ اُنہوں نے مئی ۱۹۳۹ء میں اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ "ہمارے ذہنوں اور حقیقت کے درمیان بُعد ہمیں مسائلِ حاضرہ کو حل کرنے نہیں دیتا بلکہ جنگ، انقلاب اور ایسی ہی بہت سی باتوں کو جنم دیتا ہے جو دنیا کے لیے باعثِ مصیبت بنتی ہیں۔"

عصرِ حاضر کی چنوتیوں کا سامنا کرنے کے لیے ایک موزوں اندازِ نظر کی تلاش میں اُنہوں نے مشرق اور مغرب کی تواریخ اور فلسفوں کو چھان ڈالا۔ اس تلاش اور ایک سرگرم سیاسی کارکن کی حیثیت سے ان کے ذاتی تجربات کے باہمی ردِ عمل نے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں ان کی رہنمائی کی کہ کسی عقیدے، طے شدہ نظریے یا اقوام کی کسی جمعیت سے وابستگی نہ صرف طرزِ فکر کو متاثر کرتی ہے بلکہ آزادیٔ عمل کو بھی محدود کرتی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اس قسم کے موقف سے کتنے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ کیوں کہ وہ دیکھ چکے تھے کہ ماضی میں مذہبی رسوم و تعصبات کی مجنونانہ پیروی نے کس طرح لوگوں میں نفاق اور برادرکشی کا جذبہ پیدا کیا اور قومی اتحاد اور جدوجہدِ آزادی کو نقصان پہنچایا۔ لہٰذا اُنہوں نے ایک متحد اور جمہوری قوم کی تعمیر کے لیے سیکولر اندازِ نظر اختیار کرنے کی حمایت کی جس کے لیے ضروری ہے کہ بحث ٹھوس حقایق پر کی جائے نہ کہ گھسے پٹے قدامت پرستانہ نظریات پر خواہ وہ مذہبی ہوں یا لسانی یا ثقافتی۔ ہندوستانی عوام کی بہت بڑی تعداد نے اس طرزِ فکر پر مثبت ردِ عمل کا اظہار کیا۔ یہی طرزِ فکر بین اقوامی میدان میں ناوابستگی کی شکل میں پیش کیا گیا۔ داخلی معاملات کی طرح بین اقوامی امور میں بھی نہرو جی نے اس بات کی حمایت کی کہ تمام فیصلے قدیم مذہبی عقائد سے متاثر ہوئے بغیر بحث اور باہمی تبادلۂ خیالات کے ذریعے کیے جائیں۔ وہ چاہتے تھے کہ بین اقوامی میدان میں بحثیں ٹھوس، سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی مسائل کی بنیاد پر ہوں نہ کہ نظریاتی اختلافات کی بنیاد پر۔ انہیں نسلِ انسانی کے لیے مذہب یا عقیدے کے جواز سے انکار نہیں تھا، لیکن وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ اس سے جمہوری خطوط پر بنی نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کو آگے بڑھانے میں مدد ملے، کوئی رُکاوٹ پیش نہ آئے۔ ناوابستگی کے اصول کی تشریح سب سے پہلے ۴؍ دسمبر ۱۹۴۷ء کو آئین ساز اسمبلی میں ایک تقریر میں کی گئی تھی۔ مولانا حسرت موہانی نے خارجہ

● ڈی ۸۱/۱ بھارتی نگر، نئی دہلی ۳

پالیسی پر بحث کے دوران اس بات کی حمایت کی تھی کہ ہندوستان کو یہ اعلان کرنا چاہیے کہ امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان جنگ ہونے کی صورت میں ہندوستان مؤخرالذکر کی حمایت کرے گا۔ نہرو جی نے اس دلیل کو غیر دانشمندانہ قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا۔ اُنہوں نے کہا کہ آج خارجہ پالیسی کے ایک بڑے سوال پر اس اصطلاح میں بحث کی جارہی ہے کہ 'آپ اس گروپ کے ساتھ ہیں یا اُس گروپ کے' یہ معاملے کو حد سے زیادہ سادہ شکل میں پیش کرنے کی کوشش ہے۔ عزت مآب مولانا حسرت موہانی کے لیے یہ کہنا آسان ہے کہ ہندوستان اِس جھنڈے کے تلے میدانِ جنگ میں اُترے گا یا اُس جھنڈے کے تلے۔ لیکن یقیناً ایک ذمہ دار ایوان یا ایک ذمہ دار مُلک صورتِ حال کو اس نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔"

وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ چونکہ ان کا یہ اندازِ نظر غیر قدامت پسندانہ ہے اس لیے فوری طور پر اس کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ اُنہوں نے کہا: "ہم نے ایک یا دوسرے بلاک میں شمولیت نہ کر کے خارجی اُلجھنوں سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دونوں بڑے بلاکوں میں سے کوئی بھی ہمیں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ ہم سے اِس کے یا اُس کے حق میں ووٹ نہیں دلوایا جاسکتا۔" اُنہوں نے مزید فرمایا: "پہلے گروپ کو شک تھا کہ ہم دراصل خفیہ طور پر دوسرے گروپ کے ساتھ ہیں اور اس بات کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرا گروپ یہ سمجھتا تھا کہ ہم پہلے گروپ کے ساتھ ہیں اور حقیقت کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔" یہ ہے کسی بلاک میں شامل نہ ہونے یا ناوابستگی کا اصول۔

بحیثیت قوم عمل کی آزادی کے اس جذبے کی کونپل اُس وقت پھوٹی تھی جب انڈین نیشنل کانگریس نے ۱۹۳۹ء میں انگریزوں کی جنگی کوششوں میں ہاتھ بٹانے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ ہندوستان کی طرف سے جنگ یا امن کا اعلان کرنے کا حق سامراجی حکمرانوں کے حوالے نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے معنی یہ تھے کہ جب تک ہندوستان کو غلام رکھا جائے گا 'یہ دلیل کہ جنگ جمہوریت کی حفاظت کے لیے لڑی جارہی ہے محض ایک دکھاوا یا بہانہ تصور کی جائے گی۔ اس کا یہ مطلب بھی تھا کہ کسی مُلک کو صرف اس لیے جنگ میں نہیں گھسیٹا جاسکتا کہ وہ کسی بین اقوامی ملک یا سلطنت وغیرہ کا ایک حصّہ ہے۔ یہ قومی خود مختاری کا تقاضا تھا۔' اس اصول کی تشریح تھی کہ کسی تنازعے کے ایک یا دوسرے فریق کے بارے میں کوئی موقف نوآبادیاتی راج سے آزادی 'فسطائیت کی شکست اور امنِ عالم کے فروغ کی محبوب قدروں کی بنا پر ہی اختیار کیا جاسکتا ہے۔

ناوابستہ تحریک کی آٹھویں سربراہ کانفرنس کے سیاسی اعلانیہ میں تحریک کو "دنیا میں امن کے لیے اوّلین تحریک" قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ یہ تحریک "کشیدگی' جارحیت اور تنازعات کو ختم کرنے کے لیے' بین اقوامی تنازعات کے منصفانہ اور پُرامن تصفیے کے لیے" مکمّل اور عام ترکِ اسلحہ کے لیے' مبنی بر انصاف امن کی برقراری کے لیے اور تسلط 'امتیاز' استحصال اور نا برابری کے تمام آثار کے خاتمے کے لیے کام کرنے کا عہد کر چکی ہے۔

یہ تمام آدرش جواہر لال نہرو نے مارچ ۱۹۴۷ء میں منعقدہ 'ایشین ریلیشنز کانفرنس' کا افتتاح کرتے ہوئے اپنی تقریر میں بیان کیے تھے۔ نئی اقوام کے آزادانہ کردار کے بارے میں اُنہوں نے کہا تھا کہ "ہم عرصۂ دراز سے مغربی درباروں اور چانسلریوں میں داد خواہ رہے ہیں۔ اب یہ کہانی ماضی کی داستان بن جانی چاہیے۔ ہم اپنے پَیروں پر کھڑے ہونا اور اُن تمام لوگوں کے ساتھ تعاون کرنا چاہتے ہیں جو ہم سے تعاون کرنے کو تیار ہیں۔ ہم دوسروں کے ہاتھوں کا کھلونا نہیں بننا چاہتے"۔ ان کے خیال میں ایشیا ایک عظیم تبدیلی کے دَور میں آزاد قوموں کے ایک برِاعظم کے طور پر اپنا جائز مقام حاصل کر رہا تھا اور وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ "عالمی معاملات میں ایشیا کے اُبھرنے سے امن عالم کے لیے ایک بااثر آواز پیدا ہوگی۔" یہ ایک بحرانی دَور تھا جس کے لیے وہ یورپ اور امریکہ کو ذمہ دار قرار دیتے تھے۔ اگرچہ یہ مُلک انسانی ترقی کے لیے اپنی عظیم خدمات کے واسطے "تعریف واحترام" کے مستحق تھے تاہم "مغرب نے ہمیں بے شمار لڑائی جھگڑوں میں بھی دھکیل دیا ہے" ان کی رائے میں ان لڑائی جھگڑوں اور ان کے تباہ کُن نتائج سے انسانیت کو نجات دلانے کی ذمہ داری ایشیا پر عائد ہوتی تھی۔ اگر ہم "ایشیا" کو نوآبادیاتی دَورِ حکومت کے بعد کے نیشنلزم کی علامت سمجھیں تو یہ نظریہ اور بھی واضح ہوجاتا ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ناوابستگی کے معنی ہیں قوم پرستی یا قومی خود مختاری کا ادعا۔ لیکن یہ تنگ دلانہ یا جارحانہ قوم پرستی نہیں ہے جو اُنیسویں صدی کی مغربی قوم پرستی کی طرح دوسروں پر غالب آنے کی کوشش کرے۔ اس قوم پرستی کی ابتدا، ونشوونما اس احساس کے ایک حصّے کے طور پر ہوئی کہ ساری انسانیت ایک کُنبہ ہے۔

نہرو جی نے اس کانفرنس میں بطورِ خاص یہ واضح کیا کہ "اس کام میں نہ کوئی رہنما ہے نہ پَیرو۔" یہ خیال آج ناوابستہ تحریک کے لیے بھی اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے اور تحریک کے اتحاد کے لیے تو بہت ہی ضروری

ہے۔ قوموں کے درمیان مساوات کے ساتھ دوسری قوموں کے تئیں ذمہ داری ساری انسانیت کے تئیں ذمہ داری اور ان قوموں کے تئیں ذمہ داری بہ خاص طور پر زور دیا گیا جو نسل پرستانہ اور استعماریت پسند حکومتوں کے ظلم و ستم کا شکار ہو رہی ہیں۔ یہاں افریقی عوام کی مثال قابلِ ذکر ہے۔

اس سیاق و سباق میں اُنہوں نے "اقوامِ متحدہ" کے لیے اپنی حمایت کا اعلان کیا۔ جس کے بارے میں اُن کا خیال تھا کہ "وہ بڑی مشکلات کے ساتھ عہدِ طفولیت سے اُبھر رہی ہے۔" وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ نئی قوموں کو "ایک دنیا کے آدرش کے لیے" کام کرنا چاہیے نہ کہ "کسی گروہ بندی کے لیے جو وسیع تر عالمی گروپ کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔"

وہ بین اقوامی تعاون اور دنیا میں امن کے لیے قومی آزادی کو ضروری سمجھتے تھے لیکن ان کا خیال تھا کہ "یہ آزادی اِس قوم یا اُس قوم یا کسی خاص قوم تک محدود نہیں ہونی چاہیے بلکہ تمام نسلِ انسانی کے لیے ہونی چاہیے۔" ان کی مُراد "ساری دنیا کے لوگوں کی آزادی" سے تھی جو "کسی خاص طبقے کی برتری یا بالادستی" پر مبنی نہ ہو۔ وہ "ہر جگہ کے عام آدمی کی آزادی" چاہتے تھے "جس سے اُسے ترقی کے پورے مواقع میسّر ہو سکیں۔"

ان کے نزدیک امن اور آزادی کو "اس کے سیاسی و اقتصادی پہلوؤں کے ساتھ" دیکھنا ضروری ہے۔ تبھی تو اُنہوں نے اپنی تقریر میں پسماندگی دُور کرنے اور معیارِ زندگی بلند کرنے پر خاص طور سے زور دیا تھا اُنہوں نے کہا تھا کہ اگر اقتصادی مسائل کو فوری طور پر حل نہیں کیا گیا تو "ہمیں بحران اور تباہی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔"

اسی تقریر میں انہوں نے ثقافتی و اطلاعاتی سامراجیت کو ختم کرنے کے لیے اپنی تشویش کا اظہار کیا تھا جسے ان دنوں ناوابستہ تحریک کی بحث مباحثوں میں ایک اہم جگہ دی جاتی ہے۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ "ایشیا پر یورپی تسلط کا ایک قابلِ توجہ نتیجہ یہ ہے کہ ایشیا کے مُلک ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہو گئے ہیں۔" "ان ملکوں میں سے ہر ایک کی معیشت کسی نہ کسی سامراج سے بندھی ہوئی ہے۔" اور "ثقافتی طور پر بھی وہ یورپ کی طرف دیکھتے ہیں نہ کہ اپنے دوستوں اور پڑوسیوں کی طرف جن سے کہ اُنہوں نے ماضی میں اتنا کچھ حاصل کیا ہے۔"

ناوابستگی کے نظریے نے آزادی کے ابتدائی ایام میں ہی نہرو جی کے ذہن میں ایک واضح شکل اختیار کر لی۔ اس ناوابستگی کا مطلب محض غیر جانب داری یا اُبھرتے ہوئے طاقتی بلاکوں سے علیحدگی نہیں تھا بلکہ بعض قدروں کا ادعا اور ان قدروں کا جاری و ساری رکھنے کا عہد تھا۔ اپنے اس نظریے کی تشریح اُنہوں نے اکتوبر ۱۹۴۹ء میں، .... کولمبیا یونی ورسٹی نیویارک میں اپنے ایک خطبے میں کی۔ اُنہوں نے ہندوستان کی خارجہ پالیسی کے اغراض و مقاصد درج ذیل الفاظ میں بیان کیے۔

"کسی بڑی طاقت یا طاقتوں کے گروپ کے ساتھ شامل ہوئے بغیر ہر اختلافی اور متنازعہ معاملے پر آزادانہ اندازِ نظر کے ساتھ امن کے کاز کی پیروی، ماتحت اقوام کی آزادی، قومی اور انفرادی آزادی کا تحفظ، نسلی امتیاز کا خاتمہ، قلت، بیماری اور جہالت کا خاتمہ، جنہوں نے دنیا کی آبادی کے بیشتر حصّے کو اپنے پنجوں میں جکڑ رکھا ہے۔"

جو لوگ بین اقوامی امور پر پرانے اندازِ فکر کو ترک نہیں کر سکتے تھے، اُنہیں فیصلے کرنے کے اس نئے طریقے کو اختیار کرنا دشوار نظر آیا ــــ نئے نظریے کو دفاترِ خارجہ نے یا تو خیالی سمجھ کر مسترد کر دیا یا اُسے موجودہ دونوں بلاکوں سے الگ ایک نیا بلاک بنانے کی کوشش قرار دیا۔ لیکن عام آدمیوں نے جو اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ان کا رہنما بین اقوامی اکھاڑے کے جغادریوں کے سامنے کھڑا ہے، اس نظریے کو عزّت و توقیر کی نگاہوں سے دیکھا۔ نو آبادیاتی راج کی غلامی سے آزاد ہونے والی نئی اقوام کے رہنماؤں نے بھی اس کا خیر مقدم کیا۔ اِن نئے رہنماؤں کے ساتھ جواہر لال نہرو کی خوب نبھی۔ رفتہ رفتہ پانچویں دہے کے اختتام تک اُبھرتی ہوئی اس نئی دنیا کے رہنماؤں ـــــ ٹیٹو، ناصر، سوئیکارنو، اینکروما، سیکوتورے کے درمیان ایک عام مفاہمت پیدا ہو گئی اور اُنہوں نے مل کر ناوابستہ تحریک کی بنا ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۶۱ء میں بلغراد میں منعقدہ ناوابستہ ممالک کے سربراہانِ حکومت کی ایک کانفرنس میں اس تحریک کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اٹھائیس سال بعد ایسی نویں کانفرنس بلغراد میں منعقد ہو رہی ہے۔

اس سفر کے دوران تحریک کے ارکان کی تعداد بڑھ کر چارگُنی ہو گئی ہے اور تحریک کے خیالات و عقائد نے ایک نیا عالمی نظام لانے کے لیے ایک جامع لائحۂ عمل کی صورت اختیار کر لی ہے۔ جواہر لال نہرو نے ہندوستان کے روزِ آزادی سے ناوابستہ تحریک کے آغاز تک کی مدّت کے دَوران جن خیالات کی تخم ریزی کی تھی، اُنہیں ایک واضح شکل دے دی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے ابتدائی مرحلوں میں امن اور ترکِ اسلحہ کی پکار کی نوعیت آزمائشی رہی ہو یا اس کے پیچھے یقین و اعتماد کی کچھ کمی پائی گئی ہو۔ تاہم آج نیوکلیائی ہتھیاروں سے پاک ایک غیر تشدد پسند دنیا" کا نصب العین قابلِ حصول نظر آتا ہے اور اس کا ایک ثبوت ترکِ اسلحہ کے موضوع پر گزشتہ سال منعقدہ اقوامِ متحدہ کا خصوصی اجلاس ہے

ایک سربراہ کانفرنس سے دوسری سربراہ کانفرنس تک کا سفر تحریک کے دوسرے پہلوؤں کی نشوونما کی شہادت پیش کرتا ہے۔ جبکہ پہلی سربراہ کانفرنس میں امن اور ترکِ اسلحہ کو مرکزی موضوع بنایا گیا قاہرہ میں ۱۹۶۴ء میں منعقدہ دوسری سربراہ کانفرنس نے حقِ خود اختیاری پر توجہ مرکوز کی اور یہ اعلان کیا کہ "جب تک غیر منصفانہ حالات موجود رہیں گے اور غیر ملکی تسلط کے زیرِ نگیں اقوام 'آزادی' بے انحصاری اور حقِ خود اختیاری کے بنیادی حقوق سے محروم رہیں گی دنیا میں مستقل اور دیرپا امن قائم نہیں ہو سکتا۔"

۱۹۷۰ء میں لوساکا میں منعقدہ تیسری سربراہ کانفرنس میں تحریک نے اقتصادی پہلو کی جانب ایک لمبی جست لگائی۔ کانفرنس نے اس اعتماد کے ساتھ کہ ناوابستہ ممالک انفرادی طور پر اور ایک کثیر اقوامی کوآپریٹیو تحریک کے اندر رہتے ہوئے دونوں صورتوں میں اپنی اقتصادی ترقی کا منصوبہ خود بنا سکتے ہیں اور خود ہی اس پر عمل درآمد کا بندوبست کر سکتے ہیں؛ یہ اعلان کیا کہ "اقوامِ متحدہ کا دوسرا ترقیاتی دہہ عالمی اقتصادی نظام میں ایسی تبدیلیاں کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے' جن کی بدولت غریب اقوام کی شدید ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے، ان کی آزادی کو مستحکم بنایا جا سکے اور عالمی معیشت کی زیادہ تیز رفتار اور زیادہ متوازن توسیع کا اہتمام کیا جا سکے۔"

اس نئی سمت کو ۱۹۷۳ء میں الجیئرز میں منعقدہ چوتھی سربراہ کانفرنس میں منظور کیے گئے اقتصادی تعاون کے ایکشن پروگرام میں زیادہ واضح شکل دی گئی۔ اس پروگرام کا مقصد انفرادی اور اجتماعی خود انحصاری کو یقینی بنانا تھا اور یہ سامراجیت کے خلاف جدوجہد کے سیاق و سباق میں وضع کیا گیا تھا۔ الجیئرز کانفرنس کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں اطلاعات اور خیالات کے باہمی تبادلے کو بڑھانے پر زور دیا گیا بعد میں اس نے ایک نئے اطلاعاتی اور مواصلاتی نظام کے لیے ایک جامع مطالبے کی شکل اختیار کر لی۔

باہمی روابط، بڑھتی ہوئی بیداری اور بڑھتے ہوئے اعتماد نے تحریک کو اپنے مقاصد زیادہ واضح الفاظ میں بیان کرنے پر راغب کیا۔ کولمبو کانفرنس (۱۹۷۶ء) نے ایک نیا بین اقوامی معاشی نظام بنانے کے لیے ہونے والی پیش رفت کو غیر تسلی بخش بتایا۔ نصب العین کے حصول کے لیے کانفرنس کے اعلانیہ میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ترقی پذیر ملکوں کو "خود انحصاری کے پُراعتماد جذبے" کا مظاہرہ کرنا ہوگا اور "مالی، تکنیکی، تجارتی اور دیگر شعبوں میں اپنے درمیان تعاون کے بے پناہ امکانات کا پتہ لگانے اور انہیں بروئے کار لانے کے لیے اپنی آمادگی" کا ثبوت دینا ہوگا۔

کولمبو کے بعد سربراہ کانفرنسیں ۱۹۷۹ء میں ہوانا میں' ۱۹۸۳ء میں نئی دہلی میں اور ۱۹۸۶ء میں ہرارے میں منعقد ہوئیں۔ یہ سفر ایک آسان سفر نہیں رہا۔

مختلف ثقافتی پس منظروں کی کثرت، ترقی کی مختلف سطحوں اور مختلف تاریخی تجربات کے باعث کئی چنوتیاں اور دشواریاں پیش آئیں۔ ناوابستہ تحریک کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس نے اپنے مخالفین کی انتشار پیدا کرنے کی کوششوں کے باوجود ان چنوتیوں کا مقابلہ کیا۔

ان تمام کانفرنسوں میں ایک احساس یہ پایا گیا کہ اگرچہ تحریک کے مقاصد قطعی واضح ہیں، نتائج خصوصاً اقتصادی ترقی تسلی بخش نہیں ہے۔ مثال کے طور پر گزشتہ مئی میں ہرارے میں منعقدہ وزارتی کانفرنس کے اعلانیہ میں عالمی صورتِ حال کا جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا گیا کہ "گو بین اقوامی سیاسی صورتِ حال میں کچھ بہتری آئی ہے' عالمی اقتصادی صورتِ حال بے رنگ اور پھیکی ہے۔"

اس سے بہت سے لوگوں کو ناوابستہ تحریک کی افادیت پر انگلی اٹھانے کا موقع مل گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سیاسی فضا میں بہتری اس لیے آئی ہے کہ بڑی طاقتیں بہتری لانے کی خواہش مند ہیں۔ اگر ترکِ اسلحہ کے میدان میں کچھ پیش رفت ہوئی ہے، اگر خطہ جاتی کشمکش کچھ کم ہوئی ہے تو اس کا سہرا سوویت روس اور امریکہ کے سر ہے۔ اس میں ناوابستہ تحریک کا کیا ہے؟ لیکن خود مخالف گورباچیوف بھی اس امر سے انکار نہیں کریں گے کہ انہیں اپنی پہلوں میں ناوابستہ تحریک کی اُن کوششوں سے کافی تقویت حاصل ہوئی ہے جو وہ برسہا برس سے اقوامِ متحدہ اور چھ اقوام کی پہل کے ذریعے سے کرتی رہی ہے۔

بہرحال آج تحریک کے لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اس کا عمل ایسا ہو جس سے سریع نتائج برآمد ہوں۔ بین اقوامی تعلقات زیادہ پیچیدہ ہوتے جا رہے ہیں' طاقت بالخصوص اقتصادی طاقت کے نئے مراکز وجود میں آ رہے ہیں۔ تبدیلیاں بھی بہت تیزی سے رونما ہو رہی ہیں۔ تحریک کے ارکان کی تعداد میں وسیع اضافے سے جہاں تحریک کا وزن بڑھا ہے وہاں فیصلے لینے کے عمل میں کسی قدر سستی آ گئی ہے اور نئے حالات کے مطابق بدلنے میں تامل برتا جانے لگا ہے۔

اگر تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے ہمیں جواہر لال نہرو کے طرزِ عمل سے رہنمائی حاصل کرنی ہے تو ہمیں تحریک کے اعلانات کے لیے عوام کی حمایت حاصل کرنی ہوگی۔ ہمیں وحشیانہ فوجی طاقت کے سامنے ڈگمگانا نہیں چاہیے۔ اور بھروسہ رکھنا چاہیے کہ انجام کار معقولیت اور ترحم اور دردمندی ہی کی جیت ہوگی۔

(ترجمہ: لکشمی چندر) ●

ہری شرن چھابڑہ

افریقہ کے لیے نہرو کی دردمندی

جواہرلال نہرو صحیح معنوں میں ایک بین الاقوامی شخصیت تھے۔ وہ ساری دنیا کے تھے اور ساری دنیا کے لیے ان کے دل میں پیار تھا لیکن آزادی اور امن کا علمبردار ہونے کے ناطے ان کے دل میں افریقہ کے لیے ایک خاص جگہ تھی کیونکہ وہ عرصہ دراز سے غلامی، استعماریت اور نسل پرستی کے ہاتھوں ظلم وستم کا شکار رہا ہے۔ انھوں نے کئی موقعوں پر غلامی کو افریقہ کا سب سے بڑا المیہ قرار دیا۔ ان کے دل میں سارے جہاں کا درد تھا۔ غلامی سے انھیں سب سے زیادہ ٹھیس پہنچتی تھی۔

نہرو جی ہندوستان کی آزادی کے پہلے سے مختلف موقعوں پر مختلف پلیٹ فارموں سے افریقی نجات کے کاز کی حمایت کرتے رہے تھے۔ سب سے پہلے انھوں نے ۱۹۳۸ء میں امن اور سلطنت کے موضوع پر لندن میں منعقدہ کانفرنس میں اپنے خطبۂ صدارت میں افریقی عوام کے حق میں آواز بلند کی۔ اپریل ۱۹۴۷ء میں نئی دہلی میں منعقدہ ایشین ریلیشنز کانفرنس میں بھی انھوں نے افریقہ کے بارے میں اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا "افریقی عوام کے تئیں ہم ایشیا کے لوگوں کی ایک خاص ذمہ داری ہے۔ ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیئے جس سے کہ وہ انسانی برادری میں اپنا صحیح مقام حاصل کرسکیں۔"

بانڈونگ میں ۱۹۵۵ء میں منعقدہ افریقی ایشیائی کانفرنس میں بھی وزیراعظم نہرو نے اپنے محبوب موضوع پر اظہار خیال کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ انھوں نے افریقہ میں استعماریت اور نسل پرستی کے خاتمے پر زور دیا اور کانفرنس میں افریقہ کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا کیا۔ شاید بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ نہرو کے ایما پر ہی جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت کو اس کانفرنس میں حصہ نہیں لینے دیا گیا تھا۔ اس کی بجائے جنوبی افریقہ کی افریقن نیشنل کانگریس کے ایک وفد نے جو موزز کوٹا نے اور مولوی اسمٰعیل کچھالیہ پر مشتمل تھا، مبصروں کی حیثیت سے کانفرنس میں شرکت کی تھی۔

ہندوستان کی آزادی کے ابتدائی برسوں میں ہندوستان کے عوام اور رہنما اپنے پڑوسی براعظم افریقہ کے سیاسی واقعات پر گہری نظر رکھتے رہے اگرچہ یہ بات موجب اطمینان تھی کہ افریقی عوام اپنی گہری نیند سے جاگ چکے تھے اور براعظم کے بہت سے حصے پُرامن طریقے سے آزادی کی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے تاہم سامراجیوں کا جبر واستبداد تشویش کا باعث بنا ہوا تھا۔ نہرو اچھی طرح سے جانتے تھے کہ سامراجی حکّام تبدیلی چاہنے والے عناصر کی مزاحمت کر رہے ہیں۔

کینیا میں چھٹی دہائی کے اوائل میں جب ماؤ ماؤ تحریک کے مجاہدین آزادی نوآبادیاتی انگریز حکمرانوں کے لیے دردسر بنے ہوئے تھے موخرالذکر نے یکایک دہشت کا بازار گرم کر دیا۔ کینیائی عوام کے محبوب رہنما جومو کینیاٹا کو نظربند کر دیا گیا۔ اس سے نہرو کو بیحد تکلیف ہوئی۔ انھوں نے دو ہندوستانی وکیلوں کو نیروبی بھیجا تاکہ وہ ماؤ ماؤ تحریک کے ساتھ بینہ سازباز کے مقدمے میں جومو کینیاٹا کی وکالت کریں۔ کینیائی عوام اس واقعہ کو بھولے نہیں ہیں کیونکہ یہ کینیائی عوام کی جدوجہد میں ہندوستان کی تائید وحمایت کا مظہر ہے۔

الجیریا کی جنگ آزادی میں جب فرانس شمالی افریقہ میں شکست سے دوچار تھا تو نہرو نے نیشنل لبریشن فرنٹ (ایف ایل این) کو نئی دہلی میں اپنا دفتر کھولنے کی اجازت دیدی۔ ہندوستان نے ایف ایل این کو

مالی و مادی امداد فراہم کی اور اقوام متحدہ میں الجیریا کے حق آزادی کی حمایت کی جس سے اس مسئلے پر افرو ایشیائی اتحاد میں بڑی مدد ملی۔

ایک اور افریقی مسئلہ جس نے نہرو کو بہت پریشان کیا کانگو (زائرے) کے وزیراعظم پیٹرس لومبا کا سفاکانہ قتل تھا جو ۱۹۶۰ء میں بلجیم کے سامراجیت پسندوں کے بھاڑے کے ٹٹوؤں کے ہاتھوں ہوا تھا۔ غمگین نہرو نے سامراجیوں کو خبردار کیا کہ "مُردہ لومبا زندہ لومبا سے زیادہ طاقتور ہے۔" نہرو کا مطلب یہی تھا کہ شہید کبھی نہیں مرتے۔ شاید انھیں لومبا کے ان الفاظ کی بھی یاد آئی ہو کہ "آپ ہیرو بنیں گے لیکن اپنی زندگی میں نہیں۔" انھوں نے اقوام متحدہ سے کہا کہ وہ کانگو کی خود مختاری اور سالمیت کی حفاظت کرے اور سامراجیوں کی کوششوں کو ناکام بنائے جو کانگو کی علیحدگی چاہتے تھے۔

ہندوستان خود اپنی سرزمین پر گوا میں بدترین قسم کی بربریت دیکھ چکا تھا۔ وہ پرتگیزی استعماریت کو ہمیشہ انتہائی وحشیانہ اور غیر مہذب قرار دیتا رہا۔ اسے دسمبر ۱۹۶۱ء میں گوا کو آزاد کرانے کے لیے طاقت کا استعمال کرنا پڑا۔ اگرچہ بہت ہی کم طاقت استعمال کی گئی پھر بھی یہ گاندھیائی فلسفے کے خلاف تھی۔ لیکن نہرو کی حکومت نے اس کی وضاحت یوں کی کہ وہ ہر صورت حال سے اس کے حسن و قبح کی روشنی میں نمٹتی ہے۔

دنیا کی سامراج مخالف قوتیں ہندوستان کے فیصلے سے خوش ہوئیں مگر افریقہ کے مجاہدین آزادی بالخصوص انگولا اور موزمبیق کی پرتگیزی نوآبادیوں کے مجاہدین نے اس کارروائی کا بہت ہی زیادہ خیر مقدم کیا۔

نہرو کا پختہ یقین تھا کہ جنوبی افریقہ کی حکومت گوری اقلیت کے فائدے کے لیے سیاہ فام آبادی کو سیاسی اور اقتصادی طور پر غلام رکھنے کی وجہ سے نسلی امتیاز کی جس پالیسی پر عمل پیرا ہے وہ ضمیر انسانی کے لیے ناقابلِ برداشت اور اقوام متحدہ کے منشور کے خلاف ہے۔

نسلی امتیاز کے خلاف ہندوستان کی نفرت و حقارت کا اظہار ہماری قومی آزادی کی جدوجہد سے بھی پہلے کیا گیا تھا۔ بابائے قوم مہاتما گاندھی نے جنوبی افریقہ میں اپنے قیام کے دوران اس پالیسی کی پرزور مخالفت کی تھی اور کئی مرتبہ وہاں کے گورے حکام سے ٹکر لی تھی۔ یہ عنصر ان وجوہات میں سے ایک تھا جن کی بنا پر انھوں نے بعد میں ہندوستان سے سامراجیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا عزم کیا۔

ہندوستان نے سرکاری سطح پر جنوبی افریقہ کی حکومت کو نسلی امتیاز کی پالیسی ختم کرنے کی ترغیب دی لیکن جب یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی تو حکومت ہند نے ۱۹۴۶ء میں جنوبی افریقہ سے تجارتی تعلقات منقطع کر لیے اور اپنے ہائی کمشنر کو واپس بلا لیا۔ یہ ہندوستان کے ۱۹۴۷ء میں مکمل آزادی حاصل کرنے سے پہلے کی بات ہے۔ اس سے قبل کسی اور ملک نے نسل پرستی کو قابلِ احتجاج معاملہ نہیں سمجھا تھا۔

جواہرلال نہرو نے ستمبر ۱۹۴۶ء میں "عبوری حکومت" کے سربراہ کا عہدہ سنبھالنے کے بعد اپنی پہلی نشری تقریر میں کہا تھا "اگر اس نسلی اصول کو برداشت کیا جاتا رہے گا تو اس کا نتیجہ وسیع تنازعات اور عالمی تباہی کی صورت میں نکلے گا۔"

۲۱ مارچ ۱۹۶۰ء کے ایک واقعہ نے سوئی ہوئی دنیا کو جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ اس روز جنوبی افریقہ کی پولیس نے جوہنسبرگ کے نزدیک شارپ ولے میں پُرامن افریقی عوام پر اندھا دھند گولی چلائی تھی۔ یہ لوگ 'نسلی پاس' کے قوانین کے خلاف پُرامن مظاہرہ کر رہے تھے۔ پولیس فائرنگ سے ۶۹ افراد ہلاک اور ۱۸۰ زخمی ہوئے۔ اس واقعہ سے ہندوستان میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ شارپ ولے کے ہلاک شدگان کے ماتم میں نئی دہلی میں ایک جلسہ ہوا جس میں وزیراعظم نہرو نے تقریر کی۔ انھوں نے شارپ ولے کے دردناک واقعات کا جلیاں والا باغ کے المیہ سے مقابلہ کیا۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے دوران جلیاں والا باغ (امرتسر) میں انگریز سپاہیوں نے پُرامن شہریوں کے ایک اجتماع کو مشق ستم بنایا تھا اور نہتے مردوں عورتوں اور بچوں کی ایک بڑی تعداد کو گولیوں سے بھون ڈالا تھا۔ نہرو نے کہا کہ جس طرح جلیاں والا باغ کے سانحہ نے ہندوستان میں انگریزی سامراج کی جڑیں ہلا دی ہیں اسی طرح شارپ ولے کا قتل عام جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کے خلاف پرزور جدوجہد کا نقطۂ آغاز ثابت ہوگا۔

ہندوستان اور افریقہ کے مشرقی ساحل کے درمیان طویل تاریخی روابط کی وجہ سے ہندوستانیوں کی ایک بڑی تعداد صدیوں سے مشرقی افریقہ میں آباد رہے۔ ہندوستان کے تکنیکی ماہرین اور محنت کشوں نے کینیا۔ یوگینڈا ریلوے لائن کی تعمیر کی جس سے مشرقی افریقہ کی ہندوستانی آبادی کو بہت مدد ملی۔ پھر ہندوستانی موزمبیق اور وسطی افریقہ کے پڑوسی ممالک میں بھی جانے لگے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں برطانوی نوآبادیوں میں غلاموں کی تجارت کے خاتمے کے بعد آزاد مزدوروں کی حیثیت سے ہندوستانیوں کی ہجرت جنوبی افریقہ میں شروع ہوئی۔ چنانچہ ہندوستان کے آزاد ہونے کے وقت تک ہندوستانیوں کی کافی بڑی تعداد مشرقی اور جنوبی افریقہ میں آباد ہو چکی تھی۔

نہرو نے کبھی نہیں چاہا کہ ہندوستانی آباد کار مقامی آبادی کی قیمت پر ناجائز فائدہ اٹھانے والے بنیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے ہمیشہ افریقی مفادات کی افضلیت کا ذکر کیا اور اس سرزمین پر ہندوستانیوں

کے مخصوص مفادات رکھنے کی مخالفت کی۔ افریقہ میں جاکر آباد ہونے والے ہندوستانیوں کے لیے ان کا مشورہ ہمیشہ یہی رہا کہ وہ افریقی اکثریت کی ضرورتوں اور خواہشوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

پنڈت نہرو "افریقہ افریقیوں کے لیے" کے تھیم کو دوہراتے ہوئے کبھی نہ تھکتے۔ اس موضوع پر ان کے بہت سے بیانات ہیں لیکن ان کا وسط ۱۹۵۴ء کا ایک بیان اتنا واضح ہے کہ یہاں اس کا ایک طویل اقتباس پیش کیا جا رہا ہے: "میں آپ کو بتاتا ہوں کہ افریقہ اور وہاں آباد ہندوستانیوں کے بارے میں بہت سے سالوں سے ہماری پالیسی کیا رہی ہے..... ہم نے انھیں واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بتا دیا ہے کہ اگر وہ کوئی ایسا کام یا کوئی ایسی بات کرنا چاہتے ہیں جو افریقیوں کے مفاد کے خلاف ہو تو ہم بطور ایک حکومت ان کی کوئی مدد یا حوصلہ افزائی نہیں کریں گے۔ ہم نے یہ بات ان سے صاف صاف کہہ دی ہے۔ ہاں ان کے جائز مطالبات میں ہم ان کی حمایت ضرور کریں گے بشرطیکہ ان مطالبات سے کوئی ایسا فائدہ حاصل کرنا مقصود نہ ہو جس سے افریقیوں پر زد پڑتی ہو ہم نے انھیں بتا دیا ہے کہ وہ افریقہ میں افریقیوں کے جذبہ خیر سگالی کی وجہ سے ہی ہیں اگر افریقی عوام انھیں باہر دھکیلنا چاہتے ہیں تو وہ باہر دھکیل دیے جائیں گے۔"

نسل پرست جنوبی افریقہ میں آباد ہندوستانیوں کے لیے ان کے دل میں کافی ہمدردی تھی کیونکہ وہ جنوبی افریقہ کی سیاہ فام آبادی کے ساتھ نسلی امتیاز کا شکار بنائے جا رہے ہیں انھوں نے جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کو مشورہ دیا کہ وہ افریقیوں کے ساتھ شانے سے شانہ ملاکر اپنے مشترک دشمن ــ گوری اقلیت کی نسل پرست حکومت کے خلاف لڑیں۔

آزادی کے ابتدائی ایام سے ہی نہرو یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ افریقہ کے ملکوں کے ساتھ ہندوستان کے موجودہ تعلقات کو اقتصادی اور تکنیکی تعاون کے ذریعے اور استوار کیا جانا چاہیے۔ وہ اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ بھوک، غریبی اور سست رفتار ترقی کے مسائل کو حل کرنے کی عظیم کوشش کے لیے ترقی پذیر ملکوں کے درمیان تعاون بہت ضروری ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستانی اور افریقی معیشتوں کے درمیان مفید تعاون کی بڑی گنجائش ہے۔

ہندوستان کا اقتصادی اور تکنیکی تعاون کا پروگرام اب ایک پختہ شکل اختیار کر چکا ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس پروگرام کو بنانے والے ہمارے وزیر اعظم پنڈت نہرو ہی تھے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد جلد ہی جومو کینیاٹا نے کینیا کے رہنما کی حیثیت سے نہرو کو ایک ذاتی خط لکھا جس میں ان سے یہ درخواست کی گئی کہ وہ کینیا کے طلبا کے لیے تعلیم اور تکنیکی تربیت کی سہولیات فراہم کریں۔ نہرو نے اس کے لیے ایک شیڈول تیار کرنے میں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کیا۔ وہی شیڈول اب ایک بڑا پروگرام بن گیا ہے جس کے تحت افریقہ کے کم از کم ۳۰ ملکوں کے ۵۰۰۰ سے زائد طلبا کو تعلیم و تربیت کی سہولیات مہیا کی جا رہی ہیں۔

نہرو نے افریقی ممالک کے ساتھ اقتصادی تعاون کے لیے ایک تین سطحی ڈھانچہ تجویز کیا۔ متوازن تجارت، مشترکہ پراجیکٹ اور تکنیکی امداد۔ ویسے باہمی تعاون کی بنیاد تو اشیا اور پیداوار کا تبادلہ ہی فراہم کرتا ہے لیکن آزاد ملکوں کے درمیان تبادلوں کو صرف تجارت کے شعبے تک محدود رکھنا بسا اوقات ناکافی ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر اس بنیاد کے اوپر تکنیکی امداد اور مشترکہ پراجیکٹوں وغیرہ کا بلند ڈھانچہ قائم کیا جاتے تو ملکوں کے درمیان ایسا رشتہ قائم ہو سکتا ہے جو اتنا مضبوط ہوگا کہ نہ صرف قلیل المدت مشکلوں کو جھیل سکے گا بلکہ انحصار باہم ــ ایک دوسرے کے ساتھ ساجھے داری کے احساس کو بڑھا سکے گا۔

ہندوستان کا افریقی ملکوں کے ساتھ اقتصادی و تکنیکی تعاون کا پروگرام زیادہ بڑا پروگرام نہیں ہے لیکن اس میں مزید توسیع کی بڑی گنجائش ہے اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ ہندوستان اور افریقہ کے درمیان سیاسی خیر سگالی اور مفاہمت کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ جنوب ــ جنوب میں تعاون اور اجتماعی خود انحصاری کی جڑیں مضبوط اور گہری ہو رہی ہیں جیسا کہ نہرو اور ناوابستہ تحریک نے چاہا تھا۔ نہرو کا یہ خواب کہ ہندوستان اور افریقہ "ترقی میں ساجھے دار" بنیں عملی صورت اختیار کر رہا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ افریقہ کے چار لایق فرزندوں کو بین الاقوامی مفاہمت کے لیے جواہر لال نہرو ایوارڈ دیا جا چکا ہے۔ یہ ہیں زامبیا کے صدر کینیتھ کونڈا، تنزانیہ کے صدر جولیس نایریرے، جنوبی افریقہ کے مجاہد آزادی نیلسن مینڈیلا اور سینیگال کے صدر لیو پولڈ سینگھور (یہ ایوارڈ حکومت ہند نے ۱۹۶۵ء میں جواہر لال نہرو کی یاد میں قائم کیا تھا جنھوں نے اپنی زندگی امن اور بین الاقوامی کاز کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی) افریقہ نے بھی جواہر لال نہرو کو فراموش نہیں کیا ہے ان کی ولادت کی صد سالہ تقریبات پورے افریقی براعظم میں منائی جا رہی ہیں۔ افریقی ذرائع ابلاغ افریقہ میں امن اور آزادی کے علمبردار نہرو کی خدمات پر بھرپور روشنی ڈالتے رہے ہیں۔ افریقہ کے متعدد ملکوں میں مذاکرے اور جلسے منعقد کیے جا رہے ہیں جن میں افریقی عوام کا ایک عظیم دوست ہونے کے ناطے نہرو کو خراج تحسین ادا کیا جا رہا ہے۔

ڈی۔ ایس نیتم

نہرو: ایک سچّے پارلیماں شناس

جواہرلال نہرو کے متعلق بہت سی حیران کن باتوں میں ایک بات یہ تھی کہ اگرچہ وزیراعظم کے عہدے پر فائز ہونے سے پیشتر وہ اپنے ہم مرتبہ معاصرین کی طرح کبھی کسی قانون ساز اسمبلی کے رکن نہیں رہے تھے۔ تاہم وہ ایک عظیم پارلیمان شناس ثابت ہوئے۔ تقریباً تیس برسوں تک وہ آل انڈیا کانگریس سے سرگرم طور پر منسلک رہے تھے اور پارٹی کی پالیسیوں کا اظہار تقریباً ہمیشہ وہی کیا کرتے تھے۔ ممکن ہے اس عمل پیہم نے انھیں پارلیمنٹ کے لیے پوری طرح تیار کر دیا تھا اور وہ موثر کن انداز سے بحث کرنے کے اہل ہو چکے تھے۔ قانون ساز اسمبلی میں بھی انھوں نے پالیسیوں کی توضیح و تفصیل کا کام سرانجام دیا اور جب اسمبلی ہذا بھارت کی عبوری حکومت میں منتقل ہوئی تو نہرو پہلے ہی تجربہ کار پارلیمان شناس بن چکے تھے۔ عین ممکن ہے کہ وضع دار مہذب ہونے کے باعث انھوں نے فطری طور پر خود کو ایک پارلیمان شناس میں ڈھال لیا تھا۔

ان کے اس وصف کی تشکیل میں معمولی اور غیر معمولی واقعات کارفرما رہے۔ وہ پارلیمنٹ میں باقاعدہ حاضر ہوتے اور اگر کسی نشست میں شامل نہ ہو سکتے تو اس میں ملک کے کسی اہم معاملے میں یا ان کی علالت کو دخل ہوتا۔ تاہم جب ایوان میں آتے اپنی غیر حاضری کے لیے معذرت خواہ ہوتے۔ وہ صرف وزیراعظم ہی نہیں بلکہ شروع کی تین لوک سبھاؤں کے قائد بھی تھے۔ انھیں ہمیشہ اس بات کا شدید احساس تھا کہ وہ دوسروں کے لیے اچھی مثال پیش کریں۔ اس ضمن میں ایک معمولی واقعہ کا حوالہ دینا بے محل نہ ہوگا اگر اسپیکر بول رہے ہوتے تو وہ نہ اٹھتے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ نہرو کو کسی بہت ضروری کام کے سلسلے میں دفتر جانا تھا۔ مگر جب انھوں نے اسپیکر کو کھڑا پایا اور جب تک موصوف بیٹھ نہ گئے۔ وہ ایوان سے جانے کے منتظر رہے۔ اس وضعداری، رکھ رکھاؤ کے باعث وہ ایوان کے ہر ممبر سے واضح تعظیماً پیش آتے اور عوام سے متعلق ہر مسئلے پر حزب مخالف سے مشورہ کرتے۔ ہمیشہ ان کی یہی کوشش ہوتی کہ حتی الوسع زیادہ سے زیادہ متفق رائے ہوں۔ وہ پارلیمنٹ کو اتفاق رائے کی دست یابی کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ وہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے شروع کیے گئے سرکاری اور ذاتی پروگراموں کے لیے حزب مخالف کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے اور بامروت راعیانہ منکسرانہ خوش خلقی سے اس کی سعی کرتے۔

خارجہ پالیسی کے بارے میں عبوری حکومت کے ممبران کو ایک تقریر میں یوں آگاہ کیا۔ بالخصوص خارجہ پالیسی میں آدمی کو تقریباً ہر لمحہ یہ طے کرنا پڑتا ہے کیا کرنا چاہیئے تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ہماری خارجہ پالیسی کا حقیقی نظریہ سے جائزہ لیں ... حتی الوسع ہمیں فہم سلیم سے کام لینا چاہیئے محض آئیڈیلزم (آدرش واد) سے کام نہیں چلے گا۔ اس تمہید کے بعد انھوں نے اپنے مخصوص نظریے کی تفصیل اور وضاحت شروع کی " تمام قوموں کو اس بات کی آزادی ہونی چاہیئے کہ وہ بیرونی دخل اندازی کے بغیر جس طرح چاہیں ترقی کریں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مختلف طریقوں سے ایک دوسرے پر دباؤ نہیں ڈالیں گے ... ہمارے بہت سے دوست ہیں اور ہم ان کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں تعاون کرتے ہیں لیکن میں اپنے فیصلے کو یا اپنے ملک کے فیصلے کو، یا اپنے ملک کے مقام کو کسی ایک ملک یا ملکوں کے گروپ کے حوالے کرنے کو تیار نہیں ہوں"

ابھی دو برس بھی نہیں ہوتے ہوں گے کہ انھوں نے ایک دوسری تقریر میں لوک سبھا کو بتایا کہ خارجہ پالیسی سے متعلق مسئلوں سے تمام تر عجز و انکسار سے رجوع کیا کرتے ہیں۔ چند معزز ممبران نے فرمایا ہے کہ ہماری خارجہ پالیسی کی تشکیل میں ترنگ اور تلون مزاجی کو دخل ہے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں

۲۲۲/D II ونے مارگ، نئی دہلی ۲۱

کہ وہ میرا ذکر کس لہجے میں کرتے ہیں لیکن جب وہ اس عظیم قوم کی پالیسی کو ایک فرد واحد کی ترنگ اور تلون مزاجی سے منسوب کرتے ہیں خواہ وہ شخص کوئی بھی ہو، تو یہ کوئی معمولی معاملہ نہیں۔ جیسا کہ میں برابر کہتا رہا ہوں۔ ہماری (خارجہ) پالیسی نے ہمارے ماضی کے طرزِ فکر اور اعلانوں سے نشو و نما پائی ہے اور میں اعلان کرتا ہوں کہ بدلتے ہوئے حالات کے پس منظر میں حتی الوسع ہم ان فیصلوں اور طرزِ فکر پر قائم رہے ہیں۔ میں غلط ہو سکتا ہوں، دوسرے اس کا بہتر علم رکھتے ہوں گے۔ لیکن مجھے ذاتی طور پر اطمینان ہے کہ یہ واقعی ایسا ہے"۔

تقریباً تین برس بعد ایک اور (تیسری) اہم تقریر میں نہرو نے ملک کی داخلہ پالیسیاں اور خارجہ پالیسی میں ربط اور ہم آہنگی پر زور دیا "کسی ملک کی بین الاقوامی پالیسی بالآخر اس ملک کے اقتصادی حالات پر منحصر ہوتی ہے۔ دونوں میں تطابقت ہونا لازمی ہے اور انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل اندرونی صورت حال کے موزوں و موافق ہونے کی بنا پر ہی کوئی ملک بین الاقوامی معاملات میں اپنی بات زور دباؤ اور وثوق سے کہنے کی جسارت کر سکتا ہے۔ اسی جذبے کے تحت بھارت ترقی کی طرف گامزن ہے بھارت وہ ملک ہے جو مستحکم ہے، ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باقی دنیا کے لوگ ہمیں کافی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں"۔

تقریروں کے مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ نہرو اول ترین ایک ذہن ساز تھے۔ پوری پارلیمنٹ کو اپنے اعتماد میں لینے کے بعد وہ بڑی سرگرمی کے ساتھ ایوان کے اندر ذہن بنانے کا کام کرتے رہے۔ ملک کی آزادی کی ابتدائی دہائیوں میں چونکہ فلاح و بہبود کے لیے بہت سے اقدامات اٹھائے گئے تھے، یہ عمل ضروری تھا، نہرو نے خوش خلقی خوش اسلوبی اور بڑے عجز و انکسار سے کام لیتے ہوئے، مگر پند و نصائح سے حذر کرتے ہوئے، انھیں عملی جامہ پہنایا۔

"اس ملک میں ہم سیاسی انقلاب کے دور سے گزر چکے ہیں، آزاد ہو چکے ہیں۔ (اب) ہم اقتصادی تبدیلی کے مرحلے سے گزر رہے ہیں ایک اور اہم پہلو ہے جو اتنا ہی ضروری ہے، اور وہ سماجی تبدیلی ہے۔ میں نہیں سمجھتا آپ اقتصادی اور سماجی تبدیلی کو نظر انداز کر کے سیاسی تبدیلی کے بارے میں سوچ سکتے ہیں"۔ یہ الفاظ چھٹی دہائی کے اوائل برسوں میں میرج بل (شادی بل) سے متعلق ایک تقریر کا ابتدائیہ ہیں۔ بعد ازاں جب ہندو میرج بل پر بحث ہو رہی تھی تو انھوں نے کہا تھا کہ ملک کی ترقی کے سیاق و سباق میں یہ کتنا ضروری تھا۔ انھوں نے کہا "ہم پنجسالہ منصوبوں، اقتصادی ترقی، صنعتی فروغ، سیاسی آزادی وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں۔ ان تمام کی بہت بڑی اہمیت ہے لیکن میرے ذہن میں اس بات کے بارے میں کوئی شک نہیں کہ ملک کی ترقی نہ تو صرف سیاسی سطح پر اور نہ ہی صرف اقتصادی سطح پر بلکہ سماجی سطح پر بھی ہو۔ ان سب کو ہم آہنگ کرنا پڑتا ہے، تب قوم آگے بڑھتی ہے"۔

مذکورہ بحث کے دوران ایک ممبر نے کہا کہ بھارت کے عہد قدیمہ میں قانون ساز تھے۔ منو اور یاگیہ ولکیہ اس اشاریہ سے زیر بحث مجوزہ قانونی اقدام کی در پردہ نکتہ چینی مقصود تھی۔ جواباً نہرو نے کہا "دونوں ہماری تاریخ کی بہت بڑی شخصیتیں تھیں، جنھوں نے بھارت کی تقدیر کی تشکیل کی ہم ان کے مداح ہیں"۔ تاہم یہ جاننا چاہا کہ کیا ان شخصیتوں کو بحث میں لانا مناسب تھا۔ اور حیرت کی بات یہ کہ وہ کیا کر لیتے۔ "بات یہ ہے کہ بھارت کی موجودہ صورت حالات میں منو یا یاگیہ ولکیہ یا کسی اور فرد کو بطور سند پیش کرنا مناسب ہے . . . میں تسلیم کرتا ہوں کہ انسانی زندگی کے کچھ مخصوص اصول ہونے چاہئیں، اور بلاشبہ ہیں بھی، جو نہ کبھی بدلتے ہیں اور نہ ہی انھیں بدلنا چاہیے۔ لیکن کوئی قانون بناتے وقت آپ کو اُن حالات کو بھی دھیان میں رکھنا چاہیے جو آج کارفرما ہیں نہ کہ جو ۱۰۰۰ یا ۲۰۰۰ برس پہلے کے زمانے کے ہیں"۔

اپنی اسی تقریر کے دوران اپنے مخصوص شفیق لہجے میں انھوں نے انتباہ کیا: "ہم میں بعض کی عادت ہے کہ ہم دوسرے لوگوں، دوسرے ملکوں، ان کے رسم و رواج اور ان کے مذہب یا ان کے اقتصادی اصولوں کو ملعون کرتے ہیں اور اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہم برتر ہیں"۔ بہت واضح الفاظ میں انھوں نے مزید کہا: "یہ تنگ نظری ہے اور غیر مہذب نظریہ۔ درست نظریہ یہ ہے کہ ان کو غور سے دیکھئے، ان سے سیکھئے اور جو آپ دیکھتے ہیں اس سے سبق سیکھئے، ان اقدام سے حذر کیجئے جو آپ کی نگاہ میں غلط ہیں اور ان باتوں کو قبول کیجئے جو آپ کے خیال میں درست ہیں۔ دوسرے ملکوں کے بارے میں شور و غوغا مت کیجئے۔ دوسروں کو برا بھلا کہنے کی بجائے، اپنی ناکامیوں پر غور کیجیے"۔

تاہم بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جن پر بھارت بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ ایک برس بعد ایک تقریر میں انھوں نے کہا: "میں اسے اپنے (سب کے) لیے، اپنے ملک کے لیے، اس ایوان کے لیے اور اپنے عوام کے لیے ایک خوبی سمجھتا ہوں کہ خوف ہم پر مسلط نہیں، کسی بھی دوسرے ملک سے نفرت، حقارت کا جذبہ ہمارے دل و دماغ پر حاوی نہیں اور یہ بات بھی جاگزیں نہیں کہ کسی دوسرے ملک کو ہم ناپسند ہیں۔ دوسروں کی نسبت ہم کسی قدر زیادہ حساس ہیں . . . میری نظر میں یہ خوبی ہے اور یہ اچھی جمہوری روایت کے مطابق ہے"۔

نہرو ملک کے پنجسالہ منصوبے کے بارے میں بھی ایسے ہی پُر تاثیر جوش اور ولولے کے ساتھ بولتے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں دوسرے

[illegible]

سمجھا تھا یہ نہ صرف بے حد ضروری ہے بلکہ یہ وہ شے ہے جو مجھ میں بے پناہ جوش وخروش پیدا کرتی ہے۔" بعد ازاں ان سب کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا" یہ ایک ولولہ انگیز موضوع ہے کیونکہ یہ (ہمارے) لوگوں کے مستقبل سے متعلق ہے ایک حد تک وہ مستقبل دوسرے ملکوں کے مستقبل اور باقی ماندہ دنیا پر بھی اثر انداز ہوگا۔ اس لیے یہ ایک سحور کن اور ولولہ انگیز موضوع بن جاتا ہے اور پھر اس کا اعادہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا" ہم بھارت کے مستقبل کی تو تشکیل کرنے جا رہے ہیں۔ یقینی طور پر اس کے مقابل شاید ہی کوئی کام اس قدر ولولہ انگیز ہو سکتا ہے۔ آگے چل کر اس امر کی نشاندہی کی کہ تاریخ کی تکریم کے تقاضے کو بڑے عجز وانکسار کے ساتھ سمجھنا چاہیئے اور اس کو مدنظر رکھ کر کسی منصوبہ کی تکمیل کے لیے پیش رفت کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ہم خود کو خواہ کتنا ہی عظیم اور اہل کیوں نہ سمجھیں ملک کی تعمیر کرنے اور کروڑوں عوام کو آگے لے جانے کے جلیل القدر مقصد کے مقابلے ہم ہیچ ہیں۔

غالباً وزیر اعظم کی سب سے زیادہ اہم تقریر وہ ہوتی ہے جو سال کا پہلا سیشن شروع ہونے پر دونوں ایوانوں کے مشترک جلسے میں صدر جمہوریہ کے خطبے پر طویل بحث کے جواب میں ہوتی ہے۔ پریذیڈنٹ کا وہ خطبہ ان وضع کردہ مقاصد کا خلاصہ ہوتا ہے جنھیں سال رواں کے دوران حکومت کا عملہ اور انتظامیہ عملی جامہ پہنائے گا۔ یہ مقاصد ومنصوبے مختلف شعبوں میں ملک کی ترقی کے طائرانہ جائزے نیز ملک کے اندرونی معاملات سے متعلق نشیب وفراز کے علاوہ غیر ممالک میں ہونے والے اہم ردّ و بدل کے پیش نظر وضع کیے جاتے ہیں۔ خطبہ پر بحث کا دائرہ کار کسی قدر وسیع ہوتا ہے، اور صبر آزما بھی۔ بیشتر تقریریں اکثر شتر بے مہار کی غمازی کرتی ہیں۔ بے مقصد اور اذیت ناک صبر وشکیبائی کا دامن تھامے نہرو سب سنتے رہتے۔ اس کے بعد جواباً ایک بے مثال تقریر کی اور ایک سچے معلم کی طرح ممبروں کی توجہ پریزیڈنٹ کے خطبے کے صحیح مقام کی طرف مبذول کرائی۔

ایک ایسی جوابی تقریر میں انھوں نے کہا" خطبہ کا مدعا مختصر طور پر بھارت کے دوسرے ملکوں کے ساتھ روابط اور سرکار اور ملک کو مستقبل میں کیے جانے والے اقدامات کا ذکر کرنا تھا" اور جیسا کہ تقاضہ ہے" ان تمام موضوعات کا (تفصیلی) جائزہ نہیں لیا جا سکتا تھا جن کو چند ممبران نے اپنی تقریروں میں اٹھایا ہے، حالانکہ بلاشبہ وہ ضروری ہیں۔ میں ایوان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس بات کو بھی دھیان میں رکھیں۔

مگر جب ان کے صبر وتحمل کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو انھوں نے قدرے ضبط سے کام لیتے ہوتے اپنی بے چینی کا اظہار کیا" نہایت غور اور متانت سے میں نے اس چار روزہ بحث کو سنا اور کئی بار ان باتوں پر حیرت بھی ہوئی جو اس دوران کہی گئیں۔ ایک موقع پر وہ یوں بولے" حزب مخالف کے ممبران دوسرے ملکوں کے بارے میں غیر ذمہ داری سے سرسری طور پر بات نہیں کر سکتا۔ میں بلا تامل نہ تو انھیں ملعون کر سکتا ہوں اور نہ ہی ان کی مدح۔ معزز ممبران اس امر کو محسوس کریں گے کہ خارجہ پالیسی پر گفتگو اس انداز سے نہیں کی جاتی جس سے عام جلسوں کا کاروبار چلتا ہے جب ذمہ دار لوگ دوسرے ملکوں کے بارے میں بات کرتے ہیں تو سہل الحصول عامیانہ جملوں اور محاوروں کا استعمال نہیں کرتے جو بعض حزب مخالف کے ممبران بہ سہولت کر لیتے ہیں۔ تاہم ایسی منضبط شعلہ بیانی کبھی کبھی ہی جلوہ فشاں ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ اپنے نکتہ چینوں سے بحث میں نہیں الجھتے تھے چاہے ان کے صبر وتحمل کو کوئی کیسے ہی آزماتے جیسا کہ ایک تقریر کے دوران انھوں نے کہا تھا" اپنے ساتھیوں کے ساتھ بحث وتمحیص کرنا، الجھنا، لفاظی کے داؤ پیچ دکھانا اور بحث میں انھیں مات دینا آسان ہے لیکن جن موضوعات پر ہم غور وفکر کر رہے ہیں وہ میرے نزدیک بہت اہم ہیں۔

اسی بحث میں کسی ممبر نے یوں ہی کہہ دیا تھا کہ نہرو نے تاریخ میں اپنا مقام کھو دیا ہے۔ نہرو نے ممبر سے یہ یاد رکھنے کو کہا" خیر! تاریخ مجھ سے یا کسی دوسرے شخص کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں تاہم بھارت اور اس کے کروڑوں عوام پر کیا بیتتی ہے یہ بات زیادہ اہمیت کی حامل ہے"۔

ان کی ذات کے بارے میں کچھ بھی کہا جا سکتا ہے، اس سے قطع نظر اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ بھارت کا مقدر نہرو کے ذہن وفکر میں بہت بلند وارفع تھا اور یقیناً ان کی اس رفعتِ خیال کو ان خوبیوں میں شمار کرنا ہوگا جن کی بنا پر نہرو بجا طور پر سچے پارلیمان شناس کہے جا سکتے ہیں۔ (ترجمہ: نریندر شچل)

بقیہ: جمہوریت اور اخبارات

ہمیں بتایا کہ پنڈت جی اگلے کمرے میں ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔

وہاں جا کر ہم نے دیکھا کہ پنڈت جی کی تیوری چڑھی ہوئی ہے اور وہ ہوم سکریٹری اے۔ وی۔ پائی اور آئی بی کے سربراہ بھولا ملک کے ساتھ خاموش کھڑے ہوئے ہیں۔ وزیر اعظم نے اپنا ایک ہاتھ ستبارا تن کے شانے پر اور دوسرا میرے شانے پر رکھتے ہوئے کہا" دیکھیے میں جلد برہم ہو جاتا ہوں لیکن ہوش نہیں کھوتا۔ مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ آئی بی کے لوگ آپ کو پریشان کرتے رہے ہیں۔ لیکن فکر نہ کیجیے۔ میں نے تحقیقات بند کروا دی ہے۔" پھر کہا" یہ مجھے پسند نہیں ہے کہ سب سے پہلے خبر چھاپنے کی ہوڑ میں اخبارات سرکاری راز فاش کریں یا قومی مفادات کو نقصان پہنچائیں۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھ کو یہ بھی برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔

اندر ملہوترہ

نہرو، جمہوریت اور اخبارات

جواہر لال نہرو اخبارات کی آزادی کا جس قدر احترام کرتے تھے اور اخبارات کی مخالفانہ تنقید و آراء کو جس تحمل و شائستگی سے برداشت کرتے تھے اس کی مثال بہت کم حکمرانوں میں ملے گی۔ ان کا یہ واضح بیان کہ وہ "ایک پابند پریس کے مقابلے میں ایک مکمل طور پر آزاد پریس کو ترجیح دیں گے خواہ اس میں آزادیٔ اخبارات کے غلط استعمال کے کیسے ہی خطرات مضمر ہوں" عصرِ حاضر کی ہندوستانی تاریخ میں ایک کلاسیکی اہمیت رکھتا ہے۔

یہ محض ایک خطیبانہ بیان نہیں تھا۔ آدرش پسند نہرو نے اپنے سترہ سالہ اقتدار کے ہر لمحے میں اس کا حق ادا کیا۔ درست ہے کہ وہ کبھی کبھی ایک انسان ہونے کے ناطے آزادیٔ اخبارات کے خطرناک یا غلط استعمال پر یا اپنے متعلق کسی ایسی نکتہ چینی پر جسے وہ قطعی ناواجب سمجھتے تھے طیش میں آجاتے تھے لیکن وہ اس قسم کے بیشتر موقعوں پر اپنے غصّے کا اظہار اپنے مخصوص انداز میں کرتے تھے۔ انھوں نے کبھی اپنے ذاتی احساسات کے زیرِ اثر کسی غلط کار اخبار یا رسالے کو اپنے سرکاری اختیارات کے استعمال سے دھمکانے یا "سبق سکھانے" کی کوشش نہیں کی۔

دوسرے الفاظ میں آزادیٔ اخبارات کے لیے ان کا جذبہ صادق وسیع تر جمہوری قدروں سے ان کی جذباتی وابستگی کا ہی ایک حصّہ تھا جسے وہ کسی بھی وجہ سے عارضی طور پر بھی ترک کرنے کو تیار نہ تھے۔ ان کی زندگی میں ایسے موقعے بھی آئے جب انھیں اپنے کم رواداراور کم دوراندیش رفقائے کار کو، جو بعض اخبارات کی غیر ذمّہ داری سے ناراض ہوکر ان کے خلاف سخت تعزیری وامتناعی اقدامات کرنا چاہتے تھے، روکنا پڑا۔ ایسے موقعوں پر وہ اپنے رفیقوں کو بتاتے کہ اگر آزادیٔ اظہار و بیان پر کوئی ایسی روک لگائی گئی جو آئین میں مندرج حدود سے باہر ہو تو دوسری جمہوری آزادیاں بھی باقی نہ رہ سکے گی۔

اس کے باوجود، چونکہ وہ ایک نہایت شائستہ اور مہذب انسان تھے اور اپنے "قیصرانہ" رجحانات کو، جن کے بارے میں انھوں نے انگریزی رسالہ "ماڈرن ریویو" میں ایک فرضی نام سے شائع شدہ ایک مشہور مضمون میں نہایت شاندار پیرائے میں لکھا تھا، دبانے کی کوشش کرتے رہتے تھے، اس لیے وہ کبھی کبھی اپنے سینیئر رفیقوں کو کھلی چھوٹ بھی دیدیتے تھے۔ اس کی ایک قابلِ ذکر مثال پریس (قابلِ اعتراض مواد) بل تھا یہ بل سی۔ راجگوپالاچاری کے ایما پر پیش کیا گیا تھا، جنھوں نے سردار پٹیل کے بعد وزیر داخلہ کا عہدہ سنبھالا تھا۔ لیکن پنڈت جی نے اس بات کی کوشش کی کہ اس نئے قانون کی مدّت نفاذ دو سال تک ہی محدود رکھی جاتے۔ اس مدّت کے اختتام پر اس قانون کو ختم ہو جانے دیا گیا۔ راجگوپالاچاری اس وقت تک اپنی ذمّہ داریوں سے سبک دوش ہوکر مدراس جاچکے تھے۔

اخبارات کے بارے میں نہرو کا موقف ان کے اعتدال پسندانہ رجحانات کا مرہونِ منت تھا۔ اس موقف میں جد وجہد آزادی کے دوران اخبارات کے رول کے تعلق سے ان کے تجربے اور قوم پرستی کی تحریک اور اخبارات کے درمیان قریبی تعلق کا بھی اثر تھا۔ مہاتما گاندھی نے "ینگ انڈیا" اور "ہریجن" نامی اخبارات شروع کئے اور انھیں اپنے جادو صفت پیغام ہندوستانی عوام تک پہونچانے کا ذریعہ بنایا۔ تلک کے اخبار "کیسری" کی بدولت ہی ملک کے گوشے گوشے میں ان کا یہ نعرہ سنا گیا کہ "سوراج میرا پیدائشی حق ہے"۔ موتی لال نہرو اخبار "انڈی پنڈنٹ" کے ایک ساجھے دار

۴۳ - ماہندر نگر ، نئی دلی ۳

تھے۔ خود جواہرلال نہرو نے "نیشنل ہیرالڈ" نکالا۔

آنجہانی ایم چلاپتی راؤ نے، جو تیس سال سے زیادہ عرصے تک "نیشنل ہیرالڈ" کے ایڈیٹر رہے۔ اپنے پیچھے اس بات کی کافی شہادت چھوڑی ہے کہ اخبار سے گہری وابستگی کے باوجود نہرو نے کبھی ایڈیٹر کی آزادی اور اختیارات میں دخل دینے کی کوشش نہیں کی۔

جولائی ۱۹۴۶ء میں جب بحرالکاہل میں بکنی ایٹول میں بھاری نیوکلیائی تجربات کئے گئے تو دہلی میں متعین غیرملکی نامہ نگاروں نے لکھنؤ جاکر نہرو کو گھیر لیا اور ان سے اپنا ردعمل ظاہر کرنے کی درخواست کی۔ نہرو نے دن بھر کچھ نہیں کہا۔ شام کو دیر گئے وہ اچانک "ہیرالڈ" کے دفتر پہونچے، ایک مسطور پیڈ لیا اور آدھ گھنٹے میں "موت کے سوداگر" کے موزوں عنوان سے ایک اثرانگیز اور یادگار مضمون لکھ ڈالا۔

ایک اور رات وہ بارہ بجے میں تقریر کرنے کے بعد "ہیرالڈ" کے دفتر میں آئے۔ ظاہر ہے کہ کوئی نامہ نگار بارہ بجے نہیں پہونچا تھا۔ نہرو نے "ہمارے بارہ بجے کے نامہ نگار ــــ سے" کے تحت خود اپنی تقریر کی ایک مختصر رپورٹ لکھی۔ نہرو کا لکھا ہوا متن نہرو میموریل میوزیم اور لائبریری میں موجود ہے۔ لیکن اس کی خوبصورتی میں کچھ فرق آگیا ہے کیونکہ چیف سب ایڈیٹر نے اسے چھپنے کے لیے بھیجنے سے قبل اپنے قلم سے جگہ جگہ لفظ "نہرو" سے پہلے "پنڈت" کا اضافہ کر دیا تھا۔

نہرو عوام کے سامنے اپنے نقطۂ نگاہ اور اپنی حکومت کی پالیسیوں کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ کچھ لوگوں کا یہاں تک کہنا ہے کہ انھوں نے زیادہ تر ٹائپکر وفون کے ذریعے حکومت چلائی۔ نہرو صحیح معنوں میں ایک عظیم Communicator (رابطہ کار) تھے اگرچہ یہ اصطلاح ان کی زندگی میں ایجاد نہیں ہوئی تھی اس لیے وہ دیگر موضوعات کی طرح ہندوستانی جمہوریت میں اخبارات کے بارے میں اپنے فلسفہ کی بار بار بالتفصیل وضاحت کرتے رہتے تھے۔ اس لیے کسی کو یہ جاننے کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ان کی پالیسی میں کیا چیز کارفرما تھی۔

نہرو نے کبھی ہندوستانی پریس کو یک نوعی تصور کرنے کی کوشش نہیں کی جبکہ دوسرے بہت سے لوگوں نے جنھیں اس بارے میں زیادہ علم ہونا چاہئے تھا اس غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ نہرو یہ تسلیم کرتے تھے کہ ہمارے ملک کی طرح ہمارا پریس بھی وسیع اور مختلف النوع ہے۔ انھوں نے ایک بار اخبارات کے ایڈیٹروں کے اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ہندوستان میں سبھی قسم کے اخبارات ہیں، ہزاروں اخبارات ہیں۔ ذمہ دار اخبارات بھی ہیں اور ایسے اخبارات بھی جو کبھی ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہیں کبھی غیرذمہ داری کا۔ ایسے اخبارات بھی ہیں جو ذمہ دار کم اور غیرذمہ دار زیادہ ہیں۔ ایسے صحیفے بھی ہیں جو پرواز تخیل اور دوسرے غیرذمہ دارانہ کاموں میں طاق ہیں۔ خوش قسمتی سے موخرالذکر اخبارات زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔"

انھوں نے کہا کہ "میں نے بہت سی تحریریں دیکھی ہیں جو بیحد خطرناک ہیں۔" لیکن اس کے باوجود وہ انگریزی راج کی اس پالیسی میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ کہ "خراب ذہنیت" والے اخبارات کو دبانا حکومت کا فرض ہے۔ ان کے خیال میں یہ بات بالکل غلط تھی کیونکہ برائی کو دبانا برائی کا علاج نہیں ہے۔ "پابندیاں عائد کر کے آپ کچھ نہیں بدلتے۔ اس طرح تو آپ بعض چیزوں کے صرف بیرونی اظہار کو ہی روک پاتے ہیں بلکہ ان چیزوں کی تہہ میں جو خیال ہوتا ہے وہ جڑ پکڑتا اور پھیلتا جاتا ہے۔"

لہٰذا صورت حال پر نہرو کا ردعمل یہ تھا کہ ہندوستانی اخبارات کو اور زیادہ آزادی دی جائے، دوسرے جمہوری ملکوں سے بھی زیادہ، اور یہ امید کی جائے کہ اس سے زیادہ اخبارات میں ذمہ داری کا مطلوبہ احساس پیدا ہوگا۔ جہاں تک تھوڑے سے اخباروں کی غلط روی کا تعلق تھا وہ یہ توقع کرتے تھے کہ ضروری اصلاحی اقدامات حکومت نہیں، دوسرے اخبارات اور اس کی ایسوسی ایشنیں کریں گے۔

کبھی کبھی نہرو یہ کہتے ہوئے ایڈیٹروں اور نامہ نگاروں کی سرزنش بھی کرتے تھے کہ جو لوگ ہمیشہ روئے زمین کی قریب قریب ہر چیز پر فتوے صادر کر دیتے ہیں وہ اکثر اتنے ہی "لاعلم" ہوتے ہیں جتنے کہ ملک پر حکومت کرنے کی کوشش کرنے والے سیاستداں۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ سیاستدانوں کو تو رائے دہندگان کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اخبارات کسی کو جوابدہ نہیں ہیں۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے کہ وہ کچھ نہیں کریں گے سوائے اخبارات سے یہ امید رکھنے کہ وہ خود اپنے لیے معیارات وضوابط مرتب کریں اور ان کی پابندی کریں۔ یقیناً وہ حکومت کو اخبارات پر کنٹرول رکھنے یا انھیں منضبط کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

ایک بات جس کے لیے نہرو اخبارات پر لگاتار زور دیتے رہے وہ تھی "سماج کے لیے تشویش"۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک معمولی اخبار اور ایک عظیم اخبار کے درمیان فرق اس بات سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ موخرالذکر کو عوام خصوصاً غریبوں اور استحصال کے شکار لوگوں کے لیے کتنی تشویش ہے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ ہندوستانی اخبارات کی ملکیت کے نظام میں کوئی نہ کوئی غلطی ہے۔ لیکن انھوں نے اس میں کوئی دخل نہیں دیا۔ صرف ایک پریس کمیشن مقرر کیا تاکہ وہ اخبارات اور ان کے مسائل کے بارے میں ایک جامع رپورٹ حکومت کو پیش کرے۔ جسٹس راجیادھکش کی صدارت میں مقرر کئے گئے اس کمیشن میں آچاریہ نریندر دیو

اور ڈاکٹر سی۔ پی۔ راما سوامی آیئر جیسی سرکردہ شخصیات شامل تھیں۔

پریس کے ساتھ نہرو کے غیر معمولی رشتے کا کوئی ذکر نہرو کی ماہانہ پریس کانفرنسوں کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ جب نہرو بدیش میں ہوتے تھے تو ادر بات تھی ورنہ وہ باقاعدگی کے ساتھ مہینے میں ایک بار حکومت کے تسلیم کردہ اخباری نمائندوں سے ضرور ملتے تھے اور اس ملاقات میں نامہ نگاران سے جو سوالات پوچھتے تھے وہ ان کا خندہ پیشانی سے جواب دیتے تھے۔ کانفرنس کے آغاز میں وہ نامہ نگاروں سے پوچھ لیتے تھے وہ کن اہم موضوعات پر بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ تمام موضوعات نہرو ایک کاغذ پر لکھ لیتے تھے اور پھر سلسلہ وار ہر موضوع پر سوال پوچھنے کے لیے کہتے تھے۔ وہ دوسرا موضوع اس وقت تک نہ اٹھاتے جب تک کہ پہلے موضوع پر سبھی نامہ نگار اپنے اپنے سوال نہ پوچھ لیتے۔

ان کی قریب قریب ہر پریس کانفرنس کے سوالات وجوابات دنیا بھر کے اخباروں میں جلی سرخیوں کے ساتھ چھپتے تھے۔ ہر کانفرنس میں کافی وقت نظریاتی اختلافات، اصطلاحی باریکیوں اور ہلکی پھلکی باتوں پر بھی صرف ہوسکتا تھا کیونکہ بعض نامہ نگار اوٹ پٹانگ سوالات پوچھنے کے عادی تھے جبکہ بعض کانفرنس کو اطلاعات حاصل کرنے کا ذریعہ نہ سمجھ کر اسے اپنے خیالات ظاہر کرنے کا موقع سمجھتے تھے۔ نہرو برا نہیں مانتے تھے۔ وہ ہر سوال اور ہر مداخلت کا "خواہ وہ معمولی ہو یا فکر انگیز" جواب دیتے تھے۔

آخر ۲۲ مئی ۱۹۶۴ء کی پریس کانفرنس آئی۔ ایک نامہ نگار نے جو شاید اپنا خیال ظاہر کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا پنڈت جی کو مشورہ دیا کہ وہ تربیت دے کر اپنا ایک جانشین اپنی زندگی میں ہی تیار کریں۔ نہرو جو دیکھنے سے بیمار نظر آتے تھے اور دھیرے دھیرے بول رہے تھے مسکرائے اور بولے "میری زندگی اتنی جلدی ختم ہونے والی نہیں ہے"۔ نہرو کی پریس کانفرنسوں کی طرح کی کوئی پریس کانفرنس نہرو کے بعد دیکھنے میں نہیں آئی۔

آخر میں میں دو واقعات کا خاص طور سے ذکر کرنا چاہتا ہوں کیونکہ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہرو کتنے عمدہ انسان تھے، ان کا غصہ کتنی جلدی ختم ہوجاتا تھا اور پریس کے تئیں ان کا رویہ کتنا اچھا اور قابل تعریف تھا۔ ان میں سے ایک واقعہ میرے سامنے ہوا اور دوسرے میں میں خود "ملوث" تھا۔

پہلا واقعہ ۱۹۵۰ء میں تبت میں عوامی جمہوریہ چین کی فوجوں کے داخلے کے بعد ہوا، جس کے خلاف ہندوستان نے احتجاج کیا تھا۔ ملک میں بائیں بازو کے لوگ نئے چین کی تعریف کر رہے تھے اور تبت کے "آزاد کرائے جانے" کے خلاف ہندوستان کے احتجاج پر کہ چینی بمبئی کے ہفت روزہ "بلٹز" نے تبت کے متعلق پنڈت جی کی پالیسی کے خلاف جی۔ کے۔ ریڈی کا، جو بعد میں ملک کے ایک بہترین صحافی بنے، ایک مضمون شائع کیا۔

نہرو غمگین تھے۔ انھوں نے اپنی ماہانہ پریس کانفرنس میں ریڈی کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ وہ "یا تو بے وقوف ہیں یا شریر یا دونوں ہی کا امتزاج"۔ یہ آزادی کے بعد کے دنوں کی بات ہے جب سبھی میں ایک نیا جوش تھا۔ پنڈت جی کا فرمودہ قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ سرکاری افسروں میں ضرورت سے زیادہ پرجوش افسروں کی کمی نہ تھی۔ جوں ہی کانفرنس ختم ہوئی پریس انفارمیشن بیورو (پی آئی بی) نے جی۔ کے ریڈی کا Accreditation منسوخ کردیا: اسٹیٹ آفس نے انھیں نوٹس دے دیا کہ انہیں جو سرکاری جائے رہائش ملی ہوئی ہے اسے وہ خالی کردیں۔ جب نہرو کو شام کو دیر گئے ان سخت اقدامات کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ ایک بار پھر طیش میں آ گئے اور پی آئی بی کے کارپردازوں پر برس پڑے۔ نتیجتاً ان افسروں کو ریڈی سے اظہار معذرت کرنا پڑا اور ان کا Accreditation اور جائے رہائش بحال کرنی پڑی۔

آٹھ سال بعد مجھے اور "انڈین ایکسپریس" کے آنجہانی کے سنتارامن کو ماہانہ پریس کانفرنس میں پنڈت جی کی پھٹکار سننی پڑی۔ اس وقت میں "دی اسٹیٹس مین" کے لیے کام کر رہا تھا۔ سنتارامن نے ناگا مسئلے پر ریاستی وزرائے اعلیٰ کے نام پنڈت جی کے ایک خفیہ خط کی خبر چھاپ دی تھی۔ پنڈت جی کی نگاہوں میں میرا "جرم" اور بھی زیادہ سنگین تھا۔ میں نے ایم سی سیتلواڑ کی سربراہی میں مقرر کئے گئے لاء کمیشن کی ایک انتہائی خفیہ رپورٹ شائع کردی تھی کہ انھوں نے کچھ اعلیٰ ترین عدالتی تقرریوں پر شدید نکتہ چینی کی ہے۔ نہرو اتنا برہم ہوتے کہ جب میں نے اپنی بات کہنے کی کوشش کی تو انھوں نے اونچی آواز میں بول کر مجھے چپ کرادیا۔ میرے جن رفیقوں نے میری مدد کرنی چاہی ان کا بھی یہی حال ہوا۔

نہرو نے کہا بہت ہوگیا انھیں سنتارامن اور میرے خلاف سرکاری رازوں کے قانون کے تحت کارروائی شروع کرنی پڑے گی۔

اب آئی بی (انٹیلیجنس بیورو) کی باری تھی پی آئی بی کی نہیں۔ انٹیلی جنس بیورو فوراً حرکت میں آ گیا۔ کئی دنوں تک میرا اور سنتارامن کا پیچھا کیا جاتا رہا۔ کوئی بھی شخص جسے اس کا تجربہ نہ ہوا ہو اس بات کا اندازہ نہیں کرسکتا کہ آئی بی کی سخت نگرانی میں زندگی کتنی تکلیف دہ ہوجاتی ہے۔

دھماکہ خیز پریس کانفرنس کے پانچویں روز راشٹرپتی بھون میں عطائے اعزازات کی ایک تقریب منعقد ہونے والی تھی جس کے بعد "چائے پارٹی" ہونی تھی۔ سنتارامن اور میں چائے کا لطف لے رہے تھے کہ اچانک نہرو کے "اسپیشل اسسٹنٹ" ایم۔ او۔ متھائی ہمارے پاس آئے اور

ملک راج آنند

نہرو بطور ایک فلسفی

میں فی الحال جواہر لال نہرو کے فلسفۂ زندگی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ وہ اصطلاحی معنوں میں فلسفی نہیں تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ جو فلسفہ تعلیم گاہوں میں پڑھایا جاتا ہے اس کا بیشتر انسانی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ نہرو نے ایک برطانوی اسکول اور برطانوی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی اور اس سلسلے میں انہوں نے کئی دھچکے کھائے تھے جب وہ بڑے بڑے الفاظ کے بوجھ سے فارغ ہوئے تو انہوں نے طے کیا کہ وہ ایک غیر رسمی فلسفیانہ نقطۂ نظر سے انسانی زندگی کا مشاہدہ و مطالعہ کریں گے، کیونکہ انہوں نے محسوس کیا تھا کہ بیسویں صدی میں بنی نوع انسان کو ایک ناگوار صورت حال درپیش ہے۔ دو ایسی عالمی جنگیں لڑی جا چکی ہیں جن کے بارے میں دعویٰ تھا کہ یہ جنگ ساری جنگوں کو ختم کر دے گی، اور اب تیسری عالمی جنگ کی تیاری ہو رہی ہے جس سے ممکن ہے کہ نسلِ انسانی ہی ختم ہو جائے۔

نہرو کی موت کے بعد بعض لوگوں نے اُن کا گویا پوسٹ مارٹم کیا ہے اور بہت تیز چھُروں سے اُن کے اعضاء کو کاٹا ہے۔ حال میں ایک مہربان ناقد سر جن نے اُن کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "بطور طالب علم وہ معمولی قابلیت رکھتے تھے، بطور بیرسٹر وہ ناکام تھے۔ بطور مجاہدِ آزادی اُن میں کوئی آزادئ رائے یا قوتِ عمل نہ تھی، وہ گاندھی جی کے مرضی کے تابع تھے اور جیسا کہ انہوں نے ایک امریکن صحافی موسلے کے سامنے اقرار کیا انہوں نے طاقت حاصل کرنے کی ہوس میں ملک کا بٹوارا قبول کر لیا تھا۔"

جب نہرو نے ایک چھوٹا سا مضمون "میرا فلسفۂ زندگی" کے موضوع پر لکھا تو ایک عالم و فاضل پروفیسر نے فرمایا: "نہرو کہاں کا فلسفی ہے۔ اس نے سنسکرت ہی نہیں پڑھی وہ تو ہندوستانی روایات کو رسوا کرتا ہے..."

یہ سطحی چیر پھاڑ اس لیے ممکن ہے کیوں کہ بیشتر دانشور اور نہرو کے چند ہم عصر بھی، نیم حکیم تھے، جنہیں جدید دنیا میں رہنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ انہیں کیا معلوم کہ نہرو نے اسکول میں گیری بالڈی کی تحریریں پڑھی تھیں تو کالج میں باجوٹ، پراؤڈہان اور مارکس کا مطالعہ کیا تھا۔ اور وہ سڈنی اور بیٹرس ویب، جارج برنارڈ شا اور ایچ۔ جی ویلس جیسے دانشوروں کی فیبین سوشلزم کے مداح تھے۔ انہوں نے اپنی ڈگری حاصل کرنے کے لیے حیاتیات کا مطالعہ کیا تھا اور انہیں معلوم تھا کہ سائنس علم انسانی کو ایک نئی جہت عطا کر سکتی ہے گو کہ سائنس کے غلط استعمال سے ہتھیاروں کی صنعت بڑے بڑے منافع بھی کما سکتی ہے، جن کے بل بوتے پر استعماری قوتیں دنیا کے ایک وسیع خطے پر قبضہ جمائے بیٹھی ہیں۔

انہیں کیا معلوم کہ نہرو نے اپنی مرضی سے اس وقت وکالت کرنا چھوڑ دی جب انہوں نے اس پیشے کی بیکاریوں کو دیکھا ... یہی نہیں، انہوں نے تو گاندھی جی کے زیر اثر اپنے خاندانی وقار کو بھی پھونک دیا۔

---

۲۵ ۔ کفے پریڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۵

اور ہیٹ، سوٹ، بوٹ، نکٹائی والے ایک بھورے صاحب کی جگہ کرتا، پاجامہ پہننے والے سیدھے، سادے، ہندوستانی بن گئے اور گاندھی جی نے جنوبی افریقہ کی وحشی گوری سرکار کے وہاں کے بھورے اور کالے لوگوں کے ساتھ امتیازی سلوک سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے جو اہنسا پر مبنی ستیہ گرہ چلائی تھی، اس نے ساری دنیا کو مبہوت کر دیا تھا۔

جواہر لال نہرو نے جدوجہد کا مشکل راستہ چنا۔ مراعات یافتہ طبقے کا نامی نوجوان آزادی کی تحریک میں کود پڑا اور اس طرح وہ ایک ایسا انسان بن گیا جسے روزانہ صرف اپنے بلکہ ہر سطح کے اُن لوگوں کے مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا جو استحصال اور بربریت کے نظام تلے دبے ہوئے چلے آ رہے تھے اور جو ہندوستانی سماج میں بجا طور پر برابری کا رتبہ حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔

جیسے جیسے نہرو نے دیکھا کہ مشترکہ جدوجہد میں ہر قسم کے لوگ آکر شریک شامل ہوتے جاتے ہیں۔ انہیں محسوس ہوا کہ انسان کوئی معینہ ہستی نہیں۔ اگر ایک طرف وہ ایک تجربے سے وجود میں آیا تو دوسری طرف وہ خود تجربہ کر کے کچھ بن سکتا ہے۔ لہٰذا کچھ انسانوں کے لیے یہ بالکل ممکن ہے کہ وہ قسمت میں لکھے کو بے رخی سے قبول کرنے کی بجائے اپنی قسمت کو یہیں اسی دنیا اور اسی زندگی میں بہتر بنا لیں اور عام لوگوں کی طرح مایا، کرما اور موکش کے روایتی عقیدوں سے چمٹے ہوئے محض عقبیٰ کے انتظار میں نہ بیٹھے رہیں۔

جواہر لال نہرو نے لکھا ہے:

"اور تب گاندھی جی کا ورود ہوا۔ وہ تازہ ہوا کے زوردار جھونکے کی طرح تھے۔ جس کے آنے پر لوگ انگڑائی لیتے ہیں اور گہری سانسیں لینے لگتے ہیں (تاکہ اس ہوا کو اپنے میں جذب کر لیں)۔ وہ اندھیرے میں روشنی کی شعاع کی طرح تھے۔ وہ ہمارے اوپر سے نہیں آئے بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کروڑوں ہندوستانیوں میں سے ابھرے ہیں، انہیں کی زبان میں بات کرتے ہیں اور ہمیشہ انہی کی حالتِ زار کی جانب لوگوں کی توجہ دلاتے رہتے ہیں۔ انہوں نے ہم سے کہا تم لوگ جو کسانوں اور مزدوروں کا استحصال کر کے زندگی بسر کرتے ہو، اُن کی پیٹھ سے اتر جاؤ۔ اس نظام سے باہر آ جاؤ جو اس مفلسی اور مصیبت کو جنم دیتی ہے۔ ان کے پیغام سے سیاسی آزادی کا ایک نیا مفہوم اور ایک نئی شکل نمودار ہوئی۔ ان کی تعلیمات کا نچوڑ تھا۔ بے خوفی، حق کی تلاش، ان دونوں سے منسلک عمل اور عوام کی بھلائی کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا۔"

جواہر لال نہرو نے اپنی مبہم قسم کی کلبیت یا نک چڑھے پن سے چھٹکارا پا لیا اور ڈرائنگ روم والے دانش وروں کی طرح بننا چھوڑ دیا۔ ان میں یہ عادتیں کچھ تو نوجوانی کے باعث اور کچھ آسکر وائلڈ اور والٹر پیٹر کے زیر اثر آ گئی تھیں تب وہ آزادی کی حکمتِ عملی وضع کرنے کے کام میں شریک ہونے لگے۔ وہ مہاتما گاندھی کو "باپو" پکارنے لگے۔ لیکن اُن سے بہت آزادی سے گفتگو کرتے تھے بلکہ بعض موقعوں پر اُن کی مخالفت بھی کرتے تھے۔ مثلاً وہ یہ سمجھتے تھے کہ لوگ باپو کے نعرے رام راج سے گمراہ ہو کر دیو مالائی دور کے پدرانہ اور جاگیردارانہ نظام واپس لانے کی کوشش کریں گے۔ تحریکیں چلانے میں باپو جو تاخیر کرتے تھے وہ اُن کی بھی مخالفت کرتے تھے۔ وہ باپو کے "مرن برت" کے بھی مخالف تھے، لیکن اپنی ساری تنقیدوں کے باوجود وہ گاندھی جی کی بات مان لیتے تھے کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ گاندھی جی عوام کی قوتِ عمل سے فطری طور پر زیادہ ہم آہنگ ہیں۔ جواہر لال، گاندھی جی کے چوکس اور تخلیقی ناقد تھے۔ انہوں نے اُس وقت مہاتما گاندھی کی تعریف کی جب گاندھی جی نے مہاتما کہلانے سے انکار کیا تھا۔ وہ خود بھی عوام کے لیے اتنے ہی فکرمند تھے جتنے کہ گاندھی جی۔ جن کا قول ہے: غریب کے لیے بھگوان روٹی کی شکل میں آتا ہے اور جن کا عزم تھا کہ ہر آنکھ سے آنسو پونچھ دیا جائے۔

انسانی دکھوں کا دردمندی کے ساتھ احساس، گاندھی جی اور جواہر لال نہرو میں مشترک تھا۔ نہرو بھی اپنے گرو کی طرح سارے ملک میں گھومتے پھرے۔ گاؤں سے گاؤں تک۔ چھوٹے قصبے سے لے کر بڑے شہر تک، جہاں پر بھی پولیس راج کے تلے دبے لوگوں کو ان کی ضرورت محسوس ہوئی، نہرو دوڑ پڑتے تھے۔ تو ایک نئے قسم کے یاتری کی طرح وہ حالات کے دھارے میں روز بروز زیادہ گہرے اترتے گئے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ آسام کے باغات میں کام کرنے والے مزدوروں کو قیدیوں کی طرح رکھا جاتا ہے۔ اور انہیں یونین بنانے کی اجازت نہیں ہے تو انہوں نے ان مزدوروں کی حالت سے متعلق وہٹلے رپورٹ پڑھی اور خود آسام گئے اور اپنی آمد پر لگائی گئی سرکاری پابندی کی خلاف ورزی بھی کی۔ جب انہوں نے سُنا کہ بہار میں کانگریس پارٹی کے زمیندار ممبر قبائلی لوگوں کا استحصال کرتے ہیں تو انہوں نے یہ معاملہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں اٹھایا

ب بنگال کے دہشت پسندوں نے انہیں یہ لکھا کہ اُن کے ساتھی
اسی قیدیوں کو جسمانی تکلیف و تعذیب کا نشانہ بنایا جارہا ہے تو
ہولں نے لندن سول سرشیز یونین کے ممبر ایک دوست کو خط لکھا
ے نے اس بارے میں پارلیمنٹ میں سوال کرایا۔ آخر یہ کیسے ممکن ہوا کہ ایک
ے گھرانے کا دانشور جو لبرل طبقے کی سرکاری عدم مداخلت پالیسی کا
کر ہو چکا ہو۔ اس پر یقین ہے آیا کہ انسان میں بدلنے کی اور غلامی کی
یت اور مایوسی سے اوپر اٹھنے کی صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنے آقاؤں
خلاف بغاوت کر سکتا ہے اور زیادہ بہتر انسان بھی بن سکتا ہے —
ہوں نے ایک چھوٹی سی کتاب "وہیر آر وی" (ہم کہاں ہیں) لکھی
ی، جن میں دیگر انسانوں کے بارے میں دردمندی کی ایک جھلک ملتی
ہے۔ لکھتے ہیں:

"میں کئی مہینوں تک ہندوستان میں مارا مارا پھرا
اور لاکھوں چہرے میری نظر سے گزرے۔ میں نے
اپنے ملک کے ہزاروں رُخ اور پہلو دیکھے۔ اس
کا بیش بہا تنوع دیکھا، لیکن ان سب پر ہندوستان
کی متحد کر دینے والی چھاپ تھی۔ میں نے یہ سمجھنے
کی کوشش کی کہ ان لاکھوں آنکھوں کے پیچھے، جو
مجھے اُمید و خواہش کے ساتھ گھورتی تھیں کیا
پیغام چھپا ہوا ہے، اُن کے کیا گہرے دُکھ ہیں جو
وہ ظاہر نہیں کر پا رہی ہیں۔"

جب انہوں نے یہ کتابچہ لکھا تو انہیں افریقہ میں ایک گجراتی بیرسٹر
ندھی کے کارناموں کا علم ہو چکا تھا، جنہوں نے افریقی ہندوستانیوں
ر عیسائی پادریوں کے ساتھ مل کر قید و بند کی مصیبت اور جسمانی
لیف سہہ کر عدم تشدد پر مبنی عدم تعاون کی ایک تکنیک نکالی تھی
ر معتوب لوگوں کی زندگی میں کچھ تبدیلیاں لانے میں کامیاب ہوئے
تھے۔ چنانچہ نہرو بھی کچھ لیس و پیش کے بعد انسانی حقوق دلانے کے
ے گاندھی کے طریقے یعنی حکومت کے خلاف پُرامن جدوجہد کے قائل
ہو گئے۔

نہرو نے ماقبل کے انسانوں کی مثال دیتے ہوئے کہیں کہیں
تم بدھ کا بھی حوالہ دیا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اوقات تنہائی میں
نہوں نے سوچا ہو کہ اُن کے گھرے گھر کو چھوڑ دینے میں اور گوتم بدھ کے
یاگ میں تھوڑی بہت مماثلت ہے۔ بہر حال اس کے بعد انہوں
ے گوتم بدھ اور برہمن کے مکالمے کا ذکر ضرور کیا ہے جس میں بدھ نے برہمن
سے پوچھا کہ وہ کس طرح ایک ساری قوم کو رد کرنے اور اچھوتوں کو غلام
بنانے کو حق بجانب سمجھتا ہے۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ نہرو خدا کو نہ مانتے ہوئے بھی اخلاقیات
کے پابند تھے۔ یہ اُن کے فلسفۂ حیات کا ایک بنیادی اصول تھا۔

ہندوستان کے قدیم اور روایتی مکاتیبِ فلسفہ کے بارے
میں یعنی شنکر کے ادویت، سانکھیہ کی مادیت اور دیگر درشنوں
کے بارے میں نہرو کی رائے یہ تھی کہ صرف اُس فلسفے کو جس کا
آج کل کی زندگی سے کوئی تعلق ہو، قبول کیا جاسکتا ہے۔ ہم کسی جامع
نظام کے تصور کی تعریف تو کر سکتے ہیں۔

لیکن اگر وہ کائنات کو کسی خیالی جنت کے طور پر پیش کرتا
ہے تو اُسے قبول نہیں کر سکتے۔ مطلب یہ کہ اُن کی رائے میں فلسفہ
انسانی تجربات کا نچوڑ ہے، جو موجودہ انسانوں، عورتوں مردوں
کے جذبات و احساسات، خیالات و آرا، خواہشات اور تجربات
سے بحث کرتا ہے۔ جب وہ موجودہ انسان کے مستقبل کا تصور کرتے
تھے تو اس میں تمام تر امکانی ترقی کو ضرور شامل کرتے تھے۔

گو کہ وہ رگ وید کے تخلیق عالم سے متعلق دعا کے مداح تھے جس
میں تخلیق کے بارے میں پُرتخیل قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔ لیکن وہ
ویدوں کو حرف بہ حرف مانتے نہیں تھے۔ اسی لیے وہ بعض سوتروں
اور اپنشدوں کے بھی مداح تھے۔ لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کوئی
الہامی چیز ہیں، جن پر عقیدہ رکھنا ضروری ہے۔ خاص طور پر جبکہ
اُن میں سے اکثر ایک دوسرے کے متضاد تھے۔ اسی طرح وہ یہ بھی نہیں مانتے
تھے کہ آج کل کے انسانی مسائل پرانے منتروں کے پڑھنے سے حل ہو جائیں
گے۔ اور گو کہ وہ پیدائشی طور پر برہمن تھے، لیکن وہ نہ تو پوجا پاٹ کرتے
تھے اور نہ کسی اور کسی قسم کی عبادت۔

اصل میں وہ اس تجزیے اور انداز فکر کے قائل تھے جس کا
ذکر پورva میمانسا میں ملتا ہے جو ساری بحثوں کو حسب ذیل اجزا میں
تقسیم کرتا ہے۔ (۱) موضوع (۲) موضوع کے بارے میں شک۔
(۳) ادعا (۴) رد (۵) خاتمہ یا جواب۔ لہٰذا وہ یہ سوچنے کی طرف
مائل تھے کہ فلسفیوں کو پہلے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ لوگ اپنی زندگی کے
ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کائنات کے بارے میں کیا سوچتے
یا محسوس کرتے ہیں اور زندگی کیسے بسر کرنی چاہیے۔ ماضی کے بعض دانشمند
خیالات کی وہ قدر کرتے تھے، لیکن وہ ہر روایتی خیال کو تسلیم کرنے کے لیے
تیار نہیں تھے۔ وہ پہلے یہ کھوج لگانا چاہتے تھے کہ ماضی میں جب کوئی

فلسفہ یا مذہب وجود میں آیا تو اس وقت کے سماجی حالات کیا تھے اور کیا ان حالات کی آج کل کے زمانے میں کوئی اہمیت ہے۔ مثال کے طور پر، برہمنوں نے عرصۂ دراز تک اچھوتوں کو منتر پڑھنے کی ممانعت کر دی تھی، لیکن نہرو کی رائے میں آج یہ حکم ناقابلِ برداشت ہے۔ کیونکہ ہم چاہتے ہیں کہ آج ہر شخص کو جاننے کا حق حاصل ہو تاکہ وہ حق و باطل میں تمیز کر سکے اور وہ فیصلہ کر سکے کہ وہ کس بات پر عقیدہ رکھنا چاہتا ہے اور کسے رد کر دینا چاہتا ہے۔ منوسمرتی میں لکھا ہے کہ عورت مرد کو بہکانے والی ہے اور اس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ نہرو کو عورت کی یہ تذلیل گوارہ نہیں تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ عورتوں کو وہ سارے حقوق حاصل ہو جائیں جو مردوں کو ملتے ہیں۔ نہرو کا خیال تھا کہ ہندو فلسفہ ازمنۂ قدیم اور وسطی دور کے مسائل پر شاندار بحثیں کرتا ہے، لیکن اس کا زمانۂ حال سے بیشتر کوئی تعلق نہیں۔ اسلام بھی اس طرح زیادہ تر اپنے زمانے یعنی وسطی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے ان کی رائے میں شیعہ سنی جنگیں آج کل کے زمانے میں لاحاصل اور بے سود ہیں۔ اور جب ماسٹر تارا سنگھ نے سکھوں کے لیے علیٰحدہ جگہ مانگی تو نہرو نے انہیں یاد دلایا کہ گرو گرنتھ صاحب تو سارے مذہبوں کا امتزاج ہے اس میں نہ صرف نانک، بابا فرید، کبیر اور نامدیو کے دوہے اور گیت ہیں بلکہ جپ جی کا کائناتی تصور بھی۔

نہرو اس کائناتی تصور کی ادویت (لاثنویت) فلسفے میں بھی قدر کرتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اس کا تصور خود اپنے الفاظ میں یوں پیش کیا ہے:

"فطرت کا تنوع اور فیاضی میرے دل پر اثر انداز ہوتے ہیں اور روح میں ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔ ایسے اوقات میں میں یہ تصور کر سکتا ہوں کہ میں قدیم ہندوستانی یا یونانی، یا کافر سارے دیوتاؤں کو ماننے والے دور میں چلا گیا ہوں اور وہاں کوئی اجنبیت محسوس نہیں کرتا۔"

غالباً اُن کا اندازِ فکر ہملیٹ جیسا ہو جسے اپنی قوتِ فیصلہ پر اعتماد نہیں تھا اور جو سوچ کا کھڑا رہ جاتا تھا۔ نہرو کے یہاں یہ پھر بھی واضح ہے کہ اُن کا رجحان کس جانب تھا۔ وہ پرانے ملبوسات کو اتار کر نئی بُنت کا کپڑا لانا چاہتے تھے۔ وہ پدری کلچر کو ترک کر کے جس میں روحانیت پر زور دیا جاتا تھا، اجتماعی تحت شعور کی مثبت قوتوں کو ابھارنا چاہتے تھے جو انسانوں کو مختلف آزادیوں کی طرف اکساتی ہیں اور تخلیقی قوتوں کو اظہار کا موقع دینا چاہتی ہیں۔

اُنہوں نے مثبت قدروں پر زور دیا، جن میں سے چند کا ماخذ قدیم تجسس ہی تھا، لیکن جن کو کٹر عقیدوں نے محبوس کر دیا تھا۔ وہ محض ایسی توانائیاں اخذ کرنا چاہتے تھے، جن سے مستقبل کے بنانے میں مدد ملے۔

اُنہوں نے سارے ایسے مستحکم فلسفوں اور عقائد کی منظم اطاعت سے تنفر کا اظہار کیا جو مختلف مذہبوں کی فوجوں کی وردیاں پہنے گھوما کرتے ہیں اور وہ روز بروز لاادریہ لوگوں کی طرح مذہب سے متنفر ہوتے گئے۔ انہیں ایسا لگتا کہ ہندوستان میں کئی لوگ تو خدا کو کوئی قبائلی سردار سمجھتے ہیں، جو کھانے اور روپے کے تحفے اور اطاعت و تعریف کا طلب گار تھا اور اس کے بدلے میں یہ وعدہ کرتا تھا کہ وہ انہیں نجات دے دے گا۔ نہرو کا خیال تھا کہ پرانی دیو مالا کی تعریف تو کی جا سکتی ہے، مگر زندگی بسر کرنے کے لیے نئی دیو مالا تخلیق کرنا ضروری ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ خداؤں کی مدد کے بغیر بھی انسان لافانی ہو سکتا تھا۔

جواہر لال کی رائے میں یہ کہنا کہ خدا کے بغیر زندگی میں کوئی مقصد نہیں رہے گا۔ دراصل لفظ "مقصد" کے بارے میں ابہام پر مبنی ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بطور انسان ہمارا کیا مقصد ہے۔

نہرو نے کبھی یہ سوال فلسفیوں کی اصطلاح میں نہیں پوچھا لیکن اپنی کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" اور دوسری متفرق تحریروں میں کہیں کہیں خود کلامی کے انداز میں اس سوال کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ضرور ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مجھے چین کا قدیم اندازِ فکر اپیل کرتا ہے جو بنیادی طور پر اخلاقی ہے۔ اور جس میں مذہبی تشکیک کی پُٹ ملی ہے گو کہ میں یہ نہیں سمجھتا کہ اس کا اطلاق زندگی پر کیا جا سکتا ہے۔ میں تو صرف تاؤ یعنی طرزِ زندگی اور راستے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔"

کیا یہ ممکن ہے کہ جب اُنہوں نے گاندھی جی کے اس تصور پر زور دیا کہ مقصد اور ذریعہ ایک ہی ہے اور صحیح مقصد کے لیے صحیح ذریعہ استعمال کرنا ضروری ہے تو وہ گویا زندگی میں اخلاقیات کے اصول بُن رہے تھے۔ جسے وہ واحد امکانی فلسفۂ حیات سمجھتے تھے۔

نہرو نے یہ سوال بھی اُٹھایا کہ کون کس بنا پر فیصلہ کرے گا کہ صحیح مقصد اور صحیح ذرائع کیا ہیں۔ ان کا جواب ہے وہ جو انسانیت کی پروا کرتا ہے۔ انہیں یقین تھا کہ جو خصوصیات انسان کو انسان بناتی ہیں، اُنہیں کی تکمیل سے سچی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ جبھی اُنہوں نے محو

کیا کہ سچی خوشی محض سیکولر دنیا میں حاصل ہو سکتی ہے، جہاں بغیر کسی دباؤ کے انسان انسان سے محبت کرتا ہے۔ جہاں خدا کا تصور بھی محبت کے حجاب میں مستور ہوتا ہے۔ کیوں کہ خدا ہی جو اپنی مخلوق سے پیار کرتا ہے —— انسانوں کے دل میں پیار ڈالتا ہے اور انہیں دوسروں سے پیار کرنے کو کہتا ہے۔

جواہر لال نہرو نے قبائلی سماج کا قریب سے مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے پایا کہ کچھ قبیلوں نے جنگلوں میں ایک جامع تنظیم بنائی تھی اور وہ سیکولر ادارے بنانے کی طرف مائل تھے، جنہیں وہ بعض علامتوں کی مدد سے مقدس بھی بنا دیتے تھے۔ بہر حال بنیادی جذبہ یہ تھا کہ موت کے خطرے کا سامنا کرنے کے لیے انسانی اخوت اور برادری کو تسلیم کیا جائے

دیکھو ڈارون، مجلٹ اور مارکس نے یہ افواہ اڑائی تھی کہ خدا کی موت واقع ہو چکی ہے۔ اب سائنس اس کی تصدیق کرتی نظر آتی ہے نئی دریافتوں نے انسانوں کو ہمیشہ سے زیادہ طاقتیں عطا کر دی ہیں اور اب وہ اپنی زندگی کا مقصد پورا کر سکتے ہیں؛ وہ چیزیں بھی حاصل کر سکتے ہیں جو پہلے الوہی طاقتیں معجزات کے ذریعے ممکن بنا سکتی تھیں۔

بہر طور سائنس چونکہ معروضی ہوتی ہے لہٰذا تحقیق' اخلاقی مقاصد تک محدود نہیں رہ سکتی۔ تجربہ گاہوں سے جو نیا علم حاصل ہوتا ہے وہ ہمیں ذرائع کا مالک ضرور بنا دیتا ہے، لیکن جب اس علم کو جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، دشمن پر فتح پانے کے سیاسی مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایٹم بم کی صورت میں' تو یہ یقینی طور پر انسانی زندگی پر جا جاتہ حملہ کرتا ہے اور غیر اخلاقی ہو جاتا ہے۔

جواہر لال نہرو نے سائنس کے غیر اخلاقی استعمال کے خطرے کو سمجھ لیا تھا جبھی انہوں نے ایٹم بم کے تخلیق کردہ بادلوں کی مخالفت کی تھی۔ اگرچہ دنیا کی طاقت ور ترین ریاست نے اس بات کا برا مانا تھا اور خفگی کا اظہار کیا تھا۔

بہر حال اگر مستقبل میں انسانی زندگی کو مرکزی حیثیت دینا ہے تو اس دنیا میں جس میں انسان اپنے آپ کو پائے گا اس کے حقوق کی حفاظت ضروری ہے تاکہ کوئی اُن کو چھین نہ سکے۔

جواہر لال نہرو نے "گلمپسز آف ورلڈ ہسٹری" میں بتایا ہے کہ جب تک لوگوں نے یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد بطور فرد اپنے کو منوانا شروع نہیں کیا۔ اس وقت تک انسانی حقوق نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ امریکہ میں اٹھارہویں صدی کے آخر تک غلاموں کو آزاد نہیں کیا گیا تھا۔ دراصل ۱۷۸۹ء کے فرانسیسی انقلاب کے بعد ہی یہ مانا گیا کہ بہتر طور پر زندگی بسر کرنے کیلیے انسانی آزادیاں ضروری ہیں، لیکن انیسویں صدی میں گو کہ بعض سماجوں میں چند بنیادی آزادیاں تسلیم کر لی گئی تھیں، لیکن انہی ملکوں کے اعلیٰ طبقوں نے ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ میں مختلف ملکوں پر قبضہ کر کے وہاں کی آبادیوں کو غلام بنا لیا اور ان کا استحصال شروع کر دیا۔

بیسویں صدی میں استحصال کرنے والوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ وہ زیادہ بڑا حصہ مانگنے لگے اور انہوں نے نہ صرف اپنی رعایا کو بلکہ غیر ملکوں کے باشندوں کو بھی انسانی حقوق سے محروم کر دیا۔ پھر انسانوں کو جنگوں میں توپوں کے چارے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ روسی انقلاب نے ایک ایسا سماج تو قائم کیا جس میں ہر ایک کو برابر کا حصہ ملتا تھا، لیکن وہ بھی ایک جابر کے قبضے میں چلا گیا جس نے اُن انسانی حقوق کی اَن کہی کر دی جن کی پیروی لینن نے کی تھی۔

سماجی انصاف' حق' ایمان داری اور آزادی جیسی قدروں سے جن قوموں نے فائدہ اٹھایا آج وہی ان قدروں کی نفی کر رہی ہیں۔ ان ملکوں نے تہذیب کے نام پر اور نقلی دشمنوں سے خطرہ ہونے کے نام پر، لاکھوں ایٹم اور ہائیڈروجن بم جمع کر رکھے ہیں جو روئے ہستی سے ہر قسم کی زندگی کو ختم کر سکتے ہیں۔

جواہر لال جب ہندوستان کی جمہوریت کے سربراہ بنے تو ملک نے سو سالہ جدوجہد کے بعد عدم تشدد کے ہتھیار کی مدد سے ایک سامراجی طاقت کی غلامی سے نجات پائی تھی، لیکن آزادی کا اعلان ہوتے ہی ہندوستان کو اپنی پہلی جنگ کا المیہ جھیلنا پڑا۔ چنانچہ نہرو نے صد سالہ امن قائم کرنے کے لیے، تاکہ ہندوستان اور ایشیا اور افریقہ کے دبی کچلی مخلوق بھرپور ترقی کر سکے۔ پنچ شیل وضع کیا کہ ملکوں اور لوگوں کے درمیان پُر امن بقا اور باہمی احترام قائم ہو سکے۔ ان کی خواہش تھی کہ انسان کو محض ایک وسیلہ نہ سمجھا جائے بلکہ اُسے بھرپور ترقی کا موقع دیا جائے تاکہ وہ غذا اور آزادی جیسے بنیادی حقوق بھی حاصل کر سکے۔

نہرو نے اپنی ساری زندگی، اپنی ساری ذاتی سوجھ بوجھ اور ہر سطح کی سیاست کو انسانیت کی جدوجہد میں لگا دیا۔ دوسرے ہی خواہوں نے بھی اُن کا ساتھ دیا۔ جبھی اُن کے رائٹنگ پیڈ پر رابرٹ فراسٹ کے حسب ذیل اشعار لکھے ہوئے تھے:

"جنگل دلکش ہے گھنا ہے' تاریک ہے۔
لیکن مجھے چند وعدے نبھانے ہیں۔ الخ

جواہر لال کو انسان کی صلاحیت اور اس کے بھرپور ہونے کی ضرورت پر جو عقیدہ تھا' اُسے فلسفیانہ زبان میں "انسان دوستی" کہا جا سکتا ہے۔

(ترجمہ: مہدی عباس حسینی)

آر۔ ایم۔ تنگارے

نہرو اور منصوبہ بندی

ہندوستان میں منصوبہ بندی کے بارے میں کافی پہلے سے بلکہ یوں کہیے کہ روسی انقلاب کے فوراً بعد سے سوچا جانے لگا تھا۔ کچھ دانشوروں نے بہت پہلے یہ محسوس کرلیا تھا کہ ہندوستان کی سریع اقتصادی ترقی کے لیے سوچ سمجھ کر کی گئی قومی معاشی منصوبہ بندی ضروری ہے۔ ان میں ایم۔ وِشویشوریا کا نام سرفہرست ہے۔ جواہرلال نہرو کی قیادت سے، جو ۱۹۳۸ء میں قائم کی گئی نیشنل پلاننگ کمیٹی کے صدر بنائے گئے تھے ملک میں منصوبہ بندی کے بارے میں غور و فکر کو کافی بڑھاوا ملا۔ اگرچہ یہ کمیٹی ملک کے لیے ایک قومی منصوبے کا خاکہ پیش نہیں کرسکی تاہم اس کی بدولت ہمارے دانشوروں میں منصوبہ بندی کے رموز و نکات کے بارے میں آگہی پیدا ہوئی اور ملک کی سب سے بڑی جماعت نے جو ملک کے لیے مستقبل کی راہِ عمل تلاش کررہی تھی، منصوبہ بندی کا پروگرام اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

منصوبہ بندی کے نظریے کی تشکیل میں نہرو بلاشبہ روسی انقلاب سے متاثر ہوئے تھے۔ لیکن وہ بخوبی سمجھتے تھے کہ اس قسم کے تجربے کی راہ میں کیا مشکلات پیش آئیں گی۔ ان کا عالمی تاریخ کا مطالعہ بہت عمیق تھا جس کی شہادت ان کی تصنیف Glimpses of World History سے ملتی ہے۔ لیکن ان کے نظریہ منصوبہ بندی نے کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ اس کا مآخذ تاریخ کا نظریاتی فلسفہ ہے۔ ایک منصوبہ بند معیشت سے ان کی مراد ایک ایسے نظام سے تھی جس میں ہر بات پیش بینی، خیرسگالی اور باہمی اشتراکِ عمل سے وقوع پذیر ہو جبکہ بازاری معیشت میں ہر چیز خود بخود ہوتی ہے۔

نہرو ایک پیشہ ور ماہرِ معاشیات نہیں تھے۔ تاہم انھیں ان اقتصادی قوتوں کی اچھی خاصی سمجھ تھی جو دنیا کو ترقی کی راہ پر لے جاتی ہیں انھیں اس کا علم تھا کہ انیسویں صدی کے سرمایہ دارانہ نظام نے عظیم پیداواری قوتیں کھلی چھوڑ دی ہیں لیکن انھیں اس کا احساس بھی تھا کہ اس نظام نے مسلمہ طرزہائے زندگی میں بڑا الٹ پھیر پیدا کر دیا ہے اور محنت کش لوگوں پر مشکلات و مصائب لاد دیئے ہیں۔

اگرچہ نہرو کے دل و دماغ پر روسی انقلاب کے تجربے کا اثر تھا تاہم جب آزاد ہندوستان کے لیے ترقی کے موزوں راستے کے انتخاب کا وقت آیا تو انھوں نے "مخلوط معیشت" کے ماڈل کو ترجیح دی۔ ایسا صرف سیاسی سہولت کی خاطر نہیں کیا گیا بلکہ سوچ سمجھ کر کیا گیا کیونکہ "مخلوط معیشت" کو ہی ہندوستانی معیشت کی معاشی تنظیم کا موزوں ذریعہ سمجھا گیا۔ ایک بات بہت صاف ہے اور وہ یہ کہ نہرو نے اپنی زندگی کے کسی بھی مرحلے پر فری مارکیٹ (آزاد منڈی)، کے فلسفے کو قبول نہیں کیا اور منصوبہ بندی کو ہی ایک معقول طریقہ سمجھا۔ ان کے نظریۂ منصوبہ بندی کا مقصد ہر مرحلے پر عوام کی شرکت کو یقینی بنانا تھا۔ یعنی یہ کہ جن باتوں کا اثر عوام پر پڑتا ہو اُن کا فیصلہ کرنے اور ان فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کا کام عوام جمہوری طریقے سے خود کریں۔ ہندوستان کے لیے منصوبہ بندی کے نظریے کی تشکیل میں انھوں نے جمہوری ڈھانچے کی پُرزور حمایت کی کیونکہ اس میں ترقیاتی کاموں کا فیصلہ کوآپریٹو طریقے سے سبھی متعلقہ طبقوں کی رضامندی سے کیا جاتا ہے۔ نہرو نے منصوبہ بندی کے نظریے کو "جبر و دباؤ" کے عنصر سے پاک رکھنے کی کوشش کی۔

منصوبہ بندی کے نظریے کی تشکیل میں نہرو کا کیا حصہ ہے۔ اسے ڈاکٹر پی۔ سی مہالونوبس نے مختصر طور پر یوں بیان کیا ہے۔

> "نہرو کی قیادت میں ہندوستان نے بڑی پیش رفت کی۔ نہرو نے ہندوستان میں منصوبہ بندی کے بارے

میں غور وفکر کا آغاز کیا۔ انھوں نے اپنی تقریروں اور منصوبہ بندی ... اور منصوبہ بندی کمیشن کے ذریعے گہرا تعلیمی اثر ڈالا اور ہندوستان میں قومی منصوبہ بندی کی ضرورت کا احساس پیدا کیا۔ کانگریس پارٹی اور حکومت کی وساطت سے انھوں نے کمیونسٹ ممالک سے باہر وسیع ترین پیمانے پر منصوبہ بندی کو قومی پالیسی کا ایک اہم آلہ بنایا ہے اور ہندوستان کے سوشلزم کو اپنا نصب العین قرار دینے پر آمادہ کیا۔ انھوں نے ہندوستانی منصوبہ بندی میں' دنیا میں رونما ہونے والے سائنسی انقلاب کا مکمل ادراک' انسانی اقدار اور ثقافتی روایات کے تئیں بیداری' جمہوریت کے لیے جذبہ اور بین الاقوامی نقطۂ نگاہ پیدا کیا ہے۔"

ضروری مشینری

نہرو نے منصوبہ بندی کے نظریے کو عملی شکل دینے کے لیے مثبت اقدامات کیے۔ نہرو نے منصوبہ بندی کے لیے ایک علیٰحدہ ادارے کی ضرورت محسوس کی۔ انھوں نے سوچا کہ یہ ادارہ حقائق و اعداد و شمار کی روشنی میں زیادہ سائنٹفک بنیادوں پر کام کرے گا اور مختلف شعبوں کے تکنیکی ماہرین کے تجربے کو یکجا کر سکے گا۔ اس طرح ہندوستان کا منصوبہ بندی کمیشن نہرو کے زورِ فکر کا ہی نتیجہ ہے۔ ہمیں ہندوستانی آئین میں منصوبہ بندی کمیشن کا کوئی واضح ذکر نہیں ملتا گو اس میں ہندوستان کی ترقی کے لیے مستقبل کی راہ عمل پر کافی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۹۴۷ء کے سیاسی ماحول اور غیر یقینی صورتِ حال کی وجہ سے نہرو کے لیے منصوبہ بندی پر کافی زیادہ توجہ مبذول کرنا ممکن نہ تھا۔ ۱۹۴۹ء کے وسط سے وہ مسئلہ خوراک کے حل اور اقتصادی منصوبہ بندی پر زیادہ توجہ دینے لگے۔ ۱۹۴۹ء کے آخر میں انھوں نے ایک غیر ملکی ماہر کو کافی وقت دیا جس نے ایک یادداشت تیار کی جس میں اقتصادی منصوبہ بندی کے تصورات اور ان کے لیے درکار مشینری کی تفصیلات پیش کی گئیں جنوری ۱۹۵۰ء میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں منصوبہ بندی کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا۔

اس قرارداد کا مسودہ خود جواہر لال نہرو نے تیار کیا جس میں منصوبہ بندی کمیشن کے فرائض اور ذمہ داریوں کی صراحت کی گئی تھی۔ انھوں نے منصوبہ بندی کمیشن کے کام کا تعلق براہ راست بنیادی حقوق اور سرکاری پالیسی کے رہنمایانہ اصولوں سے جوڑا۔

اس طرح نہرو نے یہ واضح کر دیا کہ منصوبہ بندی کمیشن کی تشکیل سرکاری پالیسی کے ہدایتی اصولوں کے مقاصد کو آگے بڑھاتی ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ منصوبہ بندی کی تشکیل کے لیے نہرو نے پختہ سیاسی عزم و ارادے سے کام لیا کیونکہ اسی کمیشن کو نہ صرف مرکزی حکومت کے لیے بلکہ ریاستی حکومتوں کے لیے منصوبہ بند ترقی کا راستہ تجویز کرنا تھا جب نہرو ڈاکٹر مہالونوبیس کو منصوبہ بندی کمیشن میں لائے تو انھوں نے اس بات کو یقینی بنانا چاہا کہ ہندوستان میں منصوبہ بندی کا عمل سائنٹیفک اور حقائق و اعداد و شمار پر مبنی ہونا چاہیے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ منصوبہ بندی درست اعداد و شمار کی بنیاد پر ہی کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا ۱۹۵۰ء میں نیشنل سیمپل سروے کا قیام عمل میں لایا گیا۔

جب "نیچے کی سطح سے منصوبہ بندی" کا سوال اٹھا تو نہرو نے پنچایتی راج کی تین سطحی مشینری بنانے کے بارے میں سوچا۔ پنچایتی راج یا مقامی حکومت خود اختیاری کے ان اداروں کو بلاک کی سطح پر مناسب منصوبے بنانے اور اجتماعی ترقی کے پراجیکٹ شروع کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ نہرو کا منصوبہ بندی کا تصور کافی لوچدار تھا۔ ان کا خیال تھا کہ منصوبوں میں اتنی لچک ہونی چاہیے کہ مقامی ضرورتوں کے مطابق کوئی بھی تبدیلی کرنے کی گنجائش نکالی جا سکے۔ جب انھیں یقین ہو گیا کہ مقامی اداروں کو کافی اختیارات منتقل کیے جانے چاہئیں تو انھوں نے اس کے لیے موزوں مشینری قائم کرنے میں سیاسی جرات سے کام لیا۔ ان کی کوششوں کا مقصد ہندوستان میں منصوبہ بندی کے تجربے کے لیے ضروری ڈھانچہ فراہم کرنا تھا۔ چونکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ منصوبہ بندی محض ایک خاکہ بن کر ہی نہ رہ جائے۔ عوام کا طرز زندگی بنے اس لیے وہ ہر تجویز کا خیر مقدم کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ منصوبہ بندی کے لیے ادارہ جاتی ڈھانچہ ایسا ہونا چاہیے جو ان لوگوں کا تعاون اور شمولیت حاصل کر سکے جن کے لیے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔

موزوں ادارہ جاتی اصلاحات

نہرو اچھی طرح سے جانتے تھے کہ موزوں ادارہ جاتی اصلاحات کے بغیر منصوبہ بندی پر موثر عملدرآمد نہیں ہو سکتا۔ وہ صنعت و زراعت کی تنظیم کے لیے ہمیشہ نئے نئے طریقوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ کوآپریٹو طرز کی تنظیم سے ہماری ترقیاتی کوششوں میں' بالخصوص ہمارے معیشت کے دیہی سیکٹر میں' عوام کی زیادہ تعداد میں شرکت یقینی ہو جائے گی۔ نومبر ۱۹۵۸ء میں قومی ترقیاتی کونسل نے کوآپریٹو پالیسی کے بارے میں ایک قرارداد منظور کی۔ امداد باہمی (کوآپریشن) کو ایک عوامی تحریک کے طور پر فروغ

دینے کے لیے کونسل نے اعلان کیا کہ یہ ضروری ہے کہ کوآپریٹو ادارے گرام سماج کی سطح پر ایک بنیادی اکائی کے طور پر منظم کئے جائیں اور گاؤں کی سماجی و اقتصادی ترقی کے کاموں کی ذمہ داری پوری طرح، گاؤں کے کوآپریٹو ادارے اور گاؤں پنچایت کو سونپی جاتے۔

نہرو کے ایما پر ہی قومی ترقیاتی کونسل نے خوراکی اجناس کی تھوک سرکاری تجارت بھی شروع کی۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے پر عملدرآمد کے وقت نہرو نے یہ شدت سے محسوس کیا کہ منصوبہ بندی کے مقاصد اس وقت تک حاصل نہیں کیے جاسکیں گے جب تک کہ سیاسی جرأت و اُلوالعزمی کے ساتھ ادارہ جاتی اصلاحات نہ نافذ کی جائیں۔ چونکہ ان اصلاحات کے نفاذ کا فیصلہ کوئی سیاسی قیمت ادا کیے بغیر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس لیے نہرو یہ قیمت ادا کرنے پر فوراً رضامند ہوگئے۔ ملک کی ترقی کے اس مرحلے پر انھیں کوآپریٹو طریق کاشت اور اصلاحات اراضی کے نفاذ کی سست رفتار پر تشویش ہوئی۔ ان دونوں سوالوں پر اعلیٰ ترین سطح پر کافی بحث مباحثہ ہوچکا تھا۔ نہرو نے اپنی فیصلہ کن رائے کوآپریٹو طریق کاشت اور زرعی اصلاحات کے حق میں دی دوسرے منصوبے میں ایسے ضروری اقدامات کرنے کو کہا گیا تھا جن سے ملک میں کوآپریٹو طریق کاشت کی بنیاد مضبوط ہوسکے اور تقریباً دس سال کے اندر زرعی اراضی کا کافی بڑا حصہ کوآپریٹو طریق کاشت کے تحت آجاتے منصوبے میں یہ تجویز بھی پیش کی گئی تھی کہ اصلاحات اراضی کے ضمن میں بھی ایک مشترکہ انداز نظر اختیار کیا جانا چاہیے تاکہ ہر ریاست میں زمینی اصلاحات کو قومی منصوبے کے ایک جزو کے طور پر قبول اور نافذ کیا جاسکے۔ مختلف ریاستوں نے ان ادارہ جاتی اصلاحات کو نہرو کے سیاسی عزم اور ان کے بلند مرتبے کے زیر اثر ہی قبول کیا۔

نہرو نے مسودات تیار کئے

ہندوستان میں منصوبہ بندی کے عمل سے نہرو کی وابستگی محض علامتی نہیں تھی۔ وہ اس عمل میں دل وجان سے شریک تھے اور مشکل پیش آنے پر ضروری ہدایات دیتے رہتے تھے۔ اس سے بھی اہم اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ پہلے تینوں پنجسالہ منصوبوں میں سے ہر ایک کے مسودے کا کافی حصہ انھوں نے خود ہی تیار کیا تھا اور انھوں نے ہی ان منصوبوں کے مسودوں کو پارلیمنٹ میں پیش کیا تھا۔ دوسرے پنجسالہ منصوبے کو بھی، جس سے مہالونوبس ماڈل کے بارے میں کافی اختلاف پیدا ہوگیا تھا، نہرو نے ہی آخری شکل دی تھی۔ انھوں نے دوسرے پنجسالہ منصوبے میں صنعت کاری کا جو ماڈل اختیار کیا تھا اس کا رُخ بھاری صنعتوں کی طرف تھا اس سے بہت سے ماہرین اقتصادیات نے جو ایک پسماندہ ملک کے "پہلے کیپٹلائز" کی حکمت عملی کے حامی تھے، کافی نکتہ چینی کی تھی۔ کوئی نہرو کی حکمت عملی سے اتفاق کرے یا نہ کرے، ایک بات صاف ہے وہ یہ کہ نہرو کو منصوبہ بندی کے عمل سے گہرا لگاؤ تھا۔ شری ترلوک سنگھ نے جواہر لال نہرو کے ساتھ اپنی رفاقت کی یاد تازہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ نہرو یوجنا بھون میں کافی زیادہ وقت گزارتے تھے جہاں وہ پیشہ ور ماہرین معاشیات اور متعلقہ سرکاری افسران کے خیالات بڑے دھیان سے سنتے تھے۔ لیکن بعض امور کے بارے میں وہ پختہ خیالات رکھتے تھے جو منصوبہ بندی کمیشن کی کاروائی میں مشعلِ راہ بنتے تھے۔ کبھی کبھی وہ وزیر اعظم کے روزمرّہ کے فرائض سے رخصت لے کر منصوبے کو آخری شکل دینے کے لیے کچھ روز یوجنا بھون میں گزارتے تھے۔ پہلے تینوں منصوبوں کے مسودوں میں نہرو نے اپنے قلم سے درستیاں کی تھیں یا کچھ حصوں کا مسودہ دوبارہ تیار کیا تھا۔

اُن دنوں پارلیمنٹ میں گرما گرم بحثیں اور تعمیری تنقیدیں ہوا کرتی تھیں۔ لیکن نہرو اپنے بنیادی عقائد پر اٹل رہتے۔ انھوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ حکومت کی طے شدہ پالیسی سماج کا ایک سوشلسٹ ڈھانچہ قائم کرنے کی ہے۔ انھوں نے مزید کہا "میں سمجھتا ہوں کہ اس سمت میں جانے کے لیے پس منظر بھی ہے پکار بھی اور ضرورت بھی، وہ جانتے تھے کہ سوشلسٹ ڈھانچہ قائم کرنے کا عمل ایک طویل المدت عمل ہے لیکن ان کا کہنا تھا کہ "انجام کار ہمیں ایک ایسا ڈھانچہ بنانا چاہیے جو صحیح تحریکوں کی حوصلہ افزائی کرے نہ کہ غلط تحریکوں کی، جو صحیح رجحانات کو بڑھاوا دے نہ کہ غلط رجحانات کو"۔

سماج کا ایک سوشلسٹ ڈھانچہ بنانے کا تصور پہلے تینوں منصوبوں کے مسودوں میں جگہ بہ جگہ موجود ہے۔ منصوبہ بندی سے اپنے سچے لگاؤ کی وجہ سے انھوں نے منصوبہ بندی کو ایک سنجیدہ مشق بنا دیا تھا۔ اپنے بلند مرتبے اور وسیع ترین عوامی تائید و حمایت کی بدولت انھوں نے ریاستوں میں بھی منصوبہ بندی کے تجربے کو کامیاب بنایا۔

نہرو کا ایک بڑا کام یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف منصوبہ بندی کے نظریے کو مقبول بنایا بلکہ ایسے ادارے بھی قائم کئے جن کے اندر مرکز اور ریاستوں کے کاروباری رشتے منضبط رہے اور انھیں رہنمائی ملتی رہی۔ انھوں نے منصوبہ بندی کمیشن اور قومی ترقیاتی کونسل جیسے ادارے قائم کئے جو ان کے تصورات کو عملی شکل دے سکتے تھے۔ یہ صرف ان کی گہری وابستگی اور ان کا سائنسی مزاج ہی نہیں تھا جس نے منصوبہ بندی کو ایک کامیاب تجربہ بنایا۔ یہاں ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ نہرو نے ہمیں ہمارے نصب العینوں کے حصول کے لیے منصوبہ بندی کے سائنٹیفک طریقے اور ضروری آلات مہیا کیے تھے۔ اگر یہ آلات کامیاب نہیں رہے ہیں تو غلطی ہماری ہے جواہر لال نہرو کی نہیں کیونکہ ان آلات کو استعمال کرنے والے تو ہم ہی ہیں۔ ●●●

کے۔ نٹور سنگھ

جواہر لال نہرو بطور ادیب

جواہر لال نہرو اُن معدودے چند سیاست دانوں میں سے تھے، جو ادیب بھی تھے۔ مثلاً لینن، چرچل، ڈی گال، ماؤزے تنگ، کینیڈی۔ نہرو کی کتابیں ساری دنیا میں پڑھی جاتی ہیں۔ ان کی خود نوشت سوانح عمری کا مطالعہ سارے نوآبادیاتی ملکوں میں تحریکِ آزادی کے مجاہدوں کے لیے لازمی ہو گیا تھا۔ کیوں کہ اس سے انہیں حوصلہ اور الہام حاصل ہوتا تھا۔ نہرو نے اپنی تحریروں کے ذریعے سیاست کو تاریخ بنا دیا۔

جان گنتھر نے اپنی مقبول کتاب "انسائیڈ ایشیا" میں نہرو کی آپ بیتی کے بارے میں لکھا ہے:

> "نہرو کی آپ بیتی لطیف ہے، پہلو دار ہے، امتیازی شان رکھتی ہے۔ حد درجہ سنواری ہوئی چیز ہے۔ اس میں تشکیک بھی ہے اور ذہنی جذبہ و جوش بھی۔ یہ گویا "ایجوکیشن آف ہنری ایڈمس" کا ہندوستانی روپ ہے جو مایۂ ناز نثر میں لکھا گیا ہے۔ مشکل سے دس بارہ آدمی ایسے ہوں گے جو نہرو کے مقابلے کی انگریزی نثر لکھ سکتے ہوں۔ یہ نہ صرف انتہائی تجسس پر مبنی آپ بیتی ہے، بلکہ سارے سماج کی کہانی ہے، زندگی کی کہانی ہے۔ ایک قوم کی ترقی کی کہانی ہے"۔

وزیرِ مملکت برائے امورِ خارجہ، ساؤتھ بلاک، نئی دہلی

جواہر لال نہرو کے بغیر ہند کی آزادی کی تحریک میں نہ تو دانش کا پہلو ہوتا اور نہ جمالیات کا۔ نہرو نہ ہوتے تو تحریکِ آزادی پر جارح مادہ پرستوں کا غلبہ ہو جاتا۔

نہرو کی تحریروں میں ایک جاں بخش تازگی ہے۔ اُس کی ساری سنجیدہ تحریریں جیل میں لکھی گئیں۔ ۱۹۴۰ء میں گورکھپور میں اپنے مقدمے کے دوران نہرو نے اپنے اعلیٰ بیان میں کہا تھا: "میں الفاظ اور فقروں کا دلدادہ ہوں اور انہیں مناسب طور پر استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں جو بھی رائے رکھتا ہوں اُسے الفاظ میں ذہانت کے ساتھ اور ایک خاص ترتیب سے ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں"۔

اور "گلمپسز آف ورلڈ ہسٹری" میں جو عالمی تاریخ کے بارے میں اندرا گاندھی کے نام خطوط پر مشتمل ہے اُنہوں نے اپنے آخری خط مورخہ ۹ اگست ۱۹۳۳ء میں لکھا ہے:

> "بنجمن ڈزرائیلی نے' جو اُنیسویں صدی میں انگلینڈ کا ایک عظیم سیاست داں تھا، لکھا ہے، جن لوگوں کو قید یا جلاوطن کیا جاتا ہے وہ اگر بچ جاتے ہیں تو اُن کی زندگی مایوسی سے بھری رہتی ہے۔ لیکن ایک ادیب قید کے زمانے کو اپنی زندگی کے شیریں ترین لمحات میں شمار کرتا ہے۔ ڈزرائیلی ہیوگو گروٹیس کے بارے میں لکھ رہا تھا جو سترھویں صدی میں ہالینڈ کا ایسا مایۂ ناز فلسفی تھا جسے عمر قید کی سزا ملی تھی۔ اس کے علاوہ بھی ایسے

متعدد ادیب ہوئے ہیں، جنہیں قید و بند کی شدتیں جھیلنا پڑی ہیں۔ ان میں سے مشہور ترین دو ادیب، اسپین کا سروانٹیس (مصنف ڈان کوئیکزاٹ) اور انگلینڈ کا جان بن ین (مصنف پلگرمس پروگریس) تھے۔"

لیکن ہم بلا کسی تامل کے خود جواہر لال نہرو کا نام بھی ان عظیم ترین قیدی ادیبوں میں شامل کر سکتے ہیں۔

نہرو نے جیل میں رہتے ہوئے اپنے آپ کو ذہنی طور پر باخبر اور باعمل رکھا۔ انہوں نے اپنے ذہن کی ورزش جاری رکھی اور اُسے زنگ نہ لگنے دیا۔ کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ دماغ بھی ایک عضلہ یا پٹھا ہے اور اگر اُسے مسلسل غذا نہیں پہنچائی گئی تو وہ پھول جاتا ہے اور سست پڑ جاتا ہے۔ نہرو نے یہ احتیاط برتی کہ ان کا ذہن ایک تیز اور حساس آلہ بنا رہے تاکہ وہ نئے خیالات کو قبول اور جذب کرنے اور نئے خیالات کی تخلیق کرنے کے قابل رہے۔ نہرو اپنے بارے میں اکثر منکسر مزاجی سے کام لیتے تھے۔ محولہ بالا خط ہی میں انہوں نے ضرورت سے زیادہ منکسر مزاجی سے کام لیتے ہوئے لکھا ہے: "میں نہ تو ادیب ہوں اور نہ یہ کہنے کو تیار ہوں کہ میں نے جیل میں جو سال گزارے ہیں، وہ میری زندگی کے شیریں ترین لمحات تھے۔ البتہ میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ پڑھنے اور لکھنے کے عمل نے جیل کی مدت کاٹنے میں میری بڑی مدد کی ہے۔ میں نہ ادیب ہوں اور نہ مورخ۔ لیکن پھر میں ہوں کیا؟" دراصل وہ ادیب بھی تھے اور مورخ بھی، بلکہ دونوں سے بڑھ چڑھ کر کچھ تھے۔

نہرو کو انگریزی ادب، عالمی تاریخ، یونانی ڈرامے اور شاعری کی وسیع اور گہری جانکاری تھی۔ اُن کی تحریریں ہر ملک اور ہر دور کے سنتوں اور فلسفیوں کے اقتباسات سے بھری پڑی ہیں — "ڈسکوری آف انڈیا" (تلاشِ ہند) کے، جسے انہوں نے احمد نگر جیل میں پانچ مہینے میں لکھ لیا تھا، سرورق کے مقابل صفحے پر شیکسپیر کا یہ اقتباس موجود ہے: "جب میں خاموش فکر کے شیریں لمحوں میں بیتی باتوں کی یاد جگاتا ہوں ...... الخ"

آپ نہرو کی کتابوں کا کوئی صفحہ کھولیے اور آپ کو اس سے لطف بھی ملے گا اور دانش بھی۔ یہ ماننا پڑے گا کہ نہرو کو لکھنے میں مزا آتا تھا۔ نہرو کی پچاسویں سال گرہ پر "ماڈرن ریویو" نے نہرو پر ایک مضمون مصنف کا نام دیے بغیر شائع کیا۔ دراصل یہ مضمون خود نہرو نے لکھا تھا اور اس میں وہ خود اپنا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شمال بعید سے لے کر راس کماری تک اس نے کسی فاتح سیزر کی طرح دورہ کیا ہے اور اپنے پیچھے اقبال و بزرگی اور دیومالائی اثرات چھوڑے ہیں۔ کیا اُسے اس لمحاتی پسندیدگی سے کوئی تفریح ملتی ہے یا اس میں سچ مچ طاقت حاصل کرنے کا کوئی عزم پایا جاتا ہے۔ جو اُسے ایک مجمع سے دوسرے مجمعے تک دوڑاتا رہتا ہے اور وہ خود سے کہتا رہتا ہے:

"میں نے عوام کے اس سمندر کو اپنی مٹھی میں بند کر لیا ہے اور اپنے عزم و ارادے کو ستاروں کے ذریعے آسمان پر لکھ دیا ہے۔"

یہ اقتباس ٹی ای لارنس کی کتاب "سیون پلرز آف وزڈم" سے لیا گیا ہے۔

نہرو کے ادبی اسلوب، ادبی سلاست اور زور جیسی اُن کے ادبی جوہر نے کبھی اُن کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اُن کے وزیر اعظم ہونے کے بعد بھی نہیں۔ اس کا ثبوت وہ نوٹ ہیں جو وہ دنیوی امور کے بارے فائلوں پر روزانہ لکھوایا کرتے تھے۔ میں نے ہزاروں ایسے نوٹ پڑھے ہوں گے لیکن ان میں کبھی کوئی فرسودہ یا پامال فقرہ نہیں پایا — کسی نوٹ میں وہ بے مزہ کر دینے والا پھیکا پن نہیں ہے، جو انتظامی اور افسرانہ کام کی خاص پہچان ہے۔

جواہر لال نہرو بہت پڑھتے تھے اور بہت لکھتے تھے۔ اُن کی منتخب تحریروں کی ۲۱ جلدیں (مرتبہ: ایس۔ گوپال) اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ اور ان میں سے ہر جلد ۵۰۰ صفحے سے زیادہ پر مشتمل ہے۔ ابھی نو جلدیں اور شائع ہوں گی۔ یہ ان کی دیگر کتابوں یعنی "گلمپسز آف ورلڈ ہسٹری"، "این آٹو بیاگرافی"، "یونٹی آف انڈیا" "ڈسکوری آف انڈیا"، "اے بنچ آف اولڈ لیٹرس" ان کے علاوہ ہیں۔ اور اگر ہم اس سرمائے میں ان کی تقریروں کو بھی جوڑ دیں تو ان کا کارنامہ معرکہ آرا ہو جاتا ہے۔ میں پڑھنے اور لکھنے کے بارے میں نہرو کے ذوق و شوق کی محض ایک مثال دینا چاہتا ہوں۔ قید و بند کے دوران انہوں نے ہر قسم کے موضوع یعنی نجوم سے لے کر مارکسزم تک پر ہزاروں کتابیں پڑھ ڈالیں۔ مئی ۱۹۲۲ء سے جنوری ۱۹۲۳ء تک وہ لکھنؤ جیل میں تھے۔ اس دوران انہوں نے ۱۲۱ کتابیں پڑھیں، جن میں گیتا، بائبل اور قرآن کے علاوہ سامنڈ کی "اٹالین رینایسان" (۶ جلدیں)، مارچی کی "اسٹوری ڈامو گرگر" (۴ جلدیں)، برنیر کا سفر نامہ، ولسنٹ

اسمتھ کی "اکبر" جادو ناتھ سرکار کی "شیواجی"، ہیول کی "ایرین رول اِن انڈیا"، بابر کی "تزک" شیلی اور کیٹس کی نظمیں، تلسی داس جی کی "رام چرت مانس"، جے۔ ایم۔ کینز کی "اکنامک کانسی کوینسز آف پیس" گراہم ویلس کی "ہیومن نیچر اِن پالیٹکس" ایچ۔ جی۔ ویلس کی "آؤٹ لائن آف ہسٹری" ایڈورڈ گبن کی "ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن ایمپائر" (۷ جلدیں)، شیکسپیر کے کئی ڈرامے، کارلائل کی "دی فرنچ ریولیوشن" وکٹر ہیوگو کی "لامزراب" ٹالسٹائی کی اینا کرانینا بھی شامل تھیں۔

نہرو جب کتاب پڑھتے تھے تو نوٹ بک بھی ساتھ رکھتے تھے، جس میں وہ اُن سارے پیراگرافوں کو نقل کر لیتے تھے، جو اُن کے دل و دماغ کو گرماتے تھے۔ اپنی قید کے دوران اُنہوں نے کئی نوٹ بکیں اور ڈائریاں بھر دی تھیں۔

ان کی ڈائریاں بھی نہایت خوبی سے لکھی گئی ہیں۔ اور ان میں ہم نہرو کے دلی احساسات اور خیالات کو دیکھ سکتے ہیں۔ ان سے ہمیں نہرو کے داخلی اور باطنی خیالات اور احساسات کی جھلک ملتی ہے۔ ان کی مزاجی کیفیت، افسردگی اور جوش کا پتہ چلتا ہے، اُن کے مزاج کی لچک اور پژمردگی کے بعد سنبھلنے اور اُبھرنے کی صلاحیت دکھائی دیتی ہے اور جہاں تک فانی انسان کی چھوٹی موٹی باتوں کا تعلق ہے، ایک ملیۂ نازبے تعلقی اور استغنیٰ کے آثار ملتے ہیں۔

نہرو عام جلسوں میں بیشتر برجستہ تقریریں کرتے تھے لیکن ضرورت پڑتی تو وہ تیاری بھی کرتے تھے۔ اور ان کی تقریر اہم موقع کی اہل بھی ثابت ہوتی۔ مثال کے طور پر میں صرف تین تقریروں کا ذکر کروں گا جو دنیا کی بہترین تقریروں میں شامل کرنے کے لائق ہیں۔ اوّل تو گورکھپور کے مقدمے میں اُنہوں نے جو بیان دیا تھا، اس سے بہتر بیان ممکن نہ تھا۔ بیان کے طور پر وہ ہر لحاظ سے مکمل تھا۔ اُنہوں نے کہا تھا: "جنابِ والا۔ میں آپ کے سامنے ایک ایسے فرد کی حیثیت سے کھڑا ہوں، جس پر ریاست کے قانون کی خلاف ورزی کرنے کا الزام ہے۔ لیکن میں ایک فرد سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہوں۔ میں ہندوستانی قوم پرستی کی علامت بھی ہوں۔ جس نے برطانوی حکومت سے علیحدہ ہو کر ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے کا عزم کر رکھا ہے۔ دراصل آپ صرف مجھے سزا دینا نہیں چاہتے بلکہ ہندوستان کے کروڑوں لوگوں کو سزا دینا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ کام کسی مغرور سلطنت کے لیے بھی ذرا مشکل ہوگا۔ آج گو کہ میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں اور مقدمہ مجھ پر چل رہا ہے۔ غالباً یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی عدالت میں خود برطانوی حکومت پر مقدمہ چل رہا ہے۔ آج دنیا میں عدالت سے کہیں زیادہ طاقت ور قوتیں کام کر رہی ہیں بنیادی قوتیں ہیں: آزادی غذا اور سلامتی حاصل کرنے کی خواہشیں اور جذبہ جن سے بے شمار انسان سرشار ہو کر تاریخ کا رُخ موڑ رہے ہیں۔ مستقبل کا مورخ غالباً یہی لکھے گا کہ اس شدید امتحانی دور میں برطانیہ کی حکومت اور عوام ناکام رہے۔ کیونکہ وہ خود کو ایک بدلتی دنیا کے مطابق نہ ڈھال سکے۔ مورخ غالباً سلطنتوں کی قسمت پر غور کرے گا، جو کہ ہمیشہ اسی کمزوری کے باعث تباہ ہوتی ہیں۔ اور لکھے گا کہ بس اُن کی قسمت میں یہی تھا۔ بعض اسباب سے ہمیشہ ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ ہمیں اسباب معلوم ہیں اور نتائج عواقب کی صورت میں پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔

اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ اس مقدمہ کے نتیجے میں مجھے کیا سزا ملتی ہے یا آگے چل کر میرا کیا ہوگا۔ افراد تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ اُن کی کوئی اہمیت نہیں۔ جب میرا وقت آئے گا تو میں بھی چلا جاؤں گا۔ مجھ پر برطانوی حکومت سات مرتبہ مقدمہ چلا چکی ہے اور میری عمر کے کئی سال جیل کی دیواروں کے پیچھے دفن ہیں۔ آٹھویں یا نویں مقدمے سے یا جیل میں چند سال اور بتانے سے میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ زبردست اہمیت تو اس کی ہے کہ ہندوستان کے کروڑوں بیٹوں اور بیٹیوں کو کیا در پیش آتا ہے۔ میرے سامنے یہی سوال ہے اور بالآخر آپ کے سامنے بھی یہی سوال ہے۔ اگر برطانوی حکومت یہ سمجھتی ہے کہ جس طرح عرصۂ دراز سے وہ ان کی قسمتوں سے کھیلتی آئی ہے، اُسی طرح اُن کا استحصال کرتی رہے گی۔ تو یہ اس کی خام خیالی ہے۔ اس نے ان کی مزاجی کیفیت سمجھنے میں غلطی کی ہے اور اس نے تاریخ کا لاحاصل مطالعہ کیا ہے۔"

اُن کی دوسری ناقابلِ فراموش تقریر وہ تھی جو اُنہوں نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ۱۲ بجے رات کو ہندوستان کی آزادی کے موقع پر دی تھی۔ "ہم نے قسمت سے ایک عہد کیا تھا" والی تقریر اور تیسری تقریر ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو مہاتما گاندھی کے قتل کے اعلان والی تقریر۔ "روشنی گُم ہو گئی ہے۔"

یہ تینوں تقریریں خطابت اور ادبی چاشنی کی اعلیٰ ترین مثالیں ہیں۔ آخری دو تقریروں کو میں نے خود سنا ہے اور میں کبھی انہیں بھلا نہیں سکتا۔ اور اُن کو پڑھنے سے تو ایک نشہ سا طاری ہو جاتا ہے اور یہ نہرو کا کمال تھا کہ اُس نے اُن تقریروں کو یادگار بنا دیا۔ ان میں سے ہر تقریر یکتا و بے مثال ہے۔ ہر ایک نے ملک کی روح کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ ہر ایک ہم کو فکر و تفکر، مشاہدۂ باطن بلکہ دعا و مناجات

کے اعلیٰ درجات تک پہنچا دیتی ہے۔ جواہر لال نہرو ایک زبردست انشا پرداز بھی تھے۔ اُن کے مضامین مختلف قسم کے موضوعات پر ہیں، لیکن ان سب میں فارم کا کمال مشترک ہے۔

"یونٹی آف انڈیا" میں کشمیر کے حُسن کو بیان کرتے ہوئے اُنہوں نے لکھا ہے:

"کشمیر ایک انتہائی حسین عورت کی طرح حسین ہے۔ ایسے حُسن کا مالک ہے جس کا کمال اُسے غیر شخصی بنا دیتا ہے۔ اُسے خواہشوں سے بالاتر کر دیتا ہے۔ اس نسائی حُسن کی جھلک اُس کے دریاؤں، جھیلوں اور وادیوں اور حسین درختوں میں ملتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ کشمیر کے جادوئی حُسن کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ یہ ہے اُس کا مردانہ جمال، جو اس کی سخت چٹانوں اور گھاٹیوں، اُس کے برف پوش پہاڑوں اور گلیشیر اور اُن بے رحم اور غضب ناک ندیوں میں پایا جاتا ہے۔ جو بے تحاشا گہری وادیوں میں سر کے بل گرنے کے لیے بے تاب رہتی ہیں تو کشمیر کے سیکڑوں روپ اور بے شمار رُخ ہیں جو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی مسکراتے ہوئے تو کبھی افسردہ و رنجیدہ۔ ڈل جھیل سے کُہرا اُٹھتا ہے اور ایک جالی دار دوپٹے کی طرح جو کچھ چھپاتا ہے، اُس کی جھلک بھی دکھاتا رہتا ہے۔ بادل کسی پہاڑ کی چوٹی کو آغوش میں لینے کے لیے اپنی بانہیں پھیلاتے ہیں — یا کسی بچے کی طرح چوری سے، دبے پاؤں آ کر اچانک گھیر لیتے ہیں۔ میں اس ہمیشہ بدلتے تماشے کو دیکھتا رہتا اور کبھی کبھی تو اس کے بے پناہ حُسن کا مجھ پر اتنا اثر ہوتا کہ میرا دل ڈوبنے لگتا۔ مجھے لگتا کہ جیسے یہ سب کچھ خواب ہے۔ غیر حقیقی ہے، اُن اُمیدوں اور حسرتوں کی طرح غیر حقیقی ہے جو ہمیں ہمیشہ گھیرے رہتی ہیں اور شاذ و نادر ہی پوری ہوتی ہیں۔ یہ حُسن محبوب کے اُس جلوے کی مانند تھا جو خواب میں دکھائی دیتا ہو اور آنکھ کھلنے پر معدوم ہو جاتا ہو۔"

نہرو نے نہایت اعلیٰ خطوط بھی لکھے ہیں۔ مارچ ۱۹۳۹ء میں سبھاش چندر بوس نے نہرو کو ایک غصّے بھرا، دشنام آمیز اور تہمت آمیز خط لکھا۔ نہرو نے اس کا ایسی شرافت سے جواب دیا کہ بوس کو نہایت مہذب انداز سے مسکت کر دیا۔ اس طرح اُنہوں نے بوس جیسے مضبوط حریف کو سیاسی اکھاڑے میں بالکل پچھاڑ کر رکھ دیا۔ نہرو نے بوس کے جواب میں لکھا:

"میں آپ کے اس خط کا کس طرح جواب دوں جو ۲۷ ٹائپ شدہ صفحوں پر مشتمل ہے ..... آپ کا خط بنیادی طور پر میرے رویے پر فردِ جرم عاید کرتا ہے اور میری کمزوریوں کی چھان بین کرتا ہے' جہاں تک کمزوریوں کا تعلق ہے کم از کم بیشتر کمزوریوں کے بارے میں' میں کچھ کہنے کی بجائے میں اُن کا اعتراف کرتا ہوں اور نادم ہوں کہ بدقسمتی سے وہ کمزوریاں مجھ میں موجود ہیں۔ لیکن میری ذات کون سا دلچسپ موضوع ہے۔ خاص طور پر ایک ضرورت سے زیادہ لمبے خط کے آخر میں اس بے رس اور پھُس موضوع کو اٹھانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ لہٰذا میں صرف یہ مان کر خاموش ہو جاؤں گا کہ میں ایک غیر تسلّی بخش انسان ہوں۔ جو نہ خود سے خوش ہے اور نہ دنیا سے اور یہ حقیر دنیا بھی جس میں میں رہتا ہوں مجھے کوئی خاص پسند نہیں کرتی۔"

دوسرا خط برنارڈ شا کے نام ہے۔ یہ ستمبر ۱۹۴۸ء میں لکھا گیا تھا جب کہ شا ۹۲ برس کے ہو چکے تھے۔ اور جواہر لال نہرو ہندوستان کے وزیرِ اعظم تھے۔

تو ہندوستان کے وزیر نہرو نے لکھا:

"۴۰ برس قبل جب میں ۱۸ سال کا تھا اور کیمبرج میں بی اے کا طالب علم تھا تو میں نے وہاں کے ایک جلسہ میں آپ کی تقریر سنی تھی۔ اس دوران نہ میں نے آپ کی دوبارہ زیارت کی ہے اور نہ آپ کو کوئی خط لکھا ہے۔ لیکن بہر حال اپنی نسل کے بہتیرے نوجوانوں کی طرح میں آپ کی کتابوں اور تحریروں کی معیت میں پڑھا اور پھلا پھولا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج جو کچھ بھی میری شخصیت ہے، اُس کے ایک حصّے کی تشکیل و تکمیل میں آپ کی تحریروں نے مدد دی ہے۔ کہہ نہیں سکتا کہ اس سے آپ کی ساکھ بڑھی ہے یا گھٹی ہے۔ بہر حال اگلے اکتوبر میں ممکن ہے کہ میں دو تین ہفتوں کے لیے انگلینڈ آؤں اور مجھے آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوگی بشرطیکہ یہ ملاقات آپ کے

روزمرہ کے معمول میں مخل نہ ہو۔ میں یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ آپ سے کوئی سوال پوچھ کر آپ کو پریشان نہیں کروں گا۔ یوں تو لوگوں کے دماغ بے شمار ایسے سوالات سے بھرے پڑے ہیں، جن کا کوئی تشفی بخش جواب دکھائی نہیں دیتا۔ اور اگر جواب مل بھی جاتا ہے تو کسی نہ کسی وجہ سے اس پر عمل درآمد نہیں ہو سکتا۔ خاص طور پر اُن لوگوں کی خامیوں کے باعث، جن کا کام اُن پر عمل درآمد کرانا ہے۔ میں تو آپ سے محض اس لیے ملنا چاہتا ہوں تاکہ ایک ایسی یاد اپنے ساتھ لے جاؤں جو میری زندگی کو زیادہ بیش قیمت بنا دے۔"

نہرو میں اتنا بڑکپن تھا کہ اُنہوں نے یہ پرستارانہ انداز کا خط ۵۹ برس کی عمر میں ایک دیو قامت ادبی شخصیت کو لکھا۔ دوسرے سال شا اور نہرو کی ملاقات ہوئی اور اس کے چند مہینوں بعد ۱۹۵۰ء میں شا کا انتقال ہو گیا۔

مجھے بارہا پنڈت نہرو کی قربت حاصل ہوئی ہے۔ ان میں ایک جادوئی کیفیت تھی اور کم از کم میں تو مسحور سا ہو جاتا تھا۔ اب مجھے پچھتاوا ہوتا ہے کہ میں نے اُن کو ادب اور تاریخ کے بارے میں باتیں کرنے پر کیوں نہیں اُکسایا۔ دراصل وہ لافانی اور لازوال لگتے تھے۔ دل کہتا تھا جلدی کیا ہے۔ ابھی تو اور بھی قریبی ملاقاتیں ہوں گی، لیکن ایسا ہوا نہیں۔

جہاں تک خالص ادبی ملاقاتوں کا تعلق ہے وہ صرف دو بار ہوئیں۔ میں نے کہیں اور ان کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ یہاں یہاں صرف مختصراً ذکر کروں گا۔

مارچ ۱۹۶۱ء میں آر۔ کے نرائن اپنے ناول "دی گائڈ" پر ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ لینے کے لیے دہلی آئے۔ میں اُنہیں پنڈت نہرو سے ملانے کے لیے تین مورتی ہاؤس لے گیا۔ آر۔ کے۔ نرائن پہلی بار دہلی آئے تھے اور نہرو اس بات سے خاصا لطف لے رہے تھے۔ ملاقات خوش گوار رہی، لیکن اس میں کوئی خاص معرکہ آرائیاں نہیں ہوئی۔ نرائن نے وزیر اعظم کو اپنا تازہ ترین ناول "اے ٹائیگر فرام مال گوڈی" پیش کیا۔ نہرو نے کہا کہ بدقسمتی سے اُنہوں نے نرائن کی کوئی کتاب نہیں پڑھی ہے۔ لیکن میری بیٹی نے آپ کی کتابیں پڑھی ہیں۔ اس کے بعد یہیں بیٹی کے حوالے کر دیا گیا۔ چند مہینوں بعد پنڈت نہرو سے وزارتِ خارجہ میں ملاقات ہوئی۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر اُنہیں نمستے کیا۔ لیکن میری ہتھیلیوں میں ایک کتاب بھی دبی ہوئی تھی۔ نہرو نے دیکھا کہ وہ کتاب آر موری دارین کوٹس کی "دی سول آف چائنا" ہے۔ کہنے لگے میں نے اس کی کتاب "دی سول آف انڈیا" پڑھی ہے۔" میں نے کہا "جی، میں نے بھی پڑھی ہے۔" بولے "میری رائے میں ذرا اسپنگلر سے متاثر ہے۔ ہے نا۔" میں گھبراہٹ میں صرف مسکرا کر رہ گیا

کیوں کہ میں نے اسپنگلر کو کہاں پڑھا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھ گئے۔ لیکن سیڑھیاں اُترتے وقت اُنہوں نے پھر مُڑ کر دیکھا اور نہایت دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ کہا: "نہرو شہنشاہ۔ ہنہہ!" اس میں لطیفہ یہ تھا کہ "سول آف انڈیا" میں ایک باب کی سرخی یہی ہے: "نہرو شہنشاہ"

نہرو کی وصیت بھی ایک ادبی جواہر ریزہ ہے۔ عام طور پر وصیتیں نہایت خشک اور بے مزہ ہوتی ہیں۔ جن میں قانونی اصطلاحوں کی بھرمار ہوتی ہے، لیکن نہرو کی وصیت تو نظم اور نثر اور لطیف جذبات کے دھاگوں میں پروئی ہوئی ایک مالا ہے۔ کہتے ہیں:

> "جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میری اس خواہش کا کہ میری مٹھی بھر خاک الہ آباد میں گنگا میں بہا دی جائے کوئی مذہبی اہمیت نہیں۔ میں اس سلسلے میں کوئی مذہبی جذبہ نہیں رکھتا۔ میں بچپن ہی سے الہ آباد میں گنگا اور جمنا دریاؤں سے ایک دلی تعلق رکھتا ہوں اور یہ تعلق عمر کے ساتھ بڑھتا گیا ہے۔ میں نے بدلتے موسموں اور رُتوں کے ساتھ ساتھ ان ندیوں کے مزاج کو بھی بدلتے دیکھا ہے۔ اور اکثر سوچا ہے کہ سالہا سال سے ان دریاؤں کے ساتھ کتنی تاریخ، دیو مالا، روایت، گانے اور کہانیاں وابستہ رہی ہیں اور اُن کے بہتے پانیوں کا ایک حصہ بن چکی ہیں۔
>
> گنگا خاص طور پر عوام کا محبوب دریائے ہند ہے۔ ہندوستان کی نسلی یادیں، اس کی اُمید اور خوف، اس کی جیت کے گیت، اس کی فتوحات اور اس کی شکستیں گنگا کے پانی میں گھُل مِل چکی ہیں۔ گنگا ہندوستان کی قدیم تہذیب اور تمدّن کی علامت ہے۔ ہمیشہ بدلنے والی، ہمیشہ بہنے والی، لیکن ہمیشہ پرانی گنگا۔ چنانچہ ہندوستان کے کلچرل ورثے کو آخری خراجِ تحسین کے طور پر میں چاہوں گا کہ میری مُٹھی بھر خاک الہ آباد کے مقام پر گنگا میں بہا دی جائے۔ تاکہ گنگا اُسے اس عظیم سمندر تک پہنچا دے جو ہندوستان کے ساحل کو دھوتا رہتا ہے۔"

وہ شخص جس نے رابرٹ فراسٹ کی نظم کے حسب ذیل اشعار اپنی میز پر سجا رکھے تھے، ادیب کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے:

جنگل دل کش ہے، گھنا ہے، تیک ہے
لیکن مجھے تو کچھ وعدے نبھانے ہیں
اور آرام کرنے کا پہلے میلوں جانا ہے، میلوں جانا ہے۔

(ترجمہ: مہدی عباس حسینی)

اے۔ رنگاناتھن

فطرت کا پجاری: نہرو

اگر ہندوستانی قومی تحریک کے دور کے خصوصی حالات نے نہرو کو سیاست کے بھنور میں نہ کھینچ لیا ہوتا تو وہ رومن شاعر ہورس کی طرح اپنے دیسی ماحول میں زندگی بسر کرتے۔ کتابوں کا مزہ لیتے، پہاڑوں پر چڑھتے، گلیشیر کا مشاہدہ کرتے اور اپنے چند چیدہ دوستوں کی معیت میں کشمیر کے ماورائی حسن کا لطف لیتے گو کہ نہرو نے اپنی تاریخی اور سیاسی تحریروں میں اپنے علم اور سائنسی طریقۂ استدلال کا مظاہرہ کیا ہے، لیکن اُن کے مشاہدے کی باریکی اور لطافت کا پتہ تو اُن تحریروں سے چلتا ہے جو فنون، فطرت اور کلچر کے بارے میں ہیں۔

نہرو جب بھی ہندوستان کا تصور کرتے تھے تو کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی نگاہوں کے سامنے یہاں کے پہاڑ اور دریا ہوتے تھے۔ دراصل نہرو کو نہ صرف فطرت سے لگاؤ تھا بلکہ' بلیک کے الفاظ میں' اُن کا عقیدہ تھا کہ دل جس کو چاہتا ہے وہ مقدس ہو جاتا ہے۔

کشمیر کے خواب آگیں حسن نے نہرو میں ہمیشہ تخلیقی بصیرت بیدار کی اور ان کو بہترین نثر لکھنے کی تشویق دی۔ دراصل جب وہ کشمیر کے بارے میں لکھتے ہیں تو نثر کی جگہ نظم کی سرحدوں کو چھو لیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

"کشمیر ایک انتہائی حسین عورت کی طرح حسین ہے جس کے حسن کا کمال اُسے غیر شخصی بنا دیتا ہے اور انسانی خواہشات سے بالاتر کر دیتا ہے۔ یہ ہے اُس کے نسائی حسن کی جھلک جو اس کے دریاؤں، جھیلوں، وادیوں اور حسین درختوں میں ملتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اُس کے جادوئی حسن کا ایک اور پہلو بھی ہے اور یہ ہے اُس کا مردانہ جمال جو اُس کی سخت چٹانوں اور گھاٹیوں، برف پوش پہاڑیوں اور گلیشیر اور اُن بے رحم اور خوفناک ندیوں میں پایا جاتا ہے جو نشیبی وادیوں میں اپنا سر پٹکنے کے لیے بے تاب رہتی ہیں۔ تو کشمیر کے سیکڑوں روپ اور بے شمار رُخ ہیں۔ جو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی مسکراتے ہوئے تو کبھی افسردہ و رنجیدہ۔

ڈل جھیل سے کہرا اُٹھتا ہے اور ایک جالی کے دوپٹے کی طرح جو کچھ چھپاتا ہے اُس کی جھلک بھی دیتا جاتا ہے۔ بادل کبھی کسی پہاڑ کی چوٹی کو آغوش میں لینے کے لیے اپنے بازو پھیلاتے ہیں تو کبھی کسی بچے کی طرح کھیل کھیل میں چوری سے دبے پاؤں آ کر اچانک گھیر لیتے ہیں۔ میں اس ہمیشہ بدلتے تماشے کو دیکھتا اور کبھی کبھی اس کے حسن کے جادو سے اتنا مسحور ہو جاتا کہ بے ہوش سا ہونے لگتا۔ یہ حسن مجھے ایک خواب جیسا اور غیر حقیقی لگتا۔ اُن خواہشوں اور اُمنگوں کی طرح جو ہمیں ہمیشہ گھیرے رہتی ہیں اور شاذونادر پوری ہوتی ہیں۔ یہ حسن ایسا تھا جیسے کوئی خواب میں محبوب کا جلوہ دیکھے جو جاگنے پر غائب ہو جائے۔"

یہ پیراگراف ہمیں جہانگیر کی تزک کی بھی یاد دلاتا ہے۔ جہانگیر نے لکھا تھا: "کشمیر کے خوش نُما مرغزاروں اور مسحور کُن آبشاروں کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں بے شمار بہتے چشمے اور فوارے ہیں۔ حدِ نظر تک صرف آبِ رواں اور سبزہ زار دکھائی دیتا ہے۔ گلاب، بنفشہ اور نرگس خود رَو اُگتے ہیں۔ کھیتوں میں نہ صرف پھول بلکہ بے شمار خوشبودار جڑی بوٹیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ در و دیوار، صحن و سقف سبھی پر گلِ لالہ نے گویا کسی دعوت کے اہتمام میں شمعیں جلا رکھی ہیں۔ ان چیزوں کا یا دسیع

لک سیلے ہال اسٹیٹ ۵۲/۸۔ پونم ایلی ہائی روڈ، کلپوک، مدراس-۱۰۔

جرا کاموں گا یا خوشبودار جھالروں کا کہاں تک ذکر کیا جائے۔"

شیکسپیر کے ایک ڈرامے (ایز یو لائک اٹ) کی کردار روزا لینڈ نے "پتھروں میں وعظ" اور "بہتے چشموں میں کتاب" دریافت کی تھی۔ اسی طرح نہرو صنوبر کے درختوں کے نیچے بیٹھے آوارہ ہواؤں کی آواز سُن سکتے تھے۔ "یونٹی آف انڈیا" کے ایک باب میں جس کی سرخی "فرار" ہے اُنھوں نے نفیس پیرائے میں لکھا ہے :

"کبھی کبھی میں صنوبر کے سائے میں لیٹا ہوا آوارہ ہواؤں کی سرگوشیاں سنتا۔ وہ میرے کان میں عجیب و غریب باتیں کہتیں، میرے حواس کو سکون بخشتیں اور میرے دماغ کی حرارت کو ٹھنڈا کرتیں۔ اگر ہوا مجھے بے بس اور بے دفاع پاتی تو مجھ پر حملہ آور ہو جاتی۔ وہ مکاری سے نیچے کی دنیا میں آدمیوں کی حماقت کی طرف اشارہ کرتی، اُن کے لامتناہی جھگڑے، اُن کے جذباتی ہیجان، اُن کی نفرتوں، مذہب کے نام پر کذب، سیاست کی بدعنوانیوں اور آدرشوں کی تذلیل کا ذکر کرتی اور کہتی کہ ایسے لوگوں میں واپس جانے اور اُن کے ساتھ معاملات میں اپنی عمر گنوانے کا کیا فائدہ۔ کیوں نہ یہیں رہ جاؤ جہاں امن ہے، سکون ہے، خیر و عافیت ہے۔"

نہرو نے ادب کو جو کچھ دیا وہ اُن کی سیاست سے الگ کوئی چیز نہیں بلکہ ایک بھرپور آدمی کی بھرپور شخصیت اور نقطۂ نظر کا اظہار ہے۔ اُن کا اسلوب اُن کی ذات ہی کا پرتو ہے اور وہ جو مہذب اور حساس نثر لکھتے ہیں، اُس سے اُن کی شخصیت جھلکتی ہے۔ ایک جگہ کیلاش اور مان سرور کا ان پر یہ جمالیاتی ردِ عمل ہوتا ہے :-

"میں اس دن کے سپنے دیکھتا ہوں جب کہ میں ہمالیہ میں گھومتا گھومتا اُسے پار کر جاؤں گا اور اپنے من کی پیاری جھیل اور پہاڑ تک جا پہنچوں گا۔ لیکن فی الحال زندگی کی گھڑیاں بیتتی جا رہی ہیں۔ جوانی ادھیڑ پن میں داخل ہوتی جا رہی ہے اور اس کے بعد اور بھی بُری نوبت آئے گی۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اسی طرح میں اتنا بوڑھا ہو جاؤں گا کہ کیلاش اور مان سرور تک پہنچ نہ سکوں گا۔ بہرحال سفر کا صلہ تو ملتا ہی ہے چاہے کوئی منزل پر پہنچ پائے یا نہ پہنچ پائے۔"

کیلاش اور مان سرور پر نہرو کی تحریر کو پڑھ کر اُن کی آپ بیتی میں بادلوں کی حساس منظر کشی یاد آتی ہے۔ اس میں ہلکی سی حسرت کا جذبہ بھی موجود ہے جو کالی داس کے مشہور ڈرامے "میگھ دُوت" کی بھی یاد دلاتی ہے۔ نہرو المورڑہ کی جیل میں افسردہ دلی کے ساتھ نیلے آسمان کی پہنائیوں کو دیکھتے تھے، جن میں کہیں کہیں بادل کے ٹکڑے تیرتے نظر آتے تھے۔ یہ منظر میگھ دوت کے یکش کی یاد دلاتا ہے جو جلا وطنی کے عالم میں رام گری کی پہاڑی پر تنہائی میں کسی بادل سے ہم کلام ہونے کا منتظر ہے۔ نہرو لکھتے ہیں :-

"یہ بادل عجیب عجیب شکلیں اختیار کر لیتے تھے۔ میں اُنہیں دیکھنے سے کبھی تھکتا نہیں تھا۔ میرے تصور میں وہ قسم قسم کے جانوروں کی شکلیں بنا لیتے تھے۔ کبھی کبھی سارے بادل مل جل کر ایک بڑے سمندر کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ کبھی کبھی وہ ساحلِ سمندر لگتے تھے اور جب آس پاس کے دیودار کے درختوں سے ہوا سرسراتی تھی تو محسوس ہوتا کہ کہیں دُور ساحلِ سمندر پر جوار آ رہا ہے۔ کبھی کبھی جب ایک بادل پہاڑی سے ہماری طرف بڑھتا تھا تو معلوم ہوتا کہ وہ کوئی جامد اور گٹھی ہوئی چیز ہے، لیکن پھر وہ کہرے میں تحلیل ہو جاتا اور ہم کو چاروں طرف سے گھیر لیتا۔"

نہرو کی فطرت نگاری سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی مینار پر بیٹھ کر یا ریگستان کے کونے میں سب سے الگ تھلگ ہو کر نہیں لکھتے وہ تو روزمرہ کی زندگی پر لکھتے ہیں۔ چاہے وہ بمبئی کے مانسون کا دل کش بیان پیش کریں یا دریائے سندھ کا ناقابلِ فراموش ذکر کریں، اُن کی ہر تحریر انسانی تجربے کے پتھر سے تراشی جاتی ہے۔ بمبئی میں مانسون کی آمد کا ایک شوخ اور بذلہ سنج بیان ملاحظہ ہو :

"میں آسمانوں کا چوکیدار بن گیا، تاکہ حملہ آوروں کے ہراول دستے کو دیکھ سکوں۔ کچھ چھینٹے پڑے۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ لوگوں نے کہا ابھی مانسون کہاں آیا۔ زیادہ تیز بارش ہوئی۔ لیکن میں اُسے نظر انداز کر کے کسی غیر معمولی شئے کا منتظر رہا، لیکن میں انتظار ہی کرتا رہا کہ لوگوں نے کہا اب مانسون آچکا ہے اور اُس نے اپنے قدم جما لیے ہیں۔ لیکن دھوم دھڑکا کہاں ہے، میں نے سوچا ——— زمین پر بادل کے حملے اور جنگ کا شور اور سمندر کے جوش و خروش کا مزا کہاں ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے مانسون چوروں کی طرح رات کو بمبئی میں گھس آیا۔ ایسا مانسون تو الہ آباد اور دوسرے شہروں میں بھی آتا رہتا ہے۔"

باربراٹچ مین نے تاریخ لکھنے والوں کے بارے میں لکھا ہے۔

"واقعات ہوتے رہتے ہیں، لیکن اُن کو تاریخ میں بدلنے کے لیے اُن کی تفہیم اور ترسیل ضروری ہے۔ لہٰذا تاریخ کو لکھنے والوں کی ضرورت رہتی ہے، ہو سکے تو اچھے لکھنے والوں کی۔ مثلاً ٹریولیان، جس نے ایک سپاہی کے خط میں "کوسی پوئیٹکا" (شعری مقصد) دریافت کیا اور اس کا صحیح استعمال کیا۔" نہرو نے ہیرو اسکول میں ٹریولیان کی کتاب گیری بالڈی کے بارے میں پڑھی تھی اور اس سے تشویق بھی حاصل کی تھی لہٰذا اُنھوں نے لدّاخ کے لاموں میں یہ شعری مقصد ڈھونڈ نکالا۔ (بقیہ صفحہ پر)

بدرالدین طیب جی

پنڈت جی اور مولانا

آزادی سے پہلے جب قومی تحریک اپنے عروج پر تھی، اُس وقت جو درخشاں شخصیات مہاتما گاندھی کے ارد گرد تھیں، ان میں چاند سورج کی طرح روشن دو غیر معمولی صاحبِ علم و فضل ہستیاں پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کی تھیں۔ دونوں کی پیدائش آگے پیچھے کے سالوں میں ماہ نومبر میں ہوئی تھی۔ اس اتفاق کے اثرات کا پہلو یہ پہلو جائزہ لینے کے لیے کسی کو بھی ماہرِ نجوم یا اختر شناس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ دونوں ہی نے ہندوستان کی سیاسی اور سماجی آزادی کی قومی جدوجہد میں اپنے اپنے طور پر نہایت اہم کارنامے انجام دیے۔

پنڈت نہرو کا قومی مرتبہ اور رہبر لیڈر ان کا قد و قامت مستحکم تھا۔ انہوں نے مذہب، ذات پات اور مسلک کی قید سے آزاد ہو کر نئی نسل میں جوش و ولولے کو غیر معمولی حد تک ابھارا۔ قومی معاشیات کی تشکیلِ نو کے لیے جن اصلاحوں کی ضرورت تھی۔ پنڈت نہرو انہیں جاگیردارانہ انداز میں نہیں بلکہ سائنسی اصولوں پر چاہتے تھے۔ وہ جدوجہدِ آزادی میں مہاتما گاندھی اور کانگریس میں اپنے بیش رول سے متاثر تھے۔ وہ سوسائٹی میں سیاسی، اقتصادی اور سماجی طور پر ہندوستان کے ہر فرد کو قومی یک جہتی کے مدار کے ارد گرد ہی دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے یہ نقطۂ نظر تقریباً سارے ملک میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے۔

پنڈت نہرو کا مہاتما گاندھی سے خصوصی تعلق تھا اور گاندھی جی نے پنڈت نہرو کے قومی مرتبے کے پیشِ نظر ہی انہیں نوآبادیاتی اور جاگیردارانہ نظام کے شکنجے سے آزاد ہونے والے نئے ہندوستان کے مسیحا کے طور پر اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ اگرچہ دونوں کے مابین سیاسی اور سماجی سے زیادہ اقتصادی مسائل پر بہت سے اختلافات تھے، مگر جنہوں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی کتنی قدر کرتے تھے۔ انہی روشن شخصیتوں کے سحر سے برسوں پرانی ہندوستان کی غیر ملکی حکومت کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کے کام میں دونوں ایک دوسرے کے مددگار تھے اور 'رنگا رنگی میں یک رنگی' کی تلاش میں رہنمائی کرتے تھے۔ جو اس برِصغیر میں ہزاروں برس سے تہذیبی اور ثقافتی سطح پر موجود چلی آ رہی تھی۔

گاندھی جی کا پنڈت نہرو پر ہمیشہ اعتماد رہا۔ اگرچہ پنڈت جی نے بھی ہندوستان کے تعلق سے گاندھی جی کی خواہشوں یا سیاسی مشوروں کو بہت کم رد کیا۔ سوائے آزادی کے اس مرحلہ کے جب گاندھی جی نے کانگریس پر اپنا دباؤ بڑھا دیا تھا۔ مگر پھر بھی پنڈت نہرو اور سردار پٹیل نے ہندوستان کی تقسیم منظور کر لی تھی، جو گاندھی جی کے نزدیک ایک لعنت تھی۔ تقسیم سے جو نتائج سامنے آئے ان کے پیشِ نظر پنڈت جی نے قومی زبان کے مسئلے پر گاندھی جی کا ہی فارمولہ مانا۔ 'رنگا رنگی میں یک رنگی' کے اصول کی ترقی میں آج بھی قومی زبان کا معاملہ ایک نازک مسئلہ ہے، جس کے لیے دونوں نے جدوجہد کی تھی۔

مہاتما گاندھی سے مولانا آزاد کا تعلق سب سے زیادہ اُن کے دو بنیادی نکات پر انحصار کرتا تھا، جس سے اُن دونوں کو بہت دلچسپی تھی۔ ایک تو یہ کہ ہندوستان متحد رہے اور وہ سب لوگ بھی جو اس برِصغیر میں رہتے ہیں، کیوں کہ ہندو اور مسلمانوں میں مفاہمت اور اتحاد بنائے رکھنا بھی وقت کی ضرورت تھی۔ دوسرا نکتہ تھا مغربیت کا اثر یا یوں کہیے کہ ہندوستانی تہذیب (ہندوؤں اور مسلمانوں کے روحانی، مذہبی اور مثالی تصورات کا مرکب) پر جدیدیت کا غلبہ جس کے سلسلے میں یہ دیکھنا تھا کہ روایتی ہندوستانی سماج اور اس کے ضابطوں میں نہ صرف مادی نقطۂ نظر سے بلکہ روحانی اور اخلاقی نشاۃ ثانیہ کے لیے بھی اسے کس طرح برتا جائے کہ

۲۳/۱ - شانتی نکیتن، نئی دہلی ۲۱

اس کے صرف افادی پہلو یہاں کی تہذیب میں ضم ہو جائیں۔

ان دونوں معاملات میں اس بات پر زور دینا اہم ہے کہ مولانا نے گاندھی جی کے زیرِ اثر آنے سے بہت پہلے ہی یہ نتائج اخذ کر لیے تھے۔ ان دونوں میں کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے متاثر ہوئے ہیں۔ ان نتائج تک دونوں آزادانہ اور انفرادی طور پر ہی پہنچے تھے۔ ہندو مسلم تقسیم کی تہوں سے ہی دو روشن ضمیر سامنے آئے تھے جن کا مقصد مشترک تھا۔ دونوں میں اختلاف صرف طریقۂ کار کا تھا کہ اپنے اپنے پیروؤں کو کس طرح متحد کیا جائے تاکہ دونوں طبقے ایک ہو کر مشترکہ جدّوجہد کی اساس پر ان کے متحدہ ہندوستان کے خواب کو ساکار کر سکیں۔

مولانا پیروں اور عالموں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے ذہن میں یہ خیال جڑ پکڑ گیا تھا کہ وہ خدائی مشن پر اس دنیا میں آئے ہیں۔ اس احساس اور اپنی پرورش و پرداخت کے حالات سے پیدا ہونے والی کمیوں کی وجہ سے مولانا کے مزاج میں ناپاسداری اور بے صبری در آئی تھی۔ وہ عوامی نقطۂ نظر کو قبول کرنا اپنے لیے کسرِ شان سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنے ارادت مندوں کا ایک حلقہ بنا لیا تھا۔ اس طرح ان کی حیثیت اس پیمبر کی سی ہو گئی تھی، جس پر کوئی ایمان نہیں لاتا۔ ان کے اپنے فرقے میں بھی کم ہی لوگ ان کی بات توجہ سے سنتے تھے اور ان کی باتوں پر عمل ان سے بھی کم لوگ کرتے تھے۔ ہندو مسلمانوں کے قومی اتحاد کے لیے انہیں ہندوستانی سیاست کی بساط کا بہت اہم مہرہ سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ بیشتر لوگ ان کے خیالات سے متفق نہیں تھے۔ اور اس بات سے مولانا خود بھی واقف تھے۔ مولانا کی کوشش کسی طرف سے بھی شہ مات کے لیے نہیں تھی بلکہ وہ قومی سطح پر گفت و شنید کی راہیں کھولنا چاہتے تھے۔ دونوں فرقوں میں مشترکہ طور پر اغراض و عمل کا ارتباط اور اس میں استحکام پیدا کرنے چاہتے تھے۔ وہ کسی ایک فرقہ کا فائدہ نہیں چاہتے تھے بلکہ ہندوستان کے تاریخی حقائق کو مضبوط کر کے تمام ہندوستانیوں کی بہتری چاہتے تھے۔ وہ سچے معنوں میں محبِ وطن ہندوستانی تھے اور دونوں فرقوں میں سے کسی کے بھی طرف دار نہیں تھے جب کہ ان فرقوں کے زیادہ تر رہنما تب اپنے لیے ایک باوقار جگہ حاصل کرنے کی کوشش میں لگے تھے۔ وہ لوگ اس حقیقت سے غافل تھے کہ قوم میں باوقار رُتبہ اُسی وقت حاصل کیا جا سکتا ہے جب سب متحد ہو کر جدّوجہد کریں۔ اس لیے قومی پارٹی میں مولانا آزاد کا قامت بلند ہوتا گیا جس کے وہ نام کے ہی لیڈر تھے۔ اور اپنے فرقے میں جہاں ان کی پوزیشن ثانوی نہیں تھی، وہاں وہ بتدریج خراب ہوتی گئی۔ مولانا آزاد اور پنڈت جی کے تعلقات اور روابط کو سمجھنے کے لیے اس زمانے کے حالات کو ذہن میں تازہ کرنا ضروری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گاندھی جی نے دونوں میں ایک حقیقی تعلق بنا دیا تھا۔ گاندھی جی کے بغیر دونوں کے اثرات ایک دوسرے پر بنیادی طور پر اُلٹے پڑ سکتے تھے جیسا کہ ۱۹۴۸ء میں مہاتما گاندھی کی شہادت کے موقع پر ہوا تھا۔ گاندھی جی کے بعد پنڈت جی پر مولانا کا اثر واضح طور پر کم ہوتا رہا۔ جب کہ ماضی میں ایسا نہیں ہوا تھا، کیوں کہ تب گاندھی جی مولانا کے خیالات کی تائید و توثیق کیا کرتے تھے۔ غلط نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان کے روحانی اور اخلاقی تصورات کے ضمن میں پنڈت جی کی نسبت مولانا، گاندھی جی کے زیادہ قریب تھے۔ پنڈت جی کا دماغ (باوجودکہ دل کھینچتا تھا) ہندوستانی زندگی کے روایتی ضابطوں اور ان کے مذہب اور اخلاق پر پڑنے والے اثرات سے بدل گیا تھا جن کا جُھکاؤ انسانی قدروں سے زیادہ عقیدے اور توہم پرستی کی طرف تھا۔

گاندھی جی اور مولانا اپنے مختلف طریقوں (خاص طور سے مولانا) انسانی روح کے ارتقا میں سائنسی اقدار کو جگہ دینے کے سلسلے میں اپنی توجیہات کرتے تھے اور ان کی منا جو وجدان اور الہام پر انحصار کرتی تھی۔ اس کے لیے خدا کی مرضی کو انسانوں پر لاگو کرنے کا وسیلہ مذہب ہی ہو سکتا تھا۔ پنڈت جی کا جُھکاؤ انسانی ارتقا کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ مارکسی نظریۂ فکر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کیوں کہ آدمی کے مادی حالات اس کی شخصیت اور افعال پر انحصار کرتے ہیں۔ پنڈت جی ہندو مسلم مسئلے کو اس روشنی میں دیکھتے تھے جبکہ مولانا اور مہاتما گاندھی کے لیے اس کا تعلق مذہبی پہلو سے تھا۔ اور وہ فاصلوں کو مذہبی حقائق سے اس طرح پاٹنا چاہتے تھے کہ ان میں دوبارہ پھوٹ نہ پڑے ــــ دونوں فرقوں کے آپسی رشتوں اور تعلق کا قریب سے مطالعہ اور مشاہدہ کر کے اور دونوں فرقوں کی مذہبی کتابوں کی تعلیمات کے حوالوں سے انہیں ایک دوسرے کے قریب لایا جا سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ ان کتابوں کی تشریح اور وضاحت صحیح اور سچے ڈھنگ سے کی جائے۔

۱۹۴۸ء میں مہاتما گاندھی کی شہادت کے بعد مولانا آزاد اور پنڈت جی کے تعلقات میں ایک نئی شخصیت وی۔ کے۔ کرشنا مینن کی آمد کی وجہ سے مزید تناؤ آنے لگا اور اس نئی ہستی کا اثر و دبدبہ بڑھنے لگا۔ خاص طور سے ہندوستان کے خارجہ امور کے معاملات میں کیوں کہ پنڈت جی کو پوری دنیا کی سیاست سے دلچسپی تھی اور ہندوستان نے ایشیا میں اپنی ایک اہم اور ناگزیر پوزیشن بنالی تھی۔ مسٹر وی۔ کے۔ کرشنا مینن جیسے دانشور جو لندن میں پنڈت جی کے قیام کے دوران ان کے ساتھی رہے تھے اور جن کا پروفیسر

لاسکی کے شاگرد کے طور پر لندن اسکول آف اکنامکس میں شاندار تعلیمی ریکارڈ تھا۔ وہ لیبر پارٹی کے اہم ممبروں کے بہت قریب رہے تھے اور ان کے درمیان ہندوستان کی آزادی کی مہم بھی چلائی تھی۔ کرشنا مینن کو آزادی کے بعد لندن میں ہندوستان کا پہلا ہائی کمشنر مقرر کیا گیا تھا۔ اپنی مدتِ عہدہ ختم ہونے کے بعد وہ ہندوستان واپس آگئے تھے۔ اور خارجی معاملات اور رابطوں کے سلسلے میں پنڈت جی کے مشیرِ خاص بن گئے تھے۔

مولانا آزاد کا خیال تھا۔ پنڈت نہرو پر کرشنا مینن کا اثر احسن نہیں ہے۔ ان کے ذہن میں دراصل ان واقعات نے جگہ بنالی تھی جو مسٹر وی۔ کے کرشنا مینن کے دورِ سفارت میں لندن کے انڈین ہائی کمیشن میں اسکینڈل بنے تھے۔ وہ ان افواہوں کے اثر سے آزاد نہیں ہو سکے تھے، جو رشوت ستانی اور گھپلوں کے تعلق سے بڑے پیمانے پر پھیلی تھیں اور جن کی باقاعدہ تحقیقات کرائی نہیں گئی تھی۔

بین اقوامی سطح پر ہندوستان کی ناوابستہ خارجہ پالیسی کی وضاحت کے لیے وہ کرشنا مینن کے ترجمان بننے کے اس لیے بھی خلاف تھے کہ وہ کھلے طور پر اسٹالن کی پالیسیوں اور طرزِ عمل کے حامی تھے اور نہ صرف یہ کہ روس میں بلکہ ساری دنیا میں ایسا ہی طرزِ حکومت چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ مغرب کی تضحیک ان کا شعار تھا۔ یہ کھلی حقیقت ہے کہ پنڈت جی مسٹر کرشنا مینن کو اپنی وزارت میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ عام خیال ہے کہ پنڈت جی کو ایسا کرنے میں تامل اس لیے تھا کہ وہ سوچتے تھے کہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو مولانا فوراً وزارت چھوڑ کر الگ ہو جائیں گے۔ پنڈت جی کرشنا مینن کے لیے مولانا کو قربان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ تاہم ان کے آپسی تعلقات اور ربط وضبط میں ایک لکیر سی کھنچ گئی تھی؛ ایک بنیادی تغیر آگیا تھا۔ یہ بات ان لوگوں کے لیے تکلیف دہ تھی جو یہ سمجھتے تھے کہ مولانا اور پنڈت جی کی قربت ایک سیکولر اور ناوابستہ ریاست کے قیام کے لیے لازم وملزوم ہے جس کے لیے مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو اور مولانا آزاد تینوں نے مستقل لڑائی لڑی تھی۔

اس مسئلے نے مجھے اتنا پریشان کیا کہ اس سوال کو میں مولانا کے سامنے اٹھانے کی جسارت کر ہی بیٹھا۔

میں نے ان سے کہا تھا کہ کرشنا مینن کی وزارت میں شمولیت کی مخالفت دراصل خود ان کی ذاتی ہار ہے۔ کرشنا مینن چاہے کیبنٹ کے رکن بنیں یا باہر رہیں وہ ہر حال میں خارجہ پالیسیوں کے لیے پنڈت جی کے مشیرِ خاص رہیں گے۔ لہٰذا اگر وہ وزارت میں شامل کر لیے گئے تو ممکن ہے، وہ زیادہ ذمہ دار بن جائیں اور اگر مولانا کرشنا مینن کی وزارت میں شمولیت کھلے دل سے قبول کر لیتے ہیں تو ان کے اور وزیرِاعظم کے درمیان جو ذاتی تناؤ پیدا ہو گیا ہے، وہ ختم ہو جائے گا۔

مجھے یاد ہے کہ یہ سب سن کر مولانا کے چہرے پر غصے کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی اور وہ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ان الفاظ کے ساتھ انہوں نے یہ انٹرویو ختم کر دیا تھا۔ "ہم اس مسئلے پر غور کریں گے"
میرے الفاظ نے ان پر کیا اثر ڈالا تھا اس کا فیصلہ میں صاف طور سے نہیں کر سکتا۔ لیکن اس گفتگو کی تھوڑی ہی مدت بعد کرشنا مینن وزارت میں شامل کر لیے گئے تھے۔ اور مولانا کے تعلقات پنڈت جی سے قدرے استوار ہو گئے تھے۔ جب میں ان سب حالات پر نظر ڈالتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ کیا میں نے واقعی کوئی عقل مندی کا کام کیا تھا۔ اگر مجھے ذرا سا بھی علم ہوتا کہ پنڈت جی کرشنا مینن کو وزیرِ دفاع بنائیں گے تو یقیناً میں نے یہ سب کچھ نہ کیا ہوتا۔

مولانا کا انتقال ۱۹۵۸ء میں ہندوستان پر چین کے حملے سے چار سال پہلے ہو گیا تھا۔ وہ زمانہ وزیرِاعظم پر کرشنا مینن کے اثر و دباؤ کے عروج کا تھا۔ خوش قسمتی سے مولانا اس حادثے کو دیکھنے کے لیے زندہ نہ تھے۔ لیکن اس سے پنڈت جی بھی ٹوٹ گئے تھے۔ ایشیا میں ہندوستان کے استحکام اور سربلندی کی امیدوں کے ٹوٹ جانے کے صدمے کے زیرِ اثر وہ بھی چھ سال بعد چل بسے تھے۔ (ترجمہ: انور کمال حسینی)

بقیہ: فطرت کا پجاری: نہرو

"میری لداخ کی یادیں دریائے سندھ کے کنارے بتائی گئی ایک چاندنی رات پر مشتمل ہیں۔ دریا پالش کی ہوئی چاندنی کی طرح لگ رہا تھا۔ پس منظر میں برف پوش پہاڑ تھے اور وہ بھی چاندنی میں چمک رہے تھے۔ دریائے سندھ جس سے ہندوستان نے اپنا نام حاصل کیا ہے اور جو بعد میں جاکر ایک زبردست دریا بن جاتا ہے، یہاں پر محض ایک پہاڑی چشمہ تھا جو نوجوانوں کی سی زندہ دلی کے ساتھ کھیل تماشے کر رہا تھا۔ اس کے بہتے پانیوں کی آواز کانوں کو بہت بھلی لگ رہی تھی اور اس کی چمک دار سطحِ آب آنکھوں کو لطف دے رہی تھی۔"

نہرو کو ہر حسین شے سے محبت تھی۔ وہ پھول، پودوں، بچوں، فن پاروں، ادب پاروں، سائنسی تخلیقوں سبھی سے پیار کرتے تھے۔ نہرو کے لیے فطرت نہ صرف ایک استعارہ تھی بلکہ ایک جمالیاتی علامت بھی تھی۔ دراصل جمالیاتی قدروں کے احساس نے ہی نہرو کو یہ تحریک دلائی کہ وہ ہندوستان کی روایت اور جدیدیت کے عناصر کو ہم آہنگ کر کے ایک ایسا تخلیقی عمل جاری کریں جو ہمیشہ ترقی اور کامیابی کی جانب گامزن رہے۔

نند کشور وکرم

نہرو اور اُردو

جواہرلال نہرو ایسی ہمہ گیر اور آفاقی شخصیتیں کسی مخصوص خطے، زبان، مذہب یا ذات سے وابستہ نہیں ہوتیں۔ ان کا نقطۂ نظر وسیع و عالم گیر اور ان کا منتہائے مقصود تمام بنی نوع انسان کی بھلائی و بہتری ہوتا ہے۔ تاہم ایسی شخصیتوں کی بھی ذاتی پسند و ناپسند ہوتی ہے اور اس کا اظہار وہ اپنی تقریر و گفتگو میں گاہے گاہے کرتے رہتے ہیں۔ یہی حال نہرو جی کا بھی تھا۔ اگرچہ وہ انگریزی کے ادیب و صحافی تھے اور انہوں نے اپنا قلم انگریزی کے لیے وقف کر رکھا تھا تاہم وہ اردو زبان کے بے حد گرویدہ تھے اور وہ اکثر و بیشتر اس زبان کی تعریف و توصیف کیا کرتے تھے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے کہ اردو ان کی مادری زبان ہے۔ گو انہوں نے اردو کی باقاعدہ تعلیم نہیں پائی تاہم چونکہ اردو ان کی گھریلو زبان تھی جسے آنکھیں کھولتے ہی انہوں نے سُنا۔ لہٰذا زندگی بھر وہ اسی زبان میں گفت و شنید کرتے رہے۔

دراصل نہرو مغل دَور کی عطا کردہ اس مشترکہ تہذیب کے پروردہ تھے جس میں اردو پروان چڑھی۔ اور اگر ان کے خانگی حالات کا مطالعہ کیا جائے تو ہم پر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اس تہذیب و زبان سے ان کا صدیوں پرانا رشتہ ہے۔ ان کے بزرگ راج کول فارسی زبان کے بڑے عالم تھے اور کہا جاتا ہے کہ جب مغل حکمران فرخ سیر سیر و سیاحت کے لیے ایک بار کشمیر گئے تو وہ ان کی علمیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے انہیں دہلی دربار میں مدعو کر لیا۔ اور اٹھارہویں صدی میں مغل فرمانروا کی ایما و فرمائش پر وہ کشمیر چھوڑ کر دہلی چلے آئے اور مغل دربار سے جاگیر اور مکان[۱] پایا۔

جواہرلال کے پر دادا لکشمی نارائن نہرو بھی فارسی کے اچھے عالم تھے اور وہ انگریز کمپنی کی جانب سے دہلی کے شاہی دربار میں وکیل کے عہدے پر فائز رہے تھے۔ ان کے دادا گنگا دھر نہرو اُردو اور فارسی سے اچھی آگہی رکھتے تھے اور وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے کچھ عرصہ پیشتر دہلی میں کوتوال کے عہدے پر مامور تھے اور موتی لال نہرو تو سرکاری کام کاج ہی میں نہیں عام بات چیت میں بھی اردو فارسی کا استعمال کرتے تھے۔ اور یہ واقعہ تو تاریخ کا ایک حصہ بن گیا ہے کہ ۱۹۲۸ء میں موتی لال نہرو کانگرس کے صدر تھے اور ۱۹۲۹ء میں جواہرلال نہرو کو ان کا جانشین منتخب کیا گیا۔ یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا کہ ہندوستان کی اتنی بڑی سیاسی پارٹی کا صدر باپ کے بعد بیٹا منتخب ہوا تھا۔ جب جواہرلال نہرو نے کرسی صدارت سنبھالی تو موتی لال نہرو نے بھرائی آواز میں تقریر کرتے ہوئے ان کی کامیابی کی دعا کرتے ہوئے فارسی کا یہ مقولہ پڑھا تھا کہ :

آں کہ پدر نہ تواند پسر تمام کند

مذکورہ بالا حقائق سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اردو زبان و تہذیب سے نہرو جی کا رشتہ کئی نسلوں سے چلا آ رہا تھا اور یہ کہ اردو ان کی گھریلو زبان تھی۔ علاوہ ازیں گھر میں بھی جن افراد و ملازمین سے ان کا واسطہ پڑتا تھا ان میں سے بھی اکثر کی زبان اُردو تھی۔ خصوصاً منشی مبارک علی کی جن کا نہرو جی پر گہرا اثر تھا اور جو انہیں الف لیلیٰ اور ۱۸۵۷ء کے مجاہدینِ آزادی کی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ خود پنڈت نہرو نے

---

[۱] مغل بادشاہ نے راج کول کو جو مکان دیا تھا وہ نہر کے کنارے تھا۔ اس سے وہ نہرو کے نام سے موسوم ہو گئے اور ان کا خاندان کول سے نہرو بن گیا۔

٭ جے۔ ٦۔ کرشنا نگر، دہلی ۱۱۰۰۵۱

بھی اردو سے اپنی وابستگی کا بارہا ذکر کیا تھا۔ انجمن ترقی اردو ہند کی کانفرنس ۱۹۵۸ء میں اپنی تقریر کی ابتدا ہی میں اس کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میں نے تو اردو باقاعدہ کسی اسکول میں بھی نہیں پڑھی لیکن یہ ضرور ہے کہ اردو میرے گھر کی زبان ہے جسے میں نے آنکھ کھول کر سنا اور بولا۔"

ایک اور موقع پر اردو سے اپنی رغبت اور اس کے تئیں اظہارِ فخر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا تھا۔

"میں اردو پر فخر کرتا ہوں اور بدستور بولتا رہوں گا۔ اردو میرے صوبے کی زبان ہے اور اس پر مجھے فخر ہے۔"

جیسا کہ ہم جانتے ہیں جواہر لال انگریزی کے ادیب تھے اور ان کی تمام تصانیف انگریزی میں ہیں اور ان کے اردو تراجم دیگر حضرات نے کیے ہیں کیونکہ اردو پر انہیں زیادہ عبور حاصل نہ تھا۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اردو سے انگریزی ترجمہ کرنے کی استطاعت رکھتے تھے۔ اس کا ثبوت مولانا آزاد کے خطبۂ صدارت کا انگریزی ترجمہ ہے جس کی داد انہیں مولانا ایسی عظیم ادبی شخصیت نے ان الفاظ میں دی تھی:

"اس ترجمے نے مجھ پر جو اثر ڈالا ہے وہ مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں اس وقت اپنے معتاد رکھ رکھاؤ کو دور پھینک دوں اور تمہاری اول درجہ کی ذہانت اور تمہاری غیر معمولی صلاحیتوں کو اپنا پُرخلوص خراجِ تحسین ادا کر دوں۔۔۔ انگریزی زبان پر تمہارے ماہرانہ عبور کی نسبت میرا جو اندازہ تھا اس سے وہ بہت آگے ہے۔ میں یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ ہمارے عہد کے بعض قابل ترین اشخاص بھی جو عظیم الشان کام دنوں اور ہفتوں میں بہ مشکل انجام دے سکتے تھے اس نے تمہارے صرف چند گھنٹے لیے اور وہ بھی بغیر کسی خاص سعی و محنت کے۔"

(صفحہ ۱۰۳ چند پرانے خطوط)

اور یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ وہ اردو میں جو تقریریں کرتے تھے وہ انگریزی میں سوچتے تھے اور اردو میں بولتے تھے۔ اور کبھی کبھی اپنی ان اردو تقاریر میں اردو اشعار کا بھی استعمال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مشاعروں میں بھی جب کبھی انہیں کوئی شعر پسند آتا تھا تو دل کھول کر اس کی داد دیتے تھے۔ اردو دوستی کی بنا پر ہی ان کے اردو کے متعدد شعرا و ادبا جیسے جوشؔ ملیح آبادی اور ساغرؔ نظامی وغیرہ سے ذاتی مراسم تھے اور انہوں نے یہ دوستی تاحیات نبھائی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جب حضرت جوشؔ ملیح آبادی چند مراعات کے حصول کی خاطر پاکستان جانے لگے تھے تو نہرو بھی انہیں کئی مراعات دینے پر آمادہ ہو گئے تھے لیکن مولانا آزاد نے جوشؔ صاحب کی اس بلیک میلنگ کو پسند نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومتِ ہند نے انہیں کوئی بھی ناجائز مراعات دینے سے انکار کر دیا اور وہ پاکستان چلے گئے۔

تحریکِ آزادی کے دوران جب اردو ہندی کا تنازع شروع ہو گیا تھا تو ہمارے قومی رہنماؤں نے اردو یا ہندی کے بجائے ہندوستانی زبان کو قومی زبان بنانے کی تجویز رکھی تھی یعنی ایسی زبان جس میں نہ سنسکرت کے بھاری بھرکم الفاظ کی بہتات ہو اور نہ فارسی کے دقیق اور بوجھل الفاظ کی کثرت۔ پنڈت نہرو بھی اردو اور ہندی کو ایک ہی زبان خیال کرتے تھے۔ لہٰذا اس اردو ہندی کے تنازع پر ہندوستانی کی حمایت کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

"ہندی اور اردو ہندوستانی کے دو روپ ہیں جن کی بنیاد ایک ہے۔ قواعد ایک ہے۔ ہندی کو ہندوؤں اور اردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھنا نہایت بیہودہ بات ہے۔ اردو سوائے اپنے رسم خط کے، خالص ہندوستان کی پیداوار ہے اور آج بھی شمالی ہند میں ہندوؤں کی کثیر تعداد کی گھریلو زبان ہے۔" [1]

بعض افراد اردو ہندی کے جھگڑے کا حل رسم الخط کی تبدیلی میں خیال کرتے تھے لیکن جواہر لال اس تجویز سے قطعی متفق نہ تھے۔ ان کا ارشاد تھا کہ ہندوستان میں رسم الخط تبدیل کرنے کے بارے میں تو سوچنا بھی نہیں چاہیے کیوں کہ یہ ادب و زبان کا انمول خزانہ ہے اور اس سے ہماری ذہنی ترقی اور تاریخ وابستہ ہے اور اس سے ہندوستانی ادب کو نقصان پہنچنے کے علاوہ کئی طرح کی مشکلات اور پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔ البتہ وہ اردو ہندی کے بجائے ایک مخلوط زبان ہندوستانی کے حامی تھے۔ وہ عام رائج الفاظ کو اپنانے کے حامی تھے چاہے وہ فارسی، سنسکرت یا انگریزی کے ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ ایک ایسی مخلوط زبان کو رائج کرنا چاہتے تھے جس میں غیر ملکی الفاظ کو جذب و قبول کرنے کی استطاعت ہو اور جسے لوگ کشمیر سے کنیا کماری تک سمجھ سکیں۔

---

[1] اردو ادب نہرو نمبر ۱۹۶۴ء صفحہ ۱۹۱

لیکن جواہرلال نہرو کی ہندوستانی زبان کی تجویز حصولِ آزادی کے بعد ختم ہو کر رہ گئی اور تقسیم ملک نے اردو کے کاز کو بھی آزاد ہندوستان میں غیر معمولی نقصان پہنچایا۔ ایک تو اردو کے حامیوں کی اکثریت پاکستان کے حصہ میں آگئی دوسرے ہندوستان سے بھی اردو کے حامیوں کی ایک خاصی تعداد جن میں ادبا، شعراء اور صحافی بھی شامل تھے ہجرت کر کے پاکستان چلی گئی جس سے اردو کی پوزیشن مزید کمزور ہو گئی اور باقی جو بچے انہوں نے مایوسی، ناامیدی یا کسی مصلحت کی بنا پر خاموشی اختیار کر لی۔ اس کے علاوہ ہندی کے کٹر حامیوں نے بھی اردو کو تقسیم کا ذمہ دار ٹھہرا کر اس کے خلاف نفرت و تعصب کا زہر اگلنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندی کے لیے آزاد ہند کی سرکاری زبان بننے کا راستہ بالکل صاف ہو گیا اور اردو کے مستقبل پر تاریکی اور ناامیدی کے بھیانک سائے منڈلانے لگے۔ اس تاریک دور میں اردو کے مایوس اور ناامید حامیوں کی ساری امیدیں نہرو اور آزاد سے وابستہ تھیں مگر حالات اتنے بدل چکے تھے کہ وہ بھی ہندی کے مقابلے میں اردو کے کاز کی حمایت نہ کر سکے اور شاید یہ ممکن بھی نہیں تھا اور وقت کا تقاضہ بھی نہیں تھا۔ ہاں جب آئین ہند کی تشکیل کی گئی تو اس کے آٹھویں شیڈول میں اسے بھی ایک قومی زبان کی حیثیت دی گئی۔ اس کے علاوہ آئین میں درج کئی دفعات میں بھی اس کے فروغ و تحفظ کی گارنٹی دی گئی تھی۔ مثلاً دفعہ ۳۰ (۱) کی رو سے لسانی اقلیتوں کو اپنے تعلیمی اداروں کے چلانے کا حق دیا گیا تھا اور دفعہ ۳۵۰ کی رو سے ہندوستان کے ہر شہری کو اپنی مادری زبان میں عرضداشت پیش کرنے کا حق دیا گیا تھا۔ اسی طرح دفعہ ۳۵۰ (۱) میں درج ہے کہ ہر ریاستی حکومت یا مقامی ادارے کی کوشش ہوگی کہ طلبار کی ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان میں دی جائے اور ۳۵۰ (ب) کی رو سے لسانی اقلیتوں کے لیے ایک کمشنر مقرر کرنے کی بات کہی گئی تھی جو کہ اقلیتوں کی شکایات سن کر گاہے گاہے اس کی رپورٹ حکومت کو دے گا۔

اردو کو آئین میں تسلیم کیے جانے کے باوجود اس کی ترقی و فروغ کے لیے کوئی قابلِ ذکر کام انجام نہیں دیا گیا اور اہل اردو مایوسی اور ناامیدی کا ہی شکار رہے۔ اسی دوران سہ لسانی فارمولا تشکیل دیا گیا تاکہ ہندی کے ساتھ دیگر علاقائی زبانوں کو بھی فروغ حاصل ہو۔ اس فارمولے کے تحت ضروری تھا کہ ہر اسکول میں جہاں کسی بھی زبان کے پڑھنے والوں کی تعداد دس ہو وہاں اس زبان کا استاد مقرر کیا جائے مگر اس کے باوجود اردو کے معاملے میں اس پر بوجوہ پوری طرح عمل نہ کیا جا سکا۔

نہرو جی کو بھی اس بات کا پورا احساس تھا کہ اردو کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا ہے جیسا کہ انہوں نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا:

> "۔۔۔ اردو کو آئین میں تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن اس پر اس طرح عمل نہیں ہوا ہے جس طرح کہ میں سمجھتا ہوں کہ ہونا چاہیئے تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ اردو کو خصوصاً ان صوبوں میں جہاں اس کے بولنے والوں کی کثرت ہے محبت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ زبان کی کشاکش میں ایک عجیب بات ہمارے ملک میں پیدا ہو گئی ہے۔۔۔ جہاں تک بچوں کا تعلق ہے انہیں مادری زبان ہی میں تعلیم ملنی چاہیئے کیونکہ مادری زبان ہی میں بچے کی بہترین ذہنی نشو و نما ہوتی ہے۔ بمبئی، کلکتہ اور دوسرے شہروں کی کارپوریشنوں کو چاہیئے کہ بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دلانے کی کوشش کریں خواہ ان کی تعداد دس ہی کیوں نہ ہو۔ اردو ایسی چھوٹی موٹی زبان تو نہیں کہ اس میں اتنے بچے بھی نہ ہو سکیں۔ یو پی دہلی اور پنجاب کے متعلق تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں وہاں اردو والوں کی بہت بڑی تعداد ہے۔ اتر پردیش میں غالباً عملی طور پر اردو کی طرف توجہ نہیں دی جاتی لیکن ہمارا طرز مخالفت کا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ دوستی کا، اس سے فائدہ پہنچتا ہے۔"

بعد ازاں جب کل ہند کانگریس کمیٹی کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا تو اس موقع پر بھی نہرو جی نے اردو کے ساتھ بعض ریاستوں میں ہو رہی ناانصافی کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کرتے ہوئے اس کی پُرزور الفاظ میں وکالت کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اردو سے متعلق بعض ریاستوں کا رویّہ غلط ہے اور اسے زیادہ مدت تک نظرانداز کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے اور یہ خیال غلط ہے کہ اگر شمالی ہند میں اردو تسلیم کر لی گئی تو ہندی کو نقصان پہنچے گا۔ ہندی سے اردو کی کوئی دشمنی نہیں، پھر معلوم نہیں کیوں اس کے مطالبے پر ہمدردی سے غور نہیں کیا جا رہا۔۔۔ اردو کو الگ کرنے اور ہندی کو زبردستی لاگو کرنے کا ایک نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ سرکاری ملازمتوں میں اقلیتوں کی صحیح نمائندگی نہیں ہو رہی۔

پنڈت نہرو کی اس تقریر سے متاثر ہو کر کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اردو کی ترقی و فروغ کے سلسلے میں ایک ریزولیوشن پاس کیا کہ اردو میں ابتدائی تعلیم کا انتظام کرنے کے ساتھ ساتھ نصاب کی کتابوں کی تیاری اور استادوں کی تربیت کا اہتمام بھی کیا جائے۔ حکومت کے اہم

قانون اور اعلان اردو میں شائع کرنے کے علاوہ اُردو میں عرضداشتیں دینے کی بھی اجازت ہو۔ لیکن کانگرس ورکنگ کمیٹی کی پاس کردہ اس قرارداد پر بھی عمل نہیں کیا جاسکا حالانکہ نہرو جی نے اردو کی حمایت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی اور انہوں نے اس کی بھی پُرزور آواز میں تردید کی تھی کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ انہوں نے کہا تھا:

"ہمیں اردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھنے کی عادت ترک کردینی چاہیے۔ یہ بالکل لغو بات ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ بعض جذباتی وجوہ سے مسلمان اس سے زیادہ لگاؤ محسوس کرتے ہوں لیکن اگر ایک مسلمان بھی ہندوستان میں نہ رہ جاتے تو اس وقت بھی اردو ہندوستان کی زبان رہے گی اور ترقی حفاظت اور ہمت افزائی کی حقدار ہوگی اردو ہماری تہذیب کا جزو ہے کیونکہ اس کا اثر دوسری زبانوں پر عظیم اور خوشگوار رہا ہے اور یہ تمام دوسری زبانوں کی طرح ہماری زندگی کی خوبیوں میں اضافہ کرتی ہے اور مزید یہ کہ دوسری زبانوں سے اس کا ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ اردو کو مباحثہ کی نظر سے دیکھنے والا تنگ نظر اور متعصب ہے جو زبان کے بارے میں خاک نہیں جانتا۔ اگر آئینی اور ادبی معیار سے دیکھا جائے یا عام آدمی کے زاویۂ نظر سے دیکھا جائے جو اسے پڑھتا اور بولتا ہے تو اردو کا ایک تسلیم شدہ مقام ہے۔ یہ معیار کسی زبان کے لیے استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ دستور کی رو سے اردو کو ایک قومی زبان قرار دیا گیا ہے۔ ادبی نقطۂ نظر سے بھی بلاشبہ وہ ایک مالدار اور زندہ زبان ہے۔ مقابلہ تو نہیں کروں گا لیکن دستور میں لکھی ہوئی چودہ زبانوں میں سے بہت سی ایسی زبانیں ہیں جن کا ادب اور بولنے والوں کی تعداد اردو سے بہت کم ہے۔"

گو وہ حصول آزادی کے بعد اردو کے لیے وہ سب کچھ نہ کرسکے جس کی حامیانِ اردو توقع کرتے تھے لیکن اس میں بھی کئی مجبوریاں حائل تھیں۔ اس لیے جب وزارتِ عظمیٰ کی ذمہ داریاں ان کے شانوں پر پڑیں تو ان کے بولنے کا انداز بڑا محتاط ہوگیا کیونکہ ان کی کسی بھی بات سے ہنگامہ برپا ہوسکتا تھا اور پھر انہیں صرف اردو ہی نہیں دیگر زبانوں کو بھی مدنظر رکھنا تھا۔ اور ہندوستان ایسے وسیع و عریض ملک میں جہاں لاتعداد فرقے آباد ہیں اور جہاں متعدد سیاسی مذہبی اور لسانی گروہ ہیں ذرا سی بات ہنگامے کا باعث ہوسکتی تھی اس لیے وزیرِ اعظم کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد ان میں پہلے والی انتہا پسندی نہیں رہی تھی اور ان کا لہجہ دھیما پڑ گیا تھا پھر بھی جہاں موقع ملتا تھا وہ اردو کی حمایت و تعریف میں بولنے سے نہ چوکتے تھے اور نامساعد حالات کے باوجود اردو کی ترقی سے بہت خوش ہوتے تھے۔ گو وہ اردو کو اس کا حقیقی اور جائز مقام بوجوہ نہ دلا سکے۔ تاہم دستور ساز اسمبلی سے لے کر عام جلسوں میں برابر اس کی حمایت و پیروی کرتے رہے۔ ہوسکتا ہے کہ اگر انہیں زندگی کچھ مزید مہلت دیتی تو وہ اہلِ اردو کی توقعات اور مطالبات بھی پورا کرنے میں کامیاب ہوجاتے لیکن عمر نے وفا نہ کی اور وہ اپنی مادری زبان اردو کے لیے کچھ نہ کرسکے تاہم انہیں یقین تھا کہ اردو کی ترقی و فروغ کو کوئی طاقت نہیں روک سکتی اور وہ تمام اڑچنوں اور مشکلات کے باوجود اپنا جائز مقام حاصل کرے گی جیسا کہ انجمن ترقی اردو (ہند) کی ۱۹۵۸ء میں منعقد کانفرنس میں انہوں نے فرمایا تھا:

"زبان اپنی کوششوں سے ہی بڑھتی ہے سرکاری کوششوں سے اس میں جان نہیں پڑتی۔ ہاں اس سے اس کی ترقی کا راستہ صاف ہوجاتا ہے پس اگر اردو میں جان ہے تو یہ یقیناً بڑھے گی اور ترقی کرے گی چاہے اس میں رکاوٹیں پیش آئیں۔" [۱]

---

[۱] اردو ادب نہرو نمبر ۱۹۶۴ء صفحہ ۱۵۸-۱۵۷

بقیہ: نہرو: یادِ خوش آشام

مبارکباد دے کر ہمیں بڑی مسرت حاصل ہورہی ہے۔"

یہی ایک طرح سے نہرو تھے بحیثیت انسان —— مضبوط عقائد کے حامل جو دوسروں کے ایمان دارانہ خیالات کا احترام کرتے تھے۔ وہ کٹر پن، تنگ نظری اور عدم رواداری کے خلاف تھے، لیکن دوسروں کے نظریات کے لیے ان کے دل میں بڑی رواداری تھی۔ نہرو کو عام آدمی سے بڑی دلچسپی تھی اور عام آدمی نے کئی دہوں تک انہیں اپنا آدرش بنائے رکھا بلکہ ان کی پوجا کرتا رہا۔ وہ اپنی شخصیت کے زور سے لکھوکھا آدمیوں کے دلوں کو جیت لیتے تھے۔ انہوں نے ۱۹۳۷ء میں کانگریس کی انتخابی مہم تقریباً تن تنہا چلائی، جس کے دوران انہوں نے بیل گاڑی سے لے کر ہوائی جہاز تک کی ہر ممکن سواری استعمال کرکے ہزاروں میل کا سفر کیا اور ہزاروں جلسوں میں تقریریں کیں اور شاندار کامیابی حاصل کی۔

(ترجمہ: خواجہ عبدالخالق)

نئی کتابیں

"جائزے"

قیمت: تیس روپے

"زخم کے پھول"

قیمت: ۲۵/ روپے

مصنف: ڈاکٹر محمد محسن

ملنے کا پتہ: بک اِمپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔

اردو کے نہایت معروف افسانے "انوکھی مسکراہٹ" کے خالق اور علمِ نفسیات اور فلسفہ کے ممتاز عالم ڈاکٹر محمد محسن کی یہ دو کتابیں، ان کے علمی و عقلی رویے کا لسانی اظہار ہیں۔

"جائزے" ان سولہ ادبی، نفسیاتی، شخصیتی مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۵ء تک لکھے گئے۔ ان میں سے آخری پانچ کے علاوہ گیارہ مضامین کے عنوانات میں "نفسیاتی" کی توضیح شامل ہے ادب پاروں اور مسائل کو علم نفسیات کی عینک سے دیکھنا ڈاکٹر محسن کا امتیاز ہے جو ممکن ہے کہ بعضوں کے نزدیک قابلِ ستائش نہ ہو مگر ہمیں اس طرزِ عمل کی یہ اہمیت تسلیم ہے کہ اس سے ادیب اور ایک حد تک ادب پارے کی تفہیم میں مدد یقیناً ملتی ہے، ادب پارے کی تعیینِ قدر اِک علاحدہ بات ہے۔ سماجیات، معاشیات اور لسانیات کے بعض سوڈو ماہرین کے برخلاف ڈاکٹر محسن کی یہ حقیقت پسندی لائقِ تقلید ہے کہ وہ یہ ثابت کرنے یا تاثر دینے کی کوشش نہیں کرتے کہ "انہیں حاصل، علم نفسیات ہی ادب کی پرکھ کا واحد و کامل معیار ہے۔

پیش لفظ میں ڈاکٹر محسن نے اپنے دو مضامین (ایک زیرِ نظر کتاب اور دوسرا سابقہ مجموعۂ مضامین میں شامل ہے) سے متعلق یہ راز "فاش" کیا ہے کہ یہ "معروف ناقد کلیم الدین احمدؒ اور ممتاز محقق قاضی عبدالودود" کی شخصیت کا خاکہ ہیں۔ ڈاکٹر محسن کا کہنا ہے کہ یہ راز اس وجہ سے فاش کیا جا رہا ہے کہ اب یہ دونوں "بقید حیات" نہیں — سوال پیدا ہوتا ہے کہ مصنف نے مذکورہ مضامین ہی میں، ان کی اشاعتِ اوّل کے وقت، اپنے محرکات کی وضاحت کیوں نہیں کی؟ اور ان کے اس عمل کی نفسیاتی وجہ کیا ہے؟ — ایک بزرگ و محترم ادیب کو تو ہم سے نو واردوں کے لیے اخلاقی جرأت و بے خوفی کی مثال قائم کرنی چاہیے۔

کتاب کے تمام مضامین میں، موضوع پر مصنف کی گرفت مثالی حد تک مضبوط ہے۔

زخم کے پھول ڈاکٹر محسن کی لگ بھگ تیس سالہ شاعری کا انتخاب ہے۔ کتاب کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا حصہ ۲۱ صفحات کا مضمون ہے جس میں ڈاکٹر محسن نے اپنی ذات کا تجزیہ کرتے ہوئے، خود کو سنگین احساسِ کمتری میں گرفتار ثابت کیا ہے۔ دوسرا حصہ ایک سو ایک اشعار پر مشتمل ہے — یہ اشعار آخری حصے میں شامل غزلوں سے منتخب کیے گئے ہیں، اس انتخاب کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ اشعار مصنف کو اپنے مذاقِ شعری کے آئینے میں خصوصیت سے قابلِ اعتنا محسوس ہوتے؛ دوسری وجہ یہ کہ "اگر یہ اشعار قاری کے معیارِ شعر و شاعری پر پورے اتریں گے تو قاری کو اس مجموعے کے باقی حصوں کے مطالعہ کے لیے آمادہ کر دینگے۔"

تیسرے حصے میں ڈاکٹر محسن نے بتایا ہے "میری شعر گوئی میری اس مثالی ذات کی ترجمان ہے جس سے میری حقیقی ذات کبھی آنکھ نہ ملا سکی"۔ آٹھ صفحات پر مشتمل، چوتھے حصے میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی شعر گوئی کے ان کلیدی تصورات پر اظہارِ خیال کیا ہے — آزادیٔ اختیار، شوق، یقین، غم اور حسنِ نظر۔ ایک سو ایک منتخب اشعار میں سے چند شعر بہ طور نمونہ:

جنوں کی حکایت خرد کی زبانی
فریبِ یقین دگماں زندگانی

حسن کی شوخیاں گئیں شوق کا بانکپن گیا
میری نظر کو کھا گئی شدتِ ذوقِ آگہی

غزلوں کے ان اشعار میں کارفرما نثری منطق اور شدید تعقّل ثابت کرتا ہے کہ ڈاکٹر محسن کی شاعری میں بھی ان کے مضامین جیسا علمی و عقلی رویہ کارفرما ہے۔ اس رویے نے شاعری کو بھلے ہی غیر شاعرانہ حد تک ٹھوس کر دیا ہو مگر ان کی نثر کو بڑی حد تک جامع

اور چست بنا دیا ہے۔ ہم وطنوں کے لیے ڈاکٹر محسن کی نثر مشعل راہ ثابت ہو سکتی ہے۔

خلیل الرحمن اعظمی

ترقی پسندی سے جدیدیت تک

مصنف: ڈاکٹر اسلام عشرت

قیمت: پچاس روپے، ڈی لکس: ستر روپے

ناشر: دانش پبلی کیشنز، لنگر باغ، پٹنہ

یہ کتاب مصنف کے اس مقالے کی تلخیص ہے جو پی ایچ ڈی کی سند کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ کتاب کو سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے:

"سطور اولیں" میں ڈاکٹر عشرت کا کہنا ہے: "اعظمی کی شاعری میں ان کی شخصیت کے سوز و ساز، درد و داغ اور تمام عناصر کا مکمل اور بہترین اظہار ہوا ہے۔ چنانچہ تقاضہ ہے کہ اعظمی کی شخصیت اور شاعری کی قدر و قیمت کا تعین کیا جاتا۔ میں نے اسی احساس کے تحت یہ مقالہ سپرد قلم کیا ہے اور ان کی شخصیت اور شاعری کا مکمل احاطہ کرنے کی سعی کی ہے۔" اور کتاب کی پشت پر درج رائے میں پروفیسر وہاب اشرفی نے لکھا ہے: "اسلام عشرت نے خلیل الرحمن اعظمی کی شاعری کے خد و خال ابھارنے کی سعی مشکور کی ہے —" جب کہ حقیقت اس سے مختلف ہے۔

کتاب کے صرف ان تین ابتدائی ابواب کو ایک حد تک "سعی مشکور" کہا جا سکتا ہے جن میں اعظمی کے حالات زندگی، ذہنی و ادبی پس منظر کو اجاگر کرنے والے عناصر اور ادبی نقطۂ نظر کے شواہد ترتیب دیئے گئے ہیں۔ لیکن ان ابواب کی ترتیب میں اسلام عشرت نے صرف مطبوعہ مواد ہی کو کافی تصور کر لیا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اس مواد کی روشنی میں اعظمی کے اہل خاندان و اہل خانہ اور احباب و معاصرین سے بالمشافہ گفتگو کرتے۔ یوں ممکن تھا کہ ان کی رسائی کچھ ایسے امور و عناصر تک ہو جاتی جو بظاہر تو معمولی اور چھوٹے ہوتے ہیں (اور اسی باعث اکثر و بیشتر ضبط تحریر میں نہیں آپاتے)، لیکن شخصیت اور نقطۂ نظر کی تعمیر میں انتہائی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

کتاب کے وہ دو (بنیادی) ابواب جن میں خلیل صاحب کی غزل و نظم کو موضوع بنایا گیا ہے، صرف ۲، صفحات پر مشتمل ہیں۔ ان صفحات کی تالیف میں ڈاکٹر عشرت نے وہی ٹھیٹ پی ایچ ڈیانہ طریقہ اختیار کیا ہے جس کے مطابق دیگر افراد کی رائے اپنے الفاظ میں ادا کی جاتی ہے، ممدوح کے لیے اسمائے صفات کے ڈھیر لگائے جاتے ہیں اور اس کے فن پاروں کو توڑا مروڑا جاتا ہے۔ اسلام عشرت کے مطابق

"... ان کی غزلوں کے اشعار کے مطالعے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ان کی غزلوں میں بنیادی طور پر جو باتیں پیش کی گئی ہیں وہ ان کی نجی اور ذاتی تجربات پر مشتمل ہیں۔ "جنہیں آپ بیتی کہا جا سکتا ہے یا مرثیہ خوانی بھی"۔ اعظمی نے اپنے مجموعۂ کلام "کاغذی پیراہن" کی غزلوں کو "بوئے آوارہ" کا عنوان دے کر درج کیا ہے، اور ان کا ایک شعر بھی ہے جس میں لفظ "بوئے آوارہ" بہت خوبصورتی کے ساتھ چسپاں کیا گیا ہے..." (ص ۱۰۵)

خط کشیدہ اجزا کے ساتھ ہی ساتھ، اس عبارت کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ترچھی لکیروں سے نشان زد الفاظ خلیل صاحب کے درج ذیل شعر سے بلا حوالہ ماخوذ ہیں:

ہم پہ جو گزری ہے بس اس کو رقم کرتے ہیں
آپ بیتی کہو یا مرثیہ خوانی کہہ لو

چھٹے باب کا عنوان ہے۔ اسلوب و بیان۔ کتاب کے موضوع کی رو سے اس باب کا مقصد خلیل صاحب کے اسلوب کی واضح شناخت ہونا چاہیے تھا مگر ڈاکٹر عشرت نے اس باب کے ۲۵ میں سے ابتدائی پانچ صفحے اسلوب کی انگریزی، فارسی اور اردو تعریفوں کے حوالوں پر صرف کیے ہیں اور اس کے بعد ۱۲ صفحات میں متعدد شاعروں کے اشعار درج کیے ہیں تاکہ قاری ان شاعروں کے اسلوب کو صرف مثالوں کے ذریعے سمجھ لے۔ ان میں میر، غالب، مومن، یگانہ، فیض اور فراق کے ساتھ شکیل بدایونی بھی شامل ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ "اردو زبان کے اسلام پسند مشہور شاعر حفیظ میرٹھی" کے اشعار بھی درج کیے ہیں اور لکھا ہے۔ "حفیظ میرٹھی اسلامی ذہن کے شاعر ہیں ان کا عظیم کارنامہ "شاہنامہ اسلام" ہے"۔ باب کے آخری سات صفحات میں خلیل صاحب کی ۱۳ نظموں کے اقتباسات اور مختلف غزلوں کے ۱۲ شعر نقل کر کے سمجھ لیا گیا ہے کہ اسلوب کی شناخت کا فرض ادا ہو گیا۔

ساتویں اقتباس کے بعد ڈاکٹر عشرت رقم طراز ہیں:

"... اعظمی کی شاعری کے پورے سرمایے کو مدنظر رکھ کر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان کا ایک مخصوص شعری اسلوب تھا اور وہ جذبے کے براہ راست اظہار کی بجائے اسے شعری پیکروں کے وسیلے سے پیش کرتے ہیں جو اس کی متبادل حسیاتی شکل اور موزوں علامت بن گئے

اُردو کا مقبولِ عام
مصوّر ماہ نامہ

آج کل
نئی دہلی

مہمان مُدیر: راج نرائن رازؔ

سب ایڈیٹر: خورشید اکرم

جِلد: ۴۸ شمارہ: ۵

دسمبر ۱۹۸۹ء اگرہائن۔پوس شک سمت ۱۹۱۱

قیمت: دو روپے فون: ۳۸۷۰۶۹

سرورق: ایم۔ایم۔مَلِک

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر: آج کل (اُردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ:
بزنس منیجر: پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

پروڈکشن آفیسر: آر۔ایس۔منجال

اندرونِ مُلک زرِ سالانہ: ۲۰ روپے
دو سال کے لیے: ۳۶ روپے
تین سال کے لیے: ۴۸ روپے

ترتیب

وزیرِ اعظم کا قوم کے نام خطاب

پیارے دوستو اور دیش واسیو!

کچھ ہی دن پہلے ہم سب آپ کے درمیان گھوم رہے تھے۔ آپ کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے محلوں اور گلیوں میں آپ سے رابطہ قائم کر رہے تھے۔ ہمارے آپ کے درمیان سرکار دیوار نہ بنے۔ یہی میری کوشش ہوگی۔ بھارت کے کھیت اور کھلیانوں کی دھول لے کر ہم سرکاری کمروں میں آئے ہیں۔ ان کمروں میں اس دھول کی لاج رکھیں گے۔ دلّی کی چکاچوند میں یہ نہیں بھولیں گے کہ تمام جھونپڑیوں میں ابھی چراغ نہیں جلے ہیں۔ سرکار کی آواز کسانوں، مزدوروں اور نوجوانوں کی آواز ہوگی اور اگر سرکار ایک تلوار ہے تو وہ تلوار غریبوں اور محنت کشوں کی حفاظت کے لیے استعمال ہوگی۔

پچھلے سالوں میں جو تبدیلی کی جدوجہد چلی ہے اس میں عوام کا بہت بڑا تعاون رہا ہے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں اور اس کے ساتھ جو بائیں بازو کی پارٹیوں اور بھارتیہ جنتا پارٹی نے نئی حکومت کو چلانے میں یقین دلایا ہے اس کے لیے میں شکر گزار ہوں۔

لمبی رات کے بعد سویرا تو آیا لیکن ایک تھکا ہوا سا سویرا آیا ہے۔ سرکار کی تجوری خالی ہے جگہ جگہ آگ لگی ہے، زمین لہو سے رنگی ہے اور مہنگائی نے انسان کی زندگی سستی کر دی ہے ہمارے پاس صرف دو ہی طاقتیں رہی ہیں۔ اپنی ہمت اور آپ کا اعتماد۔ پچھلی لڑائی انہیں دو طاقتوں کی بنیاد پر لڑی تھی۔ اگلی لڑائی بھی انہیں کی بنیاد پر لڑیں گے اور صرف اپنا راستہ ہی نہیں نکالیں گے بلکہ اس پر مضبوطی سے چلیں گے۔ ملک کسی بھی جماعت سے بلند تر ہوتا ہے اور ملک کے اہم مسائل کا حل قومی مصالحت کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ حزبِ اختلاف کو بھی اعتماد میں لیا جائے گا اور ابھی حزبِ اختلاف نے جو یقین دلایا ہے کہ وہ مثبت تعاون دیں گے، میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ یہ ملک سب کا ہے اور سب کا بنا رہنا چاہیے۔

پنجاب کے گھاؤ ابھی بھرے نہیں ہیں۔ دلوں کو سنگینوں سے نہیں سیا جا سکتا ہے۔ جہاں اس ملک کی سرزمین کی تقسیم سے کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا وہاں اس قومی مسئلے کو ملک گیر کوشش سے ہی حل کیا جا سکتا ہے۔ دلوں میں مرہم لگانے کی ضرورت ہے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے ساتھ میں بڑی قربانی دی ہے اور یہی ہماری اُمید کی بنیاد ہے۔ پنجاب، جموں و کشمیر اور رام جنم بھومی اور بابری مسجد جیسے پیچیدہ مسائل کا حل قومی کوشش سے کیا جائے گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی حل ان کا ضرور نکلے گا۔

دنگوں اور فسادوں نے ہم کو ہلا دیا ہے لیکن یہ بھولنا نہیں چاہیے کہ ملک کا جذبۂ اتحاد ہی ہماری سب سے بڑی طاقت ہے۔ ہم اس اتحاد کو ٹوٹنے نہیں دیں گے۔ کیوں کہ کسی ملک کا نقشہ کاغذ پر نہیں بنتا ہے، وہاں کے لوگوں کے دلوں میں ہی بنا کرتا ہے۔ اور اگر دلوں میں لکیریں پڑیں تو زمین پر بھی لکیریں پڑتی ہیں۔ ہم ان لکیروں کو نہیں پڑنے دیں گے۔ انسان کو غربت برداشت ہوتی ہے لیکن بےعزتی برداشت نہیں ہوتی۔ اور اب بہت خون بہا ہے۔ اس خون کو ہم آنسوؤں سے دھولیں یہی ایک راستہ ہے۔

ہم جنت کا وعدہ نہیں کرتے ہیں۔ لیکن اگر ہمارے پاس جھونپڑی ہو تو اس میں آپ کو خاندان کے ناتے اس جھونپڑی کو چلانے میں، اس خاندان کو چلانے میں حصہ داری کا ضرور وعدہ کرتے ہیں۔ اگر سوکھی روٹی ہی ہے تو اُسے بانٹ کر ہم ضرور کھائیں گے۔

جمہوریت، مریاداؤں کی بنیاد پر چلتی ہے۔ اس لیے جمہوری اداروں کی مریاداؤں کو دوبارہ قائم کرنا ہوگا۔ عدلیہ، پارلیمنٹ اور حسابیکھا کار (کمپٹرولر اینڈ آڈیٹر جنرل) کی خود مختاری کو دوبارہ قائم کرنا ہوگا۔

عوامی زندگی کی مریاداؤں کی خلاف ورزی نہ ہو اس کے لئے لوک پال کی تشکیل ہوگی جو وزیرِ اعظم کے بارے میں تحقیقات اور جانچ کر سکے گا۔

عوام کی شرکت بڑھانے کے لیے عوام کی معلومات میں بھی اضافہ کرنا ہوگا۔ گناہ پردے کی آڑ میں پلتا ہے۔ اگر حکومت کو عوام کی نگاہوں کے سامنے کر دیں تو بہت سے گناہ نہیں ہوں گے۔ اسی لیے آفیشل سیکریٹ ایکٹ میں ترمیم کی جائے گی تاکہ حکومت کی کارکردگی کا علم ہو سکے۔ یہ بات ضرور ہے کہ جہاں سالمیت کا سوال ہے یا خارجی پالیسی کا سوال ہے اور وہاں پر جہاں رازداری کی ضرورت ہے، وہاں ضرور رکھی جائے گی۔ اسے قائم رکھا جائے گا۔

معلومات جمہوریت کی روشنی ہے اس لئے معلومات کے حق کو آئین میں رکھا جائے گا اور دوردرشن اور آکاش وانی کو خود مختار بنایا جائے گا۔

مہنگائی سے گھروں کے چولہے تو بجھ گئے لیکن پیٹ کی آگ نہیں بجھی۔ ہم کو بہت سخت حالات میں حکومت کی ذمہ داری ملی ہے۔ اس میں آپ کے تعاون کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔

گاؤوں میں بھارت رہتا ہے۔ آج گاؤوں سے ذہن بھاگ رہا ہے، مزدور طاقت بھاگ رہی ہے، پیسہ بھاگ رہا ہے۔ اور جب تک یہ ہوتا رہے گا، بھارت ماں کا چہرہ پیلا رہے گا۔ اس کے چہرے پر سرخی لانے کے لیے ہنسی خوشی لانے کیلیے ہم لوگوں نے ملک کے وسائل کا آدھا حصہ گاؤوں میں لگانے کا عہد کیا ہے۔ کسان اور مزدور محنت کرتا ہے، لیکن اس کی محنت کے عوض میں اس کو بھوک، غریبی اور قرض ملتا ہے، اس لیے کھیتی ہر مزدوروں، چھوٹے کسانوں، بنکروں، دستکاروں کو قرضے میں راحت دینے کا ہمارا پروگرام ہے۔ جہاں زراعت ہمارے اقتصادی نظام کی بنیاد ہے، وہاں صنعت پر بھی زور دینا ہوگا۔ ایک مضبوط بھارت کے لیے مضبوط صنعتی بنیاد کا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے صنعتوں کو مثبت امداد دی جائے گی۔ خاص طور پر چھوٹی صنعتوں اور زراعت پر مبنی صنعتوں کو۔

صنعتوں میں مزدوروں کی شرکت بڑھے اس لیے ان کو انتظام میں حصہ داری دینے کا ہمارا منصوبہ ہے اور پبلک سیکٹر میں اس کو ہم بہت جلدی لگانے کی کوشش کریں گے۔ جہاں تک محنت کشوں کا سوال ہے، درج فہرست ذاتوں اور قبائل کے لوگ ایسے تمام لوگ ہیں جن کے پاس کوئی گھر نہیں ہے۔ ایک چڑیا کے پاس بھی گھونسلہ ہے جو ایک پرندے کو حاصل ہے، ایک انسان کو حاصل نہیں ہے۔ ہمارے درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے لوگ ایک عزت کی زندگی، ایک انسان کی زندگی بسر کر سکیں، اسے ہم اولیت دیں گے۔ ہمیں بھولنا نہیں چاہیے کہ بھوک ایک آگ ہے، جب تک یہ پیٹ میں رہے تو اناج سے بجھ سکتی ہے لیکن جب اس آگ کی لپٹیں دماغ تک پہنچ جاتی ہیں تو پھر اناج سے نہیں بجھتی تب انقلاب سے بجھتی ہے۔ اقتصادی و سماجی انصاف تاریخ کا تقاضا ہے۔ پسماندہ طبقے میں پیدا ہونے والے کو پیدائش سے جتنا تک سماجی سزا ملتی ہے۔ بے عزتی کی زندگی بسر کرنا سب سے بڑی سزا ہوتی ہے ان کو سماجی انصاف دینا ہمارا اولین فرض ہوتا ہے۔

یہ ہماری کوشش رہے گی کہ اقلیتوں کے ہمارے بھائی بنا خوف کی زندگی بسر کر سکیں اور ہماری ترقی میں ان کی حصہ داری ہو، ان کی شرکت ہو۔ خواتین، جن کی گود میں ہمارا مستقبل پلتا ہے، ان کو عام دھارے میں لے آنا نظام کی تبدیلی کا پہلا قدم ہوگا۔ کیوں کہ وہ ہی نظر انداز میں اور تکلیف میں ہیں۔

عوام کی طاقت ہمارے ملک کا سب سے بڑا سرمایہ ہے اور اگر ہاتھ خالی ہیں تو ہمارے ملک کا سب سے بڑا سرمایہ خالی ہے — ہم کام کرنے کے حق کو آئین میں شامل کریں گے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دوسرے دن سب کو سرکاری نوکریاں مل جائیں گی لیکن اس کے معنی یہ ضرور ہیں کہ عوام کو ایک ایسا سیاسی حق ضرور ملے گا کہ چاہے جو سرکار ہو وہ مجبور ہو کہ ایسی پالیسیوں کو اپنائے گی جس سے خالی ہاتھوں کو کام ملے اور بے کاروں کو ایک روشنی ملے۔

موجودہ اقتدار کی تبدیلی کی لڑائی میں نوجوان نسل بہت کھل کر اور جم کر سامنے آئی ہے میں نوجوانوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں اور ان کا بے حد شکر گزار و ممنون ہوں۔ لیکن جب ایک نوجوان نسل کو آگے لایا جاتا ہے تو وہ محض اقتدار میں تبدیلی کے لیے ہی نہیں بلکہ نظام کو بدلنے کے لیے، تاریخ کو بدلنے کے لیے اس نسل کو آگے کیا جاتا ہے اور میں نوجوان نسل کو اس انقلاب کے لیے پکارتا ہوں۔ کہ وہ ایک ایسا نظام لے آئیں جس میں محض وزیر اور وزارت ہی نہ بدلیں بلکہ جھونپڑی میں رہنے والوں کی زندگی بدلے اور اس تبدیلی کے لیے عوام کو بیدار کرنا ہوگا۔ اور بیدار عوام ہی ہماری جمہوریت کی سب سے بڑی بنیاد ہو سکتے ہیں۔ جمہوریت کو آج سب سے بڑا خطرہ سرمایہ داری سے ہے اور اس لیے میں نوجوانوں سے کہوں گا کہ وہ محنت کش لوگوں کو اپنے ساتھ ملائیں اور جمہوریت کے سینے پر جو سرمایہ داری چڑھی بیٹھی ہے، اس کو اکھاڑ پھینکنے کی لڑائی میں ان کو شامل کر کے ایک عوامی طاقت کو ایسا ابھاریں کہ یہ ایک نئے نظام میں تبدیل ہو جائے۔

کسی ملک کی خارجہ پالیسی اس کی قومی یگانگت پر مبنی ہوتی ہے۔ ناوابستگی کی پالیسی ہمارا قومی عزم ہے اور نئے بدلے ہوئے حالات میں ہم اس کو اور مضبوط کریں گے۔ پڑوسی ممالک سے ہم اپنے تعلقات کو بہتر بنائیں گے اور سارک ادارے کو ہم اور تیز رفتار بنائیں گے۔ جنوبی افریقہ میں جو نسلی امتیاز ہے اس کو دور کرنے کے لیے اور فلسطینیوں کو ان کے جائز حقوق دلانے کے لیے ہم پرزور کام کریں گے۔

آخر میں آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں آپ سے گزارش کروں گا کہ جو تعاون آپ نے سرکار بدلنے میں دیا، اس سے زیادہ تعاون کی ضرورت نئی سرکار کو چلانے میں ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم وہ سرکار دیں گے کہ جس سے ہر بھارت واسی اپنا سر بلند کر کے چل سکے۔

بقیہ: نیا خط

کی ہر شتاول کے تشدد سے بھی پیدا کی جائے۔ مذہبی فسادوں کی آتش زنی سے بھی پیدا کی جائے۔

تو دیکھا آپ نے اس طرح اب پہلی بار بجلی کی پیداوار بڑھانے کی ایک واضح اور زیادہ جامع پالیسی تیار ہو جائے گی۔ گویا اب ہم پرانے طریقے چھوڑ کر ایک نئی حکمت عملی کو اپنانے جا رہے ہیں۔ اب جلد ہی بجلی کی کمی ایک پرانی بات ہو جائے گی — بس تھوڑا انتظار کیجیے۔ اس بار جب بجلی آئے گی تو پھر کبھی نہیں جائے گی۔

عظیم سائنسداں: سی. وی. رمن

چندر شیکھر وینکٹ رمن جب صرف ۱۹ سال کے تھے تب اُنہیں نائب اکاؤنٹنٹ جنرل حکومتِ ہند کی نوکری مل گئی۔ اسی سال ان کی شادی ہو گئی۔ اونچا عہدہ اور ایک شریف النفس بیوی ـــــ دل میں اُبل رہے چشمے کو سست رونری بنا دینے کے لیے یہ دونوں چیزیں کافی ہیں۔ لیکن چندر شیکھر وینکٹ رمن کے دل میں جو چشمہ اُبل رہا تھا وہ آسمان پر تیر رہے بادلوں کی بوندوں سے جاملنا چاہتا تھا۔ ان کی بے قرار طبیعت اپنی منزل کا نشان ڈھونڈ رہی تھی، اور ان متلاشی آنکھوں نے ایک روز اچانک وہ دیکھا جو تصور میں کہیں جھلملا رہا تھا۔ ہوا یوں کہ دفتر سے گھر کو جاتے ہوئے راستے میں ان کی نظر ایک عمارت پر پڑی جس پر لکھا ہوا تھا: "دی انڈین ایسوسی ایشن فار دی کلٹیویشن آف سائنس۔" یہ دیکھتے ہی ان کی باچھیں کھل گئیں۔ گھر کی راہ بھول کر ایسوسی ایشن کے دفتر کی طرف بڑھ گئے۔ رمن نے وہاں اپنا تعارف فزکس کے ایک طالب علم کی حیثیت سے کرایا اور اپنا وہ مطبوعہ مضمون بھی وہاں دکھلایا جو لندن کے فلاسفکل میگزین میں لگ بھگ دو برس قبل چھپا تھا، جب وہ ایم۔ اے کے طالب علم تھے۔ ان کا یہ مضمون سورج کی کرنوں سے متعلق ایک نئی سائنسی تحقیق پر مبنی تھا۔ ایسوسی ایشن نے اس نابغۂ روزگار ہستی کو خوش آمدید کہا۔ اب رمن کا یہ معمول ہو گیا کہ صبح ایسوسی ایشن کی لیبارٹری میں پہنچ جاتے۔ دن دفتر میں اور شام کو پھر لیبارٹری میں۔ گویا دفتر کے بعد جتنا اور جب بھی اُنہیں وقت ملتا وہ سائنسی تحقیق و دریافت میں صرف کرتے۔ رمن کی زندگی کا یہ دوسرا دور شروع ہوتا ہے جہاں سے کامیابی کے نئے نئے دَر ان کے لیے وا ہونا شروع ہوتے ہیں۔

ان کی زندگی کا پہلا دور بھی کامرانیوں اور کامیابیوں کا دور تھا۔ وہ انتہائی ذہین طالب علم تھے۔ اُنہوں نے ۱۲ سال کی عمر میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۷ سال کی عمر میں ان کا پہلا سائنسی تحقیقی مضمون چھپا۔ ۱۸ سال کی عمر میں ایم۔ اے (سائنس) کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک سے لے کر ایم اے تک ہر درجہ میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ اسی سال اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ کا امتحان پاس کیا۔ اس طرح چندر شیکھر وینکٹ رمن ۱۹۰۷ء میں 19 سال کی عمر میں نائب اکاؤنٹینٹ جنرل کے عہدے پر فائز ہو کر کلکتہ آئے، جہاں سے کچھ دنوں کے بعد ان کی زندگی کا ایک دوسرا دور شروع ہوا۔

سی وی رمن فزکس کے طالب علم تھے اور طالب علم بھی ایسے کہ اُستادوں کے استاد کو ٹوک آتے۔ یہ بات بیسویں صدی کے اوائل کی ہے۔ تب ہندوستانیوں کے پاس وسائل بہت محدود تھے۔ انہیں وہ سہولتیں میسّر نہیں تھیں جو آج ہیں۔ مگر محدود وسائل کے باوجود رمن نے بہت ساری دریافتیں کیں۔ آہستہ آہستہ ان کا نام ساری دنیا میں پھیل گیا۔ انڈین ایسوسی ایشن کی لیبارٹری میں وہ اپنے رفیق سائنس دانوں کے ساتھ تحقیق و دریافت کے عمل میں جُٹے رہے، لیکن یہ عمل بہت زیادہ دنوں تک نہ چل سکا۔ ان کا تبادلہ رنگون میں ہو گیا۔ یہ زمانہ ان پر کٹھن گزرا۔ کیوں کہ وہاں وہ سہولتیں میسّر نہ تھیں کہ وہ اپنی تحقیق کا کام پورے شدومد سے جاری رکھ پاتے۔ انہیں دنوں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ وہ چھ مہینے کی چھٹی لے کر مدراس میں آ کر رہنے لگے۔ اس کے بعد ان کا تبادلہ ناگپور ہوا۔ وہاں اُنہوں نے اپنے گھر ہی میں لیبارٹری قائم کر لی تاکہ ان کی تحقیق کا کام سرد نہ پڑ جائے۔ اسی سرد و گرم میں دن کٹتے رہے کہ ۱۹۱۱ء میں ان کا پروموشن ہو گیا اور وہ اکاؤنٹینٹ جنرل ہو کر دوبارہ کلکتہ واپس آ گئے۔ یہاں سے ان کی زندگی کا تیسرا دَور شروع ہوتا ہے۔ جو بلاشبہ ان کی زندگی کا سب سے سنہرا دَور ہے۔

کلکتہ واپس آ کر وہ ایک بار پھر پورے عزم و استقلال کے ساتھ تحقیق کے کام میں لگ گئے۔ ان دنوں ہندوستان میں ایک بھی ایسا آزاد کالج نہیں تھا، جہاں صرف سائنس پڑھائی جاتی ہو ـــــ سر آشوتوش مکھرجی کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ اُنہوں نے ایک آزاد کالج کھولنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اس طرح ۱۹۱۵ء میں کلکتہ میں ایک سائنس کالج کا قیام عمل میں آیا۔ سر آشوتوش مکھرجی نے اُنہیں سائنس کالج میں درس و تدریس کا کام انجام دینے کی دعوت دی۔ سائنس اور بالخصوص فزیکل سائنس سے اُنہیں اس درجہ لگاؤ تھا کہ اُنہوں نے اعلیٰ سرکاری عہدہ چھوڑ کر کم تنخواہ پر کالج کا پرنسپل بننا منظور کر لیا۔ اب سائنس ہی ان کا اوڑھنا اور سائنس ہی بچھونا بن گیا۔ درس و تدریس کے

بقیہ ص ۳۰

فہمیدہ بیگم

مثنوی نوسرہار اور عاشورہ نامہ

اردو کے اوّلین شہادت نامے : ایک تقابلی مطالعہ

سن دسویں صدی ہجری تک اردو ادب کی کئی اصناف نہ صرف وجود میں آچکی تھیں بلکہ بعض اصناف نے اپنا معیار بھی قائم کر لیا تھا۔ انہیں میں اردو مثنوی کا شمار بھی ہوتا ہے۔ خصوصاً جنوبی ہند میں اردو مثنویاں کثیر تعداد میں قلمبند کی گئیں۔ ان مثنویوں کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ تخلیقی مثنویاں

۲۔ عربی، فارسی اور ہندوستانی زبانوں سے ترجمہ کی ہوئی مثنویاں۔

۳۔ عرب، ایران اور ہندوستان کے ادبی، ثقافتی تہذیبی ماخذ اور تمدن سے موضوعات پر مشتمل نیم تخلیقی مثنویاں۔

نفس مضمون یا موضوعات کے لحاظ سے مثنویوں کی تقسیم کی تفصیل یہاں بہت ضروری نہیں سمجھی گئی۔

۱۔ پہلی قسم کی مثنویاں زیادہ تر مذہبی، صوفیانہ، تاریخی، سوانحی اور اخلاقی قسم کی ہیں۔ کچھ بہت مختصر ہیں اور طویل مثنویاں ہزاروں اشعار پر مشتمل ہیں۔

دوسری اور تیسری قسم کی مثنویاں بیشتر طویل ہیں اور ہر دور میں ان کی مانگ رہی ہے۔ اور کثیر تعداد میں لکھی گئیں۔ ترجمہ ہونے والی مثنویوں میں سیرت محمد مصطفےٰ، حالات حضرت علی کرم اللہ وجہٗ، سیرت بی بی فاطمہ خاتونِ جنت، واقعاتِ کربلا، جنگ نامہ محمد حنیف، قصہ یوسف زلیخا اور ہندوستانی قصوں میں 'راماین' کے قصوں نے بہت شہرت حاصل کی ہے۔ ان تمام مثنویوں کے مرکزی کرداروں کا تعلق کسی نہ کسی مذہب سے ضرور ہے۔ ان قصوں میں خاتونِ جنت بی بی فاطمہؓ، بی بی مریمؑ اور سیتا جی کے چرنوں میں عقیدت کے پھول نچھاور کیے گئے ہیں تو کہیں انجیل اور قرآن کے قصے مرکزی حیثیت اختیار کر رہے ہیں۔

ابتدائی دور ہی سے اردو زبان نے ان مثنویوں کے ذریعے مندر، مسجد، گرجا اور گوردوارہ کے عقیدت مندوں اور عابدوں کو اکٹھا رہنے کی عظیم روایت قائم کی ہے۔ مختلف مذہب کے ماننے والوں کے دل کی دھڑکن کو اپنے اندر سمویا۔ اور ان سب کے قلبی سکون کا سامان فراہم کیا۔ قدیم مثنویوں کا دامن بہ اعتبار موضوعات اردو شاعری کی دیگر اصناف یہاں تک کہ غزل سے بھی زیادہ وسیع اور گہرا ہے۔ ہندوستانی اور انسانی زندگی کے ہر پہلو کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے اور محسوس ایسا لگتا ہے کہ مثنویوں کے سمندر کا غوطہ خور کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹ سکتا۔ اس کے اندر تاریخ و تمدن، رزم اور بزم کی داستانیں بھی ہیں۔ اور ہر قسم کے احساسات، خوشی و مسرت کی رنگینیاں بھی۔ قابلِ تحسین بات تو یہ ہے کہ رام راؤ سیوا بیجاپوری عقیدت و احترام سے واقعاتِ کربلا بیان کر رہا ہے تو ادھر خواجہ دل محمد اور نفیس جلیلی پورے ادب کے ساتھ راماین کے قصے سنا رہے ہیں۔ مذہبی رواداری اور احترام کی اس سے عمدہ مثال اور کہاں مل سکتی ہے۔ اردو مثنویوں کا قابلِ لحاظ حصہ واقعاتِ کربلا پر بھی مشتمل ہے۔ کئی شہادت نامے لکھے گئے ہیں۔

کسی بھی شہید کے بارے میں شہادت نامہ تحریر کیا جاسکتا ہے اور اردو ادب میں ایسے شہادت نامے لکھے بھی گئے ہیں۔ [illegible] اور مرثیے کے نام کے ساتھ اردو ادب کے حوالے سے [illegible]

ڈائریکٹر ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

اس تاریخی واقعہ کی طرف چلا جاتا ہے جو آج سے صدہا سال پہلے حسینؓ ابنِ علیؓ اور ان کے پورے خاندان کے ساتھ پیش آیا تھا۔ حسینؓ ابنِ علیؓ ۹ محرم بعد نماز مغرب اپنے میدانِ جنگ کے ساتھیوں کو یہ خوشی اجازت دیتے ہیں کہ جو اس جنگ سے آزاد ہونا چاہیں وہ بغیر کسی جھجک کے جا سکتے ہیں۔ آخر کا صرف ستر لوگ بچ رہے ہیں، جس میں ابن علیؓ کے خاندان کے پورے پورے افراد موجود تھے اور کئی ایک اُن ۹ دنوں میں میدانِ کربلا میں دریائے فرات کے کنارے پیاسے دم توڑ چکے تھے۔ دنیا کی تاریخ کا یہ ایک بے مثال اور انوکھا واقعہ ہے، جس میں عورتیں، بچیاں، معصوم بچے، نو عمر لڑکے تک نہ صرف شریکِ جنگ رہے اور قتل ہوئے بلکہ گرفتار بھی ہوئے مگر جذبۂ قربانی میں بال برابر فرق نہ آیا۔ یہ تاریخی سانحہ اُردو میں ابتدائی دَور سے ہی اہم موضوعِ ادب رہا ہے اس موضوع پر نثر پارے بھی وجود میں آئے۔ اور منظوم شاہکار بھی۔ ایسے ہی دو شہادت ناموں کا یہاں پر تقابلی مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے جو مثنوی کے روپ میں ہی لکھے گئے ہیں۔ واقعاتِ کربلا ان کا مرکزی موضوع ہے۔ اور در اصل ان شہادت ناموں میں واقعۂ کربلا میں حصّہ لینے والے کرداروں کی خودداری، ایثار و قربانی، جرأت مندی، انصاف پسندی سچائی اور بہادری کو بہ نظرِ تحسین دیکھا گیا ہے ان سب کی شخصی خصوصیات کو اُجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ شہیدوں کی شہادت پہ احترام اور عقیدت سے سر جھک گئے ہیں۔ ان شہادت ناموں میں ماتم کا انداز کم ہے۔ کرداروں کی مخصوص خصوصیات کی جلوہ گری اور تاریخی واقعہ کی اہمیت زیادہ ہے۔ اردو کا پہلا شہادت نامہ نوسرہار ہے جو شاہ اشرف بیابانی کی تصنیف ہے۔ شمالی ہند کا پہلا اردو شہادت نامہ عاشورہ نامہ ہے جو روشن علی سہارن پوری کی تصنیف ہے۔

شاہ اشرف الدین اشرف احمد نگر کے رہنے والے تھے۔ آپ کی ولادت ۲ ذیقعد ۸۷۴ھ / ۱۴۶۹ عیسوی بہ روز دوشنبہ بہ وقت ظہر فقیر آباد میں ہوئی اور آپ نے ۹۳۵ھ / ۱۵۲۸ء میں وفات پائی۔ آپ سید شاہ ضیاء الدین رفاعی بیابانی کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ ابتدائی تعلیم والد ماجد سے حاصل کی۔ ۸۹۵ھ / ۱۴۸۹ء ان سے خلافت پائی۔ اور ۹۰۹ھ / ۱۵۰۳ء میں سجادہ نشین ہوئے۔ ۹۰۹ھ ہی میں آپ نے یہ مثنوی نوسرہار تصنیف کی ہے۔

روشن علی :

روشن علی کے تفصیلی حالات موجود نہیں ہیں۔ عاشورہ نامہ کے مرتب ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے بیان کے مطابق عاشورہ نامہ کے مصنف روشن علی کے بارے میں تمام دستیاب شدہ تذکرے خاموش ہیں ظاہر ہے ادبی لحاظ سے یہ اس پائے کی تصنیف نہیں ہے کہ "عالم میں انتخاب" شہر کے تذکرہ نگار اس کی جانب متوجہ ہوتے۔ روشن علی کے بارے میں ہماری معلومات کا تمام تر ذریعہ خود اس کی تصنیف ہے، جس سے یہ ثابت ہے کہ "سیرِ دنیا" کرنے کے بعد مصنف سہارنگ پور (سہارنپور) میں مقیم ہو گیا۔ ص ۲

روشن علی کی تصانیف :

—— روشن علی کی اور کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا اور عاشورہ نامہ کی اندرونی شہادت کے مطابق وہ کم علم تھا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا خیال ہے کہ وہ معمولی علمیت کا آدمی تھا۔ اس کی لیاقت فارسی شہادت ناموں تک محدود تھی ...... ہر چند وہ کبھی کبھی آیات و احادیث بھی نقل کرتا ہے۔ لیکن عربی دانی تو کجا اس کی فارسی دانی بھی کچھ یوں ہی سی معلوم ہوتی ہے۔

شاہ اشرف کی تصانیف :

شاہ اشرف کی ابتدائی تعلیم والد ماجد سے نہ صرف شروع ہوئی بلکہ تکمیل کو بھی پہنچی۔ آپ کی علمی ادبی بنیاد مضبوط تھی۔ اب تک شاہ اشرف کی تین تصانیف کا پتہ چلا ہے۔ واحد باری، دوسری لازم المبتدی تیسری نوسرہار اور ایک چوتھی تصنیف قصّہ آخر الزماں کا بھی ذکر ملتا ہے۔

واحد باری :

واحد باری کا تعارف ڈاکٹر جمیل جالبی کے الفاظ میں یوں ہے:

" واحد باری عربی فارسی اردو کی ایک منظوم لغت ہے جو امیر خسرو کی منظوم لغت خالق باری کی روایات سے تعلق رکھتی ہے۔ تقریباً سوا دو سو سال کے عرصہ میں فرق یہ ہو گیا ہے کہ خالق باری میں ذریعۂ اظہار فارسی ہے۔ اور اب واحد باری میں ذریعۂ اظہار عام مروجہ زبان "اردو" ہے۔ واحد باری میں نہ صرف اردو الفاظ کے فارسی، عربی مترادفات لکھے گئے ہیں بلکہ موسیقی، عروض، ردیف و قافیہ اور اصناف کو بھی سمجھایا گیا ہے۔" ص ۱۸۵

لازم المبتدی ۱۹۸ اشعار کی ۳۶ عنوانات پر مشتمل مثنوی جس میں میاں بی بی کو پیش آنے والے روزانہ کے مسائل اور مذہبی ارکان کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس دَور کی زبان کا یہ ایک عمدہ نمونہ ہے۔

تیسری اور اہم تصنیف شہادت نامہ نوسرہار ہے۔ اس میں نو باب ہیں۔ اسی وجہ سے اس کا نام نوسرہار رکھا۔ مثنوی کے نام کا ذکر شاعر نے مثنوی کے آخر میں یوں کیا ہے:

ایک ایک بول یوں موزون ان
تقریر ہندوی کی بکھان
اشرف ناآگہی اللہ یار
بخشے تجھ کوں ایک کرتار
پورا ہوا نوسرہار
بے سہیلی کا آدھار

یہ مثنوی ۹۰۹ھ میں لکھی گئی ہے۔ شاعر نے تاریخ تصنیف یوں قلمبند کی ہے:

بازاں جو سنے تاریخ سال
بعد از ہجرت نبی حال
نو سو ہوئے اگلے نو
یہ لیکھ لکھا اشرف تو
قانون دھریا اس نوسرہار
لیکن یہ سب دکھ کا بہار

ان شہادت ناموں اور تاریخ ادب اردو میں موجود بیانات کے مطابق روشن علی سہارن پوری اور شاہ اشرف الدین اشرف بیابانی سنی عقیدہ کے حامل شاعر تھے۔ روشن علی نے عاشور نامہ ۱۱۰۰ھ مطابق ۱۶۸۸ء تحریر کیا اور اس سے لگ بھگ دو سو سال پہلے شاہ اشرف نے ۹۰۹ھ مطابق ۱۵۰۳ء نوسرہار کو نظم کیا۔ مثنوی کے نام کی صراحت شاہ اشرف کی طرح روشن علی نے بھی کئی موقعوں پر کی ہے۔ تاریخ تصنیف اور مثنوی کی زبان کے بارے میں بھی جگہ جگہ اظہار خیال کیا ہے۔ عاشور نامہ کی زبان کو ہندوی ہندی اور ہندوستانی کے نام سے موسوم کیا ہے۔

— بہ غربت او نیوں کے ظلم ظالمان
کہوں جنگ نامہ بہ ہندی زبان
یہ عاشور نامہ بہ ہندی زبان
کہوں کربلا کی لڑائی عیان

(ص: ۳۷)

ماخذ کے بارے میں اشارہ کیا ہے:

کتب معتبر سے سنایا پڑھا
نظم ہندوی کر کے سب کو لکھا
بہت روضۂ شہیداں سے سن کر خبر
کیا ہے بیان و را روشن ذکر

(روضۃ شہدا)

کہا روشن علی معجزہ شہ حسین
کیا بیچ ہندی سو تحقیق عین

دویم معجزہ کا کروں ہوں بیان
بہ گفتار ہندی جو سمجھے جہان

دیکھا تھا کتابوں میں یہ ہی کلام
نظم ہندوی کر کے بولا تمام

یہ روشن علی نے سنا تھا بیان
زباں ہندوستانی میں بولا عیاں

ہندی، ہندوی اور ہندوستانی زبان کا یہ عاشورہ نامہ مدتوں نظروں سے اوجھل رہا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور سفارش حسین رضوی صاحب مبارکباد اور شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس ادب پارہ کا تعارف ادبی دنیا سے کروایا ورنہ شمالی ہندوستان میں منظوم شہادت ناموں کی مدت اور بڑھ جاتی۔

اشرف نے بھی نوسرہار کی زبان کا نام ہندی مانا ہے:

ایک ایک بول میں موزوں ان
تقریر ہندی کی لکھان

بازان کہنا ہندی میں
قصۂ مقتل شاہ حسینؑ

شہادت ناموں کے نسخوں کی دستیابی:

مثنوی نوسرہار کے اب تک تین نسخوں کی نشان دہی ہو سکی ہے۔ ایک مکمل نسخہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد میں موجود ہے۔ دوسرا ہندوستان ہی میں انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ میں ہے۔ تیسرا نامکمل نسخہ انجمن ترقی اردو پاکستان میں۔ اس تیسرے نسخے کو افسر صدیقی صاحب نے ترتیب دے کر سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان شمارہ نمبر ۴۲۵ / ۱۹۸۲ء میں شائع کر دیا ہے۔ آخر میں ایک مختصر سی فرہنگ بھی دی ہے۔ عاشور نامہ کا واحد مخطوطہ رام پور رضا لائبریری میں موجود ہے۔ جس کی نقل ترقیمہ کے مطابق جعفر علی ولد میاں غلام قریشی شاہ نے ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں کی ہے۔ اسی مخطوطے کو ترتیب و تدوین کر کے ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ۱۹۶۲ء میں

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع کیا۔ انہوں نے اس ترتیب بندی میں محنت شاقہ سے کام لیا ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ دونوں اولین شہادت نامے شائع ہو چکے ہیں۔

شہادت ناموں کا سبب تصنیف :

عاشور نامہ تقریباً ساڑھے تین ہزار اشعار پر مشتمل طویل مثنوی ہے۔ اور نوسرہار میں تقریباً ڈیڑھ ہزار اشعار ہیں۔ ان شہادت ناموں کا سبب تصنیف عوام واقعات کربلا سے روشناس کروانا اور عصری تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔ دونوں کے مخاطب عوام ہیں۔ اسی وجہ سے دونوں شاعروں نے اپنے اپنے عہد کی مروجہ زبان استعمال کی ہے۔

شہادت ناموں کی لسانی اور ادبی اہمیت:

جائزے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تاریخی اہمیت کا بھی جائزہ لیا جائے۔ مختصر حالات سے واضح ہے کہ روشن علی کم علم اور اشرف باعلم شاعر ہے۔ مگر تاریخی حقائق کی پیش کش میں دونوں کا حال یکساں ہے۔ دونوں مثنویوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مثنویاں مجلسوں میں سنانے کی غرض سے لکھی گئی ہیں۔ روشن علی کا مخاطب طبقہ سہارن پور کے مسلمان ہیں جیسا کہ خود شاعر نے ظاہر کیا ہے۔

یہ ہے شاہ دنیا و دیں کا حسین
جگر مصطفےؐ کا علیؓ کا ہے چین
کہ خاتونِ جنّت کا پیارا پسر
سنی مسلمانوں کا ہے یہ راہبر

نوسرہار میں کچھ اسی انداز کی تحریر ملتی ہے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مثنوی حضرت حسین کے ہر عقیدت مند کے مطالعہ اور سماع کے لیے لکھی گئی ہے، مگر تاریخی حقائق معتبر اور مستند نہیں ہیں۔ شاہ اشرف نے واقعات کہاں سے اخذ کیے تھے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ عاشور نامہ کا مصنف فارسی شہادت ناموں کا ذکر بار بار کرتا رہا ہے۔ نوسرہار کے مطابق حضرت علی اکبر کی عمر بارہ برس ہے۔ اور حضرت علی اصغر دوڑنے کے قابل بتائے گئے ہیں :

آنر گھوڑے سہا باون   علی اکبر اس کا ناون
دوڑ آیا حسین کن   بارہ برس کہرا سن

علی اصغر کے بارے میں لکھا ہے :

علی اصغر شدہ پکڑ   انہوں میں سے باہر پڑ
علی اصغر جس کا ناون   جنگل پکڑ بہاٹیا باون

روشن علی کے عاشور نامہ کا بھی یہی حال ہے۔ اس میں بھی تاریخی حقیقتوں کے مسخ کی دلچسپ مثالیں ملتی ہیں۔ کئی موقعوں پر مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ مثنوی عاشور نامہ میں حسینی برہمنوں کے ذکر کو کافی اہمیت دی گئی ہے۔ جگہ جگہ ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا بھی بیان ملتا ہے۔ ایک ہندو پروہت کی حسین پرستی کا ذکر روشن علی نے یوں کیا ہے :

نیزوں پر شہیدوں کے سر دیکھ کر اس کا سر بارگاہ حسینی میں عقیدت مندی سے جھک جاتا ہے اور وہ امام حسین کے سر مبارک کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کوشش میں اسے اپنے سات بیٹوں کے سر ایک کے بعد ایک یزیدی سپاہی کو دینا پڑا۔

وہ تھا نام راہب پہ زنّا دار
وہ مشہور تھا اس زمیں پر غدار

اس راہب نے ان کو بے دردی سے شہید کرنے کا سبب پوچھا تو جواب ملتا ہے کہ ہم یزید کے حکم کی تعمیل پر مجبور تھے۔ یہ سنا کر لوگ چلے جاتے ہیں۔ مگر برہمن اسی جگہ پر بُت بن کر کھڑا رہ جاتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح سے حضرت امام حسین کے سر مبارک کو اپنے ساتھ رکھ لے۔

چلا چل ہو وے وہ اسی گاؤں پر
کھڑا ہو رہا بہمن اسی جائے پر
کیا عرض راہب نے دل سے سبھی
ہے ویران کی جگہ بستی اچھی
صبح کو کرو کوچ پھر جلد تر
تمہاری مہمان داری دل سے کروں
وہ سب رات چوکی مروں کی کروں

اس کے فرزندوں اور دوسروں نے راہب کے اس خیال کی تائید کی۔ اور اس کے اصرار پر حضرت امام کا سر بھی اس کے حوالے کر دیا۔ تب وہ سر لے کر گھر میں گیا اور کرنے کو خوشبو سے مہکا دیا۔

صدق سے جلاتا تھا خوشبو کے تئیں
ادب سے کری عرض اس نے یو نہیں
یہ سر ہے نبیؐ کے جو فرزند کا
علی فاطمہ کے نیاز مند کا

راہب بڑی عقیدت سے سر مبارک سے مخاطب ہے جس کے جواب میں آواز آتی ہے :

نواسے ہیں ہم شاہ خیر البشر
کہ ہیں رحمت للعالمین در خبر

اتنے میں سر مبارک نے کلمہ کی تلاوت کی۔ جسے سن کر راہب

مع ساتوں بیٹوں کے مسلمان ہوجاتا ہے۔

یہ راہب سنا کلمہ سر سے خدا
مسلماں ہوا صدق دھر باخدا
بیٹے ساتوں اس کے مسلماں ہوئے
سوا شاد خرم باایماں ہوئے
یہ سب رات عنبر جلاتا جو تھا
بہت خوب خوشبو لگاتا جو تھا

اتنے میں صبح ہوجاتی ہے اب راہب فکرمند ہے کہ سر مبارک کو کیسے بچایا جائے۔ بیٹوں پر خیال ظاہر کرتا ہے کہ میں بجائے اس کے تمہارے سر ان لوگوں کو پیش کر دوں تو کیسا رہے گا۔ سبھی بیٹے قربانی کی اس سعادت پر راضی و مسرور ہوجاتے ہیں پہلے بڑے بیٹے کا سر تن سے جدا کرکے پیش کیا جاتا ہے۔ پر سردار یہ سر لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اسی طرح دوسرے سر بھی پیش کیے جاتے ہیں جو قبول نہیں کیے جاتے۔ ساتویں سر پر انہیں دھوکا ہوتا ہے اور وہ ساتویں بیٹے کا سر لے کر چلے جاتے ہیں۔ تب راہب اپنی کامیابی اور بارگاہِ ایزدی میں اپنی دعا قبول ہوجانے پر سجدۂ شکر بجالاتا ہے اور امام حسین کا سر مبارک کربلا لے جاکر دھڑ کے ساتھ ملا دیتا ہے۔

یہ تھا ذات بھی سوا ایماں لیا
فرزند ساتوں اپنوں کو قرباں کیا
نبی کے فرزندوں پہ وہ صدق لا
وہ ثابت قدم تھا باایماں ہوا
چلے سر کو لے کر لعیں نابکار
کیا کوچ لشکر نے تھے سب تیار
یہ راہب گیا لے کے سر کربلا
کیا دفن جاکر وہ دھڑ سے ملا

(ص ۱۶۵)

عاشور ناموں کی لسانی اور ادبی اہمیت:

ان شاعروں کے فنی محاسن اور تاریخ دانی کی ناواقفیت ان ادب پاروں کی اہمیت کو کسی طرح کم نہیں کرسکتی۔ کیوں کہ یہ زبان کی ایک اہم دستاویز ہے۔ بہ قول مرتب عاشور نامہ۔

"عاشور نامے کی زبان سترہویں صدی عیسوی کے اواخر کی وہ زبان ہے جو موجودہ مغربی یوپی کے بالائی دوآب میں رائج تھی۔

چونکہ اس بات کا قطعی علم نہ ہوسکا کہ اس کا مصنف روشن علی کس مقام کا رہنے والا تھا۔ داخلی شہادت سے صرف اس قدر مسلّم ہے کہ وہ سپونیپا کرنے کے بعد سہارن پور (سہارنگ پور) میں مقیم ہوگیا تھا۔ اس لیے صرف اس قدر کہا جاسکتا ہے کہ اس نے بالائی دوآب کی فضائی زبان میں عاشور نامہ کی تصنیف کی ہے۔

روشن علی نہ تو شاعر ہے اور عالم زیادہ سے زیادہ ایک حجرہ نشین ملائے مکتب معلوم ہوتا ہے۔ عاشور نامہ کی تصنیف ایک مذہبی فریضہ کے طور پر عوام کے اصرار پر کر رہا ہے۔ اس کی علمیت اور فارسی دانی کا یہ حال ہے کہ نہ تو وہ بقول خود فارسی جنگ ناموں میں کرداروں کے نام ٹھیک سے پڑھ سکتا ہے اور نہ ان کا اندراج اپنی تصنیف میں صحیح طور پر کرسکا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی حیثیت ایک عوامی شاعر کی ہے۔ جو فارسی کے جنگ ناموں کو یہ زبان ہندی منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

عاشور نامہ ادبی لحاظ سے جس قدر ساقط الاعتبار ہے لسانی لحاظ سے اسی قدر اہم دستاویز ہے۔ شمالی ہند میں اس سے قبل اردو کے جو نمونے ملتے ہیں وہ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ ص ۱۵۔

نوسرہار قدامت کے اعتبار سے اور زیادہ اہم دستاویز ہے خصوصاً اس میں موجود بے شمار محاورے جو آج بھی زبان میں موجود ہیں، اس کی لسانی قدر و قیمت کو بڑھا دیتے ہیں۔ اس کے لسانی تجزیے سے مزید خصوصیات اور خوبیاں سامنے آسکتی ہیں۔ تاریخ ادب اردو میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایسے شہ پاروں کی لسانی اہمیت کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی صلاحیتوں کو اردو زبان کے مزاج و خون میں شامل کرکے اسے آگے بڑھایا ہے۔ اگر یہ لوگ ایسا نہ کرتے، اس زبان کو اپنے اپنے انداز میں، اپنی اپنی ضرورت کے مطابق استعمال نہ کرتے تو یہ زبان وقت کی قبر میں کبھی کی دفن ہوچکی ہوتی۔ طویل نظم لکھنا اور وہ بھی ایسے دور میں جب خود زبان بیان کی سطح پر گھٹنیوں چل رہی تھی، کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ان لوگوں نے زبان کو مختلف موضوعات سے آشنا کرکے اسے جلد ہی کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ قدیم اردو مصنفین کا ہم پر یہی احسان ہے۔" (ص۔۱۷۹)

اس طرح کا کلام لسانی اعتبار سے ایک قیمتی سرمایہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی عاشور نامہ اور نوسرہار کی تصنیف کے پیچھے مصنفین کے جو جذباتِ احترام کارفرما ہیں، ان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور یہ ادب پارے اپنے دور کے رجحانات اور سماجی عوامل کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

عظیم الشان صدیقی

سرشار کا آخری ناول — چنچل نار

سرشار کے آخری ناول "چنچل نار" کا ذکر سب سے پہلے ان کے دوست اور ہم عصر پنڈت برج نرائن چکبست نے اپنے مضمون پنڈت رتن ناتھ سرشار میں کیا تھا۔

"(سرشار کا) دبدبہ آصفی میں ایک ناول موسومہ بہ چنچل نار سلسلہ‌وار شائع ہوتا تھا۔ وہ بھی ناتمام رہا۔ اور اچھا ہوا کہ ناتمام رہا۔"

چکبست کا یہ مضمون سرشار کے انتقال کے بعد کشمیر درپن مئی ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا تھا۔ چکبست نے کوئی وجہ بیان نہیں کی کہ وہ اس کے ناتمام رہنے سے کیوں خوش تھے۔ البتہ ان کا یہ بیان ایک طویل مدت تک مستند سمجھا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ رام بابو سکسینہ نے بھی اس روایت کو ہسٹری آف اردو لٹریچر میں نقل کر دیا۔ البتہ ڈاکٹر احراز الحسن نقوی نے اپنے تحقیقی مقالے "سرشار بحیثیت ناول نگار" کے لیے کام کرتے ہوئے اس بیان کو مزید تحقیق و تلاش کا موضوع بنایا اور نصیر الدین ہاشمی کو حیدرآباد خط لکھ کر اس کی وضاحت چاہی۔ ہاشمی صاحب نے جواب میں لکھا کہ مطبوعہ ناول مل گیا ہے اور اس پر مصنف کا نام مہاراجہ کشن پرشاد چھپا ہوا ہے۔ اس لیے یہ ناول سرشار کی تصنیف نہیں ہے۔ اس خط کے علاوہ ہاشمی صاحب کا ایک مختصر مضمون بھی اس ناول کے بارے میں ہماری زبان میں چھپ چکا ہے۔ سرشار کے اس ناول کا ذکر پریم پال اشک نے بھی اپنی کتاب سرشار — ایک مطالعہ" میں کیا ہے اور نہایت یقین اور اعتماد کے ساتھ اسے سرشار کی تصنیف بتایا ہے۔ انہوں نے تو یہ بھی تحریر کر دیا ہے کہ" دبدبہ آصفی میں چنچل نار پنڈت رتن ناتھ سرشار کے نام سے شائع ہوتا رہا ہے"۔ یہ درست نہیں ہے۔

"چنچل نار" کے بارے میں دو اور مضمون بھی قابلِ ذکر ہیں: جن میں سنجیدگی سے اس موضوع پر غور کیا گیا ہے اس میں ایک مضمون ڈاکٹر قمر رئیس کا ہے جو "چنچل نار" کے نام سے نیا دور لکھنؤ میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے ہاشمی صاحب کے بیان کی تردید کرتے ہوئے مکمل مطبوعہ ناول کا مطالعہ کرنے کے بعد زبان و بیان اور تہذیبی پس منظر کی روشنی میں دلائل اور حوالوں کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ ناول مہاراجہ کشن پرشاد کی تصنیف نہیں ہے بلکہ سرشار کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلے میں دوسرا مضمون ڈاکٹر احراز الحسن نقوی کا ہے جو "چنچل نار کا قضیہ" کے عنوان سے "نقوش" لاہور بابت مئی ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں نقوی صاحب نے "دبدبہ آصفی" میں شائع چنچل نار کی اقساط کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا تھا "مختصر یہ کہ چنچل نار کو سرشار کا ناول ثابت کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی معتبر شہادت نہیں ہے اور ہر دلیل کے ساتھ ایک جواز موجود ہے۔ لہٰذا میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ چنچل نار سرکشن پرشاد کا ناول ہے جو سرشار کے اتباع میں اور پھر اصلاح کے ساتھ دبدبہ آصفی میں پہلے سات باب تک طبع ہوتا رہا۔ بعد میں ۱۹۰۳ء میں مطبع شمسی (حیدرآباد) سے طبع ہو گیا۔" ان متضاد بیانات کی موجودگی میں یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ چنچل نار کا اصل مصنف کون ہے۔ مذکورہ بیانات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ نتائج برآمد ہوتے ہیں کہ چکبست کی معلومات کا ذریعہ غالباً سرشار کا کوئی خط رہا ہے۔ انہوں نے مطبوعہ مکمل ناول تو دیکھا ہی نہیں ہے۔ اور اگر رسالہ دبدبۂ آصفی ان کے پاس آتا رہا ہے تو انہوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی ہے۔ البتہ نصیر الدین ہاشمی اور ڈاکٹر قمر رئیس کے متضاد بیانات مکمل ناول چنچل نار مطبوعہ مطبع شمسی ۱۳۲۱ھ پر مبنی ہیں جس پر واضح طور پر مصنف کا نام مہاراجہ کشن پرشاد چھپا ہوا ہے۔

۲۰۰۲ قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

البتہ ڈاکٹر احرار نے مکمل ناول کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف دبدبۂ آصفی میں شائع اقساط کی روشنی میں اپنا فیصلہ صادر کیا ہے، جب کہ رام بابو سکسینہ، پریم پال اشک اور ڈاکٹر لطیف حسین ادیب نے اس سلسلے میں کوئی زحمت نہیں اٹھائی، صرف روایت کو نقل کرنے پر ہی اکتفا کیا ہے۔ لیکن اگر سرشار کے سفر حیدرآباد رسالہ دبدبۂ آصفی مطبوعہ مکمل ناول اور مہاراجہ کشن پرشاد کے بیانات کی روشنی میں کوئی تجزیہ اور تقابلی مطالعہ کیا جائے تو دلچسپ حقائق سامنے آتے ہیں۔

سرشار ۱۳۱۳ھ (۵ - ۱۸۹۴ء) میں حیدرآباد پہنچے اور ۱۳۱۴ھ (۱۸۹۶ء) میں مہاراجہ کشن پرشاد کے زمرہ اساتذہ میں شامل ہو گئے جس کی تصدیق مہاراجہ کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے۔

"راجہ بنسی لال سررشتہ دار جو ایک قدیم معزز خاندان سے میرے دوست تھے۔ ان کی بدولت سرشار ذی وقار سے تعارف ہوا۔ گھر بیٹھے دولت آئی۔ سب نے سونے کی چڑیا سمجھا مگر میں نے ان کو جواہر کی چڑیا سمجھ کر اپنی محبت کے قفس میں نظر بند کیا —— ان کی صحبت سے میں نے نظم و نثر میں بہت کچھ استفادہ حاصل کیا۔"

(مہاراجہ کشن پرشاد کی زندگی کے حالات)

سرشار کے ترغیب دلانے پر کشن پرشاد نے ایک ناول مطلع خورشید کے نام سے لکھا جو سرشار کی اصلاح کے بعد ۱۳۱۵ھ میں محبوب پریس حیدرآباد سے شائع ہوا جس کا ذکر مہاراجہ نے بھی اپنی سوانح عمری میں کیا ہے۔

"۱۳۱۵ھ میں ان ہی (سرشار) کی ترغیب سے میں نے مطلع خورشید کے نام سے ایک ناول لکھا اور سرشار کی نظر ثانی کے بعد طبع اور شائع کرایا۔"

"مطلع خورشید" مختصر سا ناول ہے جو فسانۂ آزاد کے ضمنی قصہ ہمایوں فر اور سپہر آرا کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔ لیکن سرشار کی اصلاح کے باوجود اس میں دلچسپی و دلکشی پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ اس میں بھی ہیرو اور ہیروئن کے وصال کے لیے شاہ صاحب کا سہارا لیا گیا ہے اور ہر باب کا عنوان برج رکھا گیا ہے اور کرداروں پر بھی سپہر آرا، زینت النسا اور بڑی بیگم کا عکس موجود ہے۔ اور ناول میں جگہ جگہ فسانۂ آزاد کے مخصوص الفاظ، جملے، محاورے اور ضرب الامثال کا استعمال کیا گیا ہے۔ جس سے مطلع خورشید پر فسانۂ آزاد اور سرشار کے اثر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس ناول کا جو اشتہار دبدبۂ آصفی میں شائع ہوا تھا اس میں سرشار کا نام استعمال کیا ہے۔ جس کی عبارت ذیل میں درج ہے۔

"مطلع خورشید

یہ ادیم السیم ناول مہاراجہ کشن پرشاد حال میں چھپا ہے۔ خورشید آرا بیگم

ایک عالی خاندان شہزادی کے حسن و عشق کا حال اس خوبی سے قلمبند کیا ہے بارک اللہ۔ پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار لکھنوی نے اس کی نظر ثانی کی ہے"

(دبدبۂ آصفی مورخہ ۶ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ)

مذکورہ بیانات سے مہاراجہ کشن پرشاد اور سرشار کے تعلق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی سال (۱۳۱۵ھ) مہاراجہ کشن پرشاد نے نظام الملک آصف جاہ میر محبوب علی خان بہادر کی تقریب سالگرہ کے موقع پر ایک رسالہ دبدبۂ آصفی کے نام سے جاری کیا جس کا نگراں ٹھاکر پرشاد شوق کو کیا اور رسالے کے جملہ حقوق سرشار کے نام محفوظ کیے گئے جیسا کہ سرورق اس عبارت سے ظاہر ہے:

"جملہ حقوق پنڈت رتن ناتھ سرشار محفوظ ہیں"

اسی رسالے دبدبۂ آصفی سے چنچل نار کے قصنیہ کا آغاز ہوتا ہے۔ دبدبۂ آصفی کا پہلا شمارہ ۶ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ کو شائع ہوا تھا جو سرشار کے انتقال ۲۷ جنوری ۱۹۰۲ء کے بعد بھی ۱۳۲۲ھ تک جاری رہا۔

"چنچل نار" کا آغاز دبدبۂ آصفی کے دوسرے شمارے سے ہوا ہے اسی دوسرے شمارے کے صفحہ ۴ پر "چنچل نار" کا یہ اشتہار بھی موجود ہے۔

"چنچل نار"

اس نام کا ایک ناول جو مہاراجہ پیشکار بہادر دام اقبالہٗ نے حال میں تصنیف کیا ہے۔ آج کے پرچہ کے ساتھ شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ امید ہے کہ ناظرین رسالہ پہلے ہی سین سے کوئی رائے اچھی یا بری قائم نہ کر لیں گے ہم یہ بڑا مارل نکلتا ہے جب ناول پورا طبع ہو گا تو کتاب کے قالب میں آئے گا ناول قابل دید ہے۔ انگریزی طرز پر ناول لکھا گیا ہے —— ایڈیٹر۔"

(دبدبۂ آصفی شمارہ ۲، جلد ۱ بابت یکم جمادی الاول ۱۳۱۵ھ)

اشتہار کی یہ عبارت سرشار کے زود قلم کا نتیجہ معلوم ہوتی اسی شمارہ نمبر ۲، جلد ۱ مورخہ یکم جمادی الاول ۱۳۱۵ھ کے صفحہ ۵ سے چنچل نار کی پہلی قسط کا اس طرح آغاز ہوا ہے۔ "چنچل نار —— پہلا چھپا گنگا کا اشنان" اس کے بعد یہ سلسلہ شمارہ نمبر ۶ تک سات قسطوں میں مندرجہ ذیل تفصیل کے مطابق جاری رہا۔

نار

پہلا چھلاوا	گنگا کا اشنان	دبدبہ آصفی شمارہ ۲ جلد ۱ بابت یکم جمادی الاول ۱۳۱۵ھ
دوسرا چھلاوا	آتش زدگی	دبدبہ آصفی شمارہ ۳ " ۱ " یکم جمادی الثانی ۱۳۱۵ھ
تیسرا چھلاوا	پاروتی کی منگنی	" " " ۴ " ۱ " یکم رجب المرجب ۱۳۱۵ھ
چوتھا چھلاوا	خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا	" " " ۵ " ۱ " یکم شعبان المعظم ۱۳۱۵ھ
پانچواں چھلاوا	اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا۔ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں	
چھٹا چھلاوا	پاروتی کا بیاہ	" " " ۶ " ۱ " یکم رمضان المبارک ۱۳۱۵ھ
ساتواں چھلاوا	پتاجی تل کے لڈو کھلانا	

"چنچل نار" کی ان سات اقساط کے آغاز و اختتام پر مصنف کا نام تحریر
ں ہے۔ البتہ فہرست مضامین میں "چنچل نار" کی ابتدائی پانچ قسطوں کے سامنے
ہاراجہ کشن پرشاد کا نام درج ہے۔ البتہ آخری دو قسطوں کے سامنے صرف ایڈیٹر
فریر ہے اور غالباً حقیقت کا یہ اظہار ہی مہاراجہ کشن پرشاد اور سرشار کے درمیان
شیدگی کا سبب بنا جس کے بعد چنچل نار کی اشاعت کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔
د دبدبہ آصفی کے شمارہ ۷ میں کسی پیشگی اطلاع کے بغیر چنچل نار کے بارے میں
اعلان شائع کیا گیا۔

"اعلان چنچل نار

اس مقبول اور عام پسند ناول کے اشتیاق نے ناظرین کو اس قدر والہ بنا رکھا ہے کہ ایک ماہ تک انتظار کرنا ناگوار ہو چلا۔ چنانچہ اکثر احباب اور شائقین نے اس امر کی شکایت کی اور اپنی خواہش ظاہر کی کہ بہت جلد اختتام پاکر کتاب نما قالب میں آئے اور گلہائے معانی تازہ کے اس دلکش باغ کی سیر سے ناظرین حظ وافر اٹھائیں۔ اس لیے اس مہینے سے اس ناول کے کتاب کے قالب میں لانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ جن جن ناظرین اور شائقین کے ہاں رسالہ دبدبہ آصفی پہنچتا ہے۔ ان کی خدمت میں ماہ آئندہ کے رسالہ دبدبہ آصفی کے ساتھ بقیہ حصہ کتاب کے قالب میں بھیج جائے گا۔ لہٰذا اس مہینے میں ناول مذکورہ درج رسالہ نہیں کیا گیا۔ ہم مہاراجہ پیش کار بہادر دام اقبالہ کو بصد ادب مبارکباد دیتے ہیں کہ جناب عالی کا کلام لطافت التیام اتنی جلد مقبول خاص و عام ہوا۔ — ایڈیٹر"

(دبدبہ آصفی شمارہ ۷ جلد ۱ مورخہ یکم شوال المکرم ۱۳۱۵ھ ص ۲)

اس مضحکہ خیز اعلان کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ دبدبہ آصفی کے شمارہ ۶ کے بعد رسالے سے سرشار کا تعلق ختم ہو گیا تھا۔ چنانچہ شمارہ ۷ کے سرورق پر یہ عبارت "جملہ حقوق پنڈت رتن ناتھ سرشار کے نام محفوظ ہیں" شائع نہیں کی گئی البتہ اس شمارے میں سرشار کا ایک ریویو "رقعات شاد" کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔

سرشار کے مہاراجہ کشن پرشاد سے تعلقات خراب ہو جانے کے اسباب کیا رہے ہوں گے یہ ایک الگ بحث کا موضوع ہے۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ کچھ دنوں تعلقات خراب رہنے کے بعد یہ رشتہ پھر استوار ہو گیا تھا اور دبدبہ آصفی شمارہ ۹ جلد ۱ کے سرورق پر پھر یہ عبارت "جملہ حقوق پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار محفوظ ہیں" شائع ہونے لگی تھی لیکن اس بار چنچل نار کی کوئی قسط دبدبہ آصفی میں شائع نہیں ہوئی۔ اور شائع ہوتی بھی کیوں جب کہ اس کے مکمل کتاب کی شکل میں شائع کرنے کا اعلان رسالے میں چھپ چکا تھا۔ لیکن سرشار اور مہاراجہ کے تجدید تعلقات کے بعد ابھی دبدبہ آصفی کے چند شمارے ہی نکلے تھے کہ ان دونوں کے تعلقات پھر خراب ہو گئے اور اس بار ناخوش گواری اس حد تک بڑھی کہ سرشار کو نہ صرف دبدبہ آصفی سے علیحدہ ہونا پڑا بلکہ رسالے میں یہ عبارت بھی شائع کرانی پڑی۔

"رسالہ ہٰذا کی ایڈیٹری سے چونکہ پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار کا تعلق علیحدہ ہو گیا ہے لہٰذا اس کے کل حقوق بنام ہیرالال صاحب نشاط جاری رہیں گے"

(دبدبہ آصفی شمارہ ۸ جلد ۲ بابت ۶ ذیقعدہ ۱۳۱۶ھ)

یہ اشتہار مسلسل کئی شماروں میں شائع ہوتا رہا۔ مذکورہ عبارت سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہر دو بار نہ صرف رسالے کے حقوق سرشار کے نام محفوظ کیے گئے تھے بلکہ سرشار ہی اس کے ایڈیٹر بھی رہے تھے۔ اس کے بعد سرشار کے پھر کبھی مہاراجہ کشن پرشاد سے تعلقات استوار نہ ہو سکے اور نہ ہی سرشار کی زندگی میں "چنچل نار" کی کوئی اور قسط شائع ہو سکی اور نہ ہی مکمل ناول چھپ سکا اور اگر یہ سرشار کے انتقال کے بعد بھی شائع نہ ہوتا تو اچھا ہوتا۔

کیوں کہ اس طرح مہاراجہ کشن پرشاد مزید رسوائی سے بچ جاتے، لیکن انہوں نے سرشار کے انتقال کے ایک سال بعد اس ناول کو لطیف احمد اختر مینائی کی مدد سے مکمل کرا کے ۱۳۲۱ھ میں مطبع شمسی حیدرآباد سے شائع کرا دیا اور عذر و صفائی کے طور پر یہ عبارت اپنی سوانح عمری میں درج کر دی۔

"چنانچہ دبدبہ آصفی میں ایک اردو ناول چھپوانا شروع ہوا جو "چنچل نار" کے نام سے موسوم ہے۔ ابھی یہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ بعض احباب نے اصرار کیا کہ بصورت کتاب ایک ہی وقت میں طبع اور شائع ہو جائے تو مناسب ہے۔ میں نے اس درخواست کو بدل منظور کیا اور فوراً اس کا طبع ہونا موقوف کر دیا۔ جہاں تک کتاب چھپی تھی، وہاں تک سرشار کی نظر سے گزر چکی تھی۔ باقی جو کچھ حصہ رہ گیا تھا وہ ۱۳۲۱ھ میں لطیف احمد اختر مینائی (خلف الرشید امیر مینائی) کی مدد سے پورا ہوا۔ چونکہ سرشار صاحب اور اختر صاحب دونوں ہم وطن اور باعتبار علم و زبان و کلام ایک ہی خاندان کے دو مہرے تھے۔ میں نے مناسب خیال کیا کہ بقیہ انہی کے مشورے سے چھاپا جائے۔" (مہاراجہ کشن پرشاد کی زندگی کے (خود نوشت) حالات ص: ۸۷)

اس بیان کی موجودگی میں کون کہہ سکتا ہے کہ "چنچل نار" کی وہ اقساط جو دبدبہ آصفی میں شائع ہوئی تھیں اور مکمل ناول مہاراجہ کشن پرشاد کی تصنیف نہیں۔ لیکن یہاں سے ہی اختلاف اور انکار کا پہلو بھی برآمد ہوتا ہے۔ مکمل ناول میں دبدبہ آصفی میں شائع ہونے والی اقساط بھی شامل کی گئی ہیں، لیکن ان کی ترتیب و عنوانات بھی بدل دیے گئے ہیں جن کی تفصیل اس طرح ہے

	چنچل نار قسط وار دبدبہ آصفی		چنچل نار مکمل مطبوعہ ناول
۱۔	پہلا چھلاوہ ــــــ گنگا کا اشنان	۱۔	پہلا چھلاوا ــــــ گنگا کا اشنان
۲۔	دوسرا چھلاوا ــــــ آتش زدگی	۲۔	دوسرا چھلاوا ــــــ آتش زدگی
۳۔	تیسرا چھلاوا ــــــ پاروتی کی منگنی	۳۔	تیسرا چھلاوا ــــــ تازہ گرفتار
۴۔	چوتھا چھلاوا ــــــ کتاب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا	۴۔	چوتھا چھلاوا ــــــ منگنی
۵۔	پانچواں چھلاوا ــــــ اسی سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں	۵۔	پانچواں چھلاوا ــــــ باغ کی سیر
۶۔	چھٹا چھلاوا ــــــ پاروتی کا بیاہ	۶۔	چھٹا چھلاوا ــــــ نظارہ
۷۔	ساتواں چھلاوا ــــــ پتاجی تل کے لڈو کھلانا	۷۔	ساتواں چھلاوا ــــــ حسرت بھری نگاہ

مذکورہ اقساط اور ناول کے ابواب میں صرف ترتیب اور عنوانات کا فرق ہی نہیں ہے بلکہ موضوع و مواد اور قصہ کا فرق بھی نمایاں ہے۔ ناول کے پہلے دو باب تو معمولی ترمیم کے ساتھ اسی طرح رکھے گئے ہیں جس طرح وہ دبدبہ آصفی میں شائع ہوئے تھے۔ چوتھے اور پانچویں باب میں کچھ زیادہ ترمیم و تنسیخ سے کام لیا گیا ہے۔ البتہ تیسرا، چھٹا اور ساتواں باب از سرِ نو لکھے گئے ہیں۔ اس طرح اس ترمیم و تنسیخ کی وجہ سے نہ صرف ان کی زبان و بیان میں فرق پیدا ہو گیا ہے بلکہ قصہ کا پورا ڈھانچہ ہی بدل گیا ہے۔

دبدبہ آصفی میں چنچل نار کا موضوع ظاہر اور باطن کا تضاد ہے۔ جو لڑکی بظاہر شوخ و چنچل ہے ضروری نہیں کہ وہ آبرو باختہ بھی ہو۔ اسی طرح وہ لڑکی جو بظاہر حیا پرور اور کم گو ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ عصمت پرور بھی ہو۔ اور اس سلسلے میں جو مواد پیش کیا گیا ہے وہ اپنے موضوع سے پوری طرح مطابقت بھی رکھتا ہے جب کہ مکمل و مطبوعہ ناول کا موضوع ہند مسلم اتحاد، یک جہتی اور دو مختلف ذات کے ہندوؤں میں شادی کے رشتے کو فروغ دینا ہے اور اس سلسلے میں جو مواد پیش کیا گیا ہے وہ طرح اپنے موضوع سے مطابقت نہیں رکھتا ہے۔

موضوع و مواد کے علاوہ ان دونوں کے قصوں میں بھی نمایاں ہے۔ دبدبہ آصفی میں جو قصہ پیش کیا گیا ہے وہ اس طرح ہے کہ ناول کی سترہ سالہ پاروتی اپنی ماں لیلاوتی، باپ پنڈت نینا ناتھ اور سہیلی سندرا اور رگن ونتی کے ساتھ، راہ گیروں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتی۔ گنگا کرنے کے لیے جاتی ہے جہاں ایک حادثہ کے بعد اس کی منگنی پنڈت رام نرائن بارہ سالہ لڑکے سندر لال سے کر دی جاتی ہے۔ عمر کے اس فرق کے باوجود پاروتی اپنے شوہر کی وفادار رہتی ہے۔ وہ دوسرے لوگوں سے چھیڑ چھاڑ کر

ہنس بول لینے کو برا نہیں سمجھتی، لیکن اپنی آبرو نہیں گنواتی جب کہ
، سہیلی سندرا جو بظاہر باحیا اور کم گو ہے اور ہر وقت پاروتی کو روکتی
رہتی ہے ذرا سی ترغیب پر اپنی عصمت گنوا بیٹھتی ہے۔ سسرال میں
پاروتی کا یہی طرزِ عمل ہے وہ شوہر کے بالغ ہونے تک اپنے جذبات کو قابو
رکھنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ مصنف اسی سمت میں قصّے کو آگے بڑھانا
ہتا ہے لیکن یہ ناول نامکمل رہا۔ اگر مکمل ہو جاتا تو اچھے ناولوں میں شمار
تا۔ اس کا پلاٹ بھی نہ زیادہ گھٹا ہوا ہے نہ زیادہ ڈھیلا ڈھالا ہے بلکہ یہ
ر معاشرتی ناول کے پلاٹ کے عین مطابق ہے۔ رفتہ رفتہ قصّے میں دلچسپی
ہوتی ہے اور ارتقا کا احساس بھی موجود ہے۔ واقعات و کردار اور مکالموں
بھی ہم آہنگی موجود ہے ـــــ جب کہ مکمل مطبوعہ ناول میں قصّہ پلاٹ
اکثر نام بدل دیے گئے ہیں اور ماحول کو بھی دکنی بنانے کی کوشش کی گئی
۔ ابتدا قصّہ تو وہی ہے، لیکن یہاں گنگا اشنان کے لیے پاروتی ونڈھیاچل
ی ہے۔ پاروتی کے باپ کا نام دینا ناتھ سے نرین دیال اور پنڈت رام نارائن کا
پنڈت رام لال اور سندرلال کو رام دین کر دیا ہے۔ اس میں چھتری نوجوان چندرسین کو پاروتی
عاشق ہوتے دکھایا ہے۔ پاروتی کی منگنی اگرچہ پہلے ہی رام دین سے ہو چکی تھی
ن اس میں پاروتی اور چندرسین دونوں عشق کی پینگیں بڑھاتے ہوئے نظر
تے ہیں۔ آخر ایک پنڈت کے فتویٰ دینے پر برہمن زادی پاروتی کی شادی چھتری
ندرسین سے ہو جاتی ہے۔

مکمل ناول میں نہ صرف قصّہ، پلاٹ اور کردار کو بدل دیا گیا ہے۔
ہ اودھ اور دکن کے ماحول، فضا اور تہذیب کی بے سلیقہ پیوند کاری نے تضاد
ناہمواری پیدا کر دی ہے جس کی وجہ سے دلچسپی کم اور تاثر مجروح ہو گیا
۔ ناول میں شاد اور اختر مینائیؔ کے اشعار بھی کثرت سے استعمال کیے
ے ہیں۔

اب ذرا کرداروں کے فرق کو ملاحظہ کیجیے۔ مکمل ناول کے ابتدائی
ات ابواب میں کرداروں کی تعداد بھی دبدبۂ آصفی کے مقابلے میں کہیں
یادہ ہے۔ پاروتی کا کم سن شوہر، سندرا، استادجی اور حکیم جی کے کردار مکمل
ول میں نہیں ہیں۔ جب کہ چندرسین، متھرا سنگھ اور کماری کے کرداروں کا
زید اضافہ کیا گیا ہے۔ دبدبۂ آصفی میں ہیروئن پاروتی شوخ چنچل لیکن شوہر
رست اور باوفا لڑکی ہے۔ اس کا کردار سرشار کے ناول عنوان بے تمیزی
من چلی دوشیزہ کا سا ہے۔ جب کہ مکمل ناول میں پاروتی ایک جذباتی، دل پھینک
شق مزاج اور بے وفا لڑکی نظر آتی ہے۔

دبدبۂ آصفی کے مکالموں میں حقیقت کا رنگ زیادہ گہرا ہے۔ طبقاتی
بان، لب و لہجہ، بے ساختگی، بے تکلفی ان کے خاص اوصاف ہیں۔ لیکن مکمل
ول میں مکالمے مصنوعی اور بے محل ہیں جن کی طوالت اور یکسانیت نے قصّہ کو
بے مزا کر دیا ہے۔ مکالموں میں کرداروں کے طبقاتی فرق کو بھی ملحوظ نہیں رکھا گیا
ہے اور آخری حصّہ میں تو مکالموں کی بجائے بیانیہ سے ہی کام لیا گیا ہے۔ مکالموں
کے اس فرق کا اندازہ مندرجہ اقتباسات سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ پہلا اقتباس
دبدبۂ آصفی میں شائع چنچل نار سے لیا گیا ہے۔ ذرا پاروتی اور مٹھائی والے گھبرو
کی بات چیت ملاحظہ کیجیے اور فیصلہ کیجیے کہ اس طرح کے مکالمے کون لکھ سکتا ہے۔
سرشار یا شاد یا پھر اختر مینائیؔ۔

"پاروتی : تو پھر اس سے بڑھ کر میلہ کیا ہوگا۔ تمہارا نام کیا ہے اور تم ہو کون لوگ
گھبرو : ہمارا نام گھبرو ہے اور جات کے ہم باہمن ہیں کان کبج۔
پاروتی : قنوجیا باہمن تو ہم بھی ہیں
گھبرو : (بہت خوش ہو کر) آپ کا نام کیا ہے؟
پاروتی : ہمارا نام سن لیا ہے۔
گھبرو : واہ واہ پھر کیا پوچھنا ہے ـــــ ہم گھبرو۔ تم سن لیا۔ ہم بھی باہمن تم بھی باہمن۔ ہم بھی جوان۔ تم بھی جوان۔ بھڈری کا کہنا تو سچ نکلتا معلوم ہوتا ہے۔
پاروتی : ارے دوانے میں اب تجھے چھوڑتی کب ہوں۔ میں تو تجھے گھنٹہ بھر سے دیکھ رہی تھی۔ ہاں ایک بات ہے کہ بھونری پھیری جائے گی۔ میں کوئی بازاری عورت نہیں ہوں۔ لا برفی تو تول دے۔"
(ماخوذ دبدبۂ آصفی)

مکالموں میں یہ اودھ کی فضا، طبقاتی رنگ، بے ساختگی اور زندگی
کی حرارت کوئی پُر اعن کار ہی بھر سکتا ہے۔ اب ذرا مکمل ناول کا ایک اقتباس
ملاحظہ کیجیے:

"میں (متھرا سنگھ) ہاں یہ تو بتا کہ پنڈت جی کی بیٹی کا نام اور اس کی عمر کیا ہے
کمہاری : پاروتی نام ہے۔ سولہ سترہ برس کا سن ہے
میں : ہم سنتے ہیں کہ وہ بڑی خوب صورت ہے
کمہاری : مہراج اس کی خوب صورتی کا کیا کہنا۔ شہر میں اس کا جواب نہیں ہے۔ لاکھ میں ایک کروڑ میں ایک۔ دیکھنے والے تو یہ کہتے ہیں کہ پنڈت جی کے گھر میں پدماوتی پیدا ہوئی ہے۔" (ماخوذ مکمل ناول چنچل نار ص ۶۹)

مذکورہ مکالموں میں نہ طبقاتی رنگ موجود ہے نہ لب و لہجہ۔ ایسا معلوم
ہوتا ہے جیسے کوئی مہذب شین، قاف سے درست خاتون بات چیت کر رہی ہے۔
زبان و بیان، لب و لہجہ کا یہ فرق وہاں اور واضح ہو گیا ہے جہاں سرشار
کی عبارت میں ترمیم کر کے اُسے اپنا بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ دبدبۂ آصفی
میں چنچل نار کے پہلے باب کا آغاز صبح کے اس منظر سے ہوا ہے:
"چار کا گجر بجا ہی چاہتا ہے، پچھلا پہر، ابھی ہماری دنیا نور سے منوّر

ہونے والی ہے۔ ایک سکوت کا عالم ہے۔ چوطرفہ سناٹا۔ انسان حیوان سب خواب میں۔ جانور اپنے اپنے گھونسلوں میں ڈبکے دبکائے پڑے ہیں۔ سب تو آرام میں ہیں، مگر تین جاگنے والوں کو نیند نہیں۔ ایک تو کلاک گھڑی یہ کھٹ کھٹ میں بدستور معروف ہے۔ دوسرے زاہدانِ شب زندہ دار عشاقِ پاک پروردگار معروفِ تسبیح و تہلیل ہیں۔ بحرِ عرفان میں غرق اپنی کچھ خبر ہی نہیں۔ سالکانِ طریقت گوشہ نشینانِ خمول مست الست ...... بعض بعض گھڑیال نے چار کا گجر کھڑکا اور کلاک نے چار کا عمل بتایا، مرغِ بے ہنگام نے پھر ککڑوں کی بانگ لگائی۔ مؤذن نے مسجد سے "الصلوٰۃ خیرٌ مِنَ النوم" کہہ کر سب کو جگانا شروع کر دیا۔ اور اپنی دل کش اللہ اکبر کی صدا سے توحیدِ باری تعالیٰ اور اس کی عظمت کا ثبوت مخلوق کے دل پر جمانا شروع کیا۔" (ماخوذ چنچل نار دبدبہ آصفی)

اب اسی منظر کو شادیا اختر مینائی کے مکمل ناول چنچل نار میں ملاحظہ کیجیے جنہوں نے سرشار کی عبارت میں ترمیم کرکے اسے ثقیل اور بھونڈا بنا دیا ہے۔ یہاں منظر نگار منظر کو محسوس نہیں کر رہا ہے بلکہ دوسرے کے منظر میں قطع و برید کرکے اُسے اپنا بنانا چاہتا ہے جس سے تصنع ظاہر ہوتا ہے

"پچھلا پہر ہے۔ چار کا گجر بجا ہی چاہتا ہے۔ ابھی ابھی
ہماری دنیا نور سے منور ہونے والی ہے۔ ایک سکوت
کا عالم۔ چوطرفہ سناٹا۔ انسان حیوان سب خواب میں۔
پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں دبکے دبکائے پڑے
ہیں۔ سب تو آرام میں ہیں، مگر تین جاگنے والوں
کو نیند کہاں۔ ایک تو کلاک گھڑی کہ وہ کھٹ کھٹ
میں بدستور مصروف ہے گویا کسی بے چین کا دھڑکتا ہوا دل ہے۔
ایک آن سکون نہیں۔ دوسرے زاہدانِ شب زندہ دار
عشاقِ پاک پروردگار مصروفِ تسبیح و تہلیل ہیں۔ ان
کے جوڑ جوڑ بلکہ روئیں روئیں سے ذکرِ الٰہی کی صدا آ رہی ہے
یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک درخت ہے جس کی ڈالی ڈالی
پتے پتے پر بے شمار چڑیاں بیٹھی ہوئی اپنی اپنی بولیاں بول
رہی ہیں...... گھڑیال نے بعض بعض چار کا گجر بجایا
اور کلاک نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ مرغ سحر نے ککڑوں
کوں کی بانگ لگائی۔ مؤذن نے الصلوٰۃ خیرٌ مِنَ النوم
کہہ کر سب کو جگایا اور اللہ اکبر کی دل کش صدا سے توحید
باری تعالیٰ اور عظمت و کبریائی کا سکہ مخلوق کے دل پر
جمانا شروع کیا۔" (ماخوذ مکمل ناول چنچل نار ص ۱)

اختر مینائی بھی اگرچہ اودھ کے رہنے والے تھے لیکن سرشار جیسی رواں دواں نثر نہیں لکھ سکتے تھے۔ مذکورہ منظر میں معمولی ترمیم ہی نے اس کے حسن اور تاثر کو مجروح کر دیا ہے۔

چنچل نار (دبدبۂ آصفی) میں ایسے بہت سے مخصوص الفاظ محاورے اور ضرب الامثال بھی موجود ہیں جن کا برجستہ استعمال سرشار کی نثر کا نمایاں وصف ہے جیسے پھلتیل، کرتب، کرارے، مڈھ بھیڑ، ریجھنا، تاڑنا، پینترہ، لترہ، کچا چٹھا، گھم گھما، لونڈا، مرغِ بے ہنگام، چاق چوبند، گلخپ، مردوا، دوگال ہنس بولنا، چومکھا لڑنا، سخن مرداں جان دارد، چہ کم نہیں رہ جاتا، رنگ لائی گلہری ایک کر ساتی ایک کر بدھائی۔ جگت لڑنے میں طاق وغیرہ۔ لیکن یہ الفاظ محاورے چنچل نار کے اس حصے میں شاذ و نادر ہی استعمال ہوئے ہیں جنہیں اختر مینائی نے تصنیف کیا ہے۔

چنچل نار (دبدبۂ آصفی) میں کرداروں کے مابین فرق اور بوالہوسوں کا مذاق اُڑانے کے لیے وہی تکنیک اختیار کی گئی ہے جو عام طور پر سرشار اپنے دیگر ناولوں میں استعمال کرتے رہے ہیں۔ سرشار کے ناولوں میں طلب دیابس کے باوجود مقصد کو شدت کے ساتھ پیش کرنے اور حاصل کرنے کی کامیاب تکنیک کا استعمال ہوا ہے۔ یہی خوبی دبدبۂ آصفی کی چنچل نار میں بھی موجود ہے جب کہ مکمل ناول میں کسی خاص تکنیک کا احساس موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ چنچل نار (دبدبۂ آصفی) میں عشق کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ سرشار کے تصورِ عشق سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔ سرشار کے خیال کے مطابق عورت کا مرد کے ساتھ دوگال ہنس بول لینا معیوب نہیں ہے اور اصل عشق میاں اور بیوی کے درمیان ہی ہو سکتا ہے۔ جب کہ مکمل ناول چنچل نار میں عشق کا ایک عامیانہ تصور پیش کیا گیا ہے۔

ان شواہد کی روشنی میں آسانی سے یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ چنچل نار (دبدبۂ آصفی) کس کی تصنیف ہے۔ سرشار کی یا مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اپنی تمام لفاظی اور دعوے کے باوجود مہاراجہ کشن پرشاد نے نہ تو چنچل نار (دبدبۂ آصفی) لکھا ہے اور نہ ہی وہ مکمل ناول چنچل نار لکھا ہے جو ۱۳۲۱ھ میں مطبع شمسی حیدرآباد دکن سے محمد ابراہیم خاں اکبر کے زیرِ اہتمام شائع ہوا تھا اور جو ۲۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد بھی ان امرا میں تھے جو دوسروں کی محنت کو دولت کے زور پر خرید سکتے تھے۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اگر چنچل نار (دبدبۂ آصفی) سرشار کی تصنیف ہے تو مکمل ناول چنچل نار اختر مینائی کی تصنیف ہے اور اس میں کشن پرشاد کا کچھ بھی نہیں ہے۔ اور ان دونوں میں جو فرق ہے وہ وہی فرق ہے جو ایک صاحبِ طرز ادیب اور ناول نگار اور عام نثر نگار میں ہو سکتا ہے۔ اس لیے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ چنچل نار (دبدبۂ آصفی) سرشار کی تصنیف ہے اور اگر ناول مکمل ہو گیا ہوتا تو فسانۂ آزاد کی طرح یہ بھی ناقابلِ فراموش ناول ثابت ہوتا۔

●●

سید امام مرتضیٰ نقوی



قصائدِ ذوق میں علمی و فنّی مصطلحات

ذوق ایک لائقِ ذکر شاعر ہی نہیں بلکہ وہ اپنے دَور کی علمی اور فنی تاریخ بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے قصائد میں جتنی علمی و فنی مصطلحات کو برتا ہے اردو کے کسی دوسرے شاعر نے اتنا نہیں برتا۔ وہ اپنے دَور کے علومِ متداولہ سے بخوبی واقف تھے۔ اس لیے ہر قسم کے علم و فن کو اپنے قصائد میں جگہ دی ہے۔ آج وہ علوم و فنون گرد آلود اور کرم خوردہ کتابوں کے اوراق کے سینوں میں رہ گئے ہیں۔ یہ بھی دُور نہیں کہ کچھ عرصہ بعد یہ ساری کتابیں وقت کے قبرستانوں میں مدفون ہو جائیں۔ اور آنے والی نسلیں ان علوم و فنون سے بالکل ناآشنا ہو جائیں۔ یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ذوق نے کتنے قصیدے کہے۔ البتہ ان کے مطبوعہ قصائد کی تعداد چالیس ہے۔ جن میں سے ۳۵ مکمل ہیں اور ۵ ناتمام۔ ان تمام قصیدوں میں اشعار کی تعداد ۱۷۶۶ ہے۔ یہ قصیدے اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی مدح میں کہے گئے ہیں۔ ایک قصیدہ صوفی بزرگ عاشق نہال چشتی کی تعریف میں ہے۔

ان تمام قصائد میں ذوق نے جو علمی اور فنی مصطلحات استعمال کی ہیں ان کی تعداد حسبِ ذیل ہے:

اسماء و علائم ۱۷۔ مقامات ۳۶۔ کتب ۱۷۔ طبقات و ملل ۱۱۔ علوم و فنون ۲۰۔ ادبیات و علم عروض ۱۴۔ اسلامیات ۵۳۔ تصوف ۱۱۔ رمل ۹۔ فلسفہ ۲۰۔ منطق ۱۶۔ فلکیات ۵۱۔ تعبیرات ۲۶۔ موسیقی ۲۳۔ حلطالی ۱۰۔ آتش بازی ۱۶۔ تلمیحات ۲۲۔ گھوڑے اور ہاتھی سے متعلق ۲۶۔ فن سپہ گری اور اسلحہ ۲۲۔ سامانِ آرائش ۶۔ ملبوسات و زیورات ۹۔ معدنیات ۱۵۔ پھل پھول اور پودے ۲۷۔ پرندے ۱۵۔ تیوہار ۶۔ رسوم ۵۔ عربی صرف و نحو ۷۔ عربی فقرات ۲۹۔ مہینے ۱۰۔ متفرق اصطلاحات ۵۷۔ ذوق علمی و فنی مصطلحات کے امامِ اعظم ہیں[۱]۔ مندرجہ بالا فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کتنی مصطلحات کا اپنے قصیدوں میں استعمال کیا ہے۔ وہ ایک مصرع میں پورا علمی اور فنی موضوع قلمبند کر دیتے ہیں۔ ان کے قصائد شاعری کا نمونہ کم اور متداولہ علوم و فنون کی اصطلاحات کی فہرست زیادہ ہیں۔"[۲] ان پر فارسی شاعر خاقانی کا بہت بڑا اثر ہے۔ جب ذوق نے یہ شعر کہا تھا: ؎

جب کہ سرطان و اسد مہر کا مسکن ٹھہرا
آب و ایلہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

تو اس پر بادشاہ نے ان کو خاقانیٔ ہند کا خطاب دیا۔[۳] "مگر خاقانی اور ذوق میں فرق یہ ہے کہ مصطلحات و علمیت نے خاقانی کی شاعری کا سہارا لیا اور ذوق کی شاعری نے مصطلحات و علمیت کا۔ ایک کے یہاں شعریت علمیت کے تابع رہی اور دوسرے کے یہاں حاوی۔"[۴]

ذوق نے اپنے قصیدوں میں جگہ جگہ مختلف اشخاص کے ناموں کا حوالہ دیا ہے۔ ان میں بزرگانِ دین بھی ہیں۔ والیٔ حکومت بھی ہیں۔ عربی فارسی کے شعرا بھی ہیں۔ ماہرینِ فنون بھی ہیں۔ مثلاً ماربد جو خسرو پرویز کا مصاحب اور فنِ موسیقی کا استاد تھا۔ اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں: ؎

غلغلہ اندر محفل مستاں وجد میں خیل بادہ پرستاں
نغمہ طرازاں باربد آسا چنگ نوازاں شکل نگینہ

صحابیٔ رسولؐ دحیہ کلبی جو جبریل کی شکل میں وحی لے کر آتے تھے۔ ان کی طرف

[۱]، [۲] ڈاکٹر محمود الٰہی: اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ ص ۳۲۴
[۳] محمد حسین آزاد: آبِ حیات ص: ۵۴۲
[۴] ڈاکٹر محمود الٰہی: اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ ص ۲۳۶

گزری، امروہہ (یوپی)

ذوق اشارہ کرتے ہیں: ؎

قابل انساں کی صحبت کے ہے انساں نہ ملک
بن گیا پیشِ نبی صورتِ دحیہ جبریل

لبید و عمعق عرب کے دو شاعر تھے۔ ان کو کس طرح شعر میں پیش کیا ہے ؎

سُن کے یہ میں نے لکھا مدح میں اس کی مطلع
جس پہ احسنت کہیں مجھ کو لبید و عمعق

انہوں نے بعض خصوصیات کی بنا پر متعدد مقامات کا ذکر بھی اپنے شعروں میں کیا ہے جو کسی خاص وصف کی بنا پر مشہور رہے ہیں۔ مثلاً تتار اور ختن مشک کی وجہ سے مشہور رہیں۔ عدن موتیوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ یونان میں حکیم پیدا ہوئے۔ حلب کی شہرت آئینوں کی وجہ سے ہے۔ ؎

فکرِ فرنگ و دانشِ یونان، آگے ترے ہے طفلِ دبستاں
تو ہے وہ باہر تو ہے وہ ماہر تو ہے وہ بینا تو ہے وہ دانا

سنوارتی ہے جو شام اپنی زلفِ مشکیں کو
سوار مشکِ ختن پر ہے لاکھ آہوگیر

ذوق نے اپنے شعروں میں طب، منطق، فلسفہ اور دیگر علوم کی کتابوں کے بھی حوالے دیے ہیں۔ مثلاً شاہجہاں کے زمانے میں چندر بھان ایک شاعر تھا جس کا تخلص برہمن تھا۔ اس کے فارسی خطوط کے مجموعہ کا نام "انشائے برہمن" ہے۔ ذوق کے یہاں اس کا تصرف دیکھیے ؎

تیرے حکمِ شرع سے جب کفر دریا بُرد ہو
غرق ہووے تا بہ انشائے برہمن آب میں

"شمس بازغہ" فلسفہ کی کتاب ہے اور بدرِ منیر میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" کی طرف اشارہ ہے جو عشقیہ مثنوی ہے۔

ہوا ہے مدرسہ یہ بزم گاہِ عیش و نشاط
کہ شمس بازغہ کی جا پڑھیں ہیں بدرِ منیر

"مجسطی" حکیم اقلیدس کی علم ریاضی کی کتاب ہے اور "اشاراتِ شفا" بو علی سینا کی علم حکمت کی کتاب ہے۔ دونوں کا ذکر ایک شعر میں کرتے ہیں۔

کبھی کرتا تھا مجسطی پہ حواشی تحریر
کبھی کرتا تھا اشاراتِ شفا کی صحت

ذوق علم عروض کے استاد تھے۔ اس فن کی باریکیوں سے وہ خوب واقف تھے۔ یہ زمانہ وہ تھا جب ہر شاعر کو علم عروض سیکھنا ضروری تھا۔ بغیر اس کو حاصل کیے دستارِ فضیلت کا ملنا ناممکن تھا۔ ان کے ہم عصر غالب اور مومن اس فن میں یگانۂ روزگار تھے۔ ذوق نے جگہ جگہ اس فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ اوزان، بحر، حقیقت و مجاز، زحاف، ردیف، قافیہ، مقفیٰ و مسجع وغیرہ اصطلاحات انہوں نے استعمال کی ہیں۔ مثلاً زحاف رکن شعر میں کسی حرف کے گر جانے یا بڑھ جانے کو کہتے ہیں۔ ذوق نے اپنے شعر میں یہ لفظ باندھا ہے ؎

اور زحافوں کا عمل لے کر ردیف و قافیہ
گہ عرب گاہے عجم میں ان کو دے موزوں مقام
تا کہ علم شعر ہو داخل بہ اوزانِ بحور
تا افاعیل و تفاعیل اس سے پائیں انتظام

ذوق نے قصائد میں غالب کی طرح مسائلِ تصوف تو نہیں بیان کیے نہ انہیں ولی ہونے کا دعویٰ تھا البتہ اس علم سے گہری واقفیت ضرور رکھتی۔ مولانا آزاد نے تو اپنی شاگردی کا حق اس طرح ادا کیا ہے "جب تقریر کرتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ شیخ شبلی ہیں یا بایزید بسطامی بول رہے ہیں۔"[1] یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تصوف کی اصطلاحات' ابدال، اوتاد، ارادت' پیر' سالک، طریقت، کرامت، کشف، مجذوب، سجادہ نشین وغیرہ الفاظ کو قصیدوں میں داخل کیا ہے ؎

تا کہ سالک مسلکِ تقویٰ میں کرتا ہو سلوک
تا رہے مجذوب مست بادۂ غفلت مدام

صوفیوں کے نزدیک ابدال ایک گروہ ہے جس سے دنیا کبھی خالی نہیں رہتی اور اوتاد ان کے نزدیک اولیا کی ایک ایسی جماعت ہے جس کی تعداد ۳۵۶ ہوتی ہے۔ جو ہمیشہ دنیا میں اپنی خدمت پر مامور رہا کرتی ہے۔ ذوق ان دونوں جماعتوں کا ذکر کرتے ہیں ؎

تا وجودِ پاک سے ابدال اور اوتاد کے
انتظامِ اہلِ عالم ہووے عالم میں تمام

ذوق اس دور کی پیداوار ہیں جب فلسفہ، منطق، نجوم، طب خاص طور پر سیکھے جاتے تھے۔ ہر پڑھا لکھا آدمی اس میں شُد بُد رکھتا تھا۔ ذوق نے بھی زمانے کے رواج کے مطابق یہ علوم حاصل کیے۔ ان کے قصائد میں فلسفہ، کلام، منطق کی طرف جگہ جگہ اشارے ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اشعار میں ان علوم کے رموز کو مختلف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ مثلاً فلسفہ کی اصطلاح اشراق اور مشائیوں ہے۔ اشراق فلسفہ کا ایسا گروہ ہے جو مکاشفہ کے ذریعے تعلیم دیتا تھا۔ اور مشائیوں حکیموں کا وہ گروہ ہے جو حقائق اشیاء کا ادراک بغیر دلیل کے نہیں کر سکتا۔ اور ان حقائق کے دریافت کرنے کے لیے ملک در ملک پھرا کرتا تھا۔ اور ایک دوسرے کے پاس جا کر علم حاصل کرتا تھا۔ ذوق نے دونوں حلقۂ فکر کے گروہ کو لے کر ایک شعر میں پیش کیا ہے ؎

---

[1] محمد حسین آزاد: آبِ حیات ص ۵۴۹

کبھی مشائیوں سے کرتا تھا میں پیش روی
کبھی لے جاتا تھا اشراقیوں پر میں سبقت

انہوں نے اکثر وہ عقول یا عقول عشرہ کی اصطلاح کو بھی شعروں میں برتا ہے۔ یہ خالص فلسفہ کی اصطلاح ہے۔ حکماء کے نزدیک دس فرشتے ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ خدا نے اول ایک فرشتے کو مخلوق کیا۔ اس کے بعد ایک اور فرشتہ اور آسمان پیدا کیا۔ یہاں تک کہ ایک فرشتہ اور ایک ایک آسمان پیدا کر کے نو آسمان اور دس فرشتے پیدا کر دیے۔ دسویں فرشتے نے خدائے تعالیٰ کے حکم سے تمام جہان کو پیدا کیا۔ اب ذوق کہتے ہیں:

پُرفروغ اک جلوۂ انوارِ باطن سے ترے
دہ عقول و نہ سپہر و ہفت اختر شش جہت

خلا، فلسفہ کی اصطلاح ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہر شے جس پر عموماً خالی ہونے کا اطلاق کیا جاتا ہے ہوا سے بھری ہوئی ہے۔ ذوق نے کس طرح اپنی علمیت کا اظہار کیا ہے ؎

ہے ترے عہد میں فتنہ سے زمانہ خالی
فیلسوفی ہے حکیموں کی خلا کہنا محال

فلسفہ کی طرح منطق میں بھی انہوں نے اپنی طبیعت کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں ان کا مقصد محض اپنی علمیت کا اظہار کرنا ہے جس کی وجہ سے شعریت کم اور علمیت غالب نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے اصطلاحات کی فہرست بنا کر ان کو شعر کا جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے منطق کی اصطلاحات، اعراض، جوہر، تصدیق، علت، معلول، تصور، صغریٰ، کبریٰ، کلیات خمسہ، نتیجہ و شکل، مسائل بدیہی و نظری، علم حصولی، علم حضوری وغیرہ کو استعمال کیا ہے۔
اعراض عرض کی جمع ہے۔ عرض اس شے کو کہتے ہیں جو خود قائم نہ ہو بلکہ دوسری چیزوں کی وجہ سے عالم وجود میں آئے۔ جوہر اس کو کہتے ہیں جو اپنی ذات سے قائم ہو۔ اب ذوق کہتے ہیں ؎

کبھی میں کرتا تھا اعراض میں جوہر قائم
کبھی میں کرتا تھا معلول سے ثابت علت

صغریٰ و کبریٰ منطق کی شکلوں کے نام ہیں۔ شکل کے پہلے قضیے کو صغریٰ اور دوسرے قضیے کو کبریٰ کہتے ہیں۔

اگر پیالہ ہے صغریٰ تو ہے سبو کبریٰ
نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

مسائل نظری وہ مسائل ہیں جن میں دلیل کی حاجت ہو اور مسائل بدیہی وہ مسائل ہیں جن میں دلیل کی حاجت نہ ہو۔ ؎

جو مسائل نظری تھے وہ بدیہی تھے تمام
عقل کو تجربے کی اتنی ہوئی تھی کثرت

طب سے ذوق کو خاص شغف تھا۔ دوسرے یہ کہ ان کے خاندان کے لوگ جراحی کا پیشہ بھی کرتے تھے[1] یہاں یہ بحث نہیں کہ وہ سلمانی تھے یا کسی اور خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کو طب سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ بقول آزاد: "طب کو چند روز کیا"[2] یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے قصیدوں میں کثرت سے طب کی اصطلاحات کو جگہ جگہ برتا ہے۔ شہزادہ ابوظفر جب ولی عہد تھے تو ان کی بیماری سے شفا پانے کے بعد بادشاہ نے جشن غسلِ صحت ترتیب دیا تو ذوق نے قصیدہ لکھا اور اس میں طب کی اصطلاحات کو بے تکان استعمال کیا، جس میں بیماریوں کے نام، دواؤں کے نام اور ان کی تاثیر کی طرف اشارے کیے ہیں۔ قصیدہ کیا ہے۔ پورا شفاخانہ ہے جس سے معجونوں اور سفوف کی بُو آ رہی ہے۔

واہ وا کیا معتدل ہے باغِ عالم میں ہوا
مثلِ نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا
ہضم کامل اس قدر معدہ نے پہنچایا بہم
جید الکیموس ہے جو حلق سے اتری غذا

جید الکیموس جلد ہضم ہونے والی اور جزوِ بدن ہونے والی دوا کو کہتے ہیں۔

دھووے اس عہد میں گر زخم کو مے سے جرّاح
تو رہے حشر تلک سوزش و درد و آماس

زخم، جراح، سوزش، درد، آماس طبی اصطلاحات ہیں آماس ورم کو کہتے ہیں۔

دلِ افگار کا ہے سودۂ الماس علاج
سنگ ہے سنگِ جراحت بہ سرِ زخمِ جہاں

سنگِ جراحت وہ پتھر ہے جس کے سفوف کے چھڑکنے سے زخم سے بہتا ہوا خون بند ہو جاتا ہے۔
ذوق کو علم نجوم کا شوق تھا۔ اس میں انہوں نے دستگاہ پیدا کی۔ محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ نجوم کا ایک صاحبِ کمال پنجپورے میں رہتا تھا اس سے نجوم کے مسائل حاصل کیا کرتے تھے۔[3] یہی وجہ ہے کہ انہوں نے فلکیات کی ۵۱ اصطلاحات جگہ جگہ استعمال کی ہیں۔ شاید ہی کوئی قصیدہ

---

[1] لالہ سری رام: خمخانۂ جاوید ص: ۲۶۹
[2] [3] محمد حسین آزاد: آبِ حیات ص: ۵۵۰

ایسا ہو جہاں کسی ستارے یا برج کا ذکر نہ ہو۔ ماہرینِ نجوم کے نزدیک چونکہ ستاروں کو کسی نہ کسی منصب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس لیے ذوقؔ نے اپنے قصائد میں اس سے استفادہ کیا ہے ؎

سر پر آرائے گردوں جب تلک سلطان خاور ہو
قمر دستورِ اعظم، صدرِ اعلیٰ سعدِ اکبر ہو
عطارد مہرِ منشی زہرہ ناظرِ آسماں پر ہو
زحل میرِ عمارت، ترکِ گردوں میرِ لشکر ہو
سر ہفت آسماں جب تک کہ دورِ ہفت اختر ہو
الٰہی یہ بہادر شاہ، شاہِ ہفت کشور ہو

سعد اکبر مشتری ستارے کو کہتے ہیں، عطارد منشی فلک ہے ترکِ گردوں مریخ ستارے کو کہا جاتا ہے

سبعہ سیارہ ہوں سائر سیرِ ہفت آسماں
ہو ثوابت کا سپہرِ ہشتمیں پر اژدہام

سبعہ سیارے قمر، عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری اور زحل کو کہتے ہیں۔

برج جو اژدر ہوئے قندیلِ شب زیرِ فلک
برج تھے جتنے فلک پر سب کو روشن کر دیا

برج فلک بارہ ہیں یعنی سرطان، عقرب، حوت، حمل، قوس، اسد، جوزا، میزان، دلو، ثور، سنبلہ، جدی۔

تیرا ہاتھی ہے فلک کا کہکشاں ہے خرطوم
کان دو لزن مہ و خور، دُم سے ذنب اس سے راس

ذنب الفرس ایک ستارے کا نام ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی شکل اژدہے کی ہے اس کی ایک جانب کو راس اور دوسری جانب کو ذنب کہتے ہیں۔

علم نجوم کے ساتھ ساتھ ذوقؔ علم رمل سے بھی واقف تھے۔ اس کی مخصوص اصطلاحات عقلہ و انکیس۔ داخل خارج۔ دعوت۔ زائچہ۔ زکواۃ۔ عزیمت۔ قرعہ ڈالنا۔ نقطۂ رمّال کو اپنے قصائد میں پیش کیا ہے۔ مثلاً

کبھی افسوں و عزیمت کبھی تعویذ و طلسم
کبھی تجویز زکواۃ اور کبھی قصدِ دعوت

عزیمت اس عمل کو کہتے ہیں جس سے مؤکلوں کو حاضرات میں طلب کیا جاتا ہے۔ زکواۃ کسی اسم یا دعا کے معینہ تعداد میں ان قیود کے ساتھ پڑھنے کو کہتے ہیں جو عاملوں نے مقرر کیے ہیں۔ دعوت کسی عمل کو تعداد معینہ کے مطابق پڑھنے کو کہتے ہیں۔

تا زحل کے ساتھ شکلِ عقلہ و انکیس کر
زائچہ میں دیتے ہیں صاحبِ رمل نسبت ملام

عقلہ و انکیس رمل کی شکلوں کے نام ہیں۔ زائچہ رمل کی ان شکلوں کو کہتے ہیں جو رمّال قرعہ ڈال کر لکھتے ہیں۔

ذوقؔ کو ایک زمانے میں موسیقی کا بھی شوق ہوا۔ اور کچھ حاصل بھی کیا[1] مگر جب خاندیس سے ایک گویا آیا تو اس کی ملاقات کے بعد موسیقی سیکھنے کا خیال ترک کر دیا پھر بھی اتنے دنوں میں اُنہوں نے جو کچھ حاصل کیا، اس سے عملاً اتنا فائدہ نہ پہنچا ہو جتنا علمی اور معلوماتی طور پر پہنچا۔ اس شعبہ کے رموز و نکات سے اُنہوں نے آگہی حاصل کی اور اپنے شعروں میں اس سے استفادہ کیا۔ مثلاً:

ماہر موسیقی ایسا کہ ادا کرتا تھا
کبھی میں بارہ مقام اور کبھی چاروں مت

اہلِ فارس کی موسیقی میں بارہ مقام بنائے گئے ہیں ۱۔ راست ۲۔ اسفہان ۳۔ عراق ۴۔ کوچک ۵۔ بزرگ ۶۔ حجاز ۷۔ بوسلیک ۸۔ عشاق ۹۔ حسینی ۱۰۔ زنگولہ ۱۱۔ نوا ۱۲۔ رہاوی۔

اہلِ ہند کی موسیقی میں چار مت مانے گئے ہیں:
۱۔ سمیر مت ۲۔ بھرت مت ۳۔ ہنومان مت ۴۔ کلناتھ مت۔

لو گے جس ساز خدا ساز کو آغوش میں آج
تار چھیڑو گے کھرج کا تو سنو گے پنچم

کھرج ایک سُر کا نام ہے اور پنچم ایک راگنی کا نام ہے

لے کے انگڑائی جہیں سننے لگی رام کلی
اٹھی ملتی ہوئی آنکھوں کو کہیں اپنی للت

رام کلی اور للت صبح کے وقت کی راگنیوں کے نام ہیں:

زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر
عیاں ہو نغمہ سے تحریر نغمہ جائے صریر

تحریر نغمہ کی ایک قسم ہے جو خوشی میں گایا جاتا ہے۔ ذوقؔ کے زمانے میں خطاطی کا عام رواج تھا۔ ہر شخص جو علم حاصل کرتا تھا اس کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ خطاطی بھی سیکھے۔ یہ اس زمانے کے معاشرے کا دستور تھا۔ ذوقؔ بھی اپنی طالب علمی کے زمانے میں اس فن سے بہرہ ور ہوئے ان کے اشعار میں اس فن کی مثالیں مل جاتی ہیں مثلاً

---

[1] محمد حسین آزاد: آبِ حیات ص: ۵۴۹

جو سیلِ کحلِ بصارت ہو کلکِ خطِ غبار
تو چشمِ دائرۂ عین بھی ہو چشمِ بصیر

خطِ غبار اس خط کا نام ہے جس میں کسی لفظ کی حد بندی کر کے اس کے اندر بہت زیادہ باریک عبارت یا نقطے بنا دیے جاتے ہیں۔ چشم کسی لفظ کے حلقہ کو کہتے ہیں:

جو لکھنے بیٹھا میں ساحِق کا وصف آرائش
تو نکلا خامہ سے جو حرف تھا خطِ گلزار

خطِ گلزار اس طرزِ تحریر کو کہتے ہیں جس میں پھول پتے بنائے جاتے ہیں۔ چونکہ ذوق دربار سے وابستہ رہے اور درباروں میں جشن منائے جاتے تھے۔ آرائش و زیبائش ہوتی تھی، آتش بازی چھوٹتی تھی تو ذوق بھی ان سرگرمیوں سے کیسے الگ تھلگ رہ سکتے تھے۔ آتش بازی کو جس شوق و ذوق اور انہماک سے بنایا جاتا تھا اس کے تذکرے لوگوں کی زبانوں پر رہتے تھے۔ ذوق نے بھی یہ چرچے سُنے، ان چیزوں کو دیکھا جو ان کے سامنے تیار ہو کر آتی تھیں اور داد و تحسین حاصل کرتی تھیں۔ ذوق کے قصائد میں آتش بازی کی اصطلاحات بھی ملتی ہیں۔ مثلاً:

پھولیں کیونکر نہ چمک کر گلِ آتش بازی
شاخ تھی گل کی قلم بن گئی شورے کی قلم

شورے کی قلم ایک قسم کا کھار ہوتا ہے جو آتش بازی بنانے کے کام آتا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف آتش بازیوں کے نام انار، برج، پھلی، ہاد رنجیج، پٹاخے، گھن چکر، مور، مہتاب، ہوائی ان کے اشعار میں ملتے ہیں۔

ہوائی کبھی تھی جا کر شہابِ ثاقب سے
کہ تو زیادہ ہے یا میں فزوں ہوں آتش بار

اسی آرائش و زیبائش کے سلسلے میں ان چراغوں کا بھی ذکر ملتا ہے، جن سے اس زمانے میں درباروں اور محلوں میں روشنی کی جاتی تھی مثلاً فانوسِ خیال، قندیل، فانوسِ شیشہ، کنول وغیرہ۔

بزمِ تصویرات فانوسِ خیالی کی طرح
حلقۂ رقاصگاں ہے زیرِ گردوں جابجا

فانوسِ خیالی اس شمع کو کہتے ہیں جس کے چاروں طرف کاغذ کی تصویر کسی طرح کاٹ کر کسی چیز پر چپکا کر وصل کرتے ہیں اور اس چیز کو گردش کر دیتے ہیں۔

ذوق نے جو نکہ بادشاہ کی شان میں قصیدے لکھے ہیں اس لیے اس کے گھوڑے اور ہاتھی کی تعریف بھی ضروری تھی۔ انہوں نے گھوڑوں کی قسمیں ابلق، ادہم، اشہب، توسن، چھلاوہ، خنگ، رخش، سمند، فرس، گلگوں، سب ہی کو اپنے قصیدوں میں جگہ دی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی مختلف چالیں میٹھا پوئیہ، شاہ گام، اڑان، ڈکی، ایبیہ، ڈپٹ اور سرپٹ کو بھی نظم کیا ہے۔

گاہ سرپٹ گہ اُڑان اور گاہ میٹھا پوئیہ
گاہ ڈکی ایبیہ اور گاہ جائے شاہ گام

سرپٹ، اڑان اور شاہ گام گھوڑے کی تیز چال کو کہتے ہیں۔ میٹھا پوئیہ اس چال کو کہتے ہیں جس میں چلتے وقت پیر الگ الگ نہیں اٹھتے بلکہ اگلے دونوں پیر ایک ساتھ اور پچھلے دونوں ایک ساتھ اٹھتے ہیں۔ یہ ہلکی چال ہوتی ہے۔ ڈکی ایبیہ گھوڑے کے اچھل کر دکر چلنے کو کہا جاتا ہے۔

کیا برش قلم واں دکھلائے شہسواری
جب توسنِ تصور کھاتا سکندری ہو

سکندری گھوڑے کے ٹھوکر کھانے کو کہتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے ہاتھی سے متعلق الفاظ بھی لکھے ہیں جیسے فرطوم، حسنک، ہودج، زنجیر، فیل، عماری، کجک وغیرہ۔

نہیں بے قیدِ علائق کسی عالم میں بزرگ
رسمِ تحریر میں بھی چھوٹے نہ زنجیر سے فیل

مغلوں کے زمانے کے دفاتر میں فیل کو زنجیر سے وابستہ کرتے ہوئے لکھا جاتا ہے۔

ذوق نے فنِ سپہ گری اور اسلحہ کا ذکر بھی جگہ جگہ کیا ہے مثلاً بیکاں، تفنگ، تیغ، جوشن، جوہر، چار آئینہ، چماق، چوزنگ، زاغ کماں، خنجر، خدنگ، مندیل وغیرہ۔

گر عدو سدِ سکندر کو کرے چار آئینہ
آگے تیری تیغ کے وصلی ہے پر کاغذ ہے خام

چار آئینہ ایک قسم کے زرہ بکتر کو کہتے ہیں

حاسد و غماز و عدو ے سرکش
زیرِ شمشیرِ غضب تیرے ہوں چاروں چوزنگ

چوزنگ تلوار کے اس ہاتھ کو کہتے ہیں جس سے چار ٹکڑے ہو جائیں۔ کہیں کہیں انہوں نے شطرنج اور گنجفہ کھیلوں کی اصطلاحات بھی پیش کر کے موقع سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مثلاً:

کرتا ادنیٰ کو جو اعلیٰ نہ ترا منصوبہ
پاتا شطرنج میں فرزین کا نہ رتبہ بیدق

فرزین شطرنج کا وہ مہرہ جو وزیر کے رتبے کا ہوتا ہے بیدق شطرنج کے پیادے کو کہتے ہیں۔

ذوق نے کبوتر بازوں کی اصطلاحیں تیرایا، زفیل، گرہ باز وغیرہ بھی

استعمال کی ہیں :

ہے خدنگ تیر تیرا یا ہوا پر ہے عقاب
دم بدم دے ہے قضا کا اُڑ کے اعدا کو پیام

تیرلاّس کبوتر کو کہتے ہیں جس کے کُل جسم کا رنگ علاوہ سفید کے کسی اور قسم کا ہو اور دُم سفید ہو۔

تعویز نویسوں کی اصطلاحات بھی ان کے اشعار میں ملتی ہیں مثلاً :

بنا ہے نقش شفا خانۂ ہزار شفا
ہر ایک خانۂ تعویذ صاحبِ تکسیر

تکسیر کسی اسم کے عدد کو تعویذ کے خانوں میں اس طرح لکھنے کو کہتے ہیں کہ جس طرف سے گنو شمار میں برابر آترے ۔

ذوقؔ نے اپنے قصائد میں بعض تعبیرات سے بھی استفادہ کیا ہے مثلاً عنقا ، ہما ، آبِ بقا ، قاف تا قاف ، کتاں ، ققنس ، ہاروت ماروت ماہیِ زمین ، گاوِ گردوں وغیرہ ۔

طرزِ نالہ مجھ سے سیکھیں تو جلا دیں دشت میں
صورتِ ققنس وار آوازِ جرس کی پتلیاں

ققنس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ایک خوش آواز پرندہ ہے ، جس کی زنگارنگ آواز سے حکیموں نے موسیقی کا علم ایجاد کیا ہے ۔ کہتے ہیں کہ اس کی مادہ نہیں ہوتی۔ جب یہ پرندہ بوڑھا ہو جاتا ہے تو لکڑیاں جمع کر کے ڈھیر پر جا بیٹھتا ہے اور اپنی چونچ جس میں بہت سے سوراخ ہوتے ہیں آوازیں نکالنے لگتا ہے ، جب ایک سوراخ سے دیپک راگ نکلتا ہے تو وہ اس وقت اس سوراخ پر زیادہ زور دیتا ہے یہاں تک کہ دیپک راگ کی تاثیر سے ان لکڑیوں میں آگ لگ جاتی ہے اور ققنس اس آگ میں جل بھن کر راکھ ہو جاتا ہے ۔ جب بارش ہوتی ہے اور اس راکھ پر پانی برس جاتا ہے تو پھر اس راکھ سے خود بخود ایک انڈا پیدا ہوتا ہے۔ اس انڈے سے دوسرا ققنس وجود میں آتا ہے ۔

ذوقؔ نے قرآن شریف کی آیات اور احادیث سے بھی فائدہ اٹھایا ہے چونکہ ذوقؔ عربی داں تھے ۔ قرآن و حدیث پر ان کی نظر تھی ۔ اس لیے ناممکن تھا کہ جہاں اور علوم کا ذکر انہوں نے اپنے قصائد میں کیا ہے وہاں قرآن شریف اور حدیث کے حوالے وہ نہ دیتے ۔ ان کا ایک ایک فقرہ کسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے مثلاً :

اَتْمَمْتُ علیکم نعمت ۔ اس آیت میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ جب رسول اللہؐ حجۃ الوداع کے بعد مکہ سے مدینہ تشریف لا رہے تھے تو آپ نے غدیرِ خم کے مقام پر مجمع کو جمع کیا اور ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور خدا کا حکم سنایا : " اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ "، یعنی آج کے دن تمہارے دین کو پورا کیا اور تم پر اپنی نعمتوں کو تمام کیا اور تمہارے دین اسلام سے راضی و خوشنود ہوا ۔ اب ذوقؔ کے یہاں اس کا تصرف دیکھیے ۔

مصحف رخ ترا اے سایۂ ربّ العزّت
کھول دے معنیِ اَتْمَمْتُ علیکم نعمت

ایک جگہ حدیث کی طرف اشارہ ہے :

تیرا دل منفادم ایقان و معرفت
آگاہ رمز کنجِ کشف و سرِّ من عرف

حدیث ہے : مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ
یعنی جس نے اپنے آپ کو پہچانا ، اس نے خدا کو پہچانا ۔

ذوقؔ اپنے وقت کے جیّد عالم تھے ۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا ۔ انہوں نے اپنے عہد کے متداولہ علوم کی سیر کی تھی وہ جس معاشرے میں رہتے تھے ، جو اس کی تہذیبی قدریں تھیں ، اس کا انہیں احساس تھا۔ وہ علمی ، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے ۔ اس لیے اپنے دور کی علمی و ثقافتی تہذیب کو اپنے قصیدوں میں سمو دیا ہے۔ ان کے قصائد اس دور کے الفاظ اور مصطلحات کا ایک بیش قیمت خزانہ ہیں۔ علمی و ثقافتی تاریخ لکھنے والے کے لیے ان کے قصائد بڑے معاون ہو سکتے ہیں ۔ ●●

بقیہ : نئی کتابیں

اور لفظوں کی) کھلتی ہے ۔ یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ لفظوں کا وہ خفت و خواری کا باعث ہوتا اور ہو سکتا ہے

اس منظر نامہ کا ایک وصف اور بھی ہے : یہ کہ موصوف نے انتخاب میں شامل غزلوں کے مطالعہ و تجزیے سے غزل اور نئی غزل کے خدوخال متعین کرنے کے بجائے عام طور پر متکررہ رجحانات کو مقدم خیال کیا اور انہیں کے مطابق انتخاب میں شامل کلام کو پرکھنے کی سعی کی ہے ۔ مثال کے طور پر احباب کے جو شعر نقل کیے ہیں وہ متن سے بے جوڑ ہیں ۔ اپنے مقدمہ میں مؤلف نے سائبرِ سخن پر خاصی توجہ صرف کی ہے ، جن کا انتخاب میں شامل کلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نقائص نثر پر البتہ توجہ کی ضرورت تھی ۔ مثال کے طور پر مؤلف کا صرف ایک جملہ پیش ہے : " آزادی کے بعد دہلی کی اردو غزل نے زندگی کا لمحہ بہ لمحہ ساتھ دیا ہے اور اس نے طاقت حاصل کر کے اس کو با معنی اور ہر وقت پر وقار بنانے میں تعاون دیا ہے جس کا ثبوت آزادی کے بعد دہلی کی اردو غزل ہے "

مقدمہ کا ایک وصف " اور بھی لائقِ توجہ ہے ۔ اوقاف و علامات کی عدم پابندی اور ضمائر کے بے دریغ استعمال سے نثر میں شعر جیسا حسن پیدا ہو گیا ہے ۔

[illegible]

ج نرائن راز

فقیر موہن سیناپتی

ساہتیہ اکادمی نے اپنی سیریز "ہندوستانی ادب کے معمار" کے تحت مختلف علاقائی زبانوں کے عہد آفریں شاعروں اور ادیبوں کی حیات و خدمات پر مبنی قابلِ قدر کتابیں شائع کی ہیں۔ جذباتی ہم آہنگی کے پیشِ نظر مختلف علاقائی زبانوں کے عظیم مصنفین اور شعراء کو دوسری زبانوں میں متعارف کرانا ایک احسن خدمت ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں............ مضمون: "فقیر موہن سیناپتی" اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ یہ ساہتیہ اکادمی کی شائع کردہ کتاب "فقیر موہن سیناپتی" از مایادھر مان سنہا سے ماخوذ ہے۔ فقیر موہن سیناپتی اُڑیہ زبان کا عہد آفریں شاعر اور مصنف تھا۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ اس کی حیات و خدمات کی جانکاری ہمارے قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگی۔ ہم اپنے مصنفین کی توجہ چاہتے ہیں۔ ان سے اس سلسلے کے مضمون بھیجنے کی درخواست ہے۔ تکرار سے بچنے کے لیے مناسب ہوگا کہ مضمون نگار حضرات اپنے موضوع سے ہمیں پہلے مطلع فرمادیں۔ نئے سلسلے کا یہ مضمون آپ کو کیسا لگا۔ اس بارے میں ہمیں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔ (ادارہ)

آزمائش میں ڈال کر وقت کی کٹھالی کبھی تو شخص کی ہڈیاں تک جلادیتی ہے اور ایک مشتِ خاک کی طرح ایسے اُڑادیتی ہے کہ نام، نشان تک باقی نہیں رہتا۔ اور کبھی کایا کو کُندن اور کُندن بناتی اور ایسا دوام بخشتی ہے کہ مثال لاتے نہیں بنتی۔ کچھ ایسی ہی کہانی فقیر موہن سیناپتی کی ہے۔

اس کے لیے زندگی ابتدا ہی سے بقائی ایک طویل آزمائش بنی رہی۔ حالات معمولی، ناموافق، بلکہ ناقابلِ برداشت، علم کا دلدادہ مگر نیم خواندہ۔ ہاتھ تنگ۔ دل کشادہ، نظریں کچھ دھوندتی ہوئیں۔ بہت اچھا طالب علم مثالی مدرس، خود ساختہ نابغہ، مزید مثالی منتظم، خود ساز، عہد بلکہ تاریخ ساز، جس نے ایک صدی پہلے اُڑیسہ کو جدید عہد سے روشناس کرایا، جس کے فکر و عمل کی مہریں اُڑیسہ کی تعلیمی، سیاسی، سماجی اور ادبی زندگی کی نئی جہات پر ثبت ہیں۔ توجہ کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ فقیر موہن سیناپتی کی حیات اور کارناموں کی صحیح ترجمانی کسی حد تک میر کے اس شعر سے ہوتی ہے:

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

فقیر موہن کی ولادت بالیشور کے ایک معمولی گھرانے میں جنوری ۱۸۴۳ء میں ہوئی۔ اس کے والد لکشمن چرن بحری جہازوں کے لیے بادبان وغیرہ تیار رکھنے کا کاروبار کرتے تھے۔ فقیر موہن بظاہر معمولی بچہ تھا: حالات اور قسمت کا مارا ہوا۔ بدبختی اس کی پرچھائیں بنی ہوئی تھی۔ وہ تقریباً ڈیڑھ برس کا تھا کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ والدہ صدمے کی تاب نہ لاسکی اور بیمار پڑگئی۔ بہ مشکل برس بھر گزرا تھا۔ موت نے رحم کھاکر بیوگی کے دکھوں سے چھٹکارا دلادیا۔ وہ یتیم اور بے سہارا رہ گیا۔ اس کے سر پر سایہ صرف سادہ دل دادی ماں کا تھا۔ والدین کے انتقال کے بعد وہ سات آٹھ برس تک اسہال، پیچش اور بواسیر جیسے تکلیف دہ امراض میں مبتلا رہا۔ وہ بس کھاٹ ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک دادی ماں

۳۰/۲۹ - ایسٹ پٹیل نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸

مایادھر مان سنہا کی کتاب "فقیر موہن سیناپتی" (شائع کردہ ساہتیہ اکادمی نئی دہلی) سے ماخوذ

تھی، جو دن رات اس کے سرہانے بیٹھی ، دوا دارو کرتی ۔ موت اس بچے کو جھپٹنے کے پھیر میں تھی ۔ دادی ماں اُسے ہر حال میں محفوظ و سلامت رکھنا چاہتی تھی ۔ کیوں کہ وہ اس کے چھوٹے بیٹے کی آخری نشانی تھا ۔ بات دوا سے بڑھی تو دعاؤں تک آگئی ۔ پھر پیروں فقیروں کی منتیں مانی گئیں ۔ اتھاہ پیار کرنے والی دادی ماں کی تیمار داری کام آئی ۔ وہ اچھا ہونے لگا وہ اچھا ہو گیا ۔

دادی ماں منت کے مطابق اُسے پیروں فقیروں کے آستانے کا غلام اور فقیر بنانے کا حوصلہ تو نہ کر پائی البتہ اس کا نام برج موہن سے بدل کر فقیر موہن کر دیا ۔ اُس نے ایک راہ اور نکالی ۔ وہ ہر برس محرم کے مہینے میں اُسے آٹھ دس دنوں کے لیے فقیر بنا دیتی ۔ مسلمان فقیروں جیسے کھُلے کھُلے بیچ میل کپڑے اس کے تن پر ہوتے ۔ سر پر درویشوں جیسی ٹوپی ۔ ہاتھ میں فیروزہ دار چھڑی ایک کندھے پر لٹکتا ہوا رنگ برنگا تھیلا ۔ کھریا مٹی منہ پہ ملے وہ صبح سویرے گھر سے نکلتا ۔ دن بھر بالیشور کے گلی کوچوں اور سڑکوں پر بھیک مانگتا پھرتا ۔ شام کو گھر لوٹتا ۔ خیرات میں جو چاول ملتے ۔ دادی ماں انہیں بیچ دیتی اور اس رقم سے پیروں فقیروں کو نذر نیاز پیش کرتی ۔ دن یوں ہی گزر رہے تھے ۔

وہ نو برس کی عمر میں پرائمری اسکول میں داخل ہوا ۔ یہ روایتی انداز کا اسکول تھا ۔ یہاں فقیر موہن کو فیس کا ایک حصہ ذاتی خدمات کی صورت میں ادا کرنا پڑتا تھا ۔ اسکول چھٹنے کے بعد وہ کھانا پکانے میں ماسٹر جی کا ہاتھ بٹاتا ۔ برتن صاف کرتا اور دوسرے چھوٹے موٹے کام سرانجام دیتا ۔ اسکول کی معمولی فیس ادا کرنے کے لیے بھی تایا تیار نہ تھا ۔ بالآخر اُسے اسکول سے اُٹھا لیا گیا ۔

وہ دس برس کا تھا کہ تایا نے اُسے بالیشور میں گودی مزدوری کے کام پر لگا دیا ۔ پھر تایا نے ایک بھلائی یہ کی کہ اُسے کمیشن کر محصولات نمک کے محکمہ میں ملازم کرا دیا ۔ اُس نے محسوس کر لیا تھا کہ بالیشور بندرگاہ کا دھندا مندا پڑنے والا ہے ۔ پھر سرکار نے نمک بنانے پر پابندی لگا دی ۔ محصولاتِ نمک کا محکمہ ختم کر دیا گیا ۔ اس وقت فقیر موہن کل پندرہ برس کا تھا ۔ وہ اپنی بے قاعدہ تعلیم سے مطمئن نہ تھا ۔ اس نے بلا سبق کے مشن اسکول میں داخلہ لے لیا ۔ حالات حسبِ سابق نامساعد تھے ۔ تن پر قمیص نہیں تھی ۔ فیس ادا کرنے کے لیے پیسے نہیں تھے ۔ لگن کے ساتھ پڑھائی شروع کی ۔ تاریخ ، جغرافیہ اور ریاضی کے مضامین نے اُسے نئی خوشیوں سے روشناس کرایا ۔ حصولِ تعلیم کا یہ سلسلہ ڈیڑھ برس سے آگے نہ بڑھ پایا تھا کہ تایا نے فیس ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا ۔ اس طرح رسمی تعلیم کا یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ۔

اس کو حالات کی ستم ظریفی کہیے کہ کچھ ہی عرصہ بعد تدریس کے سلسلے کا آغاز ہوا ۔ ایک مرحلے پر جب مشن اسکول میں ماسٹر کی اسامی خالی ہوئی ، تو اسکول کا ہیڈ ماسٹر فقیر موہن سے بہتر استاد تلاش نہیں کر پایا ۔ حالانکہ اس کے پاس کوئی رسمی سند نہیں تھی ۔ تجربہ صرف گھاٹ پر مزدوری کا تھا ۔ وہ اچھا طالب علم تھا ۔ بہت اچھا استاد ثابت ہوا ۔ اس نے ریاضی ، الجبرا اور علم مثلث جیسے نئے مضامین بھی بڑی کامیابی کے ساتھ پڑھائے ۔ تاریخ جغرافیہ اور ادب جیسے مضامین پڑھانے میں تو اس کا کوئی جواب نہیں تھا ۔ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل استاد تھا اور جب اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی جگہ خالی ہوئی تو اسکول کے اربابِ اختیار نے بلا تامل اُسے ہیڈ ماسٹر مقرر کر دیا ۔ تنخواہ دس روپے ماہانہ مقرر ہوئی ۔ اب انگریز افسروں اور عیسائی مشنریوں سے اس کے روابط بڑھنے لگے جو مزید ترقیوں کا پیش خیمہ بنے ۔ وہ اُڑیہ زبان کا صحیح معنوں میں بہی خواہ تھا ۔ اُسی کی کوششوں سے اُڑیہ تعلیم کی زبان قرار پائی تھی ۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے اُڑیہ زبان میں ریاضی ، جغرافیہ ، علم مثلث اور ہندوستان کی تاریخ جیسے مضامین کی درسی کتابیں لکھیں ۔ سرکار سے قابلِ رشک انعامات پائے ۔ یہ درسی کتابیں اس کے وسیع مطالعے کا نمونہ تھیں ۔ حقائق کی سمجھ بوجھ کا آئینہ تھیں ۔ ان کا اسلوب اور انداز بڑا دلکش تھا ۔ ان کتابوں کو بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ۔ اب اس کی لکھی ہوئی درسی کتابیں اڑیسہ بھر کے اسکولوں میں پڑھائی جانے لگی تھیں ۔ اس وقت وہ بہ مشکل بیس بائیس برس کا نوجوان تھا ۔ اب اس کا شمار اڑیسہ کی ممتاز ہستیوں میں ہونے لگا تھا ۔ ایسی ترقی ، شہرت اور مقبولیت خود اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھی ۔

فقیر موہن نے ایک انقلابی قدم اور اٹھایا ۔ اس نے بالیشور میں چھاپہ خانہ لگایا ۔ اس کا مقصد کم قیمت پر کلاسیکی اُڑیہ شاعری کی معروف کتابیں عوام تک پہنچانا اور ان میں ادب کا ذوق پیدا کرنا تھا ۔ فقیر موہن نے یہ چھاپہ خانہ امدادِ باہمی کی بنیادوں پر لگایا اور بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ چلایا ۔ بقول شخصے فقیر موہن سیناپتی کا ایک ہی اقدام اُسے جدید اُڑیسہ کی تاریخ میں لافانی بنانے کے لیے کافی تھا ، لیکن وہ اس عظیم کارنامہ پر مطمئن نہیں تھا ۔ نہ ہی وہ اس شہرت پر مطمئن تھا جو اُسے بجا طور پر ایک لائق اُستاد ، ایک قابل ہیڈ ماسٹر اور درسی کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے حاصل ہوئی تھی ۔ اس نے اُڑیہ میں دو رسالے جاری کیے ۔ ایک ادب کے لیے وقف تھا ۔ دوسرے میں خبریں اور تبصرے وغیرہ شائع ہوتے تھے ۔ وہ ان رسائل کا واحد مصنف ، ناشر ، تقسیم کار تھا ۔ وہی سرمایہ کار بھی ۔ وہ ایک تھا ۔ اس کے فرائض اور منصب انیک تھے ۔ اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کے سبھی معترف تھے ۔

۱۸۷۱ء میں اُسے ریاست نیل گری کے دیوان کا عہدہ پیش کیا گیا ۔ اُس وقت اس کی عمر صرف اٹھائیس برس تھی ۔ ایک وقت تھا وہ پیسے پیسے

کا محتاج تھا۔ اب دولت اس کے قدموں میں لوٹتی تھی۔ اگلے بیس برس اس نے مختلف ریاستوں اور مقامات پر اعلیٰ انتظامی عہدے سنبھالے اور اعلیٰ خدمات انجام دیں۔ ذرا سوچیے اس نے ایک صدی پہلے تجارتی بنیادوں پر چائے کی کاشت کا منصوبہ بنایا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے باقاعدہ بازار میں سنسکرت اسکول قائم کیا۔ انگریزی اسکولی نظام کی داغ بیل ڈالی نیل گری کو باہر کی دنیا سے جوڑنے کے لیے سڑکیں بنوائیں، ناریل کے باغات لگوائے۔ وہ اوّل عوام دوست تھا۔ وہ آخر عوام دوست تھا۔ اڑیسہ کی تاریخ اُسے اس کے انتظامی کارناموں کے لیے ہمیشہ یاد رکھے گی۔ اسی کی کوششوں سے اڑیسہ کی تاریخی ریاست عہد جدید سے روشناس ہوئی تھی۔

اعلیٰ انتظامی عہدوں کے باعث اُسے تفوق حاصل ہوا اور وہ ایک وسیع تناظر میں عورتوں مردوں کے روابط اور باہمی آویزشوں کا مشاہدہ کر پایا۔ بعد میں اس نے جو تخلیقی کارنامے انجام دیے۔ جو افسانے اور ناول لکھے ان میں ان مشاہدات کی چھوٹ بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کی بدولت ان میں زندگی سانس لیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ تخلیقات فی الواقع فقیر موہن کا حصہ اور اڑیہ ادب اور عوام کو اس کی دین ہیں۔

فقیر موہن کوئی لائقِ ذکر سماجی یا تعلیمی پس منظر نہیں رکھتا تھا۔ اس پر بھی وہ جدید تر ذہن اور احساس کا ادیب کہلایا۔ اُس نے اُڑیہ ادب میں نئے رجحانات کی داغ بیل ڈالی۔ روحانیت اور فکر و دانش کے ایسے کارنامے انجام دیے کہ باید و شاید۔ وہ ایک وسیع الابعاد شاعر کے روپ میں اُبھرا۔ اُسے بجا طور پر "ویاس کوی" (آفاقی شاعر) کے لائقِ رشک لقب سے نوازا گیا۔ اُڑیہ ادب کو اس کی قابلِ قدر دین متعدد لافانی ناول ہیں اور کہانیاں ہیں۔ وہ غیر معمولی ذہانت اور صلاحیتوں کا ادیب تھا۔ اس نے ادب کی تمام اصناف میں طبع آزمائی۔ تخلیقات کا ایک غیر معمولی دفتر یادگار چھوڑا۔ اسی امر کے پیشِ نظر بامڑا کے روشن خیال دربار نے اُسے لائقِ رشک سرسوتی اعزاز سے سرفراز کیا۔ مؤثر ابعاد کا یہ شاعر بعد میں تخلیق کار اور ناول نگار بن کر ادبی افق پر نمودار ہوا۔

ابتداً اُس نے شاعری کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اپنے بیٹے کی موت کے بعد اُس نے خود کو ادبی سفر کے ایک نئے تخلیقی مرحلے میں پایا۔ اُس نے اپنے بیٹے کی موت پر سوگوار اپنی بیوی کرشنا کماری کی تسکین، سکھ، سکون کے لیے بالمیکی کی رامائن کے شعری ترجمہ کا جرأت مندانہ اقدام کیا۔ وہ جتنا ترجمہ دن میں کرتا، شام میں اپنی سوگوار بیوی کرشنا کماری کو سُنا دیتا۔ فقیر موہن کا ہر شعر سادہ اور سہل تھا۔ کرشنا کماری جیسی نیم خواندہ عورت کو بھی اُسے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ فقیر موہن کو جدید ہندوستانی ادب میں عام آدمی کی آواز کا غالباً اوّلیں ترجمان خیال کیا جاتا ہے۔ ایسے میں یہ عین مناسب تھا کہ اس عظیم ادیب کو اپنا پہلا قدر شناس سامع اور نقاد اپنی سادہ اور کم پڑھی لکھی بیوی کی شکل میں ملا۔ اپنی بیوی کی غیر معمولی قدر شناسی سے حوصلہ پاکر فقیر موہن نے جلد ہی ساری رامائن کا ترجمہ مکمل کر لیا۔

فقیر موہن نے رامائن کے بعد اپنی بیوی کی خاطر مہابھارت کے ترجمہ کی ابتدا کی اور پچھلی صدی کی آخری دہائی تک اس عظیم الشان کام کو پورا کر لیا۔ اڑیہ میں گو رامائن اور مہابھارت کے متعدد تراجم ہو چکے تھے، لیکن وہ ایسے سادہ، سہل، اصل کے مطابق اور ایسے لائقِ مطالعہ تراجم نہ تھے۔ فقیر موہن سیناپتی ہی کے تراجم اُڑیہ میں پہلے کامیاب تراجم قرار پائے۔ ان سے محض ایک غمزدہ عورت کی نہیں، تمام اُڑیہ افرادِ قوم کی ضرورت کی تکمیل ہوئی۔ قوم کے فوری روحانی تقاضوں کے پیشِ نظر فقیر موہن نے تمام اہم اُپنشدوں کے بھی اُڑیہ میں منظوم تراجم کے کام کا آغاز کیا۔ یہ اپنی نوعیت کی اوّلین کوشش تھی۔ فقیر موہن نے ویدانت کی پیچیدہ مابعد الطبیعات کو اپنے ترجمہ میں ایسی سادگی اور ہنر مندی سے منتقل کیا۔ جسے آج ہم تخلیقی ترجمہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

کسی بھی فردِ واحد کا "رامائن" "مہابھارت" اور اہم اُپنشدوں کا ترجمہ کرنا اپنے آپ میں ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ ظاہر ہے بغیر کسی عظیم مقصد کے ایسے حیران کن ذہنی و تخلیقی کارناموں کو انجام دے پانا ناممکنات میں سے ہے۔ فقیر موہن اُڑیہ کا شاید سب سے زیادہ پُر شوق مترجم ہے۔ ممکن ہے اس کے لاشعور میں اپنی بے مایہ زبان کو مالا مال کرنے کا جذبہ کار فرما رہا ہو۔ کسی بھی دوسرے شخص کی مساعی سے اڑیہ زبان اتنی پھولی پھلی نہیں جتنی کہ فقیر موہن کی کوششوں سے مالا مال ہوئی ہے۔

اس کی واقعتاً پہلی تخلیقی تصنیف اتکل براہمنڈم (اڑیسہ میں اسفار) ہے۔ یہ تخلیق اس امر کی اچھی مثال ہے کہ فقیر موہن نئی راہ نکالنے کی حیران کن صلاحیت رکھتا تھا۔

وہ انگریز افسروں کو بھدرک ریلوے اسٹیشن پر الوداع کہنے کے بعد ہاتھی پر سوار اپنے سرکاری صدر دفتر آنند پور کو لوٹ رہا تھا۔ معاً اُس نے محسوس کیا کہ ہم عصر اڑیسہ کی مشہور ہستیوں کو بھی شاعری کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ اس نے فوراً پینسل اور نوٹ بک نکالی اور کچھ لکھنے لگا۔ آنند پور پہنچتے پہنچتے اس کی کتاب نصف مکمل ہو چکی تھی۔ تیسرا دن ابھی ڈھلا نہیں تھا کہ ایک مقامی چھاپہ خانہ سے وہ کتاب شائع ہو کر آ بھی گئی۔

طنزیہ شاعری کا ایسا اچھوتا مجموعہ آج تک اُڑیہ میں تخلیق نہیں ہوا۔ فقیر موہن جیسا باکمال شاعر ہی ایسی شعری، سیاسی، سماجی تخلیق سپردِ قلم کر سکتا تھا۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی سارے اڑیسہ میں سنسنی پھیل گئی۔ اس کتاب میں کشادہ مزاح اور طنز آمیز رمز و کنایہ میں ہم عصر

شخصیتوں کا بیان ایسے جاندار انداز میں ہوا ہے کہ پڑھنے والے بے اختیار قہقہے لگانے لگتے ہیں۔

۱۸۹۴ء میں اس کی اہلیہ کرشنا کماری کا انتقال ہوگیا۔ اس شدید صدمے نے ماضی کے اس پرشوق مترجم اور طنز نگار کو باکمال تخلیقی شاعر بنا دیا۔ فقیر موہن کے الفاظ میں "اس کی موت کے بعد میں نے اپنی زیادہ تر نظمیں گہرے ذہنی کرب، ذاتی حادثوں اور بے عمل کرنے والی بیماری کے دوران لکھی ہیں تاکہ ان تکلیفوں کی طرف سے میرا دھیان بٹا رہے۔" یہی نظمیں اس کی شخصیت کی تکمیل اور شکوہ کا اظہار ہیں۔ ان بے شمار بظاہر الگ الگ نظموں میں جو چیز سامنے آتی ہے وہ ذہن اور روح کی حیران کشادگی ہے۔

فقیر موہن کے شعری موضوعات بڑے متنوع ہیں۔ یہ شاعر کی جھگڑالو بیوی سے لے کر طلاق یافتہ جوزفین یا ہندوستانی کسان کے مصائب سے لے کر نوجوان ہندو بیوہ عورتوں کے دکھ درد کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ اس نے اپنی متعدد نظموں میں جاپان کی عظمتوں اور کارناموں پر نعرۂ تحسین بلند کیا اور مثالاً اپنے ہم وطنوں کے سامنے پیش کیا۔ جہاں فقیر موہن نے غیر ملکی شخصیتوں کو موضوعِ شاعری بنایا وہاں شری کرشن، مہاتما بدھ، حضرت عیسیٰ مسیح، سنت تکارام جیسی ہستیوں کو بھی شعری خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اس کی دوسری نظمیں "ہلاس کا مرجھایا پیڑ" اور "پیڑ سے ٹوٹ کر گرنے سے پہلے ایک سوکھے پتے کا آخری تاثر" ہیں۔

فقیر موہن کی شعری دنیا، رزمیوں، بے شمار گیتوں اور طنزیہ نظموں سے عبارت ہے۔ تاہم وہ نظمیں پڑھنے والوں کو زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ جو اس نے اپنی دادی ماں اور اپنی بیوی کرشنا کماری کی موت کے بعد لکھیں۔ اس کی یہ نظمیں اشک و آہ کے مرقعے ہیں۔ ان نظموں میں روح کے کرب کی اَمٹ گونج سنائی دیتی ہے۔

فقیر موہن کو اڑیہ کے افسانوی ادب کا عظیم ترین مصنف اور مبدع ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ پچاس پچپن کی عمر تک اُسے اپنی افسانہ نویسی کی غیر معمولی امکانی صلاحیتوں کا کوئی احساس نہیں تھا۔

ایک مرحلہ پر اُس نے محسوس کیا کہ بنگالی رسائل کی مقبولیت کا باعث ان میں شائع ہونے والی کہانیاں ہیں، تو اس نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی۔ اس کی پہلی کہانی "لکشمنیہ" گزشتہ صدی کی ساتویں دہائی میں اس کے اپنے رسالہ بودھ دائنی میں شائع ہوئی تھی۔

۱۸۷۱ء میں بالیشور چھوڑنے کے بعد، پچیس (۲۵) برس تک اُس نے "لکشمنیہ" جیسی کوئی دوسری کہانی نہیں لکھی۔ مختلف انتظامی عہدوں سے سبکدوشی کے بعد اُس نے کٹک میں سکونت اختیار کرلی۔ انہیں دنوں اس کے معزز دوست اور اڑیہ کے عظیم ایڈیٹر وشوناتھ نے کٹک سے اپنا مشہور رسالہ "اتکل ساہتیہ" جاری کیا تھا۔ وشوناتھ کے اصرار پر فقیر موہن نے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ اور اس طرح ایک عظیم افسانہ نگار کا ظہور ہوا۔ اس کے بعد سے ۱۹۱۸ء میں اپنی موت تک فقیر موہن لگاتار کہانیاں اور ناول لکھتا رہا۔ یہ تخلیقات کسی بھی مصنف کے لیے اس کے تخلیقی عروج کے زمانہ میں افتخار کا باعث ہو سکتی ہیں۔ تخلیقی اعتبار سے اس کا بڑھاپا حیران کن حد تک نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ فقیر موہن سیناپتی متعدد اسالیب کا استاد تھا۔ اس نے حسب موقع بڑی ہنرمندی سے سنجیدہ اسلوب اختیار کیا اور ایسا اسلوب بھی جس کے لاکھوں ناخواندہ عوام معتقد تھے۔

فقیر موہن کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ اس نے کوئی منصوبہ بند طریقہ اختیار کیے بغیر بے شمار ناول لکھے اور کہانیاں تخلیق کیں۔ اس پر بھی ہمیں اُن میں ایک حیران کن مکمل نظام، خوب سلیقے سے بروئے کار لایا گیا ایک عظیم منصوبہ، ایک وسیع و عریض زنگارنگ میورل نظر آتا ہے۔ اور بالآخر انہیں کے درمیان سے تمام عوام کی ایک مربوط تصویر اُبھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے چار بڑے ناولوں اور بے شمار طویل اور مختصر کہانیوں میں دو صدیوں پر محیط اڑیسہ کی قومی زندگی کی بڑی جامع ترجمانی ہوئی ہے۔

فقیر موہن کا اہم تخلیقی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ادبی دنیا میں عام آدمی اور عورت کو وقعت دی اور وقار بخشا۔ فقیر موہن نے سماج کے کسی بھی طبقے کو اپنے فکر و فن کی دنیا سے باہر نہیں رکھا۔ عام آدمی یا عورت کے لیے اس کی محبت کسی غیر حقیقی اور غیر استدلالی سماجی اقتصادی نظریہ یا نعرے سے پیدا نہیں ہوئی۔ اس کے نزدیک عام آدمی اس کے اعلیٰ مسلکِ انسانیت کا اٹوٹ حصہ ہے۔ اس کا یہ مسلک ذات اور طبقے کی تمام تر حدوں سے ماورا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فقیر موہن کی تخلیقات میں اس کا قاری سماج کے سبھی طبقوں کے افراد سے روشناس ہوتا ہے۔ ان میں راجاؤں سے لے کر خاکروب اور مثالیت پسند ہیرو، ہیروئنوں سے لے کر غنڈے بدمعاش تک سبھی شامل ہیں۔ اس کی غیر معمولی ذہانت غنڈے بدمعاشوں کی پہچان دیہی اور شہری زندگی میں یکساں طور پر کر پائی ہے۔ اس کے دل میں ہمارے دیہات کے بارے میں کسی قسم کا کوئی رومانی بھرم نہیں تھا۔ چنانچہ ٹیگور کے عہد فقیر موہن ہی کو جدید ہندوستان کا سب سے بڑا بالبصیرت فن کار کہا جا سکتا ہے۔

فقیر موہن بنیادی طور پر بڑا عملی مصنف تھا۔ جب تک آس پاس وقوع پذیر ہونے والے واقعات اُسے مجبور نہ کر دیتے، وہ لکھنے کے لیے کاغذ قلم ہاتھ میں نہیں لیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی زیادہ تر افسانوی تخلیقات حقیقی واقعات کی غیر مرئی تاہم ٹھوس بنیادوں پر ٹکی ہوئی ہیں۔

فقیر موہن نے اپنے سماجی ناول "چھمن" میں اپنے پُرمصائب حالات کا احاطہ کرنے کی سعی کی ہے، جن سے اڑیسہ عوام کو اٹھارہویں صدی کے نصف آخر

سا دو چار ہونا پڑا تھا۔ فقیر موہن کا دوسرا اہم اور لافانی ناول "چھمان آٹھ گنٹھ" (چھ اعشاریہ ۲۳ ایکڑ آراضی) اس افسوس ناک دور پر محیط ہے۔ جب اڑیسہ انگریزوں کے قبضے کے بعد اڑیہ عوام کو ہر سطح پر جور و استبداد کا شکار ہونا پڑا تھا۔ اڑیسہ میں انگریزی حکومت کے پہلے پچاس برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس سے پہلے کہ پچاس بدقسمت برسوں میں بدلگی مراکھوں نے لوٹ کھسوٹ مچائی اور زمینیں ہتھیالی تھیں۔ یہی اس ناول کا موضوع ہے۔

فقیر موہن کا ناول "ماموں" اڑیسہ کے نئے شہروں کے اس سماجیاتی دور کی عکاسی کرتا ہے جو گزشتہ صدی کے نصف آخر پر پھیلا ہوا ہے "چھمان آٹھ گنٹھ" کی طرح اس ناول میں بھی بڑے موثر انداز میں یہ دکھایا گیا ہے کہ دیہات سے آئے ہوئے مرد اور عورتیں دھن دولت بٹورنے کے لیے کیسے کیسے گھٹیا طریقے استعمال کرتے ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز سے کچھ پہلے سے اڑیسہ میں سماجی انتشار کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ یہ اس مغربی تعلیم کا نتیجہ تھا، جو اڑیسہ کی نئی نسل کٹک اور کلکتہ میں پا رہی تھی۔ یونی ورسٹی تعلیم یافتہ افراد پر ذات پات کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی تھی کہ وہ اپنی پسند کی دلہن کی انفعالی مانگ کرنے لگے تھے۔ فقیر موہن کا آخری ناول "پرائسچت" ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ ناول اڑیسہ کی سماجی زندگی میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلی کا احاطہ کرتا ہے۔ سماجی زندگی کے جس دور پر یہ ناول ختم ہوتا ہے کم و بیش وہیں سے مہاتما گاندھی کے انقلابی اثرات کے تحت دوسرے مرحلے کا آغاز ہوتا ہے۔

فقیر موہن شاید اپنی نسل کے بیشتر ہندوستانیوں کی طرح برطانوی سمجھوتے میں گہرا یقین رکھتا تھا۔ تاہم یہ ہندوستانی دانشور اپنی تحریروں میں ہندوستانیوں کی اس حماقت کو در پردہ ملامت کا نشانہ بنانے سے کبھی نہیں چوکتا کہ وہ کس طرح لکڑیاں بین کر اور پانی لا کر گزر بسر کرتے ہیں، جب کہ سات سمندر پار سے آئے ہوئے انگریز یہاں موجود ہر قسم کے سکھ آرام کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

وہ "چھمان آٹھ گنٹھ" (۱۸۹۷ء) میں گاؤں کے ایک جوہڑ کا ذکر اپنے نشتر جیسے تیز طنزیہ اسلوب میں یوں کرتا ہے: "بیس بائیس یا کچھ زیادہ سفید بگلے اس جوہڑ کے کنارے دلدل میں کھڑے چھوٹے موٹے شکار کے لیے صبح سے شام تک پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن دیکھو تو کچھ ماہی خور پرندے نہ معلوم کہاں سے اڑ کر آتے ہیں، جوہڑ کی گہرائیوں میں کچھ ہی بار غوطے لگاتے ہیں۔ پھر بہت بڑی بڑی مچھلیاں کھا کر اڑ جاتے ہیں۔۔۔۔۔ وائے ہندوستان کے بھولے بگلو۔ دیکھو تو انگریز ماہی خور دور دراز سے، سمندروں کے اوپر سے اڑتے ہوئے ہماری دھرتی پہ اترتے ہیں اور خوشی خوشی واپس جاتے ہیں کہ ان کی جیبیں جو پہلے خالی تھیں اب بڑی بڑی مچھلیوں سے بھری ہوئی ہیں۔ اور تم مورکھوں کی طرح جوہڑ کے کنارے پیر سوں سے دن بھر کی کڑی محنت کے بعد بھی پیٹ بھر کھانا حاصل نہیں کر پاتے۔۔۔۔۔

[illegible]

اگر تمہیں جان پیاری ہے تو تمہیں بھی ان ماہی خوروں جیسا وطیرہ اختیار کرنا ہوگا۔ سمندروں میں تیر کر کیسے پار اترتے ہیں، یہ فن تمہیں سیکھنا ہوگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ برعکس صورت میں تم مستقبل میں اپنے آپ کو کیسے زندہ رکھ پاؤ گے۔"

ایک بابصیرت اور محب وطن مصنف کے ان تمثیلی تاثرات کے سیاسی مضمرات پچاس برس پہلے بھی قارئین پر بہ خوبی واضح تھے۔

وہ نابغہ تھا۔ ادبی اصولوں اور ضابطوں کی پابندی اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ بہ حیثیت فن کار اسے اس بات کی مطلق پروا نہ تھی کہ اس کی تخلیقات اس کے پڑھنے والوں پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ اس کے جی میں جو آیا اس نے بلا تکلف اور بلا تکان لکھا۔ انہیں اسباب کی بدولت اس کی تخلیقات میں ایک سادگی در آئی تھی، جو فطری ہے اور جو ہر قسم کے تصنع سے پاک صاف ہے۔ اس کی تخلیقات میں ہمیں گاؤں اور شہر کے عام آدمی کی وہ زبان ملتی ہے جو غیر اکتسابی ہے، جو سچی ہے، جس کی تقلید ممکن نہیں۔ لیکن جسے ایک باکمال پیدائشی فن کار کے اثر انگیز فن سادہ کے الہامی مشاہدات نے نہایت بامعنی بنا دیا ہے۔ اس کے سیدھے سادے پلاٹوں میں اس کے اپنے اور خود ہمارے عہد کے جیتے جاگتے کردار ــــ مرد، عورتیں سانس لیتے، اٹھتے بیٹھتے اور بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فقیر موہن کی یہی بے مثل صلاحیت ان سیدھے سادے پلاٹوں کو ابدیت عطا کرتی ہے۔ اس کے کردار آج بھی جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ناقابل فراموش ہیں۔ ان کا تعلق راست زندگی سے ہے۔ اس کی تخلیقات میں عام آدمی کے تئیں گہری ہمدردی کا احساس ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک متوازن اخلاقی ادراک اور ایک مستقل معروضیت کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اپنے ناولوں اور بیشتر کہانیوں میں فقیر موہن اپنے پڑھنے والوں کو پستیوں سے نکال کر نئی رفعتوں سے روشناس کراتا ہے۔ اس سے اس کی تخلیقات میں گہرائی کی شان پیدا ہوتی ہے۔ وہ مزید رفیع ہو جاتی ہیں۔

فقیر موہن سیناپتی کی افسانوی تخلیقات کا ایک نفیس پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں اچھے برے دونوں طرح کے کردار دکھ بھوگتے ہیں۔ وہ دکھ کو زندگی کا اٹوٹ عنصر خیال کرتا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے۔ اس کی افسانوی تخلیقات میں نیک دکھوں کی بھٹی میں تپ کر نکھر جاتا اور نمو پاتا ہے، جبکہ بد کی تطہیر ہو جاتی ہے۔ کسی بھی شکل میں اخلاقی کج روی کو جائز نہیں سمجھتا۔ وہ البتہ ہر فرسودہ، معذاور غیر منطقی شے کی اصلاح کی حمایت کرتا ہے۔ اس کے خیال میں گناہ محض بے آہنگی ہے۔ اس کے نام نہاد کردار بالآخر تائب ہو کر اس کے رحم و کرم سے سرفراز ہوتے ہیں کہ وہ صدق دل کے ساتھ اپنے گناہوں پر نادم ہیں۔

چنانچہ فقیر موہن کی افسانوی تخلیقات اپنے آپ میں مکمل اور مربوط ہیں۔ اڑیسہ کی زندگی اور سماج کی آئینہ دار ہوتے ہوئے بھی یہ تخلیقات تفریح، اخلاقی ترفع اور روحانی تشفی کا باعث بنتی ہیں۔ ان میں حقیقت پسندی اور مثالیت پسندی کا ایسا خوبصورت امتزاج ملتا ہے جس کے پیش نظر یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ وہ واقعی ایک عظیم مصنف تھا۔ اس کا احترام واجب ہے۔

یہ صبح زندہ رہے گی

سینٹرل لائبریری سے، ہمیں اب ڈسٹرکٹ کونسل ہال پہنچنا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ نوشی گیلانی انتظامی امور پر خاصی دسترس رکھتی تھی۔ گاڑیوں کا مناسب انتظام تھا۔ ڈسٹرکٹ کونسل ہال میں بھی ہمارے پہنچنے تک ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ "قلم قبیلہ" سے وابستہ ادیب اور شاعر کافی لگن اور خلوص سے کام کرتے تھے۔ ریلوے اسٹیشن سے لے کر کونسل ہال تک ہم جہاں جہاں بھی گئے انھیں بڑا مستعد پایا۔ اگر ادیب اور شاعر اپنے اداروں سے خلوص اور مضبوطی سے جڑے رہیں تو ادب کی ترقی کے لیے راہیں ہموار ہو جاتی ہیں۔ ڈسٹرکٹ کونسل ہال اس قسم کے ادبی اجتماعوں کیلئے اچھی جگہ ہے۔ ہال اتنا بڑا بھی نہیں کہ جلسہ شروع ہو جانے کے بعد آدھا خالی رہ جائے اور اتنا چھوٹا بھی نہیں کہ اس میں حبس اور گھٹن محسوس ہو۔ مختصر سی گل پوشی کی رسم کے بعد محفل مشاعرہ ہوئی۔

صدارت قاضی عوی عثمانی نے کی۔ نظامت کے فرائض وقار عزیز صدیقی نے ادا کیے۔ مہمان خصوصی راجندر ملہوترہ اور میں تھے۔ مگر میں راجندر ملہوترہ کو ہی مہمان خصوصی سمجھتا تھا۔ اپنے آپ کو صرف ایک معمولی مہمان ہی سمجھتا تھا میں نے۔ دراصل میں اپنے آپ کو نمایاں کرنے سے ہمیشہ احتراز کرتا ہوں۔ مجھے دو ایک ایسے دوستوں کا بھی علم ہے، جو کسی محفل میں میری طرح معمولی مہمان ہوتے ہیں، لیکن چند منٹوں ہی میں ایسا انقلاب رونما ہوتا ہے کہ مہمانِ خصوصی بے چارا تو ایک طرف کھڑا رہ جاتا ہے اور گل پوشی ان کی ہونے لگتی ہے۔ ادب کے میدان میں ایسی سوجھ بوجھ والے سپاہیوں کی تعداد بڑھنے لگی ہے۔ اب وہ جو سپہ سالار قسم کے لوگ تھے، وہ صرف اپنے سینوں پر تمغے سجاتے الگ کھڑے رہنے پر مجبور ہوتے جا رہے ہیں۔ بے چارے پڑانے سپہ سالار! لیکن راجندر ملہوترہ بڑا شریف اور کم گو آدمی ہے۔ طبیعت کا ذرا شوقین ہے اس لیے مجھے اچھا لگتا ہے۔

محفل مشاعرہ میں جو دوست شریک ہوتے ان میں سے کچھ نام اور ان کے شعر بھی یاد ہیں۔ شرکا میں امجد قریشی، فیضان عارف، نواز کاوش، نوشی گیلانی، منور جمیل، یونس عدیم اور وقار عزیز تو تھے ہی۔ دو ایک نام میرے ذہن سے اتر گئے ہیں۔ جو اشعار مجھے یاد رہ گئے وہ آپ بھی سن لیجئے۔

وقار عزیز:

میرے ہو کے نہ چھینٹے اڑا فصیلوں سے
کہیں کہیں تو نشان بہار رہنے دے

منور جمیل:

یہ دوریوں میں لمحۂ وصال کیسے آگیا
تمہیں ہمارے شہر کا خیال کیسے آگیا

نوشی گیلانی:

کوئی مخواہش نہیں تجھ سے اے مری عمرِ رواں
مرا بچپن، مرے جگنو، مری گڑیا لا دے

دو قطعے میں نے بھی سنائے اور پھر مختصر سی تقریر بھی کی۔ قطعے آپ بھی سن لیجئے۔

میں جس خیال سے سنورا ہوں کون سنورے گا
میں جس خلوص سے نکھرا ہوں کون نکھرے گا
کسی کو ہے بھی سلیقہ چمن میں جینے کا
میں جس سکون سے بکھرا ہوں کون بکھرے گا

بڑی شفیق بڑی غم شناس لگتی ہیں
تمہارے شہر کی گلیاں اُداس لگتی ہیں
وہ دردمند نگاہیں جو چھن گئیں مجھ سے
کبھی کبھی تو مجھے آس پاس لگتی ہیں

اپنی تقریر میں میں نے بہاولپور کے ادیبوں اور شاعروں کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے ہندستان سے آئے ایک چھوٹے سے وفد کا اتنے خلوص سے استقبال کیا تھا اور ہندوستان کے فنکاروں کی طرف

اپنی دوستی کا مضبوط ہاتھ بڑھایا تھا۔ میں نے "قلم قبیلہ" سے وابستہ ان سب قلمکاروں کو مبارکباد پیش کی جو اتنی صدق دلی اور خلوص سے اپنے ادارے کی خدمت کر رہے تھے۔ منور جمیل، وقار عزیز اور نوشی گیلانی کا خاص طور سے شکریہ ادا کیا۔ جو کئی دنوں سے ہمیں بہاولپور تک کھینچ لانے کی کوشش میں مصروف رہے تھے۔ جب تالیاں بجا کر سامعین نے میری تقریر کے آخری جملے سُنے تو مجھے لگا کہ ان کی تالیوں کے ترنم میں سرائیکی زبان کا تمام درد، پیار اور اعتماد گونج رہا تھا۔ ہیر اور سسی اور صاحباں اسی درد، پیار اور اعتماد کی نشانیاں تھیں، جنھیں لوگ رہتی دنیا تک یاد رکھیں گے۔

راجندر ملہوترہ نے بھی مختصر الفاظ میں اہل بہاولپور کا شکریہ ادا کیا اور پھر محفل کے صدر قاضی عموی صدیقی نے صدارتی کلمات کہہ کر ہماری بیحد پزیرائی کی۔ جب ہم لوگ ارم ہوٹل میں ڈنر کے لیے پہنچے تو بہت دیر ہو چکی تھی اور دوسرے مہمان بڑی بے صبری سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔

کھانے پر کئی دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ لگتا تھا "قلم قبیلہ" بہت جاندار ادارہ تھا۔ کچھ عرصہ پہلے یہ ادارہ اپنا ایک پرچہ بھی نکالتا تھا۔ بعض وجوہات سے جس کی اشاعت اب رک گئی تھی۔ وہیں حمیدہ غوری سے ملاقات ہوئی جو اس ادارے کی بڑی سرگرم سرپرست ہیں اور سیاسی طور پر بھی جن کا بڑا رسوخ ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی بھی وہ ایک سرگرم رکن ہیں۔ اگلے روز دوپہر کا کھانا انھوں نے اپنے گھر رکھا تھا۔ پہلے ہی بہت زیادہ دیر ہو چکی تھی اس لیے یہی مناسب تھا کہ دوستوں کو اور نہ روکا جائے۔

نوشی گیلانی نے اطلاع دی کہ اگلی صبح پریس کلب میں استقبالیہ تقریب تھی۔ ناشتے کے بعد ہمیں وہاں جانا ہوگا۔ یہ طے ہوا تھا کہ منور جمیل اور نوشی گیلانی ہمیں خود ہی پریس کلب لیجائیں گے۔

ملہوترہ، نیگی اور گوپال کچھ دیر منور جمیل اور نوشی گیلانی سے گفتگو کرتے رہے اور میں اپنے کمرے میں آگیا۔ خاصی تھکن محسوس ہو رہی تھی۔

اگلے روز صبح جب منور جمیل اور نوشی گیلانی ہوٹل آئے تو ان کی وساطت سے مجھے دو کتابیں ملیں۔ "آتش احساس" اصغر علی تبسم کا مجموعۂ کلام اور اسی کا ترتیب دیا ہوا سہیل اختر کے بارے میں لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ "سہیل اختر۔ مہکتے جذبوں کا شاعر" دونوں کتابوں کی وہیں کھڑے ورق گردانی کی تو سہیل اختر کے یہ دو شعر بہت پسند آئے۔

پھر تیری بزم ناز کی جانب چلا سہیل
پلکوں پہ عمر بھر کی پشیمانیاں لیے
یہ کیسا دور ہے ہر شخص اپنے شانوں پر
غم والم کی صلیبیں اٹھائے پھرتا ہے

اصغر علی تبسم کے بھی دو شعر اچھے لگے۔ آپ بھی سُن لیجیے۔

اجنبی بن کے مرے سامنے یوں بیٹھو گی
ہائے دل نے مرے ایسا تو نہ سوچا تھا کبھی
ایک اک گام پہ یار وا پنے دل کے سو سو تار ہوئے
لوگ ستمگر پھر بھی ہم کو دل والے ہی کہتے ہیں

پریس کلب کی استقبالیہ تقریب مختصر تھی لیکن خوبصورت تھی۔ پریس کلب کے سکریٹری نذیر ناز نے استقبالیہ پیش کیا۔ امجد قریشی، فیضان عارف اور نذیر خاکوانی نے مختصر تقریریں کیں۔ جس بات نے مجھے بیحد متاثر کیا وہ یہ تھی کہ پاکستان کے صحافی، ادیب اور شاعر سبھی کی خواہش تھی کہ پاکستان اور ہندوستان کے آپسی تعلقات زیادہ خوشگوار ہوں اور دونوں ملکوں کے صحافیوں اور ادیبوں کو آپس میں ملنے کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کی جائیں۔ میں نے بھی استقبالیہ کے جواب میں ایک مختصری تقریر کی اور پاکستان کے صحافیوں اور ادیبوں کو یقین دلایا کہ ہندوستان میں بھی ان کے ساتھی قلمکاروں کی بھی خواہش تھی کہ دونوں ملکوں کے آپسی تعلقات بہتر سے بہتر ہو جائیں اور دونوں طرف کی سیاؤں پر محبت، امن، دوستی اور بھائی چارے کے چراغ روشن ہوں۔ دونوں ملکوں کے عوام ایک حسین اور روشن صبح کا انتظار کر رہے تھے۔ راجندر ملہوترہ نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا اور بہاولپور کے صحافی دوستوں کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے ہماری اتنی قدر افزائی کی تھی۔

دوپہر کا کھانا حمیدہ غوری کے ہاں تھا۔

کھانا جتنا پُر لطف تھا مہمان اتنے کم۔ کھانے پر صرف وہی لوگ مدعو تھے جن کا تعلق شعر وادب یا موسیقی سے تھا سیاسی آدمی کوئی نہیں تھا۔ ورنہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ سیاسی لوگ دعوتوں میں قسم قسم کے لوگوں کو جمع کر لیتے ہیں۔ صرف تعلقات عامہ کو بڑھاوا دینے کے لیے۔ وہ لوگ جو کہ ایک طرح سے خاص مہمان ہوتے ہیں۔ وہ بیچارے اس ہجوم میں دب کر رہ جاتے ہیں ان کی اپنی کوئی شناخت اُبھرتی ہی نہیں۔ مجھے یہ محسوس کر کے خوشی ہوئی کہ ہماری میزبان بڑی باسلیقہ، باشعور اور بڑی متوازن خاتون تھی۔ میں نے جب اپنے اس خیال کا اظہار کیا تو انھوں نے میری تائید کی۔ انھوں نے صرف انہیں لوگوں کو کھانے پر بلایا تھا جنھیں بلایا جانا ضروری تھا۔ وہ خود ہر مہمان کے پاس جا جا کر پوچھتی تھیں کہ وہ اتنا کم کیوں کھا رہا تھا۔ ایک نوجوان نے میرے قریب آکر اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ وہ نیاز حسین لکھویرا کا چھوٹا بھائی تھا۔ اسے لاہور سے ٹیلی فون پر کہا گیا تھا کہ وہ میرے لیے تلّے کی جوتی لے کر آئے۔ اس نے بتایا کہ وہ جوتیوں کے تین چار جوڑے لیکر آیا تھا اور جو بھی جوتی مجھے پسند ہو میں چن لوں۔ کئی لوگ واقعی کتنے اچھے ہوتے ہیں۔ وہ جہاں کہیں بھی ہوں دوستیاں نبھاتے ہیں۔ نیاز حسین لکھویرا انہی لوگوں میں سے ایک ہے۔ اس کا اندازہ تو مجھے لاہور ہی میں ہو چکا تھا۔

میں نے دیکھا مہمانوں میں ایک خاتون بالکل الگ کھڑی تھی اور خاموشی سے کھانا کھا رہی تھی۔ ایکدم آنکھیں جھکاتے جیسے اسے یہ حکم دیا گیا ہو کہ وہ آنکھیں نہیں اٹھاتے گی، اور اپنی جھکی جھکی آنکھوں ہی سے ماحول کا جائزہ لے گی اور کسی سے بات بھی نہیں کرے گی۔ اپنی پلیٹ پکڑے جانے کس جذبے کے تحت میں اس خاتون کے پاس چلا گیا۔

آپ تو ایک دم اکیلی اور خاموش کھڑی ہیں؟"

"بس ویسے ہی۔"

"آپ بھی لکھتی ہیں؟"

"جی نہیں۔"

"تو کیا شغل ہے آپ کا؟"

"میرا ایک بیوٹی پارلر ہے۔"

"پھر تو ہمیں بھی اس کا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"چلئے میرا پارلر دیکھئے۔"

اتنے میں نوشی گیلانی بھی پاس آگئی۔ اس نے بتایا کہ اس خاتون کا نام نفیس تھا۔ نفیس شاہد جمیل۔ ان کے خاوند ان دنوں پاکستان سے باہر تھے اور کہ نفیس بیوٹی پارلر کے مقابلے میں بہاولپور میں کوئی بیوٹی پارلر نہیں تھا۔ اپنی تعریف سن کر نفیس نے پل بھر کے لیے اپنی آنکھیں بھی اوپر اٹھائیں اور ذرا سا مسکرائی بھی۔

"میں جا رہا ہوں ان کا پارلر دیکھنے۔"

"سینٹرل لائبریری جانے کے لیے ہم اسی سڑک سے گزریں گے آپ ان کا پارلر بھی دیکھ لینا۔"

کھانے کے بعد حمیدہ غوری نے ہمیں سرائیکی کے ٹیپ کئے ہوئے گانے سنائے۔ بڑا لطف آیا وہ گانے سن کر۔ میں نے جب تعریف کی تو انھوں نے گانوں کے دو کیسٹ بھی مجھے پیش کر دیئے۔ لکھویرا جو نیر دوسرے کمرے میں مجھے جوتیوں کے جوڑے دکھاتا رہا اور پھر جو سب سے خوبصورت جوڑا تھا وہ اس نے پیک کر کے میرے ہوٹل میں بھجوا دیا۔

گفتگو کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ پاکستان کی سرحد پر صحرا کا وہ علاقہ جو آگے جا کر راجستھان سے ملتا ہے' اسے چلستان کہتے ہیں اور سرائیکی میں اسے رُوہی کہتے ہیں۔ بہاولپور، ملتان، ساہیوال، جھنگ بلکہ آگے میانوالی تک بولی جانے والی زبان سرائیکی ہی ہے۔ مقامی طور پر اس میں تھوڑا بہت ردوبدل ہوتا رہتا ہے جو بھی بولیوں میں ہوتا ہے۔ بلکہ ایک لسانی سروے کے مطابق ہر دو میل کے بعد زبان کا لہجہ اور اس کی ادائگی میں فرق پڑتا جاتا ہے۔ ادھر ہندوستان میں سرائیکی بولنے والوں کی خاصی تعداد ہے اور یہ وہی لوگ ہیں جو تقسیم کے بعد پاکستان میں یہ زبان بولنے والے علاقوں سے اس طرف ہجرت کر آئے تھے۔ ہریانہ میں تو کئی ضلعوں میں سرائیکی بولنے والے لوگ آباد ہو گئے ہیں۔ بلکہ اب تو سرائیکی اور ہریانوی کا خوبصورت امتزاج بھی دیکھنے میں آ رہا ہے۔ یہ ریسرچ کا بہت اچھا موضوع بھی بن سکتا ہے۔ زبانیں جب ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں تو ان کا کلچر بھی ایک دوسرے میں مدغم ہونے لگتا ہے۔ رہنے سہنے کے انداز میں تبدیلیاں آنے لگتی ہیں رسم و رواج بدلنے لگتے ہیں۔ نظریات اور مزاج میں ردوبدل رونما ہونے لگتا ہے۔ نئی قدریں بننے اور سنورنے لگتی ہیں۔ نئے رشتے مضبوط ہوتے ہیں اور ایک نیا سماج تشکیل پانے لگتا ہے۔ مجھے اگر کبھی توفیق ہوئی تو میں سرائیکی اور پنجابی اور ہریانوی کے نئے رشتوں پر کسی ریسرچ پروجیکٹ کا منصوبہ بناؤں گا اور اس میں پاکستان کے اسکالرز کو بھی شریک کروں گا۔ اگر دونوں ملک کی قربت کی رفتار اسی طرح بڑھتی گئی تو مجھے یقین ہے کہ میرا یہ خواب بھی پورا ہو جائے گا۔

ہم حمیدہ غوری سے اجازت لے کر ان کے وسیع اور کھلے گھر سے باہر نکلے۔ میں نفیس شاہد جمیل کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میرے ساتھ وقار عزیز بھی تھا۔ یہ فیصلہ ہوا کہ میں نفیس کا بیوٹی پارلر دیکھ کر سنٹرل لائبریری پہونچ جاؤں گا۔ وقار عزیز میرا رہنما ہو گا۔ راستے میں وقار عزیز نے مجھے عدم کے بڑے ہی خوبصورت شعر سنائے۔ اس کے دو شعر تو مجھے اب تک یاد ہیں۔ شاید آپ کو بھی پسند آئیں۔

وہ پرندے جو آنکھ رکھتے ہیں
سب سے پہلے اسیر ہوتے ہیں

ہم فقیروں سے دوستی کر لو
گُر سکھا دیں گے بادشاہی کے

نفیس کا بیوٹی پارلر ایک پرانے لیکن کشادہ اور وسیع مکان کے ایک حصے میں ہے۔ مکان کے اندر داخل ہوا تو نفیس نے اپنے بیٹوں سے متعارف کرایا پھر اس نے مجھے اپنا بیوٹی پارلر دکھایا پارلر میں اعلیٰ ترین ساز و سامان تھا۔ بہترین قسم کی کریموں اور لوشنز سے الماریاں سجی تھیں۔ جی خوش ہو گیا۔ میں نے دہلی میں شہناز کا بیوٹی پارلر تو نہیں دیکھا لیکن اس کی تعریف بہت سنی ہے۔ میں سمجھتا ہوں بہاولپور میں نفیس کا بیوٹی پارلر بھی کچھ کم نہیں ہے۔ نفیس چائے کے جھنجھٹ میں پڑنا چاہتی تھی لیکن میں نے معذرت چاہی کیونکہ کچھ لوگ سنٹرل لائبریری میں انتظار کر رہے تھے۔

سنٹرل لائبریری کو کل شام اس وقت دیکھا تھا جب اندھیرا تھا۔ آج دن کے اجالے میں دیکھا تو مزہ آگیا۔ خوبصورت اور وسیع عمارت۔ پرانی اور نئی کتابوں کا بھرپور ذخیرہ۔ مخطوطات اور حوالہ جاتی کتابوں کا اچھا خاصہ خزانہ۔ سلیم ملک بھی موجود تھا جس نے مجھے میری کہانیوں کی نقلیں بھیجی تھیں۔ اشرف جلال نے بہت بڑھیا قسم کی چائے پلائی اور ہم لوگ دیر تک پاکستان میں لائبریری تحریک کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ کراچی کے لیے ٹرین کا قریب قریب بارہ گھنٹے کا سفر تھا بہاولپور سے۔ اگلے روز کوئی نو بجے کے قریب ہم کراچی پہونچیں گے۔

تجویز تھی کہ رات کا کھانا ذرا جلدی کھا کر

اسٹیشن پہونچا جاتے۔

"کڑاہی چکن" کے ساتھ رات کا کھانا تھا ارم ہوٹل کے پاس ہی ایک ریسٹورنٹ میں کڑاہی والا کھانا میرا پہلا تجربہ تھا۔ ایک ایک کڑاہی سب کے سامنے رکھدی گئی جس میں گرم گرم بھنا ہوا مرغ تھا کھانا کھایا۔ ہوٹل سے اپنا سامان گاڑیوں میں رکھا اور بہاولپور کے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔

اسٹیشن پر الوداع کہنے کے لیے اور دوستوں کے علاوہ حمیدہ غوری اور نفیس شاہد جمیل بھی موجود تھیں۔ ہم سب دو دو تین تین کے گروپوں میں بٹ گئے اور پلیٹ فارم پر کھڑے گفتگو کرنے لگے میں کچھ دیر دوسرے دوستوں سے بات چیت کرنے کے بعد حمیدہ غوری اور نفیس شاہد جمیل کے گروپ میں شامل ہوگیا۔ ان دونوں نے وعدہ کیا کہ انتخابات کے بعد وہ ہندوستان آئیں گی۔ ان کا چنڈی گڑھ آنا مشکل تھا اس لیے میں نے ان کو یہ رائے دی کہ جب وہ دہلی پہونچیں تو اپنے پروگرام سے مطلع کردیں تاکہ میں انہیں وہیں مل لوں۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ وہ مارچ میں انبالہ میں انڈو پاک مشاعرے کے دوران آجائیں۔ وہ تو اور بھی اچھا رہے گا۔

"لیکن یہاں مشاعرہ میں بلایا کس کو جارہا ہے؟" نوشی گیلانی نے سوال کیا۔

"آپ اور منور جمیل تو آئیں گے ہی"

"آپ کو کیسے معلوم ہے؟"

"آپ کے ہاتھ کی لکیریں بتاتی ہیں کہ عنقریب آپ کو ہندوستان کا سفر درپیش ہے"

"تو آپ ہاتھ کی لکیریں بھی دیکھتے ہیں؟" نفیس نے پوچھا۔

"جی ہاں"

"تو بتایئے میرے ہاتھ کی لکیریں کیا بتاتی ہیں؟"

"پلیٹ فارم کے نیم اندھیرے اجالے میں تو وہ یہی کہتی ہیں کہ آپ صرف ہندوستان آنا چاہتی ہیں لیکن آئیں گی نہیں۔ راہ میں بڑی رکاوٹیں ہیں"

میری بات سُن کر حمیدہ غوری، نفیس اور نوشی تینوں نے بڑی زور کا قہقہہ لگایا اسی لمحہ ٹرین آگئی جس میں ہم چاروں سوار کراچی روانہ ہونے والے تھے، لوہے کے رتھ پر۔

ہم ٹرین کے ایک کمپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑے تھے اور ہمارے دوست پلیٹ فارم پر کھڑے ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں خدا حافظ کہہ رہے تھے۔

جب ٹرین بہاولپور کا اسٹیشن چھوڑ چکی تو ہم اپنی اپنی سیٹیں تلاش کرنے لگے جیسے ایک اجنبی فضا میں چار اجنبی مسافر اپنی اپنی شناختیں بنا رہے ہوں۔

(جاری ہے)

بقیہ: سی وی رمن

ساتھ ساتھ تحقیق و دریافت کے کام میں بھی جُٹے رہے ۱۹۲۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری سے نوازا۔ ۱۹۲۱ء ہی میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں ساری دنیا کی یونیورسٹیوں کے نمائندوں کا ایک اجتماع ہوا۔ سر آشوتوش نے سی وی رمن کو کلکتہ یونیورسٹی کی نمائندگی کے لیے منتخب کیا۔ سفر انگلینڈ کے دوران انہوں نے ایک زبردست اور اہم تحقیق کی "آسمان نیلا کیوں ہوتا ہے" رمن نے اپنی تحقیق اور تجربے کی مدد سے یہ ثابت کیا .... کہ سمندر کا پانی سورج کی روشنی کے نیلے رنگ کو منتشر کردیتا ہے اس لیے سمندر کا پانی گہرا نیلا نظر آتا ہے۔ اس تحقیق نے انہیں دیس بدیس میں مشہور کردیا۔ ۱۹۲۴ء میں وہ لندن کی رائل سوسائٹی کے فیلو منتخب کیے گئے۔ لندن سے واپسی کے بعد سے وہ سورج کی کرنوں کے بکھراؤ پر غور و فکر میں لگ گئے۔ کئی برس کی مسلسل غور و فکر اور تجربے کے بعد ۲۸ فروری ۱۹۲۸ء کو انہوں نے وہ تھیوری دریافت کی جسے 'رمن اثر' کہا جاتا ہے۔

تاریخ ہند کے اس سنہرے دن کی اور سی وی رمن کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے ۲۸ فروری کو ہر سال قومی سائنس دن منایا جاتا ہے۔

دریافت پر ۱۹۳۰ء میں انہیں فزکس کا نوبل پرائز ملا۔ وہ پہلے ایشیائی تھے جنہیں فزکس کا نوبل پرائز ملا۔ اور اس طرح ۷ نومبر ۱۸۸۸ء کو تمل ناڈو کے تیروچراپلی میں جنم لینے والا ایک ذرہ آفتاب کی صورت جہاں گیر ہوا۔

اگرچہ نوبل پرائز انہیں ۱۹۳۰ء میں ملا لیکن ان کی انقلاب آفریں دریافت مشک کی طرح ساری دنیا میں اس سے پہلے ہی پھیل گئی تھی۔ ۱۹۲۸ء میں انہیں انڈین سائنس کانگریس کا صدر جلسہ منتخب کیا گیا۔ اگلے سال حکومت ہند نے انہیں 'سر' کے خطاب سے نوازا۔ ۱۹۳۳ء میں انہیں بنگلور کی انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا۔ رمن نے اس انسٹی ٹیوٹ میں فزکس ڈیپارٹمنٹ قائم کیا اور اس کی توسیع و ترقی میں بھی جی جان سے لگ گئے۔ مگر انگریز حکومت کی مداخلتوں سے تنگ آکر انہیں انسٹی ٹیوٹ کو چھوڑنا پڑا۔ ۱۹۴۸ء میں بنگلور ہی میں رمن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا اور اسی کے قیام سے لے کر آخری دن تک اس ادارے میں اپنی تحقیق و جستجو کا عمل جاری رکھا۔

۱۹۵۴ء میں انہیں بھارت کے سب سے بڑے اعزاز بھارت رتن سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ متعدد قومی و بین الاقوامی اعزازات و انعامات سے نوازے گئے۔

۲۱ نومبر ۱۹۷۰ء کو ان کا جسد خاکی خاک کی نذر ہوگیا۔ ؎

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

بہ خطِ شاعر



عمر انصاری

غزل

نظر کو کون ہے جو یہ رسائی دیتا ہے
جہاں بھی جا کے چھپے وہ دکھائی دیتا ہے

وہاں ہنوز ہیں ذرّے امیدِ باریابی کی
نہ واپسی ہی کا رستہ سجھائی دیتا ہے

عجب طرح کی یہ چپ ہے کہ ہر لگا ہے آج
عجیب شور سا اٹھتا سنائی دیتا ہے

کہاں میں اور کہاں ساری کائنات کے غم
وہ ہلکا ہے دل کو جو اتنی سمائی دیتا ہے

نظر تو آتا ہے لگتا نہیں کسی کے بھی ہاتھ
قدم قدم پہ غضب کی چھائی دیتا ہے

اک اشک شعر میں ڈھلتا ہے جب کہیں جاکر
قلم جو دل تو جگر روشنائی دیتا ہے

میں خود کو ڈھونڈنے لگتا ہوں ہر زبان میں
فریب بھائی کو جب اس کا بھائی دیتا ہے

جو دیکھنا ہے تو اپنے ہی دل میں جھانک کے دیکھ
اس آئینے میں تو سب کچھ دکھائی دیتا ہے

عمر یہ کارِ خرد سلسلہ طفلِ ناداں سے
جو ماں سے چھٹ کے بھی ماں کی دہائی دیتا ہے

عمر انصاری

سورج اور چاند

کرشن موہن

دُنا چل کے آدی باسی رکھتے ہیں وشواس ابھی تک
اس قِصّے میں
جب سنسار رچا تو اس میں دو سورج تھے
باری باری تاباں ہوتے
اس صورت میں رات کبھی آتی ہی نہیں تھی
انسانوں کو اپنے کاموں سے آرام نہیں ملتا تھا
اور وہ سو سکتے ہی نہیں تھے
لوگوں کی درخواست پہ اک نامی اور تیکھے تیر انداز نے اک سورج پر
تیر چلایا اور دھرتی پر مار گرایا
جب وہ تاباں ہونے کو تھا
ہر جانب اندھیارا چھایا
اور سدا چھایا ہی رہے گا، یوں لگتا تھا

دوسرا سورج
غصّہ و غم میں تاباں ہونے سے یکسر منکر ہو بیٹھا
آخر کار اہلِ دنیا نے اک مُرغ نامہ بر بھیجا
یک پہاڑ کی چوٹی پہ اُڑ کر اُس نے سورج کی منّت کی اور بولا
ہر مقدس تاباں ہو جا
سورج مان گیا لیکن یہ شرط بھی رکھ دی
جانور ایک ہزار چڑھائے جائیں گے اُس پر روزانہ
آدھے آدھے شام سویرے
صلح ہوئی تو مُردہ سورج چاند کے چہرے میں جی اُٹھا
دُنا چل کے آدی باسی رکھتے ہیں، وشواس ابھی تک
اس قصے میں

بھدا، پشپانجلی، دہلی ۱۱۰۰۹۲

تقدیر

مزینہ عثمانی

تم بہت خوش تھے کہ افتاد کے دن بیت گئے
نارسا نالہ و فریاد کے دن بیت گئے
ہم بھی خوش تھے کہ نہیں راہ میں مشکل کوئی
لیکن اس شومئ قسمت کو تو ہم بھول گئے
سامنے جس کے حقیقت ہے تمہاری نہ مری

آج پھر پرسشِ حالت کو چلی آئی ہے
وہی اک ہمدمِ دیرینہ جو تنہائی ہے
جس کو دو دن کی چکا چوند میں ہم بھول گئے
پھر وہی شب کا یہ بوجھ وہی وحشتِ دل

ہم کوئی بات جو چاہیں تو بنائے نہ بنے
نیند رُوٹھے ہوئے محبوب کی مانند جیسے
لاکھ بہلائیں منائیں تو منائے نہ بنے

یونہی ظلمت کی گھنی چھاؤں میں چلنا ہے ہمیں!
یونہی قسمت کا گرانبار ستم سہنا ہے
یونہی چلتے رہے آخر تو گزر جانا ہے
خاکِ یک مشت کی مانند بکھر جانا ہے!

۲۵۰۱ - بارہ دری، بلّی ماران دہلی ۱۱۰۰۰۶



غزلیں

منظور ہاشمی

جانتا ہوں کہ مرے ہاتھ تو جل جائیں گے
راکھ میں دفن جو شعلے ہیں نکل جائیں گے

یہ جو اک تم سے تعلق ہے اسے توڑ نا مت
ورنہ اس لفظ کے معنی ہی بدل جائیں گے

کوئی آواز، اسی سمت سے پھر آئے گی
ہم بھی پھر اس کے تعاقب میں نکل جائیں گے

پھر کوئی چہرہ اندھیرے میں کرن کی صورت
پھیلتا جائے گا اور دیپ سے جل جائیں گے

لوٹ کر آنے سے پہلے کبھی سوچا بھی نہ تھا
ہم کسی اور سفر پر بھی نکل جائیں گے

کس لیے آتا نہیں، سامنے میدان میں وہ
تیر کیا ٹوٹی کمانوں سے بھی چل جائیں گے؟

گزرے ہوئے تمام مناظر، نظر میں ہیں
گھر میں بھی اس طرح ہیں کہ جیسے سفر میں ہیں

پتھراؤ کرنے والے بہت دُور بین ہیں
کچھ پھل ضرور اب بھی، ہمارے شجر میں ہیں

یا تنگ ہو گئی ہیں فضاؤں کی سرحدیں؟
یا وسعتیں تمام مرے بال و پر میں ہیں؟

ہے کس کا انتظار کہ اُجڑے مکان میں؟
آنکھیں سی اب بھی چپکی ہوئی بام و در میں ہیں!

انداز آندھیوں کا یہ پہلے کبھی نہ تھا
محفوظ جنگلوں میں ہیں اب کے نہ گھر میں ہیں!

منظورؔ سب یہیں ہیں ترے شہر کے عذاب
محسوس تو کریں کہ ہم اپنے ہی گھر میں ہیں!

عجیب رنگ مرے دھوپ کے دیار میں تھا
شجر خود اپنے ہی سائے کے انتظار میں تھا

نہ جانے کون سے موسم میں پھول کھلتے ہیں؟
یہی سوال خزاں میں، یہی بہار میں تھا

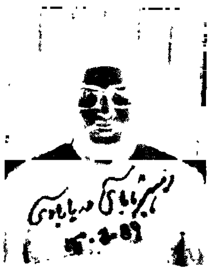
ہر ایک سمت، ہوا کے عظیم لشکر تھے
اور اک چراغ ہی میدانِ کارزار میں تھا

کھنچی ہوئی تھی مرے گرد، واہموں کی لکیر
میں قید، اپنے بنائے ہوئے حصار میں تھا

مرے شجر پہ مگر، پھول پھل نہیں آئے
نہ یوں تو پھلتے درختوں ہی کی قطار میں تھا

کوئی مکین تھا، نہ مہمان آنے والا تھا
تو پھر کواڑ کھلا کس کے انتظار میں تھا

۱۔اے۔ نذیر احمد روڈ، اے۔ایم۔یو۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲



غزلیں



کنول پرشاد کنول

اُترتے تھے جہاں اہلِ جنوں کے کارواں یارو
نہ اب وہ گاؤں باقی ہیں، نہ اب وہ بستیاں یارو

سدا بجھتے رہے جو پھول سا، دُکھیوں کی راہوں پر
کڑکتی ہیں اب اُن کے سر پہ پیہم بجلیاں یارو

جو سیدھے سچے انساں ہیں بیاں ہو حال کیا ان کا
نہ قدموں میں زمیں اُن کے، نہ سر پہ آسماں یارو

نہ پوچھا جن بڑوں کو زندگی میں یار لوگوں نے
اُنہیں کی مورت پہ کھلتی ہے ہر دن اک دُکاں یارو

بڑے فن اور بڑے فن کارے جلتے ہیں اب ساتھی
جو روشن تھے بھلا بسان دلوں میں کیوں دھواں یارو

کنولؔ کا حوصلہ دیکھیں جو اہلِ دل تو رو دیں گے
گھرا ہے اِک مجاہد قاتلوں کے درمیاں یارو

اوم کرشن راحت

میں دُعا مانگوں تو دل مجھ سے خفا ہو جائے گا
سر جھکا تو سر کو سجدوں کا نشہ ہو جائے گا

یہ مجھے معلوم کب تھا خواہشوں کی بھیڑ میں
میرا اک اک سانس جینے کی سزا ہو جائے گا

یا تو مجھ سے چھین لو یہ بُت تراشی کا ہُنر
ورنہ میں جو بُت تراشوں گا خدا ہو جائے گا

خواہشوں کے ڈوبتے سورج نے بتلایا نہ تھا
میرا سایہ میرے قد سے بھی بڑا ہو جائے گا

میرے درد و کرب کی پرچھائیاں چہرے پہ ہیں
میں یہ آنسو روک بھی لوں گا تو کیا ہو جائے گا

دھیرے دھیرے خواہشیں دم توڑ کر رہ جائیں گی
جلتے جلتے دل بھی مرگھٹ کا دیا ہو جائے گا

رہبر تابانی دریابادی

زہر کو قند بہ زعم ہمہ دانی کہنا
میرے مسلک میں نہیں آگ کو پانی کہنا

واقعہ واقعہ ہے مصلحت اندیش نہ بن
بے ضمیری ہے حقیقت کو کہانی کہنا

بات اگر حق ہے تو کچھ خود کیوں نہیں ہمت پڑتی
زیب دیتا نہیں اوروں کی زبانی کہنا

یوں تو میں نے بڑی تفصیل سے خط لکھا ہے
پھر بھی کچھ اپنی طرف سے بھی زبانی کہنا

نیند آجائے مرے فاقہ زدہ بچوں کو
شب کے ستارو! کوئی ایسی کہانی کہنا

غم کو اجداد کی میراث سمجھنا رہبرؔ
درد کو اپنے بزرگوں کی نشانی کہنا

پریم سدن، ۲-۲-۶۶۲۷-۱۳ دھول پیٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۶

۱۵۲/SL فریدآباد (این۔آئی۔ٹی) ۱۲۱۰۰۱

صیاباد، ضلع بارہ بنکی (یوپی)

آمنہ ابوالحسن

پونجی



چھوٹے سے ملگجے روشن دان کے شیشے سے چھنتی ہوئی روشنی کے مدّھم مدّھم حلقوں میں شنّو نے اپنی میلی پوٹلی کھول کر بے حد اشتیاق سے اپنی جمع شدہ پونجی کا نہ جانے کتنی مرتبہ جائزہ لیا۔ اس پونجی میں ہر بار کے مختصر اضافے کے حسابوں شنّو کا خون بھی قطرہ قطرہ بڑھتا رہتا تھا۔ شرابی کبابی باپ کی مستقل ٹھوکروں سے اس کی کمزور اور لاغر ماں اگر مر نہ جاتی تو اپنی مفلسی کے باوجود شنّو کو کلیجے سے لگا کے پال لیتی اور چاہے پیٹ بھرتا یا نہیں، مگر ماں کا پیار پا کر شنّو خوش خوش جی ہی لیتی۔ لیکن دنیا کا کاروبار سنبھالنے والے بے درد مَردوں نے عورتوں کو کس کس محاذ پر پسپا نہیں کیا تھا۔ غریبوں کا تو ذکر ہی کیا، امیر گھرانوں کی بہت سی عورتیں بھی اپنے حکمراں مَردوں کی بے جا حکمرانیوں سے انتہائی تنگ اور نالاں تھیں۔ کچھ کر نہیں سکتی تھیں تو بے چاری شنّو کی ماں کیا کر لیتی۔

جس گھر میں شنّو ملازمت کر رہی تھی وہ بھی اچھا خاصا مال دار گھرانہ تھا۔ کسی آسائش کی کوئی کمی نہیں تھی۔ پھر بھی مالک اور مالکن میں

۔ پٹودی ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

زیادہ تر ٹھنی رہتی تھی۔ نوعمر شنّو جو بتدریج جوانی کی طرف بڑھ رہی تھی اور وہ بہت سی باتیں جو پہلے نہیں سمجھ سکتی تھی، اب بغیر کسی کے سمجھائے وہ خود وضاحت سے سمجھنے لگی تھی اور سچ یہی تھا کہ اس کے غربت زدہ گھر کی طرح یہاں بھی مالک حاکم اور مالکن اسیر تھی ـــــ یہی سب دیکھ دیکھ کر شنّو نے بغیر کسی جانب داری کے مان لیا تھا کہ مرد عورت کے معاملات میں مرد کا پلڑا ہی بھاری ہوتا ہے اور عورت خواہ لاکھ طرار اور چالاک ہو آخری بازی مرد سے ہار ہی جاتی ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں وہ بے حد خاموش اور فرماں برداری سے اپنے سبھی فرائض پورے کرتی اور مالک مالکن کے کسی بھی ذاتی معاملے میں سب کچھ دیکھتے سمجھتے ناانصافی سے واقف ہوتے ہوئے بھی کبھی زبان نہیں کھولتی۔ کسی کو کچھ نہیں بتاتی کہ اگر نکالی گئی تو خود بھی اپنے شرابی باپ کے حوالے ہو کر اپنی ماں کی طرح گھل گھل کر مر جائے گی کیوں کہ شنّو خوب جان چکی تھی کہ شراب انسانوں سے ان کی نرمی اور سوجھ بوجھ اس طرح چھین لیتی ہے جیسے تیز دھوپ مٹکوں سے ٹھنڈا اور میٹھا پانی اُڑا لیتی ہے اور اپنی بیوی پر چاہے مالک نے جائز ناجائز جیسے بھی حق جتائے ہوں، مگر شنّو کی طرف کبھی نگاہِ غلط انداز سے

دیکھا بھی نہیں تھا۔ شاید شنّو کو قابلِ التفات ہی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ کالی کلوٹی میلی کچیلی ذرا سی لاغر چھوکری جو مالک کے ٹکڑوں پر پل پل کر اب کافی مضبوط ہو چکی تھی۔ تھی تو آخر کوڑے کا ہی حصہ۔ ..... اور ویسے بھی مالک کو عورتوں کی کیا کمی تھی؟ ہم پلّہ، ہم رتبہ، ہم مشرب عورتیں ہی عورتیں مالک کے اردگرد پھیلی ہوئی تھیں۔ خود مالک کی فیکٹری میں ..... کلب میں۔ جہاں مالک پابندی سے ہر شام جایا کرتے تھے اور اکثر کوٹھی میں بھی۔ مالکن کے عین سامنے۔ اپنی اپنی مختلف ضرورتوں کے لیے مالک کی شہرت کے نام لیے۔ ان کے نام اور مقام کو اور زیادہ بلند کرنے کے لیے مختلف بہانوں سے وہ آتی ہی رہتی تھیں اور بڑے بڑے چندے وصولنے کے دوران اپنی مچلتے اداؤں کے ساتھ ساتھ ایسے بلند شان دار قہقہے لگاتی تھیں کہ مالکن تو پیچ و تاب کھاتی ہی تھیں، شنّو کے بھی پسینے چھوٹ جاتے تھے، لیکن جب دیکھتے بھالتے مالکن ہی ان کا کوئی سدِباب نہیں کر سکتی تھیں تو حقیر فقیر شنّو بے چاری کیا کر لیتی۔ اپنی اوقات جان کر شنّو نے خود ایسے معاملات سے کبھی کوئی غرض نہیں رکھی۔ لیکن جب طویل تعطیلات میں مالکن کی نوجوان لڑکی زرینہ ہاسٹل سے قیام

کے لیے گھر آتی تو تب شنو کی عید بن آتی۔ طرح طرح کے ہیئر اسٹائلز، نئے نئے ڈیزائن کے ملبوسات ——— بہترین پرفیومز ——— وقفے وقفے کی پکنکوں اور نئی موویز کا میلہ سا لگ جاتا۔ جس میں زرینہ کی خاص سہیلیوں کے ساتھ ساتھ شنو بھی ضرور حصے دار ہوتی۔

اگر والدین کے آئے دن کے اختلافات سے عاجز نہ ہوتی تو شاید زرینہ کبھی ہوسٹل کا رُخ نہ کرتی۔ مگر اپنی تعلیمی یکسوئی اور ذہنی فراغت کے لیے اُسے ایسا کرنا ہی پڑا تھا اور اب اس کا گھر آنا شنو کے لیے ہمیشہ عید برابر ہوتا تھا۔ کیونکہ زرینہ جب بھی آتی، اپنے پرانے کپڑوں کے ڈھیر کے ساتھ اپنے نئے ناپسندیدہ کپڑے بھی شنو کے حوالے کر جاتی تھی۔ جنہیں ایک مسرت آمیز حیرانی کے ساتھ بدل بدل کر پہن پہن کر شنو اپنے آپ میں مگن رہتی تھی۔ ابتدا سے تیل پھلیل اور مناسب وقت پر غسل اور مناسب غذا کی بے نیازی سے البتہ شنو کے گرد دے بالوں کی چوہے کی دم جیسی سخت چٹیا کسی طرح اُس کے قابو میں نہ آتی تھی اور ہمیشہ شنو کی پیٹھ پر پھدکتی رہتی تھی جس کا شنو کو سخت ملال تھا کہ وہ چاہ کر بھی کبھی تنہائی میں زرینہ بی بی جیسے بال نہیں سنوار سکتی تھی..... مگر شنو جس حال میں تھی، خوش اور مست تھی۔ اپنے فرائض میں بہ دل و جان غرق تھی۔

مہینے کے مہینے تنخواہ تو اس کا باپ خود آ کر مالکن سے لے جاتا تھا تاہم وقت وقت پر کوٹھی آنے والے مہمان، رشتے دار اور خود زرینہ جو اس کی بے چارگی اور غربت پر رحم کھا کر اپنی مرضی اور میلان سے شنو کو جو ٹپ دیا کرتی تھی وہی دراصل شنو کی پونجی تھی جسے نہایت راز میں جوڑ جوڑ کر شنو ہمیشہ سوچتی کہ آنے والی میٹھی عید پر سب کی طرح اپنی کمائی اور اپنی پسند کا کپڑوں کا ایک جوڑا ضرور سلوائے گی، مگر نہ جانے کتنی عیدیں نکل چکی تھیں اب تک اتنی رقم ہی جمع نہیں ہو سکی تھی جتنی ایک خوبصورت پسندیدہ جوڑے کے لیے درکار ہوتی۔

یوں ہر عید پر مالکن کی جانب سے اُسے باقاعدہ نئے کپڑوں کا جوڑا یقینی طور پر مل جاتا تھا مگر اپنی محنت کی کمائی اور اپنی خصوصی پسند کا فخر کبھی مالکن کے دیے ہوئے کپڑوں سے وابستہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس طرح کھینچ تان کے روپیہ، اٹھنی، چونی والی ٹپ حاصل کر کر کے بھی کپڑے بنانے کے لائق پیسے شنو کے پاس جمع نہیں ہوئے تھے، مگر شنو بددل یا ناامید نہیں تھی ——— اُسے پورا یقین تھا کہ آہستہ آہستہ سہی ایک نہ ایک دن اُس کی خواہش ضرور پوری ہو گی اور وہ حقیقی معنوں میں اِترا سکے گی.....

اپنی پونجی کی اُس نے اپنے باپ کو ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔ صرف زرینہ اس بابت جانتی تھی۔ ویسے زرینہ کے دیے ہوئے کپڑے بھی اچھے خاصے ہوتے تھے، جس پر دوسری ملازمائیں رشک و حسد کیا کرتی تھیں۔ مگر اپنی کمائی اور پسند کا جنون شنو سے یوں لپٹا ہوا تھا جیسے اپنی بقا کے لیے مضبوط سہاروں سے نازک اندام بیلیں لپٹ جاتی ہیں۔

بس اُسی وقت جب ہفتے کے ہفتے نہا کر شنو کپڑے بدلنے کے لیے دروازہ بند کرتی تو احتیاط سے اپنی چھپائی ہوئی پونجی کے دیدار کر کر کے خوش ہو لیا کرتی۔ چنانچہ آج بھی منٹوں میں اپنی پونجی دیکھ بھال کے اُسے ہمیشہ کی طرح حفاظت سے محفوظ کر کے شنو باہر نکلی۔ تبھی دروازے کی اطلاعی گھنٹی زور سے بج اُٹھی۔ آتے جاتوں کے لیے دروازہ کھولنا بند کرنا شنو کی ہی ڈیوٹی تھی۔ لہٰذا وہ دوڑ کر دروازے پر پہنچی۔ اور دیکھا کہ چند سجے کٹے لوگ صاحب یا بیگم صاحبہ کو پوچھ رہے ہیں تو اُنہیں وہیں روک کے وہ اجازت لینے کے لیے فوراً بیگم صاحبہ کے پاس دوڑی اور اُلٹے قدموں پلٹ کر اُن لوگوں کو بیگم صاحبہ تک لے گئی ——— آنے والوں نے بتایا کہ وہ سیلاب سے متاثرہ مصیبت زدہ لوگوں کے لیے بطور امداد کپڑے اور پیسے وصول کرتے گھر گھر پھر رہے ہیں اور اسی غرض سے یہاں بھی آئے ہیں تو زیادہ تر مال دار لوگوں کی طرح بیگم صاحبہ نے بھی کڑوا منہ بنا کر جتلایا۔

”ایسے لوگوں کے لیے حکومت نے بہت سے رفاہی کیمپ کھول رکھے ہیں۔ آپ مصیبت زدوں کو وہاں کیوں نہیں لے جاتے.....“

”مصیبت کے مارے بہت ہیں بیگم صاحبہ اور فلاحی کیمپ ان کے لیے ناکافی ہیں، اس لیے انسانیت کے ناطے جو بھی مدد مل جائے ان کے بہت کام آئے گی۔“ مگر بیگم صاحبہ نے کچھ بھی نہیں دیا۔

”اس کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ امداد مصیبت کے ماروں کے لیے ہی وصول کر رہے ہیں۔ اُن کے نام پر آپ یہ مدد کیا خود اپنے لیے حاصل اور استعمال نہیں کر سکتے؟“

تو یہ سن کر آنے والوں کے چہرے اُتر گئے۔

”امدادی کمیٹیوں کی جانب سے دیا گیا یہ باقاعدہ رجسٹر ہے جی، جس میں ہر مدد دینے والے کا نام یا مدد کی رقم یا کپڑوں وغیرہ کا صحیح صحیح اندراج تاریخ وار کیا جاتا ہے۔“

”کیا یہ جعلی رجسٹر نہیں ہو سکتے؟“

”بھروسہ بھی ایک چیز ہوتی ہے بیگم صاحبہ۔“

بیگم صاحبہ کے اٹل تیور دیکھ کر آنے والے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

”اونہہ آج کی دنیا بھروسے کے قابل ہی کہاں ہے۔ قدم قدم پر تو دھوکے ہیں۔ اپنوں اور پرایوں کی طرف سے اور یہ پہچاننا ناممکن کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔“

اب آنے والوں نے قہر آلود کڑی نفرت بھری نگاہوں سے بیگم صاحبہ کو گھورا اور مزید رُکے بغیر روانہ ہو گئے۔

”نکمّے نالائق کہیں کے.....“ شنو جو ایک طرف کھڑی یہ ساری روداد دیکھ اور سن رہی

تھی، دل ہی دل میں بڑبڑائی۔

بیگم صاحبہ سچ کہتی ہیں۔ ان لوگوں کے سچے جھوٹے ہونے کا کیا پتہ . . . . واقعی سب کچھ بٹور کر خود اپنے لیے نہ رکھ لیں۔ جب تک سچ کا یقین نہ ہو جائے کوئی کیوں خواہ مخواہ اپنے اثاثے لٹائے؟

روانہ ہونے والوں کے پیچھے دھڑاک سے دروازہ بند کر کے شنو اپنے کام کاج میں مصروف ہو گئی اور اپنی روزمرہ معروفیات میں آنے والوں کو بالکل بھول بھال گئی۔ مگر اس روز رات کو جب زرینہ نے اُسے میگزین میں چھپی ہوئی مصیبت کے ماروں بھوکوں ننگوں کی تصویریں افسوس کے ساتھ دکھلائیں اور بتایا کہ وہ بھی اپنے کالج کے گروپ کے ساتھ ساتھ گھر گھر جا کر اپنے مصیبت زدہ مفلوک الحال ہم وطنوں کے لیے چندے اکٹھا کرتی رہی ہے تو اُن فاقہ زدوں اور نیم برہنہ انسانوں کو خود اپنی نظروں سے دیکھ کر شنو کانپ کانپ گئی ___ افسوس کی دھار دار کٹار شنو کو تیزی سے کاٹتی چلی گئی۔ شنو کے مسکین مگر مطمئن خدوخال پر گہرے رنج کا گہرا سایہ لہرا کر گزر گیا۔

ہا..... یہ بے چارے پریشان حال لوگ جن کے سروں پر نہ چھت ہے نہ تنوں پر مناسب کپڑے چیتھڑوں میں لپٹے سوکھی گھاس کی طرح یہ بے چارے لوگ اب کیا کریں گے؟ ایک دم دوڑ کر شنو نے دروازہ کھولا اور دیر تک بڑی دور تک نظریں دوڑاتی رہی۔ پھر تو یہ اس کا دستور ہو گیا کہ ہر تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھول کر وہ سڑک پر ضرور جھانک لیتی شاید مدد مانگنے والوں کا کوئی دستہ پھر آ رہا ہو......

مگر پھر کوئی نہیں آیا..... اور اُجڑے ہوئے بے گھر لوگوں کے احساس کی شرم و ندامت سے شنو کا سر خود بخود اپنے آگے جُھک جُھک گیا۔

مدد مانگنے والے آ کر چلے گئے اور اس نے اُنہیں کچھ نہیں دیا......

وہ امیر نہیں، مگر جو کچھ اس کے پاس تھا، وہ تو انہیں ضرور دے سکتی تھی۔ اگر اُس کے پاس کچھ نہ ہوتا تو شاید اُسے پچھتاوا نہ ہوتا مگر اب ___؟

شنو گھُٹی گھُٹی آہیں بھرتی رہی اور اس کا دل اپنی جمع شدہ پونجی سے ایک دم اُچاٹ گیا۔ اپنی محنت کے غرور اور اپنی پسند کے کپڑوں کا شوق اُبال کی طرح دب گیا۔

بقول زرینہ بی بی کے ___ "پیسہ ہی تو انسان کی آرزو اور حقیقت نہیں..... انسان غریب ہو یا امیر۔ اگر دلدار نہ ہوا تو بے کار گیا۔ دوسروں کی آفتوں میں حصہ ڈالنے والے سچ مچ کتنے امیر کتنے شان دار ہوتے ہیں۔"

ہا.... اگر وہ بھی اپنی قطرہ قطرہ جمع شدہ پونجی اُنہیں دے دیتی تو کتنی امیر ہو جاتی .... کتنی شان دار.... لیکن اب تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے واقعی کوڑے کا ڈھیر رہ گئی جس کی کتنی بھی صفائی کی جائے صاف نہیں ہوتا......

●●

بقیہ: گڑیا

لیکن گڈو نے اُسے تمام جذبات اور احساسات سے محروم کر دیا تھا۔ اس کے بال نوچ ڈالے تھے اور پتلیاں نکال کر گویا بصارت سے بھی محروم کر دیا تھا۔ اب اس کی محض بے رنگ چمڑی رہ گئی تھی۔ اب یہ ہاتھوں کا لمس پا کر مسرت کا اظہار کرتی نہ اس کی زبان پر حرفِ شکایت آتا، لیکن مریم اُسے اب بھی اسی ناز و نعم سے پال رہی تھی۔ وہ ہر قدم پر اس کا خیال رکھتی۔ کبھی زمین پر گر جاتی تو جلدی سے اُٹھا کر سہلاتی، چمکارتی، دودھ پلاتی اور اس کا سر اپنے گھٹنوں پر رکھ کر گھنٹوں بیٹھی لوریاں دیتی رہتی اس کی کوشش ہوتی کہ گڑیا ایک لمحے کے لیے بھی اس سے جدا نہ ہو۔ اُٹھتے بیٹھتے، کھانا کھاتے نہاتے، حتیٰ کہ لیٹرین میں بھی وہ گڑیا کو ساتھ رکھتی۔

مریم کی ان حرکتوں پر جمیلہ اُسے ڈانٹتی، گھڑکیاں دیتی اور جب کام دھندوں میں تھک جاتی تو اس کے دو چار ہاتھ جڑ دیتی۔ اور گڑیا چھین کر زمین پہ پٹک دیتی۔ مریم سہم کر ایک جگہ کھڑی ہو جاتی اور گڑیا کو دیکھتی رہتی۔ جب جمیلہ دوبارہ کام میں مصروف ہو جاتی تو وہ گڑیا کو اُٹھا کر کمرے میں چھُپ جاتی۔ اور وہاں بیٹھی دیر تک روتی رہتی۔

میں نے اکثر سوچا تھا کہ تنخواہ ملنے پر بازار سے ایک نہیں بلکہ دو دو گڑیاں لے آؤں گا لیکن کبھی تو شدید مصروفیتیں دامنگیر رہتیں اور کبھی دوسری چیزوں کی حاجت گڑیا خریدنے سے مجھے باز رکھتی۔ اس طرح گڑیا خریدنے کی خواہش محض موہوم سا خیال بن کر رہ گئی تھی:

شام کو جب میں کسی کام میں مصروف تھا تو جمیلہ میرے پاس آئی اور بولی "آپ کی آپ اچھی دوا لائے ہیں اس سے مریم کا بخار بالکل اُتر گیا۔"

مجھے اطمینان کا احساس ہوا۔ میں مریم کے پاس آیا۔ مریم کا چہرہ اب ایک ناقابلِ بیان مسرت سے تمتما رہا تھا اور وہ گڑیا کو گود میں لیے اب بھی اسی شوق سے دیکھ رہی تھی ___ مریم کے پاس بیٹھ کر میں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اس کی پیشانی ٹھنڈی تھی۔ "بھئی اب تو تم ٹھیک ہو گئیں۔" میں نے ہنس کر کہا تو اس نے کروٹ بدلی اور گڑیا کو اوپر اُٹھا کر اور مجھے دکھاتے ہوئے بولی: "یہ میلی ہو گیا ہے۔"

"ہاں ہاں، یہ تمہاری ہی گڑیا ہے۔" میں نے کہا تو اس نے گڑیا کو پھر کلیجے سے لگا لیا۔ اور اس کے چہرے پر گہری مسکراہٹ کے ساتھ تقویت کا رنگ پھیل گیا۔ ●●

غیر طلبیدہ مضامین نظم و نثر کی واپسی کے لیے مناسب سائز کا ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ ارسال فرمائیں۔
(ادارہ)

سلطان سبحانی



بائیں پسلی[۲]

لڑکیاں، شام، سڑک اور میں ....ہاہا
نیا شہر، نئے چہرے، نئی ناکیں، نئی سرگرمیاں...
ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ میں اس شہر کو چھوڑ کر یہاں آگیا ہوں۔ یہاں کی شام کتنی سہانی ہے۔ جیسے جھانسی کی رانی۔ یعنی کسی زمانے میں جب جھانسی میں تھا تو وہاں رانی نام کی ایک لڑکی ہر شام مجھ کو جھانسہ دے کر بھاگ جاتی تھی مگر ایک دن میں نے اس کو پکڑ ہی لیا اور جب اس کی ناک پر اپنے دانتوں کے نشانات ثبت کیے تو مزہ آگیا۔ بڑی سہانی لگی.... ہاں تو میں اپنے سابقہ شہر یعنی مس افروز کے شہر کو چھوڑ کر جب سے یہاں آیا ہوں، بہت مزے میں ہوں۔ اس شہر کی ساری لڑکیاں پرانی ہوگئی تھیں۔ سوری۔ لڑکیاں کبھی پرانی نہیں ہوتیں۔ دراصل میں خود ان کے لیے پرانا ہوگیا تھا۔ اس وقت میں اس نئے شہر کے ایک پُرہجوم سڑک پر چل رہا ہوں۔ دونوں طرف فٹ پاتھ پر کاندھے سے کاندھا چھل رہا ہے۔ گویا کاندھے اور کاندے میں کوئی فرق ہی نہیں۔ پیاز کو مراٹھی میں کاندا کہتے ہیں سامنے بڑا خوبصورت ریسٹورنٹ ہے۔ باہر ایک وردی پوش چوکیدار کھڑا ہے۔ یہ ایک دم روایتی اسٹائل ہے۔ میں جب ریسٹورنٹ جاری کروں گا تو باہر کوئی بیلن دار رکھوں گا۔ اسے کہتے ہیں جدت! چلو بھئی آج ہم اسی ریسٹورنٹ میں کچھ وقت مزے اڑائیں ہاں تو وہ شہر میں نے کیوں چھوڑا؟ یہ بہت اہم سوال ہے۔ دراصل وہاں عزت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ ارے! یہ لڑکی مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہے؟ ہوں سمجھا، ضرور کبھی اس نے مجھے اپنے خوابوں میں دیکھا ہوگا۔
خیر... اُس شہر میں ایک رات بڑا عجیب واقعہ ہوگیا میں پلنگ پر سویا ہوا طرح طرح کے خواب دیکھ رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھٹاک سے کھل گیا۔ میں چونک اٹھا۔ سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے کالے لباس میں ایک لانبی سی لڑکی کھڑی تھی۔ میں گھبرا گیا۔ وہ میرے قریب آئی اور مجھے شکیلہ کی بلی کی طرح گھورنے لگی۔ اس کی ناک بہت لمبی تھی اور ناخن بھی نوکیلے تھے۔
میں نے بوکھلا کر پوچھا "کون ہو تم؟"
وہ بولی "میں چڑیل ہو۔"
"چڑیل؟" میں نے گھبرا کر اس کے پنجوں کی طرف دیکھا۔ "مگر تمہارے پاؤں تو سیدھے ہیں۔"
"میں سیدھے پاؤں کی چڑیل ہوں۔"
"اچھا۔"
پھر سوچا کہ اس سے اور کون سا سوال پوچھنا چاہیے، لہذا ایک تاریخی سوال کر دیا۔
"تم میرے ساتھ کیا سلوک کروگی؟"
وہ بولی "وہی سلوک، جو ایک چڑیل بھوت کے ساتھ کرتی ہے۔"
"مگر میں بھوت نہیں ہوں۔"
"تم پکے بھوت ہو۔ تم نے اس شہر میں بہت سی لڑکیوں کی ناکوں پر حملے کیے۔ دانتوں سے کاٹا انھیں۔"
"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ مگر تمہاری ناک اتنی لمبی کیوں ہے؟"
"یہ میری ذاتی ناک ہے۔" وہ اور تیزی سے گھورنے لگی۔ "اب تم اپنی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"
خوف کی وجہ سے میری حالت خراب ہوگئی۔ میں سمجھ گیا کہ عزت خطرے میں ہے۔ اگر اس نے میرا بوسہ وغیرہ لے لیا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ جسے بھی یہ بات معلوم ہوگی وہ تو یہی سوچے گا کہ اب چڑیلیں بھی مجھ سے تعلقات رکھنے لگی ہیں۔ ممکن ہے وہ میرا خون ہی چوس لے اور میں بھوت بن جاؤں لہذا کسی طرح اس سے جان چھڑانی چاہیے۔
وہ اور قریب آکر بولی "سزا بھگتنے سے پہلے اپنی آخری خواہش بیان کر دو۔"
میں اپنی مُرغی سے ملنا چاہتا ہوں۔ بہت دنوں سے

۱۹۳۔ ایم ایچ بی کالونی، مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳۔ (ضلع ناسک) مہاراشٹر

کڑوک ہے۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ ڈھونگ کر رہی ہے۔" کہاں ہے وہ؟"
"پچھواڑے دڑبے میں ہے۔"
"ٹھیک ہے جاکر مل آؤ۔ مگر یاد رہے، بھاگنا نہیں۔"

میں سر ہلاکر پچھواڑے گیا اور وہیں سے رفوچکر ہوگیا۔ تب سے یہاں ہوں میں۔ اچھا شہر ہے یہ، مگر یہاں بھی دو چار لوگ مجھے پاگل سمجھنے لگے ہیں۔ نا سمجھ ہیں وہ، اگر میں پاگل ہوتا تو اس طرح سڑکوں پر آزادانہ تھوڑی گھومتا۔ کسی اعلیٰ یونیورسٹی میں لیکچرار ہوتا، کوئی میڈیکل کالج کا پرنسپل ہوتا۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور مجھے اتنے تعجب سے کیوں دیکھ رہا ہے؟ اگر اس چڑیل کی ناک کتنی لمبی تھی اگر میں اس سے کہہ دیتا کہ تمہاری ناک بھنڈی کی طرح ہے تو وہ یقیناً میرا خون پی لیتی۔ پتہ نہیں افروزا اور نیلوفر وہاں کس حال میں ہونگے۔ یہ سامنے سے جو براؤن سوٹ والا آرہا ہے کتنا لحیم شحیم ہے۔ بالکل شتر مرغ کی طرح۔ شتر مرغ بھی کتنا عجیب جانور ہے۔ جانور ہے یا پرندہ ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہیں سے جانور دکھائی دیتا ہے اور کہیں سے پرندہ۔ اتنی متضاد شخصیت، کہ اسے دیکھ کر انسان بھی شرمائیں۔ سنا ہے کہ شتر مرغ جب اپنے دشمن سے خوفزدہ ہوکر جان بچانا چاہتا ہے تو ریت میں اپنی گردن دھنسا دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اب دشمن اسے دیکھ نہیں سکتا۔ بہترین آئیڈیا ہے یہ۔ دشمن کو جب اس کا سر ہی دکھائی نہیں دیگا تو وہ کیا سمجھے گا کہ یہ کیا چیز پڑی ہے۔ وہ لحیم شحیم آدمی میرے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے دیکھ کر کتنا مسکرا رہا تھا، کہیں کسی نے میرے بارے میں اس سے کچھ کہا تو نہیں۔ وہ دو لڑکیاں جو میرے پیچھے پیچھے آرہی ہیں ضرور میرے تعاقب میں ہیں۔ مجھے ان کی نیت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے سیدھا سادا دیکھ کر میرا اغوا کرلیں۔ بہت خراب زمانہ آگیا ہے۔ جدھر دیکھو، ادھر لڑکیاں۔ مجھے اپنی رفتار اور تیز کر دینی چاہیئے۔ ریسٹورنٹ قریب آگیا ہے۔ آج کی شاندار شام ہم وہیں گزاریں گے یہ سامنے جو جنرل اسٹورس ہے اس کا مالک کتنے موٹے شیشوں کی عینک لگائے ہوتے ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کاونٹر پر اُلّو بیٹھا ہوا ہے۔ اُلّو بہت ہی عجیب وغریب پرندہ ہے۔ میں تو جب بھی اس کی صورت دیکھتا ہوں مجھے بہت زور سے ہنسی آجاتی ہے۔ بڑے سے سر پر یہ بڑی بڑی آنکھیں۔ اگر کبھی اُلّو کے سامنے آئینہ رکھ دیا جاتے تو مزہ آجاتے گا۔ جوں ہی وہ آئینہ میں خود کو دیکھے گا بے ساختہ بول اٹھے گا۔ "یہ کون بے وقوف ہے۔" اچھا ہوا یہ پرندہ صرف ویرانوں میں رہتا ہے۔ اگر شہر میں آگیا تو بہت سارے لوگ اپنے چشمے اتار لیں گے۔ بہت سی دوکانیں بند ہو جائیں گی۔ ہاں یاد آیا، میں جہاں رہتا ہوں وہاں بھی ایک موٹی عینک والا ہے۔ اس کی عینک اتنی موٹی ہے کہ اس کی وجہ سے اس کی عقل بھی متاثر ہوگئی ہے۔ مگر میری کھڑکی کے سامنے جو ایک دوسری کھڑکی ہے وہ شاید مجھ سے متاثر ہے، ہر وقت میری تاک میں رہتی ہے۔ یعنی کھڑکی نہیں بلکہ ایک لڑکی۔ اس کا نام میمونہ ہے۔ فارسی زبان میں میمونہ بندریا کو کہتے ہیں اور عربی میں نیک بخت کو۔ پتہ نہیں اس کا نام فارسی میں ہے یا عربی میں۔ اس کی حرکتیں دیکھ کر تو لگتا ہے کہ یقیناً اس کا نام فارسی میں ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر کبھی ہاتھ نچاتی ہے، کبھی کولھے مٹکاتی ہے، کبھی اُچھل کود کرتی ہے۔ ابھی چند دن ہوتے مجھے اشارے سے بلا رہی تھی۔ میں نے سر ہلا کر انکار کیا تو وہ مکّہ بتلانے لگی۔ شاید گالیاں بھی دیں۔ پھر اندر جاکر ایک بڑا سا ہتھوڑا اٹھا لائی۔ میں نے جلدی سے اپنی کھڑکی بند کر دی۔ وہ واقعی بہت خطرناک لڑکی ہے۔ اس سے محتاط رہنا بہت ضروری ہے۔ لڑکی ذات ہے پتہ نہیں کب کیا کر گزرے۔

ایک سفید بلّی کئی دنوں سے بہت پریشان کئے ہوتے ہے۔ روزانہ چوہے ڈھونڈنے کے بہانے آتی ہے اور مجھے گھور گھور کر اکڑتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ کہیں اسے میرے بارے میں کوئی غلط فہمی تو نہیں؟ غلط فہمی پر مجھے ایک بات یاد آگئی۔ کل جب میں گھر سے باہر نکلا تو پڑوس کی ایک خوبصورت سی لڑکی دوڑتی ہوئی آئی اور مجھ سے ٹکرا گئی۔ پھر شرمندہ ہوکر بولی۔

"سوری! میں سمجھی کہ یہ تم ہو۔"

میں نے بھی کہا ——— "کوئی بات نہیں، یہ میں نہیں ہوں۔"

میں نے تو سوچ لیا ہے، اب ٹکرائے گی تو کہوں گا یہ تم بھی نہیں ہو۔ کیسا زمانہ آگیا ہے، عقل کا کہیں بھی نام ونشان نہیں! اور کچھ لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہیں۔ یعنی اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ پتہ نہیں آج کل سیدھے چور کیوں نہیں پیدا ہو رہے ہیں۔ اس بات پر مجھے وہ موٹی عینک والا یاد آرہا ہے جو میرے بازو میں رہتا ہے۔ وہ خود کو بہت جینئس اور صحیح سمجھتا ہے اور باقی سب کو فضول اور غلط۔ آئے دن شور کرتا ہے کہ سب لوگ صرف غلطیاں کرنا جانتے ہیں۔ میرا دھوبی کہہ رہا تھا کہ وہ نقاد ہے دن رات دوسروں کی تخلیقات دھوتا رہتا ہے۔ دھوبن جو خود کو ایک اچھی شاعرہ سمجھتی ہے کہہ رہی تھی کہ وہ بڑا مغرور اور گھمنڈی آدمی ہے۔ شاید احساسِ کمتری کا شکار ہے۔ دوسروں میں عیب ڈھونڈتا ہے مگر خود تو پوری پوری کتاب غلط لکھ ڈالتا ہے۔ مجھے لگتا ہے دھوبی اور دھوبن سے اس کا کچھ تنازعہ چل رہا ہے، چلنا بھی چاہیئے اگر کوئی کسی شخص کی پھولوں کی کیاری میں گھس کر گدھوں کی طرح لوٹنے لگے تو ظاہر ہے کہ تنازعہ پیدا ہوجائے گا اور اس کا کوئی بھی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ لوٹنے والے کے کپڑے خراب ہو جائیں گے اور مزید تنازعہ پیدا ہوگا۔ تنازعہ تو آج کل میرا بھی چل رہا ہے۔ عبدل کے بکرے سے۔ وہ بھی پڑوس ہی میں رہتا ہے۔ میں جب بھی ادھر سے گزرتا ہوں تو میری طرف سینگ تان کر یوں دوڑتا ہے جیسے میں خیر۔۔۔۔ اس کا دوسرا سینگ ٹوٹا ہوا ہے۔ عبدل کہہ رہا تھا کہ ایک دن ایک کالے رنگ

کی کار کو اس نے بھینس سمجھ کر سینگ مارا تو کار اس کا ایک سینگ ہی لے گئی۔ مگر وہ بکرا مجھے سمجھتا کیا ہے؟ اگر اس کی ناک گندی نہ ہوتی تو پھر مزہ چکھاتا اسے۔ چھوڑو! اس کے فراق میں نہیں رہنا چاہیئے۔

ارے! وہ دونوں لڑکیاں تو ابھی تک پیچھے پیچھے چل رہی ہیں۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خطرہ ہے۔ مگر دونوں کتنی صحت مند اور سڈول ہیں۔ جیسے لوکیاں۔ وہ جو مرون کلر کے لباس میں ہے اس کی ناک کتنی خوبصورت ہے اگر کبھی تنہائی میں ملی تو کاٹ لوں گا۔ وہ سرمہ کی دوکان والے کی ناک کتنی پھیلی ہے جیسے کسی نے پکے ہوئے پپیتے پر گھونسہ مار دیا ہو۔ ہاہا.... اس روڈ پر کتنا ہجوم ہے۔ ابھی ابھی کوئی لڑکی مجھے کہنی مار گئی ہے۔ ارے! وہ دُم کٹا ہوا کتا کتنی حیرت سے دیکھ رہا ہے۔ لگتا ہے اس کی نظر میری جیب پر ہے مگر میری جیب میں تو میری نئی مُرغی کی تصویر ہے جسے میں اس شہر میں چھوڑ آیا (پرانی مُرغی تو افروز ہڑپ کر چکی ہے)..... ریسٹورنٹ قریب آگیا ہے۔ چوکیدار پتہ نہیں کیوں یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے جیسے میں انسان نہیں کوئی حویلی ہوں۔ اگر انسان کی طرح حویلیاں بھی چلتیں تو بڑا مزہ آتا۔ سب لوگ ہر وقت اپنی اپنی حویلی ڈھونڈتے رہتے اور حویلیاں خوب ٹک چھپ کرتیں۔ (میں ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا ہوں)....

اندر بڑی رونق ہے۔ لوگ گردن گھما گھما کر میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ کچھ لڑکیاں چہ می گوئیاں کرنے لگی ہیں۔ ضرور مجھ میں کوئی خاص بات ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سب میری شخصیت سے متاثر ہیں۔ ایک ویٹر قریب سے گزرتا ہے۔

"ویٹر چائے لاؤ" میں شان سے کہتا ہوں۔

وہ واٹر گرین کلر کے لباس میں جو لڑکی ہنس رہی ہے اس کی ناک کتنی ستواں ہے۔ شاید پورے دِل میں اتنی خوبصورت ناک کسی کے پاس نہیں ہے۔ جی چاہتا ہے اس سے شادی کر لوں یعنی لڑکی سے نہیں بلکہ اس کی ناک سے۔ ایک ناک کے لیے پوری لڑکی سے شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اتنا بے وقوف تھوڑی ہوں۔ کل دو آدمی میرے بارے میں بہت غلط سلط باتیں کر رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا کہ میں خطرناک قسم کا نفسیاتی مریض ہوں میرے دماغ پر عورت سوار ہے۔

اول تو یہ بات ہی سرے سے غلط ہے اور اگر صحیح بھی ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟ عورت کو چاہیئے کہ وہ ہاتھی گھوڑے پر سوار ہو جاتے۔ اگر ہاتھی گھوڑا نہ ملے تو قابلِ تعریف اور بھی جانور ہیں۔ کسی پر سوار ہو جاتے۔

دوسرا کہہ رہا تھا کہ میں ہر وقت صنف نازک کے خیال میں مست رہتا ہوں۔

یہ بات بھی غلط! سراسر بہتان ہے اور یہ صنفِ نازک کی اصطلاح کس نے ایجاد کی ہے ایجاد کی یا دریافت کی۔ ہر جگہ اختراع زیب نہیں دیتی۔ ادیبوں کو سمجھتا ہی کیا ہے۔ انھوں نے ابھی تک شاید کوئی لمبی ناک والی چڑیل نہیں دیکھی۔ یہ میں ہی جانتا ہوں کہ وہ شہر میں نے کیوں چھوڑا۔ افروز نے میری پوری مُرغی ہڑپ کر لی (چوٹی کہیں کی)، کئی لڑکیوں نے مجھے بکوٹ بھی لیا۔ گالیاں بھی دیں۔ نیلوفر.... خیر جانے دو۔

سامنے کے ٹیبل پر وہ موٹی سی عورت کون ہے؟ اس نے اپنی پکوڑا جیسی ناک میں نتھ میں کیوں ٹانک رکھی ہے۔ کیا اس طرح اس کی ناک قابل دید ہو جائے گی۔ چھی چھی جیسے پکوڑے پر جھینگر ـــ ویٹر چائے لے آیا ہے.... واہ کیا مزے کی چائے ہے۔ ایسی چائے میں ایک بار فرزانہ کے یہاں پی چکا ہوں۔ عجیب لڑکی ہے وہ۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگی۔ تم مجھے اٹھا کر پٹخ کیوں نہیں دیتے۔ ارے! وہ دونوں لڑکیاں تو سامنے آکر بیٹھ گئی ہیں۔ آخر مجھ سے چاہتی کیا ہیں؟ کہنے کو تو بے نیاز بیٹھی ہیں مگر میں جانتا ہوں کہ دونوں میرے ہی بارے میں سوچ رہی ہیں۔ وہ مرون کلر کے لباس میں جو ہے نا، اس کا رنگ کتنا صبیح ہے جیسے ابھی ابھی گوندھا ہوا آٹا۔ ابھی ابھی کا استعمال اس لیے کیا ہے کہ مجھے معلوم ہے تھوڑی دیر پڑا رہنے کے بعد اس کا رنگ تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہاں ایک بات یاد آئی۔ چند دنوں پہلے جب میں کامنی کے یہاں گیا تھا تو وہ چوکی پر بیٹھی ڈانس کر رہی تھی۔ میں سوچنے لگا شاید یہ کوئی نیا ڈانس ہے مگر جب قریب جا کر دیکھا تو پتہ چلا کہ آٹا گوندھ رہی ہے۔ اس کے ڈیڈی بڑے شکی آدمی ہیں۔ مجھ سے کہہ رہے تھے": جب سے تمہارا یہاں آنا جانا شروع ہوا ہے میرے کئی جوتے غائب ہو گئے ہیں": جادوئی جوتے آپ پہنتے کیوں ہیں؟"

اس شہر میں عجیب عجیب طرح کے لوگ ہیں۔ اور لڑکیاں؟..... ان کے بارے میں تو اب مزید کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ لیکن میمونہ سے بچ کے رہنا چاہیئے۔ کتنا بڑا ہتھوڑا ہے اس کے پاس۔ پتہ نہیں کہاں سے لے کر آئی ہے۔ کاونٹر پر منیجر بہت خوش لگ رہا ہے۔ اس نے منہدی یا کسی سیلوشن کے ذریعے اپنے بال لال کر لیے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس کے سر پر کلغی ہے اسے دیکھ کر مُرغیوں کو اکثر غلط فہمی ہو جاتی ہو گی۔ میری نئی مرغی اس وقت جانے کس حال میں ہو گی۔ ممکن ہے وہ بھی افروز کے باورچی خانے میں گھس گئی ہو (بے وقوف کہیں کی)، اُس شہر کی سب لڑکیاں مجھے پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہی ہوں گی۔ ہاہا.... یہاں میں کتنے مزے میں ہوں۔ مگر اس میمونہ کی بچی نے تو بہت ہی پریشان کر رکھا ہے۔ لگتا ہے کہ عاشق ہو گئی ہے مجھ پر۔ کل میں نے خواب میں اسے بہت غصہ میں دیکھا تھا۔ مجھ سے کہہ رہی تھی "اگر تم نے مجھ سے بے وفائی کی تو میں اس ہتھوڑے سے تمہارا سرمہ بنا دوں گی۔" میں نے کہا" سرمہ کا رواج اب کم ہو گیا ہے اس سے تو بہتر ہے لپ اسٹک بنا دو۔" اس بات پر وہ اور بھی غصہ میں آگئی۔ اچھا ہوا کہ خواب بس اتنا ہی دیکھا تھا۔

میں جس گھر میں رہتا ہوں، لگتا ہے کہ عجائب گھر ہے۔ دیواروں پر عجیب عجیب جملے اور نام لکھے

ہوتے ہیں۔ لڑکیوں، پہلوانوں، قوالوں، کرکٹ کے کھلاڑیوں اور کچھ ترکاریوں کی تصویریں چسپاں ہیں۔ پتہ نہیں کیسے کیسے لوگ اس گھر میں رہ چکے ہیں۔ جانے وہ شخص کون ہوگا جس نے ترکاریوں کی تصویریں لگا دیں۔ ایک جگہ بڑا سا لکھا ہوا ہے "دارالاحمقاں" شاید کچھ مفکر اور ڈاکٹر بھی یہاں رہ چکے ہیں۔ اس بیئر کی وردی کتنی سفید ہے۔ جیسے بگلے کے پر۔ چلتا ہے تو خدشہ ہوتا ہے کہیں اڑ نہ جائے۔ ہاں تو اس گھر میں مجھے پہلے ہی دن کئی تجربے ہو گئے۔ اول یہ کہ اس شہر میں پاگلوں کی کمی نہیں۔ دوم یہ کہ اس گھر سے کئی لوگ پاگل خانے بھیج دیئے گئے۔ ایک پڑوسی اکثر مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتا تھا مگر کئی دنوں سے نظر نہیں آ رہا ہے۔ کہیں اسے بھی وہاں نہ پہونچا دیا گیا ہو۔ یہ دنیا تو قدرت کا کارخانہ ہے۔ کارخانہ اور کبوتر خانہ ایک ہی ہے لیکن اگر دنیا کو قدرت کا کبوتر کارخانہ کہہ دیا جاتے تو بہت سے لوگ برا مان جائینگے۔

وہ نتھ والی موٹی کتنی خوش ہے اس کی نتھ کیا خوب چمک رہی ہے۔ جیسے خربوزہ پر درانتی۔ ہاں تو اس گھر میں پہلے ہی دن میرا تعارف پلنگ سے ہوا۔ جوں ہی میں اس پر بیٹھا وہ چیخ اٹھا۔ "اجی جناب —— ذرا آہستہ تشریف رکھیے۔ میں ایک نازک مزاج نواب کا پلنگ ہوں اور کافی بوڑھا ہو چکا ہوں۔"

"تم یہاں کیسے پہونچے؟"

"نواب صاحب نے مجھے ایک کباڑیتے کے ہاتھوں بیچ دیا تھا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ مجھ میں کھٹملوں کی فوجیں تیار ہونے لگی تھیں جن کی وجہ سے نواب صاحب کی صلاحیت دن بدن ختم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ہر وقت اپنے کپڑوں میں کھٹمل ڈھونڈنے لگے تھے۔ اگر میں تجوری ہوتا تو آج میری کافی عزت ہوتی۔"

دیواریں بولیں "ذرا میری بھی سنو۔ مجھ پر چاروں طرف تصویریں اور فقرے وغیرہ جو چسپاں ہیں اس بات کا ثبوت ہے کہ بہت سے لوگ میرا سہارا لے کر اپنے بارے میں بولتے ہیں یا اپنی ذات کا اعلان کرتے ہیں۔"

دروازہ بولا۔ "اس سامنے والی لڑکی سے، جس کا نام میمونہ ہے ذرا ہوشیار رہنا، اس کی وجہ سے کئی لوگ یہاں سے بھاگ چکے ہیں اور ایک دو کے سر پر پٹیاں بھی لگ گئیں۔"

یہ ساری باتیں کوئی سنے گا تو بولے گا۔ "بکواس! دیواریں اور پلنگ وغیرہ بولتے کہیں ہیں؟" ——

ارے بھئی یہ فینٹیسی ہے فینٹیسی۔ اس کے بارے میں کوئی بھی عقل مند نقاد ڈکشنری کو سامنے رکھ کر بھی کہے گا۔ "فرضی... خیالی... غیر حقیقی..."

لیکن میں نے بھی دو چار کتابیں پڑھی ہیں کرشن چندر وغیرہ نے جو فینٹیسی پیش کی کیا اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، کیا وہ محض فرضی ہے۔ بھئی ڈکشنری دیکھنے کی بجائے یہ دیکھنا چاہیئے کہ پلنگ اور دیواروں نے کیا کہا۔ عقل و شعور اگر ڈکشنری کے اندر حاصل ہوتے تو.... خیر جانے دو۔ یہ اپنا موضوع ہی نہیں ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس... ہا ہا۔

ہاں ایک بات یاد آئی۔ ایک دوپہر میں جبکہ گلی سنسان تھی اور سامنے کی کھڑکی میں میمونہ کھڑی لچک رہی تھی میں نے اس سے پوچھا۔

"تم اتنا اچھل کود کیوں بھاتی ہو؟"

وہ بولی —— "میں ٹارزن کی نسل سے ہوں۔"

میں نے کہا —— تم ٹارزن کی نسل سے ہو یا ٹارزن تمہاری نسل سے تھا؟"

اس بات پر وہ بگڑ گئی اور خوب گالیاں دینے لگی پھر ہنس کر بولی۔

"کبھی رات میں ملونا۔ میں بھی تو جانوں تم کس نسل سے ہو؟"

توبہ۔ یہ لڑکی ہے یا آفت.... وہ لمبی ناک والی چڑیل یقیناً مجھے وہاں ڈھونڈ رہی ہوگی۔ سیدھے پاؤں کی چڑیلیاں پتہ نہیں کب سے پیدا ہونے لگی ہیں۔ شاید یہ ایٹمی تجربات کا اثر ہے۔ ارے! یہ کون لڑکی ادھر چلی آ رہی ہے۔ اس کے چہرے سے کتنی وحشت برس رہی ہے۔ بال بھی بکھرے ہوئے ہیں۔ کہیں نشہ میں تو نہیں.... اُف! یہ تو میرے سامنے کی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی ہے۔ لوگ مڑ مڑ کر ادھر دیکھنے لگے ہیں۔ وہ دونوں لڑکیاں بھی اس طرف متوجہ ہیں۔ اوہ! یہ تو میرے کانوں کو مسلسل گھور رہی ہے۔ کہیں وہ چڑیل روپ بدل کر تو نہیں آ گئی؟ مگر میرے کانوں میں ایسی کون سی خاص بات ہے جو یہ اس طرح گھور رہی ہے۔ ممکن ہے اس شہر میں آ کر مجھوٹے ہو گئے ہوں۔

میں خوف و حیرت سے پوچھتا ہوں "تم میرے کانوں کو کیوں گھور رہی ہو؟"

"تمہارے کان مجھے املی کی طرح لگ رہے ہیں۔ اس کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔"

"املی کی طرح؟" —— میں بوکھلا جاتا ہوں۔ تم ہوش میں ہو کہ نہیں؟"

"تم خود ہوش میں نہیں ہو۔ دیکھتے نہیں کہ اس درخت پر لال املی کے دو کنارے لٹک رہے ہیں۔"

"میں درخت نہیں انسان ہوں۔"

"تم کیا ہو مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ مجھے صرف یہ املی چاہیئے۔ تیز کھٹی اور میٹھی۔"

ایک دیٹر قریب آ کر میرے کانوں میں سرگوشی کرتا ہے۔ "اس لڑکی سے ہوشیار رہنا، پاگل خانے سے واپس آئی ہے۔ اب تک کئی لوگوں کے کان چبا چکی ہے۔"

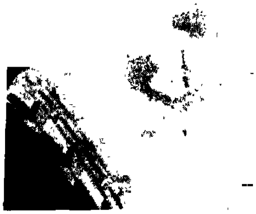
میں گھبرا کر اٹھتا ہوں اور پلک جھپکتے ہی ریسٹورنٹ کے باہر آ جاتا ہوں۔ عجیب لڑکی ہے! ایک پھلے کان کو املی کہہ رہی تھی۔ یہاں سے فوراً بھاگنا چاہیئے۔ لگتا ہے یہاں بھی عزت خطرے میں ہے۔ عجیب شہر ہے یہ۔

دارالاحمقاں، ہتھوڑا، پلنگ، اور املی۔ لڑکیاں... شام... سڑک اور بیئر...

!!!

سن خان

گڑیا



رات کو کسی آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی اور غیر شعوری طور پر میری نظر مریم کی طرف اُٹھی تو میں نے دیکھا وہ اندھیرے میں سیاہ مجسمے کی کی طرح اپنے کھٹولے پر ساکت بیٹھی تھی۔ میں نے ذرا غور سے دیکھنے کی کوشش کی، لیکن مجھے اس کا چہرہ واضح طور سے نظر نہیں آیا۔ اندھیرے میں فقط یہ معلوم ہو سکا کہ وہ ساکت بیٹھی کسی چیز کو دیکھ رہی ہے یا کچھ سوچ رہی ہے۔

میں بستر سے اُٹھ کر اس کے پاس آیا۔

میرے قدموں کی چاپ سن کر اس نے ایک وحشت کے ساتھ میری طرف دیکھا اور وہ جو قد و قامت سے ننھی منی گڑیا جیسی لگتی تھی، سہم کر اور چھوٹی ہو گئی۔ وہ بستر پر پیشاب کر دیتی ہے اس لیے جمیلہ نے اس کا بستر علیحدہ کر دیا ہے اور جب سے جمیلہ نے اس کا بستر علیحدہ کیا ہے، وہ اندھیرے میں زیادہ ڈرنے لگی ہے۔ وہ اکثر رات کو چونک کر اُٹھ جاتی ہے اور روتی ہے۔ میں نے سوچا شاید اس وقت بھی مریم چونک کر اُٹھی ہوگی اور اندھیرے میں زیادہ ڈر گئی ہوگی۔

"کیا دیکھ رہی ہو مریم؟" میں نے پوچھا تو وہ زیادہ سمٹ گئی اور مجھے غور سے دیکھنے لگی۔

مریم کے پاس بیٹھ کر میں نے اس کی پیشانی چھوئی اس کی پیشانی جل رہی تھی اور بدن آہستہ آہستہ لرز رہا تھا۔

"کیا بات ہے بیٹی؟" میں نے اس کو ذرا قریب کرتے ہوئے پوچھا تو مریم کا بدن زیادہ لرزنے لگا اور وہ کسی قدر بے چینی کے ساتھ بولی۔ "میلی گڑیا"

"گڑیا کہاں ہے تمہاری گڑیا؟" میں نے پوچھا تو مریم کچھ توقف کے بعد گلوگیر آواز میں بولی "گڈو نے میری گڑیا کہیں چھپا دی ہے"

پھر رفتہ رفتہ اس کے بدن کی لرزش بڑھ گئی اور اس کے حلق سے ایسی گھٹی گھٹی آوازیں نکلنے لگیں جیسے دیر تک ضبط کرنے کے بعد کسی غمزدہ کی آوازیں نکلتی ہیں۔ "گھبراؤ مت، تمہاری گڑیا کہیں نہیں جائے گی" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ لیکن مریم کو ذرا بھی حوصلہ نہ ہوا۔ وہ زیادہ بے اختیار ہو گئی۔ مجھے خیال ہوا کہ اگر وہ اسی طرح روتی رہی تو گڈو جاگ جائے گا۔ وہ بھی رونے لگا۔ پھر تو ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ دن بھر کی مصروفیات سے نڈھال جمیلہ اُٹھے گی اور مریم کو دھنک کر رکھ دے گی۔ میں لاکھ منع کروں گا لیکن وہ ایک نہ سنے گی بس مارتی چلی جائے گی۔ یہ بھی نہیں سوچے گی کہ مریم اس وقت بخار میں پھنک رہی ہے۔

"چپ ہو جاؤ۔ میں تمہاری گڑیا ڈھونڈ کر ابھی لاتا ہوں" میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے تسلی دی، لیکن رونا اس کے بس میں تھا نہ چپ ہو جانا۔ وہ روتی رہی لیکن کسی قدر ضبط کے ساتھ۔

میں جلدی سے اُٹھا اور گڑیا تلاش کرنے لگا۔ اس اندھیرے میں کوئی چیز واضح طور پر نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ آنگن میں، پلنگوں کے نیچے برآمدے میں — لیکن گڑیا مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ پھر میں نے زیرو پاور کا بلب روشن کیا اور دھندلی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی، لیکن گڑیا کو نہ ملنا تھا نہ ملی۔ میں تھک ہار کر مریم کے پاس آیا۔ وہ ساکت بیٹھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ "گھبراؤ نہیں۔ میں صبح تمہاری گڑیا ڈھونڈ کر تمہیں دوں گا"

میں نے کہا تو مریم کے ساکت بدن میں حرکت ہوئی اور اس کے حلق سے وہی گھٹی گھٹی آوازیں نکلنے لگیں۔ میں اُسے گود میں اُٹھا کر اپنے بستر پر لے آیا اور اپنے پاس لٹا کر تسلیاں دینے لگا۔ اس مریم کی گھٹی گھٹی آوازوں اور میرے بانہہ پر گرتے اس کے گرم گرم آنسوؤں نے مجھے دیر تک ایک

۲۹۸/۱۲۸ - ٹرنچوال روڈ، اشرف آباد، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

بے چینی میں مبتلا رکھا، لیکن آخر کار نیند اس بے چینی پر غالب آ گئی۔ اور پھر مجھے نہیں معلوم کہ وہ کب تک روتی رہی۔

صبح جب میں بیدار ہوا اس وقت مریم جاگ رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر رکھے خاموش لیٹی تھی اور اس کی نظریں خلاء میں جیسے کسی نکتے پر مرکوز تھیں۔ میں نے مریم کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اس کی پیشانی اب بھی جل رہی تھی ——

—— اور سانسیں کچھ ناہمواری کے ساتھ چل رہی تھیں۔ میں نے اس کی کیفیت کے بارے میں جمیلہ کو بتایا تو وہ مریم کے پاس آئی اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولی: "کل میں نے اسے ٹھنڈے پانی سے نہلا دیا تھا۔ اسی لیے اسے بخار ہو گیا ہے۔"

آفس جانے سے پہلے میں ایک مقامی ڈاکٹر سے مریم کے لیے دوا لے آیا۔

شام کو جب میں دفتر سے لوٹا تو جمیلہ کچھ ہراساں نظر آئی۔ وہ مریم کی پیشانی پر گیلا کپڑا رکھے بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ "بخار تو بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ دوا کی تیسری خوراک بھی دے چکی ہوں۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں۔ آپ دوا بھی تو حال کہہ کر اُٹھا لائے ہیں۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائیے۔"

میں اسی وقت مریم کو لے کر ایک تجربہ کار ڈاکٹر کے پاس گیا۔ ڈاکٹر نے اس کے سینے پر آلہ لگایا۔ نبض دیکھی۔ پلکیں ہٹا کر آنکھوں کا رنگ دیکھا اسی دوران وہ کسی زخمی اور دہشت زدہ پرندے کی طرح کبھی میری طرف تو کبھی ڈاکٹر کی طرف دیکھتی رہی۔ بخار کی شدت اور کسی خوف سے اس کے چہرے اور آنکھوں میں ایک ناقابلِ بیان بیچارگی پھیل گئی تھی۔ میں نے تسلی دی۔ "گھبراؤ نہیں۔ ڈاکٹر صاحب انجکشن نہیں لگائیں گے۔" لیکن اسے ذرا بھی تسلی نہ ہوئی۔ وہ اسی بے چینی میں مبتلا رہی۔

واپسی پر میں نے رکشا پھلوں کے ٹھیلے کے پاس رکوایا اور مریم کے لیے سیب خریدے۔ "یہ سب تمہارے لیے ہیں۔" میں نے کہا اور ایک سیب مریم کی طرف بڑھایا۔ اس نے بے دلی کے ساتھ سیب لے لیا۔ لیکن اس کا چہرہ کسی بھی تاثر سے عاری تھا۔ وہ ہاتھ میں سیب لیے میری گود میں سر ڈالے ناہموار سانسیں لیتی اور لرزتی رہی

جمیلہ نے مریم کو نئی دوا پلائی تو اس کے ہونٹ بھنچ گئے اور چہرے پر بے بسی اور تلخی کے تاثرات اُبھر آئے۔ شاید دوا بہت کڑوی تھی میں نے اس کے سرہانے سے ایک سیب اٹھایا اور اس کا موڈ بدلنے کی خاطر پوچھا۔ "میں یہ سیب کھا لوں؟" اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مجھے اس طرح دیکھتی رہی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

"یہ سیب کس کے لیے لائی ہو؟" میں نے ہنس کر پوچھا تو اُس نے خود کو ذرا سنبھالا اور کسی قدر نحیف آواز میں بولی۔ "اپنی گڑیا کے لیے"۔

اُس وقت جیسے کوئی بھولا ہوا خواب یاد آ گیا ہو۔ میں جمیلہ کے پاس گیا اور اُس سے مریم کی گڑیا کے متعلق پوچھا تو وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر بولی "کل گڈو گڑیا کے لیے رو رہا تھا۔ میں نے مریم سے لے کر اُس کو دے دی تھی۔ شاید کمرے میں ہو گی۔ گڈو کے پالنے میں۔"

کمرے میں جا کر میں نے دیکھا۔ گڑیا گڈو کے پالنے میں اس طرح اوندھی پڑی تھی جیسے مریم کے فراق میں نڈھال ہو گئی ہو۔ میں اسے اٹھا کر مریم کے پاس لایا۔

"یہ تو اپنی گڑیا۔" میں نے گڑیا کو اس کے قریب کر کے زور سے دبایا تاکہ مریم کے ساتھ گڑیا بھی ایک خوش گوار کیفیت کے ساتھ بیدار ہو جائے۔ لیکن اس زخم خوردہ گڑیا کے اندر سے کسی کلکاری کے بجائے سانپ کے پھنکارنے کی سی آوازیں نکلنے لگیں۔

مریم کی جلد میں تھرتھراہٹ آمیز روشنی بیدار ہوئی اور آنکھوں کی پتلیاں ناچنے لگیں۔ اُس نے لرزتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر گڑیا تھام لی اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔ اس وقت اس کے چہرے پر مسرت اور طمانیت کے رنگ نمایاں تھے۔

مریم کی گڑیا شام کے دھندلکے میں ذرا خوش رنگ اور جاذب نظر لگ رہی تھی۔ حالانکہ دن میں یہ اپنا رنگ اور جاذبیت کھو دیتی تھی۔ دراصل گڈو کی وحشتوں اور شرارتوں نے اسے ایسی ایسی آزمائشوں میں ڈالا تھا اور اسے ایسے ایسے جھٹکے دیے تھے کہ اُس کا بدن بے رونق ہو گیا اب اسے پمپ کرنے پر سیٹی نہیں بجتی تھی) اور زخمی ہو گیا تھا۔ جب سے گڈو نے چلنا اور چیزوں کو پکڑنا شروع کیا تھا، وہ ہر وقت مریم کی گڑیا کو حاصل کرنے کی کوشش میں رہتا تھا۔ مریم اس کی نیت سے واقف تھی۔ لہٰذا ہر وقت محتاط رہتی تھی۔ اور گڑیا کو گڈو کی نظروں سے بچانے کی کوشش کرتی لیکن اس کی تمام تر احتیاط اور تدابیر کے باوجود گڈو کی نظر گڑیا پر پڑ ہی جاتی۔ وہ مریم سے گڑیا چھیننے کی کوشش کرتا تو مریم گڑیا کو زور سے دبوچ لیتی۔ گڈو زور زور سے چیختا۔ جمیلہ دوڑ کر آتی۔ اور مریم سے گڑیا چھین کر گڈو کو دے دیتی۔ گڑیا حاصل کر کے گڈو کے چہرے پر فاتحانہ خوشی بیدار ہو جاتی۔ وہ زور زور سے ہنستا اور گڑیا کے ساتھ وحشیانہ برتاؤ کرتا۔ اُسے دانتوں سے نوچتا، زور زور سے دباتا، زمین پر پٹکتا۔ کبھی ہوا میں اُچھال دیتا۔ مریم کی زخم خوردہ گڑیا چیختی۔ کراہتی اور داد فریاد کرتی مگر گڈو اس وقت تک کھیلتا رہتا جب تک کہ اُسے اس سے دلچسپ چیز نظر نہ آ جاتی یا بھوک کی خواہش بیدار نہ ہو جاتی۔

شروع میں جب میں اُسے بازار سے خرید کر لایا تھا تو سنہرے بالوں اور گلابی آنکھوں والی یہ گڑیا دور سے دیکھنے پر زندہ اور متحرک معلوم ہوتی تھی۔ ہاتھوں کا لمس پا کر خوش ہو جاتی —— کلکاریاں بھرتی، چوٹ لگتی تو کراہتی اور کبھی کبھی چیخ کر گویا بے ضرر سا احتجاج بھی کرتی۔

بیندرناتھ



نیا قحط

اگلے زمانوں میں اناج کا قحط پڑا کرتا تھا آج کل پانی اور بجلی کا قحط بھی پڑنے لگا ہے۔ بجلی کا قحط بھی پانی کا قحط ہی ہے۔ پانی کی کمی کی وجہ سے بجلی کم پیدا ہوتی ہے، اس لیے کہ بجلی پانی یا کوئلے سے پیدا ہوتی ہے۔ کچھ مدت سے بجلی ایٹم بم (سوری ایٹم) سے بھی پیدا ہونے لگی ہے۔ لیکن بیشتر پانی اور کوئلہ ہی بجلی کی پیداوار کے لیے ذمہ دار ہیں۔ ایٹم سے پیدا کی گئی بجلی کی مقدار ابھی بہت کم ہے کیوں کہ ایٹم کے لیے یہ نیا کام ہے۔ جب پہلی بار ایٹم کو بجلی بنانے کے لیے کہا گیا تو اس نے صاف جواب دے دیا کہ صاحب یہ میرا کام نہیں ہے۔ میرا کام تو بم بنانا ہے۔ قانون کے تحت آپ میری ڈیوٹی بدل نہیں سکتے۔ بڑی مشکل سے اسے منایا گیا۔ اُسے سمجھایا گیا کہ ٹھیک ہے۔ جنگ کے دوران ہم تم سے بم بنوائیں گے، لیکن فی الحال نکما بیٹھنے سے تو بہتر ہے کہ بجلی ہی بناؤ۔ چاروناچار وہ مان تو گیا۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ ایٹم پر بجلی بنانے کے کام کے لیے زیادہ بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ اگر کسی کو ایک مارکھا چکا بھتنا تو بجلی بنانے جیسے عامیانہ کاموں میں دلچسپی نہیں لے سکتا۔ اور پھر نہ جانے کس وقت اور کب [illegible] اور وہ بم بن جائے۔

[illegible] کا کام [illegible] کوئلے سے زیادہ تر [illegible] کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔ لیکن اب جب کہ ہماری دھرتی ماں کے پیٹ کی بیماری ٹھیک کرنے کے لیے اس کی آنتوں میں سے گیس نکالی جارہی ہے تو انگیٹھیاں اور چولہے اس گیس سے جلائے جانے لگے رہیں۔ ریل کے انجن بھی ڈیزل سے گرم کیے جانے لگے ہیں۔ اس لیے زیادہ کوئلہ اب بجلی بنانے کے کام میں لیا جانے لگا ہے۔

کوئلے سے بجلی بنانا آسان کام نہیں۔ کوئلہ کانوں سے نکلتا ہے۔ انسان کے کانوں سے نہیں، زمین کے کانوں سے۔ دیواروں کی طرح زمین کے بھی کان ہوتے ہیں۔ یہ کان انسان کے کان جیسے بنے بنائے نہیں ہوتے۔ انہیں زمین کو کھود کر بنانا پڑتا ہے۔ کانوں سے کوئلہ نکالنا بڑا جوکھم کا کام ہے۔ لیکن ایسے کاموں پر دوسروں کو لگایا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں ایسے بے شمار لوگ ہیں جو یہ کام خوشی خوشی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ افسوس کہ ہمارے ہاں اتنی کانیں نہیں کہ ایسے لوگوں کی خوشیاں برقرار رکھی جاسکیں۔

کوئلے سے اور بھی بہت سے کام لیے جاتے ہیں لیکن ہر کام میں کوئلے کو خود جلنا پڑتا ہے۔ پروانے کی طرح کوئلے کی قسمت میں بھی جل کر مرنا لکھا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ پروانہ صرف خود جلتا ہے اور کوئلہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی راکھ کر دیتا ہے اس لیے ہم کوئلے سے ڈرتے ہی رہتے ہیں۔

یقین نہیں آتا کہ پانی سے بجلی پیدا ہوسکتی ہے۔ پانی گیلا، بجلی سوکھی۔ پانی ٹھنڈا، بجلی گرم پانی سست رفتار، بجلی برق رفتار۔ بجلی کے کسی آلے پر پانی گر جائے تو وہ فیوز ہو جاتی ہے تو پھر پانی سے بجلی کیسے پیدا ہو جاتی ہے؟

پانی کو پکڑ کر بڑے بڑے پہاڑوں یا اونچائیوں سے نیچے گرایا جاتا ہے۔ جس جگہ پانی گرتا ہے وہاں بجلی کے تار ڈال دیے جاتے ہیں۔ اتنی اونچائی سے گرنے سے پانی میں جو ہیبت پیدا ہوتی ہے اسی سے بجلی پیدا ہوتی ہے۔ کوئلے سے بجلی بنانے کے بعد کوئلہ راکھ ہو جاتا ہے لیکن پانی بجلی پیدا کرنے کے بعد بھی پانی ہی رہتا ہے اور اس کے بعد بھی کئی اور کاموں میں لایا جاسکتا ہے۔ مثلاً گندے لوگوں کے نہلانے، پیاسوں کی پیاس بجھانے اور شرمندوں کو ڈوبنے کے لیے۔

کئی اپوزیشن لیڈروں کا کہنا ہے کہ سودیشی حکومت انگریز حکومت سے بدتر ہے۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں پر بے شک کئی ظلم کیے، لیکن انہوں نے پانی کو تو خالص رہنے دیا۔ ہماری اپنی حکومت نے تو پانی میں سے بھی بجلی نکال لی۔ باقی کا پانی اب کھوکھلا رہ گیا ہے۔ ایسے پانی میں کیا توانائی ہوگی اسی لیے ہماری فصلیں خراب ہوتی ہیں، ہمارے نوجوان کمزور رہتے ہیں۔ ہمارے ہاضمے خراب ہوتے ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے؟ ایسے فراڈ تمام حکومتیں کرتی ہیں۔ ہم نے تو آج تک خالص پانی نہیں پیا۔ ہم تو حکومت کے شکر گزار ہیں کہ وہ

پانی سے بجلی نکال لیتی ہے۔ نہیں تو نہاتے وقت، پانی پیتے وقت، حتیٰ کہ ڈوبتے وقت بھی شاک لگنے کا خدشہ لگا رہتا۔ ہم تو کہیں گے کہ آزادی کے بعد ہماری حکومت نے رفاہِ عامہ کا یہی سب سے بڑا کام کیا ہے کہ پانی کو عام انسان کے لیے محفوظ بنا دیا ہے۔ اب چھوٹے سے چھوٹا بچہ بھی اکیلا بلا خطر پانی پی سکتا ہے، اور ذرا بڑا ہو جائے تو خود نہا بھی سکتا ہے۔

گو پانی محفوظ ہو گیا ہے لیکن اس کی سپلائی میں کمی ہو گئی ہے۔ پانی کی مانگ میں کمی کرنے کے لیے پہلے تو پانی کا ریٹ بڑھا دیا گیا پھر اس کی سپلائی دو دن میں ایک بار کر دی گئی۔ اس سے بھی مانگ میں کمی نہ ہوئی تو پانی کو آلودہ کر دیا گیا۔ اب کئی جگہ پینے کے پانی کی پائپیں گندہ نالیوں کو کراس کرکے آتی ہیں۔ اس طرح کے باہمی میل ملاپ سے کئی قسم کے جراثیم پانی میں گھس جاتے ہیں۔ حکومت کا کہنا ہے کہ اس طرح جراثیم دھل کر صاف ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ان سے بیماری کا خطرہ کم ہو جاتا ہے۔ آزادی کے بعد ہمارے ملک کے جراثیم کی اوسط زندگی میں جو اضافہ ہوا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے جراثیم دن بدن زیادہ صاف اور صحت مند ہو رہے ہیں اور ان سے جو بیماریاں پیدا ہوتی ہیں وہ بھی لوگوں کی صحت کے لیے اچھی ہیں۔

حکومت کو یہ گلہ ہے کہ لوگ ہر بات کے لیے حکومت کی طرف ہی دیکھتے ہیں۔ وہ چاہتی ہے کہ ایسا کرنے کے بجائے لوگ اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کو خود پورا کرنے کے موقف میں ہو جائیں۔ ساتویں پنج سالہ پلان کا نصب العین یہی ہے کہ ان سب گاؤں میں جہاں پینے کا پانی نہیں ملتا، مہیا کیا جائے اور ان تمام شہروں میں، جہاں یہ دستیاب ہے، اس کو کم کیا جائے۔ اس طرح دیہات اور شہروں میں سہولیات کا عدم توازن دور ہو جائے گا۔

اب شہروں میں لوگ اپنے گھروں میں کنویں کھدوا رہے ہیں اور بورویل لگوا رہے ہیں۔ ایسے کنووں میں ان بہوؤں کو دھکیل کر ڈبویا جا سکتا ہے جو خاطر خواہ جہیز نہیں لائیں۔ حکومت بہوؤں کو جلانے کی رسم کے خلاف ہے۔ ایک تو اس سے مٹی کا تیل ضائع ہوتا ہے اور دوسرے دھواں پھیلتا ہے جو آنکھوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اس کے برعکس کنویں میں دھکیلے جانے سے بہو پیاسی نہیں مرے گی اور پھر اس کی آخری رسومات سے پہلے اسے نہلانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

بجلی کے قحط کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو نالائق بچوں کی طرح بار بار فیل ہو جاتی ہے۔ دوسرے بجلی کی سپلائی میں کمی ہو گئی ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا تو بجائے راحت کے ڈر لگنے لگتا ہے کہ اب بجلی اور فون دونوں اڑ جائیں گے۔ بارش کی دو بوندیں پڑیں تو بھی یہی خدشہ۔ گرمی زیادہ ہوئی تو سب سے پہلے بجلی کو سن سٹروک ہو جاتا ہے۔ غرض بجلی کو ہندوستان کا کوئی موسم پسند نہیں۔ وہ امریکہ جانا چاہتی ہے۔ اس کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈتی رہتی ہے۔ بجلی بورڈ والوں کا کہنا ہے کہ جو بجلی پانی سے پیدا ہوتی ہے زیادہ تر وہی غیر نز سوتی ہے۔ کیوں کہ باوجود ہزار کوشش کے کچھ نہ کچھ نمی رہ جاتی ہے۔ اس لیے اب پانی سے کم اور کوئلہ اور ایٹم سے زیادہ بجلی پیدا کی جائے گی۔ لیکن فی الحال ہمیں ایسے ہی گزارہ کرنا ہوگا۔

جنتا کو صورتِ حال سے آگاہ کرکے حکومت نے جمہوری روایتوں کے پیشِ نظر تعاون کی اپیل کی ہے، بس اب صرف تیس چالیس برس اور کی بات ہے۔ اس کے بعد یقیناً یا تو مناسب مقدار میں بجلی پیدا کی جائے گی یا کوئی ایسی ایجاد نکل آئے گی جس سے بجلی کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ حکومت نے ایسی اسکیم یا چیز ایجاد کرنے والے کو ۵۱ روپے کا بذریعہ پوسٹ ڈیٹیڈ چیک دینے کا اعلان بھی کیا ہے۔ اس کے باوجود کوئی موجد میدان میں نہیں آیا۔ ویسے حکومت کو اس بات کا بھی یقین ہے کہ تیس چالیس برسوں تک اگر یہی صورتِ حال رہی اور حکومت اپنی پالیسی پر ثابت قدمی سے گامزن رہی تو عوام کو ویسے ہی بجلی کے بغیر رہنے کی عادت پڑ جائے گی۔ اس طرح اس مسئلے میں ہی اس کا حل مضمر ہے۔ حکومت نے عوام سے یہ اپیل بھی کی ہے کہ وہ بجلی کی کمی پر واویلا کرنے کے بجائے اس کے فائدوں کے بارے میں بھی سوچیں۔ مثلاً مہنگائی کے زمانے میں ان کے پنکھے اور ہیٹر وغیرہ کم استعمال ہوں گے۔ نتیجۃً زیادہ دیر تک چلیں گے۔ ہاں بجلی کے بل میں کمی نہیں ہوگی۔ کیوں کہ اس کا ریٹ وقتاً فوقتاً بڑھا رہے ہیں تاکہ عوام پہلے جتنا ہی بل دیتے رہیں۔ اس طرح انھیں ذہنی طور پر یہ محسوس نہیں ہوگا کہ بجلی کی پیداوار میں رجحان کمی کی طرف ہے۔ بیبیاں اپنی ہمسائیوں سے بڑی شیخی بگھار سکیں گی کہ ہمارا بجلی کا بل ہمارے ان کی تنخواہ کے برابر ہے۔ جمہوریت میں نفسی اعتماد کی بڑی اہمیت ہے اور حکومت اس میں کسی قسم کی لغزش پیدا نہیں ہونے دے گی۔

بہرحال حکومت اس تشویشناک صورتِ حال سے بخوبی واقف ہے۔ ہماری حکومت منٹ منٹ پر غور کرنے کی عادی ہے۔ اسی لیے اس کا نام گورنمنٹ ہے۔ گہرے غور کے بعد اس نے بجلی پیدا کرنے کے متبادل ذریعوں کا ایک محکمہ بنایا ہے۔ اس محکمے نے ایک پلان بنایا ہے۔ اس پلان کے تحت اب سورج کی شعاعوں کی گرمی سے بجلی پیدا کی جائے گی۔ سمندر کی لہروں کے جوش سے بجلی پیدا کی جائے گی، ہوا کی تندی کے خروش سے بجلی پیدا کی جائے گی۔

اس سلسلے میں بعض مشورے اور بھی ہیں۔ ان پر حکومت کو ہمدردانہ غور کرنا چاہیے۔ مشورہ یہ ہے کہ عورتوں کی حسد کی آگ سے بجلی پیدا کی جائے۔ ان کی گفتگو کی رفتار سے بجلی پیدا کی جائے، [illegible] کو بیویوں کی جھڑکیوں سے بجلی پیدا کی جائے، نوجوانوں کے عشق کی حرارت سے بجلی پیدا کی جائے۔ [illegible] کے نعروں سے بجلی پیدا کی جائے، [illegible] کی شعلہ افشانی سے بجلی پیدا کی جائے۔ [illegible]



نام کتاب مُباہلہ (افسانے)
مصنف علی امام نقوی
ناشر سیمانت پرکاشن دہلی ۱۱۰۰۰۲
قیمت تیس روپے

علی امام نقوی کی دوسری کتاب "مباہلہ" غور و فکر کے کچھ نئے معیار قائم کرتی ہے، ساتھ ہی کردار اور ان کے دائرہ عمل نیز ٹریٹمنٹ کو الگ زمین بھی عطا کرتی ہے۔ میں نے کہیں لکھا تھا کہ علی امام نقوی کا افسانہ "ڈونگر واڑی کے گدھے" (جو کہ ہندی اور مراٹھی میں ترجمہ ہو کر پسند کیا جا چکا ہے اور جو مباہلہ میں بھی شامل ہے) اپنے مخصوص تیور کے ساتھ فساد کو ایک نئے زاویے سے دیکھتا ہے۔ مذکورہ افسانے کی فضا ایکدم الگ ہے، پارسیوں کے رسم و رواج سے متعلق ہمارے یہاں لکھا ہی نہیں گیا، مکالماتی انداز میں لکھا گیا یہ افسانہ فساد کے موضوع پر اردو کے چند اچھے افسانوں میں شامل کیا جائے گا۔

"مباہلہ" میں شامل دوسرے افسانے "پاسبان، خصلت، اور میراث" بہترین شہ پارے ہیں۔ اگرچہ ان کے موضوع بڑے نہیں مگر ان کے پیش کرنے کا انداز متنوع ہے۔ یہ کہانیاں، انتظامیہ کی پیچیدگیوں، معاشرتی ڈھکوسلوں اور طے شدہ اصولوں کو توڑ دینے والی ہیں۔ ان کے ذریعے علی، سوچنے، سمجھنے اور پھر بدلنے کی فضا بناتے ہیں، صحیح اور غلط کی پہچان کرواتے ہیں اور میرے نزدیک آج کے افسانے کا یہی بہترین مصرف ہے۔

"خصلت" آپسی رشتوں اور ان کی شکستگی کو بڑے پیارے انداز میں ظاہر کرتی ہے۔ بیا اور بندر کے ذریعہ رشتوں کی نوعیت پر مار کرنے والی اس کہانی میں خاندان کا گھر کا آپسی تصادم اور ایک فرد کی بے گھری نوحہ بن کر رہ گئی ہے۔ "میراث" چار دیواری میں بند صابرہ کی کہانی ہے، جس نے کبھی پیٹ بھر روٹی نہیں کھائی۔

"ڈونگر واڑی کے گدھے" کو میں علی امام نقوی کے افسانوی سفر کا ایک اہم موڑ مانتا ہوں کہ یہاں سے ان کی افسانوی دنیا پر چھایا ہوا ابہام اور کہرا دھیرے دھیرے کم ہوتا گیا ہے۔ ذرا سا کچھ شائبہ باقی بھی ہے تو وہ ان کے اسلوب میں اتنا گھل مل کر آتا ہے کہ اسے پہچان کر الگ کرنا دشوار ہے یہ ایک دوسرے میں مدغم ہوتے اندھیرے اُجالے کی طرح ہے جس میں چیزیں پہچانی بھی جاتی ہیں اور ڈوب بھی جاتی ہیں۔

علی امام نقوی کے افسانوں کے کرداروں سے متعلق ایک بات جو محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ ان کے کردار اگر بچے ہیں تو اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار لگتے ہیں۔ ان میں بچگانہ شرارت اور شوخی دکھائی نہیں دیتی۔ نسائی کردار گو کہ چار دیواری میں ہیں پر ان میں گھٹن یا تناؤ نہیں جس کا ذکر اکثر عورتوں کے رسالوں اور سیمیناروں میں پڑھے جانے والے مقالات میں ہوا کرتا ہے۔ ان کے افسانی کے مرد کردار مخصوص سانچوں میں ڈھلے نیک، صبر و تحمل والے ہیں۔ ان میں بغاوت ہے نہ آتش فشاں۔ بس ایک چنگاری ہے جو شعلے میں تبدیل نہ ہو کر خود ان کے وجود کو اندر ہی اندر جلائے دے رہی ہے۔ یہ سارے کردار متوسط طبقے کے ہیں۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ علی کی کہانیاں کس طرح کے مسلم سماج کا نقشہ پیش کرتی ہیں؟ ان کے کردار آج کے مسلم کردار ہیں؟ اس کا جواب ملتا تو ہے، مگر پوری طرح نہیں۔

"مباہلہ" میں اچھی کہانیوں کی لمبی فہرست ہے۔ "ٹیس" "نئی کربلا" "مباہلہ" "سراب" "احتساب" "دیا" اور "چنگاری" آخر الذکر کہانی پر رک کر بات کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کیونکہ وہ دو مسلم فرقوں کا لمحاتی موازنہ کرنے والی کہانی ہے اور مبصر افسانے کے قاری کے روبرو اس کی حقیقت آشکار کرنا نہیں چاہتا بلکہ اپنے پڑھنے والوں سے یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ ۱۲۶ صفحات پر مشتمل ہارمونیم کی تیسری پیٹی جیسے ۲۱ افسانوں کے اس مجموعہ کا مطالعہ ضرور کریں کیونکہ علی امام نقوی بخوبی جانتے ہیں کہ فن کاری کے وہ کون سے عناصر ہیں جو افسانہ نگاری کی تخلیق کے ٹریک کو پھسلواں بنانے کی خاطر lubricant پیدا کرتے ہیں۔
(م۔ ناگ)

نام کتاب بوئے گل
مرتب سید محمود نقوی
قیمت بارہ روپے
ملنے کا پتہ نشاط پبلی کیشنز، نیو برج پوری دہلی ۵۳

"بوئے گل"، سید العلما مولانا علی نقی

نقوی مجتہد مرحوم کے انتقال پر کہی گئی نظموں اور قطعات تاریخ کا مجموعہ ہے۔ اس میں ہندوپاک کے ۵ شاعروں کی تخلیقات شامل ہیں جن میں شمس الرحمان فاروقی، محمود سرمدش، وحید اختر، ثمر ہلوری اور ساحر فاخری جیسے معتبر نام بھی شامل ہیں۔

اردو نظموں اور قطعات تاریخ کے علاوہ چند فارسی قطعات بھی شامل ہیں جن میں مولانا علی نقی نقوی مرحوم کے محاسن وصفات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مولانا مرحوم نہ صرف ایک جادو بیان مقرر تھے جو اپنے مخالف سے بھی بے ساختہ داد وتحسین حاصل کر لیتے تھے بلکہ ایسے صاحب قلم تھے جنھوں نے تین سو سے زائد کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن میں واقعۂ کربلا پر اردو میں سب سے معتبر اور مستند کتاب "شہید انسانیت" ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ "تفسیر قرآن"، "تاریخ اسلام"، "سفرنامۂ حج"، "نظام زندگی"، "لاتفسدوا فی الارض" ان کی بہترین تصنیفات ہیں۔ تحریر وتقریر کے مرد میدان ہونے کے ساتھ مولانا مرحوم نہایت پاکیزہ کردار کے حامل تھے۔ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا حسین امتزاج ان کے کردار میں اس طرح رچا بسا ہوا تھا کہ سید حامد صاحب کے الفاظ میں "انھیں دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ علم کا ناموس، تقویٰ کی آبرو اور شخصیت کا وقار کسے کہتے ہیں"۔ بیشتر شعرا نے مرحوم کی ان ہی خوبیوں سے محرومی پر اظہار غم کیا ہے۔ یہ مجموعہ مولانا مرحوم کی پہلی برسی (مئی ۱۹۸۹ء) کے موقع پر سید محمود نقوی کے بڑی خوش سلیقگی کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ بقول مرتب "یہ مجموعہ ہمارے رثائی ادب میں ایک خوشگوار اضافے کی حیثیت کا حامل ہے۔ اس میں ایک ہی شخصیت کے بارے میں اردو شاعری کی تقریباً تمام مروجہ اصناف سخن موجود ہیں۔ اسی طرح فن تاریخ گوئی کے بھی بہت کامیاب نمونے اس میں موجود ہیں جو بجائے خود خاصے کی چیز ہیں۔

اس میں شامل بیشتر نظمیں دامن دل کو کھینچتی ہیں۔ لیکن ایک بات بہرحال سمجھ میں نہ آسکی۔ پروفیسر وحید اختر کی نظم "قلم آشوب" کا محض انتخاب شائع کیا گیا ہے جبکہ یہ پوری نظم شائع کی جانی چاہئے تھی۔ مرتب نے آخر میں 'اشاریہ' شامل کرکے مجموعہ کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے جس میں شاعروں کے پورے نام کے ساتھ والد کا نام، تاریخ پیدائش اور موجودہ پتہ درج کیا گیا ہے۔

(قمر حسن)

نام رسالہ	ادبی کائنات (ماہنامہ)
مدیر	عقیل الغروی
قیمت:	۶ روپے فی شمارہ
ناشر	سفینۃ الہدایہ ٹرسٹ دہلی

ماہنامہ "ادبی کائنات" گزشتہ دو برسوں سے پابندی کے ساتھ مولانا عقیل الغروی کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ سفینۃ الہدایہ ٹرسٹ دہلی کے اس ترجمان نے علمی وادبی حلقوں میں ایک شناخت بنالی ہے۔ کسی بھی گروہ یا جماعت سے وابستگی کے بغیر محض علمی، فکری اور ادبی محاذ پر سرگرم عمل رہنا کتنا دشوار ہے۔ یہ وہی لوگ جانتے ہیں جنھوں نے اس وادیٔ پرخار میں قدم رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے اردو رسائل وجرائد کی زندگی محض چند شاعتوں تک محدود رہتی ہے۔ ماہنامہ ادبی کائنات کی مجلس ادارت مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے اپنے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے ابتدائی دو سال کا آزمائشی مرحلہ بحُسن وخوبی طے کر لیا ہے اور اس مدت میں مشاہیر اہل قلم کا تعاون حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ جناب مالک رام، صالحہ عابد حسین مرحوم، مولانا سید کاظم نقوی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، نیر مسعود، کاظم علی خاں، مجاہد حسین حسینی، امام مرتضیٰ نقوی، عظیم امروہوی، ثمر ہلوری صاحبان کی تخلیقات اس میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ "آفاق" کے عنوان سے عقیل الغروی صاحب کے اداریے کافی پسند کیے جاتے ہیں۔ خدا کرے یہ سلسلہ جاری رہے اور "ادبی کائنات" تشنگان علم وادب کو سیراب کرتا رہے۔

(مرغوب عابدی)

نام کتاب	نئے موسم کی تلاش
شاعر	عالم خورشید
قیمت	۳۰ روپے
ملنے کا پتہ	اردو لائبریری، مکی محلہ، آرہ

"نئے موسم کی تلاش" عالم خورشید کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ یہ ۵۰ غزلوں اور ۱۲ نظموں پر مشتمل ہے۔

نئی نسل کے نوجوان شعرا میں عالم خورشید کا نام جانا پہچانا ہے۔ عالم خورشید روزمرّہ کی زندگی میں ہونے والے واقعات اپنی فکر کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔ اپنے عہد کے مسائل اور زندگی کے شعور سے بخوبی واقف ہیں شاعری کے مزاج کو سمجھتے ہیں اور اپنے مشاہدات کو بہت سلیقے سے اپنی شاعری میں برتتے ہیں مجموعے میں شامل "کمار پاشی" کی یہ رائے خاص اہمیت کی حامل ہے۔

'عالم خورشید کی غزلوں میں تازگی کی چمک بھی ہے اور زندگی کی حق بھی۔ نئی غزل یہ شعری روایت سے استفادہ کرتے ہوئے انھوں نے سادہ اور سلیس زبان میں اپنی محسوسات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے اشعار میں کہیں کہیں زمان کی بعض نازک ترین کیفیتوں کا اظہار بڑی خوبی سے ہوا ہے عالم خورشید زندگی کو ہمزاد بنا کے پرکھنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ زندگی کو ایک سانچے میں نہیں دیکھنا چاہتے بلکہ کبھی کبھی توڑت

...بھی خواہش کرتے ہیں۔ مثلاً ؎

پھر بند کواڑوں کو میں باہر آؤں
کوئی آہٹ تو اُٹھے شور و شغب کچھ تو ہو

آج کے عہد میں کوئی کام ناممکن نہیں ہے
البتہ کبھی کبھی طریقہ کار ضرور بدلنا پڑتا ہے۔

میرے ساتھ موسم کو چلنا پڑا
مجھے صرف چہرا بدلنا پڑا

عالم خورشید نے اپنی شاعری کے وسیلے سے زمانے کی سچائی کا اظہار بہت خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ موصوف کے شعری مزاج کو سمجھنے اور ذہن کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے بطور نمونہ چند اشعار پیش ہیں

بچھڑ کے جس نے پلٹ کر کبھی نہیں دیکھا
اب ایسے شخص کا بھی انتظار کیا کرنا

جو ختم ہو گیا رشتہ وہ دوستی کا تھا
جو بچ گیا ہے تعلق وہ انتقام کا ہے

کوئی کسی کا نام یہاں جانتا نہیں
نمبر لگے ہیں شہر کے ہر اک مکان پر

ان دنوں شعری مجموعوں کی اشاعت خوب ہو رہی ہے لیکن اچھے مجموعے بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مجھے یقین ہے یہ مجموعہ ادبی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ (عمران عظیم)

نام کتاب تعلیمی مسائل اور ہماری ذمہ داریاں
مصنف محمد اسحاق
صفحات ۱۴۰
قیمت ۲۵ روپے
ناشر قیصر جاوید احمد، جاوید منزل حیدرآباد

اردو زبان میں یوں تو ہر سال سیکڑوں کتابیں شائع ہوتی ہیں لیکن ان میں سے اکثر کا تعلق شعر و ادب اور ادبی تنقید سے ہوتا ہے۔ دیگر موضوعات سے متعلق کتابوں کی کمی ہے بالخصوص تعلیم کے موضوع پر بہت کم لکھا جاتا ہے۔ شکر ہے اسحاق صاحب نے اس موضوع کی جانب توجہ دی اور ایک قابلِ قدر کتاب کا اردو زبان میں اضافہ کیا۔ زیرِ تبصرہ کتاب "تعلیم کے مختلف مسائل پر سولہ مضامین پر مشتمل ہے۔ مضمون 'تعلیم قسمت کی بات نہیں' میں مصنف نے لکھا ہے کہ آپ اس وہم سے نکل آئیے کہ تعلیم قسمت کی بات ہے۔ تعلیم ایک منصوبہ بند جدوجہد کا نام ہے۔" اسی طرح "بچوں کی تعلیم پر سزا کے اثرات" "تعلیم میں قناعت پسندی کا رجحان" "اچھا استاد" اور "لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ" ایسے مضامین ہیں جن سے والدین بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اور ان میں بتلائے گئے طریقوں پر عمل کر کے اپنے بچوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر سکتے ہیں۔

(اسد رضا)

نام کتاب : آزادی کے بعد دہلی میں اردو غزل
مرتبہ : پروفیسر عنوان چشتی
قیمت ۱۶۱ روپے
ناشر و تقسیم کار: اردو اکادمی دہلی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج

اردو اکادمی دہلی کے سکریٹری جناب سید شریف الحسن نقوی لائقِ مبارک باد ہیں کہ اُن کی نگرانی میں اکادمی نے اردو کی صرف معیاری کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا ہے۔ زیرِ نظر کتاب اس امر کی حالیہ مثال ہے۔

اس کتاب کی ترتیب میں بقول مرتب "انتخاب در انتخاب اور دہلی کے شاعروں کی خاص تعداد (چہ معنی؟) کو نمائندگی دینے" کے اصولوں کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔

میری ناقص رائے میں یہ اصول تفصیل طلب ہیں۔ بعض ناموں کی شمولیت اور بعض اہم ناموں کی عدم شمولیت کے جواز کی وضاحت چاہتے ہیں۔ فاضل مرتب نے بعض شعراء کے عدم تعاون کی بنا پر انہیں شامل نہ کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ مناسب ہوتا اگر وہ ان حضرات کے نام درج فرما دیتے۔ اس طرح وہ جانب داری اور تن آسانی جیسے الزامات سے خود کو یقینی طور پر محفوظ بنا سکتے تھے۔ اس ضمن میں جو اہم نام فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں، ان میں سرِ فہرست ہیں شمس الرحمٰن فاروقی۔ انسر آذری مرحوم، بلراج حیرت، کرشن ہراری سہگل، حنیف کیفی اور روشن لال شیدا (درد بھی صاحبِ دیوان شعراء) ایم۔ قمر الدین، ستیہ نند جاوا، اور سوپ بھٹناگر نکہت، سمت پرکاش شوق (جیسے جدید لب و لہجہ کے شاعر) رام پرکاش راہی، بلجیت سنگھ مطیر، حماں باز پانی پتی، سیماب سلطان پوری، رگھو سہائے اُمید، راز لائل پوری، کنول ابنالوی مرحوم، جگدیش بھٹناگر حیات (جیسے روایتی رچاؤ کے حامل شعراء) وغیرہ کے نام بہ خوبی لیے جا سکتے ہیں۔

یہ تالیف اس اعتبار سے معیاری ہے کہ اس میں بسمل سعیدی مرحوم، مخمور سعیدی اور عتیق اللہ جیسے شاعروں کا کلام بھی ترمیم و تصحیح کے بعد شامل کیا گیا ہے۔ ممکن ہے ایسے شاعروں کی فہرست طویل ہو جن کے کلام میں مؤلف کو زحمتِ اصلاح اٹھانی پڑی ہو۔ (یہ بھی تحقیق کا ایک موضوع ٹھہرا) میری ناقص رائے میں مؤلف کو کلام میں تنسیخ کا حق نہیں پہنچتا۔ بالخصوص ایسے میں جب کہ اس نے بقولِ خود "اس انتخاب میں فنی نقطۂ نظر سے محلِ نظر" اشعار بھی شامل کیے ہیں۔ گو وہ "ان مقامات سے متفق نہیں" ہیں۔ نئے اور رنگ پلک سے درست اشعار کی تنسیخ سے نئی غزل کی تفہیم کی سعی یقیناً ادھوری ثابت ہوگی۔ شاعر کی نمائندگی نہ کر سکنے والے کلام کی شمولیت بھی اس تفہیم میں دشواری کا باعث ہوگی۔ اس ذیل میں منور لکھنوی کا نام تخصیص سے لیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے یہی بات بعض اور شعراء کے تعلق سے بھی کہی جا سکتی ہو۔ فاضل مؤلف کو بخوبی احساس ہوگا کہ شعروں کا انتخاب یوں بھی رسوائی کا باعث ہو سکتا ہے۔

اس تالیف کی ایک اور خوبی مرتب کا سپردِ قلم کیا ہوا منظر نامہ (مقدمہ) ہے۔ یہ افراطِ الفاظ اور جوشِ بیان کا اچھا نمونہ ہے۔ تالیف خیالات اور ربط کی کمی بعض جگہ کھٹکتی ہے۔ تکرار (خیالات، جملوں

اُردو کا مقبولِ عام مصوّر ماہ نامہ

آج کل
نئی دہلی

مہمان مُدیر
راج نرائن راز
سب ایڈیٹر
خورشید اکرم

جلد : ۴۸
شمارہ : ۶
جنوری ۱۹۹۰ء
پوس۔ماگھ شک سمبت ۱۹۱۱
قیمت : دو روپے — فون : ۳۸۷۰۶۹

سرورق : مترانند میٹھانی

اندرونِ ملک زرِ سالانہ : ۲۰ روپے
دو سال کے لیے : ۳۶ روپے
تین سال کے لیے : ۴۸ روپے

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :
ایڈیٹر : آج کل (اُردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

پروڈکشن آفیسر : آر۔ایس۔منچال

ترسیلِ زر کا پتہ :
بزنس منیجر : پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

نیا سال مبارک ہو

ترتیب

ملاحظات

علامہ اقبال نے کہا تھا:

ع وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

لیکن اگر خود وجودِ زن کا رنگ ہی اڑا اڑا ہو تو تصویرِ کائنات کیسے خوبصورت ہو سکتی ہے۔ یہ دنیا خوبصورت تبھی ہو سکتی ہے جب اس کی ترقی و تشکیل میں عورتوں کو برابر کا حصہ لینے کا موقع فراہم کیا جائے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں عورتیں ہر محاذ پر پچھڑی ہوئی ہیں۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ ان کی ترقی کی راہ میں سماجی، معاشی اور دیگر کئی رکاوٹیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ملک کی ترقی اور خوشحالی میں اپنا حصہ اور حق ادا کرنے کے معاملے میں مردوں کی نسبت بہت پیچھے ہیں۔ روزگار، تعلیم، صحت اور متوازن خوراک ——— زندگی کے یہ بنیادی لوازمات بھی انہیں اس طرح میسر نہیں ہیں جس طرح اور جس قدر انہیں میسر ہونا چاہئیں۔

سماج میں عورتوں کی پستی کا غالباً سب سے بڑا سبب وسائلِ زندگی کا، ان کی دسترس سے دور ہونا اور معاشی طور پر خود مختار نہ ہونا ہے ——— ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق صرف ۱۴ فی صد خواتین کام سے لگی ہوئی ہیں۔ اس قلیل شرح کی ۹۰ فی صد خواتین، گاؤں اور شہر دونوں میں، غیر محفوظ اور غیر منضبط سیکٹر میں ملازمت کرتی ہیں۔ دیہی علاقوں میں عورتیں دستکاری، کھیتی باڑی وغیرہ کے کام

[illegible]

سے لگی ہوتی ہیں۔ شہروں میں چھوٹے پیمانے کی تجارت، گھریلو کام کاج یا تعمیراتی کاموں میں لگی ہوتی ہیں۔ دیہی اور شہری دونوں ہی ملازمتوں میں انہیں اپنے کام کا بہت کم معاوضہ ملتا ہے۔ پھر یہ کہ ان کے کام کا کوئی ضابطہ اور ضمانت بھی نہیں ہے۔ دیہی علاقوں میں عورتیں اوسطاً ۷ سے ۱۰ گھنٹے روزانہ کام کرتی ہیں۔ یہ محنت ابھی تک "سعیٔ رائیگاں" کے زمرے میں ہی رکھی جاتی ہے۔ محکمۂ مردم شماری اس محنت کو شمار نہیں کرتا کیوں کہ اس میں اجرت یا معاوضہ کا کہیں کوئی دخل نہیں ہے۔

تعلیم کے بغیر نہ کوئی طبقہ خود کو پہچان سکتا ہے اور نہ اپنے فرائض اور حقوق کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ آزادی کے بعد خواتین کی تعلیم پر بہت زور دیا گیا۔ اس کے باوجود ابھی تک ——— خواتین میں خواندگی کی شرح بہت کم ہے بلکہ دیہی علاقوں میں تو یہ شرح تشویش ناک حد تک کم ہے۔ خواتین کی مجموعی آبادی کا ۷۷ فی صد حصہ دیہی علاقوں میں رہتا ہے۔ ان میں سے صرف ۱۷٫۹۶ فی صد حصہ تعلیم یافتہ ہے۔ درج فہرست ذات اور قبائل میں یہ شرح اس سے بھی کم ہے۔ لڑکوں کی نسبت لڑکیوں کو اسکول میں کم داخلہ کرایا جاتا ہے ——— درمیان ہی میں سلسلۂ تعلیم ترک کر دینے کی شرح لڑکیوں میں کہیں زیادہ ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ مثلاً کم عمر میں شادی، گھر بار سنبھالنے اور چولہا چوکی، گھر کی معاشی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے چھوٹے موٹے برائے اجرت کام، سماجی بندشیں، اسکول کالج ہاسٹل وغیرہ کی کمی وغیرہ۔ اسکولوں میں لڑکیوں کو داخلہ دلوانے کے رجحان کو بڑھاوا دینے کے لیے ایسے تعلیمی مرکز کھولے گئے ہیں جن میں تین اور چھ برس کے درمیان کی عمر کے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے اور اسکول میں داخلہ لینے کی تشویق و ترغیب دی جاتی ہے۔ درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کی لڑکیوں کو میٹرک سے اوپر کی تعلیم کے لیے لڑکوں کی نسبت زیادہ وظیفے دیے جاتے ہیں۔ کپڑے اور ٹیوشن کی سہولتیں مفت بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کی ترغیب دینے کے لیے آندھرا پردیش اور تمل ناڈو میں ایسی یونیورسٹیاں قائم کی گئیں جو عورتوں کے لیے مخصوص ہیں۔ تعلیمی اعتبار سے پچھڑے ہوئے ریاستوں کو بالخصوص لڑکیوں کے لیے غیر رسمی تعلیم کے مراکز کھولنے کے لیے مرکزی حکومت نے مالی تعاون دیا۔ نیز ان ریاستوں کو سراہا گیا جنہوں نے لڑکیوں کے اندر تعلیم کے رجحان کو فروغ دینے میں قابلِ قدر کام کیا۔

ملازمت اور تعلیم کے علاوہ صحت اور متوازن خوراک بھی ان کا بڑا مسئلہ ہے۔ کہتے ہیں کہ تندرستی ہزار نعمت ہے۔ بدقسمتی سے اس ملک کی عورتوں کی ایک بڑی تعداد اس نعمت سے محروم ہے۔ ہر ملک و قوم کی خواتین کا صحت مند اور تندرست ہونا لازمی ہے۔ کیوں کہ خواتین ہی نسلِ انسانی کی تجدید و بقا کا ذریعہ ہیں۔ مگر حالیہ جائزے کے مطابق عورتوں کے معاملے میں متوازن خوراک میں کوتاہی کی مثالیں عام ہیں۔ سننے میں یہ بات بہت عجیب سی معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ بچوں (لڑکوں) کی نسبت بچیوں (لڑکیوں) کی خوراک اور صحت پر کم توجہ دی جاتی ہے۔ بچہ جننے کے وقت عورت کی موت، پیدائشی طور پر بچوں کا لاغر ہونا یا

پیدا ہوتے ہی بچے کی موت وغیرہ عورت کی جسمانی کمزوری کے باعث ہوتی ہیں۔ دیہی علاقوں کی ۶۰ سے ۸۰ فی صد عورتوں کے جسم میں خون کی کمی پائی جاتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بچے کی پیدائش کے وقت ماں کی موت یا بچے کا نحیف و لاغر پیدا ہونے کی شرح دیہی علاقوں میں بہت زیادہ ہے ۔ یہ نامساعد حالات مرد اور عورت کی آبادی کے تناسب میں بے اعتدالی کے ذمہ دار ہیں۔

اعداد و شمار کے تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۰۱ء میں ہمارے ملک میں عورت اور مرد کی آبادی کا تناسب علی الترتیب ۹۷۱ اور ۱۰۰۰ تھا۔ ۱۹۵۱ میں یہ تناسب گھٹ کر ۹۴۶ اور ۱۰۰۰ رہ گیا۔ ۱۹۷۱ء میں مزید گھٹا۔ اس وقت یہ تناسب ۹۳۰ اور ۱۰۰۰ کا تھا۔ ۱۹۸۱ء میں اس تناسب میں کچھ بہتری آئی اور یہ بڑھ کر ۹۳۳ اور ۱۰۰۰ ہو گیا۔ حالانکہ عام حالت میں عورت کی آبادی کا تناسب مرد سے کچھ بہتر ہونا چاہیے ۔ ترقی یافتہ ممالک میں عورت کی آبادی کا تناسب مرد سے کچھ زیادہ ہے ۔

عورتوں کی صحت اور خوراک کے معیار میں بہتری کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے ہیں۔ عورتوں کو حمل کے دوران اور بچے کی پیدائش کے بعد روزانہ کی خوراک کے علاوہ ۵۰۰ کیلوری حرارت اور ۲۰ گرام پروٹین پیدا کرنے بھر غذا مزید دی جاتی ہے۔

یہ اضافی خوراک ایک سال میں ۳۰۰ دن دی جاتی ہے۔ اس پروگرام سے فی الوقت دس لاکھ سے زیادہ عورتیں فیض پا رہی ہیں۔ آئرن اور فولک ایسڈ کی ٹکیاں، کروڑ ۲۵ لاکھ سے زائد حاملہ عورتوں کو دی گئیں۔ تقریباً تین کروڑ ۶۰ لاکھ حاملہ عورتوں کو ٹیٹنس کی سوئیاں لگائی گئیں۔

آزادی کے بعد منصوبہ بند ترقی کے پروگرام میں شروع ہی سے عورتوں کے حالات میں بہتری کے لیے کوششیں جاری ہیں۔ تعلیم، صحت، روزگار اور دیگر وسائل کی فراہمی کے لیے مختلف قسم کی اسکیمیں بنائی گئی ہیں۔ فی الوقت عورتوں کی فلاح و بہبودی کے لیے ۲۷ قسم کی اسکیمیں چل رہی ہیں، جن میں سے چند اسکیمیں صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہیں۔ یہ اسکیمیں ملک کی مختلف وزارتوں اور محکموں کے ذریعے چلائی جا رہی ہیں۔ ان اسکیموں کے ذریعے عورتوں کی مندرجہ ذیل پانچ خدمات انجام دی جا رہی ہیں: ۱۔ روزگار مہیا کرنا اور آمدنی کے ذرائع پیدا کرنا۔ ۲۔ تعلیم اور تربیت ۳۔ صحت، خوراک اور طبی سہولت بہم پہنچانا۔ ۴۔ عورتوں میں معلومات عامہ کے ذریعے بیداری پیدا کرنا اور

۵۔ قانونی سہولتیں بہم پہنچانا۔

محکمۂ زراعت و دیہی ترقیات اپنے تربیتی پروگرام کے تحت دیہی عورتوں کو سماجی جنگل بانی، دودھ کی پیداوار، زمینوں کو کٹوتی سے محفوظ رکھنے کی ترکیبوں کی تربیت دے رہا ہے۔ جواہر روزگار یوجنا کے پروگراموں کا ۳۰ فی صد حصہ دیہی عورتوں کو روزگار مہیا کرنے کے لیے مختص ہے۔ مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام، دیہی خواتین اور بچوں کا ترقیاتی پروگرام، دیہی نوجوانوں کے لیے خود روزگار پیدا کرنے کی تربیت کا پروگرام وغیرہ وہ منصوبے ہیں، جن کے تحت عورتوں کو معاشی طور پر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔

وزارت محنت اور محکمہ روزگار و تربیت ان رضاکار اداروں اور تنظیموں کو مالی اعانت دے رہا ہے جو عورتوں کو منظم کرنے، ان میں سماجی بیداری پیدا کرنے اور عورتوں کیلیے آمدنی کے ذرائع پیدا کرنے میں کوشاں ہیں۔ اسی طرح محکمۂ ترقیات خواتین و اطفال بھی اس طرح کے رضاکار اداروں کو مالی تعاون دے رہا ہے۔ مذکورہ بالا محکمہ ان صنعتوں کی طرف زیادہ توجہ دے رہا ہے جن میں کلی طور پر یا کم از کم بیش از بیش عورتوں کے روزگار کے مواقع میسر ہیں۔ مثلاً کھیتی باڑی، مچھلی پالنا، کھادی کی صنعت، ہینڈلوم، دستکاری وغیرہ۔ اس کے علاوہ یہ محکمہ جدید ذرائع روزگار مثلاً الیکٹرانکس کے سامان بنانا، گھڑی سازی، طباعت، جلد سازی وغیرہ سے فائدہ اٹھانے کے لیے عورتوں کو اس کی تربیت دینے کا کام انجام دے رہا ہے۔ ۸۷-۱۹۸۶ء میں ایک نئی اسکیم بنائی گئی ہے جس کی رو سے تمام ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں خواتین ترقیاتی کارپوریشن قائم کی گئی۔ اس کارپوریشن کا بھی مقصد عورتوں کو معاشی طور پر آزاد اور خودمختار بنانا ہے۔

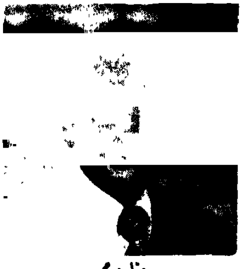
اعلیٰ تعلیم، مختلف صنعتوں کی تربیت کے پروگرام، قرض کی سہولتوں اور اسی طرح کے دیگر پروگراموں نے عورتوں کو صنعت و تجارت کے میدان میں قدم رکھنے کا حوصلہ بخشا ہے۔ محکمہ صنعتی ترقیات خاتون کاروباریوں کو شیڈ اور زمین وغیرہ کی سہولتیں فراہم کر رہا ہے۔ یہ محکمہ عورتوں میں کاروبار کے رجحان کو بڑھاوا دینے کے لیے اسمال انڈسٹریز انسٹی ٹیوٹ اور اس کی شاخوں کے ذریعے کاروبار سے متعلق ترقیات کے پروگرام منعقد کر رہا ہے۔ اس پوری کوشش کا نتیجہ یہ ہے کہ خاتون کاروباریوں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں ان کی تعداد ۲۵۰۰۰ تھی جب کہ ۱۹۸۷ء میں یہ بڑھ کر ڈیڑھ لاکھ ہو گئی۔

عورتیں زیادہ تر چھوٹے موٹے یا میکینکل کاموں میں لگی رہتی ہیں یا لگائی رکھی جاتی ہیں۔ ان چھوٹے موٹے کاموں میں ان کی ساری ذہانت اور ذکاوت آہستہ آہستہ دب کر رہ جاتی ہے۔ انسان کے اس عظیم جوہر کو ممکنہ حد تک استعمال کرنے کے مواقع فراہم کرنا پورے ملک کے لیے مفید ہوگا۔ اس لیے محکمۂ سائنس اور ٹیکنالوجی نے ایک اسکیم سائنس اور ٹکنالوجی خواتین کے لیے شروع کی ہے ۔ ظاہر ہے کہ جب عورتیں اس میدان میں قدم جمائیں گی تب ان کی ترقی کا عمل تیز تر ہو جائے گا۔

وفیات

دانشور، صحافی اور ادیب دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی کا ۱۰ر دسمبر ۱۹۸۹ء کو دہلی میں حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔

ظفر پیامی ہمہ طرح دار شخصیت کے مالک [illegible]



شادؔ عظیم آبادی کا ایک عاشق شاگرد

مظہر امام

شادؔ عظیم آبادی کے شاگردوں میں کئی باکمال شعرا کے نام آتے ہیں، جن میں سرفہرست شاید لاڈلے صاحب بیتاب تھے۔ جن کے یہ اشعار زبان زدِ خاص و عام ہیں۔

فریفتہ مجھے عالم کے رنگ و بو نے کیا
برا ستم ترے ملنے کی آرزو نے کیا

اور

سرخیِ خارِ مغیلاں یہ پتہ دیتی ہے
تیرے دیوانے یہاں آئے، یہاں تک پہنچے

یہ وہی لاڈلے صاحب بیتاب ہیں جن کے شاگرد یاسؔ عظیم آبادی (مرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی) نے چار دانگ عالم میں اپنی یگانۂ روزگار غزل گوئی کا سکہ بٹھایا۔ میر عنایت حسین امدادؔ خود استاد تھے اور شادؔ کے شاگردوں میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ شادؔ کے ایک قریبی شاگرد حمید عظیم آبادی تھے۔ جن کی کوششوں سے شادؔ کے معتبر ترین مجموعۂ غزلیات "میخانۂ الہام" کے علاوہ ان کے کئی اور مجموعے منظرِ عام پر آسکے۔ پروفیسر محمد مسلم (مسلم عظیم آبادی) شادؔ کے ایک نہایت قابلِ اعتماد شاگرد تھے جس کا ثبوت یہ ہے کہ شادؔ نے اپنی سوانح حیات اُن کی طرف سے خود تالیف کرکے اُن کے حوالے کی جسے ایک عرصے بعد ۱۹۶۱ء میں پروفیسر مسلم نے انجمن ترقی اردو دہلی کی جانب سے "شاد کی کہانی، شاد کی زبانی" کے نام سے شائع کرائی۔ ایک شاگرد شاہ حبیب بسمل عظیم آبادی تھے، جن کا ایک انتہائی مشہور شعر کسی اور کے کھاتے میں ڈالا گیا۔ لیکن اب بہ اتفاقِ رائے اُنہیں کا شعر تسلیم کرلیا گیا ہے:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

شادؔ کے شاگردوں میں ولی الرحمٰن ولیؔ کاکوی بلند اور افضل درجہ رکھتے ہیں۔ جنہیں اُستاد نے بہت جلد فارغ الاصلاح قرار دے دیا تھا۔ وہ نظم اور نثر دونوں پر قادر تھے۔ شادؔ کے ایک کم عمر لیکن چہیتے شاگرد قیس عظیم آبادی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جنہوں نے شادؔ کی زندگی میں ہی اُن کے سوانح حیات اور شاگردوں کے تذکرے اور نمونہ ہائے کلام پر مشتمل ایک کتاب "گلشنِ حیات" کے نام سے شائع کرائی۔ شادؔ کے کلام کو بیاض میں نقل کرنا اور ان کی حفاظت کرنا بھی اُن کے ذمہ تھا۔ عطاؔ کاکوی شاید شادؔ کے شاگردوں میں سب سے کم عمر تھے۔ شادؔ کے آخری دنوں میں اُن کے حلقۂ تلامذہ میں نام لکھایا۔ ایک ہی غزل پر اصلاح لی تھی کہ شادؔ اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے، پھر کسی سے اصلاح نہیں لی۔ بحیثیت محقق عطاؔ کاکوی کا درجہ بلند ہے۔ ان کی کتاب "مطالعۂ شادؔ" کے دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ "شادیات" کے نام سے ان کا سلسلۂ مضامین شادؔ عظیم آبادی کی بابت بہت سی معلومات فراہم کرتا ہے۔

عطاؔ کاکوی بفضلہٖ بقیدِ حیات ہیں۔ ان کا کام ہی شادؔ سے ان کی محبت کا ضامن ہے۔ شادؔ کے شاگردوں کی تعداد سو سے متجاوز ہے۔ ان سب کے دل میں اپنے استاد کے لیے بڑی قدر و منزلت تھی۔ شادؔ کے دامنِ فیض سے وابستہ ہونا ان سب کے لیے باعثِ افتخار تھا۔ لیکن میں یہاں شادؔ عظیم آبادی کے ایک ایسے غیر معروف شاگرد کا تعارف کرانا چاہتا ہوں جو اپنے استاد کے لیے ارادت اور عقیدت میں شاید سب سے بڑھا ہوا تھا۔ اور اس کے لیے "عقیدت مند" اور "ارادت کیش" کی صفت بھی حقیر معلوم ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے دل میں اپنے

٭ بہتاب پارک فلیٹس ریزیڈنسی روڈ، سری نگر (کشمیر) ۱۹۰۰۰۱

استاد کے لیے مجنونانہ عشق تھا۔ میری مراد منظور احمد نظر در بھنگوی سے ہے۔ منظور احمد نظر میرے حقیقی ماموں تھے اور ان کی معیت میں میرے بچپن اور نوجوانی کے کئی سال گزرے ہیں، اور میں عینی شاہد ہوں کہ وہ اپنے استاد کی بابت کوئی ہلکی سی معترضانہ بات بھی سننے کے روادار نہیں تھے۔ استاد کا نام آتے ہی ان کی آنکھوں میں ایک خاص چمک اور چہرے پر ایک عجیب تمتماہٹ پیدا ہو جاتی۔ اور وہ شاد کے کمالات اور شاعرانہ عظمت و بزرگی اور ان کی اصلاحوں کی خوبیوں کا ذکر والہانہ انداز میں کرنے لگتے۔ استاد کے تئیں ان کا والہانہ پن غلو کی حدوں کو بھی تجاوز کر گیا تھا۔

منظور احمد نظر فنا فی الشعر تھے۔ انہیں تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ پینے پلانے سے انہیں کبھی رغبت نہیں رہی، لیکن شاعری کی شراب انہیں دن رات مخمور رکھتی۔ ان کی آنکھوں کے ڈورے اسی نشہ کی غمازی کرتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں اپنے استاد کے عاشق تھے۔ شاد کی صحبتوں کا ذکر اس طرح کرتے جیسے وہ فرقت کی آگ میں پھنک رہے ہوں۔

ان کا پورا نام سید منظور احمد تھا۔ ابوالکرام کنیت تھی اور نظر تخلص فرماتے تھے۔ "مشرقی بنگال میں اردو" مؤلفہ اقبال عظیم میں "ابوالکرام" کی جگہ "ابوالاکرام" لکھا ہے جو درست نہیں۔ والد کا نام سید عبدالعلی تھا جو ناصر گنج رسول پور نستہ ضلع دربھنگہ کے رہنے والے تھے۔ محلہ شاہ سون، شہر دربھنگہ میں بھی مکان بنا لیا تھا۔ جہاں بیشتر قیام کرتے۔ سید منظور احمد کی پیدائش یہیں ہوئی۔ عبدالعلی صاحب محکمۂ آبکاری میں سب انسپکٹر تھے۔ یہاں رشوت کی گرم بازاری دیکھی تو ڈسٹرکٹ بورڈ میں اوورسیر کی ملازمت اختیار کر لی۔ یہ عہدہ بھی راس نہ آیا تو استعفیٰ دے دیا اور تاحیات رائے صاحب بابو مہا مایا پرشاد رئیس دربھنگہ کی اسٹیٹ میں تحصیل دار کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ عربی، فارسی اور اردو کی علمی استعداد قابلِ رشک تھی ان کا انتقال ۱۹۱۸ء میں ہوا۔

منظور احمد نظر کے حقیقی چچا (سید عبدالعلی صاحب کے سوتیلے بھائی) حضرت مولانا حاجی منور علی نستری اپنے وقت کے جید عالموں میں تھے۔ انہوں نے مکہ معظمہ میں حضرت شیخ العرب والعجم مولانا حاجی امداد اللہ سے بیعت فرمایا اور اپنے مرشد کے نام پر "مدرسہ امدادیہ" قائم کیا جو آج بھی لہریا سرائے (دربھنگہ) میں علم کی روشنی پھیلا رہا ہے۔ مولانا حاجی منور علی اپنی بزرگی کے باعث مولانا رشید احمد گنگوہی کو ذاتی مراسلت میں "عزیزی رشید احمد سلمہٗ" سے خطاب کرتے تھے اور مؤخر الذکر مولانا منور علی کو "حضرت مخدومی" سے خطاب کرتے ... ان سے گہرے مراسم تھے اور مولانا منور علی کی تجویز پر ہی علی گڑھ اور دیوبند کے طلبا کا تبادلہ دوران تعلیم دونوں میں ہوا تھا۔ مولانا اشرف علی تھانوی بھی ان سے عقیدت فرماتے تھے۔ مولانا حاجی منور علی کا وصال ۱۹۰۱ء میں ہوا۔

مولانا کی وفات کے وقت منظور احمد بہت چھوٹے تھے۔ لیکن ان کے والد اور مولانا کے چھوٹے بھائی سید عبدالعلی نے مولانا حاجی منور علی سے جو فیض پایا تھا اور خود سید عبدالعلی نے عربی اور فارسی میں جو دستگاہ حاصل کی تھی، ان سے بہت کچھ استفادہ کرنے کا موقع منظور احمد کو ملا۔ اور انہیں عنفوانِ جوانی میں ان کا تخلص بن کر انہیں بصیرت اور ان کے سامع اور قاری کو بصارت عطا کرتی رہی۔

منظور احمد نظر دربھنگوی کا صحیح سنِ پیدائش معلوم نہ ہو سکا۔ "گلشنِ جدید" مؤلفہ قیس عظیم آبادی کی ابتدا میں "عرضِ حال" کے عنوان سے مؤلف کی ایک تحریر ہے جس پر تاریخ نگارش ۱۸ر دسمبر ۱۹۲۵ء مرقوم ہے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب ۱۹۲۵ء میں ہی لکھی گئی ہوگی۔ اس تذکرے میں نظر دربھنگوی کی عمر پچیس سال بتائی گئی ہے۔ اس اعتبار سے ان کا سنِ پیدائش اندازاً ۱۸۹۹ء یا ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء ہونا چاہیے۔ ان کے منجھلے بھائی اور میرے ماموں خلیل احمد جگر نے، جو بفضلہ ابھی بقیدِ حیات ہیں، راقم الحروف کے نام ایک مکتوب میں ان کا سنِ پیدائش ۱۸۹۲ء یا ۱۸۹۳ء بتایا ہے۔ اقبال عظیم کے تالیف کردہ تذکرے "مشرقی بنگال میں اردو" میں نظر دربھنگوی کا سنِ پیدائش ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۷ء درج ہے۔ اس کی صحت کی گواہی بھی نہیں دی جا سکتی۔ گمان غالب ہے کہ اقبال عظیم کو اپنے حالاتِ زندگی خود نظر مرحوم نے ہی بتائے ہوں گے۔ لیکن ان میں کئی باتیں درست نہیں ہیں۔ ہم اسے مؤخر الذکر کے حافظے کی ناتوانی پر محمول کر سکتے ہیں۔

دربھنگہ کے نارتھ بروک ضلع اسکول سے منظور احمد نظر نے ۱۹۱۷ء میں دسویں یعنی میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ اس سے پہلے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ اور فارسی کی تعلیم مدرسہ امدادیہ میں مکمل کی۔ ۱۹-۱۹۱۸ء میں ضلع دربھنگہ قصبہ بہیڑہ کے متصل موضع بسگائیوں میں جناب سید تصدق کی صاحبزادی سے شادی ہوئی۔ اوائلِ عمر سے ہی شعر و شاعری سے رغبت پیدا ہو گئی تھی۔ خلیل احمد جگر نے راقم الحروف کے نام اپنے مکتوب مورخہ مارچ ۱۹۸۶ء میں اپنی کمزور یادداشت کی معذرت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

"ابتدائی زندگی دربھنگہ میں مولانا ناصر صاحب دہلوی کے ساتھ اخبارات سے منسلک رہ کر گزری اور وہیں سے شاعری کی ابتدا ہوئی۔" حکیم ابوالحسن ناصر دہلوی کی ادارت میں "مسیحا" نام کا ماہنامہ دربھنگہ سے ۱۹۰۴ء میں نکلا۔ اگر منظور احمد نظر کا سنِ پیدائش ۱۸۹۷ء تسلیم کیا جائے تو اس وقت ان کی عمر سات سال سے کم تھی۔ اگر ان کا سنِ پیدائش ۹۳-۱۸۹۲ء مانا جائے تو ان کی عمر کم و بیش ۱۲ سال رہی ہوگی۔ ممکن ہے وہ ... کی طرح حکیم ناصر کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہوں اور مسیحا کے لیے کچھ کام کرتے ہوں۔ ... اس عمر میں شعبہ ادارت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ اغلب ہے کہ ...

[illegible]

کی صحبت میں انہیں شعروادب کا ذوق پیدا ہوا ہوگا۔ اقبال عظیم کی کتاب "مشرقی بنگال میں اردو" میں ایک جگہ منقول ہے:۔

"نقاش (کلکتہ)، ندیم (گیا)، آئینہ (کشن گنج)،
مسیحا (دربھنگہ)، نئی کرن (دربھنگہ) اور شہاب
(چاٹگام) میں اکثر ان کی غزلیں شائع ہوئی ہیں۔"

جہاں تک مجھے علم ہے "مسیحا" نام کا ایک ہی رسالہ دربھنگہ سے شائع ہوا۔ اور وہ ۱۹۰۴ء میں۔ لہٰذا یہ قرینِ قیاس نہیں کہ نظر دربھنگوی کا کلام اس میں شائع ہوا ہو۔ اس رسالے کے شمارے مجھے نہیں مل سکے جن سے تصدیق ہو سکتی۔

اقبال عظیم کے بیان کے مطابق نظر صاحب نے ۱۹۱۴ء سے شعر کہنا شروع کیا[6]۔ یہ بیان درست معلوم ہوتا ہے۔ منظور احمد نظر ۱۹۲۳ء میں پٹنہ گئے اور کلکتہ کی ایک تجارتی فرم ریلے برادرس Raleigh Brothers کی پٹنہ سٹی شاخ میں ملازمت کرنے لگے۔ وہیں کے قیام کے دوران ایچ۔ ایچ۔ میڈیکل کالج میں ہومیوپیتھک کی تعلیم حاصل کی اور ایم۔ ڈی۔ ایچ کا امتحان طلائی تمغہ کے اعزاز کے ساتھ پاس کیا[7]۔ ڈاکٹر ایل۔ رائے کے قائم کردہ ہومیوپیتھک کالج کے پرنسپل بھی رہے[8]۔

"مشرقی بنگال میں اردو" میں مذکور ہے کہ نظر دربھنگوی ۱۹۱۸ء میں پٹنہ چلے گئے۔ یہ درست نہیں۔ شاداں فاروقی نے اپنے تذکرہ "بزمِ شمال" میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ نظر صاحب نے ۱۹۱۸ء میں پٹنہ سے ہومیوپیتھک کی ڈگری لی۔ حالانکہ "مشرقی بنگال میں اردو" میں ڈگری لینے کا ذکر تو ہے مگر ۱۹۱۸ء کی تخصیص نہیں کی گئی۔

نظر دربھنگوی کے پٹنہ سٹی کے قیام اور شاد سے قربت کے سلسلے میں شاد عظیم آبادی کے پوتے جناب سلطان احمد بہزاد فاطمی کا مندرجہ ذیل بیان[9] اہم ہے۔ اس سے منظور احمد نظر کی شاعرانہ مقبولیت اور اس وقت کی حریفانہ چشمکوں پر بھی روشنی پڑتی ہے:۔

"سید منظور احمد نظر کو میں نے پہلی بار اپنی کم عمری کے زمانے میں دیکھا تھا۔ ان کا قیام ان کے ہم عمر اور بے تکلف دوست سید اظہر امام اظہر (تلمیذِ شاد) کے مکان مدرسہ ہاؤس میں تھا۔ سن ۲۳ یا ۲۴ میں سید اظہر امام اظہر ہی کی وساطت سے وہ حضرت شاد کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے۔ ابتدا میں سنگلاخ زمینوں میں شعر کہتے تھے۔ استاد کی تعلیم و تربیت اور خود اپنی اکتسابی صلاحیتوں کے طفیل ابتدائی رنگِ سخن کو ترک کر دیا تھا۔ عظیم آباد میں شعر و شاعری کا اس زمانے میں کافی چرچا تھا۔ عام مشاعرے بھی ہوتے اور مخصوص شعری نشستیں بھی۔ ان سبھوں میں پابندی سے شرکت کرتے۔ بحیثیت شاعر کافی مقبول رہے اور غزلیں کامیاب ہونے لگیں۔ کچھ عرصہ بعد یہ مقبولیت اور کام یابی بعض نظروں میں کھٹکنے لگیں۔ ایک ایسا تاثر پیدا کرنے کی کوشش ہونے لگی کہ خود حضرت شاد، نظر صاحب کو غزلیں کہہ کر دے دیا کرتے ہیں۔ اس تاثر کی نفی ضروری تھی۔ لہٰذا تجویز ہوئی کہ ایک مخصوص نشست ایسی قرار دی جائے جس میں تلامذۂ شاد فی البدیہہ شعر گوئی کا نمونہ پیش کریں۔ چنانچہ ایک ایسی نشست شاد منزل کے ہال میں ہوئی تھی۔ مصرع طرح تو یاد نہیں۔ جو طرح آغازِ نشست سے پہلے نکالی گئی اس کی ردیف تھی:
"کیوں نہیں دیتے" اور قوافی تھے "دعا" اور "جفا" وغیرہ۔ کہنہ مشق تلامذۂ شاد میر عنایت حسین امداد اور لاڈلے صاحب بیتاب بہ اتفاق رائے حکم مقرر ہوئے۔ دیگر تلامذۂ شاد نے اسی نشست میں غزلیں کہیں اور سنائیں۔ نظر مرحوم نے بھی چھ سات شعر کی غزل کہی۔ ممکن ہے یہ یادگار غزل ان کے مجموعۂ کلام میں ہو۔"

یہ یادگار غزل منظور احمد نظر کے غیر مطبوعہ قلمی دیوان میں موجود ہے۔ سید اظہر امام اظہر، جن کا ذکر اوپر ہوا لیڈی انیس امام (اہلیہ سر علی امام) کے حقیقی ماموں زاد بھائی تھے۔

شاد عظیم آبادی کے پڑپوتے جناب نقی احمد ارشاد (مصنف "شاد کا عہد اور فن" حصہ اول و دوم) نے نظر دربھنگوی کی بابت لکھا ہے:

"ہمہ تن شاعر تھے۔ کیوں کہ مدرسہ ہاؤس شاد منزل سے نہایت قریب تھا۔ منظور چچا مرحوم دن بھر جد مرحوم (شاد عظیم آبادی) کی خدمت میں رہتے تھے۔ . . . نہایت خلیق، منکسر اور باغ و بہار بزرگ تھے۔"[10]

نظر دربھنگوی نے "الپنچ" کے زمانے میں شاد اور فضل حق آزاد کی معرکہ آرائیوں میں بھی حصہ لیا تھا۔ عظیم آباد کے مشاعروں میں صفی لکھنوی، نوح ناروی اور سیماب اکبرآبادی جیسے اساتذہ سخن سے بھی ان کی صحبتیں رہی تھیں۔ پٹنہ میں نظر کا قیام قیاساً ۱۹۲۶ء کے اواخر تک رہا۔ وہاں وہ ہومیوپیتھک ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنا مطب کرتے رہے، اس کے بعد وہ اپنے وطن دربھنگہ واپس آگئے۔ شاد کے انتقال کے دن یعنی ۷ جنوری ۱۹۲۷ء سے پہلے وہ پٹنہ کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ کیوں کہ نہ تو وہ استاد کی تجہیز و تکفین میں شریک تھے اور نہ تلامذۂ شاد کی اس تصویر میں جو مزارِ شاد پر لی گئی تھی۔[11] اقبال عظیم کا یہ بیان کہ نظر ۱۹۲۷ء تک پٹنہ میں

مقیم رہے[9] درست نہیں معلوم ہوتا۔

منظور احمد نظر کی ازدواجی زندگی ہمیشہ غیر مطمئن رہی اور بیوی سے تعلقات برابر کشیدہ رہے۔ شاعری سے غیر معمولی شغف نے انہیں دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا تھا۔ ان کے ہم عصر اور احباب انہیں "دیوانہ شاعر" کہتے۔ ۳۳-۱۹۳۲ء تک شاعری نے انہیں حقیقتاً مجنوں بنا دیا۔ معاش کی مجبوری تھی ہومیوپیتھک معالج کی حیثیت میں وہ پٹنہ، دربھنگہ، جلکورا (مونگیر) وغیرہ میں گھومتے رہے۔ کہیں قرار نہیں تھا۔ شادی کے تقریباً بیس سال بعد اندازاً ۳۷-۱۹۳۶ء میں بغیر کسی خاص وجہ کے اپنی بیوی کو طلاق دے دی[10]

قیام عظیم آباد کے دوران نظرؔ نے کچھ شاگرد بھی بنا لیے تھے۔ انہیں شاگردوں میں ایک کھتری رئیس بھی تھے۔ جن کے یہاں ۱۹۲۵ء میں ایک مشاعرے کا انعقاد ہوا تھا جس کی طرح تھی ــــ "بیمانے کی، دیوانے کی" شادؔ بھی نظرؔ کی دعوت پر اس میں شریک ہوئے تھے۔ شادؔ نے جو غزل پڑھی تھی اس کا مطلع اور مقطع درج ذیل ہے :

شمع سر دھنتی ہے تصویر ہے گھبرانے کی
موت منڈلاتی ہوئی پھرتی ہے پروانے کی

شادؔ جو کھی غزل اس طرح میں کہنی ہی پڑی
کوئی صورت نہیں چھوروں کو بچھڑوانے کی[12]

نقی احمد ارشاد کے بیان کے مطابق اس مشاعرے میں منظور احمد نظرؔ نے جو غیر طرحی غزل پڑھی تھی اس کا ایک مصرع تھا :

کڑی کماں کا ہو جب کہ ناوک تو کیا بچے گا بھلا نشانہ

نظرؔ کے حلقۂ تلامذہ میں حفیظ الحسن حفیظؔ دربھنگوی، عبدالقیوم قتیلؔ دربھنگوی اور ارمان عظیم آبادی کے نام بھی آتے ہیں[13]

۳۶-۱۹۳۵ء میں ایک بار پھر نظرؔ دربھنگوی عظیم آباد آئے۔ اس بار بھی ان کا قیام مدرسہ ہاؤس میں تھا۔ ان کے اعزاز میں سید اظہر امام اظہرؔ کی تحریک پر ایک شعری نشست مبارک عظیم آبادی کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں نظرؔ نے کئی غزلیں اپنے مخصوص انداز میں سنائیں۔ ہفتہ دس روز قیام رہا۔ اس دوران کئی مخصوص نشستیں رہیں۔ ان سب نشستوں میں نظرؔ مرحوم نے غزلیں پڑھیں[15]

مبارک عظیم آبادی کی صدارت میں جو نشست ہوئی اس میں نظرؔ دربھنگوی نے اس زمین میں غزل پڑھی تھی ــــ "جگر ہم سے، نظر ہم سے"۔ اسی غزل کا یہ خوبصورت شعر ہے،

لفافہ ہاتھ میں ہے، اس پہ لکھیں بھی تو کیا لکھیں
پتہ ہم نامہ بر سے پوچھتے ہیں، نامہ بر ہم سے

پٹنہ سے واپس آنے کے بعد شاعری اور ہومیوپیتھک کی طبابت دو ہی مشاغل رہ گئے تھے۔ پورنیہ میں کافی دنوں پریکٹس کی، وہیں جناب احد نور مرحوم سے دوستانہ مراسم قائم ہوئے۔ احد نور بہار کی قومی سیاست میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ عبدالقیوم انصاری کے رفیق خاص تھے۔ بہار حکومت میں وزیر بھی ہوئے تھے۔ انہیں کے صاحبزادے ڈاکٹر خالد رشید صبا روزنامہ "ساتھی" پٹنہ کے ایڈیٹر ہیں اور حکومت بہار میں وزیر بھی رہ چکے ہیں۔ منظور احمد نظرؔ پورنیہ سے واپس آئے تو دربھنگہ کے اطراف بہیڑا، پنڈول، مدھے پور وغیرہ میں مطب کرتے رہے۔ پھر دربھنگا شہر میں ہی پریکٹس کرنے لگے۔ ۱۹۵۰ء میں مشرقی پاکستان چلے گئے۔ کچھ دنوں سید پور میں قیام کرنے کے بعد ۱۹۵۱ء سے چٹگام میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ وہاں کے اساتذۂ سخن میں اُن کا شمار ہوتا تھا[16] وہاں بھی ان کے شاگردوں کا ایک حلقہ بن گیا تھا ــــ

مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں ان کے مخصوص احباب میں اقبال عظیم، حسن عظیم آبادی اور حکیم ناطق لکھنوی مرحوم کے خلف اکبر رشید احمد ایڈوکیٹ، شامل تھے۔ حمید عظیم آبادی سے بھی آخر وقت نیازمندانہ خط و کتابت جاری رہی۔

منظور احمد نظرؔ چٹگاؤں میں ہی کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہوئے اور ہر طرح کے علاج سے مایوس ہو کر ستمبر ۵۷ء میں اپنے وطن بہار لوٹ آئے۔ پہلے پٹنہ میں اپنے سب سے چھوٹے بھائی ڈاکٹر افتخار احمد دہرؔ ناصری کے یہاں قیام کیا جو ان دنوں لیبل لیتھو پریس میں جنرل منیجر تھے۔ پھر نظرؔ دربھنگا آ گئے۔ وہاں سے اپنے منجھلے بھائی خلیل احمد جگرؔ کے پاس موضع کنسی سمری چلے گئے، جہاں مؤخر الذکر پوسٹ ماسٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ وہیں ۲۰ نومبر ۱۹۵۷ء کو جان جاں آفریں کے سپرد کی۔

اُن کے انتقال پر مختلف اخبارات نے تعزیتی نوٹ لکھے اور نمونۂ کلام پیش کیا۔ اس وقت میرے سامنے روزنامہ "اخوت" کلکتہ (۲۸ نومبر ۱۹۵۷ء)، روزنامہ "عصر جدید" کلکتہ (۲۹ نومبر ۵۷ء) اور روزنامہ "آبشار" کلکتہ (یکم دسمبر ۵۷ء) کے شمارے موجود ہیں۔ جن میں نظرؔ دربھنگوی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ "اخوت" (مدیر: ناظر الحسینی) کے جذبات انگیز تعزیتی نوٹ بعنوان "ایک ادبی حادثہ" کا ابتدائی حصہ یوں ہے :

"موت فطرت کا اٹل فیصلہ ہے۔ ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ ازل سے ابد تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ لیکن کسی کسی کی موت پر پھوٹ پھوٹ کر رونے کو جی چاہتا ہے۔ یوں تو دس سال کے اندر ہندوستان میں بہت سے نامور ادیبوں اور شاعروں کی موت پر ہم آنسو بہا چکے ہیں۔ لیکن یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے..... اب بہار کے ایک ممتاز شاعر حضرت نظرؔ دربھنگوی کی موت

کی خبر آئی ہے۔ اس عظیم شاعر نے اردو شاعری کو معراج کمال تک پہنچانے میں نمایاں حصہ لیا۔ ان کی موت پر صرف بہار ہی گریاں نہیں، بلکہ ہندوستان کا ادبی طبقہ رو رہا ہے اور ہم ان کی موت کو اردو ادب کے لیے ایک نقصانِ عظیم تصور کرتے ہیں۔"

"تذکرہ مسلم شعرائے بہار" جس کے مؤلف حکیم سید احمد اللہ ندوی ہیں اور جس کی چھ جلدیں ۱۹۶۴ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان نیشنل پریس کراچی سے شائع ہوئیں، ایک ناقص تذکرہ ہے۔ اس کی اہمیت اسی قدر ہے کہ بہار کے اچھے برے اردو شعراء کے ناموں سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ حالاتِ زندگی وغیرہ کے حصول میں مؤلف نے محنت نہیں کی ہے۔ جس کی وجہ سے تذکرے میں بہت سی واقعاتی غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔ اس تذکرے میں نظر دربھنگوی کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام تقریباً من و عن "گلشنِ حیات" سے نقل ہیں۔

شمالی بہار کے اردو شعراء کا تذکرہ "بزمِ شمال" مؤلفہ شاداں فاروقی (شائع کردہ شعرستان، دربھنگا ــ ۱۹۸۷ء) معلومات کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔ ابھی اس کی پہلی جلد ہی شائع ہوئی ہے، جس میں مرحوم شعراء کے تذکرے شامل ہیں۔ نظر دربھنگوی کے حالات اور نمونۂ کلام صفحہ ۲۸۸ تا ۲۹۰ درج ہیں۔ صاحبِ "بزمِ شمال" کا ماخذ "مشرقی بنگال میں اردو" ہے اس لیے اس میں بھی وہ تسامحات راہ پا گئے ہیں جو موخرالذکر کتاب میں موجود ہیں۔ مؤلف نے نظر دربھنگوی کا کلام "مشرقی بنگال میں اردو" اور "مسلم شعرائے بہار" حصہ پنجم سے نقل کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے "مسلم شعرائے بہار" میں نظر کی جو غزل ہے، وہ بھی "گلشنِ حیات" سے منقول ہے۔ شاداں فاروقی نے بھی نظر دربھنگوی کی بابت نئی معلومات فراہم نہیں کیں۔

منظور احمد نظر دربھنگوی کو کم و بیش ۴۵ سال فکرِ سخن کا موقع ملا۔ مختلف اصنافِ شعر میں طبع آزمائی کی اور اپنی فنی صلاحیتوں کو تسلیم کرایا۔ پہلے مختلف اساتذہ کو غزلیں دکھائیں[۱۵]، لیکن شاد عظیم آبادی کی شاگردی اختیار کرنے کے بعد اُن کی زندگی تک انہیں سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد اپنی ذاتی صلاحیت کو اپنا رہبر بنا لیا۔

نظر دربھنگوی کلاسیکی روایت کے امین تھے۔ ان کے کلام میں صفائی اور شستگی کے علاوہ ایک ایسی روانی ہے، جو غیر معمولی مشق اور ریاضت کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔ صاحبِ "مشرقی بنگال میں اردو" نے لکھا ہے کہ نظر دربھنگوی نے کم و بیش تین سو غزلیں کہیں، جن سے نصف پر استاد (شاد) کی اصلاح ہے۔ راقم الحروف کے پاس ان کا کلام محفوظ ہے، جن میں غزلیں، نظمیں، رباعیات اور قطعات ہیں۔ ان کا کلام جو مجھ تک پہنچ سکا ہے، اُن میں سو غزلوں سے زیادہ نہیں ہیں ــــ نظر دربھنگوی کے ذاتی اوصاف اور کلام کی خوبیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے قیس عظیم آبادی نے "گلشنِ حیات" میں لکھا ہے:

"اخلاق و محبت آپ کا شیوہ ہے۔ دل کے غنی، غیور، نیک نہاد، علم دوست اور شوقین ہیں۔ صلاحیت وادراک اور مادۂ استقلال بھی ہے، جس سے جتنا بھر ملتے ہیں، نباہتے ہیں ..... کلام میں سادگی اور زبان کا لطف ملتا ہے۔ حسن و عشق کے عامیانہ خیالات سے دور اور حقیقی جذبات سے آپ کی طبع رسا کو خاص تقرب ہے۔"

اقبال عظیم نے اپنی کتاب "مشرقی بنگال میں اردو" میں نظر کے شعری مزاج کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"حافظ شیرازی اور مرزا غالب کا مطالعہ انہوں نے خاص طور پر کیا ہے۔ لیکن استاد کا رنگِ سخن ان کے لیے واحد رہنما کا حکم رکھتا ہے۔ جسے اپنے لفظوں میں وہ اپنی شاعری کا ایمان جانتے ہیں۔ نظر صاحب شعر مضبوط کہتے ہیں۔ اور خاص طور سے زبان کا اہتمام ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔"

بہار اسکول کا سب سے نمائندہ رنگ شاد عظیم آبادی کے کلام میں ملتا ہے۔ منظور احمد نظر دربھنگوی نے اپنے استاد کے رنگ کو اردو شاعری کا خوبصورت ترین رنگ مانا اور اسی رنگ کو اپنانے کی کوشش کرتے رہے۔ اس لیے ان کے کلام میں بھی ان اوصاف کا سراغ لگانا دشوار نہیں ہے۔ جن سے شاد کا کلام متصف ہے۔

نظر کی شاعری فنی، ریاض اور شعری تجربے کی آگ میں تپ کر نکھری اور ان کے واردات و محسوسات کی صورت گری پر منتج ہوئی۔ ان کے یہاں وہ شوخی اور طرح داری نہیں، جو لکھنؤ اسکول کا امتیازی نشان ہے، لیکن ان کے یہاں ایک ایسا بانکپن ہے جو ان کے کلام کو ایک خاص طرح کی کیفیت سے دوچار کرتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ دو اشعار کافی ہوں گے۔

ہماری خاک صحرا میں ہرن ملتے ہیں آنکھوں سے
اثر کہتے ہیں اس کو الفتِ چشمِ حسیناں کا
سرِ محفل میں رویا، کھلکھلا کر ہنس پڑا وہ گل
تماشا دیکھنے والوں نے دیکھا برق و باراں کا

ان کے یہاں اگر شوخی ہے بھی تو اس کا طنزیہ لہجہ معیارِ کلام کو پست نہیں ہونے دیتا۔

جسے چاہا اسے دل دے دیا، شیخ!
طبیعت میری، اس میں آپ کا کیا؟

باقی

مجھے تو دیکھ کر واعظ نے کافر کہہ دیا لیکن
تری صورت بھی او غارت گرِ دنیا و دیں! دیکھی؟

اُن کے یہاں درد و سوز کی وہ لے نہیں جس سے دہلی اسکول کا مزاج عبارت ہو۔ لیکن ان کے یہاں ایک شائستہ غم، ایک مہذب ٹیس ہے جو بہار اسکول کی ایک خصوصیت کی جانب اشارہ کرتی ہے:

مرا قصّہ مجھی سے پوچھنا ناصح کی عادت ہے
مصیبت میں مصیبت کا بیاں، دوہری مصیبت ہے

غم نہ ہوگا تو کیا نہ ہوگا غم
غم نہ ہونے کا دل کو غم ہوگا

ان اشعار میں "مصیبت" اور "غم" کی تکرار سے جو حُسن پیدا کیا گیا ہے وہ شاعر کی قدرتِ کلام کا واضح اشاریہ ہے۔

نظر دربھنگوی اپنے جذبات اور محسوسات کو ہنرمندی سے پیش کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ان کے طرزِ اظہار میں سنجیدگی اور پاکیزگی کے ساتھ لطافت اور شیرینی ہے۔ ان کے کلام کا عمومی رنگ یہ ہے:

محبت کا بہ مردانِ خدا معلوم ہوتی ہے
یہ عزّت، عزّتِ ہر دوسرا معلوم ہوتی ہے
ابھی سے تنگ آکر آرزو کے دم بدم شکوے
ابھی تو آرزو کی ابتدا معلوم ہوتی ہے
مری گم گشتگی کیا دیکھتے ہو، بلکہ یہ دیکھو
مری گم گشتگی کس کا پتہ معلوم ہوتی ہے

اس کفر پرستی کے پیچھے اپنے کو فریب دیے کیا کیا
کم بخت گیا میں دیر میں بھی تو ساتھ لیے قرآن گیا
دروازے تک آیا دینے کو سنتے ہی سخی سائل کی صدا
پٹ کھولتے ہی روپوش ہوا وہ پردہ نشیں پہچان گیا

لے چلیں گر پئے گلگشت وہ شامل مجھ کو
گل اُنہیں دیکھیں گے حسرت سے، عنادل مجھ کو

جو باتیں کیں تو باتوں میں گزاری رات بھر کس نے
اگر روٹھا تو روٹھا رہ گیا وہ دو پہر ہم سے

کہاں منزل سا رفیق، اے بیخودی! جا کر کہاں ڈھونڈیں
یہ منزل سخت تھی ایسی کہ چھوٹا ہم سفر ہم سے
لفافہ ہاتھ میں ہے، اس پہ لکھیں بھی تو کیا لکھیں
پتہ ہم پوچھتے ہیں نامہ بر سے، نامہ بر ہم سے

نگاہیں کیوں ہیں نیچی، یہ حیا کیا
سمجھتے ہو، کسی کا مدّعا کیا
ہلالِ عید پر سایہ فگن ہے
کسی کا ناخنِ انگشتِ پا، کیا!
سلامت، گردن و خنجر سلامت
لہو ملتے رہو، رنگِ حنا کیا!

ہم سُن کے چُپ رہے شبِ فرقت بڑی نہیں
جو چاہے کہہ لے، جس پہ مصیبت پڑی نہیں

جو مجھ غریب کو دینا ہی تھا یہ بختِ سیاہ
تو اُن کے عارضِ تاباں کا تِل بنانا تھا

شرم کے ساتھ جو ہو جائے تبسّم بھی شریک
اپنی حد پر کہیں جذبات رہا کرتے ہیں

منظور احمد نظر کا شعری تجربہ جب فنی پختگی کو چھوتا ہے تو ایسے اشعار بھی وارد ہوتے ہیں جن پر خود استاد کو رشک ہو سکتا تھا:

ہے تقاضائے جنوں سیرِ بیاباں کیجے
مل ہی جائیں گے وہاں کچھ جانے پہچانے ہوئے

اور

سُن کر ہو جاتی ہے جب شورشِ عالم خاموش
ہم فضا میں تری آواز سُنا کرتے ہیں

اس شعر کے پہلے مصرعے میں "ش" کی تکرار بھی توجہ طلب ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ نظر دنیا و مافیہا سے بے خبر رہتے تھے۔ بے نیازی اُن کا مزاج تھی۔ ایسی صورت میں وہ اپنے کلام کی حفاظت کی جانب کیا توجہ دیتے۔ چھوٹے چھوٹے کٹے پھٹے پرزوں کی شکل میں ان کی غزلیں مجھ تک پہنچی ہیں۔ ان میں بھی خود اُن کے ہاتھوں اتنی بار ترمیم و تنسیخ ہوئی ہے کہ شعر کی آخری اور موزوں ترین شکل تک رسائی ایک مرحلۂ سخت ہے۔ البتہ ۴۴ء اور ۴۷ء کے دَوران میں نے اُن کے حافظے کی مدد سے جو غزلیں نقل کی تھیں ان

کے متن کی صحت پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ نظر نے اپنے کلام کو شائع ہونے کا موقع نہیں دیا۔ وہ بہار اور مشرقی بنگال کی حدود سے باہر نہیں نکلے۔ یہ ساری باتیں ان کی شہرت اور قدر سنجی کی راہ میں حائل رہیں۔

بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں اردو غزل کا سب سے اہم نام شاد عظیم آبادی کا تھا، لیکن اس صدی کی دوسری چوتھائی کے آغاز میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ اس صدی کے اوائل میں ہی حسرت کی غزل بھی اپنا جادو جگانے لگی تھی۔ ان کے ساتھ غزل گویوں کا ایک بڑا کارواں سامنے آیا۔ شاد اور حسرت کے ساتھ اصغر، فانی، یگانہ، جگر اور فراق کے نام اس دور کی غزل گوئی کی شناخت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں لیکن بیسویں صدی کے نصف اول میں ان سب کے علاوہ ایسے بہت سے اساتذۂ سخن بھی تھے جو روایتی اور کلاسیکی غزل کی نمائندگی کر رہے تھے۔ لکھنؤ میں عزیز، صفی، آرزو، ثاقب، جعفر علی خاں اثر، سراج، آنند نرائن ملا، ناطق۔ یوپی میں ہی نوح ناروی، جلیل مانک پوری، سیماب اکبرآبادی، آسی غازی پوری، ناطق گلاوٹھی۔ بہار میں شاد کے شاگردوں کے نام پہلے آچکے ہیں۔ ان کے علاوہ فضل حق آزاد، مبارک عظیم آبادی، عرش گیاوی، شوق نیموی، عماد پوری، باقر عظیم آبادی، بدر آروی، مقصود گیاوی، صریر کابری، رنجور عظیم آبادی، تمنا عمادی، اودھ کشور پرشاد کشتہ گیاوی، رسا ہمدانی، بنگال میں وحشت کلکتوی ـــــ یہ چند نام حافظے پر زور ڈالے بغیر ذہن کے پردے پر ابھرتے ہیں۔

سید منظور احمد نظر دربھنگوی کی غزل بھی اسی روایت سے جڑی ہوئی ہے جس سے اس وقت کے بیشتر اساتذہ اور خوش گو شعرا جڑے ہوئے تھے۔ نظر کے کلام میں سرمستی اور والہانہ پن نہیں، جوش و ولولہ بھی نہیں لیکن ان کے یہاں ایک شائستہ سپردگی، دردمندی اور دل گداختگی ہے۔ جس نے ان کے کلام کو ہمارے لیے عزیز اور محترم بنادیا ہے۔

نظر دربھنگوی اکثر الفاظ کی تکرار سے لطف پیدا کرتے ہیں۔ ایسے اشعار کی مثالیں اوپر دی جاچکی ہیں۔ ان کے یہاں محاکات کے خوب صورت نمونے بھی ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر "شرم کے ساتھ تبسم کے شریک" ہونے والا شعر یا "وہ ہمہ دہ نشیں پہچان گیا" والا شعر۔ اُن کی وفاداری بشرط استواری کا یہ عالم ہے کہ وہ کعبہ میں بھی قرآن لے کر جاتے ہیں۔ ایسے کتنے شعرا ہیں جو محبت کو "کار مردان خدا" سے تعبیر کریں اور پھر عام طور پر شعرا کو محبت میں رسوائی ہی حاصل ہوتی رہی ہے۔ نظر کا محبت کو عزت اور وہ بھی "عزت دو سرا" قرار دینا اُس وقت کی روایتی غزل گوئی میں ایک نیا تصور معلوم ہوتا ہے۔ "گم گشتگی" والے شعر کا مضمون نیا نہیں۔ لیکن اچھوتا یا افتادہ بھی نہیں۔ اور پھر جس بے ساختگی اور حلاوت کے ساتھ ادا ہوا ہے، حوصلۂ اختیار داد کا طالب ہے۔

منظور احمد نظر کا المیہ ہے کہ وہ اپنے استاد کے تابع مہمل بن کر رہ گئے۔ [illegible] جانا تو درکنار، اُنھوں نے اپنے استاد سے الگ راہ اختیار کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ ان کی شعری اور خلاقانہ قوتیں ماند پڑنے لگیں۔ اور ان کی تخئیل ایک خاص دائرے سے باہر نہ نکل پائی۔

منظور احمد نظر کا محفوظ سرمایہ مختصر ہے، لیکن ان کے اچھے اشعار کی تعداد بہت مختصر نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے یہاں جتنے اچھے اشعار ملتے ہیں، اتنے بہت سے معروف اساتذہ کے یہاں بھی نہیں ملتے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ شاعر کو اس کی شہرت سے نہیں بلکہ اس کے کلام کے محاسن سے پہچاننا چاہیے۔

حواشی

۱۔ مکتوب خلیل احمد جگر بنام مظہر امام مورخہ ۱۰ر جون ۸۶ء اور "مشرقی بنگال میں اردو" مؤلفہ اقبال عظیم مشرق کو آپریٹو پبلی کیشنز، ڈھاکہ ۱۹۵۴ء صفحہ ۳۹۲۔
۲۔ "مشرقی بنگال میں اردو" صفحہ ۳۹۲
۳۔ مکتوب خلیل احمد جگر
۴۔ "مشرقی بنگال میں اردو صفحہ ۳۹۲
۵۔ ایضاً
۶۔ مکتوب خلیل احمد جگر
۷۔ راقم الحروف کی فرمائش پر لکھی ہوئی بہزاد فاطمی کی ایک غیر مطبوعہ تحریر (مارچ ۸۸ء) اس کے علاوہ بہزاد فاطمی کے مضمون "شاد عظیم آبادی کے شب و روز" (جو اُن کے مجموعۂ مضامین "...... یہ فسانہ زلفِ دراز کا" میں شامل ہے) میں بھی نظر دربھنگوی کا ذکر ملتا ہے۔
۸۔ مکتوب نقی احمد ارشاد بنام مظہر امام مورخہ یکم مارچ ۱۹۸۸ء
۹۔ بہزاد فاطمی کی ایک غیر مطبوعہ تحریر
۱۰۔ "مشرقی بنگال میں اردو" صفحہ ۳۹۲
۱۱۔ مکتوب خلیل احمد جگر
۱۲۔ بہزاد فاطمی کی ایک غیر مطبوعہ تحریر
۱۳۔ مکتوب نقی احمد ارشاد
۱۴۔ مکتوب خلیل احمد جگر
۱۵۔ بہزاد فاطمی کی ایک غیر مطبوعہ تحریر
۱۶۔ مکتوب نقی احمد ارشاد
۱۷۔ "مشرقی بنگال میں اردو" صفحہ ۳۹۲
۱۸۔ "گلشن حیات" مؤلفہ السید معین الدین احمد قیس رضوی سید آبادی عظیم آبادی ۱۳۴۴ھ صفحہ ۱۲۷۔

آغا سہیل

فیض کی انقلابی شاعری: تیسری دنیا کے تناظر میں

تیسری دنیا کا مفہوم دوسری جنگِ عظیم کے بعد بڑی تیزی سے واضح ہونا شروع ہوا۔ اس سے مراد بالخصوص وہ خطّے اور علاقے ہیں جن کا کسی نہ کسی طریق پر استحصال ہوا تھا۔ یہ استحصال اقتصادی بھی تھا (بلکہ اقتصادی ہی زیادہ تھا) معاشرتی بھی، تہذیبی اور ثقافتی بھی۔ تیسری دنیا کا جغرافیہ کچھ بھی ہو، اس کا احاطہ امریکہ جیسے سرمایہ دار ملکوں کے سلمز تک پھیلا ہوا ہے لیکن من حیث القوم جن قوموں کو بطورِ خاص اور براہِ راست نقصان پہنچا اور وہ استعماری نظام کے جبر و تعدی کا شکار رہیں، وہاں کے مسائل انتہائی جاں گسل تھے۔ فیض کی انقلابی شاعری کا مطالعہ اس تناظر میں ہونا چاہیے کیوں کہ ان کا ذہنی افق نہایت وسیع تھا۔ استحصالی نظام کا بطورِ خاص انہوں نے مطالعہ بھی کیا تھا اور اس کے نتائج کا مشاہدہ بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر وہ برِصغیر کے سامراجی نظام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں تو گویا تیسری دنیا میں جہاں جہاں استحصال ہوا انہوں نے اس کے خلاف آواز بلند کی۔

بعض مفکرین کا یہ موقف ہے کہ ادب میں ان باتوں کی گنجائش نہیں ہے۔ بالخصوص شعر و ادب میں انسان کے احساسِ جمال اور اس کی قوتِ متخیلہ کا عکس محفوظ ہونا چاہیے۔ یہی شاعری ہے اور یہی ادب ہے، لیکن اردو میں خواجہ الطاف حسین حالی نے اس پامال روش کے خلاف جو تعمیری اقدام کیا، اس کے بعد مذکورہ بالا نظریے کی کھوکھلی اور فرسودگی نمایاں ہو گئی نیز اردو ادب میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز فکر سے ہوا اور نظریے سے اس کا خمیر اٹھا۔ جذبات اور احساسات ہماری شاعری کا جزو ہیں، کُل نہیں اور یہ جزو بھی جزوِ اعظم نہیں بڑی شاعری اور بڑا ادب نہ محض جذبات سے پیدا ہوتا ہے اور نہ محض اسلوب سے بلکہ نظریے اور جذبے کی آمیزش سے جو آفاقی قدریں پیدا ہوتی ہیں، وہی پائیدار رہتی ہیں اور وہی ادب میں اپنا مقام بھی بناتی ہیں حتیٰ کہ میر جیسے خود نگر اور دروں بیں شاعر جب دل کے دائرے سے نکل کر دلّی میں داخل ہوتے ہیں تو آفاقی شاعری پیدا ہوتی ہے اور نظریے اور فکر کی توانائی ہی غالب اور اقبال کو آفاقی شاعر بناتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ فیض کی شاعری میں ہمیں جو دو نمایاں پہلو نظر آتے ہیں ان میں ایک رومانی ہے تو دوسرا جدلیاتی۔ لیکن یاد رہے کہ فیض کے رومان میں بھی معاشرتی جبر کے خلاف جو انقلابی جذبہ کارفرما ہے اس کی اساس اس کمزور رومان پر نہیں ہے، جس میں خیال، جذبہ اور وجدان کام کرتے ہیں۔ بلکہ اس کے پس منظر میں فکر اور نظریے کی مضبوط پشتہ بندی کی گئی ہے۔

فیض نے ترقی پسند تحریک سے بطورِ خاص استفادہ کیا۔ ترقی پسند تحریک ہر طرح کے استحصال کے خلاف تھی اور انسان کو انفرادی اور اجتماعی طور پر آزاد دیکھنا چاہتی تھی۔ اس وقت برِصغیر کے تمام ممالک سامراجی نظام میں جکڑے ہوئے تھے۔ برِصغیر کی تاریخ میں سامراجی نظام کے خلاف جو جدوجہد ہوتی رہی، اس تحریک کو اس کا احساس تھا اور یہ تحریک یورپ کے ان ملکوں کی تاریخ پر بھی نظر رکھتی تھی، جہاں سامراج و استعمار کے خلاف کامیاب انقلاب برپا ہوئے تھے۔ سجاد ظہیر اور ملک راج آنند جیسے مفکرین نے یورپ کے دورانِ قیام ان ملکوں کی تاریخ کو بطورِ خاص اپنے مطالعے میں رکھا تھا اور اپنے ملک کو آزاد کرانے اور استحصال سے چھڑانے کے خوش آئند خواب دیکھے تھے۔ چنانچہ فیض بھی اس تحریک میں شامل ہوئے اور انہوں نے بھی استحصال اور استعمار کے خلاف اپنی تخلیقات میں اپنے افکار کو پیش کیا جن کی سطح انفرادی تھی، لیکن ان کی نمائندگی اجتماعی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران یہ افکار و نظریات اردو شعر و ادب کے جسم

۲۳۔ ایف۔ سی۔ کالج، لاہور ۵۴۶۰۲ (پاکستان)

میں ڈھلتے رہے۔ اور تخلیقی ادب ان سے سرشار ہوتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس تناظر میں فیض جیسے شاعر نے ان اقوام اور ممالک کے بارے میں غور کیا، جو برصغیر کے باشندوں کی طرح مجبور، مقہور اور مظلوم تھے۔ اگرچہ شاعری کے فرسودہ نظریے کے مطابق غالباً فیض کی یہ سعی مستحسن نہ تھی کہ وہ اس تناظر میں غور کرتے اور اُسے اپنی شاعرانہ فکر کی اساس بناتے بلکہ ہماری روایتی شاعری کی جو متاع موجود تھی اس میں اضافہ کرتے تو ان سے نقاد مطلقاً جواب طلب نہ کرتا، لیکن کیا آنے والے زمانے کا قاری اور نقاد انہیں معاف کر دیتا۔ یاد رہے کہ ہر بڑا شاعر محض اپنے زمانے کا ترجمان نہیں ہوتا بلکہ روحِ عصر کو اپنے اندر جذب کر کے آنے والے زمانے سے مخاطب ہوتا ہے۔ اور جو آنے والے زمانے سے خطاب نہ کر سکے وہ اپنے زمانے میں پیدا ہو کر اپنے ہی زمانے میں دفن بھی ہو جاتا ہے اور اس کی شاعری اگر باقی بھی رہ جائے تو اس کی حیثیت اس ممی کی ہوتی ہے جو سامانِ عبرت بنی رہتی ہے۔ فیض کو یہ صورتِ حال مطلقاً منظور نہ تھی۔ وہ اپنے زمانے کے ترجمان تھے اور مستقبل کے انسان سے ان کا خطاب بھی تھا۔ غالب بھی "شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن" پر یقین رکھتے تھے اور مستقبل کے انسان سے مخاطب تھے۔ فیض بھی اس تناظر میں اسی قبیل کے اور اسی قبیلے کے شاعر تھے۔ وہ ایک وسیع ذہنی اُفق کے ساتھ نئے معاشرے کی تعمیر کرنا چاہتے تھے۔

آج جتنے بھی تنقید کے معروف دبستان موجود ہیں سب کے سب شعر و ادب کی جزئیات و کلیات کا احاطہ کرتے ہیں۔ کچھ دبستان ایسے بھی ہیں، جن کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ انسان کی توجہ کو اصل مسائل سے ہٹا کر کسی اور طرف بھٹکا دیا جائے۔ یہ وہ سازش ہے جو سامراج اور اس کے حاشیہ بردار ہمیشہ انسان اور اس کے ارتقاء کے خلاف کرتے رہے ہیں اور آج بھی یہ سازش جاری ہے۔ کچھ دبستان ایسے ہیں جو زبان و بیان کے اسلوبیات اور اس کے خارجی حسن و جمال میں قارئین کو اُلجھا کر ادب کے ایک اقل قلیل جزو کو کُل باور کرانے پر زور دیتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر کی وکالت کرنے والے بالواسطہ یا بلاواسطہ انسان کی فلاح و بہبود اور اس کے حقیقی ادب کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتے ہیں۔ اور ادب کے اصل مقصد کو ضعف پہنچاتے رہتے ہیں۔

فیض کی شاعری کے اس خارجی رُخ پر اسلوبیاتی نقادوں نے بہت زور دیا ہے اور ان کے معرب و مفرس ڈکشن کے قصیدے پڑھے ہیں۔ ان کی استعمال کردہ بحور، قوافی اور ردیف کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں۔ ان کے الفاظ کی خوش آہنگی اور معنی آفرینی میں رطب اللسان نظر آتے ہیں، لیکن سچ پوچھیے تو یہ فیض کی آدھی تعریف ہے۔ فیض کی شاعری کی اصل روح اس مقصد میں اور نظریے میں پوشیدہ ہے جس کی ترویج و اشاعت وہ تمام عمر کرتے رہے اور غزل ہو یا نظم یہ محض ان کے پیرایۂ اظہار تھے۔

دراصل ہر بڑے شاعر کی طرح فیض کے سامنے نظریے کی توانائی سب سے زیادہ وقیع تھی۔ جس طرح آبشار کا پانی پُرشور دریا یا آہستہ رو ندی کا فطری روپ اختیار کر لیتا ہے اسی طرح غزل اور نظم فیض کے پیرایۂ اظہار کے روپ ہیں۔

فیض، غالب اور اقبال کی طرح اپنی متخیلہ کی اساس کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ اور اسی پر ان کے نظریے اور فکر کا دارومدار ہے۔ اگر نظریے اور فکر کو منہا کر دیا جائے تو فیض کی شاعری دوسرے درجے پر رہ جاتی ہے۔ یہی حال غالب اور اقبال کا بھی ہے۔ جس طرح غالب اور اقبال کی فکر اور نظریے میں قوتِ نامیہ کام کرتی ہے اور اس میں مسلسل نشو و نما اور ارتقاء ہوتا ہے، بالکل اسی طرح فیض کی فکر میں مسلسل ارتقاء ہوا ہے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "میزان" اگر ملحوظ رکھا جائے اور ان کے آخری زمانے کے لیکچر اور خطبات سامنے رکھے جائیں اور سب کا باہم موازنہ کیا جائے تو یہی دعویٰ اپنی دلیل بن سکتا ہے اور بالکل اسی طرح ان کے تمام مجموعہ ہائے کلام کو سامنے رکھا جائے تو ان میں بھی ارتقاء کا یہی نظریہ کارفرما نظر آتا ہے۔ لہٰذا اوقات انسان کو بعض نظریات میں ترمیم کرنا پڑتی ہے۔ بعض میں کتر بیونت اور اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ ایک تو انسانی فکر میں مسلسل ارتقاء ہوتا رہتا ہے۔ دوسرے کائنات میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور نت نئے واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے سبب یہ تبدیلی بدیہی، ناگزیر اور فطری قرار پاتی ہے۔ فیض چونکہ ترقی پسند شاعر تھے۔ اور کائنات کے حرکی عمل پر یقین رکھتے تھے۔ نیز مادے کے جدلیاتی نظریے پر ایمان رکھتے تھے، اس لیے ان کے یہاں مسلسل ارتقاء کا عمل نظر آتا ہے۔ غالب اور اقبال میں نظریے کا ارتقاء مشترک ضرور ہے، لیکن ایک منزل پر آ کے غالب مادی جدلیات کے اور اقبال مابعد الطبیعیات کے قائل ہو جاتے ہیں۔ اس فرق کے سوا تینوں شاعروں میں نظریے کا فعال اور حرکی تصوّر مشترک ہے۔ غالب کے یہاں کلکتے کا سفر اور کلکتے کا نیا نظامِ معیشت ارتقاء کی نشاندہی کرتا ہے اور فیض کے یہاں اشتراکی ممالک کے انقلابات اور اشتراکی ملکوں کا ادب یہی مقام رکھتے ہیں۔ غالب کے معاشرے میں تبدیلیوں کی رفتار سست تھی۔ فیض کے یہاں یہ رفتار بہت تیز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فیض کا زمانہ سائنس اور ٹکنالوجی کا زمانہ ہے۔ ذرائع نقل و حمل تیز رفتار ہیں اور حرکت کا تصور برق آسا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا بالعموم اور استحصالی اور سامراجی معاشرہ بالخصوص فیض کا مرکزِ نگاہ بنے۔ "پاکستان ٹائمز" کی ادارت سے لے کر "لوٹس" (بیروت) کی ادارت تک اور پاکستان کی جیلوں سے لے کر نظر بندی اور زباں بندی تک دار و رسن کو اتنے قریب سے دیکھنے والے فیض کی شاعری میں جو معاشرہ اُبھرتا ہے اور جس معاشرے کا مجبور اور مظلوم انسان سامنے آتا ہے، وہ اس تیسری دنیا کا انسان ہے اور ان کی تمام شاعری اسی انسان کی ترجمان ہے۔ خواہ وہ افریقہ کا انسان ہو، فلسطین کا باشندہ ہو، برصغیر کا مجبور اور مقہور انسان ہو، سب

فیض کی شاعری میں جھلکتے ہیں اور اپنی زبان میں اگر کچھ نہیں کہتے تو ہم فیض کی زبان سے وہ سب کچھ سن لیتے ہیں جو اس خاموش فضا میں موجزن ہے۔

نقادوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو فیض کو محض رومانوی شاعر تسلیم کرتا ہے اور ان کی رومانوی شاعری کو ہی ان کی نمائندہ شاعری گردانتا ہے۔ انہیں نقادوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اس رومان سے رو سو کے انقلابی نظریے کی تان ملانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ سراسر غلط ہے — کیوں کہ مغرب کا رومانوی دبستان جس سیاق و سباق میں پیدا ہوا، فیض کا اس سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے ماسوائے اس کے کہ فیض نے مغربی ادب کا بھی مطالعہ کیا ہے اور مغرب کے رومانوی شعرا کو بھی پڑھا ہے۔ لیکن ان میں سے بیشتر کے رومان میں لایعنیت اور ماورائیت پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جذبۂ وجدان اور خیال فضا میں معلق ہیں اور خلا میں حرکت کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے پاؤں تلے زمین نہیں ہے۔ جب کہ فیض کی رومانوی شاعری ایک ایسی قوم کی آزادی کا خواب ہے جو جبر اور استعماریت میں جکڑی ہوئی ہے اور ان زنجیروں کو توڑ کر آزاد فضا میں سانس لینا چاہتی ہے۔ ان کی ابتدائی شاعری میں آزادی کا یہ خواب مبہم ضرور ہے، لیکن اس کے خدوخال اتنے غیر واضح بھی نہیں۔ پھر یہ کہ فیض کی ابتدائی زمانے کی شاعری میں یہ ابہام ملتا ہے لیکن رفتہ رفتہ جب یہ دھند چھٹتی ہے تو اس کے خدوخال بھی واضح ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے معاشرے کے انسان کی حرّیت کا جو تصور پیش کرتے ہیں، اس میں کسی قسم کا استحصال نہیں ہے اور اس انسان کے پاؤں جس زمین پر ٹکے ہوئے ہیں، وہاں مساوات ہے اور امن و سکون بھی۔ کہا جا سکتا ہے کہ جیسے جیسے شاعر کی فکر میں ارتقا رہا، اس کا مطالعہ وسیع ہوا اس کا ذہنی افق پھیلا اور اس نے سوشلسٹ ملکوں کے نظام معیشت پر غور کیا۔ رومان کی دھند چھٹتی گئی اور حقیقت کا آفتاب طلوع ہوتا گیا۔

فیض پر اتنے مضامین لکھے گئے۔ نمبر شائع ہوئے، کتابیں لکھی گئیں سمینار اور سمپوزیم منعقد ہوئے مگر کسی نے کسی بھی پہلو سے ان کے شاعرانہ خلوص پر شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا بلکہ کم و بیش ہر نقاد نے اس بات کا اقرار کیا، خواہ وہ کسی مسلک اور کسی دبستان سے وابستہ ہو، کہ فیض نے نہایت دیانت داری سے ان امانتوں کو آنے والی نسلوں تک پہنچانے کی کوشش کی جو ان کے نزدیک انسانی معاشرے کی فلاح اور بہبود کے لیے ناگزیر تھیں — تیسری دنیا میں سب سے گمبھیر مسئلہ یہ ہے کہ جو ممالک سامراج اور استعماریت کا شکار رہے ہیں، انہیں آزادی نصیب ہو، جن قوموں کے پیروں تلے سے ان کی سرزمین کھینچ لی گئی ہے۔ اس سرزمین پر وہ پھر آ بسیں۔ استحصال سے پاک، پُرامن معاشرہ قائم ہو، ہر طرف امن و امان ہو، آمریت اور تمرّد جو استحصال کی بڑی علامتیں ہیں، مٹا دی جائیں، صلح و آشتی کی فضا میں انسان ترقی کرے، انسانی نسلیں پھلیں پھولیں۔ زندہ رہنے کے لیے جیو اور جینے دو کا حق ہر ایک کو میسر آئے۔ ہر ایک کو دو وقت کی روٹی، تن بھر کپڑا اور سر چھپانے کے لیے چھت میسر ہو، رنگ اور نسل کا تفاخر ختم ہو، کوئی کسی کے اوپر جبر نہ کرے۔ غرض کہ یہ سرزمین، جہاں نوعِ بشر آباد ہے، جنتِ ارضی بن جائے۔ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ استحصال اپنی شکلیں بدل بدل کر سامنے آتا ہے اور سرمایہ دار مختلف طریقوں سے ان مقاصد کے حصول میں روڑے اٹکاتا ہے جن کے نتیجے میں تیسری دنیا معرضِ وجود میں آئی ہے۔ اس کے مسائل بے شمار ہیں اور وسائل محدود۔ یہ استحصال اگر ادب اور تہذیب کے راستے سے ہوا تو انسانی فکر کو بھٹکانے کے تمام ممکنہ ذرائع اختیار کیے گئے اور اگر معیشت کے راستے سے ہوا تو بنی نوع انسان کو جنگ و جدال میں الجھا دیا گیا۔ سرمایہ دار ملکوں کی یہی پالیسی رہی کہ ان کو لڑنے مرنے دو۔ خود اپنا اسلحہ بیچتے رہو، تجوریاں بھرتے رہو۔ اگر علامہ اقبال کو "گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات" کی صورت نظر آتی تھی تو آج بھی یہی صورتِ حال موجود ہے۔ افریقہ کا ایک ملک جب کئی سو سال کی غلامی سے آزاد ہوا اور اس مملکت کے سربراہ سے پریس کے نمائندے نے جب یہ پوچھا کہ آپ کے ملک سے جاتی ہوئی استعماریت کی کیا داستان ہے تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا کہ اب سے کئی سو سال پہلے جب ہماری سرزمین پر اور ہمارے ساحلوں پر سپید بادبانی کشتیوں سے سفید چغے پہنے ہوئے یہ سفید فام باشندے اپنی بغلوں میں بائیبل دبائے ہوئے اترے تھے تو ہمارے بزرگوں نے یہ سمجھا کہ آسمان سے فرشتے ہماری ہدایت کے لیے اتارے گئے ہیں۔ لیکن کئی سو سال تک ہمارے ملک کا سونا ان کی کشتیوں میں بار ہو ہو کر ان کے ملکوں کو جاتا رہا۔ اور اب جب کہ ہماری کانیں سونے سے خالی ہو گئی ہیں اور تمام سونا ان کے ملکوں کو منتقل ہو چکا ہے تو صورتِ حال یہ ہے کہ ہماری بغلوں میں بائبلیں دبی رہ گئی ہیں۔ فیض مذہب کے نام پر اس استحصال کے خلاف ہیں اور ان کی شاعری مزاحمتی ادب میں اس مقام پر انقلابی شاعری کا سرنامہ قرار پاتی ہے۔

بقیہ: نئی کتابیں

ان باتوں میں گہرائی سے زیادہ خلوص کا عنصر نمایاں ہے۔ چنانچہ یہ تجزیے عام اور پیشہ ورانہ قسم کے تنقیدی تجزیوں سے الگ نظر آتے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کتاب ایک قابلِ قدر کارنامہ ہے اور اس لائق ہے کہ اسے توجہ کے ساتھ پڑھا جائے۔ رواں دواں اور شگفتہ زبان و بیان نے اس کتاب کو کہیں بھی بوجھل نہیں ہونے دیا ہے۔ مصنف صاحب اس کارنامے کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

شمیم حنفی

نسیم احمد

سودا کے کلام میں شامل اُن کے بعض معاصرین کا کلام

قدیم شعری متون کی تدوین میں مدوّن کو جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، ان میں الحاقات و تصرفات کے مسائل سب سے زیادہ پیچیدہ ہیں۔ یوں تو متقدمین اور متوسطین میں سے اکثر کے دواوین میں محرّف اور مشتبہ اشعار کی نشان دہی کی جا سکتی ہے، لیکن اٹھارہویں صدی عیسوی کے ممتاز شاعر مرزا محمد رفیع سودا کے یہاں جتنی بڑی تعداد میں دوسروں کا کلام شامل ہے اور اصل متن میں جس کثرت سے تصرفات ہوئے ہیں اس کی مثال اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔

شیخ چاند نے اپنے تحقیقی مقالے "سودا" (مطبوعہ ۱۹۳۶ء) میں پہلی مرتبہ ان کی تصانیف اور کلام پر تفصیلی بحث کی اور قائم کی سات مثنویاں، شیدا اور ممتاز کی ایک ایک مثنوی راقم کے ایک ہجویہ قصیدے نیز مہربان یا مہربان خاں تخلص کے ساتھ موجود مرثیوں کو ان کے ہاں الحاقی قرار دیا اور سودا اور سوز کے مشترک کلام کے بارے میں صرف اس قدر لکھا کہ .....

"ہم نے بہت سا ایسا کلام معلوم کیا ہے جو سوز اور سودا دونوں کے دیوانوں میں مشترک ہے۔ یہ چونکہ مقدار میں بہت زیادہ ہے اس لیے یہاں اس کا نقل کرنا یا اس کی تفصیلات پیش کرنا طوالت سے خالی نہیں۔ انجمن ترقی اردو کلیاتِ سودا تحقیق سے مرتب کرا رہی ہے۔ اس سے یہ بحث صاف ہو جائے گی۔" ۱؎

لیکن افسوس کہ نہ تو انجمن کلیاتِ سودا چھاپ سکی اور نہ سودا کے الحاقی کلام کا مسئلہ حل ہو سکا۔

بعد ازاں قاضی عبدالودود، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر ناجرہ ولی الحق اور ڈاکٹر اکبر حیدری نے کلیاتِ سودا میں شامل سوز اور چند دوسرے شعراء کے کلام کی نشان دہی فرمائی۔ راقم السطور کو سودا کے تلامذہ اور معاصر شعراء کے دواوین نیز تذکروں کے مطالعے کے دوران ایسے بیسیوں شعرا کا پتہ چلا ہے جن کے اشعار سودا کے یہاں موجود ہیں یا سودا کے اشعار ان کے ناموں سے منسوب ہیں ۲؎۔ آئندہ صفحات میں میر حسن، ممتاز، راقم، کلیم، فرحت اور عاصمی کی بعض ایسی ہی شعری تصنیفات کی تفصیلات پیش کی جائیں گی۔

(۱) سودا اور میر حسن

میر حسن اردو کے ممتاز شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ میر ضیاء الدین ضیا کے شاگرد تھے، لیکن شورش، عشقی، قاسم، سعادت خاں ناصر اور آزاد کے بقول انہوں نے سودا سے بھی استفادہ کیا تھا۔ سودا کے کلام میں ان کی ایک غزل، ایک غزل کا ایک شعر اور ایک مسدس کے تین بند شامل ہیں ہیں۔ تفصیلات یہ ہیں :

الف : آباد شہرِ دل تھا اسی شہر یار تک
پہنچا نہ آ کے پھر اس اُجڑے دیار تک ۱؎
ٹک دیکھ لیں چمن کو، چلو لالہ زار تک
کیا جانے پھر جئیں نہ جئیں ہم بہار تک ۲؎

استادِ اردو، سی۔ ایچ۔ ایس، بنارس ہندو یونیورسٹی، کمچھا، وارانسی (یو۔ پی)

۱؎ "سودا" از شیخ چاند ص ۱۱۸ اشاعت ثانی ۱۹۶۳ء انجمن ترقی اردو پاکستان

۲؎ ملاحظہ ہو (۱) "کلام سودا میں الحاق" از ڈاکٹر نسیم احمد "اکادمی" لکھنؤ ستمبر اکتوبر ۱۹۸۰ء ص ۳۶ تا ۷۶ (۲) "مرزا محمد رفیع سودا اور ان کے بعض معاصرین کے کلام میں مشترک اشعار" از ڈاکٹر نسیم احمد "اکادمی" لکھنؤ مئی جون ۱۹۸۸ء ص ۸۷ تا ۱۰۱ (۳) "سودا سے منسوب قائم کا کلام" از ڈاکٹر نسیم احمد آج کل دہلی مئی ۱۹۸۹ء ص ۹ تا ۱۲

دیکھا نہ اس کو دو میں گماں سو طرف گیا
آئے نہ ہوتے کاش کہ ہم کوئے یار تک ۳؎

قسمت نے دور ایسا ہی پھینکا ہمیں کہ ہم
پھر جیتے جی پہنچ نہ سکے اپنے یار تک ۴؎

ساقی سمجھ کے دیجیو جامِ شرابِ عشق
سودا کا کام پہنچے گا آخر خمار تک

پانچ اشعار پر مشتمل مندرجہ بالا غزل کلیاتِ سودا کے تمام مطبوعہ نسخوں اور پانچ[۱] قلمی نسخوں کے علاوہ غزلیاتِ سودا کے دو جدید ترین[۲] تحقیقی ایڈیشنوں میں بھی موجود ہے۔ اس کے برخلاف یہ تمام اشعار دیوانِ[۳] میر حسن کے ایک مستند قلمی نسخے میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں خود میر حسن نے اس غزل کا مطلع اور شعر نمبر ۳، ۴ "تذکرۂ شعرائے اردو" میں اپنے کلام کے تحت نقل کیا ہے لہٰذا یہ اشعار یقینی طور پر میر حسن کے نتائجِ فکر ہیں اور غلطی سے کلامِ سودا میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ میر حسن کے یہاں مطلع اوّل کے مصرعِ دوم، چوتھے شعر کے مصرعِ اول اور پانچویں شعر کے دونوں مصرعوں کا متن کسی قدر مختلف ہے۔ سطورِ ذیل میں یہ تینوں اشعار دیوانِ میر حسن (قلمی) اور تذکرۂ شعرائے اردو کے حوالے سے نقل کیے جاتے ہیں:

۱۔ آباد شہرِ دل تھا اسی شہرِ یار تک
اب کوئی آنکھ پھیر نہ اس اجڑے دیار تک

۲۔ دیکھا جو واں نہ تجھ کو گماں سو طرف گیا
آئے نہ ہوتے کاش کہ ہم کوئے یار تک

۳۔ غافل سمجھ کے پیجیو جامِ شرابِ عشق
آخر کو کام پہنچے ہے اس کا خمار تک

(ب) "مردماں چشم نے پلکوں کی اٹھا کر سنگین
ایک عالم کو نظر بند کیا پہرے میں"

یہ شعر دیوانِ سودا کے ایک قلمی نسخے[۵] میں سودا کی غزل ع "کیا یہ پہرہ ہے کہ ہے سارا جہاں پہرے میں" میں غلطی سے شامل ہو گیا ہے۔ میر حسن نے اسے بھی تذکرۂ شعرائے اردو میں اپنا انتخابِ کلام میں شامل کیا ہے۔ اس انتخاب میں اس شعر کے علاوہ اس غزل کا مطلع بھی شامل ہے۔ مزید برآں مذکورہ بالا دیوانِ میر حسن میں یہ پوری غزل (۷ شعر کی) موجود ہے۔ تذکرے اور دیوان میں شعر زیرِ بحث کی شکل یہ ہے:

"مردمِ چشم نے پلکوں کی چڑھا سنگینیں
ایک عالم کو نظر بند کیا پہرے میں"

اور معنوی اعتبار سے یہی متن صحیح بھی معلوم ہوتا ہے۔

(ج) مسدس:

ع اک قصہ میں سنا تھا مزہ ہم سے یہ قصہ را

اس مسدس کے[۶] تین بند کلیاتِ سودا کے تمام مطبوعہ نسخوں میں شامل ہیں۔ دیوانِ میر حسن کے ایک قلمی نسخے میں یہ پورا مسدس موجود ہے[۷]۔

۲۔ سودا اور ممتاز

حافظ فضل علی ممتاز سودا کے نامور شاگردوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ پینتیس اشعار کی ان کی ایک مثنوی، چار اشعار کی ایک غزل اور ایک رباعی کلامِ سودا کے بعض نسخوں میں شامل ہے بتفصیل درج ذیل ہے:

(الف) مثنوی:

"ہوتی ہے دنیا میں جو کچھ تحفہ چیز
سب سے ہے سودا کو یہ لاٹھی عزیز" (۳۵ شعر)

یہ مثنوی[۸] کلیاتِ سودا کے تمام مطبوعہ نسخوں میں "در تعریف چھڑی" کے عنوان کے تحت موجود ہے۔ لیکن میر حسن ممتاز کے بیان میں لکھتے ہیں:

"... یک مثنوی مسمّیٰ بہ لاٹھی نامہ خوب گفتہ کہ سلسلہ اور تا بہ عصائے کلیم رسانیدہ .... چند بیتے ازاں بیاد ست ...."

اس کے بعد انہوں نے مثنوی مذکورہ کے ابتدائی بارہ اشعار نقل کیے ہیں۔

دوسرے معاصر تذکرہ نگار علی ابراہیم خاں خلیل نے بھی ممتاز کے ذکر میں میر حسن کے بیان کی توثیق ان الفاظ میں کی ہے:

"مثنوی در تعریف لاٹھی بہ بحرِ مخزن اسرار گفتہ[۹]"

اور اس مثنوی کے نو شعر بھی بطور نمونہ دیے ہیں۔

۱؎ (ا) مخزونہ سر سالار جنگ میوزیم نمبر ۱۵۶ مکتوبہ ۱۲۲۰ھ (II) مخزونہ ٹیگور لائبریری لکھنؤ یونیورسٹی مکتوبہ ۱۲۴۳ھ (III) اورینٹل ریسرچ لائبریری سرینگر مکتوبہ ۱۲۷۸ھ (بحوالہ ڈاکٹر ولی الحق) (IV) مخزونہ خدا بخش لائبریری پٹنہ مکتوبہ ۱۲۶۲ھ (V) مخزونہ انڈیا آفس لندن مکتوبہ ۱۲۱۳ھ

۲؎ کلیاتِ سودا جلد اوّل حصہ چہارم مرتبہ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی (پشاور یونیورسٹی پشاور) پاکستان) شائع کردہ مجلس ترقی اردو لاہور) (II) غزلیات مرزا محمد رفیع سودا۔ مرتبہ ڈاکٹر ناجرہ ولی الحق، شائع کردہ نظامی پریس لکھنؤ۔

۳؎ دیوانِ میر حسن مخزونہ سینٹرل لائبریری بنارس ہندو یونیورسٹی نمبر $\frac{U1\times3}{52}$ مکتوبہ ۱۲۶۸ھ

۴؎ ایضاً (دیوانِ میر حسن) ۵؎ مخزونہ سینٹرل لائبریری بنارس ہندو یونیورسٹی سنہ ندارد نمبر $\frac{U1\times3}{68/1}$

۶؎ دیوانِ میر حسن، قلمی رام پور بحوالہ مرزا محمد رفیع سودا از ڈاکٹر خلیق انجم

۷؎ ڈاکٹر اکبر حیدری نے اپنی تصنیف "تحقیقاتِ حیدری" طبع اول میں صفحہ ۱۹۳ پر لکھا ہے کہ یہ مثنوی غلطی سے نسخۂ جانسن میں شامل کی گئی ہے لیکن راقم کو نسخۂ مذکورہ میں یہ مثنوی نہیں ملا

ان تذکروں کے بیان کے مطابق مثنوی زیرِ بحث کا عنوان "لاٹھی نامہ" یا "مثنوی در تعریفِ لاٹھی" ہے نہ کہ "در تعریفِ چھڑی"

متذکرہ بالا تذکروں میں مثنوی کے پہلے شعر کے مصرعِ ثانی میں سودا کے بجائے ممتاز تخلص ملتا ہے :

ع "سب سے ہے ممتاز کو لاٹھی عزیز"

اس کے علاوہ بعض اشعار کا متن بھی مختلف ہے۔ مثلاً کلیاتِ سودا میں ایک شعر کا مصرعِ اول اس طرح درج ہے۔ ع :

"تو جو ہوں ہم سرِ تیر و قلم"

اور تذکروں میں یوں نقل ہوا ہے : ع

"کوئی تو ہے ہم سرِ تیغ و قلم"

ایک اور شعر کا مصرعِ اول کلیاتِ سودا میں اس طرح منقول ہے۔ ع

"بے ہودہ کج بحثی سے وارستہ ہے"

اور تذکرہ میر حسن اور تذکرہ علی ابراہیم میں اس کی شکل یہ ہے : ع

"بے بدہ رکھنے سے وہ وارستہ ہے"

(ب) جان تو حاضر ہے اگر چاہیے
دل تجھے دینے کو جگر چاہیے
گھر سے نکلتے ہی تجھے بر شجر
قتل کو یک بیش نظر چاہیے
عشق سے ڈر، تو وہ خاشاک کہ
آگ کے شعلے سے حذر چاہیے
سودا کے احوال سے ہے کچھ خبر
مرتا ہے ٹک لینا خبر چاہیے

اس غزل کے ابتدائی تین[۱] شعر کلیاتِ سودا کے تمام مطبوعہ ایڈیشنوں اور پندرہ[۲] قلمی نسخوں کے علاوہ دیوانِ غزلیاتِ مرزا محمد رفیع سودا۔ مرتبہ ڈاکٹر ماجدہ ولی الحق میں بھی شامل ہے۔ ایک اور قلمی نسخہ[۳] میں صرف مطلع درج ہے جب کہ مقطع مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے ایک مخطوطہ[۴] سے یہاں نقل کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس قائم چاندپوری نے اس غزل کا مطلع حافظ فضل علی ممتاز کے نام سے نقل کیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار اصلاً ممتاز کی تصنیف ہیں۔ مقطع میں سودا کا الف جس طرح دب رہا ہے اس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ یہ سودا کا کلام نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ مصرع دراصل اس طرح ہو : ع

"حال سے ممتاز کے ہے کچھ خبر"

(ج) "ممتاز کہ ہے تمام یکسر ہو نیاز
دل کش ہیں ملاقات کی اُس کے انداز

تنہا نہ اُسے فنِ سخن میں ہے دست
ہر فن میں بفضلہٖ تعلیٰ ممتاز"

تعلیٰ کے طور پر کہی گئی اس رباعی کو قائم نے اپنے تذکرے "مخزنِ نکات" میں حافظ فضل علی ممتاز کے نام سے نقل کیا ہے۔ اس رباعی میں لفظ ممتاز دو مرتبہ آیا ہے۔ یعنی اس کی ابتدا بھی اسی لفظ سے ہوئی ہے اور اختتام بھی۔ ان میں سے پہلی مرتبہ ممتاز یقینی طور پر شاعر نے بطور تخلص استعمال کیا ہے۔ لہٰذا اسے ممتاز ہی کا زائیدہ فکر قرار دیا جائے گا۔ لیکن اسے دیوانِ سودا کے ایک قلمی نسخے[۵] میں شامل کر کے کلامِ سودا میں داخل کر دیا گیا ہے۔

۳۔ سودا اور راقم

بندرابن راقم ابتدا میں میر تقی میر سے اصلاح لیتے تھے لیکن بعد مرزا محمد رفیع سودا کی شاگردی اختیار کی۔ مخمس کہنے میں دستگاہ رکھتے تھے۔ ابھی تک راقم کے دیوان کے کسی نسخے کا پتہ نہیں چل سکا ہے۔ تذکرہ نگاروں نے ان کے جو اشعا

---

[۱] (I) مخزونہ خدا بخش لائبریری نمبر ایچ ایل ۱۴۱۱ مکتوبہ ۱۱۹۳ھ
(II) مخزونہ کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ
(III) مخزونہ رضا لائبریری رام پور نمبر ۸۷۷ د
(IV) مخزونہ کتب خانہ ادارہ ادبیاتِ اردو حیدرآباد ۸۸۹/۹۲۸
(V) مخزونہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ نمبر ۴۷۲
(VI) مخزونہ سینٹرل لائبریری بنارس ہندو یونیورسٹی نمبر 3×U11/68/4
(VII) مخزونہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد نمبر ۷۹۳
(VIII) مخزونہ اسٹیٹ آرکائیوز آندھرا پردیش حیدرآباد نمبر ۹۸
(IX) مخزونہ سالار جنگ میوزیم نمبر ۱۵۶ مکتوبہ ۱۲۲۰ھ
(X) مخزونہ انڈیا آفس لندن (فوٹو اسٹیٹ مکتوبہ ۱۲۲۷ھ) کا پی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ مکتوبہ ۱۲۱۹ھ
(XI) مخزونہ برٹش میوزیم نمبر او آر ۱۲۱۱۷، مکتوبہ ۱۲۰۱ھ
(XII) مخزونہ برٹش میوزیم نمبر ۱۰۳۹، مکتوبہ ۱۲۰۳ھ
(XIII) مخزونہ برٹش میوزیم نمبر اے ڈی ڈی ۸۹۲۲، مکتوبہ ۱۲۲۰ھ
(XIV) مخزونہ انڈیا آفس نمبر بی ۱۵۲ بی ۳۳۵۲ و ۳۳۵۳، مکتوبہ ۱۸۴۴ء
(XV) مخزونہ برٹش میوزیم نمبر اے ڈی ڈی ۲۴۸۷۹

[۲] [۳] [۴] مخزونہ انڈیا آفس لائبریری نمبر بی ۱۵۲ بی ۳۳۵۳، مکتوبہ ۱۸۴۴ء بہ مقام مدراس بحوالہ کلیاتِ سودا جلد اول مرتبہ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی پشاور یونیورسٹی پشاور (پاکستان)

نمونۂ کلام کے طور پر درج کیے ہیں ان میں سے بعض کلیاتِ سودا میں موجود ہیں۔ سطورِ ذیل میں سودا اور راقم کے مشترک کلام کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

(الف)

"حاضر ہے تیرے سامنے سودا کر اس کو قتل
مجرم یہ سب طرح سے ہے پر یک نگاہ کا"

یہ شعر کلیاتِ سودا میں شامل ایک مشہور غزل[1] ع

"چھٹنا ضرور مکھ پہ ہے زلفِ سیاہ کا"

کا مقطع ہے لیکن قائم چاندپوری نے اسے صرف تخلص کی تبدیلی کے ساتھ اپنے تذکرہ میں راقم کے نام سے درج کیا ہے۔ اگر قائم کا بیان درست ہے تو اس مقطع کی بنا پر پوری غزل سودا کی بجائے راقم کی ملکیت قرار پائے گی اور یہ کہ غزل مذکور تذکرہ مخزن نکات کی تصنیف ۱۱۶۸/ ۵۵-۱۷۵۴ء سے قبل لکھی جا چکی ہوگی۔

(ب) مخمس :-

ع : نشو و نمائے باغِ جہاں سے رمیدہ ہوں" (۹ بند)

قائم نے اس مخمس کے سات بند راقم کے نمونۂ کلام میں نقل کیے ہیں۔ دراصل یہ مخمس سودا کی ایک غزل ع : "نے بلبلِ چمن نہ گلِ نو دمیدہ ہوں" کی تضمین ہے جو غلطی سے کلیاتِ سودا میں شامل کر لی گئی ہے۔ مکمل مخمس نو بندوں پر مشتمل ہے تذکرۂ قائم اور کلیاتِ سودا میں درج اس مخمس کے مشترک بندوں کے اشعار میں بعض متنی اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر آخری بند کے اختلافات بیش ہیں :

کلیاتِ سودا	تذکرۂ قائم (مخزن نکات)
پوچھا نہ یوں کبھو کہ ترا رنگ کیوں ہے زرد	پوچھے ہے تو کبھو کہ مرا رنگ کیوں ہے زرد
کہتا نہ تو کبھو یہ مجھے بھر کے آہ سرد	کہتا ہے گالیوں تو مجھے بھر کے .....
تو کون ہے کہ ملتا ہے چہرے سے اپنے گرد	تو کون ہے جو ملتا ہے .....
میں کیا کہوں کہ کون ہوں سودا بہ قول درد	.....
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں	.....

(ج) قطعہ : ع

"ہرگز ڈرا نہ مجھ سے تو اے بے شعور بھڑوے"

چند اشعار کا یہ ہجویہ قصیدہ (قطعہ) کلیاتِ سودا کے قدیم ترین مطبوعہ ایڈیشن نسخۂ مصطفائی[1] (مطبوعہ ۱۲۷۲ھ مطابق ۵۶-۱۸۵۵ء) میں ص ۳۶۷ پر ملتا ہے اس کے مقطع میں راقم تخلص کی موجودگی اسی کے بندرابن راقم شاگردِ سودا کی تصنیف ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ مقطع درج ذیل ہے ؎

"راقم نے ہجو از بس غصے میں جو کہی ہے
اڑ جاوے گا یہ تیرے اب منہ کا لونڈ بھڑوے"

۴- سودا اور محمد حسین کلیم

عرق ہے منہ پہ ترے یا گلاب ٹپکے ہے
عجب ہے مجھ کو کہ شعلے سے آب ٹپکے ہے ۱
جگر جلے ہے اور آنکھوں میں سنسناہٹ ہے
جب آگ تیز ہوئی تب کباب ٹپکے ہے ۲
رکھوں میں چشم میں کیوں کر تجھے کہ ہے برسات
پھر ایسا گھر کہ جو خانہ خراب ٹپکے ہے ۳

یہ تینوں شعر کلامِ سودا کے صرف ایک[2] غیر معتبر قلمی نسخے میں ملتے ہیں۔ اسی نسخے کے حوالے سے ڈاکٹر شمس الدین صدیقی (پشاور یونیورسٹی پاکستان) نے ان اشعار کو اپنے مرتبہ کلیاتِ سودا میں جلد اول کے حصہ ۴ میں شامل کیا ہے۔ کلیاتِ سودا جلد اول کے چوتھے حصے میں شامل کرنے کے معنی یہی ہیں کہ مرتب کے نزدیک اشعار زیر بحث کا انتساب سودا سے کرنا "بڑی حد تک مشکوک ہے"۔ لیکن ڈاکٹر سراج زبی الحق نے بنا تحقیق کے کلیاتِ مذکور کی بنیاد پر انہیں اپنے تحقیقی ایڈیشن "غزلیاتِ مرزا محمد رفیع سودا"[3] میں نقل کر دیا ہے۔ راقم کی تحقیق کے مطابق ان اشعار کے مصنف سودا نہیں بلکہ کلیم ہیں۔ تفصیل درج ذیل ہے :

میر حسن، شورش، علی ابراہیم خاں خلیل اور مرزا علی لطف کے تذکرہ ہائے شعرا و ۳ کلیم کے انتخابِ کلام میں شامل ہیں۔ سرور اور قائم کے یہاں ان دو مطلع شعروں کے علاوہ اسی زمین کا ایک زائد شعر بھی محمد حسین کلیم کے ترجمے میں نمونے کے طور پر درج ہے۔ وہ زائد شعر یہ ہے ؎

"مری مژہ کو ہے تاک بریدہ سے نسبت
لہو کہ جس سے کہ ہر دم شراب ٹپکے ہے"

---

[1] یہ غزل اگرچہ کلامِ سودا کے بیشتر قلمی اور تمام مطبوعہ نسخوں میں موجود ہے۔ لیکن سودا کی زندگی میں لکھے گئے تین قلمی نسخوں (۱) نسخۂ حبیب مخزونہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مکتوبہ ۱۱۷۳ھ (۲) نسخۂ بنارس مخزونہ سینٹرل لائبریری بنارس ہندو یونیورسٹی مکتوبہ ۱۱۷۷ھ اور (۳) نسخۂ ادارہ ادبیاتِ اردو حیدرآباد مکتوبہ ۱۱۸۰ھ میں موجود ہیں۔

[1] یہ ایڈیشن کم یاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانہ میں موجود ہے اور اسی نسخے سے میں نے استفادہ کیا ہے۔

[2] مخزونہ برٹش میوزیم نمبر اے ڈی ڈی ۲۶۵۲۹ مکتوبہ ۱۲۱۲ھ

[3] مقدمہ کلیاتِ سودا جلد اول۔ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۴ء (چھپے ۵ نمبر ۲)

ما بعد کے تذکروں میں سے "گلشنِ بے خار" "سخن شعرا" اور "طبقاتِ شعرائے ہند" میں صرف شعر نمبر ۳ ملتا ہے۔ کلامِ سودا کے نسخوں کا متن ان تذکروں میں درج اشعار کے متن سے قدرے مختلف ہے۔ اختلافات یہ ہیں :

۱۔ عرق نہیں ترے رو سے گلاب ٹپکے ہے
عجب یہ بات ہے شعلے سے آب ٹپکے ہے (منتخب اور نغز)

۲۔ ع "تجھے میں آنکھوں میں کیوں کر رکھوں کہ ہے برسات"
(تذکرہ ہائے میر حسن، خلیل، لطف اور ناسخ)

ع "رکھوں میں آنکھوں میں کیوں کر تجھے کہ ہے برسات"
(نغز، بے خار، طبقات شعرائے ہند)

"رکھوں میں کیوں کے تجھے چشم میں کہ ہے برسات"
یہ ایک گھر ہے سو خانہ خراب ٹپکے ہے
(شورش)

۵۔ سودا اور فرحت

شیخ فرحت اللہ فرحت (متوفی ۱۱۹۱ھ) سودا کے معاصر اور قاضی شاہ بدیع الدین مدار کی اولاد میں سے ہے۔ صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ اکثر مزاحوں میں شریک ہوا کرتے ہیں۔ میر حسن نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ "رطب و یابس بسیار دارد" جب کہ علی ابراہیم خاں خلیل انہیں کہن مشق اور صاحبِ دیوان قرار دیتے ہیں۔ فرحت کا ایک شعر کلامِ سودا کے بعض نسخوں میں شامل ہو گیا ہے تفصیل یہ ہے۔

"کفن میرے پہ یارو یہ لکھانا
کسو سے کوئی دل کو مت لگانا"

بنارس ہندو یونیورسٹی کے کتب خانے میں دیوانِ سودا کا ایک انتہائی اہم نسخہ (مکتوبہ ۸۷-۱۱۷۷ھ) محفوظ ہے جس میں خاتمے کی عبارات کے بعد "تصنیف فردیات وغیرہ از دیگراں" کے عنوان سے مختلف شعراء کا کلام درج ہے۔ اسی کلام میں دس مطلعے بھی نقل ہیں۔ غالباً دیوانِ سودا "مخزونہ خدا بخش لائبریری (مکتوبہ ۱۲۱۲ فصلی) کے کاتب نے ان تمام اشعار کو سودا کی تصنیف خیال کر کے سودا سے منسوب کر دیا۔ بعد ازاں اسی نسخہ کے حوالے سے ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے زیرِ بحث شعر کو اپنے مرتبہ کلیاتِ سودا جلد اول کے حصہ ۵ میں اور ڈاکٹر ناہرہ ولی الحق نے "دیوانِ غزلیات مرزا محمد رفیع سودا" میں شامل کر لیا۔ لیکن یہ انتساب صریحاً غلط ہے کیوں کہ اول تو نسخۂ بنارس کے عنوان کے الفاظ "تصنیف ..... از دیگراں سے اس بات کی تردید ہو جاتی ہے کہ یہ شعر سودا کا نتیجۂ فکر ہے۔ دوم یہ کہ سودا کے شاگرد قائم چاند پوری نے اپنے تذکرے "مخزنِ نکات" میں اس شعر کو بہ ادنیٰ تغیر شیخ فرحت کے نام سے درج کیا ہے۔ تذکرے میں شعر کی شکل یہ ہے :

مرے لوحِ مزار او پر لکھانا
کوئی دل کو کسو سے مت لگانا

معنوی اعتبار سے یہ متن زیادہ مناسب ہے۔

۶۔ سودا اور عاصی (آسی)

رات کو اک شمع کی مانند رو کر رہ گیا
صبح کو دیکھا تو سب تن اشک ہو کر بہہ گیا [۱]

قطعہ

چمن کے تخت پر جس دم شہِ گل کا تجمل تھا
ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی اور شور تھا غل تھا
خزاں کے دن جو دیکھا کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں
بتاتا باغباں رو رو کے یہاں غنچہ تھا یہاں گل تھا

قائم نے اپنے تذکرے میں منقولہ بالا تینوں شعر، خواجہ برہان الدین عاصی کے ترجمے میں ایک عجیب و غریب روایت کے ساتھ نقل کیے ہیں۔ وہ روایت یہ ہے :

"از شعرائے طبقہ ثانیہ بود، یک بیت و یک قطعہ از دے کہ بر زبان خاص و عام جاری است و عامہ نسبت بہ سر آمد شعرائے فصاحت آما مرزا محمد رفیع السودا می کنند، نسبت افتادہ راست رحمۃ اللہ تعالیٰ"

لیکن قاسم کے اس بیان کی تائید کسی اور ذریعے سے نہیں ہوتی بلکہ میر، قائم، میر حسن، شوق، خلیل، شورش اور مصحفی وغیرہ نے ان اشعار کو عاصی ہی سے منسوب کیا ہے۔ البتہ بنارس ہندو یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ دیوانِ سودا کے ایک قلمی نسخے (مکتوبہ ۱۱۷۷ھ) میں خاتمہ ترقیمہ کی عبارت کے بعد "تصنیف فردیات وغیرہ از دیگراں" کے عنوان سے جو کلام درج ہے اس میں مندرجہ بالا قطعہ بھی شامل ہے۔ لیکن یہاں دوسرے اشعار کی طرح اس قطعہ کو بھی سودا کا طبع زاد نہیں کہا جا سکتا۔ ●●

یہ صبح زندہ رہے گی

مجھے حادثوں اور سانحوں پر بڑا یقین ہے۔

میری زندگی میں ایسے حادثوں اور سانحوں کا ایک پورا ہجوم ہے جس میں کچھ خاص لمحوں کے پیکر پوری تابناکی سے چمک رہے ہیں۔ جب میں انہیں پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں تو حادثوں اور سانحوں کی بھیڑ آہستہ آہستہ چھٹ جاتی ہے اور وہ پیکر زندہ و جاوید ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ میں انسانی زندگی کو لمحوں کی ایک مضبوط زنجیر سمجھتا ہوں اور اس زنجیر میں کچھ لمحے ہمیشہ ہیروں کی طرح چمکتے رہتے ہیں۔ جب اپنے اردگرد پھیلے اندھیرے کو دیکھ کر ہمارا حوصلہ ٹوٹنے لگتا ہے تو یہی ہیرے زندگی اور فتح کا پیغام لے کر آتے ہیں اور ہمیں مخالف قوتوں کا مقابلہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ انسانی زندگی کے ارتقا اور روشن قدروں کی بقا کا بس یہی راز ہے۔ میں نے اس راز کو ہمیشہ اپنے سینے میں سنبھال کر رکھا ہے اور اس کی روشنی میں راستے تلاش کیے ہیں۔ شاید میں اسی لیے کبھی مایوس نہیں ہوتا اور امید کے پھولوں کی آبیاری کرتا رہتا ہوں۔

تیز گام ٹرین صبح ساڑھے نو بجے کراچی پہنچی تھی۔

مجھے یہ گمان بھی نہ تھا کہ ٹرین میں ایک ایسی خاتون سے ملاقات ہوگی، جس کی والدہ پانی پت کی تھیں اور جن کا رشتہ خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی سے تھا۔ گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ اس خاتون کا نام عذرا تھا اور شادی کے بعد اب وہ عذرا کرار تھیں اور اس کے خاوند کرار حسین کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ وہ اپنے دو بچوں کے ساتھ ساہیوال سے آرہی تھیں۔ جہاں وہ کسی رشتہ دار سے ملنے گئی تھیں۔ جب تقسیم کا سانحہ پیش آیا تو عذرا اس وقت بہت چھوٹی تھی، اس لیے اسے پانی پت کے بارے میں بس اتنی ہی واقفیت تھی، جتنی واقفیت اسے اپنی والدہ سے ملی تھی۔ لیکن اسے اس بات پر فخر تھا کہ اس کا تعلق حالی پانی پتی سے تھا اور اس نسبت سے اس کا خواجہ احمد عباس سے بھی رشتہ تھا۔ اسے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ ہم سب ہریانہ سے آئے تھے اور جب میں نے اسے اپنا نام بتایا تو اس نے کہا کہ وہ میری کچھ کہانیاں پاکستان میں چھپنے والے رسالوں میں پڑھ چکی تھیں۔ ادب کا رشتہ کتنا عظیم ہوتا ہے۔ اس کا ایک بار پھر احساس ہوا۔ یہ رشتہ ایک ریشمی ڈوری ہے۔ جو دور دراز علاقوں اور ملکوں میں رہنے والوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیتی ہے۔

اگلی صبح جب ہم کمپارٹمنٹ میں سے ایک ساتھ اترے تو پروفیسر کرار حسین پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ عذرا نے جب میرا تعارف اپنے خاوند سے کرایا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے اپنا ایڈریس اور ٹیلی فون نمبر دیا۔ اور کہا کہ ہم چاروں ایک شام ان کے گھر ضرور آئیں جو گلشنِ اقبال میں تھا۔ اس نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور عذرا نے بڑے ادب اور احترام سے خدا حافظ کہا اور پھر وہ اور ان کے دونوں بچے اسٹیشن سے باہر نکل گئے۔

ہم اپنا سامان اٹھوا کر جب اسٹیشن سے باہر آئے تو شاہد الوری اور جہانگیر خاں ہمارے استقبال کو کھڑے تھے۔ وہ ہم سب سے بغل گیر ہوئے اور پھر ہمیں اپنی کاڑیوں میں بٹھا کر ہوٹل ساروان لے آئے، جہاں انہوں نے ہمارے ٹھہرنے کا انتظام کیا تھا۔ ضیاء الحق قاسمی ہمارے پہنچنے سے پہلے ہوٹل کے ریسیپشن پر کھڑا تھا۔ اس نے بھی سب کو گھٹ گھٹ کر جپھیاں ماریں اور پھر ہم سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اپنے کمروں میں پہنچ گئے۔ چائے کی زبردست طلب ہو رہی تھی۔ کمروں میں پہنچتے ہی چائے کا آرڈر دیا۔ اور چائے آنے تک ٹھنڈا پانی پیتے رہے۔

شاہد الوری اور ضیاء الحق قاسمی سے میری پہلی ملاقات تھی

چائے کے دوران دونوں نے مجھے اپنی اپنی کتابیں پیش کیں۔ تھوڑے سارے عرصے ہی میں ایک مختصر مزاحیہ نشست ہوگئی۔ کچھ قطعات ضیاء الحق

قاسمی نے اور کچھ قطعات شاہد الوری نے سُنائے۔ ہم اُن کا مزاحیہ کلام سنتے رہے۔ اور جی بھر کر داد بھی دیتے رہے۔ کچھ قطعات آپ بھی سن لیں۔ یقیناً محظوظ ہوں گے۔

ضیاء الحق قاسمی کے قطعات سنیے جو اس نے اپنی کتاب "رنگِ ظرافت" سے سُنائے۔ اس نے کتاب کا انتساب اپنی بیوی کے نام کر رکھا تھا اور انتساب کے ساتھ یہ جملہ لکھا تھا:

— اپنی اکلوتی بیگم کے نام جس نے مجھے ہنسنے ہنسانے کی اجازت دی۔ ورنہ بیویاں اپنے شوہروں کو ہنسنے ہی کہاں دیتی ہیں —

کتاب کے دیباچے میں مشتاق یوسفی کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا:

"کار میں بیٹھے میں نے اپنی دُلہن سے کہا لڑکیاں اپنے میکے سے چلتے وقت آبدیدہ ہوتی ہیں مگر تمہارے چہرے پر تو پریشانی اور اداسی کے آثار تک نہیں۔ وہ پھر بھی نہ روئیں۔ مگر جب میں نے اپنے چہرے سے سہرا سرکایا تو مجھے دیکھ کر وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔"

قطعات تو رہ ہی گئے۔ سُنیے:

چند مستورات گاڑی میں سفر کرتی ہوئی
کم سِنی کا ایک دوجی کو دلاتی تھیں یقیں
اک مراثی دھم سے کُودا اور یوں کہنے لگا
میں ابھی پیدا ہوا ہوں ریل گاڑی میں یہیں

شاعری میں مجھے اتنا بھی نہ کمتر سمجھو
میر و غالب نہ سہی، اکبر و حالی نہ سہی
میرے اشعار میں کھل جاتی ہیں باچھیں سب کی
"گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی"

موٹے ہیں مگر رکھتے ہیں رفتار بہت تیز
آگے وہ کسی کو بھی نکلنے نہیں دیتے
اس ڈر سے کہ ڈولی کو کہیں چھوڑ نہ بھاگیں
"کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے"

شاہد الوری کے قطعات تضمین نگاری کے میدان میں بہت کامیاب تجربے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے: اس نے اپنی کتاب "چراغ سے چراغ" سے یہ قطعات سُنائے تھے۔

اب یہ میّت پہ مری آ کے بہانا آنسو
اب مرے سوگ میں یوں چاک گریباں ہونا
اب مری روح سے، یہ معذرتِ جور و ستم
"ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا"

وفا کی اور حد کر دی وفا کی
غمِ اُلفت ہے بیماری بلا کی
حریفِ حُسن ہو پائی نہ اُلفت
"مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"

وہ جن کے در سے بھی شاہد گزر نہیں سکتے
وہ جن کو ہم سے عداوت بہت عداوت ہے
وہ جن کی چشمِ کرم سے ہیں جان و دل محروم
"وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے"

ضیاء الحق قاسمی، شاہد الوری اور جہانگیر خاں جو مسلم کمرشل بنک لمیٹڈ کا مینیجر ہے، تینوں گپ شپ کرتے رہے اور ہمارا پروگرام مرتب کرتے رہے اور ہم لوگ نہا دھو کر تیار ہونے میں مصروف رہے — گھنٹہ بھر بعد جب ناشتہ ہو چکا تو یہ طے پایا کہ ضیاء الحق قاسمی جیسے سنجا رہتا کچھ گھنٹوں کے لیے گھر جا کر آرام کرے گا۔ ملہوترہ، شاہد الوری کے ساتھ اس کے ساتھ اس کے گھر جائے گا۔ اور جہانگیر خاں نگی، گرپال اور مجھے پولیس اسٹیشن لے جائے گا۔ جہاں کراچی میں آمد اور رخصت کی اطلاع دینا ضروری تھی۔ چنانچہ ہم تینوں جہانگیر خاں کے ساتھ پولیس اسٹیشن چلے گئے۔ وہاں ایک دوسرا مسئلہ پیش آیا۔ پاسپورٹ سائز کی تصویروں کی ضرورت تھی۔ نگی اور گرپال تو اپنے اپنے پرس میں اپنی اپنی تصویریں ڈال لائے تھے۔ میں نے تصویریں اُتروائی ہی نہیں تھیں۔ جہانگیر خاں بڑا پریکٹیکل آدمی ہے۔ اُس نے نگی اور گرپال کو پولیس انسپکٹر کے دفتر میں بٹھایا اور مجھے لے کر بازار میں آگیا۔ اُسے معلوم تھا کہ تصویریں کہاں بن سکیں گی۔ بازار کے ساتھ لگتی ہوئی ایک گلی میں ایک کیمرے والا تھا جو فوراً ہی تصویریں بنا دیتا تھا۔ کیمرے والے نے اپنا چہرہ ایک کالے کپڑے میں ڈھکا۔ ایزل پر فٹ کیمرے کو فوکس کیا اور کھٹ سے تصویر لے لی۔ پانچ تصویریں اُس نے فوراً ہی بنا کر ہمارے حوالے کر دیں۔ یہ اور بات ہے کہ تصویریں تو میری تھیں، لیکن وہ میری لگتی نہیں تھیں۔ میں جب ہنسا تو جہانگیر خاں نے کہا کہ پولیس والوں کو تصویریں چاہئیں۔ وہ ہم اُنہیں دے دیں گے۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اس کا جاننے والا تھا۔ اس لیے دس پندرہ منٹ میں ہمارا کام ہو گیا۔ دو تصویریں اب بھی میرے پاس ہیں۔ جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ کبھی کبھی آپ کی تصویر آپ سے مختلف بھی ہو سکتی ہے۔

ہوٹل ساروان واپس آئے تو ملہوترہ اور شاہد الوری آ چکے تھے۔ کھانے کا وقت ہو گیا تھا میں تو کھانا کھا کر سو گیا اور ملہوترہ اور شاہد الوری دوستوں کو ٹیلی فون کر کے شام کا اور اگلے دن کا پروگرام طے کرتے رہے۔ جہانگیر خاں کچھ دیر کے لیے چلا گیا تھا۔ اب وہ پانچ بجے ہوٹل آئے گا۔ آنکھ کھلی تو "اخبارِ جہاں" ہفتہ وار کا تازہ شمارہ جو جہانگیر خاں میرے پاس چھوڑ گیا تھا، دیکھنے لگا۔

ٹھیک پانچ بجے جہانگیر خاں میرے پاس آگیا۔ پھر سب لوگ میرے کمرے میں آگئے۔ ملہوترہ نے بتایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے گلنار آفریں اس سے ملنے آئی تھی۔ میں سو رہا تھا، اس لیے ان لوگوں نے مجھے نہیں جگایا۔ گلنار آفریں پچھلے برس انبالہ کے انڈو پاک مشاعرہ میں آئی تھی۔ اور اس نے بڑی خوب صورت غزلیں سُنائی تھیں۔

ملہوترہ نے بتایا کہ عالمتاب تشنہ نے ہمیں رات کے کھانے پر بلایا تھا۔ وہیں کچھ اور دوستوں سے

بھی ملاقات ہو گئی۔

"لیکن اس سے پہلے آپ کی ایک اور اینگیجمنٹ بھی ہے' ذاکر صاحب!" جہانگیر خاں نے کہا۔

"فرمائیے!"

"چھ بجے آرٹس کونسل آف پاکستان میں جوش میموریل سوسائٹی کے زیرِ اہتمام رئیس امروہوی کا تعزیتی جلسہ ہے۔ آپ کی شرکت ضروری ہے۔"

"آپ کو ضرور جانا چاہیے۔ بلکہ ہندوستانی ادیبوں کی نمائندگی کرنا چاہیے۔" شاہد الوری نے تائید کی اور یہ بھی بتایا کہ جہانگیر خاں اس سوسائٹی کا ایک عہدے دار بھی تھا۔

جب میں جہانگیر خاں کے ساتھ آرٹس کونسل پہنچا، لوگ آچکے تھے۔ جلسہ شروع ہونے والا تھا۔ منتظمین نے میرا استقبال کیا اور مجھے بھی دوسرے مہمانوں کے ساتھ ڈائس پر بٹھا دیا۔ جلسہ کا پروگرام شروع کرنے سے پہلے اسٹیج سکریٹری نے میرے نام کا اعلان کیا اور میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے سامعین کو سلام کیا۔ وہیں سامنے بیٹھے فرمان فتحپوری نے مسکرا کر سلام کیا۔ مجھے یاد آیا کہ کچھ سال پہلے رئیس امروہوی اور فرمان فتحپوری چنڈی گڑھ آئے تھے اور ہم نے ایک بہت شان دار مشاعرے کا اہتمام بھی کیا تھا۔ رئیس امروہوی کے انتقال کی خبر ہم نے ہریانہ اردو اکاڈمی کے خبر نامے میں بھی تو چھاپی تھی۔

تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا تو رئیس امروہوی کی بیٹی شہلا رئیس نے بھی تقریر کی۔ ایک بیٹی اپنے نامور شاعر اور ادیب باپ کے حضور میں خراجِ عقیدت پیش کر رہی تھی۔ بڑی پُر درد تقریر تھی۔ حسنین مہدی نے اپنا خراجِ عقیدت ایک نظم کی شکل میں پیش کیا۔ جس کا عنوان تھا بیکراں۔ آپ بھی وہ نظم سنیے:

بیکراں

یہ ایک لمحے کی داستاں ہے
وہ ایک لمحہ.....
کہ جس کی آغوشِ مہرباں میں
ہزار صدیوں کے فکر و فن کا حسین پیکر
ہمک رہا تھا۔
وہ ایک لمحہ.....
کہ جس کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے
طلوعِ صبحِ ازل کا منظر
دمک رہا تھا
وہ ایک لمحہ قرارِ جاں تھا
وہ ایک لمحہ رئیس شہر لوا کی تربت کا راز داں تھا
وہ ایک لمحہ جو میری جانب لپک رہا تھا
رئیس کیا تھا! ——
رئیس ابلاغ کا وہ جادو.....
کہ سر پہ چڑھ کر جو بول لیتا تھا
رئیس صحنِ چمن کے رنگوں کا معجزہ تھا
رئیس دوشِ صبا پہ خوشبو کا قافلہ تھا
وہ ایک دل تھا
جو میرے سینے میں
تیرے سینے میں
اپنے لہجے کے نرم مدھم سُروں کی صورت
محبتوں کا سفیر بن کر
دھڑک رہا تھا۔
رئیس مرشد تھا، دیوتا تھا

یہ ایک لمحے کی داستاں ہے
وہ ایک لمحہ جو بیکراں ہے
قرارِ جانِ فگار لمحہ
نویدِ ابرِ بہار لمحہ
جو اپنے خوں میں نہا کے گلنار ہو گیا ہے۔

تقریر کرنے والوں کی فہرست بہت طویل تھی چنانچہ جہانگیر خاں نے اسٹیج سکریٹری سے کہہ کر میری تقریر پہلے رکھوا دی کیوں کہ ہمیں عالمتاب تشنہ کے ہاں پہنچنا تھا۔ اسٹیج سکریٹری نے یہ مناسب نہ سمجھتے ہوئے بھی کہ مجھے سب سے بعد میں بولنے کے بجائے درمیان میں بولنے کے لیے کہا جائے، جہانگیر خاں کی بات مان لی اور میرا نام پکارا۔

جب میں اٹھ کر مائیک کے سامنے کھڑا ہوا تو سامعین نے تالیوں سے میرا استقبال کیا۔ میں نے رئیس امروہوی اور فرمان فتحپوری کی چنڈی گڑھ تشریف آوری کا ذکر کیا اور کراچی کے ادیبوں اور شاعروں اور دانشوروں کو یہ بتایا کہ رئیس امروہوی کی ہندوستان میں بھی بڑی عزت تھی اور ان کے پُراسرار حالات میں انتقال کی خبر سن کر ہندوستان میں رہنے والوں کو بڑا رنج ہوا تھا۔ میں نے ہندوستانی ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی طرف سے پاکستان کے اس نامور شاعر، ادیب اور صحافی کی موت پر دکھ اور غم کا اظہار کیا۔ میں نے اپنی تقریر کو اپنے ایک قطعہ پر ختم کیا۔ جو میں نے ایک دن پہلے ہی کہا تھا۔

تمہارے نام میں کتنے پیام لایا ہوں
میں روشنی کے، محبت کے جام لایا ہوں
مرے عزیزو، مرے دوستو، ذرا پوچھو
دلِ فگار کے کتنے سلام لایا ہوں

میں تالیوں کی بھرپور گونج میں جہانگیر خاں کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسٹیج سے اترا۔ لمحہ بھر کو فرمان فتح پوری کو سلام کیا اور شان الحق حقی سے اگلے روز ٹیلی فون پر بات کرنے کا وعدہ کر کے ہال سے باہر نکل آیا۔ میرے پیچھے ہی شہزاد منظر باہر آگیا۔ جو "جنگ" اخبار کے لیے اس فنکشن کو کور کرنے کے لیے آیا تھا۔ شہزاد منظر میرے مداحوں میں سے تھا۔ اس نے کہا کہ وہ اگلی صبح ہوٹل سارا ٹاگا میں مجھے ملنے آئے گا۔ اور اپنے تنقیدی مضامین کا تازہ مجموعہ "ردِ عمل" بھی پیش کرے گا۔ شہزاد منظر سے چند لمحوں کی گفتگو کے بعد جہانگیر خاں نے مجھے اپنی گاڑی میں دھکیلا۔ اس نے شہزاد منظر سے اس گستاخی کے لیے معذرت چاہی۔ کیوں کہ ہم عالمتاب تشنہ کے ہاں پہنچنے میں پہلے ہی لیٹ ہو رہے تھے۔

"ذاکر صاحب مجھے معلوم نہیں تھا۔ آپ اتنے

م آدمی ہیں"۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔
"اچھا ہوتا اگر آپ صبح بتانے میں اس حوالے
میرا نام درج کروا دیتے۔"
"کل کرا دوں گا۔" پھر جہانگیر خاں زور
ہنسا۔ اس کے قہقہے بڑے جاندار تھے۔ میں دن
کئی بار اس کے قہقہے سن چکا تھا جہانگیر خاں مجھے بہت
فعال اور مخلص آدمی لگا۔ وہ شاعر تھا نہ نثر نگار لیکن شعر و ادب
عشق تھا اور وہ شاعروں اور ادیبوں کا عاشق
۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ کل وہ دفتر نہیں جائے گا۔
تمام دن میرے ساتھ گزارے گا اور مجھے میرے
دوستوں سے ملائے گا۔ اس نے ایک زوردار قہقہہ
لگا کر اپنے بیان پر تصدیق کی مہر ثبت کر دی۔ کراچی
کا ادبی حلقوں میں بے حد مقبول تھا وہ۔

اس کا ایک اور ثبوت مجھے اس وقت ملا۔
جب ہم عالمتاب تشنہ کے گھر پہنچے۔ جتنے بھی لوگ
وہاں موجود تھے۔ سب نے بڑے پیار سے اس کا استقبال
کیا۔ خود تشنہ نے بھی۔ کچھ دیر گفتگو ہوتی رہی
اور ہم ایک دوسرے سے متعارف ہوتے رہے۔ ایک
دوسرے کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے رہے۔
مجھے عالمتاب تشنہ بڑی صاف ستھری شخصیت کا آدمی
لگا۔ اس کے ذہن میں کہیں جھول نہیں تھا۔ وہ ایک
سلجھے ہوئے شعور کا آدمی تھا اور جب اس کے شعر
سنے تو محسوس ہوا کہ اس کا ادبی شعور بھی بہت نکھرا ہوا
تھا۔ اس نے مجھے غزلوں کا مجموعہ "آئینے کے اس طرف"
یہ الفاظ لکھ کر پیش کیا،
"محترم کشمیری لال ذاکر کی خدمت میں ان کی
ادبی عظمت کے اعتراف کے ساتھ۔"

کتاب پیش کرنے کا ایک خوبصورت پہلو یہ تھا
کہ اس نے اپنا نام دیوناگری لپی میں بھی لکھا تھا۔
مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ وہ اپنے دوستوں
کی عزت کرنے کا گُر جانتا ہے۔ شاید اسی لیے اس کے دوست
بھی اس کی عزت کرتے ہیں۔
ناصر زیدی سے بھی یہ میری پہلی ملاقات تھی

لکھنؤ میں پیدا ہوا تقسیم سے صرف دو سال قبل اور
۱۹۷۴ء تک چاٹگام میں رہ کر کراچی چلا آیا۔ اس کا
پہلا شعری مجموعہ "ہمنام" کے عنوان سے عنقریب
شائع ہونے والا تھا۔
محفل مختصر تھی لیکن شاعروں اور ادیبوں کی
محفل تھی۔ اس لیے شعر و شاعری کا ایک دور تو لازمی
تھا۔ ناصر زیدی ہی نے پہل کی۔ کچھ قطعات شاہد الوری نے
اپنی کتاب "ففتی ففتی" سے سنائے پھر میں نے بھی کچھ
اشعار سنائے۔

پرندے جب بھی کہیں گھر بنانے لگتے ہیں
کچھ ایسے پیڑ ہیں جو دل جلانے لگتے ہیں
میں واقعات کو اتنا تراش دیتا ہوں
فسانے ہوتے نہیں ہیں فسانے لگتے ہیں
کچھ ایسے لوگ بھی دنیا میں ہم نے دیکھے ہیں
جو زخم کھاتے ہیں اور مسکرانے لگتے ہیں

اور اس کے بعد میں نے عالمتاب تشنہ سے کچھ اشعار
سنانے کو کہا۔ اس نے بڑے ہی خوبصورت شعر سنائے۔
آپ بھی سنیے لطف آئے گا۔

سفر نواز تو کوئی شجر نہیں آیا
کہیں بھی دشت میں سایہ نظر نہیں آیا
تمہارے شہر میں کیا ہو گیا ہے لوگوں کو
بہت دنوں سے کوئی دار پر نہیں آیا

ہم نے ہر راستہ بے خوف و خطر کاٹ دیا
تن تنہا یہ محبت کا سفر کاٹ دیا
کتنے بے مہر ہیں یہ شہر بسانے والے
جس کی چھاؤں میں پلے تھے وہ شجر کاٹ دیا
ہم نے دیکھا ہے سیاست کا یہ حسنِ انصاف
جس پہ دستار سجی تھی وہی سر کاٹ دیا

مے خواروں کو میخانے کی یاد دلاتے رہنا
تشنہ بھی کا سالانہ تہوار مناتے رہنا
اپنے آپ سے باتیں کرنا ساحل اور سمندر کی
گیلی ریت پہ نقش بنانا اور مٹاتے رہنا

تم سے مل کر جینے کے امکان دکھائی دیتے ہیں
دیکھنا ہم سے ملتے رہنا آتے جاتے رہنا

اس محفل میں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ بدقسمتی
سے مجھے ان کے نام اب یاد نہیں۔ ان سے معذرت چاہتا
ہوں کہ ان کا ذکر اس رپورتاژ میں موجود نہیں لیکن وہ
سب بڑے ہی خوبصورت اور پیارے لوگ تھے۔
جو ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے اور ایک دوسرے
کی مدد کرتے تھے۔
ملہوترہ نے عالمتاب تشنہ کو مارچ ۱۹۸۹ء
میں انبالہ میں ہونے والے انڈو پاک مشاعرے میں
شرکت کی درخواست کی۔ تشنہ نے دعوت تو قبول
کر لی، لیکن بڑی صاف دلی سے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر
اس کی دفتری مصروفیات نے اجازت نہ دی تو وہ
شاید انبالہ نہ آ سکے۔
تشنہ نے بڑے سلیقے سے میزبانی کے فرائض
سر انجام دیے اور بڑا پُرلطف کھانا کھلایا۔ پھر
اس نے بڑی محبت اور بڑے احترام سے ہمیں رخصت
کیا اور میں خاص طور پر شکر یہ ادا کیا کہ میں نے ایک
شام اس کے ساتھ گزاری تھی۔
جب ہم لوگ ہوٹل سار وان پہنچے تو بارہ بجنے
والے تھے۔ جہانگیر خاں اور شاہد الوری اگلی صبح ملنے
کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ ضیاء الحق قاسمی کا ری سیپشن
پر ٹیلی فون پر پیغام رکھا تھا۔ اسے تیز بخار
ہو گیا تھا اس لیے وہ شام کو نہیں آ سکا تھا۔
اگر بخار اتر گیا تو وہ اگلی صبح ٹیلی فون کرے گا اور پھر
ہمارے پروگرام میں شامل ہو جائے گا۔
جب ہم اپنے کمروں میں داخل ہوئے تو
آدھی رات گزر چکی تھی اور اگلی صبح کا آغاز ہو چکا تھا۔
لیکن اگلی صبح کا اصلی آغاز تو جب ہوا جب صبح ہم نے
ٹیلی ویژن پر تازہ خبریں سنیں اور پھر "ڈان" اخبار
دیکھا۔
"ڈان" کراچی کے پہلے صفحے پر پہلی ہی سرخی
دھماکہ خیز تھی۔

گزری ہوئی کل یعنی ۲ا نومبر ۱۹۸۸ء کو سپریم کورٹ کے گیارہ ججوں کے بینچ نے لاہور ہائی کورٹ کے اس فیصلے کو معطل کر دیا تھا۔ جس کی رو سے انتخابات میں ووٹر کے لیے شناختی کارڈ کو پیش کرنا ضروری نہیں تھا۔ یہ فیصلہ ایک بہت بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ ہوٹل کے بیرے تک اس خبر کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ صبح جب میں نے ری سپشن سے اخبار منگوایا تو چائے لانے والے بیرے نے بھی اپنی رائے کا اظہار کر دیا تھا۔

جہانگیر خاں وعدے کے مطابق ہمارے پاس پہنچ گیا تھا۔ دفتر سے اس نے چھٹی لے لی تھی۔ اس کے آنے کے تھوڑی دیر بعد شہزاد منظر بھی آ گیا۔ شہزاد منظر ادیب کے علاوہ ایک صحافی بھی تو ہے اخبار کی سرخی تو وہ بھی پڑھ کر آیا تھا۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے بعد سیاست کے میدان میں ہنگامہ خیز حالات رونما ہونے کے امکانات تھے۔

کچھ دیر اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی اس دوران میں نے چائے کا آرڈر دیا اور شہزاد منظر نے اپنے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "ردِ عمل" مجھے پیش کیا

چائے آنے تک جہانگیر خاں اور شہزاد منظر آپس میں بات چیت کرتے رہے اور میں اس کی کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اس کے اپنے لکھے ہوئے دیباچے کو سرسری نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ دیباچے کا آخری پیرا معنی خیز تھا:

"اس مجموعے میں شامل مضامین ۱۹۶۱ء سے ۱۹۸۵ء یعنی تیئیس سال کے دوران لکھے گئے ہیں۔ اس دوران میرے افکار و خیالات میں کافی تبدیلی آئی ہے اس لیے میرے ابتدائی دور کے مضامین اور موجودہ مضامین میں کافی فرق بلکہ بعض اوقات تضاد بھی نظر آئے گا۔ میں اس بارے میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ مضامین پڑھتے وقت اس حقیقت کو مد نظر رکھیے۔ اور اسے تضاد کے بجائے فکری ارتقا تصور کیجیے۔ یہ مقالات کیسے ہیں اور کیسے نہیں۔ اس بارے میں میں کوئی بات کہنا نہیں چاہتا۔ یہ قارئین اور ناقدین کا کام ہے کہ وہ اس بارے میں فیصلہ کریں۔"

مجھے شہزاد منظر کی یہ صاف گوئی اچھی لگی۔

اس نے مجھے اپنی دوسری کتاب "جدید اردو افسانہ" بھی دی۔ اسے میں نے صرف الٹ پلٹ کر دیکھا اور اپنے پاس رکھ لیا۔ اسے بعد میں پڑھوں گا۔ اتنا وقت اس سمے کہاں تھا۔ لیکن ایک بات واضح ہو گئی کہ شہزاد منظر ذہین آدمی تھا۔ اور اپنی بات کہنے کا ٹھیک ڈھنگ جانتا تھا۔

شان الحق حقی کا ٹیلی فون تھا۔ اس نے میرا پروگرام پوچھا تھا اور مجھے دوپہر کے کھانے کی دعوت بھی دی تھی۔

"جہانگیر خاں میرے پاس بیٹھا ہے۔ یہی بتائے گا آپ کو میرا پروگرام۔" میں نے یہ کہہ کر ٹیلی فون جہانگیر خاں کو دے دیا۔

"دوپہر کا کھانا تو ایم۔ آئی۔ ارشد صاحب کھلا رہے ہیں۔ رات کا کھانا میرے ہاں ہے۔ اس کے بعد رات کو ہی ایک بجے کی فلائٹ سے یہ لوگ لاہور چلے جائیں گے۔ البتہ میں ذاکر صاحب کو لے کر آپ کے پاس کوئی گیارہ بجے کے قریب آ جاؤں گا۔"

جہانگیر خاں نے ٹیلی فون دوبارہ مجھے دے دیا

"تو آپ گیارہ بجے آ رہے ہیں نا؟"

شان الحق حقی نے پوچھا

"جہانگیر خاں پر منحصر ہے وہ آپ کا گھر جانتا ہے؟"

"گھر اور دفتر دونوں معلوم ہیں اُسے۔"

"تو ہم لوگ حاضر ہو جائیں گے۔"

ٹیلی فون کی گفتگو سے یہ انکشاف ہوا کہ ہمارا دوپہر کا کھانا طے ہو چکا تھا اور رات کا کھانا جہانگیر خاں کھلا رہا تھا۔ وہیں سے ہم لوگ ایرپورٹ چلے جائیں گے۔

"تو رات کا کھانا آپ کے ہاں ہے؟

"جی ہاں ایک مختصر سی نشست بھی ہو گی۔ آپ کے کئی مداح اور دوست بھی مل جائیں گے۔"

تھوڑی دیر کے بعد شہزاد منظر نے جانے کی اجازت لی۔ اُسے کوئی ضروری کام تھا۔

پھر ضیاء الحق قاسمی کا ٹیلی فون آیا۔ کل اُسے بہت تیز بخار تھا۔ اس لیے وہ نہیں آ سکا تھا۔ اب اس کا بخار اتر گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ ہوٹل آ جائے گا۔ بات بمشکل ختم ہوئی تھی کہ شا... الوری بھی آ گیا یعنی چوکڑی مکمل ہو رہی تھی۔

ظاہر تھا کہ سب لوگ ایک ہی شخص پر توجہ نہیں دے سکتے تھے۔ ہر ایک کی ذاتی دلچسپیاں بھی تھیں۔ ملہوترہ کچھ اور دوستوں سے بھی ملنا چاہتا تھا جنہیں وہ انڈو پاک مشاعرے میں شرکت کی د... دینا چاہتا تھا۔ نیگی اور گوپال مارکیٹ میں گھو... چاہتے تھے۔

ضیاء الحق قاسمی کے آنے تک دو گروپ بن گ... تھے۔ ایک گروپ صرف جہانگیر خاں اور مجھ پر مشتمل... اور باقی سب لوگ دوسرے گروپ میں شامل تھے... چنانچہ جہانگیر خاں اور میں اپنی منزل کی طرف رو... ہو گئے۔ تقسیم سے پہلے بھی میں کراچی کبھی نہیں آیا... اس شہر کو دیکھنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ میر... خواہش تو تھی کہ میں شہر میں گھوموں اور کچھ وقت سم... کے کنارے بھی گزاروں۔ لیکن یہ سب ممکن نظ... نہیں آتا تھا۔ جہانگیر خاں نے بس یہ کیا کہ وہ ... کار میں بیٹھے بیٹھے سڑکوں اور علاقوں کے نام بت... رہا۔ جن میں سے واپس ہوٹل آنے تک سوائے دو... کے مجھے کسی بھی سڑک یا علاقے کا نام یاد نہیں رہا... نام پتے اور ٹیلی فون نمبر مجھے ویسے بھی یاد نہیں ر... کئی بار تو اس کمزوری کی وجہ سے بڑی پریشانی بھی... ہے۔ لیکن کر بھی کیا سکتا ہوں۔ کسی زمانے میں کلفٹ... کا علاقہ کراچی کا سب سے پاش ایریا سمجھا جاتا ت... لیکن اب ڈیفنس کالونی والا علاقہ اس پر سبقت... لے گیا ہے۔ جن سڑکوں سے ہم گزرے بڑی صا... ستھری اور کھلی سڑکیں تھیں۔ انار بھیسے ہم...

ے عمارتیں پُروقار تھیں۔ لاہور میں پرانے کلچر کے ار ابھی پوری طرح قائم تھے لیکن کراچی میں لگتا تھا بدیلی زیادہ تیزی سے آئی تھی۔

شان الحق حقی کے دفتر پہنچے۔ ایک بڑی عمارت تھی، جس میں کئی اداروں کے دفتر تھے۔ اوپر کی منزل پر حقی کا دفتر تھا۔ حقی بہ یک وقت کئی شخصیتوں کا مالک ہے۔ وہ شاعر بھی ہے۔ نقاد بھی ہے۔ میڈیا کا آدمی بھی ہے۔ ایڈورٹائزنگ کا بھی ایکسپرٹ ہے۔ ن کے بھگ اٹھارہ برس ترقی اردو بورڈ سے بھی وابستہ رہ چکا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے ، وہ ایک اچھا اور پُرخلوص دوست ہے۔ اس ں اور میری ملاقات میں بھی زیادہ ہاتھ حقی کا تھا۔ ہ پہل نہ کرتا تو شاید دوسرا گروپ مجھ پر حاوی رہتا۔ ور میں ڈیفینس سوسائٹی تک نہ پہنچ پاتا۔

ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے — ہم دونوں ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش میں مصروف تھے۔ جہانگیر خاں البتہ بیچ بیچ میں اپنی بات کہہ رہے ہیں اور بھی ترتیب ہونے میں معاونت کر رہا تھا۔

حقی نے مجھے ایک سو منتخب غزلوں کا مجموعہ "دل کی زبان" پیش کیا اور میرے کہنے پر چند اشعار بھی سنائے۔

بہت تاریک دل ہیں پھر بھی دیکھو
اُجالا چاندنی راتوں میں کیا ہے
نہیں پاتیں جسے بیدار نظریں!
خدایا یہ مرے خوابوں میں کیا ہے

یاد آنے لگا پھر وہ سکوں تیری گلی کا
پھر دل کا تقاضا ہے کہ بیٹھیں کہیں چل کے

شعر اچھے تھے، لیکن جہانگیر خاں کی داد نے شعروں کو دو آتشہ کر دیا تھا۔

حقی نے تقاضا کیا کہ ہم اس کے گھر چلیں۔ اس میں اعتراض کی بھلا کیا بات تھی۔ اس کے گھر پہنچ کر تو طبیعت اور بھی خوش ہو گئی۔ اس کی اپنی ذاتی لائبریری بہت اچھی تھی۔ جب میں نے اس سے اپنے پروجیکٹ کی بات کی تو اس نے کچھ اچھے علمی مشورے بھی دیے۔ وہ کچھ دیر اپنی لائبریری دکھاتا رہا۔ پھر اس نے کولڈ ڈرنکس پیش کیں۔ جہانگیر خاں نے دو ایک دوستوں کو ٹیلی فون کیے۔ اور پھر ہم شان الحق حقی سے اجازت لے کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ آج ایک اچھے دوست سے ملاقات ہو گئی تھی۔

شان الحق حقی کے گھر سے ہم لوگ سیدھے ساروان ہوٹل پہنچے جہاں ریٹائرڈ ایڈمرل ایم۔ آئی ارشد جو ان دنوں تابانی گروپ آف انڈسٹریز سے ایڈوائزر کی حیثیت سے وابستہ تھے ہمارے میزبان تھے۔ سبھی مہمان پہنچ چکے تھے۔ ہم دونوں ہی تاخیر سے آئے تھے۔ جہانگیر خاں نے دیر سے آنے کے لیے معذرت چاہنے کے بعد ارشد صاحب سے اور دوسرے مہمانوں سے میرا تعارف کرایا۔ مہمانوں میں میرا ایک بہت ہی پرانا دوست دلاور فگار بھی موجود تھا۔ بہت تپاک سے گلے ملا۔ اس کی باتوں سے لگا وہ پریشان سا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا اس کے اقتصادی حالات اچھے نہیں تھے۔ ہندوستان میں اس کی مزاحیہ شاعری کے بڑے چرچے تھے۔ مزاح اور طنز تو اس کی گفتگو میں بھی موجود تھا۔ شاہد الوری نے دلاور فگار کے بہت سے لطیفے سنائے — ایڈمرل ارشد صاحب بڑے باذوق، شائستہ اور مخلص آدمی ہیں اور کراچی کی ادبی زندگی میں ان کا ایک اہم رول ہے۔ جہانگیر خاں نے بھی انہیں رات کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ ان سے دوسری بار ملاقات کی سبیل بھی ہو گئی تھی۔

میں دو ادبی شخصیتوں سے ضرور ملنا چاہتا تھا۔ ایک تھا اردو ادب میں ایک بہت ہی معتبر نام، مشفق خواجہ اور دوسرا تھا "افکار" کا ایڈیٹر صہبا لکھنوی جس کے پرچے میں میری کچھ تخلیقات چھپتی بھی رہی ہیں۔ اگرچہ ادھر کئی برسوں سے رابطہ ٹوٹا ہوا تھا۔ جہانگیر خاں نے بتایا کہ جس طرف سے ہم کھانے کے بعد نکلیں گے، صہبا سے "افکار" کے دفتر میں ملاقات ہو جائے گی جو رابسن روڈ پر واقع تھا۔ اس کی تجویز تھی کہ مشفق خواجہ کو ٹیلی فون کر لیا جائے۔ اس نے کئی بار ٹیلی فون کیا لیکن کوئی جواب نہیں ملا — مجھے مشفق خواجہ سے نہ مل سکنے کا بہت افسوس رہا۔ اس سے ملاقات ہو جاتی تو بہت اچھا ہوتا۔ کراچی میں ایک اور دوست جس سے میں ملنا چاہتا تھا، وہ تھا ممتاز حسین۔ اس سے بھی ملاقات کی سبیل نہ بن سکی۔ زندگی میں کوئی تشنگی تو رہ ہی جاتی ہے۔ بہرحال صہبا لکھنوی سے اس کے دفتر میں ملاقات ہو گئی۔ آج کل نکہت بریلوی بھی "افکار" ہی میں کام کر رہا تھا۔ ملاقات تو طویل نہیں تھی، لیکن صہبا بڑی مروت عزت اور خلوص سے پیش آیا۔ اس نے افکار کے کچھ شمارے بھی دیے اور وعدہ کیا کہ افکار اب مجھے باقاعدہ ملتا رہے گا۔ مجھے "افکار" کے فیض نمبر میں چھپے اپنے ایک مضمون "فیض کی شاعری میں محبوب کا تصور" کی بہت تلاش تھی۔ صہبا نے یقین دلایا کہ وہ افکار کے پرانے فائلوں میں سے فیض نمبر کو تلاش کرے گا۔ اور مجھے میرے مضمون کی نقل بھجوا دے گا۔ ملاقاتیں بھلے مختصر ہوں لیکن تجدید تعلقات سے بڑی تسکین ہوتی ہے۔

مطہر ترہ کی تجویز تھی کہ ہم بندر روڈ ضرور چلیں۔ دراصل وہ مجھے کراچی کا وہ مخصوص علاقہ دکھانا چاہتا تھا، جہاں پرانی ہندو آبادی رہتی تھی اور انہوں نے اپنے مندر بنا رکھے تھے، جہاں وہ پوجا اور اپنی دوسری مذہبی رسومات ادا کیا کرتے تھے۔ مذہبی رواداری کا یہ منظر میں بھی دیکھنا چاہتا تھا چنانچہ جہانگیر خاں مجھے بندر روڈ کے گنجان علاقے میں لے گیا، جہاں مجھے دہلی کے چاندنی چوک والا نظارہ دیکھنے کو ملا۔ فٹ پاتھوں پر دکانیں تھیں، جہاں تک پہنچنے کے لیے لوگوں سے کندھے بھڑتے تھے۔ بہرحال ہم ہندو آبادی کے علاقے میں پہنچ گئے۔ واقعی دو مندر تھے، جن کے دروازے اس وقت بند تھے۔ میری خواہش تھی کہ میں دونوں مندروں کو اندر سے بھی دیکھوں۔ مندر کا ایک پجاری مندر کے باہر کھڑا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ مندر کا دروازہ کھول دے تاکہ میں بھگوان کے درشن کر سکوں، لیکن

اس نے انکار کر دیا۔ بھگوان کے درشن اس وقت نہیں ہو سکتے تھے۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ ہم لوگ ہندوستان سے آئے تھے اور خاص طور سے یہ مندر دیکھنے آئے تھے، لیکن پجاری ٹس سے مس نہیں ہوا۔ مجھے بہت کھنچ۔ آئی۔ من میں کڑواہٹ بھی ہوئی۔ لیکن کچھ کہے بغیر مندر کے چبوترے سے نیچے اتر آیا اور پھر خاموشی سے واپس سڑک پر آگیا۔ میرے ساتھیوں کی ذہنی حالت بھی مجھ جیسی ہی تھی۔

اس دن میرے لیے ایک دم ذاتی خوشی کی بات بیگم نشاط فاطمہ آپا سے ملاقات تھی۔ یہ ملاقات میرے لیے آج کی سب سے بڑی گھٹنا تھی۔ نشاط فاطمہ آپا میرے عزیز دوست نسیم احمد صاحب کی بڑی بہن ہیں۔ نسیم احمد ان دنوں وزیر اعلیٰ ہریانہ کے پرسنل سکریٹری تھے اور میری اور ان کی دوستی بڑی مضبوط بنیادوں پر قائم تھی۔ اردو ادب سے محبت بھی جس کی ایک وجہ تھی۔ دو برس پہلے نشاط فاطمہ آپا کے شوہر غیاث الدین احمد صاحب کا انتقال ہو گیا تھا جو کسٹمز ڈپارٹمنٹ میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔ نسیم صاحب کو آپا سے ملے بہت عرصہ ہو گیا تھا۔ انہوں نے مجھے آپا کے نام ایک خط دیا تھا۔ جو مجھے انہیں پہنچانا تھا اور خود بھی انہیں سلام عرض کرنا تھا۔

میرے اس کام کی تکمیل بھی جہانگیر خاں نے کرائی۔ نشاط فاطمہ آپا امام احمد روڈ پر پاکستان ایمپلائز کو آپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کے علاقے میں رہائش پذیر ہیں۔ جہانگیر خاں پوچھتے پوچھتے مجھے وہاں تک لے ہی گیا۔ نشاط فاطمہ آپا کو بڑے ادب سے سلام عرض کیا۔ اور نسیم صاحب کا خط بھی انہیں پیش کیا۔ آپا اپنے چھوٹے بھائی کا خط پڑھ کر بہت خوش ہوئیں پھر انہوں نے اپنے بیٹے خاور ریاض سے بھی ملوایا۔ وہ پی آئی۔ اے میں سروس کرتا ہے۔ رات کو ڈیوٹی کر کے آیا تھا اور اب تھوڑی دیر کے لیے پھر سو گیا تھا۔ وہ کھلی آنکھوں کو ہاتھوں سے ملتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آیا اور مجھے اور جہانگیر خاں کو بڑی محبت سے ملا۔

چائے کے دوران نشاط فاطمہ آپا مجھ سے اس طرح بات کرتی رہیں جیسے میں بھی ان کے خاندان کا ایک فرد تھا۔ انہوں نے میری وساطت سے نسیم احمد صاحب کو اور بیگم نسیم صاحبہ اور بچوں کو دعائیں بھیجیں اور پھر آپا اور خاور ریاض ہمیں باہر تک چھوڑنے آئے۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے مجھے ایک بہت ہی گہرے ذاتی سکون کا احساس ہوا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور آپا نے جب اپنے مکان کا گیٹ بند کیا تو مجھے لگا جیسے میں جنت سے لوٹ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ آج کے دن کا اصلی ہیرو جہانگیر خاں تھا۔ ہم تو جیسے سب سائیڈ ہیرو تھے۔ ایک بار ہوٹل آ کر ہم نے اپنا سامان گاڑیوں میں رکھوا لیا۔ اور ہوٹل سے چیک آؤٹ ہو گئے۔ اب ہماری منزل جہانگیر خاں کا گھر تھا۔ جہاں ایک مختصر سی نشست کا اہتمام تھا۔ اور رات کا کھانا بھی۔ اس کے بعد جہانگیر خاں، شاہد الوری اور ضیاء الحق قاسمی نے ہمیں کراچی ایرپورٹ پر چھوڑنا تھا۔

جہانگیر خاں کے گھر نشست میں جن دوستوں نے شرکت کی ان میں نعیم الرحمٰن جوہر، ضیاء الحق قاسمی، وسیم بریلوی، شاہد الوری، سید امروہوی، ناصر زیدی، نجمہ حسن خاں، اعجاز رحمانی، منظر الوبلی، گلنار آفرین، دلاور فگار اور ساقی جال حنفی شامل تھے۔

سامعین میں جہانگیر خاں کے کچھ دوست تھے، جن میں ریٹائرڈ ایڈمرل ایم۔ آئی۔ ارشد بھی موجود تھے۔

نشست کا آغاز جہانگیر خاں کی مختصر اور جامع استقبالیہ تقریر سے ہوا۔ تقریر کے بعد انہوں نے کچھ شعر بھی کہے جن میں نوٹ نہیں کر سکا کیوں کہ جہانگیر خاں کی تقریر سننے میں محو رہا۔ جہانگیر خاں نے نہ صرف کراچی کے ادیبوں، دانشوروں اور شاعروں کی طرف سے بلکہ سارے پاکستان کے قلم کاروں کی طرف سے ہمارا استقبال کیا۔ اور اس بات پر زور دیا کہ ادیب اور شاعر دونوں ملکوں کے تعلقات کو مضبوط کرنے میں بہت بڑا رول ادا کر سکتے تھے۔

اپنی تقریر کے بعد جہانگیر خاں نے جن شا[عروں] سے اپنا کلام پیش کرنے کو کہا اور ان میں سے [جن] دوستوں کے شعر میں نے نوٹ کیے ان کا ایک ایک [شعر] بھی درج کر رہا ہوں۔

سب سے پہلا شاعر نعیم الرحمٰن جوہر تھا کی غزل کا ایک شعر سنیے۔

ٹوٹ کر بھی آئینہ آئینہ ہی رہتا ہے
بو کے گل نہیں جاتی برگِ گل مسلنے سے

ضیاء الحق قاسمی کا ایک قطعہ بھی سن لیجیے۔

کیوں گلا پھاڑتا ہے جلسے میں
اس سے پوچھو اسے ہوا کیا ہے
درد اٹھتا ہے قوم کے دل میں
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

نسیم احمد وسیم نے دو مختصر سی غزلیں سنائیں دونوں غزلوں کا ایک ایک شعر جو میں نے نوٹ کیا آپ بھی سن لیجیے۔

اونچا ہے میرا قد تو یہ دستور ہے میرا
میں چھوٹے کالونی میں ذرا جھک کے گیا ہوں

وہ رگِ جاں سے بھی بڑھ کر اور کچھ آیا قریب
مجھ کو کم ہوتے ہوئے یہ فاصلے اچھے لگے

شاہد الوری نے بھی قطعات سنائے، ا[ن میں سے] بھی ایک قطعہ سن لیجیے:

کثرتِ اولاد سے تو ناک میں دم آگیا
اور وہ کہتے ہیں مجبورِ فغاں کوئی نہ ہو
اب مکاں میں کوئی گنجائش نہ کھانے کو اناج
"رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو"

اس کے بعد سید امروہوی نے ایک غزل پیش کی ج[س کا] ایک شعر اس طرح سے ہے:

نہ اسیری راس آئی نہ رہائی راس آئی
نہ سکوں ملا قفس میں نہ چمن میں آب و دانہ

ناصر زیدی جس سے کل ملاقات نہ ہو سکنے کے ...

ملاقات ہوئی تھی، اس نشست میں
...د تھا۔ اس کے دو شعر جو میں نے نوٹ کیے
آپ بھی سن لیجیے۔

ہجر کی رات کٹ گئی وصل کا دن گزر گیا
دونوں ہی ناسپاس تھے رشتۂ جاں بکھر گیا

...ر کی فضا عجیب تھی، دشت بھی کم سواد تھا
...ن ہوا چلی کہ بس موسمِ بام و در گیا

...ر حسن خان نے محفل کا رنگ بدلا اور یہ شعر سنایا:

مزاجِ وقت میں یہ کیسی برہمی آئی
بہار آئی مگر آب کے تشنگی آئی

اُداس صبحیں ہوئیں سوگوار شامیں ہوئیں
کفن لپیٹ کے ہر رات چاندنی آئی

...اس کے بعد اعجاز رحمانی نے اپنی غزل پیش کی جس کا
...شعر پیش کر رہا ہوں:

برسات میں تالاب تو ہو جاتے ہیں کم ظرف
باہر کبھی آپے سے سمندر نہیں ہوتا

...ر گلنار آفرین نے ایک غزل سنائی جس کا مطلع
...چاہتا ہے۔

زرد چہروں پہ لہو آئے ہم ایسی کرامات کریں
قتل گاہوں میں لہو ہے کس کا در منصف پہ سوالات کریں

...مد فگار نے اپنا ایک تازہ قطعہ پیش کیا۔ آپ بھی
...ن لیجیے:

میں شاعر آدمی ٹھہرا ہزاروں ملنے والے ہیں
مرے چاروں طرف امیدواروں کے رسالے ہیں
ہزاروں امیدواروں کے مقابل میں اکیلا ہوں
اُدھر اک مرجع مشتاقاں اِدھر میں ایک ووٹر ہوں
میں اپنا ووٹ کس کو دوں؟

...ولا مد فگار گو اب پہلے والا دلاور فگار نہیں
...ن اس کے طنز کے نشتر پہلے جیسے تیکھے ہیں۔

جہانگیر خاں کے اصرار پر ایک غزل کے کچھ شعر
میں نے بھی پیش کیے۔ دو شعر آپ بھی سن لیجیے۔

ہمیں تو اپنا فسانہ سنانا ہوتا ہے
تمہارا ذکر تو بس اک بہانہ ہوتا ہے

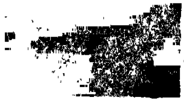
فقیرِ شہر کی مجبوریاں بھی ہوتی ہیں
فقیرِ شہر کا بھی اک ٹھکانہ ہوتا ہے

اس مختصر سی نشست کے بعد جہانگیر خاں نے سب دوستوں کا شکریہ ادا کیا اور اس کے بعد ہم سب لوگ کھانے میں شریک ہوئے۔ کھانے کے دوران دوستوں سے باتیں ہوتی رہیں۔ ایک خاص دوست جس کا ذکر کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں وہ سجاد میر ہے، جو روزنامہ "حریت" کا ایڈیٹر ہے۔ سجاد میر بہت سے اخبار کے ساتھ وابستہ رہا ہے۔ اور ایک جانا پہچانا صحافی ہے۔ اس سے جب ادب کے بارے میں بات ہوئی تو اس نے کہا کہ اسے حرف کی پہچان مجید امجد سے ہوئی اور اس نے مسائل سے اُلجھنا سلیم احمد سے سیکھا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ سجاد میر کی شریکِ حیات امریکہ سے ڈاکٹریٹ کی تعلیم حاصل کر چکی ہے اور مرغی خانہ میں ان کی تحقیق کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

جہانگیر خاں نے گھڑی دیکھ کر اعلان کیا کہ اب ہمیں ایرپورٹ کی طرف روانہ ہونا چاہیے۔ کیوں کہ وہاں ہمیں بارہ بجے تک پہنچ جانا تھا۔ فلائٹ کا ٹائم ایک بجے کا تھا۔ قریب قریب دس منٹ دوستوں سے خدا حافظ کہنے میں صرف ہو گئے۔ اور پھر جہانگیر خاں میرِ کارواں کی طرح ہم سب کو کراچی ایرپورٹ لے آیا۔ جہانگیر خاں، شاہد الوری اور ضیا الحق قاسمی ایرپورٹ پر ہی کھڑے رہے۔ جب تک ہم سیکیورٹی چیکنگ کے بعد اندر نہیں چلے گئے۔ جب میں پی۔ آئی۔ اے کے ہوائی جہاز میں بیٹھا تو مجھے ایسا لگا جیسے رن وے کے قریب عذرا کرار اور اس کے دونوں بچے ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ مجھے لگا کہ ہریانہ میں پانی پت اور پاکستان میں کراچی دونوں شہروں کے درمیان فاصلہ اب بہت کم ہو گیا تھا۔ کیوں کہ عذرا اور اس کے بچے کراچی میں رہ کر بھی پانی پت کی نمائندگی کر رہے تھے۔

[جاری ہے]

مختصر نظمیں



صہبا وحید

وہ بھی خاموش تھی
کہ جیسے رات
میری آنکھوں میں چاند اُتر آیا!

●

اُس کی آنکھیں
جہانِ معنی تھیں
میں ہی بھٹکا چمن چمن بیکار

●

دھوپ کی پتیاں
سبھی چُن لو!
سرد راتوں میں کام آئیں گی

●

پربتوں کی ندی کے سینے پر
پھول روشن،
چراغ روشن ہیں!

●

اُس کے پاؤں کفن سے باہر تھے
میں نے پہنا دی گھاس کی پاتات

●

کتنی تلخی ہے اس کے لہجے میں
چاند اُترا ہو جیسے آنگن میں
نیم کی ڈال ڈال سے ہو کر

●

صبح روشن ہے اگر
واجبِ تعظیم ہے
شام کی تاریکیوں کو بھول جانا ہے بھلا!

●

میرے کمرے کے دونوں کھلے تھے کواڑ
وہ نہ آیا مگر
اُس کو آنا نہ تھا!

●

تم اپنے طاقِ ابرو کو
کنوارے خواب کی قندیل سے پُرنور کر دینا
میں اپنے حزن سے اک اجنبی تقدیر لکھوں گا

●

میں نے بس اتنا کہا تھا،
اُس بُتِ گُل پیرہن کے واسطے
اپنے گھر کے سارے دروازے کھُلے رکھا کرو،
یوں نہ ہو، وہ آئے اور تم سے کہے؟
محبوب
چوکھٹ پر کھڑا ہے
باریابی کی اجازت چاہتا ہے!

●

سات پردوں میں وہ تھا جب مستور
اک جھلک دیکھنے کی خواہش تھی
سات پردوں سے جب وہ نکلا تو
تھرا کر میں ہو گیا بے ہوش!

●

تم سنبھالو کمین دنیا کو
میرے حصے میں خواب آئے ہیں

●

دشتِ مشرق میں ہوا کی سائیں سائیں
رات کے پچھلے پہر دل میں چھپن لے نام سی
دربدر پھرتا، بھٹکتا، اک ہیولیٰ؛
ہوشیار!

●

مری جانِ جاں،
بھولے بسرے کسی گیت کا بول کوئی
(تصور میں گم)
گنگناتی ہوئی
اون کا ایک گولہ سنبھالے
کئی دن سے کچھ بُن رہی ہے

●

تم بھی کتنے شریف انساں ہو
سادہ لوحی کا شک گزرتا ہے!

●

میرا مشکیزہ رِس رہا ہے مگر
سعی کرتی ہے تشنگاں کے لیے
اب یہی ہیں مرے رکوع و سجود

●

قصرِ اجر کے طاقِ زرّیں میں
اپنی خلعت اُتار کر کچھ دیر
اپنی غربت کا جامہ پہنوں گا

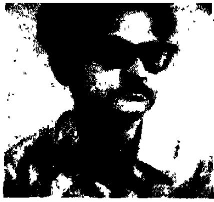
●

میں نے کھود لیے اپنے کھیتوں میں
چاہِ شیریں درخت کے نیچے
تم بھی اے آسماں نپی بھیڑ ملا کر

سیکٹر 1144/12، آر کے پورم، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۲



غزلیں



تسنیم فاروقی

مجرم ہوں چاہتوں کا وفا کی سزا ہوں میں
میری خطا یہ ہے کہ تجھے چاہتا ہوں میں

اس شہر کو قریب سے پہچانتا ہوں میں
اکثر یہاں خرید کے بیچا گیا ہوں میں

ایسے تو یہ جہاز کہیں ڈوب جائے گا
ہر شخص کہہ رہا ہے کہ بس ناخدا ہوں میں

اب میرے اس کے بیچ میں منظر نہیں کوئی
وہ دیکھتا ہے مجھ کو اُسے دیکھتا ہوں میں

اے زندگی کی دھوپ بڑا امتحاں نہ لے
دریا کے ساحلوں پہ بھی پیاسا رہا ہوں میں

تیرے لبوں کو چھوڑ کے ہر شے ہے مثلِ سنگ
میں سب کو چھُو کے دیکھ چکا ہوں ہوا ہوں میں

اے رہنما میں تیرے سفر کی شناخت ہوں
پتھریلی وادیوں میں ترا نقشِ پا ہوں میں

جو چاہتے تھے مجھ کو وہ رکھتے نہیں ہیں پاؤں
شیشہ ہوں میکدے کی گلی میں پڑا ہوں میں

تسنیمؔ اس کے غم سے قلم کی ہے زندگی
لفظوں کے دائرے میں اسے سوچتا ہوں میں

تلسی داس مارگ، نزد ہاسپٹل، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۴

ندیم نیازی

تیری آنکھوں میں شبِ غم کا مجھے کاجل مِلا
آسمانِ آرزو پر دُکھ بھرا بادل مِلا

خواب سے پہلے مجھے تعبیر اس کی مل گئی
ڈھونڈتا تھا خواب میں جس کو وہی "سانول" مِلا

بھیگی شب شاید جوانی کے نشے میں چور تھی
بھیگی شب کا جو ملا جھونکا مجھے پاگل مِلا

تھی بیاباں میں مجھے کس نقشِ پا کی جستجو
بچھڑی رُت کا لمحہ جو مجھ کو ملا بے کل مِلا

رُت جگے کی جاگتی آنکھوں کے سپنے خوب تھے
اُڑتے خوابوں کا مجھے تعبیر میں آنچل مِلا

خون رُلوائیں گے کب تک زندگی کے تجربے
دوستی کے سلسلے میں جسم سب کا شل مِلا

زندگی کو کب ملے گی روشنی آخر ندیمؔ
فکرِ مستقبل سے ہر اک شخص جب بے کل مِلا

ساحل احمد

کُند موسم ہے رفاقت کیا کروں
نذرِ پھولوں کی لطافت کیا کروں

ہر گھڑی تو گر رہی ہیں بجلیاں
آسماں کی میں حمایت کیا کروں

خار میں نے خود چُنے ہیں باغ سے
موسموں کی اب شکایت کیا کروں

سرحدِ ادراک پر جو گُل کھلا
اب یہاں اس کی صراحت کیا کروں

منہدم ہونا مقدر ہے مرا
میں بنا کر یہ عمارت کیا کروں

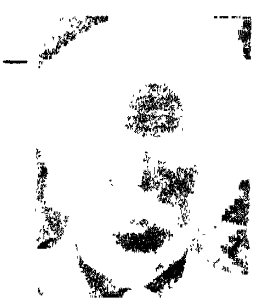
ہم نوا اب تک نہ کوئی مل سکا
اپنی یادوں کی سفارت کیا کروں

خشک کتنا ہو گیا موسم تمام
میں خزاں کی اب ادارت کیا کروں

بن چکی ہے زندگی سبھی داشتہ
میں اَنا کی اب حفاظت کیا کروں

کیوں خموشی ہے مسلط ان دنوں
تم پہ ساحلؔ میں وضاحت کیا کروں

صدر شعبۂ اردو، الیوننگ کرسچین کالج، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳



غزلیں



ف س اعجاز

کھلے دل کھلے موسموں جیسے بچے
ہرا دھوپ کی سرگموں جیسے بچے

فرشتوں سا لب پر تبسم سجائے
پیانو کی میٹھی دُھنوں جیسے بچے

گلہری پکڑنے کی دُھن میں مگن ہیں
درختوں تلے پاگلوں جیسے بچے

سرِ شام آنگن میں بیٹھے ہیں پڑھنے
غریبوں کے گھر کے دِیوں جیسے بچے

یہی کل کی دنیا کے سورج بنیں گے
مرے عہد کے جگنوؤں جیسے بچے

صداقت کے نیلے گگن میں اُڑیں گے
دُعاؤں کے اُجلے پروں جیسے بچے

یہی اشک پونچھیں گے سارے جہاں کے
دُکھی ماؤں کے آنچلوں جیسے بچے

کبھی بے سبب اپنے سایوں سے ڈرتے
دبے خوف کی آہٹوں جیسے بچے

امروز قمر

تہمتوں کے لیے اسباب مہیا مت کر
راہ چلتے ہوئے مڑ کر مجھے دیکھا مت کر

درد بویا ہے تو اب کاٹ دُکھوں کی فصلیں
میں نہ کہتا تھا کہ زخموں کو کُریدا مت کر

خاک چھانے گا مرے ساتھ کہاں در در کی
لوٹ جا گھر کی طرف جا مرا پیچھا مت کر

میں بچھڑ جاؤں گا تجھ سے تو بہت دُکھ ہوگا
اتنی شدت سے مری جاں مجھے چاہا مت کر

سوچ لے! چاہنے والا ترا پردیس میں ہے
شام کے وقت پرندوں کو اُڑایا مت کر

نیاز جیراجپوری

داستاں تحریر کرتی رہ گئی اپنی ہوا
صفحۂ آبِ رواں پر اور کیا لکھتی ہوا

آ کے یہ جلتے چراغوں کو کبھی کر جائے گُل
اور کبھی آکر کھلائے غنچہ و گُل بھی ہوا

پھڑ پھڑاتی خواہشِ پرواز بال و پر میں ہے
ہو گئی ہے ان دنوں دشمن پرندوں کی ہوا

گاؤں چھوڑو گے تو یہ احساس بھی ہو جائے گا
سانس لینے کو کبھی شہروں میں نہیں ملتی ہوا

کیا کسی نے رکھ دیا دہلیز پر روشن دیا
تیز اتنی تیز پہلے تو نہ چلتی تھی ہوا

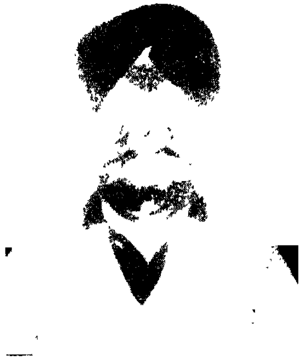
کیا صدائے برگِ زرد و خشک سنتی ہی نہیں
شاخساروں کی طرف کیوں رُخ نہیں کرتی ہوا

پہلے تو خوابِ گُلِ خوش رنگ دکھلائے بہت
اور پھر شاخِ شجر سے دیر تک اُلجھی ہوا

اے نیاز ان مہینوں کے شہر میں ڈھونڈیں کہاں
رقص کرتی کھیت کھلیانوں میں ساون کی ہوا

مدیر ماہنامہ "انشاء" ۶ اے کناٹی سیل اسٹریٹ کلکتہ ۷۰۰۰۷۳
عرفی کلینک، سرائے میاں، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
عالم میڈیکل ہال، پہاڑی پور، اعظم گڑھ ۲۷۶۰۰۱

رتن سنگھ



جنگل اُداس ہے

آدی باسیوں کی اس ٹولی کے پاؤں جنگل میں ایک ساتھ موروں کی ٹولی کو دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ موروں کی ٹولی میں وہ ایک مور جو سب سے آگے تھے، وہ بار بار اپنی گردنیں اکڑا ے اوپر آسمان کی طرف دیکھتے ہوتے، اپنے پنجے بھی نیچے اوپر اٹھا رہے تھے۔ آدی باسیوں کو لگا جیسے وہ سب کے سب ایک ساتھ ناچنے کی تیاری کر رہے ہیں۔

اوپر آسمان پر کالے بادلوں کے جھنڈ حرکت میں تھے۔ بادلوں کی ٹولیاں اُمڈ اُمڈ کر یوں آرہی تھیں جیسے ایک دوسری سے چہل کر رہی ہوں اور اس طرح ہر بیتے ہوتے پل کے ساتھ گھٹا اور گھنگھور ہوتی چلی جارہی تھی۔ بادلوں کے آپس میں ٹکرانے سے کبھی کبھی ان کی گرج چاروں طرف گونج جاتی تو لگتا تھا جیسے بھگوان شیو نے اپنا وشال روپ دھارن کر کے کسی پہاڑ کی تیکھی نوک دار چوٹی پر مستی میں آکر ناچنا شروع کر دیا ہو اور ان کے لمبے کالے بال افق تا افق بادل بن کر پھیل گئے ہوں اور ان کے ڈمرو کی آواز بادلوں کی گرج بن کر کبھی یہاں گونج اٹھتی کبھی وہاں۔

ایسے میں اس دھرتی پر بھی ہوا، دھیرے دھیرے چلنے لگی تھیں جنگل کے پیڑوں کی شاخوں کی سرسراہٹ سے جو سنگیت پیدا ہو رہا تھا، اس کی لے ہر پل ہوا کی تیزی کے ساتھ تیز ہوتی جارہی تھی۔ لگتا تھا جیسے قدرت کی اِن بیٹیوں نے رنگ برنگی پوشاک پہن کر بادلوں کی تال میں ناچنا شروع کر دیا تھا۔ جیسے جیسے ہوا کی لہروں میں تیزی آتی ان شوخ حسیناؤں کے پاؤں کی تھرکن بھی اور بڑھ جاتی۔

ایسے میں مور بھلا کیوں پیچھے رہ سکتے تھے۔ سب سے اگلے والے مور کے پاؤں میں تھرکن پیدا ہوئی تو پھر سب موروں کے پاؤں اس پر تال دے اٹھے۔ آہستہ آہستہ ان کے پنکھ یوں کھلنے اور پھیلنے لگے جیسے قدرت نے اپنی تمام رنگینیوں کو ساری خوبصورتی کو ان موروں کے پنکھوں میں بکھیر دیا ہو۔ قدرت نے موروں کے پھیلے ہوتے پنکھوں پر اپنے انمول خزانے سے بہترین ہیرے اور جواہرات نکال کر ٹانک دیتے تھے اور جیسے ہی موروں کے پنکھ پھیلتے ویسے ہی ان ہیرے موتیوں کی چمک بجلی کے کوندے کی طرح ساری فضا میں بکھر جاتی۔

ایسے میں آدی باسیوں کو پتہ ہی نہ چلا کہ ان کے ہاتھ آپس میں کب جڑ گئے۔ کب انھوں نے گول دائرہ بنا کر سارے جنگل ساری دھرتی کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور کب انھوں نے ناچنا شروع کر دیا۔ دھرتی کے ان بیٹوں پر قدرت نے جادو سا کر دیا تھا۔

ایسا لگتا تھا جیسے گھنے بادلوں، ہوا کی لہروں کی تال پر جھومتی ہوئی پیڑوں کی شاخوں، موروں کے تھرکتے بکھرتے ہوتے پنکھوں اور ناچتے ہوتے آدی باسیوں کے قدموں اور ان کے گیتوں کے بولوں میں ایک تال میل سا پیدا ہو گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایسا سماں بندھ گیا تھا جیسے سارا آسمان، ساری فضا، سارا جنگل، ساری دھرتی، ساری کائنات جھوم اٹھی تھی، ناچ اٹھی تھی۔

پاس ہی جھیل کے پانیوں میں بھی زندگی پیدا ہو گئی تھی۔ پانی کی لہروں سے اوپر اٹھتے ہوتے بند کنول یوں کھل اُٹھے تھے جیسے قدرت کے چاروں طرف بکھرے ہوتے حسن کو دیکھنے کے لیے انھوں نے آنکھیں کھول دی ہوں۔ وہ بھی جھومنے لگے، ناچنے لگے۔

یہ ناچ اس وقت تک چلا جب تک قدرت اپنی موج میں رہی۔ اور جب ناچتے ناچتے قدرت کا من بھر گیا تو کائنات کا یہ ناچ بھی ختم گیا۔ سرسراتی ہوا تھم کر پیڑوں کی ٹہنیوں پر بیٹھ کر آرام کرنے لگی۔

۲۴ گیان شکتی نگر، نرمدا روڈ، جبلپور ۔ ۴۸۲۰۰۸

ٹہنیاں بھی ہل جل نہیں رہی تھیں تاکہ ہوا کے آرام میں خلل نہ پڑے۔ دور آسمان پر بادلوں کی گھٹا اب پھیکی اور پتلی سی ہوکر سارے افق پر چت لیٹ گئی۔ ان میں اب کوئی حرکت نہیں تھی۔ موروں کے پاؤں بھی تھم گئے تھے اور وہ بھی اپنے پنکھ سمیٹ کر دانہ دُنکا چگنے لگے تھے۔

ایسے میں ان آدی باسیوں کے پاؤں بھی تھم گئے سب نے اپنی اپنی ٹوکریوں میں رکھی چاولوں کی پوٹلیاں کھولیں اور چٹنی ملاکر کھانے لگے کھانے کے بعد انھوں نے چاولوں کی شراب پی اور پھر وہ بھی آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔

لگتا تھا جیسے ساری کائنات تھم گئی تھی۔ آرام کر رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی کا عالم تھا، پیڑ خاموش تھے سارا جنگل خاموش تھا، ہوا خاموش تھی، دور افق پر، پہاڑوں کی چوٹیوں پر بیٹھے بادل خاموش تھے۔

کہیں کوئی حرکت تھی تو صرف اتنی کہ رنگ برنگی تتلیاں اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے جنگلی پھولوں پر تیرتی پھرتی تھیں۔ کبھی اڑکر یہاں بیٹھتیں کبھی وہاں۔ یا پھر کوئی گلہری ایک پیڑ سے اترتی اور چوکنی سی اِدھر اُدھر دیکھتی دوسرے پیڑ پر چڑھ جاتی۔

ایسے میں پیڑوں کے پنچھی بھی اپنے اپنے گھونسلوں میں اپنی چوزوں کو اپنے پنکھوں میں دباتے آنکھیں میچے پڑے تھے۔

جنگل کی یہ خاموشی کافی دیر تک قائم رہی۔

کچھ وقت گزرنے کے بعد ہوا پھر سے دھیرے دھیرے چلنے لگی تو جیسے سارا جنگل انگڑائی لے کر جاگنے لگا۔ ٹہنیوں کے بیچ سے سرسراتی ہوا نے جیسے ایک نغمہ چپکے سے چھوڑ دیا تھا، جو لمحہ لمحہ بڑھتا ہوا سارے جنگل میں ایک ایسی لطیف سی میٹھی آواز پیدا کر رہا تھا۔ جیسے دریا کی لہریں آپس میں ٹکراتی ہوئی گنگناتی ہیں۔

اِس نغمے کو سن کر پنکشی بھی چہچہا اٹھے تھے اور ان کے مدھر سنگیت کو سن کر آدی باسی کی ٹولی کے کچھ لوگ اٹھ کر بیٹھ گئے تھے اور باقی لیٹے لیٹے ہی آنکھیں کھولے، ٹانگیں پسارے کسمسا رہے تھے اور اٹھنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

جہاں یہ آدی باسی بیٹھے یا لیٹے تھے وہاں ان کے قریب ہی ایک شیر دھیرے دھیرے چلتا ہوا اور ان آدی باسیوں کی بو کو سونگھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ تبھی ایک ہرن آدی باسیوں کی ٹولی کے پاس سے ہوتا ہوا ادھر کو جانے لگا جدھر شیر گیا تھا تو ایک آدی باسی نے ذرا سا ہاتھ بڑھاکر ہرن کی ٹانگ پکڑ لی۔

"ادھر کہاں جاتا ہے۔ تیرا باپ ابھی ابھی ادھر سے گیا ہے۔ اُس نے دیکھ لیا تو کچا چبا جائے گا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ہرن کا منھ دوسری طرف کر کے اسے چھوڑ دیا۔

لیٹے لیٹے ہی ایک آدی باسی کی نظر ایک پیڑ کی ٹہنی پر گئی۔ اس ٹہنی کو اپنے بلوں میں جکڑے ہوئے ایک بہت بڑا سانپ، اپنے سر کو اِدھر اُدھر جھلاتا ہوا مستی کے عالم میں جھوم سا رہا تھا۔

اس سانپ کو دیکھتے ہی ایک آدی باسی نے اپنا تیر کمان سنبھالا تو دوسرے آدی باسی نے اس کے نشانے کو بھانپتے ہوئے اسے تیر چلانے سے منع کر دیا۔

"جو اپنی طرف بُری نظر سے نہ دیکھے اس پر تیر چلانے سے پاپ لگتا ہے۔"

پہلے آدی باسی نے اپنی کمان واپس زمین پر رکھ دی۔

جنگل کی دنیا اب پوری طرح بسی بسائی سی لگ رہی تھی۔

سرسراتی ہوا گیت گا رہی تھی۔

پنکشی چہک رہے تھے، کلول کر رہے تھے۔

ایک پیڑ کی ٹہنی پر سانپ جھول رہا تھا۔

جنگلی جانور اپنے چوگے کی تلاش میں چوکنے سے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ آدی باسیوں کی ٹولی کے سبھی آدی اپنا اپنا سامان اپنی ٹوکریوں میں بھر رہے تھے کہ ایک آدی باسی کی نظر اوپر ٹہنیوں کی آڑ میں بنی ایک پیڑ کی کھوہ کی طرف گئی اور وہ مسکرانے لگا۔

"کیوں مسکرا رہے ہو؟" دوسرے آدی باسی نے پوچھا۔

اس نے پیڑ کی اس کھوہ کی طرف اشارہ کردیا۔

وہ آدی باسی بھی مسکرانے لگا۔ وہاں ایک طوطا اپنی طوطی سے چہلیں کر رہا تھا۔

دور مور اور مورنیاں ایک دوسرے کے ساتھ قدم سے قدم ملاکر یوں دھیرے دھیرے چل رہے تھے جیسے لڑکے لڑکیوں کی ٹولیاں کسی سہانے موسم میں آپس میں باتیں کرتے ہوئے عشق و محبت کی نئی داستانوں کی داغ بیل ڈال رہے ہیں۔

تبھی آسمان میں ایک چنگار سی اٹھی۔

پیڑوں کی اوپری شاخوں پر بیٹھی ہوئی ننھی ننھی چڑیوں پر چیلوں کا ایک گروہ جھپٹ پڑا تھا۔ اس حملے کے ساتھ ہی جنگل کا وہ حصہ چڑیوں کی چیخ و پکار سے گونج اٹھا۔

کچھ پنکشی اِدھر اُدھر چکّر کاٹتے ہوئے چیں چیں ٹیں ٹیں کہہ رہے تھے۔ دوسرے پنکشی گھبراتے ہوئے کبھی اس ٹہنی پر بیٹھتے کبھی پھر سے اُڑکر دوسری ٹہنی پر پہونچ جاتے۔ انھیں کہیں بھی چین نہیں پڑ رہا تھا۔

کچھ بندروں کی ٹولیاں پتہ نہیں اس وقت کہاں سے آگئیں۔ وہ اپنے بچوں کو سینے سے چپکاتے پیڑوں کی اونچی ٹہنیوں پر پہنچ کر غرّانے لگے جہاں چیلوں کا گروہ منڈرا رہا تھا۔

نیچے ٹہنی پر جھولتے ہوئے سانپ نے خطرے کو بھانپ کر زور زور سے پھنکار مارنی شروع کر دی تھی۔

زمین پر گلہریاں پھدکتی ہوئی کبھی ادھر کو بھاگتیں، کبھی اُدھر کو۔ انھیں کسی طرح چین نہیں پڑ رہا تھا۔

کچھ ہرن سہم کر تھوتھنیاں اٹھاتے کبھی اوپر کی طرف دیکھتے اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتے بھرتے

...دو لے تھے اور پھر اسی پیڑ کے نیچے آکر جمع ہو جاتے جس کے اوپر چیلیں منڈلا رہی تھیں

ایک تتلی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا اور وہ گھبراہٹ میں پھول کے بجائے کانٹوں پر جا بیٹھی۔ اس کے پنکھ کانٹوں میں بری طرح اُلجھے تھے اور وہ کانٹوں کی پکڑ سے آزاد ہونے کے لیے چھٹپٹا رہی تھی۔

آدی باسی بھی اپنے اپنے تیر کمان اٹھائے ایسی جگہوں کی تلاش کر رہے تھے جہاں سے ان چیلوں کو نشانہ بنایا جا سکے۔

مور بھی کٹ کٹ کرتے ہوئے اپنے پنکھ سمیٹ رہے تھے اور گردن اٹھا اٹھا کر آسمان میں اُدھر دیکھ رہے تھے جہاں زندگی موت کے اس اچانک حملے سے بچنے کے لیے سرگرداں تھی۔

بھگوان شو نے جیسے اور روپ دھارن کر لیا تھا۔ تبھی تو بادل بن کر بکھرے ہوئے ان کے بالوں میں بجلی کڑکنے لگی تھی۔

موت کا یہ کھیل چند پلوں کے لیے چلا تھا جس میں چیلیں پانچ چڑیوں کو اپنے پنجوں میں دبا کر لے گئی تھیں اور ان کی چیخیں ادھر سے سُنائی دے رہی تھیں جدھر کو چیلوں کا گروہ اڑتا ہوا گیا تھا۔

ایک چڑیا زخمی ہو کر وہاں جا گری تھی جہاں تھوڑی دیر پہلے مور ناچ رہے تھے۔

ایک آدی باسی بھاگ کر اس چڑیا کو زمین سے اٹھا کر لے آیا۔ لیکن اس کی ہتھیلی پر بیٹھے بیٹھے ہی چڑیا نے دم توڑ دیا۔

آدی باسی اپنی ہتھیلی پر کافی دیر تک چڑیا کے تڑپنے کے درد کو سمیٹے رہا۔

زندگی کے اس درد نے جنگل کی زندگی کو اس حد تک دردناک بنا دیا تھا کہ پھدکتی گلہریاں سہم کر پیڑوں کی جڑوں میں جا چھپی تھیں۔

...ڈال تک کر ٹہنی سے لپٹا ہوا سانپ بھی اپنے پھن کو ٹہنی پر ٹکاتے بے دم سا ہو گیا تھا۔

ہرن گھاس چرنا بھول کر گردنیں لٹکائے سہمے ہوئے کھڑے تھے۔

کانٹوں میں الجھی ہوئی تتلی، سپٹاتے ہوئے کانٹوں میں ہی اُلجھ کر رہ گئی تھی۔ اس نے بھی دم توڑ دیا تھا۔ باقی تتلیاں بھی اڑنا بھول کر جہاں تھیں، وہیں چپک کر رہ گئی تھیں

اتنے میں سہمی ہوئی قدرت نے جیسے پھر سانس لی۔

ہوا پھر چلنے لگی۔

ہوا کے چلتے ہی جنگل کی ٹہنیوں میں سرسراہٹ شروع ہو گئی۔

اس سرسراہٹ نے جنگل کی فضا میں پھر سنگیت چھیڑ دیا۔

دُور افق پر بادلوں کے پرے کے پرے آئے اور گھنگھور گھٹا بن کر سارے آسمان پر پھیل گئے۔

یہ فضا پہلے سے زیادہ خوبصورت، زیادہ لطیف، زیادہ رنگین تھی۔

موروں نے افق تا افق پھیلی ہوئی گھنگھور گھٹاؤں کی طرف دیکھا اور پھر نظریں نیچی کر لیں۔ آدی باسیوں نے جھومتی ہوئی پیڑوں کی شاخوں کی طرف دیکھا اور پھر کانٹوں میں الجھی ہوئی تتلی کی طرف اور بجھے بجھے من سے انھوں نے اپنی ٹوکریاں اٹھا کر اپنی اپنی پیٹھ پر لاد لیں۔

وہی سرسراتی ہوئی ہوا تھی،

وہی گھنگھور گھٹائیں۔

پہلے سے بھی زیادہ میٹھی اور حسین۔

لیکن جنگل اُداس تھا۔ اس کی ٹہنیوں سے میٹھے گیت نہیں بلکہ ماتم کی اداس لہریں اٹھ رہی تھیں۔

آدی باسی سر جھکائے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔

مور اور مورنیاں اپنے پنکھوں میں زندگی کا حسن سمیٹے ناچنا بھول کر اداس کھڑے تھے۔

اور تو اور جھیل میں کھلے ہوئے کنول کے پھولوں نے جنگل کو اداس دیکھ کر اپنی پتیاں سمیٹ لی تھیں اور اُداس اداس سے موت کی گھنگھور کالی گھٹاؤں کو گھور رہے تھے۔

بقیہ: پہاڑ ٹوٹ رہا ہے

سر پر جھکا دیکھ کر گھگھیانے لگا۔

"گھبراؤ نہیں۔ ڈرو نہیں۔ یہ لو پہن لو" ہیڈ نے اپنا ہیلمٹ سر سے اتار کر میرے سر پر رکھ دیا۔

" Sir! اگر یہ ہیلمٹ بھی ٹوٹ گیا تو؟"

" تو پھر دوسرا، پھر تیسرا... پھر... پھر...

" اس کے بعد؟"

" اس کے بعد پھر یہی کہ تمہاری زندگی کی یہی سیکورٹی ہے۔ اس کے بغیر ہم سب نامکمل ہیں"۔ ہاں تو اب اگر آپ میرے سر سے میرا ہیلمٹ اتار لیں تو اس کے نیچے آپ کو میرا سر نہیں ملے گا کہ سر کا ہونا ہی عذاب تھا۔ اب راوی چین لکھتا ہے۔!!!

بقیہ: ملاحظات

بنانے سے نہیں بنتا۔ وہ ۶ جنوری ۱۹۲۵ء کو کپورتھلہ میں پیدا ہوئے تھے۔ کپورتھلہ سے دہلی تک ——— ڈیرہ بابا نانک، لاہور، جالندھر، سری نگر اور الہ آباد ——— ان کی زندگی کے کئی سفر اور کئی پڑاؤ تھے۔

انہوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز نامہ نگاری اور کالم نگاری سے کیا۔ ریڈیو اور دوردرشن کے سینیئر سیاسی مبصر رہے۔ ۱۹۵۹ء میں احمد رشید شروانی کے ساتھ مل کر ہفت روزہ "دوست" جاری کیا۔ ۱۹۷۰ء میں ایک نیوز ایجنسی پریس ایشیا انٹرنیشنل کے نام سے قائم کی۔

ادبی زندگی کا باضابطہ آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔

ان کی ادبی تصانیف میں: بچوں کا ناول "ستاروں کے قیدی" (۱۹۵۸ء) افسانوی مجموعے "محبت کا مطلب" (۱۹۸۷ء) اور "دہشت" (۱۹۸۹ء) اور ناول "فرار" (۱۹۸۷ء)۔ اس کے علاوہ انگریزی میں سیاسی موضوعات پر آٹھ کتابیں شائع ہوئیں۔

ادارہ متعلقین کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعائے مغفرت کرتا ہے۔



شوکت حیات

ہمدردی

تیز رفتار ٹرین اپنی منزل کی جانب بھاگ رہی تھی۔

تاریک رات میں انجن کی آواز اور پہیوں کی چھک چھک کچھ عجیب پُراسرار فضا پیدا کر رہی تھی۔

تھری ٹائر کمپارٹمنٹ کی تیسری بوگی میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ریلوے میں اپنی نوعیت کا واحد ٹی ٹی ای چھابڑہ اپنے ایماندارانہ اصولوں میں کٹر تھا۔ اس کے زور زور سے بولنے کی آواز ٹرین کے شور میں بھی پوری بوگی میں سنی جا سکتی تھی۔ ابھی ابھی اُس نے سارے مسافروں کے ٹکٹ اور برتھ کی چیکنگ کر کے اپنی فہرست مکمل کی تھی۔ ساٹھ میں سے صرف پانچ سیٹیں ایسی تھیں، جن کو بُک کرنے والے مسافر سفر نہیں کر رہے تھے۔ ان پانچ سیٹوں کے لیے ایک ہجوم ٹی ٹی ای کے آگے پیچھے تھا ـــــ ہاتھوں میں ٹکٹ اور روپے لیے ہوئے برتھ کے لیے گڑگڑا رہا تھا۔ کوئی چھابڑہ کے کانوں میں پھسپھسا کر اپنا مدعا بیان کر رہا تھا۔ کوئی اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اُسے اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔

ان مسافروں کو چھابڑہ کے اصولوں کے بارے میں کیا معلوم۔ وہ تو بس سونے کے لیے برتھ حاصل کرنے کے چالو طریقے جانتے تھے اور اپنے طور پر سیٹ کے حصول کے سلسلے میں مطمئن تھے۔ چھابڑہ اپنے ہم پیشہ افراد سے مختلف تھا۔ اپنے سخت اصول اور رالموار کے لیے اُسے کئی بار مصیبتیں بھی اُٹھانی پڑی تھیں۔ غنڈہ اور شر انگیز عناصر سے سابقہ پڑنے پر نوبت دست درازی تک پہنچ جاتی تھی، لیکن چھابڑہ اپنے طریقۂ کار کے معاملے میں کبھی ٹس سے مس نہ ہوا تھا۔ پورے محکمے میں اپنی طرز کا وہ نرالا ٹی ٹی ای تھا۔ بوگی کے درمیان وہ کھڑا ہوا اور گلا صاف کر کے اپنی پاٹ دار آواز میں بولنے لگا:

"تمام مسافر متوجہ ہوں۔ آپ سب جانتے ہیں؛ رات بھر کا طویل سفر ہے۔ ہر آدمی برتھ حاصل کرنا اور آرام سے سونا چاہتا ہے۔ لیکن صرف پانچ سیٹیں ایسی ہیں جن کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے۔ ویٹنگ لسٹ میں دو نام ہیں۔ وہ اگر موجود ہوں تو میں اُنہیں الاٹ کر دوں گا۔"

لوگ انجن کے شور میں چھابڑہ کی باتوں پر پورے طور پر متوجہ تھے۔ کوئی لفظ سماعت کے پردے سے پھسل نہ جائے۔ چھابڑہ پوری توانائی کے ساتھ بلند آواز میں بول رہا تھا:

"معزز مسافرو! میرا کام کرنے کا اپنا طریقہ ہے۔ میں پانچ برتھ خالی نہیں رکھوں گا بلکہ آپ میں سے پانچ افراد کو دوں گا۔ کسی کے چہرے پر لکھا نہیں ہوتا کہ آدمی کیسا ہے۔ میرے اوپر ریزرو برتھ کے تمام مسافروں کے مال و اسباب کی پاسبانی کی ذمہ داری ہے۔ پانچ مسافروں کے علاوہ باقی لوگوں کو میں اگلے اسٹیشن پر اتار دوں گا۔ جن کی برتھ ریزرو نہیں ہے، وہ لوگ جنرل بوگی میں جائیں گے!"

مجمع میں کھلبلی مچ گئی۔ اس ٹرین میں عموماً لوگ پہلے سے ریزرویشن نہ ملنے پر بھی کسی نہ کسی طرح سوتے جاگتے اپنی منزل تک پہنچ جاتے تھے۔ جنرل بوگی میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ اگر اس سخت آدمی نے واقعی اپنے اعلان پر سختی سے عمل کیا تو آگے کے سفر کا خدا ہی مالک ہے ـــــ لوگ سوچ کر پریشان ہو رہے تھے۔

چھابڑا نے ویٹنگ لسٹ کے دونوں ناموں کو پکارا۔ دو آدمی بھیڑ کا سینہ چیرتے ہوئے آگے آئے۔ اُنہیں تو جیسے صحرا میں چشمہ مل گیا تھا۔ چھابڑا نے رسید کاٹ کر انہیں برتھ نمبر بتایا۔ اب تین کی گنجائش رہ گئی تھی اور کم از کم ڈیڑھ درجن افراد اس کے لیے ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ چھابڑہ نے کہا کہ وہ ان تین برتھوں پر عمر رسیدہ لوگوں کو جگہ دے گا۔ اُس نے ایک ایک کر کے کھڑے ہوئے مسافروں کو گھورنا شروع کیا۔ تین بوڑھوں سے ریزرویشن چارج

ڈاکٹر مہابیر بھون، مہندرو، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶

لینے اور رسید دینے کے بعد ایسا لگا جیسے چھابڑا کے سر کا بہت بھاری بوجھ ہٹ گیا۔ مجمع کے نوجوان اور ادھیڑ افراد اداس ہو گئے اور انہوں نے خشمگیں نگاہوں سے چھابڑا کو گھورنا شروع کیا۔ چھابڑا نے کہا:

"معاف کرنا مسافرو! اب بچے ہوئے لوگ اگلے اسٹیشن پر اُترنے کے لیے تیار رہیں!"

جیسے جیسے اگلا اسٹیشن قریب آ رہا تھا، مسافروں کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ جنرل بوگی میں ٹھیک سے کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہیں ملے گی۔ کچھ یہ سوچ کر پُر اُمید ہوئے کہ وہ کسی دوسرے تھری ٹائر کمپارٹمنٹ میں جگہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ کوئی ضروری تو نہیں کہ اس بوگی میں بھی ایسا ہی سخت ٹی ٹی ای ہو۔ اگلا اسٹیشن آیا اور چھابڑہ سبھوں کے پیچھے پڑ گیا۔ سب کے سب اُترنے لگے مگر ایک مسافر لنگڑاتے ہوئے گیٹ تک جا کر واپس اندر آ گیا۔ اس کے چہرے پر عجیب اذیت ناک کیفیتیں تھیں۔ ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ سخت عذاب میں مبتلا ہو۔ وہ چھابڑا کے آگے گڑگڑانے لگا۔

"دیکھیے صاحب، میرے پاؤں میں موچ ہے۔ میں لنگڑاتے ہوئے بڑی مشکل سے چل رہا ہوں۔ مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ میں اُتر کر دوسری بوگی میں سوار ہو سکوں۔ دوستوں نے سہارا دے کر اس بوگی میں سوار کر دیا تھا۔ کلکتہ میں دوست لوگ آئیں گے اور مجھے اُتار دیں گے۔ میرے ساتھ رعایت کیجیے اور مجھے کسی بھی طرح ایڈجسٹ کر دیجیے۔ اگر میری ٹانگوں پر زیادہ زور پڑا تو میری ہڈی ٹوٹ بھی سکتی ہے۔" چھابڑا کو تو روز ایسے معاملوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے کچھ سوچا اور پھر بولا۔

"میں اپنی سیٹ پر ایک ضعیف انسان کو جگہ دے چکا ہوں۔ اگر کوئی مسافر تمہیں اپنی ذمہ داری پہ اپنی برتھ پر بیٹھنے کی جگہ دے دے تو میں تمہاری ٹانگ کی مجبوری کے تحت رعایت کر سکتا ہوں۔"

اس نوجوان نے بڑی بے بسی سے مسافروں کا جائزہ لیا۔ بھلا کون اس کے لیے زحمت کر سکتا تھا۔ چھابڑہ نے کہا کہ وہ خود سبھوں سے پوچھ لے۔ نوجوان کی درخواست پر لوگوں نے انکار میں سر ہلانا شروع کیا۔ اب وہ مایوس ہو چکا تھا۔ اچانک ایک ضعیف نے دُھند میں دیکھتے ہوئے اُسے اپنی برتھ پر بیٹھنے کی پیش کش کی۔ نوجوان کو جیسے کوئی خزانہ مل گیا۔ پیروں میں تکلیف رہتے ہوئے بھی لپکتے ہوئے وہ اس بوڑھے کے پاس گیا اور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے عاجزی سے گڑگڑانے لگا۔

"آپ کا احسان ہے کہ آپ نے مجھ پر رحم کیا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ!"

"دیکھو بیٹے یہ احسان نہیں۔ ایک ضرورت مند نے دوسرے ضرورت مند کی مدد کی ہے۔ حساب برابر ہے۔ میں اپنی تنہائی سے گھبرا رہا تھا۔ یوں بھی ٹرین میں مجھے نیند نہیں آتی۔ آنکھ کے عارضے میں مبتلا ہوں۔ تم بھی تکلیف میں مبتلا ہو۔ ہم دونوں مصیبت کے ماروں کو ایک دوسرے کی راحت کا خیال ہونا چاہیے......!"

"بہت بہت شکریہ بابا!"

"آؤ...... بیٹھ جاؤ.....!"

نوجوان، بابا کے پاؤں کی جانب بیٹھ گیا۔ بابا سمٹ کر اوپر کی جانب کھسکتے ہوئے آدھے ہو گئے۔ چھابڑہ مطمئن ہو کر ریزرویشن چارٹ دیکھنے لگا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں بابا؟"

"وہیں۔ جہاں سے آگے یہ ٹرین نہیں جاتی۔ کلکتہ۔ بڑی مجبوری ہے۔ ضرورت ہی ایسی آ پڑی!"

"کیسی ضرورت؟"

"میری آنکھوں میں روشنی بہت کم ہے۔ مجھے بہت ہائی پاور کے لینس کی ضرورت پڑتی ہے۔ شیشے کی عینک سے کام نہیں چلتا۔ کلکتے کے ڈاکٹر نے کانٹیکٹ لینس لگانے کا مشورہ دیا تھا تاکہ پاور نہ بڑھے اور مجھے ٹھیک نظر آ سکے۔ شیشے کا چشمہ اتنے ہائی پاور میں ٹھیک ڈھنگ سے کارگر نہیں ہوتا۔ میں جس شہر میں رہتا ہوں، وہ غیر ترقی یافتہ شہر ہے۔ سچ پوچھو تو قصبہ ہے۔ ہمارے مُلک کے بیشتر شہر قصبے کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

"اور گاؤں مت پوچھو......!" بابا نے سرد آہ بھری۔ "ہمم...... تبھی تو میری آنکھوں کے کنٹیکٹ لینس گرد و غبار کی زد میں معینہ مدت سے پہلے دُھندلے پڑ جاتے ہیں اور مجھے برابر اس بڑے شہر میں جا کر انہیں بدلوانا پڑتا ہے۔"

"ہاں صاحب! قصبوں میں دھول بہت اُڑتی ہے۔ لوگ جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن بڑے شہروں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" نوجوان نے پوچھا۔

بابا کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ کمپارٹمنٹ میں ایک نقطے کی طرف اُداس آنکھوں سے گھورتے رہے۔ پھر بولے۔

"بڑے شہروں میں دھول نہیں اُڑتی۔ لیکن کارخانوں کی چمنیوں اور گاڑیوں کے دھوئیں سے فضا آلودہ ہو جاتی ہے۔ نئے بڑے شہر جنہیں تم مہانگر کہتے ہو، وہ آرام و آسائش کے معاملے میں جنت کا نمونہ ہیں۔ لیکن انہوں نے ہی قصبوں اور دیہاتوں کو جہنم بنا لیا ہے۔ شاید اسی لیے کسی نے کہا ہے......" بوڑھے نے محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور قدرے دھیمی آواز میں بولا: "شہر کو دیہاتوں سے گھیرو اور.....!"

"اور حملہ کرو.....!" "کیا خوب کہا انکل......!!" نوجوان ہنسا۔ "کاش آپ کی طرح ملک کے سارے بزرگ اس بات کو محسوس کرتے اور...... شاید تب اتنے برسوں کے بعد بھی چند گھنٹوں کے سفر میں برتھ کے لیے یہ آپا دھاپی نہ ہوتی.....!"

"کیوں....؟ دوسرے بوڑھے ایسا

نہیں کہتے...؟"

"دوسرے لوگ ڈرتے ہیں...... خاموش رہتے ہیں..... چپ چاپ تماشا دیکھتے ہیں...... بے حسی کی خطرناک بیماری کا شکار ہیں..... ہم نوجوان بولتے ہیں تو کہتے ہیں لوانڈین کی بات کی کیا اہمیت ہے.....؟ بہت سے موقعوں پر اگر ہم لوگ پریکٹیکل ہونے کا ثبوت نہ دیں تو اس ملک میں جینا محال ہو جائے!"

معمر، نوجوان کے شعور اور سوچنے کے انداز سے متاثر ہوا۔ بات بات پر پورے ملک کا حوالہ دینے کا جذباتی انداز اُسے پسند آیا۔ انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف قدم بڑھاتا ہوا رجحان معمر کی نظر میں خوشگوار تھا۔ اس نے نوجوان کو بتایا کہ وہ اس بڑے شہر میں اجنبی ہوگا۔ اگر وہ تھوڑا وقت دے سکے تو اسے آسانی ہو جائے گی۔ نوجوان نے اُسے وقت دینے کا وعدہ کیا۔ ساتھ ساتھ اسے اپنے مکان میں قیام کرنے کی پیش کش بھی کی۔

بیشتر لوگ اپنی اپنی برتھ پر سو چکے تھے۔ ٹرین غالباً کسی پہاڑی علاقے سے گزر رہی تھی۔ سنّاٹے میں اس کی آواز بے حد پُراسرار معلوم ہو رہی تھی ——— چھابڑا جاگ رہا تھا اور ان کی طرف دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ بوڑھے نے اپنے تھیلے سے لنچ بکس نکالا اور نوجوان کو بھی کھانے میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ کھانے کے دوران میں دنیا کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات پر تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ نوجوان کی گہری سوجھ بوجھ کی باتیں سن کر وہ عش عش کر اُٹھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ نئی نسل افکار کی سطح پر پرانی نسل سے کافی آگے بڑھ چکی ہے۔

کھانے کے بعد دونوں لیٹے ہی تھے کہ اچانک نوجوان کے منہ سے چیخ نکلی۔ آپ نے دھماکا سنا انکل؟"

"نہیں!" بوڑھا خوف سے اپنی جگہ پر اور سمٹ گیا۔ نوجوان اوراوپر کھسک آیا۔

"میں نے تو سُنا!" نوجوان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

چھابڑا ٹہلتے ہوئے وہاں تک آیا ——

"کیسا دھماکا بھائی.....؟"

"نہیں..... نہیں..... مجھے لگا" نوجوان بولتے بولتے چُپ ہو گیا۔

چھابڑہ نوجوان کے چہرے کو گھورتا ہوا اپنی سیٹ پر لَوٹ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

نوجوان کی نیند سے بوجھل آنکھیں دُور چلتے بجھتے مناظر میں اُلجھ گئیں۔ تیزی سے چلتا ہوا ایک ہاتھ رکشا سڑک کے بیچوں بیچ اُلٹا پڑا تھا۔ حادثے نے پرخچے اُڑا دیے تھے۔ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے سامنے چلچلاتی دھوپ میں نوجوانوں کی لمبی قطار۔ چوراہے پر ٹریفک جام ——— فٹ پاتھ پر نوجوان لیٹا تھا۔ اس کے نیچے فٹ پاتھ سو رہا تھا۔ فٹ پاتھ کے تارکول کے نیچے زمین سو رہی تھی۔ زمین کے نیچے، بہت نیچے پگھلے ہوئے پتھروں میں افراتفری مچی تھی ——— نکاسی کے لیے بے قرار، یہاں سے وہاں تک سر پٹکتا اور دھماکا کرتا پگھلا ہوا پتھر، دھماکا نوجوان نے سُنا۔ بوڑھے نے نہیں۔ چھابڑہ نے بھی نہیں۔ ہاتھ رکشے کو اُلٹتے ہوئے اور اس کے نیچے دب کر خون تھوکتے ہوئے رکشا چالک کو بھی نوجوان نے دیکھا۔ بوڑھے اور چھابڑہ نے نہیں۔ رکشا چالک کی اُکھڑتی ہوئی سانسوں کی آواز بھی صرف اُسی کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔

نوجوان کی پلکیں نیند کے بوجھ سے بند ہو رہی تھیں۔ جسم پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ نیم غنودگی کے عالم میں وہ بوڑھے کی باتوں پر ہاں ہوں کیے جا رہا تھا۔ سوتے جاگتے گپیں کرتے رات کا بیشتر حصہ گزر گیا تھا۔ منزل تک پہنچنے میں ابھی دیر تھی۔ نوجوان آدھی سے زیادہ جگہ میں پسر کر خرّاٹے لے رہا تھا۔ برتھ کے کونے میں سمٹے سکڑے بوڑھے نے بھی سونے کی کوشش کی، لیکن اُس کی دُھندلی آنکھوں میں نیند کا دُور دُور تک پتہ نہ تھا۔

آخر کار صبح ہو گئی۔ بوڑھے نے اُسے پیار سے اُٹھایا۔

"اُٹھو بیٹے..... شہر قریب ہے..... تم ذرا مت گھبرانا..... اسٹیشن پر تمہارا کوئی آدمی نہیں آئے تو فکر مت کرنا۔ میں تمہیں چلنے پھرنے اور ٹرین سے اُترنے میں سہارا دوں گا!"

اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔ ٹرین کی رفتار دھیمی پڑنے لگی تھی۔ نوجوان اُٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ اور پہلو بدل رہا تھا۔ بوڑھا اس کی بے چینی محسوس کرتے ہوئے بولا۔

"گھبراؤ نہیں بیٹے..... یہ تو اس سفر کا آخری اسٹیشن ہے..... اطمینان سے اُترنا!"

"گاڑی رُک گئی ——— بھیڑ دروازے کی طرف لپکی۔ ہر آدمی خواہ مخواہ عجلت میں تھا —— بوڑھے نے ایک ہاتھ سے تھیلا اُٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے نوجوان کو سہارا دیا۔ پیچھے پیچھے چھابڑہ تھا۔ گیٹ کے پاس آکر نوجوان جھٹکے سے نیچے کودا۔ بوڑھا چلّایا۔

"گِرا..... گرا بے چارہ.....!"

چھابڑہ کی تیز نگاہوں نے دیکھا؛ وہ نوجوان تیز قدموں سے چلتا ہوا بغیر پیچھے کی طرف دیکھے بھیڑ میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔ اُس نے بابا کا ہاتھ پکڑتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"جو گرا سو گرا..... آپ سنبھلیے بابا.....!"

چھابڑہ کے سنبھالتے سنبھالتے بھی بابا گر گئے۔ کراہتے ہوئے بڑی مشکلوں سے وہ دھیرے دھیرے اُٹھے۔ انہوں نے سامنے نگاہ دوڑائی —— غبار سا کو دُھندلے کانٹیکٹ لینس کے پیچھے ان کی متحیر اور نم آنکھیں تیز گام جم غفیر کو دھوئیں کے مرغولوں میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

••

ا رفیع

پہاڑ ٹوٹ رہا ہے

ہمارے سروں پر پہاڑ ٹوٹ رہا تھا۔
میں نے ــــ شاید سب نے یہ محسوس کیا
، ہمارے سروں پر پہاڑ ٹوٹ رہا ہے۔
صرف پہاڑ ٹوٹ رہا ہے؟
کیا اس کے نیچے ہمارے سر نہیں ٹوٹ
ہے ہیں؟
عجیب اُوٹ پٹانگ سے چھوٹ رہے ہیں
دں کے پٹاخے ــــ دھم، دھا دھم، دھم
یہ خیالوں کے پٹاخے نہیں ہیں۔ یہ تو سچ مچ
پٹاخے ہیں جو پہاڑ توڑنے کے کام آتے ہیں۔
ا ابھی میرے دفتر کا چپراسی چلاتا ہوا میرے
ے میں گھسا تھا

"صاحب کچھ ہو رہا ہے ہمارے سروں پر۔
ے دفتر کی چھت جہاں ختم ہوتی ہے اس کے
پہ اوپر کچھ ہو رہا ہے، پٹاخے چھوٹ رہے ہیں
نیلے شعلے لپک رہے ہیں۔ نہ جانے کیا کیا کچھ
ہا ہے اور نہ معلوم کیا کیا ہونے والا ہے۔
ے سروں پر۔" میں نے اسے ڈھارس
مائی: "چل کر دیکھتا ہوں ماجرا کیا ہے۔"
دفتر کی تین منزلیں طے کر کے چوتھی منزل

پر پہنچا تو میں نے بھی محسوس کیا کہ کچھ ٹوٹ رہا ہے۔
ٹھیک میرے سر پر کچھ ٹوٹ رہا ہے۔ روشن دان
سے شعلوں کی لپک صاف نظر آ رہی تھی۔ کچھ دیر
میں میرے اوپر بھی لرزا سا طاری ہونے لگا۔ اپنی
پانچوں انگلیاں سر پر پھیریں۔ سر سلامت تھا، دراصل
ترتیب جسم میں سر سب سے اوپر ہوتا ہے اس لیے
خطرات بھی اس کے لیے زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر مجھے
خیال آیا کہ کیوں نہ ہیڈ آفس سے دریافت کیا جائے
کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ہمارے سروں کے اوپر کیا
ٹوٹ رہا ہے؟ کیوں ٹوٹ رہا ہے۔ اس توڑ
پھوڑ کا سرچشمہ کون ہے؟
میرے سوالات یوں ہی رہ گئے۔ جواب
نہ دیکر ہیڈ نے پیغام بھیجا کہ وہ بھی کئی دنوں
سے اس انتشار کو محسوس کر رہا ہے۔ اچانک کہ
آہستہ آہستہ، کیسے ہوئی شروعات اس کی فی الحال
بتانا مشکل ہے۔ چھان بین ضروری ہے۔ میں نے
اپنے معمار اعلیٰ کو ہدایت دی ہے کہ وہ اس بات
کی تہہ تک اترے اور بتائے کہ ہمارے سروں پر
کیا ہو رہا ہے، کچھ نہ کچھ ہونا ضروری ہے مگر سروں
پر ہی ہونا کوئی ضروری نہیں، ہمارے سروں پر
کچھ ٹوٹ رہا ہے کہ ہم خود چیخ رہے ہیں۔ ہیڈ نے
امید دلائی کہ رپورٹ جلد ہی آ جائے گی۔

میں بڑی بے چینی سے رپورٹ کا انتظار
کرنے لگا۔ چپراسی میں اور میرا ہیڈ اور باقی سب
کے سب اپنے اپنے سروں پر کچھ ٹوٹتے جانے کا
خوف لیے خود کو کہیں محفوظ کر لینے کی دھن میں
لگے تھے۔ سامنے سیڑھی کے جو کونا ہے میرا چپراسی
بار بار وہیں جا کر چھپتا ہے۔ لفٹ مین کیبن سے باہر
ہی نہیں نکلتا۔ ہیڈ نے تعمیری ونگ کو حکم دیکر
بڑی جلد بازی میں اپنی چھت کے نیچے موٹی موٹی
سیلنگ منڈھوالی تاکہ ٹوٹنے کی آوازیں ان میں جذب
ہو کر فنا ہو جاتے۔ سر کسی جوکھم میں نہ پڑے، ان
مراعات خصوصی کے لیے میں Entitled
نہ تھا کیونکہ میں ہیڈ سے صرف ایک اِنچ کم تھا۔
ایک اِنچ کی کمی ہماری ہائرآرکی میں کبھی کبھی ایک صدی
کا بُعد بھی پیدا کر دیتی ہے۔ میں ایسے ہی ایک بُعد
کا شکار رہا۔ بات کہیں رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔
سر پر کچھ بکھرنے کچھ ٹوٹنے کا مرحلہ برابر جاری رہا۔
کبھی کبھی تو ایسا لگتا کہ دھماکہ ہو گیا ہے اور ہم سب
ملبے کے نیچے دفن ہو گئے ہیں۔ دفن ہونا دنیا
میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مگر آدمی کا کھونٹے
کی طرح مٹی میں دفن ہونا بڑی بھیانک بات
ہے۔ کتنے دو ہتھڑ پڑتے ہیں کھونٹے کے سر پر۔
تو کیا ایسا ہو رہا ہے کہ ہمارے سروں پر

ــــ زو سروس، آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ

جو بھاؤ کے لیے آہنی چادر تنی ہے اس پر ہتھوڑے پڑ رہے ہیں؟ ممکن ہے وہ چوٹ سہتے سہتے ٹوٹ پڑے پھر وہ ہتھوڑا ـــــ!!

"میں بہت زور سے چیخ پڑا۔ پھر جو لوگ بھی چھپے چھپے سے تھے سب کے سب باہر نکل آتے اور میرے کمرے میں جمع ہوتے

"کیا ہوا؟ کیسی چیخ تھی۔ کوئی مرا تو نہیں؟"

"سب ٹھیک ہے نا۔ سر دبا کر دیکھو۔ سر سلامت ہے کہ نہیں۔ میں پھر چیخا۔

"نہیں، نہیں، رُک جاؤ۔ سر سلامت ہے مگر سنو۔ آواز سنو۔ دھم دھا دھم ٹوٹ رہا ہے ہم سب کے اوپر کچھ۔"

سب نے اپنی اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں چھت ویسی کی ویسی ہی تھی۔ مگر چوٹیں پڑنے کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔

"صاحب کچھ ہونے والا ہے، کل میرے گھر میں بھی یہی آواز تھی۔ حالانکہ وہاں کوئی چھت نہیں ہمارے سر کے اوپر جھونپڑی ہے۔ مگر اس کے باوجود سر پر کچھ ٹوٹ رہا تھا۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ کیا تمہارے بچوں نے یا کبھی بیوی نے بھی یہ آواز سنی ہے کبھی۔"

"میں نے ان سے دریافت نہیں کیا۔ مگر وہ لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔ صبح کو ان سے پوچھنا بھول گیا۔"

"اُف اوہ! تم لوگ ہر بات نامکمل، ادھوری چھوڑ دیتے ہو۔ بھلا یہ بات بھی بھولنے کی ہے کہ سر پر مسلسل چوٹیں برس رہی ہیں اور ہم سب اسے بڑی خاموشی سے برداشت کیے جا رہے ہیں۔"

"صاحب کیا بتائیں۔ بیوی بچے میرے بے سر پیر کے ہو گئے ہیں۔ انہیں کچھ محسوس ہی نہیں ہوتا۔ اور میں انھیں بتا بھی نہیں سکتا کہ میرے اور آپ کے سروں پر کیا گزر رہی ہے۔"

"جاؤ۔ جا کر اپنی اپنی پناہ گاہوں میں چھپ جاؤ۔ اب سب بے کار ہے۔ اسے ٹوٹنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

پھر میں نے اپنا سر دونوں پیر کے گھٹنوں کے درمیان گھسا لیا۔ اور میز سے ٹک گیا۔ میری اس دشا کی خبر ہیڈ کو دی گئی۔ میں قریب قریب نیم بیہوش تھا، ہیڈ بھاگے بھاگے نیچے آتے۔ کان کے قریب آوازیں لگائیں۔ پانی چھڑکا مجھے ہوش سا آنے لگا ـــ "کڑاکڑاکڑاکڑاکڑاک"، پھر کچھ چیخا۔ میں کرسی سے اُچھل کر ہیڈ کے قدموں میں آگرا میں بہت پریشان تھا۔

"کیا ہوا سر؟ رپورٹ آئی۔"

"آگئی۔"

"حقیقت کیا ہے۔"

"Confidential ہے۔"

"میں مر جاؤں گا۔ اب اوپر کی چھت ٹوٹنے ہی والی ہے۔ آپ رپورٹ کو خفیہ راز میں رکھ کر میری جان لینا چاہتے ہیں۔"

"نہیں ایسا نہیں ہے۔ رپورٹ حقیقت سے آگے کچھ نہیں بتاتی۔ حقیقت وہی ہے جو ہم تم اور اس دفتر کے سب لوگ جانتے ہیں۔"

یہ سن کر میرے ہاتھ پاؤں پھر ڈھیلے پڑ گئے۔ بے ہوشی دوبارہ طاری ہونے لگی۔ رپورٹ وہی تھی، جو میں نے، اس نے اور سب نے محسوس کیا تھا۔ کوئی اختلاف نہیں تھا۔ رپورٹ نے شبہے کی گنجائش ہی نہیں رکھی۔ حالانکہ جتنی رپورٹیں اب تک اخباروں میں شایع ہوئی تھیں ان میں شبہ کی گنجائش بہرحال رکھی گئی تھی، مگر یہ رپورٹ اس قدر واضح اور مدلّل ہے کہ شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ کاش کہ رپورٹ میں درج حقائق مشکوک ہوتے تو میں انھیں اپنے ذہنی سکون کی خاطر اپنے مطابق Interpret کر لیتا۔ رپورٹ سے وہی اخذ کرتا جن کی مجھے ضرورت تھی۔ مگر اس قدر واضح اور مرصع رپورٹ آج تک میری نظروں سے نہیں گزری۔ میں اس ٹھوس رپورٹ کا مارا ہوا ہوں۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ بند ہو گئیں میری آنکھیں۔ کچھ توقف کے بعد کھل گئیں میری آنکھیں: میں سپیرے کی پٹاری میں بند ہوں۔ مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ میرے اوپر کوئی چیز نہیں ٹوٹ رہی ہے۔ ڈراؤنی آوازیں بھی غائب ہیں۔ میں ریشم سا چکنا اور بانس کے کونپل سا لچ لچیلا ہوں۔ مجھ پر کوئی انگلی نہیں رکھ سکتا کیونکہ انگلی رکھتے ہی میں سرک جاتا ہوں اس کے نیچے سے۔ اگر انگلیوں کے بیچ کسی نے دبانے کی کوشش کی تو سرک کر شاخوں سے باہر نکل آؤں گا۔ مجھے کوئی پکڑ نہیں سکتا۔ مجھ پر کوئی حملہ آور نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میرے سر پہ پٹاری کی وفادار کمانیاں اننت پہرہ دے رہی ہیں۔ میں محفوظ ہو گیا ہوں۔ میں خوش ہوں۔ بہت خوش ہوں میں۔ مجھے رقص کرنا چاہیے۔ ہاں میں رقص کر رہا ہوں۔ بین بج رہا ہے۔ میں رقص کر رہا ہوں۔ میری گردن پٹاری سے باہر آرہی ہے۔ پٹاری کی چھت اُلٹ گئی ہے۔ بین بج رہا ہے میں رقص کر رہا ہوں۔ میری گردن اب ایکدم باہر آگئی ہے۔ بین اچانک خاموش ہو گیا۔ سپیرے نے میرا کٹھوا دبا لیا ہے۔ میری سانس حلق میں پھنس گئی ہے۔ میرے زہریلے دانت آپس میں پھنس گئے ہیں۔ ریشمی دُم ہوا میں شوں شائیں کر رہی ہے مگر سپیرے کی گرفت گردن پر سخت ہے۔ وہ مجھے انسانوں کے ہجوم میں لے آیا ہے۔ میرے آپس میں گھتے ہوتے دانتوں کا تماشہ دکھا کر پیسے دو پیسے وصول کر رہا ہے۔ میں خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی ایک زوردار کوشش کرتا ہوں۔ دُم کی دلدوز لرزش ماحول پر حملہ آور ہو گئی۔ مگر میری گردن دبی تھی۔ دانت آپس میں اسی طرح پھنسے تھے۔ مجمع نے زبردست تالی بجائی۔ خوف سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ آہستہ آہستہ میری آنکھوں کے سامنے سے مجمع غائب ہو گیا۔ سپیرے کی گرفت گردن پر اتنی سخت تھی کہ میں کراہنے لگا۔ چہرہ پر اچانک پانی کے چھینٹے محسوس ہوتے۔ آنکھ کھلی دیکھا۔ ہیڈ میرے کان میں زور زور سے کچھ پھونک رہا تھا، میں ہیڈ کو اپنے

اطہر راہی

آخری منظر

کنڈکٹر نارائن نے بیگ سنبھالتے ہوئے دروازہ بند کیا اور "استاد بڑھاؤ" کی تیز ہانک لگائی

یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ سب سواریاں بیٹھ چکی ہیں اور بکنگ مکمل ہو چکی ہے۔

شیخ کریم نے سوئچ گھمایا اور بس کا انجن بڑبڑانے لگا۔ دسمبر کی سرد شام تھی۔ کل ہی تنخواہ ملی تھی۔ کریم نے گھر کا سارا سامان خرید کر بھر دیا تھا۔ شام کی یہ بس اندور تک جاتی تھی اور مسافروں میں بہت مقبول تھی۔ لوگ دن بھر اپنے کام کاج سے نپٹ کر شام کے چھ بجے اس بس میں بیٹھتے اور ٹھیک دس بجے رات اپنے اپنے گھروں کو پہنچ جاتے۔ واپسی کا سفر صبح چھ بجے شروع ہوتا اور پھر دس بجے تک اپنے اپنے کام سے لگ جاتے۔

شیخ کریم بس کو ڈپو کے حوالے کر کے گھر چلا جاتا اور پھر شام کو ڈیوٹی پر حاضر ہو جاتا۔ کریم سرکاری روڈویز کے ان ڈرائیوروں میں سے تھا جو اپنی ڈیوٹی کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں۔ باون سیٹوں کی اس بس کی وقت کی پابندی مثالی سمجھی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے مسافر دوسری بسوں کے مقابلے میں اس میں سفر کرنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ کریم کو عام ڈرائیوروں کی طرح بری عادتیں بھی نہ تھیں۔ اسٹاپ پر بس چار پانی ہی اس کے لیے کافی تھا۔ البتہ بس چلاتے ہوئے اس کے دماغ میں ماضی کی زندگی اور مستقبل کے خواب ایک فلم کی طرح چلتے رہتے۔ یہ فلم اُسے بیدار اور چاق و چوبند رکھتی۔ کنڈکٹر کے اشارے پر بس رکتی یا کسی لمبے کا وٹ پر یہ سلسلہ کبھی کبھی ٹوٹ جاتا۔

گیئر ڈالتے ہی بس نے منزل کی طرف سفر شروع کر دیا۔ کریم کو اپنا بچپن یاد آ گیا۔ وہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ کب پیدا ہوا؟ اس کی پیدائش پر کیا خوشیاں منائی گئیں؟ اسے معلوم نہ تھا۔ ہاں جب شعور کی پہلی منزل شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس کا باپ تو اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی مر چکا تھا۔ یہ شخص جسے وہ اپنا باپ سمجھتا تھا، ایک بے حد کاہل اور ظالم آدمی تھا۔ آٹھ سال کی عمر سے ہی کریم نے وہ سارے کام سیکھ لیے جو جوان کرتے آئے ہیں — گھر کی گائیں اور بکریاں چرانا، ان کا دودھ لگانا، دودھ ٹھکانوں پہ پہنچانا، باڑے کی صفائی کرنا، دودھ والی گائے کو چارہ دینا۔ ہر موسم میں اس کی صبح پانچ بجے سے پہلے ہی شروع ہو جاتی اور رات دس بجے ختم ہوتی۔ اگر صبح اٹھنے میں دیر ہوتی تو ایک ٹھوکر کا اضافہ ہو جاتا جو دن بھر اس کی کمر کو اپنی غلطی کا احساس دلاتی رہتی۔ ایسے میں صرف ماں کی آنکھوں میں ہمدردی کی چمک اس کا غم ہلکا کرتی تھی۔

بارہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ان ہمدرد آنکھوں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور ایک دن صبح اُجالے سے پہلے ہی وہ اس گاؤں کو چھوڑ آیا۔

شہر میں کبھی برتن دھوئے، کبھی صاحبوں کے جوتوں پر پالش کیا، کبھی فرش صاف کیا، لیکن آخر میں ٹھکانا مستری رحیم کا کارخانہ بنا، جہاں دن بھر مختلف اسکوٹروں اور کاروں کی دھلائی سے لے کر ان کی چھوٹی موٹی خرابیوں سے ہوتا۔ وہ مستری کریم کہلانے لگا۔ اسی کارخانے کے ایک حصے میں لوہے کا ایک پلنگ اس کی کُل کائنات تھا۔

مستری سے روڈویز کی ڈرائیوری تک ایک اور کہانی تھی۔ بہر حال وہ اب استاد کریم تھا۔ معقول تنخواہ تھی۔ لیکن اب گھر کہیں نہ تھا۔ کبھی ریوا کبھی اندور، کبھی جبل پور، کبھی رائے پور، جہاں ڈیوٹی لگتی۔ وہاں کے ڈپو ہی اس کے گھر تھے۔

ریوا کی ایک رات بھی ایسی ہی سرد رات تھی۔ جب مسافر خانے کی ہلچل نے اس کی نیند اُڑا دی۔ شاید کسی عورت کے چلانے کی آواز نے اُسے گہری نیند سے اٹھا

۴-۵/۲ - یونیورسٹی کیمپس، امین ۔ ۱۰-۴۵۶ (ایم پی)

دیا تھا۔ کرنے میں وہ بکی ایک عورت سے کچھ لوگ زبردستی پر آمادہ تھے۔ وہ ماں اور بہنوں کی دُہائی دے رہی تھی۔ کریم نے نیند بھری آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ ان لوگوں نے اسے بھی حصہ دار بنانے کی کوشش کی۔ مگر اس عورت کے چہرے کی معصومیت میں اُسے اپنا بھولا بسرا بچپن یاد آ گیا اور وہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے

صبح جب بس واپسی کے سفر کے لیے تیار ہوئی تو اس میں ڈرائیور کی ایک سواری بڑھ گئی تھی۔ اور یہیں سے کریم کو جس کی اپنی کوئی زندگی نہ تھی، گرہستی نہ تھی، ایک بے نام اور بے مقام عورت کے ساتھ گھر اور گرہستی کی فکر ہوئی۔

بس اسٹینڈ سے تھوڑے فاصلے پر ایک کارخانے کے آس پاس کئی جھگیاں بن گئی تھیں۔ اس میں ایک جھگی مستری کریم کا گھر تھی۔ ساب گائوں اور ورکشاپ کے بعد یہ تیسرا ٹھکانہ تھا۔ کریم کی زندگی کی گاڑی ایک ڈگر پر چل نکلی۔

- - - - -

یہیں سال بھر بعد گڈّی کا جنم ہوا۔ اُسے بھی وہ اس کی ماں کی طرح ابھی کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔ مگر گڈّی ان کی زندگی کا ایسا نقطۂ آغاز بن گئی تھی، جہاں سے زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں شروع ہوتی ہیں۔ ایک نئی صبح طلوع ہوتی ہے۔ یوں تو سب کو اپنے بچے بے حد پیارے لگتے ہیں۔ مگر واقعی گڈّی بہت پیاری تھی۔ نہ جانے کہاں سے دائیں ہونٹ اور ٹھڈّی کے نیچے ایک خوب صورت تل لے آئی تھی جو اس کی معصومیت اور حُسن میں مزید اضافہ کرتا تھا۔

دیکھتے دیکھتے دو سال بیت گئے۔ اب کریم کو زندگی بڑی خوش گوار اور کامیاب لگنے لگی۔ ملازمت میں اچھی کارکردگی کی وجہ سے اسٹاف خوش تھا۔ اس وجہ سے مختلف شہروں کی خاک چھاننا پڑی۔ اسعد سا رعٹ آرام کا تھا۔

نیم کریم کی زندگی کی فلم اس کے ذہن میں اسی طرح چل رہی تھی کہ کنڈکٹر نے سیٹی بجائی

"اُستاد مُنڈی تیکیس سِبر ملے ہے"

کنڈکٹر نے ہانک لگائی۔ یہ اندور کا چھوٹی ناکہ تھا۔ گاڑی دھیمی ہوئی اور رک گئی۔ اب سامنے بھرا پُرا شہر تھا۔ کریم کی فلم بیچ ہی میں رہ گئی۔

دس بجے اسٹینڈ تک پہنچتے پہنچتے گاڑی خالی ہو گئی۔ ڈپو میں گاڑی کھڑی کر کے ٹفن اٹھائے وہ کینٹین چلا آیا جہاں اور بہت سے ساتھی زندگی کی گاڑی میں پٹرول بھرنے کے عمل میں معروف تھے۔

صبح پانچ بجے جب آئل پانی چیک کر کے گاڑی اسٹینڈ پر لگائی تو کنڈکٹر نارائن دوڑتا ہوا آیا۔ "استاد! رات بڑا گھپلا ہو گیا۔"

کریم نے سامنے کا شیشہ صاف کرتے ہوئے کہا: "کیا رات زیادہ پی لی تھی ؟ یا ٹکٹوں کی رقم جمع کرنے کے بجائے ہار گیا۔"

"ارے نہیں استاد ــــ ایسی بات نہیں۔"

نارائن نے گمبھیرتا سے کہا۔

"اپن سالا شام کو جب چلا تھا تو کچھ نہ تھا ــــ لیکن بابو لوگ بتاتے ہیں کہ رات کو بارہ بجے گیس نے ہزاروں کو موت کی نیند سلا دیا۔"

"ارے کہیں گیس سے بھی ہزاروں لوگ مرتے ہیں ؟ اور یہاں یہ گیس کیا ہوتی ہے۔ صاحب لوگ تو پٹرول کو بھی گیس کہتے ہیں اور ایک گیس وہ ہوتی ہے جو سلنڈر میں بھری ہوتی ہے اور کھانا پکانے کے کام آتی ہے۔ اس سے کہیں ہزاروں لوگ مرے ہیں ؟" کریم نے بدستور شیشے کو چمکاتے ہوئے سوال کیا۔

"پتا استاد اپنے کو تو معلوم نہیں، مگر وہ نکلی ایک کارخانے سے ہے۔" نارائن نے خالی بیگ ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

چھ بجتے ہی بس روانہ ہو گئی۔ لیکن بھری پُری بس میں صبح کی سردی کے باوجود گرما گرمی تھی۔ لوگ ایک دوسرے سے کسی گیس کا ذکر کر رہے تھے۔ کچھ چہروں سے پریشانی عیاں تھی۔ کچھ اخبار لیے الجھ رہے تھے۔

شہر سے باہر نکلتے ہی کریم کی یادوں اور خوابوں کی فلم پھر شروع ہو گئی۔ اگر اب کی لڑکا ہوا تو وہ ضرور صاحب لوگوں کی طرح آپریشن کرا لے گا اور وہ انکریمنٹ مُفت میں مل جائیں گے۔ مگر گڈّی کو کسی اچھے اسکول میں داخلہ کرانا پڑے گا۔ آس پاس تو کوئی اسکول نہیں ہے۔ آئی۔ جی کے بنگلہ کے پاس ایک اسکول سے خوب صورت یونی فارم پہنے بچے آتے جاتے رہتے تھے۔ وہ اسی اسکول میں گڈّی کو داخل کرا دے گا۔ گھر سے ذرا دور ہے تو کیا ہوا ؟ اس کی ماں چھوڑ آیا کرے گی اور پھر لے آیا کرے گی۔ اب اس کو بھی تو گھر میں کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔ جب تک گڈّی اسکول جانے کے لائق ہو جائے گی، لڑکا بھی ذرا بڑا ہو جائے گا۔ اس نے اپنے تصور کی آنکھ سے اپنی بیوی کو گود میں بچہ لیے گڈّی کو یونیفارم پہنے اسکول جاتے دیکھا۔

مگر وہ اب زیادہ دن تک اس جھگی میں نہیں رہے گا۔ سنا ہے سرکار کوارٹر بنوا رہی ہے۔ اسی میں اٹھ جائیں گے۔ وہیں آس پاس تو ہو گا ہی۔ کوارٹر کی پکی چھت کے تصور نے کریم کے دماغ میں خوشی کی لہر دوڑا دی۔ بس میں اب سناٹا تھا۔ لوگ شاید بحث کر کے اُکتا چکے تھے۔ کچھ لوگ اخبار کو سینے سے لگائے خراٹے لے رہے تھے اور کچھ باہر دوڑتے ہوئے کھیتوں، درختوں اور مکانوں کو دیکھنے میں کھوئے ہوئے تھے۔

وہ پھر اپنے بچپن میں لوٹ آیا۔ اس کے تین بہن بھائی اور تھے۔ اس نے خود کبھی اسکول کا منھ نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اُن تینوں کو دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ لیکن وہ اپنے بچوں کو ضرور پڑھائے گا۔ گڈّی تو اتنی سندر ہے کہ اگر وہ پڑھ لکھ گئی تو اُسے بر ملنے میں کوئی پریشانی نہ ہو گی، لیکن اگر لڑکا میری طرح نکلا تو ــــ لیکن میں تو پڑھنا چاہتا تھا۔ لیکن پڑھنے کون دے رہا تھا۔ یقیناً میرا بیٹا بھی پڑھنا چاہے گا۔ میں اسے خوب پڑھاؤں گا۔ لیکن وہ کیا بنے گا ؟ ــــ اس کا ذہن اس بارے

تھی بالکل خالی تھا۔ مگر یہ گیس کیا ہوتی ہے ؟
کیسے نکلی ؟ کہاں نکلی ؟ کریم کے ذہن نے پھر اس کا
ساتھ چھوڑ دیا۔

سامنے سے آنے والی بس کے ڈرائیور نے
ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔

پریم استاد آج پھر اوور لوڈنگ کر کے
سو سے اوپر روپے بنائے گا، اس نے سوچا۔

پریم استاد نے کھڑکی سے منہ نکال کر
گاڑی برابر میں کھڑی کر دی۔

"کریم دادا غضب ہو گیا۔ شہر میں گیس
نکل آئی ہے۔ ہزاروں مر گئے۔ اور جنہیں موت نہیں
آئی وہ بھی مُردے سے بدتر ہیں۔ مجھ پر تو بھگوان
کی کرپا ہو گئی۔ بال بچے ساگر میں تھے اور میں آج
سویرے سے ہی رائے پور سے آیا ہوں۔ جلدی جاؤ
اپنے بال بچوں کی خبر لو۔"

کریم کے ساتھ بس کے مسافروں نے بھی پھٹی
پھٹی آنکھوں سے اس خبر کو سُنا۔

"مگر یہ گیس نکلی کہاں سے؟" کریم
نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"ارے اسی کارخانے سے جو ریلوائی اسٹیشن
کے پاس ہی ہے اور کیڑے مار دوائیں بناتا ہے۔"
کریم نے پورے ہوش و حواس سے اس خبر کو سُنا۔
اور ۔۔۔ "اچھا استاد" کہہ کر بس اسٹارٹ کر دی۔

اسٹیرنگ وہیل پر اس کے ہاتھ کپکپا رہے
تھے اور پیر بھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے سُن ہو گئے ہوں
پچھلے تین سالوں سے وہ اسی کارخانے کے پاس ایک
جھگی میں رہ رہا تھا۔ اگر سواریوں کی موت اور زندگی
کا سوال نہ ہوتا تو شاید وہ بس کو ہوائی جہاز نہ بنا دیتا۔
اس کے ذہن میں ماضی اور مستقبل کی فلم کا ایک ایک
سین دم توڑ چکا تھا۔ صرف گڈّی اور اس کی ماں کا
چہرہ گھوم رہا تھا۔

شہر شروع ہونے سے بہت پہلے لوگوں کے
قافلے آتے دکھائی دے رہے تھے۔ ٹیمپو، بسیں،
تانگے، اسکوٹر، سائیکلیں، ٹرک اور پیدل انسانوں
کا ایک سیلاب اُمڈا چلا آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا
تھا جیسے دشمن فوج کے حملے کے ڈر سے لوگوں نے شہر
خالی کر دیا ہو۔ وہ بس کو تیز چلانا چاہتا تھا، مگر اس
بھیڑ میں لوگوں کو بس سے کچلے جانے کی بھی پروا نہ تھی۔
اس کے ہاتھ بدستور کانپ رہے تھے۔ جبڑا بھنچا
ہوا تھا۔ اور ٹانگوں کی طاقت جواب دے رہی تھی۔

بس اسٹینڈ پر بس چھوڑ کر نارائن سے کچھ کہے
بغیر وہ بھاگا۔ راستے میں دودھ ڈیری کی بھینسیں
اپنے کھونٹوں سے بندھی پھولے ہوئے پیٹ اور جھاگ
اگلتے منہ سے ٹانگیں پھیلائے خاموش تھیں۔ محلہ
سنسان تھا۔ اس کے پیروں کی جان نکلی جا رہی تھی۔
جہاں رات دن ننگ دھڑنگ بچے گندگی میں
کھیلتے پھرتے تھے۔ عورتیں پانی کی ایک بالٹی پر لڑنے
مرنے کو تیار رہ جاتی تھیں۔ وہاں سناٹے کا راج تھا۔
جھگیوں کے دروازے چوپٹ کھلے تھے۔

وہ اپنی جھگی کے دروازے پر ڈھے گیا۔ پہلی
تاریخ کا لایا ہوا سارا سامان ترتیب سے رکھا تھا۔
چولہے کی راکھ بجھ چکی تھی۔ کھلی دیگچی میں رات کی بچی
کھچی کھچڑی پڑی تھی۔ پاس ہی ایک خارش زدہ کتا پھولے
پیٹ اور منہ میں سفید جھاگ بھرے ٹانگیں پھیلائے
پڑا تھا۔ اُس نے آہٹ پر ذرا سی بھی جنبش نہ
کی۔ دیوانے کریم وہاں کب تک کھڑا رہا۔ پھر
کچھ لوگوں کے بھاگنے کی آواز آئی تو وہ فوراً ادھر
دوڑا۔ شاید ان بھاگنے والوں میں اس کے گھر کے لوگ
بھی شامل ہوں۔ مگر وہ لوگ اسی کی طرح اپنے گھر
والوں کی خبر لینے آئے تھے اور دوبارہ گیس نکلنے
کی افواہ سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

وہ بھی ان میں شامل ہو گیا۔ بس اسٹینڈ پر
پھر بھیڑ بڑھ گئی تھی۔ ایمبولینس اور فائر بریگیڈ
کی گاڑیاں ہی نہیں ملٹری اور پولیس والے مردہ
اور نیم مردہ لاشیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اسپتال لے جا رہے
تھے۔ بڑے اسپتال کے میدان میں لاشوں کا میلہ
لگا تھا اور روتے بسورتے چہرے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک
ایک لاش کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ گیس نے
ان کے پیاروں کے چہرے بھی مسخ کر دیے تھے۔

کریم نے بھی ایک ایک چہرہ دیکھنا شروع
کیا۔ گڈّی کی ماں، ریلوائی جیسی بے نام اس کی
زندگی میں آئی تھی۔ اسی بے نام حیثیت سے لاشوں
کے ایک انبار میں پڑی تھی، لیکن گڈّی کہیں نظر نہ
آئی۔ اس نے کئی بار کھلی آنکھوں اور پھولے چہروں
والے بچوں میں نچلے ہونٹ اور ٹھوڑی کے نیچے تل والی
بچی کو تلاش کیا، لیکن وہ وہاں نہ تھی۔ لوگوں سے
پوچھا۔ پورے شہر کا کونا کونا چھان مارا لیکن اس
کا پتہ نہ چل سکا۔ اخبار میں مرنے والوں کی تصویریں
چھپیں جو ان کی پہلی اور آخری تصویریں تھیں۔
لیکن ان میں بھی وہ چہرہ نہ تھا۔

مہینوں گزر گئے۔ زندگی پھر اسی ڈھب
سے گزرنے لگی۔ گھر میں اب کیا رکھا تھا، وہ پھر
ڈپو میں رہنے لگا۔ بس چلتی رہی، لیکن اب اس
کی زندگی کی فلم صرف گڈّی پر آکر رک گئی تھی۔ صرف
ایک چہرہ۔ نچلے ہونٹ اور ٹھوڑی کے بیچ تل
والا چہرہ۔ نہ ماضی نہ حال نہ مستقبل۔ اس کی
یادداشت سے سب محو ہو چکا تھا۔ وہ بے نام عورت
بھی اور اس کی گرہستی بھی۔ لیکن وہ چہرہ جانے کا
نام نہیں لیتا تھا۔ اس کے محکمے نے بھی بچی کی تلاش
میں پوری کوشش کی۔ اور دوستوں نے بھی ۔۔۔
جن میں سے کئی اس کی طرح ستم رسیدہ تھے۔ کسی کی ماں،
کسی کا بھائی، کسی کی بیٹی، کسی کی بیوی۔ سب ہی
تو ایک چکی میں پس چکے تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنے آپ
کو ڈھارس دیتا کہ وہ اکیلا نہیں ہے، لیکن وہ معصوم
چہرہ اس کی آنکھوں سے دور نہ ہوتا۔

چھٹی کے دن اس کا معمول تھا کہ وہ دس
گیارہ بجے ہی کھانا کھا کر شہر کی سڑکوں پر گھومتا پھرتا۔
شاید ذہن کے کسی گوشے میں یہ آرزو چھپی تھی کہ گڈّی
اچانک کہیں مل جائے گی اور وہ گود میں اٹھا کر
دیوانہ وار اُسے چومنے لگے گا۔

ایک دن ایک ٹیکسی پاس آکر رکی۔ پنڈت
نُعب نرائن مسرا نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ مسرا جی

ے اس کی صاحب سلامت جب سے تھی جب وہ رحیم مستری کے کارخانے میں کام کرتا تھا۔ بھلے آدمی تھے۔ اچھی سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ایک خوب صورت بنگلے میں رہتے تھے۔ بڑا لڑکا ولایت چلا گیا اور وہیں کا ہو رہا۔ بیٹی بھی پردیس بیاہی گئی۔ اتنے بڑے بنگلے میں دونوں میاں بیوی رہتے تھے۔ ان کی کار مستری رحیم کے کارخانے میں اکثر سروسنگ کے لیے آتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی وہ کار ہی کے کام سے بنگلے پر بلا لیا کرتے اور بغیر کھلائے پلائے اُسے آنے نہ دیتے تھے۔ مسرائن ذرا سخت قسم کی عورت تھیں۔ چھوت چھات پر سختی سے عمل کرتیں۔ رسوئیا۔ چوبے جی بھی اس وقت تک رسوئی میں نہ آتے جب تک ہاتھ پیر صابن سے اچھی طرح نہ دھو لیں۔ باہر کے کھانے پینے کے برتن الگ تھے جو رسوئی میں نہ آسکتے تھے۔ ماس مچھی کھانے والوں سے تو انہیں خدا واسطے کا بیر تھا۔ مسرا جی اکثر ان کی اس چھوت چھات کا مذاق ملازموں ہی کے سامنے اڑاتے رہتے جس پر وہ کبھی کبھی ناراض ہو جاتیں۔

مسرا جی نے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اُسے بٹھا لیا۔ ان کی گاڑی میں کوئی خرابی تھی اور وہ اس وقت مستری ہی کو لینے نکلے تھے۔

کریم نے کاربوریٹر کھول کر وہیں لان میں صاف کرنا شروع کر دیا۔ چوبے جی چائے اور ناشتہ لے کر آگئے۔ مسرائن ابھی تک دکھائی نہ دی تھیں۔ اندر کچھ چہل پہل تھی۔ کریم نے جب مسرائن کے نہ دکھائی دینے اور اندر کی چہل پہل کا سبب پوچھا تو ... چوبے جی نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر جواب دیا۔

"کیا بتائیں بھیّن مسرا جی کے بٹوا تو ولایت ماہی رہ گئے اور بٹیا ہوائی جہاز گرنے میں ماری گئیں۔ اب دیکھیا پنڈتائن کو ایک چھوکری مل گئی ہے جسے وہ اپنی بٹیا کا دوسرا جنم سمجھ رہی ہیں۔"

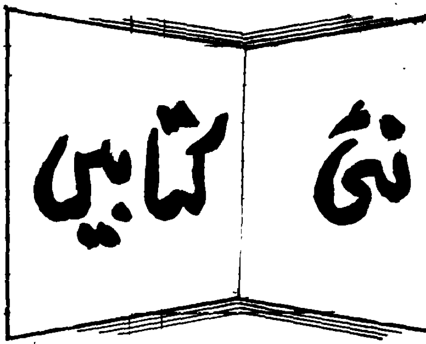
"چھوکری ___ کہاں سے مل گئی؟" کریم کے کان کھڑے ہو گئے اور ہاتھوں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔

"ارے وہی گیس والی صبح ایک چھوکری بنگلے کے باہر کھڑی رو رہی تھی۔ اُسے گھر لے آئیں۔ شام کو ہی خبر آئی کہ بٹیا جہاز گرنے سے ختم ہو گئیں۔ اسی کو وہ اپنی بٹی کا دوسرا جنم سمجھ رہی ہیں۔"

اتنے میں مسرا جی ایک بچی کی انگلی پکڑے لان کی طرف آتے دکھائی دیے۔ بچی قہقہے لگا رہی تھی۔ اچھل رہی تھی، اس کی قابلِ رشک صحت نے رنگ کو اور نکھار دیا تھا۔ لیکن کریم کی نگاہیں دائیں ہونٹ اور ٹھوڑی کے بیچ تل ہی پر اٹک کر رہ گئیں۔

کاربوریٹر صاف ہو چکا تھا۔ کریم نے کانپتے ہاتھوں سے اس کو فٹ کیا۔ اب وہ بچی سے نظریں ملاتے ڈر رہا تھا۔ اس کی ٹھوڑی کانپ رہی تھی۔ جبڑا سنچا ہوا تھا۔ پیر کانپ رہے تھے ___ بچی لان پر لگے جھولے میں قہقہے لگا رہی تھی۔ مسرائن دور کھڑی جیسے اس کی بلائیں لے رہی تھیں۔

یہ آخری منظر تھا، جس نے شیخ کریم کے حافظے سے سب کچھ بھلا دیا تھا۔



ماہنامہ شاعر بمبئی' اقبال نمبر
مدیر: افتخار امام صدیقی'
صفحات: ۶۴۸
قیمت: پچاس روپے

ماہنامہ شاعر بمبئی ان رسالوں میں نہیں جنھیں کسی تعارف کی ضرورت ہو۔ زیر نظر خصوصی نمبر سے پہلے بھی شاعر کے کئی ایسے خاص نمبر شائع ہو چکے ہیں جن کی آج بھی اہل علم کو تلاش رہتی ہے۔ لیکن اقبال نمبر ان خصوصی شماروں سے بہت مختلف ہے۔ کسی موضوع پر مضامین اکٹھا کر دینا اور شائع کر دینا کم محنت کا کام نہیں ہے۔ روایتی اور توصیفی مضامین میں بھی پڑھنے والے کو شاعر یا ادیب کی شخصیت اور اس کے فن کے بارے میں کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے۔ لیکن ایسے مضامین کو جمع کرنا اور شائع کرنا جو شخصیت کو Construct، تعمیر اور Deconstruct دونوں کریں بڑی جرآت اور جوکھم کا کام ہے۔ اسی لیے میں شاعر کے اس نمبر کو اقبال شناسی میں ایک ایسا اضافہ سمجھتا ہوں جسے پڑھ کر اقبال سے ہماری محبت اور بڑھ جاتی ہے اور وہ ہماری ہی دنیا کے ایک انسان لگنے لگتے ہیں۔

اقبال اردو کے وہ خوش نصیب شاعر ہیں جن کے بارے میں اتنا زیادہ لکھا گیا ہے کہ اقبالیات یا اقبال ادب، خود مطالعے کا ایک وسیع موضوع بن گیا ہے لیکن اس کا ایک نقصان یہ ہوا کہ خود اقبال اس اقبالیات اور محققوں اور ناقدوں کی موشگافیوں میں کہیں کھو گیا۔ غالب اور غالب کے بارے میں پڑھ کر ان سے محبت کا احساس ہوتا ہے لیکن اقبال کا نام آتے ہی ڈر لگتا ہے کہ کہیں کوئی 'بے حرمتی' نہ ہو جائے۔ اقبال کے ناقدین اور محققین نے اپنی تحقیق و تنقید کا سارا زور انھیں معلم اخلاق، عالم دین، مبلغ اسلام، بانیِ نظریۂ پاکستان، مفکر، فلسفی اور نہ جانے کیا کیا کچھ ثابت کرنے میں صرف کر دیا ہے۔ اس سارے انبار اور تحقیقی گھن گرج میں وہ آوازیں دب کر رہ گئیں جنھوں نے اقبال کو ایک انسان اور ایک شاعر کی شکل میں دیکھنے کی کوشش کی۔ شاعر کا یہ نمبر اسی طرح کی کوششوں کا تجزیہ اور اقبال شناسی کی ایک کوشش ہے۔

یہ اقبال نمبر آٹھ ابواب میں منقسم ہے جس میں آٹھوں باب کے چار حصے ہیں۔ پہلا باب 'آفتاب تازہ' اقبال البم' شجرۂ نسب خاندان اقبال' اور حضرت سیماب اکبر آبادی کی ایک نظم 'نذر اقبال' کے خطی عکس پر مشتمل ہے۔ یہ نظم پہلی بار شائع ہوئی ہے اس پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے لیکن جس طرح کے جذبات کا اس میں اظہار کیا گیا ہے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے انتقال کے کچھ دنوں بعد لکھی گئی ہوگی۔ شجرہ اقبال میں آج تک کی تمام معلومات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ توقیت اقبال' کو بھی مختلف ماخذات سے اس طرح ترتیب دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ کوئی اہم واقعہ اور تاریخ چھوٹنے نہ پائے۔ اس میں اقبال کی زندگی سے متعلق بیشتر واقعات کی تاریخ وار ترتیب مل جاتی ہے۔ لیکن ایک جگہ محل نظر ہے ص ۲۵ پر آفتاب اقبال کی پیدائش فروری ۱۸۹۸ء میں دکھائی گئی ہے جس وقت تک اقبال نے دوسری شادی نہیں کی تھی لیکن ص ۲۷ پر ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۴ء والدۂ آفتاب اقبال کی وفات کی تاریخ' لکھی گئی ہے اور ان کی والدہ کا نام مختار بیگم لکھا گیا ہے جو درست نہیں ہے۔ مختار بیگم اقبال کی تیسری بیوی تھیں اور آفتاب اقبال زوجہ اول یعنی کریم بی بی کی اولاد تھے۔

دوسرے باب 'معجزہ فن' میں گیارہ تحقیقی و تنقیدی مقالات ہیں۔ ابتدائی دو مقالات محمد عظیم فیروز آبادی کے ہیں جو 'اقبال کی تاریخ ولادت' اور اقبال کے والد کے نام سے متعلق ہیں جو بڑی محنت سے لکھے گئے ہیں اقبال کی تاریخ ولادت کے تعین کے سلسلے میں ہمیشہ ہی محققوں میں اختلاف رہا ہے۔ اقبال کی تحریروں نے بھی اس سلسلے میں بہت سی الجھنیں پیدا کی ہیں اس لیے اس میں کسی نے کسی بیان کو صحیح قرار دے کر تاریخ کا تعین کیا اور کسی نے کسی اور کو۔ محمد عظیم نے ان تمام بیانات اور تحقیقوں کو سامنے رکھ کر ایک نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی ہے ان کا استدلال سائنٹیفک اور نتیجہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ ان کے مضامین یقیناً معلومات لہٰذا revealing ہیں لیکن بعض جگہ ان کا لہجہ بہت اچھا نہیں ہے۔ اقبال کے والد کا نام نتھو عرف نور محمد تھا یہ بات سب کے علم میں ہے۔ نور محمد کی عرفیت کا اضافہ اقبال نے کیا یا خود ان کے والد یا کسی اور بزرگ نے۔ یہ بہت بڑا مسئلہ نہیں ہے اور نہ اس سے اقبال کی

ر فن میں کوئی اضافہ ہوتا ہے۔ بہرحال ایک
شخصیت کی زندگی کے معمولی سے معمولی پہلو
اہمیت مل جاتی ہے اس لیے اقبال کے یہاں
س طرح کی تحقیق میں لوگوں نے بڑی دلچسپی
ی ہے۔ ص ۵۳ سطر ۲۶ اور ص ۴۰ سطر ۱۹
تابت کی غلطی سے سو سال کا فرق ہوگیا
۔ اس باب کے دیگر مضامین بھی اقبال شناسی
سلسلے میں اہم مضامین ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن نے
نئے انداز سے اقبال کے کلام کا مطالعہ کیا
۔ اقبال کا عہد تہذیبی شکست و ریخت کا
تھا۔ اس وقت تین تہذیبیں ہمارے سامنے
ایک عہد وسطیٰ کی مسلم تہذیب۔ ایک اس
بعد وجود میں آنے والی 'طواں' تہذیب اور
یورپ کی نئی تہذیب جو سائنس، ٹکنالوجی،
بنوں اور نئی تحقیق و ایجادات کی تہذیب
۔ ڈاکٹر محمد حسن نے مختلف تہذیبی رویوں کی
دگی میں اقبال کے ردعمل اور تہذیبی رویے
زیر کیا ہے۔ جو اہم بھی ہے اور دلچسپ بھی
موضوع کی وسعت مزید تفصیل اور تجزیے
طالبہ کرتی ہے۔ 'اقبال خطابت اور شاعری'
جگن ناتھ آزاد نے اپنے انداز میں کلیم الدین احمد
اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی
۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے 'اقبال اور شپنگلر' میں
ل اور شپنگلر کے کلچر کے نظریات کا تنقیدی
یہ کیا ہے۔ تاراچرن رستوگی نے 'اقبال اور
یانیت' سے بحث کی ہے اور اسی موضوع
قبال کے بھتیجے اعجاز احمد نے 'علامہ اقبال اور
ریت میں روشنی ڈالی ہے اعجاز احمد 'مظلوم
ال کے مصنف کی حیثیت سے اقبالیات اور
ذات اقبال کی تحقیق میں اہم جگہ رکھتے ہیں۔
کا مضمون ان کے مخصوص نقطۂ نظر کی روشنی
اقبال کے عقائد اور احمدی عقیدے کے سلسلے
بہت معلومات افزا ہے۔ سلیمان اطہر جاوید
'اقبال کے ادبی تنقیدی شعور' کا بڑا اچھا اور

کامیاب تجزیہ کیا ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں ادب اور آرٹ کے بارے میں اقبال کے خیالات کو یکجا کر دیا ہے جس سے اقبال کو سمجھنے میں یقیناً مدد ملتی ہے۔ رفیع الدین ہاشمی کا مضمون '۱۹۸۶ء کا اقبالیاتی ادب' بڑا معلومات افزا مضمون ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہند و پاک ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے مختلف ملکوں اور زبانوں میں ایک سال میں اقبال پر کتنا کام ہوا ہے اور کون کون سے نئے پہلو اقبال کی شخصیت اور فن کے سامنے آتے ہیں۔

تیسرے باب میں صرف دو مضامین ہیں عبداللطیف اعظمی کا 'ترانۂ ہندی ایک تنقیدی مطالعہ' اور دوسرا رفاد فتیحی کا 'مسجد قرطبہ ایک اسلوبیاتی مطالعہ'۔ عبداللطیف اعظمی ترانۂ ہندی کے سلسلے میں اس سے قبل بھی لکھتے رہے ہیں لیکن یہ مضمون اس نظم کے سلسلے میں ان کی تحقیق کا ماحصل ہے۔ اس کے مطالعے سے اس نظم کی پہلی اشاعت سے لے کر آج تک کی ساری بحثیں سامنے آجاتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اور اہتمام کیا گیا ہے کہ ترانۂ ہندی یا 'ہمارا دیس' کی اولین چار اشاعتوں کا عکس بھی شائع کر دیا ہے تاکہ کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے اور خود اقبال کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودے کا عکس بھی شائع کر دیا ہے۔ یہ تمام چیزیں پہلی بار کسی ایک جگہ شائع ہوئی ہیں۔ رفاد فتیحی کا مضمون 'مسجد قرطبہ ایک اسلوبیاتی مطالعہ' اردو میں اسلوبیاتی مطالعہ کی ایک کڑی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ کسی فن پارے کی لسانی ساخت ہی ادب کے جمالیاتی احساس کو فکری احساس میں تبدیل کرتی ہے۔ یہ بات محل نظر ہے۔ لسانی ساخت جمالیاتی اثر میں اضافہ کا سبب تو ہو سکتی ہے لیکن فکری احساس میں اسے کس طرح بدل دیتی ہے یہ واضح نہیں ہو سکا۔ اقبال کے اسلوبیاتی مطالعے پر اس سے قبل دو مضامین ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے شائع ہو چکے ہیں اور دونوں ہی میں انھوں نے مسجد قرطبہ کی صوتی اور اسلوبیاتی خوبیوں سے بحث کی ہے۔ زیر نظر مضمون محنت سے لکھا گیا ہے اس میں 'صوت' فعل اور اسم تینوں کا مطالعہ کیا گیا ہے اور مخصوص حالات میں ان سے نظم کے آہنگ، زور، اثر اور روانی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اسے بڑی اچھی طرح سے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

چوتھا باب 'سفرنامہ' اقبال کے سفر دکن سے متعلق ہے جس میں صرف ایک مضمون داستانی 'از دکن تا اردو ام' ہے جو دکن کے مشہور محقق سلیم تمنائی کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ چند نایاب تصاویر اور خطوط کے عکس ہیں۔ سلیم تمنائی نے اس زمانے کے اخبارات، رسائل اور دوسرے حوالوں سے علامہ اقبال کے سفر دکن اور اس سلسلے کی مصروفیتوں کی پوری تفصیل مہیا کر دی ہے۔

پانچواں باب 'اقبال کے شاہین' اردو شاعری پر اقبال کے ہمہ گیر اثرات سے متعلق ہے۔ اس میں پہلا مضمون اکبر رحمانی کا 'اقبال بنام لمعہ حیدرآبادی' ہے۔ لمعہ حیدرآبادی کے اقبال سے تعلقات اور خطوط کے بارے میں اکثر شک و شبہ کا اظہار کیا جاتا رہا ہے۔ اس مضمون کے ساتھ اقبال کے خطوط لمعہ حیدرآبادی کے اور اکبر رحمانی کے نام اقبال کے خطوط بھی دیے گئے ہیں جن سے ان مباحث پر روشنی پڑتی ہے اس کے علاوہ کلام لمعہ حیدرآبادی کا ایک انتخاب بھی شامل اشاعت ہے جو ان کے کلام پر اقبال کے گہرے اثرات کے مطالعے کے لیے اہم ہے۔ اسی طرح افسر سیمابی کا تعارف افتخار امام اور نیاز فتحپوری نے اور نبیرۂ اقبال آزاد اقبال کا تعارف سید مظفر حسین برنی نے کرایا ہے۔ ان حضرات کے کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال نے اپنے عہد کے شعرا کو کس طرح متاثر کیا تھا۔

چھٹے باب میں اقبال پر شائع ہونے والی چار اہم کتابوں کا تجزیہ کیا گیا ہے اور دو کتابوں کے مکمل عکس بھی شائع کر دیے گئے ہیں۔

'اکبری اقبال' اکبرالہ آبادی کے رنگ میں اقبال کی ایک نظم ہے جو اب نایاب ہے۔ اسی طرح شیخ اعجاز احمد کی کتاب 'مظلوم اقبال' اور عامر منظر زبیری کی کتاب 'خد و خال اقبال' اب نایاب ہیں۔ ان کتابوں کے حوالے مختلف مضامین میں ضرور ملتے ہیں۔ لیکن ان کی تفصیلات قارئین اقبال کی نگاہ میں نہیں تھیں۔ ان کتابوں کے تعارف اور تجزیے سے اقبالیات میں دلچسپی رکھنے والوں اور اقبال پر تحقیقی کام کرنے والوں کو یقیناً فائدہ ہوگا۔

اس باب کی چوتھی کتاب سعید اختر درانی کی تازہ اور اہم تحقیق 'اقبال یورپ میں' ہے یہ کتاب ابھی کچھ عرصہ پہلے شائع ہوئی ہے اس سے اقبال کے بارے میں بہت سی نئی باتیں سامنے آتی ہیں جو اقبال کی شخصیت پر نئے زاویوں سے روشنی ڈالتی ہیں۔ اس کتاب میں اقبال کے چند سے غیر مطبوعہ خطوط اور ان کے عکس شامل ہیں۔ ان تمام خطوط اور دوسری اہم دستاویزات کو ان کے عکس کے ساتھ اس باب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ باب اقبال کی زندگی، تعلیم، قیام یورپ اور شاعری کے بارے میں اہم معلومات کا حامل ہے۔

ساتواں باب تصانیف اقبال سے متعلق ہے شروع میں تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی جائزہ افتخار امام صدیقی نے لیا ہے۔ اس حصے کو انھوں نے مکاتیب اقبال کے مجموعے، نثری مجموعے، ملفوظات اور دیگر تصانیف میں تقسیم کیا ہے اور تقریباً اسّی صفحات میں اقبال کی تمام تصانیف کا مختصر مگر جامع تعارف دیا گیا ہے۔ بیشتر تصانیف کی اشاعت اول کے پہلے صفحات کے عکس بھی فراہم کر دیے گئے ہیں اور ان کی مختلف اشاعتوں سے متعلق سائز، طابع، ناشر، سنہ اشاعت، ملنے کے پتے، قیمت وغیرہ کے بارے میں بھی تفصیلات درج کر دی گئی ہیں۔

آٹھواں باب 'نوادرات اقبال' پر مشتمل ہے اس میں گزشتہ کچھ عرصے میں اقبال سے متعلق جو معلومات یا ان کے جو خطوط ملے ہیں انھیں اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ اس کے اہم مشمولات میں اقبال کے پانچ خطوط، جمع و ترتیب سید مظفر حسین برنی، ملفوظات اقبال، مرتبہ اکبر حیدری کاشمیری، نوادرات اقبال جمع و ترتیب ادارہ شاعر، اقبال کے خطوط بنام محمد عبدالجلیل بنگلوری، دو غیر مطبوعہ خطوط اور مدارس و بنگلور کے سفر سے متعلق بعض دعوت ناموں، سپاس ناموں، خطبات اور تقاریر کی تفصیلات ہیں جنھیں ظفر احمد اسلام الظفر کے تعارف کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اسی حصے میں اقبال اور ان کے اہل و عیال سے متعلق اکبر علی خان عرشی زادہ کا ایک دستاویزی مجموعہ ہے۔ یہ حصہ اقبال کی ازدواجی زندگی، بیٹوں سے ان کے تعلق اور ان کی زندگی کے بعض دھندلے گوشوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اقبال کے ان کے بیٹوں اور بیویوں سے تعلق کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مظلوم اقبال میں مشمولہ اقبال کے خطوط میں کس رعونت کی طرف بھی لوگوں نے اشارے کیے ہیں۔ کبھی ان کے بیٹے اور بیوی پر الزام لگایا گیا اور کبھی اقبال پر۔ اس سلسلے میں افتخار امام صدیقی نے اقبال کی ازدواجی زندگی کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے بڑی منصفانہ بات لکھی کہ

"۔۔۔۔ علامہ اقبال اور آفتاب
دونوں ہی اپنے اپنے دلوں میں
حق بجانب تھے میرے خیال میں تو
ہر اس شخص کو اپنی داخلی زندگی میں
جھانک لینا چاہیے جو علامہ اقبال
کی ازدواجی زندگی کے دونوں پہلوؤں
پر لکھتے ہوئے یک طرفہ اور انتہا پسند
ہو جاتا ہے۔"

اس حصے میں وہ تمام خطوط اور دستاویزات کی نقل کے ساتھ ان کے عکس بھی شائع کر دیے گئے ہیں جو کسی طرح بھی اقبال کی خانگی اور ازدواجی زندگی پر روشنی ڈال سکتے تھے۔ عکس کی اشاعت سے نمبر کے صفحات ضرور بڑھ گئے لیکن اقبال پر کام کرنے والوں کے لیے ایک ایسا بیش قیمت سرمایہ ایک جگہ جمع ہو گیا جس کے حصول کے لیے لوگوں کو نہ جانے کہاں کہاں سر مارنا پڑتا۔ یہ اقبال خصوصی نمبروں کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے اس میں اقبال کی شخصیت کے ہر پہلو کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ خواہ ان کی خوبیاں ہوں یا کوتاہیاں۔ اس کے علاوہ اس کی ترتیب میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ پیغامبر اقبال، حکیم و فلسفی اقبال اور مظلوم اقبال کے مقابلے 'انسان اقبال' اور شاعر اقبال کا مطالعہ کیا جا۔ اس انداز پر اس کی ترتیب اور اصل دستاویز، خطوط اور کتابوں کی فراہمی اور ان کا تجزیہ آسان کام نہیں تھا۔ افتخار امام صدیقی اور ادارہ شاعر اس کام کے لیے صرف مبارکباد کے نہیں بلکہ ... کے مستحق ہیں۔ اردو اداروں اور اکیڈمیوں کو ... پر ضرور غور کرنا چاہیے۔ شاعر کا یہ نمبر اقبال کے مطالعے اور تحقیق کے سلسلے میں ایک ناگزیر دستاویز ہے۔

نام کتاب : سازِ اودھی میں نغمۂ غالب
مترجم : پروفیسر نورالحسن ہاشمی
قیمت : ۶ روپے
ناشر : نورالحسن ہاشمی مطب پرانی گنج، لکھنؤ

غالب کا ترجمہ بہت سی زبانوں میں ہو چکا اور ترجمے کا یہ سلسلہ غالب شناسی کے ساتھ ساتھ بڑھتا جا رہا ہے۔ پروفیسر نورالحسن ہاشمی کا ترجمہ منظوم ہے اور اودھی میں ہے۔ یہ ترجمہ بے حد دلچسپ اور خوبصورت ہے۔ ہاشمی صاحب نے غالب کے پورے دیوان کا ترجمہ نہیں کیا بلکہ منتخب سو اشعار کا ترجمہ کیا ہے۔ ان میں سات اشعار فارسی کلام کے بھی شامل ہیں۔ مثلاً دیوان کے پہلے شعر کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

وستر پہیرے کا گد کیرا، پتر اک اک جلائے
گو نہے چنچل اپنے کلم سے ہم کا دہس بتائے

ح ایک اور شعر کا ترجمہ دیکھیے: ؎
سن اے غارت گرِ جنسِ وفا سن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

سُن لے لوٹن ہارے من کے، سُن لے کان کھول
ٹوٹے من کا بول گھٹے تا، وہ کا بول امول

ں ترجمے سے ذہن میں کئی سوال ترجمے کے بارے
یدا ہوتے ہیں۔ اوّل کیا کسی زبان کی شاعری کو
ی زبان کی شاعری میں اس کی تمام نزاکتوں کے
منتقل کیا جاسکتا ہے۔ کیا مترجم کو اس کا حق
، وہ اصل میں اضافہ یا ترمیم کر دے۔ یہ اضافہ
ے کس حد تک جائز ہے۔ ظاہر ہے ترجمہ بہت
کام ہے۔ پھر شعر کا شعر میں ترجمہ مشکل ترین عمل ہے۔
ں اصل کے ساتھ پورا انصاف مشکل ہی نہیں تقریباً
ہے۔ اس کے بعد ترجمے کی اہمیت سے انکار نہیں
سکتا۔ اس لیے ترجمے میں حذف و اضافے کے بجائے
س بات کو دیکھنا چاہیے کہ اصل شاعر کا مفہوم
یں تبدیل نہ ہو جائے یا وہ بات لکھی جائے جو
ے اصل میں موجود نہ ہو۔ غالب اور دوسرے
کے بعض ترجموں میں مترجموں نے زیادہ آزادی
ہے جس کی وجہ سے وہ ترجمے نہیں رہ گئے ہیں
پروفیسر ہاشمی نے ترجمہ دوہے کے انداز پر
ے۔ یعنی ہر شعر کا ترجمہ مطلع کی شکل میں ہے اور
ں اصل شعر کے قوافی یا ردیف کو اہمیت نہیں
ہے بلکہ مفہوم کی ضرورت کے مطابق دوہے کے
ں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ہاشمی صاحب نے غالب
دھی میں منتقل کرنے میں کہیں کہیں زیادہ آزادی
ہے، لیکن انہوں نے اس بات کا خاص طور
ل رکھا ہے کہ غالب کا مفہوم تبدیل نہ ہونے
پائے۔ اس کے لیے انہوں نے غالب کے شعر کے بعد
پہلے اس کا مطلب نثر میں لکھا ہے اور پھر اس کا
اودھی ترجمہ لکھا ہے۔ اودھی میں غالب کا یہ پہلا ترجمہ
ہے۔ اس خوب صورت اور دل چسپ ترجمے سے یقیناً
نئے ترجموں کے لیے راہیں کھلیں گی۔

شارب ردولوی

نام کتاب: منٹو نامہ
مصنف: جگدیش چندر ودھاون
ناشر: جگدیش چندر ودھاون، ۱۶۴۔ مکرجی نگر ایسٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۹
قیمت: ایک سو اسّی روپے

منٹو کی کہانیوں میں ایک کہانی منٹو کی اپنی ذات بھی ہے۔ شاید اسی لیے منٹو کے شیدائیوں میں ایسے اصحاب بھی شامل ہیں، جن کی بابت یہ فیصلہ مشکل ہے کہ ان کی اصل دل چسپی کا محور منٹو کی تحریریں ہیں یا اس کی زندگی۔ اردو افسانے کی پوری تاریخ میں بحیثیت افسانہ نگار یہ امتیاز بھی منٹو کو حاصل ہے کہ اُسے وہ لوگ بھی معرکے کا لکھنے والا سمجھتے تھے جنہوں نے کبھی منٹو کی کوئی تحریر نہیں پڑھی تھی۔ آدمی کا سایہ اُس کی اپنی ہستی سے بڑا ہو جائے تو وہ جیتے جی داستان بن جاتا ہے۔ یہی صورتِ حال منٹو کے ساتھ بھی ہے۔ پچھلے چند برسوں میں جتنی باتیں اور بحثیں منٹو کے بارے میں ہوتی رہی ہیں، اتنی کسی بھی دوسرے افسانہ نگار کے بارے میں نہیں ہوئیں۔ منٹو کی کہانیوں پر فلمیں، تھیٹر، ڈرامے، تحقیقی مقالے اور مضامین اور کتابیں، پھر ۱۹۴۷ء کے بعد جو معاشرتی، ذہنی اور سیاسی فضا پیدا ہوئی اس کے پس منظر میں منٹو کی معنویت نئے سرے سے متعین، غرض کہ منٹو کی حیثیت ایک مستقل ادبی، تہذیبی اور اجتماعی حوالے کی ہے۔ ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں میں بھی منٹو کا نام زوروں سے چل رہا ہے۔ بلراج مین را ہندی اور اردو میں منٹو کے کلیات کی ترتیب و تدوین میں معروف ہیں اور منٹو سے متعلق ایک ساتھ کئی کتابیں اشاعت کی راہ دیکھ رہی ہیں۔

جگدیش چندر ودھاون کی کتاب "منٹو نامہ" کو بھی منٹو کی بازیافت کا ہی ایک جز سمجھنا چاہیے۔ یہ کتاب منٹو سے ایک عشق کا حاصل ہے۔ ودھاون صاحب پیشے کے لحاظ سے صنعت کار ہیں۔ لگ بھگ ستر برس کی عمر۔ سیاسیات کے ایم۔ اے ہیں اور ادب سے ان کی دل چسپی قطعی غیر رسمی اور شخصی نوعیت کی ہے۔ اصطلاحی معنوں میں نہ ادیب نہ نقّاد۔ مگر منٹو سے ان کی وابستگی ایسی سچی اور پکّی ہے کہ منٹو کے بہت سے باضابطہ نقّادوں کو بھی اس پر رشک آئے گا۔ کمال کی بات یہ ہے کہ اس عمر میں انہوں نے نہ صرف یہ کہ منٹو کو ایک غیر معمولی طالب علمانہ انہماک کے ساتھ پڑھا، ایک خاصی بھاری بھرکم کتاب بھی منٹو کے بارے میں لکھ ڈالی۔ "منٹو نامہ" پانچ سو انیس صفحات پر مشتمل ہے ــ لیکن کتاب کے ابتدائی صفحات سے ہمیں یہ اطلاع بھی ملتی ہے کہ ودھاون صاحب نے اصل مسودے کو خاصا مختصر کرنے کے بعد یہ کتاب اپنی موجودہ صورت میں شائع کی ہے۔

اس کتاب کے دو حصّے ہیں اور دونوں کا حجم تقریباً یکساں ہے۔ ودھاون صاحب نے پہلے حصّے میں منٹو کی شخصیت اور سوانح سے بحث کی ہے۔ اور بڑی تفصیل کے ساتھ منٹو کی زندگی کا حال احوال اور اس کی شخصیت کا خاکہ مرتب کیا ہے۔ دوسرے حصّے میں منٹو کے فن پر مختلف عنوانات کے تحت اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اس حصّے کے آخر میں منٹو کے بعض اہم اور متنازع فیہ افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

کتاب بہت سلیقے کے ساتھ ترتیب دی گئی ہے، خاص طور پر شخصیت اور سوانح کی تفصیلات کے باب میں ساری جاں کاہی اور خوش نظمی آئے دن چھپنے والے تحقیقی مقالوں میں کبھی خال خال ہی دکھائی دیتی ہے۔ جہاں تک منٹو کے فنی اور تخلیقی تجزیے کا سوال ہے، ودھاون صاحب نے سیدھے سادے انداز میں اپنی باتیں کہہ دی ہیں۔ (بقیہ صفحہ ۵۳ پر)

مکتوبات

غلطی ہائے مضامین

"آج کل" ستمبر ۱۹۸۹ء میں شائع شدہ شہزاد منظر کے مضمون "قاضی عبدالودود اور افسانوی ادب" سے مجھے بطور خاص دلچسپی پیدا ہوئی۔ انہوں نے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے جس پر ابھی تک کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ اس کے لیے وہ داد کے مستحق ہیں، لیکن شہزاد منظر کے بعض بیانات غیر ذمہ دارانہ ہیں اور بعض نہایت سرسری۔

(۱) دراصل ماہنامہ "معیار" پٹنہ (مدیر قاضی عبدالودود) کے کُل پانچ شمارے منظرِ عام پر آئے۔ آخری شمارہ جولائی، اگست ۳۶ء کی مشترکہ اشاعت تھی جس پر "شمارہ" (شمارہ نہیں) "۵ و ۶" درج ہے۔ اس نے کُل "پانچ یا چھ شمارے" کہہ کر شک پیدا کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۲) "انگارے" کا سنِ اشاعت ۱۹۳۳ء نہیں ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۳۲ء کے اواخر میں شائع ہوا۔ اور ۳۳ء کے اوائل میں اس پر پابندی لگا دی گئی۔ تحقیق سے بھی یہ ثابت ہے اور خود سجاد ظہیر نے بھی مجھے یہی بتایا تھا۔ اس مجموعے پر سنِ اشاعت درج نہیں ہے۔ "انگارے" دراصل ان لوگوں کی نظر سے بھی نہیں گزری ہے جو اس کا ذکر طمطراق سے کرتے رہتے ہیں۔ یہ کتاب کراؤن سائز کے ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ شروع میں دو صفحات اور ہیں جن پر کوئی صفحہ نمبر نہیں ہے۔ ان میں سے پہلے صفحے پر کتاب کا نام وغیرہ ہے۔ اسے میں ہو بہو نقل کر رہا ہوں۔ کیوں کہ اس سے کئی معلومات حاصل ہوتی ہیں:

انگارے

دس مختصر کہانیوں کا مجموعہ

از

سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں، محمود الظفر

پبلشر: سید سجاد ظہیر، بٹلر گنج، لکھنؤ

باہتمام مرزا محمد جواد نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ میں چھپا۔

بار اوّل تعدادِ اشاعت: ۱۰۰۰ قیمت: ۸؍

دوسرے صفحے پر فہرست ہے۔ اس مجموعے میں سجاد ظہیر کی پانچ کہانیاں (نیند نہیں آتی، جنت کی بشارت، گرمیوں کی ایک رات، دلاری، پھر یہ ہنگامہ) احمد علی کے دو افسانے (بادل نہیں آتے، مہاوٹوں کی ایک رات) رشید جہاں کا ایک افسانہ (دلّی کی سیر) اور ایک ایکٹ کا ایک ڈرامہ (پردے کے پیچھے) اور محمود الظفر کی ایک کہانی (جواں مردی) شامل ہیں۔

(۳) افسانوی ادب سے قاضی عبدالودود کا تعلق ظاہر کرنے کے لیے شہزاد منظر نے "معیار" کی فائل کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ "معیار" میں قاضی عبدالودود کا ایک طبعزاد افسانہ، ایک مغربی افسانہ اور ایک ڈرامے کے ترجمے شامل ہیں۔ یہ تینوں فرضی ناموں سے ہیں ــــــ ان کے علاوہ "عالمی ادب" کے جائزے اور اردو کے بعض رسائل اور کتابوں کے تبصروں کے دوران قاضی صاحب نے افسانوں اور ناولوں وغیرہ پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ لیکن تخلیقی ادب سے دلچسپی کی بنا پر انہیں "تخلیقی فن کار" قرار دینا سراسر غیر تنقیدی رویہ ہے۔ شہزاد منظر نے اس کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا کہ قاضی صاحب کو فکشن اور ڈرامے سے کب اور کیسے دلچسپی پیدا ہوئی، کیوں کہ "معیار" کے مطالعے سے اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ان کی نظر قاضی عبدالودود کی مختصر خود نوشت "میں کون ہوں، میں کیا ہوں" پر نہیں پڑی، جو "معاصر" پٹنہ کے "قاضی عبدالودود نمبر" میں شامل ہے۔ اس کے یہ اقتباسات قابلِ توجہ ہیں:

"میرے والد کو داستانِ امیر حمزہ کے مطالعے کا شوق تھا۔ اور ان کے پاس اس کی بہت سی جلدیں تھیں۔ میں نے یہ سب بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھیں۔ "بوستانِ خیال" کی ایک جلد کہیں اور ملی، مگر اس میں میرا دل نہ لگا۔ بعد کو میں نے سرشار کے ناول اور رینالڈس کے ناول کے تراجم دیکھے۔ پریم چند کی بہت سی کہانیاں بھی پڑھیں۔ بعنوانِ شباب میں، میں نے خود رومانی انداز کی ایک کہانی لکھی۔ اس کا عنوان مجھے یاد نہیں۔ یہ "آگرہ اخبار" میں ایک فرضی نام (جذباتِ حسرت کا مصوّر) سے چھپی تھی۔ میں بلگرامی ٹیوٹوریل کالج میں داخل ہوا تو میں نے بہت سے انگریزی ناول دیکھے۔ اور یہ سلسلہ پٹنہ واپس آنے کے بعد بھی جاری رہا۔ یورپ میں شاعری کی بہ نسبت مجھے ناول دیکھنے کا زیادہ شوق رہا اور انگلستان، فرانس، اٹلی، اسپین، ناروے، روس، جرمنی اور امریکہ کا شاید ہی کوئی بڑا ناول لکھنے

والا ہو، جس کے ناول میری نظر سے نہ گزرے ہوں۔ میرے زمانۂ اقامتِ یورپ میں جیمس جوائس کا اور مارسل پروست کا بہت چرچا تھا۔ یورپ سے واپسی کے بعد بھی میری دلچسپی ناولوں سے باقی رہی اور میں نے "معیار" کے لیے خود بھی ایک کہانی لکھی جو ایک فرضی نام سے اس میں شائع ہوئی۔ کہانی کا عنوان "ایک ہونہار نوجوان" ہے۔ میں نے دو تین کہانیوں کا انگریزی سے ترجمہ بھی کیا ہے۔"

"مجھے ڈراموں سے واقعی دلچسپی اس وقت ہوئی جب میں نے انگلستان میں تھئیٹر میں ڈرامے دیکھے۔ میرے زمانۂ اقامتِ انگلستان میں کوئی اہم ڈرامہ جو وہاں اسٹیج ہوا ہو، ایسا نہ تھا جو میں نے نہ دیکھا ہو۔ یونانیوں کے ڈراموں سے لے کر پرانڈیلو (اطالوی تمثیل نگار جس کا اس زمانے میں بڑا چرچا تھا) تک کوئی بڑا تمثیل نگار نہیں، جس کے ڈرامے میں نے نہ دیکھے ہوں۔"

(۴) شہزاد منظر کا ایک اور غیر ذمہ دارانہ بیان یہ ہے :

"قاضی صاحب نے اس دور میں نہ صرف طبع زاد افسانے لکھے بلکہ اس عہد کے بعض مغربی مصنفوں مثلاً مولیئر، کیتھرین پار، موریس میترلنک، ولیم گر ہارڈی اور و۔ و۔ جیکبس کے افسانوں اور ڈراموں کے ترجمے بھی کیے۔"

پہلی بات تو یہ ہے کہ قاضی صاحب نے "معیار" کے دور میں صرف ایک طبعزاد افسانہ لکھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ "معیار" میں مولیئر اور موریس میترلنک کے جو تراجم ہیں وہ آرزو جلیلی کے کیے ہوئے ہیں۔ ولیم گر ہارڈی کے افسانے کا ترجمہ محمد ادیب کا ہے۔ کیتھرین پار کسی مصنف کا نام نہیں ہے، بلکہ موریس بیرنگ کے ایک ڈرامے کا نام "کیتھرین پار کہ" ہے جس کا ترجمہ قاضی صاحب نے فرضی نام سے کیا ہے۔ و۔ و۔ جیکبس کے افسانے کا ترجمہ بھی فرضی نام سے قاضی صاحب نے کیا ہے۔ ان کے کل یہی دو ترجمے "معیار" میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ قاضی صاحب کا کوئی ترجمہ کہیں نہیں چھپا۔

(۵) شہزاد منظر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ قاضی صاحب نے جس زمانے میں میکسیم گورکی پر قلم اٹھایا اس وقت برطانوی حکومت نے ہر طرح کے اشتراکی لٹریچر پر پابندی عائد کر رکھی تھی اور لوگ گورکی کے نام سے زیادہ واقف نہیں تھے۔ اور سعادت حسن منٹو نے اس وقت تک "عالمگیر" اور "ہمایوں" کا "روسی ادب نمبر" مرتب نہیں کیا تھا۔

مجھے اندازہ نہ تھا کہ شہزاد منظر ادب کو بھی اخبار کی طرح پڑھتے ہیں۔ جس تحریر کو وہ قاضی صاحب سے منسوب کر رہے ہیں۔ وہ سرے سے ان کی ہے ہی نہیں۔ میکسیم گورکی کے انتقال کے بعد جو تعزیتی نوٹ "معیار" کے آخری شمارے جولائی، اگست ۱۹۳۶ء (صرف جولائی نہیں) میں صفحات ۲۷۷ اور ۲۷۸ (صرف ۲۷۷ نہیں) پر شائع ہوا۔ وہ آرزو جلیلی کا لکھا ہوا ہے۔ فہرست کے صفحہ ۲۷۳ پر بھی یہ درج ہے۔ اور تعزیتی نوٹ (یادِ رفتگاں) کے صفحہ ۲۷۷ پر بھی۔ یہ مضمون نگار کی ایک ناقابلِ معافی بے احتیاطی ہے۔ آرزو جلیلی "معیار" کے معاون مدیر تھے اور ان کا نام ہر شمارے میں قاضی عبدالودود کے ساتھ ساتھ شائع ہوا ہے۔ "معیار" میں ان کے لکھے ہوئے کئی مضامین، تبصرے اور افسانے، ڈرامے کے ترجمے شامل ہیں، آرزو جلیلی سائنس کے پروفیسر تھے۔ کم عمری میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۶ء کے دوران "معیار" "اردو" (مدیر: عبدالحق) "ہمایوں" "ادبی دنیا" "ادبِ لطیف" "ساقی" وغیرہ میں ان کے بے حد وقیع مضامین شائع ہوئے۔ چند عنوانات سے ہی ان کی تبحرِ علمی کا اندازہ ہو سکتا ہے :

قدیم چینی شاعری	ساقی
پوچوئی (آٹھویں صدی کا چینی شاعر)	اردو
کہکشاں (سائنسی نقطۂ نظر سے)	ہمایوں
میترلنک اور اس کی ذہنی مخلوق	ادبِ لطیف
مصطلحاتِ علمیہ	ادبی دنیا
اندر سبھا کے متعلق چند غلط فہمیاں	معیار

طبع زاد مضامین لکھنے کے علاوہ آرزو جلیلی نے مولیئر، میترلنک، موپاساں اور اسی قبیل کے بلند پایہ مغربی مصنفین کے افسانے اور ڈرامے اردو میں منتقل کیے۔ انہوں نے اپنی نگارشات کی داد میرزا ادیب (ادبِ لطیف) منصور احمد (ہمایوں) اور شاہد احمد دہلوی (ساقی) وغیرہ سے حاصل کی۔

"معیار" میں میکسیم گورکی پر جو تعزیتی نوٹ ہے وہ ایک مختصر مضمون کی حیثیت رکھتا ہے اور آرزو جلیلی کے علم، مطالعہ اور تنقیدی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ شہزاد منظر نے اسے قاضی عبدالودود کی تحریر بتا کر تقریباً سارے کا سارا مضمون اقتباسات کی صورت میں پیش کر دیا ہے جو "آج کل" کے پورے ایک صفحہ پر پھیلا ہے۔

اب رہا گورکی اور روسی ادب کے تعلق سے شہزاد منظر کا بیان :

انہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ جو تھائی دہائی کے آغاز سے ہی اشتراکی خیالات ہندوستان میں عام ہونے لگے تھے اور روسی ادیبوں کی نگارشات کے ترجمے اردو کے موقر رسالوں میں دکھائی دے رہے تھے۔ منٹو کی کتاب "روسی افسانے" ۱۹۳۴ء میں مشہور اشتراکی ادیب باری (علیگ) کے دیباچے کے ساتھ شائع ہوئی۔ اس میں گورکی کا بھی ایک افسانہ "فرد کی شکست" کے نام سے شامل ہے

ان کے افسانوں کے کئی تراجم پہلے ہی "ہمایوں" میں شائع ہو چکے تھے۔ "ہمایوں" لاہور کا "روسی ادب نمبر" مئی ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ منٹو اس کے باقاعدہ مرتب نہیں تھے، لیکن انہوں نے اس کے ایڈیٹر حامد علی خاں کا سب سے زیادہ ہاتھ بٹایا تھا۔ اس میں منٹو کے گیارہ تراجم تھے۔ اور دو طبعزاد مضامین۔ اس میں سے ایک نہایت وقیع مضمون "روسی ادب پر ایک طائرانہ نظر" ہے۔ اس میں دوسرے ادیبوں کے علاوہ گورکی کا بھی شایانِ شان تعارف کرایا گیا۔

صدیق حسن صاحب میرے پڑوسی ہیں۔ علی گڑھ میں سرگرم اشتراکی کارکن رہ چکے ہیں۔ ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھے۔ سعادت حسن منٹو اور شاہد لطیف ان کے ہم سبق تھے۔ صدیق حسن صاحب نے بتایا کہ "بالشویک پارٹی کی تاریخ" کے علاوہ ان دنوں کسی روسی ادب پر پابندی نہ تھی اور میکسیم گورکی وغیرہ کی نگارشات سے ہم لوگ بخوبی آشنا تھے۔ اسی زمانے میں سردار جعفری علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں شریک ہوئے۔ انہوں نے "لکھنؤ کی پانچ راتیں" میں لکھا ہے کہ منٹو انہیں اپنے کمرے میں لے گئے۔ جہاں انہوں نے منٹو کی ایک تصویر ان کے دوستوں کے ساتھ دیکھی جس کی پشت پر گورکی کا ایک اقتباس تھا۔ جعفری نے یہ بھی لکھا ہے کہ منٹو نے انہیں وکٹر ہیوگو اور گورکی سے آشنا کیا۔ "عالمگیر" لاہور کا "روسی ادب نمبر" پورے کا پورا منٹو کا مرتب کیا ہوا ہے۔ اس نمبر میں بطور تعارف "منٹو نے بائیس صفحات پر مشتمل ایک اہم مضمون لکھا ہے جس میں روسی ادب اور ادیبوں پر بشمول میکسیم گورکی سیر حاصل تبصرہ ہے۔ اسی نمبر میں منٹو کا ایک مضمون "میکسیم گورکی کی تصانیف پر ایک نظر" بھی ہے۔ جس میں انہوں نے گورکی کے فن سے بحث کی ہے اور دوسرے اہم روسی ادیبوں مثلاً طالسطائی اور چیخوف سے اس کا تقابلی مطالعہ پیش کرتے ہوئے اپنی تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ مختصر یہ کہ جب "معیار" میں گورکی پر تعزیتی نوٹ چھپا ہے اس وقت گورکی کے نام سے اردو داں طبقہ واقف تھا، اور "ہمایوں" کا روسی ادب نمبر" شائع ہو چکا تھا۔ "عالمگیر" کا روسی ادب ممکن ہے اس وقت تک شائع نہ ہوا ہو، لیکن اس کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔

شہزاد منظر کے لیے یہ بات بھی دلچسپی کا باعث ہوگی کہ جس مہینے "معیار" میں میکسیم گورکی پر آرزو جلیلی کا نوٹ شائع ہوا، اسی مہینے یعنی اگست ۱۹۳۶ء کے "ساقی" میں سعادت حسن منٹو کا تعزیتی مضمون بہ عنوان "میکسیم گورکی" شائع ہوا جو چار صفحات پر محیط ہے۔

(۶) جاسوسی ادب کے تعلق سے قاضی عبدالودود کے ایک تبصرے کا اقتباس شہزاد منظر نے پیش کیا ہے۔ لیکن اس کی آخری آٹھ سطریں بے محل، بے موقع اور غیر متعلق ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ خالی الذہن ہو کر یہ اقتباس نقل کیا گیا ہے۔

[illegible]

(۷) "سحرِ بنگال" میں طاہرہ دیوی شیرازی کے نام سے شائع شدہ تصویر کو "خوب صورت بنگالی حسینہ" کی تصویر قرار دینا ناظرین کے ذوقِ جمال پر حملہ ہے۔ اس سے قطع نظر کہ خوب صورت کے ساتھ حسینہ کی اضافی صفت عجیب ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شہزاد منظر نے یہ تصویر نہیں دیکھی جو پہلے نومبر ۱۹۳۲ء کے "ساقی" میں پورے صفحہ پر اور پھر "سحرِ بنگال" میں نسبتاً چھوٹے سائز میں شائع ہوئی۔ یہ ایک فربہ اندام، بھاری چہرے والی، زیورات سے لیس خاتون کی تصویر ہے۔ یہ عکسی تصویر نہیں معلوم ہوتی۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی مصور نے تصویر بنا کر اس کا عکس لیا گیا ہے۔

منظر امام، سری نگر

دردبھرا احساس:

بہت دن بعد تلخ صاحب کی تحریر پڑھی۔ "اپنے کھو جانے کا" ایک دردبھرا احساس" دیکھا۔ واقعی وہ اپنے ہونے کے احساس کو دبا نہ سکے۔ میں تو آپ سے ہمیشہ عرض کرتا رہا ہوں کہ اردو ادب سے روٹھے ہوئے لوگوں کو منائیں اور آپ بہت حد تک کامیاب بھی ہیں۔ بیرراجہ جیسے کہانی کاروں کی واپسی اور تلخ جیسے شاعر اور نثر نگاروں کا ہم لوگوں کے درمیان رہنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ جانیے کہ ہماری نسل ان درمیانے لوگوں کی نذر ہو جائے گی ــــ مجھے یاد آیا کہ ظفر اقبال (پاکستان) نے شاعری میں درمیانے لوگوں کے غلبے کی وجہ اصیل شعراء کی کنارہ کشی بتایا ہے۔

من موہن تلخ نے پرانے عظیم شعراء کے حوالے سے ذاتی تجزیوں کی روشنی میں کئی بڑی بڑی باتیں کہہ دی ہیں۔ آپ کے حوالے (سے) تلخ صاحب سے ملاقاتیں تو ہوتی رہیں۔ مگر اُن میں ذاتی طور پر میں نے کوئی تلخی نہیں پائی۔ یا پھر انہوں نے اپنے بڑوں سے جو شفقت پائی، اپنے چھوٹوں میں تقسیم کر رہے ہوں ــــ "آج تو خیر دور ہی چھوٹوں کا ہے۔" اُن کا یہ جملہ بے شوند کے ہاتھیوں کے لیے بھرپور ہے۔

سبطین اخگر، بدایوں

اُردو کا مقبولِ عام مصور ماہ نامہ

آج کل
نئی دہلی

مہمان مُدیر
راج نرائن رازؔ

سب ایڈیٹر
خورشید اکرم

جلد: ۴۸
شمارہ: ۷
فروری ۱۹۹۰ء
ماگھ۔پھاگن شک سمبت ۱۹۱۱

قیمت: دو روپے — فون: ۳۸۷۰۶۹

سرورق: ایم۔ ایم۔ ملک

اندرونِ ملک زرِ سالانہ: ۲۰ روپے
دو سال کے لیے: ۳۶ روپے
تین سال کے لیے: ۴۸ روپے

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر: آج کل (اُردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

پروڈکشن آفیسر: آر۔ ایس۔ منہال

ترسیلِ زر کا پتہ:
بزنس منیجر: پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترتیب

خود کفالت کی جانب پیش رفت

پروفیسر مدھو ڈنڈوتے (مرکزی وزیر خزانہ)

میرے عبوری بجٹ پیش کرنے کی وجوہات بہت واضح ہیں۔ میں پچھلی حکومت کے تیار کردہ ڈھانچے کی بنیاد پر اپنا خاکہ تیار کرنا نہیں چاہتا۔ بعض تجربے اور نئے کام شروع کیے جانے ہیں۔ اس کے بعد ہی میں بجٹ پیش کرنا چاہوں گا، لیکن اس سے پہلے ہم اقتصادی صورتِ حال کے بارے میں اہلِ وطن کو آگاہ کرنا چاہیں گے۔ یہی سبب ہے کہ ہم نے موجودہ اقتصادی صورتِ حال کی ایک رپورٹ حال ہی میں عوام کے سامنے پیش کی ہے۔ یہاں میں ایک بات کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔ ہمارے ایک ترجمان نے کہا تھا کہ حکومت کے خزانے کے صندوق خالی ہیں۔ یہ صورتِ حال بتانے کا ایک اشاراتی انداز جس سے اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جائے۔ اس کو لغوی معنوں میں نہیں لیا جانا چاہیے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اقتصادی صورتِ حال قدرے مایوس کن ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بیان کہ خزانے کے صندوق خالی ہیں، سچ بات کو کم کر کے بیان کرنا ہے۔ کیوں کہ خزانے کے صندوقوں کے خالی ہونے سے کہیں زیادہ بُرا قرضوں کا بوجھ ہے۔ موجودہ شرحوں پر رواں مالی سال کے آخر میں کل قرضہ سو ہزار کروڑ روپے کا ہو جائے گا۔ ایسی صورتِ حال میں قرضہ جاتی خدمات کا تناسب کافی زائد ہوگا۔ ماہرینِ اقتصادیات کی نظر میں ۲۰ فی صد قرضہ جاتی خدمات کا تناسب کافی محفوظ تناسب ہے۔ لیکن جب اس سے تجاوز ہو جاتا ہے تو قرضے کی امداد کو کم کرنے کی فوری کوششیں کی جاتی ہیں۔ میں یہ اعلان نہیں کر رہا کہ قرضے نہیں لیے جائیں گے، لیکن ٹھوس اقدامات کرنے کے لیے کوششیں کی جائیں گی۔

جس طرح ہم بتدریج زیادہ خود کفیل معیشت کے لیے کوشاں ہیں، اس حد تک قرض لینے کی ضرورت قدرتی طور پر کم ہو گی اور اس سے بیرونی قرضوں میں کمی آئے گی۔ اگر آپ مجھ سے ایک سیدھا سوال دریافت کریں کہ کیا میں بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور دیگر مالی اداروں سے قرضہ لوں گا تو میں اس سوال کا واضح جواب نہیں دوں گا۔ لیکن اگر ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے، جس سے دباؤ کے تحت قرضہ لینے کی ضرورت پڑ جائے تو ہم مالی اداروں کی ایسی شرائط قبول نہیں کریں گے جو ہماری اقتصادی اور مالی پالیسیوں کے خلاف ہوں۔

جہاں تک درآمدات اور برآمدات کی پالیسی کا تعلق ہے یہ لائق ستائش ہے۔ ہماری مالی اور اقتصادی پالیسیوں کا زور عام طور پر اس بات پر ہو گا کہ اگر درآمدات ناگزیر ہوں تو بھی درآمدات چیدہ چیدہ اور کچھ خاص خاص چیزوں تک محدود ہو۔ درآمدات کے خاص خاص چیزوں تک محدود ہونے کے معنی ہیں کہ چیدہ چیدہ اشیاء خاص خاص مواقع اور ضرورت میں ہی درآمد کی جائیں۔ مثال کے طور پر جب کیروتیل کا معاملہ طے ہوا تھا تو سرکاری اداروں سے متعلق کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں واضح طور پر کہا تھا کہ تیل کی قیمتوں میں گراوٹ کے وقت زیادہ قیمت پر کیروتیل کا معاملہ طے کرنا دانشمندانہ فعل نہیں ہے۔ اس لحاظ سے وقت کی اہمیت ہے۔ ہمیں اس چیز کو مدِنظر رکھنا ہے تاکہ ہمارا غیر ملکی زرِ مبادلہ برباد نہ ہو جائے۔

بعض ایسے شعبے جہاں جو پیداواری مقاصد کے لیے ضروری ہیں، ان کے لیے کل پرزے اور سازو سامان درآمد کرنا ہوتا ہے۔ اگر اس طرح کے سازو سامان اور متعلقہ کل پرزوں کو درآمد کرنے کے لیے غیر ملکی زرِ مبادلہ کا کافی ذخیرہ نہ ہو تو سارا پیداواری عمل متاثر ہوگا اور ترقیاتی سرگرمیاں بھی متاثر ہوں گی۔ لہٰذا ہمیں غیر ملکی زرِ مبادلہ کی ضرورت ہے۔ اور اس کے لیے ہمیں برآمدات بڑھانی ہوں گی تاکہ ہمارے پاس یہ ذخیرہ ہو سکے۔ لہٰذا بڑی بڑی مشینوں کی درآمد کا سوال بہت اہم ہے۔ اس ضمن میں رہنما ہدایات بہت واضح ہوں گی۔ لیکن اس کا طریقۂ کار تحکمانہ نہیں بلکہ حقیقت پسندانہ ہوگا۔

میں نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ میں تحرک اور خام خیالی کو خلط ملط نہیں کروں گا۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ .... تحرکی ہونا ایک چیز ہے اور خیالی باتیں کرنا دوسری چیز۔ خود کفیل معیشت کی تعمیر کے لیے کثیر قومی اداروں اور مشترکہ کاموں پر زور نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی بعض شعبوں میں بعض مقاصد کیلئے بعض ٹیکنالوجیوں کو درآمد کرنا ہے۔ ایسے معاملوں میں جہاں کہیں بہت ضروری ہوگا۔ ہم اس کا خیر مقدم کریں گے۔ صورتِ حال بہت اچھی نہیں ہے۔ میں معیشت میں اعتماد اور بھروسہ کا عنصر لانا چاہتا ہوں۔ میں ملک

میں اور بیرونِ ملک ایسا ماحول پیدا کرنا چاہوں گا۔ جس سے سرمایہ کاری ہو اور عوام اس بات کا اندازہ لگا سکیں کہ سرمایہ کاری فائدہ مند ہوگی یا نہیں۔ اس کے لیے میں کوئی شک و شبہ پیدا نہیں کرنا چاہوں گا۔ اس کے لیے میں سرمایہ مارکیٹ کے تاثرات واضح کروں گا۔ ان کا ابتدائی ردِ عمل حالات کا جائزہ لینے اور انتظار کرنے کا تھا اور وہ ایسا ہر ایک کے ساتھ کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت صورتِ حال میں کافی لچک ہے۔ اس کا کافی اچھا ردِ عمل رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بازار کی قوتوں پر ردِ عمل ظاہر کرنے میں ہماری حد بندیاں ہیں .... ہم یہ نہیں چاہیں گے کہ عوام کے غریب ترین طبقات کو معاشی قوتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔

بہت سے عوامل کی وجہ سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ افراطِ زر میں اضافہ ہوا ہے۔ بہت سے ایسے معاملے ہیں جن پر فوری توجہ کرنی ضروری ہے۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ بڑھتا ہوا خسارہ معیشت کے افراطِ زر کے بوجھ میں اضافہ کر رہا ہے۔ یہ بات مکمل طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ اشیاء کی کمی سے کالا بازاری کو فروغ ملتا ہے۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بعض ضوابط اور طریقے اور ٹیکس سے متعلق بعض پالیسیاں قدرے بوجھل ہیں۔ یہ تاخیر کا سبب بنتی ہیں جو ترقی کی راہ میں رکاوٹوں کا باعث ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ قوانین میں بعض کمیاں بدعنوانیوں کو راہ دیتی ہیں۔ لہٰذا نئی سرکار کی پوری توجہ اصول و ضوابط کو سادہ بنانے پر ہوگی چاہے وہ ٹیکس کے قوانین ہوں یا لائسنس دینے کی پالیسی ہو یا انتظامیہ کے ضوابط ہوں۔ ان کو اس طرح سادہ بنایا جائے گا کہ سارا عمل کم بوجھل ہو جائے۔ اکثر جب قوانین بنائے جاتے ہیں تو ماہرین بیٹھ کر خامیاں تلاش کرتے ہیں تاکہ ان سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ ہم اس چیز سے بچنا چاہیں گے۔ اس کے لیے کالا بازاری کو روکنے کے لیے ٹھوس اقدامات کیے جائیں گے۔ ہم اس ناجائز دولت کو تلاش کریں گے اور اسے ختم کریں گے۔

ایک اور میدان فضول اخراجات کا ہے۔ میں اس وقت ہر چیز کو معیاری نہیں بنا رہا ہوں۔ میں اپنا اتسو وغیرہ جیسے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک ہونے والے میلوں کے اخراجات دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے بہت سے اخراجات کی ضرورت نہیں تھی۔ میں فنونِ لطیفہ کے خلاف نہیں ہوں۔ نہ میں اخلاقی طور پر تنگ نظر ہوں، لیکن بالآخر ترجیحات متعین کی جاتی ہیں۔ لہٰذا تمام فضول اخراجات میں کمی لانی ہے۔ مثال کے طور پر اہم شخصیات کے تحفظ پر آنے والا خرچ بہت زیادہ ہے۔ لیکن بعض اوقات نفسیاتی پہلو بھی متاثر کرتے ہیں قیمتوں کے معاملے میں بھی ایسا ہوتا ہے اکثر قلت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے قیمتوں میں اتار چڑھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔

پہلے دن ہم نے اعلان کیا تھا کہ ہم قیمتوں سے متعلق کمیٹی بنائیں گے اور اس بات کو دیکھیں گے۔ قیمتوں پر قابو پانے اور ان میں کمی لانے کے لیے ٹھوس اقدامات کیے جائیں۔ یہ دیکھا گیا کہ جہاں تھوک بیوپاریوں نے بڑی مقدار میں چینی جاری کی۔ وہاں چینی کی قیمتیں گرنے لگیں۔ یہ نفسیاتی پہلو ہیں جو مددگار رہیں گے لہٰذا سادگی کا ماحول بنانا ہوگا تاکہ فضول خرچی کو روکا جا سکے۔

یہ بھی دیکھا جائے گا کہ ملک میں ایسا ماحول پیدا نہ ہو جس سے سرمایہ کاری کے خواہش مند افراد کے دلوں میں معیشت کی اندرونی صلاحیت کے بارے میں شکوک پیدا ہوں۔ میں یہ تاثر پیدا ہونے دینا نہیں چاہتا کہ ہماری معیشت دیوالیہ ہو گئی ہے۔ اس کے برخلاف ہمیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ ہم اپنی معیشت کی طاقت اور اس کے استحکام کو قائم رکھیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ خود کفالت کی جانب پیش رفت غیر ملکی قرضے کے بتدریج بوجھ کو کم کرے گی۔ ہمیں یقین ہے کہ سرمایہ کاری بڑھے گی۔ ہمارا طریقۂ کار متوازن اور عملی ہوگا۔ ●●

بقیہ : ظفر پیامی: "فرار" کے آئینے میں

زندگی کی بصیرت میں اضافے کی بلکہ تبدیلی کی شکل فرار میں یہ ہے کہ ہمارے زمانے کا انسان (خاص طور پر متوسط طبقے کا انسان) ایک قسم کی تن آسانی کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ وہ راہ کی دشواریوں سے بچ کر تن آسانی اور سہولت کی زندگی گزارنے کو نشاطِ زیست جانتا اور مقصدِ حیات گردانتا ہے۔ "مہلک" اور جان لیوا دشواریوں سے دامن بچا کر فرار ہی کو عافیت اور اسی کو عقلمندی بلکہ بہتر مسلکِ حیات جانتا ہے۔ جب کہ اس انسان کو ناول کے آخر میں تجربات اس سے بالکل مختلف نتیجے تک پہنچاتے ہیں اور اس کے اندازِ نظر میں بنیادی تبدیلی پیدا کرتے ہیں یعنی زندگی فرار میں نہیں بلکہ حق گوئی اور حق کی حفاظت کے لیے شجاعت اور شہادت کے مراحل سے گزرنے میں ہے۔

"فرار" میں نثری اسلوب کی کبھی نئی وسعتیں سامنے آئی ہیں۔ فقرے، جملے اور مکالمے ہی نہیں بلکہ فطری مناظر اور جذبے اور شعور کی چنگاریاں جن عبارتوں میں مقیّد ہو گئی ہیں وہ اردو ناول میں یادگار رہنے والی ہیں۔ یہ جملے محض لفظی بازی گری یا اسلوبیاتی صناعی نہیں ہیں بلکہ زندگی کے وسیع مشاہدے اور وسیع تر تجربے سے پھوٹنے والی کیفیات ہیں جو لفظوں میں مجسم ہو گئی ہیں۔

اس لحاظ سے "فرار" جیسے ترشے ترشائے نکھرے ستھرے ناول معاصر ادب میں بہت کم ہیں اور ظفر پیامی کے لیے یہ افتخار کم نہیں کہ ان کے قلم سے ایک ایسے ناول کی تخلیق ہوئی جو روشن خیالی، دردمندی اور تخلیقی بصیرت کا ایک نادر نمونہ ہے۔

محمد حسن

ظفر پیامی: "فرار" کے آئینے میں

ظفر پیامی کا ناول "فرار" ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے :

"اب بھاگتے بھاگتے تھک چکا ہوں۔ اب جینے کو جی چاہتا ہے۔" (صفحہ ۲۳۲)

یہ جملے ناول کے ہیرو تاری کے ہیں اور ان کا رشتہ ڈاکٹر سحر ہاشمی کے ان جملوں سے جڑا ہوا ہے :

"ہم سب جب تک نہیں لڑیں گے اپنے اپنے راونوں کے خلاف اور اپنے اپنے یزیدوں کے خلاف نہ اس مستقل خانہ جنگی کو روک سکیں گے اور نہ موت کی یلغار کو۔" (صفحہ ۲۲۹)

اور اسی کا سلسلہ جڑا ہوا ہے ذرا پہلے کے اس مکالمے سے :

"مگر اگلی لڑائی آپ میں اور ہم میں شاید نہ ہو۔ ہم کسی اور سے بھی لڑ سکتے ہیں۔ آپ لڑیے اپنے ہاں اور ہم لڑتے ہیں اپنے ہاں۔" (صفحہ ۲۲۸)

اور معاملہ سارے ناول کا اسی قدر ہے کہ یہ 'آپ' اور 'ہم' کون ہے اور یہ 'یزید' اور 'راون' کون ہیں جو آپ اور ہم کو لڑاتے تو رہتے ہیں، مگر ان کے خلاف کوئی متحدہ جنگ نہیں ہوتی۔ اور ناول کا بنیادی سوال ان کی پہچان کا بھی اتنا نہیں ہے کہ ان کی طرف ناول نگار صرف چند بلیغ اشارے کرتا ہوا گزر جاتا ہے سوال یہ ہے کہ ان سے نپٹنے کا راستہ کیا ہے۔ تاری کا راستہ یا سحر ہاشمی کا راستہ۔ تاری کا راستہ یہ تھا کہ ہم لڑنا نہیں چاہتے کیوں کہ ہم مرنا نہیں چاہتے اس لیے ہر بار منظر نامہ بدل دیتے ہیں۔ ہندوستان چھوڑ کر پاکستان جا بسے پھر وہاں سے مشرقی پاکستان چلے آئے اور یہاں زمین گرم ہو گئی تو نیپال اور وہاں سے شاید لندن جاتے، مگر سحر ہاشمی کے اس دل آویز جملے نے ارادے تبدیل کر دیے، کردار بدل دیا۔ اور اس بات پر ایمان لانے پر مجبور کر دیا کہ جینے کا راستہ ہر ایک کے لیے ایک ہی ہے اور وہ بھاگنا نہیں ہے۔ لڑ کر جینے کا ہے کہ آج ہم خود ہی ارجن ہیں، خود ہی کرشن اور خود ہی گیتا۔

اب آیئے ذرا دیکھیں کہ یہ مکالمے کن کرداروں کے درمیان ہوئے۔ ایک طرف ہیں تاری اور رکّو مرزا جو برابر ناخوش گوار حالات سے بھاگتے آئے ہیں۔ یہ فرار اتنا بھرپور ہے کہ اپنی پہلی بچی کو ہندوستان چھوڑنے کے بعد مرزا سلیم بیگ کی مطلقہ رکّو سے پانچ سال ساتھ رہنے کے بعد بھی شادی سے مفرور رہے۔ دوسری طرف ہندوستان میں چھوڑی ہوئی بلکہ یوں کہیے کہ ہندوستان چھوڑنے سے انکار کرنے والی بچی سحر ہاشمی اور ان کے درمیان یہ مکالمے اور ان کا مقصد صرف اتنا تھا کہ زندگی خواہ کہیں کی ہو اور کسی معاشرے کی ہو، انسان سے صرف ایک ہی مطالبہ کرتی ہے۔ اور وہ مطالبہ ہے سچائی کی خاطر لڑ کر جینے کا اور اس جہاد میں شہادت بھی شامل ہے۔ اور شجاعت بھی (۲۲۷)

ظفر پیامی کا ناول اسی مسلسل 'جہاد' کا بیان ہے اور کس کس طرح ہر معاشرے اور ملک کے راون اور یزید جہاد لڑنے والوں کی نظروں کو دھندلاتے ہیں۔ اور کیسے کیسے عجیب و غریب اُلجھاوے میں ڈالتے ہیں۔ ان کی داستان "فرار" میں بیان ہوئی ہے۔

پس منظر ہے ۱۹۷۲ء کی لڑائی جو مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان لڑی گئی اور جس میں مشرقی پاکستان کی مدد ہندوستان نے کی اور پھر اس لڑائی نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ ایسی جنگ کہ جس میں لاکھوں آدمی قیدی بنائے گئے (جن میں مسز چغتائی بھی تھیں جو حاملہ تھیں اور اپنے سابق وطن الہ آباد کے جنگی قیدی والے کیمپ میں پہنچ گئی تھیں)

D-7، ماڈل ٹاؤن، دہلی ۱۱۰۰۰۹

اور ہزاروں سپاہی اور ہوا باز بستیوں پر بم گرانے اور انہیں تباہ و برباد کرنے کے 'مقدس' کام میں لگ گئے تھے (اور ان میں سے ایک کیول کوہلی جو اپنے سابقہ وطن لاہور پر بم نہ گرا سکا اور بھارتی سرحد کی طرف بھاگنے کی بجائے ماڈل ٹاؤن لاہور کی طرف بھاگا اور پھر اپنوں ہی کی گولی کا شکار ہو گیا۔

یہی اس ناول کی دنیا ہے۔ سحر ہاشمی جو مقابلہ کرنا جانتی ہے۔ خواب جسے عزیز ہیں اور جس کے لیے ان خوابوں کی تعبیر کا جہاد ہی زندگی ہے۔ مسز چغتائی جو سیاسی گردشوں کے اس گرداب میں پھنسی ہوئی ہیں۔ کیول جو اپنے وطن کی مٹی کی سگندھ بھلا نہیں سکا؛ تاری اور رگھو مرزا جو آرام سے جینا چاہتے ہیں۔ کچھ لمحے نشاط کے، کچھ گھونٹ شراب کے اور بس۔ ! اور سیاست کی چکی ہے جو راون اور یزید کے ہاتھ لگ گئی ہے۔ اور انسانی رشتوں کو پیس پیس کر سرمہ بنائے ڈالتی ہے۔ کیسا عجیب گھٹالا ہے کہ الہ آباد کی رہنے والی مسز چغتائی خود اپنے ملک' اپنے شہر میں اجنبی ہیں اور کیول اپنے شہر میں۔ پھر یہ راولوں اور ان راولوں کے ہم وطن ایک تیسرے ملک بنگلہ دیش میں ایک دوسرے کے مقابل اور ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور اس تیسرے دیس میں اجنبی ہیں۔ اور اس ملک کے لیے لڑ رہے ہیں۔ جہاں وہ پیدا نہیں ہوئے تھے۔ ان کی معاشرتیں اور تہذیبیں انہیں مختلف سمتوں میں گھسیٹتی ہیں اور ان کی سیاسی شہریتیں مختلف سمت میں کھینچ رہی ہیں۔

اور ان سے جذبات کی جو کربلائیں اور مہابھارتیں وجود میں آتی ہیں ان کی ایک جھلک بڑی دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ فرار میں موجود ہے اس خون آشام کھیل میں جب انسانی رشتے اور وابستگیاں گیہوں کے دانوں کی طرح پستی ہیں تو قدریں کیسے بکھرتی ہیں اور کیسے کیسے ردِ عمل قوسِ قزح کی طرح کھلتے ہیں۔ اور اپنے اندھیرے اور اجالے پھیلاتے ہیں۔ اس کی مثالیں مولانا اکرام کی خوفناک نفرت انگیز تقریر (صفحہ ۸۸)

الہ آباد کے گم نام ہندو اخبار کی فرقہ پرستانہ عبارتیں (صفحہ ۱۵۰)

ملن پیاؤ گروپ والے انقلابی' شونکر مکرجی (صفحہ ۲۰) اور پھر بنگلہ دیش میں مہاجرین کے کیمپ کے اندر کی صورتِ حال میں ملتی ہیں۔

> لاہور کے پروفیسر صدیق پنڈت، تو یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ
> "قومیں جب نزع کے عالم میں ہوتی ہیں تو انہیں
> ذاتی دوستی جیسی نزاکتوں سے درگزر کرنا پڑتا ہے"

(صفحہ ۱۰۴)

مگر "فرار" کے ہر صفحہ پر ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے۔ اور یہ ٹوٹے ہوئے پیمان اور پیمانے گواہ ہیں کہ تاریخ کی بے انصافیوں کی ذمہ دار اقتدار والوں نے کیسے انسانی رشتوں کی ہولی کھیلی ہے اور کیسے اپنے پیاروں کو ایک دوسرے کے لیے اجنبی بنا دیا ہے اور انہیں ایک دوسرے کا خون پینے پر مجبور کیا ہے۔ ایک دوسرے کا ہی نہیں، خود اپنا بھی۔

تقسیم ہندوستان اور ہند و پاک جنگوں پر اردو میں کئی ناول لکھے گئے۔ بنگلہ دیش کی لڑائی پر تو شاید یہ تنہا ناول ہے اور اب چند ماہ پہلے عبدالصمد نے اپنے ناول دو گز زمین میں اس موضوع کو چھوا ہے، لیکن درحقیقت اس قدر لطافتوں اور نزاکتوں کے ساتھ کسی نے اس پر قلم نہیں اٹھایا۔ بلاشبہ ظفر پیامی کا ناول پڑھتے وقت قرۃ العین حیدر کے ناول یاد آتے ہیں۔ مگر درحقیقت یہ شباہتیں سطحی اور اوپری ہیں۔ اوّل تو ظفر پیامی واقعات کی منطق، ترتیب، ربط اور تراش خراش سے کبھی غافل نہیں ہوتے اور اس طرح محض اسلوب کا شکار ہو کر بہکتے نہیں۔ دوسرے ان کے ذہن میں ناول کا مقصد اور اس کی سمت بالکل واضح رہتی ہے اور اسی لیے وہ ہر کردار کو اسی نظام کے تحت مربوط کرتے جاتے ہیں۔ تیسرے ظفر پیامی محض تہذیبی فضا میں محو ہو کر کردار کی اندرونی زندگی اور اس کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے غافل نہیں ہوتے۔

اور یہ آخری خصوصیت انہیں اپنے دور کے اکثر ناول نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ سحر ہاشمی ہوں یا کیول۔ دونوں کردار باطنی تہہ داریوں سے اس قدر بھرپور ہیں کہ اردو ادب میں زندہ جاوید ہو سکتے ہیں۔ اپنی تمام پیچیدگیوں کے باوجود "فرار" کا کوئی بھی کردار محض مصنف کے ہاتھ کا کھلونا نہیں ہے۔ بلکہ اپنی شخصیت، اپنا مزاج اور اپنا شعور رکھتا ہے۔

ناول اگر محض اپنے زمانے کی تاریخ ہوا تو کچھ بھی نہ ہوا۔ کیوں کہ بہرحال تاریخ کی کتابیں اسے دبا لیں گی۔ اگر ناول محض سماجی دستاویز ہوا تو بھی کچھ نہ ہوا۔ کیوں کہ بہرحال دوسری سماجی دستاویزیں اس سے زیادہ مستند قرار پائیں گی۔ ہاں اگر اس کے ذریعے کوئی ایسا جمالیاتی انبساط اور ایسی بصیرت ملے جو دوسرے ذریعوں سے نہ مل سکتی تھی تو البتہ کچھ بات ہے اور "فرار" میں کچھ بات ہے اس طرز کی۔

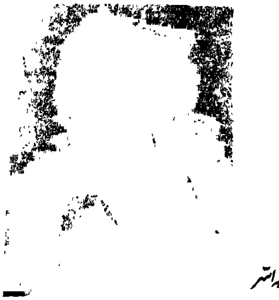
معاملہ یہ ہے کہ تاریخ کے مختلف موڑوں سے ہر معاشرہ گزرتا ہے بڑے بڑے سیاسی واقعات تو شہ سرخی بنتے ہیں۔ مگر عام انسان کے دل و دماغ پر کیا گزرتی ہے اور انسانی رشتوں کی نازک دنیا کس طرح ان آندھیوں سے زیر و زبر ہوتی ہے اس کی داستان ناول ہی کہتا ہے۔ مگر فرار کا دائرہ یہاں ختم نہیں ہوتا یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ یہ سکرات کا عالم انسانی رشتوں ہی کا نہیں ہے، انسانی تہذیب و تمدن نے صدیوں کے سفر میں جو قدروں کی دریافت کی ہے یا انہیں پایا ہے وہ سکرات میں مبتلا ہیں۔ اور یہ سکرات گویا پوری انسانیت کی متاعِ بے بہا پر طاری ہے۔ یہ تڑپ' یہ اضطراب' یہ ہاتھ پاؤں پٹکنے کی کیفیت، یہ نفرت اور محبتوں کے درمیان بٹے ہوئے دلوں کی ہر دھڑکن ہر صفحے پر بکھری ہوئی ہے۔

اور بصیرت؟ ——— سوال تو بصیرت ہی کا ہے۔ زندگی کس طرح گزرے

بقیہ ص۳۲ پر

دیویندر اسر

ظفر پیامی:
معاملات کا رمز آشنا


دیویندر اسر

دو اقتباسات:

"کوئی کہانی نہ نئی ہوتی ہے اور نہ پرانی، نہ طویل اور نہ مختصر، نہ تجریدی اور نہ روایتی، نہ حقیقت پسند اور نہ جدت پسند، نہ علامتی اور نہ واقعاتی، کہانی بس کہانی ہوتی ہے۔ اچھی یا بری، زندہ یا مردہ ..... جس کہانی نے جذبات بھی جس طرح آپ سے کہنی تھی، اسی روپ میں آپ کے سامنے آگئی کہ آپ اور آپ کی کہانی کوئی دو تو نہیں ہیں؟

ظفر پیامی

"میں سوچتا ہوں کہانیاں کون پڑھتا ہے جب آپ کوئی رسالہ اٹھاتے ہیں تو کیا آپ کہانی کا صفحہ پلٹتے ہیں۔ ویسے بھی کہانی اس رسالے میں کیا کر رہی ہے۔ وہ اتنی ہی بے رس لگتی ہے جتنی کہ نظم — شاید وہ بے رس ہے بھی۔ ہو سکتا ہے کہ اگر آپ خود کہانیاں لکھتے ہیں تو آپ اُن پر سرسری نظر ڈالیں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کہیں وہ آپ سے آگے تو نہیں نکل رہا۔ یا وہ کس کی پیروی کر رہا ہے۔ ہمارے ادب کی ہر صنف لگاتار براہِ راست بیان کی طرف بڑھ رہی ہے۔ آتم کتھا۔ اعتراف۔ مقالے کے فارم کی جانب۔

جان تامسن

بظاہر ان دو اقتباسات میں کوئی رشتہ نہیں، لیکن "دہشت" (ظفر پیامی) کی کہانیوں کے مطالعہ کے بعد جو تاثر ذہن قبول کرتا ہے۔ اگر اُس کا تجزیہ کیا جائے تو یہ رشتہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ "دہشت" کی ہر کہانی نے "جذبات بھی جس طرح آپ سے کہنی تھی اسی روپ میں آپ کے سامنے" رکھ دی ہے اور یہ "روپ" لگاتار براہِ راست بیان کی طرف بڑھ رہا ہے...... مقالے کے فارم کی جانب"۔ اس کا ذکر بعد میں۔ پہلے "دہشت" کی کہانیوں کے موضوع اور مواد کے بارے میں چند باتیں۔

"دہشت" کی قریب قریب تمام کہانیوں کا موضوع تشدد ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک موضوعی مجموعہ ہے۔ تشدد جو انسانوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ اور افراد پر روا رکھتا ہے۔ تشدد جو فسادات کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ تشدد جو قتل و غارت کو جنم دیتا ہے۔ تشدد جس کے باعث انفرادی اور اجتماعی دہشت کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ تشدد جو اقدار کو مسخ کر دیتا ہے جس کے باعث رشتے لوٹ جاتے ہیں، اور انسانی پن سے اعتماد اُٹھ جاتا ہے اور انجام کار انسان نہ صرف اپنے وجود سے محروم ہو جاتا ہے بلکہ اپنے جوہر کو بھی فنا کر دیتا ہے۔ اگر وجود قائم بھی رہے تو وہ دہشت کے باعث اپنے جوہر سے نا آشنا ہو جاتا ہے

ظفر پیامی کا سروکار ہے دہشت۔ دہشت کی مختلف اشکال کی پہچان۔ اس کے مختلف النوع اظہار۔ اس کے پیچھے حرکت کرتی ہوئی قوتیں اور نظریات اور دہشت کے چکرویو کو بھیدنے کی خواہش اور کوشش۔ چکرویو جس کی رچنا میں ریاست، سیاست، مذہب، سرمایہ اور دانش اور نوکرشاہی کی کارفرمائی شامل ہے۔ پولیس اور فوج اور دوسری عسکری قوتیں بھی شامل ہیں۔ یہ قوتیں ڈبل اسپیک اور نیو اسپیک کے ذریعے اپنی ہوسناکی اور سفاکی کی اتاولیں پیش کرتی رہتی

B-3/153، جنک پوری، نئی دہلی ۱۱۰۰۵۸

ہیں۔ عوام کو گمراہ ہی نہیں کیا جاتا بلکہ فنا بھی کیا جاتا ہے۔ یہ کہانیاں ایک سطح پر آرویلین ڈراؤنے خواب کو پیش کرتی ہیں۔ سیاست داں جو کھیل کھیلتے ہیں وہ درحقیقت گلیڈئیٹرز کا کھیل ہے۔ 'کم دی گل' میں گلیڈئیٹرز کی علامت سے دو ملکوں کے جنگی کھیل کی علامت بیان کی گئی ہے، جو افسانے سے زیادہ حقیقت کے قریب ہے جنگ جو برف کے پل کے لیے لڑی گئی ہے۔ لیکن یہ برف کا پل ہے کہاں؟ فوجی افسر جو اس بات چیت میں شامل ہوتے ہیں، وہ اس کھیل کو جنگ کے میدان ہی میں نہیں، بات چیت کی میز پر بھی کھیلتے ہیں۔ اپنی ذات اور اپنی عیاش زندگی میں ڈوبے ہوئے عوام اور ملکوں کے مفاد سے بے نیاز۔

"مگر سنو بھالو۔ یار، برف کا یہ پل ہے کہاں؟"

"ویسے مجھے بھی پتہ نہیں کہ اصل میں یہ ہے کہاں؟"

"ذرا نقشہ دیکھیں میرے بریف کیس میں ہے۔"

"چھوڑ دیار اس بکواس کو، کل اخباروں میں پڑھ لیں گے۔"

"ہاں چھوڑ۔ اس بکواس کو۔ کوئی کم دی گل کر یار۔"

"ہاں کوئی کم دی گل۔"

اور وہ دونوں کم دی گل کرنے کھانے کی میز کی جانب بڑھے۔ جہاں رکھا ہوا کھانا ٹھنڈا ہونے کے باوجود ابھی باسی اور بے مزہ نہیں ہوا تھا۔

اور یہ کھیل جاری رہتا ہے۔ جب کوئی حاکم آدم خور کو پکڑ کر پنجرے میں بند کرنے کے لیے پنجرہ تیار کرواتا ہے اور لوگ بڑی بیتابی سے انتظار کرتے ہیں کہ کب عوام کو اپنی خون آشامی کا شکار بنانے والا آدم خور اس پنجرے میں بند ہوگا۔ لیکن ہوتا کیا ہے؟ حاکم خود اس پنجرے میں بند ہو جاتا ہے اور رعایا کی بے چینی اور بغاوت سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ ظفر پیامی نے 'پنجرہ' میں اس عمل کو بہ کمال خوبی یوں بیان کیا ہے:

"پنجرا ایجاد کرکے گویا مملکتِ لازوال کے بادشاہ نے تمام مسائل چشم زدن میں حل کر لیے تھے۔ شہر کے ہر مسئلے کا حل خالی پنجرے میں موجود تھا۔ نئے شاہِ دوراں کی بادشاہت کے ایک سال پورا ہونے پر جو جشن منایا گیا، اس میں بھی ان کا سب سے اہم کارنامہ پنجرے کی ایجاد ہی کو بتایا گیا۔

("پنجرا اس قدر پرکشش ثابت ہوا کہ لوگ آدم خور کی تباہیوں کو بھی بھول گئے۔ آدم خور اب بھی آتا اور پہلے کی نسبت کہیں زیادہ شہر والوں کو اپنا لقمہ بناتا مگر لوگ اس تباہی کو اب روزمرہ کا معمول سمجھنے لگے تھے۔")

"آدم خور کے خونی پنجے سے محفوظ رکھنے کے لیے بڑے بڑے لوگوں نے ہزار جتن کرنے شروع کر دیے۔ انہوں نے خود کو آہنی لباس میں جکڑ کر حفاظتی تدابیر کے طور پر اپنے قریب ترین عزیزوں کو بھی آدم خور سمجھ کر ان سے آزادانہ میل جول ترک کر دیا۔ ہر وقت وہ حصارِ آہن میں موجود رہتے اور اپنے بھگتوں کی اگنی پریکشا کے بغیر درشن نہ دیتے۔ اپنی حرکات و سکنات پر انہوں نے اس قدر پہرہ بٹھا دیا کہ بعض اوقات انہیں خود خبر نہ ہوتی کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ اور کیا کر رہے ہیں۔ وہ جہاں جاتے چشم زدن میں گرد و نواح کو ایسے جیل نما قلعے میں بدل دیتے جہاں چڑیاں تو کیا چیونٹی کے پاؤں تک نہ پہنچ پاتے..... پنجرے کے اندر مقید اور محفوظ شخص دس سالہ دورِ حکومت کی شان دار کامیابی پر عوام کو مبارکباد دیتے ہوئے تلقین کر رہا تھا کہ خونی پنجے والے اجنبی آدم خور کا سامنا کرنے کے لیے ہم سب کو ایمان، اعتماد اور تنظیم کی دولت سے مالا مال ہو کر ہمت، بہادری اور بے خوفی سے آخری دم تک لڑتے رہنا چاہیے۔"

یہ اقتباسات ظفر پیامی کی عصری آگہی اور ان کے سیاسی شعور کی بخوبی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کی ہر کہانی میں سیاست کے اسی سفاک کھیل کی عکاسی ملتی ہے۔ ضرب تقسیم مکھیہ منتری اور ناراض منتری کے مابین تنازعے اور صلح ــــ (راج بھون سے ایک خاص حکم نامہ جاری ہوا۔ پردیش کو ایک ایمان دار اور حساس انتظامیہ دینے کے خیال سے ایک نیا محکمہ قائم کرنے کا اعلان کیا گیا۔ اس نئے اور اہم محکمہ کی بھاری ذمہ داری آپ مکھیہ منتری کو سونپی گئی۔ انسدادِ رشوت ستانی کے نئے محکمے کو آپ مکھیہ منتری ایسے مخلص اور مضبوط اور ایمان دار منتری ہی کی ضرورت تھی۔ خشک اور تری کی ضرب و تقسیم کا مسئلہ برادرانہ ڈھنگ سے حل ہو چکا تھا) مناسب کارروائی اور مجرب نسخہ میں سیاست کا یہ خون ریز کھیل جاری رہتا ہے۔ فساد، فساد، فساد ــــ کہ اقتدار قائم رہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں اقتدار کی ہی جنگ جاری ہے۔ بجٹ کے نام پر اخراجات میں اضافہ۔ "بجٹ مہم" کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ اگلا قومی بجٹ جب پیش ہوا تو اس میں کئی سو کروڑ کے نئے ٹیکس پیش کیے گئے تاکہ نئے قائم شدہ محکمۂ بجٹ کے بڑھتے ہوئے اخراجات پورے کیے جا سکیں "ــــ بجٹ)۔ عالمی بھوک کے مسائل پر غور کرنے کے لیے شہر کے سب سے بڑے فائیو اسٹار ہوٹل کے کانفرنس ہال میں "عالمی بھوک" پر بحث

"عصریات اور حسیاتِ عصری" پر ایک بین الاقوامی سیمینار میں دنیا بھر سے آنے والے سکریہ ماہرین نے مسئلے کے ہر پہلو کو بڑی ذہانت اور مہارت سے جانچا پرکھا اور کھنگالا۔ "مردہ گھر" بھی اسی قماش کی کہانی ہے۔

اس مجموعے کی اہم کہانیوں میں، "دہشت" "بابا سیٹیاں والا" "سجالو بھاگاں والی" اور "واپسی" ہیں کہ یہ عمومی بیان سے پرے فرد کی ذہنی کیفیات کو بڑے ہی پُراثر انداز میں پیش کرتی ہیں۔ "دہشت" میں ٹیکسی والا اور مسافر ایک لمبا سفر طے کرتے ہیں، لیکن راستے بھر اسی کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں کہ اس سفر کا انجام کیا ہوگا۔ مسافر جو ہر موڑ پہ ہر حرکت پہ اپنی زندگی کو خطرے میں محسوس کرتا ہے۔ لیکن ٹیکسی والا ہر موڑ، ہر حرکت پر اس خطرے کی آگاہی سے پریشان ہے۔

"بات سر یہ تھی کہ اس ٹرپ پر آنے سے پہلے چاچے اور تائے دونوں نے بہت منع کیا تھا، اسی لیے تو چاچا جی رات موقع دیکھنے بھی آئے تھے۔ آپ کو ملنے کے بعد انہوں نے کہا تھا "بابے سواری تو ٹھیک ہی ہے۔ مگر پتہ کیا خبر کہاں لگیے پھرے۔ کون جانے کون سا محلہ کیسا اور کون سی گلی کیسی۔ وہ لوگ نہ جانے کیا کر بیٹھیں"۔ ....تب سر میں نے سکھنا سکھی تھی۔ واگورو اگر بال صحیح سلامت لوٹ آیا تو تیری حضوری میں گیارہ روپے پرشاد چڑھائے گا ..... پھر بابے نے لال رومال میں رکھے دونے سے نکال کر ارداس کا پرساد اس کے دونوں ہاتھوں میں تھما دیا ....."

"واپسی" کا کردار بھگت سنگھ کا بُت ہے۔ اس کے سر پہ ہیٹ ہے یا پگڑی۔ یہ فساد کی جڑ بن گیا۔

"کچھ دن بعد جم کر لڑائی ہوئی۔ چوک شہیداں کے آس پاس کی کئی دکانیں جل کر راکھ ہوگئیں۔ پگڑی ٹوپی کی اس جنگ میں مصیبت سروں کی آئی جب سر ہی نہ رہے تو کیا ٹوپی اور کیا پگڑی اور اس طرح اس نگری میں جہاں کبھی فساد نہیں ہوا تھا، اتنے زوروں کی لڑائی ہوئی کہ چوک شہیداں، چوک فسادیاں اور قبرستان، شہر خموشاں بن کر رہ گیا۔ چوک شہیداں کے اس فساد کے بعد لوگ صرف "اُن لوگوں" اور "اُن لوگوں" کے مظالم کی داستانیں بیان کرتے اور "خون کا بدلہ خون" کی قسمیں کھاتے رہتے۔"

عہدِ حاضر کے خونچکاں واقعات کی یہ فلم جاری رہتی ہے ــــ لیکن کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ اس دور میں جب خالص فن کی تلاش میں نکلے ہوئے افسانہ نگار دادی اماں کی گود میں کہانی سننے اور کہنے کے لیے جا بیٹھے اور کچھ داستان گو بن کر الاؤ کے گرد جمع ہوگئے۔ علامت پرستی، تجریدیت، جدیدیت ــــ ایک افسانہ نگار ایسا ہے جو اپنی کہانیوں کا مواد وہاں سے اٹھاتا ہے، جہاں یہ واقعات ہو رہے ہیں، جہاں آج کی تواریخ لکھی جا رہی ہے۔ موجودہ دور میں حالات جس تیز رفتاری سے بدل رہے ہیں، ان میں انسان بھی بدلا ہے اور اس کی زندگی بھی۔ "دہشت" کی کہانیاں جن کرداروں کی داستان رقم کرتی ہیں، وہ ان ہی حالات کے پروردہ ہیں۔

"دہشت" کی کہانیاں واقعاتی، بیانیہ، تجزیاتی اور کسی حد تک سبق آموز ہیں۔ واقعات جو ہر روز ہمارے اِردگرد، ہماری نظروں کے سامنے رُونما ہو رہے ہیں، جن میں ہم سب شامل ہیں۔ ظفر پیامی ان واقعات کو من وعن بیان کرتا ہے۔ کبھی علامتی پیرائے میں، کبھی داستان کے روپ میں، کبھی خبروں کی طرح۔ ظفر پیامی کا رویّہ تجزیاتی ہے کہ یہ واقعات کیوں ہو رہے ہیں۔ ان کے پیچھے کون سی قوتیں کارفرما ہیں۔ ان کہانیوں کے واقعات وہ خبریں ہیں جنہیں ہم ہر روز اخباروں میں پڑھتے ہیں۔ ان کا بیان کبھی نامہ نگاروں کی کہانی کی طرز پہ ہے۔ کہانیاں خبروں کا تجزیہ ہیں۔ واقعات جب حقائق اور خبروں کے بہت قریب ہونے لگتے ہیں تو کہانی کار علامتی پیرایۂ اظہار اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن یہ علامتی اسلوب تجریدیت اور تمثال کے برخلاف حقائق کو "فوکس" میں لانے کے لیے اختیار کیا گیا ہے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ حقائق کتنے سنگین ہیں نہ کہ ان حقائق پر پردہ ڈال کر دور از کار تشریح پیش کرنے کے لیے ــــ

اس لیے "دہشت" کی کہانیاں خالص ادبی اقدار یا جمالیاتی ذوق کی تسکین کا ذریعہ نہیں بلکہ فروغِ شعور (Consciousness Raising) کا وسیلہ ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ آج بھی کچھ قارئین کہانی کا مطالعہ ذاتی فنی ذوق کی اندرونی ضرورت کے لیے کرتے ہوں۔ لیکن جو کچھ ہمارے سامنے ہو رہا ہے اور جس نے "الگاؤ"، دہشت اور احساسِ گناہ اور عدم اقدار کو جنم دیا ہے وہ خالص کہانی کی نہیں، سوالات اور احتجاج کے رویّے کا تقاضا کرتے ہیں۔ کہانی کی پرکھ میں جو غیر معمولی تبدیلی آئی ہے "دہشت" کی کہانیاں اس کی عکاس ہیں۔

جو کہانی کار ان مسائل کا سامنا کرنے میں تذبذب اور تشکیک میں مبتلا ہیں، قارئین اور ان کے مابین ذہنی فاصلہ بڑھ رہا ہے۔ ان کہانیوں میں جو دہشت کی کیفیت ہے وہ اس معنی میں نفسیاتی ہے کہ وہ فرد کے ذہن پر چھا گئی ہے، لیکن وہ فرائڈین اصطلاح میں نیوراتی دہشت نہیں اور نہ ہی وہ وجودی نظریے کی پروردہ دہشت ہے۔ کیوں کہ یہ زندگی کی بے ثباتی اور لایعنیت پر مبنی نہیں بلکہ انسان اور زندگی سے بے پناہ لگاؤ اور مثبت

بتگی اور معنی خیز Empathy سے پیدا ہوئی ہے، اس لیے ان کہانیوں میں
مکس نہیں، بلکہ آغاز سے انجام تک ایک مستقل کرائسس کی صورتِ حال ہے۔
ح کی کہانی میں بکھرے انسان کی مکمل ذات کو شامل کرنے اور زندگی کو اثبات
ینے کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ کہانی زندگی سے فرار کے بجائے زندگی کی جانب واپس
ٹ رہی ہے۔

ظفر پیامی اس خطرے سے آگاہ ہیں کہ اس ڈگر پر چلتے ہوئے ان کی
ہانیاں اعداد و شمار کی تفصیل بن کر نہ رہ جائیں۔ وہ اپنی کہانیوں کو معمول
لم کا بدل نہیں بناتے بلکہ زندگی کی حقیقت کو جیسا کہ انہوں نے
سے سمجھا ہے، ایک نئے امتزاجی پیٹرن میں پیش کرتے ہیں۔ حقیقت جس کا
دراک محض تخیل، کتاب اور اخبار سے ممکن نہیں۔ روزمرہ کے واقعات اور
ہانی کی حقیقت میں ایک مہین سی جھلی ہوتی ہے جو دیوارِ چین نہیں، لیکن جو
ندگی سے گہرے طور پر متعلق ہونے کے باعث واقعات کو سیاست کی ریاست
ے نکال کر فن کے دائرے میں لے آتی ہے۔ لیکن جب حقائق خارج
ے بغیر اپنا رنگ روپ بدلے فن کی ریاست میں داخل ہوتے ہیں تو واقعہ نگاری
ر کردار نگاری کے کئی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جو فن اور زندگی کے مابین نازک
شتوں پر از سرِ نو غور کرنے پہ مجبور کرتے ہیں۔ جب روزمرہ کے خارجی حقائق
ندگی کی تمثال بن کر سامنے آتے ہیں تو زندگی کا نیا شعور عطا کرتے ہیں۔ یہ نئی شکل
ور نیا شعور کتابی علم یا اخباری کہانی کے براہِ راست مشاہدے سے حاصل
ہیں ہو سکتا۔

کہانی کی اہمیت محض تکنیک، ہیئت، بیان یا اسلوب کا سوال نہیں۔
بلکہ حقائق، کردار اور زندگی کے بنیادی عناصر اور اقدار کے اظہار میں ہے جس
ا تلاش ویژن اور تخیل کی متقاضی ہے۔ ظفر پیامی کی کہانیاں تکنیک کے
نوع یا جدت کے باعث نہیں، ویژن اور مستند عکاسی کے باعث اہم ہیں۔
گزشتہ کچھ برسوں میں لوگوں کی دلچسپی اخبار، رسالے اور کتابیں
ڑھنے میں بڑھی ہے۔ لیکن ادب پڑھنے میں ان کی دلچسپی بڑھی ہو، ایسا
کھائی نہیں دیتا بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو ادب کے خالق ہیں وہی اس
کے قارئین بھی ہیں (شاید وہ بھی نہیں) افسانے کے قارئین کی نسبت
یر افسانوی تحریریں پڑھنے والے قارئین کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ جس کا ایک
سبب یہ ہے کہ غیر افسانوی نئی صحافت کی کہانیاں افسانوی ادب میں بیان
حقائق سے کہیں آگے نکل گئی ہیں ـــ افسانوی ادب کو دستاویزی بیانیہ
(Documentary Narrative)
نے جو چیلنج پیش کیا ہے وہ افسانے کے بارے میں نئے طور سے سوچنے پر مجبور
کر رہا ہے۔
آج سماج میں جو واقعات رونما ہو رہے ہیں، جو تواریخ لکھی جا رہی

ہے، افسانے کے بجائے اخباری کہانی اُسے زیادہ جامعیت گہرائی، عصریت اور
استناد کے ساتھ پیش کر رہی ہے جب کہ افسانے میں پیش کیے گئے واقعات کسی دور
از کار دنیا کی روداد معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے اردگرد مسائل ہی مسائل ہیں۔
جو لگاتار بڑھتے جا رہے ہیں، پیچیدہ ہوتے جا رہے ہیں اور ناقابلِ حل بنتے
جا رہے ہیں۔ ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے فن کار سے زیادہ نامہ نگار کی ضرورت
پڑتی ہے۔ جو کہانی کار یہ رول ادا کر سکتا ہے اس کے لیے ترسیل کی ناکامی کا المیہ
کوئی معنی نہیں رکھتا۔ آج کا قاری ایسی کہانی پڑھنا پسند کرتا ہے جو سیدھے وہاں
سے اٹھائی گئی ہو جہاں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ سڑکوں، گلیوں، گھر آنگن
کھیت کھلیانوں سے واقعات جس تیزی سے بدل رہے ہیں اور لوگوں کی زندگی
کو ہمہ گیر طور پر متاثر کر رہے ہیں۔ جدید افسانہ اس کا ساتھ دینے کے اہل نہیں کیونکہ
جب یہ واقعات اس کا موضوع بنیں گے، وہ تاریخ کا حصہ بن چکے ہوں گے۔
یہ دور علامتوں کے زوال کا دور ہے۔ تجریدی افسانے کا نہیں غیر افسانوی
کہانی کا ہے ـ دستاویزی بیانیہ کا ہے۔ اس نئی طرز کی کہانی کو
Fabulous Fiction یا Fabulations
کا نام دیا گیا ہے۔ ظفر پیامی کی کہانیاں نئی نئی طرز کی کہانیاں ہیں یعنی
Faction ہیں۔ (Fact + Fiction)
اس سے یہ مراد نہیں کہ ان کی کہانیاں محض واقعات کا بیانیہ ہیں یا کسی اخبار
کی روزمرہ کی خبروں کا خلاصہ بلکہ یہ کہ ان کی کہانیاں ان واقعات اور خبروں
کا ماڈل پیش کرتی ہیں۔ ان کہانیوں کی اہمیت واقعات کی تفصیلات
پیش کرنے میں نہیں بلکہ واقعات کی ازسرِ نو تشکیل کرنے میں ہے۔ حقائق
کو ریکارڈ کر کے اس طرح فریز Freeze کرنے میں ہے کہ واقعات
کے داخلی پیٹرن میں قاری بصیرت حاصل کر سکے۔ جب حقائق کی ازسرِ نو
تشکیل ہوتی ہے تو وہ زندگی کی نقل نہیں بلکہ زندگی ہی بن جاتی ہے۔
آج کہانی کار کی رنگ بھومی اس کا تخیل نہیں سڑکیں ہیں۔ سڑکیں
بڑی بے رحم ہوتی ہیں۔ ان پر خون بہتا ہے، جم جاتا ہے اور وہ خاموش رہتی
ہیں۔ عہدِ حاضر کے کئی دانشوروں اور ادیبوں کی طرح ـ ظفر پیامی ان میں
شامل نہیں۔ کیوں کہ وہ اس رزمِ خیر و شر کے خاموش تماشائی نہیں۔

ورما دیوان

زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا

۱۹ جنوری ۱۹۵۷ء کے دن بہت سے انگریزی، ہندی اور اردو کے اخباروں میں ایک خبر چھپی تھی: ۱۷ جنوری کو ایک مثالی شادی ہوئی، جس میں دولہا دُلہن کے کنبوں نے مل کر کل ۱۸ روپے خرچ کیے۔ تینتیس سال پہلے ہوئی اس شادی کو سماج سُدھار کی جانب ایک اہم قدم سے موسوم کیا گیا تھا۔

اردو اور انگریزی کے نوجوان صحافی اور افسانہ نگار دیوان بیریندر ناتھ 'ظفر پیامی' کی یہ شادی پنجاب کے مشہور انقلابیوں، پرنسپل چھبیل داس اور شریمتی سیتا دیوی کی بیٹی منورما سے ہوئی تھی۔ اُن دونوں نے جہاں سماجی برائیوں کے خلاف جدوجہد کرنے کا فیصلہ کیا، وہاں یہ قسم بھی کھائی کہ وہ سماجی اور سیاسی ناانصافی اور فرقہ واریت کے خلاف بھی ڈٹ کر جدوجہد کریں گے اور یہ قسم کبھی نہیں ٹوٹی۔

دیوان بیریندر ناتھ ظفر پیامی جو اس وقت انگریزی کے ہونہار اور بے باک صحافی سمجھے جاتے تھے۔ ۱۹۵۵ء میں وہ تیئیس برس کی عمر ہی میں افرو ایشیائی بانڈونگ کانفرنس کو بھی اخباری نمائندے کی حیثیت سے کور کر چکے تھے۔ وہ اردو میں ظفر پیامی کے نام سے بھی شہرت و مقام حاصل کر چکے تھے۔ ظفر پیامی کا قلمی نام اُنہیں کشمیر میں شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ۱۸ سالہ بریندر ناتھ کشمیر سرکار کے رسالے "تعمیر" کے ایڈیٹر تھے اور ریڈیو کشمیر سے "پیامِ ظفر" کے عنوان سے پروگرام پیش کرتے تھے۔

۷ ستمبر ۱۹۵۷ء سے منورما اور دیوان بیریندر ناتھ ظفر پیامی کا ایک ساتھ آگے بڑھنے کا جو سلسلہ شروع ہوا، اس میں اُنہوں نے کبھی پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا۔ پہلا غیر ملکی سفر مغربی ایشیا کے عرب ملکوں کا بذریعہ سڑک شروع ہوا جو پورے چھ مہینے تک چلتا رہا۔ اس میں پاکستان، ایران، عراق، سیریا، جارڈن، لبنان، مصر اور کویت شامل تھے۔ پولیٹیکل سائنس میں ایم اے فائنل کا امتحان دے کر منورما بھی صحافت کے میدان میں کود پڑیں۔ لکھنا تو اُسے وراثت میں اپنے انقلابی پتا پرنسپل چھبیل داس سے ملا تھا جن کی مشہور کتابوں: "انقلابی شرارے"، "چنگاریاں" اور "انقلاب زندہ باد" — نے محض نیشنل کالج لاہور میں ان کے چہیتے شاگرد بھگت سنگھ ہی کو نہیں، بلکہ ہزاروں نوجوانوں کو متاثر کیا تھا۔ خود دیوان بیریندر ناتھ کا بھی یہ کہنا تھا کہ جب وہ اسکول ہی کے طالب علم تھے تب اُنہوں نے یہ تمام کتابیں پڑھی تھیں۔ دیوان بیریندر ناتھ کے پھوپھی زاد بھائی اور پنجاب کے مشہور انقلابی بابا پیارے لال بیدی اور ان کی وہ انگریزی بیوی فریڈا بیدی جس نے ڈٹ کر ہندوستان کی جنگِ آزادی میں حصّہ لیا، پرنسپل چھبیل داس اور ان کی انقلابی اہلیہ سیتا دیوی کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ دیوان صاحب کی پیدائش کپورتھلہ کے مشہور دیوان خاندان میں ہوئی تھی۔

ستمبر ۱۹۵۷ء سے مارچ ۱۹۵۸ء تک مختلف اخباروں کے نمائندے کی حیثیت سے عرب ملکوں کا دَورہ کرتے ہوئے دیوان بیریندر ناتھ اور منورما دیوان نے بہت سے انقلابی اور تاریخی اہمیت کے واقعات کو ایک ساتھ ایک نظر سے دیکھا۔ اسی دَوران عراق میں انقلاب کا آتش فشاں یک لخت پھٹا۔ مصر اور شام کا اتحاد ہوا تھا اور متحدہ عرب جمہوریہ کے نام سے ایک نئے مُلک کا جنم ہوا تھا۔ وہ دونوں قاہرہ میں تھے۔ جب صدر ناصر نے اپنی تاریخی تقریر میں سویز نہر کو قومیانے کا اعلان کیا تھا، پورے ڈیڑھ گھنٹے تک دونوں کے انٹرویو صدر ناصر سے ہوئے۔ عربی اخباروں میں یہ مزے دار سُرخیاں چھپیں کہ ایک نوجوان

۱۹ A ۸، گل مہر پارک، نئی دہلی

آج کل، نئی دہلی

ہندوستانی صحافی قاہرہ میں موجود ہے جو عربی پڑھ سکتا ہے، لیکن بول نہیں سکتا۔ ہم نے اپنے مصری دوستوں کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ اردو زبان کو بھی طرح سے جاننے والا ہر شخص عربی زبان کو پڑھ سکتا ہے۔

قاہرہ ہی میں منورما دیوان نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان واپس جاکر اُسے اردو زبان سیکھنی ہے۔ ایک بات اکثر مذاق میں کہی جاتی کہ اردو کی شادی ہندی سے ہوئی اور انگریزی زبان گواہ کی صورت میں موجود ہے۔ اُسے اتفاقاً واپس ہندوستان پہنچ کر خوش حال گھر سنسار میں عملی شکل دی گئی ، جہاں منورما نے اردو سیکھنی شروع کی، وہاں دیوان بیریندر ناتھ ظفر پیامی ایک اچھے ہونہار بچّے کی طرح ہندی سیکھنے لگے۔ حالانکہ اردو اور ہندی کے ان دونوں طالب علموں کے استاد الگ الگ تھے۔ لیکن دونوں نے ایک دوسرے کو ان دونوں زبانوں کے دائرے وسیع کرنے میں بہت مدد دی۔

مغربی ایشیائی ملکوں کے لمبے سفر کے پہلے پڑاؤ لاہور میں جب برصغیر کے مشہور شاعر "شاہ نامہ اسلام" کے خالق اور پاکستان کے قومی ترانے کے بول اور دُھن بنانے والے ابوالاثر حفیظ جالندھری سے ملاقات ہوئی اور چونکہ حفیظ صاحب دیوان بیریندر ناتھ کو تب سے جانتے ہیں جب وہ ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ اور اپنی پھوپی یعنی بیدی صاحب کی والدہ بی بی پھول کور کے ساتھ لاہور ہی میں بیدی خاندان کے ساتھ رہتا تھا۔ حفیظ صاحب ہمیشہ دیوان بیریندر ناتھ کو جہاں ایک طرف دیوان صاحب بہادر کہہ کر مذاق سے مخاطب کرتے تھے وہاں پیار سے بندری کہہ کر اپنے بیٹے کی طرح سمجھتے۔ حفیظ صاحب کی بیٹیاں تھیں کوئی بیٹا نہیں، اس لیے وہ بندری ہی کو اپنا بیٹا مانتے تھے، لیکن جب ان کی ملاقات منورما سے ہوئی تو اُنہوں نے کہا: "پرنسپل چھبیل داس کی یہ بیٹی میری بیٹی ہے، بہو نہیں۔ اس پر دیوان صاحب بہادر اور حفیظ صاحب کے پیارے بیٹے بندری بہت جھنجھلائے اور اُنہوں نے پیار سے کہا: "اباجی! آپ نے کیسے ایک منٹ میں رشتے کو بدل ڈالا۔ لڑکے سے داماد بنا دیا۔"

تب اباجی نے ہنس کر کہا تھا: "بھئی ہم شاعروں کا کیا جب چاہے جہاں چاہے مصرعے کو بدل دیں۔" اباجی حفیظ جالندھری نے جس خوبصورتی سے مصرعے کو بدلا تھا، اسی خوبصورتی سے اُنہوں نے ۲۲ دسمبر ۱۹۸۲ء تک دیوان بیریندر ناتھ اور منورما کو اس مضبوط بندھن میں باندھے رکھا جسے آسانی سے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

آج مجھے ـــــ منورما دیوان کو جب اپنے شوہر دیوان بیریندر ناتھ ظفر پیامی کے بارے میں کچھ لکھنے کے لیے کہا گیا ہے تو پچھلے ۳۲ سال سے چلتا ہوا قلم رُک رُک سا رہا ہے۔ میں سمجھ نہیں پا رہی کہ میں اس عظیم شخصیت کے بارے میں کیا اور کیسے لکھوں اور جو زندگی میں میرا ہمسفر ہونے کے ساتھ ساتھ ہم پیشہ بھی تھا اور ہم خیال بھی۔ جو سچے معنوں میں میرا فرینڈ (دوست) فلاسفر اور گائیڈ بھی تھا۔ مجھے ہمیشہ یہی احساس رہا کہ وہ ایک بے حد نیک دل اور رحم دل انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسا گرُو ہے، جس کے پاس سکھانے کے لیے بہت کچھ ہے۔ مجھے تو ایک بھی ایسا موقع یاد نہیں آتا کہ جب کسی نے ظفر پیامی سے کسی طرح کی مدد مانگی ہو اور اُنہوں نے یہ بھی سوچا ہو کہ انکار کر دیں۔ خود بیمار ہیں۔ ۱۰۲ بخار ہے، لیکن ڈرائیور کے بیٹے کو اسکول میں بطور گارڈین پیش کروانے کے لیے گھنٹوں گزار رہے ہیں۔ اگر کسی نے بھی خط لکھ دیا کہ مالی مدد چاہیے تو فوراً منی آرڈر بھیج دیا۔

جب جب بھی کبھی انسانوں کا خون بہا، دیوان صاحب پریشان اور بیمار ہو گئے۔ فرقہ وارانہ فساد ہوئے تو ان کا قلم تو تیز تلوار کی طرح چلتا، لیکن ان کا دل بے حد غمگین ہو جاتا۔ مجھے آج احساس ہو رہا ہے کہ پچھلے تیس برسوں میں ایسے اندوہ ناک واقعات نے اُن کے دل کو گہری چوٹ پہنچائی۔ نومبر میں بدایوں اور بھاگل پور میں ہونے والے فسادات نے اُنہیں بے حد پریشان اور مایوس کر دیا تھا۔

پنجاب میں ہونے والے تشدّد کے واقعات سے وہ بہت پریشان تھے۔ یہی کہا کرتے تھے: "ایک پنجابی ہونے کی تکلیف مجھے جھیلنی پڑ رہی ہے۔" اُنہوں نے نہ جانے کتنی مرتبہ یہ لکھا کہ "نہ جانے مجھے ایک پنجابی ہوتے ہوئے کتنی بار مرنا پڑے گا؟"

نومبر ۱۹۸۴ء میں جب دہلی میں فساد ہوئے تو اس نے دیوان صاحب کو اتنا پریشان کر دیا کہ کافی دنوں تک اُنہوں نے کسی سے بات نہیں کی۔ مجھ سے یہی کہتے کہ نہ جانے ہم کب اس فرقہ وارانہ نفرت کی آگ سے نجات پائیں گے؟ وہ اس خاندان سے نہیں بلکہ روایت سے تعلق رکھتے تھے، جہاں ہر مذہب کی سچی قدر ہوتی تھی؛ جہاں گھر میں گورو گرنتھ صاحب سجا ہوا تھا، ہر روز گرُبانی سُنی جاتی تھی اور جہاں سے ہر سال بغداد میں غوثِ اعظمؒ کے حضور میں نذرانہ بھی بھیجا جاتا تھا، جہاں کرسمس کا انتظار سال بھر تک رہتا اور بودھ بھکشوؤں کو 'دان' اکثر دیا جاتا تھا۔ دیوان بیریندر ناتھ ظفر پیامی نے ہمیشہ جہاں کہیں بھی مذہب کا خانہ بھرا اس میں Non-Believer یعنی مذہب کے بندھنوں میں یقین نہ رکھنے والا ہی لکھا۔ لیکن اُنہوں نے کبھی کسی مذہب کی شان کے خلاف کچھ نہیں لکھا۔ اُنہوں نے جان بوجھ کر کبھی کسی کا دل نہیں دُکھایا۔ وہ ہمیشہ یہی مانتے تھے کہ سچا اور نیک انسان وہ ہے جو انجانے میں بھی کسی کا دل نہیں دُکھاتا۔

جب برسوں تک ظفر پیامی خاموش رہا اور دیوان بیریندر ناتھ اس پر حاوی رہا تو صحافی دیوان بیریندر ناتھ کو میں نے ہمیشہ پریشان پایا۔ کیوں کہ اُنہیں ہمیشہ سچ سوچنے، بولنے اور لکھنے کی عادت تھی، جو صحافت میں بہت تلخی اور ترشی لاتی تھی۔ نتیجتاً اُنہیں اکثر مخالفت اور نکتہ چینی کا سامنا

کرنا پڑتا تھا۔ جیسا کہ ظفر پیامی نے اپنے ناول "فرار" کے شروع میں لکھا ہے: "اپنے چہرے کو پہچاننا ہی سب سے مشکل کام ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے سچ بولنا بہت آسان ہے۔ لیکن سچ سننا اور سہنا مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہے، لیکن ظفر پیامی صاحب نے یہی کوشش کی کہ ہمیشہ زندگی میں سچ بولا جائے۔ ان کا ناول "فرار" اور افسانوں کا مجموعہ "دہشت" اسی کوشش کا ثمرہ و نتیجہ ہیں۔

میں نے ظفر پیامی کو ہر افسانہ لکھنے سے پہلے ایک عجیب و غریب ذہنی کشمکش میں گرفتار پایا۔ جب افسانہ مکمل ہو جاتا تو ان کے چہرے پر ایک بھولے بھالے بچے کی مسکراہٹ کھل جاتی۔ مجھے ہمیشہ یہی احساس ہوتا کہ وہ ہر افسانے میں اپنی ہی من بیتی کہہ رہے ہیں۔ ناول "فرار" کے متعلق ظفر صاحب نے لکھا تھا: "یہ نہ آپ بیتی ہے نہ جگ بیتی صرف من بیتی ہے۔" ان کا یہ ناول ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہو چکا ہے۔

۱۹۷۱ء میں ہم دونوں نے مل کر ہندوستان کی واحد کثیر الزبان فیچر ایجنسی پریس ایشیا انٹرنیشنل کو شروع کیا تھا۔ یہ ایک ساتھ انگریزی، اردو، ہندی، مراٹھی اور عربی میں مضمون، رپورٹیں اور فیچر ۱۵۰ اخباروں کو ہر روز بھیجتی ہے۔ دیوان بیریندر ناتھ ہر ہفتے اپنا کالم لکھتے۔ لیکن کبھی اس سے مطمئن نہیں ہوتے تھے۔ Perfection کی تڑپ انہیں ہمیشہ پریشان کرتی رہی۔ کام چلاؤ مضمون یا افسانہ لکھنے سے وہ ہمیشہ کتراتے تھے۔

ہم دونوں نے ایک ساتھ ہندوستان اور دنیا کے بہت سے ملکوں کا سفر کیا۔ مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوا کہ ان میں ایک بھولے بھالے بچے کا جوش ہے۔ جو زیادہ سے زیادہ مقامات کی سیر کرنا چاہتا ہے، جو علم حاصل کرنا چاہتا ہے، جو تیزی سے دوڑنا چاہتا ہے۔ سیاسی مسائل پر مضامین لکھنے، تبصرہ کرنے، افسانے اور "فرار" جیسا ناول لکھنے والے دیوان بیریندر ناتھ ظفر پیامی کی ایک خواہش ہمیشہ رہی کہ وہ بچوں کے لیے اچھے افسانے اور ناول لکھیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب انہوں نے اپنا ناول "ستاروں کے قیدی" آج سے پچیس سال پہلے لکھا تھا اور اسے لکھتے ہوئے وہ جتنے خوش تھے، اس سے یہ احساس ہوتا تھا کہ اس کا ننھا ہیرو جاوید وہ خود ہی ہیں۔

ظفر صاحب کو پریوں کی خوبصورت کہانیوں سے ہمیشہ گہرا لگاؤ رہا۔ جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے:

> "اب اس رنگین دنیا سے بھاگ کر کہانی میا کی گود میں بس جانا چاہتا ہوں۔ جو سلسلہ نو دس برس کی عمر میں بچوں کی کہانیوں سے شروع کیا تھا۔ تمنا یہی ہے کہ ایسی ہی کوئی داستان کہتے کہتے نیند آ جائے۔"

اور سچ مچ ۱۰ دسمبر ۱۹۸۹ء کو صبح دس بج کر ۴۵ منٹ پر ظفر پیامی (دیوان بیریندر ناتھ) کو اپنی زندگی کی داستان کہتے کہتے نیند آ گئی۔

آج کل نئی دہلی

بقیہ: ہم کہ خود اپنے دشمن

۱۹۶۰ء میں اس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا۔ ("محبت کا مطلب") اور وہ ادب کی دنیا میں ظفر پیامی کے نام سے متعارف ہوا۔ مگر صحافت کے میدان میں چونکہ اسے زیادہ کامیابی حاصل ہو رہی تھی، اس لیے اس کے اندر کا ادیب کونے میں دبک کر خاموش بیٹھ رہا۔ مگر آخر کب تک۔ ایک وقت ایسا آیا کہ اس کے اندر کے ادیب نے صدائے احتجاج بلند کرنی شروع کی اور بیریندر نے ظفر پیامی کو پھر سے زندہ کرنے کے لیے سارے کام چھوڑ چھاڑ کر ایک ناول لکھنا شروع کیا۔ جو ۱۹۸۷ء میں "فرار" کے نام سے شائع ہوا۔ اس بیچ اس نے کچھ نئے افسانے بھی لکھے، مگر ابھی اسے اپنی نظر میں وہ کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی جس کی وہ خواہش رکھتا تھا۔ اگر عمر وفا کرتی تو ہو سکتا ہے کہ ظفر پیامی دیوان بیریندر ناتھ سے بازی لے جاتا۔ اس سوال پر مجھ سے کئی بار اس کی بحث ہوئی۔ مگر میں اسے یہ کبھی نہ کہہ سکا کہ اس کے اندر دو لکھنے والے ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ اگر وہ سن لیتا تو میری اس بات پر ضرور خفا ہوتا۔ افسوس کہ میری ان باتوں پر خفا ہونے والا اب کوئی نہیں ہے۔

بقیہ: جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے

پہلے تو ٹالا پھر جب میں نے بہت اصرار کیا تو کہا کہ حفیظ صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ لکھنا بعد میں شروع کرنا پہلے ریاض کرو۔ جب میری سمجھ میں بات نہیں آئی تو انہوں نے کہا کہ میں نے بالاستیعاب میر، نظیر، انیس، غالب اور اقبال کا شاعری میں اور خاص طور سے خواجہ حسن نظامی کا نثر میں مطالعہ کیا ہے اور اب بھی اس پر وقت خرچ کرتا ہوں۔ اسی کو 'ریاض' کہتے ہیں۔ وہ ادبی اور علمی تحریروں کے علاوہ صحافتی مضامین کا بھی پوری پابندی سے مطالعہ کرتے تھے۔ ان کے اندازِ کار کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ صبح ½9 بجے تک ان کے تمام صحافتی کام ختم ہو جاتے تھے اور جب دنیا کا کاروبار شروع ہوتا تھا، وہ اس وقت آرام سے ملنے جلنے، ادھر ادھر جانے اور تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے۔ ان کو دیکھ کر ہی بے آہِ سحرگاہی، کچھ ہاتھ نہ آنے والی بات سمجھ میں آتی تھی۔

غرض کس کس بات کا ذکر کیا جائے؟ فلسطین، جنوبی افریقہ، ملک کی فرقہ وارانہ صورتِ حال، سیاسی درماندگی، اردو کی مظلومی نہ جانے کون کون سے ایسے زخم تھے جن کے ساتھ وہ جیے۔ لیکن خود بھی زندگی کرنے کا جگر ان میں تھا اور یہی وہ ورثہ ہے جو دیدی، صبا اور سمیرا سمیت ہم سب کو دے کر وہ خود تو چلے گئے اور ہماری حالت یہ کر گئے کہ:

جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے

ظفر پیامی: ہم کہ خود اپنے دشمن

اس وقت جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، بریندر ناتھ کو ہم سے رخصت ہوئے اکیس دن ہو چکے ہیں، مگر مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ میں بار بار یہ بات بھول جاتا ہوں حالانکہ میں نے لوگوں کو اس کا بے جان جسم اس گاڑی میں رکھتے ہوئے دیکھا ہے جو اپنے مسافروں کو اُس کے آخری سفر پر لے جاتی ہے.... اور میں منورما کا آنسوؤں بھرا چہرہ بھی نہیں بھول پا رہا۔ مگر یہ بات میں بار بار بھول جاتا ہوں کہ بریندر اب نہیں رہا۔ دن میں جب بھی کوئی اچھی چیز پڑھتا ہوں تو عادت کے مطابق خیال آتا ہے کہ اسے بریندر کو دکھاؤں گا اور کہوں گا کہ وہ بھی تو لکھ سکتا ہے ایسی چیز۔ پھر اپنا کالم لکھتے وقت جب کوئی پیچیدہ سیاسی مسئلہ زیر غور ہوتا ہے تو بات کرنے کے لیے سب سے پہلے اُس کا نام ذہن میں آتا ہے۔ اور جب لاہور کے دنوں کی یاد آتی ہے اور اکثر آیا کرتی ہے تو سب سے پہلا خیال بریندر ہی کا آتا ہے۔ کیوں کہ وہی تو ایک ایسا ساتھی تھا جس کے ساتھ چالیس بیالیس سال پرانی یادیں تازہ کر لیا کرتا تھا۔ شاید میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ وہ میری سوچ کا بڑا اہم حصّہ تھا۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ مجھے اس کی ہر بات سے اتفاق ہوتا۔ ہم میں کئی باتوں پر بڑے اختلافات تھے اور ہم بات بات پر جھگڑتے بھی بہت تھے۔ مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ میں نے کسی جھگڑے کے بعد اس کا خیال دل سے نکال دیا ہو۔ مجھے اس کے گلے شکوے بھی بہت سننے پڑتے تھے۔ آخری دنوں میں جب اُس نے شکوے کرنے بند کر دیے تھے تو مجھے ایک کمی کا احساس ہونے لگا تھا۔

بریندر ناتھ کے میرے ساتھ جو جھگڑے ہوتے، اُن کے اور بھی کئی اسباب ہوں گے، مگر سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ اور میں نے اُس سے سیکھا بھی بہت کچھ تھا۔ اس لیے اُسے یہ بات عجب معلوم ہوتی کہ کسی اہم معاملے میں میری رائے کا اس کی پسند سے ٹکراؤ بھی ہو سکتا ہے۔ بریندر کے مزاج کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ انتہا پسند تھا۔ جن لوگوں کو وہ چاہنے لگتا، اُن کی کسی بھی خامی یا کمزوری کا بیان اُس سے برداشت نہ ہوتا اور جن لوگوں کو اُس نے اپنی سوچ کی سرحد کے دوسری طرف رکھا ہوا تھا اُن کی تعریف سننا بھی اُسے پسند نہ ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی وہ تحریریں بہت زیادہ مؤثر ہوتیں، جن میں وہ اپنے دل کی بھڑاس پوری طرح سے نکال لیتا تھا۔ بریندر نے کئی سال تک ریڈیو کے لیے حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ لکھا۔ یہ تبصرہ اس قدر شوق سے سُنا جاتا تھا کہ آل انڈیا ریڈیو کے سیاسی تبصروں کا کوئی اور پروگرام مجھے یاد نہیں، جو اس قدر مقبول ہوا ہو۔

بریندر ناتھ کے مزاج کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ باتوں سے دوسرے کو متاثر کرنے اور اُس کا دل موہ لینے کا فن اُسے بہت اچھی طرح سے آتا تھا۔ یہاں دلّی میں جن لوگوں کا اُس سے واسطہ پڑا وہ جانتے ہیں کہ زبان کی لوچ سے وہ سننے والے کا دل جیت لینے میں کیسی مہارت رکھتا تھا۔ میں تو بریندر کی اِس خوبی کا اُس زمانے سے معترف تھا جب وہ ابھی ہائی اسکول کی آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ مجھے اب بھی اچھی طرح سے یاد ہے وہ دن جب وہ پہلی بار ہماری کلاس میں آیا۔ اُن دنوں اس کے پہناوے اور ڈیل ڈول میں ایسی سب خصوصیات موجود تھیں، جن سے اسکول کے شرارتی لڑکوں کی طبیعت کھِلانے لگتی ہے۔ وہ پنجاب میں ڈیرہ بابا نانک کے ایک اسکول سے آیا تھا، جو غالباً ایک قصباتی مدرسہ تھا۔ یہ بات اُس کے لباس سے صاف جھلکتی تھی۔ بچّے کے کپڑے کی اچکن، تنگ چوڑی دار پاجامہ اور پاؤں میں دیسی جوتی۔ پھر کاٹھی اُس کی ایسی تھی کہ عمر سے چار پانچ سال بڑا معلوم ہوتا تھا۔ مگر اب وہ جس اسکول میں آیا

322 ـ سی، نرآنند وہار، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۸

، وہاں لاہور کی انگریزی داں "مڈل کلاس" کے لڑکے پڑھتے تھے۔ اس اسکول میں کوئی بھی اس وضع قطع کا نہ تھا۔ اب جو لڑکے کلاس میں بیٹھے بیٹھے بور ہوا کرتے ہیں، انہیں اگر اپنے نئے ہم جماعت کو دیکھ کر شرارتیں سُوجھنے لگیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہ تھی، مگر ہربیندر نے جلد ہی اس گروہ کو جتا دیا کہ اس پر ہنسنا انہیں بہت مہنگا پڑے گا۔ اپنی قصباتی وضع کے باعث اُسے کوئی احساسِ کمتری نہ تھا۔ اُس نے پہلے تو شرارت پسندوں کی فوج کے ایک دو لیڈروں کی پٹائی کر کے سب پر اپنی جسمانی طاقت کی دھاک بٹھا دی۔ پھر اپنی علمیت سے نہ صرف اپنے ہم جماعتوں بلکہ اُستادوں تک کو مرعوب کیا۔ یہ بات ضرور ہے کہ اس علمیت کا تعلق نصاب کی کتابوں سے کم اور سیاست و ادب سے زیادہ تھا۔ آخر میں اُس نے اپنی باتوں کے سحر کا جادو جگایا اور لیڈر ہونے کی صلاحیت کا بھی مظاہرہ کیا۔ اُس ہائی اسکول کی آخری جماعت میں جب ہم پہنچے تو وہ اسکول کے طلبہ کی یونین کا صدر تھا۔ اس اسکول کی تاریخ میں پہلے کبھی طلبہ کی کوئی یونین نہیں بنی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُس زمانے میں جب کہ مُلک کی تقسیم کو صرف ایک سال باقی تھا اور فرقہ وارانہ کشیدگی زور پکڑتی جا رہی تھی۔ ہمارے اسکول کی یونین میں سب فرقوں کے لڑکے تھے۔ اُس نے بڑی شعوری کوشش کی کہ ہندو اور مسلمان لڑکوں سے اُس کی یکساں طور پر دوستی ہو۔ یہ سب مارکسی نظریات کا اثر تھا جو اُسے اپنے گھر کے ماحول سے ملے تھے۔ ہربیندر کے پھوپھی زاد بھائی جن کے ساتھ وہ رہتا تھا، لاہور کے مشہور کمیونسٹ لیڈر تھے اور جن کی رہائش ان دنوں پھوس کی جھونپڑیوں میں تھی — مسٹر بی۔ پی۔ ایل۔ بیدی نے اپنی خوشی سے اس طرح کی رہائش گاہ کا انتخاب کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ درختوں کے جُھنڈ میں وہ جھونپڑیاں بہت خوب صورت دکھائی دیتی تھیں، مگر اُن میں زندگی کی وہ آسائشیں نہ تھیں جو پکے مکانوں میں ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ اُن میں بجلی بھی نہ تھی۔ علاوہ ازیں وہاں کے شاندار بنگلوں کے درمیان یہ پھوس کا نگر ایک عجیب تضاد پیش کرتا تھا۔

ہربیندر کی تربیت اُس ماحول میں ہوئی جس میں مارکسزم اور سیاست زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھے۔ ایسے ماحول میں سانس لینے والے نوجوان کو اگر سیاست سے دلچسپی ہو جائے اور وہ انقلابی لیڈر بننے کے خواب دیکھنے لگے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ مگر ہربیندر تا کھ کا زیادہ بڑا خواب ادیب بننے کا تھا۔ اُس زمانے میں ادب سے اُس کی دلچسپی کا ایک واقعہ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ ہمارے اسکول میں صبح دُعا کے وقت علامہ اقبال کا ترانہ (سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا) گایا جاتا تھا۔ یہ نہ جانے کب سے تھا، مگر جب ہم نویں جماعت میں پہنچے تو شاید کسی استاد کے کہنے پر یہ ترانہ ہٹ کر کوئی مذہبی گیت گایا جانے لگا۔ اُس وقت تک ہمارے دوست نے اسکول کے لڑکوں میں اچھا خاصا رسوخ پیدا کر لیا تھا۔ اس تبدیلی پر اُس نے بڑا احتجاج کیا۔ اور سب سے کہتا پھرا کہ اقبال کا ترانہ بدل دیا گیا ہے۔ اس سوال پر اُس نے ایجی ٹیشن کا سا ماحول بنا لیا۔ اور نہ جانے ہیڈ ماسٹر کے علاوہ اور کس سے شکایت کی کہ چند ہی دنوں میں اسکول میں دوبارہ "سارے جہاں سے اچھا" گایا جانے لگا۔ اس وقت مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ اقبال ایک بہت بڑا شاعر تھا۔

ان واقعات کے بہت سال بعد جب لاہور چھوٹ چکا تھا اور مُلک میں ایک سوشلسٹ انقلاب کا خواب بہت کچھ غیر حقیقی معلوم ہونے لگا تھا تو روزگار حاصل کرنے کی جد و جہد شروع ہوئی۔ اُس وقت ہربیندر کو اخبار نویسی سے بہتر اور کوئی کام دکھائی نہ دیا، جس گھر میں اُس نے تربیت پائی تھی، وہاں بھی روزی کے لیے اس شغل کو اپنایا گیا تھا۔ بیدی صاحب نے اپنے لاہور کے قیام کے دوران انگریزی کے دو پرچے نکالے اور دونوں ہی اس قدر کامیاب تھے کہ دوسری مجبوریوں کے باعث بند نہ ہو جاتے تو ہندوستان کی انگریزی صحافت میں اُن کا بڑا اہم مقام ہوتا۔ علاوہ ازیں بھابی فریڈا بیدی تو اپنے مضامین اور کتابوں کی وجہ سے سارے پنجاب میں مشہور ہو چکی تھیں۔ ہربیندر کی اپنی خواہش تو تخلیقی ادب میں نام پیدا کرنے کی تھی۔ مجھے اس کے وہ افسانے یاد ہیں جو وہ اسکول کی کاپیوں پر لکھا کرتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی یہ خواہش بھی جوان ہوتی گئی۔ مگر تخلیقی ادب سے روٹی تو نہیں ملتی، اس لیے روح اور جسم کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے اخبار نویسی اختیار کی گئی۔ اُس کی تحریروں میں چاہے وہ انگریزی میں ہوں یا اردو میں اتنا تیکھا پن تھا اور ایک بات یہ کہ وہ اتنے پہلو تلاش کر لیتا تھا کہ اخبارات کی دنیا میں بہت جلد اُس کے لیے کامیابی کے دروازے کھُلنے لگے۔ علاوہ اس کے وہ بلا کا زود نویس تھا۔ وہ ایسی رفتار سے لکھتا تھا کہ مجھے لگتا جیسے اُس کے دماغ میں قدرت نے کوئی کمپیوٹر فٹ کر رکھا ہے۔ پھر تنظیمی صلاحیت بھی اُس میں تھی اور لوگوں کو متاثر کرنے اور تعلقات بنانے کا فن وہ شروع سے ہی جانتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہربیندر اور منورما نے اپنا فیچر سنڈیکیٹ پریس ایشیا انٹرنیشنل شروع کیا تو انہیں کامیابی حاصل کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ مگر صحافت کے میدان میں یہ کامیابیاں اُسے ایک لحاظ سے مہنگی پڑیں۔ اُس کی زندگی کا اصل مقصد تو تخلیقی ادب میں نام پیدا کرنے کا تھا اور صحافت تو صرف روزی کمانے کا ایک ذریعہ تھا۔ علاوہ ازیں ایک نظریہ یہ بھی تھا کہ اخبار نویسی میں بہر حال قلم سے اُس رشتہ بنا رہے گا اور اخبار کے کالم کا پیٹ بھرنے کے بعد افسانہ لکھنا کوئی ایسا مشکل نہیں ہوگا، مگر یہاں اُس نے ٹھوکر کھائی۔ کیوں کہ تجربہ کہتا ہے کہ صحافت اور تخلیقی ادب ایک دوسرے کے سخت دشمن ہیں۔ کسی بات اور خیال کو دیکھنے، پرکھنے اور پھر لکھنے میں ادیب اور صحافی کی نظر میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ ایک میدان کے شہسوار کو دوسرے میدان میں بڑی مشکل سے کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ ہربیندر کے اندر صحافی اور ادیب دونوں موجود تھے اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ دونوں ہر وقت ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے۔

(بقیہ ۱۲ پر)

اختر الواسع



دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی

جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے

دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی کی موت کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے سے صرف ایک شخصیت غائب نہیں ہوئی، اس شخصیت میں کئی شخصیتیں چھپی ہوئی تھیں اور ہر شخصیت اپنی ایک الگ شناخت رکھتی تھی۔ ایک صحافی، ایک دانشور، ایک سماجی مفکر، ایک ادیب، ایک ذمہ دار شہری، غرض کہ دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی ایک ساتھ کئی حیثیتوں سے یاد کیے جاتے ہیں۔ میں جب ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو آنکھوں کے سامنے تصویروں کا ایک پورا سلسلہ گزرنے لگتا ہے۔ ہر چند کہ یہ تصویریں ایک دوسرے سے الگ اور اپنے آپ میں مکمل ہیں، لیکن ان سے مل جُل کر جو تصویر بنتی ہے، وہ صرف ایک شخص کی نہیں بلکہ زندگی اور فکر کے ایک اسلوب، ایک روایت، ایک تہذیب، اقدار کے ایک مکمل نظام کی تصویر ہے۔ اس لحاظ سے دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی کی شخصیت بجائے خود ایک کائناتِ اصغر تھی۔

چند صفحات میں اس پوری کائنات کا احاطہ آسان نہیں۔ کچھ اس لیے بھی کہ دیوان صاحب سے میرے تعلقات کی نوعیت ایسی نہیں تھی کہ میں قطعاً غیر جذباتی اور معروضی انداز میں ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں یا ان کی خدمات کا جائزہ لے سکوں۔ میں نے انہیں ہر روپ میں دیکھا، مگر اس وقت ان کے جس روپ میں ساری شکلیں جذب ہوتی نظر آتی ہیں وہ ایک محترم بڑے بھائی کا ہے۔ ایسا بڑا بھائی جو رہنما بھی تھا اور غم گسار بھی، چارہ گر بھی تھا اور چارہ ساز بھی۔

میرا ان سے ذہنی رشتہ تین دہائیوں سے بھی زیادہ پرانا ہے — جب شعور کی آنکھیں کھولیں تو جن چند ناموں سے تعارف ہوا، اُن میں سے ایک ظفر پیامی کا تھا۔ جن کا بچوں کے لیے لکھا گیا سائنسی ناول "ستاروں کے قیدی" "کھلونا" (دہلی) میں قسط وار شائع ہو رہا تھا۔ جب ذرا اور بڑے ہوئے تو "بیسویں صدی" اور "شمع" میں ان کے سفرنامے اور افسانے پڑھنے کو ملے، اخباروں میں مضامین دیکھے اور ریڈیو پر ان کے تبصرے سنتے رہے۔ اسی زمانے میں "بانو" (دہلی) میں دنیا کی بڑی بڑی خواتین سے مسز منورما دیوان کے انٹرویو شائع ہوتے تھے۔ کسی نے بتایا کہ یہ ظفر پیامی کی بیوی ہیں تو عجیب سا لگا۔ اس لیے کہ اس سے پہلے کسی ایسے میاں بیوی سے واقفیت نہ تھی، جو دونوں قلم کے دھنی ہوں اور دوسرے کچھ اس لیے بھی کہ جس معاشرتی فضا میں نشو و نما ہو رہی تھی، اس میں ایک مسلمان مرد کا ہندو عورت سے شادی کرنا کچھ بعید از قیاس تھا۔ چوتھی اور پانچویں جماعت کے طالب علم کی سوچ کا دائرہ اس وقت اور یہ بھی کیا سکتا تھا؟

وقت گزرتا رہا۔ غالباً ۱۹۷۱ء میں پہلی دفعہ زیدی (مسز منورما دیوان) کے توسط سے جب پہلی ملاقات ہوئی تو میں نے دونوں کے سامنے اپنی پرانی سوچ کا بھی اظہار کیا کہ میں ظفر پیامی اور منورما دیوان کے بارے میں کیا محسوس کرتا تھا — ؟ دونوں خوب ہنسے اور پھر انہوں نے بتایا کہ حضرت نظام الدین (ایسٹ) میں شادی کے فوراً بعد جب انہیں کرائے کا ایک مکان ملا تو مالک مکان بھی اسی مغالطے کا ایسا شکار ہوا کہ اس نے فوراً انہیں اپنا گھر چھوڑنے کا نوٹس دے دیا۔ مسز ارونا آصف علی جو اس وقت دہلی کی میئر تھیں، انہوں نے سمجھایا بھی کہ تم مالک مکان کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کیوں نہیں کر دیتے، مگر یہ اَڑ گئے اور کہا کہ یہ اصول کا معاملہ ہے اور ہر شہری کو اس کا یکساں حق حاصل ہے کہ وہ کہیں بھی رہ سکتا ہے اور اس کے ساتھ مذہبی، لسانی یا علاقائی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیے۔ ان کے اس موقف کی جس شخص نے پوری طرح آخر تک حمایت کی وہ تھے بیسویں صدی کے مالک و مدیر خوشتر گرامی صاحب، جن کا

۳۵۲-بی، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

دیوان صاحب ہمیشہ بڑی ممنونیت کے ساتھ تذکرہ کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ بعد میں اُنہوں نے کچھ عرصہ بعد ایک دوسرا مکان لے لیا اور اس میں وہ ۱۹۷۷ء تک برابر رہتے رہے۔ ان دو ناموں نے بی بی جی (مسز منورما دیوان کی والدہ محترمہ) کے جالندھر میں ہونے والے پنجاب اسمبلی کے الیکشن پر بھی اثر ڈالا۔ اور اس کی وجہ سے وہ ہار گئیں۔ ناموں کے سلسلے میں ایک واقعہ کا اور تذکرہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔ ہولی اور دیوالی پر ڈاکیہ آتا اور ہم صاحب کو پوچھتا اور ان سے اپنا انعام حاصل کرتا۔ اور عید، بقرعید پر وہ صاحب کو یاد کرتا اور انعام پاکر خوشی خوشی لوٹ جاتا، مگر ان دونوں نے ہی کبھی اس بارے میں حقیقت کو ان پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ آج جب کہ ہم مصلحتوں ہی کو حقیقت بنا بیٹھے ہیں، یہ رویّہ کتنا عجیب لگتا ہے ــــ نا؟

پہلی ملاقات کے بعد یہ رشتہ دن بہ دن مضبوط تر ہوتا گیا۔ اب وہ میرے بھائی صاحب تھے اور میں اُن کے لیے چھوٹا بھائی۔ میں علی گڑھ سے دہلی آتا تو ان کے یہاں ہی رہتا۔ کھاتا پیتا۔ ۱۹۷۷ء میں ان کی بھابی جنہیں وہ سب سے زیادہ عزیز اور محترم مانتے تھے فریڈا بیدی کا انتقال ہوا تو ان کے گھر سی۔ ۷۰، نظام الدین (ایسٹ) میں تعزیت کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ ان میں مسز اندرا گاندھی بھی تھیں۔ شیخ محمد عبداللہ بھی اور نہ جانے کتنے لوگ تھے۔؟ فریڈا بیدی ــــ مشہور انقلابی مفکر اور رہنما بی۔ پی۔ ایل۔ بیدی کی انگریز رفیقہ حیات تھیں، جو آکسفورڈ میں ان کی ہم جماعت تھیں اور جن کے ساتھ مل کر اُنہوں نے ہندوستان کے بارے میں مارکس کے خطوط کو انگریزی میں مرتب کیا تھا۔ دونوں نے بھائی صاحب کو ہمیشہ اپنا بڑا بیٹا مانا اور وہ بھی دونوں کو بابا اور ممّی ہی کہتے تھے۔ بابا اب میلان (اٹلی) میں رہتے ہیں ــ (فلم اسٹار کبیر بیدی اور مشہور صنعت کار رنگا بیدی انہی کے بیٹے ہیں) بھائی صاحب کی موت بابا کے لیے کتنا بڑا صدمۂ جانکاہ ہے ــ؟ اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

حفیظ جالندھری صاحب سے بھی میری ملاقات اُنہوں نے اپنے گھر پر ۱۹۷۷ء میں کرائی تھی اور بھائی صاحب کی خواہش پر میں نے کافی وقت ان کے ساتھ گزارا۔ وہ میرے ساتھ علی گڑھ بھی گئے تھے۔ حفیظ صاحب کی شاعرانہ طبیعت مزاج کے طنطنہ اور مغلوب الغضب کیفیت کو وہ جس طرح نبھاتے اور سنبھالتے تھے۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ آدابِ فرزندی کس طرح ادا کیے جاتے ہیں۔ حفیظ صاحب نے دیدی کو بیٹی بنالیا تھا اور ان کی شادی پر "شاہنامہ اسلام" کے ہندوستان میں حقوق قانونی طور پر لکھ کر ان کے جہیز میں دے دیے تھے اور وہ جب بھی یہاں آتے تو اس بات پر بہت ناراض ہوتے کہ وہ "شاہنامہ اسلام" کے مختلف ایڈیشن شائع کرنے والے ناشروں سے رائلٹی کیوں نہیں لیتے ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں حفیظ صاحب جب آخری بار دہلی آئے تو ایک بڑے اشاعتی ادارے کے ذمہ دار سے وہ اس پہلی ملاقات میں اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے رہے کہ وہ ان کی بیٹی کو شاہنامہ اسلام کے منافع سے رائلٹی کیوں نہیں دیتے؟

بھائی صاحب کے والد سردار اعلا دیوان بدری داس ہندو، ان کی ماں سکھ، پھوپھی زاد بڑے بھائی اور مربّی بی۔ پی۔ ایل۔ بیدی مذہباً سکھ اور نظریاتی طور پر مارکسسٹ، ماں سے زیادہ شفیق اور مہربان بھابی فریڈا بیدی پہلے مذہباً عیسائی اور بعد میں بدھ مت قبول کر کے راہبہ بن گئی تھیں۔ رفیقِ سفر اور رفیقِ حیات مسز منورما دیوان کے والد پرنسپل چھبیل داس پکّے انقلابی بلکہ باغی، بائیں بازو کی آتش نوا تقریروں اور تحریروں کے لیے مشہور، شہید بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کے علمی و فکری رہنما اور استاد، مسز منورما دیوان کی والدہ شریمتی سیتا دیوی، عدم تشدد کی پیرو، پکّی گاندھیائی، گروکل کانگڑی (ہردوار) کے بانی آچاریہ رام دیو کی بیٹی، غیر منقسم ہندوستان میں لاہور سے پنجاب اسمبلی کی ممبر اور بعد ازاں ممبر راجیہ سبھا، ٹریڈ یونین کی لیڈر۔ ادھر فردوسیٔ اسلام ابوالاثر حفیظ جالندھری سے اتنا گہرا نیاز مندی کا رشتہ اور احمد رشید شروانی صاحب سے بھائیوں سے زیادہ گہرا تعلق۔ یہ سب دیکھ کر ایک دن میں نے پوچھ ہی لیا کہ ایسے اور اتنے متضاد عناصر ہمارے یہاں جمع ہو جائیں تو آج کل کرفیو نہ سہی تو دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کی ضرورت فوراً ہی لاحق ہو جاتی ہے۔ پھر آپ نے کس طرح توازن برقرار اور بحال رکھا؟ اپنی مخصوص دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگے۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ ہندوستان کا حُسن اور عظمت دونوں اسی وصل خواہی اور صلحِ کُل میں ہے۔ آج لوگوں نے مشترکہ ثقافت اور مشترکہ تہذیب کو صرف نعرہ سمجھا ہے۔ ہم اس میں پیدا ہوئے۔ پلے بڑھے اور جیے ہیں۔ ہندوستان کی بقا اور ترقی کی کنجی بھی یہی ہے۔ کاش اس حقیقت کو ہم ہندوستانی سمجھ پاتے۔

اسی لیے بھائی صاحب کے یہاں انسان دوستی عقیدہ کا درجہ رکھتی تھی۔ صاحبانِ اقتدار کے سامنے وہ ہمیشہ شانِ کج کلاہی سے گئے۔ مگر جب ماما اور راماں (ان کے گھریلو خدمت گار) بیمار پڑے تو ان سمیت سارے گھر والے ایسے پریشان تھے جیسے کہ کوئی بہت قریبی عزیز خطرناک علالت کا شکار ہو۔ اچھے اچھے ڈاکٹروں کا علاج، تن من دھن سے خدمت۔ اب تو دونوں نہیں رہے لیکن مجھے یقین ہے کہ دونوں اس اعتبار سے مطمئن رہے ہوں گے کہ آخری وقت میں وہ کسی احساسِ محرومی کا شکار نہیں ہوئے۔ دیدی اور بھائی صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ بھی رہی کہ وہ خود حسن اور ادا کو عزیز رکھتے، انہوں نے بڑی خوبی اور حسنِ تربیت سے اپنی دونوں بچیوں صبا اور سمیرا کو بھی ورثہ میں منتقل کر دیں اور وہ بھی دلِ درد مند کی دولتِ بیش بہا کی قابلِ فخر وارث ہیں۔

بھائی صاحب کی ادبی تحریریں ایک ایسے دل نشین اسلوب اور پیرائے میں ہوتی تھیں کہ مجھے اُنہیں پڑھ کر رشک آتا تھا اور یہ کیفیت اب بھی ہے۔ میں نے ایک دفعہ پوچھ ہی لیا کہ آپ اتنی خوب صورت عبارت کس طرح لکھ لیتے ہیں؟

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

یہ صبح زندہ رہے گی

پی۔ آئی۔ اے کا ہوائی جہاز جب لاہور ایرپورٹ پر اترا تو صبح کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ ہم اپنا سامان لینے کے لیے لگیج اسٹرپ کے سامنے کھڑے تھے، لیکن ہم میں سے کسی کا سامان بھی لگیج اسٹرپ کے ذریعے ہم تک نہیں پہنچا۔ کچھ اور بھی ایسے مسافر تھے، جن کا سامان انھیں نہیں ملا تھا۔ ملہوترہ اور گوپال انکوائری پر گئے تو معلوم ہوا کہ کچھ مسافروں کا سامان اس ہوائی جہاز میں نہیں چڑھایا گیا تھا۔ اُن مسافروں میں ہم بھی شامل تھے۔ سامان اگلی فلائٹ سے آئے گا جو ساڑھے نو بجے کے قریب پہنچے گی۔ ہمیں مشورہ دیا گیا کہ ہم کوئی دس بجے کے قریب آکر ایرپورٹ سے اپنا سامان حاصل کرلیں۔ یہ فیصلہ ہوا کہ گوپال دس بجے آکر سب کا سامان لے لے گا۔ ایرپورٹ سے باہر نکلے تو ساڑھے چار بج رہے تھے۔ اور فضا میں ہلکی ہلکی خنکی بسی ہوئی تھی۔ میاں ریاض صاحب کا ڈرائیور ہمیں لینے کے لیے آیا ہوا تھا۔ معمول کی طرح اس نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کی اور ہماری خیریت دریافت کی۔

"دس بجے پھر آنا پڑے گا آپ کو۔ ہمارا سامان اگلی فلائٹ سے آئے گا۔" ملہوترہ نے اُسے مخاطب کیا۔

"دوبارہ آجاواں گے مالکو۔" اُس نے جواب دیا۔

ہم سب گاڑی میں بیٹھ کر گل برگ کے لیے روانہ ہوگئے۔ جب ہم میاں صاحب کی کوٹھی پر پہنچے تو پانچ بج چکے تھے اور آس پاس نیم اندھیرے اور نیم اُجالے کا سماں تھا۔ تھوڑی دیر میں صبح ہو جائے گی۔

ہمارے بستر لگے ہوئے تھے۔ مجھے ہلکی ہلکی ٹھنڈ بھی لگنے لگی تھی۔ میں بنا کپڑے بدلے ہی بستر میں گھس گیا اور نرم نرم کمبل کو اپنے ارد گرد لپیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔

میں جب جاگا، گوپال تیار ہوکر سامان لانے کے لیے ایرپورٹ جا چکا تھا۔ آج ہماری دو اہم مصروفیات تھیں جو ہم کراچی جانے سے پہلے طے کرگئے تھے۔ چار بجے شام "الفلاح" کی بہت بڑی عمارت میں واقع پاکستان نیشنل سینٹر میں مجلسِ احبابِ انبالہ کی طرف سے استقبالیہ تھا اور اس کے بعد ہم سب کو سرور بھٹی نے اپنے فلم اسٹوڈیو میں مدعو کر رکھا تھا۔ وہاں سے ہم لوگوں کو سرور بھٹی کے گھر کھانے پر جانا تھا۔ گویا کہ ہم لوگ تین بجے تک فری تھے۔

مجھے دو بہت ضروری کام کرنا تھے۔ ایک تو مسز چمپا منگت رائے نے مجھے اپنے بھائی مسٹر سنگھا سے ٹیلی فون پر بات کرنے کو کہہ رکھا تھا، جن کی صحت ان دنوں خراب تھی۔ اور پھر انہی کے حوالے سے ان کی بیوی سنتوش سنگھا سے بھی بات کرنی تھی جو آج کل ایجوکیشنل سوسائٹی اسکول کی پرنسپل تھیں۔ مسز منگت رائے کی اپنی بھابی سے بڑی گہری دوستی تھی۔ انہی کی ایک اور عزیزہ تھیں مسز سلمیٰ جو نیشنل آرٹ کالج میں ٹیچر تھیں۔ ان سے بھی بات کرنا تھی۔ میری بیٹی ڈاکٹر کملیش موہن نے بھی کچھ لوگوں کے ایڈریس دے رکھے تھے جن کے پاس کچھ پرسنل پیپرز تھے۔ جن کی میری بیٹی کو اپنے پروجیکٹ کے لیے ضرورت تھی۔ پھر میرا اپنا بھی ایک بہت ضروری کام تھا۔ مجھے ان تمام نوٹس کو مناسب ڈھنگ سے ترتیب دینا تھا۔ جو میں پچھلے دس دنوں میں اپنی نوٹ بکوں میں لکھتا رہا تھا۔ اب اگر ان کو ترتیب نہیں دے پاؤں گا تو پھر اپنے رپورتاژ کے لیے ٹھیک طرح سے مرتب کیا ہوا مواد نہیں مل سکے گا۔ چنانچہ میں نے دو تین گھنٹے لگا کر اپنا کام کیا۔ اس دوران میں ملہوترہ اور رینگی اور گوپال مارکیٹ چلے گئے۔ اسی دوران قلیل شفیق کا ٹیلی فون آیا کہ وہ بھی شام کے استقبالیہ میں آرہا تھا اور جلسے کے بعد مجھے اُسی کے ساتھ سرور بھٹی کے فلم اسٹوڈیو جانا تھا۔ سرور بھٹی نے کچھ اور دوستوں کو بھی وہاں بُلا رکھا تھا اور میرا وہاں جانا بہت

روری تھا۔ اپنے کام سے نپٹ کر میں کچھ دیر سو گیا۔

پاکستان نیشنل سینٹر میں شام کا استقبالیہ ہت اچھا رہا۔ مجلسِ احباب انبالہ کے اراکین نے اہور کے بہت سے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں راکھٹا کر لیا تھا۔ زیادہ تعداد ان شاعروں اور دیبوں کی تھی، جن کا تعلق انبالہ سے تھا۔ حسن رضوی نے اسی حوالے سے ہم سب کا، خاص طور سے راجیندر ملہوترہ کا اور میرا سامعین سے تعارف کرایا۔ اس نے شامِ بہار ٹرسٹ کی ادبی خدمات کا بھرپور جائزہ لیا اور کہا کہ ہریانہ میں یہ انجمن ایک ایسا فورم ہے جس کی وجہ سے ہر برس مارچ کے مہینے میں ہندوستان اور پاکستان کے شاعروں کو ایک دوسرے سے ملاقات کا موقع مل جاتا ہے۔ اور اس طرح دونوں ملکوں کا ثقافتی رشتہ بھی مضبوط ہوتا ہے۔ میرا تعارف کراتے ہوئے اس نے میری گزشتہ ۴۵ برسوں کی ادبی خدمات کا ذکر کیا اور میرے کئی افسانوں اور ناولوں کے نام لے کر ان کی تعریف کی۔ حسن رضوی کو اس بات کا فخر تھا کہ اس کا تعلق انبالہ سے تھا، جس سے وقار انبالوی اور ناصر کاظمی کا بھی رشتہ تھا۔ صدارت قتیل شفائی کر رہا تھا اور اُسے اس بات کا فخر تھا کہ میری اور اس کی بہت پرانی دوستی تھی۔ تقاریر کا سلسلہ کچھ دیر جاری رہا۔ ہر مقرر نے اسی بات پر زور دیا کہ ہندوستان اور پاکستان کے دوستانہ تعلقات کو مضبوط کرنے کے لیے دونوں ملکوں کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو ایک دوسرے سے ملنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے جانے چاہئیں اور انہیں اس عمل کو جاری رکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتیں مہیا کی جانی چاہئیں۔

تقاریر کے بعد شعر و سخن کا سلسلہ شروع ہوا۔ جتنے بھی شاعر دوست اس جلسے میں آئے تھے، سبھی نے اپنا اپنا کلام پیش کیا تو میں ہر ایک شعر کو دھیان سے سنتا اور اس کی داد دیتا یا پھر شعروں کو نوٹ کرتا رہتا۔ دونوں کام بیک وقت نہیں ہو سکتے تھے۔ میں نے کوشش تو بہت کی کہ ہر شاعر دوست کا کم از کم ایک شعر تو نوٹ کر ہی لوں، لیکن پھر بھی کئی دوست ایسے تھے، جن کے شعر نوٹ نہیں کر سکا، شعر لکھنے کی کوشش کی تو ایک آدھ مصرع ادھورا رہ گیا۔ جن شاعروں کے شعر نوٹ کر سکا وہ آپ کے لیے حاضر کر رہا ہوں۔ سیف زلفی نے نظامت کے فرائض سرانجام دیے۔ انبالہ سے تعلق رکھنے والے اقبال سحر کا ایک شعر سنیے:

دوستوں کے ہاتھ میں تلوار ہے
اب یہاں جینا بہت دشوار ہے

اقبال سرہندی نے جس کی پیدائش انبالہ کی تھی۔ بہت ہی درد بھری آواز میں کہا تھا:

نور چہروں سے گلابوں کے اُڑا لگتا ہے
زہر یہ کیسا ہواؤں میں گھلا لگتا ہے

ابراہیم عالم کے اس شعر پر اُسے بہت داد ملی

سانپ اور سپیرے میں دوستی تو ہوتی ہے
کون کس کو ڈس لے گا یہ پتہ نہیں ہوتا

محمد حسین رضوی کا بھی یہ شعر بہت اچھا تھا:

میں جہاں جاؤں مجھے میرا ہی گھر لگتا ہے
جس جگہ سجدہ کروں تیرا ہی در لگتا ہے

ناصر چودھری کا بھی ایک شعر سنیے:

طالبِ خوشبو تھے ہم رنگوں کے گرویدہ نہ تھے
کاغذوں کے پھول تو ہم کو پسندیدہ نہ تھے

انبالہ سے ہی تعلق رکھنے والا عاقل کاظمی کہہ رہا تھا:

یہ مجھے کون رنج دیتا ہے
شبِ اوّل کبھی شبِ آخر

خلش ہاشمی کے اس شعر کو بھی بے حد پسند کیا گیا:

کبھی مجھ کو کبھی غیروں ہی کو دیکھا کرنا
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ترا ایسا کرنا

اور پھر ذکی قریشی نے کہا:

دل نے تھپک تھپک کے شبِ غم سُلا دیا
مشکل ترین جو کام تھا کر کے دکھا دیا

نثار اکبر آبادی کے اس شعر نے خوب سماں باندھا:

برسوں میں شہر شہر، مرا جھولے انگ انگ
جی چاہتا ہے میں بھی اُڑوں بادلوں کے سنگ

نرگس شیخ کا بھی ایک شعر سنیے:

یوں تو اس بزم میں ہر اک سے شناسائی ہے
پھر بھی احساس یہ ہوتا ہے کہ تنہائی ہے

اور پھر مطلوب خاں مطلوب نے ایک خوبصورت شعر پڑھا:

بہار آئی ہے لیکن ہر طرف صورت خزاں کی ہے
چمن گلچیں نے لوٹا ہے یہ غفلت باغباں کی ہے

نجمی نگینوی کے اس شعر پر بھی خاصی داد ملی:

نئے حصار، نئے بام و در نکل آئے
ہم اپنی کھوج میں جانے کدھر نکل آئے

غیاث چودھری نے ایک ہی شعر سے محفل کا رنگ بدل ڈالا:

بچھڑو تو شب و روز کی مانند ہی بچھڑو
لوٹ آؤ تو موجوں کی طرح ٹوٹ کے ملنا

عباس رضوی کا بھی ایک شعر سن لیجیے:

جانے وہ تصویر خریدی کیوں اُس نے
جس میں گُم صُم ایک پرندہ بیٹھا تھا

گلزار بخاری نے ہلکے پھلکے رنگ میں یہ شعر کہا۔ سننے والوں نے پسند کیا:

سچ میں کیا ہے کہ تجھے یاد کرے گا کوئی
اچھے اچھوں کو یہاں لوگ بھلا دیتے ہیں

شاہد واسطی کا نام پکارا گیا تو اس نے کہا:

میں ہر شے سے جدائی چاہتا ہوں
درِ حق پر رسائی چاہتا ہوں

مشاعرے کے ناظم سید زلفی نے مشاعرے کی اس منزل پر اپنی غزل پیش کی۔ ایک ہی شعر نوٹ کر سکا تھا آپ بھی سن لیجیے:

تم بھی تو مسیحائی کا اعجاز دکھا دو
جو پیاس سے مرتا ہے اُسے زہر پلا دو

اور پھر حسن رضوی کے نام کا اعلان ہوا اور اس نے ہریانہ سے اپنے تعلق کا اظہار ہریانوی غزل کہہ کر کیا۔ ایک شعر سنیں اور داد دیں:

تمہارے پاس نہ ہمارے پاس
وہ تھا چاند ستارے پاس

یزدانی جالندھری کو بہت دنوں کے بعد دیکھا تھا۔ بڑے اچھے شعر کہتا ہے۔ شعر اتنے خوبصورت تھے کہ نوٹ کرتا تو لطف نہ اُٹھا سکتا۔ بہر حال ایک شعر پھر بھی نوٹ کر ہی لیا۔ ذرا تیور دیکھیے۔

ٹوٹا نہیں اشکوں سے ابھی ضبط کا پشتہ
پانی ابھی خطروں کے نشان تک نہیں آیا

اور پھر طفیل ہوشیارپوری چھڑی کا سہارا لے کر آیا اور اپنی غزل پیش کی۔ میرا معاملہ پھر وہی تھا۔ صرف ایک ہی شعر نوٹ کر سکا تھا۔

میری آنکھوں میں وہ رہتے ہیں اُجالوں کی طرح
میں نے دیکھا ہے انہیں دیکھنے والوں کی طرح

اب شاعروں کی فہرست ختم ہو گئی تھی۔

جن شاعروں کے اشعار آپ نے پڑھے ہیں، ان کے علاوہ کچھ ایسے شاعر بھی تھے، جن کا کلام میں نوٹ نہیں کر سکا تھا۔ لیکن انہوں نے بہت ہی اچھے شعر سنائے تھے۔ ان کے نام ہیں: سلامت احمد خیال، زبیر سیرا، اقبال دیوانہ (پنجابی شاعر) غلام رسول مضطر، حسن عسکری کاظمی، اختر شمار، اعتبار ساجد اور امداد ہمدانی۔

اس کے بعد "پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق" والا معاملہ تھا۔ صدارت کر رہا تھا میرا جگری دوست قتیل شفائی۔ اس کا حکم کیسے ٹال سکتا تھا میں۔ چنانچہ مجھے بھی چند اشعار سنانے پڑے۔ اور پھر قتیل نے میری دوستی کے حوالے سے وہ غزل سنائی جو اس نے گوڑگاؤں کے آل انڈیا مشاعرے میں آج سے تقریباً تیس سال پہلے سنائی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب کنور مہندر سنگھ بیدی گوڑگاؤں میں ڈپٹی کمشنر تھے اور میں وہاں درس و تدریس کا کام کرتا تھا۔ ان دنوں کچھ لوگ واقعی ہماری دوستی سے جلتے تھے۔ اس غزل کے کچھ شعر تو مجھے آج تک زبانی یاد ہیں:

گرمیٔ حسرتِ ناکام سے جل جاتے ہیں
ہم چراغوں کی طرح شام سے جل جاتے ہیں

جب بھی آتا ہے مرا نام ترے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں

اس خوبصورت تقریب کے بعد ہم "العلاج" سے باہر نکلے تو اندھیرا ہو گیا تھا۔ اب قتیل شفائی کی ذمہ داری تھی کہ وہ ان سب مہمانوں کو جنہیں سرور بھٹی نے مدعو کر رکھا تھا۔ باہو فلمز کے اسٹوڈیو تک پہنچائے۔ سب سے پہلے تو اس نے مجھے گاڑی کے اندر دھکیلا اور پھر راجندر ملہوترہ، گوپال اور نیگی کو۔ اس کے بعد دوسری گاڑی میں باقی مہمانوں کو بٹھایا۔ دو ایک لوگ حسن رضوی کے ساتھ بیٹھ گئے۔

جب دیوانوں کا یہ قافلہ باہو فلمز کے اسٹوڈیو کے باہر پہنچا تو سرور بھٹی باہر کھڑا ہم سب کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ایک دفعہ پھر مجھے اپنے گلے سے لگا کر میرا استقبال کیا اور پھر دوسرے مہمانوں سے نہایت ہی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ اور ہم سب کو بڑی عزت کے ساتھ اسٹوڈیو کے اندر لے گیا۔ میرا ایک اور جگری دوست منیر نیازی پہلے سے موجود تھا۔ اس نے مجھ سے بغل گیر ہو کر یہ شکایت کی کہ میں اب تک اس کے گھر نہیں پہنچا تھا۔ میں نے اپنی غلطی تسلیم کی اور مجبوری کا اظہار کر کے معافی مانگ لی۔ پھر عطاء الحق قاسمی سے بغل گیر ہوا۔ وہ اسلام آباد سے ایک ہی روز پہلے واپس آیا تھا۔ لاہور پہنچنے پر پہلے ہی دن جس شخص سے ملاقات ہوئی، وہ تھا دلدار پرویز بھٹی۔ ایک دلکش شخصیت کا آدمی۔ باقی لوگ تو وہی تھے جو قتیل شفائی اور حسن رضوی کے ساتھ آئے تھے۔ فلم اور ادب پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ زیادہ گفتگو تو فلم پر ہی ہوئی۔ فلم کی کہانیوں پر، ڈائریکشن پر۔ ہندوستانی اور پاکستانی فلموں کے معیار پر۔ اور پھر ان دو فلموں پر جو سرور بھٹی نے ڈائریکٹ کی تھیں پنجابی میں "مولا جٹ" اور اُردو میں "بازارِ حسن" دونوں فلمیں کامیاب رہی تھیں۔ سرور بھٹی کی فلموں سے قتیل شفائی اور منیر نیازی دونوں کی گہری وابستگی تھی۔

اور سرور بھٹی کو اس پر فخر بھی تھا۔ گفتگو کے دوران مجھے لگا کہ سرور بھٹی سلطان باہو کا بڑا عقیدت مند تھا۔ اس نے سلطان باہو کا کلام اپنی بھرپور دل کش آواز میں سنایا۔

دلدار پرویز بھٹی نے سلطان باہو کا کچھ کلام میری بیاض کے پہلے دو خالی صفحوں پر اپنے ہاتھ سے لکھا اور ساتھ میں اس کا انگریزی ترجمہ بھی لکھ دیا۔ دلدار بھٹی کو انگریزی زبان پر خاصی قدرت حاصل ہے۔ کلام کا کچھ حصہ جو بھٹی کے ہینڈ رائٹنگ میں میرے پاس موجود ہے آپ کے سامنے بھی پیش کر رہا ہوں:

جو دم غافل سو دم کافر
ساہنوں مرشد ایہہ فرمایا ہُو
سنیاں سخن، گئیاں کھل اکھیاں
اساں چت مولا ول لایا ہُو
کیتی جان حوالے رب دے
اساں ایسا عشق کمایا ہُو
مرن توں پہلوں مر گئے باہو
تاں مطلب نوں پایا ہُو

سچ مانیے میں تو سرشار ہو گیا تھا۔ نغمگی اور تصوف کی اس کی ہلکی ہلکی خاموش پھوار میں سرور بھٹی نے واقعی سماں باندھ دیا تھا۔

جب ہم اسٹوڈیو سے باہر نکل کر گاڑیوں میں بیٹھ کر سرور بھٹی کے گھر کی طرف روانہ ہوئے تو میرے ذہن میں سلطان باہو کا ہی کلام گونجتا رہا۔ کھانے میں بڑا اہتمام کر رکھا تھا سرور بھٹی نے۔ اتنی انکساری اور شرافت تھی اس شخص میں کہ میں اس کا قائل ہو گیا۔ لگتا تھا اس نے سلطان باہو کے کلام کو اپنی شخصیت میں جذب کر رکھا تھا۔

آدھی رات ہونے کو تھی۔

جب سرور بھٹی سارے مہمانوں کو گاڑیوں میں بٹھا رہا تھا۔ تو وہ مجھے الگ ایک طرف لے گیا اور بولا۔

"اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

"کل ہم لوگ جہلم جائیں گے۔ رات کا قیام
یا ہے۔"
"پرسوں؟"
"پرسوں یعنی ۱۶ر نومبر کو ہم اسلام آباد
ا ہوں گے۔"
"واپسی کب ہوگی؟"
"انشاء اللہ ۸ر نومبر کو ہم لوگ لاہور
واپس آجائیں گے۔"
ہمیں اس طرح اکیلے باتیں کرتے ہوئے
دیکھ کر قتیل اور حسن رضوی بھی آگئے۔
"تو کیا فیصلہ ہوا؟" حسن رضوی نے
سرور بھٹی سے پوچھا۔

"اٹھارہ دی شام ساڈھے نال گزارن گے۔"
"پروگرام پکا نا؟" قتیل نے پوچھا۔
"ذرا مجھے ملہوترہ سے پوچھ لینے دو۔"
ملہوترہ سے پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ
اٹھارہ کی شام میاں ریاض صاحب کے ساتھ
گزارنا چاہتا تھا۔
"پر انتی شام ساڈھے نال گزاروگے
ذاکر صاحب۔"
میں خاموش رہا اور خاموشی کے خالی کاغذ
پر جو معاہدہ لکھا گیا اس پر گواہی درج ہو گئی —
قتیل شفائی، حسن رضوی اور دلدار پرویز بھٹی کی۔
منیر نیازی گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا تھا۔

منیر نیازی بڑا بے نیاز آدمی ہے۔ وہ بے کار کے جھگڑوں
میں نہیں پڑتا۔ جبھی تو وہ اس طرح کے شعر
کہہ سکتا ہے:

عادت سی بنالی ہے تم نے تو منیر اپنی
جس شہر میں بھی رہنا اکتائے ہوئے رہنا

سرور بھٹی اپنی دل کش مسکراہٹ سے
سب کو ہاتھ ہلا ہلا کر خدا حافظ کہہ رہا تھا۔
آدھی رات کا آدھا چاند آسمان سے آدھی
ادھوری چاندنی برسائے جا رہا تھا۔

[جاری ہے]

بقیہ: سلور فش

آنکھیں کبھی کبھی کچھ اس طرح تکے جاتی ہیں
کہ ان کی آواز ہی سنائی نہیں دیتی — بے نظر
آنکھیں اتنا نہیں اکھرتیں، بے آواز آنکھیں کھل
جاتی ہیں۔
اور جب اس سے نظریں چار ہوئیں تو
اس کی آنکھیں کھل گئیں
میں چپکے سے اٹھا — ریفریجریٹر
کے قریب جا کر وہ چیزیں الگ کر لیں جنہیں اس میں
رکھتا تھا۔
اس سمے کچھ عجیب احساس سے دوچار
تھا میں۔ چیزیں الگ کرتے ہوئے مجھے محسوس ہو رہا تھا
جیسے میں خود کو اس سے الگ کر رہا ہوں۔
ریفریجریٹر کھولتے ہی ٹھنڈے ٹھنڈے
اجالوں نے مجھے آلیا۔ وہ بھی پاس ہی بیٹھا ہوا
تھا — اسے بھی شاید ٹھنڈے اجالوں نے
چونکا دیا ہوگا — ایسا میں سمجھ رہا تھا —
لیکن وہ تو کاغذ پر جھکا ہوا تھا۔ اور اس کا قلم
اس طرح کاغذ کو چوم رہا تھا جیسے الفاظ کا مقدر
بدل رہا ہو۔

میں نے اس کی طرف سے توجہ ہٹائی اور
اپنی نظریں اس پر سے اٹھا کر ریفریجریٹر میں لے آیا۔
ریفریجریٹر میں سوائے اجالوں کے اگر
کچھ تھا تو اسٹیل کی ایک پلیٹ تھی جو خالی تھی۔
میں نے ساری چیزیں جو الگ کی تھیں
ریفریجریٹر میں رکھ دیں۔ کہنے لگا۔
"کیا کر رہے ہیں آپ۔ میں خود
تین چار دن سے یہی سب کرنے
کی سوچ رہا تھا — جب کیا
ہی ہے تو ایک زحمت اور کر دیجیے۔
وہ خالی پلیٹ بھی نکال لیجیے جس کو
آپ نے بغور دیکھ کر پھر رکھ دیا ہے۔"

میرے کھسیانے پن پر اس نے مسکراہٹ دبالی۔
میں نے ریفریجریٹر سے پلیٹ نکالی تو اب
وہ خالی نہ تھی — شاید میں نے اس میں کوئی
کیسیٹ رکھ دیا تھا جس کے برابر ایک بال پین
بھی دھرا تھا۔
جب میں پلیٹ نکال رہا تھا تو اس نے میرے
تھرتھراتے ہاتھوں کو کھن کھناتے سن لیا تھا۔
میں نے اس کو بغور دیکھا۔ وہ کھل کر ہنسا۔
وہ دیواروں پر ٹکے آسمان سے بے نیاز تھا۔
میں حیران تھا کہ میں خشک آنکھوں سے کیوں
رو رہا ہوں — کیا وہ واقعی اتنا اونچا آدمی ہے
جو کبھی آسمان کو چھت بنا لیتا ہے کبھی فرش۔ . .

بہ خطِ شاعر

غزل

یہ ہجر ہے، تو یہاں آتش بجاں نہیں ہے کوئی
مگر سکون سے پھر بھی یہاں نہیں ہے کوئی

نہ دھوپ کا کوئی پیکر، نہ سائے کا آسیب
یہ دشت، "دشتِ انا" ہے یہاں نہیں ہے کوئی

خود اپنی ذات پہ اس کے وجود کی صورت
یقیں بھرا ہوا یعنی گماں نہیں ہے کوئی

یہ زندگی ہے اسے توڑ کر یہ کیوں چاہوں
پھر اس کے بعد بہار و خزاں نہیں ہے کوئی

بھرا پڑا ہے بہت شہر، آرزو کی طرح
مگر یہ دل ہے کہ جیسے یہاں نہیں ہے کوئی

میں اپنے قتل کے محضر پہ دستخط کر دوں
ترے خلوص پہ مجھ کو گماں نہیں ہے کوئی

ہر ایک دل ہے تہی، "کاسۂ نظر" کی طرح
مگر غضب یہ ہے خالی مکاں نہیں ہے کوئی

بچھی ہوئی ہے ازل سے عجب "بساطِ وجود"
ہے میزبان، مگر میہماں نہیں ہے کوئی

دلوں کے بیچ ہے "دیوارِ گریہ" اے ناصح
محبتوں کے مگر درمیاں نہیں ہے کوئی

دل و نگاہ یہ اک دوسرے سے پوچھتے ہیں
نہاں نہیں ہے کوئی یا عیاں نہیں ہے کوئی

دلوں کا قحط ہے عنوان آج دنیا میں
مکیں ہزاروں ہیں لیکن مکاں نہیں ہے کوئی

عنوان چشتی

عنوان چشتی

کنویں کا تارہ



صحرا کا عکس

اندر سروپ دت نادان

شب، وہ سمندر
ایک عجب طوفان اٹھاتا
میرے دروازے آپہنچا
میں نے ہمت باندھ کے پوچھا
آبی آنکھوں والے بابا!
آخر مجھ سے کون سی ایسی بھول ہوئی ہے
جس کے باعث
تیرے دل کو ٹھیس لگی ہے
یہ سن کر وہ کھول سا اٹھا
اور مری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا
یاد نہیں ہے شاید تجھ کو
تیرا میرا رشتہ ہے صدیوں کا رشتہ
میں ہوں تیرے پرکھوں کا لافانی پرکھا
تیرا تن میرا ہی تن ہے
تیرا من میرا ہی من ہے
میں ہی جنم داتا ہوں تیری ہر خوبی کا
لیکن تیری گمراہی کا تاج کبھی کو پہناؤں گا
ٹھہراؤں گا تجھ کو قاتل
اُن رسموں کا
جن کے دم سے اس دھرتی پہ
قائم تھی میری مریادا............
تُو نے غلط رستہ اپنا کر
مجھ کو عبث بدنام کیا ہے
اور تُو خود بھی
ندیا ہو کر
اس حیران کنویں کا تارا بن بیٹھا ہے!

آج اُس کو
اپنی تخلیقی صلاحیت پہ شک ہونے لگا تھا
وہ کہانی
جس کی خاطر
وہ برابر جی رہا تھا، مر رہا تھا
اُس کی مشکل بن گئی تھی۔
فرش پر بکھرے ہوئے کاغذ کے پُرزے
اُس قلم کی ناتوانی کا فسانہ کہہ رہے تھے
جس کی شہہ زوری کے قصّے
چار سُو پھیلے ہوئے تھے............
اس مصیبت کی گھڑی میں
ایک نسوانی صدا نے
اُس کے دُکھتے دل میں یہ نشتر چبھویا
کیوں نہیں لکھتے کہانی
میں تمہارے راستے سے ہٹ گئی ہوں
اور ہے اس گھر سے غائب
آج وہ ننھا فرشتہ
جس کو تم نے
خامشی کی راہ کا بدو کہا تھا
اب تو اس گھر کے در و دیوار پر ہے چُپ کا پہرا
کیوں نہیں اب آزماتے اپنا جوہر
کیوں بنے بیٹھے ہو مایوسی کا پیکر

....

وہ جرابا چیخ اٹھا
اب نہ لکھی جائے گی مجھ سے کہانی
کیا ملے گا مجھ کو اس صحرا میں پانی

۳/۲۶۹ - بی - پشچم وہار نئی دہلی ۱۱۰۰۶۳

قمر ادیب

التباس

افشاں خیزاں
یادیں آئیں
تو ......
سونے آنگن میں پھر سے
پیلا چاند اُتر آیا ہے
جانے کیوں ایسا لگتا ہے
رات گئے جب گھر آتا ہوں
سرگوشی میں گھر کہتا ہے
آج بھی تم جلدی آئے ہو

راندۂ جہاں

سبک ہواؤں کے ہاتھ
جب جب
ہرے پپیتوں کو توڑتے ہیں
ہرے پپیتے
دھواں دھواں سی
اُداس آنکھوں کو ڈھونڈتے ہیں
دُھواں دھواں سی
اُداس آنکھیں
اسی لیے راندۂ جہاں ہیں
کہ اُن کے خوابوں کی سرزمینیں
بلند و بالا ہیں
آسماں ہیں

ادریس گنج، ہردوئی (یوپی)

غزلیں



محسن زیدی

کیا تعلق، کیسا رشتا میرے اُس کے درمیاں
ریت کا ہے اک گھروندا میرے اُس کے درمیاں

ایک صحرا آئنہ آنکھوں میں چمکتا ہوا
ایک دریا لہر کھاتا میرے اس کے درمیاں

سلسلہ خیر و خبر کا نامہ بر کے دم سے تھا
اب نہیں وہ بھی وسیلہ میرے اُس کے درمیاں

نیم وا آنکھوں میں جیسے جلتے بجھتے سے چراغ
کچھ اندھیرا کچھ اُجالا میرے اُس کے درمیاں

جنگ پانی کے لیے دریا بہ دریا آج بھی
معرکہ صحرا بہ صحرا میرے اس کے درمیاں

منحصر ہے میرے سر پر اس کے خنجر پر نہیں
یہ سر و خنجر کا رشتا میرے اُس کے درمیاں

شمع اک جلتی ہوئی دو پتھروں کے بیچ میں
اور روشن ایک کتبا میرے اُس کے درمیاں

قرب کے باوصف بھی محسن رہا میں اس سے دُور
طے شدہ اک فاصلہ تھا میرے اس کے درمیاں

اپنے ہی نہیں غیر طرف دار ہیں اس کے
وہ یار سبھی کا ہے سبھی یار ہیں اس کے

کچھ لوگ ہیں ایسے بھی جو حق بات کہیں گے
ایسا تو نہیں سب ہی نمک خوار ہیں اس کے

یہ شیشۂ گردوں میں ہے عکسِ سحر و شام
یا جلوہ نما گیسو و رخسار ہیں اس کے

وہ بھاؤ بدل سکتا ہے بس ایک نظر سے
ساری ہی دُکانیں سبھی بازار ہیں اس کے

اُس نے ہی تو اس راہ کو دُشوار بنایا
رستے میں بچھائے ہوئے یہ خار ہیں اس کے

لگتا ہے یہیں پر تھا کہیں شہرِ تمنّا
ہر چند نشانات نہ آثار ہیں اس کے

محسن جو ملے جنسِ ہنر ہم کو بتاؤ
کوئی نہ سہی ہم تو خریدار ہیں اس کے

۱۷۷- راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

غزلیں



عتیق اللہ

ایک پتھر ہوا میں ٹھہرا تھا
اور رُخ پر ہی میرا اُبھرا تھا

کتنے برسوں کے بعد آنکھ کھُلی
اور اسی روز مجھ کو مرنا تھا

اک نشاں تھا اور اُس نشاں سے پرے
آنسوؤں کا غبار پھیلا تھا

مجھ کو بخشا نہ میرے بیٹوں نے
ان زمینوں کا میں بھی حصّہ تھا

پانو پھیلائے رات بیٹھی تھی
طاق میں اک چراغ رکھا تھا

سر برہنہ سواریاں تھیں اور
رات کا بے کنار صحرا تھا

پانو آنکھوں نے کر لیے پیدا
اب جو دیکھا کبھی نہ دیکھا تھا

در کے، دیوار کے درمیاں کچھ تو ہے
اس زمیں کی جگہ آسماں کچھ تو ہے

دُور ہوتے ہوئے نقش و آثار میں
اک ابھرتا ہوا سا نشاں کچھ تو ہے

کوئی اُترا تو تھا بام جاں پہ ابھی
اس اُفق پر چمک سی عیاں کچھ تو ہے

دیکھتا ہوں اُسے روزنِ خواب سے
رشتۂ دید سا درمیاں کچھ تو ہے

کچھ تو ہے اس کے انکار کی پشت پر
آنکھ کی اوٹ میں بھی نہاں کچھ تو ہے

سوئے دل تیر آئے کہ پتھر کوئی
اس نشانے پہ تسکین اماں کچھ تو ہے

252/A.G.، شالیمار باغ، دہلی ۵۲ ۱۱۰۰

حامدی کاشمیری

پیچھے ڈالی ڈالی ہاتھ
نقش حیرت خالی ہاتھ

کس کی شہادت پر جابئیر
لب منکر، اقبالی ہاتھ

دیکھ رہے تھے حیرت سے
چاٹ گئے ہریالی ہاتھ

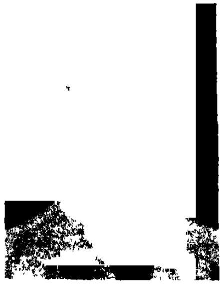
پھوٹو، چشم ہے بے تقصیر
ہیں وجہِ پامالی ہاتھ

اپنی حفاظت کر لیں
کرتے ہیں رکھوالی ہاتھ

شب کو تعاقب کرتے ہیں
وحشت کہنہ سالی، ہاتھ

شالیمار، سری نگر، کشمیر

غزل



عالم خورشید

کبھی جب زندگی کا گوشوارہ دیکھتا ہوں میں
تو ہر مد میں خسارہ ہی خسارہ دیکھتا ہوں میں

سمندر کے تلاطم سے مجھے تم کیا ڈراتے ہو
بھنور کے ہی پس پردہ کنارہ دیکھتا ہوں میں

مرے اس خواب کی تعبیر کوئی شخص بتلائے
کہ اپنی بند مٹھی میں ستارہ دیکھتا ہوں میں

مرے ساتھی گھروں سے منزلوں تک کب کے جا پہنچے
ابھی تک گھر پہ بیٹھا استخارہ دیکھتا ہوں میں

کبھی ساکت کسی چٹان کے مانند لگتی ہے
کبھی اس زندگی کو پارہ پارہ دیکھتا ہوں میں

گھروں سے مشعلیں لے کر سڑک پر لوگ آئے ہیں
نئے موسم کی آمد کا اشارہ دیکھتا ہوں میں

معرفت ڈائریکٹر آف اکاؤنٹس (پی) پٹنہ ۸۰۰۰۰۱

اشعار

وشواناتھ درد

دیوانے کی کبھی سن لے اے کامران ہستی
تجھ کو نگل نہ جائے یہ زندگی کی پستی

اب کس ڈگر پہ نکلیں یادوں کا ہاتھ تھامے
بے روح ہر گلی ہے شمشان سی ہے بستی

لے کر متاع ہستی بازار میں جو نکلے
یہ جنس بے بہا تو نکلی بہت ہی سستی

اپنے غموں کا رشتہ اب درد کس سے جوڑیں
جب غیر سی لگے ہے خود کو ہماری ہستی

تیرے شہر سے جو نکلے تو ملی ہمیں یہ مستی
کہیں کھو گیا ہے جادہ کہیں کھو گئی ہے بستی

مجھے تم نے غم دئے تھے، مجھے فکر دی غموں نے
مجھے جس سے راس آیا، یہ مزاج غم پرستی

۲/۲۶۸۔ پشچم پوری، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۳

غزل



چندر پرکاش جوہر بجنوری

ہزار شکل میں ظاہر ہے زندگی کا لباس
زہے نصیب ملا جس کو آدمی کا لباس

نہ جانے کون، کہاں، کس لباس میں مل جا
کرو نہ طنز کبھی دیکھ کر کسی کا لباس

ہزار اطلس و کمخواب سے فزوں تر
وہ اک لباس جسے کہیے سادگی کا لباس

ہر آدمی نہیں انساں وگرنہ کہنے
ہر آدمی کے بدن پر ہے آدمی کا لباس

ہے ایک نعمت بے مثل خاکساری
جو مل سکے تو پہن لیجے عاجزی کا لباس

خرد کا مرتبہ اعلیٰ سہی مگر جوہر
جنوں کے بدلے نہ لے عقل و آگہی کا لباس

۶۔ ریلا بلڈنگ، لیڈر روڈ، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

شرون کمار ورما

موڑ

اُس کے بیٹے نے، اُس کے نئے جُوتے پہن لیے تھے اور اب ٹہل ٹہل کر دیکھ رہا تھا۔

اُس نے اخبار سے نظریں ہٹا کر بیٹے کی طرف دیکھا ــــ اُس کی چائے بدمزہ ہوگئی تھی اور گرما گرم خبریں ٹھنڈی پڑ گئی تھیں۔ آئینے کے سامنے کھڑا اُس کا بیٹا کچھ زیادہ ہی سمارٹ اور دراز قد نظر آرہا تھا۔ اُس کے اندر کڑواہٹ سی گھُل گئی۔ اُس نے اپنے اندر کچھ سخت کھُردرے الفاظ کو چُبھتے ہوئے جملوں میں ڈھلتے محسوس کیا۔ لیکن یہ الفاظ اُس کے اندر مزید کڑواہٹ چھوڑ کر پردیسی پرندوں کی طرح جانے کس اُفق میں ڈوب گئے۔ اُس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ جیسے پرندہ اُڑان بھرنے کے لیے اپنے پیروں تلے کسی ٹھوس مضبوط سہارے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔

وہ آٹو جھیل رہی تھی۔ جوان بیٹے کی طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرائی۔ اُس کے چہرے پر، اس پل ممتا کے اُجالے میں گھُلا مِلا فخر اور اطمینان کا گلابی رنگ بھی تھا۔ اس سے پیشتر کہ وہ اپنی کڑواہٹ، . . . . اپنی ناراضگی کا اظہار کرتا۔ اُس کا بیٹا ماں کے پرس سے کچھ روپے نکال کر کمرے سے جا چکا تھا۔ موٹر سائیکل کی آواز فاصلے کے سمندر میں ڈوب گئی تھی۔

"بالکل تمہاری طرح لگ رہا تھا۔" اس کی بیوی نے پیار اور فخر سے کہا۔ "تم نے نوٹ کیا۔ اس کی آواز بالکل تمہاری جیسی ہے۔ گمبھیر اور ٹھہری ٹھہری۔"

"مجھے تمہارے لاڈلے کی حرکتیں ذرا پسند نہیں۔"

"اب کیا ہوا؟" اُس کی آواز میں ڈر تھا۔

"کیا کیا اُس نے؟"

"منع کرو۔ سمجھاؤ اُسے، اُس روز میری نئی ٹائی لے گیا۔ آج جُوتے ــــ کیا کہنا چاہتا ہے وہ اس طرح؟"

"کچھ نہیں۔ ہم پر اپنا حق جتا رہا ہے۔"

"یہ کوئی طریقہ نہیں۔"

"ناراض مت ہوا کرو ــــ" اُس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن خاوند کا سنجیدہ چہرہ اور ناراضگی دیکھ کر وہ چُپ ہوگئی۔ یہ باپ بیٹے میں کیسا ٹکراؤ ہے۔ کیوں ہے؟ وہ اپنے اندر اُلجھنے لگی۔ وہ ان دونوں کے بیچ خود کو پِستا محسوس کر رہی تھی۔ وہ تو کسی کو کھو نہیں سکتی تھی۔ نرمی سے بولی۔ "ہمیں تو خوش ہونا چاہیے۔ ہمارا بیٹا جوان ہوگیا ہے۔ اسے دوست بنا لو اب اپنا۔"

اُسے لگا وہ عورت اُس سے رہا سہا اپنا پن بھی چھین لینا چاہتی ہے۔ بیٹا اُس عورت کے وجود اور حزن کا حصہ ہے، جب کہ خاوند محض ایک سماجی رشتہ، ایک قانونی بندھن۔ اس خیال نے اس کے اندر جیسے کچھ توڑ ڈالا۔ اُس نے اس عورت کی طرف دیکھا ان بائیس برسوں میں وہ دھیرے دھیرے اس پر قابض ہو چکی تھی۔ اور یہ اُسے اچھا ہی لگا تھا۔ اپنا آپ اُسے سونپ کر ایک طرح سے پُرسکون اور مطمئن ہوگیا تھا، لیکن اب اُسے احساس ہونے لگا تھا کہ چاند کا تو صرف عکس جھیل میں ہوتا ہے جب کہ کنول جھیل کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔

"اُس کی یہ من مانیاں ٹھیک نہیں۔"

"ابھی تھوڑا سا بچپنا ہے۔ پریشان مت ہوا کرو ــــ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"وہ موٹر سائیکل اتنی تیز چلاتا ہے۔"

اپنے اس جملے پر وہ خود حیران رہ گیا۔ کیا وہ یہی کہنا چاہتا تھا۔ سوچ تو وہ کچھ اور رہا تھا۔ پھر یہ خیال ــــ یہ اپنے بیٹے کے لیے دُکھ تھا، ہمدردی تھی کہ شکایت ــــ

"میں سمجھا دوں گی اُسے۔" وہ مسکرا دی۔

بیوی کی یہ نرم سی مسکراہٹ ہمیشہ اُسے سُکھ کا احساس دلاتی تھی۔ لیکن اُس پل وہ بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔ جیسے کنکروں پر ننگے پاؤں چل رہا ہو۔ اُس نے سوچا۔ وہ اب اپنے ہی گھر میں غیر ضروری

۱۸۰/۱۱ - کوچہ لمباں، امرتسر ۱۴۳۰۰۱ (پنجاب)

آجکل نئی دہلی

ہو رہا تھا۔ جیسے بجلی آجانے پر پرانی لالٹین۔“

اُس نے الماری کھولی۔ پرانا کوٹ، پرانی پتلون، پرانی ٹائی، پرانے جوتے پہنے۔

”اُتار دو یہ سب۔ اچھا نہیں لگتا۔“ بیوی نے حق سے کہا۔

”مجھے اچھا لگتا ہے۔“

مرد کا لہجہ اجنبی ہو رہا تھا۔ وہ کچھ عرصے سے اُس مرد کو دُور ہوتے محسوس کرنے لگی تھی اور اس احساس نے اُسے ڈرا دیا تھا۔ اس نے ایسا کیا کیا تھا؟ کیا چاہتا ہے وہ۔ ان بائیس برسوں میں اُس نے سب ہی کچھ تو اُسے دے دیا تھا۔ وہ بیٹے کو بار بار میرا کہتا ہے جب کہ وہ ہر جگہ باپ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

وہ گھر سے نکل آیا۔ سڑک خالی تھی۔ جامن اور آم کے درختوں پر دھوپ پھیلی تھی، بارشوں کی منتظر۔ نیم کی چھاؤں میں دھونی رمانے والا سادھو اب وہاں نہیں تھا۔ ناشپاتی کا باغ کاٹا جا رہا تھا۔ باغ کے اندر کلہاڑیوں، پیڑوں کے گرنے اور آدمیوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ سڑک کے کنارے بورڈ ایستادہ تھا۔ رہائشی پلاٹ —— رابطے کے لیے کسی پراپرٹی ڈیلر کا نام، پتہ اور ٹیلی فون نمبر درج تھا۔ اُس نے خالی زمین کی طرف دیکھ کر سوچا۔ شہر کتنی تیزی سے پھیل اور بدل رہا ہے۔ یہ تواریخی، دھارمک، اُونگھتا شہر کسی بھوکے دیو کی طرح جاگا ہے۔ اور آدم بو، آدم بو کرتا من مانیاں کر رہا ہے۔ جب اُس نے اس علاقے میں مکان بنایا تھا تب یہ جگہ شہر سے دُور سمجھی جاتی تھی اور اب شہر جیسے اس میں آگھسا تھا۔ اُس نے اس باغ کو ہر روپ ہر رنگ میں دیکھا تھا —— پت جھڑ میں —— جب سارے پیڑ ننگے اور خالی ہو جاتے۔ سوکھے پتے، سوکھی ٹہنیاں —— پھر پھاگن اور چیت کی میٹھی رُت کی چنچل ہوائیں اُن میں زندگی بھر دیتیں۔ تب شاخوں میں لچک سی پیدا ہو جاتی۔ پھر سفید، ہلکے گلابی پھولوں کے چراغ روشن ہو جاتے۔ اور پھر یہ پھول ننھی، ہری ناشپاتیوں کو جنم دے کر بکھر جاتے۔ اگلی رُت میں آنے کا خاموش وعدہ کر کے۔

باغ کا بڑا حصہ صاف کر دیا گیا تھا۔ یہاں آکر بسنے والے کیا کبھی سوچیں گے کہ انہوں نے کیا اُجاڑ دیا ہے۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ چوک میں رکشا والے نے پوچھا کہ اُسے کہاں جانا ہے؟ ’کہیں نہیں‘۔ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ کچھ دُور جاکر ایک کار اُس کے قریب آکر رُکی۔ مسز دیوان نے اُسے حیرت سے دیکھا لفٹ کی پیش کش کی۔ اُس نے مسکرا کر شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔ سچ مچ اُسے کہیں نہیں جانا تھا۔ اس کہیں نہیں جانے میں کتنا مزہ تھا۔

وہ گھر سے دُور آگیا تھا اور اب تھکان سی محسوس کر رہا تھا۔ پیدل چلنے کی عادت کہاں رہی تھی۔ ذرا سستانے اور تازہ دم ہونے کے خیال سے ایک ریستوران میں داخل ہو گیا۔

اندر نیلی گلابی روشنیاں خواب کی سی کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔ چھت کی آرائشی جالیوں کے پیچھے چھپا اسپیکر موسیقی بکھیر رہا تھا —— وہ جیسے بہت پیچھے لوٹ گیا تھا۔ زندگی کی مصروفیات نے تو جیسے اُس سے اُسے چھین لیا تھا۔ اور یہ مصروفیات اُس نے خود پیدا کی تھیں۔ اپنے بارے میں جیسے سوچنا بھول ہی گیا تھا۔ آنکھیں موند کر اُس نے اپنے اندر دیکھا۔ اپنا آپ اُسے بہت اُداس اور بہت اکیلا دکھائی دیا۔ شادی، بیٹا، بڑھتا ہوا کاروبار، مکان، کار، بینک بیلنس۔ اُس نے سوچا تھا۔ یہ سب حاصل ہو جانے پر فراغت مل جائے گی۔ لیکن وہ تو اور زیادہ اُلجھ کر رہ گیا تھا۔

کافی کی مہک نے ایک اور خوشبو کی یاد تازہ کر دی تھی۔ —— بہت پہلے بیوی کی فرمائش پر ترک کی عادت نے جیسے اُسے للکارا۔ اس نے بیرے سے سگار لانے کے لیے کہا۔ سگار کا بھرپور کش لے کر اُسے لگا کہ وہ ابھی ’باقی‘ ہے۔ پوری طرح ختم نہیں ہوا۔

سامنے نیم تاریک کونے میں ستون کی آڑ میں ایک نوجوان نے اپنے ساتھی لڑکی کو لپٹا کر چوما۔ ایک اور کونے میں دبی دبی نسوانی ہنسی اُبھری۔ کسی صوفے پر کانچ کی چوڑیاں چھنکیں۔ اسپیکر سے اب ایک ہندوستانی گیت مغربی دُھن کے سہارے اُبھر رہا تھا۔ گانے والے کی آواز میں نہ رس تھا نہ لوچ۔ سپاٹ، لطافت سے عاری، بیسیوں ملکی اور غیر ملکی سازوں کی بیساکھیوں پر لنگڑا کر چلتا وہ گیت، اُس کے ذہن میں کُلہاڑی کی طرح ضربیں لگا رہا تھا۔ کھُردرے الفاظ، ’اُچھلتے کُودتے‘، نہ جذبہ نہ شاعری —— یہ سب کیا ہے! کیوں ہے! خوب صورتی، نرمی، مٹھاس کہاں چھوڑ آئے ہم یہ سب۔ گیت اپنے شور کے ساتھ ختم ہوا تو اُس نے راحت محسوس کی۔ اُس نے سکون کے احساس میں ڈوب کر آنکھیں مُوند لیں۔ تبھی اُس ستون کے پیچھے سے آواز آئی۔ پھر سے لگا نا یہ گیت۔ اُسے لگا اُس نے یہ آواز پہلے کبھی سُنی ہے۔ ان آوازوں کا ریلا اُس کے ارد گرد ناچتا رہتا ہے۔ وہی ڈھول ڈھمکا پھر شروع ہو گیا۔ اور جیسے اُسی بے سُری آواز نے ہاتھ پکڑ کر اُسے ریستوران سے باہر نکال دیا۔

ریستوران میں چھوڑے ہوئے سگار کی مہک کچھ دُور تک اُس کے ساتھ رہی پھر وہ اکیلا ہو گیا۔ آکاش کی نیلاہٹوں میں اُڑتا ہوا ایک بگلا یوکلپٹس پر ٹنگے بادل کے ایک ٹکڑے میں غائب ہو گیا۔ بتیوں والے چوک میں پہنچ کر اُس کے قدم رُک گئے۔ کہاں جا رہا ہے وہ! کیوں! اس طرح کب تک چل سکے گا۔ چوراہے کی بتیاں آنکھیں جھپک رہی تھیں۔ اِدھر اُدھر رُکا ہوا ٹریفک ایک دم حرکت میں آجاتا۔ سب کچھ کہیں نہ کہیں بندھا ہے۔ وہ بچوں کی طرح بتیوں اور ٹریفک کے اس کھیل سے لُطف اندوز ہوتا رہا۔ اس دوران کئی شناسا چہرے اُسے پہچان کی لہروں میں ڈال گئے۔ کئی آنکھوں نے مسکرا کر دیکھا۔ کچھ نے حقِ دوستی ادا کیا۔ یہاں کیوں کھڑے ہو۔ کار خراب ہے۔ کہیں جا رہے ہو۔ آج اکیلے ہو۔ چلو گھر پہنچا دیں۔ کلب

چلتے ہو۔ آج فیکٹری میں ناغہ ہے۔؟

سمجھا اکیلے ہونا جرم ہے۔ کلب، فیکٹری، گھر کے علاوہ وہ کہیں نہیں ہو سکتا۔ کیا اُس کی بیوی کا ہر وقت اُس کے ساتھ ہونا لازمی ہے۔ زندگی کے سفر میں کیا وہ عورت اس کی منزل کا ٹکٹ ہے۔ اُسے اپنے کرم فرماؤں پر غصہ آیا۔ وہ اُس کے وجود کو اپنے پن کے ساتھ قبول کیوں نہیں کرتے۔ کیا وہ صرف بزنس مین شوہر اور باپ ہی ہے۔ کار، بیوی، بینک بیلنس کے بغیر کیا اس کی شخصیت مکمل نہیں ہو سکتی۔

یوکلپٹس کی شاخوں پر رُکا بادل کا ٹکڑا دھیرے دھیرے گھلتا جا رہا تھا۔ ہری بتی پر ٹریفک حرکت میں آیا تو وہ بھی بے ارادہ بائیں طرف مڑ گیا۔ گلے، ناک، کان کے اسپتال کی طرف چلتے ہوئے اُس نے محسوس کیا کہ وہ اس سڑک سے پہلی بار مل رہا ہے۔ شاید کار میں گزرتے ہوئے اس کا دھیان ادھر نہیں گیا تھا۔ لانڈری، بیکری، میڈیکل اسٹور کلاتھ ہاؤس، بیوٹی پارلر، کراکری سینٹر، کباب شاپ، ویڈیو گیمز، مہاراجہ ٹریولز ——— اور اُس کے دوست کی کوٹھی والا موڑ ——— شاید یہ نہیں ہے ——— یہی ہے ——— اُس نے پہچان کے لیے مورتی کا تیج کی طرف دیکھا ——— بھگوان کرشن کی مورتی، رنگ پھیکے پڑ چکے تھے۔ بانسری ٹوٹ گئی تھی ——— مکٹ بھی آدھا رہ گیا تھا۔ پرندوں کی بیٹوں نے چہرہ گندا کر دیا تھا۔ شاید اب یہاں کسی کے پاس دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ خوبصورت، ہرا بھرا لان، وہ اونچے گھنے درخت ——— کہاں گیا وہ سب کچھ ——— وہاں تو اب دُکانیں تھیں۔ دو کالونیں میں بھیڑ سی تھی۔

وہ گلی میں داخل ہو گیا ——— نمبر تین ——— لوہے کا گیٹ ذرا سا دھکیل کر وہ اندر داخل ہو گیا ——— سیڑھیاں، برآمدہ ——— اُس نے بیل پر انگلی رکھ دی۔ نوکر نے دروازہ کھولا۔ اُسے کمرے میں بٹھا کر اندر اطلاع دینے چلا گیا۔ وہی کمرہ ——— کشادہ، اونچی چھت پُرسکون راحت بخش، لیکن کچھ بدلا بدلا سا ——— نیا ماڈرن فرنیچر، قالین، فانوس، پردے، وال پینٹنگز، ٹیوب لائٹس۔

"ارے تم! ——— کیسے ہو ——— بہت دن بعد آئے۔"

اُس نے تکان کے احساس سے دوست کی طرف دیکھا، مسکرایا اور ٹانگیں قالین پر پھیلا دیں۔

"بنا فون کیے آ گیا۔ تم ڈسٹرب تو نہیں ہو گئے۔"

"نہیں نہیں۔ تم ٹھیک تو ہو۔ کچھ پریشان تھکے تھکے سے لگتے ہو۔ خیریت تو ہے۔"

"نتھنگ ٹو وری Nothing to worry"

اُس نے ہنسنے کی کوشش کی۔ لمبی مسافت نے شاید اُسے سچ مچ بُری طرح تھکا دیا تھا۔ اب ٹانگیں جیسے ٹوٹ کر جسم سے الگ ہو گئی تھیں۔ ہلکا ہلکا درد کمر سے شانوں کی طرف رینگ رہا تھا۔

"کیا لو گے ——— ٹھنڈا یا گرم؟"

"کچھ نہیں۔ ایک گلاس پانی منگا دو۔ میں یوں ہی چلا آیا ——— اُس نے جُرم کے احساس سے کہا ——— میرا خیال تھا۔ تم گھر پر نہیں ہو گے۔ لیکن ایسا میں نے گھر سے چلتے ہوئے نہیں سوچا تھا۔ راستے میں بھی نہیں۔ تمہاری کوٹھی میں داخل ہوتے ہوئے بھی یہ بات میرے ذہن میں آئی۔ اچھا ہوا تم مل گئے ورنہ مایوسی ہوتی۔

اُس کا دوست اُسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُسے دوست کا لہجہ، انداز، ڈھنگ غیر معمولی سا لگ رہا تھا۔ وہ پرانے دوست تھے، لیکن وہ آنے سے پہلے ہمیشہ فون پر وقت طے کر لیتا۔ پھر اتنا تھکا تھکا اور پریشان سا تو وہ کبھی نہیں ملا تھا۔

"تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"بالکل ——— perfectly well"

"آج میں پیدل ہی چلا آیا۔" وہ مسکرایا۔

"گھر سے ——— اتنی دُور ——— سچ کہہ رہے ہو۔ پر تمہیں کیا سُوجھی ——— کار خراب تھی؟"

"نہیں۔ بس جی چاہا ——— لیکن اس سے ایک فائدہ بھی ہوا۔ اپنے اس شہر کو بہت قریب سے دیکھ سکا ہوں۔ لگتا ہے بہت عرصہ بعد شہر سے ملاقات ہوئی ہے۔ ہر طرف زبردست تبدیلی ہوئی ہے۔ اب یہ سڑک ہی لے لو۔ سب کچھ بدل گیا ہے۔ اور وہ مورتی کا تیج ——— پہچانی نہیں جاتی۔ لان کی جگہ دو کالونں نے لے لی ہے۔"

"ہاں"۔ اُس کا دوست مسکرایا۔ "یہ تبدیلی بہت تیز بھی ہے۔ ہونا ہی تھا۔ آبادی، انڈسٹری ضرورتیں۔ سب کچھ تو بڑھا اور بدلا ہے۔ یوں بھی لان پر خرچ ہوتا ہے اور دو کالونوں سے معقول آمدنی ——— اب تو وہ لوگ دو کالونوں کے اوپر بھی فلیٹس بنانے کی سوچ رہے ہیں۔"

"لیکن اس طرح کوٹھی کی ساری شان، سارا حُسن جا تا رہا ہے۔"

"شان اور حُسن کا Concept بھی تو بدل گیا ہے۔"

"تمہارا یہ کمرہ بھی تو بدل گیا ہے۔"

"ہاں، پہلے بیٹھک ہوا کرتی تھی۔ اب ڈرائنگ روم ہو گیا ہے۔ اب ہم کھانا نہیں کھاتے۔ لنچ اور ڈنر لیتے ہیں۔" اس کا دوست ہنسا۔ نیا خون۔ نئی باتیں۔ یہ سب ہمارے صاحبزادے راجیش کے شوق ہیں۔ اپنے وقتوں کے شوق ہم نے پورے کر لیے ——— اب ان لوگوں کا زمانہ ہے۔ یاد ہے ہمارے والدین ہماری کچھ عادتوں سے پریشان رہا کرتے تھے سنیما تک دیکھنے سے منع کرتے تھے۔ کلبوں میں جانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لوگ سیر و تفریح کے لیے نہیں، تیرتھ یاترا پر جایا کرتے تھے۔ میں نے تو سارا بوجھ دھیرے دھیرے راجیش پر ڈال دیا ہے۔ شروع میں تو اُلّل بچھیرے کی طرح رسی تڑانے کی کوشش کرتا تھا۔ اب ایسا لائن پر آیا ہے کہ فیکٹری اور بینک کے سوا اُسے کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔ میں تو سُکھی ہو گیا ہوں۔ کبھی کبھار جی چاہا تو فیکٹری ہو آیا چند منٹوں کے لیے۔ اب اس کی ماں کا خیال ہے، اُس کی شادی کر دی جائے۔"

اُس نے محسوس کیا وہ پیچھے رہ گیا ہے۔ لیکن کیا اس دوڑ میں ہانپ ہانپ کر آگے نکلنا ضروری ہے۔ کیا اس کا دوست صحیح راستہ پر ہے۔ اس میں اور کلب میں بیٹھ کر رمی کھیلنے، بیئر وہسکی پینے والے بیبیوں مل مالکوں میں کیا فرق ہے۔ اس کی الگ پہچان کیا ہے۔ یہ تو ناشپاتی کا پیڑ ہے۔ سب ایک جیسے ایک ہی موسم میں پھل لانے والے ـــــ وہ اس بھیڑ کا حصہ کیوں بنے۔ وہ اپنی الگ شناخت بنائے رکھنا چاہتا ہے تو کیا بُرا ہے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" اُس نے موضوع بدل دینا مناسب سمجھا۔ "آج تمہارے ساتھ بیٹھ کر بیئر پینے کا من تھا۔"

"تو ابھی منگا لیتے ہیں۔"

"نہیں، کلب میں ـــــ سوچتا ہوں یہ رکھ رکھاؤ، یہ غیر ضروری بندھن، توڑ کر بیتے دنوں میں لوٹ جاؤں۔"

"یہ ناممکن ہے ـــــ خیر چلتے ہیں۔"

اس دَوران اُس کے دوست کی بیوی آگئی۔

"بھائی صاحب، کیا بات ہے، آج اکیلے ہیں۔ بہن جی کہاں ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے اُن کی ـــــ؟"

"بالکل ـــــ سوچا آج اس پرانے یار کو بور کیا جائے۔ لے جاؤں اسے ـــــ"

"آج ہم دوستوں کا موڈ آوارہ گردی کا ہے۔" اس کے دوست نے بیوی سے کہا۔

"ضرور، آدمی کو کبھی کبھی آوارہ گردی بھی کرنی چاہیے!" وہ ہنسی۔ "مرد، چابیوں کے گچھے کی طرح بیوی کے پلو سے ہی بندھا رہے تو اچھا نہیں لگتا۔"

"تو میاں، اب جلدی سے نکلو ـــــ شریمتی جی پر بھی ہم بوجھ بنے بیٹھے ہیں۔" اس کے دوست نے کہا۔ پھر بیوی سے مخاطب ہوا۔ "کار کی چابی لا دینا۔"

کار اسٹیریو پر غزلوں کا کیسیٹ لگا کر اُس کا دوست راحیش کے رشتے کی باتیں کرنے لگا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ آج وہ ان باتوں کے موڈ میں نہیں تھا۔

"آج، تمہاری طرف رُکتے ہوئے میں کیفے ٹیریا میں جا بیٹھا۔ مدت بعد گیا تھا۔ جیسے ایسی جگہوں پر جانا بھول ہی گیا تھا۔ بالکل ماڈرن طریقے سے سجایا ہے مالکوں نے۔ ایک مزے کی بات بتاؤں آج میں نے پورا سگار پیا۔ بڑا اچھا لگا۔ یاد ہے کالج کے دنوں میں ہم سگار پیا کرتے تھے اور ہمارے ساتھی ہمیں حیرت سے دیکھا کرتے تھے۔ ہم نے بھی تبھی بیئر پینی شروع کی تھی۔

ہم دوسروں سے الگ اور آگے سمجھا جانا چاہتے تھے۔ بزرگوں کو ہماری یہ باتیں یہ عادتیں پریشان کیا کرتی تھیں۔ یاد ہے تمہارے اور میرے والدین اس پر ناراض ہوا کرتے تھے۔ یار، میرے پتا جی نے تو مجھے گھر سے نکال دینے کی دھمکی دے ڈالی تھی ـــــ وہ تو ماں نے بچا لیا ورنہ ـــــ" وہ کھُل کر ہنسا۔ "تمہارا بیٹا آج کل کیا کر رہا ہے ـــــ پڑھائی تو ختم کر لی تھی اُس نے ـــــ"

"موٹر سائیکل دوڑاتے پھرتے ہیں صاحبزادے ایک لڑکی کو پیچھے بٹھا کر۔"

"گڈ ـــــ" اُس کا دوست خوش تھا۔ "یار اگر لڑکی نیک اور اچھے خاندان کی ہے تو شادی کر دو دونوں کی۔ یار، ہم تو ترسا کرتے تھے ان باتوں کو۔ تمہیں اچھا نہیں لگتا کہ تمہاری خواہشات کسی رُوپ میں تو پوری ہو رہی ہیں۔ یاد ہے، لڑکیوں کو دیکھ کر ہم لوگ کیسے ہاتھ چھوڑ کر سائیکل چلاتے تھے۔ تم تو گرے بھی تھے ایک بار ـــــ"

اُسے سب یاد تھا۔ اُس نے اتنے برسوں بعد اس واقعہ پر ہلکی سی خجالت محسوس کی ـــــ اس نے کار رُکوا کر سگار خریدے۔

کلب میں بیئر کا گلاس لبوں سے لگاتے اُس نے محسوس کیا کہ وہ خود میں لوٹ آیا ہے۔ اُس نے سگار سلگایا۔ دوست سے بھی کہا۔ اُس نے بھی سگار سلگا لیا۔ کش لے کر اُس نے جیسے اپنے اندر جھانکا۔ کیا وہ پہلے یہاں نہیں تھا۔ اگر تھا تو بیچ میں کہاں چلا گیا تھا۔ اُس نے دوست کی طرف دیکھا۔ وہ شاید گلے میں خرابی محسوس کر رہا تھا۔ اُسے کھانسی اُٹھنے لگی۔ ذرا سنبھلا تو بولا۔

"مدت بعد پیا ہے نا۔ اسی لیے۔"

"مجھے تو ـــــ تمہارا گلا خراب تھا تو انکار کر دیا ہوتا ـــــ بیئر سپ کرو۔"

"اب اس عمر میں کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی ہے۔ آج کف سرپ کی ڈبل ڈوز سہی۔" اس نے سگار ایش ٹرے میں رکھ دیا۔ کھانسی پھر اُٹھنے لگی تھی۔

"تم گھر جاؤ۔ مجھے افسوس ہے۔ آج تمہارے ساتھ بہت زیادتی کر دی میں نے۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تم نے کہہ دیا ہوتا۔ اب تم گھر جاؤ۔"

"آئی ایم ویری سوری۔"

"بے وقوف مت بنو۔ ہو جاتا ہے ایسا کبھی کبھی۔ میں خود چاہتا تھا کہ پرانی یادیں تازہ کرتے، لیکن یہ کھانسی۔"

اُس نے بیرے سے گرم پانی لانے کے لیے کہا۔ پانی پی کر جب اُس کی طبیعت ذرا سنبھلی تو وہ اَن منا سا چلا گیا۔

اُس کے دوست کا چھوڑا ہوا سگار دھیرے دھیرے سُلگ رہا تھا۔ گلاس میں تھوڑی سی بیئر بھی تھی۔ اُس نے وہ بیئر سگار پر اُنڈیل دی۔ سگار جیسے احتجاج کر کے بجھ گیا۔ اب نہ دھواں تھا نہ بیئر۔ سگار کا ٹکڑا ایش ٹرے میں اوندھا پڑا تھا۔

درختوں میں اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ ٹینس کورٹ کی زرد بتی اُداسی سے جل رہی تھی ـــــ گھنے درختوں میں پرندے اپنی واپسی کا پُر زور اعلان کر رہے تھے ـــــ وہ پھر اُداس ہونے لگا۔ کیا کیا دن سہے اُس نے۔ یہ لاحاصلی کا دُکھ اُس کی روح میں اُترنے لگا۔

مثانے پر بوجھ محسوس کر کے وہ باتھ روم کی طرف گیا۔ برآمدے میں مسز دیوان نے روک لیا۔

"کیا بات ہے مسٹر شرما آج ـــــ"

"نتھنگ ـــــ کرائے اوکے ـــــ"

عابد سہیل

یہ واقعہ ہے یا کوئی منظر ہے خواب کا

آنکھ کھلتے ہی وہ اپنی عادت کے مطابق لحاف جسم پر سے ہٹا کر اُٹھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ اُسے جانے کیسے بہت پہلے کہیں پڑھا ہوا ایک جملہ یاد آ گیا۔ لیکن یہ یاد کچھ دُھندلی دُھندلی سی تھی۔ کچھ ظاہر اور زیادہ ترچھپی ہوئی۔ جیسے گہرے بادلوں کے پیچھے سورج۔ اسے جملے کے مفہوم کا کچھ کچھ احساس تو تھا، لیکن پوری بات یاد نہیں آ رہی تھی۔ اُس نے ذہن پر زور ڈالا تو جیسے سورج نے بادلوں سے نکلنا شروع کیا۔ اب اس جملے کے الفاظ بھی دھیرے دھیرے یادداشت میں اُبھرنے لگے تھے۔

وہ جملہ کچھ یوں تھا: "آنکھ کھلتے ہی بستر سے اس طرح نہ کھاگو جیسے کسی نے تمہیں ڈنک مار دیا ہو۔ بلکہ اس خواب کے بارے میں سوچو، جو تم نے دیکھا ہے"۔

"خواب! خواب تو اس نے بہت دنوں سے نہیں دیکھا' شاید کئی برسوں سے"۔ اس نے سوچا۔

یہ خیال اس قدر ریختہ تھا کہ اس نے دماغ پر زور ڈالنے کی کوشش بھی نہیں کی اور یہی سوچتا رہا کہ نیند ابھی پوری نہیں ہوئی ہے۔ لیکن ایک بہت پُرانا خواب اُسے یاد آ رہا تھا۔ کسی ایسی کھوئی ہوئی چیز کی طرح جسے بھولے ہوئے بھی ایک عرصہ ہو گیا ہو اور جو اب ایک دم یاد آ گئی ہو۔

ایک بہت بڑا مکان تھا۔ بہت سے کمرے اور دالان تھے۔ باہر بڑا سا میدان تھا جس کے ایک حصہ میں چھوٹا سا باغ تھا۔ اسی لمحہ وہ اُلجھن میں پڑ گیا کہ وہ خواب یاد کر رہا ہے یا حقیقتوں کو خواب کی شکل دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن نہیں یہ خواب ہی تھا۔ حقیقتوں سے زیادہ خوب صورت۔

باہر بڑا سا میدان ضرور تھا۔ باغیچہ بھی تھا، لیکن خواب کے باغیچے سے کچھ چھوٹا۔ کمرے اور دالان بڑے ضرور تھے، لیکن ایسے سجے ہوئے نہ تھے جیسے خواب میں اس نے دیکھے تھے۔ ان کمروں اور دالانوں میں صاف ستھری وردیاں پہنے اِدھر اُدھر آتے جاتے ملازم بھی نہ تھے۔ عیش و آرام کا ایسا سامان بھی نہ تھا جیسا خواب کے ان کمروں میں تھا۔

پھر اُسے یاد آیا کہ تیس، سال قبل کے اس خواب کو اس نے برسوں یاد رکھنے کی کوشش کی تھی۔ پوری تفصیل کے ساتھ کہ ایسا ہی مکان ہوگا، ایسا ہی باغیچہ، کتابوں کی ایسی ہی خوب صورت سی الماری۔ لیکن پھر آندھیاں اتنی تیز چلنے لگی تھیں کہ سب کچھ بکھر کر رہ گیا تھا۔ اور فراغت، فرصت کا کوئی ایسا لمحہ بھی ہاتھ نہ آیا تھا جس میں بیٹھ کر وہ اُسے یاد ہی کر لیتا۔

ابھی وہ اس خواب کے کمروں اور دالانوں میں گھوم پھر کر ایک ایک چیز کو حیرت اور استعجاب سے دیکھ ہی رہا تھا کہ اُسے ایک دوسرا خواب یاد آ گیا اور جیسے اُس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

چار کمروں کا ایک بے حد خوب صورت سا مکان۔ اُس نے ابھی ایک ہی کمرہ دیکھا ہے، لیکن جانے کیسے اُسے احساس ہے کہ مکان میں چار کمرے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔ مکان میں اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ اسے یہ بھی یاد نہیں کہ وہ اس مکان میں کب اور کیسے آیا ہے۔ کب اور کیسے؟ شاید چاروں طرف آگ لگی تھی، جس کی لپٹیں اس کے جسم کو چھونے ہی والی تھیں، بلکہ چھونے لگی تھیں۔ کل نہیں، پرسوں۔ لیکن یہ بات اتنے قریب کی نہیں۔ لیکن اس نے اس مکان میں داخل ہو کر اطمینان کا سانس لیا تھا۔

سجی سجائی الماریاں دیواروں سے لگی کھڑی ہیں۔ کسی میں پھول ہی پھول ہیں۔ جو ہیں تو شاید پلاسٹک کے، لیکن ان کی خوشبو سے سارا کمرہ مہک رہا ہے۔ ایک دوسری الماری میں چینی کے رنگا رنگ برتن سجے ہوئے ہیں۔ اتنے خوب صورت برتن اُس نے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ تیسری الماری سِلے سلائے کپڑوں سے بھری ہے۔ کچھ کپڑے ہینگروں میں ٹنگے

نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد، لکھنؤ

ہیں ۔ اور کچھ نہایت سلیقے سے تہہ کیے ہوئے رکھے ہیں۔ الماری بند ہے، لیکن اس میں تالا نہیں لگا ہے ۔ اس نے کسی کپڑے کو چھوا تک نہیں ہے، لیکن اسے احساس ہے کہ یہ سارے کپڑے جیسے اُسی کے لیے سیے گئے ہیں ۔ دیوار پر ایک نہایت خوبصورت روغنی تصویر ٹنگی ہے ۔ وہ تصویر کی طرف بڑھتا ہے، ذرا قریب سے دیکھنے کے لیے ۔ یہ تصویر یقیناً کسی مغربی فن کار کا شاہکار ہے ۔ ایک حسینہ جس کے بال کھلے ہوئے ہیں ۔ ہاتھ آسمان کی جانب بلند کیے ہوئے بے خودی کے عالم میں دُور اُبھرتے ہوئے چاند کو دیکھ رہی ہے ۔ اس کے چہرے پر معصومیت، حُسن، شرم اور پاکبازی کا ایسا امتزاج ہے جو اس سے پہلے اُس نے کبھی نہ دیکھا تھا ۔ مغرب کے آئینے میں مشرق کا عکس سب کچھ بھول کر وہ بھی اپنے ہاتھ اسی طرح اُٹھاتا ہے تو اس کا ایک ہاتھ بائیں جانب کے دروازے پر جھولتے ہوئے پردے سے ٹکراتا ہے ۔ پردہ کی دبازت کا اُسے ایک دم احساس ہوتا ہے ۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کے اُس پردے پر جس پر بڑے بڑے پھول بنے ہوئے ہیں، آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتا ہے ۔ اتنا نرم اور خوب صورت کپڑا تو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا ۔ وہ پردہ اُٹھاتا ہے تو دوسرا کمرہ نظر آتا ہے ۔ وہ نہایت آہستگی سے اس میں داخل ہو جاتا ہے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایک ایک چیز کو دیکھتا ہے ۔ یہ کمرہ پہلے والے کمرے سے بھی زیادہ خوب صورت ہے ۔

سامنے دیوار پر ایک نقشین گھڑی ٹنگی ہے ۔ بیل بوٹوں سے ایسی سجی ہوئی جیسے گھڑی نہیں گلدستہ ہو ۔ لیکن اس کا ڈائل بالکل صاف ہے ۔ نہ کوئی سوئی ہے نہ گھنٹوں اور منٹوں کی گنتیاں اور نشان ۔ بس پنڈولم ایک جانب سے دوسری جانب یکساں رفتار سے حرکت کر رہا ہے ۔ اُسے پہلی بار وقت کے عدم وجود کا احساس ہوا ۔ دن ہے کہ رات ۔ اُس نے سوچا ۔ لیکن کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکا ۔

کیا یہاں وقت رک گیا ہے ۔ لیکن اگر وقت رک گیا ہے تو پنڈولم حرکت کیوں کر رہا ہے؟ وہ سوچنے لگا، سوچتا رہا، سوچتا رہا اور پنڈولم کی کس حرکت نے اس کے دماغ کو آنکھوں میں تبدیل کر دیا ۔ اُسے احساس بھی نہیں ہوا ۔

کمرے کی ایک ایک چیز ایسی تھی اور اس قدر قرینے سے رکھی تھی کہ کسی کمی کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا ۔ بائیں طرف ایک میز پر طرح طرح کے پھل رکھے ہوئے تھے ۔ تر و تازہ ۔ ایسے کہ جیسے شاخوں سے توڑے ہی نہ گئے ہوں ۔ اُسے بھوک کا کچھ کچھ احساس ہونے لگا تھا ۔ لیکن بس ایسا جیسا کسی بہت لذیذ چیز کو دیکھ کر ہوتا ہے ۔ اس نے کرسی کھینچی ۔ ایک سیب اُٹھایا اور چھری سے کاٹا تو اس میں سے رس پھوٹ پڑا ۔ سیب اس قدر لذیذ اور میٹھا ہو سکتا ہے ۔ یہ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا ۔ پھر اُس نے انگور کے چند دانے منہ میں ڈال لیے جو فوراً ہی گھل کر اُسے ایک عجیب سے سرور سے روشناس کرا گئے ۔ کیا جنت میں ایسے ہی پھل ہوں گے ۔ اس نے سوچا ۔ ہاں ایسے ہی ہوں گے ۔ اس نے خود ہی جواب دیا ۔ کیوں کہ اس سے بہتر پھلوں کا تصور بھی ممکن نہیں ۔

اس کا اندازہ ٹھیک تھا ۔ سامنے والا دروازہ ہی دوسرے کمرے میں کھلتا تھا ۔ وہ پردہ اُٹھا کر اس میں داخل ہو گیا ۔ یہ کمرہ ان دو کمروں سے بھی خوب صورت تھا ۔ سامنے مسہری پر بستر بچھا تھا ۔ جسے دیکھنے ہی سے اس کی نرمی کا احساس ہونے لگا ـــــ وہ خود پر قابو نہ پا سکا اور جوتے پہنے پہنے ہی بستر پر دراز ہو گیا اور اس کا سارا جسم نرم گدّے میں دھنستا چلا گیا ۔ اس بستر پر تو کوئی آنکھ کھولے کھولے بھی لیٹے تو پانچ منٹ ہی میں نیند کی دنیا میں پہنچ جائے ۔ اُس نے آنکھیں بند کیے کیے سوچا ۔

پھر اس نے اپنے اس خیال کی سچائی کو پرکھنے کے لیے آنکھیں کھولیں تو ایک ہی جست میں بستر سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور چھت کو گھورنے لگا جہاں ایک ننگی تلوار بال سے باریک تاگے سے لٹک رہی تھی ۔ تاگا ٹوٹ جاتا تو تلوار سیدھی اس کے سینے میں پیوست ہو جاتی ۔ اس نے سوچا اور تیزی سے سامنے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا جو چوتھے کمرے میں کھلتا تھا ۔

یہ کمرہ ذرا تکونا سا تھا ۔ جس کے اس عیب کو چھپانے کے لیے ایک کونے میں لکڑی کی ایک جالی کھڑی کر دی گئی تھی ۔ اور دوسرے میں پھولوں سے لدے ہوئے پودوں کے کچھ گملے سجا دیے گئے تھے ۔ اس دروازے سے جس کا رُخ باہر کی طرف تھا، روشنی کی ایک کرن آ رہی تھی ۔ لیکن وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ یہ کرن سورج کی تھی یا چاند کی ۔ اس نے دراز میں سے باہر جھانکا تو ایک لق و دق میدان سامنے تھا ۔ چٹیل، بے برگ و گیاہ میدان لیکن اب بھی اُسے اندازہ نہ ہو سکا کہ اُس وقت دن تھا یا رات ۔ دروازہ اندر سے بند تھا ۔ اُس نے زنجیر کھولی اور دروازے کو اپنی طرف کھینچا، لیکن اُس میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی ۔ اُس نے زور سے دھکا دیا ۔ لیکن دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا ۔ اب اُسے خوف کا ہلکا ہلکا احساس ہونے لگا تھا ۔ وہ تیزی سے تیسرے کمرے میں گیا، تیسرے سے دوسرے میں اور دوسرے سے پہلے میں، اس خیال سے کہ پہلے والے کمرے میں باہر جانے کا راستہ ضرور ہو گا ۔ لیکن اس میں تو بس ایک ہی دروازہ تھا ۔ جس سے وہ ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا ۔ وہ تیزی سے پلٹا ۔ لیکن کسی کمرے میں ایک ایک دروازے کے علاوہ کوئی اور دروازہ نہ تھا ۔ چوتھے کمرے میں اس جگہ جہاں اس نے ابھی ابھی دروازہ کھول کر باہر نکلنے کی کوشش کی تھی، پھٹے پرانے کپڑے کا ایک پردہ لٹک رہا تھا ۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر پردہ ہٹایا تو وہاں دروازہ کا نشان تک نہ تھا ۔ وہ تیسرے کمرے کی طرف پلٹا ۔ اسی لمحہ اُسے اس خوب صورت، نرم، دبیز گدّے کا خیال آیا جو مسہری پر بچھا تھا ۔ کس قدر آرام دہ تھا وہ بستر ۔" اُس نے سوچا ۔

مسہری اپنی جگہ موجود تھی۔

"لیکن اس آرام دہ بستر سے فائدہ جس پہ تلوار لٹک رہی ہو۔"

بستر اپنی جگہ سے غائب تھا۔

"پھل کس قدر لذیذ تھے۔"

میز پہ انواع و اقسام کے پھل سج گئے۔

"لیکن صرف پھل کب تک؟"

گرم ہوا کا ایک تھپیڑا اس کے جسم کو جھلساتا ہوا گزر گیا۔

"الماری میں کس قدر خوب صورت کپڑے رکھے تھے۔ ان کو پہن کر میں کتنا اسمارٹ لگوں گا!"

طرح طرح کی خوشبوؤں سے اس کا دماغ مہک اٹھا۔

"لیکن مجھے ان کپڑوں میں دیکھے گا کون؟ انھیں پہن کر باہر نکل سکوں تو ——!"

روغنی تصویر کے ہاتھوں کے پنجرنے اُسے اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی۔

اب جو وہ پلٹا تو اس نے دیکھا کہ وہ تلوار جو تھوڑی دیر قبل چھت سے لٹک رہی تھی، ہوا میں لہرا رہی تھی۔ اور دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے اور دوسرے کمرے سے تیسرے کمرے کی طرف بھاگا۔ پلٹ پلٹ کر اس تلوار کو دیکھتے ہوئے جو اس کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ وہ چکرا کر فرش پر گر گیا۔ تلوار اس کے سینے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"اب بھاگنے سے بھی کیا ہوگا؟" کسی نے کہا۔

"لیکن یہاں تو کوئی ہے نہیں۔" اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوچا۔

کوئی تھا بھی نہیں۔

"آگے بڑھ کر تلوار پکڑ لے اور اُسے گھٹنے پر مار کر توڑ دے۔" ایک دوسری آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"تلوار کو ہاتھ لگائے گا تو ہاتھ زخمی ہو جائے گا۔ دعا مانگ —— رب العزت اس مصیبت سے نجات دلا۔"

وہ تلوار کو بھول کر جو اس کے سینے پر تنی ہوئی تھی، چاروں طرف دیکھنے لگا۔ یہ آوازیں کہاں سے آ رہی تھیں۔ متضاد آوازیں۔ اُمید اور حوصلہ دینے والی اور مایوس کر دینے والی آوازیں۔ لیکن کچھ بھی ہو۔ یہ آوازیں اس کے دل و دماغ سے گزرنے والی ہر لہر سے واقف تھیں۔

"صبر کر کہ خدا صابروں کے ساتھ ہے" کسی نے سرگوشی کی۔

"صبر کر لے —— یعنی تلوار کے سامنے اپنا سینہ کھول کر کھڑا ہو جائے اور کہے —— اے ظلم کی تلوار آگے بڑھ اور میری روح کو میرے جسم سے جدا کر دے۔"

ایک دوسری آواز گونجی "موت اور زندگی تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن تدبیر کر، عمل کر۔"

یہ خیال اس کے دل کے پاس سے اس قدر آہستگی سے گزرا کہ وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ یہ خود اس کا اپنا احساس تھا یا کسی دوسرے کی آواز۔

تلوار اب بھی اس کے سامنے فضا میں معلق تھی لیکن اب اس میں وار کرنے کی شاید ہمت نہیں رہ گئی تھی یا شاید اس کی دھار کند ہو گئی تھی۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا تو ایسا لگا جیسے تلوار پیچھے کی جانب حرکت کر رہی ہو۔

"اتنے صحرا، اتنے دریا، اتنے پہاڑ، اتنے سمندر کہاں سے ان چار کمروں میں سما گئے؟" اس نے تلوار کا تعاقب کرتے کرتے سوچا۔ لیکن اب ان کمروں کی دیواریں بھی نظر نہ آ رہی تھیں اور اس کے لیے ان کے درمیان کے فاصلوں کا اندازہ کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اور وہ سمندروں، صحراؤں اور پہاڑوں پہ دوڑتا ہوا تلوار کو اپنے قبضے میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ آخر اس نے تلوار کو جا ہی لیا۔

گھر کے سارے لوگ اس کے بستر کے چاروں طرف کھڑے تھے اور ان میں ہر ایک دوسرے کو حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"اتنا زوردار قہقہہ تو آپ کبھی لگاتے نہیں۔ میں تو ڈر گئی تھی۔" اس کی بیوی نے کہا۔

اس نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی۔ خوب صورت کمرے، ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر، دھار دار چٹانوں کے بڑے بڑے پہاڑ، اندھیروں کو اپنے دامن میں سمیٹے صحرا۔

وہ خود بھی حیران نظروں سے ان کو دیکھتا رہا۔ پھر جیسے اُسے سب کچھ یاد آ گیا۔

"ایک پیالی چائے تو پلا دو۔" اس نے کہا اور لوگوں کو ایک ایک کر کے کمرے سے باہر جاتے ہوئے دیکھ کر اس نے سمندروں، پہاڑوں، صحراؤں اور تلوار پر قابو پانے والے لمحے کی یادوں کے ساتھ کچھ اور وقت گزارنے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

اقبال متین

سلور فش

آسمان شاید اس کے تصور کا ایک حصہ ہوگیا تھا۔ بند کمروں میں بکھری کتابوں کے درمیان وہ کیا کھوجتا پھرتا ہے اس کو معلوم ہو تو ہو، مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ بند کمروں میں ہوا کے جھونکوں کو مقیّد کرکے وہ اپنی انگلی سے کچھ لکھتا ہے۔ لیکن فراٹے بھرتا سیلنگ فین ان تحریروں کو زمین پر کہیں بکھیرتا رہتا ہے۔

کھلا ہوا بال پین کبھی کاغذ پر دھرا ہوا ملتا کبھی ہوا کے جھونکے سے کاغذ کے پلندے پر سے ڈھلک کر میز پر پڑا ہوا۔

عجب افراتفری کا عالم ہوتا ان دونوں کمروں میں۔ ریفریجریٹر پر بھی اُلٹی سیدھی کچھ کتابیں دھری ہوئی ملتیں اور ان کتابوں پر چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر پڑا ہوا ــــ لیکن آسمان کو اپنی چھت سے جوڑ کر شاید اس نے ٹانکے جوڑ دیے تھے یا کیلیں ٹھونک دی تھیں۔

بعض منظر اپنی اصلیت کھوکر اس طرح دل میں کھُب جاتے ہیں جیسے وہی ان کی اصلیت ہو ــــ دل میں بسی ہوئی کسی قبر کو آپ زمین پر رکھ کر کتنا ہی سنوار دیں لیکن جب وہاں سے ہٹیے تو وہی ایک مٹی کا تودہ دل میں اُٹھائے آپ سارے زمانے کو ناپتے پھرتے ہیں ــــ نہ سنگِ مرمر، نہ جالیاں، نہ جالیوں میں گھرا کتبہ کچھ بھی ساتھ نہیں رہتا ــــ شاید اسی لیے اس کی گلابی چھت مجھے آسمانی نظر آتی تھی ــــ کیوں وہ آسمان سر پر اُٹھائے اُٹھائے پھرتا تھا۔

اب وہ بہت پیارے، بہت خوب صورت ہاتھ مٹی میں مل کر زمین بن گئے تھے اور اسی زمین پر کھڑے کھڑے اس نے اس طرح آسمان کی طرف دیکھا تھا کہ آسمان اس کی آنکھوں میں بھر کر رہ گیا اور گلابی چھت آسمانی ہوگئی۔

اب ساری کتابیں، سارے رسالے انتظار کرکے تھک گئے تھے کہ ان ہاتھوں کا لمس اُنہیں پھر قرینہ عطا کرے گا جو کبھی ان پر دھول جمنے بھی نہیں دیتا تھا ــــ ملائم کپڑوں کے چھو چھو کر اچٹ اچٹ جانے میں کیسی اپنائیت ہوتی تھی۔

گرد اگر یوں جھٹکی جائے جیسے کدورت جھٹکی جا رہی ہو تو جذبہ اپنی ہر صورت کی تشکیل کرتے سمے محبت کا روپ وقتی طور پر دھار ہی لیتا ہے۔ وہ انگلیاں جو اس کی ٹائی کی گرہ درست کرکے اپنا سب کچھ آنکھوں کو سونپ دیتیں اور اس کی واپسی تک اُسے آنکھوں میں بھرے بھرے پھرتیں۔ وہی اُنگلیاں اس کے غائبانے میں اس کی چہیتی کتابوں کو سنوارتیں۔ کھلی کتاب میں ترک رکھتیں، جیسے وہ پڑھتے پڑھتے میز پر اوندھا مار گیا تھا ــــ بکھری ہوئی کتابیں بک شیلف میں اس طرح سجا دیتیں، جیسے اس کے ہاتھوں سے سنوار رہی ہوں۔ اور سجاتے وقت اسی کی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں ــــ کبھی کبھی تو یہ اسی کی آنکھیں اُسی کو دیکھتیں۔

اس کو جب بھی اپنی کسی کتاب کی ضرورت پڑتی۔ وہ، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس نے کہیں رکھ چھوڑی ہے ہاتھ بڑھا کر بک شیلف سے نکال لیتا اور مسکرا کر ان آنکھوں کی طرف دیکھتا جو پہلے ہی اپنی فتح کا اعلان جھکی جھکی نظروں سے کرتی رہتیں۔ پھر یہ دونوں ہاتھ کرسی کی پُشت سے پھولوں کے ہار جیسی باہیں بن کر اس کی گردن میں حمائل ہو جاتے۔ پھر صرف آنکھیں رہ جاتیں، پھر صرف ہونٹ رہ جاتے، پھر صرف لمس رہ جاتا اور لمس کا احساس ــــ اور پھر یہی احساس علم کی انانیت کو انکسار کی اس حد تک لے جاتا، جہاں چاہتوں کی کلیاں چٹکتی ہیں ــــ محبت چمن در چمن نکھرتی ہے اور عشق، ماضی، حال، مستقبل سب کو ایک لمحے میں جکڑ کر گلزار کھلا دیتا ہے۔

میں یہ تو جانتا تھا کہ اس کی پہلی نظر کتاب

۱/۳۷-۱۵-۹، والمیکی نگر، نظام آباد ۵۰۳۰۰۱ (آندھرا پردیش)

اب اُسی صورت نے اُس کے گھر پہنچ کر اُس کو اپنے ہالے میں اس طرح محصور کر لیا کہ وہ جس طرف دیکھتا وہی موہنی دیکھتا، وہی چھب دیکھتا ——

کسی کو ترسانا تھا تو اس طرح ترسا ترسا کر اس کو رکھا کہ اس کی آنکھوں میں سوائے تیرتے ہوئے آنسوؤں کے اپنی شبیہ تک دُھندلا دی اور جب اُس کو آنا تھا تو اس طرح آئی کہ گھر کے سارے دروازے کھُلے کے کھُلے رہ گئے —— اب یہ لڑکی اپنے پروفیسر کی زندگی کا دوسرا نام تھا۔

رِم جھم رِم جھم پھواریں پڑتیں تو دنیا بھر میں اس سے اچھا موسم کوئی نہ ہوتا۔ موسلا دھار بارش، گرجتے بادلوں اور چمکتی بجلیوں کے ہراول دستوں کے ساتھ سب کچھ شرابور کر دیتی اور وہ موٹر کے آئینے چڑھائے یونیورسٹی سے سیدھے گھر جانے کی بجائے لمبی لمبی سڑکیں اُس وقت تک طے کیے جاتا جب تک کہ بارش ختم نہ جاتی —— اور جب یہ موسم اس کی زلفوں، اس کے ہونٹوں، اس کی آنکھوں، اس کے ماتھے اور اس کی مانگ میں سما جاتا تو وہ اپنی اس زندگی کو خوشبو کی طرح چھُوتا ہوا اپنی موٹر گراج میں پارک کر دیتا —— دنیا میں اس موسم سے اچھا کوئی موسم جیسے دونوں ہی نے نہیں دیکھا تھا۔

اور ہر موسم اپنی خصوصیات سے سوا بہت کچھ اور بھی لے آتا جس میں وہ خود بھی سمائے ہوتے۔

زندگی حسین تو ہو سکتی ہے لیکن وہ زندگی کیسی ہوتی ہوگی جس کا نام ہی حُسن ہو گیا ہو —— کچھ بھی ہو۔ ایک بات طے ہے —— ایسی زندگی برسوں بِتا کر بھی لمحوں کا حاصل ہو جاتی ہوگی۔

چنانچہ ورق ورق کو خوشبو عطا کرنے والی مخروطی انگلیاں تو چھُپ چھُپ کر پروفیسر کے دل کی دھڑکن کبھی تیز کرتی تھیں کبھی مدھم۔ لیکن پھُولوں کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں نے آخرش اپنی ایک سہیلی سے پوچھ ہی لیا ——

اور جب ان جھکی جھکی آنکھوں نے نظریں اُٹھا کر اس بھیگی بھیگی کتاب کی نمی اپنی کرنیں پھینک کر خشک کر دیں تو سوچتے سوچتے ساری روشنیاں کتابوں میں سمٹ آئیں۔ سارا حُسن کتابوں میں سمٹ آیا۔ اتنا سمٹا کہ وہ آنکھیں پچھلے سے پہلے اس کے گھر آگئیں اور پھر کتابوں میں بند ہو گئیں —— اور یہ سب کچھ اس طرح دیکھتے دیکھتے ہو گیا کہ اُمڈ اُمڈ کر چھائے ہوئے بادل نہ اس کو شرابور کر سکے نہ لپک لپک کر جھُلسنے والے شعلے اس کو خاکستر۔ بس ایک کوندہ سا لپک کر بجھا اور نیلا آسمان اس کی چھت پر ٹانک گیا۔

حُسن کا غرور علم کے انکسار سے ٹکرا کر اس طرح پاش پاش ہو جائے گا، اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا اور سچ پوچھیے تو یہ سوچنے کی بات بھی نہ تھی۔ —— اللہ میاں کو ایسے روپ میں بھلا کون صاحبِ ایمان دیکھے گا اور کیوں دیکھے گا کہ سارا مہکتا، لہکتا، چمن کا چمن اُٹھا کر ویرانوں میں پھینک دیا۔ ویرانے بھی کیسے ویرانے —— چاروں طرف سناٹے اور وہ بھی ایسے کہ خود سناٹوں کا دم گھُٹ جائے ——

اس کے گھر میں دن کو رات بنا کر چمکنے والے جگنو، گھنگھرو سی بجاتی ہوئی ملبوس کی ایسی سرسراہٹ کہ گھر کے پردے ہوا کے جھونکوں سے صرف ہلیں نہیں، بجنے بھی لگیں۔ پگھلی ہوئی کبھی چاندی بن کر بہتی ہوئی آواز، جو اس کے چھوٹے سے گھر میں دن میں ہزار بار اس کا نام لیتی اور سو سو بہانے، بس اسی کا نام رٹے جاتی۔

اُس کو خشک آنسو رُلا رُلا کر دل کی کورِ بصارتی کو گھی سمیٹنے والی مخروطی انگلیاں اب اُس کے گھنے بالوں میں کنگھی کرنے لگی تھیں —— وہ صورت جو کتابوں اور رسالوں کے اوراق میں چھپ چھپ کر اُس کو اتنا تنگ کرتی کہ وہ زار و نزار ہو کر اپنے سارے وجود کو ایسے آنسو بنتے محسوس کرتا جنہیں نہ بہنا آئے نہ جل بجھنا ——

سے اُچٹ کر جن آنکھوں سے اُلجھ گئی تھی، ان آنکھوں نے پھر کتاب میں اس کا جی لگنے نہ دیا۔

ایسا ہوتا ہے کیا؟ میں نے بھی سُنا تھا، اُس نے بھی سُنا تھا کہ دل ایک نظر کا محتاج ہے۔ چاہو خرید لو چاہے بیچ دو۔ گرہ میں کچھ ہو کہ نہ ہو —— کسی کی حیراں حیراں، ترساں ترساں، جھُکی جھُکی نظریں سب لے جاتی ہیں۔

—— دل کیا، اس کا اثاثہ کیا —— وہ تو ساری زندگی کو اُٹھا کر یہ بھی بھول جائے کہ جھُکی جھُکی آنکھیں اب اُس نے موند لی ہیں۔ اب ان موندی ہوئی آنکھوں کے اندھیروں میں اپنی زندگی کی کرن کرن ڈھونڈتے پھرو۔

لیکن نہ میں نے یہ سُنا تھا نہ اُس نے کہ آنکھیں ساری کتابیں چُرا لیتی ہیں۔ سارا علم چُرا لیتی ہیں ——

وہ کلاسوں میں جانے سے قبل ہی یونیورسٹی کے احاطے میں داخل ہوتے ہی اپنے وجود کو کھوجنے لگتا۔ خود کو اس طرح کھو کھو کر گنوا گنوا کر ڈھونڈنے میں بھی اتنا ہی مزا ہے جتنا تکیے میں منہ چھپا کر آنسو چھُپانے میں —— یہ تو شاید عام آدمی کی باتیں ہیں —— لیکن وہ یونیورسٹی میں تھا۔ علم و دانش کے سمندر میں شاید جذبے، علم کی انانیت کو، علم کے انکسار تک پہنچا دینے کا یارا رکھتے ہیں —— اور وہ جذبہ جس کا رشتہ سیدھا آنسوؤں سے جا ملتا ہے تو ایسے میں علم کہاں رہ جاتا ہے —— ساری کتابیں ورق ورق آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہیں۔

میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اسی طرح بھیگ بھیگ گیا تھا —— کیوں کہ اب تو وہ خود ورق ورق کتاب بن گیا تھا اور اس کتاب کی نمی ساری یونیورسٹی میں، ان آنکھوں کو پکارتی تھی —— مجھے پڑھو۔ مجھے پڑھو —— اس سے پہلے کہ میرا حرف حرف مٹ جائے۔ اس سے پہلے کہ میں ورق ورق بکھر جاؤں ——

آج کل نئی دہلی

"تم بتاؤ ــــــ شاید تم بتا سکتی ہو؟"
"یہ شاعر، ادیب اور پروفیسر قسم کے شوہر کو کس طرح خوش رکھا جا سکتا ہے؟"

سہیلی نہ صرف جہاں دیدہ تھی، اُس نے تو یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ جس ریت کے خطے پہ وہ اپنا گھروندہ لیے بیٹھی ہے، اس خطۂ ریگ پہ زمانے بھر کے بادل اُمڈ اُمڈ کر چھائے ہوئے ہیں۔ ــــ اور جب بارش ہونے لگی تو ہر قطرۂ بارش میں وہی سمایا ہوا تھا جو آج بھی اس کے گھر کی چھت کی طرح تھا۔

اُس نے سوچا، کہہ دے کہ ــــــ
"مٹی بن جاؤ۔ مٹی ہی سے سارا چمن مہکتا ہے"۔
لیکن اس کی سہیلی نے کچھ نہ کہا۔
مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے صرف اتنا پوچھا۔
"تمہیں کتنے بچے ہیں؟"

شام کے کجلانے پر میں جب بھی اُس کے گھر پہنچ کر کال بیل پر نرمی سے اُنگلی رکھ دیتا تو وہ پوچھے بغیر بھی کہ میں کون ہوں، مجھے پہچان لیتا۔ لیکن پوچھتا ضرور۔

کون؟

اور شاید میری آواز سُنے بغیر ہی کہہ دیتا۔
"آئیے دروازہ بند نہیں ہے"۔

میں اس طرح اس کے گھر میں داخل ہوتا۔ جیسے اس کے پُرسکون اضطراب پر پہرے بیٹھا رہا ہوں۔

وہ بھی مجھے دیکھ کر کچھ اس طرح مطمئن ہو جاتا جیسے میرا کفن سرکا کر خود اپنا ہی چہرہ دیکھ رہا ہو۔ میں تو کب سے اس کو جانتا تھا۔ لیکن شاید ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی زندگی سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے اور پھر زندگی کو بھی اتنی فرصت نہیں تھی کہ ہمارا پیچھا کر کے ہمیں جوڑتی۔
لگتا تھا، میں اور وہ ایک ہی پٹری پہ بھاگ رہے تھے اور جب ایک دوسرے کی گرفت ٹوٹ گئی تو میں ذرا سا آگے نکل گیا اور وہ میرے پیچھے پیچھے تھا۔ چڑھائی ختم کر کے شاید ہم کھائی میں اُتر رہے تھے۔ ڈھلان پر اگر میں رُک جاتا تو اس کا پیچھے سے آ کر مجھ سے ٹکرا جانا یقینی تھا۔ اس لیے شاید میں رُکا نہیں اور اُس نے بھی پیچھا کرنا نہیں چھوڑا۔

عمر کا تفاوت علم کے فاصلے نہیں پاٹتا، لیکن تجربے کا عمق پاٹ سکتا ہے۔ اور ہم ایک دوسرے کے سینوں میں چھپی کھائیوں کو کہیں نہ کہیں پاٹ رہے تھے۔

وہ کاغذ کو چُومتے ہوئے قلم کو کاغذ سے جُدا کیے بغیر میز پہ دھری وہسکی کی طرف اشارہ کرتا۔ اور میں گلاس کی تلاش میں اُس کے دو کمرے کے گھر میں کسی ایسی کائنات سے گزرتا رہتا جو میرے قدموں کے نیچے بچھی رہ کر بھی مجھے دکھائی نہ دیتی۔
کیا میں اپنے ہی قدموں کے نیچے نہیں ٹوٹ رہا تھا؟

پنیر کا کُھلا ڈبہ کسی کُھلی کتاب پر دھرا ہے۔ ــــ کسی گلاس میں دو چار گھونٹ وہسکی اس تپائی پر دھری ملتی ہے جو آرام کرسی کے برابر رکھی تھی۔ بستر پہ دھری کتابوں میں کہیں ایک پلیٹ بھی مل جاتی، جس میں نمکین کا جو، آلو کے مہین چپس کو منھ چڑاتے رہتے۔ یہ کیسی افراتفری تھی کہ ہر قرینہ سسکتا ہوا آنکھوں میں کُھب جاتا۔

اب نہ وہ خوش بُو تھی نہ سرگوشیاں تھیں نہ سرسراہٹ تھی ــــ گردمیں اٹی بند کتابوں کی پیشانیوں پر جانے کسی نے کیا لکھ دیا تھا جو پڑھا نہیں جاتا تھا ــــ وہ شبیہ جو پروفیسر کی نس نس میں سرایت کر گئی تھی اب تصویروں کی چوکھٹوں میں کہیں دیوار پر آویزاں تھی۔ کہیں کتابوں کے شیلف پر دھری تھی ــــ کہیں ریفری جریٹر پر ــــ اور یہ چھوٹے بڑے فریم بس اپنی ایک ہی خصوصیت کی وجہ سے کمرے کی دوسری چیزوں سے خود کو ممیز کرتے تھے۔ اور وہ خصوصیت یہ تھی کہ ان پر گرد نہ تھی۔
میں کہیں سے جب گلاس ڈھونڈ نکالتا تو مجھے اس لیے کبھی کبھی ہنسی بھی آ جاتی کہ اس گلاس کو یہیں رکھا ہوا میں نے بارہا دیکھا ہے ــــ پھر وہ مجھے کیوں نظر نہ آیا۔

وہ جیسے چونک کر مجھے پکارتا۔
"کہاں رہ گئے آپ؟"
میں گلاس اُٹھا کر اس کی میز پہ لے آتا۔
وہ جانتا تھا کہ میرے ہاتھ میں رعشہ ہے اور میں پیگ بنانے سے گریز کرتا ہوں۔

میرے خالی گلاس پر شیشے کا منھ رکھ کر وہ اپنی کسی ایسی مسرت کو چھپاتا جس کا رشتہ اس کے نہ بہنے والے آنسوؤں سے رہا ہوگا۔
ٹیپ ریکارڈر کے دھیمے سُر مجھے سمجھاتے کہ اُس نے اپنی میز سے اُٹھ کر بٹن دبایا ہے۔
اُس کو مصروف دیکھ کر میں بھی کوئی رسالہ اٹھا لیتا کہ میرے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی ــــ
"مُنھ اندھیرے ہی نام کسے ڈھونڈنے چل دیے؟"
میں ان ساری کیفیات سے بچ نکلنا چاہتا تھا۔ لیکن کوئی اور آواز زخموں کے بخیے اُدھیڑ کر رکھ دیتی۔

میں پہچان نہ سکتا کہ ٹیپ ریکارڈر بند ہونے کے باوجود اب یہ اس کی آواز ہے یا خود میری اپنی۔
میں نے ٹیپ ریکارڈر کی طرف نظر کی جو ریفری جریٹر کے اوپر پڑے ہوئے بے ترتیبی سے سامان کے ساتھ دھرا تھا ــــ اور ابھی ابھی بند ہوا تھا۔

میں نے اُٹھ کر ساری چیزوں کو بغور دیکھا۔ ــــ کاغذ کے پیکٹ میں انڈے دھرے تھے اور پنیر کا ٹن کُھلا پڑا تھا ــــ مسکے کے پیکٹ میں مسکہ پگھل کر اپنی صورت کھو رہا تھا ــــ مچھلی کے ڈبوں نے پنیر کو تقریباً ڈھانک رکھا تھا۔ انہی چیزوں میں سے دو تین کیسٹس بھی جھانک رہے تھے۔

(بقیہ صفحہ ۴۰ پر)

ابناش سنگھ برگھی

عقل کی دوا

صبح اخبار میں پڑھا کہ اب عقل بڑھانے کے لیے امریکہ میں ایک دوا ایجاد ہوئی ہے۔ اس دوا کے استعمال سے انسان کی عقل بڑھ جاتی ہے۔ ایک شخص کے لیے سو گرام دوا کافی ہے۔ اس کے ساتھ ہی دوا بیچنے والی کمپنی کا دہلی کا پتہ بھی لکھا تھا۔ سو گرام کی شیشی کا دام ایک ہزار روپے تھا۔

یہ پڑھنے کی دیر تھی کہ میری بیوی میرے پیچھے پڑ گئی۔ کہنے لگی آپ کو تو پہلے ہی عقل کی سخت ضرورت تھی۔ شکر ہے مالک کا جس نے میری سنی۔ اور یہ دوا ایجاد ہوئی۔ اب آپ آج ہی جائیے اور یہ دوا خرید کر لائیے۔" عقل کی دشمن کی یہ صلاح مجھے پسند آئی۔ میں نے اس کے مشورے کو بغیر کسی حیل و حجت کے، شاید پہلی بار، خوشی سے مان لیا۔ اب پیسے کا انتظام کرنا تھا۔ سات سو روپے میرے بینک کے حساب میں باقی تھے۔ باقی کے تین سو روپے میری بیوی نے گھر کے خرچے سے بچا کر میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ کہنے لگی "یہ لیجیے۔ اس ماہ کھانا کم کھا لیں گے۔"

بینک کھلا، میں پیسے نکلوا کر، دو بسیں بدل کر، خوش خوش دوا لینے کے لیے پہنچا۔ وہاں بہت بھیڑ تھی۔ خریداروں کی ایک لمبی لائن تھی۔ ہم بھی اس میں کھڑے ہو گئے۔ بہت دھکے کھائے، کئی بار لائن ٹوٹی، بہت سے لوگوں کی جیب صاف ہوئی، لیکن ہم نے بھی ہمت نہیں ہاری۔ بھیڑ کم کرنے کے لیے میں نے بلند آواز میں کہا۔ "لوگ بے کار دھکے کھا رہے ہیں۔ یہ بھیڑ تو آج ہی ہے، کل کو یہ دوا آرام سے ملے گی۔ اوپر سے ڈسکاؤنٹ الگ ملے گا۔"

"بھائی صاحب، اگر آپ میں اتنی عقل ہوتی تو ادھر کیا لینے آئے؟" بھیڑ میں کھڑے ایک شخص نے بلند آواز میں کہا۔ میں لاجواب ہو گیا اور میری چال کامیاب نہ ہوئی۔

آخر بہت دھکم دھکے کے بعد ہم نے سو گرام کی شیشی خرید کر مورچہ فتح کر ہی لیا۔

گھر پہنچ کر میں نے شیشی کھول کر استعمال کی ترکیب پڑھی۔ اپنے کنبے کے سبھی افراد کو کہا کہ وہ سب میرے نزدیک آ جائیں۔ میں اپنی عقل میں اضافہ کر لوں اور پھر تمہیں کچھ نصیحت دوں گا۔

"پاپا عقل کے لیے مجھے آپ کی نصیحت کی نہیں بلکہ دوا کی ضرورت ہے۔ تھوڑی مجھے بھی دے دیجیے نہ۔" میرے بیٹے نے بڑی حلیمی سے کہا۔

"ہاں ہاں۔ ٹھیک تو ہے، ماں صدقے جائے، اس کو دے دو نہ۔" میری بیوی نے کہا۔

میں اس کی طرف دیکھ کر بولنے ہی والا تھا کہ وہ پھر بولی۔ "پہلے بھی تو آپ گزارہ کر ہی رہے تھے، یہ دوا اس کو دے دیجیے۔ بے چارہ پڑھائی کر رہا ہے۔ فکر مت کیجیے۔ آپ کی جتنی بھی عقل ہے، اتنی ہی ٹھیک ہے۔ میں آپ کو چھوڑ کر تو نہیں جا رہی۔ پہلے بھی تو جیسے تیسے گزارہ کر ہی رہی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میرے ہاتھ سے دوا کی شیشی جھپٹ لی۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے کہا "یہ شیشی تو میں اپنے لیے لایا ہوں۔ کسی اور کو دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" یہ کہہ کر میں نے شیشی چھیننے کی کوشش کی، لیکن اس نے اپنا شیشی والا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

"پہلے یہ بتائیے کہ آپ تو پہلے ہی سمجھدار ہیں اور پھر زیادہ عقل کا آپ کیا کریں گے؟" میری بیوی نے کہا۔ "تمام عمر آپ میرے ساتھ چالاکی کرتے رہے ہیں، دھوکا دیتے رہے ہیں۔ اب کون سی کسر رہ گئی ہے کہ اب آپ اپنی عقل کو اور بڑھانا چاہتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر عقل کی کسی کو ضرورت ہے تو وہ مجھے ہے۔"

"دیکھیے اس پر میرے پیسے خرچ ہوئے ہیں۔" میں نے زور دے کر کہا۔

"لیکن بچت تو میری تھی۔ یہ بچت میں نے اپنا پیٹ کاٹ کر کی ہے۔" بیوی بولی۔

۵/۱۴۔ J، راجوری گارڈن، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۷

میں نے غصے میں بھرتے ہوئے کہا : "نہیں، یہ مجھے دے دو۔" میں نے اس کے ہاتھوں سے شیشی چھیننے کی کوشش کی۔ کھینچا تانی میں شیشی نیچے گر کر ٹوٹ گئی۔ جلدی سے ہم نے زمین پر گری دوا کو اپنے ہاتھوں سے چاٹنا شروع کر دیا۔ اس سے کسی کی بھی عقل میں کوئی اضافہ ہوتا نظر نہیں آیا۔ بلکہ ایک ہزار روپے کے اس نقصان کو ایک دوسرے کے سر پر تھوپنے کا جھگڑا اور رگڑا ہو گیا۔ جھگڑے میں ایک دوسرے کو کیا کیا کہا گیا، یہ کس کو کیا بتائیں۔ کہتے ہیں کہ قمیص اوپر اٹھانے سے اپنا ہی بدن ننگا ہوتا ہے۔ اس واقعے سے ہمیں احساس ہوا کہ اس میں شک نہیں کہ ہمیں عقل کی ضرورت ہے۔ میں نے سوچا چاہے کیسے بھی ہو گھر کے ہر فرد کے لیے ایک ایک سو گرام عقل کی دوا کا انتظام کیا ہی جانا چاہیے۔

دوسرے ہی دن میں نے بیوی کی جھوٹی بیماری کا بہانہ بنا کر اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے پانچ ہزار روپے نکلوائے۔ روپے لے کر جب عقل کی دوا خریدنے گیا تو اس دکان کے باہر بورڈ لگا تھا کہ اس دوا کی بکری بند ہے۔ وہاں کچھ لوگ باتیں کر رہے تھے کہ کمپنی والے اس دوا کی بلیک کرتے ہیں۔ پانچ ہزار روپے دو تو ایک ہزار روپے والی شیشی فوراً مل جائے گی۔ دوا کی تو کمی نہیں ہے، لیکن ذخیرہ کرنے والوں نے تمام دوا جمع کر رکھی ہے۔ میں نے دکان دار سے کہا کہ میں اسے بلیک میں خریدنے کو تیار ہوں، لیکن وہ نہیں مانا۔ مجھے ایسا لگا کہ دکان دار کو اس بات کا شک ہے کہ میں اسے بلیک کی قیمت میں خرید بھی سکوں گا؟ مجھ سے یہ بے عزتی برداشت نہ ہو سکی۔ میں نے اس کے خلاف رپورٹ کرنے کی دھمکی دی۔

"جائیے، جس سے مرضی رپورٹ کیجیے ــــ" دکان دار نے کہا۔

یہ بات سن کر پاس ہی کھڑے ایک اور صاحب بولے "سنا ہے سرکار سوچ رہی ہے کہ اگر یہ عقل سماج کے دشمنوں کے ہاتھ لگ گئی تو وہ اس کا غلط استعمال کریں گے اس لیے ایسے طریقے کا پتہ لگایا جا رہا ہے کہ اس دوا سے حاصل کی گئی عقل کا استعمال صرف عوام کے مفاد کے لیے ہو۔ شاید اسے بھی قومی دائرے میں لایا جانا چاہیے۔ اس کی تقسیم کے لیے علاقائی توازن اور کمزور طبقوں کو ترجیح دینے کا دھیان رکھنا بھی ضروری ہے۔"

"چھوڑیے صاحب پالیسی کی ان لمبی چوڑی باتوں کو۔" پاس ہی کھڑے ایک دوسرے شخص نے کہا۔ "اگر آپ کی بات میں کچھ سچائی ہوتی تو یہ تمام معاملہ اب تک ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخباروں میں بھی آ چکا ہوتا اور پارلیمنٹ میں بھی اٹھایا جا چکا ہوتا۔ اصلیت تو آج کے ایک اخبار میں چھپی ہے کہ کوئی دوا ایسی ہے ہی نہیں جس سے عقل میں اضافہ ہو۔ یہ تو لوگوں کو جھوٹے پرچار سے گمراہ کر کے پیسے کھانے کی ایک چال ہے۔ اس لیے سرکار نے ہی اس دوا کی فروخت پر پابندی لگائی ہے ــــ"

یہ سن کر دکان دار نے اپنا منھ دوسری طرف کر لیا۔ میں تمام معاملہ سمجھ گیا۔ گھر میں آکر میں نے گھر والوں کو کہا کہ دوا کی صرف ایک ہی شیشی ملی تھی اور میں اسے پی کر ہی گھر لوٹا ہوں۔

"سچ مچ آپ بہت عقل مند ہیں۔" میری بیوی نے کہا۔ اور آج تک وہ میری عقل پر ناز کرتی ہے۔

بقیہ : موڑ

مسٹر دیوان تو حسب معمول اپنی بلیرڈ ٹیبل پر ہوں گے۔"

" As usual " وہ ہنسی۔

"ہاں مسز شرما کا فون آیا تھا۔ آج آپ لنچ پر گھر نہیں گئے؟"

"نہیں جا سکا ــــ انڈسٹریز ڈیپارٹمنٹ میں کام تھا کچھ۔ بس لیٹ ہو گیا۔

She was quite disturbed

"میں ابھی فون کرتا ہوں۔" وہ دفتر کی طرف چلا گیا۔ فون پر کھنہ صاحب بھی کسی سے لمبی بحث میں الجھے ہوئے تھے ــــ وہ باتھ روم سے فارغ ہو کر آنے کی سوچ میں باہر نکلا تو اس نے بیٹے کی آواز سنی۔ وہ بیرے سے اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

"روی کیا بات ہے؟" اس نے بیٹے کو پکارا۔

"ڈیڈی، آپ یہاں کب آئے۔ میں نے دو بار کلب میں فون کیا۔ معلوم ہوا آپ یہاں نہیں آئے۔ ماما، صبح سے بہت پریشان ہیں۔"

وہ بیٹے کو برآمدے کے دوسرے کنارے کی طرف لے گیا تاکہ بیرے یا کوئی اور ان کی باتیں نہ سن سکے۔

"ابھی چلتے ہیں گھر ــــ"

"ماما باہر کار میں ہیں۔"

"ٹھیک ہے تم انھیں اندر لے آؤ، میں باتھ روم ہو کر ابھی آیا ــــ"

جب وہ باتھ روم سے ہلکا ہو کر لوٹا تو ماں بیٹا اطمینان سے بیٹھے تھے۔ وہ خاوند کو دیکھ کر مسکرائی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔

بیرے کو دیکھ کر اس نے بیٹے سے پوچھا۔

"ول یو ہیو اے ڈرنک ــ ؟"

بیٹے نے جھجکتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا پھر قدرے تامل سے کہا۔

"اے سمال ون ــ"

عورت نے مرد کی طرف دیکھا اور مسکرا دی اور پاؤں پھیلا کر جیسے بے فکر ہو گئی۔

شرون کمار

انتہا

کبھی کبھی من ہر کا من یوں ہی اُداس ہو جاتا ہے۔ کیوں اُداس ہو جاتا ہے من! وہ اپنے آپ سے پوچھتا ہے۔ سبھی کچھ تو ہے اس کے پاس۔ گھر بار، روپیہ پیسہ اعلیٰ نوکری۔ کتنے لوگ ہیں اس ملک میں، جو یہاں تک کبھی پہنچ پائے۔ اس پر بھی اس کے اندر کہیں نہ کہیں کچھ ریری سی ہوتی رہتی ہے۔ اس کے ساتھ کچھ اچنبھا ہونے جا رہا ہے۔ کیا اچنبھا ہو سکتا ہے اس کے ساتھ!

من ہر کے پیچھے اب چھپن برس پڑے ہیں۔ ان چھپن چھپن برسوں میں اس نے کیا کچھ نہیں دیکھا! جدوجہد اور جدوجہد، تحقیر، بے عزتی، تنگی، تنگ دستی کیا کیا کچھ نہیں دیکھا۔ اب کہیں جا کر کچھ ٹکتا ہوا نظر آتا ہے۔ مکان ملا تو بڑی جدوجہد کے بعد۔ منصب عہدہ ملا تو ایک عمر بِتا کر۔ اور عزت؟ وہ تو جیسے آنکھ مچولی کھیلتی رہتی ہے۔ خوب چھکا ہاہے اس نے اسے۔ کبھی کبھی تو دھتا بھی بتا دیتی ہے۔ چلو! آخری سیڑھی تک خود نہیں پہنچ پائے، بچے تو پہنچیں۔ لیکن بچے بھی تو اپنی راہ خود چلنا چاہتے ہیں۔ وہ اب سیانے ہو گئے ہیں۔ انہیں اُنگلی پکڑ کر چلنا اچھا نہیں لگتا۔ ایک دن چھوٹے بچے نے کہہ بھی دیا تھا۔ پاپا جی، ہمیں ہمیشہ پڑھنے کو کہتے رہتے ہیں۔ خود جو لڑھکے تھے ایک بار!

کتنا کڑا وار کیا تھا اس بچے نے اس پر — ایک ہی وار میں والد کو چت کر دیا تھا۔ والد تلملا اٹھا تھا۔ اس کا گلا رُندھ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے اُن دنوں کی یاد تازہ ہو آئی تھی — جب وہ اتنا لمبا راستہ پیدل ہی طے کر کے اپنے دفتر پہنچتا تھا۔ اس کی اتنی بساط نہیں تھی کہ تین پیسے خرچ کر کے بس یا ٹرام سے اس فاصلے کو طے کر سکے۔

اُدھر دفتر جانا۔ اِدھر امتحان کی تیاری کرنا۔ اس کی آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ گال پچک گئے تھے۔ چہرے کی جلد بھی جیسے کھنچ گئی تھی۔ لوگ ہمیشہ اُس کا ذکر 'سکڑو' کہہ کر کیا کرتے تھے۔ کیا کبھی وہ اس پستی سے اوپر اُٹھ سکے گا۔

ایک خستہ خراب مکان میں رہتا تھا وہ، مکان میں اور بھی کئی لوگ تھے۔ اُسے اس مکان میں ایک کوٹھری نما کمرہ ہی مل پایا تھا۔ وہیں کھانا، وہیں سونا، بس اتنی ہی جگہ تھی، جہاں مشکل سے بستر بچھ سکے۔ بستر بھی زمین پر بچھاتا تھا اور اسی سے ذرا ہٹ کر کھانا بناتا تھا۔ کھانا بھی اپنے ہاتھ سے بنانا پڑتا تھا۔ کھٹملوں کو رُوکھے کھانے کی خوشبو شاید اچھی لگتی تھی۔ وہ رات کو بتّی بجھتے ہی قطار اندر قطار دوڑے چلے آتے اور بستر پر چاروں طرف سے چڑھائی کر دیتے تھے۔ من ہر کے جسم میں تب خون ہی کتنا تھا! شاید اسی لیے وہ اسے کم کم ہی کاٹتے تھے۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ من ہر کی ہڈی اُن کے دانت میں گڑ جاتی ہو — کئی کھٹمل تو صبح مرے مسلے ہوئے ملتے تھے۔ صبح اُٹھتے ہی من ہر کا پہلا کام اُنہیں جھاڑو سے باہر نکال کرنا ہوتا تھا۔ وہ اُنہیں نکال باہر تو ضرور کرتا ساتھ ہی اس کے دانت بھی کچکچا اُٹھتے تھے۔

کتنا مجبور تھا من ہر اُن دنوں۔ پڑھ لکھ کر بھی بیکاری کے کگار پر۔ چلو بیٹا باپ سے تو زیادہ پڑھ لکھ گیا۔ بیٹے نے من میں ایک بات ٹھان رکھی تھی — کہ وہ باپ کی طرح بابو گیری نہیں کرے گا۔ باپ نے بہت چاہا تھا کہ بیٹا ٹائپنگ سیکھے، شارٹ ہینڈ سیکھے اور اس کے دفتر ہی میں کہیں لگ جائے! زیادہ پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ انٹر کر لیا ہے۔ کافی ہے۔ ترقی کرتے کرتے انسپکٹری مل ہی جائے گی۔ کیا باپ کو بعد میں انسپکٹری نہیں ملی اس نے تو صرف میٹرک ہی کیا تھا۔ لیکن من ہر، جیسے بن پڑے بی اے کر لینا چاہتا تھا — وہ زمانہ اور تھا۔ یہ زمانہ اور ہے۔ تب میٹرک پاس کی بھی قدر تھی۔ اب بی۔ اے پاس کو بھی کون پوچھتا ہے لیکن بی۔ اے کرنے سے کوئی راہ تو کھلتی ہے۔ چاہو تو مقابلے کے کسی امتحان ہی میں بیٹھ جاؤ۔ پروفیشنل کیریئر کے

ایس بی ڈی - ۹۵ - پریتم پورہ، ناورا اپارٹمنٹس دہلی ۱۱۰۰۳۴
[illegible] نئی دہلی

لیے بھی تو بی۔ اے پاس ہونا ضروری ہے۔

من ہر کسی نہ کسی طرح ایک سیڑھی اپنے والد سے اوپر چڑھ گیا تھا۔ کہیں ٹیوشن پڑھا کر کچھ کماتا تھا۔ پڑھتا بھی تھا۔ والد نے پہلے تو اس کے لیے سب کچھ کیا ـــــ بعد میں جانے کیوں انہیں اس کی ہر بات، ہر حرکت ناگوار گزرنے لگی تھی۔ انہیں اس کا آگے پڑھنا قطعی پسند نہیں تھا۔ حالانکہ وہ خود بڑے خراب حالات سے گزرے تھے۔ ان کے گھر میں تو کوئی پڑھا لکھا تھا ہی نہیں اور غریبی بھی اتنی کہ اس کے بارے میں سوچ کر اُن کا دم گھٹتا تھا۔ من ہر کو کبھی کبھی اپنے والد پر ترس بھی آتا۔ چلو، یہاں سے یہاں تک تو پہنچے۔ اب تو قسمت کی ریکھا اُسے ہی بڑھانی ہے۔ بڑھے گی ریکھا۔ ضرور بڑھے گی۔ اُسے اپنے آپ پر بھروسا تھا۔ اُس کے والد غریب گھر کے تھے تو کیا ہوا۔ بڑے سگھڑ سیانے تھے۔ عقل فہم تیز تھی۔ تبھی تو اُسے بھی تیز عقل ملی۔ عقل اس کی ماں کی بھی تیز رہی ہوگی۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود وہ ہر بارے میں بڑے بھرپور طریقے سے بات چیت کر سکتی تھی۔ بلکہ بات چیت میں تو وہ اس کے والد سے بھی بازی مار لے جاتی تھی۔

من ہر کو کبھی کبھی اپنے آپ میں، اپنی والدہ اور اپنے والد دونوں کی خوبیاں دکھائی دیتیں۔ ماں تیز، والد کے مزاج میں کچھ ٹھہراؤ تھا۔ ماں باپ کو بڑھ چڑھ کر باتیں کہہ لیتی۔ والد اکثر مدافعت میں ناکام رہتے۔ من ہر بھی اپنے سے بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے والوں کا جواب لانے میں ناکام رہتا۔ اس اعتبار سے اُس کی بیوی اس کی ماں سے بازی مار لے گئی تھی۔ وہ تو حاضر جوابی کی پڑیا ہے۔ اِدھر بات سُنی، اُدھر چٹاک سے جواب دے دیا۔ اچھے خاصوں کو غوطہ دے دیتی ہے۔ اسی لیے سب طرف اس کی چلتی ہے۔ اُٹھا پٹک بھی اُسے خوب بھاتے ہیں۔ اس سے لیا اس کو دیا۔ یہ بیچا وہ خریدا۔ اُدھار لینے سے بھی اُسے کوئی عذر نہیں۔ اُدھار کی بدولت ہی تو وہ اتنے بڑے بڑے کام کر پاتی ہے۔ بیٹی کی شادی تو طے کر لی، لیکن پلّے دس کوڑیاں نہ تھیں، لیکن موقع پر جانے کہاں کہاں سے پیسے اپنے آپ آنے لگے ہر رشتہ دار مدد پر آمادہ۔ اُدھر سہیلیاں بھی مدد کو تیار۔ کچھ دھاک ہی ایسی بٹھا رکھی تھی، اُس نے سب پر۔ سب یہی سوچتے کہ بڑی گہری عورت ہے یہ۔ وقت پر ضرورت کسے نہیں پڑتی۔ اُدھر من ہر تھا کہ چپ بلکہ سُن سا ٹیلی فون کے پاس بیٹھا رہتا۔ بہت اداس۔ بیوی ٹھیک اپنے والد پر گئی ہے۔ وہ بھی بہت اُٹھا پٹک کرتے تھے۔ کبھی بزنس تو کبھی نوکری۔ اپنے ساتھ زیادتی ہوتی دیکھی تو سرکار پر مقدمہ دائر کر دیا۔ سرکاری نوکری کیوں چھوڑیں۔ نوکری چاہے چھوٹی ہی ہو۔ ٹھیک پڑھے لکھے ہوتے میرے والد تو جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے۔ ایک بار بیوی نے ایسے ہی جوش میں آکر کہہ دیا تھا۔

اب کیسے کہیں قسمت نہیں ہوتی! اِدھر بیٹی کا رشتہ طے ہوا، اُدھر من ہر کو جھٹ سے ڈھنگ کی نوکری مل گئی، جو اُسے دھیرے دھیرے آگے سرکاتی رہی۔

یہ بات الگ کہ اس وقت کے اڑھائی سو آج کے پانچ ہزار کے برابر ہیں۔ اُس وقت ایک روپے کی سبزی سے تھیلا بھر جاتا تھا۔ گھی چار روپے کیلو تھا۔ دودھ پچاس پیسے لیٹر تھا۔ جیب میں دو چار روپے ہوں تب بھی کام چلتا تھا۔ لیکن اب؟ اب تو اور اور کے لیے للک رہتی ہے۔ چاروں طرف لکھ پتی ہی لکھ پتی ہیں۔ کوئی کروڑ پتی بھی ہو تو کیا عجب۔ اچھی سے اچھی کوٹھیاں ہیں۔ کوٹھیوں میں بڑھیا سے بڑھیا قالین، غالیچے ہیں۔ روشنی کے لیے جھاڑ فانوس کا بھی کوئی حساب نہیں۔ لکڑی کو تراش خراش سے کیا کیا رُوپ نہیں دے گئے۔ سچ مچ آدمی کتنا سیانا ہو گیا ہے۔ کیا وہ اپنی ترقی کی آخری حدوں کو نہیں چھو رہا ہے؟ کیا کبھی دیکھا تھا پہلے کسی نے اتنا پیسہ! جیسے پیسے کا سیلاب آ گیا ہو۔ مرغ شراب فائیو اسٹار ہوٹل، ڈسکو اسٹیپ، قوالی کی رات، غزلوں کی شام، بیوٹی پارلر، اے سی کار، اے سی سیلون۔ اب روپے پیسے سے کیا نہیں ملتا۔ کیا نہیں ہوتا۔ بہت کچھ تو من ہر کے ذخیرۂ الفاظ میں اب تک بھی داخل نہیں ہو پایا۔ بھلا ایک نوکری پیشہ ایک بزنس والے سے کیا مقابلہ کر سکتا ہے۔ جو وہ ایک مہینے میں کماتا ہے، اتنا وہ ایک دن میں کماتے ہیں، لیکن من ہر کے بچوں کا ذخیرۂ الفاظ ایک دم جدید ہے۔ انہیں ان امیروں کے سامنے کسی طرح کی جھینپ نہیں ہوتی۔ امیروں کے بچے بھی من ہر کے گھر میں کبھی کبھی آ ہی جاتے ہیں۔ عام سادہ سا گھر ہے من ہر کا، لیکن سب کچھ ایک سلیقے سے ہے، اس لیے خوب صورت دکھائی دیتا ہے۔ اُدھر اُن بچوں کے شاندار گھر وہاں سب کچھ قیمتی ہونے کے باوجود ایسا خوب صورت دکھائی نہیں دیتا ہے۔ ارے، اب کیسے بتائیں کہ یہ سب پیسہ کیسے آتا ہے۔ ایک بار من ہر کی بیٹی سے اس کی سہیلی نے کہا تھا۔ وہ سہیلی ہمیشہ خود ہی کار چلا کر اُن کے یہاں آتی تھی اور اس کی بیٹی کو ساتھ لے کر کالج جاتی تھی۔ پاپا پہلے اوورسیئر تھے۔ دس پندرہ سال ہی نوکری کی ہوگی۔ اچھے پیسے ہاتھ لگ گئے پھر نوکری چھوڑ کر کارخانہ لگا لیا۔ ساتھ میں اپنے دو تین رشتہ داروں کو بھی لے لیا۔ کاروبار آئے دن بڑھتا ہی گیا۔ رشتہ دار دغا دینے سے باز تھوڑے ہی آتے ہیں۔ ہمارے سگے پھوپھا نے ہی گڑبڑ شروع کر دیا۔ پاپا ان معاملوں میں بہت ہوشیار ہیں۔ اُنہوں نے کہا۔ یہ لو اپنا حصہ اور وہ رہا تمہارا راستہ! ایک کو راستہ دکھایا تو دوسرے کو اپنے آپ کان ہو گئے۔ اب انکم ٹیکس والے ہیں۔ بجلی والے ہیں۔ پولیس والے ہیں۔ لیبر والے ہیں ـــــ پاپا نے سب سے بنا کر رکھی ہے۔ کیا مجال کہ کوئی ذرا کر چوں چرا کرے۔ کان پکڑ کر سیدھا باہر۔ ایک بار یونین والوں نے شور مچایا تو اچھی دھنائی کروا دی پاپا نے ان کی۔ ارے پیسے سے ہم کیا نہیں خرید سکتے۔

من ہر کی بیٹی کی سہیلی ایک دم آئینے کی طرح صاف ہے۔ اس بار کہیں کوئی داغ نظر نہیں آتا۔ جو دل میں آتا ہے صاف کہہ دیتی ہے۔ باپ کے کام کو تو اتنا بڑھیا سمجھتی ہے کہ بس۔ اکلوتی اولاد ہے بہت

ہو۔ بزنس میں ایسے ہی کمائی ہوتی ہے‘ ایک بار اس اور کبھی الٹا، پوری جان کھپانی پڑتی ہے۔ بزنس والے گھروں میں مرد جان کھپاتے ہیں۔ عورتیں عیش کرتی ہیں۔

عیش ہی تو کرتی تھی وہ لڑکی۔ خود تو رقا ہی تھی، من ہر کی بیٹی کو بھی کرواتی تھی۔ آج اس فائیو اسٹار میں تو کل اُس فائیو اسٹار میں۔ گھر میں بھی ایسے ایسے لوازمات آتے کہ پوچھو نہیں۔ ماں بیچاری وہی سیدھی سادی عورت۔ کہنے کو مہنگی سے [مہنگی] ساڑی پہنتی۔ لیکن کہیں نہ کہیں ظاہر ہو ہی جاتا کہ اناڑی ہے۔ کوئی کام نہ سوجھتا تو گھر میں صفائی ہی شروع کر دیتی۔ اس وقت وہ صرف پیٹی کوٹ ہی پہنے ہوتی۔ بیٹی کہتی: ماں پتاجی کے اسٹیٹس کا تو خیال کرو۔ تو وہ بڑی سادگی سے جواب دیتی۔ بیٹا اپنا پہلا وقت کبھی نہیں بھولنا چاہیے اور اسی لیے وہ گھر کی نوکرانیوں کو کبھی کبھی اپنے برابر بٹھا کر کھلاتی۔ وہ اکثر اپنی بیٹی سے کہتی، ’جب ہماری شادی ہوئی تھی تو تیرے پتاجی کو کھانے کے بھی لالے پڑے ہوئے تھے۔ سچ بابا اتنے غریب تھے!‘ بیٹی کبھی کبھی تو تعجب کرتی۔ پاپا نے خود بھی اُسے ایک بار بتایا تھا۔ ’بیٹی‘ ایشور تو ہے۔ یہ تو میں مانتا ہوں۔ لیکن ایشور کیسا انصاف کرتا ہے۔ یہ میں آج تک بھی نہیں سمجھ پایا۔ جب تک ہم ایمانداری سے چلتے رہے تب تک پیسے پیسے کو ترستے رہے۔ اور جب سوچا ایشور جو کرواتا ہے وہی کرتے ہیں۔ بھلا بھی اور بُرا بھی۔ تب سے نقشہ ہی کچھ اور ہو گیا۔ پاکستان بنا۔ تب میری عمر بھی کوئی سولہ سترہ سال کی تھی۔ میں سب سمجھتا تھا۔ دنگوں میں پتاجی کو وہیں ہماری آنکھوں کے سامنے زندہ جلا ڈالا گیا۔ بچا میں، میری ماں اور ایک چھوٹی بہن۔ پتا نہیں کیسے بچ گئے۔ جسم میں بڑی جان تھی اس وقت میرے۔ پتاجی کا جلتا ہوا جسم آج بھی میری آنکھوں کے سامنے پھڑپھڑاتا ہے۔ وہ میرے مرتے وقت تک پھڑپھڑاتا رہے گا۔ اس وقت ہم سب کی آنکھوں کے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ اپنی جان کتنی پیاری ہے ہم سب کو۔ بعد میں ماں ہر وقت روتی رہی۔ بالکل خالی ہاتھ آئے تھے ہم ادھر۔ تن پر جو کپڑے تھے بس وہی تھے۔ بالکل میلے کچیلے۔ اِدھر لاکر ہمیں فیروزپور کیمپ میں پٹک دیا گیا۔ کیمپ میں آئے ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ باڑھ آ گئی۔ چاروں طرف پانی ہی پانی! دیکھا ایشور کا انصاف۔ پھر ماں کو ہیضہ ہو گیا اور وہ دو چار دن میں پار ہو گئی۔ سوچ سکتی ہو کیسا وقت ہو گا وہ ہمارا؟ پتاجی کہتے جا رہے تھے اور بیٹی کی آنکھیں بھیگ برس رہی تھیں۔ فیروزپور سے ہم کسی طرح دلی پہنچے۔ تمہاری بُوا مجھ سے چار سال چھوٹی تھی۔ لوٹ کھسوٹ تو ان دنوں چل ہی رہی تھی۔ اب کہاں جائیں ہم! ہر کوئی اجنبی تھا۔ بالکل اجنبی۔ کسی پر آسانی سے وشواس بھی تو نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب ایشور کی کرنی ہی کہو۔ ہمیں پاکستان سے آیا ہوا جان پہچان کا ایک شخص مل گیا۔ وہ بھی لُٹ لُٹا کر یہاں پہنچا تھا۔ بالکل اکیلی جان۔ بال بچے گھر گرہستی سب کچھ ختم ہو چکے تھے۔ جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ اس نے ہمیں اپنا لیا۔ ہمیں بھی محسوس ہوا کہ ہمیں اپنا کوئی سرپرست مل گیا ہے۔ اپنے لیے اس نے کوئی چھوٹا سا کام ڈھونڈ لیا اور میرے لیے بھی ڈھونڈ دیا۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے پڑھنا شروع کر دیا۔ اور کرتے کرتے اوورسیئر بن گیا۔ اوورسیئری کا دھندا کوئی بُرا نہیں۔ کوئی بزنس نہ بھی کریں۔ تب بھی چلتا ہے۔ سب ٹھیکے دار تمہارے آگے پیچھے رہیں گے۔ تم نہ بھی لو تب بھی پہنچائیں گے۔ اب آتے پیسے کو کون منع کرے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تم آمدنی سے زیادہ دکھاوا کرو گے تو جھٹ سے گرفت میں آ جاؤ گے۔ اس لیے تم نے دیکھا ہو گا کہ انسپکٹر یا اوورسیئر بڑے غریب سے بن کر رہتے ہیں۔ روپیہ پیسہ رشتہ داروں کے نام کرتے یا اِدھر اُدھر پھیلانے لگتے ہیں۔ دیکھا نہیں پچھلی بار جب ہم امرتسر گئے تھے۔ کیا ٹھاٹ دار کوٹھیاں تھیں، ان اوورسیئروں کی۔ کیا پوسٹ اور کیا کوٹھیاں! لیکن پکڑے کون! سبھی ایک جیسے ہیں۔ بس کچھ نہیں اس دنیا کا حساب کتاب! جو نہیں لیتے‘ وہ تنگی سے پریشان ہیں‘ ضمیر کی آواز انہیں کے لیے ہے‘ جو ایسے مانتے ہیں۔ الجھن تو دونوں کے لیے ہے۔ اس لیے تنگی میں گھٹ گھٹ کر مریں کیوں!“

من ہر کو یہ سب باتیں اچھی طرح یاد تھیں۔ بلکہ ایک طرح سے یہ اس کے دل پر کھُدی ہوئی تھیں۔ اُس کی بیٹی ہی نے اُسے بتایا تھا یہ سب کچھ۔ بیٹی کی سہیلی کا نام روپالی تھا۔ بیٹی کی شادی ہوئی تو بعد میں روپالی کی شادی بھی ہو گئی۔ جس گھر میں روپالی بیاہ کر گئی‘ اُن کے ٹھاٹ باٹ اور بھی نرالے تھے۔ کہتے تھے، سب جگہ سونا ہی سونا مڑھا نظر آتا تھا۔ ہیرے جواہرات کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ پہلے کے راجا بھی اُن کا کیا جواب لائیں گے۔ اب پرانے زمانے کے راجاؤں کا زمانہ لد گیا۔ اب نئے راجاؤں کی بات کرو۔ اب تو پرانے راجاؤں کو اپنی ٹھاٹ برقرار رکھنے کے لیے نئے راجاؤں کے ہتھکنڈے اپنانے پڑیں گے۔ پہلے راجا غریب پہ جور و ظلم کرتے تھے۔ ان کی بستیاں جلوا ڈالتے تھے، اُن کی بہو بیٹیوں کو سرِ عام گھسیٹ لیتے تھے۔ آج کے راجاؤں کو یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ امپورٹ ایکسپورٹ کا سہارا لیتے ہیں۔ بس چلتا ہے تو کچھ اسمگلنگ سے بھی بچا لیتے ہیں۔ پھر بلیک کی دنیا ان کی اپنی ہے۔ اس میں چاہے جیسے بھی غوطے لگاتے رہیں۔ کسی حسینہ پر طبیعت آ گئی ہو تو اس کے سامنے دانہ ڈالو۔ وہ اپنے آپ بندھی چلی آئے گی۔

من ہر سمجھتا سب کچھ ہے لیکن کر کچھ نہیں پایا۔ بس اپنی اُسی بندھی بندھائی تنخواہ کے سہارے چلتا رہا ہے۔ لاکھوں نہ سہی، ہزاروں تو آتے ہی ہیں۔ وہ ملک کے کروڑوں لوگوں سے بہتر حالت میں ہے۔ ایک بار من ہر کے دل میں کیا آئی کہ وہ روپالی کے باپ سے ملنے چلا گیا۔ اُن کی بڑی فیکٹری من ہر کے گھر سے زیادہ دُور نہیں تھی۔ من ہر نے ادھر دفتر سے قرض لے کر ایک پرانی فئیٹ خرید لی تھی۔ اسکوٹر تو اس کے پاس پہلے سے تھا ہی۔ وہ روپالی کے باپ سے ملنے اپنی کار

ہی میں گیا۔ اُسے اس نے پہلے سے فون کر دیا تھا۔ من ہر کا خیال تھا کہ شاید وہ اُسے گیٹ کے پاس ہی مل جائے گا۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو گیٹ کیپر نے روکا اور سیکیورٹی میں پاس بنوا لینے کو کہا۔ سیکیورٹی والوں نے اس سے کئی سوال پوچھے —— کہ کہاں سے آئے ہو؟ کیوں ملنا چاہتے ہو۔ من ہر کو یہ سب اچھا نہیں لگا کیا روپالی کے پتا نے انہیں آگاہ نہیں کیا تھا۔ گیٹ کے قریب دو مرسڈیز کاریں کھڑی تھیں۔ من ہر کو اپنی اوقات کا جیسے وہیں احساس ہو گیا۔ پاس لے کر آگے بڑھا تو اب اُسے استقبالیہ پر روک دیا گیا اور اُسے دو چار منٹ انتظار کرنے کے لیے کہا گیا۔ من ہر کو یہ بھی ناگوار گزرا۔ ناحق یہاں آئے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ بہتری اب اسی میں ہے کہ یہیں سے لوٹ چلیں۔ لیکن اتنے میں استقبالیہ میں بیٹھی لڑکی نے کہا کہ وہ اندر جا سکتا ہے۔ اور بائیں طرف کے دروازے کی طرف اشارہ کر دیا۔ دروازہ کھول کر وہ کمرے میں داخل ہوا تو اُسے وہ کمرہ بڑا سجا ہوا معلوم پڑا۔ کمرے میں اسی کی عمر کا ایک شخص بڑی سی ٹیبل کے پیچھے گدّے دار کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ظاہر ہے روپالی کا پتا وہی تھا۔ لیکن وہ روپالی سے ایک دم مختلف تھا۔ جہاں روپالی کے چہرے پر معصومیت تھی۔ اس کے چہرے پر تھوڑا سا روکھاپن تھا۔

خیر، من ہر کو دیکھتے ہی وہ ایک دم اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور بڑے تپاک سے آگے بڑھ کر اُس نے اس سے ہاتھ ملایا اور پھر اُسے پاس ہی رکھے ہوئے صوفے پر بٹھاتے ہوئے خود بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا تو من ہر کو کافی اچھا لگ رہا تھا۔ پھر من ہر اُسے ایک ٹک دیکھتا رہا۔ اُس وقت اس کے دل میں طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔ کیا یہ وہی آدمی ہے جس کی زندگی کی شروعات ایسی دوزخی تھی؟ خود من ہر کی اپنی زندگی کی شروعات بھی تو کم دوزخی نہیں تھی۔ پھر جیسے وہ اور من ہر کچھ عرصہ تک متوازی پٹریوں پر چلتے رہے اور آخر اپنی اپنی راہ پر لگ گئے، لیکن روپالی کے باپ نے اگر نوکری نہ چھوڑی ہوتی تو کیا وہ اس سے آگے نکل پایا ہوتا؟ شاید نہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ اس وقت ایگزیکٹو انجینئر کے عہدے پر ہوتا جب کہ صاحب پچھلے دو برسوں سے چیف ایڈمنسٹریٹر کے عہدے پر ہے۔ خیر، باتوں کا سلسلہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا کہ ایک باوردی لڑکا کافی کے دو پیالے اور کھانے کا کچھ سامان اُن کے سامنے رکھ گیا۔ من ہر نے غور سے دیکھا۔ ہر شے عمدہ تھی۔ اور سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ کیا صوفہ اور کیا غالیچے۔ کیا پردے اور کیا کراکری۔ اور کیا دروازے پر پچی کاری۔ فیکٹری بھی ایئرکنڈیشنڈ۔ پھر اس نے غور کیا کہ کمرے میں کلوز سرکٹ ٹی وی سیٹ ہے۔ جس کے اسکرین پر فیکٹری اور دفتر میں ہونے والے کام کی تصویریں برابر آتی رہتی ہیں —— نہ جانے من ہر کو کیوں تھوڑی دیر بعد ہی وہاں کچھ اٹ پٹا سا لگنے لگا۔ وہ کسی خاص مقصد سے تو یہاں آیا نہیں تھا۔ لیکن وہ بات کو آگے بھی نہیں بڑھا پا رہا تھا اور چونکہ روپالی کے پتا کو بھی اس سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ اس لیے اس کی زبان بھی زیادہ نہیں کھل پا رہی تھی شاید من ہر کے دل میں احساسِ کمتری پیدا ہو چلا تھا۔ شاید اس کے دل نے کہا ہو —— کاش میں نے بھی یہی راہ پکڑ لی ہوتی —

خیر، وہ وہاں سے چلنے کو ہوا تو روپالی کے پتا نے اُسے روکا بھی نہیں۔ اور اپنے کمرے کے دروازے پر اس سے ہاتھ ملا کر اُسے رخصت دے دی۔

من ہر گھر پر لوٹ آیا تھا۔ چھٹی کا دن تھا اس لیے وہاں چلا گیا تھا۔ اس کی بیٹی کئی بار کہتی رہی تھی کہ وہ ایک بار روپالی کے ڈیڈی سے ضرور مل لیں۔ کیوں؟ کیوں بھلا؟ تب اس کی بیٹی کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اور نہ ہی روپالی کی ہوئی تھی۔ تب تو وہ اس سے ملا نہیں۔ پھر آج کیوں چلا گیا اس سے ملنے۔ شاید من ہر کے من میں رہا کہ اس سے کوئی کام ہی سدھ جائے۔ نوکری سے ریٹائر ہونے میں اب دو ڈھائی سال ہی تو بچے ہیں۔ لیکن وہ ایسی کوئی بات وہاں چھیڑ ہی نہیں پایا تھا بلکہ دونوں طرف سے کچھ چپی سی ہی بنی رہی تھی۔

گھر پہنچ کر من ہر اداس تھا۔ کیا ایک اعتبار سے یہ اس کی تحقیر نہیں ہے؟ لیکن ایسی تحقیر تو وہ زندگی میں بارہا برداشت کر چکا تھا۔ ہر موڑ پر۔ ہر قدم پر۔ کیا ہوا آج اگر وہ اس عہدے پر ہے۔ اس سے اوپر اور بھی تو ہیں۔ اگر وہ آبرو اتارنے پر تل جائیں تو اُنہیں کون روک سکتا ہے۔ ایک روز اعلیٰ افسر نے کہہ بھی تو دیا تھا —— تم ٹھیک سے کیس بھی پُٹ اپ نہیں کر سکتے۔ کہنے کو چیف ایڈمنسٹریٹر بنے ہو۔ اب اس کا چہرہ پچک کر ایک دم چھوٹا ہو گیا تھا۔ اور ایک بار تو ایک ٹریفک کانسٹیبل نے اُسے کافی جھنجھٹ میں ڈال دیا تھا۔ اور اس کے یہ کہنے پر میں ایک سرکاری دفتر میں اونچے عہدے پر ہوں۔ اس نے تڑاک سے پھٹکار دی تھی —— اونچے عہدے پر ہوں گے آپ اپنے دفتر میں۔ یہاں تو ہمارا قانون چلے گا! واقعی وہ اس وقت پس و پیش میں پڑ گیا تھا۔ کیا وہ اس کے ڈی۔ ایس۔ پی سے بات کرے؟ لیکن ڈی ایس پی نے بھی ایسا ہی سلوک کیا تو۔ بے شک قانون جو ہے سو ہے ہی۔ اصلی قانون داں تو یہ چھوٹے اہلکار ہی ہیں، جو ہر قانون کو اپنی طرح سر انجام دیتے ہیں۔ کیا اس کے اپنے دفتر میں اس کے ماتحت کارکن کسی کام میں اڑنگا لگانے پر اتر آئیں تو کیا وہ اپنے من کی کروائے بغیر رہتے ہیں۔ تب کیسا لاچار ہوتا ہے وہ اس وقت۔ اُسے یاد ہے ایک بار کچہری میں اُسے ایک چپراسی نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کہا تھا —— ارے کاغذ پر کچھ وزن تو رکھو۔ اُڑا جا رہا ہے۔ چپراسی کو اس کاغذ پر مجسٹریٹ کی صرف مُہر ہی لگانی تھی اور مجسٹریٹ وہاں سامنے بیٹھا تھا!

من ہر کو یہ تحقیر اور بھی کئی طرح سہنا پڑی اور تو اور اپنے کو 'بھگوان کے بندے' کہنے والوں کے یہاں اُسے تحقیر کی ایک دوسری شکل ملی۔ اُن دنوں وہ 'بھگوان کے بندوں کی سبھا' میں اکثر شامل ہوتا تھا۔ سبھا کے منتظم ایک بزرگ شخص تھے۔ بچاسی کو چھو رہے ہوں گے۔ لیکن کاٹھی کافی مضبوط تھی۔ چہرے سے جلال بھی خوب ٹپکتا تھا۔ اپنے کو ہمیشہ وہ بھگوان کا ادنیٰ سیوک کہتے۔ سبھا میں جو کوئی بھی آتا۔ اُن کے پاؤں پر اپنا ماتھا ٹیکتا

اور وہ دھیرے سے اُسے اپنے آشیرواد سے سرشار کر دیتے۔ من ہر ان دنوں ایک طرح سے دہریہ تھا اس نے جب لوگوں کو ان کے پاؤں پر ماتھا رکھتے ہوئے دیکھا تو وہ شش و پنج میں پڑ گیا۔ وہ تو کھڑے کھڑے ہی تعظیم کرنے کا عادی تھا اور اس نے اسی طرح اُن کی تعظیم بھی کی۔ پھر ایک دن جانے کس رَو میں آکر اُس نے بھی اُن کے پاؤں چھو لیے اور ان پر اپنا ماتھا رکھ دیا۔ کچھ سکون تو ضرور ملا اُسے لیکن ایسا بھی نہیں کہ کسی ماورائی احساس سے گزر رہا ہو۔ پھر وہ دھیرے دھیرے اُن کے پاؤں چھونے اور ان پر ماتھا رکھنے کا عادی ہو گیا۔ اس کا جی اس سبھا میں خوب لگتا تھا۔ رام رحیم، کرشن کریم میں وہاں کوئی فرق نہیں تھا۔ زرتشت اور عیسیٰ بھی وہاں اتنے ہی لائقِ پرستش تھے، وہاں ہندو بھی آتے اور دوسرے لوگ بھی۔ مرد بھی آتے اور عورتیں بھی۔ غیر ملکی بھی خاصی تعداد میں وہاں ہوتے تھے۔ وہ سبھی خوشحال تھے۔ غیر ملکیوں میں بھی زیادہ تر خوشحال ہی تھے۔ وہ اپنی کاروں میں آتے اور بڑھیا سے بڑھیا نذرانے دے جاتے۔ من ہر کو خوشحالی کہاں نصیب تھی۔ نہ اکثر سوچ سمجھ کر اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا۔ اس لیے ہر بار وہ نذر نذرانے لے جانے میں ناکام رہتا تھا۔ اس سے اس کے دل میں کمتری کا احساس پیدا ہوتا۔ وہ اندر ہی اندر گُھٹتا رہتا۔ دن تہواروں پر تو نذر نذرانوں کا سلسلہ اور بھی خاصا ہوتا اور لوگ بڑی سے بڑی بھینٹ لے کر وہاں پہنچتے۔ ایسے ہی ایک موقع پر من ہر بھی وہاں پہنچا تو تھا، لیکن تھا بالکل خالی ہاتھ۔ اُدھر ایک غیر ملکی بھگت الیکٹرانک ٹائپ رائٹر لے آیا تھا۔ بھیڑ اُس دن کافی تھی۔ اس لیے عقیدت مند قطار میں ایک ایک کر کے آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ اپنی بھینٹ وہاں پاس میں رکھ دیتے اور پاؤں چھو کر آشیرواد پاتے۔ من ہر کی باری آئی تو وہ آگے تو بڑھا، اُس نے پاؤں بھی چھوئے لیکن آشیرواد کے لیے وہ انتظار ہی کرتا رہ گیا! یہ کیا!

کیا بھگوان کے بندوں میں بھی بھید بھاؤ چلتا ہے؟ کیا یہاں بھی پیسے ہی کا بول بالا ہے؟

من ہر اس دن بڑا بے چین رہا۔ گھر میں پیسے کی کمی نے اُسے پہلے ہی پریشان کر رکھا تھا۔ ایک خرچا پورا کیا نہیں کہ دوسرا تیار ہے۔ اور پھر پیسے کی قیمت بھی کیا ہے؟ پہلے تو اُسے بیٹی کی شادی پر اُٹھائے قرض کو ہی چکانا ہے۔ مانا کہ تنخواہ معقول ہے۔ لیکن معقول تنخواہ کیا ہر مرض کا علاج ہے۔ اس سے تو کسی طرح مہینہ ہی پار ہو پاتا ہے۔ قرض اُتارنے کے لیے تو کچھ اوپر سے بھی آنا چاہیے۔ لیکن اوپر سے آئے کہاں سے؟ کیوں نہیں نوکری ہی ایسی کی اُس نے؟ یا کسی طرح کا ہتھکنڈا ہی اپنایا ہوتا۔ کیوں پیسے کی تہذیب سے ایک طرح سے بیگانہ ہی رہا۔ کیوں نہیں، اس نے کچھ لوگوں کی طرح پیسہ ہی سوچا اور پیسہ ہی جیا۔ کیا ایسے لوگوں کے لیے سب کچھ بے معنی ہو جاتا ہے؟ جیسے کہ روپالی کے باپ کے لیے۔ اگر کوشش کی ہوتی اُس نے تو کیا وہ بھی پیسے والا نہیں بن سکتا تھا۔ تب شاید اُسے یہ ذلّت بھی بار بار نہ جھیلنی پڑتی۔ تب شاید اُسے بھگوان کے بندوں کی سبھا میں، مقام بھی خاص نمائندے کا ملتا۔ اور منتظم ہر خاص موقع پر ایک خاص کرسی اس کے لیے لگواتے یا اُسے بھی اپنے پہلو میں اسٹیج پر ہی جگہ دیتے۔

اس سبھا میں من ہر کی جان پہچان ایک ایسی خاتون سے ہوئی، جو ہر اعتبار سے اُسے مکمل معلوم ہوئی۔ صحت مند، خوب صورت، اونچی، لانبی، نکھری ہوئی ——— جلال اس کی ہر ہر ادا سے ظاہر ہوتا تھا۔ من ہر کو لگا جیسے کہ وہ زندگی کے اسرار کو جان گئی ہے۔ وہ وہاں بڑے پُرسکون انداز سے آتی اور بڑے ہی پُرسکون انداز سے چلی جاتی۔ وعظ کے دَوران اس کی آنکھیں بند ہی رہتیں اور جب کھلتیں تو اپنے ہی ایک خاص انداز کی چمک لیے ہوتیں۔ من ہر کی پتنی اُن دنوں نہ جانے کیوں اُسے بات بات پر پھٹکارتی رہتی تھی۔ پھٹکار کا سلسلہ رات سوتے وقت تک جاری رہتا تھا۔ اس سے من ہر کے اعصاب ہمیشہ ڈھیلے ہی رہتے اور کوشش کے باوجود اُن میں تناؤ نہ آپاتا۔ یا کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ بے چینی کا بوجھ وہ تمام دن اپنے ساتھ لیے لیے گھومتا اور رات کو بھی وہ اُسے من سے اُتار نہ پاتا۔ اس سے وہ اپنے آپ کو بے جان سا محسوس کرتا۔ دو چار بار تو اُسے ایسا بھی لگا جیسے اس نے اپنا مردانہ پن کھو دیا ہو جو اب کبھی لوٹے گا نہیں۔ کبھی کبھی اس کے سامنے ایک سوال بھی اُٹھتا ——— کیا وہ بھی اپنی بیوی کو ویسے ہی اذیت دے جیسی کہ وہ اُسے دیتی ہے۔ یا دوسرا طریقہ اس نیتی ایک دم کٹھور ہو جاتا ہے۔ کیوں نہیں؟ کیا جسمانی بھوک کی کوئی اہمیت نہیں۔ کیا جسمانی تعلق کے بغیر عورت برسوں مہینوں کو کاٹ سکتی ہے۔ سبھا کے منتظم تو ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ عورت اور مرد کو صرف اولاد پیدا کرنے کے لیے ہی جسمانی تعلق رکھنا چاہیے۔ اور جب اولاد پیدا کرنے کی خواہش جاگے بھی تو پہلے گُرو سے اجازت لینی چاہیے تاکہ جو اولاد پیدا ہو وہ اپنے میں ایشور کی سبھی خوبیاں لیے ہوئے ہو۔ جناب منتظم ایسی اولاد کو ’گاڈ گائیڈڈ‘ کہتے تھے۔

ایشور! گاڈ! کون ہو تم بھائی؟ ذرا اپنا روپ تو دکھا دو۔ من ہر کے ایک دوست نے کہا تھا کہ وہ تو ذرّے ذرّے میں بستا ہے۔ اس نے تب ایک اشلوک بھی دہرایا تھا۔ جس کا یہ مطلب تھا۔ کہ جیسے آئینے کو مہین سے مہین پیس دینے پر بھی اس میں آئینے کی خوبی موجود رہتی ہے۔ اسی طرح ایشور بھی مہین سے مہین ذرّے میں اپنا وجود بنائے رکھتا ہے۔ ایک اور کا کہنا تھا کہ ایشور تو صرف احساس ہے۔ اُسے مانیں تو سب کچھ نہ مانیں تو کچھ بھی نہیں ہے اس کے اس احساس کا موازنہ گھنٹے کی کھنک سے کیا تھا جس کی گونج دھیرے دھیرے دور ہوتے ہوتے گہری بھی ہوتی جاتی ہے! لیکن سب سے پہلے ایشور کے احساس کو پایا کس نے؟ آدمی کی لاچاری نے؟ اس کی بے بسی کی حالت نے۔ اپنی قسمت کے سامنے

کتنا لاچار ہے یہ آدمی! خوب ہاتھ پیر پٹک لینے پر بھی وہ روتا ہی رہتا ہے اور کئی بار بغیر انگلی ہلائے سب کچھ اپنے موافق ہوتا رہتا ہے۔ اس خاتون سے من ہر کو کئی موضوعات پر بات چیت کرنے کا موقع ملا تھا۔ حالانکہ وہ خود اعتمادی پر بہت زور دیتی ہے لیکن اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ آدمی کا پہلا فرض اپنے آس پاس اپنے رابطے میں آنے والوں میں خوشیاں بانٹنا ہے۔ اگر آپ کوئی خوشی ان کو دے سکتے ہیں تو لوگ جنگل میں بھی آپ کے پیچھے چلے آئیں گے۔ اور اگر آپ نفرت کا زہر پھیلاتے ہیں تو محلوں میں رہنے پر بھی لوگ آپ سے دور بھاگیں گے۔ ایک دوسرے سلسلے میں اس نے یہ بھی کہا تھا کہ کسی بھی کام کو شروع کرتے وقت آپ کے اندر دو طرح کی آوازیں اُٹھتی ہیں ——— ایک مدھم رہتی ہے اور دوسری واضح اور نمایاں۔ لیکن مدھم آواز ہی صحیح آواز ہوتی ہے۔ جسے لوگ عام طور پر سن نہیں پاتے۔ اور نمایاں آواز کے پیچھے پیچھے چل پڑتے ہیں۔

من ہر کو ان دونوں باتوں میں جیسے کہ زندگی کی حقیقت نظر آئی تھی۔ کاش کہ وہ اپنے چاروں طرف خوشی بکھیر پاتا۔ اُسے محسوس ہوا تھا کہ وہ اب تک ایک بے یقینی کی زندگی بسر کرتا آیا ہے۔ کسی سے ملتے وقت اس کے دل میں جانے کیوں کئی طرح کے خیالات اُبھرتے تھے۔ کبھی وہ کسی کی کاٹنا چاہتا اور کبھی کسی کو نیچا دکھانے کے فراق میں ہوتا۔ اور کئی بار ایسا بھی ہوا کہ جب کبھی کسی نچلی سطح کا شخص اس سے ملنے آیا، اس نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ تو ضرور کیا، لیکن دل کے اندر اُسے کچھ ڈھستا ہوا بھی محسوس ہوا۔ اور تو اور ایک بار حالات ایسے ہوئے کہ اس کی پھوپھی زاد بہن ایک بار اپنے بچوں سمیت آپہنچی تھی تو کچھ عجیب طرح کے جذبات اس کے چہرے پر آتے جاتے رہے تھے جب کہ اس کے برعکس اُس کی بیوی بالکل خاموش رہی تھی۔ بلکہ اس نے صورتِ حال کو سمجھا تھا۔ اور اس عورت کو ہر طرح سے ڈھارس بندھائی تھی۔ تب بیوی ہی سے اُسے معلوم ہوا تھا کہ شوہر کے چلے جانے کے بعد یہ عورت اپنے آپ کو ہر طرح سے لاچار پا رہی ہے اور بچوں کے رشتوں کے لیے ماری ماری شہر در شہر بھٹک رہی ہے۔ تب ایک دن من ہر نے بھی غور کیا تھا کہ اس کی حالت واقعی گمبھیر ہے اور وہ بیٹھے بیٹھے ہلتی تو رہتی ہے۔ اپنے سے باتیں بھی کرتی رہتی ہے۔ خیر اس وقت من ہر بھی کافی جذباتی ہو گیا تھا۔ لیکن بعد میں دوسرے معاملوں کو لے کر اُس نے بیوی کو ٹوکا تھا۔

اُن سب باتوں کو یاد کر کے جانے من ہر کو کیسا کیسا لگنے لگا تھا۔ کیوں نہیں وہ بھی پرسکون رہ پایا۔ اپنی بیوی کی طرح؟ کیوں وہ بات بات پر اُسے ٹوکتا رہا۔ پھوپھی زاد بہن سے بیوی کا رشتہ۔ بالآخر خاوند کے باعث ہی تو ہے۔ تب کیسے بیوی نے اسے تحمل سے قبول کر لیا جب کہ وہ اس سے ایک طرح کی دوری ہی بناتے رہا۔ کیوں؟ کیوں کہ ان کا خاندان گردش میں پھنس گیا ہے؟ کیا نہیں تھا اُن کے گھر میں بھی ایک وقت۔ فریج، ریڈیو، موٹر سائیکل! لیکن جب گردش کا چکا گھوما تو سب ایکایک غائب ہو گیا۔ من ہر کو یاد ہے۔ جب ان کا فریج بک رہا تھا۔ تو کسی طرح اس پھوپھی زاد بہن کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک رہے تھے۔ بچے بھی بالکل چھوٹے تھے۔ گھر کے لوگوں ہی نے انہیں گھر سے بے دخل کر دیا تھا۔ خود شوہر اپنی خرافات سے باز نہیں آتے تھے۔ اچھی خاصی نوکری تھی۔ وہاں جانے کیا گول مال ہوا کہ نوکری سے ہاتھ دھونے پڑ گئے۔ گھر والوں سے تو پہلے سے اُلجھن تھی ہی اس لیے وہاں بھی بے دخلی تک کی نوبت آ پہنچی ..... کیسے ہوتا ہے یہ سب؟ من ہر حیران تھا، کہیں تو آدمی اُٹھتا ہے تو اُٹھتا ہی جاتا ہے اور کہیں گرتا ہے تو اُسے تھاہ نہیں ملتی۔ خرافات کہنے والے تو ویسے اور بھی انیک ہیں۔ اُدھر ہر طرح کے گھپلے کریں گے اور اِدھر دیوی دیوتاؤں کی منت مان لیں گے۔ کیا یہ دیوی دیوتا اتنی آسانی سے جھانسے میں آجاتے ہیں۔ کیا وہ ان کی کارستانی دیکھ نہیں پاتے؟ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم اپنی قسمت کی ڈوری خود ہی بُنتے ہیں۔ اپنی سوچ سے، اپنے اعمال سے، اپنی خواہشوں سے۔ تب پھوپھی زاد بہن کے شوہر نے اپنی قسمت کی ڈوری کیا خود ہی تیار نہیں کی اور تو اور تنگ دستی میں اس کی نیت کو بھی شک کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا اور ہوتے ہوتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگ اس کی شکل سے بھی بیزار ہونے لگے۔ پھر سننے میں آیا کہ وہ ہر ملنے والی عورت پر ڈورے ڈالنے کی فکر میں رہتا ہے۔ اور اپنی ہوس کی رو میں اُس نے اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کو بھی نہیں بخشا۔ پھر سننے میں یہ بھی آیا کہ اس نے یہ شہر چھوڑ دیا ہے اور راجستھان کے کسی دوسرے شہر میں بس گیا ہے۔ پھر سننے میں آیا کہ اب اس کا کام ٹھیک چل نکلا ہے۔ اور اس کے بیٹے بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگے ہیں۔ پھر سننے میں آیا کہ وہ کافی خوشحال ہے اور اچھی خاصی جائداد کا مالک بن گیا ہے اور پھر سننے میں آیا کہ وہ تو اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہے لیکن اس کے بیٹے گھر کی اچھی دیکھ بھال کر رہے ہیں جیسے کہ سب کچھ سلسلہ وار چل رہا ہو۔ دراصل یہ سلسلہ ہی تو ہے جو من ہر کو پریشان کیے رہتا ہے۔ کہیں آپ نے ذرا بھی کچھ ناحق جھٹکنے کی کوشش کی تو آپ کو اس کا ڈنڈ فوراً مل جاتا ہے۔ اور کہیں لوگ سب کچھ ہڑپ کیے جاتے ہیں اور انہیں کبھی چبھن تک نہیں ہوتی۔

ہاں ایک وقت وہ بھی تھا، جب ایشور کو من ہر نے بالائے طاق رکھ دیا تھا اور دیوی دیوتاؤں کی طرف تو وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا جب اس کی بیوی مندر جاتی تو وہ باہر کھڑا کھڑا ہی اس کا انتظار کرتا رہتا۔ شنی، منگل کو منانا بھی اُسے ایک بے کار سی حرکت محسوس ہوتی۔ کتنی رسموں میں بندھی ہے یہ میری بیوی۔ وہ اکثر سوچتا، لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اُسے ہر طرف ایشور کا چمتکار ہی نظر آنے لگا۔ آدمی کے اعضا کی تشکیل، اُن کا ایک دوسرے میں سما جانا،

من، اس کی اُڑان، آنکھ جھپکتے ہی کہاں سے
کہاں پہنچ جانا، من کا بہک جانا، نفرت، پیار،
رونا، ہنسنا، دُکھ درد، خوشی، کچھ پا لینے کی للک،
آگے بڑھتے رہنے کی خواہش، دنیا کا نظام! کوئی
تو ہے جو اُن سب کو چلاتا ہے۔ کوئی تو ہے جس کی
انگلی میں ضابطے قاعدے کی یہ ڈور بندھی ہے۔
نہیں تو سب ایک دوسرے سے ٹکرا نہ جائیں! اور
جب ٹکراتے ہیں تو کیسی تباہی آتی ہے۔ تباہی کے
ویسے اور بھی تو کئی روپ ہیں۔ زلزلہ، باڑھ، بجلی۔

انہیں دنوں من ہر بھگوان کے بندوں
کی سبھا کے ایک رُکن کے رابطے میں آیا تھا اور اُسی نے
اس کو سبھا کی راہ بتائی تھی۔ جہاں وہ ایشور کے وجود کا
برابر قائل ہوتا رہا۔ حالانکہ سبھا کے منتظم سے اُسے ایک
طرح کا دھکا ہی ملا اور وہ اُن سے دھیرے دھیرے
بے تعلق ہوتا گیا۔ لیکن وہ خاتون؟ اُس نے بھی وہاں
آنا ایکا ایک بند کر دیا تھا اور پھر پتہ چلا کہ وہ بدیس
چلی گئی ہے۔

من ہر کو کچھ باتیں سوچ کر اب بھی اپنے
آپ پر ہنسی آتی ہے کیسے وہ دھیرے دھیرے
خود بھی رسموں کی ڈور میں بندھتا چلا گیا۔ منگل اور
شنی کے دن جیسے کہ اس کے ذہن پر نقش ہو گئے تھے۔
ہر منگل کو وہ پرشاد کا دونا لیے مندر پہنچتا اور
اُسے ہنومان جی کی نذر چڑھانے کے لیے پجاری کے
حوالے کر دیتا۔ اسی طرح ہر شنی وار کو جیسے وہ "شنی
کو منا دے ....." کی آواز سنتا، ویسے ہی کشکول
میں چونی یا اٹھنی ڈالنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ ایک
بار ایک جیوتشی نے کام کو سدھ کرنے کے لیے ایک
ٹوٹکا بھی بتایا تھا اور اُس نے اُسے پورا بھی کیا تھا۔
ٹوٹکا کیا تھا بس پرانے جوتے کو پرانے کپڑے میں
لپیٹ کر ایک چوراہے پر اس طرح پھینکنا تھا
کہ کوئی اُسے دیکھ نہ رہا ہو اور نہ ہی وہ خود مُڑ کر
اُسے دیکھے۔ اُس نے پرانے کپڑے میں لپٹے پرانے
جوتوں کی پوٹلی چوراہے پر پھینک تو دی تھی، لیکن
اُسے برابر یہی ڈر لگ رہا تھا کہ اگر کسی نے اُسے
دیکھ لیا تو کیا ہوگا۔ نہیں! کسی نے اُسے نہیں دیکھا
تھا۔ اور تعجب کہ اس کا رُکا ہوا کام پورا بھی ہو گیا
تھا۔ کیسے پورا ہوا وہ کام؟ کیا محض یہ ایک
اتفاق تھا؟ کیا ہمارے ستارے ہمیں اس
طرح سے متاثر کرتے ہیں؟ کیا جیوتش ایک مکمل علم
ہے؟ اس جیوتشی نے اُسے اور بھی کئی باتیں بتائی
تھیں۔ جیسے ناک کی سانس —— جیسے سانس
کو اپنے موافق بنانا اور سادھنا کرنا! یعنی کسی کو
بھی اپنے کام سے اپنے بس میں کر لینا۔ کیا آدمی کے
اندر ایسی طاقت ہے؟ کیا فروغ پاتی ہے یہ طاقت؟
کیسے آدمی دھیرے دھیرے اُونچا اُٹھتا جاتا ہے۔
کیسے آدمی ایک کے بعد ایک منزل طے کرتا جاتا ہے؟
تب وہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

من ہر کو لگا جیسے نظر انداز نہ کیے جا سکنے کا یہ
یہ جذبہ اس کے اپنے ہی اندر چھپا ہوا ہے، جو وقتاً
فوقتاً اس پر حاوی ہوتا رہتا ہے۔ تب کیوں نہیں
اُس نے اُسے باہر نکال پھینکا؟ تب کیوں نہیں
اُس نے اپنے آپ کو مضبوط بنایا؟ تب کیوں نہیں
اُس نے پیار کی جگمگاہٹ چاہی۔ وہ عورت ٹھیک
ہی تو کہتی تھی —— اپنے کو ایک نقطے پر لے آؤ
جہاں سے کوئی تمہیں گرا نہ سکے۔

وہ بار بار کہتی Seek Perfection
The rest will follow

من ہر کی آنکھوں کے سامنے اس خاتون کا چہرہ
اب بھی بار بار چمک اُٹھتا۔ کہاں وہ کھائی!
وہ جیسے اُسے بلانے لگتی ہے۔

اور اُس عورت نے یہ بھی تو کہا تھا کہ "ایک
مرکزی نقطے پر لایا ہوا من ایک ایسا چراغ ہے جو
ہماری آتما کے ہر گوشے کو اُجاگر کرتا ہے۔ تب
کرو نا اپنی آتما کے ہر گوشے کو اُجاگر، من ہر!

آگلا قدم



نام کتاب : مکان (ناول)
مصنّف : پیغام آفاقی　　قیمت: ..[illegible] روپے
ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامع مسجد، دہلی ۶

ناول مکان مجھے کئی وجوہ سے پسند آیا۔ یہ عام ناولوں سے مختلف ہے۔ مصنّف نے جو موضوع لیا ہے وہ آجکل کے آشوب کا مظہر ہے مگر اس کو برتنے میں مصنّف نے بلندی اور گہرائی دونوں کو چھو لیا ہے۔ اس ناول میں جو نفسیاتی اور فلسفیانہ گہرائی ہے، وہ اس ناول کو عام ناولوں سے ممتاز کرتی ہے۔ کہانی تو سیدھی سادی ہے، مگر اس کے ارتقا میں نیرا، کمار، نیئر اشوک، الوک، انکل، سونیا کے یہاں جو اُتار چڑھاؤ آئے، وہی اس ناول کی جان ہیں۔

کہیں کہیں کرداروں کی سوچوں میں تکرار محسوس ہوتی ہے۔ شاید یہ عمل ناگزیر ہو۔ موجودہ زندگی کی پیچیدگی، تضادات، اخلاقی قدروں کا زوال، بڑھتی ہوئی کرپشن اور اس کے اثر سے تمام اعلیٰ قدروں کا زوال۔ یہ باتیں بہت کھُل کر سامنے آجاتی ہیں۔ بڑی چیز، ان سب کے باوجود مصنّف کا زندگی کے ثبات اور انسان کی روح پر اعتماد ہے۔ جو پورے ناول کو ایک مجاہدہ (Crusade) بنا دیتا ہے۔ جس میں مکان کو محفوظ رکھنے کی جدّوجہد انسانیت کی بقا کی ایک سعی بن جاتی ہے۔

کچھ کرداروں یعنی الوک کا بہہ جانا اور اشوک کے یہاں آخری تبدیلی ـــ ان کے لیے قاری کو پہلے سے تیار نہیں کیا گیا۔ کم سے کم میرا تاثر یہی ہے۔ یہ تبدیلی اچانک ہوتی ہے۔

اُمید کہ اس مصنف کا یہ ادبی سفر جاری رہے گا۔ اور وہ اردو کو کئی اچھے ناول اور افسانے دے سکیں گے۔ "مکان" اب بھی اردو میں ایک منفرد ناول کہا جاسکتا ہے اور اس کے فکر و فن دونوں کی خصوصیات یقیناً ادبی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کریں گی۔

آل احمد سرور

نام کتاب : کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں
مصنف : مالک رام
ناشر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی
قیمت : ۵۱ روپے

جشن ولادت ابوالکلام آزاد کے موقع پر شائع شدہ یہ کتاب، مولانا آزاد سے متعلق گیارہ مضامین پر مشتمل ہے۔ یہ کام بروقت اور مفید ہے کہ اس وقت جشن ولادت کے سلسلے میں مولانا سے متعلق جو مختلف کام کیے جارہے ہیں اس کتاب سے ان تحقیقی تنقیدی کاموں کو نئی روشنی ملے گی، اور اس طرح اور زیادہ بہتر کام سامنے آسکیں گے۔ اس کتاب میں حسب ذیل مضامین شائع کیے گئے ہیں:

مولانا آزاد کی تاریخ ولادت
مولانا ابوالکلام آزاد (پہلے بیس برس)
مولانا آزاد بحیثیت صحافی
مولانا آزاد کی خطابت
مولانا آزاد کے احسانات اردو ادب پر
تحریکِ آزادی کی مذہبی بنیاد (افکارِ آزاد کی روشنی میں)
غالب اور ابوالکلام آزاد
غبارِ خاطر
تذکرہ
کچھ کرنے کے کام
ابوالنصر غلام یٰسین آہ۔

مولانا آزاد سے متعلق تقریباً یہ سارے مضامین اہم ہیں اور ان کے افکار و خیالات کی نئی جہتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ان کی زندگی اور خدمات کے نئے پہلوؤں کو روشنی میں لاتے ہیں۔

ان مضامین میں ایک اہم مضمون "کچھ کرنے کے کام" ہے جس میں مولانا آزاد سے متعلق چند اہم کام کرنے کی طرف متوجہ کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ "الہلال" کے سلسلے میں مالک رام صاحب نے تحریر کیا ہے:

"..... الہلال کی دعوت کا عمیق اور وسیع مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ دیکھا جائے کہ اس نے ہر سفے کیا پیغام لوگوں تک پہنچایا اور وہ کس طرح کے اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے کوشاں رہے ....."

الہلال ہی کے سلسلے میں انہوں نے اس طرف بھی توجہ دلائی ہے :

"الہلال کی دعوت کا دوسرا محاذ سیاسی تھا۔"
"افسوس اس موضوع پر بھی جتنا اور جس انداز سے لکھنے کی ضرورت تھی نہیں لکھا گیا۔ اس مسئلے کا گہرائی سے مطالعہ کرکے ہمیں الہلال کے اثرات کو متعین اور مرتب کرنا چاہیے۔"

آگے ترجمان القرآن کے متعلق مالک رام صاحب نے بہت درست فرمایا ہے:

"سوال یہ ہے کہ بیسیوں ترجمے اور تفسیر کی کتابیں موجود ہوتے ہوئے ترجمان القرآن کو یہ اہمیت کیوں دی گئی؟ اس پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے محققوں اور مصنفوں کو ترجمان القرآن پر اس پہلو سے غور کرنا چاہیے کہ اس کی زبان، ترجمے کی صحت، استدلال کی جدت اور بیان کی شگفتگی نے اسے ایک تخلیقی کارنامے کا درجہ دیدیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس پر اس نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی جائے کہ یہ کس حد تک مسلمانوں کے سوادِ اعظم کی ضروریات کو فقہ اور مذہب کی موشگافیوں میں جائے بغیر پورا کرسکتا ہے؟ میرے خیال میں ترجمان القرآن پر اس پہلو سے ابھی تک کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا۔"

آگے آزاد بحیثیت ادیب کے تحت تحریر کرتے ہیں:

"ستم یہ ہے کہ انہوں نے اردو ادب کو، خاص کر نثر کو کیا کچھ دیا، ان کا اردو نثر پر کوئی اثر پڑا یا نہیں، اس کا کوئی وقیع جائزہ آج تک نہیں لیا گیا۔ اس کی قدر و قیمت کا تعین نہیں ہوا۔ گزشتہ نصف صدی میں اردو ادب کی متعدد تاریخیں لکھی گئیں، لیکن ان میں سے بیشتر میں ان کا نام تک نہیں ملتا۔ آخر کیوں؟

اور آخر میں مولانا آزاد کے نظریہ تعلیم کے سلسلے میں مالک رام صاحب نے اس طرح توجہ دلائی ہے:

"... انہوں نے اپنی تقاریر میں اور فائلوں پر جن خیالات کا اظہار فرمایا اپنی مجبوریوں کے باعث انہیں بھی جمع نہ کرسکا۔ یہ کرنے کا کام ہے اور ضرورت ہے کہ کوئی صاحبِ علم، ماہرِ تعلیم ان تمام تحریروں کو جمع کرنے کے لیے تیار ہوجائے۔ کام دقت طلب ضرور ہے، لیکن ناممکن نہیں۔ اس سے ہمیں ان کے نظریۂ تعلیم اور طریقۂ کار کے بارے میں روشنی ملے گی اور ممکن ہے کہ ہماری کچھ تعلیمی مشکلات کے حل کرنے میں بھی وہ معاون ثابت ہوں۔"

مولانا آزاد سے متعلق آئندہ کام کرنے کے لیے یہ تمام گوشے جن کی طرف مالک رام صاحب نے اشارے کیے ہیں، یقیناً قابلِ توجہ ہیں، بے شک ان پہلوؤں کو روشنی میں لانے کی سخت ضرورت ہے تاکہ مولانا آزاد کی شخصیت اور زیادہ واضح طور سے سامنے آجائے۔

اس مجموعے کا آخری مضمون مولانا آزاد کے بڑے بھائی "ابوالنصر غلام یسین آہ" سے متعلق ہے۔ یہ مضمون اس لیے اہم ہے کہ مالک رام صاحب نے پہلی بار ان کے متعلق اس قدر تفصیل سے معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔

ابتدا میں مالک رام صاحب نے "پیش گفتار" میں اپنے اور مولانا آزاد صاحب کے تعلقات پر مفید روشنی ڈالی ہے جس کے مطالعہ سے دونوں حضرات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور "ابوالکلامیات" کے بہت سے گوشے سامنے آتے ہیں۔

بلاشبہ یہ کتاب اس جشنِ صد سالہ ولادت ابوالکلام آزاد کے موقع پر ایک مفید اور قیمتی اضافہ ہے۔

عبدالقوی دسنوی

نام کتاب: تاج محل
مصنف: راحت عزمی
قیمت: ۵۰ روپے
ناشر: راحت عزمی - ۲۸۷-۶-۱۷-ا- بیرون نبیر پورہ، کوچہ سلان حیدرآباد ۵۰۰۰۲۳

یہ ایک تحقیقی و تاریخی مقالہ ہے جسے راحت عزمی نے بڑی محنت اور برسوں کی کاوش کے بعد لکھا ہے۔

"تاج محل" ساری دنیا کے لیے ایک مرکزِ کشش اور مرکزِ توجہ رہا ہے۔ اس کی دل کشی نے صرف شاعروں اور مصوروں، افسانہ نگاروں اور فن کاروں کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ اس کا سحر آگیں حسن ہر دیکھنے والے کو متاثر کرتا ہے، لیکن ان دیکھنے والوں میں ہزاروں میں ایک بھی ایسا نہیں ہوتا جو اس کی تاریخ اور اس سے متعلق دوسرے حقائق سے واقف ہو۔ سیاحوں کے لیے جو کتابچے ایسی جگہوں پر فروخت ہوتے ہیں، وہ عام معلومات پر مبنی ہوتے ہیں اور ان میں چند سطحی باتوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

راحت عزمی نے ایک سنجیدہ محقق کا فرض ادا کرتے ہوئے تاج محل سے متعلق تمام حقائق کو یک جا کردیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے قدیم اخبارات و کاغذات سے بھی استفادہ کیا ہے اور معاصر تاریخی کتابوں سے بھی۔ اس کتاب کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا اندازِ تحریر بہت شگفتہ، سلیس اور دل کش ہے۔ کتاب اتنی دل چسپ ہے کہ ایک بار شروع کردینے کے بعد ختم کیے بغیر رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ راحت عزمی اس تحقیقی کاوش کے لیے یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں۔

نام کتاب: گورکھرو کے پھول
شاعر: ظفر گورکھپوری
قیمت: تیس روپے
ملنے کا پتہ: رچنا پبلی کیشنز F4/6، نیو میونسپل کالونی دیونار، بمبئی ۴۰۰۰۴۳

ظفر گورکھپوری اردو کے ممتاز اور مقبول شاعر ہیں۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام "تیشہ" ۱۹۶۲ء میں اور دوسرا مجموعۂ کلام "وادیٔ سنگ" ۱۹۷۵ء میں شائع ہوچکا ہے۔ "گورکھرو کے پھول" ان کا تیسرا

مجموعہ ہے جو غزلوں پر مشتمل ہے۔

ظفر کی غزلیں واقعی گوکھرو کے پھول کی طرح خوب صورت، نرم و نازک اور دل کش ہیں۔ اور جس طرح وہ پھول اپنی نرمی و دل کشی سے دوسروں کو متوجہ کر لیتے ہیں۔ اسی طرح ظفر کے اشعار پڑھنے والے کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ظفر نے زندگی کو جیسا دیکھا اور جیسا پایا اسی طرح اُسے پیش کر دیا ہے۔ وہ خیالی دنیا نہیں آباد کرتے اور نہ ایسے در و بام تعمیر کرتے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ ان کے لیے زندگی کے نشیب و فراز، اس کی رنگینیاں و رعنائیاں اور اس میں سے نمودار ہونے والے لمحہ بہ لمحہ نئے نئے رنگ اتنے پرکشش ہیں کہ ان کا بیان ہی ان کے لیے سب کچھ ہے۔ اسی لیے ان کی غزلوں میں آج کی زندگی کا کرب اور آج کی زندگی کے محسوسات کی ایک دنیا آباد نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنے مجموعۂ کلام کی ابتدا اس شعر سے کی ہے:

روشنی سر میں لیے پھرتے ہو دیوانے ہو
کسی دیوار کسی در کے حوالے کر دو

یوں تو "گوکھرو کے پھول" میں کئی مقدمے اور پیش لفظ ہیں، لیکن میں ان کے کلام کا اصل مقدمہ اسی کو سمجھتا ہوں جو ہماری آج کی زندگی اور تجربے کا شعر ہے۔ اسی طرح ان کے چند اور شعر ملاحظہ ہوں۔

مسائل اتنے تھے دنیا کے اپنے ساتھ ظفر
کہ خود سے ملنے کا موقع کبھی ملا ہی نہیں

بہت طویل ہے، سوچو تو مختصر بھی بہت
رگِ گلاب سے تلوار تک سفر میرا

گھر میں پہنچوں گا تو سب گھڑی ٹوٹ لیں گے ظفر
آنکھ میں چبھتی ہوئی گردِ سفر دیکھے گا کون

تیز بارش کی دعا میں نے ظفر مانگی تھی
یہ بھی لازم ہے کہ اب گرتی ہوئی چھت دیکھوں

ظفر زندگی کی راہوں سے صرف ایک تماشائی کی طرح نہیں گزرے بلکہ وہ خود تماشا بھی رہے ہیں اور تماشائی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار کو آسانی سے فراموش کر دینا ممکن نہیں ہے۔

نام کتاب: نفسیاتی تنقید
مصنف: ڈاکٹر سلیم اختر
قیمت: ۶۰ روپے
ناشر: مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور

ڈاکٹر سلیم اختر پاکستان کے اہم نقاد ہیں ان کے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ "نگاہ اور نقطے" اور تنقید پر ایک کتاب "دبستانِ تنقید" کے علاوہ نفسیات اور ادب پر بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ڈاکٹر سلیم اختر کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے۔ انہیں نفسیات سے ابتدا ہی سے دل چسپی رہی ہے۔ ادب اور لاشعور، تین بڑے نفسیات داں اور اقبال کا نفسیاتی مطالعہ ان کے نفسیاتی نقطۂ نظر کو بہت واضح انداز میں پیش کرتے ہیں۔

نفسیاتی تنقید کچھ عرصہ پہلے تک ایک اہم دبستان اور تنقید کے ایک توانا رجحان کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن گزشتہ دس سال میں تنقیدی فکر میں اس قدر تیزی سے تبدیلیاں آئیں کہ آج نفسیاتی دبستانِ تنقید کے پیرو خال خال نظر آتے ہیں۔ اردو تنقید میں بھی یہ رجحان بہت تیزی سے آیا اور ایک زمانے میں بہت سے لوگوں نے نفسیات کو بنیاد بنا کر ادب اور ادیب کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی، جن میں میرا جی، ریاض احمد، شبیہ الحسن، حسن عسکری، سلیم احمد، شکیل الرحمٰن، سلیم اختر اور چند دوسرے حضرات نے بہت اہمیت حاصل کی اور نفسیاتی تنقید نے اردو میں بھی ایک دبستانِ تنقید کی حیثیت حاصل کر لی۔ لیکن گزشتہ دہائی میں جو تبدیلیاں آئیں اس میں تحلیلِ نفسی اور نفسیاتی تنقید کا زور کم ہوتا گیا۔ لیکن ادب اور نفسیات کا جو تعلق ہے اس کے تحت نفسیاتی نقطۂ نظر کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بعض چیزوں کو سمجھنے میں یقیناً مدد ملتی ہے۔

نفسیاتی تنقید، نفسیاتی نقطۂ نظر اور اردو میں نفسیاتی تنقید کو سمجھنے کے لیے بہت اہم کتاب ہے۔ انہوں نے بڑی جامعیت کے ساتھ نفسیاتی نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے اور تذکروں سے لے کر آج تک کی تنقید میں اس کے اثرات کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

کتاب کے ابتدائی چار ابواب میں فرائڈ، یونگ اور ایڈلر کے نفسیاتی نقطۂ نظر کی وضاحت کی گئی ہے اور ان کے اثرات کو اردو ناقدوں کے یہاں تلاش کیا گیا ہے۔ اس کے پہلے باب کی حیثیت پیش بندی کی ہے جس میں آبِ حیات سے بجنوری اور وحیدالدین سلیم تک نفسیاتی اثرات یا رجحانات کو تلاش کیا گیا ہے۔ دوسرا باب فرائڈ اور ان سے متاثر اردو ناقدین پر مشتمل ہے۔ تیسرا باب یونگ اور ان سے متاثر ناقدین اور چوتھا باب ایڈلر اور ان سے متاثر اردو ناقدین پر مشتمل ہے۔ اس مقالے میں سات ابواب ہیں۔ اس کے آخری تین باب بے حد اہم ہیں۔ جن میں پانچویں باب میں ڈاکٹر سلیم اختر نے نفسیاتی تنقید کے اہم مباحث اور اردو اصنافِ سخن کا نفسیاتی مطالعہ کیا ہے اور خاص طور پر تشبیہ، استعارے، علامت، امیج وغیرہ کی نفسیاتی اہمیت سے بحث کی ہے۔ چھٹے باب میں نفسیاتی تنقید کے طریقۂ کار سے بحث کرتے ہوئے خطوط، ڈائری، سوانح عمری اور خود نوشت کے نفسیاتی عوامل کا تجزیہ کیا ہے۔ اور ساتویں باب میں نفسیاتی تنقید کی عملی مثالیں پیش کی ہیں۔ یہ مباحث اردو تنقید میں یقیناً ایک اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اردو ناقدوں کو بھارتی اور پاکستانی ناقدوں میں تقسیم کیا ہے۔ ادب میں اس طرح کی تقسیم مستحسن نہیں ہے۔

نام کتاب: دوپہر
شاعر: خورشید افسر بسوانی
قیمت: ۲۰ روپے
تقسیم کار: نصرت پبلشرز امین آباد، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

خورشید افسر بسوانی اردو کے مشہور شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنے مجموعۂ کلام "دوپہر" کے دیباچے میں اپنے نظریاتِ شعر پر گفتگو کرتے وقت لکھا ہے کہ "میں جدیدیت، تجریدیت اور ترقی پسندی یا قدامت پرستی کے جھمیلوں میں نہیں پڑا..... لیکن یہ اشعار مجھے اس لیے اچھے لگتے ہیں کہ ان میں میری زندگی کے مدّوجزر کی جھلکیاں ہیں"۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ وہ ایک اچھے شاعر ہیں اور جو کچھ جس طرح محسوس کرتے ہیں اسی طرح پیش کر دیتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ زندگی کے مدّوجزر انسان کے جذباتی زندگی اور محسوسات کو متاثر کرتے ہیں اور اس کے کلام میں ان نشیب و فراز کی تصویریں یا جھلکیاں نظر آتی ہیں اور ان سے کسی فن کار کا بچنا ممکن نہیں ہے۔

"دوپہر" کی شاعری میں وہ تمازت اور تیزی بھی ہے جو ہر چیز کو روشن اور نمایاں کر دیتی ہے۔ اور وہ سایہ بھی ہے جو گرمی کی شدّت سے سکون پہنچاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں خورشید افسر بسوانی کی شاعری میں زندگی کی گرمی بھی ہے۔ اور محبت کی نرمی اور خنکی بھی۔ مثلاً ان کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

نہ تو چہرہ نہ تخاطب نہ کسی تے سے لگاؤ
شہر میں آج بھی تہذیب ہے بنجاروں کی

بے لہو حرف ابھرتے ہی نہیں کاغذ پر
سرِ شبیر تو اب ترکِ قلم ہے ہم کو

کون جلتے ہوئے ماحول کی تاریخ لکھے
بکنے والوں ہی کے ہاتھوں میں قلم آتے ہیں

کوئی اعزاز نہ منصب نہ وظیفہ نہ خطاب
ہمیں درباروں کے آداب ابھی کم آتے ہیں

ساتھیوں سمجھے نہ پائے مشغلِ دار و رسن
میرے ہی سر کی ضرورت ہے تو سر دیتا ہوں میں

ان اشعار سے خورشید افسر بسوانی کا نظریۂ شعر بھی ہمارے سامنے آجاتا ہے اور زندگی کے مدّوجزر کی وہ جھلکیاں بھی، جن کا انہوں نے اپنے پیش لفظ میں ذکر کیا ہے۔ ان کے مجموعے "دوپہر" کی غزلیں اپنی تازگی اور شگفتگی کی وجہ سے ہر پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہیں۔

آجکل نئی دہلی

نام کتاب: ادبی مقالات
مصنّف: کاظم علی خاں
قیمت: ساٹھ روپے
ملنے کا پتہ: ۲۰۱۔ وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

کاظم علی خاں اردو کے ان محققوں میں ہیں جنہوں نے اپنی محنت اور تحقیقی بصیرت سے اردو تحقیق میں اپنے لیے ایک نمایاں جگہ بنالی ہے۔ کاظم علی خاں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تحقیق کے جدید اور سائنسی اصولوں پر گہری نظر رکھتے ہیں اور اپنے مضامین میں ان اصولوں پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ وہ بغیر سند کے کوئی بات کہنا درست نہیں سمجھتے اور جب تک وہ اپنے ماخذات کو اچھی طرح نہیں دیکھ لیتے اور ان کی صحت پر پورا اطمینان نہیں کر لیتے، وہ ان پر بھروسہ نہیں کرتے۔ اسی لیے ان کا شمار اردو کے معتبر محققوں میں ہوتا ہے۔

انہوں نے بہت سے مضامین لکھے ہیں۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "ادبی مقالات" اردو تحقیق کے مطالعے میں ایک اہم اضافہ ہے۔ "ادبی مقالات" میں ان کے تیرہ تحقیقی مضامین اور تین اشاریے شامل ہیں........... جس میں میر اور لکھنؤ، آتش کے بعض غیر معروف شاگرد، تلامذۂ صبا لکھنوی، کلامِ امیر اللہ تسلیم 'قدیم ماخذ میں' میر مہدی حسین مجروح ایک تعارف، غالب کے بعض غیر معروف شاگرد، غالب اور مرزا رجب علی بیگ سرور اور مطالعۂ مراثیٔ دبیر ان کے اہم تحقیقی مقالات ہیں۔ ان مقالات میں بعض بہت اہم باتیں پہلی بار سامنے آئی ہیں۔ خاص طور پر آتش کے غیر معروف شاگردوں کے بارے میں تلامذۂ صبا اور غالب کے غیر معروف شاگردوں کے بارے میں یا میر مہدی مجروح کے سلسلے میں۔ یہ ایسے موضوعات ہیں کہ اردو میں ان پر سیر حاصل کام نہیں ہوا ہے۔ کاظم علی خاں نے پہلی بار غالب کے تقریباً ڈیڑھ سو ایسے شاگردوں کا ذکر کیا، جن کا ذکر نادراتِ غالب، فیضانِ غالب یا تلامذۂ غالب جلد اوّل و دوئم کسی میں نہیں تھا۔ اسی طرح بڑی تلاش و جستجو اور تحقیق کے بعد انہوں نے آتش کے ۲۳ غیر معروف شاگردوں کے حالات درج کیے، جن کا ذکر اب تک کسی محقق نے شاگردانِ آتش کے سلسلے میں نہیں کیا تھا۔ اسی طرح انہوں نے اپنے مضامین میں اردو تحقیق کی بہت سی غلطیوں اور محققوں کی کوتاہیوں کی نشاندہی کی ہے۔

تحقیق بہت مشکل اور بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ اس کے لیے بڑے مطالعے اور ذہنی سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ کاظم علی خاں نے ان مضامین میں بڑی ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔ ان مضامین سے ان کے مطالعے کی گہرائی اور مطالعے کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ اردو تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یقیناً ایک بہترین تحفہ ہیں۔

شارب ردولوی

پھولوں کی وادی

رفعت سروش

منظوم ڈرامہ، جو نہ صرف اعلیٰ
تخلیقی اظہار کی بدولت ہمارے
جمالیاتی ذوق کی تسکین کا باعث
بنتا ہے بلکہ ہمیں بہتر شہری بننے
کا درس بھی دیتا ہے۔

قیمت: سولہ روپے
پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اُردو کا مقبول عام
مصوّر ماہ نامہ

آج کل
نئی دہلی

مہمان مُدیر: راج نرائن رازؔ

سب ایڈیٹر: خورشید اکرم

جلد: ۴۸ شمارہ: ۸

مارچ ۱۹۹۰ء
پھالگن چیت شک سمت ۱۹۱۱

قیمت: دو روپے

فون: ۳۸۷۰۶۹

سرورق: ایم۔ ایم۔ مِلک

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر: آج کل (اُردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

بزنس ڈیزکا پتہ:
بزنس منیجر: پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

پروڈکشن آفیسر: آر۔ ایس۔ منجال

اندرونِ مُلک زرِ سالانہ: ۲۰ روپے
دو سال کے لیے: ۳۶ روپے
تین سال کے لیے: ۴۸ روپے

ترتیب

صحت کے شعبے کی ترجیحات

از: نیل منی راؤ ترے (وزیر صحت و خاندانی بہبود)

صحت سے متعلق قومی پالیسی میں ۲۰۰۰ء تک سب کے لیے صحت کا نشانہ طے کیا گیا ہے۔ یہ بلاشبہ ایک قابل ستائش اور سودمند نشانہ ہے تاہم یہ مقصد حاصل کرنا مشکل ہوگا۔

جب تک کہ ہم ترجیحات اور پالیسیوں کو از سرِ نو متعین نہیں کرتے ہیں صحت عامہ کی خدمات شہری علاقوں تک محدود ہیں اور دیہی بھارت اب بھی پسماندہ ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر ہمیں اپنی توجہات اور ترجیحات میں مناسب تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے صحت پر کسی بھی منصوبۂ عمل میں صرف ابتدائی صحت کے مراکز اور ذیلی مراکز کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لیے مالیاتی وسائل کو شامل کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس بات کو بھی یقینی بنانا ہے کہ ان مراکز کو چلانے کے لیے ضروری افرادی قوت فراہم ہوں۔ باصلاحیت معالجوں کو دیہی علاقوں میں بسنے کی ترغیب دینے اور عام لوگوں کی صحت سے متعلق ضروریات کی تکمیل کرنے کے لیے انہیں راضی کرنے کے ماضی میں تمام تر کوششوں کے باوجود ہمارے ملک میں طبی پیشہ افراد آج بھی شہروں میں ہی محدود ہیں۔ حقیقت میں ہماری کوششیں گاؤں میں رہنے والے ہر ایک فرد کے دروازے تک صحت کا پیغام لے جانے کے لیے ہونی چاہیے۔

دیہی علاقوں میں ساز و سامان سے لیس تعلیم اور تحقیق کے طبی مراکز قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

بھارت نے آزادی سے لے کر اب تک صحت سے متعلق مختلف پروگراموں میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ صحت کے شعبے میں جو اخراجات پہلے پنجسالہ منصوبے میں صرف ۶۵.۲ کروڑ روپے تھے، ساتویں منصوبے میں بڑھ کر ۳۳۹۲ کروڑ روپے ہو گئے ہیں۔ چھوا چھوت والی بڑی بڑی بیماریوں کے خاتمے اور روک تھام میں ہوئی اہم پیش رفت کے نتیجے میں شرح اموات میں کمی واقع ہوئی ہے۔ یہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۲۷.۴ کے مقابلے میں گھٹ کر ۱۹۸۸ء میں ۱۰.۹ رہ گئی ہے۔ اس سے مدتِ حیات میں بھی قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے اور یہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۳۲ برس سے بڑھ کر ۱۹۸۵-۹۱ء میں ۵۸ برس ہو گئی ہے۔ بچوں کی شرح اموات میں بھی زبردست کمی آئی ہے۔ یہ شرح ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۱۸۳ فی ہزار کے مقابلے میں کم ہو کر ۱۹۸۸ء میں صرف ۴۴ فی ہزار رہ گئی ہے۔ شرح پیدائش میں بھی کمی واقع ہوئی ہے۔

چھوا چھوت والی بڑی بڑی بیماریوں کی روک تھام اور خاتمے کے سلسلے میں چلائے جا رہے قومی صحت سے متعلق متعدد پروگرام بہت کامیاب رہے ہیں۔ عالمی صحت تنظیم اور ریاستی سرکاروں کے اشتراک سے چلائی گئی زبردست مہموں کی وجہ سے چھوٹی چیچک کا مکمل طور سے خاتمہ ہو چکا ہے۔ ملک جولائی ۱۹۷۵ء سے چھوٹی چیچک کے اثرات سے آزاد ہے۔ ہیضہ کی روک تھام سے متعلق پروگرام ۱۹۷۰ء میں شروع کیا گیا تھا اور اس کے نتیجے میں ہیضے کے معاملے اور اس سے ہونے والی اموات کی تعداد میں بھی کمی واقع ہوئی ہے۔ یہ معاملے ۷۵ء میں بالترتیب ۸۳۵، ۸۶ اور ۴۲۰۷۰ سے گھٹ کر ۱۹۸۵ء میں ۵۸۱۳ اور ۴۱۵ رہ گئے ہیں۔

۱۹۸۲ء میں کوڑھ کے خاتمے سے متعلق ایک قومی پروگرام شروع کیا گیا تھا جس کا خاص نشانہ یہ ہے کہ ۲۰۰۰ء تک اس بیماری کو مکمل طور سے قابو میں کر لیا جائے۔ اس پروگرام میں تیز رفتاری سے توسیع اور اضافہ ہوا ہے اور اب اس کے تحت ۳۱ مارچ ۱۹۸۸ء تک کوڑھ کی روک تھام کے ۷۰۸ مراکز سروے اور علاج ۷۴۰۰ مراکز قائم کیے جا چکے ہیں۔ ۱۹۸۷-۸۸ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ تشخیص والے معاملات کے مقابلے میں علاج کیے گئے معاملات کا تناسب دس فی صد زیادہ تھا۔ یہ سلسلہ جاری ہے۔ ۱۹۸۲ء میں کثیر ادویاتی طریقۂ علاج کا جو سلسلہ شروع کیا گیا تھا وہ کوڑھ کے معاملے میں بہت زیادہ کامیاب ثابت ہوا ہے۔ ٹی بی ایک جان لیوا بیماری ہے۔ ٹی بی کی روک تھام سے متعلق قومی پروگرام کی شروعات کے بعد سے ٹی بی سے ہونے والی اموات میں بھی کمی واقع ہوئی ہے۔ اس پروگرام کے تحت ٹی بی کے نئے مریضوں کی تشخیص کا اوسط ایک سال میں تقریباً سولہ لاکھ رہا ہے۔ جس سے ۱۹۸۵ء کے اعداد و شمار کے مقابلے میں ۲۶ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ ٹی بی کے علاج کی مدت کو ۲۴-۱۸ مہینے سے گھٹا کر ۶-۸ مہینے کرنے کے لیے انسداد ٹی بی کی قومی

دوائیوں پر مشتمل منضبط مدتی کیموتھریپی کا استعمال شروع کیا گیا اور اب تک اس طریقہ علاج کو چار سالوں (۸۰-۱۹۷۹ء) کے دوران ۱۷۶ اضلاع میں اختیار کیا جا چکا ہے۔

اس طرح کے علاج کی ....

سہولیات اس سال مزید ۷۵ اضلاع میں فراہم کی جا رہی ہیں۔ نابینائی کی روک تھام کے قومی پروگرام کے تحت ہر سال اوسط بنیاد پر ملک بھر میں موتیا بند کے ۱۲ لاکھ آپریشن کیے جانے کا نشانہ مقرر کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کامیابی کا تناسب ۱۹۸۵ء میں ۸۵٫۱ فی صد تھا جو سال ۱۹۸۹ء میں ۹۹ فی صد ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں جو اہم اقدامات کیے گئے ہیں۔ ان میں آپتھلمک اسسٹنٹوں کی تربیت، رضاکار تنظیموں کی زیادہ سے زیادہ شرکت اور ۱۸ بڑی ریاستوں میں آنکھوں کے علاج سے متعلق چھوٹے مراکز کا قیام شامل ہے۔

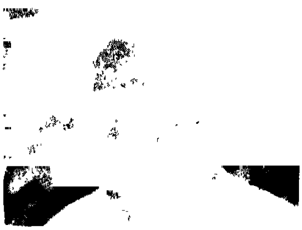
ایڈز کے بڑھتے ہوئے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے ۱۹۸۵ء میں ایڈز کی روک تھام کے لیے ایک نیا پروگرام شروع کیا گیا تھا۔ یہ پروگرام تین اہم پہلوؤں، نگرانی، تعلیم نیز معلومات میں اضافہ اور خون دینے والے افراد کی جانچ پڑتال پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ خون دینے والے افراد کی جانچ پڑتال کے لیے میٹرو پولیٹن شہروں میں خون کی جانچ پڑتال کے ۲۸ علاقائی مراکز قائم کیے گئے ہیں۔ خون دینے والے افراد کی جانچ کرنے کی سہولیات ان تمام شہروں میں فراہم کی جا رہی ہیں، جن کی آبادی پچاس ہزار سے زیادہ ہے۔ ایک طرف تو ان بیماریوں کی تحقیق اور صحیح علاج کے لیے ڈاکٹروں کی تربیت دینے کا کام شروع کیا گیا ہے۔ اور دوسری طرف اسکولوں، کالجوں اور عوام میں ایڈز سے متعلق عام بیداری پیدا کرنے کے لیے صحت سے متعلق تعلیم دینے کا کام بھی انجام دیا جا رہا ہے۔ اس سے متعلق خون محفوظ رکھنے کے بینکوں اور انتقالِ خون کی خدمات اور سہولیات کے میدان میں ترقی اور جدید کاری کے لیے ایک نئی اسکیم بھی شروع کی گئی ہے جس کا مقصد خون دینے والے افراد کے خون کی جانچ کرنا، خون کو محفوظ طریقے سے جمع رکھنا اور ضرورت مند مریضوں کو خون کی سپلائی کرنا ہے۔

منشیات کے بڑھتے ہوئے خطرے اور مسئلے سے نپٹنے کے لیے منشیات کی عادت اور لعنت سے چھٹکارا دلانے سے متعلق ایک پروگرام شروع کیا گیا ہے۔ اس کے تحت شہروں میں بڑے بڑے اسپتالوں میں منشیات کی عادت چھڑانے کے لیے مراکز قائم کرنے کی منظوری پہلے ہی دی جا چکی ہے۔ اس کے علاوہ دہلی، ویلور، لدھیانہ، بمبئی، مدراس اور کلکتہ کے بڑے بڑے پرائیویٹ اسپتالوں میں او۔پی۔ڈی کی سہولیات فراہم کرنے کی بھی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ گزشتہ کچھ برسوں میں ایک تبدیلی آئی ہے۔ اس کے تحت علاج کرنے کے پہلے کے نظریے کی جگہ اب انسدادی وادبی نظریہ اپنایا گیا ہے۔ تا کہ قومی صحت پالیسی کے تحت ۲۰۰۰ء تک سب کے لیے صحت کے متعین نشانے کی حصولی کے لیے عام لوگوں کو صحت سے متعلق زیادہ سے زیادہ تعلیم دی جائے۔ رواں مالی سال کے دوران ذیابیطس کی روک تھام اور دانتوں کی دیکھ بھال وغیرہ کے لیے بھی متعدد پروگرام شروع کیے گئے ہیں۔

خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام نے بھارت میں ترقیاتی منصوبہ بندی کے سلسلے میں مرکزی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ ترقیاتی منصوبوں میں ان پروگراموں کے لیے مخصوص رقم میں بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ پہلے پنجسالہ منصوبہ میں صرف ۶۵ لاکھ روپے مخصوص کیے گئے تھے جو ساتویں منصوبے میں بڑھ کر ۳۲۵۶۰۰ لاکھ روپے ہو گئے ہیں۔ ان پروگرام کی شروعات سے مارچ ۱۹۸۹ء تک تقریباً دس کروڑ ۶۲ لاکھ بچوں کی پیدائش روکے جانے کا اندازہ ہے اس کے باوجود آبادی میں اضافے کی شرح اب بھی خطرناک حد تک زیادہ (دو فی صد سے زیادہ) ہے۔ ایسا اس لیے کہ شرح پیدائش میں کمی کا عمل مقابلتاً دھیما ہے۔ جب کہ شرح اموات میں تیزی سے کمی آئی ہے۔ اس لیے اس صورتِ حال نے علم الآبادی کے موجودہ وسائل میں بنیادی حیثیت حاصل کر لی ہے ـــ اس پروگرام کے تحت خاندانی منصوبہ بندی اپنانے والوں کی کل تعداد ۸۵-۱۹۸۴ء میں ایک کروڑ ۶۴ لاکھ ۴۰ ہزار سے بڑھ کر ۸۹-۱۹۸۸ء میں دو کروڑ ۴۱ لاکھ دس ہزار ہو گئی ہے۔ جب سے یہ پروگرام شروع ہوا ہے اس وقت سے کر اب تک یہ ایک ریکارڈ ہے۔

عام بیماریوں سے محفوظ رکھنے کی غرض سے ۱۹۸۵ء میں بچوں کو بچپن میں ٹیکے لگانے کا ایک پروگرام شروع کیا گیا تھا۔ ۱۹۹۰ء تک فی صد حاملہ عورتوں کو انجکشن لگانے اور کم از کم ۸۵ فی صد شیر خوار بچوں کو ڈپتھیریا، پرٹوسس، ٹیٹنس، ٹی بی، پولیو، مائی لیٹس اور خسرے کے انجکشن لگانے کا نشانہ رکھا گیا ہے۔ ۱۹۸۵ء کے بعد سے حاملہ عورتوں اور شیر خوار بچوں دونوں کو ٹیکے لگانے سے متعلق خدمات کی انجام دہی میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ ٹیکے لگانے کے پروگرام کے تحت انجام دیے گئے کام کی سطح میں ۸۹-۸۸ء تک ڈی۔پی۔ٹی کے ٹیکوں کے معاملے ۵۱ فی صد سے بڑھ کر ۷۵، فی صد ڈی بی وی کے معاملے ۴۰ فی صد سے بڑھ کر ۷۲، فی صد بی سی جی کے ٹیکوں کے معاملے میں ۳۰ فی صد سے بڑھ کر ۷۹، فی صد اور ٹی ٹی (پی ڈبلیو) کے معاملے ۴۰ فی صد سے بڑھ کر ۶۳ فی صد ہو گئے ہیں۔ جسم میں پانی کی کمی کے نتیجے میں ہونے والی اموات سے بچوں کو بچانے

شمیم حنفی



اُردو ادب آزادی کے بعد

(ہندوستان میں)

آزادی کے بعد کا دور برصغیر میں سیاسی اور سماجی سطح پر ابتری کا اور فکری سطح پر انتشار کا دور رہا ہے۔ یہاں میری مراد تقسیم کے ساتھ رُونما ہونے والی مخصوص انسانی صورتِ حال سے ہے۔ اس صورتِ حال نے مجموعی اعتبار سے اس دور کے ادب کو ایک نئی جمالیات سے روشناس کرایا ہے۔ یہ جمالیات شعر و ادب کی روایتی جمالیاتی قدر کے برعکس بڑی حد تک اس جمالیات کا عکس کہی جاسکتی ہے، جس کا ظہور یورپ میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد یعنی کہ اس صدی کی دوسری دہائی میں ہوا تھا، جو ادب کے رسمی رول سے علاقہ نہیں رکھتی جو آسودگی کا تجربہ بخشنے کے بجائے ایک گہرے اخلاقی ملال اور اضطراب کو راہ دیتی ہے۔ جس کا خمیر لاحاصلی، محرومی، بے سمتی، فنا پرستی اور خوف کے کھردرے احساسات سے تیار ہوا ہے، جو روشنی کے بجائے اندھیرے میں سفر کرتی ہے اور کسی متعین منزل تک نہیں پہنچاتی۔

ہر چند کہ تقسیم کا ادب ایک واضح سماجی جہت رکھتا ہے اور آزادی کے بعد کے چار پانچ برسوں میں یہ ادب روایتی ترقی پسندی کی ترویج کا واسطہ بھی بنا، لیکن اس زمانے میں نسبتاً زیادہ نمایاں صورتیں ایک شدید ردِّ عمل کا اظہار کرتی ہیں۔ تقسیم کے بعد فسادات، ہجرت اور سیاسی و نظریاتی تصادمات اور تضادات کے پس منظر میں ایک ایسے ادبی تصور کو اُبھرنے کا موقع ملا جو ادب اور ادیب کے سیاسی و سماجی رول کی نفی کرتا ہے اور ادب میں مقصدیت یا ادب کی سماجی افادیت سے متعلق تمام معروف و مروّج ایقانات پر ضرب لگاتا ہے۔

یہاں اس حقیقت کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ آزادی سے پہلے برِصغیر ہند و پاک میں اردو کی علمی و ادبی روایت مشترک تھی۔ دونوں ملکوں کا ماضی ایک تھا اور ایک ہی جذباتی فضا اور جمالیاتی مزاج سے دونوں ملکوں کے ادیب واقف تھے۔ دونوں کی ذہنی تربیت یکساں خطوط پر ہوئی تھی — ادیبوں کی جو نسل تقسیم کے ساتھ ہندوستانی اور پاکستانی کہی جانے لگی اس کے فکری مناسبات اور حسی و جذباتی انسلاکات یکساں تھے۔ انہیں ایک دوسرے سے ممیز کرنے والی حقیقت جغرافیائی لحاظ سے ناگزیر اور ٹھوس ہونے کے باوجود مصنوعی تھی۔

یہ بات بھی ہمیں یاد رکھنی چاہیے کہ ہندوستانی اور پاکستانی ادب کی اصطلاح کا اطلاق آج بھی اردو والوں پر پوری طرح نہیں ہوتا۔ اردو کو تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنانے والے ادیب جو سرحد کے دونوں طرف بستے ہیں، آج بھی ایک دوسرے کے تجربوں میں شریک دکھائی دیتے ہیں۔ یہ مماثلت ادب کی آفاقیت یا لازمانیت کے عمومی تصوّر سے زیادہ اس واقعے سے تعلق رکھتی ہے کہ دونوں ملکوں میں پیدا ہونے والے اردو ادب کا ماضی ہی نہیں حال بھی کئی معنوں میں ایک ہے۔ دونوں ملکوں کے ادیب ایک دوسرے کو جانتے اور سمجھتے ہی نہیں، ایک دوسرے سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔ دونوں ملکوں میں چھپنے والے رسائل ایک ساتھ ہندوستانی اور پاکستانی ادیبوں کی نگارشات شائع کرتے ہیں۔

جس طرح قرۃ العین حیدر، بیدی، اختر الایمان، عمیق حنفی، بلراج کومل، باقی پاکستان کے ادیبوں کے نزدیک محض ہندوستانی نہیں ہیں۔ اسی طرح انتظار حسین، انور سجاد، خالدہ اصغر، منیر نیازی، کشور ناہید، زاہد ڈار اور فہمیدہ ریاض ہندوستانی ادیبوں کے لیے صرف پاکستانی نہیں ہیں۔ ان ادیبوں یا ان کے معاصرین نے جن میلانات کو ترقی دی ہے وہ

D-114 - ذاکر باغ، اوکھلا روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

[illegible] دہلی

اردو ادب کی مشترکہ روایت کا حصہ ہیں۔ انہیں پاکستانی اور ہندوستانی لکھنا غلط ہوگا۔

پچھلے چند برسوں میں پاکستانی ادیبوں کے ایک چھوٹے سے گروہ نے پاکستانی ادب کی اصطلاح کو جغرافیائی سیاق سے زیادہ ایک مخصوص ذہنی، فکری، تہذیبی ادبی اور جمالیاتی سطح پر برتنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جس طرح امریکی ادب اور برطانوی ادب دو قائم بالذات اور منفرد روایات کے ترجمان ہیں۔ اسی طرح پاکستانی ادب بھی ہندوستانی ادب سے الگ اپنی شناخت رکھتا ہے۔ لیکن اس گروہ کی ادعائیت کے باوجود یہ مسئلہ پاکستانی ادیب تا حال حل نہیں کر سکے ہیں۔ اپنی جڑوں کی تلاش یا اپنی تہذیبی اور ادبی شناخت کا مسئلہ اسی لیے پاکستان میں ایک مستقل سوال کی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستانی ادیبوں کا ایک حلقہ اس سوال کا جواب پانچ ہزار برسوں پر پھیلی ہوئی تاریخ میں ڈھونڈتا ہے۔ ایک دوسرا حلقہ چودہ سو برس کی اسلامی تہذیب اور روایت میں ڈھونڈتا ہے ایک تیسرا حلقہ پچھلے چالیس برس یعنی آزادی کے بعد سے اب تک کے پاکستان کی مجموعی صورتِ حال میں ڈھونڈتا ہے۔ اور ایک چوتھا حلقہ اُن ادیبوں کا ہے جو تاریخ کے چکر میں پڑنے سے انکار کر دیتے ہیں اور نئے انسان کی بین الاقوامیت کے تناظر میں نئے ادب کا تعین کرنا چاہتے ہیں۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو کا جو بھی ادب سامنے آیا وہ اس نوع کے کسی سوال سے دوچار نہیں ہے۔ ان بنیادوں پر ہم چاہیں تو ہندوستان کے اردو ادب اور پاکستان کے اردو ادب میں ایک حدِ فاصل بھی قائم کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ امرِ واقعہ کے طور پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے مخصوص سیاسی اور سماجی ماحول نے وہاں کے ادیبوں کو تحریکوں کی ایک مخصوص جہت سے بھی روشناس کرایا ہے۔ مثال کے طور پر سیاسی جبر، مذہبی ظلمت پسندی اور تنگ نظری سرکاری احتساب کے خلاف احتجاج کی جو روایت پاکستانی ادیبوں میں ملتی ہے۔ اس کے اسباب و عناصر اردو ادب کی مجموعی روایت کے بجائے پاکستان کی موجودہ صورتِ حال میں تلاش کیے جانے چاہئیں۔ ادب میں سماجی مقصدیت کے ترجمانوں کو پاکستانی معاشرے میں پھیلی ہوئی کٹھ ملائیت اور پاکستانی سیاست پر بورژوا سرمایہ دارانہ تصورات کے تسلط کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ان حقائق نے سماجی مقصدیت کے فرسودہ نظریے کو ایک نئی زندگی دی ہے۔ احتجاج سے قطع نظر تقسیم کے بعد کا پاکستانی ادب، پاکستان میں اظہار کی آزادی پر جبر کے سبب بالواسطہ مبہم اور علامتی اظہار کے فروغ کا ذریعہ بھی بنا۔ یہ میلان تقسیم کے بعد ہندوستان کا اردو ادیبوں میں بھی مقبول ہوا۔ مگر اس قبولیت کے اسباب الگ الگ ہیں۔ پاکستان کے ادیبوں نے اظہار کے اس طریق کو ایک مصلحت اور مجبوری کے طور پر قبول کیا تھا۔ ہندوستان میں اُسے ایک جمالیاتی ضابطے کے طور پر اختیار کیا گیا۔ پچھلے چار پانچ برسوں سے یہ میلان روبہ زوال ہے۔ کچھ تو اس لیے کہ فیشن ایبل جدیدیت اور آوا گارد کے روایتی تصور کی کشش اب تیزی کے ساتھ کم ہوتی جا رہی ہے۔ تجربہ پسندی کا شور دب چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ پاکستان کے ادیبوں میں سیاسی اور سماجی احتجاج کی لے روز بروز اونچی ہوتی جا رہی ہے۔ ادیبوں کا ایک حلقہ اس میلان سے الگ ہے، لیکن اس حلقے کی حیثیت پاکستان کے ادبی معاشرے میں ایک ایسے مرکز گریز حلقے کی ہے جو اپنے عہد کی تاریخ کو اپنے تخلیقی تجربے کا حوالہ بنانے پر آمادہ نہیں ہے۔

ان چند امتیازات سے قطع نظر تقسیم کے بعد کی ادبی روایت جو اردو شاعری اور فکشن کے واسطے سے سامنے آئی اس کے شناختی نشانات ہند و پاک دونوں ملکوں میں کم و بیش ایک جیسے ہیں۔ یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے کہ اردو کے تخلیقی ادب نے پاکستان میں مقدار و معیار کے لحاظ سے جو مرتبہ حاصل کیا ہے، ہندوستان میں جنم لینے والا ادب بعض مستثنیات کے ہوتے ہوئے بھی اس کے مقابلے میں بہرحال کم تر ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تقسیم کے بعد سے تاحال پاکستان کے ادیبوں نے جس ذہنی اور جذباتی ماحول میں زندگی گزاری ہے اور تاریخ تہذیب اور سماجی صورتِ حال کو جس طرح اپنے تخلیقی تجربے کی اساس بنایا ہے اس کی نوعیت ہندوستان کے اردو ادیبوں کے تجربات اور ماحول سے مختلف رہی ہے۔ پاکستانی ادیبوں کے تجربات زیادہ سچے، کھرے دوٹوک اور وسیع ہیں۔ ان کا تاریخی حوالہ کہیں زیادہ مستحکم اور واضح ہے۔ پاکستانی ادیبوں کی نگارشات ادب کے غیر زمانی اور غیر مکانی عناصر سے مزین ہونے کے باوجود ہر معنی خیز اور سچے ادب کی طرح اپنی تاریخ میں سانس لیتی ہیں اور ایک زندہ و متحرک حقیقی سطح پر اپنے قاری سے رشتہ قائم کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں جنم لینے والا معاصر ادب اردو ادب کی مجموعی صورتِ حال کے مفہوم اور مزاج کے تعین میں زیادہ موثر رول ادا کرتا ہے۔ فرانسیسی انحطاط پسندی، علامتیت اور روایتی جدیدیت کے میلانات جیسے جیسے کمزور پڑتے جا رہے ہیں۔ ہندوستان کے اردو ادب پر پاکستانی ادیبوں کی معنویت کے نشانات اس تناسب سے رفتہ رفتہ زیادہ روشن ہوتے جا رہے ہیں۔ پوسٹ موڈرنزم کا تصور ہمارے یہاں دیر سے مقبول ہوا۔ لیکن آٹھویں دہائی کے آغاز کے ساتھ ساتھ اس تصور کو ہماری ادبی روایت میں ایک نئی زمین میسر آئی ہے۔ اب عام طور پر یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ جدیدیت ترقی پسندی کی ضد نہیں۔ یہ ایک نئی حقیقت پسندی ہے جس کا خاکہ روایتی ترقی پسندی کے زوال اور پوسٹ موڈرنسٹ ریڈیکلزم کے فروغ کے ساتھ جدیدیت اور ترقی پسندی کے مابین مفاہمت کے ایک نو دریافت تصور نے ترتیب دیا ہے۔ بنگالی ادیبوں

نے اس دہائی کو The Burning Seventies کا نام دیا تھا۔ اس دہائی کے ساتھ ادب کی سماجی معنویت ادب اور ادیب کی تاریخی موقف نیز ادبی جمالیات کے ایک نئے شعور کو ترقی ملی ہے۔

چھٹی دہائی اردو والوں میں نظریاتی تنازعوں کی دہائی تھی۔ ۵۵ء تک پہنچتے پہنچتے روایتی ترقی پسندی کا سحر ٹوٹنے لگا تھا۔ اس زمانے میں جدیدیت ایک متبادل ادبی میلان کی صورت سامنے آئی۔ تنہائی، بے چارگی، ناوابستگی اور علیحدگی کے تصورات نے ایک نئی بوطیقا کی تشکیل کی۔ ادب میں ذہنی اور جذباتی تجربوں کا دائرہ تیزی سے سمٹتا گیا۔ یہاں تک کہ جدیدیت نے ایک نئی تخلیقی شریعت کی حیثیت اختیار کر لی۔ نئی تاریخیت، نئی مذہبیت، علامتی اور اساطیری طرزِ اظہار، وجودیت اور لایعنیت اس نئی تخلیقی شریعت .... جیسے جیسے انتہا پسندی بڑھتی گئی۔ ردِ عمل کی بعض صورتیں بھی دھیرے دھیرے رونما ہونے لگیں۔ نئے ادیبوں کا جھگڑا ایک طرف ترقی پسندوں سے تھا۔ دوسری طرف اپنی ادبی روایت کے تمام تر ماضی سے۔ ادب کے سلسلے میں ایک مبہم اور مصنوعی اختصاصی رویے کی قبولیت نے جس کی جڑیں دراصل مغرب کے مشینی اور ٹیکنولوجیکل تمدن میں پیوست تھیں اور جس نے اجتماعیت کی ضد کے طور پر اپنے آپ کو نمایاں کیا تھا، ادب کے ہمہ گیر مفہوم کو اس حد تک سمیٹا کہ ادب بھی سائنس اور سماجی علوم کی طرح انسانی اظہار کا ایک اختصاصی میدان بن گیا۔ اس دور میں ادب کے وسیع انسانی رشتوں سے زیادہ ادب کے محدود اور قدرے آزاد لسانی اور ساختیاتی پہلوؤں کو اہمیت دی جانے لگی۔ اس رویے کے خلاف ترقی پسندوں کا احتجاج تو خیر ان کی نظریاتی اوعائیت پر سا اور تو کلاسیکی ادیبوں کا احتجاج ان کی روایت گزیدگی نیز نئے طرزِ احساس سے بے خبری پر مبنی تھا۔ لیکن نئے ادیبوں میں بھی اس زاویۂ نظر سے اگر اختلاف کی کوئی آواز اٹھی تو تجربہ پسندی کے شور میں گم ہو گئی۔ مثال کے طور پر باقر مہدی تھے جو آوارہ کارد کے بنیادی عنصر کی حیثیت سے سرکشی اور احتجاج کے رویے پر اصرار کر رہے تھے اور اس رویے کی روشنی میں تمام ادیبوں سے وابستہ ماضی پرستی، احیاء پسندی اور قنوطیت کے میلانات کے مخالف تھے۔ ان کی ریڈیکلزم نہ تو روایتی ترقی پسندی سے ہم آہنگ تھی۔ نہ روایتی جدیدیت سے۔ رسمی اجتماعیت اور رسمی انفرادیت دونوں سے اس کا راستہ الگ تھا۔

ہندوستان میں ساتویں دہائی کے ادبی ماحول کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس دور میں تخلیق پر تنقید کی بالادستی قائم ہو گئی۔ تنقید کو سب سے زیادہ پنپنے کا موقع تخلیقی اضمحلال کے زمانے میں ملتا ہے۔ اس دور کی بدنصیبی یہ رہی کہ شعر اور نثر کی تمام تخلیقی اصناف کی رہبری کا فرض ادیبوں کی تخلیقی امنگ اور استعداد کی جگہ تنقید انجام دینے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادب کا رشتہ قاری سے کمزور پڑتا گیا اور اس کی حیثیت ادیب اور نقاد کے مابین ایک بے روح مکالمے کی ہو گئی۔ یہ ایک طرح کا ذہنی اور جذباتی ابتذال تھا۔ جس کے شکار ادیب بھی تھے اور نقاد بھی۔ ادب میں ڈی ہیومنائزیشن کے تصور کو سب سے زیادہ تقویت اس دور میں ادیبوں اور نقادوں کے اسی ابتذال سے ملی۔

ظاہر ہے کہ اس میلان کا انجام بھی وہی ہوا جو ہر طرح کی انتہا پسندی کا مقدر ہوتا ہے۔ ہمارے ادیبوں کو ہوش اس وقت آیا جب وہ اپنی تخلیق کے تنہا قاری رہ گئے۔ اسی موڑ پر انہیں خیال آیا کہ پوسٹ موڈرنزم کا دور جو مغرب میں ایک روایت بن چکا تھا، اس نے ادب کے سماجی، انسانی مواد، ادب اور تاریخ کے تعلق، ادبی روایت کے مفہوم اور ماضی سے حال کے رشتوں کو ایک نئی جہت دی ہے۔ یہ جہت مستقبلیت کے ایک ناگزیر عنصر سے مربوط ہے اور اس طرح ہمیں ادب کی ایک نئی اخلاقیات اور ایک نئی جمالیات کے شعور تک لے جاتی ہے۔ اس جہت نے ہمیں اپنے ماضی اپنے حال اور اپنے مستقبل سے انکار کی بجائے ایک نئے اقرار کی راہ دکھائی۔ ادبی روایت کی تعمیر و تشکیل کا سرا ہاتھ آیا۔ چنانچہ آٹھویں دہائی سے اب تک ادب دراصل انسانی تجربوں کی اس نئی تعبیر اور نئی تعمیر کا ادب ہے۔

آخر میں چند وضاحتوں پر اپنی بات ختم کرتا ہوں:

۱۔ یہ نوٹ تقسیم سے اب تک کے ادب کی تاریخ یا تدریجی ارتقا کا خاکہ نہیں ہے۔

۲۔ اس پورے عرصہ میں ہمارا ادب ایک ساتھ کئی متوازی میلانات کا ترجمان رہا ہے اور ادیبوں کے کئی حلقے یا گروہ بیک وقت سرگرم رہے ہیں۔ یہاں صرف غالب میلانات سے بحث کی گئی ہے۔

۳۔ اس گفتگو میں تقسیم کے بعد کے پاکستانی ادب یا ہندوستانی ادب کی اصطلاح کا مفہوم نظریاتی امتیازات کی بجائے محض جغرافیائی حد بندیوں کا تابع ہے۔

۴۔ صحیح نتائج تک پہنچنے کے لیے ہمیں پاکستانی یا ہندوستانی ادب کی جگہ پاکستان میں جنم لینے والے اردو ادب اور ہندوستان میں جنم لینے والے اردو ادب کا تصور ذہن میں صاف کر لینا چاہیے۔

۵۔ تقسیم سے اب تک کا زمانہ مجموعی اعتبار سے اردو شعر و ادب کے لیے خاصا زرخیز رہا ہے۔ اس نوٹ میں اس دور کے اہم تخلیقی کارناموں کی فنی قدر و قیمت کے تعین کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ یہ مسئلہ ایک الگ بحث کا متقاضی ہے۔

ظہیر احمد صدیقی

اخلاقی اقدار اور اُردو ادب

دورِ حاضر کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ انسان سے انسان کا رشتہ ٹوٹتا جا رہا ہے۔ زندگی کی صالح قدریں بکھرتی جا رہی ہیں۔ وہ سماج میں رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگا ہے۔ موجودہ دور کی دوڑتی بھاگتی دُنیا ایک لمحے کے لیے بھی پیچھے کی طرف دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ سائنس اور جمہوریت زندگی کی قدروں کے احترام سے محروم ہیں۔ تہذیب کی بربادی کا ثبوت تعصب اور تنگ نظری کی صورت میں افراد اور جماعتوں میں نمایاں ہے۔ ان حالات میں اس انسان کی ذمّہ داری بڑھ جاتی ہے جو انسانی قدروں پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ انسانیت کے احترام کے بغیر نہ کوئی معاشرہ پنپ سکتا ہے اور نہ کوئی ادب ترقی کے منازل طے کر سکتا ہے۔ غلام السیدین صاحب نے دلچسپ بات کہی ہے:

> "ہر انسان اس مشترک انسانیت کے رشتہ کا احترام کرے جو اُسے دوسروں سے ملاتا ہے اور خارجی یا نمائشی فرق کی وجہ سے خود کو دوسروں سے برتر اور اعلیٰ نہ سمجھے۔"

زندگی کی اس دوڑ میں کبھی کبھی یہ خدشہ بھی سر اُٹھاتا ہے کہ کہیں ہماری ترقّی ترقیٔ معکوس تو نہیں ہے۔ ہم جب اپنے مسائل کا جائزہ لیتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ وہ قدریں جو احترامِ انسانیت اور صالح سماج کے بنانے میں کام آتی تھیں، وہ قدریں گُم ہوتی جا رہی ہیں۔ تہذیب، شرافت، مشرقیت، مذہب، تعلیم غرض کون سی چیز ہے، جس کا ہم حق ادا کر رہے ہیں۔ میں قنوطی نہیں ہوں۔ مگر حقائق سے چشم پوشی ممکن نہیں ہے۔

احترامِ انسانیت کے لیے کس انسانی وصف کی سب سے زیادہ ضرورت ہے تو میں سیدین صاحب کا ہم نوا ہو کر 'رواداری' کا ذکر کروں گا۔ یہ رواداری منزل نہیں ہے، مگر منزل تک پہنچنے کا ذریعہ یقیناً ہے اور اس کے ڈانڈے جا کر تہذیبی قدروں سے مل جاتے ہیں۔ تہذیب ایک ایسی چیز ہے جس سے افراد اور جماعتوں کی شناخت ہوتی ہے۔ بقول سیدین صاحب:

> "رواداری کی صفت پیدا کئے بغیر تہذیب کی منزل تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ بہت سے نیک نیت اور نیک نفس لوگوں کی خوبیوں پر محض اس لیے پانی پھر جاتا ہے کہ ان میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔"

تہذیب فرد اور جماعت میں دماغی بیداری اور نشو و نما پیدا کرتی ہے۔ احترامِ انسانیت کے سلسلے میں رواداری کا ذکر کیا گیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ جرم اور مجرم کے فرق کو سمجھے۔ وہ اپنی غلطیوں کا محاسبہ کر کے ان میں اصلاح پیدا کرے۔ دوسروں کی غلطیوں کو فیاضی کے ساتھ معاف کر دے۔ حضرت محبوبِ الٰہی فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے غلاموں کی غلطیوں کو ستر مرتبہ معاف کرتا ہوں تاکہ اپنے آقا سے بھی معافی کا خواستگار ہو سکوں۔

سائنس کی ترقی نے جو کارنامے دکھائے ہیں، ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انسان کو بڑی حد تک توہمات کی زنجیروں سے آزاد کر دیا جو احترامِ انسانیت کے لیے بہت ضروری تھا۔ انسانی زیاں میں سب سے زیادہ تقدیر پرستی کو دخل ہے۔ تقدیر کے غلط تصورات نے انسان کو مجہول اور اس کے عمل کو جامد بنا دیا۔ انسانی بقا کے لیے عمل کی جو اہمیت ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ عمل

(۳۱-۲۹) C/۸، پروین [illegible] یونیورسٹی کیمپس، دہلی، ۱۱۰۰۰۷

انسان کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کرتا ہے۔ اس سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے دلوں کے زنگ بھی صیقل ہو جاتے ہیں۔ یہ خود شناسی خدا شناسی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں
ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

احترامِ انسانیت کا جو سبق مذہبِ اسلام نے سکھلایا ہے وہ اس کی ہر عبادت سے ظاہر ہے۔ فرد اور جماعت، عدل اور توازن کا جو امتزاج یہاں ملتا ہے اس کی مثال پیش کرنے سے شاید تاریخِ عالم قاصر ہے۔ مذہب نے سب سے پہلے جس پر زور دیا وہ "احترامِ انسانیت" ہی تھا جس کا ثبوت قرآنِ حکیم اور قرآنِ ناطق کی ذات کا ایک ایک واقعہ برہانِ قاطع ہے۔ حضورِ اکرمؐ کو خلقِ عظیم کا خطاب اور آپؐ کا معراج کے لیے تشریف لے جانا دراصل عظمت و احترام کی دلیل ہے۔ کسی عربی شاعر نے لکھا ہے:

"آپؐ کے بارے میں ہمارے علم کی رسائی بس اس
حد تک ہے کہ آپ بشر ہیں، لیکن خدا کی مخلوق
میں سب سے بہتر ہیں۔" (ترجمہ)

یہ احترامِ انسانیت ہی عظمتِ انسانی کی دلیل ہے۔ قدیم فلاسفر اور مفکروں کے سامنے ہر زمانے میں یہ مسئلہ مرکزی توجہ کا حامل رہا ہے کہ انسانِ کامل کا تصور کیا ہے تاکہ احترامِ انسانیت کے حدود متعین کیے جا سکیں۔ ان تصورات کی تعبیر ہر دبستانِ فکر نے اپنے نقطۂ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ان کی نظر چند مفروضات اور تجریدی تصورات سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انسانیت کے تصور میں کہیں نہ کہیں کوئی کمی رہ جاتی ہے۔ احترامِ انسانیت ایک عمل ہے اور عظمتِ انسانی اس کا نتیجہ۔ بصیرت کی آنکھ اگر اس کے نور سے روشن ہو تو انسانِ کامل کا جلوہ وجدان اور الہام کے آئینے میں دیکھ سکتا ہے۔ اس لیے جہاں جہاں احترامِ انسانیت کا ذکر آئے اس کو اگر انسانی عظمت سے تعبیر کریں تو غلط نہ ہوگا۔

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

انسان کو اپنی انفرادیت کا احساس اور قدرت کی وسیع دنیا میں اپنے وجود کی اہمیت کا خیال فلسفہ و تصوف کے راستے سے آیا جس کو وجودی فلسفہ کہا جا سکتا ہے۔ وجودی فلسفہ میں کائنات، زندگی اور مظاہرِ فطرت کی حقیقت پر بحث کی جاتی ہے۔ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ صرف خدا ہے اور خدا کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ بھی وحدت الوجود کے عقیدے کے باوجود کائنات کو غیر حقیقی یا مصنوعی خیال نہیں کرتے۔ ڈاکٹر وحید اختر نے ان الفاظ میں وضاحت کی ہے۔

"انہوں نے عالم کے وجود اور انا (خودی) کی نفی
کی اور ترکِ عمل کا سبق دیا۔ لیکن جب کائنات اور
انسان اللہ کے مظہر خارجی ہیں تو یہ نفی نہیں ہوئی بلکہ
انسان اور عالم دونوں کا اثبات ہوا۔"

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ متعدد صوفیہ نے ان لوگوں کا رد کیا ہے جو عبد اور معبود کے فرق کو مٹانا چاہتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی شاید بے محل نہ ہو کہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں کے نتائج یکساں ہیں یعنی قلب کو ماسوی سے خالی کر دینا۔ اس تصور میں بھی احترامِ انسانی کا پہلو نمایاں ہے یعنی جس نے ماسوی سے رشتہ منقطع کر لیا اس کا شمار صدیقین میں ہو جائے گا۔ تصوف روح کے تقاضوں سے عبارت ہے اور روح کا تعلق انسان سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی انسانی تطہیر کا مسئلہ پیدا ہوا ہے تو تصوف کے نظریات نے رہنمائی کی ہے۔ فنا کے سلسلے میں ان کا خیال ہے کہ انسان کی اعتباری ہستی ختم ہو جائے اور حقیقی ہستی باقی رہے۔ ظاہر ہے کہ قدرت نے کارخانۂ قدرت اس انداز سے بنایا ہے کہ اعتباری ہستی کلی طور پر مٹ نہیں سکتی۔ البتہ یہاں پر مرشدِ کامل کی ضرورت ہوتی ہے جو ان دونوں تصورات میں "توازن" پیدا کرے اور انسانیت کو شرف عطا کرے۔ وجودیت کی تحریک نے ترقی پسند حلقہ میں ہلچل پیدا کر دی۔ اس تحریک کو ترقی پسند تحریک کے نظریات کا حریف خیال کیا گیا۔ مگر سبطِ حسن کے ایک جملے نے ترقی پسندوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا — انہوں نے کہا:

"یہ جدیدیت اور وجودیت کی جو تحریکیں ہیں،
ان پر کوئی تشویش نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ یہ
ہمارے فکری حریف نہیں ہیں۔"

احترامِ انسانیت اور عظمتِ بشر یوں تو زندگی کے ہر شعبہ سے وابستہ ہے مگر اردو ادب نے جس طرح اس کا اظہار کیا ہے، وہ سب سے مختلف ہے۔ ادب اور زندگی ایک دوسرے کے عکس ہیں۔ اس لیے ادب خواہ وہ نثر ہو یا شعر اس نے عظمتِ بشر کی کہانیاں سنائی ہیں۔ اس کا سبب سے

بھرپور اظہار تصوف میں ہوا ہے۔ تصوف کی روایت کو اردو ادب نے فروغ دیا تصوف سے انسان نے خود شناسی کے ذریعے خداشناسی کا وصف پایا۔ تصوف کے اثر سے مساوات کا تصور اردو ادب میں عام ہوا۔ ورنہ عربوں میں عجمی کے لیے۔ ہندوستان میں برہمن کا غیر برہمن کے لئے تعصب ایک حقیقت ہے۔ مگر اردو ادب کا یہ سیکولر کردار رہا کہ اس نے برہمن اور غیر برہمن ہی نہیں بلکہ شیخ و برہمن کے فرق کو بھی مٹا دیا۔ اس مساوات نے انسان کو دوسرے کو سمجھنے کا موقع فراہم کیا۔ نیاز فتح پوری نے اس امر کی طرف دلچسپ اشارہ کیا ہے۔

"تصوف ہمیشہ میری پریشانیٔ خیال کی جائے پناہ رہا
ہے، لیکن اس کا علمی یا فلسفیانہ پہلو نہیں جس میں
لطائف قلب یا حقیقت و معرفت وغیرہ کی اصطلاحوں
سے بحث کی جاتی ہے بلکہ اس کا اخلاقی پہلو، اس کا
والہانہ مشرب، اس کا نعرۂ ہمہ اوست، اس کا
آوازۂ پندارم تو ئی کہ آپ اگر عملی زندگی میں اس کی
تفسیر کریں تو نتیجہ وہی انسانیت پرستی نکلتا ہے۔"

اس طرح تصوف میں فنا کے مفہوم نے بھی بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں۔ فنا سے ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ انسان اپنی ذات کو خدا میں جذب کر دے۔ یہ تصور ان لوگوں کا تھا جو زندگی کی جدوجہد اور عمل سے تھک کر بیٹھ گئے اور اس تھکن کو ان مفروضات کے سہارے بھلانے کی کوشش کرتے تھے۔ فنا کا تصور اسلامی تصوف میں یہ ہے کہ اپنی خودی اور ارادہ کو خدا کی خودی اور ارادے سے وابستہ کر دے۔ جس کو اقبال خودی کا مسلمان ہونا کہتے ہیں۔ اکثر صوفیوں نے اپنے ملفوظات میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ تصوف کی وجہ سے انسانی مکروہات اخلاقِ حمیدہ میں بدل جاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں انسان صفاتِ الٰہی کا مظہر بن جاتا ہے۔

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

تصوف کے بنیادی تصورات پر نظر ڈالیے تو اس کے ڈانڈے اسلامی نظریات سے ہم آہنگ نظر آئیں گے۔ جب میں تصوف کی بات کر رہا ہوں تو میری مراد اس عجمی تصوف سے ہرگز نہیں ہے جس کے لیے اقبال کو "تعلیم گوسفنداں" کا طعنہ دینا پڑا تھا۔ ان کے نظریات سے یہاں بحث مقصود نہیں ہے۔ میں ان صوفیانہ نظریات کی بات کر رہا ہوں۔ جہاں فرد کی انفرادیت ہی اس کا سب سے بڑا احترام ہے۔ رنگ، نسل، تہذیب کے اصنام کو اسی لیے توڑا گیا کہ انسان کی عظمت اور انفرادیت نمایاں ہو سکے۔ دورِ حاضر کا المیہ یہ ہے کہ انسان بہت سے خانوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ شاعر نے کتنے دردمندانہ انداز سے بارگاہِ نبوت میں فریاد کی تھی۔

شب پرستوں کے تسلط سے یہ ڈر ہے مولا
ظلمتیں صبح کی راہوں کو نہ کر دیں مسدود

رنگ کے نسل کے، دولت کے، سیاست کے صنم
پھر نہ بن بیٹھیں کہیں نوعِ بشر کے معبود

گزشتہ سطور میں سماج اور ادب کے رشتہ کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ اس سے مراد یہ تھی کہ زندگی کا کوئی مسئلہ ادب کے دائرے سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس طرح ادب بھی زندگی سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ یقین دین خواہ شعوری ہو یا غیر شعوری مگر اس کے اثرات نمایاں رہیں گے۔ احترامِ انسانیت ہو یا عظمتِ انسانی کے قصیدے، ان کو ادب نے، خصوصاً شاعری نے اپنی بے لاگ رائے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بقول نیاز فتح پوری:

"ہر چند اقوام کے مختلف خصائص، افراد کے مختلف
مزاج اور ملکوں کے مختلف سیاسی اور معاشرتی
حالات ادب کی مختلف شکلیں پیدا کرتے رہتے ہیں
لیکن ان میں ادب کی کوئی شکل ایسی نہیں ہے جس
میں رواجِ انسانی کا اظہار نہ کیا گیا ہو۔ جس میں مسلّمات
حیات کی تشریح نہ کی گئی ہو۔"

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اردو شاعری کی کوئی صنفِ سخن ہو اس میں احترامِ انسانیت کے تعلق سے عظمتِ انسانی کے ترانے گائے گئے ہیں۔ اس سے زیادہ انسانیت کا احترام اور عظمت کیا ہوگی۔ خدا اپنے بندوں کے بھیس میں بندوں کی آزمائش کے لیے آنا پسند کرتا ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن اللہ اپنے بندوں سے پوچھے گا کہ میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ میں برہنہ تھا تم نے مجھے کپڑے نہیں دیے۔ بندے عرض کریں گے کہ خداوندا تو ان چیزوں سے بے نیاز ہے بھلا تجھ کو ان کی کیا حاجت؟ ارشاد ہوگا کہ میرے بندے بھوکے، پیاسے اور برہنہ تمہارے دروازے پر آئے ان کا دینا میرا ہی دینا تھا۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے ان جذبات کو شعر کے جامہ میں ڈھال دیا ہے۔

غمِ انساں کا دے کر وہ کہتے ہیں مجھ سے
یہ غم ہے ہمارا اِسے کھو نہ دینا

اگر جذبۂ شوق بے چین کر دے
کسی لٹ کے دل میں ہمیں ڈھونڈ لینا

ہم آئیں گے اس طرح سے بھیس بدلے
تمہاری نظر کو خبر بھی نہ ہوگی

نہ پہچان پائے تو اتنا سمجھ لو
شبِ ہجر کی پھر سحر بھی نہ ہوگی

میر کی شاعری کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے، اُنھوں نے اس صحت مند تضاد پر بھی غور کیا ہوگا کہ زندگی کی تمام منفی روایتوں پر ایمان کے باوجود جب وہ "انسان کا ذکر کرتے ہیں تو وہی منفی لہجہ اثبات میں بدل جاتا ہے۔ ان اشعار کو پڑھیے تو محسوس ہوگا کہ اعتماد اور ایقان ایک مستحکم نظریہ کی حیثیت سے میر کے دیوان کا عنوان بن گئے ہیں۔

اب ایسے ہیں کہ صانع کے مزاج اوپر بہم پہنچے
جو خاطر خواہ اپنے ہم ہوئے ہوتے تو کیا ہوتے

ثباتِ قصر و در و بام و خشت و گل کتنا
عمارتِ دلِ درویش کی رکھو بنیاد

مت رنجہ کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد
دل ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

پہلے اور آخری شعر میں عظمتِ انسانی کا ذکر ہے اور دوسرے تیسرے اشعار احترامِ انسانی کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ انسانیت کے اس احترام نے میر کی شاعری کو قنوطیت کی دلدل میں پھنسنے نہیں دیا۔ عظمتِ انسانی کا یہ تصور کبھی کبھی اپنا رُخ بھی بدل دیتا ہے۔ میر وسعتِ کائنات کو سمیٹ کر اس کا رُخ اپنی ذات کی طرف کر دیتے ہیں۔ میر کی انا اور احساسِ تفاخر اسی عظمتِ انسانی کا دوسرا رُخ ہے۔

برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب، صاحب نظر بنے ہے

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اس قسم کی مثالیں میر کے کلام سے فراہم کی جاسکتی ہیں۔ انسان کی ذات پر اعتماد میر کی شاعری کا مزاج ہے وہ اس میر سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں۔ جو ناکامیوں سے کام لینے کو زندگی کا حاصل خیال کرتے تھے۔

اس عہد کے دوسرے شاعر خواجہ میر درد کا نام بھی اس ضمن میں اہم ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ تصوف نے اردو اور فارسی شاعری میں نفی خودی کی تعلیم دی ہے۔ مگر تصوّف کی اصل روح انسانیت کا احترام ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایرانی اثرات کی جڑوں کو جس ملک نے سب سے زیادہ مضبوط کیا وہ ہندوستان ہے، مگر اسی کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ہندوستان میں اسلامی تجربات کے اظہار کی نمایاں صفت یہ رہی ہے کہ شاعر فخر کے ساتھ لفظ "انا" کا استعمال کرتا ہے۔ خواجہ میر درد صوفی تھے اور ان کا تصوف دوسرے نظریۂ تصوف رکھنے والوں سے اس لیے مختلف ہے کہ اُنھوں نے تصوف کو فلسفہ کی موشگافیوں سے بچانے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔

باوجودے کہ پر و بال نہ تھے آدم کے
وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

نہیں مذکور شاہاں نزد ہرگز اپنی مجلس میں
کبھو کچھ ذکر آیا بھی تو ابراہیم ادہم کا

یوں تو کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں جو ذاتِ واجب کے ظہور کی جلوہ گاہ نہ ہو۔ اور کون ہے جو اپنے وجود کی شناخت کے لیے اس ذات کا محتاج نہ ہو۔ مگر انسان کو ان سب میں ایک خاص خصوصیت حاصل ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا مظہر ہونے کی وجہ سے .... اس کی ذات سے وابستہ ہے۔ اور اسی کے ساتھ اس کا ظہور ہماری وجہ سے ہے۔ شرف انسانی اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ اللہ نے اس کو احسن التقویم کے لقب سے نوازا اور خلیفہ مقرر کیا۔

باغِ جہاں کے گُل ہیں یا خار ہیں تو ہم ہیں
گر یار ہیں تو ہم ہیں، اغیار ہیں تو ہم ہیں

اس سلسلے میں ایک اہم نام غالب کا بھی ہے۔ غالب کی شخصیت بڑی عجیب و غریب ہے۔ کون نہیں جانتا کہ غالب وہ شخص ہے جس نے ہندوستانی مسلمانوں کی شکست خوردہ عجمی روایات کو زندہ رکھنے کی کوشش

کی ہے اور اس عجمیت کی بدولت وہ ایک طرف عربی عناصر سے غیریت برتتا ہے اور دوسری طرف میں اپنے آپ کو بیگانہ نہیں تو ممتاز ضرور خیال کرتا ہے۔

ع: غالب از خاکِ کدورت خیز ہندم دل گرفت

محض اس کا اندازِ بیان نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے غالب کا پورا ذہن کام کر رہا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ امر بھی دلچسپی کا باعث ہے کہ غالب کا تصوف تزکیۂ نفس کے لیے کم اور اپنے تحفظ کے لیے زیادہ ہے۔ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی میں عرض یہ کر رہا تھا کہ اگر یہ تسلیم کر لیں کہ غالب کے تصوف پر ان کی انا چھائی ہوئی تھی تو شاید یہ بات غالب کے مزاج سے قریب ہو کہ اس انا کی روشنی میں وہ کچھ آفاقی تجربات بھی کر رہے تھے۔ جن میں اخلاقی مضامین بھی ہیں اور احترامِ انسانیت بھی۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

عشق و مزدوریِ عشرت گہہ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اس محدود وقت میں یہ بات ممکن نہیں کہ ہر شاعر کے یہاں ان اثرات کی نشاندہی کی جائے۔ مگر جی چاہتا ہے کہ فانی کے بعض اشعار کی طرف توجہ دلاؤں۔

وہاں سجدے سے اب تک قدسیوں کے سر نہیں اُٹھے
پڑا تھا جس جگہ راہِ محبت میں قدم میرا

مجھ سے ہر جلوے نے سیکھا امتیازِ قلب و سنگ
ورنہ حُسنِ دوست کا، آگے تو یہ عالم نہ تھا

تا عرضِ شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ
اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دُور

وہ پائے شوق دے کہ جہت آشنا نہ ہو
پوچھوں نہ خضر سے بھی کہ جاؤں کدھر کو میں

مندرجہ بالا اشعار اس شاعر کے ہیں جس کو "یاسیات کا امام" کہا جاتا ہے اور اس کے اشعار کو تو جوان ولولوں اور حوصلوں کے لیے زہر قاتل سمجھا جاتا ہے۔ مگر جب بات انسانی خودداری کی ہوتی ہے تو غم کی ان تاریکیوں میں خود اعتمادی کی روشنی پیدا ہو جاتی ہے۔

فانی کا انتخاب میں نے خاص طور پر اس لیے کیا کہ ان کی شخصیت اور شاعری پر تنقیدی تعصب کے بہت سے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ عرفانِ غم کو لوگوں نے گور و کفن کی شاعری سے تعبیر کیا اس وقت فانی کے یہاں غم کی نوعیت سے بحث مقصود نہیں۔ عرض صرف اس قدر کرنا ہے کہ ہماری شاعری کے دو غم نصیب شاعر (میری مراد میر اور فانی سے ہے) جب انسانی فتوحات پر نظر ڈالتے ہیں تو دل پر انسانی عظمت کا نقش بیٹھ جاتا ہے۔ ان کے یہاں اس کا اظہار کبھی "حدیثِ دیگراں" کی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی خود کو نمائندہ خیال کر کے "انا" کے میدان میں اُتر جاتے ہیں۔

شرفِ انسانی کے اظہار میں اقبال کا نام بے حد اہم ہے۔ اقبال اسلامیات کے حوالے سے انسان دوستی کا سبق دیتے ہیں۔ ان کے اس پیغام میں جدوجہد بھی ہے اور پیغامِ اخوت بھی۔ وہ حرکت و عمل کو کائنات کے ارتقاء اور زندگی کے تحفظ کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔ روحِ ارض آدم کا استقبال کرتی ہے۔ "مومن" "مردِ مسلمان" "مردانِ خدا" وغیرہ یہ سب اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ غزلوں میں بھی یہی روح کارفرما ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے دہقاں ذرا
دانہ بھی تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

اقبال کی نظر مشرق اور مغرب کے سماجی اور سیاسی حالات پر برابر لگی رہی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ جذبۂ انسان دوستی کی بنا پر انسانیت کے دُکھ درد کا مداوا اسی راستے سے تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسی لیے کبھی وہ مغرب کی مادہ پرستانہ اور تاجرانہ تہذیب کی سست بنیادی کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور کبھی مشرق کی زبوں حالی، غلامی اور عیوب کا سبب جمہوری نظام کو قرار دیتے ہیں۔ ان سب کا مقصد تکریمِ انسانیت ہے۔ "مثنوی پس چہ باید کرد" اقبال کے اسی نظریے کی ترجمانی کرتی ہے۔ اقبال اشتراکیت کی بعض جگہ تائید کرنے کے باوجود تعمیرِ انسانیت کے لیے اس کو

(بقیہ صفحہ پر)

شارب ردولوی



ایک مردم خیز خطہ : ردولی

ایسا کون سا شہر یا قصبہ ہوگا جس کی اپنی کوئی خصوصیت نہ ہو، لیکن ردولی کی کچھ بات ہی الگ ہے۔ اس کا نام آتے ہی تاریخ کے کتنے صفحے نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں اور میرؔ کا یہ شعر اپنی تمام تہہ داریوں کے ساتھ یاد آنے لگتا ہے : ؎

جہاں سے دیکھیے اک شعرِ شور انگیز اُٹھے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیوان میں

ردولی کا ذرہ ذرہ شعرِ شور انگیز کی مثال ہے۔ آج بھی کان لگا کر سنیے تو وہاں کے ذرات کے دلوں کی دھڑکن میں آریوں کی آمد سے لے کر آج تک کی تاریخ سنائی دے گی۔ جدید ہندوستان کے نقشے میں وہ خواہ کتنا ہی موہوم نقطہ کیوں نہ ہو، لیکن یہ سرزمین آریوں کی پہلی سلطنت کوشل راج کا ایک اہم حصّہ تھی۔ اس نے راجہ دشرتھ کی حکومت، رام چندر جی کا بن باس اور ان کی واپسی کو قریب سے دیکھا تھا۔ اودھ کے دارالسلطنت فیض آباد سے بہت قریب ہونے کی وجہ سے یہ ہمیشہ صاحبِ نظر اور اہلِ علم حضرات کا مرکز رہی۔ اور جب شجاع الدولہ کے زمانے میں اودھ کا دارالسلطنت لکھنؤ منتقل ہوا تو اس کے راستے تہذیب اور علم و ادب کے کارواں لکھنؤ گئے اس نے اودھ کی تہذیب کو بنتے اور فروغ پاتے دیکھا۔ لکھنؤ اور فیض آباد دونوں جگہ سے قربت نے اسے خود ایک تہذیبی مرکز بنا دیا۔

ردولی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہاں کی تمام آبادی تعلقداروں اور زمینداروں پر مشتمل تھی۔ معاشی اطمینان اور فراغت کی وجہ سے ہر گھر میں علم و ادب کا چرچا تھا۔ ہر شخص شاعر، ادیب اور انشا پرداز تھا۔ اس سرزمین کی برتری یہ بھی رہی ہے کہ بہت سے صوفیہ نے اسے اپنی تعلیم و تربیت کا مرکز بنایا۔ یہیں سے محبتوں کے وہ سوتے پھوٹے جن سے سارا ملک فیض یاب ہوا۔ اور جن کے فیوض و برکات کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ نہ جانے کتنے پریشان حال، شکستہ دل، نا امید، آج بھی ان درگاہوں سے اپنی مرادیں پاتے ہیں۔ یہ درگاہیں جہاں ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی، بودھ اور جینی سب یکساں عقیدت کے ساتھ آتے ہیں اور منتیں مانتے اور مرادیں پاتے ہیں۔ یہاں کے سب سے مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ احمد عبدالحق تھے جو مخدوم صاحب کے نام سے مشہور ہیں۔ مخدوم صاحب صابری چشتی سلسلے کے بزرگ ہیں۔ ہندوستان کے صوفیہ کی تاریخ میں ان کا بہت اہم مقام ہے۔ اردو زبان کی نشو و نما کے سلسلے میں بھی ان کا نام لیا جاتا ہے۔ عرس کے زمانے میں پندرہ دن شب و روز قوالی کی محفلیں ہوتی ہیں۔ اس درگاہ میں دو سجادہ نشین ہیں۔ ایک شاہ ابی احمد صاحب مرحوم کے بیٹے شاہ حماد احمد صاحب ہیں اور دوسرے شاہ آفاق احمد مرحوم کے پوتے شاہ عمار احمد نیر میاں ہیں۔

یہاں کی دوسری درگاہوں میں شیخ سیاح کی درگاہ بہت اہم ہے۔ آپ کا نام شیخ صلاح الدین سہروردی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کی درگاہ پر پاگل اور دیوانے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں اکثر ہم لوگ شیخ سیاح کی درگاہ ان پاگلوں کو دیکھنے جاتے تھے، جو ان کی درگاہ کے باہر کھونٹوں سے باندھ دیے جاتے تھے۔

شیخ صفی الدین، شیخ محمد اسماعیل، شیخ سماع الدین، شیخ محمد صالح کے فیوض کے چشمے اسی سرزمین سے جاری ہوئے۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا تعلق بھی ردولی سے تھا، جو بعد میں کرنال چلے گئے اور وہاں سے آکر گنگوہ میں سکونت اختیار کرلی۔ انہیں بزرگوں کی وجہ سے لوگ ردولی کو

D5/18 ماڈل ٹاؤن، دہلی ۱۱۰۰۰۹

احتراماً ردولی شریف کہتے ہیں۔ لیکن بزرگوں کا تذکرہ سید سالار مسعود غازی اور زہرہ بی بی کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ کہتے ہیں کہ زہرہ بی بی ایک نابینا لڑکی تھی۔ سیّد سالار کا جب ایک بار گزر ردولی سے ہوا تو وہ ان کے پاس گئیں اور ان کی دعا سے ان کی آنکھوں میں روشنی آگئی۔ انہوں نے سید سالار سے شادی کی درخواست کی۔ سیّد سالار نے بہرائچ کے جہاد سے واپسی پر شادی کا وعدہ کیا، لیکن وہ وہیں شہید ہو گئے۔ زہرہ بی بی نے ان کا روضہ تعمیر کرایا۔ ردولی میں اسی روضے کی ایک اینٹ لاکر دفن کی گئی اور ہر سال جیٹھ کے مہینے میں پہلے اتوار کو وہاں میلہ لگتا ہے۔ دُور دُور سے لوگ پیدل چل کر اس میلے میں آتے ہیں۔ یہ آنے والے بڑے بڑے سجے ہوئے بانس لیے ہوتے ہیں۔ جن کے اوپری حصّے میں لمبے بال بندھے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ 'جلفے' والے کہلاتے ہیں۔ جلفے زلفوں کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ ان کی حیثیت سید سالار کے باراتیوں کی ہوتی ہے۔ یعنی وہ زہرہ بی بی سے سیّد سالار کا عقد کرانے کے لیے آتے ہیں۔ اسی رشتے سے قصبے کے تمام شرفا اور روٗسا قصبے کے باہر ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہوتے تھے۔ اور یہ آنے والے انہیں کنکریاں مارتے اور مذاق کرتے ہوئے قصبے میں داخل ہوتے تھے۔ آدھی رات میں عقد کے وقت اس کا اعلان ہوتا ہے کہ چھپکلی لگ جانے یا قمر در عقرب کے شروع ہو جانے کی وجہ سے نکاح نہیں ہو سکتا۔ اس لیے صبح یہ سب زہرہ بی بی کے جہیز کا سامان لے کر جس میں ایک پلنگ اور ایک پیڑھی ہوتی ہے بہرائچ چلے جاتے ہیں۔ آج بھی جب تک یہ سامان بہرائچ نہ پہنچے وہاں سید سالار کا عرس شروع نہیں ہو سکتا۔

ردولی کی تہذیبی زندگی میں مخدوم صاحب کے عرس اور محرم کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ یہ دو موقعے ایسے ہیں کہ تمام اہلِ ردولی جمع ہو جاتے ہیں اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ بلا تفریق ہر شخص وہ خواہ شیعہ ہو یا سنّی، ہندو ہو یا مسلمان ان میں شریک ہوتا ہے۔ چودھری ارشاد حسین مرحوم کا امام باڑہ اور سجاوٹ خوب صورتی اور آراستگی میں بے مثال ہے۔ لوگ دُور دُور سے اس امام باڑے کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ ۲ محرم کی شب میں یہاں سے تعزیے کا جلوس نکلتا ہے جسے دیکھنے کے لیے قرب و جوار کے لوگوں کا ایسا زبردست مجمع ہوتا ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ ۴ محرم کو چودھری عیوض علی کے امام باڑے سے جلوس نکلتا ہے۔ ۷ محرم کو بڑے امام باڑے سے جو صفی امام باڑہ بھی کہلاتا ہے، مہندی اٹھتی ہے جو درگاہ حضرت عباس جاتی ہے۔ ۸ محرم کو علم کا ایک بہت بڑا جلوس محلہ بنگلہیہ سے اٹھتا ہے جس کے دیکھنے کے لیے دیہات کی عورتیں سرِ شام سے آکر سڑک کے کنارے بیٹھ جاتی ہیں اور ساری رات 'دہے' روتی رہتی ہیں۔ یہ عورتیں زیادہ تر ہندو ہوتی ہیں۔ ۹ محرم کو ہر امام باڑے میں روشنی ہوتی ہے۔ چودھری ارشاد حسین مرحوم کے امام باڑے کی روشنی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ۹ کی شب میں چھوٹے چھوٹے لڑکے مخصوص طرح کے سفید کپڑے پہنے اور سفید پگڑیاں باندھے امام باڑوں کا گشت کرتے رہتے ہیں یہ سبک کہلاتے ہیں جو جناب صغریٰ کے پیغام بر سمجھے جاتے ہیں۔ یہ اس وقت تک نہ بیٹھتے ہیں اور نہ آرام کرتے ہیں جب تک دوسرے دن تعزیے دفن نہ ہو جائیں۔ سبز و سیاہ کپڑوں میں ملبوس مردوں اور عورتوں سے سڑکیں بھری ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ۱۰ محرم کو مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کے تعزیے بھی جلوس کے ساتھ دودھا دھاری اور امام باغ میں دفن ہوتے ہیں۔

دودھا دھاری کا نام آیا تو اس کا تھوڑا سا ذکر بھی کر دوں۔ یوں تو موضع وزیر گنج کے پاس یہ ایک غیر آباد جگہ ہے جہاں تعزیے دفن ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ایک بہت وسیع و عریض عمارت ہے جس میں تین مسجدیں چار امام باڑے، ایک پری خانہ ایک جنات خانہ اور کئی صحنچیاں ہیں اور ان میں جانے کے لیے تقریباً دس ہزار زینے چڑھنے پڑتے ہیں۔ یہ عمارت موضع وزیر گنج کے کاشی رام کلوار نے بنائی تھی جس کی قبر اسی عمارت میں موجود ہے کہتے ہیں کہ اس نے ایک رات خواب دیکھا جس میں جنوں نے اسے حکم دیا کہ تم اس طرح کی ایک عمارت بنواؤ اس حکم کے ساتھ اُسے یہ بھی بتایا کہ فلاں فلاں جگہ پر روپیہ ہے۔ تم عمارت کے اخراجات کے لیے وہاں زمین کھود کر روپیہ نکال لو۔ اس نے اس جگہ کو کھودا اور وہاں سے جو روپیہ ملا اس سے اس عمارت کی تعمیر ہوئی۔ اس کے نام کے سلسلے میں ایک عجیب قصہ مشہور ہے کہتے ہیں کہ وزیر گنج سے روزانہ ایک نوجوان عورت دودھ بیچنے قصبے میں آتی تھی اور دودھ بیچ کر واپس چلی جاتی تھی۔ ایک دن موجودہ دودھا دھاری کی جگہ پر ایک بزرگ نظر آئے۔ انہوں نے اس عورت کو بلا کر دودھ مانگا اس نے دودھ دے دیا تو بزرگ نے دعا دی کہ جا تیرا دودھ کبھی ختم نہ ہو۔ وہ عورت حسبِ معمول دودھ بیچنے قصبے میں آئی۔ سارا دن دودھ بیچتی، لیکن دودھ ختم نہ ہوا شام ہونے لگی تو واپس گھر کی طرف چل پڑی۔ اسی جگہ پہنچ کر اسے فکر ہوئی کہ وہ گھر والوں کو کیا جواب دے گی کہ اتنی رقم اس کے پاس کہاں سے آئی جب کہ دودھ اسی طرح موجود ہے۔ مارے ڈر کے اس نے دودھ کی مٹکی زمین پر الٹ دی۔ اس میں سے دودھ کی ایسی دھار بہہ نکلی کہ چاروں طرف دودھ ہی دودھ نظر آنے لگا۔ اس دن سے یہ جگہ دودھا دھاری کے نام سے مشہور ہو گئی۔ یہ عمارت اب بہت شکستہ ہے لیکن دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ معلوم نہیں، اب بھی وہاں پریاں اور جن رہتے ہیں یا نہیں اور رہتے ہیں تو اسی طرح کسی کو روپیوں کی جگہ بتا کر اس کی مرمت کیوں نہیں کراتے۔

ردولی کی تاریخی عمارتوں میں سلیر بابا کا مندر ہے جو بودھ مندر ہے جس کے آثار رفتہ رفتہ ختم ہو گئے ہیں لیکن وہ پتھر موجود ہے جس پر کسی ایسی زبان میں عبارت کندہ ہے جو پڑھی نہیں جاتی اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کسی زمانے میں بودھوں کی بھی آبادی تھی۔ اس کے علاوہ تقریباً نو سو سال پرانا ایک مندر ہے جو دیوکالی کا مندر کہلاتا ہے، جہاں اساڑھ کے مہینے میں میلا لگتا ہے۔ یہاں کی پرانی عمارتوں میں خلیل کی سرائے اور مسجد ہے۔ ایک زمانے تک سرائے میں قیام کرنے والوں کو تین دن تک مفت کھانا ملتا تھا۔ مسجد کے لیے صفی لکھنوی مرحوم نے قطعۂ تاریخ لکھا تھا اور "کعبہ در ہند بنا کرد خلیل" سے تاریخ نکالی تھی۔

ردولی صوفیائے کرام کی طرح ادبا و شعرا کا بھی مرکز رہا ہے۔ یوں تو ہر گھر میں شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ شعری نشستیں، ادبی محفلیں اور مشاعرے عام تھے اور زبان دانی اور شاعری میں یہ دوسرا لکھنؤ تھا۔ یہاں کے قدیم شعرا میں مولوی سید علی، محمد یوسف اثر اور نواب حسن فوق بہت مشہور رہے۔ محمد یوسف اثر کا شمار استادوں میں ہوتا تھا۔ وہ بے حد نفیس خطاط اور طغریٰ نویس تھے۔ فوق مرحوم کا ایک شعر آج بھی زبان زد خاص و عام ہے ؂

یہی نہ ہوگا کہ در در کی خاک چھانیں گے
بس اور اے دلِ خانہ خراب کیا ہوگا

مرتضیٰ احمد مطیر کہنہ مشق اور خوش گو شاعر تھے اور قرب و جوار میں ان کے شاگرد پھیلے ہوئے تھے۔ بڑے کروفر سے مشاعرے میں شعر پڑھتے تھے۔ ان کا ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے۔

اور ہیں گردشِ دوراں سے جو چیخ اٹھتے ہیں
لا زمانے کی مجھے لے سر و سامانی دے

ردولی کے ممتاز شعرا میں مولوی جعفر مہدی رزم بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ وہ دبستانِ دبیر سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے اردو مرثیہ گوئی میں اپنے لیے ایک نئی راہ پیدا کی تھی۔ حکیم محمد واصف ردولوی کا شمار اچھے قصیدہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ اردو کے مشہور ترقی پسند شاعر مجاز ردولی میں پیدا ہوئے اور یہیں ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ انہوں نے اپنے انتقال سے ایک دن پہلے ان لوگوں کی شکایت کرتے ہوئے جو انہیں لکھنوی کہتے تھے مجھ سے کہا تھا کہ میں لکھنوی کیسے ہو گیا اور پھر بڑی حسرت سے یہ شعر پڑھا تھا۔

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

اور یہ آخری شعر تھا جو مجاز کی زبان سے ہم لوگوں نے سنا تھا، اس لیے کہ دوسرے دن شاعرِ شہیر نگاراں علی گڑھ یونیورسٹی کے ترانے کا خالق اور اپنے عہد کا سب سے مقبول شاعر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا تھا۔ اسی سرزمین سے مشہور شاعر اور نقاد باقر مہدی تعلق رکھتے ہیں جو کھرے انسان بھی ہیں اور کھرے شاعر بھی اور یہیں سے تعلق تھا مسعود اختر جمال کا جو ترقی پسند گروہ میں اپنی نرم اور دل کش شاعری کے لیے مشہور تھے۔ ان کی غزلوں میں زندگی لہریں لیتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ ردولی کے دوسرے مشہور شعرا میں صادق المشیر جامی، نسیم انصاری، محمد عمر اختر، سید اشرف نجم، شبیر حسین کاظمی اور ذبیار ردولوی تھے۔ مولوی اختر ایک خوش گو اور کہنہ مشق شاعر تھے، لیکن خود کبھی اپنے شعر نہیں پڑھتے تھے بلکہ غزلیں کہہ کر شاگردوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ آج کے شعرا میں ممتاز علی احمر، نقی شبیر نقی، شاہ مبین احمد منظر، شاہ اقبال ردولوی، ماترہ دت کیف، بدری پرشاد سلوک اہمیت رکھتے ہیں۔

ہزلیہ شاعری میں بھی ردولی کے شعرا کسی سے پیچھے نہیں، ہزلیہ شاعری کا یہ سلسلہ میاں چرکین سے شروع ہوتا ہے۔ میاں چرکین کا نام جعفر علی تھا اور محلہ خواجہ مال کے رہنے والے تھے۔ وہ بہت اچھے شاعر تھے۔ لیکن لوگ ان کا کلام چرا کر مشاعروں میں پڑھ دیتے تھے، اس لیے انہوں نے ایسا رنگ اختیار کیا کہ کوئی اسے اپنا نہ کہہ سکے۔ اور اس رنگ میں بھی ایک تاریخ بنا گئے۔ محمد عقیل مفلس اور امتیاز علی تمیز بھی اپنے زمانے کے مقبول ہزل گو تھے اور عزمی ردولوی آج کے ممتاز ہزل گو ہیں، جن کا کلام اخبارات و رسائل میں برابر شائع ہوتا رہتا ہے۔ یہ افسانہ نگار بھی ہیں اور ایک ناول شکیلہ بیگم شائع ہو چکا ہے۔

شاعری کی طرح نثر نگاری میں بھی ردولی نے تاریخ ساز ہستیاں پیدا کی ہیں۔ مولوی محمد حلیم انصاری عربی کے جید عالموں میں تھے۔ ان کے عربی مضامین مصر کے اخبارات و رسائل میں اور اردو کے مضامین الہلال اور البلاغ میں شائع ہوتے تھے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف اور مترجم تھے۔

ردولی کی سب سے بڑی ادبی شخصیت چودھری محمد علی ردولوی کی تھی۔ اردو کی پوری تاریخ میں چند ہی ادیب ایسے گزرے ہیں جنہیں Man of Letters کہا جا سکتا ہے۔ چودھری محمد علی کی شخصیت ان میں سے ایک تھی۔ وہ ایک صاحبِ طرز انشا پرداز اور افسانہ نگار تھے۔ غالب کے بعد اردو مکتوب نگاری میں ان کا کوئی جواب ملنا مشکل ہے۔ ان کے خطوط کا مجموعہ "گویا دبستان کھل گیا" کے علاوہ ان کی آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں گناہ کا خوف، کشکول محمد علی شاہ فقیر اور میرا مذہب ان کی اہم تصنیفات ہیں۔ چودھری صاحب کے علاوہ ردولی کی اہم شخصیتوں میں شاہ معین الدین احمد ندوی کا نام آتا

ہے جو معارف کے ایڈیٹر عربی کے جید عالم اور مورخ تاریخ اسلام سیرت صحابہ، علمی نقوش، خلفائے راشدین، اسلام اور عربی تمدن، دینِ رحمت، تابعین اور تبع تابعین اور حیاتِ سلیمان کے مصنف تھے۔ شاہ معین الدین احمد ندوی کا سلسلۂ نسب شیخ العالم شاہ احمد عبدالحق رح سے ملتا ہے۔

اردو کی جدید تاریخ میں جن لوگوں کو محقق و نقاد کا مرتبہ حاصل ہے، ان میں ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی ایک اہم شخصیت ہیں۔ داغ، میر، اور آتش پر ان کی کتابوں کے علاوہ ان کے تحقیقی مقالے شبلی ایک دلبستان، گلہائے داغ، صہبائے مینائی اور آتش کدہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر خورشید نعمانی اور ڈاکٹر مسعود حسن رضوی کی کئی تحقیقی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ اور مولانا آزاد کے مشہور محقق اور کئی کتابوں کے مصنف محمد عتیق صدیقی بھی ردولی کے رہنے والے تھے، جن کا شمار اردو کے ممتاز محققوں میں ہوتا ہے۔

ردولی کی یہ کہانی یہاں ختم نہیں ہوتی۔ یہاں کے اطبا میں حکیم غلام حسنین مرحوم کی بڑی اہمیت تھی۔ وہ قرب و جوار میں بڑے حکیم کے نام سے مشہور تھے۔ وہ ایک ماہر نباض اور فن طب کے ماہر تھے۔ انہوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں، جن میں خزینۃ اللآلی، ان کے مجربات کا مجموعہ ہے۔ وہ باقاعدہ علم طب کی تعلیم دیتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں حکیم محمد و اور حکیم محمد یونس بہت مشہور تھے۔ حکیم حسن عباس اپنے عہد کے ماہر اطبا اور عالموں میں تھے۔ حکیم مولوی رونق علی زبردست عالم اور طبیب تھے۔ انہوں نے عیسائی علما سے کئی مناظرے کیے اور کتابیں لکھیں یہاں کے ماہرین فن، یہاں کے خوشنویس، یہاں کے مجاہدینِ آزادی کے نام ملک کی تاریخ کا حصہ ہیں۔

ماسٹر لطیف الرحمن، پنڈت ہزاری اور ادریس ترنی نے تحریکِ آزادی میں زبردست قربانیاں دیں۔ ماسٹر لطیف الرحمن، مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کے ساتھیوں میں تھے، لیکن آزادی کے بعد انہوں نے کبھی کوئی عہدہ قبول نہیں کیا۔ انہوں نے قصبہ میں مخدومیہ اسکول قائم کیا جو آج نیشنل انٹر کالج کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں کی وہ شخصیتیں جو ادیب و شاعر نہیں تھیں ایک دبستان تھیں کہ جب گفتگو کرنے لگیں تو "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی" کی کیفیت ہو۔ میر نعمت اور میاں مظہر ایسی شخصیتیں تھیں کہ ان کے پاس بیٹھ کر وقت کا احساس ختم ہو جاتا تھا۔ یہاں کے آم سرخا، لنگڑے، سیندوری، ثمر بہشت اور دسہری، یہاں کے گنے، یہاں کی مٹھائیاں بوندی لڈو، خرمے، حبشی حلوہ، یہاں کی ملائی کی برفی، یہاں کے کھانے، پیڑہ خشکہ، پیاؤ برے، بیرو ری، لچری قیمہ اور دہی کے پیالے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ خدا مغفرت کرے شاہ آفاق احمد مرحوم کہا کرتے تھے کہ یہاں کے لوگ کھاتے نہیں، مزہ لیتے ہیں۔ یہاں کی ہر بات میں نفاست اور سلیقہ ہے۔ یہاں کا بیکنے والا بھی اس طرح سے بات کرے گا کہ آپ حیران رہ جائیں اور کیوں نہ ہو یہ وہ سرزمین ہے جس کی مٹی نے نہ جانے کتنے ولی اللہ، مہاتماؤں اور بزرگوں کے قدموں کو بوسہ دیا ہے۔

بقیہ: اخلاقی اقدار اور اردو ادب

کافی خیال نہیں کرتے۔ لوگ کہتے ہیں کہ آگے بڑھو۔ مادی سرفرازی اسی میں ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ پیچھے چلو اور اس قدر پیچھے چلو کہ چودہ سو برس کا فاصلہ مختصر رہ جائے۔ اسی میں تکریم انسانیت کا راز پوشیدہ ہے۔

یہ عہد بہت سے نظریات اور تحریکوں کا عہد ہے۔ مختلف الخیال لوگ اور جماعتیں مل کر جدا ہو جاتی ہیں۔ اور جدا ہو کر پھر مل جاتی ہیں۔ اس ہنگامی دور میں بھی ان جماعتوں نے انسان کی تلاش ترک نہیں کی ہے۔ انسان کی تلاش کا عمل صدیوں سے جاری ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش ایک لامتناہی عمل ہے، مگر اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ترقی پسند تحریک نے واضح طور پر پہلی مرتبہ فرد اور جماعت کے رشتہ کو زندگی کے مختلف شعبوں کے تعلق سے پیش کیا ہے۔ جوش ہوں یا فیض، مجروح ہوں یا جذبی، فراق ہوں یا مجاز سب کے یہاں ایک ایسے انسان کا تصور ملتا ہے جو بے باک اور جری ہے۔ وہ یہ ہمت رکھتا ہے کہ زمانے کے مسائل اور مصائب کا سامنا کرے۔ وہ انسان کے دکھ اور درد کا اگر مداوا نہیں کر سکتا تو کم از کم ان کے غم میں شریک تو ہو سکتا ہے۔

سیاسی نقطۂ نظر سے نہ سہی مگر سماجی اصلاح کی کوششیں ہر زمانے میں مختلف صورتوں میں ہوتی رہی ہیں۔ اور اس نے آئندہ کے راستے کھول دیے۔ ادب میں اس کا اظہار الفاظ کے پردے میں ہوتا رہا ہے

یہ عہد مشینوں کی حکومت کا ہے عظمتِ انسانی کی جگہ مشینوں کے گن گائے جا رہے ہیں۔ اس تیز رفتار زندگی میں خود انسان مشین بنا جا رہا ہے عظمتِ انسانی، احترامِ انسانیت، خودداری، رواداری یہ سب الفاظ خوابِ پریشان بنتے جا رہے ہیں۔ آج کا المیہ یہ ہے کہ انسان کا رشتہ انسان سے ٹوٹتا جا رہا ہے۔ اگر اس بکھرتی زندگی کی اخلاقی اقدار کے سہاروں سے شیرازہ بندی نہ کی گئی تو انسانیت پر سے اعتماد اٹھ جائے گا۔ ایک انسان دوسرے کے لیے اجنبی ہو جائے گا جب انسان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا تو احترامِ انسانیت کی بات کون کرے گا:

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

یہ صُبح زندہ رہے گی

پچھلی رات کو آدھی ادھوری چاندنی کا اثر اگلی صبح تک قائم رہا۔ صبح جاگا تو سلطان باہو کا کلام میرے ہونٹوں پر تھا

جس تُو بنے نال گُرھتی دیویں اوس تو بنے نال پانی
جہیڑے آئے میل محمد، اوہو آئے مکانی

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ تصوف مجھے ہمیشہ اُداس کر دیتا ہے۔ تصوف کے ذکر سے تسکین تو ضرور ملتی ہے۔ لیکن اداسی کی ہلکی سی پرت دل و دماغ پر جم جاتی ہے۔ کچھ دیر کے لیے اگلی صبح ناشتے کے بعد جب میاں ریاض ہمیں گاڑی میں بٹھا رہے تھے اور ڈرائیور کو ضروری ہدایات دے رہے تھے اور گھر کے لوگ بھی خدا حافظ کہہ رہے تھے تو مجھے جانے کیوں سلطان باہو کے مصرعے ایک بار پھر یاد آ گئے۔ جو لوگ کسی خوشی کے موقع پر جمع ہوتے ہیں وہی لوگ اس وقت بھی جمع ہوتے ہیں جب جنازہ اُٹھتا ہے۔ میں گاڑی کی کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھا ہاتھ باہر نکال کر میاں ریاض اور اُن کے خاندان کے دوسرے افراد کو الوداع ضرور کہہ رہا تھا، لیکن میرا دل اُداس تھا۔ کبھی کبھی ایسا کیوں ہوتا ہے میرے ساتھ؟ میں اس کا جواز نہیں ڈھونڈ پایا تھا اب تک۔ اس کا جواز شاید کبھی ملے گا بھی نہیں۔ گاڑی گیٹ سے باہر نکلی تو میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"گوپال، سگریٹ نکالو یار۔"

"آج صبح صبح سگریٹ کی طلب ہو گئی ذاکر صاحب۔" وہ اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر مجھے دے دیے۔ میں نے سگریٹ سلگا کر دونوں چیزیں اُسے لوٹا دیں۔ میرا خیال تھا ملہوترہ کوئی تبصرہ کرے گا۔ لیکن وہ کچھ نہیں بولا۔ صرف ایک معنی خیز مسکراہٹ سے اُس نے میری طرف دیکھا۔ میں بھی جواب میں صرف مسکرا دیا۔ الفاظ کا سہارا نہیں لیا۔ الفاظ کے سہارے کبھی کبھی سنبھالتے نہیں ڈگمگا دیتے ہیں۔ گاڑی اُنہیں سڑکوں سے گزر رہی تھی جن سڑکوں سے ہم پچھلے کئی دنوں سے گزرتے رہے تھے۔ ایک بار کسی اجنبی نے اپنے قریب سے گزرتے ہوئے ایک بزرگ آدمی کو روک کر اس سے پوچھا تھا۔

"یہ سڑک کہاں جاتی ہے؟"

"یہ تو کہیں نہیں جاتی بھائی صاحب۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے اسے یہیں پڑے ہوئے دیکھا ہے۔"

بزرگ آدمی نے مسکرا کر جواب دیا اور آگے نکل گیا۔

سڑکیں تو وہیں پڑی رہتی ہیں جاتی کہاں ہیں بے چاری۔ جاتے تو ان پر چلتے ہوئے لوگ ہیں۔ اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف۔ کوئی ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہے۔ کوئی صرف سڑکوں کی پیمائش کرتا رہتا ہے۔ اور میلوں کا حساب کرتا رہتا ہے۔ کتنا چل چکا ہے وہ اب تک اُسے ابھی اور کتنا چلنا ہے۔ اپنے آپ سے سوال کرتا ہے اور خود ہی ان کے جواب بھی تلاش کرتا رہتا ہے۔ زندگی کا یہ سفر شاید سوالوں اور جوابوں کا ہی کھاتا ہے۔ یہ کھاتا سفر کے ساتھ کھلتا ہے اور سفر کے ختم ہونے پر اس کے آخری صفحے کے نیچے لکیر کھینچ دی جاتی ہے حساب ختم ہوا۔

میں یہی سوچتا رہا اور جب سگریٹ کا آخری حصہ کھڑکی سے باہر پھینکا تو محسوس کیا کہ اس کے ساتھ ہی میں نے دماغ پر پڑا ہوا بوجھ بھی اُتار پھینکا تھا۔

شاہدرہ، کالا شاہ کاکو، مریدکے، کاموکے اور امین آباد سے گزر کر ہم گوجرانوالہ پہنچ گئے تھے۔

"آپ کو یہاں ایک بہت اچھے دوست سے ملواؤں گا ذاکر صاحب۔" ملہوترہ نے ڈرائیور کو بازار کی طرف گاڑی گھمانے کو کہا۔ گاڑی ایک ٹریول ایجنسی کے سامنے رُک گئی۔ ہم سب گاڑی سے

اُترے اور ملہوترہ کے ساتھ دُکان میں داخل ہوئے میز کے سامنے ایک بڑا ہی اسمارٹ نوجوان بیٹھا تھا۔ ملہوترہ کو دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور بڑی محبت سے ہاتھ ملایا۔ ملہوترہ نے پھر ہم سب کا تعارف کرایا۔ چند ہی لمحوں میں وہ نوجوان بڑا بے تکلف ہوگیا۔ اس کا نام حبیب الرحمٰن تھا۔ اور وہ ایک ائیر ٹریول ایجنسی چلا رہا تھا اور اس کے پاس کئی ایجنسیاں ہیں۔ میں نے چائے پی اور دوسرے ساتھیوں نے ٹھنڈا مشروب۔ حبیب الرحمٰن کو سیاست سے بڑی دلچسپی ہے۔ لیکن وہ سیاست میں سرگرم طور پر شریک نہیں ہے۔ اس سے بڑی جم کر گفتگو ہوئی۔ اس کے خیال میں بھی پاکستان کے نظام میں تبدیلی کی ضرورت تھی۔ کئی دن پاکستان میں رہ کر اور مختلف لوگوں سے بات کرنے کے بعد یہ اندازہ تو ہوگیا تھا کہ لوگ اب پرانے نظام سے مطمئن نہیں تھے۔ انتخابات میں اب ایک ہی دن تو رہ گیا تھا۔ عوام کا زیادہ رجحان پاکستان پیپلز پارٹی کی طرف تھا۔

ہم حبیب الرحمان کے پاس زیادہ دیر نہیں رُکے۔ ہمیں شام سے پہلے پہلے جہلم پہنچنا تھا۔ جہاں امداد بھاٹی بڑی بے صبری سے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہم نے حبیب الرحمٰن سے اجازت لی اور اُس نے ہر ایک سے بغل گیر ہو کر خدا حافظ کہا۔ دُکان سے باہر نکلے تو سامنے پاکستان پیپلز پارٹی کا ایک بہت بڑا بینر نظر آیا۔ سڑک کے آر پار۔

لوگوں کو انصاف ملے گا
عزت، روٹی، راج ملے گا

عوام کو اگر یہ چیزیں مل جائیں تو وہ اور کچھ مانگیں گے ہی نہیں۔ اُن کی بنیادی ضرورتیں یہی تو ہیں۔

ہمارے سفر کا اگلا پڑاؤ گجرات تھا۔ جہاں مجھے شریف کنجاہی سے ملنا تھا۔ اطلاع اُسے مل چکی تھی۔

بازار سے نکل کر جب گاڑی شاہراہ پر آئی تو میں نے ملہوترہ سے کہا۔

"گوجراں والہ کے قریب گکھڑ بھی تو ہے؟"

"بس یہی آٹھ دس کلومیٹر ہے۔"

"ذرا سڑک پر ایک منٹ کے لیے گاڑی رُکوا لینا وہاں۔"

"رُکوا لیں گے کوئی خاص بات ہے؟"

"کسی زمانے میں گورنمنٹ نارمل اسکول گکھڑ بہت مشہور تھا۔ استاد یہیں ٹریننگ حاصل کرتے تھے۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"میرے ایک رفیقِ کار تھے۔ لالہ جگدیش راج ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ ہریانہ میں وہ اسی اسکول کے طالب علم رہ چکے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اسکول کے باہر بورڈ پر بڑے موٹے موٹے الفاظ میں ایک جملے کے دو ٹکڑے ہمیشہ لکھے رہتے تھے۔"

"کیا جملہ تھا وہ؟"

"دنیا ایک بہترین کتاب ہے
اور زمانہ ایک بہترین اُستاد۔"

"بہت ہی خوبصورت جملہ ہے۔" ملہوترہ نے بڑے کھُلے دل سے تعریف کی۔

"میں نے لالہ جگدیش راج کے لیے اسے اس طرح بدل دیا تھا۔

"عورت ایک بہترین کتاب ہے
اور روقت ایک بہترین استاد۔"

"یہ پہلے سے بہتر ہے۔" ملہوترہ، نیگی اور گوپال تینوں ایک ساتھ بولے:

"اس جملے کو بدلنے کی بھی ایک کہانی ہے۔"

"وہ کیا؟" میرے پہلو میں بیٹھا نیگی بولا۔

لالہ جگدیش راج بڑا ہی معصوم قسم کا آدمی تھا۔ اب تو بیچارے کو مرے ہوئے بھی کئی سال ہوگئے ہیں۔ اعداد و شمار کا بہت بڑا ذخیرہ تھا اس کے پاس۔ ہمیں جب بھی کبھی کسی تعلیمی کمیشن کی سفارشات کا حوالہ دینے کی ضرورت پڑتی، لالہ جگدیش راج سب کچھ زبانی بتا دیتا۔ وہ حساب کتاب کا بھی بڑا پکا تھا۔ اُس نے ایک رجسٹر بنا رکھا تھا۔ جس میں جب سے اُس نے ملازمت اختیار کی تھی، اپنی تنخواہ، جی پی ایف، مہنگائی بھتہ، سب طرح کی تفصیلات مہینہ وار درج تھیں۔ وہ روزانہ ڈائری لکھتا تھا جس میں اخراجات کی تفصیل ہوتی تھی اور کچھ نہیں۔ میں نے ایک دفعہ حساب کتاب کی اتنی زیادہ تفصیلات رکھنے کے بارے میں پوچھا تو اُس نے کہا۔ سبکدوشی کے وقت یہ تفصیلات بہت کام آتی ہیں۔ ورنہ تو پینشن طے ہونے میں مہینوں لگ جاتے ہیں۔ لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ بیچارے کے ریٹائر ہونے کے کچھ ہی دن بعد موت ہوگئی۔ پینشن کے حساب کے لیے اس کا رجسٹر کام ہی نہ آسکا

"لیکن وہ جملہ بدلنے کی بات تو بیچ میں ہی رہ گئی۔" نیگی بولا۔

"دفتر میں میرا کمرہ اس کے کمرے کے ساتھ تھا۔ مجھے ابھی ٹیلی فون نہیں ملا تھا، اس لیے میں اسی کا ٹیلی فون استعمال کرتا تھا۔ دن میں کئی بار اس کے کمرے میں جانا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی میں کہتا۔ "لالہ جی چائے تو پلواؤ۔" جواب ملتا "آج میں بہت مصروف ہوں۔ کل پلواؤں گا۔" ویسے تم چائے بہت پیتے ہو۔ چائے صحت کے لیے بڑی نقصان دہ ہوتی ہے۔ پھر لالہ جگدیش بہت زور سے ہنستا اور میں ٹیلی فون پر بات کرنے کے بعد اپنے کمرے میں لوٹ آتا۔ لیکن ایک وصف تھا اس میں اگر کوئی عورت اس سے ملنے آجاتی تو وہ اُسے چائے ضرور پلاتا اور کینٹین سے کچھ کھانے کو بھی ضرور منگواتا۔ اس وقت اگر میرا کوئی ٹیلی فون آتا تو وہ کہہ دیتا کہ اس وقت وہ ایک میٹنگ میں تھا۔ ٹیلی فون کوئی گھنٹہ بھر بعد کر لینا۔ اس وقت وہ کسی کو نہیں بلاتا تھا۔ لیکن میں کبھی کبھی شرارت کی غرض سے اس کے کمرے میں چلا جاتا جب وہ کسی لیڈی وزیٹر کے ساتھ چائے پی رہا ہوتا لیکن اس سے وہ زور سے ہنستا اور چائے پیش کرتا۔ میں یہ جواب دے کر اپنے کمرے میں آجاتا کہ میں نے بھی چائے منگوا رکھی تھی۔ ایسے ہی ایک لمحہ میں جب

[illegible] وزیر جلدی جلدی میں چائے پی کر اٹھ کر جا چکی تھی تو میں لالہ جگدیش راج کے کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

لالہ جی کو وہ گورنمنٹ ہائی اسکول گکھڑ کے باہر بورڈ پر ہر وقت ایک جملہ لکھا رہتا تھا۔ وہ کہا تھا لالہ جگدیش راج نے وہ جملہ دُہرایا:

"دنیا ایک بہترین کتاب ہے
اور زمانہ ایک بہترین اُستاد۔"

اگر اس کو بدل کر یوں کر دیا جائے تو کیسا رہے۔

"عورت ایک بہترین کتاب ہے
اور وقت ایک بہترین اُستاد۔"

مگر مشکل یہ ہے کہ نہ تو اچھی کتاب ملتی ہے اور نہ استاد کے پاس فراغت ہوتی ہے۔ "تم بہت بدمعاش ہو۔" لالہ جگدیش راج زور سے ہنستے ہوئے بولا اور میں اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

میری اس بات پر میرے ساتھیوں کے علاوہ گاڑی کا ڈرائیور بھی ہنسنے لگا۔

اسی لمحہ ہم گورنمنٹ نارمل اسکول گکھڑ کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ رُکے نہیں کہ رُکنے کی فرصت نہیں تھی۔

گجرات شہر سے کوئی دو میل پہلے ہی ملہوترہ نے گاڑی رُکوا دی۔

"یہاں کہیں نبی بخش کالونی کا بورڈ لگا ہوگا سڑک پر۔" ملہوترہ نے گوپال سے کہا۔

گوپال گاڑی سے اُتر کر بورڈ تلاش کرنے لگا۔ پھر ملہوترہ، نیکی اور میں بھی باہر آ گئے۔ ملہوترہ نے سڑک کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ ہم ذرا آگے نکل آئے ہیں۔ ہم سب دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے گاڑی کو بیک کیا۔ بس کوئی آدھے منٹ کے بعد ہم نبی بخش کالونی کے سامنے تھے۔ سڑک سے نیچے اُتر کر صابن کی ایک فیکٹری تھی۔ اسی کے بڑے سے گیٹ میں گاڑی داخل ہوئی۔ اس کالونی کا نام نبی بخش صاحب کے نام پر رکھا گیا تھا۔ جو ملہوترہ کے والد کے دوست تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے تینوں لڑکوں نے یہ فیکٹری شروع کی تھی۔ جن میں سے ایک لڑکا پرویز نبی ان دنوں لاہور میں تھا۔ گجرات میں دوسرے دونوں بھائی اس فیکٹری کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔

دو نوجوان صاف ستھری شلوار قمیص پہنے باہر کھڑے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ وہ دونوں بھائی تھے۔ یہ انہیں کی فیکٹری تھی۔ فیکٹری کے پیچھے ہی انہوں نے اپنا مکان بنا رکھا تھا۔

ملہوترہ کو انہوں نے چاچا جی کہہ کر مخاطب کیا۔ اور بڑی عزت سے پیش آئے۔

"شریف صاحب کا کئی بار ٹیلی فون آ چکا ہے۔"

"یہ ہیں ذکر صاحب۔ شریف صاحب کے بہت پرانے دوست۔" ملہوترہ نے میری طرف اشارہ کیا۔ دونوں بھائی بڑے تپاک سے ملے پھر انہوں نے نیکی اور گوپال سے ہاتھ ملایا اور ہم سب کو اپنے دفتر کے اندر لے گئے۔ بڑے بھائی سہیل نبی نے شریف کنجاہی کو ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ ہم پہنچ گئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد سہیل نبی نے ہمیں اپنی فیکٹری دکھائی اور ہم سب کو ان سب صابنوں کے پیکٹ پیش کیے جو ان کی فیکٹری میں بنتے تھے اور جن کی پاکستان اور پاکستان سے باہر بہت مانگ تھی۔

جب تک شریف کنجاہی پہنچا، چھوٹے بھائی نے کھانے کا انتظام کر لیا تھا۔ شریف سے لگ بھگ بیالیس سال کے بعد ملاقات ہو رہی تھی۔ یہ نہیں کہ ہم ایک دوسرے کی ادبی سرگرمیوں سے ناواقف رہے تھے اسی مدت میں شریف کنجاہی نے پنجابی شاعری اور تنقید میں بہت اچھا کام کیا تھا۔ کچھ برس پہلے وہ پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ میں بھی آیا تھا۔ لیکن میں ان دنوں باہر گیا ہوا تھا۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے نہ مل سکنے کا بہت افسوس رہا تھا۔ میں نے شریف کا ملہوترہ سے تعارف کرایا اور اس نے مارچ ۱۹۸۹ء میں انبالہ میں منعقد کیے جانے والے مشاعرے میں شرکت کی بھی درخواست کی۔ پھر بعد میں میں اور شریف باہر لان میں کھڑے باتیں کرتے رہے۔ مجھے کچھ کتابوں کی ضرورت تھی ــــ اس نے کہا کہ جب دو دن کے بعد ہم اسلام آباد سے واپسی پر ادھر سے گزریں گے تو وہ سب کتابیں مجھے دے دے گا۔ کوئی پینتالیس سال پہلے میں نے کنجاہ میں شریف سے اس کی ایک پنجابی کی نظم سُنی تھی۔ میں نے اُسے وہ نظم سنانے کے لیے کہا۔ اس نے وہ نظم سُنائی تو مجھے وہ سارا زمانہ یاد آ گیا۔ جب ہم دونوں شام کو نہر کے کنارے گھومنے جایا کرتے تھے اور پھر ہم دونوں ہی اکٹھے لاہور جایا کرتے تھے۔ اور ادیب دوستوں سے ملتے تھے۔ شریف کنجاہی کی نظم کا ایک حصہ تو مجھے پینتالیس برس سے یاد ہے۔ آپ بھی سُن لیجیے:

میں وَن دا سنگھنا بُوٹا
تے ٹھنڈیاں میریاں چھاواں
تے مِٹھیاں میریاں پیلوں
آ راہیا جھٹ گھُسا لے
آ پیلو میریاں کھا لے
میں وَن دا سنگھنا بُوٹا
تے ٹھنڈیاں میریاں چھاواں
جیون پینڈا ڈونگاں منیاں
پر اینج دُھپے سڑیاں
دُھدل سچکیاں کجھ نہیں بندا
او ہو جھٹ سُہاتے، جیہڑے چھاواں بیٹھ وہا نے
آ راہیا جھٹ گھُسا لے
آ پیلو میریاں کھا لے
مَیں وَن دا سنگھنا بُوٹا
تے ٹھنڈیاں میریاں چھاواں
تے مِٹھیاں میریاں پیلو

نظم کے دوسرے بند میں زندگی کا جو فلسفہ شریف کنجاہی نے پیش کیا ہے اسے میں نے زندگی میں ہمیشہ اپنے سامنے رکھا ہے۔ اسی لیے کبھی فضول کی دوڑ دھوپ اور بیکار کی جدوجہد نہیں کی۔

اس کی وجہ سے اپنی خودداری بھی قائم رہی ہے۔ ہمیں شام تک جہلم پہنچنا تھا، اس لیے شریف کے ساتھ زیادہ وقت نہ گزار سکا۔ بس اس امید پر اس سے رخصت لی کہ دو دن کے بعد اسلام آباد سے واپسی پر یہیں اسی فیکٹری میں ملاقات ہوگی۔ شریف واپس چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے کہا تھا:

"کنجاہ نہیں جاؤ گے؟"

"ایس وار نئیں اگلی وار۔"

وہ اگلی بار کے اس وعدے ہی سے مطمئن ہوکر خدا حافظ کہتے ہوئے چلا گیا۔ ہم فن کار لوگ ان چھوٹے چھوٹے وعدوں کا سہارا لے کر ہی زندگیاں گزار دیتے ہیں۔ جب وہ وعدے پورے ہو جاتے ہیں تو ہماری خوشیوں کا ٹھکانا نہیں رہتا اور جب ٹوٹ جاتے ہیں تو ہم کتنے اداس ہوتے ہیں۔ زندگی گزارنے کے لیے یہ چھوٹے چھوٹے وعدے، یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں، یہ چھوٹے چھوٹے دلاسے، یہ مبہم مبہم بھروسے کتنے ضروری ہیں۔ ان کے بغیر زندگی کتنی بے معنی، حقیر اور بے مقصد ہو جاتی ہے۔

جب ہم گجرات ریلوے اسٹیشن کے سامنے سے گزرے تو میری نظروں کے سامنے کنجاہ کے خوبصورت قصبے کے خدوخال ابھر آئے۔ کچھ ہی فاصلے پر تو وہ قصبہ تھا، جہاں میرا گھر ہوا کرتا تھا۔ اور جس کی ایک گلی میں شریف کنجاہی کا گھر تھا جس کا والد میرے ساتھ ہمیشہ بڑی شفقت سے پیش آتا تھا — شریف کی معصوم سی بچی مجھے کتنا پیار کرتی تھی اور شریف کی بیوی کتنی مروت سے پیش آیا کرتی تھی۔ وہیں ایک گلی میں نیّر خاندان کی حویلی تھی جس میں کبھی لاجپت رائے نیّر کا بچپن گزرا تھا۔ اور جس کے صحن میں بھی پیارے لال نیّر کھیلا تھا۔ یہ وہی پیارے لال تھا جو مہاتما گاندھی کا سکریٹری بنا تھا۔ بعد میں اسی خاندان سے ڈاکٹر سوشیلا نیّر کا تعلق تھا جو آج بھی واردھا کے آشرم کا کام دیکھتی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ہی تو اس کی کتاب

SATYAGRAHA AT WORK

کا اجرا نائب صدر ڈاکٹر شنکر دیال شرما صاحب نے کیا تھا۔ کنجاہ کے باہر کھیتوں میں تو غنیمت کنجاہی کا مقبرہ تھا۔ جس کے بارے میں مجھے شریف کنجاہی نے بتایا تھا۔ لیکن اس بار کنجاہ جانے کا ویزا نہیں تھا میرے پاس۔ اب اپنے گھر کو دیکھنے کے لئے بھی قانونی اجازت ضروری تھی۔

شریف کنجاہی اور میں کبھی گجرات سے استاد امام دین کو کنجاہ لے جایا کرتے تھے اور اسلامیہ ہائی اسکول کے ہال میں اس کی شاعری سنا کرتے تھے۔

ہم اس لیے تندور نہیں تاتے
کہ وہ ہمارے گھر نہیں آتے

میں نے اپنے آپ میں فیصلہ کیا کہ اس بار لاہور سے امام دین کا دیوان "بانگِ دُہل" ضرور لے جاؤں گا۔ حامد حسین میری اتنی مدد تو ضرور کرے گا۔

اسٹیشن سے کچھ دور ہی تو شاہ دولا کا مزار تھا۔ جہاں میں کبھی کبھی جایا بھی کرتا تھا اور شاہ دولا کے چوہوں کو دیکھا کرتا تھا۔ شاہ دولا کے چوہے تقسیم کے بعد نہیں دیکھے۔ ادھر یہاں گجرات میں تو اب بھی ہوں گے۔ گجرات ریلوے اسٹیشن پر اور اس کے باہر وہ ہرے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے فرغل پہنے اکثر گھومتے رہتے تھے۔ وہ ان دنوں خیرات مانگا کرتے تھے۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" ملہوترہ نے مجھے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"شاہ دولا کے مزار کا خیال آگیا تھا۔"

"وہ تو یہاں اب بھی موجود ہوں گے۔"

"آپ نے دیکھے ہیں کبھی شاہ دولا کے چوہے؟"

"میرا تو گجرات میں سگریٹوں کا کاروبار تھا۔ اکثر دیکھے ہیں شاہ دولا کے چوہے۔"

"استاد امام دین سے بھی ملاقات رہی ہوگی آپ کی؟"

ہاں اس سے تو اس کی شاعری بھی سنی ہے۔ باؤ چنگی کی طرف سے گزرتے ہوئے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔

"وقت نہیں ہے ورنہ شہر کا ایک چکر لگانا چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔

"واپسی پر لگائیں گے۔ اس دفعہ جہلم نہیں رکیں گے ہم۔" ملہوترا نے ایک اور امید کا آنچل پکڑا دیا تھا۔

گجرات کا ذکر بغیر مغل حماموں کے ادھورا ہے۔ مغلوں کے زمانے میں یہاں تین حمام تھے جنہیں مغل حمام کہا جاتا تھا اور یہ مغلوں نے بنوائے تھے۔ مغلوں کے قافلے گجرات سے بھمبر اور وہاں سے کشمیر جایا کرتے تھے۔ یہاں ان کا پڑاؤ ہوتا تھا اور یہیں قافلے والے غسل کرکے تازہ دم ہوا کرتے تھے اور اپنا اگلا سفر شروع کرتے تھے۔

گاڑی سڑک سے گزرتی جارہی تھی۔ گاؤں اور قصبے گزرتے جا رہے تھے۔ اب ہم پبّی کے علاقہ سے گزر رہے تھے۔ دونوں طرف کچی پہاڑیاں جو بہت اونچی نہیں تھیں اور درمیان میں سڑک۔ اچھا لگ رہا تھا یہ ماحول اور پھر اچانک ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ ایک ٹائر پنکچر ہوگیا تھا۔ ہم سب گاڑی سے نکل کر سڑک کی ایک طرف کھڑے ہوگئے۔ سڑک پر منی بسوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ یہ سب بسیں اسلام آباد جارہی تھیں۔ پاکستان میں منی بسوں کا بڑا رواج ہے۔ ائیرکنڈیشنڈ بسیں، معقول کرایہ، اچھی سڑکیں۔

اس خوبصورت کھلی ہوا میں خوب لمبے لمبے سانس لیے میں نے جیسے میں اس فضا کو اپنی شخصیت میں جذب کرلینا چاہتا تھا۔

پبّی کا علاقہ کافی دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس علاقے میں سے گزرتے ہوئے ملہوترہ مجھے اس کے بارے میں معلومات بہم پہنچا رہا تھا اور میں ایک اسکولی بچے کی طرح سب دھیان سے سن رہا تھا۔

بہ خطِ شاعر



کرامت بخاری

غزل

نکلا ہوں میں حصارِ غمِ دہر توڑ کے
ایسی اڑان ہے حدِ امکاں کو چھوڑ کے

لینا ہو امتحان جو میرے خلوص کا
رکھ دوں گا قطرہ خونِ جگر کا نچوڑ کے

ہمزاد کا سماں ہے نظر میں طرف طرف
قوسِ قزح سجاؤں گا رنگوں کو جوڑ کے

بے ربط حرف و صوت کا ہے قافلہ تو کیا؟
معنی نکال لوں گا میں لفظوں کو جوڑ کے

خوابوں کا ہے خلا مری آنکھوں میں خیمہ زن
پہنچا ہوں آسماں پہ زمینوں کو چھوڑ کے

کب تک یہ زہرِ وسوسہ سر پر ہے سوار
رکھ دوں گا شک کے ناگ کی گردن مروڑ کے

یہ فاختائیں کس کو دیں پیغامِ آسماں
شہتوت پر یہ سوچتی ہیں سر کو جوڑ کے

پیپل اگا ہوا ہے ہر اک کی منڈیر پر
رسموں کے دائروں کی فصیلوں کو توڑ کے

موجیں جو اٹھ رہی ہیں کرامت خیال میں
رکھ دیں نہ حوصلوں کے گھروندوں کو توڑ کے



ہوا چل رہی ہے

زاہدہ زیدی

ہوا چل رہی ہے
بہت دُور .....
شفاف نیلی ہوا چل رہی ہے
ہوا کہہ رہی ہے
چلو شام ہونے کو ہے
اپنے اس حجرۂ پُر سکوں سے نکل آؤ
نیلی فضاؤں میں
کچھ دیر .....
پروازِ غم آزماؤ

....

ہوا تیز رفتار ہے
اس کو کیسے بتاؤں
کہ یہ حجرۂ پُر سکوں تو نہیں
اک کھنڈر ہے
کہ میں جس کے ملبے کی تہہ میں پھنسی ہوں
مرے چار سو خون کی جھیل ہے
ہڈیوں کی چٹانیں ہیں
یا نیم مُردہ بدن
ذرا دُور وہ جن کو ملبے سے باہر نکالا گیا ہے

....

ہوا جانتی ہے
مرے جذبۂ نامکمل کے زیر و بم تموج
مری فکر کے زیر و بم کو یہ پہچانتی ہے ....
ہوا کہہ رہی ہے ....
ذرا غور سے دیکھو کس کس کو باہر نکالا گیا ؟

یہ لاشیں ہیں جن کو سجا کر
جھروکوں میں لا کر
بٹھایا گیا ہے ....

......

نکل آؤ ملبے سے
بوسیدہ ملبوس کو پھاڑ کر
توڑ کر یہ چٹانیں
جھٹک کر یہ مفلوج لمحے ......
اسی خون کی جھیل میں ڈوب کر
شام ہونے کو ہے
دہکنے لگی برف کہسار پر
دیکھو —— دیکھو
اُفق پر ......
شفق زار لمحوں کے
یہ برق رفتار نقشِ قدم
تجلّی کی سیماب پاریہ کہانی
بڑھو ......
جامِ آتش اٹھاؤ
سنہری فضاؤں میں کچھ دیر
پروازِ غم آزماؤ
کہ اب شام ہونے کو ہے
ہوا کہہ رہی ہے
بہت دُور شفاف نیلی ہوا کہہ رہی ہے
کہ اب شام ہونے کو ہے
شام ہونے کو ہے

"آبشار" ۴- ایچ۔ آئی۔ جی فلیٹ، سر سید نگر، سول لائنز، علی گڑھ (یو پی)

غزلیں

حکیم منظور



رات جن آنکھوں میں کاٹی، صبح انہی آنکھوں میں تھی
اور خاکستر کے دامن میں ہے بس لا حاصلی

میرا موسم التفات اُس کا، مجھے موسم سے کیا
یہ ہے اُس کی بات جو ہے ساتھ پھر بھی اجنبی

کیسے ان کی خامشی ٹوٹے گی اور پگھلے گی برف
ان کہستانوں میں رہتی ہی نہیں کوئی پری

بن نہیں پاتی کوئی تصویر کاغذ سادہ ہے
تشنگی بے صبر دریا میں نہیں دریا دلی

اب نہ ہنستی ہے نہ تو محفل سجاتی ہے کہیں
کن جھمیلوں میں پھنسی تو کیا ہوا اے زندگی

کیا نہیں لگتے تھے اچھے پھول یا جلتے چراغ
کیا سمجھ کر تو نے رکھی تھی ہوا سے دوستی

اک نیا موسم لکھا ان کے بدن پر دھوپ نے
ان گلابوں پہ رقم ہر برگ تھی تیغ بستگی

.... اور وہ لو جا گیا اتنا کہ بن بیٹھا خدا
.... اور ہم میں سے نہیں اس جرم سے کوئی بری

بے سروں کے طائفے میں، میں بھی ہوتا ایک آج
شکر ہے سر منظور جھکنے سے بچا عزت بچی

ہے کسی کو یاد بیداری میں ہم سوئے کہاں
راستے ڈوبے کہاں اور ہمسفر کھوئے کہاں

ہم ہیں پورے ذہن آدھی سوچ کے مارے ہوئے
گرچہ پتھر بھی نہ پھینکے، پھول بھی بوئے کہاں

پھر جنوں کیا ہے اگر اظہار میں آئے نہیں
یہ نہ سوچو جاگتے میں سنگ ابھی سوئے کہاں

جب کبھی چاہوں رو رو کر جی کا بوجھ کچھ ہلکا کروں
وہ کہ دریا ہے وہ کیا روئے گا اور روئے کہاں

اک شجر ایسا تھا جو ہر شاخ تھا طائر فروش
یاد جب آیا تو پھر ہم رات بھر سوئے کہاں

اب یہ سنگستاں ہے اور ٹوٹے ہوئے عکسوں کی فصل
آئینے بوئے تھے اب میں ہی کہوں بوئے کہاں

کس سے پوچھیں اس بھری ظلمات میں منظور ہم
جو ہمارے تھے وہ سورج ہیں کہاں کھوئے کہاں

بناوٹوں کے غبار کو دل سے صاف کرنا
مری طرح تم بھی زخم ہو اعتراف کرنا

نئے نئے تجربوں میں لذت نئی نئی سی
تم آئینہ ہو تو سنگ سے اختلاف کرنا

کبھی کبھی اپنی آنکھ کی سیڑھیاں اُتر کر
کبھی کبھی اپنے دل میں بھی اعتکاف کرنا

کہا جو آتش کدہ ہیں اندر سے پھول سارے
تمہارا حق ہے مری زباں میں شگاف کرنا

جسے تلاشا نہ خود لہو کے چراغ لے کر
بجا ہے ہر ایسی راہ سے انحراف کرنا

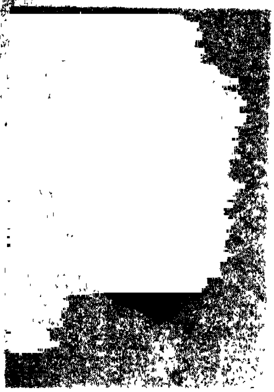
ہو تازہ جو سیکھ جائے آدابِ کفر ایماں
یقین کو بھی مقابلِ شین کاف کرنا

مری طبیعت کا رنگ دیوارِ گل اُٹھاؤں
تمہاری مستی ہے اُس میں موسم شگاف کرنا

کہا جو میں نے کہ تنگ دل رُت ہے تم ہو بے حس
نکل گیا سچ زباں سے لوگو معاف کرنا

میں کیسے منظور توڑ دوں خوشبو سے اپنے رشتے
میں کعبۂ دل کا چھوڑ دوں کیسے طواف کرنا

۲۷۔ گورنمنٹ فلیٹس، گاندھی نگر، جموں (توی) ۱۸۰۰۰۴



ایم۔ قمرالدین

ذرا شعور آگیا ہے، یعنی اب ایسے اپنا حساب لکھوں
جو رکھے انگارا ہاتھ پر وہ، تو اس کو میں اک گلاب لکھوں

زباں یہ میری، قلم یہ میرا، جُدا جُدا ہیں اسی بنا پر
اگر ہو کہنا ہی خوب کہہ دوں، اگر ہو لکھنا خراب لکھوں

کئی دنوں سے نظر کی حد تک، غبار چھایا ہوا ہے لیکن
یہ شہر والوں کا ہے تقاضا، سحاب سمجھوں، سحاب لکھوں

یہ حرف میرے کہ جلد ہی اب، ہر آنکھ میں اجنبی بنیں گے
وہ جس کے سارے ورق ہوں سادہ نہ کیوں اب ایسی کتاب لکھوں؟

سوال ایسا ہے اس نے بھیجا، جو اصل میں اِک جواب ہی ہے
جو اصل میں اک سوال ہی ہو، اُسے بھی ایسا جواب لکھوں

یقین ہے کوئی پڑھ کے خود ہی کرے گا وادین کا اضافہ
گناہ تیرے جہاں جہاں ہیں، وہاں وہاں گر ثواب لکھوں

اُسے نہ آیا تھا، زندگی بھر، یہ سچ ہے کوئی کتاب پڑھنا
مگر ہے سچ یہ بھی، جانتا تھا، وہ شکل پڑھنا نقاب پڑھنا

وہ اور ہیں، ہم نہیں وہ ہرگز، ہے جن کو پڑھنے کا لُطف حاصل
لکھا ملے زخم جب کہیں پر، تو فرض اپنا گلاب پڑھنا

لہو کی اِک چھینٹ بھی نہیں ہے، تو کیا؟ تمہاری قیامتوں کو
تمام آنکھوں نے پڑھ لیا ہے کہ جانتی ہیں عذاب پڑھنا

فریق دونوں ہی مطمئن تھے، حساب دونوں کے تھے برابر
اسے نہ آیا حساب لکھنا، اُسے نہ آیا حساب پڑھنا

یہ اُن کے وعدوں کا گوشوارہ، اور اُس پہ اُن کا بیان بھی ہے صاحب
یہ چند سطریں ضرور پڑھیے جو آپ چاہیں سراب پڑھنا

وہ پڑھ کے جس کو ہر ایک انساں بجائے انساں بنے اگا سب کچھ
نصیب میں آگیا ہے اپنے اب ایک ایسا نصاب پڑھنا

۱۲۰۔ لائرس چیمبرس، سپریم کورٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

محمود یسین

اُس کا بستر

اب وہ میرے بالکل قریب پہنچ گیا ہے۔
اب میں اُس کے سانس لینے کی آواز بھی سُن سکتا ہوں۔

اُس کے قدموں کی خاموش چاپ تو میں ازل سے سنتا آرہا ہوں۔ حالانکہ وہم پلتا رہتا ہے میرے اندر کہ میں اس بار اُس کی گرفت میں نہیں آؤں گا۔ لیکن ہر بار یہی ہوتا ہے۔ وہ اور میں۔ وہ اور اُس کا بستر۔ اُس کا بستر اور میں۔

ٹیک پلٹ جاتا ہے لیکن وہ میرا تعاقب کرنے سے باز نہیں آتا۔ میں بھی تو بس اُس سے بچنے کے لیے اُس کا انتظار کرتا ہوں۔ کیا واقعی اُس کا اور میرا رشتہ اٹوٹ ہے۔

بلی چوہے سے کھلواڑ کرنا کب بند کرے گی؟

لیکن اب تو میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ اب تو میں بس ایک چھوٹے سے اسکول کا چھوٹا سا پرنسپل ہوں۔ اب مجھ میں وہ بات کہاں! لیکن وہ ہے کہ اپنا بستر بغل میں دبائے میرا پیچھا کر رہا ہے۔ میرے نزدیک آتا جارہا ہے۔ میں اُس کی سانس کی گرمی اپنی گردن پر محسوس کرنے لگا ہوں۔ یہ بات معمولی نہیں ہے۔ اسی بات سے بچنے کے لیے میں کوشاں رہتا ہوں۔ اگر یہی بات ہوتی رہتی ہے تو میرے ہونے کا کوئی ارتھ نہیں اور میں ہوتے ہوئے بھی نہ ہونے کے برابر ہو جاتا ہوں بلکہ اس ہونے سے تو نہ ہونا بہتر ہے۔ آخر میں اور میرا وجود۔ میرا وجود اور وہ۔ وہ اور اس کا بستر۔ اُس کا بستر اور میں۔

رونا اسی بات کا ہے۔

پرندے کے پر کاٹنا کبھی تو بند کروگے؟

میں نے کہا تو ہے کہ میں اب کچھ بھی نہیں رہا۔ بس ایک ٹوٹتے بکھرتے اسکول کا ہیڈ ٹیچر پرنسپل ہوں۔ تم کچھ بھی کہو۔ میری وہ اوقات نہیں رہی۔ لیکن وہ تو اب بھی میرے پیچھے کھڑا ہے۔ اب میں بھی اس کو انچ انچ اپنی جانب بڑھتا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ اُس کے دل کی دھڑکنی کی آواز میرے وجود کو تبعض کر رہی ہے اور اُس کے سانس کی گرمی مجھے بے حال کرتی جارہی ہے۔

تم جانتے نہیں۔ تم جان بھی نہیں سکتے۔ تمہیں اس ہولناک صورتِ حال کا احساس نہیں ہو سکتا۔ بڑی دہشت خیز بات ہے۔ اُس کا میرے اتنے قریب پہنچ جانا۔

اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہے اُس کی بغل میں دبا بستر۔ بستر کے خیال ہی سے میرا دل بیٹھتا چلا جاتا ہے۔ یہ کوئی ایسا بستر نہیں ہے کہ جو مجھے پوری آسائش، آرام اور آسودگی دے گا۔ یہ کسی دولہے اور دلہن کے لیے ہنی مون کی رات کو بچھایا گیا بستر نہیں ہے۔ یہ کسی بھی طرح عام بستر نہیں ہے۔ جس پر لیٹتے ہی کوئی سُکھ کی نیند سو جاتا ہے یا محوِ خواب ہو کر کسی حسین وادی میں پہنچ کر عیش کی نئی منزلیں طے کرنے لگتا ہے۔ یہ اُس کا بستر ہے۔ دراصل یہ بستر ہی میرا مسئلہ ہے۔ تبھی تو میں بار بار کہتا ہوں —— میں اور وہ، اور اس کا بستر۔ اس کا بستر اور میں بڑی بھیانک بات ہے۔

ایک گتھی جو سلجھائے نہیں سلجھتی، بلکہ بدستور اُلجھتی چلی جاتی ہے۔ کوئی سِرا ہاتھ آئے تو بات بنے۔ گول کرے کی گولائی کوئی سمت نہیں رکھتی بے سمت گولائی اور اس میں سمت ڈھونڈتا میں اور میرے پیچھے ازل سے چلا آرہا وہ اور اس کی بغل میں دبا کلبلاتا بچھ جانے کے لیے بے چین ہوا جاتا بستر کلبلاتا ہوا بستر اور خوف کے جبڑوں میں کسمساتا ہوا میں۔

ای-۴۰، ویسٹ پٹیل نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸

دیکھنے میں وہ بستر بالکل عام بستر جیسا ہے۔ نرم، گداز اور آرام دہ۔ اُسے دیکھ کر اُسے بچھانے کے لیے دل مچل اُٹھتا ہے، لیکن اُس کے بچھتے ہی پتہ نہیں کیوں میرے وجود میں ایک ہول سرایت کر جاتا ہے۔ میں ہراساں نظروں سے کبھی بستر کو کبھی خود کو دیکھنے لگتا ہوں۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے یہ بستر مجھے آرام دینے کے بجائے....

بات اتنی سی ہی نہیں ہے۔ بات بہت گھنی ہے، بہت پیچیدہ ہے۔ بات میرے وجود اور اس کے وجود کے واسطے سے جو کچھ مجھے ملا ہے اس سے جڑی ہوئی ہے۔ بستر تو بعد میں آتا ہے۔ حالانکہ آتا ضرور ہے۔ میں لاکھ چاہوں بستر کا آنا رک نہیں سکتا۔ شاید میں ہی.....

میں چلتا رہتا ہوں۔ وہ میرا پیچھا کرتا رہتا ہے۔ کوئی دوسرا اس کی پرچھائیں تک نہیں دیکھ سکتا۔ اُس کے قدموں کی خاموش چاپ سُننا تو درکنار۔

لیکن اب تو میں وہ نہیں ہوں۔ اب تو میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں نے کہا تو ہے کہ اب میں ایک بوسیدہ اسکول کا بکھرتا ہوا پرنسپل ہوں۔ پھر وہ میرے پیچھے کیوں لگا ہوا ہے۔ پہلے کی بات اور تھی۔ پہلے میں تھا اور میری پیاس تھی۔ کچھ بھی نہ ہوتے ہوئے سب کچھ ہو جانے کی اَن بجھ پیاس تھی۔ اور اُس پیاس کو لگاتار بڑھاتے چلا جانے والا میں تھا۔

میں جھوٹ نہیں بولتا۔ میں تھا اور میرے سامنے حدِ نظر تک پھیلی ہوئی دھرتی تھی۔ اور اپنی تمام تر پہنائیوں پر اتراتا آسمان تھا۔ ان دونوں کے لیے میری پیاس تھی جس کی اپنی کوئی حد نہیں تھی۔ کیا تماشا تھا۔ فطرت میرے سامنے اپنی رعنائیوں کے ساتھ ایک دوشیزہ کی طرح پسری پڑی تھی۔ اس کا کوئی اور تھا نہ چھور۔ ادھر میں اپنی پوری اوقات اور بساط بھر اسے بھوگنے پر تلا ہوا تھا۔ اُس کی پرچھائیں تک پر کسی دوسرے کو کوئی حق دینے کو تیار نہیں تھا۔

بات صرف میری اور فطرت کی ہوتی تو کوئی بات نہ تھی۔ بات تو روز بروز لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جاتی تھی۔ ادھر فطرت خود تھی، اُدھر میری اپنی فطرت تھی۔ عجیب معاملہ تھا۔ دونوں کے بیچ بہت فاصلہ تھا۔ لیکن میں سب کچھ سمیٹ لینے پر اُتارو ہو چکا تھا۔

کیا تم نہیں جانتے کہ کچھ بھی پانے کے لیے بہت کچھ چھینا پڑتا ہے۔ میں تو سب کچھ پانے پر تُلا بیٹھا تھا۔

تم شاید یہ کہنا چاہتے ہو کہ دانا لوگ ایسا نہیں کہتے۔ سیانے تو یہی کہتے آ رہے ہیں کہ تھوڑا سا پانے کے لیے بہت کچھ چھوڑنا پڑتا ہے۔

مجھے ہنسی آتی ہے ایسے سیانوں پر۔ دانا لوگ؟ کہاں کے دانا لوگ؟ بس دور بیٹھے اپنی بات کہہ کر آپ ہی اُس کی تعریف کرنے والے۔ خود سے بے بہرہ۔ خود سے انجان۔ کچھ نہ کر سکنے والے دوسروں کو تیاگ اور تپسیا.....

اُنہیں خود اپنا سامنا تک نہیں کرنا آتا۔ وہ شاید جان بوجھ کر خود سے کنّی کتراتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ گیان بگھارتے ہیں، اُپدیش دیتے ہیں۔

میں کبھی پاؤں جمانے سے پہلے یہی کہتا رہا — اپنے لیے کچھ نہیں۔ سب کچھ دوسروں کے لیے۔ میں خود بھی دوسرا کا ہوں۔ میری کھال تک..... لیکن یہ سب میں سچے دل سے کہتا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ سچ کب اور کیسے جھوٹ میں بدلنے لگتا ہے۔ کب کوئی کالی دھند انجانے میں میرے من پر چھانے لگتی ہے۔ میں اپنے کو سنبھالتا ہوں۔ دوسروں کی طرف دیکھتا ہوں۔ اپنے کہے کو یاد کرتا ہوں۔ لیکن اپنے کو ہی رد کرتا چلا جاتا ہوں۔ جو کچھ میری مٹھی میں آچکا ہے اُسے کسی طرح بنائے رکھنے اور زیادہ پانے کی خواہش اور زیادہ پراپت کرنے کی اِچھا— لالچ، لمحہ لمحہ بڑھتا ہوا لالچ۔ پل پل بڑھتی جا رہی طمع۔ کائنات کی وسعتیں اور میری خواہشیں۔ کوئی انت نہیں۔ زیادہ دُور اور دور اور چھوٹے سے نفرت۔ محدود نہ ہونے میں ہی....

وہ بھی ایک ہی تھا جسے صرف تین گز زمین کی خواہش رہی۔ میں تو دونوں جہان پاکر بھی مطمئن نہیں۔

تبھی شروع ہوتا ہے کھیل۔ آج زمین، کل زر، پرسوں جورو۔ اُس سے اگلے دن اقتدار کے کاریڈوروں میں داخل ہونے کی تگ ودو۔ اُسی تگ ودو کو بڑھاتے بڑھاتے دوسروں پر حکومت کرنے کی خواہش۔ اپنی منانے، اپنی جتانے کا بھی۔ روز افزوں حرص اُس کمی کو پورا کرنے کے لیے اور طاقت حاصل کرنے کی چال بازیاں۔ دھیرے دھیرے دوسروں کے قافلے کو بنجر زمینوں، سنگلاخ پہاڑیوں اور برفانی علاقوں کی جانب ہانکتے رہنے کا پلان۔ کبھی تلوار، کبھی توپ، کبھی گیس چیمبر کبھی ایٹم بم کا سہارا۔ کہاں گیا وہ دوسرا جس کے نام پر میں نے طاقت ہتھیائی تھی۔ کہاں ہیں وہ سیانے جو اپنے اندر بیٹھے ناگ کو پہچانتے ہیں نہ اُس ناگ کے پھن میں سرسراتے زہر کو جانتے ہیں۔ اُپدیش، وعظ، سرمن!

عہد در عہد لکھی جانے والی کہانی! سُنائی جانے والی داستان! بار بار میری ہی زبانی۔ کبھی اس رنگ میں کبھی اُس رنگ میں۔ تعقب بدلنے سے فطرت تھوڑی بدل جاتی ہے۔ سب کچھ چاہنے کے لیے مجبور کرتی فطرت۔ سب کچھ حاصل کرنے کے لیے مجبور کرتی فطرت۔ کیا کچھ نہیں کروا ڈالتی مجھ سے۔ اپنوں کا لہو، اپنوں کی جان، اپنوں کا ایمان، اُن کی [illegible] اُن کا ارمان سب بے معنی۔ سب فضول۔ صرف میری بلت، میری ذات ہی سب کچھ۔ حاصل کرنے سے پہلے کچھ۔ حاصل کرنے کے بعد کچھ۔ یہ دوہرا [illegible]

اُدھر بے کنار وسعتوں والی فطرت اِدھر بھاگے چلے جانے والی فطرت ۔

تبھی تو وہ لگاتار میرا پیچھا کرتا رہتا ہے ۔ اپنے بغل میں دبے بستر کو سہلاتا ہوا میرے نزدیک آتا چلا جاتا ہے اور اب ۔۔۔۔

نہیں ۔ اب نہیں ۔ آج نہیں ۔ آج تو سب ہوا ہو گیا ۔ صدیوں پہلے کی میری ممیاں تک کیڑوں مکوڑوں کی خوراک بن گئیں ۔ تہذیبیں جن کا خالق ہونے کا میں دعویٰ کرتا تھا ، نیست و نابود ہو گئیں ۔ اُس سب کا تو نام و نشان تک نہیں رہا جس کو دیکھتا ہوا میں فخر سے تن جاتا تھا ۔ اور سامنے بکھری لاشوں پر مسکراتی نظریں ڈالتا ہوا مزید انسانوں کو مقتل میں دھکیلنے کی خواہش سے بھر جاتا تھا ۔

اب میں محض ایک چھوٹے سے قسم کا پرنسپل ہوں ۔ ایک چھوٹے سے بے نام اسکول کا کرتا دھرتا ۔۔۔ ہیڈ ۔۔۔ ناظم ۔

پھر وہ کیوں آج میرے پیچھے آ کھڑا ہوا ہے ۔ شاید اُسے میری پرانی باتیں یاد آ گئی ہیں ۔ یا شاید اُس نے میرے آج تک گھڑے نظام پھر سے اپنے ذہن کے پردوں پہ اُبھار لیے ہیں ۔ یا اُن نظاموں کو دوسروں پر لاگو کرنے ، لیکن خود کو کسی بھی نظام سے آزاد رکھنے کی میری چال اُسے پھر سے میرے پیچھے آ کھڑا ہونے کے لیے مجبور کر رہی ہے ۔

میں اُسے کیسے یقین دلاؤں کہ میں اب وہ نہیں رہا ۔ اب تو میں کچھ بھی نہیں رہا ۔ آخر میں کتنی بار کہوں کہ میں کچھ بھی نہیں رہا ۔

میں مانتا ہوں کہ صدیوں تک وہ میرے پھیلنے کا منظر دیکھتے دیکھتے میرے پیچھے چلتا ہوا مجھ تک پہنچتا رہا ہے ۔ مجھے روک کر میرے سامنے آ کر کھڑا ہوتا رہا ہے ۔ میری طرف پھنکارتی نظروں سے دیکھتے ہوئے میرے پاؤں میں پڑی دھرتی پر بستر بچھاتا رہا ہے ۔ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر اس بستر پر لیٹ جانے کی ترغیب دیتا رہا ہے ۔ میرے اُس بستر پر پہنچتے ہی اُس کی آنکھوں میں ایک دہشت خیز چمک اُبھرتی رہی ہے اور اُس کے ہونٹوں پر زہریلی ہنسی ناچتی رہی ہے ۔ وہ اپنے ہاتھ میں تیز دھار والا چمکیلا خنجر تھامے میری طرف دیکھتا ہوا کبھی بستر کی لمبائی چوڑائی اور کبھی میرے پھیلاؤ کو ناپتا رہا ہے ۔ میرے جسم کا جو بھی حصہ بستر سے باہر ہوتا دکھائی دیتا رہا ہے اُسے کاٹ کاٹ کر پھینکتا رہا ہے ۔ مجھے مجبور کرتا رہا ہے کہ میں اپنے وجود کو بستر کے حدود اربعہ میں محدود اور محصور رکھوں ۔ ورنہ اُس کا تیز دھار والا چمکتا خنجر ۔۔۔۔

عجیب تماشا ہوتا رہا ۔ میں پھیلتا رہا ۔ وہ مجھے کاٹتا رہا ۔ میں بڑھتا رہا ۔ وہ مجھے چھانٹتا رہا ۔ اِدھر میں مجبور اُدھر وہ بے بس ۔

لیکن اُسے آج تو نہ میرے پیچھے کھڑا ہونے کی ضرورت ہے نہ میرے لیے بستر بچھانے کی ۔ آج تو میں کچھ بھی نہیں ۔ صرف ایک چھوٹے سے اسکول کا ادنیٰ سا پرنسپل ہوں ۔ آخر میں اُسے کتنی بار بتاؤں کہ نہ میں نیرو ہوں نہ فرعون میں تو بس پرنسپل ہوں ۔ ایک معمولی اسکول کا بے نام پرنسپل ۔ یعنی کہ ہیڈ ۔۔۔ ناظم !

بقیہ : ملاحظات

کے لیے اورل ری ہائی ڈریشن تھیراپی کو بھی بڑھاوا دیا جا رہا ہے یعنی مخصوص قسم کا گھول پینے کے لیے دیا جاتا ہے ۔ اس سلسلے میں اورل ری ہائی ڈریشن سالٹس (ڈی آر ایس) کے پیکٹ صحت عامہ کی خدمات کے مراکز کے ذریعے مفت تقسیم کیے جاتے ہیں ۔۔۔ ۲۰۰۰ تک سب کے لیے صحت کے نصب العین کی حصول کے لیے کی جانے والی کوششوں میں صحت سے متعلق تعلیم کی فراہمی کی سہولت عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے اقدامات کیے گئے ہیں ۔ حکومت دیہی علاقوں میں صحت سے متعلق بنیادی سہولیات میسر کرانے کے نشانے کی حصول کے قریب پہنچ گئی ہے ۔ مارچ ۱۹۹۰ء تک ملک بھر میں ایک لاکھ تیس ہزار ذیلی مراکز ' ابتدائی صحت کے ۲۱۶۶۶ مراکز اور کمیونٹی صحت عامہ کے ۲۷۰۸ کے مراکز کے قیام کے متعین نشانے کے مقابلے میں ۳۰ جون ۱۹۸۹ء تک ۱۲۱۷۷۶ ذیلی مراکز ابتدائی صحت کے ۱۹۱۷۳ مراکز اور کمیونٹی صحت عامہ کے ۱۶۶۵ مراکز قائم کیے جا چکے ہیں اور یہ سبھی کام کر رہے ہیں ۔ ۲۰۰۰ء تک سب کے لیے صحت کے نشانے کو عوامی تحریک کی شکل دے کر اس کی حصول کے لیے کوششیں کی جا رہی ہیں ۔ رضاکار تنظیموں اور مقبول عام رہنماؤں کی عوام میں صحت اور صفائی کے بارے میں بیداری پھیلانے کے لیے ہمت افزائی کی جا رہی ہے اگر تمام لوگ مل کر اجتماعی کوشش کریں تو صد فی صد صحت مند اور تندرست قوم کا ہمارا خواب ضرور پورا ہوگا ۔

●●

بقیہ : بارے انگلیوں کا کچھ بیاں ہو جائے

آپ یہ جان لیں کہ جن بزرگ کے مزار پر یہ مشاعرہ ہے وہ بہت جلالی ہیں ۔ آپ جیسے خرافاتی کو تو وہ اُٹھا کر پھینک دیں گے ۔"

وہ صاحب ہنس کر بولے ۔ " آپ بھی کیسی بے پر کی اُڑاتے ہیں ۔ وہاں کون بزرگ ہیں ۔ ارے بھائی وہاں تو اُن کی صرف ایک انگلی دفن ہے ۔" قاضی نے صبر کے ساتھ اُن کی بات سُنی اور نہایت سکون سے بولے ۔ " تو کیا آپ اُنگلی کو کچھ کم خطرناک سمجھتے ہیں ؟ " یہ کہہ کر اُنھوں نے ہماری طرف مسکرا کر دیکھا اور ہم نے اس انداز سے اپنا سر ہلایا گویا یہ استفسار اُن کا نہ ہو ، ہمارا ہو ۔

●●

امام نقوی

ھّی



کبوتر... کبوتر... کبوتر...

ز......

پانی سے بھری بالٹی اُٹھانے کے بعد
ں ہی پلٹی تو اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔ دل
ی گوشے سے خوشی کا سوتا پھوٹا اور دوسرے ہی
س کا چہرہ کھل اُٹھا۔ دالان میں ہمیں موجود پاکر
نے بالٹی چھوڑ دی۔ ایک چھناکہ ہوا بالٹی میں سے
ڑا سا پانی اُچھل کر زمین پر گرا۔ اُس نے دھپ
پاتے ہوئے زینے طے کئے اور آیا کہہ کر میری بیوی
پٹ گئی۔ کوئی ایک منٹ تک وہ بیگم سے لپٹی
ی رہی۔ پھر ان کے اُبھرے ہوئے پیٹ کو محسوس
ے ہی اس کی خوشیوں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔
ہوتے ہوئے اُس نے کنکھیوں سے میری
دیکھا اور بیگم سے بولی:

"اری..... تم نے تو بڑی جلدی
دی..... کہیں بھاگا جاوے تھا یہ بچہ۔"
میں مسکراتے ہوئے باورچی خانے کی طرف
گیا۔ ساس چولہے کے برابر بیٹھی پراٹھے بنا رہی
ں۔ چولہے میں اُپلوں کے ساتھ کتے بھی جل
ہے تھے۔ اُدھر دالان میں وہ بیگم سے مخاطب
تھی۔

"سہر گئی ہو بیاہ کر.... پر مجھے تو لگے دماگ
اِنکے چھوڑ گئیں۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"اے لو..... اوئی آپا.... بیاہ کر
دن ہی کئے گزرے جو تم لوہ چھٹانے لوٹ آئیں۔"

"چُپ کم بخت۔"

"اور لو..... اب چپ بھی مجھے ہی کرواؤ
ہو..... بھائی جی کو کر وائیں چُپ..... سچ
کہوں ہوں۔ ابھی تو تمہارے مہینے کے دن تھے میں
تو جانوں..... دو چار سال مجے کرتیں۔ پھر گود موت
سے ہاتھ سنتے تو کوئی بات بھی تھی۔"

"کون ہے یہ؟" —— چائے کی پیالی ساس
سے لیتے ہوئے میں نے پوچھا تو پراٹھا پلٹتے
ہوئے ساس نے جواب دیا۔

"نھتی۔ کو نجڑی ہے۔ ڈیوڑھی میں پڑی
رہتی ہے۔ اس کی ساس کسی زمانے میں ہمارے
گھر کام کیا کرے تھی۔"

"مر گئی وہ؟"

"نہیں۔ رام راج میں خربوزوں کی پالیز لے
لے رکھی ہے اور اسے میرے سپرد کر گئی ہے۔"

"کیوں؟"

"وہاں اس کا پہلا میاں جو ہو گا۔"

"پہلا میاں؟"

میں نے حیرت سے ساس کی طرف دیکھا۔ وہ
جھینپتے ہوئے انداز میں نظریں چُراتے ہوئے آٹے کی
پرات میں سے نیا پیڑا توڑ رہی تھیں۔ قدرے
توقف کے بعد پیڑا بناتے ہوئے اُنہوں نے کہا۔

"ہاں اس سے طلاق لینے کے بعد اس کے
بڑے بھائی سے نکاح کیا ہے جھولو بیٹی نے۔"

"اوہ۔ میں نے ہونٹ سکوڑنے کے بعد
چائے کا گھونٹ لیا۔

"یہ کبوتر، کبوتر کیا بک رہی تھی؟" بیگم
کی آواز سنائی دی۔

"اجی وہ..... کچھ نا..... رات بھی فلم
دیکھنے گئی تھی ملا کے سنگ۔ اڈے کے دھورے
منڈوا بنا..... اسی میں گاوے تھی وہ سسری۔
کبھی کو لہے مٹکاوے تھی اور چیخے تھی کبوتر، کبوتر۔
اور... اور کبھی اپنے کبوتر دکھاوے تھی۔"

"نھتی تو چُپ نا رہنے کی" —— ساس نے
توے پر پراٹھا ڈالتے ہوئے بلند آواز میں اُسے ڈانٹا تو
وہ دھپ سے چبوترے پر اُتر آئی اور جھک کر ساس

نت ایران قونصل، سپس لوک - ۴۷ - نے پین سی روڈ، ممبئی ۴۰۰۰۳۶

ـلیا۔

"میں کیا کہہ رہی حکیمنی۔ آپا بھی بیں گی۔ میں تو یہ بتاؤں تھی کہ رات فلم دیکھی تھی۔ اسی میں گا وے تھی وہ سسری۔.... ایمان سے لے.... مجھ دُکھیاری کو تو سب کہیوں۔ آنکھ کا پانی جاتا رہا۔ اسے کسی نے بھی نہ کہا.... کبھی تنے تھی کبھی جھٹکے تھی اور اللہ کسم حکیمنی — ایک بات مالو۔ جاؤ دیکھ باؤ منڈوے میں سسری کو۔"

"چُپ رہ کم بخت۔ کسی کا تو خیال کیا کرو۔ آتے کی شرم نہ جاتے کا خیال"۔ ساس نے دستِ پناہ اُٹھایا تو وہ ایک دم سے پیچھے ہٹ کر کھلکھلائی اور ہنستے ہوئے بولی۔

"تم بھی کیا کہہ حکیمنی۔ یہ کوئی گیر ہیں۔ آپا کے میاں ہیں گے۔ گھر کے داماد۔ کیوں جی بھائی جی....."

"اری کہاں جا مری۔ میں اِنکے میٹھا پانی کی باٹ دیکھ رہا ہوں۔"

ڈیوڑھی میں سے ننھی کے میاں کی آواز آئی۔ ننھی نے ایک ذرا سا منہ ترچھا کیا اور دالان کی طرف بڑھتے ہوئے اُسے جواب دیا۔

"بالٹی بھری رکھی نل کے دھورے۔ آکے نہا لو جی۔ میں آپا کنے بیٹھی۔"

چکی سے اُٹھنے کے بعد بھی ذہن پر چکی کی گھڑگھڑاہٹ مسلط تھی اور کانوں میں چکی کے مالک لالہ کیشو داس کی آواز قید سی ہو کر رہ گئی تھی۔ لالہ بڑا نیک بندہ ہے۔ کتنے پیار سے اُس نے استقبال کیا۔ خود ہی چائے اور پاپے لایا تھا۔ پاس پڑوس کے دوکاندار متحیرانہ انداز میں ہمیں دیکھ رہے تھے۔ لالہ سے کسی ہم عمر پڑوسی نے اپنی حیرت ظاہر کی تو اُس نے دھیمے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"اپنے حمد کے بہنوئی ہیں۔ بمبئی میں رہویں.... اور تم تو جانتے ہو۔ یہ سب کچھ جو سکا ہے گا —"

کیا تنخواہ دیتے ہیں آپ بھائی اسد کو؟۔ میں نے ایک احمقانہ سوال کیا تو لالہ مسکرائے تھے اور اسی دھیمے لہجے میں بولے تھے۔

"تنخواہ اور نیں دے سکوں.... وہ بھی میاں حمد کو.... میاں یو مالک ہے گا۔ چکی اس کی ہے گی۔ جو جی میں آوے گلے میں سے نکالے ہے۔" لالہ کا جواب سُن کر میں نے بھائی اسد کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا تھا۔ انہوں نے تائیدی انداز میں مسکراتے ہوئے سر ہلایا تھا۔ پھر جب چکی کے پاٹوں نے گھڑگھڑانا شروع کیا تب فوراً ہی ایک ہاڑا اُٹھا کر اُنہوں نے چکی کے پھیروں میں پلٹ دیا۔ اُدھر لالہ اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہے تھے۔

"میاں مشرف اور میاں اعجاز پاکستان نہ جاتے تو حمد کو یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ وے تو اُنکے چل دیے اور یہ اِنکے ڈائن ڈائن پھرا کرے تھا۔ کبھی اپنے ماموں کے سنگ کبھی کیھتوڑے والے میاں کیسر کے... کئی برس تو لوں ہی کھوئے اُس نے.... ماموں نے کچھ سکھایا نہ میاں کیسر نے۔ اور کون سکھاوے ہے۔ سب سُورے جوتیاں سیدھی کرا دیں۔ پانی بھروا دیں۔ ہاں تو میں کہوں تھا بُرا ہو سیاست کا۔ ملک تو بٹا ہی بٹا۔ کم بخت ہمارے دل بھی بٹ گئے۔ جو سُورے جو رہے پر گھچاڑے حجامت بنایا کریں تھے، اک دم سے خاں صاحب ہو گئے۔ آفت تو میر صاحبوں کی آئی۔ کام دھندا سیاؤں نے کبھی نہ کیا۔ کھیتی باڑی بٹائی پہ اٹھا دیا کریں تھے۔ بعد کو کھانے کو کچھ نہ بچا۔ اب جھولوں کی زندگی جیوے ہیں۔"

کیسی کیسی کہانیاں بکھری پڑی ہیں اس طرف۔ ایک سے ایک دل خراش۔ چپ چپ سی۔ کسی نے شکوہ نہ شکایت۔ یہ اسد، بیگم کا بھائی۔ اسے اپنے بھائیوں سے کوئی شکایت نہیں، جو بٹوارے کے بعد پاکستان چلے گئے اور راستے بھول گئے۔ ایسے ہی کیا — انہوں نے تو اپنی ماں کو بھی فراموش کر دیا۔

چلتے چلتے کمر اور سینے پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی تب چونک کر میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ ملک ٹال کی دکان قریب ہی تھی یعنی گھر آ چکا تھا۔ مکٹ سے سگریٹ خریدنے کے بعد میں گھر کی طرف چل دیا۔ دُور سے مکان دکھائی دیا۔ بے اختیار لالہ کیشو داس کی آواز کانوں میں گونجی۔ دروازے کے دونوں پاٹ بیٹوں کا انتظار کرتی ماں کی آنکھوں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ اور اندر سے ننھی کی آواز آ رہی تھی۔ میرے کھکھارنے پر چوکی سے اُٹھنے کے بعد اُس نے لوٹا اُٹھایا اور دھپ دھپ کرتی نل کی ہودی پر پہنچی، ہتھی چلائی۔ لوٹا بھرنے کے بعد تیزی سے لہراتی ہوئی بیچ کے در میں آ کھڑی ہوئی۔

"لوٹا رکھ دو۔ میں ہاتھ دھو لوں گا۔"

"میں دُھلاؤں۔"

"ارے بھئی اب تو ہم پرانے ہو گئے۔ یہ چونچلے ختم کرو۔"

"اے لو۔ اور سُنو.... زمانا اُس وقت تک پرانا نہ ہوا کرے جب لو نیا نہ آ جا۔ بس۔ آ جاؤ۔"

ننھی کی بات میں وزن تھا۔ خاموشی سے آگے بڑھا۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد میں نے لباس تبدیل کیا تب تک چوکی پر دسترخوان بچھایا جا چکا تھا۔ بیگم کھانا اُتار رہی تھیں۔ میں نے ایک طرف بیٹھتے ہوئے بیگم سے ساس کے بارے میں پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ قریب گاؤں کسی تیجے میں گئی ہوئی ہیں۔ ان کی غیر موجودگی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں نے بیگم کے ساتھ کھانے پر اصرار کیا۔ مگر وہ پس و پیش میں مبتلا تھیں۔ مبادا کھانے کے دوران اماں چلی آئیں۔ ننھی نے انہیں غور سے دیکھا اور بولی:

"اب لے وہ نہ آنے کی ہیں۔ لاؤ پنکھا مجھے دو اور بیٹھ جاؤ۔ اری.... سرمائی ہو۔ باؤلی ہوئی ہو۔ دیکھیو تو۔ کتے اچھے ہیں گے بھائی جی سنگ کھلا ویں گے.... اور ایک ملا ہے گا۔ جھولو بیٹیا بھول کے بھی نہ پوچھے ہے گا۔"

"آج تم بھی ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ —"

میں نے مسکراتے ہوئے اسے مدعو کیا تو وہ پھول کی طرح کھل اُٹھی۔ پھر ممنونیت آمیز لہجے میں بولی:

"اُنکے بھی تمہارا ہی ہے گا بھائی جی۔"

"اگر ا تنگے ہمارا ہے تو ا تنگے تمہارا
ا ۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ ــــ چلو آجاؤ۔
ں نے اُسی کے لہجے میں نقل اُتاری تو بیگم بھی مسکراتے
ئے مصروف ہو گئیں۔ ننھی نے ایک بار تو پہلو بدلا پھر
ی کا کونا سنبھالتی ہوئی بولی:
"جلد کرو ہو تو روٹی پہ سالن دھر مجھے
ڑا دو۔ اُدھرے بیٹھ کے کھا لوں گی۔"
"نہیں ۔ ہمارے ساتھ بیٹھو ــــ
ی آپا کے برابر ــــ میری ہدایت پر وہ بیگم کے
بر بیٹھ تو گئی، لیکن اس کے پیر چوکی سے نیچے ہی تھے۔
ں نے اُسے مخاطب کیا۔
"بھئی، تم ہو تو ہماری سالی ۔ پر شرماری
۔ پیر اوپر کر لو۔ تمیز سے بیٹھو۔ دسترخوان کے کچھ
اب ہوا کرتے ہیں۔"
"اجی ہوا کریں۔ پر مجھے کچھ نہ بتایا باؤلے
لدیڑ وں نے۔"
"ہائیں۔ تم گالیاں بھی بک لیتی ہو ــــ
سنے کچھ ٹھکتے ہوئے اُسے ٹوکا تو وہ جھینپ گئی۔
ر سر جھکانے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔
"یہ گالی ہے گی؟"
"پھر کیا ہے؟"
"اجی ما پھر کرنا بھائی جی۔ ماری برادری
ں تو ..... اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ اپنی صفائی
ں طرح پیش کرے۔ میں نے کچھ سوچ کر بات
لنے کی خاطر کہا۔
"مجھے تم سے کچھ باتیں بھی کرنی ہیں۔"
کچھ ڈرتے سہمتے اور لجاتے ہوئے اس نے
ٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
"اچھا ..... یہ تو بتاؤ تم نے اپنے میاں
طلاق کیوں لی تھی۔
میرا سوال سن کر اس نے پہلے تو بیگم کو منذبذبہ
انکھوں سے دیکھا پھر ایک نظر مجھ پہ ڈالی، کچھ
رچا اور بیتاخ سے بولی۔
"وہ سُورا اِ تنگے منھ ڈال پڑ جایا کرے تھا۔

اس کے اشارے پر میں اور بیگم دونوں ہی جھینپ
کر رہ گئے۔ کچھ دیر تک ہم سب ہی خاموش رہے۔
پھر میں نے ہی بات چلانے کی غرض سے پوچھا
"بس اتنی سی بات پر؟"
"اجی یو ہی ہوتی تب تو بات بن جاتی ــــ
سورے کو لے آتی سڑک پر ۔ پر وہ تو لولائی کیے جا
تھا۔ بتیرا کہا بھڑوے سے۔
"پھر گالی!"
"اجی ما پھ کر دگلتی ہوگئی۔ عادت جو ہے گی
ــــ سری۔ ہاں تو میں کیا کہوں تھی ..... ہاں یاد
آگیا۔ بتیرا کہا بھاڑوے سے ۔ لولائی کرنے کو جی کرے
تو ما کے سنگ چلا جا۔ پر مان کے ہی نہ دیا۔ کب
تک لولاتی اپنے کو؟ سال بھر بعد پھچوں کے آگے
کہنا ہی پڑ گیا۔
"تو سال بھر لولایا اُس نے؟"
ہاتھ روک کر ننھی نے مصنوعی غصے سے پہلے
میری طرف دیکھا۔ پھر بیگم سے شکایت بھرے
انداز میں بولی۔
"دیکھو ہو آپا سیم۔ یو تو مجے لے رہیں۔"
"بہنوئی جو ہوں تمہارا۔"
"ایمان سے لے۔ میں تو ایسا نہ سمجھوں تھی۔"
ننھی نے جھینپتی ہوئی آواز میں کہا۔
اور سر جھکانے کے بعد پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ
بڑھا دیا۔

بچی کی پیدائش کے بعد میری واپسی کا
پروگرام بنا تو بیگم کا موڈ بہت اُتر گیا۔ ساس اور سالے
کے چہروں پر بھی افسردگی چھائی، لیکن میری
مجبوریوں کے پیش نظر سب ہی چپ رہے۔
بیوی کو اخراجات کی خاطر معقول رقم اور ڈھیروں
دلاسے دینے کے بعد ابھی اٹھا نے ڈیوڑھی میں
پہنچا تو وہاں ننھی اور اس کا میاں موجود تھے۔
ننھی کی ہدایت پر اس کے میاں نے رکشا نکالا۔
اور مجھے بس اڈے تک چھوڑ آیا۔

میرانپور سے میرٹھ اور بمبئی تک کا سفر
تصورات کے سہارے طے ہوا۔ بمبئی پہنچ کر کاروبار
کے چکر ویو میں کچھ اس طرح الجھا کہ میران پور یاد
آیا نہ وہاں کے لوگ اسی۔ تین ایک ماہ بعد بیگم
بھائی اسد کے ساتھ چلی آئیں۔ میرے روز و شب
مکان سے دکان اور دکان سے مکان کی روٹین کی نذر
ہونے لگے۔ ڈھائی سال کا عرصہ اسی آمد و رفت
یا پھر بٹیا کے ساتھ کھیلنے کھلانے میں گزر گیا۔
اسی دوران بیگم پھر دوہری ہونے لگیں۔ قبل از
وقت ہم ایک مرتبہ پھر میران پور پہنچے۔ ڈیوڑھی
خالی پڑی ہوئی تھی۔ صحن میں ساس اپنی بیٹی سے
لپٹ گئیں۔ بھائی اسد نے بچی کو مجھ سے لے لیا۔
چائے وغیرہ سے نجات ہونے کے بعد میں نے ننھی کے
بارے میں بھی بھائی اسد سے پوچھا تو وہ برا سا منھ
بنا کر رہ گئے۔ میں نے جب اس کا سبب معلوم کیا تو
ناگواری سے بولے۔
"کیا رکھا فضول باتوں میں؟"
"آخر ہوا کیا؟"
"ہونا کیا۔ بھاگ گئی حرام زادی۔"
"کس کے ساتھ؟"
"اپنے یار کے ساتھ بھاگی ہوگی۔"
"پر کیوں؟"
"بس یوں ہی سی تھی وہ۔ ایک کے پاس
پڑے تھی۔ دوسرے سے نین مٹکے چلیں تھے سسری
کے۔ مولے سے بیاہی تھی تو ملا کو گھورا کرے تھی۔
ملا کے نکاح میں آئی تو ......
"اسد جا۔ گوشت لیا۔ جہاں دیدہ ساس
نے بات کاٹ دی۔ بیٹے نے ماں کی طرف معنی خیز
انداز میں دیکھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔
دوسرے دن سہ پہر کے وقت چائے پینے
کے دوران ملا آگیا۔ ساس نے ننھی کے بارے میں
معلوم کیا تو وہ گالیاں بکنے لگا۔ مغلظات کا طوفان
تھا کہ تھمنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ ساس گرفت
ہو رہی تھیں کہ کہاں ہم نے ریڈیو کھول دیا۔ میری

...بیدگی ان کی ندامت میں اضافہ کر رہی تھی —
اُدھر مُلّا نخفی کی ماں بہنوں کو اپنے بستر پر پہنچا رہا تھا۔ دم لینے کی خاطر ایک پل کو وہ چپ ہوا تب میں نے اُسے ڈانٹا۔ پہلے تو چند لمحے وہ حیرت سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔

"وہ سے جانا تھا چلی جاتی چھنال پر اپنے پوت کو کیوں چھوڑ گئی۔ ماری جان اجاب میں ہے گی۔ ماں سے کہوں ہوں کہ اسے سنبھال تو وہ گالیاں دلیوے۔ بہنوں کے آگے ہاتھ جوڑوں تو وہ کیہویں اسی چھنال کے دھورے چھوڑ ریا۔"

"تو چھوڑ آ۔"

"اجی کہاں چھوڑ آؤں۔ کچھ پتہ بھی ہو حرامڑ کا۔ میں تو نہ جانوں کہاں چھنالہ کروا رہی۔"

"اچھا بس۔ چپ رہو تم ——" میں اس کی گالیوں سے عاجز آ چکا تھا۔ کافی دیر تک منھ کھولے وہ مجھے دیکھتا رہا۔ غالباً اسے یقین تھا کہ اس مسئلہ پر میری ہمدردیاں اسی کے حصے میں آئیں گی۔ لیکن میری گھُرکی نے تو پانسہ ہی پلٹ دیا تھا۔

آپ نے بھی مجھ ہی کو ڈانٹا۔ اسے کچھ نہ کہا، جو اپنی کوکھ کے جنے کو چھوڑ گئی۔ ہائے .... مارا تو نصیب ہی کھوٹا ہے گا سُورا۔

ہارے ہوئے انداز میں رُک رُک کر اُس نے کہا اور سر جھکا کر کھرنجے کی اینٹوں کو دیکھنے لگا۔ ہم سب ہی خاموش تھے اور اپنے دلوں میں مختلف احساسات کو جگہ دے رہے تھے۔ کچھ لمحے اسی عالم میں گزرے۔ پھر خاموشی کو بیگم نے توڑا۔ وہ مُلّا کی حمایت میں بول رہی تھیں۔ میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا تو وہ مجھ سے کہنے لگیں۔

"کسی کا تو آدا خراب ہوتا ہے اس کا تو کھدانا ہی خراب ہے۔"

دن چھپنے سے اِک ذرا دیر پہلے ہم زلف اور ان کے بال بچے بھی آ گئے۔ رات کے کھانے تک گھر بھر میں خوب چہل پہل رہی۔ سالی کی بچیاں کبھی مسالہ پیسنے میں لگی رہیں۔ کبھی اُپلے توڑنے میں۔ ہم زُلف ہمیشہ کی طرح اس بار بھی مجھ سے شکایت کر رہے تھے کہ میں ان کے لیے بمبئی سے پاپلیٹ مچھلی نہیں لایا۔ اُدھر نل کی سیٹی چوں چوں اس ساری بھاگ دوڑ اور گفتگو میں پس منظر موسیقی کا رول نبھا رہی تھی۔ تقریباً آٹھ سوا آٹھ بجے سب دسترخوان کے گرد بیٹھ چکے تھے تو ہم زلف نے نخفی کے بارے میں دریافت کیا تو بھائی اسد نے منھ بناتے ہوئے پھر ایک بار نخفی کو صلواتیں سنانی شروع کیں۔ میں نے ہاتھ روکتے ہوئے ان سے پوچھا۔

"وہ اتنی ہی بُری تھی تو اپنے گھر میں کیوں جگہ دے رکھی تھی۔"

"یہاں تو دنیا بھر کے لخیتڑوں کو پناہ مل جاوے ہے۔"

"کیوں؟"

"اکیلے جو ہیں گے! ہمارے پُرکھے یہ حویلیاں چھوڑ گئے ہیں گے۔ ایک آدھے کو دوسرا تو کے لیے ڈالنا ہی پڑے ہے۔ ورنہ ان دیواروں سے ہی ڈر لگے ہے۔"

"میرے خیال میں ساری غلطی نخفی کی نہیں۔ اس کی سسرال والے بھی ذمہ دار ہوں گے۔ میں نے اپنی رائے ظاہر کی تو بیگم نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ اس کا کھدانا ہی خراب ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"میں چھوٹی سی تھی تب ہی بگڑ چکی تھی ہم زلف نے قدرے جھجکتے ہوئے آہستگی سے میرے کانوں میں کہا تو منھ کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ روک کر میں نے ان کی طرف دیکھا اور پہلو بدل کر رہ گیا۔ بھائی اسد نے غور سے میری طرف دیکھا اور پھر ایک ایک لفظ پر زور دے کر مجھ سے بولے،

"بے کار سوچ رہے ہو ان کے بارے میں۔ کمین لوگ ہیں یہ۔"

بھائی اسد کا ریمارک سن کر میں نے نوالہ پلیٹ میں چھوڑ دیا۔ فوراً ہی سب میری طرف متوجہ ہو گئے پھر اُنہوں نے ایک دوسرے کو یوں دیکھا جیسے کوئی میری اس حرکت کا مطلب جانتا ہو گا۔

اسی دوران پانی کا گلاس ختم کر... نے کے ... میں اُٹھ کر کمرے میں گھُس گیا۔ سالے کے ریمارک ... میرا موڈ خراب کر دیا تھا۔ کمرے میں بستر پر لیٹنے ... بعد میں نے سگریٹ جلایا۔

اور میں لمبے لمبے کش لیتے ہوئے سوچنے ... کہ شمالی ہند کے نجیب الطرفین آج بھی صرف ا... زیورات کو کھرا سمجھتے ہیں۔ اُدھر باہر دالان میں ... دسترخوان پر بیٹھی بیگم اپنے بھائی کو میری ناراضگی کی اطلاع دے رہی تھی۔ اور وہ بڑی معصومیت سے اس کا سبب دریافت کر رہے تھے۔

پہلی بچّی کی پیدائش کے موقع پر ز... نہ رُکنے کی بہ نسبت اس مرتبہ مجھے کچھ زیادہ ہی ٹھہر... پڑا۔ کیوں کہ میرے اپنے گھر کا شیرازہ بکھرنا شرو... ہو گیا تھا۔ چوں کہ میں اس جھمیلے میں ملوّث نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا بمبئی سے چلتے وقت ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ اب لوٹ کر ابنوں میں ... جاؤں گا بلکہ دہلی ہی میں کہیں ملازمت کر لو... دبی دبی زبان سے بیگم نے میرے خانگی معاملا... سے اپنے گھر والوں کو آگاہ کر دیا تھا۔ تاکہ ہمار... بڑھتے ہوئے قیام کی مدت ان کے ذہنوں ... کو جنم نہ دے۔

اس بار بھی بیٹی پیدا ہوئی۔ بیگم کا منھ ... گیا۔ ساس کی آنکھوں میں بھی سراسیمگی کے سا... صاف دکھائی دینے لگے۔ بچّی کو غسل دے کر ... نے میری طرف بڑھایا تو میں نے مسکراتے ہوئے ... ہاتھوں پر اُٹھا کر خدا کا شکر ادا کیا۔ ساس ...

میں دوڑتے بھاگتے سراسیمگی کے سائے رخصت ہوئے۔ بچی کے کانوں میں اذان اور اقامت کہہ کر میں نے اُسے ساس کی طرف بڑھا دیا اور دائی کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اپنے دوپٹے کا آنچل دونوں ہاتھوں پر پھیلائے میرے سامنے کھڑی تھیں۔ میں نے سوالیہ انداز میں ساس کی طرف دیکھا۔ پہلی بچی کے موقع پر یہ معاملات ساس نے نمٹائے تھے اور میں اس علاقے کے طور طریقوں سے ناواقف تھا۔ اسی لیے بے اختیار میری نظریں ساس پر پڑی تھیں۔

"حکیمنی کی طرف کیا دیکھو۔ اِنگے دھی کے ہونے پر ساڑھے تین اور پوت پہ گیارہ روپئی اور ایک جوڑا دیوے ہیں۔"

دائی نے مجھے آگاہ کیا۔ میں نے دوبارہ ساس کو دیکھا تو وہ تائیدی انداز میں سر کو جنبش دے رہی تھیں۔ میں نے جیب میں سے روپے نکالے۔ اکیاون روپے گن کر دائی کے دوپٹے پہ رکھ دیے۔ اس نے تشکر آمیز انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے آنچل سمیٹا۔ دُور ہی سے میری بلائیں لیں۔ اور اپنی کنپٹیوں سے اک ذرا اوپر ہاتھوں سے جاکر انگلیاں چٹخانے کے بعد زچہ خانے کی طرف بڑھ گئیں۔

نو دس روز بعد جب بیگم چلّہ نہا چکیں تب میں دہلی کے لیے روانہ ہوا۔ اپنے کام کا تجربہ تو تھا ہی۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد لاجپت نگر کی سپنا مارکیٹ میں شیشے کی دُکان پر کانچ کاٹنے کی نوکری مل گئی۔ ہفتہ عشرہ بعد قریب ہی ایک بستی میں رہائش کی خاطر ایک کوارٹر کا بندوبست بھی ہو گیا۔ ڈیڑھ ماہ بعد سیراں پور جا کر میں بچوں کو لے آیا۔ زندگی پھر روزمرّہ کے معمولات کی نذر ہونے لگی۔ نسیم، فہیم اور بیگم کے علاوہ میری زندگی میں کچھ تھا تو معمولات کا وہ سلسلہ جو ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتے ہی شروع ہوا اور شاید دمِ آخر ختم ہو تو ہو۔

کبھی کبھی ایک دم سے میراں پور یاد آنے لگتا۔ ساس، سالی، سارتھو اور بھیا اسد کے چہرے نگاہوں کے سامنے آتے۔ اکثر جب بچے سو جاتے تب میں سوچتا کہ مجھے اپنے باپ کی یاد کیوں نہیں آتی۔ چھوٹے بڑے بھائی بہنوں کو فراموش کرنے میں کس طرح کامیاب ہو گیا؟ ہمارے اختلافات اس نوعیت کے تو ہرگز نہ تھے کہ تعلقات کی ڈور توڑ دی جائے۔ لیکن ہمارے بیچ جس قسم کی سرد مہری قائم تھی وہ جلد یا بدیر اس کی شکستگی کا باعث بن سکتی تھی۔

ایک دن سود اسلف لینے کے بعد گوشت خریدنے کے ارادے سے نظام الدین گیا تو دوکان پر مجھے نھنی مل گئی۔ ہم نے خوش گوار حیرت بھرے انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ خیریت معلوم کی۔ میں نے اپنا پتہ بتانے کے بعد گھر آنے کی دعوت دی تو وہ منھ بناتے ہوئے بولی۔

"مشکل ہے گا میرا آنا بھائی جی یہ سورے مَردوے بھی عجیب ہوا کریں۔ کھد تو حرام کے جنے اِنگے اُنگے جھانکے پھروں جا اور جو ہم نے کسی کو دیکھ لیا تو آفت کا ڈریں۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مگر ایک بات تو بتاؤ۔ تم نے ملاّ کو کیوں چھوڑ دیا؟"

"اجی کیا کروگے پوچھ کر ——— حرام کے پِلّوں نے یہی کہا ہوگا۔ میں بھاگ یائی۔ یوں نا بتایا ہوگا ناس گئوں نے، ہم نے کیا کیا۔"

"چلو تم ہی بتا دو۔"

"اُتّے ناس گئے حرامی تھے سارے۔ اجی میرا بس ہی نہ چل کے دیا ورنہ سوروں کی بھلا ند میں آگ دھرتی میں۔"

"اوہ ——— کچھ بتاؤ گی بھی یا گالیاں ہی بکتی رہوگی۔"

"اجی ——— جب لو حکیمن کے پڑے رہے جو کچھ بیتے تھی۔ بس ایک ہی نٹ کھٹا تھا۔ وہ حرام کا جنا دیر سے آوے تھا جوا کھیل کھال کے۔ پھر جانے کیا ہوا۔ وہ اپنی ماں کے بہکاتے میں آن گیا۔ ہم اپنے گھر چلے گئے۔ پر بھائی جی۔ اِنگے جانا ہی غضب ہو گیا۔ حرامی تو رات رات بھر جوا کھیلا کرے تھا۔ اندر موٹا اس چکر میں تھا کہ مجھے پھر نو لائے۔ پر مصیبت تو تب آئی جب ملاّ کا چاچا سکور ایک رات میرے کنے آن پڑا۔ پہلے میں تو لیو سمجھی جانو ملاّ آگیا ہے گا اور موج مستی کر رہا پر جب مجھے لگا کوئی اور ہے گا تو میں نے دُر کا میا بُڈھا تو بھاگ لیا۔ پر کم بختی ماری ساس نے بڑی ہونگ مچا دی۔ مجھے آوارہ، بدماس، اِنال، چھنال کہتی رہی۔ جانو ہو کیوں، بُڈھے سکور کا کہنا جو ماتا۔ بھلا کوئی بات بھی تھی۔ جوان جہان مسٹنڈے موٹے کو تو دھورے آنے نہ دیا میں نے۔ اس بُڈھے کو بکل میں پڑا لیتی۔ میں پڑاؤں بھاڑ و کو۔ اس سے تو میں بھاڑ و بھی نہ دلوانے کی اپنے آنگن میں۔"

"ہوں ——— کسی کا آوا خراب ہوتا ہے ان کا کھدا یا ہی خراب ہے۔ غیر ارادی طور پر نھنی کے متعلق بیگم کا تبصرہ میری زبان پر آگیا۔ نھنی نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر آہستہ سے بولی۔

"ٹھیک ہی کہو ہو بھائی جی۔ بعد کو میں نے برادری کے آگے بات رکھنی چاہی تھی...... جانو ہو اس بُڈھی ڈلاّ نے کیا کہا۔ وہ حرام کی کہوے تھی بہو کیا کرنے جا رہی تو...... گھر کی گھر میں رہنے دے۔ باہر نہ کال۔ یوہی بات مارے رستے داروں نے بھی کی۔ بس جی۔ ویں دن میں نے گھر نہ کالی پر اگلے دن کھد نکل یائی۔ یہاں ایک بھلا مانس ٹکرا گیا مجھ سے۔ پر سورا سک کرے ہے مجھ پہ۔"

"پر تم اپنے بچے کو کیوں چھوڑ آئیں؟"

"میرا بچہ۔ اپنے گھر سے لائی تھی وے؟ ملاّ کا تھا۔ وسی کے دھورے چھوڑ یائی۔ مجھے کیا پڑی تھی دوسرے کی بلا مٹھائے پھرنے کی!"

پھر ایک دم سے وہ چونکی جیسے اچانک ہی اُسے کچھ یاد آگیا ہو۔ دوسرے ہی لمحے سلام کرنے کے بعد وہ مُڑ گئی۔ میں گوشت کی تھیلی لیے اس وقت تک کھڑا رہا جب تک نھنی میری نگاہوں کی حدوں سے نکل نہ گئی۔ گھر پہنچنے کے بعد میں نے بیگم

[illegible] سے ملاقات اور ہمارے درمیان ہوئی گفتگو کا خلاصہ بتایا تو وہ افسردہ سی ہوگئیں۔

یونہی دو سال بعد ہم ایک مرتبہ پھر بمبئی میں تھے۔ دہلی سے آنے کے بعد مجھ پر کچھ ایسی برساتیں گزریں کہ مجھے خود اپنا بھی ہوش نہ رہا۔ یاد رہا تو بس اتنا کہ روز کنواں کھودنا ہے اور اسی بیگار کے طفیل اشیائے خورد و نوش کا حصول ممکن ہے۔ اس عرصہ میں دو تین مرتبہ میراں پور کے چکر بھی لگے۔ لیکن ننھی اور اس کی داستان حافظہ کے کسی ایسے گوشے میں جا پڑی تھی، جہاں خاصی تعداد میں نبولیوں صفت یادوں کا ڈھیر تھا اور ان حالات میں مجھ میں ہرگز اتنا یارانہ تھا کہ یادداشت کی چھڑی سے اس ڈھیر کو بکھیرنے کی حماقت کرتا۔ برسوں بعد ایک بار پھر مجھے میراں پور جانا پڑ گیا۔ بھتیجا اسد نے ہمیں اطلاع دی کہ ان کے بڑے بھائی مشرف کا کراچی میں انتقال ہوگیا ہے اور ہم یہاں بھی ان کا چہلم کر رہے ہیں۔ میں نے بیگم سے ساتھ چلنے پر اصرار کیا تو جوانی کی دہلیز پر کھڑی بچیوں کا حوالہ دے کر انہوں نے انکار کر دیا۔ مجبوراً میں تنہا ہی میراں پور پہنچا۔ چہلم کی مجلس اور مرنے والے کے کردہ و ناکردہ گناہوں کا بوجھ ہلکا کرنے کی غرض سے بھتیجا اسد نے اپنی ہی برادری کے پیٹ بھرے۔ میر صاحبان کی ضیافت کی تھی۔ میں خاموشی سے سارا تماشا دیکھتا رہا اور تیسرے روز وہاں سے رخصت ہو کر دہلی پہنچا۔ بیس روپوں کے عوض جنتا ایکسپریس میں مجھے اوپر کی برتھ مل گئی۔ برتھ پر لیٹتے ہوئے غیر ارادی طور پر میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ خاصی بھیڑ تھی۔ سامنے نیچے کی برتھ پر کالے سوٹ اور سبز دوپٹے میں ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ چہرہ گھونگھٹ کی اوٹ میں تھا۔ اس کے برابر ہی ادھیڑ عمر کے دو تین مرد تھے۔ ٹھیک اس کے سامنے والی برتھ پر ایک نو عمر لڑکی ایک لڑکے سے سٹی بیٹھی تھی۔ ان کے دائیں بائیں بھی کچھ لوگ تھے۔ مقررہ وقت پر ٹرین نے رینگنا شروع کیا۔ میں نے کروٹ بدل کر سونے کا ارادہ کیا۔۔۔ کیوں کہ بس کے تین چار گھنٹے کے سفر نے مجھے تھکا دیا تھا۔ ابھی سونے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ پلکوں کے کواڑ خود بخود کھل گئے۔ وہ آواز...... جانی پہچانی تھی.....

"یو تیرا کیا لگے ہے گا؟"

میں نے کروٹ بدل کر دیکھا۔ کالے سوٹ اور سبز دوپٹے والی عورت نوجوان لڑکی سے مخاطب تھی اور اس لڑکی کی آنکھوں سے اضطراب جھانک رہا تھا۔ وہ جو اس سے لگا بیٹھا تھا، وہ بھی بدحواس تھا۔

"ارے ساتھ کیا لگے اس کا؟"

"میں اس سے شادی کرنے والا ہوں۔۔۔

لڑکے کے جواب پر سب ہی ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"اور کہاں جا رہے ہو تم دونوں؟

"ہم..... بی..... ہم.. وہاں لڑکا ہکلانے لگا۔

"ہوں۔۔۔ تو لونڈیا کو بھگا لایا ہے۔۔۔ کیوں؟۔۔۔ دونوں نے ایک دوسرے کو بیچارگی سے دیکھا اور سر جھکا لیا۔ لڑکی اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے بیٹھی تھی۔ کالے سوٹ والی نے پھر کہا۔

"ارے باؤلو! چُپ کا گُڑ ٹھونس کر نکلے ہو گھر سے۔ میں کہوں۔ اب بھی کچھ نہ بگڑا۔ اگلے پہ گاڑی تھمے گی۔ گھر لوٹ پڑو۔ اور تُو کان کھول کر سن لے لونڈیا۔ عورت جات کی دو کھونٹیں ہوا کریں۔ ایک باوا کی، دُوجے خصم کی۔ میں تو دیکھتے ہی جان گئی خصم والی نا ہے گی۔ سن بھی رہی یا نا؟ اری باؤلی۔ رستے وہی بکتے ہوا کریں جو گھر کے بڑے کیا کریں۔ سمجھے ہے نا۔ میں کیا کہہ رہی۔

وہ دونوں سر جھکائے بار بار تھوک نگل رہے تھے۔ اور کمپارٹمنٹ میں دیگر افراد خاموشی سے صورتِ حال کا جائزہ لے رہے تھے۔

"کیا سوچ رہو تم دونوں۔ کہاں کے ہو۔

لڑکے نے پھنسی پھنسی آواز میں بتایا کہ دونوں ہی سہارن پور کے کسی نواحی علاقے کے ہیں۔

"میری مانو سہارن پور لوٹ جاؤ۔ مجھ سوال سڑی سودائی نے تمہیں دیکھتے ہی تاڑ لیا کہ گھونٹ تڑا کے بھاگے ہو تم دونوں۔ بمبئی پہنچ گئے تو.....'

"یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اس طرح گھر سے نکلنا غلط ہے۔ ایک مسافر نے سمجھایا۔

"ہاں بچو! گھر لوٹ جاؤ۔ بڑے مان جائیں تو بیاہ کر لینا۔ ورنہ صبر کر لینا۔ دوسرا مسافر بھی بولا۔

پر..... پر..... ہم جائیں کیسے؟ جو پیسے تھے ان سے ٹکٹ خرید لیے۔ اب تو ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔

لڑکی نے بے ساختہ اپنی مجبوری ظاہر کر دی۔ کچھ دیر کی خاطر کمپارٹمنٹ کے اس حصے پر خاموشی چھا گئی جو میری توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا۔ سب سے پہلے اسی آدمی نے اپنی جیب میں سے کچھ چھوٹے نوٹ نکالے اور لڑکی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔

"اسے رکھ لو بیٹی۔ میری پاس یہی تھے۔

نیکی کی ایک لہر اٹھی۔ پھر کئی ہاتھ ان کی طرف بڑھے۔ ذرا سی دیر میں تیس پینتیس روپے لڑکی کے ہاتھ میں پہنچ چکے تھے۔ میں نے بھی جیب میں ہاتھ ڈالنے کی خاطر اپنے جسم کو اک ذرا سا ترچھا کیا اور اتفاق سے سامنے نیچے کی برتھ پر بیٹھی کالے سوٹ اور سبز دوپٹے والی عورت نے بھی اسی لمحے پہلو بدلا۔ بلاشبہ وہ ننھی تھی۔ اور وہ اپنی شلوار کے نیفے میں انگلی ڈالے ہوئے تھی۔ دوسرے ہی لمحے ننھی نے ہاتھ کھینچ اور اس لڑکی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی

"یہ رکھو اپنے دھورے۔ (بقیہ صفحہ ۳۴ پر)

حمید سہروردی



میں دھرتی نہ بادل

بجلی آہستہ آہستہ ہی کہتی رہی اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ کیوں نہ ہو. . . . بجلی کی آواز مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ اُس نے جب راجو سے کہا تھا۔ تم ہر جگہ اپنا روپ بدل لیتے ہو اور اپنی ہی ترنگ میں سرشار رہتے ہو۔

راجو صرف مسکرا کر رہ گیا تھا۔

بجلی کو ادھر چند دنوں سے راجو کی حرکتیں کچھ عجیب سی لگ رہی تھیں۔ راجو کبھی کچھ کہتا اور کبھی کچھ —— ایسا لگتا کہ وہ بہروپیا ہے —— مجھے کیا کرنا ہے۔ میرے ساتھ تو وہ بالکل سچا سچا سا لگتا رہتا تھا۔ پتہ نہیں وہ کب مجھ سے جھوٹا موٹا ہی سوانگ بھرے۔ سوانگ کیا۔ مجھے اب کبھی ایسا لگتا ہے وہ سارے کا سارا جھوٹا ہے۔ ہر وقت نئی بات، نئے رنگ اور نئے طور —— اس کا کیا بھروسہ، کب کیا کہہ دے۔ آج وہ آجائے تو میں صاف صاف ہی کہہ دوں گی۔ بجلی کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا ہے اور ایک جا رہا ہے، لیکن اُس نے اب تک کوئی فیصلہ نہیں کیا کہ اُسے کیا کرنا ہے؟

بجلی سوچتے سوچتے پلنگ پر دراز ہو گئی۔

چند منٹوں کے لیے اُس کی آنکھ لگ گئی۔ پھر وہ اچانک خوف کے مارے جاگ گئی۔

رات دھیرے دھیرے گزر رہی ہے۔

ایک دم اُس نے بند آنکھوں میں ایک ہجوم کو خطرناک ہتھیاروں سے لیس بھاگتے ہوئے دیکھا تھا اور چاروں طرف اُسے خون ہی خون نظر آ رہا تھا —

بجلی چونک کر اُٹھ بیٹھی —— کمرے میں ٹیوب جل رہا تھا۔ ماحول پر ایک قبرستانی سناٹا طاری تھا۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں —— صرف میں ہی میں ہوں۔ پھر آج راجو کیوں نہیں آیا۔

سفید رنگ —— لال رنگ ——

لوگوں کی بھگدڑ —— خواب اور حقیقت ——

پھر میں کہاں جا رہی ہوں۔ کس دن کے لیے میں یہ دن گزار رہی ہوں۔ آج تو نوکر بھی نہیں آئے۔ ایسا کیوں ——؟ بابو تو ہر روز آیا کرتا تھا۔ اور رانی تو کسی دن چھٹی ہی نہیں لیتی —— وہ تو آج اپنے گھر پر نہیں تھا۔ پھر رانی کہاں گئی ہوگی۔ کس نے بلا لیا ہوگا —— مگر بابو، بابو کہاں مر گیا؟ بابو کی جورو تو حاملہ ہے۔ وہ خود آج دوپہر میں بابو کو تلاش کرتے ہوئے آئی تھی۔ کہیں بابو کی جورو نے بچہ تو نہیں جنا ہوگا؟ ہو سکتا ہے بابو اپنے بچے کی خوشی میں نہیں آیا ہوگا۔ بابو کی جورو بھی کتنی خوش قسمت ہے۔ سماج میں سر اُٹھا کر چل سکتی ہے۔ مگر بابو ہر روز تاڑی پی کر اُسے خوب پیٹتا ہے۔ پیٹتا ہے تو کیا ہوا۔ ہے تو وہ بابو کی پیاری — اُس کے گلے میں اُس کا ہی تو منگل سوتر ہے اور اس کی کوکھ سے بابو ہی کے تو بچے پیدا ہو رہے ہیں۔ پھر بابو کی جورو تو اُس دن، اپنے رشتہ دار کی شادی میں لہک لہک کر، جھوم جھوم کر شادی کے گیت گا رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ شادی اُس کی اور بابو کی ہو رہی ہے۔ اُس دن کس طرح بابو کی جورو نے کہا تھا کہ میں اب بابو کے ساتھ جیون بسر نہیں کر سکتی۔ پھر بابو کیوں کر اُس کے سامنے سر جھکائے ہوئے کھڑا ہوا تھا۔ یوں جیسے میری جان! تم جو بھی کہو گی میں مان لوں گا —— بابو کی جورو نے کس انداز سے کہا تھا اب بابو تاڑی نہیں پیا کرے گا —— بابو کی جورو اُس وقت کتنی خوش تھی۔ ہاں اگر بابو تاڑی پی کر آجائے گا تو میں اُس کا گھر چھوڑ دوں گی۔ بابو نے تاڑی کے نشے میں کہا تھا۔ ہاں ہاں تاڑی پینا چھوڑ دوں گا۔ تو کیوں گھر چھوڑ کر جاتی ہے۔ کس کے پاس جائے گی۔ کیا تیرا کوئی اور یار ہے؟ —— دیکھو تو زیادہ ٹک ٹک کرتی رہے گی تو میں تجھے سیدھے ریل کی پٹری کے نیچے پھینک دوں گا. . . . .

صدر شعبۂ اردو میسرز کے۔ ایس کے کالج، بیڈ ۴۳۱۱۲۲ (مہاراشٹر)

جا جا بہت آیا ۔۔۔۔ بڑا بابو بن کر ۔
مجھے ٹرین کے نیچے پھینک دے گا ۔
بابو اپنی جورو کی طرف مارنے کے لیے بڑھ رہا تھا ۔ میں نے ہی تو اُسے روک دیا تھا ۔ پھر دونوں ایک ساتھ رونے لگے تھے ۔ اپنے ماتا پتا کو روتے ہوئے دیکھ کر اُن کے دونوں بچے بھی رو رہے تھے ۔ مجھے یہ سب کتنا اچھا لگ رہا تھا گھر بھرا بھرا ہو تو آدمی سورگ کو بھی بھول جائے ۔ مگر جو نرک سے گزرتے رہتے ہیں، ان کا کوئی نہیں ہوتا ۔۔۔۔

بجلی ٹہلتے ٹہلتے، پھر اپنے پلنگ پر آ کر بیٹھ گئی ۔ کیا کیا جائے ۔ کیوں نہ فارم پر فون کر کے پوچھ لیا جائے ۔ راجو کہاں گیا ہوا ہے؟ بجلی فون کے قریب جاتی ہے ۔ پھر سوچتی ہے ۔ اتنی رات گئے راجو اگر وہاں نہیں ہوگا تو فون کون اُٹھائے گا ۔ کوئی نہ کوئی تو وہاں موجود ہوگا ۔۔۔۔ ٹھیک ہے فون کر لینے میں کیا حرج ہے ۔۔۔۔ بجلی فون کا نمبر گھماتی ہے اور چونکا اُٹھاتی ہے اور حیرت کے سمندر میں اِدھر اُدھر ڈولنے لگتی ہے ۔

ایک نسوانی آواز اُدھر سے آتی ہے ۔

"ہاں، صاحب آفس میں ہی ہیں ۔ باہر کے کسی ملک سے ایک پارٹی آئی ہوئی ہے ۔ کوئی سودا طے کر رہے ہیں ۔"

"یہ میٹنگ کب تک چلتی رہے گی؟"

"پتہ نہیں کب تک چلتی رہے گی ۔ تم کون ہو؟"

میں واقعی، میں کون ہوں، اُن کی؟

خود کو سنبھالتی ہوئی بولتی ہے

"کہنا میرے گھر سے فون آیا تھا ۔"

"میرے گھر سے فون آیا تھا ۔ کیا بات ہے آپ اپنا نام بتائیے؟"

"بس تم اتنا ہی کہہ دو ۔ میرے گھر سے فون آیا تھا ۔"

"ٹھیک ہے ۔ کہہ دوں گی ۔"

بجلی نے فون رکھ دیا ۔ ٹھیک ہے ۔ میں کون ہوں ۔ میں کچھ ۔۔۔۔ میں اپنے آپ کو کیا کہوں؟ راجو کے پاس تو میرے لیے بہت سے شبد ہیں ۔ پر میں اُسے کیا کہہ سکتی ہوں ۔ پھر یہ سب کچھ بس گزر رہا ہے ۔ بابو کی جورو کو روزانہ وہ مار پڑتی ہے اور بابو روز تاڑی پیتا ہے ۔ وہ ایک دوسرے کو پتی پتنی کہہ سکتے ہیں اور بلا جھجک بچے بھی پیدا کرتے رہتے ہیں نہ بابو کی جورو بابو کو چھوڑتی ہے اور نہ بابو تاڑی کو چھوڑتا ہے ۔ اور نہ ہی اپنی جورو کو ۔۔۔۔

راجو نے آج تک مجھے مارا نہیں اور نہ ہی بچے پیدا کرنا پسند کرتا ہے ۔ ہر وقت نت نئے طریقے ۔۔۔۔ پھر میں کہاں ہوں ۔۔۔۔ میں نے آج تک اُس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تمہارے کاروبار کیا ہیں؟ اور نہ ہی مجھے اس کے فارم کا پتہ معلوم ہے ۔ میں کس طرف سے گزر رہی ہوں ۔۔۔۔ آنے والے دنوں کے نام کیا ہو سکتے ہیں؟ یہ کہنا کتنا آسان ہے ۔ ہم دونوں اپنا جیون سُکھ سے گزار سکتے ہیں ۔۔۔۔ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے ۔ وہ آئے گا ۔ اُس نے تو کبھی یہ نہیں کہا میں تمہیں چھوڑ دینا چاہتا ہوں ۔ پھر مجھے یہ خیالات کیوں پریشان کر رہے ہیں ۔ کیوں ۔۔۔۔ میں کیا کھو رہی ہوں ۔ میرے پاس اب رہ ہی کیا گیا ہے ۔۔۔۔ میں نے اُسے سب کچھ سونپ دیا ہے ۔ مگر اُس نے کبھی اپنا آپ نہیں سونپا ۔۔۔۔ وہ لڑکی جو فون پر بات کر رہی تھی وہ کون تھی؟ پھر اتنی رات گئے اُس کے فارم میں ۔ اتنی رات گئے لڑکی ۔۔۔۔ اور وہ ۔۔۔۔ کیا وہ بھی میری طرح ریت میں گھروندے بنا رہی ہے ۔ باہر ملک کی پارٹی سے کیا تعلق ہے اُس کا ۔ اُس نے تو کہا تھا کہ وہ تو بس ایک کمیشن ایجنٹ ہے اور اپنا کوئی خاص آفس نہیں ۔ کہیں وہ لڑکی کسی اور کے بارے میں تو جواب نہیں دے رہی تھی ۔ پھر ایک بار فون کر لیا جائے ۔ کہیں رانگ نمبر تو نہیں تھا

بجلی ڈائل گھماتی ہے ۔ پھر اُدھر سے وہی آواز ۔۔۔۔ مگر اس مرتبہ لڑکی کا لہجہ تلخ اور تیز تھا ۔۔۔۔ "کیوں ۔۔۔۔ نہیں، رانگ نمبر نہیں ۔ دیکھو میں نے راجو سے کہہ دیا ہے ۔" میرے گھر سے فون آیا ہے ۔" مگر اُنہوں نے کوئی کیئر (Care) نہیں کیا ہے ۔۔۔۔ تم سو جاؤ ۔۔۔۔"

بجلی نے غصّہ سے کہا ۔" اے لڑکی بدتمیزی سے بات نہ کر ۔ خاموش ہو جا ۔"

"تم کون ہو؟ مجھے لڑکی کہہ رہی ہو ۔۔۔۔ ذرا ہوش سنبھال کر بات کر، تیری حیثیت ہی کیا ہے ۔ تو کون ہے؟"

بجلی کو کاٹو تو لہو نہیں ۔۔۔۔ اُس نے فون رکھ دیا اور خاموش چھت کو گھورنے لگی ۔

میں ۔۔۔۔ میں کون ہوں؟

میں دھرتی نہ بادل
میں دھرتی نہ بادل
میں دھرتی نہ بادل ۔

●

بقیہ : ساتھی

اب او کھلا آ دے گا ۔ میں سبھی اُنگے اُترو لوگ کُھدری ٹکٹ بھیجو ۔ اپنا بھی اور اس کا بھی ۔ سبھی رہی یا یونہی دیدے پھاڑے دیکھو جاگی؟"

لڑکی نے ہاتھ بڑھا کر نفی سے سو روپے کا نوٹ لے لیا ۔ جیب میں پڑا ہوا میرا خالی ہاتھ نکل آیا ۔

ٹرین کی رفتار بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی ۔

غیر طلبیدہ مضامین نظم و نثر کی واپسی کے لیے مناسب سائز کا ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ ارسال فرمائیں ۔
(ادارہ)

گربچن سنگھ

درد اور سمندر

لہروں نے ہمیں باندھ لیا تھا۔

اور جب میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو مجھے وہاں بے پایاں گہرائیاں نظر آئیں۔ اُس نے مجھ سے کہا۔ چلو۔ ورنہ لہریں ہمیں کھینچ کر ساگر کی اتھاہ گہرائیوں میں لے جائیں گی۔

لہروں کا خوف مجھے بھی تھا۔ ہم رفتہ رفتہ سرک کر سوکھی ریت پر آگئے۔ دن ابھی ڈوبا نہیں تھا۔ ریت گرم تھی۔ اس گرم ریت پر لیٹ جانے کو جی چاہا۔

چلتے چلتے اچانک ریت میں میرے پیر پھنس گئے۔ میں گرتے گرتے بچا۔ املا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ کہنے لگی اس بالو کے نیچے بھی سمندر ہے۔ اس کی لہریں تمہیں باندھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

میں نے اُسے اس طرح ہنستے ہوئے بہت کم دیکھا تھا۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے آگے بڑھنے لگے۔

پچھلے دن املا نے میرا ایک نوجوان سے تعارف کرایا تھا۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں آرہا تھا۔ میں پوچھ بیٹھا۔ "اُس کا نام کیا ہے؟"

"کس کا؟"

"وہ مریض، جس سے کل تم نے میرا تعارف کرایا تھا۔"

"وہ .... ہاں .... کمل ....! تم اُسے اتنی جلدی بھول گئے .....؟"

"مجھے بھولنے کی بیماری ہے۔"

کمل کی بات یاد آنے لگی۔ اُس نے کہا تھا۔ آہ --- ! ہم تینوں مریض ہیں۔"

میں نے سوچ رکھا تھا، اُس سے پوچھوں گا "تمہیں کیا بیماری ہے ....؟"

"آج وہ دکھائی نہیں دیا۔ میں نے اپنی نظریں دُور تک دوڑاتے ہوئے املا سے پوچھا۔

املا نے اپنی نازک اُنگلی سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ دیکھو۔ وہ بیٹھا ہے کمل ریت کے ڈھیر پہ ....!"

"ریت کے ڈھیر پہ؟"

"ہاں ....!"

"اس ریت کے نیچے بھی تو سمندر ہے...!"

املا تیز قدم بڑھاتی ہوئی اُس طرف چل دی۔ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے پاؤں کس کر جکڑ لیے ہوں ..... شاید لہروں نے۔

کچھ دُور جا کر املا نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور بولی۔ "جلدی آؤ .....!"

میں کھانسنے لگا۔ میرا دم پھولنے لگا تھا۔

وہ چند لمحہ کھڑی میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر لوٹ کر میرے پاس آئی۔ "کیا تھک گئے؟"

"نہیں تو .....!" میرے جسم میں ایک قوت عود کر آئی تھی۔

کمل اپنی جگہ سے اٹھ کر ہماری طرف آرہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔ ہم اشتیاق بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

جب وہ قریب آیا تو املا کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "املا، میں نے دُور سے تمہاری لہراتی، چمکتی سیاہ زلفیں دیکھی تھیں اور اس کے پیچھے اُچھلتی ہوئی سمندر کی لہریں۔"

"ہماری نظریں تمہیں ہی تلاش کر رہی تھیں۔" املا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور ہم سب لوگ وہیں ریت پر بیٹھ گئے۔

کمل بولا۔ "جی چاہتا ہے میں اس گرم ریت پر لیٹ جاؤں۔"

"آپ لیٹ سکتے ہیں۔" میں نے کہا

"اور آپ .....؟" اُس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

اے-۹، پنجابی لائن، رام داس بھاٹیہ، جمشید پور ۸۳۱۰۰۱

"میں رات چھانے سے پہلے ریت پر
لیٹنا مناسب نہیں سمجھتا۔"
"اودیناش ٹھیک کہتا ہے کمل۔"
املا نے میری تائید کی۔
ہم تینوں دوڑتے ہوئے آبی پرندوں
کی طرف دیکھنے لگے۔ اُدھر غروب ہوتے ہوئے
آفتاب کی روشنی میں سمندر کا پانی اُبلتے ہوئے
سونے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

اور اُس رات جانے کیوں نیند میری
آنکھوں سے غائب ہوگئی تھی جو پل بھر کو آنکھ لگی
بھی تو دیکھا، سمندر کی جوشیلی لہریں دہاڑتی
ہوئی آگے بڑھتی چلی آرہی تھیں۔ ایک جوگن
سر کے بال پھیلائے ساگر کے کنارے کھڑی ہے
لہریں اُسے اپنی باہوں میں باندھ کر ساگر کی
اتھاہ گہرائیوں میں لے جانا چاہتی ہیں۔
"کنارے سے ہٹ جاؤ۔" میں چیخ
کر کہتا ہوں۔
"بابو جی کیا ہوا....؟" نوکر نے مجھے
جگا دیا تھا۔
"کیا ہوا....؟"
"بابو جی آپ سپنے میں بڑبڑا رہے تھے۔"
"سپنا....!" میں بڑبڑا رہا تھا...
نہیں تو.... شاید سمندر میں طوفان آیا ہے۔"
"میں کمرے کی کھڑکی بند کر دیتا ہوں —
آپ سو جائیں۔"
"جانے کیوں نیند نہیں آتی۔"
"آجائے گی۔ آپ آنکھیں بند کر کے
لیٹے رہیں۔"
نوکر کو کیا پتہ بند آنکھوں میں کتنا بڑا
سمندر لہرانے لگتا ہے۔ نیند آئے تو کیسے آئے —
ہاں کمل ضرور گہری نیند سو رہا ہوگا۔

دوسرے دن تیسرے پہر جب ہم
گرم گرم ریت پر ٹہل رہے تھے۔ میں نے کمل سے
پوچھا۔ "میرے دوست کل رات تمہیں نیند آئی
تھی؟"
وہ اطمینان سے بولا۔ "کل مجھے بڑی گہری
نیند آئی۔"
املا نے کہا۔ "مجھے بھی۔"
ساگر سے کسی نے پوچھا تھا۔ "تم کیوں جاگتے
رہتے ہو۔ دن رات بے قراری میں کروٹیں لیتے رہتے
ہو۔ کیوں....؟"
وہ بولا تھا۔ "چاند مجھے جاگنے پر مجبور
کرتا ہے۔ چاند سے پوچھو۔ وہ کیوں جاگا کرتا ہے۔"
چاند نے کہا۔ "وہ اُروشی کی تلاش میں
ہے۔ ساگر سے پوچھو وہ کیوں روتا کانپتا
ہے....؟"
سوال جواب دونوں اپنی جگہ ہیں۔
میں نے املا سے پوچھا۔ "تمہیں اُس
چینی راجہ کی کہانی یاد ہے، جسے نیند نہیں آیا کرتی
تھی اور ایک بلبل اُس کے کمرے کی کھڑکی کے
قریب شاخِ گل پر بیٹھا نغمہ سرائی کیا کرتا تھا۔"
"ہاں.... لیکن یہ یاد نہیں کہ چینی راجہ
کو کیوں نیند نہیں آتی تھی۔ لیکن تم جانتی ہو،
بلبل تبھی گاتا ہے جب اُسے شاخِ گل پر پھول
کھلا نظر آتا ہے۔"
"میں نے کل خواب میں رنگ برنگے پھول
کھلے ہوئے دیکھے تھے۔"
"بہت خوب صورت سپنا ہوگا وہ۔"
املا نے مسکراتے ہوئے کہا۔
اُس کی باتیں میرے کانوں میں رس
گھولتی رہیں۔ میرے پیروں تلے ریت تپ
رہی تھی۔ میں اُس دن جلدی ہی آرام گاہ کی طرف
لوٹ آیا تھا۔ رات کو نیند نہیں آرہی تھی اور
مجھے کافی تیز بخار تھا۔
ڈاکٹر کی تاکید تھی۔ میں بستر پر لیٹے لیٹے
مکمل آرام کروں۔

دوسرے دن میں آرام گاہ سے باہر نہیں
نکلا۔ شام اُترنے سے پہلے میں نے کھڑکی سے باہر
جھانک کر دیکھا۔ دُور تک ریتیلا میدان، چلتے
پھرتے لوگ۔ یوں لگا سمندر کچھ پیچھے سرک گیا ہے۔
کل کچھ اور دُور سرک جائے گا۔ پرسوں کچھ اور دُور
دُور۔ بہت دُور ہوتا جائے گا اور پھر ریت
کے سوا اور کچھ نظر نہیں آئے گا۔
رات کو املا آئی اور شکایت بھرے لہجے
میں بولی۔ "تم ساحلِ سمندر پر آئے نہیں....!"
"مجھے ڈاکٹر نے مکمل آرام کرنے کو کہا ہے۔"
"آج ہم نے ڈھیر ساری کوڑیاں اور
سیپیاں اکٹھی کی تھیں۔"
"کس لیے؟"
"ہار بنانے کے لیے۔"
میں سوچتا رہا کتنا بچپنا ہے املا میں۔
کسی وقت معصوم بچوں کی طرح باتیں کرنے لگتی ہے۔
وہ میرے ساتھ بیٹھی کافی باتیں کرتی رہی تھی۔
جب وہ چلی گئی تو ماحول سونا ہو گیا تھا۔ جو خواب
میں نے گزشتہ رات دیکھا تھا، وہ اُس سے
بیان نہیں کر سکا تھا۔
آرام کی خاطر بستر پر لیٹے لیٹے چار چھ دن
بیت گئے۔ زندگی حرکت کا نام ہے جو چلتے چلتے
رُک جاتا ہے اُس میں ٹھہرے ہوئے پانی جیسا
تعفن اور سڑاندھ پیدا ہو جاتی ہے۔ شاید اسی لیے
ساگر ہمیشہ حرکت میں رہتا ہے۔
ساگر سے کسی نے پوچھا تھا۔ تم کیوں جاگتے
رہتے ہو....؟"
وہ بولا تھا "چاند جاگنے کو مجبور کرتا ہے۔
چاند کیوں جاگتا ہے۔ سوال اپنی جگہ ہے۔
میں نے اپنے کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر
اوپر آسمان پر کھلے ہوئے چاند کو دیکھا۔ سفر در سفر۔
متواتر سفر....! یہ کیا جنم جنم کے پھیرے ہیں....یا
ٹوٹتا ہے۔ ڈوبتا ہے۔ مر کر پھر زندہ ہو جاتا ہے۔
جی کر پھر مر جاتا ہے۔ مر کر بھی امر نہیں ہوتا۔

سویرے املا میری خیریت پوچھنے کو آئی ۔
چند باتوں کے بعد میں نے اُس سے پوچھ لیا " املا کیا تم پچھلے جنم کو مانتی ہو ؟ "

" مانتی تو ہوں ۔ لیکن پچھلے جنم کی کوئی بات مجھے یاد نہیں ۔"

" تمہیں ساگر اچھا لگتا ہے نا ۔ تم پچھلے جنم میں ضرور جل پری رہی ہو گی ۔

" اور تم ....؟ "

" تم ہی کہو ... "

" میں کچھ سوچ نہیں سکتی ۔"

" اور کمل کے بارے میں ۔"

" وہ دریائی گھوڑا رہا ہو گا ۔"

" دریائی گھوڑا .... آنکھوں کے سامنے کئی گھوڑے تیرتے دکھائی دینے لگے ۔

رُکا کون ہے ۔ سبھی تو حرکت میں ہیں۔
دوڑ رہے ہیں۔

دارجلنگ میں ایک بار ایک موٹر سائیکل سوار کو قلابازی کھا کر کھائی میں گرتے دیکھا تھا ۔
اس کی محبوبہ سڑک پر پڑی چیخ چلا کر مدد کے لیے پکار رہی تھی ۔ کوئی کر بھی کیا سکتا تھا ۔ کھائی گہری تھی ۔ اور وہاں اندھیرا تھا ۔

ڈاکٹر سے بہت کہہ سُن کر ٹہلنے کی اجازت لی ۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا نرم گداز ریت پر ٹہلنے اور سمندر کی خوشگوار ہوا میں میری طبیعت کو بڑا سکون ملتا ہے۔

ڈاکٹر نے ہدایت کی کنارے سے دُور رہا کرو۔

کنارے سے کچھ ہی دُور تو ناریل کے وہ دیوہیکل درخت کھڑے ہیں جن کے سائے تلے چیونٹے اور چیونٹیاں اپنا گھر بناتی ہیں ۔۔ کیکڑے انڈے دیتے ہیں۔ اُن درختوں تلے کی ریت کافی ٹھنڈی ہوتی ہے ۔

میں گرم گرم ریت پر چل رہا تھا ۔
کمل نے معافی مانگتے ہوئے کہا ۔ مجھے معاف کرو گے بھائی میں ایک دن بھی تمہاری خیریت معلوم کرنے نہیں آسکا ۔ دراصل بات یہ ہے کہ ڈاکٹر نے مجھے سیڑھیاں چڑھنے اُترنے کے لیے منع کر رکھا ہے اور تمہارا قیام ہوٹل کی دوسری منزل میں ہے ۔"

" میں تمہاری مجبوری جانتا ہوں کمل ۔"
پھر اُس کی نظریں آس پاس کچھ تلاش کرنے لگیں ۔

" املا نہیں آئی ....؟" میں نے پوچھا ۔

" پتہ نہیں کیوں نہیں آئی ۔ اس کے بغیر سارے ماحول میں سوناپن ہے ۔"

لہریں بدحواس سی کنارے سے ٹکرا رہی تھیں ۔ شور تو تھا ہی ۔

" املا کیوں نہیں آئی ۔"

" جانے کیوں نہیں آئی ۔" وہ بھی تو فلیٹ کی دوسری منزل میں رہتی ہے اور میں کہہ چکا ہوں ۔ ڈاکٹر نے مجھے سیڑھیاں چڑھنے اُترنے سے منع کر رکھا ہے ۔ ورنہ خود جا کر پتہ لے آتا ۔"

جانے کیوں اُس دن سمندر کی ہوا میں زیادہ نمی تھی ۔ میں کھانسنے لگا ۔ کھانسی کے جھٹکوں سے خون کا دباؤ بڑھ گیا اور آنکھوں کے سامنے تلّے ناچنے لگے ۔ کمل سے اور باتیں کرنے کو جی نہیں چاہا ۔

دوسرے دن املا کی زبانی پتہ چلا ۔ پچھلے دن وہ بہت کمزوری محسوس کر رہی تھی ـــ طبیعت بے حد سُست تھی ۔ اس لیے ساحل پر نہیں آسکی ۔ اُس نے گرم شال اوڑھ رکھی تھی ۔

میں نے کہا " تمہیں آرام کرنا چاہیے تھا ۔
یہاں ہوا بوجھل ہے اور ساگر گمبھیر

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دی ۔

میں نے پچھلی رات پھر خواب دیکھا تھا ۔
ساگر کی جوشیلی بپھری ہوئی لہریں چیختی ہوئی آگے بڑھی چلی آرہی تھیں ۔ اور ایک جوگن سر کے بال پھیلائے کھڑی ہے ۔ لہریں اُسے لپیٹ کر بے پایاں گہرائیوں میں لے جانا چاہتی ہیں ۔

اُس وقت میں املا کے مسکرانے کا مطلب بالکل نہیں سمجھ سکا ۔

ایک چھوٹا بچہ کھیلتے کھیلتے میرے بالکل قریب آکر کھڑا ہو گیا ۔ اس کی معصوم آنکھوں میں ایک عجیب سی سوالیہ چمک تھی ۔ میں پہلے کئی مرتبہ اُسے ساحل سمندر پر دیکھ چکا تھا ۔ کچھ دُور کھڑی اُس کی ماں اُسے پکار رہی تھی ۔

میں بچے سے بولا " جاؤ تمہاری ماں بُلا رہی ہے ۔ جی چاہا اُس کا پیار لے لوں ۔

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگا تاکہ میں بھی ساتھ چلوں ۔"

بچے نے دو چار بار میرا ہاتھ کھینچا اور پھر ماں کی اونچی پکار کے سامنے مجبور ہو کر اُس کی طرف چلا گیا ۔

املا کمل سے کہہ رہی تھی " میں ایک دن نہیں آئی تو تم میرے لیے اس قدر بے چین ہو اُٹھے اور اگر میں کہیں سمندر میں کھو جاؤں تو کیا تم میری تلاش کرو گے ....؟"

" ضرور ـــ تم تو موتی ہو ۔"

" اور اگر وہ موتی گہرائیوں میں کھو گیا تو ؟"

" تو میں بھی ساگر میں گم ہو جاؤں گا ۔"

املا ہنسنے لگی ۔" تو چلو ہم ساگر کی گہرائیوں میں ہمیشہ کے لیے کھو جائیں ۔ لہریں ہمیں اپنے دامن میں چھپا لیں گی ۔"

" سچ ....!" کمل کے چہرے پر ایک رنگ آیا ، ایک رنگ گیا ۔ یوں لگا جیسے وہ کانپ رہا ہے ـــ!

" تمہیں سردی لگ رہی ہے نا .....؟"
کہتے ہوئے املا نے اپنی شال اُسے اوڑھا دی ۔

مجھے لگا ساگر آج زیادہ چنچل ہے ۔

میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر ریت پر کسی کے پیروں کے نشان دیکھتا ہوا رفتہ رفتہ آگے بڑھنے لگا ۔

خواب میں، میں ایک ریگستان میں

بھٹک رہا تھا۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ سمندر سوکھ گیا تھا۔ پیاس سے میرا حلق سوکھا جا رہا تھا۔ کہیں ایک بوند پانی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ساگر میں پانی ہوتا بھی تو اس پانی سے کب کس کی پیاس بجھی ہے۔ ساگر تو خود پیاسا ہے۔

کبھی نا ساگر سے کوئی پوچھتا ہے۔ "تم تڑپتے کیوں ہو۔ بے قرار کیوں رہتے ہو؟"

وہ کہتا ہے چاند مجھے جاگنے اور تڑپنے پر مجبور کرتا ہے۔

چاند اروشی کی تلاش میں ہے۔

کل اروشی کی کہانی غلط ثابت ہو گی۔

میں ریت پر تنہا بیٹھا ہوا تھا۔

اُس وقت ساگر مجھے کچھ پرسکون نظر آ رہا تھا۔ کمل آیا اور وہ میرے قریب بیٹھ گیا۔ وہ کچھ تھکا ماندہ سا لگ رہا تھا۔ میں بولا۔ تم بڑے خوش قسمت ہو کمل....!"

"کیسے....؟"

"کسی کو تمہارا خیال رہتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

میں ریت سرکا سرکا کر ایک گڑھا سا کھودنے لگا۔ نیچے کی ریت گیلی تھی۔ میں نے کہا۔ "دیکھو گرم ریت کی تہہ میں پانی ہے۔"

اس نے میری بات پر دھیان نہیں دیا اور بولا۔ "جانے املا ابھی تک کیوں نہیں آئی۔"

"سنا ہے اُس کے یہاں کوئی آیا ہے۔"

"کون....؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ لیکن املا کو کل دل کا دورہ پڑا تھا۔"

اُس نے مجھ سے کوئی اور سوال نہیں کیا۔

میں نے کہا "املا دل کی مریض ہے۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو گے۔"

"مجھے بھی یہی شکایت ہے۔" کمل بولا اور وہ سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔

اس مختصر سی گفتگو کے بعد ہم کافی دیر تک خاموش بیٹھے رہے اور جب شام ڈھل چکی تھی۔ سمندر کا پانی سیاہ نظر آنے لگا تھا۔ ہم اپنی آرام گاہ کی طرف لوٹنے لگے۔

جاپن کے راجہ کی کہانی ذہن سے نکل گئی تھی اُسے نیند کیوں نہیں آتی تھی۔ روز نقلی بلبل کیا گایا کرتا تھا۔ کچھ یاد نہیں پڑتا۔

دوسرے دن پھر وہی اُداس شام تھی۔ سب کچھ پہلے جیسا ہی لگ رہا تھا۔ کمل میرے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ چہرے پر اُداسی اور ویرانی مسلط تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو....؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

چونکتے ہوئے اُس نے کہا "نہیں تو.... کچھ نہیں....!"

"املا آج بھی نہیں آئے گی۔" میں نے کہا۔

وہ اُداس نظروں سے ساگر کی طرف دیکھنے لگا۔

تب نہ ساگر نے نہ ریت نے اور نہ ہی کمل نے مجھ سے پوچھا 'ہم خاموش کیوں بیٹھے ہیں۔ کمل اختلاج قلب کا مریض ہے۔ اس کے حزن کا دباؤ ہمیشہ زیادہ رہتا ہے۔

میرے دل میں تڑپ ہے، بے چینی ہے۔ اور رات چاندنی ہے۔ ساگر سے کوئی پوچھے گا وہ کیوں تڑپتا ہے کیوں کراہتا ہے، کیوں چھٹپٹاتا ہے؟ وہ کہے گا چاند مجھے سونے نہیں دیتا۔ چاند کو اُروشی کی تلاش ہے کل اُروشی کی کہانی غلط ہو جائے گی۔

نوکر سونے سے پہلے میرے پاس آیا۔ رُندھی ہوئی آواز میں بولا۔ بہت بُری خبر ہے بابو جی۔ بہت بُری۔ آپ سوتے ہیں۔ میں کل سویرے آپ کو بتاؤں گا۔"

میں لیٹا ہوا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جلد بتاؤ کیا بات ہے؟"

"نہیں بابو جی آپ سو جائیں۔ میں کھڑکی کے پٹ بند کر دیتا ہوں۔"

رات کے سمندر میں جوار بھاٹا اُٹھا کرتا ہے۔

میں بولا۔ "ابھی کہو۔"

"سن کر آپ کو نیند نہیں آئے گی بابو جی۔"

اس کی آواز اُداسی سے اور بھیگ گئی۔

"نہیں ابھی کہو۔ کیوں کہ سنے بغیر بھی میں نہیں سو سکوں گا۔"

"بابو جی وہ دیدی وہ املا دیدی مر گئی۔"

"کیسے....؟ کیوں....؟" میں تڑپ اُٹھا جیسے ساگر کی ہولناک لہریں آئیں اور مجھے جکڑ کر کس کر گہرائیوں میں لے گئیں۔

میں نے نوکر سے اور کچھ نہیں پوچھا۔ اُس نے اور کچھ نہیں بولا۔ جاپن کے راجہ کو نیند نہیں آتی تھی اور بلبل گایا کرتا تھا۔ بلبل خاموش ہو گیا۔ ریت ٹھنڈی پڑ گئی۔ اب کون گھومے گا اُس پر۔ کون بکھری ہوئی کوڑیاں اور سیپ جمع کرے گا۔

سمندر ہولناک لہجے میں گرج رہا تھا۔

رات کو پھر نیند نہیں آئی۔ پل بھر کو بھی آنکھ نہیں لگی۔ گہری نیند سو جانے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن نیند نہیں آئی۔ اپنے دل و دماغ پر بھی تو اپنا قبضہ نہیں ہے۔ اس پر کسی اور کا قبضہ ہے۔

"کس کا؟"

"ایک عظیم غیبی طاقت کا!"

سوچتا رہا۔ لیکن آنکھوں سے ایک بھی آنسو باہر نہیں نکلا۔

کل یعنی گزشتہ رات آسمان پر پورا چاند تھا۔

آج ہم سمندر کے کنارے کافی پرے ہٹ کر بیٹھے تھے۔ وہاں کی ریت ٹھنڈی تھی۔ کیونکہ رات کو مدوجزر کافی اُٹھان میں تھا جو پورے ساحل پر چھا گیا تھا۔ ریت گیلی بھی تھی۔ ہم لوگ گرم ریت پر بیٹھنے اور ٹہلنے کے عادی تھے نا۔ میں کمل

کہنا چاہتا تھا آج ریت ٹھنڈی ہے۔

پیشتر اس کے کہ میں کچھ بولوں۔ وہ میری بغل سے اُٹھا اور کیچڑ ملی ریت پر ساحل کی طرف بڑھنے لگا۔

"ٹھہرو.....!" اُسے ٹوکتے ہوئے میں نے پوچھا۔ "کہاں جارہے ہو.....؟"

وہ مُڑ کر میری طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"آنا ہے تو میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

میں اُس کے ساتھ ہولیا۔ ہم بڑھتے گئے۔ ہلکی ہلکی لہریں ہولے سے آکر ہمارے پیروں کو گدگدا جاتی تھیں۔ ساگر پُر سکون لگ رہا تھا۔

وہ نیچے دھرتی پر یوں دیکھنے لگا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔

میں نے پوچھا "کیا دیکھ رہے ہو۔"

وہ بولا "نشان ڈھونڈ رہا ہوں۔ کہاں جلی تھی اُس کی چتا..... یہیں نا.....؟"

"کوئی نشان نہیں ملے گا۔" میں نرم لہجے میں بولا۔ "جانتے ہو میں نے کافی دن پہلے ایک خواب دیکھا تھا۔ ایک جوگن سر کے بال پھیلائے ساگر کے کنارے کھڑی ہے۔ خوفناک لہریں آتی ہیں اور اُسے جکڑ کر اپنے سمندر کی بے پایاں گہرائیوں میں لے جاتی ہیں۔ میں تو جانتا ہی تھا کہ اُس کا وجود ہمیں دھوکا دے جائے گا۔"

وہ مُردہ لہجے میں بولا۔ "یہیں تو اُس کی لاش جلائی گئی تھی۔ اب نہ یہاں راکھ ہے نہ جلی ہوئی لکڑی اور نہ کوئلے اور نہ ہی جلی ہوئی ہڈیاں! کہاں گئے سب!"

سب کو ساگر کی لہریں بہا کر لے گئیں۔ اب ان کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔ چلو ہم ان لہروں سے پرے ہٹ کے بیٹھ جائیں۔ یہ سمندر ٹھگ کا ہے۔

میں اُس کا ہاتھ تھامے سوکھی ریت پر ایک طرف بڑھنے لگا۔ پھر ہم ریت کا ایک اونچا ڈھیر دیکھ کر اُس پر بیٹھ گئے۔

اُس کی آنکھیں نم تھیں۔

کچھ دیر بعد وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "تم جانتے ہو وہ مجھے بہت چاہتی تھی۔"

"ہاں۔"

"وہ تمہاری بھی دوست تھی۔"

"ہاں۔"

"اب تم اکیلے رہ گئے۔"

"اور ایک دن ہم سب بالکل اکیلے رہ جائیں گے۔"

میں نے گہرا سانس لیا۔

اُس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور سر نیچے جھکا لیا۔

ڈھیر ساری باتیں یاد آنے لگیں۔ ساحل سمندر کی گرم ریت، ریت کے گھروندے۔ ریت پر بکھری ہوئی کوڑیاں۔ چتا، چتا کی راکھ اور پھر مدوجزر۔

کوئی کہہ رہا ہے۔ "آؤ ہم ہنستے ہنساتے ساگر کی گہرائیوں میں اُتر جائیں۔ سب کی نظروں سے چھپ جائیں۔"

ایک خفیف سی آواز کانوں میں سرسرا رہی ہے۔ تم جب ساحل پر نہیں آتے ہو تو یہاں کا ماحول بڑا اُداس لگتا ہے۔ ساگر کی لہریں بھیانک لگتی ہیں۔

وہ میری بغل سے اُٹھ کر ایک طرف کو ہولیا مجھے اس سے کچھ پوچھنے کی خواہش نہیں ہوئی — آفتاب رفتہ رفتہ سمندر میں اُتر چکا تھا۔ اُداسی ملا ویران اندھیرا حدِ نظر تک پھیل گیا تھا۔ رات کو اور اُترنے دو، اندھیرا اور گہرنے دو۔ ایک چاند آسمان پر صاف دکھائی دے گا تب میں ساگر سے پوچھوں گا۔ "تم تڑپتے کیوں ہو۔ سو کیوں نہیں جاتے؟"

وہ کہے گا۔ چاند سے پوچھو جو مجھے جاگنے پر مجبور کرتا ہے۔

چاند کہے گا میں تو اروشی کو ڈھونڈ رہا ہوں۔

یہ سُن کر میں خاموش رہ جاؤں گا۔

رات گہرانے لگی تھی۔ ساگر پھر چیخنے چنگھاڑنے لگا تھا۔ گہرائیوں کا خوف مجھے بھی تھا۔

●

مسعود اختر



بارے انگلیوں کا کچھ بیاں ہو جائے

صاحبو! انگشتِ شہادت کی برابر والی چھوٹی اور موٹی انگلی انگوٹھا کہلاتی ہے۔ انگوٹھا اگر کسی معشوق کا ہو تو وہ عاشقوں کو دکھانے اور کسی آمر کا ہو تو عوام کا ٹینٹوا دبانے کے کام آتا ہے۔ بعض ناعاقبت اندیش انگوٹھے کو کالی اور نیلی روشنائی میں ڈبو کر دستاویزوں پر اس کا نقش بناتے ہیں۔ انگوٹھے کے نقش کی اثر پذیری کے لحاظ سے بعض افراد کو خوش اور اکثر کو پریشان دیکھا گیا ہے۔ البتہ زمانے کی رفتار کے ساتھ جوں جوں خواندگی کے تناسب میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ انگوٹھے کے نقش کا چلن بھی کم ہوتا جاتا ہے۔ ہمارے دوست قاضی زوّار حسین نامعلوم اس بات پر حیرت زدہ ہیں کہ ہندوستان میں ایک بڑی کمپنی رام کو ٹھینگا دکھا کر اپنا مشروب فروخت کر رہی ہے۔

صاحبو! ہاتھ کی سب سے آخر والی ننھی منّی انگلی کنّی کی انگلی کہلاتی ہے۔ انگشتِ شہادت اور کنّی کی انگلی مکتب اور مدرسوں میں علم سے جی چرانے والے بچّوں کی سرپرستی کرتی ہیں۔ بچّے انہیں انگلیوں کے بل بوتے پر رفعِ حاجت جیسے ہنگامی اعلان کرتے نظر آتے ہیں۔ انگشتِ شہادت اور کنّی کی انگلی کی درمیانی دو انگلیاں بظاہر بے کار اور ناکارہ نظر آتی ہیں۔ لیکن کسی سنجیدہ گفتگو اور کسی بھاری بھرکم شخصیت کو چٹکیوں میں اُڑانا ہو تو انگشتِ شہادت کی برابر والی اُنگلی فوراً انگوٹھے کے گلے جا لگتی ہے۔ جب کہ کنّی کی انگلی کی برابر والی انگلی انگوٹھیاں پہننے کی شائق ہے۔ اکثر مرد و زن اسے منگنی کی انگوٹھی پہناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رنگین مزاج ایک ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھانے والے نوجوان جوڑوں میں یہ انگلی خاصی مقبول ہے۔

صاحبو! اس طرح ہاتھ میں پانچ انگلیاں ہوتی ہیں، لیکن یہ کبھی برابر نہیں ہوتیں، لیکن قاضی نامعلوم اس کلیہ کو تسلیم نہیں کرتے۔ اُن کا کہنا ہے کہ یہ انگلیاں ہی ہیں جو بھلے چنگے انسان کو "ٹھینگا" بنا دیتی ہیں۔ اور ان کے عدم وجود کی بدولت ہی آدمی لُنڈا کہلاتا ہے۔

صاحبو! آئرن فنگرس یعنی فولادی انگلیاں، گولڈن فنگرس یعنی سنہری انگلیاں انگریزی میں ہوتی ہیں۔ اردو میں صرف لیلیٰ کی انگلیاں ہوتی ہیں جو مجنوں کی پسلیوں سے نزاکت میں کسی طرح کم نہیں ہوتیں۔ جب کوئی ہوس پرست ان نازک انگلیوں کو مروڑنے کی کوشش کرتا ہے تو ان کے چٹخ جانے کا خدشہ لاحق ہوتا ہے۔ لیکن جب کوئی مہ جبیں نچلے ہونٹ کو دانتوں سے دبا کر اپنی مخروطی انگلیاں خود مروڑے تو غزل کے شاعر اس حرکت کو ادا کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق میں انگلیاں ہیں، جن سے ہماری حیرانی اور عبرت کا سامان مہیّا ہوتا ہے۔ ادھر کسی نازنین نے اپنی انگلیاں مروڑ اور ادھر شہنشاہ بمع اپنے تخت و تاج کے اس پائے نازنین پر اوندھے منھ آ گرے۔

صاحبو! حرکت میں برکت کے فلسفہ پر عا[...] افراد کا خیال ہے کہ انگلی کامیابی حاصل کرنے کا پہلا زینہ ہے کیوں کہ انگلی پکڑے بغیر پہنچے تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہے۔ مشاہدے سے [...] چلتا ہے کہ انگلی پکڑنا اور انگلی پکڑ کر چلنا جیسے محاوروں کو سیاست شناسوں نے عملی طور پر رواج دیا ہے۔ یہ خود انگلی پکڑ کر پہنچے کی طرف بڑھ جاتے ہیں اور عوام کو انگلی پکڑ کر چلنے کا عاد[ی] بنانے کے لیے ہر قسم کے ہتھکنڈوں کا استعمال کرتے ہیں۔ ان ظالموں کی انگلی جس کی طرف اُٹھ جاتی اُس کا وقار لمحوں میں پیوندِ خاک ہو جاتا ہے۔ ظالموں کی انگلیوں کے سنگدلانہ استعمال میں یہ لوگ قطعاً باک محسوس نہیں کرتے۔ ان کی انگلی کے ایک اشارے سے توپیں اور میزائیل تک لیے گ[...]

۲۴۸، آزاد کالونی، گلی نمبر ۲، اسلام آباد، میرٹھ ۲۵۰۰۰۲
یو۔پی

[illegible]

افسانوں پر داغ دیے جاتے ہیں۔ ماضی کے سینے پر یہ دلسوز واقعہ نقش ہے کہ ایک سنگدل سیاستداں نے ہزار ہا انسانی لاشوں کے سروں پر کھڑے ہو کر اپنے داہنے ہاتھ کی انگشتِ شہادت اور اس کے برابر والی انگلی کو کھڑا کر کے اپنی وکٹری Victory کا اعلان کیا تھا۔ بعض بے وقوف اس واقعہ کو معیار مان کر اپنی چھوٹی چھوٹی کامیابیوں کا اعلان انگلیوں کے اسی منحوس نشان سے کرتے ہیں۔

صاحبو! لٹریچر میں آنکھ کے اشارے کے بعد انگلی کے اشارے کا بڑا مرتبہ ہے — انگلی کا اشارہ خلقِ خدا کو پاگل بنا دیتا ہے۔ اس کا عملی مظاہرہ کھیل کے میدانوں اور بالا خانوں پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک دانشور کے بقول خیالی انگلیاں بھی اپنا ایک الگ وجود رکھتی ہیں۔ یہ الفاظ کا جامہ پہن کر ظاہر ہوتی ہیں اور اکثر اوقات دکھتی رگوں کو چھیڑتی ہیں۔ طنز سے ان کی وابستگی جگ ظاہر ہے۔

صاحبو! بزمانۂ طالب علمی میں ایک دن ادب کی کلاس میں ہمارے ایک بقراط پروفیسر نے انگلی کی تعریف دریافت کی۔ ہم نے نہایت متانت سے اُن کے سوال کا جواب دیا ''انگلی وہ متحرک شے ہے جو میلے ٹھیلوں، جلسے جلوسوں اور بھیڑ کے اکثر مقامات پر اپنا کرشمہ دکھاتی ہے''۔ پروفیسر موصوف ہمارے اس دانشمندانہ جواب سے بہت محظوظ ہوئے اور انہوں نے اپنی مسرت کا واضح اظہار اس طرح کیا کہ ہمیں آٹھ دن کے لیے کلاس سے باہر نکال دیا۔ قاضی نامعلوم نے جب یہ واقعہ سُنا تو اپنی انگلی اپنے ہی دانتوں سے کاٹ لی۔ اور بعد ازاں اُسے چوستے ہوئے بولے۔ ''میاں مجھے ایسے لوگوں سے سخت نفرت ہے''۔ ہم نے انگلیاں چٹخاتے ہوئے اُن کی بات سُنی۔ ہم جانتے ہیں کہ قاضی جب کسی سے نفرت کرتے ہیں تو اپنی عزیز ترین شے بھی اس نفرت کی راہ میں قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ نفرت کے ذیل میں اُن کا ردِّ عمل شدید ہوتا ہے۔ دنیا کے اکثر دامادوں کی طرح وہ بھی اپنی ساس صاحبہ سے نفرت کرتے ہیں۔ گزشتہ سال چند روز کی مہمان داری کی غرض سے ساس صاحبہ کی آمد کی خبر جیسے ہی اُن کے کان میں پڑی تو وہ شعلوں کی مانند سُرخ ہو گئے۔ انہوں نے فوراً اپنے خوب صورت کتے کو اپنی آغوش میں بھرا اور اپنے فیملی ڈاکٹر کے نرسنگ ہوم میں جا پہنچے۔ ڈاکٹر نے انہیں اس ہیئت میں دیکھا تو مسکرایا — انہوں نے ڈاکٹر کی آنکھوں کے آگے اپنی کنی کی انگلی لہرائی اور اپنے حسین کتے کی نرم و ملائم دُم پر انگلی رکھتے ہوئے بولے۔

''عزیزم کی دُم تراش دیجیے''۔

''قاضی لگتا ہے کسی مشاعرے سے ہوٹ ہو کر آ رہے ہو۔ میاں اتنا شاندار کتا۔ اتنی خوبصورت اس کی یہ دُم اور تم اسے کٹوانا چاہتے ہو''۔ ڈاکٹر نے اپنی انگلیاں نچائیں۔

''جی ہاں! میں یہ شاندار اور خوبصورت دُم کٹوانا چاہتا ہوں۔ دراصل آج کی فلائٹ سے میری خوش دامن تشریف لا رہی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ عزیزم اُنہیں دیکھ کر اپنی دُم ہلائیں اور اُنہیں یہ خیال گزرے کہ میرے گھر میں اُن کا استقبال ہو رہا ہے''۔

صاحبو! دوستوں کی ایک بے تکلف محفل میں ایک دن ایک صاحب نے افسانوی لہجے میں کہا۔ ''بعض ستم ظریف انگلیوں کو ایسے فرش کے طور پر استعمال کرتے ہیں جس پر اکثر اوقات رقصِ مردانہ ہوتا ہے۔ حالانکہ اس فرش پر صنفِ نازک کو رقص کرتے بہت کم دیکھا گیا ہے۔ البتہ انگلیوں کا یہ فرش آدم کے بیٹوں کو حوا کی بیٹیاں ہی فراہم کرتی ہیں''۔

قاضی نامعلوم کو اُن حضرت کا یہ انداز کھل گیا۔ بڑی ترشی سے بولے:

انگلیوں پر نچانے جیسے پست محاورے کے لیے اتنی لاف و گزاف کی کیا ضرورت تھی۔ اُن کا یہ فقرہ سُن کر وہ صاحب سٹپٹا سے گئے۔ ہم نے موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے اُن صاحب کو ایک گوشۂ تنہائی کی سمت گھسیٹا اور بولے۔

بھائی قاضی ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمیں بھی اس محاورے کی پستی کا احساس چند دن پہلے ہی ہوا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایک روز ہماری اہلیہ قاضی کے گھر اُن کی بیگم سے ملاقات کے لیے گئیں۔ اس گھر میں شاید یہ اُن کی پہلی وزٹ تھی۔ اہلیہ اُس گھر میں جاری و ساری قرینے سے بہت متاثر ہوئیں۔ آخر کار جب اُن سے نہ رہا گیا تو اس راز سے پردہ اُٹھانے کی غرض سے اُنہوں نے قاضی کی نصف بہتر سے پوچھ ہی لیا۔

''یہ سلیقے سے سجا ہوا باورچی خانہ، صاف شفاف فرش اور جھماتے ہوئے یہ برتن بہن آخر کیا استعمال کرتی ہو۔ قاضی کی نصف ''برتر'' نے آہستگی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''کوئی خاص چیز نہیں بہن۔ بس شوہر کا استعمال کرتی ہوں''۔ یہ سُن کر ہماری اہلیہ نے اپنی انگلی دانتوں تلے دبالی۔ لیکن میرے بھائی اُس دن سے یہ پستی طعن و تشنیع کی صورت میں ہمارے گھر میں بھی سیندھ لگانے کی کوشش کر رہی ہے''۔

دوستوں کی اُسی محفل میں جب ایک دوست نے یہ کہا کہ انگلی حلق میں ڈالی جاتی ہے اور اس کا مقصد کسی ڈوبی ہوئی شے کی وصولی یا بازیابی ہوتا ہے۔ تو قاضی نامعلوم نے انہیں ٹوک دیا کہ حضور یہ ہرائی کسی جاہل کی اُڑائی ہوئی ہے۔ حلق میں انگلی ڈالنا بس ایک محاورہ ہے اور صرف اردو لغات کی زینت ہے۔ عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس پر سابق الذکر نے فقرہ چست کیا کہ کم عقل اور کند ذہن افراد کو عاقلوں کی گفتگو میں یوں بے محابانہ دخل نہیں دینا چاہیے۔ اگر آپ کے خاندان میں افزائشِ نسل کا سلسلہ جاری ہوتا تو آپ کو معلوم ہوتا کہ بچہ جب اس جہانِ فانی میں وارد ہوتا ہے تو دائی اس کا تانتوا توڑنے اور گلے اُٹھانے کے لیے اس کے حلق

ہوالتھا ہے۔ قاضی سے جب اس وار کی تاب لاتے نہ بنی تو پہلو بدل کر بولے کہ محترم ممکن ہے کہ یہ ناقص اطلاع آپ کی والدہ محترمہ نے آپ کو دی ہو۔ لیکن اس میں تصحیح فرمالیں۔ گلے اٹھانے کے لیے جو شے بچے کے حلق میں ڈالی جاتی ہے وہ انگلی نہیں انگوٹھا ہوتی ہے اور پھر یہ کہ گلے اٹھانا یا تانتوا توڑنا کسی شے گم گشتہ کی وصولی کے غماز ہیں۔

صاحبو! قاضی نامعلوم انگلیوں سے متعلق محاوروں کا بے پناہ درک رکھتے ہیں۔ وہ اس موضوع پر طویل عرصے تک بے تکان بول سکتے ہیں۔ ایک دن کہنے لگے۔

"انگلانا اور انگلی کرنا ایسے محاورے جب شرفا کی گفتگو میں شامل ہو جاتے ہیں تو گفتگو لمحوں میں ابتذال کی سرحد میں داخل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنکھ میں انگلی کرنا، کان میں انگلی کرنا، ناک میں انگلی کرنا ثقہ حضرات کے نزدیک معیوب فعل گردانا جاتا ہے اور یہ کہ۔"

ہمیں لگا کہ قاضی پٹری سے اترنے والے ہیں اس لیے ہم نے تیزی سے بات کا رخ تبدیل کر دیا اور کہا: قاضی یہ جو مصرع ہے ؎

انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ انگلیاں زخمی ہیں، ان سے خون ٹپکے، بات سمجھ میں آتی ہے، لیکن یہ قلم سے خون کیسے ٹپک رہا ہے۔" سن کر مسکرائے بولے:

"میاں اردو شاعری آپ جیسے کج فہموں کے لیے نہیں، اشاروں، کنایوں کی تہ تک پہنچنے کے لیے ذہانت درکار ہوتی ہے۔ میرے عزیز یہاں انقلاب کا ذکر ہو رہا ہے۔ انگلیاں زخمی ہیں۔ ان سے خون رس رہا ہے۔ اس کے باوجود وہ قلم تھامے جنگ پر آمادہ ہیں۔ خون رس رس کر قلم کی نوک تک آ پہنچا ہے اور دیکھنے والوں کو خون انگلیوں سے نہیں بلکہ قلم سے ٹپکتا نظر آ رہا ہے۔" ہم نے بات کا پہلو ایک بار پھر تبدیل کیا۔

"مرشد یہ دسوں انگلیاں دسوں میں چراغ کا کیا مفہوم ہے؟"

ہمارے اس سوال پر قاضی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر آنکھوں کو خواب ناک بناتے ہوئے بولے: "لگتا ہے آج کل شبستان رحمن اور سلمیٰ یاسمین نجمی کی کتابیں زیر مطالعہ ہیں آپ کے۔ عزیزم دسوں انگلیاں، دسوں میں چراغ کا مفہوم ہے بٹاخہ عورت یعنی دلکش عورت یعنی چندے آفتاب چندے ماہتاب۔"

اب ہم سمجھے قاضی کی ننہیال میں اتنے انار بٹاخے کیوں چھوٹتے ہیں۔ موصوف کے نانا محترم ہر چوتھے پانچویں سال ایک نئی نویلی دلہن گھر میں کیوں لا بٹھاتے ہیں۔ حقیقت ہم پر واضح ہو چکی تھی۔ اس لیے ہم نے کہا۔

"آپ کے نانا جان کی پے در پے شادیاں کا راز شاید ہم جان چکے ہیں۔"

قاضی نے ایک بار پھر زوردار قہقہہ لگایا بولے:

"اس گمان میں نہ رہنا خوب سے خوب تر کی تلاش کا کوئی عالم وہاں نہیں ہے۔ ہمارے نانا اس وقت ستر کے پیٹے میں ہیں۔ نہ ان کے منہ میں دانت ہیں اور نہ پیٹ میں آنت حق زوجیت ادا کرنے کے جوہر کا سوال تو قطعاً لایعنی ہے۔ ہاں قوت بصارت و سماعت تا حال بحال ہے۔ اس صورت میں ہر چوتھے پانچویں سال ایک نئی شادی رچانا اور اس پر ساٹھ ستر ہزار روپے خرچ دینا بظاہر بے وقوفی نظر آتی ہے، لیکن اس میں جو نشہ ہے اس کا لطف کوئی ہمارے نانا سے پوچھے۔ میرے عزیز ذرا تصور کرو اس لطیف کیفیت کا کہ ہمارے ستر سالہ نانا سہرا باندھے بیٹھے ہیں۔ مولوی صاحب نکاح پڑھا کر جا چکے ہیں۔ صاحب سلامت کا شور سرگوشیوں کی نہج تک آ پہنچا ہے کہ دلہن کے پیچھے سے ایک مترنم آواز ابھرتی ہے: لڑکے کو سلامی کے لیے اندر بھیجئے۔ ذرا اندازہ کیجئے اس جملے کی لطافت کا، اس کے ذائقہ کا، اس کے نشہ کا۔"

صاحبو! ایک روز ہم نے استاد سلیم الدین احمد ایم اے سے منقول ایک تجربہ کار جیب کترے کا یہ قول قاضی کے گوش گزار کیا۔

"آپ اگر انگلیوں کے قہر سے بچنا چاہتے ہیں تو اپنی جیب میں معقول تعداد میں ریزگاری رکھا کریں۔ اس سے آپ کی جیب محفوظ رہے گی۔"

برا سا منہ بنا کر بولے:

"انگلیوں کے قہر و غضب کا نزول کچھ جیبوں تک ہی محدود نہیں ہے میرے عزیز!" اور واقعتاً ہمیں اپنی کمزور یادداشت پر بڑی ندامت ہوئی ہمیں یاد آیا کہ چند سال پیشتر جب احمد فراز میلہ نوچندی کے انڈو پاک مشاعرے میں تشریف لائے تھے تو قاضی نامعلوم نے بھی اس میں شرکت کی تھی۔ ہم بھی ان کے ہمراہ تھے۔ وہ تیل پھلیل سے لیس، شیروانی زیب تن کیے۔ بیاض بغل میں دبائے جیسے ہی میلہ کی بھیڑ میں اترے اللہ جانے وہ انگلی کس کی تھی۔ لیکن ایک حسین کڑکتی ہوئی بجلی کا قہر نازل ہوا تھا قاضی کے گال پر۔

اس مشاعرے کے بعد وہ بہت چوکنا رہنے لگے تھے۔ شرارتی عناصر کو دور سے پہچان لیتے۔ چند ماہ پیشتر شہر میں ایک بزرگ کے مزار پر عرس کی گہما گہمی تھی۔ اس موقع پر ایک آل انڈیا مشاعرہ بھی ہونا تھا۔ اب چونکہ مشاعروں نے قوالیوں کی جگہ لے لی ہے اس لیے یہ بات کوئی حیرت کا باعث بھی نہ تھی۔ ہمارے ایک قریبی دوست نے اس مشاعرے میں سامع کی حیثیت سے شرکت کی خواہش کا اظہار کیا۔ قاضی بھڑک گئے۔ انہیں ڈانٹتے ہوئے بولے:

"آپ جیسے ہڑدنگے، لپاڑیے مشاعرے میں جاتے ہیں اور مشاعرے کا تیمیہ خراب کرتے ہیں۔ آپ ہرگز وہاں تشریف نہ لے جائیں (بقیہ ص ۲۶)

نئی کتابیں

م کتاب : غالب درونِ خانہ
منف : کالی داس گپتا رضا
ے کا پتہ : موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲
مت : ۱۲۵ روپے

کسی کا مصرع ہے ع محتسب را درونِ انہ چہ کار، منشی پریم چند کی بیوہ شِورانی دیوی ے ہندی میں کتاب لکھی "پریم چند گھر میں"۔ گھر یب روں خانہ کا مترادف ہے۔ ۱۹۷۱ میں عالد نظیر وفی نے 'اقبال درونِ خانہ' لکھی۔ ہندی اور ردو کی ان دونوں کتابوں کے مصنفین متعلقہ ریب کے قریبی عزیز تھے۔ کالی داس گپتا رضا الب کے اہلِ خانہ نہیں لیکن گھر کے بھیدی زور معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے 'غالب درونِ انہ' لکھ کر ۲۷۔ دسمبر ۱۹۸۹ء کو بازار میں دی۔ تاریخ غالب کا یوم ولادت ہے۔ غالب کی اندانی اور گھریلو زندگی کے بارے میں جو بھی علومات بہم پہنچ سکتی تھیں وہ سب اس کتاب ں یک جا کر دی گئی ہیں۔ لیکن یہ کتاب درونِ خانہ ک محدود نہیں، اس میں چند مضمون زندگی کے بعض دوسرے کوائف کے بارے میں بھی ہیں مثلاً الب کے سفرِ کلکتہ کی توقیت، آبِ حیات میں رجمۂ غالب وغیرہ۔

کتاب کا پورا نام 'غالب درونِ خانہ' (محقق سوانح) ہے۔ محقق نیز متحقق بہ فتحِ قاف اوّل اسم مفعول کے صیغے ہیں۔ دونوں کے معنی یکساں ہیں: تحقیق کیا ہوا۔ کتاب کے مشمولات سے درونِ خانہ کا جواز تو ملتا ہے لیکن محقق سوانح سے لگتا ہے جیسے یہ غالب کی باقاعدہ سوانح ہو۔ دراصل ایسا نہیں ہے۔ یہ حیاتِ غالب سے متعلق کئی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سوانح کے کئی اہم ابواب چھوٹ گئے ہیں مثلاً کلکتے میں قتیل پرستوں سے معرکہ، دلّی میں قمار بازی اور قید کی صعوبت، معاشی پریشانیاں، دہلی اور رام پور کے درباروں سے تعلقات، ہم عصر شعرا سے مراسم، غدر کی صعوبتیں، تاطع برہان کا معرکہ وغیرہ۔ جو کتاب درونِ خانہ کا محور ہو وہ پوری سوانح ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے بہتر ہوتا کہ ذیلی عنوان 'سوانح کے چند محقق ابواب' ہوتا۔ خود مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ یہ کتاب حیاتِ غالب کی باقاعدہ روداد نہیں ہے (ص ۸)۔

درونِ خانہ کی رعایت سے رضا صاحب نے اپنے پیش لفظ کا دلچسپ عنوان 'خانہ باغ' رکھا ہے جہاں سے وہ درونِ خانہ تاک جھانک کر رہے ہیں۔

کالی داس گپتا رضا اردو دنیا میں ایسے محقق کی حیثیت سے ابھر کر آئے ہیں جو دقتِ نظر اور جزئیات بینی کے لیے مشہور رہے۔ غالب پر ان کا مطالعہ اور تحریریں اتنی عریض و عمیق ہیں کہ وہ اس موضوع پر جو کچھ لکھیں گے وہ محقق اور مستند ہوگا۔ ذیل میں اس کتاب کے مختلف ابواب یا مضامین کا ایک سرسری جائزہ لیا جاتا ہے۔

پہلا مضمون "غالب کا خاندان۔ دادا، والد، چچا اور پھوپھیاں وغیرہ" کے عنوان سے ہے۔ اس میں سات مختلف کتابوں سے خاندان اور اجداد کے بارے میں خود غالب کی تحریروں کے اقتباس دیے ہیں جن میں اس موضوع سے متعلق تمام ضروری باتیں آگئی ہیں۔ بعد میں رضا نے ان بیانات پر تبصرہ کیا ہے۔

ص ۱۱۔ پہلا اقتباس پنشن کے مقدمے کے عرضی دعوے سے ماخوذ ہے۔ اس میں انگریزی فوج کے دو افسروں پرّوں اور لارڈ لیک کا نام آتا ہے۔ لارڈ لیک مشہور افسر ہیں، پرّوں غیر معروف۔ رضا صاحب نے تاریخ کی انگریزی کتابوں سے لے کر دونوں کی سوانح دی ہے، لیک کی مختصراً، پرّوں کی نسبتاً مفصل تر۔ اس کے لئے خاصی کھکیڑ کرنی پڑی ہوگی۔

ص ۱۲۔ عرضی دعوے کے مطابق ۱۸۰۶ء میں غالب کی دادی کی عمر ۷۰ برس کی تھی۔ اس سے رضا صاحب نے حساب لگایا کہ دادی کی ولادت ۱۷۳۶ء کی ہوگی۔ میرے خیال میں اس زمانے میں ماہ و سال کا حساب زیادہ تر ہجری سنہ سے کیا جاتا تھا۔ ۱۸۰۶ء کا بڑا حصہ ۱۲۲۱ھ کے برابر ہے۔ اس میں سے ۷۰ برس منہا کرکے سنہ ولادت ۱۱۵۱ھ برآمد ہوتا ہے اور اس کا بیشتر حصہ ۱۷۳۸ء کے مطابق ہے۔ یہی غالب کی دادی کا سنہ ولادت ہونا چاہیے۔

ص ۱۴۔ پنج آہنگ کے ایک خط میں اور دوسری کئی جگہوں پر غالب نے اپنے خاندان کے سلسلے میں کہا ہے کہ وہ سلجوقی تھے اور ان کا نسب افراسیاب و پشنگ سے ملتا ہے۔ غلام رسول مہر

نے اپنی کتاب 'غالب' میں لکھا ہے کہ محققین کے نزدیک تو یہ بھی ثابت شدہ بات نہیں کہ سلجوقی انہیں تورانیوں کی نسل سے تھے جن کی عظمت و برتری کا افسانہ شاہ نامہ نے سنایا ہے"۔ (لاہور، تیسرا ایڈیشن ص ۷)۔ مالک رام نے اپنی کتاب 'ذکرِ غالب' میں غلام رسول مہر کے اس اعتراض کو نقل کر دیا ہے لیکن اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ رضا صاحب کو غالب کے اس دعوے پر اپنی رائے درج کرنی چاہیے تھی۔

ساتویں اقتباس (ص ۲۱) میں یوسف حسین خاں کی "غالب اور آہنگِ غالب" کی سند پر بتایا ہے کہ غالب کا یہ کہنا درست نہیں کہ ان کے والد حیدرآباد میں تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہے۔ یوسف حسین خاں نے حیدرآباد میں اُس دور کے کاغذات دیکھے۔ منصب داروں میں کہیں عبداللہ بیگ کا نام نہ تھا، جس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ بہت معمولی حیثیت کے ملازم رہے ہوں گے۔ مجھے یہ دلچسپ اطلاع پہلی بار رضا صاحب کی کتاب سے ملی۔

تیسرا مضمون 'غالب کی تاریخ ولادت' ہے، جس میں رضا صاحب نے غالب کی بیان کردہ تاریخ کی تائید کی ہے۔ دو حضرات نے غالب کے زائچے کی بنا پر مختلف سنین ولادت برآمد کیے تھے۔ رضا صاحب نے درست اعتراض کیا کہ اگر دو نجومی ایک زائچے سے مختلف سنین نکالتے ہیں تو زائچہ غلط ہے یا زائچہ دان۔ حنیف احمد نقوی نے غالب پر دانستہ غلط بیانی کا جو الزام لگایا تھا۔ اس کی رضا صاحب نے شافی تردید کی (ص ۳۸)، لیکن انہوں نے یہ نشان دہی نہیں کی کہ حنیف نقوی نے یہ بات کس مضمون میں کہی تھی اور وہ کہاں شائع ہوا سوء اتفاق سے درونِ خانہ کے آخر میں کتابیات بھی نہیں۔ بہرحال تاریخ ولادت کی جملہ بحث مصنف کی بالغ نظری کا ثبوت ہے۔

پانچواں مضمون (ص ۴۷) 'غالب کا مذہب' ہے۔ غالب نے شاہ ظفر کی شیعیت سے برأت کے سلسلے میں ایک فارسی مثنوی لکھی تھی۔ اس سے لوگوں کو خود غالب کے مذہب کے بارے میں غلط فہمی ہو گئی۔ غالب نے ایک فارسی خط میں مجتہد العصر مولوی سید محمد لکھنوی کو لکھا تھا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ میں بساطِ شعر کو الٹ دوں اور غزل کے پیرائے میں نوا سنجی کرو (یعنی غزل کی ایمائیت میں اپنے مذہب کی وضاحت کروں)۔ پاکستان سے پنج آہنگ کا اردو ترجمہ چھپا ہے۔ مترجم جناب مہاجر نے قیاس کیا ہے کہ وہ غزل ع مشغول حق ہوں بندگیِ بوتراب میں' ہے۔ رضا صاحب غالب کی ہر تحریر کا زمانہ جانتے ہیں۔ انہوں نے گرفت کی کہ شیعیت والی مثنوی ۵۴-۱۸۵۳ء کی ہے جب کہ 'بوتراب میں' والی غزل ۱۸۴۷ء کے دیوان میں موجود ہے، اس لئے یہ غزل اس مثنوی کا نتیجہ نہیں۔ رضا نے صحیح انکشاف کیا کہ غالب کی مشارٌالیہ غزل دراصل ایک سلام ہے جو حسبِ معمول غزل کی ہیت میں لکھا گیا۔ ع سلام اسے کہ اگر بادشا کہیں اس کو۔ رضا صاحب کے مطابق یہ سلام ۱۸۵۴ء کا ہے اور اس میں غالب نے اپنا عقیدہ کھُل کر بیان کیا ہے۔

ساتویں اور آٹھویں مضامین غالب اور ان کی بیوی امراؤ بیگم کے معاملات سے متعلق ہیں۔ ان کے تعلقات پر غالب کی نثر و نظم میں جو کچھ مواد ملتا ہے وہ سب ان مضامین میں جمع کر دیا ہے۔ بعضوں کا جو یہ خیال ہے کہ غالب اور ان کی بیگم میں ہمیشہ اَن بن رہی۔ اس کی رضا صاحب نے مدلّل تردید کی ہے۔ دوسرے مضمون کے آخر میں ایک پاکستانی کتاب سے جمیل الدین عالی کی طویل تحریر نقل کی ہے، جس میں والیِ لوہارو کے نام غالب کے متعدد خطوط کا تذکرہ ہے۔ ہندوستان کے قارئین کو اس مفید تحریر سے واقف کرانے کا سہرا رضا صاحب کے سر ہے۔

نواں مضمون 'غالب کے سفرِ کلکتہ کی توقیت'' ہے۔ ہے تو یہ محض ساڑھے چار صفحات کا لیکن اتنے سے مطالب لکھنے کے لئے انہیں کس قدر مآخذ دیکھنے پڑے ہوں گے، وہ مضمون کے اندراجات کو مفصل دیکھنے سے اندازہ ہو گا۔ حالی نے یادگارِ غالب میں اس موضوع پر بہت گھپلا کیا تھا۔ رضا صاحب نے وضاحت سے سفر کی ایک ایک منزل کی صحیح تاریخ طے کر دی ہے۔ مضمون کے ابتدائی حصے میں جو تاریخی معلومات ہیں اُن کے لئے تاریخ کی کئی انگریزی کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑی ہو گی۔

دسواں مضمون '' عارف اور فرزندیِ غالب' میرے نزدیک اس مجموعے کا شاہکار ہے۔ اب تک عام عقیدہ تھا کہ غالب نے عارف کو متبنیٰ کر لیا تھا اور وہ غالب کے پاس رہتے تھے۔ رضا صاحب نے اس غلط فہمی کا پردہ چاک کیا اور مستند مآخذ سے اس موضوع کے جملہ مالہ و ماعلیہ پیش کیے۔ یہ چوٹی کا ایک ماہرِ غالبیات ہی کر سکتا تھا۔ غالب کے اس مصرع (ع مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی'؛ کا داخلی مفہوم سمجھ میں نہ آتا تھا۔ رضا صاحب نے کہیں سے کلیاتِ عارف تلاش کی اور اس میں سے ۷ اشعر کا ایک قطعہ دریافت کیا جو غالب کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے (درونِ خانہ ص ۱۰۰)۔ اس قطعے سے اس مصرع کا پس منظر کھُل کر سامنے آتا ہے۔

گیارہواں مضمون " غالب کا ملازمِ خاص کلّو داروغہ" بھی اسی طرح تحقیق کا بہترین نمونہ ہے۔ مجھ سے کلّو کے بارے میں پوچھا جاتا تو صرف اتنا کہہ سکتا کہ غالب نے دو تین خطوں میں اس کا نام لیا ہے۔ لیکن رضا صاحب نے تو کلّو کے تقریبی سنہ ولادت ۱۸۳۰ء اور سنہ

وفات ۱۹۲۳ء کا بھی اندازہ کرلیا، غالب کے انتقال کے بعد اس کی ملازمتوں تک کی تفصیل معلوم کرلی۔

بارہواں مضمون غالب کے بھانجے مرزا عباس بیگ کے بارے میں ہے۔ اس غیر معروف شخصیت کے بارے میں جگہ جگہ سے اتنی معلومات فراہم کی ہیں کہ مجھے خیال آتا ہے، ایم فل کے مقالے میں بھی کوئی اتنی محنت نہیں کرتا۔ اگر مضمون کو تھوڑا سا مفصل کردیا جائے تو پی ایچ ڈی کا مقالہ ہوجائے گا۔ اس مضمون میں ادبی مواد جتنا ہے، اسی قدر تاریخی مواد ہے جس کے لیے بہ کثرت تاریخی کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا ہوگا۔ یہی کیفیت الٰہی بخش خاں معروف کے مضمون کی ہے۔ عباس بیگ عام اردو قارئین کے لیے غیر معروف شخصیت ہیں لیکن معروف اسم بامسمیٰ ہیں۔ اس میں رضا صاحب نے آبِ حیات سے معروف کے حالات کو تفصیل سے مقتبس کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

ہوسکتا ہے ان میں کچھ انشا پردازی اور رنگ آمیزی آزاد کی طرف سے ہو لیکن بیشتر بیانات کی اساس پختہ معلوم ہوتی ہے کیوں کہ یہ سب انہوں نے استاد ذوق سے بالتفصیل سنے تھے"۔ (ص ۱۶۳)۔

لیکن یہ مسلّم ہے کہ آزاد نے آبِ حیات میں کئی واقعات صریحاً وضع کرکے لکھے ہیں۔ کسی معاملے میں صرف آزاد کا بیان شافی شہادت نہیں۔ رضا صاحب نے عابد پشاوری کی کتاب "ذوق اور محمد حسین آزاد" (۱۹۸۷ء) کا حوالہ دیا ہے اور ولیم فریزر سے متعلق عابد کے ایک بیان کی مناسب تردید کی ہے (ص ۱۸۵-۸۸)۔ عابد نے ذوق و معروف کے تعلق سے اور جو کچھ لکھا ہے رضا صاحب کو اس کا بھی جائزہ لینا چاہیے تھا۔ عابد نے لکھا ہے کہ آبِ حیات کی طبعِ اوّل میں معروف کے بارے میں محض چند سطریں تھیں۔ معروف کے اہلِ خاندان کی طرف سے اعتراض ہوا کہ معروف ذوق کے شاگرد نہ تھے (ذوق اور محمد حسین آزاد ص ۲۰)۔ اس پر آزاد نے آبِ حیات کی طبع دوم میں معروف سے متعلق بیانات کا انبار لگادیا۔ معلوم نہیں انہوں نے لاہور میں بیٹھے بیٹھے یہ سب دریافت کیے یا ان میں سے کچھ ان کے زرخیز تخیل کی پیداوار تھے؟

معروف نے تسبیحِ زمرد کے نام سے سو مطلعے کہے جن میں سے ہر ایک میں سبزی کے ذکر کا التزام تھا۔ آزاد نے ان سب کو ذوق کی جھولی میں ڈال دیا ہے۔ عابد اس کی تردید کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلامی تسبیح میں سو دانے ہوتے ہیں، ایک سو ایک نہیں۔ یہ سب مطلعے عمدۂ منتخبہ میں موجود ہیں اور ان کی تعداد سو ہے۔ یہ سب مطلعے معروف کے دیوانِ اوّل میں ہیں۔ عابد کا کہنا ہے کہ مجموعۂ نغز (۱۲۲۱ھ) میں معروف کے دیوان کی تدوین کا ذکر ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دیوان اس سنہ تک ترتیب پاچکا تھا ذوق اس وقت تک ۱۷-۱۸ سال کے ہوں گے ذوق کی اس کم سنی میں یہ ممکن نہیں کہ معروف ذوق کے شاگرد ہوچکے ہوں گے۔

ذوق نے تسبیحِ زمرد کا ایک فارسی قطعۂ تاریخ کہا جس سے ۱۲۳۶ھ برآمد ہوتا ہے۔ عابد کا استدلال ہے کہ، چونکہ اس تسبیح کے اشعار ۱۲۲۱ھ سے پہلے ہی وجود میں آچکے تھے اس لیے یہ قطعۂ تاریخ ذوق کا نہیں، آزاد کا مصنفہ ہے۔ لیکن اتفاق سے یہ قطعہ سرور کے عمدۂ منتخبہ میں موجود ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ذوق ہی کی تصنیف ہے۔ عمدۂ منتخبہ میں معروف کے دونوں دیوانوں کا ذکر ہے کاش رضا صاحب عابد کے اس موقف پر بھی بحث کرتے کہ تسبیحِ زمرد میں ذوق کا کوئی بہرہ ہے کہ نہیں اور یہ کہ معروف کے دیوانِ اوّل اور دیوانِ دوم کی کیا تاریخیں ہیں؟ رضا صاحب ص ۱۸۰ پر یہ سوال تو اٹھاتے ہیں کہ کیا دیوانِ اوّل میں ۱۲۳۶ھ تک کا کلام ہے! اگر ایسا ہے تو دیوانِ دوم میں کس عہد کا کلام ہے! رضا صاحب معروف پر قدرت کے ساتھ بیان کرسکتے تھے۔

انہوں نے معروف اور رنگین کے بعض معاملات کا ذکر کیا ہے اور رنگین کی ہجوِ معروف والی جو رباعیاں دی ہیں، وہ کم از کم میرے لیے بالکل نئی ہیں۔ رضا نے دیوانِ معروف کے ایک نہایت قدیم مخطوطے کا بھی تعارف کرایا ہے جس کے ترقیمے میں اسے معروف علی معروف کا دیوان قرار دیا ہے۔ کوئی بھی دیکھتا تو یہ فیصلہ کرتا کہ یہ معروف علی معروف الٰہی بخش خاں معروف سے الگ کوئی شخصیت ہوگی لیکن رضا صاحب نے معروف کے دیوانِ مطبوعہ سے کئی مطلعے نقل کردیے جن میں سے تین میں شاعر نے خود کو الٰہی بخش اور دو میں معروف علی کہا ہے۔ (درونِ خانہ ص ۱۸۲)۔ یہ ہے محققانہ تاویل۔

آگے کے دو مضامین نواب احمد بخش خاں اور مرزا افضل بیگ (غالب کے بہنوئی کے چھوٹے بھائی) کے بارے میں ہیں اور یہ بھی جزئیاتی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ دونوں میں رضا صاحب کی تاریخی طبیعت ایک بار پھر نمودار ہوتی ہے۔ آخری دو مضامین آبِ حیات میں ترجمۂ غالب (مع حواشی) اور "توقیتِ غالب" ہیں۔ میں ان دونوں پر کہیں اور لکھ چکا ہوں۔ آبِ حیات والا مضمون کتابی شکل میں شائع ہوچکا ہے۔ "توقیتِ غالب" میں مختلف جزئیاتی واقعات کی تاریخیں طے کرنے میں متعدد مآخذ کو دیکھنا پڑا ہوگا۔ اس فہرست میں بعض ایسے اندراج آگئے ہیں جو براہِ راست توقیتِ غالب کا جزو نہیں مثلاً مہاراجہ رنجیت سنگھ، ممنون، آتش، ناسخ، شاہ نصیر، مومن، شیفتہ، آغا جان عیش وغیرہ کے سنہ وفات یا سرجان لارنس

[illegible] معتبر ہوتا۔ شاید معاصرینِ غالب کے [illegible] و وفات اس لئے دے دیئے ہوں کہ [illegible] سے عہدِ غالب کو سمجھنے میں مدد ملے۔

اشاریئے میں اندراجات کی زمرہ بندی حروفِ تہجی کے لحاظ سے کی گئی ہے لیکن یہ کمی رہ گئی ہے کہ ایک حرف کے تحت مختلف ناموں کی الفبائی ترتیب نہیں۔ علی گڈھ تاریخ ادب اردو کے اشاریے میں بھی یہی صورتِ حال تھی۔ اشاریئے میں ان کے صفحہ نمبر کو خط کشیدہ کر دیا ہے۔ اس زحمت کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

غالبیات میں رضا صاحب کی یہ گیارہویں کتاب ہے۔ ساتویں کتاب 'آبِ حیات میں ترجمۂ غالب' موجودہ کتاب میں ضم ہے اس لئے ہم "دردنِ خانہ" کو دسویں کتاب کہہ سکتے ہیں۔ حسبِ معمول اس کتاب میں رضا صاحب غالبیات کے ایسے محقق کے طور پر سامنے آتے ہیں جو سوانح و کلامِ غالب اور عہدِ غالب کی تمام جزئیات پر ماہرانہ نظر رکھتا ہے۔ ہم منتظر ہیں کہ وہ غالب کی ایسی بھرپور مستند سوانح عمری لکھ دیں جس میں غالب کی اب تک کی تمام سوانح عمریوں سے کہیں زیادہ مفصل اور معتبر مواد موجود ہو۔ گیان چند

نام کتاب : 'شہرِ آرزو' (شعری مجموعہ)
شاعر : احسان دربھنگوی
قیمت : تیس روپے
ملنے کا پتہ : ہمایوں جمیل خاں
۱/۸۷ منظفر احمد اسٹریٹ، کلکتہ ۱۶

احسان دربھنگوی ان شاعروں میں ہیں جنہوں نے اپنی بے نیازی کو لذت اندوزی کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ انہیں کبھی ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا نہیں رہی۔ شاعری اُن کے لئے اپنے غم کا بوجھ ہلکا کرنے اور روحانی مسرت حاصل کرنے کا وسیلہ ہے۔ انہیں اس سے [illegible] دلچسپی نہیں کہ وہ شاعری میں کوئی اپنا رنگ پیدا کریں یا اپنی انفرادیت منوانے کی کوشش کریں۔ یہی ان کی کمزوری ہے اور ان کی طاقت بھی۔ کمزوری اس لئے کہ وہ اپنے استاد اور بزرگ جمیل مظہری کے رنگ میں کچھ اس حد تک رنگ گئے کہ خود ان کے کلام کا حُسن بہت سے لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا، اور طاقت اس لئے کہ ان کی شاعری میں جو ایک فطری والہانہ پن، ربودگی، احساس کی شدت اور جذبے کا خلوص ہے، وہ اسی لئے شاداب رہا کیوں کہ انہوں نے ناقدا ور قاری کی جانب غیر ضروری نیاز مندی نہیں دکھائی۔ 'شہرِ آرزو' انہیں کا مجموعہ کلام ہے۔

احسان دربھنگوی ایک نہایت خوش گو شاعر ہیں۔ اچھی شاعری عموماً نقادوں کی نگاہ اور سر سے اونچی جاتی ہے، اس لئے اگر احسان دربھنگوی کو وہ شہرت نہیں ملی جس کے وہ مستحق ہیں، تو ہمیں اس پر تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ احسان دربھنگوی کا یہ شعر اکثر میری نوک زبان پر ہوتا ہے:

وقتِ رخصت نہ مجھے دیدۂ تر سے دیکھو
اِک مجاہد کو مجاہد کی نظر سے دیکھو

میں سمجھتا ہوں کہ ان کی شناخت کے لئے بس یہی ایک شعر کافی ہے۔ البتہ اس کا سنِ تخلیق مجموعے میں ۱۹۵۲ء بتایا گیا ہے جو درست نہیں معلوم ہوتا۔ اگر اس مطلع کی شانِ نزول بقول اویس احمد دوراں یہ ہے کہ اثر مجیدی کے کلکتہ سے ڈھاکہ جانے کے موقع پر کہا گیا تھا: تو پھر یہ ۱۹۵۴ء سے پہلے کا شعر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح یہ غزل:

یہ سوچ رہا ہوں توڑ کے خُم بیدار کروں میخانے کو

جس پر سنِ تخلیق ۱۹۶۰ء درج ہے، دراصل ۱۹۵۵ء میں کہی گئی تھی۔

احسان دربھنگوی کے چھوٹے بھائی اویس احمد دوراں نے جو خود ایک معروف ترقی پسند شاعر ہیں۔ "میرے بھیا" کے عنوان سے کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے جس سے احسان صاحب کی شخصیت کے خدوخال اجاگر ہوتے ہیں اور ان کی شاعری کے محرکات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے احسان دربھنگوی کی کسرِ نفسی، دوستی، بغیر لاگ لپیٹ کے زندگی کرنے کی روش ان کی شخصیت کو دلکشی اور ان کی شاعری کو آب و رنگ عطا کرتی ہے۔ جس مجموعے میں اس نوع کے اشعار ہوں، اس کے معتبر ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے:

اے شمع میری طرح شرارے اُگل کے دیکھ
مجھ سے مقابلہ ہے تو دن کو بھی جل کے دیکھ

بڑی مشکلوں سے کاٹا، بڑے کرب سے گذارا
ترے بعد کوئی لمحہ جو ملا مجھے خوشی کا

اگرچہ صحرائے زندگی میں کوئی مرا ہم سفر نہیں ہے
مگر یہ محسوس ہو رہا ہے کہ تم مرے ساتھ آ رہی ہو

لاکھ تم بجھا ڈالو اپنے سب شرر احساںؔ!
لوگ تو کریدیں گے، راکھ ہی سہی دل میں

اک لڑائی تو بہر حال لڑوں گا اے دوست!
جان جائے یا رہے، جیت اِدھر ہو یا اُدھر

"شہرِ آرزو" کی نظموں میں "فسانۂ آدم" "داستانِ ناتمام" اور "التجا" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

کتاب : ابابیل (شعری مجموعہ)
مصنف : اویس احمد دوراں
ناشر : جمال اویسی، محلہ فیض اللہ خاں، دربھنگہ
قیمت : بیس روپے

"لمحوں کی آواز" کے بعد "ابابیل" اویس احمد

دوراں کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ دوراں ایک طباع، ذہین اور مخلص شاعر ہیں۔ اپنے نظریات مشاہدات اور محسوسات کو نئے تخلیقی کے ساتھ غیر پیچیدہ اسلوب میں پیش کرنا اُن کا طرۂ امتیاز ہے۔

اویس احمد دوراں، بہ قول خود "ذہنی عیاشی کرنے والوں اور سماج کا خون چوسنے والوں"۔ کے شاعر نہیں ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کی نظمیں اور غزلیں پڑھتے وقت بین الاقوامی حالات و واقعات اور ان کے پس منظر کو دھیان میں مد نظر رکھا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جہاں نقاد تخلیق کار وں کے بارے میں گمراہیاں پھیلاتا ہے۔ وہاں تخلیق کار بھی اکثر اپنے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موجب بن جاتا ہے، جس سے خود اُس کی ادبی حیثیت متاثر ہوتی ہے۔ اویس احمد دوراں کا المیہ یہ ہے کہ ناقدین نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ "لمحوں کی آواز" اس زمانے میں منظر عام پر آیا، جب جدیدیت اپنے عروج پر تھی اور ترقی پسندانہ خصوصاً خطیبانہ لب و لہجہ اپنی توقیر کھو چکا تھا۔ ناقدین کے پاس کچھ سکہ بند الفاظ اور فقرے ہوتے ہیں، جنھیں وہ تخلیقی فن کاروں کی تحسین یا تنقید کے لئے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ انھیں اس کی فرصت کہاں کہ وہ دوراں کی شاعری کے خوبصورت پہلوؤں کی نشان دہی کر سکتے۔ (اختر اورینوی کے مضمون کی حیثیت استثنائی ہے)۔

"ابابیل"، کی کچھ نظموں میں "برہنہ گفتاری" نمایاں ہے جن کا دفاع دوراں نے اپنے پیش لفظ میں کیا ہے، جو قطعی تاثر کن نہیں ہے۔ ظالم اور مظلوم کی کشمکش میں ظاہر ہے شاعر ہمیشہ مظلوم کے ساتھ ہوگا اور اس کا شاعری اگر عصر کے تقاضوں سے آنکھیں بند نہیں کرتی تو اس درد و کرب کا اظہار ضرور ملے گا جو مظلوم کا مقسوم ہے۔ لیکن 'خبردار' اور 'للکار' کی وہ آواز جو میدان کارزار میں سنائی دیتی ہے، اگر شاعر کو عزیز ہے تو اسے بلا تکلف قلم چھوڑ کر تلوار اٹھا لینی چاہیے۔ شاعر پر واجب نہیں ہے کہ وہ خلوت میں ہی اپنے احتجاج کو لباس حریر پہناتا رہے۔ اگر اس کا دل غیض و غضب سے بھرا ہوا ہے تو اسے تلوار اُٹھانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ لیکن شاعری کو چیخ و پکار کا بدل بنا دینا شاعری کے ساتھ انصاف نہیں ہے، اور اس کے منصب کے منافی ہے۔

"ابابیل" میں جو نثری اور آزاد نظمیں ہیں، وہ کمزور ہیں اور میں سمجھتا ہوں انھیں مجموعے میں شامل کر کے شاعر نے اپنے ساتھ زیادتی کی۔ پابند نظموں میں "رشتوں کا اتحاد" اور 'بشارت' بھی اسی نوع کی نظمیں ہیں۔ لیکن ان کے یہاں جستجو، التہاب، سفر جاری ہے، دشت تپاں، گلاب کی موت، تہہ خنجر، نئی پود جیسی دلکش نظمیں بھی ہیں جہاں فکر کا خلوص شعری پیکر میں ڈھل گیا ہے۔ دراصل یہی نظمیں دوراں کی شاعری کی شناخت نامہ ہیں۔ میں نے جن نظموں کی بابت اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ ان میں سے "گلاب کی موت" اور 'تہہ خنجر' کے سوا سب کی سب دوراں کے پہلے مجموعے "لمحوں کی آواز" میں شامل ہیں۔ "ابابیل"، کی ۴۲ نظموں میں سے ۱۳ 'لمحوں کی آواز' میں موجود ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ 'وفاداری بہ شرط استواری'' ان کی تخلیقی قوتوں پر اثر انداز ہو رہی ہے۔

اویس احمد دوراں کی غزلوں میں سادگی اور صفائی ہے اور عموماً ان کا لہجہ نرم ہے حزنیہ لے نے ان کے اکثر اشعار کو سوز و گداز عطا کیا ہے۔ ظالم اور مظلوم، دولت اور ناداری کی کشاکش کا اظہار ان کی غزلوں میں بھی برملا ہوا ہے لیکن صنف غزل کا حق ادا کرنے کی کوشش بھی انھوں نے دلجمعی کے ساتھ کی ہے۔

دوراں شعر اور موسیقی کے ربط باہم کا عرفان رکھتے ہیں، اور جب جب وہ شعر کی دیوی کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ایسی لطیف غنائیت اور تھرتھراہٹ پیدا ہو جاتی ہے کہ خود ہم اپنے دل کی دھڑکن ان کے اشعار میں سننے لگتے ہیں۔ دوراں کو ڈیڑھ مصرعوں یا تین ہم وزن ٹکڑوں کو ایک مصرعے میں ڈھال کر ایک خاص لنگی اور آہنگ پیدا کرنے کا ہنر آتا ہے۔ مثلاً فاعلن مفاعلین کی تکرار سے:

تو نے کچھ سنا لے دل/ درد کی دوا لے کر/ کوئی آنے والا ہے

یا

تیرگی کے پردوں سے/ لاکھوں چاند اگاتی ہے/ آدمی کی بیداری

یا فعلن فعولن کی تکرار سے:

پہلے پہل جب/ امبر کے نیچے/ ہم تم ملے تھے

اس کوشش میں شکست ناروا کے اعتراض کا خطرہ بھی رہتا ہے:

صحرا کے درد و غم کے مسافر/ محو سفر ہیں
مقتل سجانے/ نالوں کے خیمے/ زیر و زبر ہیں

حرف کے دبنے کی مثال بھی ان کے یہاں مل جاتی ہے۔

فردا کی شیریں داستاں تیرے ہی پاس ہے

بحیثیت مجموعی 'ابابیل' ایک قابل توجہ مجموعہ ہے جو عصری شاعری کے ایک رُخ کو اُجاگر کرتا ہے

— مظہر امام

مکتوبات

شاید :

آج کل کا دسمبر کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ سبھی مندرجات معیاری ہیں۔ فقیر موہن سیناپتی جیسے مضامین کا سلسلہ جاری رکھیے، اچھا قدم ہے۔ اس سے اُردو کے اُن خود ساختہ "بڑوں" کا قبلہ شاید درست ہو جائے جو جوڑ توڑ کو ہی دوامی زندگی کا ضامن سمجھتے ہیں۔

مسعود اختر، میرٹھ

رجحان :

دسمبر کے پرچہ میں فقیر موہن سیناپتی پر راج نرائن راز صاحب کا مضمون پسند آیا۔ یہ سلسلہ قابلِ قدر اور دلچسپ ہے، اسے جاری رکھیے۔

ویسے یہ شمارہ کمزور ہے۔ کیا نظم کیا نثر، کیا تنقید، کیا تحقیق۔ کہانی "گڑیا" پڑھی ہوئی ہے کس نام سے یاد نہیں۔ ساتذہ اور دیگر زبانوں کی تخلیقات سے فیض حاصل کرنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔

شفیقہ فرحت، بھوپال

جان دار

"آج کل" شمارہ بابت فروری ۱۹۹۰ء میں "گوشۂ ظفر پیامی" خاصہ کی چیز ہے۔ یہ حصہ جان دار ہے۔ جسے حاصلِ شمارہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ ہر قلم کار نے اپنے موضوع کو احسن طریقے سے قلمبند کیا ہے۔ رسالے کی پُشت پر ظفر پیامی کی دلکش فوٹو بھی جاذبِ نظر ہے۔ اور اس قابل ہے کہ اسے البم میں سجائیں۔

محمد مصباح اللہ، مدراس

خوبصورت انداز :

"فقیر موہن سیناپتی" (آج کل: بابت: دسمبر ۱۹۸۹ء) پڑھا۔ واقعی سیناپتی کی شخصیت بڑی عظیم ہے۔

آپ نے بڑے خوبصورت انداز میں اردو والوں کے سامنے اسے پیش کیا ہے۔ نہیں معلوم کہ ہندوستان کے دیگر علاقوں میں ایسی کتنی شخصیتیں ہوں گی، جن سے ہم اردو والے ناآشنا ہیں۔ یہاں تمل ناڈو میں بھی بہت سے لوگ ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ جو اردو کے ادیب ہیں وہ تمل ادب سے ناآشنا ہیں اور جو تمل کے ادیب ہیں وہ اردو نہیں جانتے۔ اس لیے وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔

البتہ ایک حضرت سہروردی ہیں جو کبھی جمال محمد کالج ترچناپلی سے وابستہ تھے۔ اُنہوں نے کبھی "ترو کرل" جو شاعر ترو ولوور کی شاعری ہے، کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو علمی اداروں سے متعلق ہیں۔ یہاں عموماً دو قسم کے مسلمان ہیں۔ ایک تمل بولنے والے مسلمان جو لبّے کہلاتے ہیں، دوسرے دکنی مسلمان جو صرف اردو بولتے ہیں یعنی ان کی مادری زبان اردو ہوتی ہے۔ لبّے مسلمان جن کی مادری زبان تمل ہے، ان میں شمالی ارکاٹ کے ضلع میں آمبور، وانمباڑی، پرنامبٹ وغیرہ شہروں کے رہنے والوں نے اردو کو اپنایا ہے۔ تقریباً سو سال سے ان لوگوں کی زبان اردو ہے۔ ان میں بہت ادیب اور شاعر بھی پیدا ہوئے ہیں۔ اب موجودہ دور ایسا آیا ہے کہ نئی نسل اردو سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ تمل زبان اردو بولنے والی نئی نسلوں پر بھی غالب ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں کی دراوڑی حکومت تمل کی ترویج و اشاعت اور تحفظ و بقا کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔

نثار احمد، مدراس

دو مصرعے :

دسمبر کا شمارہ پیشِ نظر ہے۔ بیشتر مشمولات معیاری ہیں۔ عظیم الشان صدیقی کا مدلل مقالہ ایک حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے۔ "قصائدِ ذوق میں علمی و فنی مصطلحات" محنت سے لکھا گیا ہے۔ راج نرائن راز کا مقالہ "فقیر موہن سیناپتی" اپنے موضوع کا عمدہ احاطہ کرتا ہے۔ غزلوں میں عمر انصاری، منظور ہاشمی اور رام کرشن راحت بالخصوص متاثر کرتے ہیں۔ افسانوں میں محسن خاں کی "گڑیا" ایک نازک کہانی ہے۔ اس کے دو کردار گڈو اور ریشم میر کے کسی نازک شعر کے دو مصرعے لگتے ہیں۔ محسن نے بچوں کی نفسیات پر ایک کامیاب کہانی لکھی ہے۔ "بائیں پسلی ۲" کی حد سے متجاوز تجریدیت کم سے کم میرے ناقص شعور کے پلے نہ پڑی۔ "پونجی" تو محترمہ آمنہ ابوالحسن کی تخلیق لگتی ہی نہیں۔

شاداب رضی، بھاگل پور

اُردو کا مقبول عام معتبر ماہ نامہ

آج کل

نئی دہلی

مہمان مدیر

راج نرائن راز

سب ایڈیٹر

خورشید اکرم

جلد : ۴۸ شمارہ : ۹

اپریل ۱۹۹۰ء چیت بیساکھ شک سمت ۱۹۱۲

قیمت : دو روپے فون : ۳۸۷۰۶۹

سرورق : آر۔ کے۔ ٹنڈن

اندرونِ ملک زرِ سالانہ :	۲۰ روپے
دو سال کے لیے :	۳۶ روپے
تین سال کے لیے :	۴۸ روپے

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :

ایڈیٹر: آج کل اُردو

پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۔

پروڈکشن آفیسر : آر۔ ایس۔ منحال

ترسیلِ زر کا پتہ :

بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن

پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترتیب

مساوات اور انصاف کے ساتھ ترقی

مدھو دنڈوتے
(مرکزی وزیر برائے خزانہ)

یہ تاثر بدقسمتی سے عام ہو رہا ہے کہ حکومت منصوبہ میں کٹوتی کر رہی، سرمایہ کاری کو کم کر رہی ہے اور اس طرح ترقی کی شرح خاصی کم ہو جائے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں ترقی کی ضرورت ہے لیکن اہم سوال یہ ہے کہ ترقی کس کے لیے؟

آج سارا زور اعلیٰ سطح کے لوگوں کی ترقی کے لیے ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ نچلی سطح پر لوگوں کو بھیک کے پیالے ہاتھ میں لے کر ترقی کے نتائج کے ان تک پہنچنے کا انتظار کرنا چاہیے۔ اس وقت ترقی مساوات کے اصول سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ لہٰذا حکومت اس بات کو فوقیت دے گی کہ مساوات اور انصاف کے ساتھ سماجی ترقی ہو۔ اکثر ایسا محسوس ہو سکتا ہے کہ تعداد کے اعتبار سے ترقی کی رفتار سست ہے، لیکن ترقی کی نوعیت ایسی ہوگی کہ اس سے ڈھانچے میں عدم توازن ختم ہوگا اور سماج کے بڑے حصے کو ترقی کا پھل ملے گا۔

وسائل محدود ہونے کے سبب بنیادی سوال سرمایہ کاری میں ترجیح کا ہے۔ اشیائے صارفین کی پیداوار کو قطعی طور پر ترجیح دی جانی چاہیے جن کو سماج کا بڑا طبقہ استعمال کرتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ باہر سے ٹکنالوجی لائی جائے اور غیر ملکی سرمایہ کا خیر مقدم کیا جائے۔

لیکن ترقی کا ایک نیا ماڈل تیار کرنا ہوگا جو لامرکزی سیکٹر میں روزگار کے مواقع کا جائزہ لے گا اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں مزدوروں کو کام پر لگائے گا۔ یہ ماڈل مرحلہ وار شروع کیا جائے گا۔ وہ اشیاء جو گھریلو صنعتوں میں تیار ہو سکتی ہیں، چھوٹی صنعتوں میں ان کی تیاری کی حوصلہ افزائی نہیں کی جائے گی۔ اسی طرح جو اشیاء چھوٹی صنعتوں میں بآسانی تیار ہو سکتی ہیں، انہیں بڑے پیمانے کی صنعتوں میں تیار کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں ہونی چاہیے۔ اگر کوئی بڑی صنعت ایسی چیز تیار کر رہی ہے جو چھوٹی صنعتوں میں بھی بنائی جاتی ہے تو بڑی صنعت کو توسیع کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

اگر ترقی کے اس ماڈل کو مرحلہ وار اپنایا جائے تو آگے چل کر ایک سیکٹر کے دائرۂ کار میں دوسرے کا دخل نہ ہو سکے گا۔ اس کا براہِ راست نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ صنعتوں کے خستہ حال ہونے یا پیداوار بند ہونے جیسی صورتِ حال سے بچا جا سکے گا۔ دوسرے ترقی کا یہ طریقہ روزگار پیدا کرنے والا ہوگا کیوں کہ لامرکزی سیکٹر روزگار فراہم کرے گا۔

ایسی بھی مثالیں ہیں جب کہ موجودہ یونٹیں ایسی چیزیں تیار کر رہی ہیں جو چھوٹے پیمانے کے سیکٹر کے لیے مخصوص ہیں وہ اپنی توسیع کرنا چاہتی ہیں تاکہ وہ مقابلے میں شریک رہ سکیں۔ ایسے واقعات کم ہوتے ہیں جہاں پائیداری کا سوال ہو۔ مثال کے طور پر اگر کوئی صنعت تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے اور یہاں تک اسے توسیع کی اجازت نہیں دی جاتی تو اس کا معاملہ زیر غور لایا جا سکتا ہے، لیکن ایسے معاملے پر اس کی نوعیت اور استحقاق کے لحاظ سے غور کیا جائے

ہمارے ملک میں فیرا (FERA) جیسے طریقے لائسنس دینے کی پالیسی اور دیگر کنٹرول ضروری ہیں۔ لیکن ان کی تشکیل میں خامیاں کم از کم ہونی چاہئیں۔ یہ بوجھل نہیں ہونے چاہئیں۔ آج لائسنس دینے کے طریقے، پالیسیاں اور ٹیکس قوانین اس طریقے سے بنائے گئے ہیں کہ وہ بہت بوجھل ہو گئے ہیں۔ ان میں جو امتیازی اختیارات دیے گئے ہیں وہ باعث تشویش ہیں۔ ان کام کرنے کے طریقوں، رہنما معیارات (Norms) اور قوانین کو ملخص بنانے کی اصل ذمہ داری حکومت کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بعض پابندیاں بھی ضروری ہیں۔ یہ چیز مساوات کے اصولوں کے مطابق نہیں ہے کہ بڑے اجارہ دار صنعتی گھرانے ترقی کریں اور دوسری طرف ناپائیدار صنعتی ادارے ہوں یہی وجہ ہے کہ پیداواریت متاثر ہوتی ہے اور روزگار کے مواقع بھی کم ہو جاتے ہیں۔ ان دو انتہاؤں سے بچنا ہے اور اس کے لیے غیر ضروری ہے۔ آج ہمارے غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخائر میں زبردست کمی آئی ہے۔ غیر ملکی زرمبادلہ کا ذخیرہ بنانے کی فوری ضرورت ہے اس کے لیے بعض پابندیاں ضروری ہیں۔

اگر اس موجودہ مالی برس کے آخر تک
رضے کا بوجھ ۔۔۔۔ر۔۔۔ اکروڑ روپے ہو جاتا ہے
ندازے کے مطابق قرض سروس کا تناسب
ی صد سے زیادہ ہو جائے گا ۔ اس کا مطلب
ہ کہ ہمیں برآمدات سے حاصل ہونے والی آمدنی
یک تہائی حصہ ترقیاتی سرگرمیوں پر خرچ
ے کے سُود کی ادائیگی اور سروس اخراجات پر
چ کرنا پڑے گا ۔

بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ قرضے کے
ھاری بوجھ کو کس طرح کم کیا جائے ۔ ایسا کچھ نہیں
ے جسے نظر انداز کیا جا سکے ۔ خود کفالت کے حصول
ر زیادہ سے زیادہ زور دینا ہوگا ۔ کسی بھی حالت
ں بین الاقوامی اداروں کی ایسی کوئی شرط منظور
ہیں کی جائے گی جس سے حکومت کی بنیادی اور
الی اور اقتصادی پالیسیوں کی خلاف ورزی ہو ۔
ور جس سے ملک کے وقار کی توہین ہو ۔

قرضے حاصل کرنے کے بھی مختلف راستے
ہیں ۔ ایک راستہ یہ ہے کہ آئی ۔ ایم ۔ ایف سے
رضہ لیا جائے یا پھر مختلف ممالک سے امداد
حاصل کی جا سکتی ہے ۔ ایک اور طریقہ یہ بھی ہے
ہ غیر ملکی بازاروں سے قرضے حاصل کیے جائیں
یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی بھی ایک خاص طریقے ہی
کو اپنایا جائے یا کسی بھی ایک راستے کو زیادہ
ترجیح دی جائے ۔

ملک کی ادائیگی سے متعلق توازن
کی حالت بہت خراب ہے ۔ اگر اس حالت کو
بہتر بنانا ہے تو اندھا دھند درآمدات سے گریز
کرنا چاہیے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ درآمد کی
جانے والی اشیاء کی قیمتوں اور حسبِ وقت
اشیاء کی درآمدات عمل میں آئیں اس وقت کے
لحاظ سے صرف اُن ہی منتخب اشیاء کو درآمد کیا جائے جنہیں
درآمد کرنا لازمی ہو لیکن اُس کے ساتھ ہی
یہ سوال اٹھتا ہے کہ ہم کہاں سے اور کس وقت
کم سے کم قیمت پر اشیاء درآمد کریں ۔ درآمدات
کے سلسلے میں ہمیں انتخاب سے کام لینا ہوگا اور
ساتھ ہی ساتھ برآمدات کے معیار کو بھی بہتر
بنانا ہوگا ۔

برآمدات کو بہتر بنانے کے لیے بعض اوقات
بطور امداد نقد معاوضہ دینے کی ضرورت بھی
پڑ سکتی ہے ۔ بعض فروغ دینے والی پالیسیوں
کی بھی ضرورت ہے ۔ حالانکہ برآمدات میں ۲۸
فی صد کا اضافہ ہوا ہے ۔ لیکن ڈالر کے اعتبار سے
یہ شرح دراصل کم ہے ۔ برآمدات کی مقدار
کے اعتبار سے بھی کارکردگی کوئی بہتر نہیں رہی
ہے ۔ بعض منتخب شعبوں میں جہاں برآمدات
میں اضافہ کرتا ہے ، تکنالوجی درآمد کرتے
اور باہر سے روپیہ حاصل کرنے کا خیر مقدم کیا
جائے گا ۔ لیکن یہ صرف منتخب شعبوں کے لیے
ہی ہے ۔

حکومت کو تجارتی اداروں کے
بڑے بڑے گروپوں کے جھگڑوں میں کوئی دلچسپی
نہیں ہے ۔ ایک صنعتی گروپ کو دوسرے گروپ
پر فوقیت دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔
صنعتی پالیسی واضح ہوگی ۔ جو صنعتیں ضوابط
اور قوانین پر عمل کریں گی ، انہیں موجودہ حکومت
سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے ، لیکن
اگر جو کوئی بھی صنعت یہ سوچتی ہے کہ وہ حکومت
پر پالیسیاں تبدیل کرنے کے لیے دباؤ ڈال سکتی ہے
تو وہ اس کی بھول ہے ۔

حکومت انتخابات میں پیسے کے بے جا
استعمال کو ختم کرنا چاہتی ہے ۔ سیاست دانوں اور
صنعت کاروں کے درمیان ایک ناپاک رشتہ
پایا جاتا ہے ۔ اس رشتہ کو توڑنے کو اولیت
دی جائے گی ۔ ●●

بقیہ : دم

اُن کا لیڈر سانگن میں بہت ہی چوکنا کھڑا ہوتی ہوا
کے فقدے ذرّے کو شو بگھ رہا تھا ۔

چند ہی لمحوں میں اس کے جوان کونے کونے کو
کھود کے آ گئے ۔

" کہیں پر کوئی نہیں ۔ سامنے والے کمرے میں
چار خوف زدہ بیٹھے ہیں ۔ شطرنج کھیل رہے تھے ۔
لیکن اب بساط اُلٹی ہے "

" یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ باہر شور کہاں سے
آ رہا تھا ؟"

" زروغزجی ــــ " آپ جسے تلاش کر رہے
ہیں وہ میں ہوں ۔ صرف میں ۔ میں نعرہ لگا کے
دکھا دوں "

پاگل نے بہت ہی چہک کے کہا اور جواب
کا انتظار کیے بغیر دیوانہ وار نعرے لگانے لگا ۔
واقعی اُس کی اکیلی آواز میں اتنا دم تھا کہ جیسے
بہت سے لوگ ایک ساتھ نعرے لگا رہے ہوں ۔

" چُپ رہو ۔ چُپ رہو "

ایک دہاڑ کے ساتھ اُس نے بندوق کا کندا
پاگل کے سر پر دے مارا ۔ خون کا جیسے فوارہ چھوٹ
پڑا اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا ۔ اماں اس سے
لپٹ کر رونے اور بَین کرنے لگی ۔

" اب کیا کیا جائے ؟"

ایک نے دریافت کیا ۔

" اُن چاروں کو پکڑ کے لے چلو "

" مگر "

" مگر اگر کیا ــــ آخر ہم یہاں کیا
کرنے آئے تھے اور یہ سالے کمرے میں جمع ہو کر
اس وقت کیا کر رہے تھے "

" ضرور کوئی سازش کر رہے ہوں گے ۔
اور ہمیں دکھانے کے لیے شطرنج کی اُلٹی بساط بچھائی
ہو گی "

چاروں کو گرفتار کر کے جب وہ لوگ جانے
لگے تو اماں بہت زور زور سے رونے لگی ۔ پاگل
بے ہوش پڑا تھا اور راجہ چھت پر چڑھ کے جو غائب
ہوا تھا نواب تک اُس کا پتہ نہیں تھا ۔ ●●

کالی داس گپتا رضا



والیٔ لوہارو اور ۱۸۵۷ء

فخرالدولہ دلاورالملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ والیٔ فیروزپور جھرکا ولوہارو (۲۲ دسمبر ۱۸۰۴ء) کا ایک مقامی عورت مُدّی سے تعلق تھا[۱] جس سے دو لڑکے اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ایک لڑکا چھوٹی عمر ہی میں فوت ہوگیا تھا۔ دوسرا شمس الدین احمد خاں تھا جو ۱۸۰۹ء میں تولّد ہوا تھا۔ ۱۸۱۲ء کے لگ بھگ نواب احمد بخش خاں نے ایک ہم کفو بیگم بیگم جان سے شادی کرلی جس سے ۱۸۱۴ء میں امین الدین احمد خاں پیدا ہوئے۔ اور ۱۸۱۶ء میں ضیاءالدین احمد خاں۔

نواب احمد خاں نے اپنے بڑے بیٹے شمس الدین احمد خاں کی عادات و اطوار کو دیکھ کر حینِ حیات یہ فیصلہ کر دیا کہ فیروزپور جھرکا کی گدّی پر شمس الدین احمد خاں بیٹھیں اور لوہارو کی ریاست دوسری بیگم کے بیٹوں امین الدین احمد خاں اور ضیاءالدین احمد خاں کے حصّے میں آئے۔

نواب احمد بخش خاں اکتوبر ۱۸۲۷ء میں انتقال کر گئے اور جیسا کہ اندیشہ تھا شمس الدین احمد خاں معاہدے سے پھر گئے۔ بھائیوں کے درمیان زبردست کش مکش شروع ہوگئی۔ اسی اثناء میں ولیم فریزر کے قتل کے الزام میں ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو شمس الدین کو پھانسی ہوگئی۔ فیروزپور جھرکا کا علاقہ بحقِ سرکار ضبط ہوگیا اور لوہارو پر دونوں بھائیوں امین الدین احمد خاں اور ضیاءالدین احمد خاں کا حق تسلیم کرلیا گیا۔ جب ضیاءالدین احمد خاں بالغ ہوئے تو انہوں نے ریاست کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی بات چھیڑی۔ دونوں بھائیوں میں تنازعہ بڑھا۔ آخرکار ۱۸۳۵ء[۲] میں حکومتِ انگریزی نے فیصلہ کیا کہ امین الدین احمد خاں والیٔ ریاست لوہارو ہوں اور ضیاءالدین احمد خاں کو ۱۸ ہزار روپیہ نقد سالانہ وظیفہ خزانۂ ریاست سے ملتا رہے اور وہ ریاست کے معاملات میں دخل نہ دیں۔ اس پر یہ لوہارو سے نقلِ مکان کرکے مستقل دہلی آرہے۔ اس طرح اگرچہ نوابی دونوں بھائیوں کے قبضہ میں رہی مگر ایک کے حصّے میں فخرالدولہ کا خطاب اور ریاست آئی اور دوسرے کے حصّے میں وظیفہ۔ اور دونوں چین کی بنسی بجانے لگے۔ حتیٰ کہ مئی ۱۸۵۷ کا زمانہ آن لگا اور ہنگامہ شروع ہوگیا۔ اس ہنگامے میں نواب امین الدین احمد خاں والیٔ لوہارو کا جو رول رہا۔ اس کے متعلق زیادہ معلومات فراہم نہیں تمام (ا) روزنامچہ عبداللطیف (۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ) (ب) تصانیفِ غالب دستنبو اور (ج) خطوطِ غالب میں کچھ تفصیل ملتی ہے۔ انہیں کو رہنما بنا کر ذیل کی معلومات پیش کی جاتی ہیں

عبداللطیف کا روزنامچہ اگرچہ چشم دید حالات پر مبنی ہے، مگر

---

۱ گھاٹا شمس آباد ضلع گوڑ گانواں کے منسارام نامی میو کی دو بیٹیاں تھیں ایک کا نام موسی تھا اور دوسری کا مُدّی۔ موسی راجا بختاور سنگھ والیٔ الور نے اپنے ہاں رکھ لی تھی اور مُدّی نواب احمد بخش خاں نے۔ جسے بہت بعد میں بہو خانم خطاب دے کر باقاعدہ بیوی بنا لیا تھا۔

۲ اس سے پہلے ۷ اگست ۱۸۳۴ء کے احسن الاخبار میں یہ اندراج ملتا ہے عرض کیا گیا کہ نواب امین الدین خاں جاگیردار لوہارو کے علاقے سے بہت سے زمیندار منحرف اور سرکش ہوگئے ہیں اس لیے شریروں اور فسادیوں کے انتظام و تادیب کی غرض سے نواب صاحب نے چھ سو پیادوں کو ملازم رکھ لیا ہے۔

۴۳۔ اے۔ جل درشن، چوتھی منزل، نیپین سی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۳۶

یادداشتوں پر منحصر ہے، جسے بہت بعد میں سمیٹا گیا اس لیے معمولی اصلاحے بھی ہوتے رہے۔ مثلاً نواب علاؤالدین احمد خاں علائی کی وفات کا ذکر ہے جو ۳۱ اکتوبر ۱۸۸۴ء کو ہوئی تھی یا مولانا شریف حسین کی تاریخ وفات ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۷ء درج ہے۔

پہلے روزنامچے کے اندراجات دیے جاتے ہیں کیوں کہ ان کا تعلق ہنگامے کے رونما ہونے سے آخر تک ہے۔ غالب کے یہاں سے اقتباسات بعد میں درج کیے جائیں گے:

(ا) ۱۹ رمضان، ۱۲ مئی

صبح کے وقت جب بادشاہ کو اصلاحِ ملکی کا خیال پیدا ہوا۔ فخر الدولہ مرزا امین الدین احمد خان بہادر اور میاں نظام الدین اور نواب مرزا ضیاء الدین احمد خاں بہادر اور نواب حسن علی خاں اور نواب احمد علی خاں اور اعتماد الدولہ میر حامد علی خاں بہادر اور نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خاں غالب اور نواب بُدھن صاحب اور خان جہاں خاں اور ارادت خاں اور مفتی صدر الدین خاں اور کرم علی خاں ایوانِ شاہی میں آداب بجانے کے لیے حاضر ہوئے اور زمین بوسی سے سرخ روئی حاصل کی اور ہر ایک نے ایک ایک خرمہرہ پیش کیا۔ بادشاہ کے حکم سے ہر روز کے لیے مرتبۂ "خانہ داری" سے یہ لوگ بہرہ اندوز ہوئے۔ نواب فخر الدولہ بہادر نے مگس رانی کا درجۂ بلند حاصل کیا۔

۱۹ شوال۔ ۱۳ جون

چونکہ بدذات باغیوں نے انگریز شیر مردوں کے مقابلے میں اپنی مکاری اور روباہ بازی سے نامردی کا ثبوت دیا۔ اس لیے سب نے سمجھ لیا کہ ان بدست لوگوں سے لڑائی میں کوئی بڑا کام انجام نہیں پائے گا۔ اور یہی بات بادشاہ کے دل میں بھی جم گئی۔ پس بادشاہ نے حسرت کے ساتھ آج شام کو ایک مجلسِ شوریٰ منعقد کی۔ اولاً نواب زینت محل اور شاہزادوں سے دریافت فرمایا۔ پھر عمدۃ الحکماء حکیم احسن اللہ خاں اور نواب سیف الدولہ میر عباس وکیل شاہی سے کچھ بلائے دریافت کی گئی۔ جب ان کی رائے سے اطمینان خاطر نہیں ہوا تو چند خاص امیرزادوں کو بھی بلانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ صمصام الدولہ نواب فرخ جاہ احمد قلی خاں بہادر، امیر الامراء نواب احتشام الدولہ انیس الرحمٰن خاں بہادر، مظفر الدولہ نواب سیف الدین حیدر خاں بہادر، معین الدولہ نواب ذوالفقار حیدر نظارت خاں بہادر حافظ ندیم الدولہ محمد داؤد خاں بہادر، نواب فخر الدولہ مرزا امین الدین احمد خاں بہادر اور نواب بدھن صاحب صاحبزادہ نواب امیر خاں کو بلوایا اور انجمن آراستہ کی۔

اللہ اللہ منتخب اشخاص دربار میں کھڑے ہوئے اور بادشاہ انکشافِ راز کے لیے بیٹھے اور تقدیر نے مسکرا کر تماشہ دیکھنے کیلیے آنکھیں کھولیں۔ بات جو زیر بحث آئی یہ تھی کہ اس طرف سے دل ہٹانا اور انگریزوں کی طرف جانا مناسب ہے۔ سب نے عرض کیا کہ یقیناً اب ان تباہ کاروں کے ساتھ اس مقام پر رہنا اپنے تئیں خطرے میں ڈالنا ہے۔ اور اس جگہ سے اکبر آباد چلے جانا بہتر ہے۔ اللہ اللہ جب عقل نے صحیح تجویز کی طرف رہنمائی کی تو مقدر نے دل میں وسوسہ پیدا کر دیا۔ مکرر امراء سے دریافت فرمایا گیا۔ جواب میں انہوں نے پھر وہی باتیں عرض کیں۔ فرمایا کہ انگریزوں سے دوستی کی شکل کیا نکالی جائے اور کس طرح سکون بخش ثبات حاصل ہو۔ (حاضرین نے) عرض کیا کہ اگر یہ بات نہیں ہے، تو یہ چاہیے کہ اول احوال تحریر کیا جائے اور جواب کے انتظار میں توقف فرمایا جائے۔ حتیٰ کہ طریقہ مہر و محبت پیدا ہو اور موافقت اور اتحاد کی صورت نکلے اور جواب مژدۂ راحت لائے اور قاصد بشارت فرحت دے۔ اس وقت اس منزل کی طرف قدم اٹھایا جائے۔ بادشاہ نے امیرزادوں کی رائے پر رضامندی کا اظہار کیا اور خط لکھنے کا حکم دیا۔ بنام نواب گورنر جنرل بہادر اور نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کو خط ارسال کیا گیا۔

۱۹ر ذی قعدہ، ۳۰ر جولائی
دربار کے منعقد ہونے کے وقت نواب فخر الدولہ بہادر مرزا امین الدین احمد خاں اور نواب حسن علی خاں کو "امتیازی عصا" مرحمت ہوئے۔ اس عطیہ سے شرفِ امتیاز حاصل کرنے پر انہوں نے (بادشاہ کی) مدح و ثنا کی اور ایک ایک اشرفی بطور نذرانہ پیش کی۔

پوشیدہ نہ رہے کہ یہ عصا سلاطین صرف امرا کو عنایت فرماتے تھے اور وہ بھی ان معدودے چند کو جو معتمد اور مخلص ہوں۔ اس زمانے میں اس کی حقیقت خاص و عام سب پر روشن تھی۔ اس وقت تم بھی اس سے واقف ہو جاؤ۔ سنو۔ جس کسی کو یہ اعزاز بخشا جاتا تھا تو وہ بارگاہ میں اس پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر اپنے اعزاز و مرتبہ کے مطابق سیدھا کھڑا ہو جاتا تھا اور سکون و اطمینان کے ساتھ مدح و ثنا اور عروض و معروض کرتا تھا.....

۲۲ ذی قعدہ، ۱۶ر جولائی
نواب فخر الدولہ بہادر مرزا امین الدین احمد خاں کو فیروزپور جھرکہ کے واسطے فرمان آل تمغا تحریر کیا گیا کہ تمہارا باضافہ فیروزپور ہماری طرف سے دوامی عطیہ ہے۔ چاہیے کہ خود انتظام کریں اور خود لشکر کا بندوبست کریں اور آج سے اپنے تئیں سلطنت کے خواص اور خانہ زادوں میں شمار کریں اور جو کام بھی کریں رضائے خالق کا خیال رکھیں اور اس کا شکریہ ادا کرتے رہیں۔ نواب فخر الدولہ چونکہ ذی فہم شخص تھے۔ اس لیے انہوں نے اس کام سے انکار کیا اور سچ تو یہ ہے کہ اس وقت زمانے کا عجب رنگ تھا کہ بادشاہ کی نعمت زحمت کا حکم رکھتی تھی اور زحمت نعمت کے برابر تھی جیسا کہ مشہور ہے: اس کا پانی آگ تھا اور آگ پانی۔

۱۶ر ذی الحجہ، ۸ر اگست
نواب مرزا ضیاء الدین احمد خاں بہادر کو عصائے سلطانی عطا ہوا۔ جب ان کو یہ اعزاز ملا تو مدح بھی کی۔

نواب مرزا ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیک سیرت اور ستودہ اخلاق رئیس تھے اور امتیازی شان کے مالک تھے۔ مردم شناس اور غریب نواز تھے اس میں شک نہیں کہ اُن کے عادات و اخلاق پسندیدہ تھے۔ فارسی اور عربی علوم میں کمال حاصل تھا۔ نظم و نثر میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔

۲۳ ذی الحجہ، ۱۵ اگست [1]
لشکر کے لیے روپیہ خرچ ناگزیر تھا اور انہوں نے اس کے طلب کرنے میں ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ چنانچہ مرزا مغل شاہزادہ نے اُن کی تحریک پر قرض خواہی کی بزم منعقد کی اور مہاجنوں اور سوداگروں سے اس معاملے میں گفتگو کی۔ جب اس طرف سے انکار ہوا تو اس طرف سے جبر ہونے لگا اور ہر مذہب و ملت کے لوگوں سے قرض طلب کیا گیا۔ نواب فخر الدولہ مرزا امین الدین خاں بہادر سے بھی خواہش کا اظہار کیا گیا۔ جب کئی بار یہ بات کہی گئی اور وہ ہر دفعہ انکار کرتے رہے تو "سرلشکر" جو مرزا مغل کے پہلو میں بیٹھا تھا، بولا کہ یہ کام میرے سپرد کر دیا جائے تاکہ (زبردستی) روپیہ وصول کروں۔ جوں ہی اس کی زبان سے یہ بات نکلی نواب فخر الدولہ

[1] یہاں ذیل کے اندراج کا کوئی محل نہ تھا۔ محض حاشیے میں اس لیے دکھایا ہے کہ یہ غالب کے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ملوث ہونے کا ثبوت ہے:

۱۹ر ذی الحجہ، ۱۱ر اگست

"نجم الدولہ نواب اسد اللہ خاں غالب نے ایک قصیدہ لکھ کر بادشاہ کو سنایا اور خلعت زیب تن کیا۔

غالب فارسی زبان پر پورا عبور رکھتے تھے۔ ان کی بہت سی تصنیفات ہیں۔ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور اہلِ فارسی پر سبقت لے گئے۔"

بہادر کی رگِ حمیت و شجاعت پھڑک اُٹھی اور کہا کہ کس کی مجال اور طاقت ہے کہ مجھ سے بولے اور روپیہ لے۔ میں تنہا ذرا سی دیر میں سروں کو تن سے جدا کر کے فتراک میں باندھ لیتا ہوں۔ اگرچہ کوئی بادشاہ زادہ ہی کیوں نہ ہو۔ میرا شیوہ رزم پیرائی ہے، نہ کہ دُکانداری۔ جب غصّے میں ان کا رنگ سُرخ اور اُن کا حال دگرگوں ہو گیا تو (وہ) بلا اندیشہ اس بات کو چھوڑ کر معذرت کرنے لگا۔ مرزا مغل نے بھی بہت دلجوئی کی اور محبت و دلداری کے ساتھ اُٹھا کر اپنی جگہ پر بٹھایا۔ وہاں سے اُٹھ کر نواب فخر الدولہ بہادر اسی غصّے کی حالت میں بادشاہ کے پاس گئے اور مرزا مغل کی شکایت کی۔ اور جگہ جگہ یہ بات کہی۔

فخر الدولہ بہادر، صاف طینت باوفا رئیس تھے اور شجاعت و مروت میں نامور تھے۔ ان کے صاحبزادے فخر الدولہ بہادر نواب مرزا علاؤ الدین احمد خاں بہادر اپنے باپ سے بھی بہتر تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بے کسوں کے لیے باعثِ راحت اور ان کی مشکلات کو حل کرنے والے تھے۔ ان کی صحبت دل آویز اور ان کی تقریر دل انگیز تھی۔ مروت، محبت اور سخاوت تو اُن پر ختم تھی۔ نثر نگاری میں یکتا اور شاعری میں اپنے زمانے کے پیشوا تھے ابھی کچھ عرصہ ہوا کہ ہمیشہ کے لیے سو گئے۔ نہ صرف مجھ کو (جسے اُن کے ساتھ رشتۂ محبت و اخوت تھا) اُن کی جُدائی کا رنج و غم ہوا، بلکہ ایک عالم پر چھا گیا۔ البتہ اللہ کا شُکر ہے کہ اُن کے بڑے صاحبزادے اور جانشین مرزا امیر الدین احمد خاں بہادر ان باقیاتِ صالحات سے ہیں۔

۱۳ محرم، ۴ ستمبر

نواب مظفر الدولہ بہادر سید ضیف الدین حیدر خاں نے عرض کیا کہ باغیوں کے بعض پیادے اور سوار تیرہ باطن ہونے کی وجہ سے اعتماد الدولہ میر حامد علی خاں سے بے جا وہم اور بدگمانی رکھتے ہیں اور کسی کی پند و نصیحت کو نہیں سنتے اور اپنی ستمگری کی روش پر قائم ہیں۔ بادشاہ نے اُن کی حفاظت کا حکم دیا۔

معز الملک رضی الدولہ بہادر مرزا محمد قدرت اللہ بیگ خاں، امیر الامراء نواب احتشام الدولہ بہادر امین الرحمٰن خاں، نواب فخر الدولہ بہادر مرزا امین الدین احمد خاں، نواب صمصام الدولہ فرخ جاہ احمد علی خاں، نواب مظفر الدولہ بہادر سید ضیف الدین حیدر خاں، نواب معین الدولہ بہادر سید ذوالفقار حیدر نظارت خاں اور سیف الدولہ بہادر میر عباس اور ندیم الدولہ بہادر حافظ محمد داؤد خاں اور مرزا عبداللہ اور مرزا ابوبکر شاہزادہ کے ساتھ مشورہ کے لیے ایک جگہ بیٹھے اور بالاتفاق اسی تجویز کے گوش گزار کرنے کے لیے شاہی خلوت کدے میں گئے اور اس طرح عرض کیا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشکلات اور دقتوں کا وقت آنے والا ہے۔

(ب) جس ہفتے انگریزی فوج نے شہر کو فتح کیا، اسی ہفتے نام ورانِ دانشمند امین الدین احمد خاں بہادر اور محمد ضیاء الدین خاں بہادر نے حفظِ وضع کی خاطر اور اُمید بہتری پر شہر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ بیوی بچوں کے علاوہ تین ہاتھی اور چالیس گھوڑے ساتھ تھے، پرگنہ لوہارو کا رُخ کیا، جو اُن کی آبائی جاگیر ہے۔ پہلے مہرولی گئے اور اس گورستانِ پُر انوار (مقبرہ) میں قیام کیا۔ دو تین روز آرام کیا۔ اس دوران میں لٹیرے سپاہیوں نے قیام گاہ کو گھیر لیا، جو کپڑے پہنے ہوئے تھے اُن کے علاوہ سارا سامان چھین لیا اور چلے گئے۔ البتہ تینوں ہاتھی جن کو وفادار اور خیر خواہ ہمراہی اس لوٹ مار کے شروع ہوتے ہی نکال کر لے گئے تھے، تباہی و نقصان کے نشان کی حیثیت سے باقی رہ گیا.... جیسے تین جلے ہوئے خس ہوں۔

(یہ لوگ) لوٹ مار کی مصیبت اُٹھا کر (اس) بے سروسامانی کے ساتھ جس کو تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو

(ریاست) دوجانہ کی طرف روانہ ہوگئے (دوجانہ) کے نامور اور نیک کردار (فرماں روا) حسن علی خاں بہادر نے ازراہِ انسانیت و فیاضی (ان کا) استقبال کیا۔ یہ کہہ کر کہ "میرا گھر بھی آپ ہی کا گھر ہے"۔ ان سب کو دوجانہ لے گئے۔

قصّہ مختصر سردارِ خوش خصال (حسن علی خان) نے اپنے ہمسر (مہمانوں) کے ساتھ وہی سلوک کیا جو شاہِ ایران نے ہمایوں کے ساتھ کیا تھا۔ صاحب کمشنر بہادر نے (ان حالات) سے واقف ہو کر اپنے پاس بلالیا۔ (یہ لوگ) شہر میں آئے اور حاکم سے ملاقات کی (صاحب کمشنر) نے کچھ دیر طعن و تشنیع کی (لیکن) جب نرم جواب سُنا تو پھر کچھ نہیں کہا۔ قلعے کے اندر ایوانِ خان سامانی پہلو میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔

تسلسلِ کلام کی رعایت کی وجہ سے میں اس خاندان کی تباہی کی داستان نہیں لکھ سکا۔ یوں سمجھو کہ مہرولی میں ان لوگوں کو لُوٹا گیا اور دہلی میں ان کے مکانات جو مالکوں سے خالی تھے، نذرِ غارت گری ہوئے۔ جو سامان یہ لوگ وہاں (مہرولی) اپنے ساتھ لے گئے تھے لوٹ مار کرنے والوں کے حصّے میں آیا۔ بعض متعلقین زندہ دوجانہ پہنچے، اور جو سامان یہاں محلات میں تھا، سب لُٹ گیا۔ بس اینٹیں پتھر باقی رہ گئے۔ نہ سیم و زر محفوظ رہا نہ لباس و بستر کا تار ایک بچا۔ خدا (ان) بے گناہوں پر رحم کرے۔ اس آغازِ ناسازگار کا انجام بہ خیر ہو، او(ان) کو اس مصیبت کے بعد ...یم نصیب ہو۔

یقیناً اکتوبر کی ۱، [۱۸۵۷ء] تاریخ تھی اور سنیچر کا دن کہ یہ دونوں دانش سرزانِ یگانہ شہر میں آئے اور جیسا کہ میں نے (پہلے) کہا ہے، قلعہ میں قیام کیا۔ اس واقعے کے دو تین دن کے بعد فوج کو حکم دیا گیا۔ فوج گئی اور مجرم کے حاکم........ عبدالرحمن کو مجرموں کی طرح لائی۔ قلعے کے اندر ایک ایوان کے گوشے میں، جس کو دیوانِ عام کہتے ہیں (ٹھہرنے کے لیے) جگہ دی گئی اور ان کی ساری جائداد انگریزی حکومت نے ضبط کرلی۔

(ج) . "یہ دوسرا حادثہ مجھ کو پہلے ہی معلوم ہوگیا تھا۔ قضا و قدر کے اُمور میں دم مارنے کی گنجائش نہیں ہے۔ کہیں جاگیر پہ جانے کی اجازت جلد ہو جائے تاکہ سب یک جا باہم آرام سے رہو۔[1]" غالب۔ مارچ ۱۸۵۸ء

"سُنا ہے لوہارو بھی ان دونوں صاحبوں (امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں) کو مل گیا۔ یہ بھی ایک تہنیت ہے۔ خدا سب کا بھلا کرے"۔

(غلام نجف خاں جولائی اگست ۱۸۵۸ء)

"امین الدین خاں کو جاگیر ملنے کا حال..... کیوں کر لکھوں ...... اُن کو جاگیر اگست میں ملی"۔

(مجروح، لعدا ز جولائی ۱۸۵۸ء)

نواب احمد بخش خاں میں دو خوبیاں تھیں۔ پہلی یہ کہ وہ انگریزوں کے چاپلوسی کی حد تک فرماں بردار تھے۔ دوسری یہ کہ وہ نہایت جری، بے باک، بہادر مگر معاملہ فہم جنگ باز تھے۔ ان دونوں خوبیوں نے اُنہیں انگریزی حکومت کا منظورِ نظر بنا رکھا تھا۔ ان کے صاحبزادے نواب امین الدین احمد خاں کو بھی یہ دونوں خوبیاں ورثے میں ملی تھیں۔ اگرچہ وہ نواب احمد بخش خاں کے انتقال (اکتوبر ۱۸۲۷ء) کے وقت صرف ۱۳ سال کے تھے تاہم اُنہوں نے اپنے والد کی روایت کو قائم رکھا۔ ۱۸۵۷ء میں ان کی عمر ۴۳ سال تھی۔ ان کی معاملہ فہمی کا یہ عالم رہا کہ جیسے ہی بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت کا اعلان ہوا وہ ہنگامے کے دوسرے ہی دن یعنی ۱۲ مئی کو اپنے بھائی نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں، غالب، آزردہ وغیرہ کے ساتھ آداب بجالانے کے لیے حاضر ہوگئے۔ "مگس رانی" کا درجۂ بلند حاصل کیا۔" پھر ۱۳ جولائی کو "امتیازی عصا" بادشاہ کی طرف سے عطا ہوا۔ مگر ۱۶ جولائی کو جب بادشاہ کی طرف سے فیروز پور جھرکا

بقیہ صـ۲۱ـ پر

---

[1] جیسا کہ غالب نے دستنبو میں لکھا ہے ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے خاتمے پر دلّی شہر چھوڑ کر امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں نے لوہارو کا قصد کیا۔ راستے میں لُٹ لٹا کر دوجانہ پہنچے، مگر وہاں پکڑ لیے گئے اور خاصی مدت انگریزوں کی حراست میں لال قلعے کے اندر رہے۔ آخر بے گناہ ثابت ہوئے اور جولائی ۱۸۵۸ء کے بعد لوہارو جانے کی اجازت ملی۔

ر الحسن راشد کاندھلوی

غالب کا منظومہ:

ترجمہ تحریر مولوی محمد سالم، یا مثنوی نمودارِ شانِ نبوّت و ولایت،

وجہ تالیف، اوّلین ترتیب اور پہلی اشاعت

غالب کی مشہور فارسی مثنوی "بیاں نمودارِ شانِ نبوّت و ولایت
ہ حقیقت پرتو نور الانوار حضرت الوہیت ست" غالبیات کے موضوعات و
باحث میں ایک اہم اور دلچسپ مطالعہ ہے۔ اس مثنوی کے حوالے سے
لب کے مذہبی خیالات و معتقدات اور غالب سے مولانا فضل حق خیرآبادی
مراسم و تعلقات پر خاصی گفتگو کی گئی ہے۔ عام خیال ہے کہ یہ مثنوی مولانا
رآبادی کے غالب سے تعلقات کی مرہونِ منت ہے اور مولانا کی فرمائش
ان کے اصرار پر لکھی گئی ہے۔ مولانا خیرآبادی کی تحریک سید احمد شہید (یا
بی تحریک) سے "سخت مخالفت" اس مثنوی کی ترتیب و تالیف کا بنیادی
رک تھی۔ اس معروف روایت کی اساس مولانا الطاف حسین حالی کی اس
لاع پر ہے کہ:

> "مولانا فضل حق مرحوم مرزا کے بڑے گاڑھے دوست اور ان کو فارسی زبان کا نہایت معتقد رشاعر مانتے تھے چوں کہ مولانا کو وہابیوں سے سخت مخالفت تھی، انہوں نے مرزا پر نہایت اصرار کے ساتھ یہ فرمائش کی کہ فارسی میں وہابیوں کے خلاف ایک مثنوی لکھ دو جس میں ان کے بڑے بڑے اور مشہور عقیدوں کی تردید اور خاص کر امتناع نظیر خاتم النبیینؐ کے مسئلے کو زیادہ شرح و بسط کے ساتھ بیان کرو۔

> اس مسئلے میں مولانا اسمٰعیل شہید کی یہ رائے تھی کہ خاتم النبیینؐ کا مثل ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہے ممتنع بالذات نہیں ہے۔ یعنی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مثل اس لیے پیدا نہیں ہو سکتا کہ اس کا پیدا ہونا آپ کی خاتمیت کے منافی ہے نہ اس لیے کہ خدا اس کے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ برخلاف اس کے مولانا فضل حق کی یہ رائے تھی کہ خاتم النبیینؐ کا مثل ممتنع بالذات ہے اور جس طرح خدا اپنا مثل پیدا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح خاتم النبیین کا مثل بھی پیدا نہیں کر سکتا۔

> مرزا صاحب پر یہ فرمائش ہوئی کہ اس مسئلے پر جو رائے مولانا فضل حق کی ہے وہ فارسی نظم میں بیان کی جائے۔ مرزا نے اوّل عذر کیا کہ مسائل علمی کا نظم میں بیان کرنا مشکل ہے مگر انہوں نے نہ مانا۔ لاچار مرزا نے ایک مثنوی جو کہ ان کی کلیات میں مثنویات کے سلسلے میں چھپی مثنوی ہے لکھ کر مولانا کو سنائی۔ انہوں نے بے انتہا تعریف کی اور یہ کہا کہ اگر میں فارسی شاعری میں تمہارے برابر مشاق ہوتا تو بھی ایسی خوبی سے ان مطالب کو ادا نہ کر سکتا"۔ [5]

چونکہ غالب کے جملہ مآثر و معاصر اس مثنوی کی ترتیب تالیف کے تذکرہ سے یکسر خاموش ہیں اور خطوطِ غالب میں بھی ایک موقع پر "مثنوی ردِ وہابیہ" کے مجمل و نا تمام حوالے کے علاوہ کوئی

دلویان، کاندھلہ، ضلع مظفر نگر (یوپی) ۲۴۷۷۷۵

[5] "یادگارِ غالب" حالی ص: ۷۲ - ۷۱
(طبع دوم - مطبع فیض عام علی گڑھ ۱۸۹۷ء)

اور تفصیل درج نہیں[1]۔ اس لیے یادگارِ غالب کی مذکورہ بالا روایت کو جو اس مثنوی کے پس منظر اور وجہ تالیف کے متعلق دریافت واحد ماخذ ہے اس بحث میں قولِ فیصل اور تقریباً سند کی حیثیت حاصل ہے۔ اس روایت کی اسی انفرادیت و خصوصیت کی وجہ سے مؤلفاتِ غالب کے ضمن میں مثنوی نمود داری شانِ نبوّت وولایت کے تعارف میں تحریک سیّد احمد شہید کے خلاف معاصر ردِ عمل کے تذکرہ میں اور مولانا خیر آبادی کے احوال و سوانح میں حالی کے اس قول کا حوالہ و اعادہ ایک عام معمول ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ حالی کی یہ اطلاع حقیقتِ واقعہ کا مناسب اظہار اور اس مثنوی کی وجہ تالیف کی صحیح روداد نہیں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ مثنوی نمود داری شانِ نبوّت کی ترتیب و تالیف کے دو مختلف محرکات دو دور، دو ترتیبیں اور دو اشاعتیں ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے جدا اور خاصی حد تک غیر متعلق ہیں۔ حالی کی روایت اس مثنوی کی ترتیب و اشاعت کے دوسرے دور کا اور صرف ان آخری اشعار کا پس منظر بیان کر رہی ہے جو امکان و امتناع نظیر کے موضوع پر ہیں۔ مثنوی کے ابتدائی تین چوتھائی یا ۹۸ (اٹھانوے) اشعار کا اس پس منظر سے مولانا خیر آبادی کی وہابیوں سے سخت مخالفت سے مولانا کی غالب سے باہمی مراسم و تعلقات سے کچھ واسطہ نہیں۔ مثنوی کے اس حصّے کی وجہ تالیف و ترتیب کچھ اور ہے جس کا (میری ناچیز معلومات کے مطابق) حالی کسی اور ماہرِ غالبیات یا اور کسی تذکرہ نگار نے کچھ ذکر نہیں کیا۔

یہ مثنوی دراصل مولانا محمد سالم (خلف مولانا سلام اللہ بن مولانا شیخ الاسلام حنفی) دہلوی کی ایک تحریر کی ترجمانی اور اس کا منظوم فارسی پیرہن ہے جو بہادر شاہ ظفر کی تعمیلِ ارشاد میں شعبان یا رمضان المبارک سنہ ۱۲۶۸ھ جون جولائی ۱۸۵۲ء میں منظوم و مرتب ہوئی اور بہادر شاہ کی ہدایت کے مطابق مطبع سلطانی قلعہ معلیٰ شاہ جہاں آباد (دہلی) سے اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ مگر تعجب ہے کہ خطوطِ غالب میں کلیاتِ نظم فارسی کی قدیم و جدید اشاعتوں میں اور احوالِ غالب پر دریافت معروف ماخذ میں مثنوی نمود داری کی اس ترتیب و اشاعت کا کہیں حوالہ و اشارہ درج نہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس اشاعت کے نسخے انتہائی کمیاب بلکہ معدوم و مفقود ہیں۔

مجھے اس اشاعت کا ایک صاف ستھرا عمدہ نسخہ اپنے علمی محسن و کرم فرما جناب ترفیق احمد صاحب علوی کیرانوی (خیل خورد کیرانہ ضلع مظفر نگر یوپی) کی عنایت سے حاصل ہوا ہے۔ موصوف کے دلی شکریہ اور جذبات سپاس و امتنان کے ساتھ اس نادر اشاعت کا تعارف اور اس کی ترتیب و تالیف کا کچھ منظر و پس منظر سطور ذیل میں حاضر ہے۔ اگرچہ اس مثنوی کے سببِ تالیف کے ذکر میں حالی کی محولہ بالا روایت کے بعض اجزا درست اور مطابق واقعہ نہیں ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس مثنوی کی ترتیب و تالیف کا تحریک سید احمد شہید کے خلاف ردِ عمل سے کچھ تعلق ضرور ہے۔ مثنوی کے اسلوبِ بیان اور مضامین کے بین السطور سے تحریک سیّد احمد شہید[2] (یا وہابی تحریک) کے بعض نظریات کی تردید صاف جھلک رہی ہے جو اس مثنوی کی نظم و ترتیب کے اصل محرک مولانا محمد سالم کے خیالات کا اثر ہے۔ مولانا نے تحریک سیّد احمد شہید اور اس تحریک کے مخالف علمار کے درمیان متنازعہ مذہبی اسلامی چند مباحث پر ایک تحریر مرتب کی، جس میں "وہابیوں کے بڑے بڑے اور مشہور عقیدوں کی تردید تھی"۔

مولانا محمد سالم نے یہ تحریر بہادر شاہ ظفر کے حضور پیش کی اور اس مضمون کو فارسی میں نظم کرا دینے کی درخواست کی۔ بہادر شاہ ظفر نے یہ درخواست منظور فرمائی اور غالب کو جو اس وقت دربار سے وابستہ اور مہر نیم روز کی ترتیب میں مشغول تھے، اس خدمت پر مامور کیا۔ تعمیل ارشاد ہوئی اور غالب نے اس مضمون کو نظم کرکے بہادر شاہ کے ملاحظہ سے گزارا، بہادر شاہ کو یہ ترتیب و ترجمانی بہت پسند آئی:

"بملاحظہ اعلیٰ حضرت کیواں منزلت گزرانیدہ و
بسیار پسند طبع مشکل پسند قدسی افتادہ"

بہادر شاہ نے اس کی فوراً طباعت کا حکم دیا۔ اسی ارشاد کی بجا آوری میں یہ مثنوی مطبع سلطانی سے کتابی صورت میں جلوہ گر ہوئی، اس اشاعت کے ساتھ دو صفحے کی ایک تمہید شامل ہے جس میں اس مثنوی کی وجہ تالیف اور محرکات کا صاف تذکرہ موجود ہے۔

---

[1] غالب لکھتے ہیں: "ردِ فرقہ وہابیہ میں ایک مثنوی جو سابق میں لکھی تھی وہ محی الدولہ کو بھیجی۔ رسید بھی نہ آئی"

مکتوب بنام حبیب اللہ ذکا محررہ ۱۰ ربیع الاول سنہ ۱۲۷۹ھ (۲۶ اگست ۱۸۶۳ء) اردوئے معلیٰ ص ۳۷۸ (شیخ مبارک علی لاہور بار اوّل بلا سنہ) نیز ملاحظہ ہو غالب اور ذکا: از جناب ضیا الدین احمد شکیب ص ۳۵ ص ۱۱۶ (دہلی: ۱۹۷۲ء) بعض اور خطوط میں بھی ایک مثنوی کے بھیجنے کا تذکرہ ہے مثلاً مکتوب بنام تفتہ مورخہ ۳ دسمبر ۱۸۵۸ء اردوئے معلیٰ ص ۳۸ نیز مکتوب مورخہ یکم ستمبر بلا سنہ اردوئے معلیٰ ص ۸۸ نقش اور خطوط میں بھی تذکرہ ہے۔ مگر ان سے یہی مثنوی مراد ہے یا کوئی اور۔

[2] تحریک سیّد احمد شہید جو غلط طور پر وہابی تحریک کے نام سے مشہور ہے غیر منقسم ہندوستان، بلکہ جنوب مشرقی ایشیا کی سب سے بڑی منظم اور طاقت ور تحریک تھی جس نے ہندوستان کی اسلامی تاریخ پر، یہاں کی سیاست پر اور اردو نثر کی ابتدائی تاریخ پر ان مٹ نقوش ثبت کیے ہیں۔ تفصیلات پر مختلف زبانوں میں کم و بیش دو درجن کتابیں دستیاب ہیں۔

اور اس کی مدد سے اس مثنوی کی تالیف واشاعت کی تمام روداد آئینہ ہو جاتی ہے۔ ان معلومات سے استفادہ کے لیے اس تمہید کا بہ تمام و کمال مطالعہ ضروری ہے۔ تمہید نگار لکھتے ہیں :

> بعد حمد آفریں و نعت حضرت سید المرسلین و خاتم النبیین صلواۃ اللہ علیہ وعلیٰ آلہ طیبین' و اصحابہ الطاہرین، بر مرات ضمیر ارباب حقیقت' و اصحاب طریقت منطبع میگردد کہ درین ولا سالک مسالک ہدایت ناہج مناہج شریعت' جامع معقول و منقول' حاوی فروع و اصول' مولانائے معظم و مکرم مولوی محمد سالم نادمجدہ' مسائل جواز استمداد از حضرات انبیاء علیہم السلام خصوصاً جناب مستطاب خیر الانام و اولیائے کرام قدس اللہ اسرارہم از روایات فتاوہائے فقہیہ نگاشتہ بحضور خاقان گیتی ستان' و سلطان دارا دربان حضرت ظل سبحانی خلیفتہ العمانی ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطانہ و افاض علی العالمین برہ و احسانہ پیش کش کردہ' بنا بر نظم آں استدعا نمودہ بودند'
>
> چنانچہ حسب الحکم قضا شیم زبدۂ سخنوران' اسوۂ سخن فہمان نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ در یک صد و یک بیت جملگی مسئلہ ہائے جواز استمداد وغیرہ منظوم کردہ' بملاحظہ اعلیٰ حضرت کیواں منزلت گزرانیدند و بسیار پسند طبع مشکل پسند قدسی افتادہ'
>
> و بتاریخ نہم شہر شوال ۱۲۶۸ھ ہجریہ مقدسہ مطابق سال شانزدہم جلوس معلی احکام داد ند بنا بر طبع آں' در مطبع سلطانی شرف صدور یافتہ و بقالب طبع درآمدہ است۔ والسلام علی من اتبع الہدیٰ'[1]

---

[1] تمہید اشاعت اول منظومۂ غالب صد ۲ صد ۳ (دہلی: ۱۲۶۸ھ)
اس تمہید و تحریر کا حرف بہ حرف ترجمہ تکلف اور شاید فضول شمار ہو۔ اس لیے اس کا صرف مفہوم اور خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ :

حمد پیدا کرنے والے کی حمد و ثنا اور حضرت سید المرسلین خاتم النبیین کی تعریف کے بعد درود و سلام ہو آپ پر' آپ کی برگزیدہ آل اور پاک ساتھیوں پر۔

اہل طریقت اور اصحاب حقیقت کے آئینۂ ضمیر پر واضح ہو کہ قریب میں راہ ہدایت پر چلنے والے اور شریعت کے کشادہ راستہ میں سہولت پیدا کرنے والے عقلی نقلی علوم کے جامع اور فروع و اصول کے ماہر مولانا معظم و مکرم مولانا محمد سالم حضرات انبیاء خصوصاً حضرت خیر الانام علیہم السلام اور بزرگان دین استمداد (مدد چاہنے) کے مسائل فقہی روایات سے لکھ کر سلطان عالم پناہ بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں لائے اور اس (مضمون) کو نظم کرا دینے کی درخواست کی۔ چنانچہ (بہادر شاہ کے) اہل فرمان کے مطابق ممتاز شاعر اور سخن فہموں کے سردار نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ نے ایک سو ایک شعر میں استمداد وغیرہ کے جائز ہونے کے تمام مسائل کو نظم کر کے اعلیٰ حضرت (بہادر شاہ) کے ملاحظہ کے لیے پیش کیے، جو ان کی مشکل پسند طبیعت کو بے انتہا پسند آئے۔ بہادر شاہ نے ۹ شوال ۱۲۶۸ھ (۲۸ جولائی ۱۸۵۲ء) مطابق سنہ ۱۶ جلوس بہادر شاہ کو (اس کی طباعت کا) حکم دیا۔ جس کی وجہ سے مطبع سلطانی کو اس کی طباعت کا شرف حاصل ہوا۔ اور یہ کتاب لباس طباعت سے جلوہ گر ہوئی۔ سلام ہو ان پر جو ہدایت (سچائی) کے پیرو کار ہیں۔

اس تمہید یا دیباچہ کا تجزیہ کیجیے تو کئی سوالات سامنے آتے ہیں :

۱۔ مولانا محمد سالم کون تھے۔ ان کا تعارف اور علمی مرتبہ کیا ہے اور ان کے قلعۂ معلیٰ خصوصاً بہادر شاہ ظفر سے کس طرح کے روابط تھے؟

۲۔ مولانا نے جو تحریر منظوم ترجمہ کے لیے بہادر شاہ ظفر کے حضور پیش کی، وہ کس قسم کی تھی اور اس کی زبان کیا تھی؟

۳۔ بہادر شاہ ظفر کی اس موضوع سے ذاتی دلچسپی تھی یا یہ ترجمہ صرف از راہ مراسم و محبت کرایا گیا ہے۔

ان سوالات کے فیصلہ کن جوابات کے لیے معتبر ذرائع معلومات راقم سطور کی دسترس میں نہیں ہیں۔ تاہم میں نے اس سمت پیش قدمی کی ایک معمولی سی کوشش ضرور کی ہے۔ نتائج کچھ اس طرح ہیں :

(۱) مولانا محمد سالم سلالۂ شیخ عبد الحق محدث دہلوی سے وابستہ اس خانوادۂ علم و عمل کی روایات کے خاتم اور آخری روشن چراغ تھے۔ شیخ عبد الحق تک سلسلۂ نسب اس طرح ہے:

مولانا محمد سالم بن سلام اللہ بن شیخ الاسلام بن حافظ فخر الدین

بن محب اللہ بن نور اللہ ابن نور الحق بن شیخ عبد الحق محدث دہلوی[1]

تعلیم و خادہ کی تفصیل علمی تدریسی خدمات کا تذکرہ اور سنین ولادت و وفات دریافت نہیں ۔ اگرچہ غالب کے زیر تعارف منظومہ کے تمہید نگار نے مولانا سالم کے لیے جامع "منقول و معقول" اور "حاوی فروع و اصول" کے بلند کلمات استعمال کیے ہیں ۔ مگر افسوس کہ دستیاب ذرائع معلومات و مآخذ اس قول کی تصدیق و تحقیق میں ہماری مدد سے قاصر ہیں[2]

مؤلف نزہۃ الخواطر کی اطلاع ہے کہ مولانا محمد سالم نے اپنے عہد کے علماء سے تعلیم پائی ۔ حرمین کا سفر کیا اور حج و زیارت حرمین سے مشرف ہوئے ۔ مولانا عبد الحئی حسنی نے مولانا محمد سالم کی چھ تالیفات کا بھی ذکر کیا ہے ۔ جو یہ ہیں

اصول الایمان ، نور الایمان ، لطائف الاسرار (تعویذات و عملیات میں) طریق السالم ، ترجمہ حزب البحر اور رسالہ جواز سماع و غناء[3]

مولانا حسنی کے بقول ' اصول الایمان ان میں سب سے زیادہ مشہور ہے ۔ وہ دہلی سے ۱۲۵۹ھ میں شائع ہوئی تھی[4] مولانا محمد سالم کے متعلق پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کا ارشاد ہے :

"مولانا محمد سالم اور مولانا نور الاسلام کے بعد شیخ محدث کے خاندان کی علمی حیثیت تقریباً ختم ہو گئی ۔ حدیث سے وہ والہانہ تعلق جو شیخ محدث سے لے کر مولانا محمد سالم تک خاندانِ حقی کی خصوصیت تھی ، بعد کو کسی بزرگ میں نظر نہیں آتی ۔"[5]

ممکن ہے یہ خیال درست ہو مگر مولانا محمد سالم کے متعلق مزید اطلاعات کا فقدان اس روایت کی صداقت کو کمزور کر رہا ہے ۔

مذکورہ بالا مآخذ اگرچہ اس تذکرہ سے خاموش ہیں مگر زیر تعارف مثنوی کی تمہید اور خانوادۂ مغلیہ کے بعض شہزادوں کی تحریرات سے مولانا سالم کے قلعۂ معلیٰ سے قریبی روابط و مراسم کا اندازہ ہوتا ہے[6] ان تعلقات کا کیا پس منظر تھا ۔ مولانا قلعہ سے کس حیثیت سے وابستہ تھے ۔ وظیفہ و ملازمت کا سلسلہ تھا یا مولانا کی کسی خصوصیت و نسبت کی وجہ سے بادشاہ اور اہلِ قلعہ مولانا سے خلوص و عنایت رکھتے تھے ، کچھ معلوم نہیں ۔

(۲) مولانا محمد سالم کی تحریر کی کیا کیفیت اور ترتیب تھی ، کوئی فتویٰ تھا ، مفصل رسالہ تھا یا یادداشت کے طور پر مرتب اقوال و نکات تھے ۔ اور اس میں گفتگو اسی طرح مجمل مختصر مختصر فقروں میں درج تھی ، جس طرح غالب نے اس کو نظم کیا ہے یا اصل تحریر مفصل اور علمی استدلال و مباحث سے پر تھی ۔ شاعر نے اس کا صرف خلاصہ نظم کیا ہے ۔ اس کا موجودہ معلومات کی روشنی میں یقینی جواب ممکن نہیں مگر قرائن یہی بتا رہے ہیں کہ غالب کی مثنوی مولانا کی تحریر کا بہ تمام و کمال عکس و آئینہ ہے ۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کی تحریر بہت مجمل و مختصر تھی اور اس میں کوئی نادر نکتہ ' علمی بحث اور دلیل ایسی نہیں تھی جو اہلِ علم و ذوق کو کسی طرح متاثر کر سکے جناب غلام رسول مہر کے الفاظ میں :

" (اس) مثنوی میں کوئی دلیل ایسی نہیں جسے نئی یا شرعی کہا جا سکے ۔ عام باتیں ہیں جو بارہا کہی گئی ہیں ۔ البتہ انہیں پیش کرنے کا ڈھنگ نیا ہے اور عوام کے لیے خاصا جاذب معلوم ہوتا ہے ۔"[7]

ان قرائن کی روشنی میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فنی استدلالی بحث اور آ

---

۱ مستفاد از حیات شیخ عبد الحق محدث ' مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی ص۱۵۵ (دہلی : ۱۳۷۳ھ)

۲ تمہید کی عبارت سے معلوم ہو رہا ہے کہ اس تحریر کا مرتب کوئی درباری شخص اور مبالغہ کا عادی ہے ۔ جس شخص نے بہادر شاہ ظفر جیسے بے دست و پا بے حکم ، بے ملک برائے نام حکمراں کے لیے " خاقان گیتی ستاں " " سلطان دارا دربان " جیسے غیر معمولی کلمات استعمال کیے ہیں وہ مولانا محمد سالم کے لیے مبالغہ سے کیوں بچا رہا ہوگا ۔ ؟

۳-۴ ملاحظہ ہو : نزہۃ الخواطر مولانا عبد الحئی حسنی رائے بریلوی ص۲۰ ، ص۱۴۴ (حیدرآباد دکن ۱۳۷۸ھ / ۱۹۵۹ء) مولانا کی تالیفات کی یہی فہرست نظامی صاحب نے بھی نقل فرمائی ہے ۔ دونوں کا ماخذ مرآۃ الحقائق مؤلفہ مولانا محمد برکت علی حنفی ہے

۵ حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی ۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی ص۲۶۴ (دہلی : ۱۳۷۲ھ)

۶ گنج بخش لائبریری ' اسلام آباد (پاکستان) کے ذخیرۂ مخطوطات میں شطحیات پر فارسی میں ایک نامعلوم الاسم رسالہ محفوظ ہے ۔ یہ رسالہ شہزادہ عالی بخت بن فیروز شاہ بن شاہ عالم کو مولوی محمد سالم کی عنایت سے حاصل ہوا تھا ۔ عالی بخت نے اس کی نقل لی ۔ یہی نسخہ گنج بخش لائبریری کی زینت ہے ۔ ترقیمۂ کاتب میں تحریر ہے :

"محمد عالی بخت ولد فیروز بخت بن شاہ عالم بادشاہ از عنایت مولوی محمد سالم گرفتہ تحریر نمود ۔ ۳۰ جلوس اکبر بادشاہ ۱۲۵۲ھ "

ملاحظہ ہو : فہرست مخطوطات گنج بخش ۔ مرتبہ احمد منزوی ص۲۲ ، ج ۲ ۔ (اسلام آباد : ۱۹۷۰ء)

۷ کلیاتِ غالب فارسی (کی ایک جامع تر اشاعت پہلا حصہ مشتمل بر قصائد و مثنویات مرتبہ جناب غلام رسول مہر ص۵ (لاہور ۔ ۱۹۶۹ء)

موضوع کا علمی جائزہ مولانا محمد سالم کا مقصد ہی نہیں تھا بلکہ اس تحریر کے ذریعے دہلی اور اطراف و نواح کے عوام کی جذباتی توجہ مولانا اپنے نظریہ کے لیے چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ اس تحریر میں قرآن شریف کی کسی آیت کا حوالہ ہے نہ حدیث و سنت سے استدلال ہے نہ قدیم علماء اور متکلمین کی تحقیقات و تصانیف سے استفادہ ہے۔ جو کچھ ہے وہ اس عہد (تیرہویں صدی ہجری) میں دہلی اور اس کے اطراف و نواح میں مشہور و مقبول چند علماء اور مشائخ کے اقوال و کلمات کا خلاصہ ہے۔ یہ سب حضرات اپنے اپنے سلاسل تصوف اور قوت افاضہ و تاثیر کے لیے مشہور تھے۔ ان حضرات کا نام آنے کے بعد وہ اس نقطۂ نظر کی عوام کی جانب سے برملا مخالفت مشکل تھی لہٰذا مولانا سالم نے اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرتے ہوئے اس امکان سے فائدہ اٹھانے کی پوری پوری کوشش کی۔ بعد میں غالب ایسے مشہور شاعر کے ذریعے اس کی ترجمانی اور بہادر شاہ کے حوالہ سے اس کی اشاعت بھی اس خیال کی تائید کر رہی ہے۔

اسی بحث سے وابستہ ایک سوال مولانا محمد سالم کی تحریر کی زبان کا ہے۔ وہ فارسی میں تھی یا اردو میں؟ فارسی میں ہونا ہر طرح قرین قیاس ہے مگر زیر نظر اشاعت میں ایک موقع پر غالب کی اس کاوش کے لیے ترجمہ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو غمازی کرتا ہے کہ اصل تحریر اردو میں تھی۔ غالب نے اس کو فارسی میں منتقل کیا ہے۔ اگر یہ استدلال درست ہے تو یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ یہ ترجمہ یا مثنوی باقیاتِ غالب میں ایک منفرد قسم کی یادگار رہے۔ اس تحریر کے علاوہ غالب نے کسی اور اردو تحریر کو فارسی کا پیرہن نہیں بخشا۔

(۳) بہادر شاہ ظفر قلعہ کے رنگین ماحول کے پروردہ۔ میلوں ٹھیلوں اور دہلی میں مروّج تمام رسومات کے دلدادہ نیز ان سب طور طریقوں کے پابند اور عادی تھے[۱] جن کے خلاف تحریک سید احمد شہید سے وابستہ علماء خاص طور پر سرگرم تھے، اس لیے بہادر شاہ کی اس طبقہ اور مزاج کے افراد سے قربت و وابستگی طبعی امر تھا، جو ان رسومات اور طور طریقوں کے لیے گنجائش اور مذہبی جواز فراہم کرتے ہوں مگر اس کے باوصف بہادر شاہ کے خاندان حضرت شاہ ولی اللہ اور تحریک سید احمد شہید کے سربرآوردہ علماء سے بھی اسی قدر مراسم و تعلقات تھے جس قدر اور علماء سے تھے مولانا محمد سالم کی تحریر کی ترتیب سے تقریباً دو سال پہلے جب مولانا ولایت علی صادق پوری جو تحریک سید احمد شہید کے نامور رکن ممتاز عالم مبلغ اور مصلح تھے، دہلی آئے۔ اور وہاں ان کی مجالس وعظ اور قوت تاثیر کا چرچا عام ہوا تو بہادر شاہ نے مولانا کو قلعہ میں آنے کی دعوت دی۔ ضیافت کا اہتمام کیا۔ مولانا قلعہ میں گئے تو بہادر شاہ نے اعزاز و اکرام کا خاص معاملہ کیا۔ فرش تک آکر استقبال سے نوازا۔ اپنے پاس بٹھایا اور دربار میں وعظ کہلوایا۔ خود سنا اور اس سے تاثر ظاہر کیا اور مولانا کو اپنے ذاتی مہمان کی حیثیت سے قلعہ میں قیام کی دعوت دی۔ مگر مولانا نے اس کو پسند نہیں کیا اور بہادر شاہ سے ملاقات کے چند دن بعد دہلی سے چلے گئے۔[۲]

قلعہ میں مولانا ولایت علی کی پذیرائی دعوت ضیافت کا اہتمام اور مولانا کے وعظ میں بہادر شاہ کی شرکت ایسی بات نہیں تھی کہ عوام میں اس کا چرچا نہ ہوا ہو اور ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے بہادر شاہ پر بھی وہابیت کا الزام آگیا ہو۔ بہادر شاہ ظفر جو اپنی مرنجان مرنج طبیعت اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے کسی مسلک سے صاف وابستگی کو پسند نہیں کرتے تھے، اس صورت حال سے پریشان ہوئے ہوں۔ اور اپنی عادت کے مطابق اس معاملہ کی صفائی اور وہابیت کے الزام سے برأت کے لیے اشتہارات و رسائل کا سلسلہ

---

[۱] اس ذوق و مزاج کی بعض تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیے:
۱۔ بزم آخر منشی فیض الدین (زیر نظر اشاعت جناب کامل قریشی کی مرتبہ اور دہلی ۱۹۸۶ء کی طباعت ہے۔
۲۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد' مرتبہ: جناب رئیس احمد جعفری (کتاب منزل لاہور: طباعت اول (بلا سنہ)

[۲] مولانا ولایت علی رجب ۱۲۶۶ھ میں دہلی آئے تھے اور غالباً شعبان (جون: ۱۸۵۰ء) میں ان .... کی بہادر شاہ ظفر سے ملاقات ہوئی: تفصیلات کے لیے دیکھیے
۱۔ الدر المنثور فی تراجم اہل صادق پور مولانا عبد الرحیم صادق پوری۔ ۱۶۵-۱۶۴ طبع سوم (پٹنہ: ۱۳۸۴ھ)
۲۔ سرگزشت مجاہدین: جناب غلام رسول مہر ۲۵۷-۲۵۶ (شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، بلا سنہ۔ غالباً طبع سوم)
۳۔ وہابی تحریک: ڈاکٹر قیام الدین احمد ص ۱۹۰-۱۵۹ (کراچی: ۱۹۷۶ء)

شروع کیا ہو، جس کا نقطۂ عروج مولانا محمد سالم کا رسالہ ہو اور اس طرح بادشاہ ہو کے وہابیت کا داغ دھونا مقصد ہو۔ مگر یہ تمام قرائن و قیاسات ہیں۔ عین ممکن ہے کہ مولانا محمد سالم کی تحریر کی وجہ ترتیب و اشاعت کوئی اور قضیہ ہو؟

اس تحریر کے پس منظر اور متعلقات کے کچھ تذکرہ کے بعد اولین طباعت کی طرف ایک مرتبہ پھر رجوع ہوتے ہیں اور اس سے تعارف اور معلومات حاصل کرتے ہیں:

مثنوی شانِ نبوت و ولایت میں معروف و متداول نسخوں کے مطابق کُل ۱۲۸ اشعار ہیں جس میں ۲۸ شعر وہ ہیں جس میں امکان و امتناع نظیر کے موضوع پر بحث ہے، مگر زیرِ تعارف اولین اشاعت میں کُل ۱۰۱ شعر ہیں۔ ان میں ۱۰۱ میں سے ۹۸ اشعار جوں کے توں وہی ہیں جو مثنوی کے متداول نسخوں میں شامل ہیں۔ قدیم اشاعت میں تین شعر اور متاخر ترتیب میں ۲۸ شعر ایسے ہیں جو ان طباعتوں میں ہر ایک کو دوسری سے ممتاز کرتے ہیں۔ دونوں نسخوں کا توافق اور اتحاد:

من سبک روہم گراں جاں نیستم
صد نشاں پیداست پنہاں نیستم

پر ختم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد پہلی اشاعت اور موجودہ نسخوں کی ترتیب الگ الگ ہے اولین طباعت میں اس شعر کے بعد یہ تین شعر اور ہیں:

"غالب آہنگ دعا را سازدہ | بہر آمین بخت را آواز دہ
گفتہ ام زیں پیش بیتے دلنشیں | آورم از خویش بیتے دل نشیں
بر دعائے شہ سخن کوتاہ باد
تا خدا باشد بہادر شاہ باد" [۱]

یہ تینوں شعر بعد کی اشاعتوں میں درج نہیں اور کم سے کم مطبوعہ نسخوں [۲] میں ایسا کوئی حوالہ اور وضاحت نہیں ملی جن میں ان اشعار کے وجود یا ان کے خارج کیے جانے کا کسی نے تذکرہ کیا ہو —— یہ تینوں شعر مثنوی نمودارِ شانِ نبوت کے دوسرے نسخوں میں شامل نہ ہونے میں تو یکساں ہیں۔ مگر ان تینوں میں سے تیسرا اور آخری شعر اس لحاظ سے منفرد ہے کہ وہ کلیاتِ نظم فارسی کی پہلی مثنوی سرمۂ بینش میں آخری شعر اور صرف اختتام کی حیثیت سے شامل ہے۔ اس لحاظ سے محولہ بالا دو شعر غالب کے نودریافت کلام اور کلیاتِ نظم فارسی پر ایک اضافہ شمار کیے جا سکتے ہیں۔

جیسا کہ ابھی گزرا کہ:

من سبک روہم گراں جاں نیستم
صد نشاں پیداست پنہاں نیستم

تک جملہ (اٹھانوے ۹۸) اشعار اولین طباعت اور نئی اشاعت میں ایک ہیں۔ قدیم اشاعت متاخر ایڈیشنوں سے دو مرقعوں پر ایک ایک لفظ کی خفیف ترمیم میں مختلف ہے۔ اگرچہ یہ کوئی بہت اہم اختلاف نہیں ہے مگر اس کو نظر انداز کیا جانا بھی قرینِ مصلحت نہیں۔ اس ترمیم و تغییر کی تفصیل اس طور ہے:

---

[۱] یادداشت بخیر اس طرح کا ایک واقعہ مولانا سالم کی تحریر کی ترتیب کے دو سال بعد سنہ ۱۲۷۰ھ میں پیش آیا تھا جب بہادر شاہ کی ایما پر ان کی طرف سے لکھنؤ میں حضرت عباس کی درگاہ پر دھوم دھام سے علم چڑھایا گیا۔ جب اس واقعہ کی شہرت ہوئی اور بہادر شاہ کے شیعہ ہو جانے کی خبر اڑی تو بہادر شاہ نے اس الزام کی صفائی کے لیے سو جتن کیے۔ حالی کے بقول:

حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے اس کے تدارک کے لیے کچھ رسالے شائع کرائے اور بہت سے اشتہارات گلی کوچوں میں چسپاں کرائے گئے۔ جس میں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا تھا اور بہادر شاہ کے حکم سے مرزا صاحب نے بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی، جس کا نام غالبؔ دمغ الباطل ہے جس میں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا۔ اس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی۔ جو مضامین حکیم احسن اللہ خاں نے بتائے تھے ان کو فارسی میں نظم کر دیا تھا ——
یادگارِ غالب ص۳۷ (علی گڑھ: بلا سنہ)

مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: متفرقاتِ غالب۔ مسعود حسن رضوی ادیب ص۲۶ تا ۴۰ (لکھنؤ: ۱۹۶۹ء) ان ماخذ اطلاعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہادر شاہ ایسے معاملات میں کس قسم کا ذہن و مزاج رکھتے تھے۔ ممکن ہے کہ مولانا ولایت علی سے ملاقات کے بعد بھی ایسی ہی صورت پیدا ہو گئی ہو۔ بہرحال موضوع تحقیق طلب ہے —— دمغ الباطل کا غالب سے انتساب درست نہیں، یہ مولانا صہبائی کی تالیف ہے۔ اس کا ایک مطبوعہ نسخہ (پہلی طباعت) ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

[۲] ترجمہ تحریر مولوی محمد سالم ص۱۱ (مطبع سلطانی دہلی: ۱۲۶۸ھ)

[۳] کلیاتِ نظم فارسی (یا مثنویات) غالب کے درج ذیل نسخوں سے مراجعت یا استفادہ کا راقم سطور کو موقع ملا ہے:

۱- کلیاتِ نظم فارسی (منشی نول کشور، لکھنؤ: جنوری ۱۸۷۲ء)
۲- کلیاتِ غالب مرتبہ جناب مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی (لاہور ۱۹۶۷ء)
۳- ،، ،، مرتبہ جناب امیر حسن نورانی (لکھنؤ ۱۹۶۸ء)
۴- کلیاتِ غالب (ایک جامع تر اشاعت) مرتبہ جناب غلام رسول مہر حصہ اول (لاہور: ۱۹۶۹ء)

آج کل نئی دہلی
اپریل ۱۹۹۰ء

پہلی اشاعت میں درج ذیل شعر کے الفاظ یہ ہیں:

اولیا را اگر گرامی داشتیم
نز پئے رومی و جامی داشتیم

متاخر طباعتوں کے دوسرے مصرع میں جامی کے بجائے شامی تحریر ہے۔ اس کے بعد درج شعر قدیم اشاعت میں اس طرح ہے:

از برائے آں کہ ایں آزادگاں
در رہ حق جاں بجاناں دادگاں

اس شعر کے دوسرے مصرع میں بھی ایک معمولی سی ترمیم ملتی ہے۔ متاخر اشاعتوں میں "دررہِ حق" کی جگہ "از رہِ حق" قلم بند کیا گیا ہے۔ اس برائے نام اختلاف کے علاوہ ابتدائی ۹۸ اشعار میں کوئی اور اختلافِ کتابت ناچیز کی نظر میں نہیں آیا۔

زیر نظر اشاعت میں غالب کے اس منظومہ یا مثنوی کے لیے کوئی عنوان درج نہیں۔ اس کو ترجمہ تحریر مولوی محمد سالم سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ طباعت کُل گیارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلا صفحہ ٹائیٹل کے لیے وقف ہے۔ دوسرے تیسرے صفحہ پر تمہید یا حرفِ آغاز درج ہے چوتھے صفحہ سے منظومہ کا متن شروع ہوا ہے اوسط قط کا مناسب قلم ہے۔ صفحہ ۴ پر پہلی سطر میں پوری بسم اللہ تحریر ہے۔ پھر دو کالمی صفحہ ہے۔ اس صفحہ پر بارہ اشعار کے لیے جگہ نکلی ہے۔ اس کے بعد صفحہ ۵ سے صفحہ ۱۰ تک فی صفحہ ۱۳ اشعار کتابت کیے گئے ہیں۔ آخری گیارہویں صفحہ پر کُل گیارہ شعر درج ہیں۔ آخری شعر دو کالمی ترتیب کے بجائے ایک کالمی کتابت میں دو سطر میں لکھا ہے۔ اس شعر کی دائیں جانب آڑے قلم سے "کتبہ المذنب محمد بخش" اور بائیں طرف اسی انداز پر "سنہ ۱۲۶۸ھ" تحریر ہے۔ اس کے بعد ایک مربع نما خانہ ہے۔ اس میں تمام شُد درج ہے۔ یہ اس اشاعت کی آخری تحریر ہے۔ اس کے بعد کا صفحہ جو ترتیب کی رُو سے بارہواں صفحہ ہونا چاہیے بالکل سادہ اور ہر قسم کی تحریر و اندراج سے معرّیٰ ہے۔

مذکورہ تفصیلات سے یہ بات بالکل محقق اور واضح ہوگئی، کہ مثنوی شانِ نبوت و ولایت کی اوّلین ترتیب سے مولانا فضل حق خیرآبادی کا کچھ واسطہ تعلق نہیں تھا۔ طبع اوّل کی دریافت و تعارف سے قطع نظر یہ بات اس وجہ سے بھی سمجھ میں آتی تھی کہ مثنوی کی متعارف ترتیب و متن کے مطابق تین چوتھائی حصہ ان مباحث و مسائل پر مشتمل ہے جن سے مولانا خیرآبادی کبھی بہت وابستہ و منسلک نہیں رہے۔ اگرچہ مسئلہ استمداد تبرکات کی اہمیت و زیارت، قدم شریف کے وجود و ثبوت اور متعلقہ مباحث میں مولانا خیرآبادی کا مسلک تحریک سید احمد شہید کے علماء سے خاصا مختلف تھا۔ مگر ان موضوعات پر کسی رد و کد، مناظرہ یا تحریری لشکر کشی میں مولانا خیرآبادی نے سرگرم حصہ لیا ہو، راقم سطور کو معلوم نہیں ان مباحث کے ذخیرے میں گنتی کے تین چار فتوے ایسے ہیں، جن پر مولانا کی مہر یا تائیدی دستخط ثبت ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا نے ان مباحث پر نہ کوئی تحریر مرتب کی اور نہ اس میں تعاون فرمایا۔ اگر یہ مثنوی مولانا کی فرمائش یا ایما پر لکھی گئی ہوتی تو اس میں سرِفہرست عنوان اور بنیادی موضوعِ گفتگو مسئلہ ارکان و امتناعِ نظیر کو ہونا چاہیے تھا، مگر مثنوی میں یہ مبحث سب سے آخر میں مذکور ہے، جو اس مثنوی کی مولانا سے نسبت کو مشتبہ کر رہا تھا۔ اوّلین ترتیب و اشاعت کی دریافت کے بعد اس اندیشے کی تصدیق ہوئی اور مثنوی کی ترتیب کی صحیح واقعی نوعیت بڑی حد تک بے غبار ہو کر سامنے آگئی ہے۔

جس وقت مولانا محمد سالم کی تحریر مرتب ہوئی اور اس کا منظوم ترجمہ شائع ہوا اس زمانے میں مولانا خیرآبادی واجد علی شاہ کی حکومت میں ملازم صدرالصدور کے عہدے پر فائز اور لکھنؤ میں مقیم تھے[1] یہ منظوم ترجمہ مولانا تک کب پہنچا۔ اس کے بعد مولانا دلی کب تشریف لائے، کب مولانا کی فرمائش پر غالب نے آخری اشعار لکھے، متعین طور پر معلوم نہیں، لیکن اگر یہ سب مراحل بہت جلد بھی طے ہوئے ہوں تب بھی سنہ ۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۳ء کی پہلی ششماہی سے پہلے کہاں روبہ عمل آئے ہوں گے

بہرحال جس وقت بھی یہ موقع آیا مولانا خیرآبادی نے امتناعِ نظیر پر چند شعر اس ترتیب میں شامل کرنے کی غالب سے تحریک کی یا حالی کے الفاظ میں: "نہایت اصرار کے ساتھ یہ فرمائش کی"۔ غالب نے مولانا کی پاسِ خاطر میں چند شعر لکھے، مگر چونکہ غالب بھی ایک زمانے میں تحریک سید احمد شہید (یا وہابی تحریک) سے متاثر رہ چکے تھے[2] اور خاندان شاہ ولی اللہ رح

---

[1] مولانا خیرآبادی وسط سنہ ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء میں ملازم ہو کر لکھنؤ گئے اور واجد علی شاہ کی معزولی تک وہیں ملازم اور مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ سنہ ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۶ء میں "جانِ عالم" کی گرفتاری یا خارج البلد ہونے کے بعد لکھنؤ چھوڑ کر الور آئے۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: مضمون "مولانا فضل حق خیرآبادی - دورِ ملازمت" از مرتبہ پروفیسر محمد ایوب قادری مرحوم مشمولہ ارمغان فاروقی (نذر خواجہ احمد فاروقی) ترتیب ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی صفحہ ۲۴ تا ۲۴۷ (دہلی: ۱۹۸۷ء)

قادری صاحب کا یہ مضمون علامہ فضل حق خیرآبادی اور جہاد آزادی۔ مرتبہ: مولانا سعید الرحمٰن علوی (لاہور: ۱۹۸۷ء) میں بھی شامل ہے۔ ص ۱۲۸ - ۱۳۷

[2] جناب خواجہ منظور حسین نے اپنی کتاب "تحریک جہد و جہاد بطور موضوعِ سخن" (کراچی؟) میں غالب کے تحریکِ جہاد اور مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہید سے روابط کا سراغ لگایا ہے اور کلامِ غالب میں اس کے اثرات دریافت کیے ہیں۔ یہ کتاب راقم سطور کو دستیاب نہیں ہوئی۔ اس کے بعض مندرجات اور ان پر اظہار خیال کے لیے رجوع فرمایئے:

کے علماء کے نظریہ کے مطابق امکانِ نظیر کے قائل تھے۔ اس لیے ان اشعار میں امکانِ نظیر کا صاف طور پر اثبات کیا اور :

دریکے عالم دو تا خاتم مجو ئے
صد ہزاراں عالم و خاتم بگو ئے

پر اس گفتگو کو ختم کر دیا جو مولانا خیر آبادی کے نظریہ کے سراسر خلاف تھی۔ ظاہر ہے مولانا کو اس سینہ زوری پر سخت غصہ آیا ہوگا اور مولانا اس حرکت سے نہایت ناراض ہوئے ہوں گے چنانچہ :

"مولانا نے فرمایا کہ یہ تم نے کیا لکھا ہے کہ متعدد عالموں میں متعدد خاتم ہو سکتے ہیں۔ نہیں، بلکہ اگر لاکھ عالم خدا پیدا کرے تو بھی خاتم النبیین ایک ہی ہوگا۔ پس اس مضمون کو مثنوی میں سے بالکل نکال ڈالو اور جس طرح میں کہتا ہوں اس طرح بیان کرو۔" [1]

اس فہمائش اور اصرار مزید کے بعد غالب نے پندرہ شعر اور کہے ہیں، جس میں مولانا خیر آبادی کے نظریۂ امتناع نظیر کو ثابت کیا ہے، مگر یہ جو کچھ لکھا ہے مولانا کے جبر سے لکھا ہے، حالی کے بقول : ان کو مرزا کے اصلی خیالات سے کچھ تعلق نہیں، [2]

اگر غالب کو مولانا کے خیالات سے ذرا بھی اتفاق ہوتا تو غالب کے لیے مولانا کے مدعا کو تفصیل سے مدلل طور پر نظم کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ کیوں کہ اس وقت مولانا کے خیالات و دلائل عالم آشکارا تھے اور اس موضوع پر مولانا کی تین کتابیں :

۱۔ رسالہ تقریر اعتراض بر تقویۃ الایمان (مولفہ اواخر سنہ ۱۲۴۱ھ / جون جولائی سنہ ۱۸۲۶ء)
۲۔ ابطال الطغویٰ فی تحقیق الفتویٰ (مولفہ وسط سنہ ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۷ء)
۳ امتناع النظیر [3] (مولفہ تقریباً سنہ ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴-۳۵ء)

وجود میں آچکی تھیں۔ ان کے نسخے اہلِ علم کی دسترس میں تھے اور ان کے رد و جواب کا سلسلہ جاری تھا۔ غالب اگر چاہتے تو مولانا کی تحریرات کا عطر کشید کر اس کو شعری لباس عطا کر سکتے تھے، لیکن ہوا یہ کہ مکرر اصرار اور مولانا کی ناراضی کے باوجود اس موضوع پر صرف پندرہ شعر کہے اور اس میں بھی کوئی بات ایسی درج نہیں کی جس کا خاص وزن اور غیر معمولی اہمیت محسوس کی جائے! عجب نہیں کہ ان اشعار میں یہ کیفیت جان بوجھ کر پیدا کی گئی ہو۔ مضمون و موضوع سے ناواقفیت کا شاخسانہ نہ ہو۔

امکان و امتناع نظیر کے موضوع پر اشعار کی ترتیب کے بعد یہ اشعار آکاش نئی دہلی۔

ترجمہ تحریر مولوی محمود سالم میں کب شامل ہوئے، راقم سطور کو معلوم نہیں۔ مگر یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ پہلی ترتیب و اشاعت کے آخری تینوں اشعار کا اس منظومہ سے اخراج غالباً جنگ آزادی ۱۸۵۷ء یعنی بہادر شاہ ظفر کی معزولی کے بعد کسی وقت ہوا ہوگا۔ غالب بہادر شاہ ظفر کی موجودگی میں ان کی مدح اور درازیٔ عمر کی دعا پر قلم پھیر دیتے اور اپنے لیے آمدنی کا ایک دروازہ بند کر لیتے اور متعدد متوقع منافع سے ہاتھ کھینچ لیتے، سخت مشکل تھا۔ اس لیے یہ خیال قرینِ حقیقت معلوم ہوتا ہے کہ اس مثنوی میں حذف و اضافہ کا عمل جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا ہے اسی وقت یہ تمام اشعار ایک لڑی میں پروئے گئے اور اسی وقت اس منظومہ کا نام "مثنوی نمودارئ شانِ نبوت و ولایت کہ در حقیقت پرتو نور الانوار حضرت الوہیت است" طے اور تجویز ہوا ـــــ مگر یہ سوال ہنوز حل طلب ہے کہ غالب اپنے مکتوبات و تالیفات میں اس اشاعت کا ذکر کیوں نہیں کرتے۔ کیا یہ بھی بہادر شاہ ظفر اور قلعہ معلیٰ کے روابط کے تمام نشانات و باقیات کو یکسر بھلا دینے کی خواہش اور تحریک کا حصہ ہے یا تحریک سید احمد شہید سے وابستگی کے مٹے مٹے نقوش اس کے تعارف اور اشاعت میں مانع ہیں؟

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

●●

---

[1] و [2] یادگار غالب ص۲۲، ص۲۳ (مطبع فیضِ عام، علی گڑھ : بلا سنہ)

[3] یہاں امتناع النظیر کا نام مولانا خیر آبادی کے متاخر تذکرہ نگاروں کی روایت کے بقول اور عام شہرت کے حوالے سے درج کیا گیا ہے ورنہ بعض شواہد و قرائن کی وجہ سے راقم سطور کو اس کا مولانا خیر آبادی سے انتساب مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ تفصیلات کا یہ موقع نہیں۔

[4] قلعہ کے زمانۂ ملازمت کی اپنی مشہور تصنیف مہر نیمروز کے متعلق، غالب منشی شو نرائن کو لکھتے ہیں : "اس کا نام مہر نیمروز ہے، وہ سلاطین تیموریہ کی تواریخ ہے، اب وہ بات گئی گزری بلکہ وہ کتاب اب چھپانے کے لائق ہے، نہ چھپوانے کے قابل۔" (مکتوب مورخہ ۱۰ ۔ نومبر ۱۸۵۸ء)

ملاحظہ ہو :

مکاتیبِ غالب : مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی، مقدمہ ۲۹ (رام پور : ۱۹۴۹ء) نیز اردوئے معلیٰ ص۲۶۸ (شیخ مبارک علی لاہور : طبع اوّل بلا سنہ)

عبدالمغنی



اقبال اور کلیم الدین احمد

جناب کلیم الدین احمد نے "اردو شاعری پر ایک نظر" میں اقبال پر اپنی تنقید ان جملوں پر ختم کی تھی :

"اقبال ایسے شاعر تھے جس کی اردو شاعری منتظر تھی مشرقی و مغربی ادب سے وہ آشنا، نظم کے صحیح مفہوم سے باخبر۔ شاعرانہ اوصاف کے حامل، قوتِ حاسہ، غائر و محیط دماغ، ادراک، فطرت کا مشاہدہ، انفرادی طرزِ ادا، غرض ساری خوبیاں تھیں۔ اس کے ساتھ زبردست شخصیت اور تبحرِ علمی بھی۔ کیا کچھ وہ نہ کرسکتے تھے۔ اردو شاعری کو پستی سے نکال کر بلندی پر جگہ دینا ان کے لیے مشکل کام نہ تھا، لیکن اس طرف انہوں نے توجہ نہ کی۔ شاعری کو ایک آلہ سمجھا۔ قومی ترقی کا خاص قسم کے خیالات کی تشہیر کا اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے، لیکن اردو شاعری تشنہ کام ہی رہی۔"

(ص: ۱۸۷۔ حصہ دوئم، تیسرا ایڈیشن ۱۹۶۶ء)

اس اقتباس میں تنقید کے ساتھ قدر شناسی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کلیم الدین احمد اقبال کو اردو کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے خیال میں اقبال سے پہلے اردو شاعری "پستی" میں تھی، جسے "بلندی پر جگہ دینا ان کے لیے مشکل کام نہ تھا"۔ لیکن کلیم الدین احمد کا یہ نقطۂ نظر بجائے خود اس حقیقت کا غماز ہے کہ وہ اقبال کو کبھی نہیں بخشیں گے۔ ظاہر ہے کہ جب اردو شاعری میر کی غزل، سودا کے قصیدے، انیس کے مرثیے، میر حسن کی مثنوی اور غالب کے کلام کے باوجود پستی ہی میں پڑی ہوئی تھی تو اقبال اسے یکایک بلندی پر کیسے لے جاتے؟ کسی زبان میں ادب کا ارتقا اس طرح نہیں ہوتا کہ کوئی فن یکایک دامنِ کوہ سے چھلانگ لگا کر چوٹی پر جا پہنچے۔ ہر ادب کی روایات ہوتی ہے جن میں توسیع و اجتہاد اور اضافہ کر کے ترقی کی منزلیں طے کی جاتی ہیں۔ لہٰذا اقبال بھی اردو نظم اور غزل کے ورثے سے انحراف نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ کلیم الدین احمد کی توقع غیر تنقیدی ہے۔

دراصل کلیم الدین احمد کا مطمحِ نظر اردو ادب اور شاعری کی تنقیص تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی جو کچھ قدر شناسی مذکورہ بالا جملوں میں نظر آتی ہے وہ اقبال کی نظم و غزل دونوں کے ایسے تنقیدی مطالعے پر مبنی ہے، جس میں غزل کی تعریف نظم کی خوبیوں کے لیے کی گئی ہے اور نظم کی خامیاں غزل کی خوبیوں کے حوالے سے واضح کی گئی ہیں۔ اقبال کے تغزل کی تحسین کلیم الدین احمد ان لفظوں میں کرتے ہیں :

"ان کی غزلوں میں خیالات کی ایک عقبی زمین ہے اور ہر شعر اس عقبی زمین سے متعلق ہے اور اس وجہ سے ہر شعر میں بلور کی سی صفائی ہے۔ جان ہے اور شعروں میں ربط ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خیالات ایک مرکز کے گرد چکر کھاتے ہیں۔ اور یہ مرکزیت انہیں پراگندگی سے بچاتی ہے۔"

(ص: ۱۸۳۔ ایضاً)

اس اقتباس میں خیالات کی مرکزیت اور ترتیب کو اقبال کی غزلوں کی خوبی بتایا گیا ہے۔ جب کہ درحقیقت تغزل سرے سے اشعار و افکار کے ربط

پروفیسرز کوارٹرز، سائنس کالج کمپاؤنڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۵

کا کام نہیں۔ یعنی یہ ربط کسی غزل کا نہ تو ترکیبی عنصر ہے نہ اس کے لیے وجہ امتیاز یا باعث کمال، غزل کے اشعار اور ان کے خیالات میں ربط ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ تاریخ ادب میں بہترین شاعروں نے بہترین غزلیں ربط کی ناگزیر شرط یا صفت کے بغیر کہی ہیں۔ خواہ وہ حافظ ہوں یا میر یا غالب۔ اقبال کی متعدد غزلوں میں ربط اشعار یقیناً نمایاں ہے: مگر محض یہی ایک چیز ان کے کمال کا سبب نہیں۔ جب کہ ان کی متعدد عمدہ غزلوں کے تمام اشعار مربوط نہیں ہیں۔ لہٰذا غزل گوئی میں اقبال کا اصلی کارنامہ اس صنفِ سخن کی ہیئت میں کوئی انقلاب نہیں ہے۔ اس کے تصورات اور احساسات میں ایسی ترقی اور انفرادیت ہے جس کا سراغ اقبال سے پہلے اردو یا فارسی شاعری میں نہیں ملتا۔

"خضرِ راہ" کا تجزیہ کرتے ہوئے کلیم الدین احمد بحیثیت نظم اس کی فنی خامیوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

> "یہاں شعروں میں ربط و تسلسل نہیں۔ ہر شعر میں ایک مکمل خیال ہے، اس لیے ایک شعر دوسرے شعر کا محتاج نہیں۔ اور شعروں کی ترتیب میں رد و بدل بھی ممکن ہے۔ ایسی صورتِ حال میں ارتقائے خیال تو ہو ہی نہیں سکتا۔ ہر شعر زندگی سے متعلق ہے۔ اور یہی چیز ان شعروں میں باہمی ربط پیدا کرتی ہے۔ لیکن یہ وہ ربط کامل نہیں جو پہلے بند میں ملتا ہے۔ یعنی اس بند کی صورت غزل کی سی ہے۔ مضامین مختلف سہی، طرزِ ادا بھی مختلف سہی، لیکن ہر بند کی وہی کیفیت ہے جو کم و بیش مربوط غزل کی ہوتی ہے۔"
> (ص: ۱۵۲ - ایضاً)

ان نکات کا مطلب یہ ہے کہ ایک کامیاب نظم میں مربوط غزل سے بھی زیادہ تنظیم تخلیق کے مختلف حصوں میں ہونی چاہیے۔ اس طرح کہ ہر بند دوسرے بند سے مربوط اور ایک بند کے اشعار میں بھی ربطِ باہمی ہو۔ جب کہ کلیم الدین احمد کا خیال ہے کہ اقبال کی متعدد مشہور و مقبول نظموں: مثلاً شکوہ، طلوعِ اسلام اور خضرِ راہ میں یہ ہیئتی تنظیم مفقود ہے۔ اس سلسلے میں کلیم الدین احمد تخلیق کے عناصر میں عضویاتی ترکیب کا معیار پیش کرتے ہیں، جس کے مطابق اردو کی نظمیں انہیں بالکل ناکام اور خام نظر آتی ہیں۔ فن کا یہ تنقیدی نقطۂ نظر انتہاپسندانہ بلکہ کلیم الدین احمد کا خود ساختہ ہے۔ اس لیے کہ عضویاتی پیوستگی صرف کسی جان دار کے جسم میں ہو سکتی ہے، جس کا خالق خدا کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ یا پھر کسی مشین کے پرزوں میں جو بالکل بے جان ہوتے ہیں اور ان کی مصنوعی تشکیل میں فقط کاری گری کا جوہر دکھایا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ادبی تخلیق میں احساسات کا اظہار کتنا ہی مربوط ہو اس میں پیچ و خم نمایاں ہوں گے اور ہیئت کا حسن تخیل کی بلندی پر منحصر ہوگا نہ کہ وسیلۂ اظہار کی میکانکی تراش خراش پر۔ گرچہ اجزائے تخلیق میں موضوع و مواد کے لحاظ سے ممکن حد تک ہم آہنگی فطری طور پر موجود ہوگی۔ کلیم الدین احمد اپنی خیالی مثال پسندی میں ان حقائق کو نظرانداز کر جاتے ہیں کہ مغرب بالخصوص انگریزی کے جن ادبی نمونوں کے ساتھ موازنہ کرکے وہ اردو کی ادبی تخلیقات پر نکتہ چینی کرتے ہیں، وہ نمونے بھی ایک تنقیدی تجزیے میں ان کی خیالی مثال پسندی کے معیار پر ہرگز پورے نہیں اتریں گے۔ خواہ وہ شیکسپیئر کے ڈرامے ہوں ملٹن کے رزمیے یا دانتے کی تمثیلی نظم۔

اقبال سے کلیم الدین احمد کو سب سے بڑی شکایت یہ ہے:

> "اقبال نظمیں لکھتے ہیں۔ لیکن وہ پیغمبری کو شاعری سے زیادہ ضروری اور زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ انہیں کچھ کام کرنا ہے، ضروری پیغام دینا ہے، سوتوں کو جگانا ہے، اس لیے وہ پیغام اور صرف پیغام پر دھیان دیتے ہیں۔ شاعرانہ محاسن اور ٹکنیک پر کافی دھیان نہیں دیتے اور ان چیزوں پر زیادہ غور و فکر نہیں کرتے۔"
> (ص: ۱۶۴ - ایضاً)

اس عبارت میں زبان و بیان کی خامیاں ہیں۔ کلیم الدین احمد "پیغمبری" کا لفظ اقبال کے لیے بلاتکلف پیغام بری کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ جب کہ اردو محاورے میں پیغمبر صرف رسول کو کہا جاتا ہے نہ کہ ہر صاحبِ پیغام انسان کو۔ دوسری بات یہ کہ کلیم الدین احمد ایک جملے میں پہلے کہتے ہیں کہ اقبال "پیغام اور صرف پیغام پر دھیان دیتے ہیں۔" لیکن دوسرے ہی جملے میں فرماتے ہیں کہ شاعرانہ محاسن اور ٹیکنیک پر کافی دھیان نہیں دیتے اور ان چیزوں پر زیادہ غور و فکر نہیں کرتے۔ کیا صرف پیغام پر دھیان دینے اور کافی دھیان دینے میں کوئی فرق نہیں ہے —— اس طرح زیادہ غور و فکر کرنے کا مطلب کچھ نہ کچھ غور و فکر تو ضرور ہے۔ اس قسم کی ناقص عبارت درحقیقت تنقید کے فکری عیب کے سبب ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ناقد کے ذہن میں الجھن ہے۔ اور خیالات میں یکسوئی نہیں ہے۔ اس کے ذہن پر شاعر کے زبردست تخلیقی کارنامے کا رعب بھی ہے اور وہ ایک فن کار پر نکتہ چینی کرکے اپنی تنقید کا اعتبار بھی قائم کرنا چاہتا ہے، لیکن یہ بڑا سطحی اندازِ نظر ہے اور اس سے تنقید کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ پھر سوال یہ ہے کہ کیا فن واقعی پیغام سے خالی ہوتا ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا کوئی عظیم ادب آج تک بغیر کسی پیغام کے تخلیق کیا گیا ہے۔ دانتے، شیکسپیئر، ملٹن اور گیٹے کے شہکاروں کو افکار و پیغامات سے عاری

تصور کرنا ادبیاتِ عالم کی صحیح قدر و قیمت سے صریح ناواقفیت کا ثبوت دینا ہے۔ اقبال یقیناً ایک صاحبِ پیغام شاعر تھے اور ان کی فن کارانہ عظمت کے تار و پود ان کی عظیم فکر ہی سے تیار ہوئے ہیں۔ گرچہ انہوں نے فنِ شاعری کے تمام آداب بھی بہ تمام و کمال ملحوظ رکھے ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کلامِ اقبال میں فکر و فن کا کامل امتزاج ہے۔ اس لیے کہ ان کی مخصوص فکر نے ہی ان کے فن کا وہ شاندار اسلوب ترتیب دیا ہے جو منفرد طرزِ اقبال ہے اور کلامِ اقبال کے لیے ادبیاتِ عالم میں امتیاز کا باعث۔

ایسی بات نہیں کہ کلیم الدین احمد اس ادبی نکتے سے آگاہ نہیں۔ وہ خود تسلیم کرتے ہیں:

"میں یہ نہیں کہتا کہ پیغام اور شعر میں کوئی بیر ہے۔ شرط یہ ہے کہ پیغام شعری تجربہ بن جائے۔ ایسا ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ اس سے پیغام کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں ہوتی اور شعریت بھی ہاتھ آجاتی ہے۔ "شعاعِ امید" میں پیغام شعری تجربہ بن گیا ہے۔ "لالۂ صحرائی" میں بھی یہی بات ہے اور "شاہین" میں بھی۔ (ص: ۱۶۷ - ایضاً)

جب ایسی بات ہے تو پھر اس قسم کا غیر ذمہ دارانہ بیان اتنی قطعیت کے ساتھ کیوں جاری کیا جاتا ہے کہ اقبال پیغام اور صرف پیغام پر دھیان دیتے ہیں۔" یہ صورتِ حال کلیم الدین احمد کی تنقیدِ اقبال میں تضاد کا بیّن ثبوت ہے۔

بہرحال کلیم الدین احمد اپنے مخصوص محدود نقطۂ نظر سے بھی اقبال کے کارنامے کا اعتراف کرنے پر مجبور رہیں:

"اقبال نے اپنی قوم و ملت کی ایسی گراں قدر خدمت کی ہے جس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ اس میں بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اقبال اردو میں بہترین قومی و ملی شاعر ہیں۔"

(ص: ۱۴۵ - ایضاً)

لیکن اس اعتراف کے باوجود فرماتے ہیں:

"قومی و ملی شاعری شاعری کی ایک قسم ہے اور کچھ بہت اچھی قسم نہیں۔ کسی ادب میں، وہ مشرقی ہو یا مغربی اس کا مرتبہ بہت بلند نہیں۔" (ایضاً)

گویا ناقد نے ایک سانس میں شاعر کی جو تعریف کی تھی، اُسے دوسرے ہی سانس میں اس نے واپس لے لیا۔ ذہنی یا نفسیاتی اُلجھن اس کو کہتے ہیں، جس کے شکار کلیم الدین احمد اقبال کے معاملے میں ہیں۔ رہا ان کا یہ بیان کہ مشرقی یا مغربی کسی ادب میں قومی و ملی شاعری کا مرتبہ بہت بلند نہیں اور یہ بہت اچھی قسم کی شاعری نہیں تو "بہت اچھی" اور "بہت بلند" کے الفاظ کے درمیان تضاد سے قطع نظر یہ بیان ہی سرے سے بالکل غلط ہے ورنہ دانتے اور ملٹن کی قومی و ملی شاعری کو دربارد کر دینا ہوگا اور شیکسپیئر اور گیٹے کی شاعری کے بھی ملی و قومی عناصر کو رد کرنا ہوگا۔ سی۔ ایس۔ ایلیٹ دانتے کو سب سے بڑا آفاقی شاعر قرار دیتا ہے، حالانکہ دانتے کا سرمایۂ افتخار "ڈیوائن کامیڈی" سراسر مسیحی و مغربی نظریۂ زندگی اور تصورِ کائنات پر مبنی ہے، جس کو تسلیم کیے بغیر اس تصنیف کو واہیات و خرافات کے سوا کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا۔

"اقبال — ایک مطالعہ" میں کلیم الدین احمد کا نقطۂ نظر کم و بیش وہی ہے جو "اردو شاعری پر ایک نظر" میں تھا — بیش لفظ ہی میں مطالعۂ اقبال کا یہ انداز ظاہر ہوتا ہے:

"اقبال شاعر تھے، اچھے شاعر تھے اور وہ زیادہ اچھے شاعر ہو سکتے تھے۔ اگر وہ شاعر ہونے پر قناعت کرتے اور پیغمبر بننے پر مصر نہ ہوتے۔ اس پیغمبری نے ان کی شاعری پر ایک کاری ضرب لگادی، لیکن اس کاری ضرب کے بعد بھی ان کی شاعری باقی رہی اور یہ ان کی شعری جان داری کا ثبوت ہے۔" (ص: ۷)

کاری ضرب کے بعد کوئی بچتا نہیں۔ لہٰذا اقبال کی شاعری کا بچ جانا ایک معجزہ ہے یا کلیم الدین نے ایک بار پھر محاورۂ زبان کا غلط استعمال کیا ہے۔ بہرحال اس بیان کی قابلِ ذکر چیز ایک عظیم فن کار کے متعلق اس کے ناقد کا سرپرستانہ انداز ہے۔ اقبال تو اچھے شاعر تھے ہی۔ اور ہیں، کلیم الدین احمد کے ارشاد سے پہلے بھی اور بعد بھی۔ اصل سوال ان کے "زیادہ اچھے شاعر" ہو سکنے کا ہے جو ظاہر ہے کہ وہ کلیم الدین احمد کے بقول اس وقت ہو سکتے تھے۔ جب خوش قسمتی سے کلیم الدین احمد کی تنقید پڑھ لیتے۔ مگر بدقسمتی سے ان کی وفات اس تنقید سے قبل ہی ہو گئی۔ مگر بات یہ ہے کہ بزرگانہ تنقید ایک بزرگ شاعر کے شاعرانہ مقام پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی ادبی حیثیت میں کوئی فرق کلیم الدین احمد کی تنقیدوں سے آج تک نہیں ہو سکا اور نہ آئندہ ہونے کی اُمید ہے۔ اقبال کی جگہ تاریخِ ادب میں دانتے، شیکسپیئر، گیٹے، فردوسی، حافظ اور سعدی جیسے عظیم شعرائے عالم کی صف میں محفوظ ہے۔ لہٰذا اقبال کے متعلق کلیم الدین احمد کے تبصرے صرف تنقیدی عجوبے ہیں۔ جن پر ایک نظر ڈال لینا بس عجائب کا مشاہدہ ہے۔

"اقبال — ایک مطالعہ" کے مختلف ابواب میں کلیم الدین احمد نے اقبال کی نظم و غزل کا جو تنقیدی جائزہ لیا ہے وہ عالمی ادب کی [illegible]

بھی پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی چھوٹی بڑی اردو فارسی نظموں کا موازنہ بالعموم مغربی بالخصوص انگریزی شاعری کے نمونوں سے کیا گیا ہے۔ بعض اوقات کی سرخیاں ہی تقابلی مطالعے کی نشان دہی کرتی ہیں۔ مثلاً

دانتے اور اقبال

شاہین اور The Wind Hover

اقبال اور ملٹن

میں اپنی کتاب "اقبال اور عالمی ادب" میں اقبال پر کیے گئے کلیم الدین کے اعتراضات کا مفصل تجزیہ کر چکا ہوں لہٰذا موجودہ مضمون میں اس موضوع پر صرف چند اشارات کافی ہوں گے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ کلیم الدین احمد اقبال کی جن تخلیقات کی تعریف کرتے ہیں ان کا موازنہ بھی انگریزی شاعری کے چند نمونوں سے کر کے یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ اقبال اچھے شاعر ہوں تو ہوں، بہت اچھے شاعر نہیں۔ مثال کے طور پر وہ "شاہین" کی تحسین کر کے اس کا موازنہ The Wind Hover سے کرتے اور دونوں نظم کے نقائص پر روشنی ڈالتے ہیں۔ حالانکہ اوّل تو انگریزی نظم کا مصنف ہوپکنس کوئی بڑا شاعر نہیں، نہ ہی اس کی مذکورہ نظم کوئی عظیم شاہکار ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہوپکنس ایک قسم کا متشاعر (Postaster) ہے اور اس کی نظم The Wind Hover بہت حسین تخلیق نہیں۔ اس کے بعض بیانات تو اتنے مبہم ہیں کہ آئی۔ اے۔ رچرڈز جیسے ناقد کو ان کی تشریح کرنی پڑی۔ پھر بھی ان کے معانی واضح نہیں ہوئے اور بعض لفظوں کا مفہوم آج تک متعین نہیں ہوا۔ لہٰذا "شاہین" سے انگریزی نظم کا موازنہ صحیح نہیں۔

اس طرح "لالۂ صحرا" کا موازنہ ولیم بلیک کی نظم The Sun Flower سے کیا گیا ہے۔ یہاں بھی معاملہ یہ ہے کہ بلیک کا شمار انگریزی شاعری میں احیاء رومانیت کے ایک پیش رو کی حیثیت سے دوسرے درجے کے شاعروں میں ہے اور اس کی مذکورہ نظم بھی کوئی خاص کارنامہ نہیں۔ اس کے باوجود کلیم الدین احمد کہتے ہیں:

"نظم کی حیثیت سے یہ "لالۂ صحرا" سے بہتر ہے۔ گرچہ
اس میں وہ خیالات کی گہرائی نہیں جو لالۂ صحرا میں
ہے۔"

(ص: ۲۸-۲۲۷ - اقبال ــــ ایک مطالعہ)

یہ ایک عجیب و غریب فیصلہ ہے کہ جس نظم میں گہرائی کم ہے وہ اس نظم سے بہتر ہے جس میں گہرائی زیادہ ہے۔ شاید کلیم الدین احمد کو خود بھی اپنے بیان کی عجوبگی کا احساس ہے لہٰذا وہ اس کی تشریح ان لفظوں میں کرتے ہیں:

"بات یہ ہے کہ اقبال کا Ego بہت زبردست تھا
اس لیے وہ علیحدگی (Detachment) سے واقف

نہ تھے اور نہ ہو سکتے تھے۔

(ص: ۲۲۸ - ایضاً)

اس بات میں بات صرف اتنی سی ہے کہ کلیم الدین احمد فن کی تخلیق سے فنکار کی علیحدگی کو گویا شرطِ فن کاری فرض کرتے ہیں، جب کہ یہ مفروضہ بجائے خود غلط ہے۔ خواہ بعض مغربی ناقدین نے اس پر کتنا ہی زور دیا ہو۔ واقعہ تو یہ ہے کہ "لالۂ صحرائی" میں موضوع کے ساتھ شاعر کی وابستگی ہی نے اس نظم کو ایک شاہکار بنایا ہے۔ اس کے علاوہ یہ وابستگی محض ذاتی نہیں، علامتی ہے، یعنی شاعر کی ذات یہاں دراصل انسان کی علامت ہے۔ جو ایک پھول میں مدغم ہو کر اس کی کیفیات کو بہت وسیع کر دیتا ہے اور اس طرح نظم کے اندر آفاقی مضمرات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں کلیم الدین احمد سمجھتے ہیں کہ اقبال نے اپنی ذات کو علامت بنائے بغیر موضوع پر حاوی کر دیا ہے لیکن یہ ناقد کے فہم کا قصور ہے، لالۂ صحرا میں بداہتہً اقبال کی شخصیت علامتی شکل میں ظاہر ہوئی ہے۔ چنانچہ لالۂ صحرا خود ایک علامت بن گیا ہے کائنات میں انسان کے ظہور و نمود کی ـــ نظم کا ایک شعر واضح طور پر اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے:

"تو شاخ سے کیوں پھوٹا میں شاخ سے کیوں ٹوٹا
اِک جذبۂ پیدائی اِک لذتِ یکتائی

اقبال کی طویل نظموں میں کلیم الدین احمد کو صرف اردو کا "ساقی نامہ" پسند ہے جب کہ "مسجد قرطبہ" اور "ذوق و شوق" جیسی اہم اور عظیم تخلیقات پر انہوں نے نکتہ چینیاں کی ہیں۔ "طلوعِ اسلام" اور "خضرِ راہ" کا بھی یہی حال ہے۔ ان نظموں کے بعض حصوں، خصوصاً "خضرِ راہ" اور "ذوق و شوق" کے پہلے بند کی تحسین بھی وہ کرتے ہیں تو تمہید نظم یا ابتدائے موضوع کی حیثیت سے نہیں بلکہ ان کی منظر نگاری کے سبب جس میں حسنِ فطرت کا مرقع پیش کیا گیا ہے۔ نظم میں عضویاتی پیوستگی تلاش کرنے والے ناقد کی یہ خوردہ فروشی حیرت انگیز ہے اور اس سے کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری میں بے ربطی اور انتشارِ فکر کا سراغ ملتا ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ وہ فن اور ہیئت کے چکر میں فکر و مواد کو نظر انداز کر دیتے ہیں ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ مثال کے طور پر "خضرِ راہ" کے موضوعات کی سنجیدگی خواجہ خضر کی شخصیت اور خود موضوعات کی اہمیت کے سبب ہے اور خواہ شاعر نے اپنے بیان میں ایمائیت کے بجائے زیادہ تر صراحت کا طریقہ اختیار کیا ہو، مگر اس صراحت میں جا بجا شاعرانہ پیکروں، علامات و تلمیحات کے علاوہ حد درجہ روانی اور غنائیت ہے۔ "طلوعِ اسلام" اور "ذوق و شوق" میں بھی یہ خوبی موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تخلیقات میں بے شمار ایسے عمدہ اور پُر اثر معنی خیز اور فکر انگیز اشعار ہیں جو با ذوق قارئین کے حافظے پر نقش اور عوام و خواص

کے درمیان زبان زد ہو چکے ہیں، پھر موضوع کا پورا ہیولا بڑی کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ان سب تفصیل میں ابھرتا ہے، جن سے تنظیم ہیئت کا بھی ثبوت ملتا ہے خواہ کلیم الدین احمد کے مزعومات اس کے برخلاف ہوں۔

جہاں تک ملٹن کے ساتھ اقبال کے موازنے کا تعلق ہے اس میں شاعرِ مشرق کے ساتھ سخت ناانصافی کی گئی اور مغربی شاعر کو بلاوجہ خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ اقبال نے ملٹن کی طرح کوئی دیو مالائی رزمیہ تصنیف نہیں کیا، جس میں اساطیری کرداروں کو خلافِ واقعہ سرگرمیوں میں مصروف دکھایا گیا ہے۔ اقبال کی شاعری صرف حقائق پر مبنی ہے اور تاریخی واقعات سے اعتنا کرتی ہے۔ نہ کہ بےبنیاد اور نامعقول افسانہ طرازی پر۔ پھر غنایت میں اقبال کو ملٹن پر فوقیت حاصل ہے اور تنظیم ہیئت میں بھی وہ کسی سے کم نہیں۔ رہا دانتے جس کے طربیۂ خداوندی (ڈیوائن کامیڈی) کی قصیدہ خوانی میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے گئے ہیں تو معلوم ہونا چاہیے کہ مغربی شاعری کی یہ انجیل جس کی پرستش مغربی نقادوں کا پیشہ ہے نہ صرف اساطیر و خرافات سے بھری ہوئی ہے بلکہ عہدِ وسطیٰ کے سخت مذہبی تعصبات کی تاریک خیالیوں کی آئینہ دار ہے۔ جب کہ اقبال کا جاوید نامہ اس کے مقابلے میں عصرِ حاضر کی بہترین روشن خیالی کی ایک اہم ترین فنی و فکری دستاویز ہے۔ اس کے علاوہ موضوع کی مناسبت سے اس کی ترتیب و تنظیم بھی حسن و خوبی کے ساتھ کی گئی ہے خواہ کلیم الدین احمد اس کے قائل نہ ہوں۔ اس سلسلے میں سیرِ افلاک کا جو نقشہ اقبال نے پیشِ نظر رکھا ہے وہ جغرافیۂ وجود کے ان مباحث پر مبنی نہیں ہے جیسا کلیم الدین احمد غلط طور پر سمجھتے ہیں۔ جو خود قیاسات پر مبنی ہیں اور ان کے بارے میں بحث کی گنجائش ختم نہیں ہوئی۔ "جاوید نامہ" نہ صرف مشرق بلکہ عالمی شاعری کا نقطۂ عروج ہے خواہ کلیم الدین احمد کا فتویٰ اس کے خلاف ہو۔

مختصر یہ کہ کلیم الدین احمد کا مطالعہ اقبال ان کی تنقیدی نارسائی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ انہوں نے اقبال کے شاعرانہ کمال کی قدر شناسی کے بجائے اس کی ناقدری کر کے اپنی تنقید نگاری کے وقار کو بری طرح مجروح کیا ہے۔

بقیہ: والیٔ لوہارو اور ۱۸۵۷ء

(جو شمس الدین احمد خاں کے پھانسی پانے کے بعد ضبط ہو گیا تھا) دوامی عطیے کے طور پر عنایت ہوا تو اُسے قبول کرنے سے انکار کیا کیوں کہ انہیں معلوم تھا بہادر شاہ انقلابی تحریک کی رہنمائی کی قطعاً صلاحیت نہیں رکھتے اور کہ ملکہ زینت محل، شہزادے اور بعض امرا جو سازشوں کا جال پھیلا رہے ہیں وہ کبھی اس تحریک کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ اس طرح فیروز پور جھرکا پر اپنا قبضہ جما لینے کے معنی ایک ایسی مثال قائم کرنے کے ہوتے جو صریحاً انگریزوں کے حکم کی نافرمانی ہوتی۔ یقیناً ان کا وہی حشر ہوتا جو کئی دوسری ریاستوں کا ہوا تھا۔ مثلاً جھجر کے نواب عبدالرحمٰن خاں بلب گڑھ کے راجا ناہر سنگھ اور فرخ نگر کے رئیس احمد علی خاں کو پھانسی دے دی گئی۔ اور ان کی ریاستیں ضبط ہو گئیں۔ بہادر گڑھ کے رئیس بہادر جنگ کی ریاست تو ضبطی میں آئی مگر انہیں موت کے گھاٹ نہیں اُتارا گیا۔ انہیں پنشن دے کر لاہور بھیج دیا گیا۔ نواب امین الدین احمد خاں بھی پکڑے گئے قلعے میں بند بھی رہے۔ مگر نو دس ماہ بعد اپنی تدبیر سے چھوٹ گئے اور سب مراتب بھی بحال ہوئے۔

دوسری خوبی کے لیے روزنامچے میں ۱۵ اگست (۱۸۵۷ء) کا اندراج دیکھیے۔ جب ایوانِ شاہی میں "سرِ لشکر نے کہا کہ نواب امین الدین احمد خاں سے میں روپیہ زبردستی وصول کر کے دکھاتا ہوں تو نواب امین الدین احمد خاں نے جو جواب دیا وہ وہی ہے جو اُن کے بہادر باپ ایسے موقع پر دیتے۔

تاہم معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہادرانہ رویہ نواب امین الدین احمد خاں کے عہد تک ہی رہا۔ ان کے بعد انگریزی حکومت کی فرماں برداری تو باقاعدہ رہی مگر "شیوۂ رزم پیرائی" ختم ہو گیا۔

یہ صبح زندہ رہے گی

جب ہم جہلم پہنچے تو چار بج رہے تھے۔ ملہوترہ ہمیں سیدھا امداد ہمدانی کے گھر لے گیا۔ وہ بے چارا تو کئی گھنٹوں سے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ چائے پی چکے تو ملہوترہ ہمیں بازار میں وہ عمارت دکھانے لے گیا جو اس زمانے میں امپیریل تمباکو کمپنی کا آفس ہوا کرتا تھا۔ پھر وہ بازار میں اپنے کچھ پرانے واقف کاروں سے ملتا رہا اور میں اور امداد ہمدانی آپس میں بات چیت کرتے رہے۔ دراصل سگریٹوں کا کاروبار ملہوترہ کے والد نے جہلم ہی میں شروع کیا تھا۔ راجندر ملہوترہ کا ایک فائدہ یہ ہے کہ پاکستان کے ہر بڑے شہر میں پاکستان تمباکو کمپنی کی ایجنسیاں ہیں۔ اور اس حوالے سے راجندر ملہوترہ کی شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ ایک کاروباری طبقے سے بھی شناسائی ہے۔

امداد ہمدانی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ وہ مجھے بڑا بے نیاز سا آدمی لگا۔ لیکن اس میں خلوص اور مروّت بہت تھی۔ مجھے اس نے جہلم اور قلعہ روہتاس کے بارے میں ایسے باتیں بتائیں جن کے بارے میں مجھے علم نہیں تھا۔ راجندر ملہوترہ کی زندگی کا بہت حصّہ جہلم میں گزرا تھا۔ اس لیے اس شہر کے تاریخی پہلوؤں پر بھی اس نے بہت روشنی ڈالی۔ میرے لیے یہ معلومات بہت کارآمد تھیں چنانچہ میں ان دونوں سے زیادہ معلومات حاصل کرتا رہا۔ جہلم شہر کا پرانا نام باٹاکوٹی ہے اور دریائے جہلم کا نام وتستہ۔

وجہ یہ ہے کہ جتنے بھی حملہ آور آتے رہے وہ اس شہر میں توڑ پھوڑ ہی کرتے رہے۔ یہاں کے لوگ بڑے حوصلہ مند اور جاں نثار ہیں۔ اس لیے ہمیشہ حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے رہے۔ سکندر اور پورس کی لڑائی بھی یہیں ہوئی تھی۔ جہلم سے کوئی تیس میل دُور جلال پور شریف کے مقام پر اس حقیقت کو مدّنظر رکھتے ہوئے کہ اس علاقے کے لوگ بڑے بہادر اور جفاکش تھے اور انہیں فوج میں بھرتی ہونے کا شوق تھا۔ انگریز نے آتے ہی یہاں کنگ جارج رائل ملٹری اسکول کھولا تاکہ فوجیوں کے بچوں کو تعلیم دی جا سکے۔ اسی حوالے سے جہلم کو چھاؤنی بنایا گیا تھا۔

جہلم سے جُڑا ہوا ایک اور تاریخی واقعہ بھی ہے۔

مہابت خاں جہانگیر کو دہلی سے قید کر کے یہاں لایا تھا اور اس سرائے عالمگیر میں قید کر دیا تھا۔ نورجہاں خانہ بدوشوں کا بھیس بدل کر اور اپنے ہمراہ فوجیوں کو لے کر جہلم پہنچی اور دریائے جہلم کو کشتیوں کے پل سے پار کیا۔

ڈاکٹر صفدر حسین زیدی نے اس واقعہ کا ذکر اپنی کتاب "تاریخِ ہندوستان" میں کیا ہے۔ اس نے اپنی تحقیق میں یہ ثابت کیا ہے کہ نورجہاں نے ایک رات جہلم میں قیام کیا تھا۔ اور پھر مہابت خاں کی فوج پر اچانک حملہ کر کے جہانگیر کو اس کی قید سے چھڑا لیا تھا۔ اور اُسے واپس دہلی لے گئی تھی۔

جہلم شہر اور اس کے آس پاس پرانے مندروں کے نشان ملتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے کئی مندر سکندر سے بھی پہلے کے بنے ہوئے ہیں۔ ایسا ہی ایک مندر رگھوناتھ جی کا ہے۔ اس کے سامنے ایک چھوٹا سا کنواں تھا، جسے ٹھنڈی کھوئی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ کھوئی تین طرف سے بڑے بڑے درختوں سے گھری ہوئی تھی، جو ہزاروں سال پرانے تھے۔ اس کھوئی کا پانی جہلم کے سب کنوؤں سے زیادہ ٹھنڈا تھا اور لوگ گرمی کے موسم میں پینے کا پانی یہاں سے بھر کے لے جایا کرتے تھے۔ راجہ ضیاء اللہ جہلم کے ڈپٹی کمشنر نے مارشل لاء کے دوران ان تمام درختوں کو کٹوا دیا تھا اور ٹھنڈی کھوئی کو چھوڑ کر آس پاس کے تمام کنوؤں کو بند کروا دیا تھا۔

جہلم سے کوئی بیس میل دُور منگلا دیوی کا مشہور

مندر ہے، جہاں اب منگلا ڈیم بنایا گیا ہے۔ تقسیم سے پہلے منگلا مندر کے پاس سے دریائے جہلم کے پانی میں تربوز بہائے جاتے تھے اور لوگ ان ٹھنڈے تربوزوں کو دریا کے گھاٹوں سے خریدا کرتے تھے۔ متحدہ ہندوستان میں جہلم عمارتی لکڑی کا سب سے بڑا مرکز تھا۔

جہلم شعر و شاعری کا بھی بڑا اہم مرکز رہا ہے۔ ہندو شعراء میں رام جوایا خنداں کا خاص مقام ہے۔ مشتاق رائے خنداں کا شاگرد تھا۔ امداد ہمدانی نے استاد شاگرد دونوں کا ایک بہت بڑا دلچسپ واقعہ سنایا۔ رام جوایا خنداں اور مشتاق رائے دیوالی کی رات کو دریائے جہلم کے کنارے گئے اور دونوں نے ایک ایک مصرعہ کہہ کر ایک شعر مکمل کیا۔

مشتاق رائے نے پہلا مصرعہ کہا:

یہ میری آہ کے شعلے یہ سیلِ اشکِ رواں

خنداں نے دوسرا مصرعہ کہہ کر شعر مکمل کر دیا:

دیے جلا کے ندی میں بہا رہا ہوں میں

راجندر ملہوترہ نے بتایا کہ ان دنوں ایک مزاحیہ شاعر ہوا کرتا تھا، جس کا نام ماسٹر نرالا اوتار تھا۔ وہ اپنے مزاحیہ اشعار اپنی پوشاک پر لکھے رکھتا تھا۔ اس کا ایک شعر ہے:

نرالا گرم مسالہ

سستا اور اعلا

نرالا کو ان دنوں گجرات کا استاد امام دین کہا جاتا تھا۔

جہلم کا ایک پنجابی کا شاعر جس کا نام جوگی جہلمی ہے۔ مجھے اس سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا اگلے روز۔ اُس نے ایک شعر اپنے آٹوگراف کے ساتھ لکھ کر مجھے دیا۔

جس ویلے ساں بے سُرتی وِچ کوئی کیہنوں مُکی پھڑدای
ہُن تھاں تھاں تُہنہ پھیر دا ہاں جِس دِن دی سُرت سنبھالی اے

اور یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ مارچ ۹۸ء کے انڈو پاک مشاعرے میں ضرور آئے گا۔ اس کی عمر اب ۸۵ کے لگ بھگ ہے۔ اُس نے مروت میں وعدہ تو کر دیا لیکن آیا نہیں کوشش کریں گے کہ پنجابی شاعری کا یہ آفتاب غروب ہونے سے پہلے ہندوستان میں بھی اپنی دھوپ پھیلا سکے۔

رام جوایا خنداں کی ایک غزل کے کچھ اشعار امداد ہمدانی نے سنائے۔ خنداں کا کلام اب تلف ہوتا جا رہا ہے کاش جہلم کے ادیب اور شاعر اُسے سنبھال لیں اور کتابی شکل میں چھپوا دیں۔

ہجر میں لطفِ انتظار آیا

وہ تصور میں بار بار آیا

جلوۂ حُسن نے سحر کر دی

جب کوئی شام انتظار آیا

زندگی میں سکوں نہ تھا خنداں

موت آئی مجھے قرار آیا

ملہوترہ نے ۱۹۸۴ء کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس سال جہلم میں دو اندر آئے تھے۔ ایک اندر کمار گجرال دوسرا راج اندر ملہوترہ۔

ڈپٹی کمشنر جہلم راجہ سلیم اختر کی طرف سے اُن کے اعزاز میں ایک مشاعرہ منعقد کرایا گیا۔ جس کا اہتمام امداد ہمدانی اور مرحوم احسان بٹ نے کیا تھا۔ اس تقریب میں گجرال صاحب نے ایک دلچسپ بات کہی۔ تقسیم سے پہلے لاجپت رائے لائبریری قائم ہوئی تھی۔ جسے لالہ لاجپت رائے کے نام سے منسوب کیا گیا تھا۔ تقسیم کے بعد اس لائبریری کا نام اقبال لائبریری کر دیا گیا۔ گجرال صاحب نے اپنی تقریر میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اہلِ جہلم نے لائبریری کا نام تبدیل کر کے دونوں بڑی شخصیتوں کے نام پر پھولوں کی دو بڑی چادریں چڑھا دی تھیں۔ اس واقعے سے جہاں گجرال صاحب کی اردو دوستی کا ثبوت ملتا ہے، وہاں اس بات کی بھی تصدیق ہوتی ہے ان کے دل میں لالہ لاجپت رائے اور علامہ اقبال دونوں کے لیے عقیدت ہے۔

راستے میں گاڑی میں بیٹھے ہوئے راجندر ملہوترہ نے روہتاس کے قلعے کا ذکر کیا تھا جس کی بڑی تاریخی اہمیت تھی، لیکن اُسے قلعے کی پوری تفصیلات معلوم نہیں تھیں۔ یہ تفصیلات مجھے امداد ہمدانی نے بتائیں۔

ابراہیم سوری چار سدہ، ضلع پشاور کا رہنے والا گھوڑوں کی سوداگری کیا کرتا تھا۔ اس کا بیٹا حسن خاں نامی فوج کی ملازمت میں بڑا مشہور تھا۔ حاکم جونپور نے حسن خاں کی جوانمردی کو دیکھ کر اُسے بہرام پور پرگنہ کی جاگیر دی اور ایک ہزار سوار کا سردار مقرر کر دیا۔ حسن خاں کی بیوی اُمید سے تھی۔ اس نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ ایک چاند آسمان سے اُتر کر اس کے پاس آ گیا ہے۔ اُس نے جب یہ خواب حسن خاں کے آگے بیان کیا تو اُس نے ایک تازیانہ ہوا میں لہرا کر اُسے کسی اور کے آگے بیان کرنے سے منع کیا۔ کیوں کہ اس سے اس کا نیک اثر زائل ہو جاتا ہے۔ بچہ پیدا ہوئے پر اس کا نام فرید خاں رکھا گیا۔ ایک دن بچپن میں فرید خاں اپنے باپ کے سامنے ایک درہم کے لیے رو رہا تھا کہ اچانک ایک فقیر نے آ کر کہا کہ ہندوستان کا بادشاہ ایک درہم کے لیے روتا ہے؟ ان دونوں باتوں سے حسن خاں کو یقین ہو گیا کہ میرا بیٹا ایک دن ضرور ہندوستان کا بادشاہ بنے گا۔ چنانچہ فقیر کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی۔ حسن خاں اپنی خداداد ذہانت کی وجہ سے فوج میں ترقی کرتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ اُس نے بابر بادشاہ کے درباریوں میں ایک خصوصی مقام حاصل کر لیا۔ ایک دن بادشاہ شکار کھیلنے کے لیے جنگل میں جا رہا تھا اور حسن خاں نے بھی ساتھ جاتے ہوئے اپنے بیٹے فرید خاں کو بھی مدد کے لیے ساتھ لے لیا۔ اتفاق سے ایک شیر نے بادشاہ پر حملہ کر دیا، مگر فرید خاں نے بڑھ کر شیر کو مار ڈالا اور بادشاہ کی جان بچالی جس پر بادشاہ نے اُسے فرید خاں

کے بجائے شیر خاں کا خطاب دے دیا۔ چنانچہ یہ بابر بادشاہ اور ہمایوں کے درمیان شیر خان کے نام سے جانا گیا۔

بابر ایک قیافہ شناس بادشاہ تھا جب کبھی شیر خاں اپنے باپ کے ہمراہ بادشاہ کے دربار میں جاتا تو بادشاہ اس کی پیشانی کو دیکھ کر بڑا متاثر ہوتا۔ وہ اسے دیکھ کر لرز جاتا۔ اور سوچتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لڑکا ہمارے خاندان میں تفرقہ ڈال دے جو ہمارے لیے ایک مصیبت بن جائے۔ کیوں کہ بادشاہ اکثر فقیر اور فقیر اکثر بادشاہ بن جاتے ہیں اور نظام دنیا الٹ پلٹ ہوتا رہتا ہے چنانچہ اس کے قتل کی سازشیں شروع ہو گئیں۔ چنانچہ جب اسے پتہ چلا کہ بادشاہ مجھے قتل کروانے کے درپے ہے تو یہ اپنی سلامتی کے لیے وہاں سے بھاگ کر سلطان محمد حاکم پٹنہ کی فوج میں ملازم ہو گیا۔ جب سلطان محمد حاکم پٹنہ نے وفات پائی تو اسے اس کی جگہ جانشین مقرر کر دیا گیا۔ اسی دوران حسن خاں نے بھی وفات پائی اور اسے اپنی والد کی جائداد کا قبضہ بھی حاصل ہو گیا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی پٹنہ کے قریب راجہ چامن برہمن والیٔ روہتاس گڑھ سے ملاقات کی اور اسے کہا کہ میں ہمایوں سے ڈرتا ہوں، اس لیے تمہارے پاس پناہ لینا چاہتا ہوں۔ تم مجھے امان دو۔

راجہ اس بات پر رضامند ہو گیا۔ جب شیر خاں کو اطمینان ہو گیا کہ اب راجہ کی طرف سے اسے کوئی خطرہ باقی نہیں ہے تو اس نے اپنی ایک ہزار فوج کے سپاہیوں کو پالکیوں میں سوار کر کے قلعہ روہتاس گڑھ پر حملہ کر دیا۔ اور اسے فتح کر کے ۹۴۰ھ میں اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کر دیا۔ اس فتح کے بعد شیر خاں اپنی فوج میں مزید اضافہ کر کے ہمایوں سے جنگ کرنے کے لئے متوجہ ہوا

ہمایوں بھاگ کر لاہور میں مقیم اپنے بھائی [illegible]

کامران سے مدد کا طالب ہوا لیکن اس نے اسے کورا جواب دے دیا جس پر اس نے ایران کا رخ کر لیا۔ شیر شاہ بھی اس کے تعاقب میں یہاں تک چلا آیا۔ مگر منگلا کے مقام پر گکھڑوں کے علاقے کے سردار آدم خاں اور سارنگ خاں نے اسے آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے جنگ شروع کر دی۔ بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ جس میں آخر شیر خاں فتحیاب ہوا۔ مگر گکھڑوں سے خطرے کے باعث ان کی سرکوبی کرنی ضروری تھی۔ اس لیے اس نے گھان ندی کے کنارے ایک اونچے ٹیلے پر صوبہ بہار کے قلعہ روہتاس گڑھ کی طرز کے مطابق شاہو سلطان کو ایک سنگی قلعہ بنانے کا حکم دیا اور خود شیر خان نے شیر شاہ کا لقب اختیار کر کے امور سلطنت کے انتظام میں مصروف ہو گیا۔

شاہو سلطان نے بروز یکشنبہ یازدہم ماہ ربیع الآخر ۹۴۸ھ بکرمی ۱۵۹۰ء بمطابق ۱۵۴۸ء کو قلعہ کی بنیاد رکھی۔ پہلے اندرکوٹ کی عمارت مثلاً شاہی محلات، لنگر خانوں اور شاہی مسجد کی تعمیر شروع ہوئی جو کہ ۴ سال، ۷ ماہ ۲۱ دن میں مکمل ہوئی۔

اس علاقے کے گکھڑوں کو پسماندگی کے پیش نظر اس قلعہ کی تعمیر اسی علاقے کے مزدوروں اور معماروں کی مدد سے کرائی گئی۔ ان کا سربراہ معمار شاہو سلطان تھا۔ جب تعمیر کا آغاز ہوا تو قلعہ کا کل رقبہ تقریباً ۱۳۰ بیگھے تھا۔ لیکن بعد میں شیر شاہ کے حکم سے اس رقبہ میں ۲۲۶ ایکڑ کی توسیع کر دی گئی۔ غرضیکہ ۳۵۰ ایکڑ پر محیط ایک عظیم الشان قلعہ جس کے ساتھ تاریخ کی حیرت انگیز روایتیں جڑی ہوئی ہیں، بن کر تیار ہو گیا۔ قلعہ کی تعمیر میں جو مسالہ استعمال کیا گیا وہ صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی مضبوط حالت میں موجود ہے۔ جب اس مسالے کو ٹیسٹ کیا گیا تو اس میں پہاڑی پتھر، لکڑی کا کوئلہ اور روہتاس کے آس پاس پائی جانے والی ایک خاص قسم کی خودرو گھاس موجود پائی گئی۔ یہ گھاس جلانے پر ایک سفید مادے کی شکل اختیار کر کے لئی سی بن جاتی ہے۔

روہتاس کے قلعے کے ساتھ ایک اور تاریخی جگہ کا نام بھی وابستہ ہے وہ ہے ٹلہ جوگیاں۔ جس سے ناتھ جوگیوں کی روایت جڑی ہوئی ہے۔ جوگیوں کی روایت کا آغاز گورکھ ناتھ سے ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گورکھ ناتھ شوجی کا چیلا تھا اور انہوں نے اپنے سب چیلوں میں سے صرف گورکھ ناتھ ہی کو گورو کا خطاب دیا اور آئندہ کے لیے اسے خود بھی گورو کہلانے اور چیلے بنانے کا اختیار دے دیا۔

گورو گورکھ ناتھ خود ریاست نیپال کے ایک گاؤں گورکھ پور کا نیپالی قوم کا ایک فرد تھا۔ جو ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا دل غریب انسانوں کی محبت سے لبریز تھا۔ وہ ظالم راجوں، مہاراجوں اور امیر لوگوں سے سخت متنفر رہتا تھا۔ اس نے شدھ بھاشا میں اپنا عارفانہ کلام یعنی شبد لکھے ہیں

گورکھ ناتھ ایک گورو ہونے کے ساتھ ایک انقلابی شاعر بھی تھا۔ اس نے سامراج کے مظالم، لوٹ کھسوٹ کے خلاف پہلی آواز بلند کی۔ اس نے اپنی شاعری کے ذریعے اولادِ آدم کو محبت، اخوت، امن و آشتی اور انسان دوستی کا پیغام دیا۔ جب اسے تبلیغ کرتے کرتے کافی عرصہ ہو گیا تو اسے اپنے گورو مچھندر ناتھ نے شمالی پنجاب میں ٹلہ کے پہاڑ پر جا کر قیام کرنے کا حکم دیا۔

جب اس نے اپنے چیلوں سمیت جانے کی تیاری مکمل کر لی تو گورو نے ایک نرم گھاس سے بنا ہوا ہار بھی اس کے گلے میں ڈال دیا اور کہا کہ یہ تمہارا زنار یعنی جنیئو ہے۔ دوسرے آگ کی ایک چھوٹی سی لکڑی اٹھا کر کہا کہ اپنے زنار سے باندھ لو اس کا نام ناد ہے یعنی یہ تمہارے کرموں کی شکتی ہے

تیسرے شوجی مہاراج کی پتنی پاربتی نے اپنی ران کے خون سے ایک کرتہ تر کر کے گورکھ ناتھ کو

دیا اور کہا کہ آئندہ تم ہمیشہ ایسا ہی سرخ لباس پہنا کرو۔ چنانچہ جوگی لوگ اب گیرو کپڑے ہی پہنتے ہیں۔ ساتھ ہی گورو جی نے یہ بھی ہدایت کی کہ ہندو لوگ مُردوں کو جلاتے ہیں۔ مگر تم جلانے کے بجائے قبر میں دو زانو بٹھا کر اس پر مڑھی بنا دیا کرو۔

یہ تمام مکمل ہدایات دینے کے بعد گورو جی نے اُسے رُخصتی کی اجازت دے دی۔ اور یہ اپنے چیلوں کے ٹلہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں جب جوگیوں کا یہ قافلہ سیالکوٹ سے باہر ایک جنگل میں خیمہ زن ہوا تو انہیں وہاں ایک کنواں نظر آیا جس میں سے پانی نکالنے کے لیے جب ڈول ڈالا گیا تو اندر سے فوراً ایک انسانی آواز آئی کہ:

" میں معذور ہوں۔ مجھے خدا کے لیے اس کنویں سے باہر نکالو۔

چنانچہ جب اسے باہر نکالا گیا تو وہ راجہ سلوان کا لڑکا پورن بھگت تھا جس کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی تمام مظلومانہ داستان گورو جی کو سُنائی۔ اس پر گورو جی نے اسے اپنی روحانی طاقت سے مکمل تندرست کر دیا۔

اور اسے اپنے چیلوں میں شامل کر کے اس کا نام چورنجی ناتھ رکھ دیا۔ پورن بھگت کا باپ راجہ سلوان اس وقت اسی علاقہ کا گورنر تھا۔ ٹلہ قومی شاہراہ پر دینہ سے شمال کی طرف ۱۷ کلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے، جس کی چوٹی سطح زمین سے ۳۲۰۰ فٹ بلند ہے۔ یہ ایک خوب صورت صحت افزا جگہ ہے۔ یہاں طبی جڑی بوٹیوں کے علاوہ مختلف قسم کے درخت اور پرندے پائے جاتے ہیں۔ یہاں جوگیوں نے ایک پرستش گاہ تعمیر کی۔ وہاں یہ لوگ بیٹھ کر تپسیا کیا کرتے تھے۔ اور اپنے اسرار کی قوت اور کمالات کی وجہ سے علاقہ بھر کے لوگوں میں کافی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ انہیں دودھ کا چڑھاوا بے شمار ہوا کرتا تھا۔ اگر پہاڑ سے نیچے مشرق کی طرف اترا جائے تو وہ جگہ آجاتی ہے، جہاں رانجھا کے کان چھیدے گئے تھے یہیں سے اُس نے سنکھ اور مندرائیں لی تھیں۔ یہ جگہ آج بھی عشق و محبت کی یادگار ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہیر رانجھا کا قصہ لکھنے والا وارث شاہ بھی اس ٹیلے پر آیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ سوری کے عہد حکومت میں جوگی جودھا ناتھ ٹلہ جوگیاں پر مسند نشین ہوا تھا۔ اس کے نام سے کئی روحانی کرامتیں جُڑی ہوئی ہیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ روہتاس کا قلعہ تعمیر کرنے سے پہلے شیر شاہ سوری جودھا ناتھ کی شہرت سُن کر ٹلہ پر حاضر ہوا۔ شیر شاہ جب ٹلہ پر پہنچا تو اس کی پُر کیف فضا اور دلکش وادی اُسے بہت پسند آئی اور اُس نے اپنے دل میں یہ سوچا کہ وہ ٹلہ کو اپنی قیام گاہ بنائے گا۔ جب وہ رات کو سو رہا تھا تو خواب میں اُسے کسی بزرگ نے اس ارادے سے باز رہنے کی ہدایت کی۔ اگلے دن جب شیر شاہ جودھا ناتھ کے پاس پہنچا تو اُسے دیکھتے ہی جودھا ناتھ نے فوراً کہا کہ اے بادشاہ یہ ٹلہ تو صدیوں سے فقیروں کا استھان چلا آ رہا ہے۔ اس پر قبضہ کرنا آسان نہیں۔ اگر ایسا کرو گے تو نقصان اُٹھاؤ گے۔ شیر شاہ نے ڈر کر کہا۔ "حضور، میں تو دعائے خیر و برکت کے لیے حاضر ہوا ہوں"۔ اس کے بعد شیر شاہ نے ٹلے سے ملحقہ نو گاؤں بطور جاگیر جوگی جودھا ناتھ کے نام وقف کر دیے۔

مغلوں کے دورِ حکومت میں اکبر بادشاہ یہاں اکثر آیا کرتا تھا۔ اس کے بعد جہانگیر بھی موسم گرما میں کشمیر سے واپسی پر اسی راستے سے شکار کھیلتا ہوا گزر جاتا تھا۔

مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں جہلم نہیں آتا اور میری ملاقات امداد ہمدانی سے نہ ہوتی تو میں روہتاس کے قلعے کے بارے میں اتنی قیمتی معلومات سے محروم رہ جاتا۔ میں نے امداد ہمدانی کا شکریہ ادا کیا اور اس نے ایک زوردار قہقہہ لگا کر کہا۔

میں نے یہ سب باتیں اس لیے بتائی ہیں کہ آپ کے قلم کی مدد سے یہ ساری باتیں ہندوستان کے ہزاروں لوگوں تک پہنچیں گی جو شاید جہلم اور روہتاس کے قلعے سے بہت واقفیت نہیں رکھتے۔

[جاری ہے]

عبداللہ کمال

کابوسِ شب سے مبارزت

(پہلا محاذ)

عجب طلسم ہے .....
..... یہ کون چھا رہا ہے
کس کا غلبہ ہے مرے وجود پر
نفس پہ بوجھ بڑھتا جا رہا ہے
—— خواب گوں
فشارِ خوں جنوں کی آخری حدوں میں ہے!
زماں مکاں کے درمیان اک نئی چٹان ہے
مرے شکستہ حوصلوں کا تازہ امتحان ہے
حدِ نگاہ تک فقط گمان ہی گمان ہے
یہ کیسا آسمان ہے؟
چٹان کو پہاڑ پر چڑھانے کا عمل...
میں رفتہ رفتہ خرچ ہوتا جا رہا ہوں راہ میں
کہ ہر نئی چٹان کے عقب میں اک چٹان ہے
قطار در قطار... بے شمار... اور میں...
—— میں اپنی ریزہ ریزہ کرچیاں سمیٹتا ہوں بار بار!
اور اب.....
زماں مکاں سے مستعار کچھ غبار ہے
میں ایک مشتِ خاک ہی سہی
مری طلب ابد شکار ہے
مرے عقب میں خواہشوں کا غار ہے
قدم قدم پھسلتا جا رہا ہوں میں
یہ سلسلہ ازل سے برقرار ہے!
دباؤ دل پہ بڑھتا جا رہا ہے ——
دم بہ دم
عجیب عجیب عذاب ہے

نفس نفس میں نارِ التہاب ہے
مرے وجود پر ابھی عذابِ خواب ہے
فضائے دل، شرار گوں
فشارِ خوں جنوں کی آخری حدوں میں ہے
رگوں میں ہے
—— اُترتی دھند کا فسوں
سیاہ گوں، غلیظ طائرانِ شب
جھپٹ رہے ہیں ننھی منی جگنوؤں سی، فاختاؤں پر
مرے خدا.....
مرے خدا، مجھے عُقاب کر!
میں ایک عرصۂ جہاد ہوں
.... لہو لہو
بقا کی جنگ کھی لڑائی ہے ہواؤں سے
لہو ٹپک رہا ہے چار سو فضاؤں سے
جہت جہت غنیم ہے ——
مرا خدا عظیم ہے!
غنیم، میرے بے پناہ وار میں
گرج، چمک
سحاب و صاعقہ....
مرے غضب کی مار میں
زماں مکاں مرے پروں کی وسعتِ حصار میں!
مری مبارزت : غنیم سے غنیم تک
مری مراجعت : الف سے لام میم تک
خدائے ذی الکریم تک!

●

عبور

قدم قدم پہ نیا امتحاں ہے میرے لیے
یہ شہر آج بھی اک ہفت خواں ہے میرے لیے

نہیں ہے اب کوئی احساسِ روز و شب بھی مجھے
بس ایک عرصۂ پیکارِ جاں ہے میرے لیے

نہ رہ گزارِ شجر دار ہے، نہ آب و سحاب
یہ تیز دھوپ، یہ صحرائے جاں ہے میرے لیے

میں اک ستارہ ہوں، اُس کے فلک سے ٹوٹا ہوا
وہ دُھندھوتی ہوئی کہکشاں ہے میرے لیے

سمیٹ لیتی ہے مجھ کو، میں ٹوٹا پھوٹا سہی
یہ رات خرقۂ آوارگاں ہے میرے لیے

مہکتے رہتے ہیں خوابوں میں ہجرتوں کے گلاب
نئی زمین، نیا آسماں ہے میرے لیے

عبور کرنا ہے دریائے شور مجھ کو کمال
اور ایک کشتیِ بے بادباں ہے میرے لیے

پوسٹ بکس نمبر ۴۷۶۳، اندھیری ویسٹ، بمبئی ۴۰۰۰۵۸

غزل

فضا ابن فیضی

آگ میں پھولنے پھلنے کا ہنر جانتے ہیں
نہ بجھا ہم کو، کہ جلنے کا ہنر جانتے ہیں

آبشار اپنا بھی قدموں میں ہمارے رکھ دے
ہم چٹانوں سے پھسلنے کا ہنر جانتے ہیں

خوار ہم کو، اسی شائستہ انا نے رکھا
کیوں نہ گرتے کہ سنبھلنے کا ہنر جانتے ہیں

سیدھے ہاتھوں نے جو کھینچی ہیں لکیریں ٹیڑھی
ان لکیروں پہ بھی چلنے کا ہنر جانتے ہیں

ہم وہ لمحہ ہیں کہ مربوط ہیں صدیاں ہم سے
وقت کی گود میں پلنے کا ہنر جانتے ہیں

کیا سمیٹے گا ہمیں وقت کا گہرا دریا
ہم کناروں سے اُبلنے کا ہنر جانتے ہیں

تُو نشانہ تو لگا ہم بھی کماں ہیں تیری
تیر کی زد سے نکلنے کا ہنر جانتے ہیں

منزلیں بھی انہیں گمراہ نہیں کر سکتیں
راستے، موڑ بدلنے کا ہنر جانتے ہیں

اس کی آنکھوں میں ہیں ہنستے ہوئے خوابوں کی طرح
میرے آنسو بھی بہلنے کا ہنر جانتے ہیں

کیا انہیں حرف کی میزان میں تولے کوئی
لوگ بس بات اُگلنے کا ہنر جانتے ہیں

جسم رکھتے ہیں جو ہستیاں معانی سا فضاؔ!
قالبِ لفظ میں ڈھلنے کا ہنر جانتے ہیں

موج لبیک کہے کشتی کا لنگر بولے
دوں جو صحرا کو صدا میں تو سمندر بولے

جھیلنا ہے تمہیں یہ کرب بھی آنکھوں والو!
کیا کروگے، جو نظر چُپ رہے، منظر بولے

اتنے سنگیں ہیں حقائق مجھے اندازہ نہ تھا
آئینے کو جو مخاطب کروں، پتھر بولے

لُطف کیا آئے، جو کھڑکے نہ ہوا کی زنجیر
اتنی اونچی تو اُڑانیں ہوں کہ شہپر بولے

یہ عدالت تو ہے قاتل کی گواہی دے کون
آستیں کوئی اشارہ دے، نہ خنجر بولے

عدیہ ہے، خود مرا واحد متکلم مجھ سے
کبھی چہرہ کبھی آواز بدل کر بولے

پردۂ سازِ بدن جیسے قبا ہو اس کی
ہاتھ رکھوں تو گریباں میں کبوتر بولے

اپنی اس وضع پہ خود پھول بھی حیراں ہے فضاؔ
رنگ تو چُپ رہے، خوشبو کہ برابر بولے

میں خود ہوں نقد، مگر سو اُدھار سر پہ ہے
عجب وبالِ غمِ روزگار سر پر ہے

گماں ہے سب کو کہ ہوں آسماں اُٹھائے ہوئے
سفر سفر، وہ قدم کا غبار سر پہ ہے

کسی پہ گزرے نہ آشوبِ بحر و بر ایسا
سمندر آنکھ میں ہے کوہسار سر پہ ہے

یہ زندگی بھی تضادات کا ہے مجموعہ
چٹانیں قدموں میں ہیں آبشار سر پہ ہے

سُبک نہ سمجھو مجھے پُشت ٹوٹ جائے گی
میں ایک پَل سہی، صدیوں کا بار سر پہ ہے

زمیں کے ذمّے ہے جو قرض کیوں چکاؤں میں
زمانہ کس لیے آخر سوار سر پر ہے

کم از کم اتنا تو میں بھی دماغ رکھتا ہوں
سمجھ رہا ہوں حریفوں کا وار سر پہ ہے

ہوائے جاں کا تقاضا کہ رہیے گھر سے دُور
کہیں جو گھر میں بیاباں ہزار سر پہ ہے

ہزار گھاٹے کا سودا ہو یہ فقیری؛ حرف
یہی بہت ہے کلاہِ وقار سر پہ ہے

فضاؔ نہ تھا کبھی تازہ دماغ اتنا میں
ہے اس کا ہاتھ کہ شاخِ بہار سر پہ ہے

مئوناتھ بھنجن (یوپی) ۲۷۵۱۰۱

پروین کمار اشک

جب بھی خالی مکاں میں گھر کرنا
ہو سکے تو مجھے خبر کرنا

محسنوں کو خدا سمجھتے ہیں
ہم پہ احسان سوچ کر کرنا

مجھ کو تفتیشِ دشتِ شب کا حکم
چاند خود آپ اِدھر اُدھر کرنا

سرنگوں ہوں تو اچھے لگتے ہیں
پیڑ کوئی نہ بے ثمر کرنا

بخشنا بحرِ حرف اور خود ہی
داستاں قطرہ مختصر کرنا

دھوپ میں "شمس" "شمس" کی فریاد
سائے میں بھی "شجر" "شجر" کرنا

چڑیا بھی گھر بدل رہی تھی اشک
اور مجھ کو بھی ساتھ سفر کرنا



کرشنا اسٹریٹ، پٹھان کوٹ ۱۴۵۰۰۱ (پنجاب)

دل مسافر اور کیا یادِ سفر لے جائے گا
دور رستہ۔ زخم پاؤں۔ چشم تر لے جائے گا

دھرتیاں سب بے مروت آدمی سب بے وفا
تو وفاؤں کا گھروندا کس نگر لے جائے گا

وہ مِری آوارگی پر مسکرا کر ایک دن
تھام لے گا ہاتھ میرا اپنے گھر لے جائے گا

اِک چراغِ بے ضیا لے جائے گا دہلیز سے
اور در و دیوار کے گرنے کا ڈر لے جائے گا

میں شجر پھر بھی لگاتا جاؤں گا یہ جان کر
جب ثمر آئے گا کوئی توڑ کر لے جائے گا

اس لیے دھرتی سے رشتہ توڑ کر بیٹھا ہوں اشک
اِک فرشتہ آئے گا اور چاند پر لے جائے گا

ہوا سے کوئی جا کے کہتا نہیں ہے
ہمارے گھروں میں دریچہ نہیں ہے

میں تالاب کی قید میں منجمد ہوں
یہ پانی کسی سمت بہتا نہیں ہے

میں سائے میں اس کے بسر ہو رہا ہوں
کہ جس شاخ پر کوئی پتہ نہیں ہے

جسے پیار کیجے جسے یار کہیے
ہمارے نگر میں وہ چہرا نہیں ہے

خدا مانتا ہی نہیں کیا کروں میں
اِدھر میری جھولی میں سجدہ نہیں ہے

مِرا آئینہ اشک کہتا ہے مجھ سے
بہت دن ہوئے تم کو دیکھا نہیں ہے

غزلیں

شبنم نقوی

پی رہا ہے زندگی کی دھوپ کتنے پیار سے
دُور جو بیٹھا ہوا ہے سایۂ دیوار سے

اس طرح کیا ناپتا ہے آسماں کی وسعتیں
مت بڑھا قامت کو اپنی طرۂ دستار سے

گوشۂ دل کی خموشی گھر میں بھی ملتی نہیں
گھر کے ہنگامے بھی کم ہوتے نہیں بازار سے

دل ہے وہ وادی اُلجھ جاتی ہیں سانسیں بھی جہاں
طے نہ کر راہِ محبت ایک ہی رفتار سے

منزلِ شہرِ تمنّا شاید اب نزدیک ہے
اب نظر آنے لگے ہیں راستے ہموار سے

سوچتے کیا ہو مرے گھر میں دیا کوئی نہیں
روشنی یہ آرہی ہے روزنِ دیوار سے

کس قدر خود دار تھے وہ پاؤں کے چھالے نہ پوچھ
کوئی سرگوشی نہ کی زنجیر کی جھنکار سے

۱۸۷۔ ہمت گنج، الہ آباد (یوپی)

عمران عظیم



ماتھے پہ شکن لا نہ ان آنکھوں میں غضب لکھ
اے دوست خفا کیوں ہے مجھے اس کا سبب لکھ

گونگی ہیں فضائیں تو شجر بھی ہوئے بہرے
مت شاخِ تمنّا پہ کوئی عرضِ طلب لکھ

اک اس کی محبت کے بُلاوے کو بھی سُن لے
جا صفحۂ رُخسار پہ کچھ گرمیٔ لب لکھ

دستورِ زمانے کے ہیں سفّاک بہت اب
اوقات بتا اپنی کوئی نام و نسب لکھ

موسم کی طرح تجھ کو بدلنا ہے عظیم اب
خاموشیٔ گفتار کہیں شور و شغب لکھ

نیّر ولا، گنگوہ، سہارنپور (یوپی)

دوہے

بھگوان داس اعجاز

اندھے کے گھر آئینہ تھا گونگا حیران
اندھا سُندر ہے بہت، کیسے کرے بیان

خوشیاں رنگ بکھیر تیں گلیوں گلیوں گھوم
موت کا گھر نزدیک ہے کسے نہیں معلوم

ہم نے اپنی پہنچ کے، بہت کیے اعلان
لیکن ہوتی نے کئی، چھین کے تیر کمان

کیسے کہیں تقدیر ہم، کیسے کہیں سنجوگ
بستی بیگانی مگر پہچانے سب لوگ

ہار کے بازی جیت لی پھر ہم نے اس بار
اجڑی بستی ہو گئی بسنے کو تیار

خود ہی اپنی موت کا باندھے ہے سامان
انجانے ہیں راستے راہی ہے نادان

گھر میرا ہے کس گلی، کس کی میں آواز
در در دستک دے رہا انجانا اعجاز

T-451، بلجیت نگر، نئی دہلی ۸ ۱۱۰۰۰

عبدالصمد

دَم

رات کی تاریکی ماحول کی سنگینی میں گھل مل گئی تھی۔

تاریکی، سناٹا اور چاروں گھونٹ گونجتی ہوئی خاموشی کی چیخ جو بند کمرے میں بھی یوں گھسی آرہی تھی جیسے اُسے روک ٹوک کی پروا نہ ہو۔ خاموشی کی موجودگی میں کمرے میں پھر اور کس چیز کا گزر ہو سکتا تھا۔ ابھی ابھی وہاں شطرنج کی بساط بچھی تھی۔ بچھی تو اب بھی تھی لیکن خاموشی نے سارے نظام کو یوں درہم برہم کر دیا تھا کہ بساط اُلٹی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

خاموشی کی موجودگی میں بھی وہ سانسیں تھیں جن کی رفتار گم تھی، وہ آنکھیں تھیں جن کی سمت لاپتہ تھی۔ وہ وجود تھے جن کی انفرادیت کھو چکی تھی۔

اچانک ایک دھماکے کے ساتھ آواز آئی۔ نکڑ کے پیپل کے درخت پر سے ایک پرندہ چیخا۔ کہیں قریب ہی سے ایک جانا بوجھا نعرہ بلند ہوا۔ جواب میں اِدھر سے بھی ایک نعرہ لگا جس سے کمرے کے اندر کی خاموشی لرز گئی۔

"یہ کس کی حرکت ہے ؟"

بظاہر اُلٹی ہوئی بساط کے قریب بیٹھے ہوئے فرد کے منھ سے نکلا۔ ویسے شاید وہ واقف تھا کہ ـــ

" اور کون ہو سکتا ہے !"

" خیر اس بے چارے کے بارے میں کیا کہنا۔ وہ بے چارہ تو ـــــ "

"واہ خوب، بے چارہ وہ گھر والوں کے لیے ہوگا۔ باہر والے اُسے کیوں پاگل ماننے لگے!"

" دیکھو کہیں وہ پھر نعرہ بازی نہ کرنے لگے !"

"بھلا اُسے کون روک سکتا ہے۔ جب بھی نعرے لگیں گے وہ جواب دے گا ہی!"

" اُسے کمرے میں بند کیوں نہ کر دیں ؟"

"سبھی روشن دان تو لوٹے پڑے ہیں۔ کھڑکیاں تک اپنے حواس میں نہیں۔ صرف کواڑ بند کر دینے سے فائدہ ؟"

" دیواریں تو ہیں !"

بے سمت آنکھوں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اگرچہ کمزور اور خستہ حال، لیکن اس کا دروازہ بند تھا۔ ٹوٹے ہوئے روشن دان اور کھڑکیاں بند تھیں۔ اس میں بند ہو کر لوگ اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے پر مجبور ہی نہیں، مصر تھے۔

" لیکن اس میں تو ـــــ آخر ہم لوگ کہاں جائیں !"

" کہیں بھی۔ جب بند ہی رہنا ہے ہمیں"

" یہ کمرہ بھی کیا ـــ بس یہ ہے کہ یہاں سے آواز باہر نہیں جاتی۔"

" یا یوں کہو کہ ہم نے اپنی آوازوں کو اپنے اند
قید کر لیا ہے !"

باہر پھر کچھ شور سا ہوا۔ کچھ کھڑ کھڑاہٹ ..... کچھ چیخیں، نعرے .....

ادھر سے پھر جوابی نعرہ بلند ہوا۔ بند کمرے کی
کمزور دیواریں ہل سی گئیں۔ اپنے آپ کو بند کیے ہو
لوگ لرز سے گئے۔ خاموشی کا زور ہوا تو ان میں سے
ایک بولا۔

"یوں بند ہونے سے کام نہیں چلے گا و
جوابی نعرے بلند کرتا رہے گا اور ہم کتے کی موت
مارے جائیں گے !"

سب خاموش رہے تو حوصلہ پاکر وہ شخص آ
بڑھا۔ اور بند دروازہ آہستہ سے کھول دیا۔ درواز
ایک کمزور سی کراہ کے ساتھ کھلا اور باہر کی ہواؤ
میں تیرتی ہوئی طرح طرح کی آوازیں اندر آگئیں
باہر دالان میں وہ بیٹھا تھا۔ بے ترتیب
لباس، ابتر جسم، اُلجھے ہوئے گندے بال، سُرخ آنکھ
اور ہاتھوں میں ایک زنگ آلود چھری، جیسے وہ ما

محل پر، نالندہ، بہار شریف

فضا میں بلند کرتا جس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر کامیابی کے رنگ آجاتے۔ پاس کی پلنگڑی پر بیٹھی ہوئی بوڑھی عورت منھ پر پلو رکھے رو رہی تھی۔

"اب کیا کیا جائے؟"

چاروں باہر آکر ایک ساتھ سوچنے لگے۔

ان میں دو پاگل کے سگے بھائی تھے اور دو اُن کے دوست پڑوسی جو وقت اور موقع دیکھ کر آگئے تھے۔ اور اب ماحول کی سنگینی نے جن کے پیر پکڑ لیے تھے۔

"کیا کیا جائے؟"

سوچ تو رہے تھے چاروں۔ لیکن دراصل اگر کچھ کرنا تھا تو صرف ان دو ہی کو، جو اپنے گھر کے تھے۔ ابھی وہ کسی نتیجے پر پہنچے بھی نہیں تھے کہ ایک چیخ نے باہر کی خاموشی کو ایک بار پھر چاک کر دیا۔ دوڑنے کی آوازیں۔ بوٹوں کی سنگین چاپ اور وہی مانوس نعرہ۔

پاگل اپنی جگہ سے اُٹھا اور چھری والا ہاتھ فضا میں لہرا کے اُس نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ نعرے کا جواب دیا۔ ایسا لگا جیسے اس بوسیدہ مکان کے اندر ہی اندر ایک میدانِ جنگ کھُل گیا ہو۔

"اماں، اس پاگل کو روکیے۔ یہ ہم سب کو مروا دے گا۔"

اماں کی ہچکیاں اور تیز ہو گئیں۔ پاگل نے اپنی سُرخ آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"میں رُک گیا تو پھر تم بچ نہیں سکو گے۔"

اُنھوں نے اس کی بات جیسے سُنی ہی نہیں۔ اور اپنی ماں سے لپٹتے رہے۔

"وہ اگر نعرے لگاتے ہیں تو لگائیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے، لیکن جوابی نعرہ تو کھلم کھلا اشتعال انگیزی ہے۔"

اماں بس روئے جا رہی تھی۔ وہ جیسے کسی کی بات سُن ہی نہیں رہی تھی۔

"اماں کچھ بولو گی بھی یا بس روتی ہی رہو گی؟"

"تم لوگ بڑے خود غرض ہو۔ اپنے آپ کو بند کیے پڑے ہو۔ راجہ کی تمہیں کوئی فکر نہیں آخر وہ تمہارا سگا بھائی ہے۔ چوبیس گھنٹے ہو گئے اُسے گئے ہوئے۔ پتہ نہیں وہ ....."

وہ اور زور سے رونے لگی۔

"راجہ ــــ"

ایک زیرِ لب بڑبڑایا۔

"آخر راجہ غائب کہاں ہے؟"

یہ سوال پڑوسی دوست نے پوچھا۔

"غائب کہاں۔ اُس کی تو عادت ہی یہی ہے۔ ہاں یوں کہو کہ آج فضا خراب ہے۔ اس لیے اماں کو زیادہ فکر ہے۔ ورنہ اس کا تو کام ہی یہ ہے۔"

"تشویش کی بات تو ہے۔ شہر میں چھرے بازی ہو رہی ہے۔ اب تو لاشیں بھی نہیں ملتیں۔"

"اُسے چھرے بازی کی کیا پڑی۔ وہ تو خود۔ ہاں یہ کہو کہ پولیس ....."

اماں جو اُن کی باتیں سننے کے لیے سسکیاں لینے لگی تھیں۔ پولیس کا نام سن کر پھر زور زور سے رونے لگی۔

"اوہ رونا بند تو کرو اماں۔ کچھ سوچنے تو دو ہمیں۔"

"لو، اماں میں آگیا اور تین کو ٹھکانے لگا آیا ہوں۔"

دروازے سے راجہ کی آواز آئی اور وہ وحشی سا اُن لوگوں کے سامنے آگیا۔ اماں نے اُسے صحیح سلامت دیکھا تو دوڑ کر اُس سے لپٹ گئی۔ اور چٹ چٹ بلائیں لینے لگی۔ اُس کے پیچھے پتہ نہیں کون سی اَن دیکھی طاقت تھی جو سب کو نظر آرہی تھی۔

دونوں بھائی اُسے گھور رہے تھے۔ پاگل اپنے آپ میں مست بار بار چھُری کو فضا میں بلند کرتا اور جوش کے ساتھ ہواؤں پر وار کر کے سُست پڑ جاتا۔

راجہ سب کی طرف سے بے پروا پانی کی بھری بالٹی سے منھ ہاتھ دھونے لگا۔ ساتھ ہی اماں سے باتیں کرتا رہا۔

"اماں ہمیں گاجر مولی سمجھ رکھا ہے۔ ایسا سبق سکھا کر آیا ہوں کہ بس یاد ہی کرتے ہوں گے۔ کہتے ہیں کہ یہ لوگ ..... بھلا ہم کیا جانیں یہ سب۔ ہم تو کسی کی ٹیڑھی آنکھیں تک برداشت نہیں کریں۔ بھلا بتائیے۔ میں تو ماسٹر کے یہاں سے چُپ چاپ چلا آرہا تھا۔ حالانکہ دیکھو اماں میری تو شکل بھی ایسی ویسی ہے۔ لباس بھی کچھ ایسا ویسا ہے۔ پھر بھی سالوں نے میری چال سے مجھے پہچان لیا۔ اور لگے دوڑانے۔ میں نے بھی اُنہیں وہ چوکڑیاں دیں۔ اُنہیں ایسی ایسی گلیوں کی سیر کرا لایا کہ بیٹا یاد رکھیں گے۔"

"پھر تو نے تین کیسے مارے؟"

اماں نے بہت ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ اُس نے اپنا رونا دھونا کب کا بند کر دیا تھا۔

راجہ بہت زور سے ہنسا۔

"ارے وہ ــــ اماں، وہ تو مجھے سنسان گلی میں مل گئے تھے۔ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی کی طرح۔ سالے دواؤں کی شیشیاں لے کر بھاگے جا رہے تھے۔ میں نے بھی اُنہیں ان کی چالوں سے پہچان لیا ــــ اور پھر ــــ"

وہ پھر ہنسا اور ہنستے ہنستے اُس نے منھ بنا کے آواز بدل کے مرنے کی نقل بھی کی۔ اماں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے اور پاگل نے ایک بار پھر نعرہ بلند کیا۔

فضا تھرا اُٹھی۔ باہر سے دوڑنے بھاگنے کی آواز آئی۔ اس وقت دالان پر کھڑے ہوئے چاروں افراد نے محسوس کیا کہ وہاں پر دراصل صرف تین ہی فرد ہیں۔ اماں، پاگل اور راجہ۔

وہ وہاں سے چل کر پھر کمرے میں آگئے۔

باہر کے جو دو فرد تھے وہ بڑے سُست سے تھے۔ اُن کے راستے مخدوش ہو گئے تھے۔ یعنی وہ جہاں تھے وہ جگہ بھی اب محفوظ نہیں تھی۔

پھر بھی خاموشی سے سنگینی اور بڑھتی تھی۔

"مجھے تو ایسے لگتا ہے کہ بات اب ختم نہیں ہوگی ـــــ کوئی چاہتا ہی نہیں ہے نا۔"

"سارا فساد نعرے بازی کا ہے نعرہ لگا کے یا سُن کے انسان اپنے آپ میں نہیں رہتا"

"اگر نعرے کا جواب نہیں دیا جائے تب ـــــ ؟"

"تب پھر نعرہ جنم لینے سے پہلے ہی دم توڑ دے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کون ہے جو جواب نہیں دے۔ یہ کوئی معمولی بات تو نہیں۔"

"نعرے کا جواب نہیں دینا تو نعرہ لگانے سے زیادہ ہمت کی بات ہے۔"

"پتہ نہیں نعرہ بازی میں وہ کون سی قوت ہے جو انسان کو جواب دینے پر مجبور کر ہی دیتی ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ہر انسان کے جسم میں کوئی آٹومیٹک مشین فٹ ہے۔ جو اگر خراب کر دی جائے تو پھر بات بن سکتی ہے۔

"میرا خیال ہے کہ ایسی بہت سی مشینیں اگر خراب کر دی جائیں تو بہت سی باتیں بن سکتی ہیں۔"

اتنے میں باہر کچھ شور و غوغا پھر بلند ہوا۔ کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔ بہت سے کتے ایک ساتھ بھونکنے لگے۔ کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ باہر کے دونوں افراد کے چہروں پر صاف پریشانی کے آثار تھے۔

"بہت دیر ہو گئی۔ گھر کے لوگ بہت پریشان ہوں گے۔"

"انہیں پتہ تو ہے نا کہ تم یہاں ہو۔ پھر پریشانی کی کیا بات ہے۔"

"پتہ تو ہے، لیکن اتنی دیر ـــــ پتہ نہیں وہ لوگ بھی کس حال میں ہیں۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ کب، کس وقت، کہاں، کیا ہو جائے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

باہر شور و غل سے بے پروا راجہ اماں کو اپنی فتوحات کی داستانیں سنا رہا تھا ـــــ "اور جانتی ہو اماں، یہ لوگ سمجھ رہے تھے کہ راجہ کو بھی گاجر مولی کی طرح کاٹ دیں گے۔ یہی تو بھول ہے ان کی۔ ہاں وہ بڑے بھیا کے بارے میں سمجھیں۔ منجھلے بھیا کے بارے میں کہیں تو بات ٹھیک بیٹھے گی۔ وہ بے چارے تو گاجر مولی ہی ہیں۔ اب دیکھو نا اس وقت بھی کمرے میں بیٹھ کر سبزیوں کے بھاؤ پر باتیں کر رہے ہیں۔"

کمرے میں صاف اس کی آواز آ رہی تھی۔ بے تحاشا غصہ آنے اور خون کھولنے کے باوجود ان میں سے کوئی باہر نہیں نکلا۔ شاید انہوں نے اپنی مشین کے کسی پرزے کو خراب کر ڈالا تھا ـــــ

ـــــ "اور سنو گی اماں۔ ہم چھ سات دوست ایسے ہیں جو پورے محلے پر نہیں، پورے شہر پر بھاری پڑیں گے۔ ابھی کسی نے پہچانا نہیں ہے ہمیں۔"

"ارے بُرے آدمی سے نہیں۔ پولیس سے لگتا ہے رہے۔ تو تو....."

اماں بولتے بولتے چپ ہو گئیں۔ راجہ ایک بار ڈکیتی کے الزام میں دھر لیا گیا تھا تو پولیس نے اس کی زبردست پٹائی کی تھی۔ بعد میں الزام ثابت نہیں ہونے پر وہ چھوٹ گیا تھا۔ اور محلے کے حلوائی کی دکان سے مفت دودھ پی پی کے اس نے ساری کسر پوری کر لی تھی۔ کوئی اس کے سامنے اس واقعے کو زبان پر کبھی نہ لاتا تھا۔ بس ایک اماں تھی جو اس کو من و عن یاد رکھے ہوئے تھی اور راجہ کو اس سے ڈرانے کی کوشش بھی کرتی۔ راجہ جھنجھلا گیا۔

"اماں تم تو بس پولیس ہی کو سب کچھ سمجھتی ہو۔ ایک بار پکڑ لیا اور دو چار تھپڑ لگا دیے تو کون سی ایسی بات ہو گئی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اس سے میرا ڈر ختم ہو گیا۔ ورنہ میں بھی پولیس سے ہمیشہ ڈرتا رہتا ـــــ ان پولیس والوں میں کچھ دم نہیں اماں۔ لوگ تو ان کی بندوق سے ڈرتے ہیں اور بس۔"

"تو میں بھی بندوق ہی سے ڈرتی ہوں. کیا تیری یہ چھری اُن کی بندوق کا مُنھ بند کر دے گی؟"

"اماں بندوق اگر ان کے پاس ہے تو ہمارے پاس نہیں ہے کیا۔ ارے اپنے پاس تو ایسی بندوقیں ہیں کہ ان پولیس والوں نے کیا ان کے باپ نے بھی نہیں دیکھی ہوں گی۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ پولیس کی بندوق سے کوئی ڈر جائے۔ اب تو....."

"جانتے ہو۔ یہ اُن بندوقوں کی باتیں کرتا ہے جو غیر ملکی ایجنسیاں بانٹتی ہیں تاکہ ہمارے مُلک میں انتشار قائم رہے۔"

بڑے بھیا نے سرگوشی کی۔

"اس بے وقوف کو کیا معلوم کہ جن لوگوں نے اسے بندوق دی ہے، انہوں نے اس کے دشمن کو بھی بندوق دے رکھی ہے۔ اب دونوں آپس میں سر پھوڑ لو۔"

منجھلے بھیا کی جانکاری بھی بہت دُور کی تھی۔

"تیرے پاس اتنی بندوقیں کہاں سے آئی رے کہ تو پولیس سے مقابلہ کرنے چلا ہے؟"

اماں بہت ہی بے اعتباری سے راجہ سے پوچھ رہی تھی۔

راجہ اپنی مخصوص ہنسی میں کھِلا۔

"بہت بھولی ہو اماں تم۔" اب بندوق، گنڈاسہ، چھرے کے لیے ہم دوسروں کا منھ دیکھیں گے۔ یہ چیزیں ہم لوگ خود بنا لیتے ہیں اماں اور صرف اپنے لیے نہیں بناتے۔ دوسروں کو بھی دیتے ہیں۔"

"آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔"

"پھر بھی بھلا پولیس سے تمہارا کیا مقابلہ؟"

اماں بھی اس سے بحث کرنے کے موڈ میں تھی

"پولیس سے اچھے ہتھیار ہیں ہمارے پاس۔

یوں بھی ہم لوگ بس اپنی حفاظت کا سامان کرتے ہیں۔ اب کوئی پتھر سے ہمیں مارے تو ہم اینٹ سے بھی نہ ماریں۔"

"جانتے ہو یہ جن ہتھیاروں کی بات کر رہا ہے، وہی ہتھیار چوری، ڈکیتی، روڈ ہولڈاپ وغیرہ میں کام آتے ہیں

اندر کی سرگوشی اندر ہی محدود تھی۔

"یہ لوگ ہتھیار خود بھی استعمال کرتے ہیں اور دوسروں کے ہاتھ بیچتے بھی ہیں۔"

"یہ مسئلہ قومی اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ پیسے اور ہتھیار کے افراط ہی نے تو سارے مسئلوں کو جنم دیا ہے۔ سارا کھیل بس انہی کا ہے۔ جب یہ نہیں تو کھیل نہیں۔ اس لیے سرکار بھی ان پر کنٹرول نہیں کر سکتی۔"

باہر لاؤڈ اسپیکر پر کچھ اعلان ہو رہا تھا۔

"افواہ پھیلانے اور دنگا کرنے والوں کو فوراً پولیس کے حوالے کیجیے۔ ان کے ٹھکانوں کا پتہ ......"

"کیا راجہ کو......"

بڑے بھیا کی ناک راجہ کے سبب کئی بار کٹ چکی تھی۔ اب تو محلے سے باہر سے بھی اس کی شکایتیں آنے لگی تھیں۔ سب لوگ بڑے بھیا ہی کو گھر کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ انہیں کیا پتہ کہ بڑے بھیا کے سامنے تو راجہ اور شیر بن جاتا ہے۔ انہیں چڑھانے میں اسے بہت مزہ آتا ہے۔ وہ تو اس سے پوچھتے بھی نہیں تھے۔ نہ اپنے بچوں کو اس کے پاس پھٹکنے دیتے۔ ویسے بھی بڑے اور منجھلے بھائیوں کے بیوی بچے ان کی سسرال میں رہتے۔ اس گھر میں اتنی جگہ کہاں تھی۔ ایک پاگل اور ایک بدمعاش نے کسی کے رہنے کے قابل ہی کہاں چھوڑا تھا۔ اگر دونوں بھائیوں کی نوکری کا حیلہ نہ ہوتا تو ان کے لیے بھی یہاں جگہ نہیں تھی

"بات تو ٹھیک ہے جیل میں رہے گا اور چار چوٹ کی مار پڑے گی تو خود بھی سدھر جائے گا اور دوسروں کو بھی چین سے رہنے دے گا۔"

"لیکن اماں ـــ اماں تو اسے بہت چاہتی ہے وہ تو مر ہی جائے گی۔"

"اماں کو پتہ کیسے چلے گا اور پھر راجہ نے اپنی نیک نامی میں کسر ہی کون سی چھوڑی ہے یوں بھی وہ بلیک لسٹ میں ہے۔ پولیس کو تو بس اس کے بارے میں خبر مل جائے۔"

"ایسی غلطی بھی نہ کیجیے گا بھائی صاحب وہ مجھے تو کیا پکڑیں گے۔ ہاں آپ لوگ پکڑ نہیں سکیں گے۔" راجہ کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے ان کی سرگوشیاں سن لی تھیں۔ شاید دیواروں کے بھی کان ہو گئے تھے۔

"نہیں تو کیا کرے گا تو۔ ہمیں قتل کر دے گا؟"

یہ منجھلے بھیا تھے۔ بڑے بھیا تو غصہ اور ایمرجنسی میں بھی اس سے مخاطب ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔

"میں تو کچھ نہیں کروں گا ـــ لیکن آپ اُن سے بچ کے رہیے جن کے حوالے آپ مجھے کرنے جا رہے ہیں۔"

"کوئی کسی کو حوالے کرنے نہیں جا رہا ہے۔ تو جا اماں کے پاس۔ ہم لوگ تو باتیں کر کے یوں ہی اپنے وقت کو ٹال رہے ہیں۔"

باہر کے آدمیوں میں سے ایک نے بہت سمجھاتے بجھاتے ہوئے کہا۔

"اوہ تو یہ وقت آپ پر اتنا بوجھ ہے کہ اسے ٹال رہے ہیں؟"

راجہ عجیب لہجے میں بولا۔ حالات نے شاید اس پر اپنا کافی اثر ڈال رکھا تھا۔

"تم ہماری فکر نہ کرو۔ رہے اور مسائل تو اس کے لیے سرکار ہے، پولیس ہے۔ ہم کیوں اُن کے کام میں دخل دیں۔"

"پولیس کا کام آپ کی حفاظت کرنا نہیں یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اور آپ بھی اچھی طرح جان لیجیے۔"

"ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ پولیس کا کام تم جیسے لوگوں کی خبر لینا ہے۔"

منجھلے بھیا اس سے کسی طرح قائل ہونے والے نہیں تھے۔

اماں دودھ جلیبی کا پیالہ لیے آگئی۔

"لے راجہ کھالے۔ جانے کب سے بھوکا ہے۔"

راجہ پیالہ لے کر باہر چلا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے اماں بھی گئی۔

"آیا ہے ہم لوگوں کو سبق سکھانے۔"

بڑے بھیا پھٹ پڑے۔ اتنی دیر سے وہ اپنے آپ کو دبائے بیٹھے تھے۔

کوئی شریف اور سمجھدار آدمی ہنگامہ پسند نہیں کرتا۔ یہ تو چند غنڈے ہوتے ہیں جن کے وجود اور روٹی روزی کا اسی پر دارومدار ہے۔"

"آخر اماں کیوں نہیں روکتیں راجہ کو۔"

باہر کے لوگ ان کے گھریلو ماحول کو دیکھ کر بڑے حیران تھے۔

"اماں کی وہ سنتا کب ہے۔ جب تک ابا زندہ تھے، اُن کا کچھ رعب اس پر تھا۔ ان کے مرنے کے بعد تو وہ شیر ہو گیا اور اب دن بدن۔"

"آپ بڑے بھائی تھے ـــ آپ کو تو شروع سے ہی اس پر قابو رکھنا چاہیے تھا۔"

"بھئی میں کیا کرتا ـــ میں خود ہی بال بچوں والا آدمی ہوں۔ مجھے تو کبھی فرصت ہی نہیں ملی۔ پھر راجہ اماں کے لاڈ پیار میں پہلے ہی سے برباد تھا۔"

اور وہ جو لگ ہے اس کو پاگل کرنے میں بھی اماں ہی کا ہاتھ ہے۔ میں نے کتنا چاہا کہ اُسے پاگل خانے میں داخل کرا دوں لیکن وہ تیار نہیں ہوتیں۔ پتہ نہیں کس نے ان سے کہہ دیا کہ وہاں بہت خراب کھانا ملتا ہے۔ اور بہت مار پڑتی ہے۔ اب بھی وہ تو دماغی اسپتال ہے، وہاں تو اس کے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو سب پاگلوں کے ساتھ ہوتا ہے۔"

یکایک دالان سے پھر ایک نعرہ بلند ہوا۔
سبھی گم صم سے ہو گئے۔ باہر دوڑتے ہوئے لوگوں کی آوازیں آئیں۔ ایک بھاری ٹرک شور مچاتا ہوا گزر گیا۔

"بھلا بتائیے۔ خواہ مخواہ اس طرف سارے لوگوں کی توجہ مبذول کرا رہا ہے کم بخت۔"

"اماں اسے روکتی کیوں نہیں۔"

"اماں کے بس کی چیز نہیں ہے وہ۔"

"اماں کے بس کی چیز تو ہم لوگ ہیں۔"

دالان سے عجیب عجیب آوازیں آنے لگیں وہ گھبرا گئے۔

"لگتا ہے وہ آ گئے۔"

"کون؟"

"جن کے انتظار میں ہم بیٹھے ہیں۔"

"لیکن ہم تو یہاں اس لیے بیٹھے ہیں کہ......"

"اگر وہ واقعی آ گئے ہیں تو پھر یہاں اس کمرے تک آنے میں انہیں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے۔ وہ جو بھی ہوں آ تو جائیں جلدی سے۔"

جب واقعی دیر ہو گئی اور کوئی نہیں آیا اور آوازوں کا سلسلہ بھی جاری رہا تو ان میں سے ایک نے کھڑکی سے جھانکا —— جھانکتا رہا۔ اس نے دوسروں کو بھی جھانکنے کی دعوت دی۔ دالان کا منظر عجیب تھا کہ ابھی ابھی پاگل نے جو نعرہ لگایا تھا اس سے خوش ہو کر راجہ بُری طرح ہنس رہا تھا۔ راجہ کی دیکھا دیکھی اماں بھی ہنس رہی تھی۔ پاگل نے جو سب کو یوں ہنستے دیکھا تو وہ بھی اس کارِ خیر میں شریک ہو گیا......... ان تینوں کے قہقہوں نے مل کر ایک عجیب آواز کو جنم دیا تھا۔
—— ایک بالکل نئی آواز ——

باہر کے دونوں فرد بھی اس منظر کو دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ البتہ دونوں بھائیوں کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ بڑے بھیا سے تو یہ برداشت ہی نہیں ہو سکا۔ وہ دوڑ کر باہر چلے گئے۔

"چُپ رہو تم سب۔"
وہ بہت زور سے دہاڑے۔

اماں اور راجہ تو چپ ہو گئے، لیکن پاگل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بدستور ہنستا رہا۔ اگرچہ اس ایک کے قہقہے میں نہ اب کوئی دم تھا نہ نیا پن۔

"اماں یہ کیا پاگل پن ہے —— یہ بے چارا تو خیر..... لیکن آپ —— یہ بار بار گلا پھاڑ کے نعرے لگاتا ہے۔ باہر پولیس اور ملٹری پھری پڑی ہے۔ شک ہو گیا تو وہ ہم سب کو بھون ڈالیں گے۔"

"میں تو اس لیے اپنا گلا پھاڑ رہا ہوں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ یہاں بھی کوئی رہتا ہے۔ آپ کو اچھا نہیں لگتا تو چوڑیاں پہن کے کمرے میں بند رہیے۔ مردوں کے درمیان نہ آئیے۔"

پاگل نے بہت سنجیدگی سے کہا اور باہر کا ایک فرد سوچنے لگا۔

"یہ تو کسی لحاظ سے پاگل نہیں لگتا۔"

"تم چُپ رہو پاگل کہیں کے —— میں تم سے بات نہیں کر رہا۔ اماں یہ ہم سب کو کٹوا دے گا۔ پتہ نہیں اس کی نعرہ بازی سے باہر کن کہانیوں نے جنم لیا ہوگا اور پتہ نہیں اب کیا ہوگا۔"

"جائیے جائیے کچھ نہیں ہوگا۔ کہانیاں گھڑنے والوں کو شوق ہوگا تو وہ خود ہی آ کر دیکھ جائیں گے۔"

راجہ بے حیا بن کر موقع بے موقع بڑے بھیا سے مخاطب ہو ہی جاتا۔

بڑے بھیا پیر پٹختے ہوئے کمرے میں چلے گئے۔

"اماں، بچے گا تو اب کوئی نہیں —— ہاں یہ بزدل کی موت مریں گے۔ اور ہم بہادر کی۔ دیکھ لینا۔" باہر سے راجہ کی آواز آئی۔

باہر کے دونوں فرد بس ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔

"کسی طرح گھر چلے جائیں۔"
لیکن کس طرح۔ باہر کی خبر کسی کو نہیں تھی۔

وہ لوگ تب تک باہر پہنچے ہوئے تھے۔ یوں سناٹے کی خبر تو تھی۔ لیکن رہ رہ کر چیخ، نعرے بازی، توڑ پھوڑ گاڑی اور دوڑ بھاگ کی جو آوازیں تھیں، وہ لمحہ لمحہ طرح طرح کی کہانیاں سنا رہی تھیں۔

اچانک باہر کا دروازہ زور زور سے پیٹا جانے لگا۔ شاید کسی نے چیخ کر دروازہ کھولنے کو بھی کہا۔ در و دیوار کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ راجہ دیکھتے ہی دیکھتے دیوار کے سہارے چھت پر چڑھا۔ اور پتہ نہیں تاریکی میں کہاں گم ہو گیا۔ پاگل بار بار دروازہ کھولنے کے لیے اٹھتا، لیکن اماں اُسے پکڑ لیتیں۔ پتہ نہیں بوڑھی اماں کی پکڑ میں وہ کون سی قوت تھی کہ پاگل کسی طرح دروازے تک نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ باہر سے بار بار دروازہ کھولنے کو کہا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد دروازہ توڑنے کی آواز آئی۔ ویسے بھی اس میں دم ہی کتنا تھا۔ بس یہ کہ وہ بند تھا۔ اور بند کیا جا سکتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے آنگن میں بہت سے باوردی لوگ آ گئے۔ دالان پر اماں پاگل کو پکڑے بیٹھی تھی۔ "کہاں ہیں وہ لوگ؟"

ایک گرج دار آواز نے پوچھا۔

"کون لوگ؟ یہاں تو کوئی بھی نہیں۔"

"وہی جو یہاں سے نعرہ بازی کر رہے تھے۔ اور فساد کی تیاری کر رہے تھے۔ جلدی بتاؤ ورنہ تم دونوں کو ایک ساتھ بھون دوں گا۔"

"میں نعرہ لگا رہا تھا۔ میں اکیلا ہی سب لوگ ہوں۔" پاگل نے بہت خوش ہو کر کہا۔

ان کے لیڈر نے اسے بہت غور سے دیکھا پھر جیسے سب کچھ سمجھتے ہوئے بولا۔

"تو چپ رہ پاگل —— سبھی جوان گھر بھر کی تلاشی لو۔ گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔ پاتال میں بھی اگر کوئی چھپا ہے تو اسے ڈھونڈ نکالنا ہے۔"
سبھی جوان تیل کی طرح گھر کے اندر پھیل گئے۔

پیغام آفاقی

پیتل کی بالٹی



کچھ دنوں سے وندنا تیزی کے ساتھ پاؤں پٹکتی ہوئی کبھی گھر میں اِدھر جاتی کبھی اُدھر جاتی۔ کبھی بلّی سے لڑائی۔ کبھی پانی کا نل کھلا چھوٹ جانے پر ہنگامہ، کبھی غصّے میں برتنوں کو اِدھر اُدھر بکھیرتی۔ اور کبھی کوستے ہوئے کسی پردے کو سیدھا کرتی اور پھر اُسے بگڑی بگڑی ہوئی نگاہوں سے دیکھتی۔

"سب میرے دشمن ہیں۔" اُس نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔

"کیا ہوا؟ اتنی اُکھڑی اُکھڑی سی کیوں ہو۔ کہیں باہر چلیں۔"

"معلوم نہیں۔ یہاں موت بھی نہیں آتی۔"

"کیا ہوا؟"

وہ مجھ پر برس پڑی۔ "میری قسمت ہی ایسی ہے۔ وہ دروازے کے سامنے والی الماری کی طرف گئی۔ الماری کے پٹ جھٹکے سے کھولے۔ اور پھر ٹھٹھک کر خالی خالی نظروں سے کچھ دیکھنے لگی۔

"کیا بات ہے؟"

"تم کو تو فرصت ہی نہیں ملتی۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"کیا بات کرنی ہے۔ بولو، بولو!"

"اے ہٹو۔"

"بولو نا کیا بات ہے۔ میں نے کھڑے ہو کر اس کے بے چین سراپا کو اپنی باہوں میں لے لیا۔

"تم کو تو بس یہی آتا ہے۔" پھر جیسے چند لمحے انجانے میں وہ مطمئن سی ہو گئی پھر اچانک میں نے اپنے بازو پر اس کے دانتوں کی جکڑ کو محسوس کیا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ میری باہوں کے حلقے سے آزاد ہو گئی۔ وہ تیزی سے بالکونی میں جا کھڑی ہوئی۔ اور کھلے آسمان میں دیکھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر کمرے میں لوٹ آئی۔

"تم بہت مصروف ہو۔ میرا یہاں بیٹھنا تم کو اچھا نہیں لگتا؟" میں نے اس کی طرف دیکھا "یہاں بیٹھ جاؤں؟"

"تم کو منع کس نے کیا ہے؟"

"پتہ نہیں تم ڈسٹرب ہوتے ہوگے؟ اور پھر وہ میرے بغیر کچھ کہے ہوئے پلنگ پر بیٹھ کر میرے پاؤں دبانے لگی

"تمہاری تیاری کیسی چل رہی ہے؟" وہ انٹیریر ڈیکوریشن کا کورس کر رہی تھی۔

"میں تو تنگ آگئی ہوں۔ پڑھوں گی ذرا اطمینان ہو جائے۔"

"تم کو امتحان دینا ہے تو فرصت پیدا کرو۔"

"کیا کروں سارا گھر اُجاڑ پڑا ہے۔ میں نہ کروں تو یہ گھر جہنم بن جائے گا۔"

"سارے کام بانٹ دیا کرو۔ نوکروں کو ان کے کام بتا دو۔ کام لینا سیکھو۔"

"تم کو تو بس افسری سوجھتی ہے۔ یا تو سوئے رہتے ہو، یا کوئی آجائے تو گھنٹوں گھنٹوں گپ مارتے رہتے ہو۔ مجھے گھر میں سکون چاہیے۔" وہ بچوں کی طرح رونے لگی۔ "میں سب توڑ دوں گی، سب پھینک دوں گی۔" اُس نے تکیہ اٹھا کر فرش پر پھینکا۔ پھر قلم اٹھا کر دوسری طرف پھینکا۔ پھر اُس نے ٹیبل گھڑی کو ہاتھ لگایا۔ میں نے پچکارتے ہوئے آگے بڑھ کر اُسے منع کیا۔ اور گھڑی نرمی سے اُس کے ہاتھ سے لے لی۔ اُس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر بھوکی بلّی کی طرح میرے داہنے بازو پر دانت گاڑ دیے۔ اور آٹومیٹک مشین گن کی طرح دس بیس مُکّے میری باہوں اور پیٹھ پر برسا دیے پھر جیسے بے بسی سے شانوں پر سر رکھ دیا اور گھُٹ گھُٹ کر رونے لگی۔

ڈی۔۱۔ تھانہ راجوری گارڈن، دہلی ۱۱۰۰۲۷

میں نے اُسے پھر پکارا۔ تھوڑی دیر کے بعد انتہائی سکون کے عالم میں اُس نے چہرہ اُٹھایا۔ اُس دن مجھے لگا تھا جیسے وہ اپنے آپ کو پہچاننے اور دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"یہ گھر تو تمہارا ہے نا، میرا تھوڑا ہی ہے"، اس کی آنکھوں میں ایک عجیب لپکتا ہوا سوال تھا۔

"یہ تمہارا گھر ہے؟"

"ارے چھوڑو میرا کیا ہے۔ ہر کام تمہاری مرضی سے ہوتا ہے۔"

"کیوں گھر کی ہر ایک چیز تمہاری مرضی سے خریدی جاتی ہے۔ ہر کام میں تمہارا مشورہ شامل ہوتا ہے۔"

"ارے چھوڑو تم میری صرف وہی باتیں مانتے ہو جو تم کو پسند آتی ہیں۔"

"کیوں؟ کون سا کام ہے جو نہیں ہوا؟"

"گناؤں!" وہ مجھے غور سے دیکھنے لگی۔

"تمہارے لیے یہ الماریاں خریدیں۔ تمہارے کہنے پر تمہاری پسند کے تین سیٹ اور ٹی سیٹ خریدے اتنی ساری ساڑیاں خریدیں۔ میں گناتا چلا گیا۔ اور ایک ایک نام پر وہ مجھے دیکھتی چلی گئی۔ جہاں ساڑیوں کا ذکر آیا وہاں اُس کے چہرے پر ایک ٹھہراؤ، ایک سکون پیدا ہوا۔ لیکن پھر وہی احتجاج۔ چند لمحوں کے بعد ایک نئے انداز میں شروع ہو گیا۔ اور جب میں گناتے گناتے ڈریسنگ ٹیبل پر پہنچا۔ تو اُس نے ایک جارحانہ جملہ پھینکا" وہ تو تم نے جب بنایا جب تمہاری مرضی ہوئی ورنہ میں خود کتنی بار کہہ چکی تھی۔"

"میں نے جان بوجھ کر تاخیر تھوڑے ہی کی تھی۔ جب پیسہ بچا تو بنایا۔ میں نے مدلل انداز میں کہا۔

"یہی تو میں بھی کہتی ہوں کہ میری کوئی اہمیت نہیں۔ میرے کہنے سے نہیں بنا۔ جب پیسہ ہوا تب بنا۔ میرے لیے خود سے سوچنا تو تم جانتے ہی نہیں۔ تم پولیٹیشن ہو۔ وقت کے مطابق چلتے ہو۔ جس بات میں سہولت سمجھتے ہو وہی کرتے ہو۔"

"ہاں تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

"ہاں حرج کیا ہے۔" اس نے جیسے طنز سے کہا اور پھر جیسے گفتگو ختم ہوتے دیکھ کر بات آگے بڑھانے کے لیے بولی گئی۔ "میں اتنی مشکل سے یہ سب کچھ جمع کر رہی ہوں کل مر جاؤں گی تو دوسری آئے گی اور راج کرے گی۔ ایک ایک سامان دیکھ کر اس کا جی کھل اُٹھے گا اور کیوں نہیں، بنا بنایا گھر جو مل جائے گا۔"

میں خاموش اسے دیکھتا رہ گیا۔ میری طرف سے کچھ جواب نہ ملنے پر وہ پھر بڑے دلاور انداز میں بولی۔ "اچھا روی یہ بتاؤ کہ میں مر جاؤں گی تو تم میرے لیے کیا کرو گے۔ مجھے بھول جاؤ گے نا؟ دوسری شادی کر لو گے؟"

"تم کیوں مرو گی؟"

"نہیں بتاؤ نا تم کیا کرو گے؟"

"میں پھر زندہ رہ کر کیا کروں گا۔"

"ایسی بات نہیں کرتے۔" وہ بوکھلاہٹ کے ساتھ بگڑی۔ "تم شادی کرو گے نا؟" وہ پھر اسی کریدنے پر لگ گئی۔

"بالکل نہیں کروں گا۔" میں نے اس کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، لیکن میرے اس قسم کے وعدے کو اس نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ ارے جب کرو گے نا تب پتہ چلے گا کہ میں کیا تھی؛ میں ہوں کہ چپ رہتی ہوں۔ تم اتنا ستاتے رہتے ہو۔ دوسری ہوتی تو ہنگامہ کھڑا کر دیتی ـــــ سچ سچ بتاؤ روی۔ میں اگر مر گئی تو دوسری شادی کرنے کے بعد تم مجھے یاد رکھو گے نا؟ اُس نے تیسری بار پوچھا۔ میں نے اُسے غور سے دیکھا اور محسوس کیا کہ میں نے اگر اس بار بھی اس سے یہ کہہ دیا کہ میں شادی نہیں کروں گا تو وہ بور ہو جائے گی۔

"میں تمہاری تمام تصویروں کو فریم میں لگوا کر کمرے میں رکھوں گا۔ میں نے بھرے پُرے فلمی رومانٹک لہجے میں کہا اور وہ توقع کے خلاف اسی ڈائیلاگ پر لہرا اُٹھی۔ "ارے چلو۔ وہ رہنے دے گی۔ تم تھوڑے ہی دنوں میں سب اتروا کر پھنکوا دو گے۔"

"کیوں، ایسا بالکل نہیں ہوگا۔ تم جانتی نہیں ہو کہ میں تمہیں کتنا پیار کرتا ہوں۔ اس نے میری آنکھوں میں سیدھا گہرائی تک دیکھا اور اس کی آنکھوں میں چمک اور سکون کے کئی سائے ایک ساتھ گزر گئے۔ میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ویسے وہ واقعی خوش بہت ہوگی کہ اتنا اچھا گھر اور اس میں سب چیزیں کری کرائی اس کو مل جائیں گی۔"

"ارے چلو، تم سے کون شادی کرے گی۔"

"کیوں مجھ میں کیا کمی ہے۔ اتنا اسمارٹ ہوں۔"

"وہ تو میں نے تم کو اسمارٹ بنایا ہے۔ ورنہ پہلے تم کیا تھے۔ یاد کرو۔ ہونق لگتے تھے۔"

"جانتی ہو، جب میں چلتا ہوں تو کتنی لڑکیاں مجھے گھور گھور کر دیکھتی ہیں۔ وہ جو تم نے میرے لیے کالی دھاریوں والا شرٹ خریدا ہے اس کی خوب صورتی کا اندازہ اسی سے ہوا۔"

"دیکھی میری پسند۔ اور ایک تم خود خرید کر لاتے ہو۔ ایسے کپڑے جو تم خود ہی بھول کر بھی دوبارہ نہیں پہنتے۔"

"ہاں اسی طرح اسمارٹ بناتی جاؤ۔ پھر دیکھنا۔"

"ارے اتنی مجال۔ کچومر نکال دوں گی سمجھے کیا ہو۔ جو تمہاری طرف کوئی دیکھے تو پھر بتاؤں۔ ٹانگ توڑ دوں گی۔"

"اور اگر ساتھ میں آ گئی تو؟"

"ہاں تم لاؤ گے ضرور۔ یہ میں جانتی ہوں۔"

اس دن شام کو وہ دو رنگین ٹائیاں لے کر آئی ..... "دیکھو تو تمہیں پسند ہیں۔ کتنے اسمارٹ لگو گے تم انہیں باندھ کر؟" میں تمہارا

کتنا خیال رکھتی ہوں۔ ارے تم مجھ سے دوستی رکھو تو کیا سے کیا ہو جاؤ۔ لیکن تم سمجھتے ہی نہیں — یہ روز روز ایک ہی کپڑے پہن کر جاتے ہو۔ عادت ہے تمہاری میں طرح طرح کے کپڑے لاتی ہوں اور تم پہنتے ہی نہیں۔ بہت گندی عادت ہے۔ اس رات میں نے جان بوجھ کر دسوں عورتوں اور لڑکیوں کا ذکر کیا اور ان کی تعریفیں کیں اور پھر شکایت کی اور ان کو ریجیکٹ کر دیا۔ اور وہ بڑے چاؤ اور انہماک سے سنتی رہی۔

کبھی شام کو دیر سے گھر آیا تو اُس نے پوچھا۔ "کیا کرتے رہتے ہو۔ اتنی دیر سے آئے ہو۔"

میں تھوڑی دیر خاموش رہا پھر کہا۔

"تم گھر میں کچھ دلچسپی کا سامان پیدا کرو۔ ایسے آدمی کیا باتیں کرے۔ آدمی ایک ساتھ مل کر کچھ کرے تو ایک بہانہ، ایک تعلق رہتا ہے — ہنی مون کا زمانہ ختم ہوا۔ کوئی نہ کوئی اور موضوع ہونا چاہیے۔ کچھ عجیب خالی خالی سا سناٹا سا لگتا ہے۔"

"ہاں ہاں، میں سمجھ رہی ہوں۔ میں خوب جانتی ہوں کہ تم نے کیا موضوع تلاش کیا ہے؟"

"تم خواہ مخواہ کی باتیں پیدا کرتی ہو — اس سے غلط بنیاد پیدا کرتی ہو۔ اس سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔"

"بات کو غلط رُخ دینے کی کوشش مت کرو۔"

"غلط رُخ تو تم دے رہی ہو۔"

"میں بالکل صحیح کہہ رہی ہوں۔"

"تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"وہ جو تم نے اپنے رلیسٹ روم میں ایک کلنڈر رنڈ کا رکھا ہے۔"

"ارے وہ تو ایک بہت اچھا معیاری کلنڈر ہے۔ رکھنے کے لیے ہی تو ہوتا ہے۔"

"مونہہ شرم نہیں آتی۔ لوگ کیا کہیں گے۔"

"لوگ تو خود بھی اُسے غور سے دیکھتے ہیں۔"

"ہاں۔ وہ بھی تمہارے ہی جیسے ہیں۔"

"تم تو عجیب ہو۔ اس زمانے میں تم ایسی باتیں کر رہی ہو۔ میں کہاں کہاں آنکھیں بند رکھوں گا۔ کلنڈر، فلم، سڑکیں — کہاں کہاں!"

"ہاں ہاں میں تو بہت دقیانوسی عورت ہوں۔ ہنی مون کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب تو تمہیں کوئی موڈ لڑکی چاہیے۔"

"یہ میں نے کب کہا؟"

"چھوڑو مجھے۔ وہ ہاتھ جھٹک کر کھڑی ہو گئی جڑیل۔ ایک دن آفس آؤں گی اور پھاڑ کر باتھ روم میں پھینک دوں گی۔"

"اور فلش بھی چلا دینا۔ میں نے تیزی سے جاتی ہوئی وندنا کو پیچھے سے اونچی آواز میں کہا۔

اس دن آفس سے آتے ہوئے رمیش بھی چند منٹ کے لیے میرے ساتھ آ گیا تھا — وہ ابھی ڈرائنگ روم میں بیٹھنے ہی والا تھا کہ وندنا آ گئی۔

"دیکھیے گا یہ اُدھیڑے ہوئے دھاگے کہیں آپ کے کپڑوں میں نہ چپک جائیں۔"

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ میں نے اپنی شال کے پھول اُدھیڑے ہیں۔ بڑے گنوار قسم کے ہیں۔ اب دیکھنا یہ حصہ کتنا اچھا لگ رہا ہے۔"

"تو آپ نے دن بھر یہی کیا ہے؟" رمیش محظوظ ہو رہا تھا۔

"ہاں، وندنا نے اطمینان سے کہا۔

"اب یہ اچھا لگ رہا ہے نا" اُس نے شال کے اُدھڑے ہوئے حصے کو اپنے کندھے پر ڈالتے ہوئے دکھایا۔ شال اس حال میں کسی کھڑپی کی طرح سپاٹ اور کھردری لگ رہی تھی۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔

"کیوں آپ کو یہ اچھا نہیں لگ رہا ہے"

"ہاں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

"خیر مناؤ کہ تم گھر میں نہیں تھے۔" رمیش نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ وندنا کو بےساختہ ہنسی آ گئی۔ لیکن وہ پھر سیریس ہو گئی۔ پھر وہ اُٹھ کر اندر کچن میں گئی۔ چائے لائی اور پھر ایک دوسری شال لے کر بیٹھ گئی۔

"دیکھیے، اس کے کنارے کتنے بُرے ہیں، انہیں بھی اُدھیڑوں گی۔ وہ ایک چمٹی لے کر اس کے دھاگے نکالنے لگی۔ میں اس کو دیکھتے دیکھتے اس کی اُنگلیوں میں کھو گیا۔ جب وہ انہماک کے ساتھ اپنی نازک اُنگلیوں کے ناخونوں اور تیز چمٹی سے پھولوں کے بخیے اُدھیڑ رہی تھی تو مجھے نہ جانے کیوں یوں لگ رہا تھا کہ شال کے اوپر سے دھاگوں کا پھول مٹتا جا رہا ہے اور میرے وجود پر گدگدی کے ساتھ پھولوں کے نقوش اپنے گہرے رنگ میں اُبھرتے جا رہے ہیں۔

دوسرے روز صبح وہ خاموش خاموش گم سم اپنے آپ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جیسے بہت بےچینی سے کچھ سوچ رہی ہو۔ پھر وہ ڈرائنگ روم میں میرے پاس آئی۔

"ردی۔"

"ہاں۔"

"یہ دھوبی بڑا تنگ کرتا ہے۔" اُس نے تقریباً غراتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا؟"

"دیکھو، ابھی تک نہیں آیا۔ میں دو گھنٹے سے اس کا انتظار کر رہی ہوں۔ جب مرضی ہو آتا ہے۔ جب جی چاہتا ہے کپڑے واپس دیتا ہے۔ تین دن ہو گئے کپڑے لے گئے۔"

"کیوں، تم نے کب دینے کو کہا تھا؟"

میرے سوال پر اُس نے میری طرف خاموشی سے چند لمحے دیکھا۔ کچھ اُلجھی رہی اور پھر سُنی اَن سُنی کر دی۔ پھر جیسے وہاں کھڑا رہنا اُسے بےمعنی لگا۔ اور وہ وہاں سے چل دی — لیکن پھر

واپس آئی۔

"نہیں یہ دھوبی بالکل ٹھیک نہیں ہے۔"

وہ جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتی رہی تھی۔ "دیکھو نا۔ تمہارے کرتے پاجامے دے ہی نہیں گیا۔ صرف ایک سیٹ رہ گیا ہے۔"

"تم اس کو صاف صاف وقت متعین کر کے بتا کیوں نہیں دیتیں اور اس کے باوجود اگر وہ کپڑے وقت سے نہیں دیتا تو مجھے بتاؤ۔"

"بے کار کی باتیں کرتے ہو۔"

وہ اٹھی اور الماری کے اندر سے دھلے ہوئے سارے کپڑے بستر پر پٹک کر ان کا معائنہ کرنے لگی۔ یہ دیکھو کیسے جلایا ہے۔ یہ دیکھو، داغ سارا کپڑا برباد کر دیتا ہے ـــــ یہ دیکھو کم بخت پھاڑ کے لایا ہے۔ ـــــ ابھی تک نہیں آیا ـــــ وہ کپڑوں کو خواہ مخواہ الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی اور اس کے چہرے پر تناؤ بڑھتا گیا جیسے وہ ان کپڑوں سے اپنے غصے کو ہوا دے کر اس کے شعلوں کو تیز کرنا چاہتی ہو ـــــ اس کا دھیان اب آہستہ آہستہ دروازے پر مرکوز ہو رہا تھا۔

لگ بھگ دس منٹ بعد دروازے کی گھنٹی بجی اور وہ گھنٹی کی آواز سے ہی جیسے پہچان گئی اور پھر پاؤں دبانا چھوڑ کر پلنگ سے تیزی سے اچھل گئی۔ دروازہ کھلا۔ دھوبی کو اندر بلایا گیا۔ اور پھر اس کی تنقید۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار ـــــ اور ـــــ اور ـــــ دھوبی نے اپنی صفائی میں جو کچھ بن پڑا جواب دیتا رہا۔ مگر اس کی خامیوں کی فہرست اتنی طویل اور اتنی مدلل تھی کہ اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ بالآخر وہ چپ ہو گیا اور جاتے جاتے بولا۔ میں پورا خیال رکھوں گا میم صاحب۔ آئندہ ایسی بات نہیں ہوگی۔"

"تو خیال رکھے گا نگوڑا۔ سمجھتے آتا کیا ہے۔" اس نے دھوبی کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

آخری برسات کی امس اور ہلکی ہلکی گرمی تھی۔ اتوار کا دن تھا۔ پنکھا آن تھا۔ ابھی ابھی ہم لوگوں نے تلاش کر کر کے ادھر ادھر کی بہت سی باتیں کی تھیں اور اب میں لیٹا ہوا ایک رسالہ پڑھ رہا تھا۔ وندنا دیواروں پر ادھر ادھر تک رہی تھی۔ پھر وہ مسکراہٹ دباتی ہوئی اٹھی اور سوئچ بورڈ کے پاس دبے پاؤں گئی اور پنکھے کا سوئچ آف کر دیا۔ پنکھے کی رفتار دھیمی ہو گئی۔ پھر اس نے آن کر دیا۔ رفتار پھر تیز ہو گئی۔ ایک دو بار کے بعد میری نگاہ اب اس طرف اٹھ رہی تھی۔

"چھوڑو نا، کیا کر رہی ہو۔" میں نے ٹوکا۔

لیکن وہ مسلسل یہ حرکت میری طرف دیکھ دیکھ کر کرنے لگی۔ میں نے ادھر دیکھنا چھوڑ دیا تو اس نے ایک بار پنکھے کو بالکل ہی بند کر دیا۔ مجھے گرمی محسوس ہوئی۔ میں تو پہلے جان بوجھ کر انجان بنا رہا۔ پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ وہیں کھڑی پوری توجہ سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"تم یہ کیا کر رہی ہو۔ آن کر دو نا گرمی ہو رہی ہے۔"

"گرمی ہو رہی ہے۔ وہ بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنسی اور پھر پنکھا آن کر دیا۔ پھر آف کر دیا۔

"یہ تم کو کیا سوجھی ہے۔"

"میں تنگ آگئی ہوں۔" اور میں نے دیکھا کہ وہ تو جیسے جھگڑنے پر تلی ہوئی تھی اور اس بارے میں وہ سنجیدہ تھی۔ کم بخت یہ بجلی کا پنکھا۔ یہ بجلی تو میری سوت بن گئی ہے ـــــ اس نے ٹی وی کو گھور کر دیکھا۔ پہلے سینما دیکھنے باہر نکل جاتے تھے تو تفریح ہو جاتی تھی۔ اب ٹی وی پر فلم دیکھو، مشاعرہ دیکھو اور ہوٹ بھی نہ کر پاؤ۔ اور نام ہے کوی سمیلن۔

ایک چراغ جلا دیا کرتی تھی روزانہ شام اپنے گھر میں جب گاؤں میں تھی تو کیسی روشنی ہو جاتی تھی۔ اب کوئی سوئچ دبا دے اور روشنی بھک سے ـــــ یہ دیکھو کتنی اچھی لگ رہی ہے یہ لڑکی جو پوجا کے لیے تھال میں دیے سجا کر لے جا رہی ہے ـــــ مجھے گھور کر مت دیکھو، روی، میں جانتی ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر جگہ اپنی دلیل دے کر آجاتے ہو ـــــ کیا میں منھ میں تالا لگا کر بیٹھ جاؤں؟' میں آدمی ہوں یا جانور۔ کسی کام کے لیے بولو تو ورک لسٹ، نوکر ـــــ کسی لفظ کا معنی پوچھو تو ڈکشنری، کسی موضوع پہ بات کرو تو کوئی مستند کتاب۔ فریج میں خرابی ہو تو ڈیلر کا فون نمبر ـــــ کوئی سامان خریدنا ہو تو تمہارا وہ کلرک۔ تم نے اپنی جان بچانے کا پورا انتظام کر رکھا ہے۔

"جب میرے ماتحت دوسرے میرے کام کر سکتے ہیں تو تم کیوں چاہتی ہو کہ ان کا کام میں کروں۔ یہ کون سی ضد ہے۔"

وہ لاجواب ہو گئی۔

"میں کبھی ایک نوکر ہوں نا کھانا بنانے کے لیے" وہ دھیرے سے بولی۔

"اپنے کو نوکر سمجھتی ہو تو مت بناؤ کھانا باورچی سے بنوا لو۔"

"روی تم سمجھتے کیوں نہیں۔"

"کیا تم اطمینان سے سمجھاؤ تب نہ سمجھوں۔ یہ کوئی سمجھانے کا طریقہ ہے۔ اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں۔ اگر نیند پوری نہیں ہوئی تو بوجھل طبیعت کے ساتھ کل آفس کیسے جاؤں گا۔ میٹنگیں۔ کیسے اٹینڈ کروں گا۔

میں کروٹ لے کر سو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز پر میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا وہ اندھیرے میں بستر پر سر جھکائے بیٹھی ہے۔

میں اٹھ بیٹھا۔ "کیا بات ہے؟"

وہ بے اختیار زور زور سے رونے لگی۔ انتہائی بے بسی کے ساتھ جیسے اس کے اندر سے ادھ جلا دھواں بھبک رہا ہو۔ میں اسے چپ کراتا رہا لیکن وہ روتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد اس کا

رونا کم ہوا لیکن وہ سسکتی رہی۔ چہرہ انتہائی مضمحل ہوگیا تھا اور آنسوؤں سے گلا رُندھ گیا تھا۔

دوسرے دن صبح وہ اُٹھی تو اُس کے چہرے پر ایک بے چارگی تھی۔ اس کے بعد وہ کچھ دن نارمل رہی۔ لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میرے مزاج کو مدِنظر رکھتے ہوئے شائستہ رہنے کی کوشش میں اپنے آپ کو دبائے رکھتی ہو۔ میں اس کو دیکھتا تھا، لیکن کچھ سمجھ نہیں پاتا تھا۔ میں کبھی اس عجیب بات سے اُلجھن میں پڑ جاتا تھا۔ کچھ دنوں تک سب کچھ نارمل سا رہتے رہتے اچانک ایک دن وندنا کے چہرے پر ایک پُراعتماد چمک اُبھرنے لگی جو بہت عجیب سی تھی۔ میں نے اس کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن وہ مجھ سے کھُل نہیں رہی تھی۔ جیسے اپنے اندر ہی اندر وہ کچھ چھُپائے ہوئے سوچ رہی ہو اور مجھے بتانا نہیں چاہتی ہو۔ ایک دن صبح کچھ عجیب سی آواز پر میری آنکھ کھُلی تو پورے مکان میں کھن کھن جھن جھن کی آواز پھیل رہی تھی یہ آواز باتھ روم کی طرف سے آرہی تھی۔ اسی دوران نوکرانی مجھے چائے دے گئی اور میں ایک کتاب اُٹھا کر پڑھنے لگا، لیکن میری توجہ بار بار باتھ روم کی طرف جارہی تھی، جہاں سے وہ آواز آرہی تھی۔ وندنا کتنی عجیب و غریب حرکتیں کرتی رہتی ہے۔ اس زمانے میں پیتل کی بالٹی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد وندنا کی آواز سنائی دی۔

"روی!"

"ہاں!" میں نے بستر پر لیٹے لیٹے ہی جواب دیا۔

"ذرا ایک کام کردوگے؟"

"کیا؟" میں وہیں سے بولا۔

"ذرا اِدھر آؤ!"

میں باتھ روم تک گیا تو یہ دیکھ کر مجھے عجیب سا لگا کہ وندنا گھٹنوں تک صابن اور سرف کے جھاگ میں سنی سنائی کپڑوں کے ایک انبار کے بیچ پلاسٹک کے چوکے پر بیٹھی ہے اور سفید بھرپور جھاگ اس کی کہنیوں تک پہنچ رہا ہے۔ جھاگ کے کچھ رنگین چھینٹے اُڑ اُڑ کر اس کے چہرے پر بھی ٹک گئے تھے۔ جنہیں وہ اب مجھ سے بات کرتے ہوئے اپنے بازو کے اوپری حصّے سے پونچھ رہی تھی۔

میری نگاہ پیتل کی بالٹی پر پڑی تو وہ مجھے ایسے دیکھنے لگی جیسے میری نظروں کو پڑھ رہی ہو اور میری طرف سے کچھ کہے جانے کے ڈر سے خوف زدہ ہو۔ جیسے میری طرف سے پوچھے جانے والے متوقع سوال کا جواب اس کے پاس نہ ہو۔ اس سے اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے دُکھ کی ریکھائیں کھنچ آئیں، لیکن پھر بھی اُس نے پورے یقین سے میری طرف دیکھا اور جھپٹ کر بولی: "یہ بنیان اُتارو۔ کتنا میلا ہوگیا ہے۔ ایسے ہی لٹکائے پھرتے ہو۔" یہ کہہ کر وہ مجھے کڑی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ "ذرا الماری سے ٹینوپال کی ڈبیہ لاکر دو، سب سے نیچے والے شیلف میں کنارے رکھی ہے"

اب اُسے یقین ہو چلا تھا کہ میں کچھ نہیں کہوں گا اور اُسے پیتل کی اس شور مچاتی بالٹی کو استعمال کرنے کے لیے کوئی صفائی دینے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ پھر بھی اس کی آنکھیں جیسے مجھے وارننگ دے رہی تھیں کہ وہ پہلے سے جانتی ہے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں اور اس کے باوجود وہ اپنی جگہ کافی مضبوط ہے۔ وہ جانتی ہے کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اب مجھے اس کے بیچ میں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس نے میرا بنیان کھینچ مجھ سے لے کر اسی بالٹی میں ڈالا اور مجھے نظر انداز کیے ہوئے اس بالٹی کے اندر جھانکتی رہی۔ اس وقت میرے جی میں آیا کہ میں اس سے کہوں کہ سامنے برآمدے میں رکھی ہوئی واشنگ مشین کس لیے ہے؟ لیکن یکایک جیسے کسی انجانی وجہ سے میں ایسا نہیں کہہ پایا۔

میں اس کی یہ حرکت دیکھ ہی رہا تھا کہ مجھے اس کو دیکھتے دیکھتے ایسا لگا کہ وہ بالٹی جس میں وہ بڑے چاؤ سے کپڑے دھو رہی تھی' وہ بالٹی' بالٹی نہیں تھی بلکہ اس کے ہاتھوں کی چوڑی بن کر کھنکھنا رہی تھی۔ بالٹی کی آواز پورے مکان میں گونج کر صاف صاف سُنائی دے رہی تھی اور جیسے میں کافی دیر تک اسے ہی سنتا رہا۔

میں کمرے کے اندر گیا اور ٹینوپال کی ڈبیہ لاکر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ پھر میری نگاہ کونے میں پڑی ہوئی پلاسٹک کی بالٹی پر پڑی جو مجھے مُردہ سی لگی

وفیات

مشہور شاعر مشیر جھنجھانوی کا ۲۱ مارچ کو دل کا دورہ پڑنے سے دہلی میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۶۵ سال تھی، لیکن شعر ولب میں اب بھی تازہ کاری تھی۔ ان کا کلام اعلیٰ و معیاری جرائد و رسائل میں شائع ہوتا تھا۔ اب تک ان کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے، لیکن ادبی حلقے شاعرانہ مرتبہ کے اس حد تک معترف تھے کہ انہیں متعدد سپاسنامے پیش کیے گئے اور ایوارڈ بھی دیے گئے۔ مرحوم کے لواحقین میں اہلیہ کے علاوہ تین بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔

اردو کے ممتاز نقاد اور محقق ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین کا ۲۸ دسمبر ۱۹۸۹ء کو انتقال ہوگیا۔ ان کی ولادت ۵ جون ۲۹ء کو میرٹھ میں ہوئی تھی۔ وہ میرٹھ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر تھے۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں اردو اسالیب نثر' سیر المصنفین بعد یادداشت لسانیات' فن سوانح نگاری' ارباب نثر اردو خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

خدا مرحومین کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین (ادارہ)

یوسف ناظم



پیشہ بغیر جی نہ سکا...

کسبِ معاش کے لیے آدمی کو کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کرنا ہی پڑتا ہے۔ کچھ لوگوں کو جنہیں قدرت اندر ہی اندر اپنا متبنیٰ بنا لیتی ہے، کسی پیشے میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ پیشہ بغیر سماج کے معزز رکن بنے رہتے ہیں۔ یہ اُن کا موروثی حق ہوتا ہے۔ پیشہ جو بیسے دس صرف عوام کے لیے ضروری ہے۔ عوام بھی اب دو قسم کے ہونے لگے ہیں۔ ایک جنہیں عوام النّاس کہا جاتا ہے۔ کہنے کو یہ عوام النّاس رائے عامہ بناتے ہیں اور ان کا ایک مفادِ عامہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ ساری باتیں کذب و افترا کی تعریف میں آتی ہیں۔ ان کا کچھ ہوتا وتا نہیں ہے صرف یہ ہوتے ہیں اور وہ بھی اس لیے کہ ان کا وجود ان کے عدم وجود سے قدرے بہتر ہوتا ہے۔ دوسری قسم کے عوام غریب النّاس ہوتے ہیں۔ یہی ان کا نام بھی ہے اور ان کی صفت بھی۔ اس طبقے میں کوئی بچّہ دودھ پیتا بچّہ نہیں ہوتا۔ سب کے سب پانی پیتے بچّے ہوتے ہیں اور فوراً ہی اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بچپن ہی میں یہ کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن قدرت کی کرنی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ انہیں کوئی پیشہ راس نہیں آتا۔ یہ عمر بھر تجربہ کرتے رہتے ہیں اور ان کا ہر تجربہ پیچھے کی طرف ایک قدم ہوتا ہے۔ یہ طبقہ ہوتا بھی ذرا زیادہ وزنی ہے۔ ان کے بوجھ تلے زمین کے دب جانے کا ہمیشہ خطرہ رہتا ہے۔ زمین کو شاید اسی لیے اتنا سخت اور مضبوط بنایا گیا ہے۔ آسمان البتّہ مزے میں ہے۔ وہ فقط دیکھتا رہتا ہے کہ زمین پر کیا ہو رہا ہے۔ اُسے تو گھومنا بھی نہیں پڑتا۔ آسمان پر اگر اتنا بار ڈالا جاتا تو وہ کب کا اسی زمین پر سربسجود ہو جاتا اور بنات النعش گردوں کو دن کے اوقات میں بھی نہاں ہونے کی جگہ نہ ملتی۔ سارے ستارے فلمی ستارے ہو جاتے۔ لیکن جانے دیجیے۔ یہ نظامِ شمسی اور فلمی دنیا کا مسئلہ ہے۔

کہا جاتا ہے آج تک کسی فردِ واحد کو بھی اس کی مرضی کا پیشہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ صحیح آدمی صحیح جگہ ہو، یہ اب تک شاید ہی ہو سکا ہو۔ دنیا کے سارے کام اسی لیے ادھورے رہ جاتے ہیں۔ بہت پہلے کسی نے کہہ دیا تھا کارِ دنیا کسے تمام نکرد۔ یہ مقولہ اصل میں انتظامیہ اور عدلیہ کے بارے میں تھا، لیکن اب یہ ہر کسی پر صادق آتا ہے۔ دنیا کے سارے افراد مجرّد وال افراد ہیں۔ سب کی عادتیں ایک سی۔ سب کے اطوار ایک سے۔ فرشتے بھی اب اعمال نامہ لکھتے ہیں تو اس طرح جیسے راشن کارڈ لکھ رہے ہوں۔ اُنہیں صرف نام اور پتہ لکھنا پڑتا ہے۔ اعمال تو سب کے یکساں ہوتے ہیں۔ اسے ہی قومی کردار کہا جاتا ہے۔ کچھ پیشوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

معلّمی: تدریس کا پیشہ پہلے بہت آسان تھا۔ اب بہت مشکل ہے۔ تعداد میں طالبِ علم بکثرت ہو گئے ہیں لیکن وہ مدرسہ صرف اس لیے آتے ہیں کہ ملنے جلنے کی اس سے بہتر اور اس سے زیادہ فراخ جگہ اور کوئی نہیں ہوتی۔ کسی پارک یا میدان میں جاؤ تو کوئی نہ کوئی مالی یا چوکیدار آ کر اپنا حکم چلاتا ہے۔ مدرسے میں ایسی کوئی قباحت نہیں ہوتی۔ نہ کوئی ٹوکتا ہے نہ روکتا۔ اساتذہ تو گھبرائے گھبرائے پھرتے ہیں۔ اور اب تو لڑکیاں تک پیچھے سے دبے دبے آتی ہیں اور اُنہیں سانپ کہہ کر ڈرا دیتی ہیں۔ یہ جونیر کالج کا ذکر ہے۔ ڈگری کالج میں تو اساتذہ جا ہی نہیں سکتے۔ کچھ کالجوں میں تو صرف اس لیے اسٹرائیک ہوتی ہے کہ اساتذہ کالج میں نظر آ گئے تھے اور کچھ کالجوں میں اس لیے ہوتی ہے کہ آخر کالج میں کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی چاہیے۔

مدرسین کی دنیا بالکل الگ ہوتی ہے۔ اسے

۱۹۔ الہلال، ۱۳۔ باندرہ ریکلیمیشن، بمبئی ۴۰۰۰۵۰

ھی دنیا کا نام دیا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ حسابی نقطۂ نظر غلط ہوگا۔ کیوں کہ مدرسین کی دنیا تو سب سے پہلے قائم ہوئی تھی۔ یہ آسمانی پیشہ ہے، اسی لیے اس کا درجہ بہت بلند ہے۔ مدرسین نہایت بے ضرر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ سب کے سب اس طرح صاحبِ نصاب ہوتے ہیں کہ نصابی کتابوں کے علاوہ وہ کسی دوسری کتاب پر نظر ڈالنا بھی معیوب سمجھتے ہیں۔ اور نصابی کتابیں پڑھنے کی انہیں اس لیے ضرورت پیش نہیں آتی کہ وہ انہیں حفظ رہتی ہیں۔ ریاضی کا نصاب تو بدل ہی نہیں سکتا۔ شروع سے جو پہاڑے چلے آ رہے ہیں بس چلے آ رہے ہیں۔ سائنس کے فارمولے بھی خطبۂ نکاح کی طرح ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتا۔ طالب علم اسی لیے ریاضی اور سائنس کے مضامین میں بآسانی ناکام ہوتے ہیں۔ جن اسکولوں کے نتائج میں طلباء سو فی صد کامیاب ہوتے ہیں سمجھ لینا چاہیے امتحان ہال میں کوئی نگراں کار موجود نہیں تھا۔ اور اگر تھا تو خفتہ یا خفیہ تھا۔

عام مجمع میں مدرسین کو شناخت کر لینا مشکل نہیں ہے۔ ان کی آواز اونچی اور نظریں نیچی ہوتی ہیں۔ چہرے سے ہراسانی، بُشرے سے پریشانی اور حرکات و سکنات سے بیچارگی کا اظہار ہوتا ہے۔ (بیچارگی کا اظہار ہمہ دانی کے اظہار سے دولاکھ درجے بہتر ہوتا ہے۔) چونکہ اب مدرسوں کے اوقات الگ الگ ہونے لگے ہیں۔ اس لیے صبح اور دوپہر کے مدرسین کی صورت و شکل میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ ایک کو ان کے زکام سے اور دوسرے کو ان کی تکان سے پہچانا جا سکتا ہے۔ دوپہر میں ڈیوٹی پر آنے والے مدرسین اس لیے کم نہا کر آتے ہیں۔ تھکے ہوئے تو اس لیے ہوتے ہیں کہ گھر کا سارا کام نپٹائیں تو گھر سے باہر جانے کی اجازت ملے۔

مدرسین بھی ڈاکٹروں کی طرح خانگی پریکٹس کر سکتے ہیں۔ اُن کی خانگی پریکٹس ٹیوشن ہوتی ہے۔ گھر پر ٹیوشن کے لیے آنے والے بچے بہت مفید ہوا کرتے ہیں۔ مدرسین کو بازار نہیں جانا پڑتا۔

مدرسین کو قوم کا معمار مانا جاتا ہے۔ لیکن خود قوم کے کسی تعمیری کام میں مشغول ہونے کی ضمانت نہیں ہے۔ بہت کم مدرسین کو لہو و لعب میں مبتلا ہوتے دیکھا گیا ہے۔ ان میں ہمت کا فقدان ہوتا ہے۔ طلبا تو بہادری کا کوئی کام کر جاتے اور ایک تمغہ حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن کسی مدرس کو فضول وقت ضائع کرتے نہیں دیکھا گیا۔

طبابت: طبابت میں گھریلو نسخے بھی سالس ہیں اور علمِ طبابت یعنی میڈیکل سائنس کے ترقی یافتہ چونچلے بھی۔ یہ پیشہ ہے ہی چٹکلوں اور چونچلوں کا۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دادی ماں اور نانی ماں کے پڑھے ہوئے کچے اور کالے دھاگے میں بندھا دیکھا گیا ہے۔ درد کش (Pain killer) گولی نوش کرنے کے بجائے ہلدی چونے کے لیپ میں ملوث پایا گیا ہے۔ وید، حکیم، طبیب اور ڈاکٹر اس پیشے کو یہ سمجھ کر اختیار کرتے ہیں کہ یہ انسانی خدمت ہے۔ عوام بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں یہی اس پیشے کی کامیابی کا راز ہے۔ ڈاکٹر تو یہ توفیق ہو یا جہاں دیدہ صحت مند سے صحت مند شخص میں بھی کوئی نہ کوئی عارضہ تلاش کر لیتا ہے۔ خدا نخواستہ اگر ناکام رہتا ہے تو کسی اسپیشلسٹ کی مدد حاصل کرتا ہے اور جب یہ صحت مند شخص اسپیشلسٹ کے پاس پہنچتا ہے تو اس کے سارے رازہائے سربستہ طشت از بام ہو جاتے ہیں۔ فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ اس کے خون میں کون سے ذرات کم اور کون سے حد سے زیادہ ہیں۔ ایک ریڈیالوجسٹ اُسے یہ خوش خبری سناتا ہے کہ اس کے فربہ جسم میں ایک آنت پڑوس کی دوسری آنت پر چڑھائی کر رہی ہے اور عنقریب اپنی سرحد پار کرنے والی ہے۔ خون کے ذرّوں کی فراہمی اور مذکورہ آنت کی سرکوبی کا مشورہ دیا جاتا ہے اور یہ صحت مند شخص دوسرے دن کسی اسپتال میں نرسوں کے جھرمٹ میں پایا جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر اُسے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ بیمار ہونے میں بھی کچھ فائدے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ڈاکٹر صحت مند شخص کو تو مریض بنا سکتے ہیں، لیکن ایک مریض کو مریض ہی رہنے دیتے ہیں۔ مریضوں میں ایک ڈاکٹر سے قطع تعلق کر کے دوسرے ڈاکٹر کا حلقہ بگوش ہونے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ وہ اس تیزی سے ڈاکٹر بدلتے ہیں جس تیزی سے اہلِ سیاست اپنی جماعت بدلتے ہیں

طبابت کے پیشے میں بھی یونیفارم ہوا کرتا ہے۔ دواخانوں میں کام کرنے والے ڈاکٹروں کو کرکیٹ کے ایمپائروں کی طرح سفید کوٹ پہننا پڑتا ہے اور یہی کوٹ اُنہیں غلط فیصلوں کا عادی بناتا ہے۔ بس فرق یہ ہوتا ہے کہ کرکیٹ ایمپائر اُنگلی اُٹھاتا ہے اور یہ جواب دے دیتے ہیں آپریشن کرنے والے ڈاکٹروں کو آپریشن تھیئٹر میں ہرے رنگ کا لبادہ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اصل میں یہ ہری جھنڈی ہوتی ہے جو مریض کو دکھائی جاتی ہے۔ وہ کسی سمت میں بھی جا سکتا ہے۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ آپریشن روم کو تھیئٹر کیوں کہا جاتا ہے۔

کوئی ڈاکٹر اپنا علاج خود نہیں کرتا۔ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ جینٹلمین ڈاکٹر بالعموم لیڈی ڈاکٹر سے شادی کرنے کے خواہش مند ہوتے اور کرتے بھی ہیں۔ کیا تعجب ان دونوں کا بلڈ گروپ بھی ایک ہوتا ہے۔ طبابت میں بلڈ گروپ کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ معاشقہ ہو یا معاملہ بلڈ گروپ پیشِ نظر رہتا ہے۔ میاں بیوی دونوں ڈاکٹر ہوں اور ایک ہی مریض کا علاج کر رہے ہوں تو مریض اختلافِ رائے کی تاب زیادہ دن نہیں لا سکتا۔

طبابت کے پیشے میں ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ مریض ختم بھی ہو جائے تو طبابت جاری رہتی ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ مریض کہیں اپنی مرضی سے تو نہیں مرا اس کا پوسٹ مارٹم کیا جانا ضروری ہوتا ہے۔ اس عمل کے دوران اتفاق آرا سے اس کے جسم کا بیشتر سامان اِدھر اُدھر جاتا ہے۔ ایسا اکثر جگہوں پہ ہوتا ہے۔ ایئرپورٹ پر جب کسٹم آفیسر مسافروں کے اسباب کی جانچ پڑتال کرتے ہیں تو کچھ اشیا اپنے اہل و عیال کے استعمال کے لیے بھی منتخب کر لیتے ہیں۔ یہی پوسٹ مارٹم میں بھی ہوتا ہے۔ مریض کے سوگواروں کو بھی تکلیف نہیں ہوتی۔ مریض کا وزن کم ہو جاتا ہے۔

وکالت: ڈاکٹروں کے سفید کوٹ کے برعکس وکلا، صاحبان کو سیاہ لبادہ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ مطلع کتنا ہی صاف کیوں نہ ہو، عدالت کے احاطے میں سیاہ گھٹائیں چھائی رہتی ہیں۔ (انصاف کا سورج بڑی مشکل سے طلوع ہوتا ہے) ڈاکٹر آپس میں لڑتے نہیں ہیں جب کہ دو وکلا، کا مقدمے کی کارروائی کے دوران جج کے روبرو لڑنا ضروری ہے۔ یہ اپنی قانون دانی کے مقابلے میں زبان دانی کا زیادہ مظاہرہ کرتے ہیں۔ جج صاحبان کو بھی اسی میں لطف آتا ہے۔ قانونی نکات تو وہ سنتے ہی رہتے ہیں — یہ لطائف و ظرائف کہاں سننے کو ملتے ہیں۔ اور اگر ان دونوں میں سے ایک کا تعلق طبقۂ اناث سے ہوا تو یہ جنگ خانہ جنگی معلوم ہونے لگتی ہے۔ (تھیئٹر اصل میں اسے کہا جا سکتا ہے۔ آپریشن روم کیسے تھیئٹر ہو گیا) لڑائی کے منظر سے جب جج کا دل بھر جاتا ہے تو وہ آرڈر آرڈر کا حکم دیتا ہے اور اس طرح فوری طور پر لا اینڈ آرڈر کا قیام عمل میں آتا ہے۔ حاضرین بھی خوش ہوتے ہیں کہ کم سے کم کمرۂ عدالت میں لا اینڈ آرڈر دیکھنے کو ملا — آنکھیں ترس گئی تھیں۔ جج کے منع کرنے پر وکلا، صاحبان اس طرح جھک کر کورنش بجا لاتے ہیں جیسے وہ جاپان کے باشندے ہوں۔

ایک وکیل کو جرح کے فن پر عبور حاصل ہونا چاہیے۔ جرح اور انٹرویو میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ انٹرویو میں انٹرویو دینے والا شخص زیادہ سے زیادہ بولنا چاہتا ہے۔ بلکہ بعض شوقین حضرات تو بلا پوچھے بھی کچھ نہ کچھ بولتے رہتے ہیں۔ لیکن جرح کے موقع پر گواہ کو حتی الامکان اپنا مونہہ بند رکھنا پڑتا ہے اور وکیل کو اپنے الفاظ گواہ کے مونہہ میں ڈالنے پڑتے ہیں۔ بہت زور لگانا پڑتا ہے — یہ زورِ بیان ہوتا ہے۔ اس عمل کو گواہ توڑنا کہا جاتا ہے۔ اصلی گواہ ٹوٹ جاتے ہیں، لیکن معتبر گواہ نہیں ٹوٹتے۔ اسی لیے مقدمے کے فریقین کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کوئی معتبر گواہ ان کے ہاتھ آ جائے۔ عادی مجرموں کی طرح عادی گواہ بھی پائے جانے لگے ہیں۔ ایک وکیل کی قابلیت کا اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب وہ کسی عادی گواہ کو زیر کر سکے۔

کڑی سے کڑی جرح اور بڑی سے بڑی بحث یہی وہ دو شمشیریں ہیں، جو پیشہ وکالت میں وکیلوں کے کام آتی ہیں۔ جس طرح ایک سرجن کے لیے ہاتھ کی صفائی ضروری ہے۔ اسی طرح ایک وکیل کے لیے ذہن کی چالاکی ضروری ہے۔ وکیل کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ مجرم کو باعزت بری کروا دے۔ اور ایک بے گناہ کو اگر وہ شاعر ہے تو "زندان نامہ" لکھنے کا موقع فراہم کرے۔ وکالت بڑا ہوائی پیشہ ہے۔ یہ بادِ صبا بھی ہے اور بادِ صرصر بھی۔

سیاست:

بظاہر یہ کوئی پیشہ نہیں ہے ایک عمل ہے، لیکن درحقیقت یہ پیشہ ہی ہے اور یہ اُن لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو کسی دوسرے کام کے اہل نہیں ہوتے۔ پڑھے لکھے لوگ اس پیشے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ خواندہ اور نیم خواندہ لوگ بہت کامیاب ہوتے ہیں۔ کچھ صحافیوں کو اس پیشے میں ضرور کامیاب ہوتے دیکھا گیا ہے۔ لیکن بس سو گز کی دوڑ میں۔ لمبی دوڑ میں اُن کا دم پھول جاتا ہے۔ تجارت اور اس قسم کے دوسرے پیشوں میں نقصان کا اندیشہ رہتا ہے۔ سیاست ہی سب سے محفوظ پیشہ ہے۔ اس میں نقصان نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس پیشے میں سارا کمال ہتھیلی کا ہوتا ہے۔ اسی میں جنت دکھائی پڑتی ہے۔ مشہور یہ ہے کہ ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمائی جا سکتی۔ لیکن اس ہتھیلی میں یہ کام بھی ہو سکتا ہے۔ جس طرح پانچ اُنگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں اسی طرح ساری ہتھیلیاں ایک سی نہیں ہوتیں۔ عام آدمیوں کی ہتھیلیاں پیچھے سے بند ہوتی ہیں ان ہتھیلیوں میں اچھے خاصے مین ہول Man Hole بنے ہوتے ہیں۔ ان پر کوئی سرپوش بھی نہیں ہوتا

سیاست میں سفر، مدام سفر لازمی ہے اور یہ سفر بھی راستے اور ذرائع نقل و حمل بدل کر کیا جانا چاہیے۔ تجارت میں کوئی شناسا کام نہیں آتا۔ شناسی کام آتی ہے یعنی موقع شناسی۔

پیشے اور بھی ہیں جو سب آہ و فغاں کے کام آتے ہیں۔ اب تو صبر بھی پیشوں کی فہرست میں شمار ہونے لگا ہے۔ ●●

بنگلہ نظم

آگ چاہیے

بنگلہ شاعر : مُراری مکھوپادھیائے
اردو ترجمہ : معصوم شرفی

محبت میں چاند مت بنو
بن سکو تو سورج بن کر آؤ
میں اس سے جوشِ عمل لے کر
تاریک جنگل میں آگ لگا دوں گا

محبت میں ندی مت بنو
بن سکو تو سیلاب بن کر اُٹھو
میں انہی موجوں کی تندی سے
نراستا کے باندھ توڑ دوں گا

محبت میں پھول مت بنو
بن سکو تو سنگِ خارا بن کے آؤ
اس کی گھڑگھڑاہٹ کو سینے کے اندر لیے
میں لڑائی کی خبر ہر سمت پھیلا دوں گا

محبت میں پنچھی مت بنو
بن سکو تو طوفان بن کر آؤ
اس طاقت کے بل بوتے پر میں
گناہوں کے محل ڈھا دوں گا

چاند، ندی، پھول، ستاروں اور
پنچھیوں پر
پھر کبھی غور کریں گے
تاریکی میں آخری لڑائی ابھی باقی ہے!

* شاداب منزل ۲۳/۲ برئی پارہ پوسٹ : آر ایل بی لین
۲۴ پرگنہ (شمال) پن ۷۴۳۱۹۴

گجراتی دلت نظم میں

سرکس کا باگھ

نرسینہ پرمار۔
ترجمہ : جینت پرمار

میں گویا سرکس کا باگھ بن گیا ہوں!
لیکن سرکس کی یہ دنیا ——
کیا وہ میری دنیا ہے؟
ہر روز درشکوں کے منورنجن کی خاطر
رنگ ماسٹر کے اشارے اشارے پر
میں کھیل کرتا ہوں!
لیکن کبھی چیخ اُٹھتا ہوں تب ——
میں صرف درشکوں کو ہی نہیں
خود کو بھی بُرا لگتا ہوں
خیمے کی آزاد ہوا مجھے اُکساتی ہے
لیکن پنجرے کی سلاخیں
میری آنکھوں میں چُبھ جاتی ہیں
رنگ ماسٹر کی لکڑی کی مار تو.....
میرے لیے کسی بساط میں نہیں
لیکن لوگوں کی بھیڑ میں
نامرد کی طرح مار کھاتے رہنا
مجھ سے برداشت نہیں ہوتا
میں چیخ اُٹھتا ہوں:
میں سرکس کا باگھ نہیں
میں انسان ہوں.... میں انسان ہوں....
لیکن مجھے تو ——

وہ طمانچہ شعلہ بن کے بھڑک اُٹھتا ہے

جینت پرمار

چلچلاتی دھوپ میں
اسکول سے چھوٹتا
بغل میں بستہ دبا کر
سیدھا گھر کی طرف بھاگا
پیاس گلے میں کھٹک رہی تھی
رستے میں اِک پیڑ کے نیچے
پانی والی بڑھیا کو دیکھ
اُس کی طرف لپکا
اور بڑھیا کے سامنے
کھڑا رہ گیا
سوالیہ نشان کی طرح
اس نے میری ذات پوچھی
—— میں نے خشک آواز میں کہا:
"ڈھیڑ"
پانی کے جواب میں اُس نے
زور سے طمانچہ دے مارا
آج بھی جب اس پیڑ کے پاس سے گزرتا ہوں
تو بھوت کی طرح منو مجھے گھورنے لگتا ہے
اور میرے دائیں گال پر
وہ طمانچہ شعلہ بن کے بھڑک اُٹھتا ہے!

منو : منوسمرتی کا خالق

نظم — پروین گڑھوی

ٹھہرو!
نیوٹران بم کی کھوج کا
ابھی انت نہیں ہوا
ہم ایک ایسا بم بنائیں گے
کہ جس سے
انسان کا بدن رہے گا ویسا ہی
صرف قتل ہوگی اُس کی آتما ——
جو مہابھارت کے اٹھارہویں دن بھی
قتل نہیں ہوئی تھی!

ایک نظم — منگل راٹھوڑ

جن کا نہ ہو کوئی ثبوت
نہ ہو جن کا کوئی علاج....
دانت بھینچ کر
انہیں سہن کر رہا ہوں
زندگی بھر
اس سر پٹختی شام میں ——
میری داڑھ میں دکھتی ہیں ابھی تک
وہ ساری ناانصافیاں
جن کا نہ ہو کوئی ثبوت
نہ ہو جن کا کوئی علاج

نئی کتابیں

حرفِ وفا
وفا ملک پوری
مکتبۂ صبحِ نو، کاشانۂ وفا، پیہ رنیہ سٹی،
(بہار) ۸۵۴۳۰۲
صفحات : ۱۱۲ قیمت : ۲۵ روپے

۲۔ تعارف
طلعت عرفانی
موڈرن پبلشنگ ہاؤس،
۹ گولہ مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
صفحات : ۱۱۲ ۔ قیمت : ۴۰ روپے

۳۔ الکلام
طاہر تلہری
طاہر تلہری تلہر (ضلع شاہ جہاں پور، یوپی)
صفحات: ۱۵۲ قیمت : ۸ روپے ۵۰ پیسے

۴۔ اوراقِ گل
جوہر بجنوری
چندر پرکاش جوہر بجنوری
۶۔ ریوا بلڈنگ • لیڈر روڈ، الہ آباد ۳
صفحات : ۴۴۴
قیمت : ۲۰ روپے

۵۔ مطلعِ حیات
احسن رضوی دانا پوری
ایڈ شاٹ پبلی کیشنز، بمبئی
صفحات : ۲۳۲ ۔ قیمت : ۴۵ روپے

۶۔ پرواز
رشیدہ قاضی
موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، دہلی
صفحات: ۱۱۲ ۔ قیمت : ۴۰ روپے

۷۔ نشاطِ خاطر
حسین عظیم آبادی
دائرۂ اردو "الامن" محلہ کھتور لوکھر
پٹنہ ۸۰۰۰۰۴
صفحات ۱۴۸ قیمت ۱۲ روپے

۸۔ آگ اور پھول
عاصی سعید
عاصی سعید، قصبہ و ڈاک خانہ عمری کلاں
ضلع مرادآباد (یوپی) ۲۴۴۵۰۱
صفحات : ۱۳۶ قیمت ۹ روپے

۹۔ نام کتاب : متاعِ آخرِ شب
شاعر : محسن زیدی
قیمت : چالیس روپے
ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ، اردو بازار، جامع مسجد
دہلی ۱۱۰۰۰۶

وفا ملک پوری صاحب تقریباً ۴۰ سال سے مشقِ سخن کر رہے ہیں، لیکن "حرفِ وفا" آپ کا پہلا مجموعہ ہے جو صرف ۸۰ غزلوں پر مشتمل ہے۔ لہٰذا یہ حرفِ وفا ہے اور حرفِ معتبر بھی۔ کہا جاتا ہے کہ غالب کے کلام کی نہایت بے دردی سے قطع و برید ہوئی۔ جبھی جو بچ گیا وہ تیر و نشتر ہے۔ وفا صاحب کی دو بیاضیں رہزنوں نے لوٹ لیں۔ لیکن ان کا بچا کھچا کلام بھی اس پائے کا ہے کہ ڈاکٹر عبدالمغنی ان کی ایک غزل کے بارے میں لکھتے ہیں :

"عصرِ حاضر میں ایسی نفیس اردو غزل کم یاب ہے۔"

اسی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کیوں تیرگیٔ وقت خفا ہم سے ہوئی ہے
اک شمع جلانے کی خطا ہم سے ہوئی ہے

یہ سچ ہے کہ ہم سوختہ دل سوختہ جاں ہیں
لیکن تری محفل میں ضیا ہم سے ہوئی ہے

دو گام بھی ہم ساتھ ترے چل نہیں پاتے
اے مصلحتِ وقت خطا ہم سے ہوئی ہے

سب مانگ لیا تجھ سے مگر تجھ کو نہ مانگا
حق یہ ہے کہ توہینِ دعا ہم سے ہوئی ہے

وفا کے کلام کے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں :

"وفا ملک پوری خود کو کائنات میں محزون و تنہا دیکھتے ہیں لیکن وہ شکست یاب نہیں

کیوں کہ ان کی تعقلانہ سنجیدگی میں طنز کا خفیف سا رنگ ہے۔ (وہ) اپنے مزاج کے اعتبار سے اور اپنی فنی پختگی کے اعتبار سے بھی جلال و نسیم سے نزدیک تر نظر آتے ہیں"۔

یہ امر بحث طلب ہے کہ کیا وفا کے کلام میں حزن و یاس اور احساسِ تنہائی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اندھیرے کا ذکر اُن کے کلام میں بار بار آتا ہے۔ لیکن، اُن کے یہاں اندھیرے کا یہ ذکر یاسیت یا محزونیت پر مبنی نہیں (فیض نے بھی تو "یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر" کا ذکر کیا ہے) بلکہ حالاتِ حاضرہ پر ایک حقیقت پسندانہ ردِ عمل ہے فیض کی طرح وفا کو بھی اپنی دھرتی سے پیار ہے اور اگر آزادی کی سحر سے شاعر کے خواب پورے نہیں ہوتے اور اس کے ہم وطنوں کا مستقبل روشن نہیں ہوا تو اسے یہ کہنے کا حق حاصل ہے :

سورج کی روشنی جو ملی بھی تو کیا ملی
سورج کی روشنی سے اندھیرا سوا ملا

لیکن وفا میں یہ حوصلہ بھی ہے :

دیکھی گئی نہ مجھ سے جو تاریکیٔ چمن
گھبرا کے میں نے اپنا نشیمن جلا دیا

وفا کی شاعری کے ایک پہلو پر ابھی ناقدین نے کم توجہ دی ہے وہ ہے ان کی حب الوطنی جو ان کے کلام میں ایک موجِ تہہ نشین کی طرح جاری و ساری ہے :

یہ میرا نشیمن بھی کام آئے تو آ جائے
لیکن مرے گلشن کو آباد خدا رکھنا

ہے اس کی تہہ میں مرے خون کے چند قطرے بھی
بہت عزیز ہے گلشن کی خاک بھی مجھ کو

اور علاقائی تعصبات کے بارے میں اُن کا قول ہے:

گلشنِ ہند کا ہر ذرّہ وطن ہے اپنا
کم نظر ہیں جو بہاری، دکنی کرتے ہیں

ساتھ ہی ساتھ ان کی حقیقت پسندی یہ بھی کہلاتی ہے :

نہ سائبان نہ آنگن نہ چھت نہ روشن دان
اور اس پہ سب سے لڑائی کہ گھر یہ میرا ہے

دراصل وفا کی حقیقت پسندی ایک لطیف مزاح اور خود پر ہنسنے کی صلاحیت کی بھی عکاس ہے۔

بڑھا ہوا ہے زمانے میں کاروبار کا قد
کہ اپنے قد سے بھی کچھ اور گھٹ گیا ہوں میں

وفا ملک پوری جیسے کہنہ مشق، حساس اور حالاتِ حاضرہ کا ادراک رکھنے والے شاعر کا قد کبھی نہیں گھٹ سکتا۔

طلعت عرفانی (تلک راج وششٹ)

پاکستان میں پیدا ہوئے، ہریانہ میں آن بسے۔ اور ریلوے میں ملازمت کرتے ہیں۔ تقسیمِ ہند اور ہجرت کے زخم نے ان کے دل میں جو گداز پیدا کیا اس کا اظہار شاعری کے ذریعے ہوا۔ وہ ایک فطری شاعر ہیں اور غزل کی جگہ نظم کے واسطے سے اپنی ذات اور تجربات کی نئے اور چونکا دینے والے لہجے میں ترجمانی کرتے ہیں۔ ملک کی تقسیم سے پیدا شدہ نفرت اور تعصب کے بھوت کا تصور اُنہیں اب بھی ہراساں کر رہا ہے :

کون ہے یہ ؟
اور اگر یہ وہ نہیں تو وہ کہاں ہے ؟
جس جگہ ہم بیٹھ کر
اپنے حصارِ ذات میں اُلجھے ہوئے ہیں،
یہ کوئی گنبد ہے، روزن ہے،
کہ روشن آسماں ہے ؟
یا فقط خواہش زدہ مٹی کا
اک خالی مکاں ہے ؟
یا کہیں ایسا نہ ہو وہ آ چکا ہو ؟
اور ہمیں اپنی طلسمی تیغ سے
تقسیم کر کے جا چکا ہو
(کلکی اوتار)

یہی بھوت "نقشِ فریادی" میں ان کو ستاتا ہے، جہاں وہ موجودہ تعصب اور نفرت کی شکلوں میں وہی ۱۹۴۷ والے عفریت کا ہیولا دیکھتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا اندازِ بیان خطابت سے پُر ہے، لیکن یہ خطابت لفظی الٹ پھیر پر نہیں بلکہ بھرپور حسیت اور قوی جذبۂ شعری پر مبنی ہے۔ طلعت کے محرکات میں نفرت سے نفرت کے ساتھ ساتھ امن سے محبت بھی شامل ہے۔ اس کی ترجمانی میں اس نے لکھنؤ، کبوتر اور شاہین کے استعارے بڑے تخلیقی انداز میں استعمال کیے ہیں۔ اس کے یہاں امن پسند لکھنؤ سارا ہندوستان ہے، کبوتر عوام ہیں اور شاہین استعمار کا استعارہ ہے، لیکن طلعت دوہرے استعارے استعمال کرتا ہوا کبوتر کو امن کی علامت بنا لیتا ہے:

کوئی علاقہ ہو، شہر ہو، ملک یا جزیرہ،
ہمارا پیغام تو سدا
امن و آشتی کا تھا.....
حدوں کا جس طرح کا تعین بھی
لوگ چاہیں،
ہم ان حدوں کی خلاف ورزی
کسی بھی صورت نہیں کریں گے
تمہارے بچوں کی خیریت کی
دعائیں اپنے پروں پہ لکھ کر،
تمام سمتوں میں آج تک ہم
اُڑا کیے ہیں، اُڑا کریں گے
(کبوتروں کی عرضداشت)

دنیا چونکا دینے والا لہجہ اگر نظم میں طلعت عرفانی کے پاس ہے تو غزل میں طاہر ظہری کے پاس۔ ملاحظہ ہو ان کے مجموعے "الکلام" میں ان کے کلام کا ایک رُخ :

اندیشوں کی یہ رات گزرتی بھی نہیں ہے
اور پاس کوئی نیند کی گولی بھی نہیں ہے
اس شے کو لیے پھرتے ہیں بازار میں ہم لوگ
جس شے کا طلبگار کباڑی بھی نہیں ہے

کرتی ہے شب و روز کتابوں کے لیے ضد
بچّی ابھی اسکول میں پڑھتی بھی نہیں ہے

کچھ ایسا لگتا ہے جیسے یہ درد و کرب کی رات
رُکی رُکی سی ہو بگڑی ہوئی گھڑی کی طرح

ان اشعار میں شاعری کو زندگی کے قریب لانے کی ایک شعوری کوشش دکھائی دیتی ہے، جو مستحسن بھی ہے اور براہِ راست دل میں اُتر جانے والی بھی۔

لیکن طاہر کے پاس دوسرا لہجہ بھی ہے' زیادہ تہہ دار، معنی خیز اور عالمگیر:

سورج کی طرح اپنے ہی محور میں قید ہوں
صدیوں سے روشنی کے سمندر میں قید ہوں

آزر کا فن ہے جس کو خدا کہہ رہے ہیں لوگ
پتھر تو بے قصور ہیں پتھر میں کچھ نہیں

سائل صدا لگائے بغیر آگے بڑھ گیا
شاید وہ جانتا تھا مرے گھر میں کچھ نہیں

کچھ ایسے بدحواس ہوئے آندھیوں سے لوگ
جو پیڑ کھوکھلے تھے اُنہیں سے لپٹ گئے

صدا لگاتا ہے ہر در پہ دیر سے سورج
اب اس فقیر کی جھولی کو بھر دیا جائے

بھٹک نہ جائے کہیں رات کے گھنے بن میں
غریب چاند کو اک راہبر دیا جائے

مُٹھی میں بند ہے مری غیرت کی داستاں
دنیا سمجھ رہی ہے کہ کچھ پا گیا ہوں میں

ہمیں طاہر کے اس قول سے اتفاق ہے:
کب تک نظر انداز کرے گی مجھے دنیا
گزری ہوئی تاریخ کا اخبار نہیں ہوں

وہ یقیناً مستقبل کے نقیب ہیں اور ان کی شاعری ہر لحاظ سے خیر مقدم کی مستحق ہے۔

"اوراقِ گُل" کے خالق چندر پرکاش جوہر بجنوری ایک کہنہ مشق اور مستند شاعر ہیں۔ جو روایتی اندازِ بیان میں بھی اپنے جوہرِ ذاتی سے ایک نیا رنگ بھر دیتے ہیں۔ اگر سوچ نئی ہو اور طبیعت حساس تو پرانے اندازِ بیان میں بھی نیاپن آجاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

کیوں نہ ہم بدل ڈالیں کہنہ اصطلاحوں کو
کیوں نہ آج قاتل کو چارہ گر کہا جائے

وہ چمن ہو یا صحرا دونوں ایک جیسے ہیں
اک عجیب الجھن ہے کس کو گھر کہا جائے

یوں دل کی وادیوں سے گزرتی ہے اس کی یاد
جیسے اترتی دھوپ کا منظر دکھائی دے

مجھے ڈر ہے چھین نہ جائے مری بے کسی کی عظمت
کہیں آپ کا تصور مجھے دے نہ دے سہارا

میں انتظار ہی میں رہا اور زندگی
چُپ چاپ میرے پاس سے ہو کر گزر گئی

نہ جانے عشق کی منزل بھی کیسی منزل ہے
تمام عمر چلے پھر بھی فاصلے ہیں بہت

ایسے بھی مسافر ہیں خود جن کے لیے صدیوں
راہیں بھی ترستی ہیں منزل بھی ترستی ہے

جوہر بجنوری خود اپنی شاعری کے بارے میں رقم طراز ہیں: "نظریاتی طور پر میں ادب برائے زندگی یا شعر برائے زندگی کا قایل ہوں۔ قدیم اور جدید کی بحث سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ مشاہدہ مطالعہ اور ذاتی تجربات کی روشنی میں عصری مسائل کا حل تلاش کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں — غزل میں کھردری زبان کا استعمال مجھے اس لیے ناپسند ہے کہ میں اُسے غیر معیاری تصور کرتا ہوں۔ زبان و بیان کی صحت پر خصوصی نظر رکھتے ہوئے میں نے ہمیشہ فن کا احترام کیا ہے۔ مجھے اس سلسلے میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے وہ اہلِ نظر جانیں۔"

احسن رضوی داناپوری مرحوم بھی زبان و بیان اور فن کے کامل شاعر تھے۔ آرزو لکھنوی کی شاگردی نے انہیں فنّی طور پر مزید مستند بنا دیا تھا۔ "مطلعِ حیات" اُن کے مراثی کا مجموعہ ہے جو اُن کی موت کے بعد شائع ہوا ہے۔ یوں تو وہ فلموں کے مکالمہ نویس کے طور پر زیادہ مشہور ہوئے لیکن اُن کا اصل میدان شاعری تھا۔ وہ پٹنہ کے سیّدوں کے ایک چشتی نظامی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ خاندانی حالات کی بنا پر گھر سے بھاگ کر کلکتہ پہنچے۔ وہاں سے رنگون پھر لاہور ہوتے ہوئے جب ممبئی پہنچے تو فلمی دنیا سے منسلک ہو چکے تھے۔ "مطلعِ حیات" کے دیباچے میں محمود سروش لکھتے ہیں۔ "احسن کے مرثیے اگرچہ فنّی روایات کی پوری پابندی کے مظہر ہیں۔ مگر موضوعی طور پر روایتی نہیں ہیں۔ ان میں تفصیلی واقعہ نگاری نہیں بلکہ اشاراتی بیان ہے۔ ان میں بین نہ سہی مگر غم کی دہکتی ہوئی آگ کی تپش ضرور ہے۔ ان میں سراپا نگاری نہیں ہوتی مگر کردار نگاری یقیناً ہے۔"

بے ثباتیِ دنیا احسن کا خاص موضوع ہے۔ ملاحظہ ہو:

اے ساکنانِ انجمنِ زیست ہوشیار
اس چاندنی سے فیض نہ پاؤ گے زینہار

گھاٹے میں چل رہے ہیں زمانے کے کاروبار
بازارِ زندگی میں اجل کا ہے اقتدار

لاکھوں برس جیے کوئی حاصل تو موت ہے
کب تک چلے گی ناؤ کہ ساحل تو موت ہے

دنیا بنی تھی جن کے لیے وہ کہاں رہے
دو چار دن رہے بھی تو دامن کشاں رہے

ایسے رہے کہ جیسے کوئی میہماں رہے
کیا گھر ہے یہ مکیں نہ رہے اور مکاں رہے

خاک اُڑ کے کہہ رہی ہے کہ عبرت کی جا ہے یہ
سایہ سرک رہا ہے کہ مہماں سرا ہے یہ

آج کل انشائیے کی صنف ہند و پاک دونوں ملکوں میں مقبول ہو رہی ہے۔ اس کا ایک ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ اس وقت راقم کے سامنے تین مجموعے انشائیوں کے رکھے ہیں جو اپنے اپنے رنگ میں منفرد ہیں۔

رشیدہ قاضی کا مجموعہ "پرواز" حسن صوری اور حسن معنوی دونوں کا حامل ہے۔ یوسف ناظم کا پیش لفظ گویا سونے پر سہاگہ ہے۔ رشیدہ قاضی کے یہاں پطرس کا رنگ جھلکتا ہے تو کہیں رشید احمد صدیقی کا، لیکن بیشتر خود ان کی انفرادیت چھائی رہتی ہے۔ "گائے" کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:

"ہندوستانی معاشرے پر گائے کی چھاپ بڑی گہری ہے..... دُور کیوں جائیے ہمارے پڑوسی رامو کاکا کی مثال سامنے ہے۔ بیٹی کے بیاہ کی بات پکی کر رہے تھے میں نے ڈرتے ڈرتے کہا: "ذرا اُس سے بھی پُوچھ لیجیے۔" فرمایا: "وہ بے زبان کیا کہے گی۔ لڑکی ذات گائے برابر۔" پارسال جب لالہ جی کی بی اے پاس نواسی نے اپنی شادی کے موقع پر نتھ پہننے سے انکار کر دیا تو رامو کاکا بھڑک اُٹھے۔ غصہ کی وجہ پوچھی تو یوں گویا ہوئے۔

"گائے کی ناک میں رسی ڈال کر ہی تو مالک اُسے اپنے گھر لے آتا ہے۔ نتھ کے بغیر ناتھ کیسا؟"

اب دوسرا رنگ دیکھیے:

"تسلیم و رضا گئو ماتا کا شیوہ ——— وہ نہ کُتے کی طرح بھونکتی ہے نہ گھوڑے کی طرح دولتی جھاڑتی ہے نہ شیر کی طرح غراتی ہے نہ ہاتھی کی طرح چنگھاڑتی ہے۔ مگر یہ ایسی پاکیزگیٔ کردار فسادات کے زیرِ عنوان جتنی خوں ریزی ہوتی ہے وہ اکثر و بیشتر اسی غریب کے نام پر..... استحصال گائے کے مقدس نام کا ہوتا ہے اور خون نسلِ انسانی کا۔"

"کُتے میں سے بھونک کا عنصر نکال دیا جائے تو باقی کیا رہ جاتا ہے؟"

"مسلمانوں سے حکومت چھن گئی تو قاضیوں کی کرسی بھی جاتی رہی۔ خالی خولی لقب بچ رہا۔ ان دنوں تو یہ عالم ہے کہ قاضی کا نام زبان پر آتے ہی ذہن میں نکاح پڑھانے والے قاضی اُبھرتے ہیں۔ وہ قاضی جو فریقین کا انصاف نہیں کرتے صرف اُنہیں زوجیت کی ڈوری سے باندھ دیتے ہیں اور اس بھری پُری دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ انصاف کرنے کو چھوڑ دیتے ہیں..... ماضی میں دولت مند قاضی شاذ ہی دیکھنے میں آتے تھے آج ڈھونڈنے پہ بھی کوئی کنگال نہیں ملے گا..... نکاح پڑھانے والے قاضیوں کا حال جتنا تابناک ہے مستقبل اتنا ہی تاریک۔ آپ نے وہ کہاوت ضرور سُنی ہوگی میاں بیوی راضی تو کیا کرے قاضی۔ دیکھنا یہی کہاوت آگے چل کر وہ دھماکا بپا کرے گی کہ سارے قاضی بھک سے اُڑ جائیں گے اور محبت کرنے والے جوڑے بے باکانہ کہتے پھریں گے

باقی نہیں قاضی کی ضرورت تہہ افلاک

رشیدہ قاضی کی ظرافت ایک پہاڑی چشمے کی طرح رواں دواں ہے۔ اس میں تصنع ہے نہ آورد۔ البتہ سنجیدگی کی ایک زیریں لہر نظر آتی ہے اور کہیں کہیں حزن کا عنصر بھی جھلکتا ہے جو سچے مزاح کی ایک پہچان ہے۔ یہ خصوصیت شیکسپئر کے جوکر میں خاص طور پر پائی جاتی ہے۔

حسین عظیم آبادی کے انشائیوں کا نام "نشاطِ خاطر" ہے۔ وہ نہ صرف پرانے انشائیہ نگار ہیں بلکہ "صنفِ انشائیہ اور انشائیے" کے مصنف بھی۔ ان کے مداحوں میں کلیم الدین احمد، رشید احمد صدیقی اور احتشام حسین جیسی محتشم ہستیاں شامل ہیں۔ اسلوب کا اندازہ حسب ذیل نثر پارے سے ہو سکتا ہے:

"رسم عقیقہ اور رسم ختنہ کی طرح جشنِ اجرا کی حیثیت بھی ثقافتی ہوتی ہے کہ ایک سہتا ہے، دوسرے حظ اُٹھاتے ہیں۔ یعنی ہماری چیز ہم سے ہی لُٹائی جاتی ہے۔ یہ پہلو بلاشبہ اس رسم کی ایک تلخ حقیقت ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ سہنے والا طفلِ معصوم نہیں۔ عمر کی سہ پہر سے گزرتا ہوا ایک باحیا اور عزت دار انسان ہوتا ہے۔ سچ بتائیے یہ قدر و منزلت باعثِ شماتت نہیں کہ بھرے مجمع میں اپنی متاعِ حیات کو غیر کے ہاتھ سے کوئی آپ قبول کرے؟"

"آگ اور پھول" عاصی سعید کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے ان کا ایک مجموعہ "چٹخارے" شائع ہو چکا ہے۔ اس کی تعریف ڈاکٹر وزیر آغا فکر تونسوی، یوسف ناظم اور احمد جمال پاشا جیسے مستند ادیبوں اور پیشہ ور رقیبوں نے کی تھی۔ "آگ اور پھول" کا مسودہ ایک کاتب نے ۹ مہینے تک اپنے پاس رکھ لیا اور کتابت کر کے نہ دی۔ شاید اُنہیں موصوف کا مزاح زیادہ پسند آ گیا۔ مصنف نے اس کا بدلہ قاریوں سے یوں لیا کہ کتاب کو اپنے خط میں پیلے مسطر پر لکھ کر لیتھو کے ذریعے چھپوا دیا۔

اب پڑھنے والوں کو سچ مچ کی دیدہ ریزی کرنا پڑے گی۔ بہر حال اُن کی نثر کے جواہر پاروں کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

"لاعلمی میں علم سے زیادہ افادیت ہے۔ زیادہ عافیت ہے۔ اس طور لاعلمی ایک نعمت ہے نعمتِ غیر مترقبہ لاعلمی ہی کی نیند کے خوابوں نے مذاہب کو جنم دیا۔ مذاہب نے حق و ناحق، حرام و حلال، جائز و ناجائز کی اقدار قائم کیں۔ انہیں مذاہب سے دنیا کی ریل چل رہی ہے۔ ہنوز پٹری سے نہیں اتری۔"

(مہدی عباس حسینی)

شہرِ دل (اوّلین شعری مجموعہ: ۱۹۶۱ء) سے رشتۂ کلام (دوسرا مجموعۂ کلام: ۱۹۷۸ء) اور اس کے بعد متاعِ آخرِ شب (تازہ ترین شعری پیش کش: ۱۹۹۰ء) تک کا شعری سفر تقریباً تین دہائیوں پر مشتمل ہے۔ یوں تو اپنے تخلیقی سفر کے آغاز ہی سے محسن زیدی کے شاعرانہ جوہر اپنی آب و تاب دکھانے لگے تھے نیز ان کے فکر و نظر کی راہیں متعین ہونے لگی تھیں۔ یہ حقیقت بھی آشکار ہونے لگی تھی کہ وہ خطِ مستقیم کے شاعر نہیں ہیں۔ محسن زیدی اپنے تینوں مجموعہ ہائے کلام میں ایک ایسے فن کار کے روپ میں نمایاں ہوئے ہیں جو کسی مخصوص و محدود نظریۂ شعر و ادب کا پابند ہوئے بغیر ہی کشتِ سخن کی آبیاری کرتا ہے۔ محسن زیدی کے تخلیقی سفر میں صرف اور صرف ان کا ضمیر ان کی رہ نمائی کرتا ہے۔ ثبوت میں "متاعِ آخرِ شب" سے بعض اشعار کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں:

مرے قلم نے نہ باطل کا تذکرا لکھا
مآل کچھ بھی ہوا حرفِ حق سدا لکھا

عزت کی بھیک اس درِ ذلت سے مانگئے
میرا تو کیا سوال ہے میری بلا نہ جائے

محسن زیدی کا طائرِ تخئیل خارج سے داخل کی سمت محوِ پرواز ہوتا ہے۔ اُن کے اکثر غزلیہ اشعار اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ ان کا تخلیق کار اپنے گرد و پیش سے کسی لحہ بھی غافل نہیں رہا ہے۔ غالباً اسی سبب ان کی غزلوں میں عہدِ حاضر کی پیچ در پیچ سماجی زندگی اور اس کی پیدا کردہ المناکیوں کا تذکرہ سماجی حقیقت نگاری کی سطح پر فن کارانہ مہارت کے ساتھ ہوا ہے۔

ایسا نہیں کہ اور ستمگر نہ آئیں گے
لیکن تمہارے قد کے برابر نہ آئیں گے

کیا یہ لہو کا دور مرے سر پہ ختم ہے
کیا دوسروں کے سر پہ یہ خنجر نہ آئیں گے

باغ سارا تو بیاباں نہ ہوا تھا سو ہوا
جو خزاں کا کبھی احساں نہ ہوا تھا سو ہوا

دیکھتے دیکھتے آپہنچا سروں تک پانی
اب تک اندازۂ طوفاں نہ ہوا تھا سو ہوا

دوستوں میں جو تعلق تھا وہ باقی نہ رہا
دشمنوں میں کوئی پیماں نہ ہوا تھا سو ہوا

وہ موت کا منظر تھا جو دن رات وہی ہے
منھ سے نہ کہو صورتِ حالات وہی ہے

کچھ اتنے ہو گئے بیزار اپنے حال سے لوگ
کہ اپنے حال پہ اب سوچتا بھی کوئی نہیں
ظلم دیکھیے کہ گھروں میں لگی ہے آگ
اور حکم ہے مکین نکل کر نہ گھر سے آئیں

محسن زیدی فکری سطح پر جدید طرزِ سخن کے شاعر ہیں، لیکن ان کا اسلوبِ سخن ترقی پسند شاعری سے زیادہ قریب ہے۔ اس کے باوصف اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کسی مخصوص نظریہ یا تحریک سے خود کو سختی سے وابستہ نہیں ہونے دیتے۔ وہ اپنے فن کارانہ شعور کو مشعلِ ہدایت بنائے ہیں۔ وہ ہم عصر شعراء سے متاثر ضرور ہیں، لیکن کسی کی تقلید نہیں کرتے۔ اُن کے کلام کا منفرد بانکپن شاعروں کے انبوہ میں بھی اُن کی شناخت علیحدہ بناتا ہے۔ مثال میں "متاعِ آخرِ شب" کے یہ اشعار:

مرے سخن نے مجھے روشناس سب سے کیا
وگرنہ چہرے سے پہچانتا بھی کوئی نہیں

مجھے محسن اس کا گلہ نہیں مجھے مال و زر جو ملا نہیں
جو ہُنر سخن کا مجھے ملا وہ کہاں سبھی کو عطا ہوا

"متاعِ آخرِ شب" میں جن تاثرات، تجربات اور مشاہدات کو شاعرانہ پیکر عطا کیا گیا ہے۔ وہ موجودہ عہد کی پُر پیچ سماجی زندگی کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ اپنے مختلف النوع شعری تجربات کو شاعر نے تخلیقی بصیرت کے ساتھ خوب صورتی سے پیش کیا ہے:

کون اس تیغِ ستم گر سے بچا
جو بچا اپنے مقدر سے بچا

صاف انکار ہی بہتر ہے کہ میں
زحمتِ عرضِ مکرر سے بچا

میں بالمشافہ نہیں جانتا کسی کو یہاں
کہ مجھ سے میرا تعارف بھی غائبانہ ہوا

خواہشِ تخت و تاج اور ہے کچھ
لیکن اپنا مزاج اور ہے کچھ

ہمارے روز و شب پہلے بسر ایسے نہ ہوتے تھے
ہم اپنے حالِ دل سے بے خبر ایسے نہ ہوتے تھے

(جعفر عسکری)

اُردو کا مقبولِ عام مصوّر ماہ نامہ

آجکل

نئی دہلی

مہمان مُدیر: راج نرائن رازؔ

سب ایڈیٹر: خورشید اکرم

جلد: ۴۸ - شمارہ: ۱۰

مئی ۱۹۹۰ء بیساکھ جیٹھ شک سمت ۱۹۱۲

قیمت: دو روپے فون: ۳۸۷۰۶۹

سرورق: آر۔ کے۔ ٹنڈن — تصویر سرورق: آنچل
تصویر پُشت: جوگندر چاولہ

اندرونِ ملک زرِ سالانہ: ۲۰ روپے
دو سال کے لیے: ۳۶ روپے
تین سال کے لیے: ۴۸ روپے

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر "آج کل" (اردو)
پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

بزنس منیجر: جسونت سنگھ
پروڈکشن آفیسر: آر۔ ایس۔ منچال
اسسٹنٹ بزنس منیجر: شکنتلا

ترسیلِ زر کا پتہ:
بزنس منیجر
پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترتیب

ملاحظات

لیلا بین دتانیہ اور اس کا کُنبہ نسلوں سے احمد آباد کے مانک چوک بازار میں سبزیاں فروخت کرتا آیا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں لیلابین نے خود روزگار چلانے والی خواتین کی ایسوسی ایشن سیوا SEWA میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس وقت سے وہ اس بے قاعدہ پھیلنے والے اور لگاتار ابھرتا نظر آنے والے تجارتی مرکز میں چھوٹی چھوٹی گلیوں میں سودا فروخت کرنے والے افراد کو جو میونسپل حکام سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے رہے ہیں۔ اپنے اعتماد میں لے کر ان کو منظم کرنے کا کام کر رہی ہیں۔

۱۹۸۴ء میں خود روزگار چلانے والی خواتین کی ایسوسی ایشن (سیوا) کے تنظیمی طریقوں میں ایک بالکل نئی جہت کا اضافہ عمل میں آیا۔ اس ایسوسی ایشن کی جنرل سکریٹری ایلا بھٹ نے ایک ویڈیو تعلیمی پروگرام سے تحریک پاکر جو انہوں نے اپنے مالی کے دورے کے دوران دیکھا تھا۔ احمد آباد میں بھی ایسا ہی تجربہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

سب سے پہلے لیلابین اور ایسوسی ایشن کے دیگر ۱۹ اراکین نے ایک سہ روزہ ویڈیو تربیتی ورکشاپ میں حصہ لیا۔ شرکت کرنے والوں کی ایک تہائی تعداد لیلابین کی طرح ناخواندہ تھی۔ دیگر عورتوں میں ایک تہائی تعداد ہائی اسکول سے کم پڑھی لکھی تھی۔ ان میں ہر عمر کی خواتین، ہندو مسلم خواتین کاریگر، سامان بیچنے والیاں اور بڑھئی کے پیشے سے متعلق خواتین نیز روزگار چلانے والی خواتین کی ایسوسی ایشن کی رہنما خواتین بھی شامل تھیں۔

لیلابین نے بتایا کہ میں یہ نہیں جانتی تھی کہ ویڈیو کیا ہے۔ میرے گھر میں تو بجلی تک نہ تھی پھر بھی میں نے آلات کو چلانا سیکھا ہے۔ ساتھ ہی ری پلے کرنا بھی سیکھا اور آخر کار میں پورا ویڈیو پروگرام بنانے لگی۔ ورکشاپ کے اختتام پر جس میں شرکاء نے اپنے سے متعلق امور پر اپنے پروگرام تیار کیے اور خواتین نے ویڈیو سیوا VIDEO SEWA نام کی ایک کوآپریٹو سوسائٹی قائم کی۔ ہفتہ وار میٹنگوں کا انعقاد اور تجدیدی کورسوں کا اہتمام کیا گیا۔ پیداوار سے متعلق تکنیکوں پر عبور حاصل کرنے کے لیے محض تین ہفتوں کا ورکشاپ کافی نہ تھا اور حقیقت یہ ہے کہ خواتین نے اپنی مستقل کل وقتی ملازمتوں پر کام کرنا جاری رکھا۔ ویڈیو ٹریننگ اور ریکارڈنگ کرنے کی پریکٹس (مشق) بھی اس طریق عمل کا ایک حصہ تھا۔ ویڈیو سیوا کے ممبران کے درمیان آہستہ آہستہ ایک ٹیم کی طرح یک جان ہو کر کام کرنے کا جذبہ، نظم وضبط و اعتماد پیدا ہوتا گیا۔

ابتدائی ویڈیو ورکشاپ کے کئی ماہ بعد خواتین کو اپنی نو حاصل شدہ مہارت کو کام میں لانے کا ایک اہم موقع ہاتھ آیا۔ عدالتی ہدایات پر احمد آباد کی میونسپلٹی نے مانک چوک بازار کے فٹ پاتھ کے دُکان داروں سے مارکیٹ میں جگہ حاصل کرنے کے حق کے بارے میں گفت و شنید شروع کر دی۔

فٹ پاتھ کے دُکان داروں کے نمائندگان کو اطلاع دینے کے لیے ایک میٹنگ منعقد ہوئی۔ اور ویڈیو سیوا کے تین ممبران نے اس میٹنگ کی کارروائی کو ٹیپ کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیلابین نے آوازیں ٹیپ کرنے کا کام اچھی طرح انجام دیا۔ دُکان دار ویڈیو کے عملے سے مطمئن تھے۔ لہٰذا اس کام سے میٹنگ میں کوئی رخنہ اندازی نہیں ہوئی۔

طویل بحث ومباحثہ کے بعد انہوں نے متعلقہ امور اور شرائط کی ایک فہرست مرتب کی۔ اس گرماگرم بحث و مباحثے کی ویڈیو فلم تیار کی گئی۔ اس میں الفاظ اور خواتین کے چہرے اپنی زندگیوں کے بارے میں فیصلے خود دے رہے تھے۔

میٹنگ کی کارروائی کو ٹیپ کرنے کے بعد ایلا بھٹ نے خود اپنے آپ سے سوال کیا کہ "اگر میونسپل حکام اس میٹنگ میں موجود ہوتے تو کیا وہ ان خواتین کے مسائل سے اتنے ہی بیگانہ رہتے؟" انہوں نے میونسپل کمشنر کو غیر رسمی طور پر اس ٹیپ کو دیکھنے کے لیے مدعو کیا۔ جب انہوں نے خواتین کے مشتعل چہرے دیکھے، ان کے چہروں پر پولیس کے خوف کے احساسات اور ان کے اتحاد کی جھلک اور میونسپلٹی پر عدم اعتماد دیکھا تو بہت متاثر ہوئے۔

ویڈیو پر ان کے مسائل سننے کا مطلب
ھا کہ وہ اپنے جذبات نہ چھپا سکے ۔ وہ اس
ت بذاتِ خود انسان تھے ۔ میونسپل کمشنر نہیں
۔ وہ خواتین براہِ راست ان سے اس انداز
ں ہرگز ایسی گفتگو نہ کر پاتیں جیسا کہ اُنہوں
ویڈیو ٹیپ کے سامنے کر لیں اور وہ بھی
ں خواتین کی بات اس انداز سے کبھی نہ سن
تے ۔

یہ ٹیپ چھوٹے دُکان داروں اور
سپلٹی کے درمیان معاملات طے کروانے میں نہایت
ثابت ہوا ۔ حکام کو مسائل سے آگہی ہوئی اور
معنوں میں تعمیری گفت و شنید شروع ہو گئی ۔
ابین اور ویڈیو سیوا کے اراکین کو اس تجربے
ویڈیو کی اہمیت واضح ہو گئی ۔

لیلا بین ۱۹۸۵ء میں کُل وقتی پروڈیوسر
گئی تھیں ۔ اُنہوں نے ویڈیو سیوا کے ٹیپ
ن کرنے کے لیے مدراس میں تمام "سیوا" امدادِ
ں اداروں کی تیار کردہ اشیاء کے لیے منعقدہ
نمائش میں ایک حصّہ لیا ۔ اس وقت
میں بلاک پرنٹر ، نیکر ، رضائیاں وغیرہ بنانے
لے اور کمہار اور چھوٹا چھوٹا کام کرنے والے
ں شامل تھے ، انہیں یاد ہے کہ بہت سے
ب پروگرام دیکھنے اور کام سیکھنے آئے تھے ۔
ان تک کہ ٹیلی ویژن سے بھی کچھ افراد آئے
ے اور اُنہیں اس بات کا یقین نہیں آیا تھا
یں نے ٹیپ تیار کیے ہیں ۔ وہ پوچھتے تھے کہ بھلا
سبزی بیچنے والی ایسے ویڈیو ٹیپ تیار کر سکتی
ہے ؟

یہاں تک کہ جب میں نے انہیں اپنے
یتی ورک شاپ کے بارے میں اور ان ٹیپوں
یار نے میں بتایا جو ہم نے تیار کیے تھے تو بھی
یں پورا یقین نہیں ہوا ۔ لہٰذا میں نے اُنہیں
ناعت سے بتایا کہ میں کس طرح ۱۴ کو ۱۴ پن
ل اور ٹی ۔ ایس ۔ سی کیبل سے منسلک کر سکتی

ہوں اور کس طرح وھائٹ بیلنس اور آڈیو لیول
کو سیٹ کرنا ہوتا ہے ، یہاں تک کہ وہ مطمئن
ہو گئے ۔

ناخواندگی لیلا بین اور "سیوا" کے دیگر
اراکین کے لیے ایک رُکاوٹ بن کر سامنے آتی
ہے ۔ مثال کے طور پر "ویڈیو سیوا" نے ایک نیا
ڈیک خریدا جو ان کے دیگر ساز و سامان بنانے
والے کے علاوہ کسی اور نے بنایا تھا ۔ اس نئے
پلے بیک یونٹ کے کام کرنے کا عمل "سیوا"
کے دیگر ساز و سامان جیسا ہی ہے ۔ تاہم اس
کی ساخت اور رنگ مختلف ہیں ۔ اس نے "ویڈیو
سیوا" کے ناخواندہ اراکین کے لیے خاصی مشکلات
پیدا کر دی تھیں ۔

خوش قسمتی سے ایک حل نکل آیا ۔ ویڈیو سیوا
کے تمام اراکین نے جو ویڈیو پر انگریزی الفاظ و اعداد
نہیں پڑھ سکتے تھے ویڈیو فرہنگ کے پڑھنے کی
تربیت حاصل کی ۔ اُنہوں نے "اجیکٹ" کا "ریوائنڈ"
"آن" وغیرہ الفاظ پڑھنا سیکھ لیے ۔ روز مرّہ
کا کام چلانے کے لیے لکھنا پڑھنا سیکھا اور بیس
کے قریب الفاظ مغربی ہندسے اچھی طرح یاد کیے ۔
اور نتیجے کے طور پر لیلا بین نے مدراس میں "ویڈیو
سیوا" کی نمائندگی کی اور کسی خوف و خطر کے بغیر
اجنبی آلات سے کام لیا ۔

لیلا بین نے ایک منتظم اور ایک پروڈیوسر
کی حیثیت سے اپنی صلاحیت اور کام کرنے کی مہارت
کو یک جا استعمال کر کے ایک امتیاز حاصل
کیا ہے ۔ اُنہوں نے اودھکی ان خواتین کے
متعلق بھی ایک ٹیپ تیار کرنے کا فیصلہ کیا
جنہیں خشک سالی کے باعث احمد آباد ہجرت
کرنا پڑا تھا ۔ یہ خواتین دریا کی تہہ سے ریت
کھود کر اور گدھوں پر لاد کر تعمیرات کے مقاموں
تک پہنچا کر اپنی روٹی روزی کماتی تھیں ۔

اس ٹیپ کو تیار کرنے کے لیے پہلے
لیلا بین نے ان خواتین کا اعتماد حاصل کیا اور

اس کے بعد ان کے مسائل سے آگاہی حاصل کی ۔ ان کے
ذریعے ٹیپ کی تیاری "سیوا" اور ادھر
خواتین کے مابین رابطہ پیدا کرنے کا ایک آلہ
ثابت ہوا ۔ ایک مرتبہ جب ٹیپ تیار کرنے کا کام
مکمل ہو گیا ۔ وہ "سیوا" واپس آئیں تاکہ اپنے
ٹیپ کو اسکرین پر دیکھ سکیں ۔ ٹیپ تیار کرنے کے
کام میں شرکت اور ٹیلی ویژن کے ذریعے تربیت دیے
گئے اپنے مسائل کو دیکھ کر اُنہیں ایک نیا پس منظر
نظر آیا اور منظم ہونے کے ان کے فیصلے میں یہ اہم
کڑی ثابت ہوئی ۔

دھیرے دھیرے کئی سال گزر گئے اور
ویڈیو سیوا کی سرگرمیوں اور کام کو جاری رکھنے
کا ویڈیو ایک لازمی حصّہ بن گیا ہے ۔ تجربے نے
میڈیم کا موثر استعمال سکھا دیا ۔ وہ ان
ٹیپوں کا استعمال نئے تجارتی گروپ منظم کرنے ، موجودہ
ممبران اور موجودہ تجارتی گروپ کے نئے
ممبران کو تحریک دینے ، آگے بڑھنے اور مضبوط
کرنے کے لیے کرتے ہیں ۔ ان پروگراموں کے
ذریعے "سیوا" اسٹاف ممبران کو مختلف
موضوعات مثلاً کس طرح نمک اور پانی کا
ملنے والا محلول تیار کیا جاتا ہے ، کیسے بغیر
دھوئیں کے چولہے بنتے ہیں اور کس طرح
بچت اور قرض کی سہولیات کا استعمال کیا جا سکتا
ہے ، پر تعلیم دی جاتی ہے اور اطلاعات فراہم
کی جاتی ہیں ۔ خود روزگاری خواتین کے مسائل
کو پیش کرتے ہیں اور پالیسی وضع کرنے والوں
پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔

ویڈیو سیوا کے اراکین اس وقت گروپ
رہنماؤں اور سہولیات بہم پہنچانے والوں کا کردار
ادا کرتے ہیں ۔ جب ان کے پروگراموں کو استعمال
کیا جاتا ہے ۔ لیکن کاروباری ٹیپوں کے برعکس
یہاں پروڈیوسر اور ناظرین کے مابین کوئی
دوری نہیں ہے ۔ "سیوا" نے خواتین کے مختلف
گروپوں کو اپنے ویڈیو ٹیپ دکھا کر (بقیہ صفحہ ۴۲ پر)

سید محمد عقیل رضوی

"آگ کا دریا"

کے ایک حصے کا تاریخی اور تہذیبی مطالعہ

لکھنؤ کے رومی دروازے میں پہر دن چڑھے نوبت بجنے والی تھی۔ بیل گاڑیاں اور شکرم میں چرخ چوں کرتی دیہات کی طرف سے شہر کے ناکوں میں داخل ہو رہی تھیں۔ ان بیل گاڑیوں پر ترکاریاں اور پھل لدے تھے۔ اور مسافر سوار تھے۔ چوک اور نخاس میں چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ امرا کے محلات کے پائیں باغ صاف کیے جا رہے تھے۔ ملازمین باسی پھولوں کے گلدستے اور گجرے سمیٹ رہے تھے۔ مہریاں خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ سڑکوں کے کنارے ساقنوں اور تنبولیوں اپنی اپنی دکانوں کی آرائش شروع کر دی تھی۔ لوگ آتے تھے۔ دو گھڑی ہنس بول کر زردہ کھا کر یا حقے کے دو کش لگا کر اپنے اپنے کام میں مصروف آگے بڑھ جاتے تھے۔ میدان میں نجیبوں کی پلٹنیں قواعد کر رہی تھیں۔ تلنگے جھلنگے حبشی، راجپوت، عہدے دار محلاتِ شاہی کے پہرے پر مستعد کھڑے تھے۔ رمنا کے جنگلوں میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ گومتی کے کنارے کشتیاں بندھی کھڑی تھیں۔ ساحلِ دریا پر بنی کوٹھیوں کا عکس شفاف پانی میں جھلملا رہا تھا۔ ساون کے اودے بادلوں اور آس پاس کے سبزے کی وجہ سے گومتی بھی سبزہ رنگ ہو رہی تھی۔ حیات بخش ٹیڑھی کوٹھی، کنکر والی کوٹھی، سنگھاڑے والی کوٹھی، خورشید منزل سب جگہوں پر بادل جھک آئے تھے، باغوں میں ٹیکا لگ گیا تھا۔ کنجوں میں جھولے پڑ گئے تھے۔ لکھنؤ ساون منانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

پھر دوپہر کی نوبت بجی۔ طعام خانوں کی رونق دوبالا ہوئی۔ بھٹیارنیں مصروف ہوئیں۔ دیوان خانوں میں دسترخوان بچھے

بیگمات نے خس کی ٹٹیوں کے پیچھے چوسر کی بساط بچھائیں۔ مہریاں ا
خواصیں پان دان کھول کر بیٹھیں۔ لڑکیاں بالیاں چُنریاں رنگنے
مصروف ہوئیں ...... سہ پہر کی نوبت بجی۔ دن ڈھلنا شروع ہ
..... چڑیا جھیل پر بادل جھک آئے تھے۔ موتی محل پر بارش کی
ہلکی بوندیں برس گئیں۔

چوتھا پہر آیا۔ سورج ڈوبنے لگا۔ ہواؤں میں خوشبوئیں
آئیں۔ شام اودھ اپنی پوری آب و تاب سے بزم آرا ہوئی۔ سار
شہر کو رنگا رنگ خوشبوؤں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چھڑکاؤ کی ہ
مٹی کی سوندھی خوشبو، گندھیوں کی دکانوں کی مہک، قنوج کے
جون پور کے گلابوں کی خوشبو، مندروں میں سے اٹھتے ہوئے عود کی
بادشاہ کے محل میں بہتی ہوئی عطر کی نہر کی خوشبو۔ پھر گلی کوچوں
کھڑکیاں اور دروازے کھلے۔ لوگ گلیوں اور سڑکوں پر آ گئے۔
کوچوں سے نغموں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں۔ خوش شکل اور
لباس کنجڑنیں، تیز طرار تنبولنیں، حسین اور حاضر جواب بھٹیارنیں
اور لاونیاں گاتی پھرتی تھیں۔ گلی کے لڑکے بیت بازی کرتے جاتے
گوئیاں کھیلتے جاتے تھے۔ غریبوں اور امیروں کے مکانوں سے س
جل ترنگ اور تان پورے کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ندی کنا
بیٹھے ہوئے جوگی ترئی بجاتے تھے۔ نئی بیاہی لڑکیاں اپنے اپنے گ
میں بیٹھی سڑک کی اور دیکھتی تھیں کہ ساون منانے کے لیے اُن کا
میکے سے ڈولی کب بھیجے گا ...... ہر شخص مسرور تھا۔
لوگو! خوش ہو لو کہ دنیا فانی ہے۔ جانے کتنے دن کا جینا
نصیبوں میں لکھا ہے۔ آپس میں ہنس بول لو۔ غنیمت جانو کہ یہاں

● صدر شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد (یو پی)

ہم جنس مل بیٹھے ہیں۔ کل کیا جانے کہ کیا ہو۔ کریچ نگاڑا سائنس کا باحبت ہے دن رَین۔ باقی صرف خدا رہے گا[1]"

ناول کا یہ ٹکڑا ایک جذباتی ڈھنگ سے لکھی ہوئی نثر ہے جس پر اودھ کی تاریخی جھلکیاں اُسے اصلیت سے قریب لے جاتی ہیں۔ اگرچہ بہت واضح طور پر پتہ نہیں چلتا کہ یہ نقشہ کس نواب کے دَور کے لکھنؤ کا ہے۔ کیونکہ اس میں شجاع الدولہ، بہو بیگم اور بینی بہادر کے نام بھی آتے ہیں (جو فیض آباد کے لیے زیادہ مناسب ہیں۔ لکھنؤ تو اس وقت محض ایک قصبہ تھا۔ شاید اسی لیے کہیں کہیں گھاگھرا اور فیض آباد کا نام بھی درمیان میں آجاتا ہے) مگر مجموعی طور پر یہ آصف الدولہ یا اُن کے بعد ہی کا لکھنؤ ہے۔ رومی دروازے پر نوبت بجتی ہے۔ پورے شہر کی ماحول کی خوش باشی، جشنِ غم کی فضا، خوشبوؤں کی لپٹ، دُکانوں کی جھک، خوش شکل اور خوش لباس کنجڑنیں، تیز طرار تنبولنیں، حسین اور حاضر جواب بھٹیارنیاں، سب آصف الدولہ کے لکھنؤ کا بھی ماحول پیش کرتی ہیں اور غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے لکھنؤ کا بھی (وہی جو فسانۂ عجائب میں ہے۔) ("ذرا ٹھہرو۔ آصف الدولہ۔ یہ کس کا نام لیا کہ دل کے سارے تار جھنجھنا اُٹھے۔ وہی آصف الدولہ جس کا نام لے کر ہندو دُکان دار اپنی دُکانیں کھولتے ہیں۔ جس کو نہ دے مولا اُس کو دے آصف الدولہ") لیکن جب کوٹھیوں کے نام لیے جاتے ہیں تو حیات بخش، خورشید منزل، ٹیڑھی کوٹھی (شہزادہ سلیمان شکوہ کی کوٹھی) سب پر بادل جھک آتے ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ناول میں آصف الدولہ کے لکھنؤ کی تصویر نہیں ہے بلکہ بعد کی ہے۔ کیوں کہ یہ تمام عمارتیں سعادت علی خاں کے دَور میں بنی ہیں۔ پھر بہت آگے چل کر جب جذباتی اظہار ختم ہو جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نقشہ غازی الدین حیدر کے لکھنؤ کا ہے۔ یہ جذباتی اظہار، عبارت کے بہاؤ، اس کی کیفیات میں مزہ لینے اور اُن صورتوں کے ختم ہونے پر افسوس کرنے سے ظاہر ہوتا ہے۔

۱۔ یہ نام یہ صورتیں بڑی اہم ہیں۔ جب کوئی ان کا نام لیتا ہے تو دل پر چوٹ لگتی ہے۔ شجاع الدولہ، بہو بیگم، بینی بہادر، ٹکیت رائے۔

۲۔ "یہ لوگ جو، اِن سڑکوں پر چل رہے ہیں، گا رہے ہیں، غرض ہیں، انہوں نے جینے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے (یہ الگ بات ہے کہ یہ لوگ دُور اندیشی اور فکرِ فردا سے بے خبر ہیں۔ کیوں کہ ملکی سیاست کا جو پنجہ، ان کی گردنوں کو دبوچ رہا ہے، اس کی اُنہیں خبر نہیں۔ گویا یہ سب (Apicurian) ہیں) یہ لوگ باوقار، بالنفاست، باوضع اور پُر امن زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ جو، ان باغوں میں جمع ہیں، بڑے اہم لوگ ہیں کیوں کہ یہ ایک بڑی تہذیب کے نمائندے ہیں "

۳۔ حاضر جواب بھٹیارنیں ساون اور لاونیاں گاتی پھر رہی ہیں گلی کے لڑکے بیت بازی کرتے جاتے ہیں اور گولیاں کھیلتے ہیں۔ غریبوں اور امیروں کے مکانوں سے ستار اور جل ترنگ اور تان پورے کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں "

یہ ساری عبارتیں جذباتی ہیں اور دُھندلی بھی جو پڑھنے میں تو بہت اچھی لگتی ہیں مگر جن لوگوں کے موسموں کو سدا بہار اور زندگیوں کو 'جشنِ غم' کی زندگی دکھایا گیا ہے، اُن پر ناول نگار کا عدسہ رکھا ہوا ہے۔ اور مصنفہ کی نگاہ کا تاریخی اور سماجی کینوس بہت چھوٹا ہے۔ اس میں سے ایک طبقہ جسے لکھنوی تہذیب میں "اشراف" کہتے تھے، وہ بھی غائب ہے۔ پھر غریبوں کا معیار کیا تھا اور امیروں میں کیسی معاشی صورتوں کے لوگ شامل تھے۔ قرۃ العین کی عبارت اس کا لحاظ نہیں کرتی۔ "غریبوں اور امیروں کے مکانوں سے ستار اور جل ترنگ اور تان پورے کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں "۔ اس عبارت میں خاصی PALICY سے ہے ساری تہذیبی صورتیں، فی کس آمدنی، پر چلتی ہیں، مگر بدلتی ہوئی تہذیبوں میں تاریخ کی وراثت بھی کچھ دُور تک ساتھ چلتی ہے۔ اگرچہ معاشی بدحالی اُسے کھوکھلی اور مصنوعی بھی کرتی جاتی ہے۔ پورے اودھ پر تاریخ اور بدلتی ہوئی معاشیات کے باعث یہ افسردگی (DEPRESSION) کا دَور ہے۔ آصف الدولہ اپنے شہر میں تو "جس کو نہ دے مولا اُس کو دے آصف الدولہ" بنے ہوئے تھے۔ مگر اودھ کی مملکت سے مشرقی اودھ یعنی گورکھ پور اور اعظم گڑھ وغیرہ کا علاقہ انگریز ہڑپ کر چکے تھے اور شاہانِ اودھ سے قرض پر قرض لے کر صرف معاہدے کے کاغذات انہیں تھماتے جاتے تھے۔ مگر تہذیبوں کی اپنی پاسداری اور وجاہت کے طریقے بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ یورپ کی جاگیردارانہ تہذیب جب صنعتی انقلاب اور فرانسیسی انقلاب سے دوچار ہوئی تو بہت سے امرا، لارڈ اور بیرن مزید مضبوطی سے اپنی تہذیب کو گرفت میں لینے کی خاطر، سارے طریق کار اپنی مٹتی ہوئی تہذیب کی شدت سے اپنانے لگے۔ وہ اپنی صبح کی ابتدا خیرات

---

[1] "آگ کا دریا" مصنفہ قرۃ العین حیدر صفحہ ۲۲، مکتبہ جدید لاہور۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۵۹ء۔ اس ایڈیشن کے صفحہ ۲۲ سے صفحہ ۲۴۶ تک دیکھا جائے۔

(ALMS) سے کرتے اور خاتمہ رات کی عشائے آخر کی دعا سے اور اس طرح سمجھتے تھے کہ وہ اپنی قدیم تہذیب کو واپس لے آئیں گے۔ تاریخ کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ مگر کون نہیں جانتا کہ ۱۸۰۵ء میں اودھ برٹش انڈیا میں شامل کر لیا گیا تھا اور لکھنوی تہذیب جانکنی میں گرفتار تھی۔ اگر اس کے باوجود اودھ ایسا ہی تھا جیسا کہ قرۃ العین نے اس موقع پر پیش کیا ہے تو پھر "رام راج" اور کیا ہوگا۔ تاہم تاریخ کے خالص Bare Fects کا تقاضہ، ناول سے نہیں کیا جا سکتا کہ ناول تاریخ نہیں۔ ہاں تاریخ کے دباؤ سے جو سماجی اور معاشی تبدیلی آتی ہے اُسے ناول نگار کی پیش کش سے جھلکنا چاہیے۔ اگر ناول نگار وقت کا صحیح شعور رکھتا ہے تو اُسے بدلتے ہوئے سماج کی تنقید بھی کرنی چاہیے اور ان تبدیلیوں کے اسباب و علل پر تجزیاتی نظر بھی ڈالنی چاہیے۔ وکٹوریائی عہد میں جو انگلینڈ میں دولت کی فراوانی کی ظاہری چمک دمک ہے اس سے اس دور کے ناول نگاروں کی نظریں خیرہ نہیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ ڈکنس، جارج ایلیٹ، تھیکرے، سب سوسائٹی کو تنقیدی نظر سے بھی دیکھتے ہیں۔ دولت کی بے جا تقسیم اور اس دور کے امیر و غریب سب کی زندگی بسر کرنے، ان کے ساتھ انصاف اور ناانصافیوں، سب پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ دولت کی غلط تقسیم سے صرف چند کو فائدہ پہنچتا ہے اور صرف چند لوگوں کی بنائی ہوئی تہذیب کا اطلاق پورے ملک اور سماج پر کرنا صحیح تہذیبی مطالعہ نہیں ہے۔ قرۃ العین کی یہ عبارت اور اُن کا پیش کیا ہوا یہ ماحول نہ تمام اودھ کا ہے اور نہ پورے لکھنؤ کا۔ نواب نذیر کا اپنی ماں کو متعدد بار لوٹنا اور بنارس، اناؤ، گورکھپور وغیرہ انگریزوں کو واگزار کرنا نہ معاشی بلندی ہے اور نہ تہذیبی۔ پھر غریبوں کے گھروں سے اگر تان پورے اور جل ترنگ کی آوازیں اُٹھ رہی ہیں تو یہ صرف شہر کے کسی مخصوص حدود کی تہذیبی فضا ہو سکتی ہے۔ پورے لکھنؤ کے غریبوں کی نہیں اور اس کا دائرہ انہیں کوٹھیوں، رمنوں اور چوک کے گرد ہی ہو سکتا ہے جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ بہرحال یہ مطالعہ خواہ کتنا ہی دلپذیر کیوں نہ ہو مکمل طور سے حقیقت پر مبنی نہیں۔ قرۃ العین کی ان عبارتوں میں رونا دھونا، ہائے وائے، زیادہ ہے۔ سوشل تنقید اور حقیقت نگاری نہیں ہے۔ اگر غریب غربا بھی ہر وقت تان پورہ اور جل ترنگ بجایا کرتے ہیں تو پھر غریب کی اصطلاح کا اطلاق اُن پر نہیں ہوتا۔ یہ پوری عبارت فیوڈل لکھنؤ کی پیش کش ہے۔ عام سوسائٹی کی نہیں۔ اس میں مزدور پیشہ اور کچلے ہوئے طبقے کا کہیں پتہ نہیں یہ مادی آسائشیں اور انٹلکچول کلچر، سب کا مقسوم نہیں۔

مگر اس فیوڈل سوسائٹی کی پیش کش کی اوپری فضا بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ ولیم نائٹن، میجر برڈ، لیشپ ہیبر، چہار گلشن شجاعی، تاریخ فرح بخش، ذکر میر، مثنوی میر حسن سب سے اس اوپری فضا کی تائید ہوتی ہے۔ اسی لیے تاریخی اور سماجی حقیقتوں کو چھوڑ کر ناول کے اس بیانیہ کے سہارے اس ٹکڑے کو ایک اچھا ٹکڑا کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اس میں خاصی Over Doing ہے تاہم نثر کا بہاؤ خاصا شاندار ہے۔

یہ عبارت اپنے ظاہری اسلوب سے متاثر بھی کرتی ہے اور اس میں کہیں کہیں تخلیقی نثر کی شان پیدا ہو جاتی ہے جو Leboured نہیں بلکہ محسوسات کی زبان سے آئی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور اپنے اندر برجستگی کی بھی شان رکھتی ہے اور تاریخی ناول نگاری کی وہ لہر بھی جس میں حال کی ناآسودگی ماضیت میں پناہ کی ترغیب دیتی نظر آتی ہے۔ بہت پہلے شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے کسی مقالے میں لکھا تھا کہ "خراب نثر سے میری مراد قرۃ العین کی نثر ہے۔" لیکن یہ قرۃ العین کے ساتھ زیادتی ہے۔ مگر یہ بات صحیح ہے کہ نثر سے جن حقیقی توجیہات اور واقعات کی اُمید کی جاتی ہے وہ قرۃ العین کی نثر میں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں۔ مصنفہ کی اپنی پسند و ناپسند اور داخلی جذباتیت، اُن کی جذباتی زبان سب مصنفہ ہی کے نقطۂ نظر کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ اور جس نثر میں یہ کیفیت ہو وہ اچھی نثر نہیں ہو سکتی۔ ڈکنس بھی اپنے ناولوں میں اکثر اپنے نقاطِ نظر شامل کر کے حقیقتوں کو پس پشت ڈال دیتا تھا یا پھر ایسی چیزوں پر زور دیتا تھا جنہیں وہ بہتر سمجھتا تھا۔ کبھی وہ اُن اصلاح پسندوں کے ساتھ ہو جاتا، جو اُس دور کے انتہا پسند تھے۔ اور کبھی واقعات کو اپنے نقاطِ نظر اور مزعومات (WHIMS) کے مطابق توڑ مروڑ دیتا تھا۔ اس طرح تحریر میں خرابی یہ ہوتی ہے کہ کشمکش کا تو اندازہ ہو جاتا ہے مگر پرابلم کی صحیح تصویر سامنے نہیں آتی۔ اور وہ MIRROR OF SOCIETY والی بات ادھوری رہ جاتی ہے۔ مصنفہ کی خطابت اپنا نقطۂ نظر اور ذاتی فیصلے اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ قرۃ العین کی اوپر پیش کی ہوئی تصویر یہ ظاہر کرتی ہے کہ لکھنؤ کی تہذیب میں ہر وقت بس یہی کچھ ہوتا رہتا تھا۔ مصنفہ بذاتِ خود چونکہ موسیقی اور تہذیبی جلسوں کی شوقین ہیں اس لیے لکھنؤ کے ہر امیر غریب پر یہ فضا مسلط کر دیتی ہیں۔ اس میں لکھنؤ کی کراہتی ہوئی زندگی کی کوئی تصویر نہیں اور نہ ہی فرنگی محل اور خاندانِ دلدار علی غفراں مآب سے متاثر طبقہ با علم و حکمت کی ادبی اور تہذیبی فضا کی جھلکیاں کہیں نظر آتی ہیں، نہ مڈل کلاس اور اس کے نیچے کی زندگی کی تصویریں ہیں۔ نہ اودھ کے دیہات ہیں نہ نخاس کے چڑی مار، کہ یہ بھی لکھنؤ کی اسی نوابی تہذیب کا حصہ تھے۔ یہ تمام عبارت اُنہیں حقیقت نگاری سے دور لے جا کر

ایک رومانی اور VISIONARY بنا دیتی ہے۔ یہ ایک طرح کی RECREATION OF EMOTION سے COMFORT کی طرف لے جانے کی کوشش ہے ایسا Comfort جو کبھی ممکن نہیں ہو سکتا۔ انگریزی سازشوں سے جو سوسائٹی زیر و زبر ہو رہی تھی غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے زمانے میں جو لکھنؤ میں دھیرے دھیرے INDUSTRIALIZATION اور مشینی زندگی داخل ہو رہی تھی۔ چھاپہ خانوں کی ایجاد سے جو علمی ادبی دنیا میں تبدیلی آ رہی تھی، اُس کے اشارے اس ٹکڑے میں نہیں۔ کلکتہ سے برابر لوگوں کا رابطہ تھا، کلکتہ جو انگریزی تہذیب کا ہندوستان میں مستقر تھا، وہاں کی تبدیلیوں کا اودھ اور لکھنؤ پر کوئی تہذیبی اثر، ناول کے اس ٹکڑے میں پیش نہیں کیا گیا۔ اگرچہ دوسری جگہ کلکتہ سے لکھنؤ آنے والوں کے اشارے ہیں، مگر وہ تاریخی سفر ہیں۔ خرابی یہ ہے کہ قرۃ العین کی تصویر صرف ماضی میں زندہ رہنے کی تصویر ہے۔ لکھنؤ کے متعلق یہ ماضیت صرف اس حد تک جذباتی بنا دیتی ہے کہ وہ تاریخ کا راستہ بھی کبھی کبھی بھول جاتی ہیں۔ نوابی اودھ کی بنیاد بجائے محمد امین برہان الملک سعادت خاں کے صفدر جنگ سے رکھواتی ہیں اور اودھ کے گیارہ نوابوں کی بجائے صرف نو نوابوں سے اودھ پوری پر حکومت کراتی ہیں۔

"نواب صفدر جنگ سے لے کر سلطانِ عالم
(واجد علی شاہ) تک نو حکمرانوں نے اودھ پوری پر
راج کیا۔ سلطانِ عالم کے زمانے میں سلیمن صاحب آیا۔
صفدر جنگ نے اپنی طاقت کے بل پر اس سلطنت
کی بنیاد ڈالی تھی۔" ("آگ کا دریا" ص ۲۷۴ پہلا
ایڈیشن، مکتبہ جدید لاہور)

حضرت گنج میں تو گاتھک وضع کی عمارتوں میں کنول جل رہے ہیں لیکن بیر بجارا اور ٹھاکر گنج کے لوگ کیسی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ نہاں نئی صنعتی آگہی کیا تبدیلیاں لائی اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ چوک میں چمپا بائی کی سبز کوٹھی تو چمک رہی ہے مگر چوک کے ہزاری بزاری، چکن کاڑھنے والے، رنگریز، مٹی کے کھلونے بنانے والے' آرٹسٹ نہ سہی صنعت کار (ARTISAN) ہی سہی مگر وہ بھی لکھنوی تہذیب کو پروان چڑھانے میں اپنا اپنا رول ادا کر رہے ہیں۔ ان کی جھلکیوں کے بغیر صرف تان پورے اور "انت بھئی رُت بسنت میرو" یا چمپا بائی کی سبز کوٹھی، لکھنؤ کی مکمل تہذیب کو پیش نہیں کر سکتی۔ اس تصویر سے لکھنؤ کے بہت سے صنعتی اور تہذیبی محلے غائب ہیں۔ مصنف کی پیش کی ہوئی گلیوں میں یا تو سنڈے مونچھوں پہ تاؤ دیتے اکڑتے پھرتے ہیں یا چونے والیاں (چونہ پیزنیاں) اور قصباتی پتریاں چھن چھن کرتی، ڈولساں بنائے گھوم رہی ہیں۔ گویا چوک میں سوا رنڈیوں اور تماشبینوں کے اور کسی طرح کے انسان نہیں۔ شاید ان صورتوں پر زیادہ زور دینے کا سبب مصنف کے نزدیک لکھنؤ کی ایک مخصوص تہذیبی زندگی اور رنگینی و چہم کی زندگی ہی پیش کرنا تھی کہ آگے چل کر وہی ست یگ والا تصور یوں اُبھرتا ہے۔

"ہوا میں اشرفیاں اُچھالتے چلے جائیے کوئی نہ پوچھے گا
بہو بیٹیوں کی عزتیں محفوظ ہیں۔ ایک بیٹی سارے
محلے کی بیٹی سمجھی جاتی ہے۔ یہ ابوالمظفر معز الدین شاہِ
زمن غازی الدین حیدر کا دارالسلطنت ہے۔"

ناول کے لیے یہ سب بہت اچھا ہے۔ مگر اس دور کی سماجی تاریخ اس بیان کا ساتھ نہیں دے سکتی جن کی نظریں تاریخ اور اُس وقت کے لکھنؤ کی شہری زندگی پر ہیں وہ اس وقت عبارت پر سوالیہ نشان لگائیں گے کہ محل خانۂ شاہی غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے ہوا دار اُٹھانے والے پریوں کے جمگھٹ منی بیگم بنت النساء اللہ خاں انشاؔ، دھنیا کہارن، تاریخ پری خانہ، تاریخ اودھ مصنفہ 'نجم الغنی'، بہارِ عشق اور فریبِ عشق سب اُن کی نظر میں ہیں، جن کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسے مصنفہ کا صرف GRAND PASSION والا اسٹائل ہی سمجھنا چاہیے جس میں خواہشات، ماضیت اور خواب ناکی کا دبا دھائی ہے۔ مگر ان تمام صورتوں کو وقت کا دریا بہائے لیے جاتا ہے اور یہی افسوس کی بات ہے۔ سارے استعارے اور امیجز تباہی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور یہ سب کے سب FLOATING ہیں۔ منجمد نہیں جن سے نتیجہ یہ نکلتا ہے۔

"فنا، فنا۔ ہر شے فنا
وقت فنا میں شامل ہے
وقت کو مختلف حصوں میں قید کر لیا گیا ہے۔ مگر وہ پَل پَل
چھن چھن اس قید کو توڑتا ہوا چپ چاپ آگے نکلتا جاتا ہے۔
اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نَو، منزلِ آخر فنا
اب رومی دروازے پر مغرب کی نوبت بجے گی۔"

یعنی غروبِ عظمت اور Twilight of Lucknow وقت کی موت، اقتدار کی موت، تہذیب کی موت جو افسوس ناک ہے۔ نہ ہوتی تو کیسا اچھا ہوتا۔ لیکن اسے صرف اسٹائل کا بازیافتی مزاج Retrospective Tendency نہیں سمجھنا چاہیے جو

؟ ان معنوں میں Sense of the past جن کا اس تحریر میں ذکر ہے بلکہ دھیرے دھیرے اس سے محبت، لگاؤ اور "کیا اچھے زمانے تھے" کی پسندیدگی کو ستانے والی یاد بن جاتا ہے جو آہستہ آہستہ ایک طرح کا انتخاب اور امتیازانہ (ELECTICISM) بھی بنتا ہے جس میں اپنی تاریخ اور اپنے ٹریڈیشن تخلیق کار کو ڈھکاتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ نئی زندگی سے فرار کے منطقے میں داخل ہو جاتا ہے تاہم وقت اور تاریخ کا احساس اس ٹکڑے میں لمحاتی طور پر ہی سہی مگر بڑے خوب صورت طریقے سے جاگتا ہے۔ گوتم نیلمبر جب لکھنؤ کے رومی دروازے پر پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے:

"لکھنؤ کے رومی دروازے پر پہر دن چڑھے کی
نوبت بجنے والی تھی۔ بیل گاڑیاں اور شکرمیں
چرخ چوں کرتی دیہات کی طرف سے شہر کے ناکوں
میں داخل ہو رہی تھیں۔"

اس جملے سے لکھنؤ کی عظمت کا آفتاب طلوع ہوتا نظر آتا ہے۔ دن کی ابتدا عظمت کی ابتدا ہے۔ پھر دوپہر اور تیسرا پہر۔ لڑکیاں بالیاں چنریاں رنگنے میں مصروف ہیں۔ رمنا میں پلے ہوئے جانور جنگھاڑتے پھرتے ہیں۔ ہرن کلیلیں بھر رہے ہیں (چوکڑیاں بھر رہے ہیں)۔ چڑیا جھیل پر بادل جھک آئے ہیں۔ موتی جھیل پر بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں برس گئیں۔ وقت بھی بدل رہا ہے اور عظمت کی کیفیات کا بھی اندازہ ہو رہا ہے پھر چوتھا پہر شام کا بہترین منظر جس میں لکھنؤ کا شباب اپنے عروج کو پہنچتا ہے۔ مگر یہاں شام اپنی علامت چھوڑ دیتی ہے اور ایک عام مرقع اور سمع زندگی کے اظہار کے لیے صرف معمولات کا اظہار کرتی ہے۔ یہ حصہ اس ٹکڑے کا سب سے جان دار اور بولتا ہوا حصہ ہے کہ مصنفہ خود بھی اس میں ڈوب جاتی ہیں کہ انہیں یک بارگی تاریخ اور وقت کا احساس ہوتا ہے اور وقت کے بدلنے کا افسوس بھی (مگر وقت کا بدلنا تو ابدی ہے)۔ "لوگو خوش ہو لو کہ دنیا فانی ہے"۔ سے لے کر "لوگو مسرت بڑی چیز ہے دوسروں سے ان کی مسرت نہ چھیننا"۔ تک ناول نگار، ناول کے واقعات کی سطح چھوڑ کر اپنے احساسات کی دنیا میں واپس آجاتا ہے اور تاریخ سے وقت کی لائی ہوئی تبدیلیوں تک اس کا ذہن پھیل جاتا ہے۔ مگر غیر علامتی وقت اپنی سطح کو چھوڑ نہیں پاتا۔ اس کی تفصیل میں ایسا گم ہو جاتا ہے کہ اسے بھی اس ماضی میں لذت ملنے لگتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نیلامبر، سرل، کلکتہ، لکھنؤ، چمپا باجی، چوک، سب بہ قرۃ العین ایک لمحاتی کردار بن کر زندہ ہیں۔ مگر پریوں کے شہر کی طرح جگمگاتا لکھنؤ، بارونق آباد، بھرے پُرے باغ، کٹڑے، قلعہ، مچھی بھون ابھی جگمگاتے رہتے ہیں کہ اودھ کی شام آجاتی ہے۔ اودھ کی عظمت غروب ہو جاتی ہے:

"اب رومی دروازے میں مغرب کی نوبت بجے گی
چار پہر دن گزر چکا ہے، چار پہر رات گزر جائے
گی.... انسانوں کا جلوس اپنی اپنی قبروں میں
اتر رہا ہے۔ وقت موت ہے۔"

یہاں تک پہنچ کر مصنفہ کی ساری جذباتیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ساری EMOLLIENT LANGUAGE OF PASSION AND PATHOS ختم ہو جاتی ہے۔ اور ناول پھر تاریخ اور واقعات کی سطح کو گرفت میں لے کر چلنے لگتا ہے۔ اس ٹکڑے کا ظاہری لسانی اسلوب شگفتہ ہے۔ علامتیں، استعارے اور جملہ لوازم بہت واضح اور خوش آہنگ ہیں۔ واقعات کی پیش کش کے لیے جو خواب ناک اور رومانوی فضا بنائی گئی تھی، وہ پورے ماحول اور ضعف کے ساتھ قاری کو اپنے ساتھ لپیٹے رہتی ہے اور اسی لیے اس عبارت کی Pathetic Phallacy (Fallacy) خواجہ حسن نظامی اور راشد الخیری کی طرح لمحاتی نہیں بنتی اور نہ اختتام پر اس طرح کے جھٹکے قاری کو دیتی ہے۔ ہاں اس ناول "آگ کا دریا" کی ابتدا میں جو قرۃ العین نے وقت، ماضی اور استقبال کا تصور اور فلسفہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے حوالے سے قائم کیا تھا۔ شاید یہاں ان کے ذہن سے نکل جاتا ہے۔ ایلیٹ کے مصرعے جو قرۃ العین نے ترجمہ کرکے "آگ کا دریا" کی ابتدا میں لکھے ہیں اور جو گیتا کا چربہ ہیں، اس طرح ہیں: "آگے بڑھو مسافرو۔ ماضی سے بھاگ کر

....

کرم کے پھل کا خیال نہ کرو — آگے چلو
او مسافرو اور ملاحو!

....

کرشن نے ارجن سے میدانِ جنگ میں کہا
الوداع نہیں — بلکہ آگے بڑھو مسافرو۔"

قرۃ العین کی جذباتیت، اوپر کے اقتباس میں ایلیٹ کے وقت کے تصور اور اسپرٹ کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ یہاں تک کہ "مستقبل کا مدھم گیت" بھی اس اقتباس میں نہیں ابھرتا۔ قرۃ العین کا یہ پورا ناول کسی خوش آئند مستقبل کی نہ بشارت دیتا ہے اور نہ تمنا کرتا ہے۔ اگرچہ مستقبل خود بخود ترتیب پاتا جاتا ہے۔ "آگے بڑھو مسافرو" میں نئی زندگی اپنانے کا اشارہ البتہ ہو سکتا ہے۔ وہ جیسی بھی کچھ ہے، با دلِ ناخواستہ ہی سہی، بدلتی ہوئی تاریخ کی روا روی ہی سہی۔ شاید اسی لیے مصنفہ نے ایلیٹ کی نظم کے اس ٹکڑے کو "آگ کا دریا" کا سرنامہ بنا لیا ہے:

وقت جو تباہ کن ہے، قائم بھی رکھتا ہے
مستقبل ایک مدھم گیت ہے
آگے بڑھو مسافرو، ماضی سے بھاگ کر

●●

علی احمد فاطمی

تاریخی ناول

احسن فاروقی نے اپنی کتاب "ناول کیا ہے" میں لکھا ہے:
"تاریخی ناول شاید ناول کی نمایاں ترین قسم ہے"۔ تاریخ کی سچی تصویر پیش کرنے کا ناول سے زیادہ مؤثر ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے تاریخ نے ادب کی تمام اصنافِ سخن میں ناول کی خصوصیات کا احترام کرتے ہوئے نہایت گرم جوشی سے اُسے گلے لگایا، کیونکہ ناول کی مقبولیت و مقصدیت کو دیکھتے ہوئے مورخین کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ تاریخ کو جتنی کامیابی تاریخی ناول کے ذریعے مل سکے گی کسی اور صنف کے ذریعے نہیں۔ ہندی کے مشہور ادیب اور "ہندی کے تاریخی ناولوں میں تاریخ کا استعمال" کے خالق ڈاکٹر گووندجی کا خیال ہے کہ فکشن اور تاریخ ایک دوسرے سے اتنے قریب ہیں کہ دونوں کا ایک دوسرے میں ضم ہو جانا فطری ہے۔ "کہانی انسانی زندگی کا آئینہ ہوتی ہے اور تاریخ اس زمین پر انسانی زندگی کے ماضی کی کہانی ہوتی ہے۔ دونوں میں رشتہ لازمی ہے۔ عام طور پر یہی ہوا ہے کہ صنف ناول کی مقبولیت انہیں ناولوں کے ذریعے ہوئی جو تاریخ کو موضوع بنا کر لکھے گئے۔ انگریزی ادب میں اگرچہ ناول کی ابتدا اٹھارہویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے ہو چکی تھی۔ لیکن کہا یہ جاتا ہے کہ ناول نے اصل مقبولیت اس وقت پائی جب والٹر اسکاٹ کا ناول "ویورلے" (Vaverley) ۱۸۱۴ء میں چھپ کر آیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے اسکاٹ کے ناول چھپ کر سامنے آتے گئے اور مقبول ہوتے گئے۔ انگریز جب ہندوستان پر قابض ہو گئے اور ہندوستانی تہذیب و تمدن پر انگریزیت طاری ہو گئی تو انگریزی ادب کے اثر سے ہندوستان کے مختلف ادب میں ناول کے ابتدائی دور ہی میں تاریخی ناول لکھے گئے۔ بنکم چندر چٹرجی کا "درگیش نندنی" (۱۸۶۵ء میں) لکھا گیا۔ ہری نرائن آپٹے نے "اوشا کال" (۱۸۹۵ء میں) لکھا۔ ہندی ادب کے کشوری لال گوسوامی نے پہلا تاریخی ناول "ہردے ہارنی" (۱۸۹۰ء میں) شائع کیا۔

اردو میں ناول کی ابتدا تو نذیر احمد ۱۸۶۹ء میں کر چکے تھے — لیکن صنف ناول کو عوامی سطح پر مقبول اور روشناس کرانے میں جو رول شرر کے پہلے اور اردو کے پہلے تاریخی ناول "ملک العزیز ورجنا" (۱۸۸۸ء) نے ادا کیا، وہ کوئی اور نہ کر سکا۔ اس کے بعد "حسن انجلینا" (۱۸۸۹ء) "منصور موہنا" (۱۸۹۰ء) اور دوسرے ناول "ہاٹ کیک" کی طرح بکنے لگے اور عوام و خواص دونوں میں یکساں طور پر مقبول ہوئے۔ ان کی غیر معمولی مقبولیت و شہرت کو دیکھ کر کم از کم اُردو میں ایک زمانے میں تاریخی ناول نویسی فیشن بن گئی۔

تاریخی ناول سے مراد وہ ناول جس میں تاریخ سموئی گئی ہو۔ یعنی ناول اور تاریخ یا تاریخ اور ناول۔ اہلِ علم واقف ہیں کہ تاریخ کی بنیاد حقائق پر ہوتی ہے۔ تاریخ کے مشہور فلسفی ای۔ ایچ۔ کار نے لکھا ہے — "تاریخ، مورخ اور اس کی صداقتوں کے عمل، ردِ عمل کا ایک سلسلہ ہے اور حال و ماضی کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والا ایک طویل مکالمہ"۔[1] وُوڈ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "تاریخ سائنس ہے۔ اس سے کچھ کم اور نہ کچھ زیادہ"۔[2] ماضی کی صداقتوں سے فضول چیزیں نکال کر مورخ جو لکھتا ہے اُسی سے تاریخ بنتی ہے۔ تاریخ دراصل حقیقی اور غیر حقیقی یادوں سے مل کر بنتی ہے۔

۱؎ WHAT IS HISTORY P-24

۲؎ THE IDEA OF HISTORY P-249

• شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

جن میں اکثر کی بنیادیں حقائق پر ہوتی ہیں۔ اور کبھی کبھی جھوٹ اور قیاس بھی اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ جیسے تحقیق کا فن اور بیدار ذہن مسلسل کھنگالتا رہتا ہے اور حقائق کی تلاش میں لگا رہتا ہے اور یہ تلاش ہی انسان کو تصیر تاریخ میں لے جاتی ہے۔ تو ایک طرف تاریخ ہے جس کا بیشتر مواد حقائق پر مبنی ہوتا ہے اور دوسری طرف ناول۔ ناول کی کوئی جامع اور مکمل تعریف ممکن نہیں اور فکشن کے ماہرین ناول کی جو بھی تعریف کریں، اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ فکشن خواہ زندگی کی صداقتوں کی کتنی ہی ترجمانی اور آئینہ داری کر رہا ہو، تخیل کے بغیر اس کی تخلیق و تکمیل ممکن نہیں۔ ناول نگار خواہ کتنا ہی حقیقت نگاری سے کام لے لیکن تخیل کے بغیر وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر قسم کے ناول میں تخیل کا رول گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ کہیں پیچیدہ اور کہیں بہت معمولی ہو جاتا ہے۔ تاریخی ناولوں میں بلاشک و شبہ تخیل کا رول غیر معمولی صورت و اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ تاریخی ناول میں تو تخیل کی کلیدی حیثیت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ تاریخی ناول وہی اچھا اور کامیاب سمجھا جائے گا جو خوب صورتی کے ساتھ تاریخی ماحول اور مقصد کو پیش کرے۔ وہ جس دور کی منظر کشی کرے وہ آنکھوں میں اتر آئے۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ پورے تاریخی واقعات کو پوری سچائی کے ساتھ پیش کرے بلکہ تاریخی ماحول کی تشکیل اور تاریخی ناول کی تخلیق میں اکثر و بیشتر اسے تخیل ہی سے کام لینا پڑتا ہے۔ تاریخ صرف پلاٹ اور دل چسپ واقعات دیتی ہے اور ناول اس میں دل کشی اور لچک پیدا کرتا ہے۔ جہاں تاریخ کے اوراق دھندلے پڑ جاتے ہیں، ناول نگار اپنے تخیل کی روشنی سے اسے روشن اور تابناک کر دیتا ہے۔ "تاریخی ناول" تاریخ اور ناول دونوں کی کمیوں اور خوبیوں کو اپنے اندر جذب کر کے آگے بڑھتا ہے۔ جہاں تاریخی حقائق کی روشنی ہوتی ہے، وہ آسانی سے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جہاں اندھیرا ہوا فکشن اپنی شعاعوں سے اسے منور کرنے لگتا ہے۔ سچی اور سیدھی باتوں کو براہِ راست کہہ دینا تاریخ کا کام ہے۔ ناول نگار اسے اپنے ڈھنگ سے سوچتا ہے اور ناول کے سانچے میں ڈھالنے کے بعد حقیقت کو کہانی بناتا ہے۔

تاریخی ناول نگار، تاریخ اور ناول یعنی حقیقت اور تخیل دو متضاد اشیاء سے تاریخی ناول کی تخلیق کرتا ہے جو ایک بے حد مشکل، نازک اور پیچیدہ عمل ہے اور یہی وجہ ہے کہ اردو کی طرح دوسرے ادب میں حقیقتاً تاریخی ناولوں کی تعداد بہت کم ہے۔ تاریخی ناولوں کے نام پر جو تعداد نظر بھی آتی ہے، وہ تاریخی کم، رومانی یا سماجی زیادہ ہے۔

عام طور پر تاریخی ناول پر بات کرنے والے تاریخ پر زیادہ اور ناول پر کم زور دیتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ ناول میں تاریخ جذب کرتے وقت تاریخ کو توڑنا مروڑنا نہیں چاہیے۔ ایسے حامیانِ صداقت اس حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ ناول نگار جس وقت تاریخی ناول لکھنے بیٹھتا ہے تو اسے تاریخ کی تمام شرطوں کے ساتھ ساتھ ناول کی بھی شرائط کا پورا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اسے ہر وقت کا خطرہ لگا رہتا ہے کہ اس کا ناول صرف تاریخ ہو کر نہ رہ جائے۔ مشہور شاعر اور ناول نگار ٹیگور نے درمیان کا راستہ نکالتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے "ناول نگار سچ کی پورے طور پر حفاظت کر رہا ہے یا نہیں۔ یہ دیکھنا چاہیے بلکہ صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ اس میں تاریخی ماحول پیدا ہو سکا ہے یا نہیں۔ اگر ایسا ہے تو وہ ایک تاریخی ناول نگار سمجھا جائے گا۔"[1]

والٹر ریلے نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "تاریخی ناول کے اہم کردار اپنے آپ میں تاریخی نہیں ہونا چاہیے۔"[2]

لیکن اس کے برعکس مشہور ناقد جارج لوکاچ نے لکھا ہے کہ ناول نگا کو اپنے مطابق کوئی تبدیلی نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی اس میں کوئی کاٹ چھانٹ کرنی چاہیے۔ تاریخی واقعات خود اپنے آپ میں افسانویت رکھتے ہیں۔ اگر بغیر تبدیلی کیے سچ کو فن کارانہ ڈھنگ سے پیش کیا جائے تو خواہ کتنا ہی تخیل سے کام لیا جائے کام بڑی مشکل ہوگی۔"[3]

ہندی تاریخی ناول نگاروں کا ایک گروپ اس سے اختلاف کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تاریخ میں تبدیلی پیدا کرنے کے بعد ہی کوئی عمدہ تاریخی ناول لکھا جا سکتا ہے۔ چتر سین شاستری اور راہل جی وغیرہ اسی انداز سے سوچتے ہیں۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ تاریخی ناول میں تاریخ کی تلاش حماقت ہے۔ تاریخ بدلتی رہتی ہے۔ تاریخی ناول کوئی تاریخ نہیں ہے۔ وہ تو کہانی کی ایک شکل ہے۔ ہاں اس میں تاریخی "مٹھاس" (इतिहास रस) ضرور ہونا چاہیے۔

سچ بات تو یہ ہے کہ تاریخی ناول میں تاریخ کا ہونا لازمی ہے اور ناول کا فن بھی۔ ان دونوں میں پہلی بات یہ یاد رکھنے کی ہے کہ تاریخی ناول — ناول پہلے ہے تاریخ بعد میں۔ ناول کا فن ہر شے پر غالب رہنا چاہیے۔ اس فن میں اگر تاریخ کی تصویر ملتی ہے، جسے تاریخی مٹھاس کا نام دیا ہے تو وہ تاریخی ناول کی شکل اختیار کرے گا۔

تاریخ کا تعلق مورّخ اور ناول نگار دونوں سے ہوتا ہے — دونوں ہی حقیقت کے متلاشی ہوتے ہیں۔ لیکن فرق اتنا ہے کہ مورخ حقائق

---

[1] चतुर्सेन के उपन्यासों में इतिहास चित्रन P. 31

[2] THE ENGLISH NOVEL P-87

[3] THE HISTORICAL NOVEL P-290

کو ماضی کے اوراق میں تلاش کرتا ہے اور ناول نگار چونکہ اپنے ناول میں ایک دور ایک عہد کی زندگی پیش کرنا چاہتا ہے، اس وجہ سے وہ جس دور میں جھانکے گا اس کی مکمل زندگی کو تلاش کر کے تمام انسانی اور سماجی رشتوں کو دیکھنا چاہے گا۔ مورخ اور ناول نگار میں بنیادی فرق یہی ہے کہ ایک تاریخ لکھتا ہے اور دوسرا تاریخی ناول۔ دونوں اگرچہ ماضی کی طرف پلٹتے ہیں، لیکن مواد کی فراہمی کا انداز جداگانہ ہوتا ہے۔ مورخ بڑی ہوشیاری سے محض سن اور تاریخ تلاش کرتا ہے۔ کون بادشاہ کب گدی پر بیٹھا، کتنی لڑائیاں لڑیں۔ اور کب وفات پاگیا یا اس کے ارد گرد۔ لیکن اس سے آگے نہیں۔ اگرچہ اس طرح کے مواد کی فراہمی بھی ایک بڑا کام ہے، لیکن اس کی شکل دوسری ہو گی۔ واقفیت تو ہو جائے گی، لیکن اس کا تعلق دل کی دھڑکنوں سے نہ ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سن اور واقعات کے سلسلے میں دفتر کے دفتر قلمبند کر دیتا ہے، لیکن اثر انگیزی اور ماحول میں کیفیت پیدا کرنے کے لیے جن اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے، اُس سے وہ محروم رہتا ہے۔ اس کے برخلاف ناول نگار ان تمام کمیوں کو اپنے ناول میں پورا کرتا ہے۔ جب وہ ماضی میں ڈوبتا ہے تو اس کی روح تک میں ڈوب جاتا ہے۔ ماضی کے اندر ایک دنیا سجاتا ہے اور اس سجی ہوئی دنیا کو خوبصورت ڈھنگ سے پیش کرنے کے لیے ناول کا سہارا لیتا ہے۔ ناول اور تاریخ میں بنیادی فرق ناول نگار اور مورخ کے اندازِ فکر کا ہے۔ تاریخی ناولوں کا مقصد کبھی یہ نہیں رہتا کہ وہ صرف تاریخی واقعات کو پیش کر رہا ہے بلکہ حال میں ماضی کی تصویر سجانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ حال کا انسان ماضی کی زندگی کو دیکھے اور پھر اپنی زندگی کو سجائے۔ اس طرح پس پردہ تاریخی ناول ماضی کی دنیا کو ہی اُجاگر نہیں کرتا بلکہ مستقبل کی طرف سوچنے کی دعوت بھی دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اکثر تاریخی ناول اسی عہد میں لکھے گئے جب حال کی صورتِ حال خراب رہی اور عظمتِ رفتہ کو دُہرائے جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تاکہ تاریخی ناولوں کا مطالعہ اپنے مستقبل کے لیے راہیں ہموار کرے اور سماج کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہو —— اکثر ناقدین نے اس امر پر اعتراض کیا اور سوال اُٹھایا کہ آخر ناول میں تاریخ کو سمیٹا ہی کیوں جائے۔ تاریخ ایک الگ فن ہے اور ناول الگ۔ ان دونوں کی آمیزش کیا معنی رکھتی ہے۔ سماج کے نشیب و فراز اور حال کے مسائل نے اکثر عظمتِ ماضی کو دُہرانے پر مجبور کیا ہے۔ حال اور مستقبل کو مستحکم کرنے کے لیے جا بجا ماضی کے کارناموں کو زندہ کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ تاریخ زیادہ تر حقائق پر مبنی ہوتی ہے اور حقائق عام طور پر تلخ۔ خشک اور غیر دلچسپ ہوا کرتے ہیں اور ناول اپنے آپ میں نرمی دل کشی اور چمک رکھتا ہے جو حقیقتوں کی اس غیر دلچسپی اور خشکی کو بڑی حد تک دُور کر دیتا ہے۔ اردو میں تاریخی واقعات کو اکثر ناصحانہ اور عالمانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ نصیحت اگر خشک انداز میں ہو تو کڑوی دوا کا کام کرنے لگتی ہے۔ ناول اس دوا کو شہد کی شکل دینے میں مدد کرتا ہے۔ شبلی کی تاریخی حیثیت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ اردو میں بحیثیت مورخ ان کی قدر و منزلت مسلّم ہے۔ المامون، الفاروق، سیرۃ النبی جیسی کتابیں غیر معمولی حیثیت رکھتی ہیں۔ شرر نے تقریباً ایسے ہی واقعات کو ناول کی شکل میں پیش کیا۔ یہاں دونوں کا موازنہ مقصود نہیں، لیکن شبلی کے مقابلے شرر کا پیغام زیادہ مقبول ہوا اور زیادہ حلقے میں پھیلا جبکہ دونوں کا مقصد تقریباً ایک تھا۔ شرر کو یہ احساس بھی تھا کہ جس بات کو سرسید، حالی، شبلی وغیرہ کہہ رہے ہیں وہ کس حد تک اور کس انداز سے کن لوگوں تک پہنچا رہے ہیں۔ شرر کی تخلیقی مراجعت کی ایک بڑی وجہ ان کا یہ احساس تھا اور اسی بنا پر انہوں نے تاریخی ناول لکھے جو بے حد مقبول ہوئے اور وہ مقصد جو اُس وقت کے تمام ادیبوں اور شاعروں پر غالب تھا، شرر پہلے ادیب ہیں، جن کے ذریعے پایۂ تکمیل کو پہنچا اور اس اعتبار سے شرر اپنے معاصرین میں زیادہ کامیاب رہے اور سچ بات تو یہ ہے کہ تاریخ کا مطالعہ تو تاریخی کتابوں سے کیا جا سکتا ہے، لیکن اس سے روشنی اور حرارت تاریخی ناول کے ذریعے ہی مل سکتی ہے۔

تاریخ اور ناول کی آمیزش کی ایک اور وجہ ناول کی خصوصیات کے ساتھ چند تاریخ کی بھی ایسی خصوصیات ہیں جو ناول نگار کو اپنے کینوس میں سمونے کے لیے آمادہ کرتی ہیں۔ جب ہم ماضی کے قصے اور کارنامے سنتے ہیں تب ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ماضی کے پس منظر میں ہم کیسی کیسی کہانیاں چھوڑ آئے ہیں۔ اور تاریخ کی یہ دنیا عجیب و غریب یادیں جذب کیے ہوئے ہے۔ کبھی کبھی تو یقین ہم سے سوال کرتا ہے کہ کیا ماضی میں ایسا ہوا تھا۔ لیکن ماضی کی باتوں پر ہمیں یقین اس وقت ہوتا ہے جب اس کی تفصیلات یعنی اس کا ماحول، رہن سہن روایتیں وغیرہ یقین دلاتی ہیں کہ یہ ساری چیزیں سچ ہیں۔ قدیم قصے ہمیں حیرت کی دنیا میں لے جاتے ہیں اور ایک عجیب سا دلچسپ و دل کش تاثر چھوڑتے ہیں۔ کہیں بہادری، کہیں پیار، کسی مقام پر افسوس، کسی مقام پر مسرت کے بُلبُلے پھوٹتے نظر آتے ہیں۔ ہم ماضی کی طرف جاتے ہیں تو اس وقت کی رنگین و چمکیلی تصویریں ہم کو گھیر لیتی ہیں اور انسانی نفسیات کے مطابق ہم اس دنیا کو بہتر سمجھ کر آج کی زندگی کے عناصر تلاش کرنے لگتے ہیں، ماضی میں اپنا حال تلاش کرنے لگتے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر قدیم و جدید کی یہ آمیزش ہمیں ایک الگ دنیا میں لے جاتی ہے اور پھر یہ دنیا ہماری اپنی دنیا سے زیادہ دل کش اور خوب صورت لگنے

گئی ہے۔

ماضی کی ایک ٹنگسن اور ہکسپیلی دنیا دو طرح سے تاریخی ناول کے لیے مواد فراہم کرتی ہے ایک تو وہ تاریخ ہوتی ہے جو صرف مواد دیتی ہے اور اس مواد کو ناول نگار اس انداز سے ڈھالتا ہے جیسے بدن میں اعضا ، ڈھلے ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کی وہ تاریخ ہے جو صرف مواد ہی نہیں بلکہ تاریخی ناول نگار کے لیے سانچہ بھی پیش کرتی ہے۔ عام طور پر ناول نگار دوسری قسم کی تاریخ کی طرف زیادہ رجوع ہوتا ہے۔ کیوں کہ ایسی تاریخ میں صرف دو کام رہ جاتے ہیں۔ کہانی کو سانچے میں ڈھالنا، اس پر تخیل کا رنگ چڑھانا۔ ایسے تاریخی ناولوں کی تخلیق میں ناول نگار کہانی، کردار، واقعات سب تاریخ سے لیتا ہے۔ صرف اُن پر رنگ چڑھانے کا کام ناول نگار کا ہوتا ہے۔ لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ اب چونکہ وہ اپنے سارے مواد تاریخ سے لے لیتا ہے، اس لیے اس کا مطالعہ عمیق ہوتا چلا جاتا ہے اور یہاں پر وہ مورخ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے، لیکن ساتھ ہی وہ فن کار بھی ہے ــــ کیوں کہ ماضی کو پیش کرنے کا اس کے پاس ایک ایسا آرٹ ہے جو مورخ کے پاس نہیں ہوتا، اس لیے یہ بات کہی جاتی ہے کہ ناول نگار تو مورخ بن جاتا ہے، لیکن مورخ ناول نگار نہیں بن پاتا۔ اس مقام پر ناول نگار کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور اس کو ایک ساتھ دو ذمہ داریاں سنبھالنی پڑتی ہیں۔ اول ناول نگار کی دوئم مورخ کی۔

تاریخی ناول سے متعلق یہ موضوع بھی اکثر بحث طلب ہو گیا ہے کہ تاریخی ناولوں کے لیے تاریخ کے شہرت یافتہ واقعات زیادہ اہم اور مددگار ہوتے ہیں یا غیر شہرت یافتہ واقعات۔ اس سلسلے میں مختلف نقادوں کے مختلف خیالات ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ شہرت یافتہ واقعات اپنی روشنی اور مواد کے اعتبار سے زیادہ مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ بٹیر فیلڈ لکھتا ہے:

"The Arena of Great historic event provides a more spacious theme for the novelist...."
...... لہ

غیر شہرت یافتہ واقعات کے سلسلے میں اتنی آسانی ہوتی ہے کہ واقعات کے زیادہ تر پہلو چونکہ تاریک ہوتے ہیں اس وجہ سے ناول نگار کو آزادی ہوتی ہے کہ ناول جس رُخ پر چاہے موڑ دے اور کہانی کو جس ڈھنگ سے چاہے پیش کر دے۔ موضوع جتنا تاریک اور مبہم ہوگا، ناول نگار کو اتنی ہی آسانی ہوگی اور وہ فن ناول کے ساتھ انصاف کر سکے گا۔ بعض ادیبوں اور ناول نگاروں نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انسانی زندگی سے وابستہ جب بھی کوئی ناول لکھا جائے تو یہ ضروری ہے کہ اس کی ساری نفسیات، طرزِ زندگی، محبت، خوف، نفرت غرضکہ ہر طرح کے احساسات کی ترجمانی کرے ورنہ وہ ناول نہ ہو کر تاریخ یا کوئی اور شکل اختیار کرے گا۔

ہم جیسے جیسے ماضی کی گہرائیوں میں ڈوبتے جاتے ہیں اس طرح کے احساسات زائل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ کوئی معمولی پہلو نہیں ہے بلکہ ناول نگار کے لیے سب سے اہم پہلو یہی ہے۔ ناول خواہ کسی موضوع سے تعلق رکھتا ہو۔ اگر وہ انسانی زندگی کی ترجمانی نہیں کر رہا ہے تو وہ کامیاب ناول کبھی نہیں ہو سکتا۔ بعض نقادوں نے اس مسئلے کو زیادہ اہم مسئلہ نہیں سمجھا۔ پنڈت ہزاری پرساد دویدی اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

" ماضی کے تمام واقعات کا علم ہونا مشکل ہوتا ہے عام طور پر قدیم ماضی کے بارے میں معلومات کم ہی ہوتی ہیں اور نزدیک کے ماضی کی کچھ زیادہ۔ تاریخی ناول نگار دور کے واقعات کو ربط دینے کے لیے تخیل کا سہارا زیادہ لیتا ہے۔ نزدیک کے واقعات میں کم ــــ ہر حالت میں خواہ وہ کسی دور کا تذکرہ کر رہا ہو اس کی تصویر کشی میں انسانیت، نفسیات وغیرہ ڈھالے بغیر نہیں نہیں بڑھ سکتا۔ لیکن یہ سب کرنا بہت مشکل کام ہے"

اس سلسلے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔ ہر طرح مثالیں ہیں بعض ناول ایسے بھی ہیں جو بے حد معمولی واقعات اور قدیم دور سے تعلق رکھتے ہیں اور کامیاب ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو مشہور واقعات پر لکھے گئے ہیں، لیکن ناکام رہے ہیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ ایسے کامیاب ناولوں کی تعداد زیادہ ہے جو ماضی قریب سے متعلق ہیں۔ انگریزی کے مشہور تاریخی ناول نگار والٹر اسکاٹ کے تقریباً تمام ناول چار پانچ سو سال کی تاریخ کے اندر ہی لکھے گئے، جہاں وہ پیچھے کی طرف مڑتا ہے۔ قلم میں لغزش آتی ہے۔ ٹیلسمان اس کی زندہ مثال ہے جو ریوبرلے اور آئی ونہو جیسی مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔ ہندی ادب میں بھی صورتِ حال یہی ہے۔ ورنداون لال ورما کے 'جھانسی کی رانی لکشمی بائی' مرگ نینی۔ پرتاپ نرائن سری واستو کا ناول "بے کسی کا مزار" امرت لال ناگر کا "شطرنج کے مہرے" اور رانگیئے راگھو کے زیادہ تر ناول ماضی قریب

لہ THE HISTORICAL NOVEL P-65

سے تعلق رکھتے ہیں۔ اردو کے تاریخی ناول نگاروں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ عزیز احمد اور قاضی عبدالستار کے وہ ناول زیادہ کامیاب ہیں جو قریب کے ماضی پر لکھے گئے ہیں۔ صلاح الدین ایوبی کے مقابلے میں داراشکوہ کی کامیابی اس بات کا ثبوت ہے۔ اردو میں تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے عبدالحلیم شرر کا سب سے اہم مقام ہے، لیکن ان کے ساتھ معاملہ برعکس ہے۔ ان کے وہ ناول زیادہ اہمیت رکھتے ہیں جو ماضی بعید سے متعلق ہیں۔ فردوس بریں، ایام عرب، جویائے حق کی کامیابی کا انحصار ان کی ٹھوس تاریخی معلومات پر منحصر ہے۔ ماضی دور کا ہو یا قریب کا۔ واقعات شہرت یافتہ ہوں یا غیر شہرت یافتہ۔ دراصل یہ ساری چیزیں اتنی اہمیت نہیں رکھتیں جتنا کہ اُن واقعات کو پڑھنے اور غور کرنے کے بعد ناول نگار کے ذہن میں کھولتا ہوا مسالہ اُسے لکھنے پر مجبور کرتا ہے اور یہ مسالہ اُسے چھوٹے واقعات سے بھی مل سکتے ہیں اور بڑے واقعات سے بھی۔

تاریخ سے متعلق اکثر ایک بحث اور اُٹھی ہے کہ تاریخی ناول کے لیے ماضی کی ایک حد ہونی چاہیے۔ ویسے تو گزرتا ہوا ہر لمحہ ماضی ہو کر تاریخ کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ دس پانچ سال پرانے واقعات کو اگر ناول میں سمویا جائے تو کیا وہ تاریخی ناول ہو جائے گا۔ اس پہلو پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر ستیہ پال چگھ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے ؎

"ایسے ناول جس میں مصنف کے عہد سے الگ
ہٹ کر ماضی کے واقعات، کردار یا حالات میں
سے کسی ایک یا ایک سے زیادہ عناصر پر منحصر
تخیل کے سہارے ماضی کے ماحول کو زندہ کیا
گیا ہو۔ اُسے تاریخی ناول کہتے ہیں۔"[1]

ہندی کے دوسرے ادیب ڈاکٹر دیو راج اُپادھیائے نے تاریخی ناول کے لیے واقعات کو کم از کم پچاس سال پرانے ہونے کی شرط لگائی۔ اور ڈاکٹر برج بھوشن سنگھ نے سو سال کی قید لگائی۔ تاریخ کے اس موضوع پر کسی طرح کے اصول نہیں بنائے گئے۔ لیکن ناول کے لیے بنیادی شرط یہ ضرور ہے کہ کم از کم اتنا وقفہ ضرور ہو کہ واقعات کچھ اس طرح جھلملا جائیں کہ تخیل کی شمولیت لازمی ہو جائے ورنہ ناول کی شکل بگڑ جائے گی۔ یہ پہلو بعض معاملات میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بعض ناول جو ناول نگار نہ چاہتے ہوئے بھی بعض حلقوں میں تاریخی ناول سمجھے گئے۔ جان میریٹ نے اپنی کتاب "انگلش ہسٹری اینڈ انگلش فکشن" میں اس طرح کا ایک سوال اُٹھایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ بعض ایسے ناول جو اپنے وقت میں "تاریخی ناول کے طور پر نہیں لکھے گئے" وقت گزرنے پر تاریخی ناول کی شکل اختیار کر گئے۔[4]

ہندی میں گووند سوامی کا ناول "اندرمتی" اور یشپال کا ناول "جھوٹا سچ"

اسی شمار میں آتا ہے۔ اردو میں بھی اس طرح کی بحث "آگ کا دریا" اداس نسلیں وغیرہ کے حوالے سے اکثر اُٹھائی جاتی ہیں۔ یہ خیال غور طلب ہے کہ "اداس نسلیں" اور "آگ کا دریا" تاریخی ناول نہیں تو کچھ دن کے بعد بھی ناول تاریخ کی صف میں آ کھڑے ہوں گے پھر تاریخی ناول اور دوسرے ناول میں کچھ فرق نہ رہ جائے گا۔ پھر محض تاریخ کو چھو لینے سے کوئی ناول تاریخی ناول نہیں ہو جاتا۔ اس کے ناول نگار کو نہ صرف اس عہد کو لینا پڑتا ہے، جس کو ناول نگار نے نہ دیکھا ہو۔ اس کے علاوہ وہ جس عہد کو منتخب کرے اس کے تمام تر حالات، رسم و رواج، رہن سہن، ملبوسات و زیورات، کھانا پینا، بولنا چالنا، غرضکہ اس عہد کی روح اُتر آئے۔ اور ساتھ میں ان سب حالات کے تحت اس عہد کی عوامی زندگی کا نقشہ بھی پیش کرے اور اپنے موضوع کے ساتھ انصاف بھی کرے۔ وقفۂ ماضی سے متعلق والٹر اسکاٹ نے کم از کم پچاس سال کی قدامت کی شرط رکھی ہے۔[2] شیفرڈ نے اپنی کتاب میں لیزل اسٹیفن کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے — تاریخ کے لیے کم از کم ساٹھ سال کی قدامت لازمی ہے۔[3]

تاریخی ناول میں سب سے اہم ضرورت تاریخی ماحول کی ہوتی ہے۔ وہ جس دور کو منتخب کرے صرف پلاٹ اور کردار ہی نہ لے بلکہ اس دور کا پورا ماحول پیش کرے۔ اُس عہد کا معاشرہ، رہن سہن، محاورے اور دیگر رسومات، زبان و بیان کو اس انداز سے اپنے کینوس میں اُتار لے کہ اُس تاریخ کا زندہ ماحول ناول کے صفحات پر جملہ آب و تاب کے ساتھ اُبھر آئے اور چند لمحوں کے لیے قاری اپنے وجود کو بھول کر اپنے آپ کو اسی دور میں محسوس کرنے لگے جس کا تذکرہ ناول میں ہو۔ یہ نہ ہو کہ منظر عرب کے ریگستان کا ہے اور زبان دہلی کے چاندنی چوک کی۔ کردار ایران کے ہیں اور ان کی گفتگو تسنیم کے آداب لکھنؤ کے اکبری دروازے کے ہوں۔ یہ کوئی معمولی فن نہیں اس کے لیے زبردست مطالعہ و مشاہدہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ در بدر بھٹکنے اور اپنے آپ کو اس دور میں پہنچانے کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ مرحلہ کسی طرح طے بھی ہو جائے تو یہ شرط بھی ہمہ وقت لگی رہتی ہے اس کے دماغ پر فنکاری کی ایسی مہر ہو، اس کے قلم میں اتنی طاقت ہو کہ اس دور کی چمکتی ہوئی تصویریں ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیں، اسی لیے ورنداون لال ورما کہتے ہیں: "تاریخی ناول میں تاریخی ماحول کی عکاسی ادیب کے لیے بہت ضروری ہے۔"[5] پدم لال پنا لال بخشی نے بھی اس بات پر زور دیا ہے اور کہتے ہیں — "تاریخی ناول میں ناول کی سب سے بڑی فنکاری تاریخی ماحول کو پیش کرنے میں ہے۔"[6]

---

1. THE AMERICAN HISTORICAL NOVEL P-50
2. THE ART AND PRACTICE OF HISTORICAL FICTION P-16
3. ऐतिहासिक उपन्यास P. 23
4. ENGLISH HISTORY OF ENGLISH FICTION P-3
5. ऐतिहासिक उपन्यास P. 28
6. " " " "

تاریخی ماحول پیش کرنے کے لیے تاریخی ناول نگار کو مخصوص قسم کے ماحول کے علاوہ مخصوص قسم کی زبان استعمال کرنی پڑتی ہے۔ تاریخی ناول میں چونکہ جنگ، تصادم، عشق و محبت، دربار، بادشاہ، وزیر وغیرہ کا ذکر زیادہ ہوتا ہے، اس لیے اس کو حقیقی انداز میں پیش کرنے کے لیے ناول نگار کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ہونا لازمی ہے۔ جہاں تاریخی حقائق دھندلے نظر آتے ہیں وہاں ناول نگار کے فن کی روشنی تیز ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر زبان اپنا جوہر دکھاتی ہے۔ عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ ناول میں جس دور کا تذکرہ کیا جائے اسی دور کی زبان ہونی چاہیے۔ تاریخی ناول کے لیے یہ ایک ناممکن سی بات ہے۔ ہر عہد کی زبان پر قابو رکھنا ناول نگار کے لیے ممکن نہیں۔ عرب کی تاریخ کے لیے عربی زبان اور انگلش تاریخ کے لیے انگریزی زبان کی واقفیت تو لازمی ہے۔ لیکن زبان ہو بہو اس عہد کی ہو یہ ایک مشکل امر ہے۔ فن تو یہی ہے کہ جن کے خیالات و نفسیات کو آج کی زبان میں پیش کرے اور مزہ اسی عہد کا آئے۔ عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناول "ایام عرب" ان کے ناولوں میں اس وجہ سے کامیاب ہے کہ وہ عرب کے ایام جہالت سے تعلق رکھتا ہے اور بیسویں صدی کی زبان ہوتے ہوئے بھی عرب کی پوری تصویر کشی کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شرر نے اس وقت کی جہالت کی ایسی تصویر کشی کی ہے جو اس سے قبل ان کے کسی ناول میں نظر نہیں آتی۔ کبھی کبھی معاملہ الٹ بھی جاتا ہے اور ماحول و زبان میں تضاد نظر آنے لگتا ہے۔ قدیم ہندو عہد پر ناول لکھے جا رہے ہوں تو مناسب ہو گا کہ ناول نگار سنسکرت زبان سے واقف ہو۔ اور حسب ضرورت کے تحت سنسکرت کے الفاظ استعمال کرے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اندر شیو نند لال یا دیوکی نندن کھتری کی وہ زبان استعمال کرے جس میں اردو و فارسی کی کثرت ہوتی ہے تو ماحول بے حد مضحکہ خیز ہو جائے گا۔ تاریخی ناول کے فن سے متعلق بعض اور بھی باتیں جن پر ابھی تک غور نہیں کیا گیا ہے، یہاں بھی تنگیٔ وقت کی وجہ سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

اس مقالے میں تاریخی ناول کے فن پر سرسری باتیں کرنے کے بعد اب کچھ مجموعی تعریفیں پیش کی جاتی ہیں: پال لئی سسٹر نے تاریخی ناول کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"تاریخی ناول ایک ایسا ناول ہے جس کی کہانی
ایسے حقیقی واقعات اور کرداروں کے ذریعے
بنائی جاتی ہے جن پر تاریخیت کی مُہر لگ چکی ہو۔"[1]

جان بچن نے تاریخی ناول کی تعریف اس طرح کی ہے:

"تاریخی ناول ایک ایسا ناول ہے جس میں مصنف
کے عہد سے الگ کسی عہد کی زندگی کو دوبارہ تعمیر کیا
جائے اور ماحول کو پھر سے ڈھالنے کی کوشش ہو۔"[2]

اے۔ بی۔ وارڈ نے جو تاریخی ناول کی تعریف کی ہے وہ بڑی حد تک جان بچن کی تعریف سے مشابہ ہے۔ جوناتھن فیلڈ نے تاریخی ناول ان کو قرار دیا ہے۔ جن میں تاریخی حوالے واقعات اور کرداروں کا میل ہے اور جنہیں ہم پہچان سکیں۔[3]

کچھ اور بھی تعریفیں ہیں جو یہاں تفصیل نہیں رکھتیں اس لیے پیش نہیں کی جا رہی ہیں۔ سبھی نے اس بات کو مانا ہے کہ تاریخی ناول میں ماضی کے واقعات ہونے چاہییں اور اس کے ساتھ ہی تخیل کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ ڈاکٹر ہزاری پرساد دویدی نے بھی تاریخی ناول کے بارے میں یہی کہا ہے:

تاریخی ناول ایک ایسا ناول ہے جس میں ماضی
کے کرداروں، ماحول اور واقعات کے حقیقی عناصر
کو تخیل کے ذریعے موجودہ زندگی کے لائق بنایا
جاتا ہے۔"[4]

تاریخی ناول کی چمک اور اس کی دلکشی قائم رکھنے کے لیے بعض نقادوں نے تو اس حد تک کہہ دیا کہ تاریخ اس حد تک ہونی چاہیے جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ تاریخی ماحول ہے ورنہ حقائق کی طرف زیادہ توجہ نہ دینی چاہیے۔ سر والٹر سکاٹ نے تو اس حد تک کہہ دیا کہ تاریخی ناولوں میں بڑے بڑے کردار تو تاریخی ہونے ہی چاہییں۔[5]

پروفیسر ہربرٹ فیلڈ جس نے اس موضوع پر اہم کام کیا ہے اور باقاعدہ تاریخ اور ناول کے رشتے پر کتاب لکھی ہے، لیکن پوری کتاب میں دو جملے بھی ایسے نہیں ملتے جس میں تاریخی ناول کی جامع تعریف سمٹ آئے۔ وہ کہتا بھی ہے کہ تاریخی ناول ایسا فن نہیں ہے جس کی تعریف محض دو جملوں میں کر دی جائے۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے:

"تاریخی ناولوں میں بہت زیادہ صداقتوں پر غور
نہیں کرنا چاہیے، لیکن اتنی صداقتیں لازمی ہیں
کہ ہم اُن میں اُلجھ کر نہ رہ جائیں۔ ایسا لگے کہ ماضی
کی باتیں ہو رہی ہیں۔ تاریخی ناول کے معاملات

---

[1] THE AMERICAN HISTORICAL NOVEL P-4
[2] ENGLISH HISTORY OF ENGLISH FICTION P.2
[3] THE ART AND PRACTICE OF HISTORICAL FICTION P-87
[4] ऐतिहासिक उपन्यासों में कल्पना और सत्य की परस्तावना।
[5] THE ENGLISH NOVEL P-77

بڑے نازک ہوتے ہیں۔ غیر محتاط جانب داری، غیر تعمیری احساسات ہم کو لاپروائی کی طرف لے جاتے ہیں۔۔
تاریخی ناول کی ایسی تصویریں یاد دلاتی ہیں کہ اس میں ایک ایسا ماحول ہوتا ہے کہ ہم اس میں کچھ نہیں پاتے۔ لیکن ہمیں بس اتنا سوچنا ہے کہ اس میں تاریخی احساسات کا اندازہ ہونا چاہیے بس اس سے زیادہ کچھ نہیں ـــــ لہٰذا ایک طرح سے تاریخی ناول تاریخ کی ایک شکل ہوتی ہے۔ ماضی کے کارناموں کو کس انداز سے سمجھا جائے یہ کارنامہ انجام دیتے ہیں۔" [1]

تاریخی ناول میں چونکہ متعدد اشیاء کی آمیزش ہوتی ہے۔ اس لیے ہیڈ فیلڈ نے اس کو ایک مکسچر مانا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ وہ فن ہے جو مختلف آرٹ سے مل کر پیدا ہوتا ہے۔ مختلف فن کی آمیزش سے نیا فن پیدا ہوتا ہے۔ [2]

تاریخی ناول پر عام طور پر خشکی اور غیر دلچسپی کا الزام لگایا جاتا ہے، لیکن یہ الزام انہیں پر لگتا ہے جو صرف گڑے مُردے اُکھاڑتے ہیں۔ تاریخ صرف ماضی کے واقعات کو ہی نہیں دُہراتی بلکہ آنے والے وقتوں کے لیے مشعل کا کام کرتی ہے۔ سقراط نے ایک جگہ لکھا ہے ـــ
"سارے مطالعے میں سب سے اچھا مطالعہ یہ ہے کہ انسان کیا تھا اور اُسے کیا ہونا چاہیے۔" [3] تاریخ زندگی کے ایسے ہی بڑے مقصد کی تکمیل میں مدد کرتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے تاریخی ناول کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ آخر میں رابندر ناتھ ٹیگور کے یہ جملے ملاحظہ کرتے چلیے ؎

"جو شخص صرف تاریخ پڑھے گا اور ناول کو پڑھنے کا موقع نہیں پائے گا، وہ بدقسمت ہے اور جو شخص صرف تاریخ ہی پڑھے گا اور شاعری کو پڑھنے کا موقع نہیں پائے گا، یقیناً اس کی قسمت اور بھی خراب ہے۔" [4]

اوپر کے جملوں سے تاریخ اور تاریخی ناولوں کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، لیکن اس کی شرطیں، اس کے لوازمات، اس کے فنی تقاضے اس کے اصول و ضوابط اس قدر نازک اور پیچیدہ قسم کے ہوتے ہیں کہ معمولی ناول نگار کی اس سمت نظر اُٹھانے کی ہمت ہی نہیں پڑتی اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر ادب میں ناولوں کے انبار میں سب سے کم تعداد تاریخی ناولوں ہی کی پائی جاتی ہے۔

اُردو ادب میں جتنی کم تعداد تاریخی ناولوں کی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ کم تاریخی ناول کے فن پر مواد کی کمی ہے۔ علی عباس حسینی، احسن فاروقی کی ناول پر کتابیں بے حد پرانی ہو چکی ہیں۔ ان کتابوں میں صنفِ ناول پر ہی خاطر خواہ باتیں نہیں ملتیں، تاریخی ناول پر تو نہیں کے برابر ہیں۔ پروفیسر نورالحسن ہاشمی اور احسن فاروقی کی مشترکہ کتاب "ناول کیا ہے" میں ناول کی ہیئت فن پر کارآمد باتیں ملتی ہیں، لیکن اس میں بھی تاریخی ناول پر کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ وقار عظیم نے فکشن پر اچھا کام کیا ہے۔ ان کی کتاب "داستان سے افسانے تک" مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جس میں تاریخی ناول اور ناول نگار سے متعلق کوئی اہم بات نہیں ہے۔ بعد کے ادیبوں میں سہیل بخاری، آدم شیخ، مجتبیٰ حسین وغیرہ نے ناول پر کام کیا اور شرر کے بارے میں بھی لکھا۔ لیکن یہ سب تاریخی ناول کے فن سے تقریباً نابلد تھے۔ شرر سے متعلق اگرچہ ہمیں فراق گورکھپوری، قمر رئیس، عبدالقادر سروری، جمیل احمد کندھائے پوری اور مجنوں گورکھپوری کی کتابوں میں بھی مواد ملتا ہے، لیکن ان میں سے کوئی بھی تاریخی ناول پر بحث نہیں کرتا۔ جب کہ شرر کے ناولوں پر سب بڑے اعتماد سے تبصرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ تاریخی ناول کے اس قحط زدہ ماحول میں پروفیسر یوسف سرمست کی پہلی کوشش ہے جنہوں نے اپنی کتاب "بیسویں صدی میں اردو ناول" میں شرر کے موضوع اور فن پر بات کرنے سے قبل انگریزی حوالوں کے ذریعے تاریخی ناولوں کی تعریف کی ہے۔ تاریخ اور ناول کو الگ الگ سمجھانے کے بعد تاریخی ناول کے فن اور شرائط کو اُجاگر کیا ہے۔ ان حوالوں میں اردو کے کوئی حوالے نظر نہیں آتے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اُردو میں سنجیدگی سے اس پہلو پر کسی نے نہیں سوچا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شرر اور دوسرے تاریخی ناول نگاروں کے بارے میں عجیب و غریب فیصلے کیے گئے۔ راقم الحروف نے شرر کے ناولوں پر باقاعدہ تحقیقی مقالہ رقم کیا ہے جس میں باقاعدہ ایک باب میں تاریخی ناول کے فن پر بحث کی گئی ہے جو بعد میں الگ سے کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ اس پہلو پر تاریکی کی وجہ سے شرر کے ملک العزیز ورجنا (۱۸۸۸ء) سے لے کر قاضی عبدالستار کے غالب (۱۹۸۶ء) تک کا تاریخی ناول کا یہ تقریباً سو سالہ سفر اپنے آپ میں تمام رنگینیاں سمیٹنے کے باوجود اپنی بعض کمیوں کی وجہ سے سُونا سُونا سا لگتا ہے۔ اگرچہ یہ ویرانی تنہا اردو کی قسمت میں

---

[1] THE HISTORICAL NOVEL P-3
[2] " " " P-4
[3] ऐतिहासिक उपन्यास P-48
[4] " " P-41

نہیں آئی بلکہ بعض مقامات پر انگریزی اور ہندی ادب میں بھی نظر آتی ہے۔ لیکن انگریزی ادب کی وسعت اور ہندی ادب کے راشٹر پریم نے اسی موضوع پر سوچنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ انگریزی تاریخ جیسے بنجر اور خشک زمین پر لوائن بی لوکاچ، ہیئر فیلڈ، شیفرڈ جیسے ادیب گل افشانیاں کر جاتے ہیں۔ ہندی ادب میں تاریخی ناولوں کے اصولوں کا تعین زیادہ ناول نگار خود ہی کر کے آگے بڑھتا ہے۔ ہزاری پرساد دویدی، ورنداون لال ورما، ڈاکٹر رانگیے راگھو وغیرہ صرف تاریخی ناول نگار ہی نہیں بلکہ تاریخی ناولوں پر مضامین لکھتے ہیں۔ اور انہیں مضامین کی بنیاد پر ڈاکٹر ستیہ پال چگھ، ڈاکٹر گوونجی، گوپی ناتھ تیواری جیسے ادیب تاریخی ناول کے فن کی خوب صورت عمارت کھڑی کرتے ہیں۔

اُردو میں تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے سب سے بڑی شخصیت شرر کی ہے۔ انہوں نے اپنے ناول ملک العزیز ورجنا کے ذریعے اردو میں تاریخی ناول کی بنیاد ڈالی اور اپنی جملہ ادبی زندگی کی وساطت سے اُردو فکشن کو چند اچھے تاریخی ناول دیے۔ شرر نے جس دور میں ناول لکھنا شروع کیا وہ دور نہ صرف تاریخی ناول بلکہ صنفِ ناول کا ابتدائی دور تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات اور مختلف ادیبوں و شاعروں کی کوششوں سے کروٹ لیتے ہوئی سماجی و تہذیبی فضا نے شرر جیسے مولوی کو ناول کی طرف متوجہ کیا۔ انہوں نے پہلے دلچسپ اور دلکش جیسے معاشرتی ناول لکھے اور اپنے رسالے "دلگداز" میں صنفِ ناول کی افادیت پر کارآمد باتیں بھی لکھیں۔ لیکن یہ وہ دور بھی تھا جب ناول میں رقم کردہ عشقیہ قصوں کی مذہبی حلقوں میں مخالفت بھی کی جا رہی تھی اور صنفِ ناول کو ناجائز یا غیر پاکیزہ قرار دیا جا رہا تھا۔ چنانچہ اس اعتراض سے بچنے کے لیے گھریلو اصلاحی ناول اور تاریخی ناول لکھے جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کچھ اور بھی ضرورتیں تھیں۔ شرر ایک جگہ لکھتے ہیں،

"یورپ میں جو علم کی اخلاقی مذہبی نیز پولیٹکل اخلاق کا ذریعہ ناول قرار دیے گئے تو یہ کوئی بے عقلی کا کام نہیں کیا گیا اور نہ یورپ ایسا بے عقل اور نا عاقبت اندیش ہے کہ کسی فاش غلطی میں مبتلا ہو جائے۔ اصل یہ ہے کہ ناول سے زیادہ کوئی موثر پیرایہ کسی مسئلہ یا کسی تہذیب کے ذہن نشین کرنے اور لوگوں کو اس کا پابند بنا دینے کا ہو سکتا ہی نہیں۔ ناول کا اسلوب وہ شکر ہے جو کڑوی دوا کو خوشگوار بنانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔" لہ

آخیر کی چند سطریں اہمیت رکھتی ہیں۔ شرر بنیادی طور پر تاریخی ذہن لے کر آئے تھے۔ حالی کا مسدس اور شبلی کی تاریخی کتابیں محدود ہو کر رہ گئی تھیں اور شرر اپنا پیغام ہر طبقہ میں پہنچانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ناول کا میدان منتخب کیا۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ تاریخی واقعات خواہ وہ کتنے ہی خشک اور غیر دلچسپ ہوں ناول کے پیرائے میں ڈھال کر انہیں دلچسپ بنایا جا سکتا ہے۔ ایک جگہ اور وہ لکھتے ہیں : سہ

"جس طرح طبیب ایک نسخہ تجویز کرتے وقت مختلف اجزا کو اس خوبی سے ترکیب دیتا ہے کہ ان سے ایک نیا مؤثر اور نفع بخش مزاج پیدا ہو۔ بعینہ یہی کام آجکل ایک مورخ کا ہونا چاہیے کہ واقعات کو وہ محض روایات کی حیثیت سے جمع کر کے صرف اس کو کھٹی دھان کو اس کوکھٹی میں جمع نہ کر دے بلکہ ان کی نئی ترکیب سے نیا رنگ اور نیا مزاج پیدا کر دے اور اس کے تازہ منافع اور فوائد سے لوگوں کو فائدہ پہنچائے اور یہی سبب ہے کہ ناولوں کے ذریعے ہم تاریخوں کا جو مذاق ملک میں پیدا کرتے ہیں وہ ان بزرگوں کی تاریخ پڑھ کر بالکل تشریف لے جاتا ہے۔" لہ

مندرجہ بالا تحریروں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں ناول اور خصوصاً تاریخی ناول کا تصور بالکل مختلف تھا۔ اصول کے مقابلے مقصد زیادہ غالب تھا۔ چنانچہ شرر کے زیادہ تر ناول ایک ہی مقصد کے تحت لکھے گئے۔ ماضی کی عظمتوں کو دہرانے کے لیے اپنی کھوئی ہوئی تہذیب واپس لانے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ لیکن شرر نے پھر بھی ان تمام جذبوں کو سلیقے سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ یہ الگ بات ہے کہ اکثر وقت اور حالات نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ لیکن جہاں دیا وہاں زوالِ بغداد، ایامِ عرب، فردوسِ بریں جیسے خوبصورت تاریخی ناول سامنے آئے، جن سے جوش تو پیدا ہوا ہی تاریخی ناول کا قافلہ بھی چل پڑا۔ اس وقت سے لے کر اب تک اردو میں تاریخی ناولوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ شرر کے ناولوں کی کامیابی دیکھ کر ان کے معاصرین میں محمد علی طبیب، منشی سجاد حسین وغیرہ نے بھی تاریخی ناول لکھے۔ جعفر عباد عبرت، نیل کا سانپ، رام پیاری جیسے ناول مشہور ہوئے اور بعض نقادوں کے خیال کے مطابق یہ ناول شرر کے ناولوں سے زیادہ مقبول اور اچھے ناول تھے اس بحث سے قطع نظر کہ ان ناولوں کی اپنی کیا قدر و قیمت تھی، اس میں شک

بقیہ ص ۲۵

لہ مضامین شرر جلد چہارم ص : ۳۳۲

لہ دلگداز جولائی ۱۹۱۰ء

نیلم فرزانہ

خواتین ناول نگار

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ خواتین مردوں سے مختلف احساسات و جذبات رکھتی ہیں، اس لیے ان کا ردِّ عمل بھی مختلف ہوتا ہے۔ ہندوستان جیسے روایتی معاشرے میں یہ اختلاف اور بھی نمایاں ہے۔ یہاں کے کلچر نے مردوں اور عورتوں کے دائرۂ عمل کی حد بندیاں قائم کر رکھی ہیں۔ یہاں تک کہ دونوں کی پرورش اور تربیت بھی مختلف انداز میں ہوتی ہے۔ اس امتیاز میں آج کل قدرے کمی آئی ہے، لیکن اب بھی ماحول زیادہ نہیں بدلا ہے، جس کا لازمی نتیجہ دونوں کے درمیان افتادِ طبع، ردِّ عمل اور فکر و احساس کے ساتھ ساتھ تجربات کی نوعیت اور دائرۂ کار کا فرق ہے۔

دوسری دلچسپ حقیقت جس کی طرف اشارہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ باستثنائے چند، خواتین نے شاعری کے میدان میں زیادہ کامیابی حاصل نہیں کی۔ البتہ فکشن بالخصوص ناول نگاری میں وہ مرد ناول نگاروں کی ہمسری کرتی نظر آتی ہیں بلکہ بعض مثالیں بے مثال ہیں۔ رشیدۃ النساء بیگم (پہلی خاتون ناول نگار) سے لے کر قرۃ العین حیدر تک اور بعد تک خواتین کی ناول نگاری نے جو ارتقائی منزلیں طے کی ہیں وہ کسی کارنامے سے کم نہیں ہے۔ یوں تو خواتین نے مردوں کے بعد ناول لکھنا شروع کیا۔ لیکن جب اس میدان میں قدم رکھا تو پورے اعتماد اور خلوص کے ساتھ اس صنف کے تقاضوں کو نبھایا اور اردو ناول کو اس کے موجودہ مقام تک لانے میں اہم رول ادا کیا۔ ابتدا میں ان کے موضوعات خانگی امور خواتین کی مشکلات اور بعض سماجی و تہذیبی مسائل تک محدود رکھے اور ان کا رُخ اخلاقی اور تعلیمی تھا۔ پھر خواتین نے باہر کی دنیا میں قدم رکھا۔ اور مختلف سیاسی، سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں کے بیچ اجتماعی اور انفرادی زندگی کے بدلتے ہوئے منظر نامہ کی تصویر کشی کی۔

(۲)

خواتین کی ناول نگاری کی ابتدا انیسویں صدی کی آخری دہائی میں ہوئی۔ بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں تک خواتین کے تحریر کردہ متعدد ناول منظرِ عام پر آچکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عام ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیبی، معاشرتی، سیاسی اور تعلیمی صورتِ حال حد درجہ ابتر تھی۔ تعلیم کے فقدان کی بنا پر جہالت کی ساری برائیاں مسلم معاشرے کا حصہ تھیں۔ توہم پرستی اور غلط رسم و رواج کی بھیڑ سی تھی۔ عام مسلم خواتین کی حالت اور بھی خراب تھی۔ سماج میں ان کی حیثیت ثانوی تھی۔ تعلیم ان کے لیے ضروری نہ تھی اور نہ ہی معاشرے کو ان کی ذہنی اور روحانی ضرورتوں کا احساس تھا۔ زندگی کی تین بنیادی ضرورتیں کھانا، کپڑا اور مکان ان کا حق تھا۔ اس سے زیادہ کی نہ وہ حق دار سمجھی جاتی تھیں اور نہ وہ اس سے زیادہ کا مطالبہ کرتی تھیں۔ زندگی کے ہر محاذ پر مردوں کا تسلط تھا۔ یہ صورتِ حال اب بھی ہے اور خواتین آج بھی معاشرے میں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔

ہندوستانی تاریخ کے ایک اہم موڑ پر یہ وقت بھی آیا کہ معاشرے کے بعض حساس لوگوں نے خواتین کو جدید علوم سے آگاہ ہونے اور جدید زندگی کے تقاضوں سے آزادانہ طور پر نبرد آزما ہونے کی اجازت دی — دانشوروں نے بجا طور پر محسوس کیا کہ خواتین کو فرسودہ رسوم و رواج کی کال کوٹھری سے باہر لائے بغیر بہتر سماج کی تشکیل مشکل ہے۔ اس ضرورت کا

● ویمنس کالج، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (یوپی)

احساس ڈپٹی نذیر احمد کو بھی تھا۔ لیکن انہوں نے اور ان کے بعد راشد الخیری اور دوسرے اصلاح پسندوں نے جس آئیڈیل خاتون کا تصور کیا وہ صوم و صلوٰۃ کی پابند، امورِ خانہ داری میں ماہر سگھڑ بیوی تھی۔ جس کے لیے گھر سے باہر کی دنیا اسی قدر تاریک تھی جتنی کہ صدیوں پہلے معاشرے نے ان کی قسمت میں لکھ دی تھی۔

یہ خواتین تھیں جنہوں نے اپنی ہم جنسوں کے لیے جد و جہد کا آغاز کیا البتہ انہیں سجاد حیدر یلدرم اور بعض دوسرے روشن خیال اشخاص کا تعاون بھی ملا۔

بیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں میں خواتین مصنفین کا ایک ایسا گروہ سامنے آیا جس نے عام خواتین کے ساتھ ہونے والی بے انصافیوں کے خلاف قلمی محاذ قائم کیا۔ اسی دوران کئی ایسے رسائل شائع ہونا شروع ہوئے جو خواتین کے لیے مخصوص تھے۔ ان میں تہذیب نسواں (۱۸۹۸ء لاہور) خاتون (۱۹۰۵ء علی گڑھ) اور عصمت (۱۹۰۸ء دہلی) خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ 'تہذیب النسواں' کی ایڈیٹر محمدی بیگم تھیں۔ اس طرح حقوقِ نسواں کی تحریک چل پڑی۔ خواتین نے افسانوں، ناولوں اور مضامین کے ذریعے اصلاحی رجحان کو عام کرنے کی کوشش کی۔ ابتدائی تیس پینتیس سال تک خواتین کی ناول نگاری اس اصلاحی مقصد کا اظہار کرتی ہے۔

ڈاکٹر شائستہ اختر سہروردی اپنی کتاب :

A CRITICAL STUDY OF URDU FICTION

میں محمدی بیگم کو پہلی خاتون ناول نگار قرار دیتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں :

"Mohammadi Begum's neme come first among the women novelists."

لیکن ڈاکٹر سید مظفر اقبال نے اپنی کتاب "بہار میں اردو نثر کا ارتقاء" میں تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ رشیدۃ النساء بیگم پہلی خاتون ہیں۔ جس نے ناول لکھنے کی ابتدا کی۔ ان کا ناول "اصلاح النساء" کے نام سے ۱۸۸۱ء میں لکھا گیا اور ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا۔

رشیدۃ النساء بیگم کے ناول "اصلاح النسا" کے بعد مسز سراج الدین احمد کا ناول "ناولِ دکن" کے عنوان سے رسالہ خاتون (۱۹۰۵ء) میں قسط وار شائع ہوا۔ اس ناول میں جو کردار پیش کیے گئے ہیں اور ان کا جو ماحول ہے ان میں مشرقی اور مغربی تہذیب کے بہترین عناصر کا امتزاج ملتا ہے۔ ان کے بعد محمدی بیگم اور پھر خواتین کی ایک طویل فہرست ہے جنہوں نے ناول لکھے' ان میں اکبری بیگم نذر سجاد حیدر، عباسی بیگم، صغریٰ ہمایوں، مسز عباس طیب جی، مس حسن بیگم بیگم شاہنواز، ضیا بانو اور خدیو جنگ وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

اکبری بیگم نے چار ناول لکھے لیکن شہرت "گودڑ کا لال" کو ملی۔ قرۃ العین حیدر نے اس ناول کی ابتدائی شہرت کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

"گودڑ کا لال"، ۱۹۰۷ء میں پہلی بار شائع ہوا —
چھپتے ہی دھوم مچ گئی۔ بہت جلد اس نے نئی مڈل کلاس
مسلمان عورتوں کی بائبل کی حیثیت اختیار کر لی۔
لڑکیوں کو جہیز میں دیا جانے لگا وغیرہ"۔[1]

یہ سات سو اٹھائیس صفحات پر مشتمل ایک نہایت ترقی پسند ناول ہے۔ اس کی ترقی پسندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں نہ صرف روایتی پردے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی بلکہ پہلی بار مسلم لڑکیوں کے لیے مخلوط تعلیم کا تصور ملتا ہے۔

ثریا جبیں اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ ثریا کے کردار کو پیش کرتے ہوئے مصنفہ نے اس آئیڈیل لڑکی کو پیش کیا ہے، جسے وہ اپنے سماج میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ ایک ایسی لڑکی کا تصور کرتی ہیں جو اتنی تعلیم یافتہ، خود دار اور باحوصلہ ہو کہ وہ اپنی مدد آپ کر سکے اور مرد کے سہارے کے بغیر بھی باعزت زندگی جینے کی اہل ہو۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب مرد بھی روشن خیال ہوں اور اپنی بچیوں اور بہنوں کی تعلیم و تربیت کے لیے اسی انداز میں سوچتے ہوں۔ لہٰذا اکبری بیگم نے اس طرح کے روشن خیال مردوں کے کردار بھی تخلیق کیے۔ 'گودڑ کا لال' میں اس طرح کا ایک کردار حسن رضا ہے۔ حسن رضا ثریا جبیں کا بھائی ہے۔ وہ ایک موقع پر کہتا ہے :

"بھائی ہمارے ملک کے مردوں کا مزاج بہت
بگڑ گیا ہے۔ عورتوں کی قدر ان لوگوں کو بالکل
نہیں ہے۔ اپنا دست نگر اور محتاج
سمجھ کر جس طرح چاہتے ہیں، سلوک کرتے ہیں۔
ان کے جائز حقوق اور شرعی آزادی سے بھی
محروم کر دیتے ہیں۔ علم جیسی نعمت سے محروم
رکھتے ہیں۔ نہ کسی قسم کا ہنر ہی سکھاتے ہیں اور
پھر ہر طرح سے موردِ الزام بناتے ہیں۔ میرا ارادہ
ہے اگر خدا کی مدد بھی شاملِ حال ہوئی تو میں
اُسے بالکل کسی قسم سے مردوں کا دستِ نگر نہ رکھوں

---

[1] قرۃ العین حیدر : کارِ جہاں دراز ہے : جلد اوّل ۱۹۷۷ء ص : ۱۵۶

اگر خدانخواستہ اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک ہو جیسا
ہمارے مرد بے زبان قابلِ رحم مستورات کے ساتھ
کرتے ہیں تو یہ اپنی مدد آپ کرسکنے کے قابل
ہوں۔[1]

حسن رضا اپنے ارادے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ثریا جبیں اعلیٰ تعلیم یافتہ، سلیقہ مند، موسیقی و مصوری سے شغف رکھنے والی باہمت و خود دار لڑکی کے روپ میں سامنے آتی ہے۔

اسی قبیل کی دوسری ناول نگار نذر سجاد حیدر ہیں۔ نذر سجاد حیدر بذاتِ خود آزادیٔ نسواں اور تعلیمِ نسواں کی تحریک کی ایک موثر رکن رہی ہیں۔ اس زمانے کے مختلف رسائل تہذیب النسواں، خاتون، عصمت میں شائع ہونے والے ان کے مضامین اور افسانوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے تمام ناول بھی ان کی اسی جدوجہد کا ثمرہ ہیں۔

نذر سجاد حیدر کے پانچ ناول منظرِ عام پر آئے۔ ان میں ایک ناول اختر النساء بیگم ہے، جس میں انہوں نے تعلیم نسواں کی ضرورت و اہمیت کو موضوع بنایا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار اختر النساء بیگم زندگی کے نشیب و فراز سے گزر کر بالآخر انسپکٹر آف اسکول کے عہدے تک پہنچتی ہے۔ نذر سجاد حیدر اس ناول میں سماج میں رائج توہم پرستی کو بھی تنقید کا نشانہ بناتی ہیں۔ ان کے آئیڈیل کردار سماج کے ایسے پہلوؤں سے بھی بغاوت کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بہتر تعلیم کے ذریعے ان سماجی برائیوں کا انسداد کیا جاسکتا ہے۔

اکبری بیگم اور نذر سجاد حیدر کے علاوہ خواتین کا ایک پورا گروہ ہے جس نے سماجی، معاشرتی مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ محمدی بیگم کے تین ناول شائع ہوئے۔ صغریٰ بیگم آج کل اور شریف بیٹی، مسز عباس طیب جی کا ناول شوکت آرا بیگم، ۱۹۱۷ء میں چھپا۔ مس حسن بیگم کا ناول روشنک بیگم (۱۹۴۰ء) بھی ایک اہم ناول ہے۔ ضیاء بانو کے تین ناول ’فغانِ اشرف‘ ’فریبِ زندگی‘ اور ’انجامِ زندگی‘ منظرِ عام پر آئے۔ ان کے ناولوں پر راشد الخیری کا اثر نمایاں ہے۔ عباسی بیگم کا ناول ’زہرہ بیگم‘ (۱۹۳۵ء) بھی ایک اہم ناول ہے۔ اس ناول کی ہیروئن زہرہ اپنے دور کی جدید لڑکی کی نمائندہ ہے۔ حمیدہ سلطان مخفی کا ناول ’ثروت آرا بیگم‘ (۱۹۴۲ء) صغریٰ ہمایوں کا سرگزشتِ ہاجرہ (۱۹۲۶ء) بیگم شاہنواز کا ”حسن آرا“ ظفر جہاں بیگم کا ”اختری بیگم“ ”طیبہ بیگم“ کا ”انوری بیگم“ اور محترمہ سدید کا ”بیاضِ سحر“ ایسے ناول ہیں جنہیں اپنے زمانے میں کافی شہرت ملی۔

ان ناولوں میں جس ماحول کی تشکیل کی گئی ہے اور زندگی کے جس نقطۂ نظر کو پیش کیا گیا ہے وہ نئی زندگی اور نئی تعلیم کا تقاضہ ہے۔

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں اردو ناول کی دنیا میں ایک منفرد نام سامنے آتا ہے۔ یہ حجاب امتیاز علی ہیں۔ یہ اپنے عہد کی نہایت ترقی یافتہ اور روشن خیال خاتون ہیں۔ ان کی ترقی پسندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ہندوستان کی پہلی مسلمان خاتون ہوا باز ہیں۔ انہوں نے ۱۹۳۶ء میں ناردن لاہور فلائنگ کلب سے پائلٹ کا لائسنس حاصل کیا۔ رسالہ تہذیب النسواں (۱۹۳۶ء) میں حجاب کے اس کارنامے کا کافی چرچا رہا۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا۔ حجاب امتیاز علی سے تقریباً پچیس تیس سال قبل خواتین کی ایک بڑی تعداد ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھ چکی تھی۔ ان کا مقصد معاشرے بالخصوص طبقۂ نسواں کی اصلاح تھا۔ پیش کش کے انداز پر بھی اس مقصدیت کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اس پس منظر میں حجاب امتیاز علی نے اپنے لئے ایک الگ راہ نکالی اور اپنے ناولوں کے لئے عشق و محبت کے موضوع کا انتخاب کیا۔ حجاب نے زیادہ تر افسانے لکھے۔ ان میں چند طویل تخلیقات ایسی بھی ہیں جو اپنے کینوس اور کرداروں کے دائرۂ عمل کے اعتبار سے ناول یا ناولٹ کے ذیل میں آتی ہیں۔ ان میں دو تخلیقات کافی اہم ہیں
”ظالم محبت“ اور ”میری ناتمام محبت“

حجاب کے ان دونوں ناولوں کا موضوع گرچہ ”محبت“ ہے لیکن ان کے ناولوں کو ہم خالص رومانی ناول نہیں کہہ سکتے۔ یہ ہلکے پھلکے رومانی سوشل ناول ہیں۔ کیوں کہ یہاں بھی بنیادی مسئلہ معاشرہ اور اس کی قدریں اور شادی بیاہ کے مسائل ہیں۔ یہاں محبت اخلاقی اصول و اقدار اور سماجی قوانین سے ٹکراتی ہے۔ اور اس ٹکراؤ میں محبت کی شکست ہوتی ہے۔

حجاب کے ناول رومانی ان معنوں میں ہیں کہ انہوں نے اپنے موضوع کو پیش کرنے کے لیے جس طرح کا ماحول تشکیل کیا ہے وہ ایسے امراء و رؤسا کے طبقے کا ہے جو محلوں میں رہتا ہے جواہرات اور موتیوں میں کھیلتا ہے۔ حجاب کی اس خود ساختہ کائنات میں سب کچھ اتفاقی ہے۔ یہاں تک کہ مسرت اور غم بھی۔ یوں تو اس رومانی طلسمی کائنات میں مسرت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے لیکن صرف مسرت پالینے کا نام نہیں ہے بلکہ کھونے کا غم بھی ان کے لیے

---

[1] اکبری بیگم: ”گودڑ کا لال“ نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔ ص: ۱۵۰
(والدہ افضل علی)

یا ذہن کو مسرت کا بھی سبب بنتا ہے جسے "رومانی غم" بھی کہہ سکتے ہیں۔

حجاب نے ان ناولوں میں موضوع کی مناسبت سے کردار وضع کیے ہیں، لیکن پس منظر میں کردار ٹائپ اور علامتی ہو جاتے ہیں جنہوں نے ان ناولوں کی تین نسلوں کے باہمی رویوں اور ان کے اندرونی تضادات کا نمائندہ بنا دیا ہے۔ حجاب تیسری نسل سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کے اہم کردار دوسرے لفظوں میں ہیرو ہیروئن ان ہی کی نسل کے ہیں۔ جن کا واسطہ ماضی کی دو نسلوں سے ہے۔ یہ کردار ان دو نسلوں اور ان کے خاندانی و معاشرتی تحفظات سے متصادم ہیں۔ شکست تو نئی نسل کی ہوتی ہے۔ لیکن نئی نسل کا پچھلی نسلوں سے خود کو علاحدہ کرنے کی جد و جہد کا پتہ چلتا ہے۔ مغربی تعلیم کے اثر سے بیسویں صدی کے اوائل میں یہ رجحان شروع ہو چکا تھا۔ اس دور کے اس احساس کو حجاب نے اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔

میری ناتمام محبت کی ہیروئن روحی اور ظالم محبت کی ہیروئن جیوتی دونوں ہی معاشرے اور پرانی خاندانی روایات کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر اپنی مرضی کی زندگی جینا چاہتی ہے، لیکن جب روحی کی زندگی کا فیصلہ دادی زبیدہ کے ہاتھوں ہوتا ہے تو وہ سوچتی ہے۔

وہ لوگ مجھے شہباز کی ہونے والی بیوی تصور کرتے ہیں۔
زندگی کی اس گتھی کو سلجھانے میں میری رائے لینا
ضروری نہیں خیال کیا گیا۔ کیوں کہ ہم مشرقی لڑکیوں
کے سینے میں مشرقی بزرگوں کے خیال کے مطابق
دل نہیں ہوتے۔ اور نہ سروں میں دماغ ہی
ہوتے ہیں۔ [1]

یہاں رسم و رواج کے سامنے مشرقی عورت کی ازلی بے دست و پائی کا احساس ملتا ہے۔

عام طور سے یہ کہا جاتا رہا ہے کہ خواتین کی ناول نگاری بنیادی طور پر نذیر احمد اور راشد الخیری کی روایت ہی کی ترقی یا تجدید ہے، لیکن اس دور کی سبھی خواتین ناول نگاروں کے لیے ایک کلیہ کے طور پر ایسا کہنا غلط ہے۔ یہ صحیح ہے کہ چند خواتین ناول نگاروں نے نذیر احمد ہی کی روایات کو آگے بڑھایا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی کچھ خواتین ناول نگار ایسی ہیں کہ نذیر احمد یا راشد الخیری کے اثر سے بالکل آزاد ہیں۔ انہوں نے اپنے طور پر زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی اور خواتین کے لیے ایک نئی زندگی کا خواب دیکھا جہاں خواتین انسانیت کے بنیادی حقوق کی طلب گار ہیں، وہاں انہیں نئی تعلیم و تہذیب سے بہرہ ور ہونے کا حق بھی حاصل ہے۔ ان کے مرکزی کردار کا اگر گھر کے اندر استحصال ہوتا ہے تو وہ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے گھر سے باہر نکل کر جد و جہد کر سکتی ہے۔

مذکورہ خواتین کے ناولوں میں بیشتر کردار کے ناول ہیں۔ ان کا یہ کردار عام طور پر معاشرے کے کسی مخصوص رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں اور تخیل کی پیداوار ہیں۔ یہ جس رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں، وہ سماج کا مثبت یا منفی پہلو ہوتا ہے اور ناول نگاروں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ معاشرہ اپنے منفی رجحانات میں تبدیلی لائے۔ اس کے لیے وہ آئیڈیل کردار تخلیق کرتی ہیں۔ یہ عام طور پر نسائی کردار ہیں۔

ہمیں اس دور کے ناولوں کو جدید فنی معیارات پر نہیں پرکھنا چاہیے اور کرداروں کی پیش کش میں ان کے اپنے تحفظات معتقدات اور جانب داریوں کا بڑا دخل ہے۔ اس لیے کرداروں کی پیش کش میں وہ معروضیت مفقود یا کم ہے جو اعلیٰ کردار نگاری کی بنیادی قدر ہے۔ اس نوع کی معروضیت ان سارے ناول نگاروں کے یہاں کمزور ہے۔ جنہوں نے ناول کو براہِ راست اصلاح معاشرہ کا وسیلہ بنایا۔ نذیر احمد اور پریم چند اس کی مثالیں ہیں۔

اس پورے دور کا ایک خاص رجحان رومانیت ہے۔ جس کے علمبرداروں میں نمایاں نام سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کے ہیں۔ یہ بنیادی طور پر رومانی عینیت پسندی کا دور ہے۔

اس مجموعی حالت سے قطع نظر ان خواتین ناول نگاروں کے یہاں غیر شعوری طور پر ہی سہی بعض بڑے خوبصورت اور دلچسپ کردار وضع ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر محمدی بیگم کے ناول "شریف بیٹی" میں نائن کا کردار شوکت آرا بیگم میں شوکت کی سہیلی سرو ری کا کردار "گدڑ کا لال" میں مقبول بیگم کا کردار۔

ان ناول نگاروں کی ایک اور خوبی جزئیات نگاری پر ان کی دسترس ہے۔ ان کے یہاں اپنے ماحول اور سماجی معاشرتی زندگی کی عکاسی مثلاً متوسط مسلم گھرانوں کا ماحول، شادی بیاہ کے مسائل اور دوسری رسومات کی زندہ تصویریں ملتی ہیں۔

(۳)

۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان "انگارے" کی اشاعت اور ترقی پسند تحریک کے آغاز نے اردو ادب میں ایک نئی حقیقت نگاری کا آغاز ہوا۔ اپنی آئیڈیل کائنات کے لیے خوابوں کی دنیا تخلیق کرنے کے بجائے ادیبوں نے مستقبل کی بنیاد معاشرے کی حقیقت پسندانہ چھان بین

[1] حجاب امتیاز علی: "میری ناتمام محبت" ایلو ریک ڈپو، لکھنؤ ۱۹۵۸ء ص: ۸۶

بررکھی۔ مارکس اور فرائیڈ کے تصورات نے ماضی اور موجودہ معاشرے کی جہان بین کے لیے معیارات فراہم کیے۔ اس عہد کی اہم خاتون ناول نگار عصمت چغتائی نے جدید نفسیات کے معیار پر اپنے مشہور ناول "ٹیڑھی لکیر" میں شمن کے کردار کا مطالعہ پیش کیا۔ ایک ایسی لڑکی جو زندگی کے آغاز سے کہانی کے انجام تک روایتی سماج سے بغاوت کرتی رہی اور جس کا ہر عمل اور ردِ عمل اس کے لاشعوری محرکات کا آئینہ دار تھا۔

عصمت کے ناول میں شمن کی نفسیات ایک نارمل لڑکی کی نفسیات نہیں ہے۔ اس کے گھریلو ماحول نے بچپن ہی سے اس کے مزاج میں کجی پیدا کر دی ہے۔ یہ کجی ختم نہیں ہوتی بلکہ دن بدن اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ عصمت نے شمن کے روزمرہ کے معمولات میں اس کی کجی کے مظاہر پیش کیے ہیں۔ اور محرکات کی جستجو کی ہے جو خارجی بھی ہے اور داخلی بھی۔ خارجی محرکات میں وہ مخصوص معاشرہ ہے جس میں شمن پیدا ہوئی اور پروان چڑھی۔ عصمت نے اس ماحول کی تصویر کشی میں اظہار و بیان کی بھرپور صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ مصنفہ نے خود کو سماجی ماحول کی پیش کش تک محدود نہیں رکھا۔ بصورتِ دیگر شمن ایک ٹائپ کردار بن جاتی ہے، جو مخصوص معاشرے کی نمائندگی کر رہی ہوتی ہے۔ یہ نمائندگی جزوی طور پر شمن کرتی بھی ہے۔ عصمت شمن کے بارے میں لکھتی ہیں:

"شمن کی کہانی کسی ایک لڑکی کی کہانی نہیں ہے
یہ ہزاروں لڑکیوں کی کہانی ہے۔ اس دور کی لڑکیوں
کی کہانی ہے جب وہ پابندیوں اور آزادی کے
بیچ ایک خلا میں لٹک رہی ہیں۔"[1]

لیکن عصمت نے شمن کے کردار کا نفسیاتی تجزیہ پیش کر کے اسے ٹائپ بننے سے بچا لیا ہے۔

لیکن ہم اس ناول کو خالص نفسیاتی ناول نہیں کہہ سکتے — جیسا کہ عام طور پر کہا گیا ہے اس لیے کہ شمن کی نفسیات کی تشکیل میں ماحول کا بھی حصہ ہے اور عصمت نے اس ماحول کی اچھی خاصی تصویر کشی کی ہے۔ اس لیے اگر اسے صرف نفسیاتی نہ کہہ کر سماجی نفسیاتی ناول کہیں تو بہتر ہوگا۔

عصمت نے جس نکتہ پر اس ناول کو ختم کیا ہے وہ شمن کا ماں کے رتبے کو قبول کر لینا ہے۔ یہ ایک نوع کی مراجعت ہے۔

عصمت کا یہ کردار اردو ناول کا ایک اہم کردار ہے — رسوا کے امراؤ جان کی طرح۔ ناول "ٹیڑھی لکیر" کا امتیاز یہ ہے کہ پہلی بار اتنے وسیع کینوس پر کسی ایک کردار کی داخلی زندگی کو پیش کیا گیا — "ٹیڑھی لکیر" کا یہ امتیاز بھی ہے کہ ایک آدھ موقع کے علاوہ عصمت نے شمن سے وہ کام نہیں لیے جنہیں علم نفسیات کی معلومات کی دین کہا جائے۔ اس لیے کہ جب بھی کوئی نفسیاتی کہانی لکھی جاتی ہے تو مصنف کے لیے یہ چیلنج ہمیشہ بنا رہتا ہے کہ وہ کہانی کو کیس ہسٹری بننے سے بچائے۔ عصمت اس مقصد میں کامیاب ہیں۔

عصمت کے دوسرے ناول "ضدی" "معصومہ" "سودائی" "عجیب آدمی" "دل کی دنیا" اور تاریخی ناول "ایک قطرہ خون" ہیں۔ ان ناولوں کو "ٹیڑھی لکیر" جیسی ادبی اہمیت حاصل نہیں ہو سکی۔

(۴)

۱۹۴۷ء کے آس پاس اور اس کے بعد خواتین ناول نگاروں کی ایک کھیپ ہے جنہوں نے اردو ناول کے فکری و فنی ارتقا میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان میں قرۃ العین حیدر کا نام نہ صرف خواتین ناول نگاروں میں بلکہ اردو ناولوں کی تاریخ میں سب سے معتبر نام ہے۔

قرۃ العین حیدر نے اردو ناول میں ایک نئی حقیقت کی روایت قائم کی ہے، جسے "تاریخی حقیقت نگاری" کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اس اصطلاح کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ اگر ہم ۱۹۴۷ء کے بعد کے روبہ زوال معاشرے کا تصور کریں جس میں قدروں کی شکست و ریخت کی رفتار خاصی تیز تھی اور کسی واضح سمت کی موجودگی کا دور دور تک نشان نہیں تھا۔ قرۃ العین حیدر کا داستان طراز ذہن اسی تہذیبی زوال کو اپنا موضوع بنا لیتا ہے جو بات قرۃ العین حیدر کو اپنے ماقبل اور ہمعصر فکشن نگاروں سے ممتاز اور منفرد کرتی ہے۔ وہ یہ کہ دوسرے ادیبوں نے ماضی سے صرفِ نظر کر کے صرف حال کو مرکزِ توجہ سمجھا۔ اس کے برخلاف قرۃ العین حیدر نے ماضی کو ایک حقیقت تسلیم کیا اور اسے حال اور مستقبل سے اس طرح مربوط کیا کہ ان کی یہ کوشش اردو فکشن میں ایک اجتہادی کوشش بن گئی۔ اس طرح انہوں نے وقت کے تجربے کو پہلی بار وسیع کینوس عطا کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے اس مخصوص طریقۂ کار کو نئی میں نے تاریخی حقیقت نگاری سمجھا ہے۔ یہ تاریخی حقیقت نگاری بنیادی طور پر حقیقت کی تلاش اور اس تک رسائی کا ایک کارگر وسیلہ ہے۔

قرۃ العین حیدر کے اب تک ۶ ناول منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ میرے بھی صنم خانے (۱۹۴۰ء) سفینۂ غمِ دل (۱۹۵۲ء) آگ کا دریا (۱۹۵۹ء) آخرِ شب کا ہمسفر (۱۹۷۹ء) کارِ جہاں دراز ہے (۱۹۷۷) گردشِ رنگِ چمن (۱۹۸۹ء)

---

[1] عصمت چغتائی (پیش لفظ) "ٹیڑھی لکیر" کتاب کار، رام پور، یوپی ۱۹۶۷ء

پہلے تین ناولوں کے مطالعے کے بعد جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ ان ناولوں کا محرک بنیادی طور پر ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم ہے۔ تقسیم سے پیدا صورتِ حال نے سوچنے والے ذہنوں کو جس طرح متاثر کیا اور جس اضطراب سے دوچار کیا۔ قرۃ العین حیدر کے تینوں ناول اسی کا آئینہ ہیں۔ "آگ کا دریا" ان کا کارنامہ ہے۔ یہ ناول ایک وسیع کینوس پر لکھا گیا جس میں فن کار کے نقطۂ نظر اور فنی طریقۂ کار کی مختلف جہتیں ملتی ہیں۔

"آگ کا دریا" میں تین ایسے عہد ہیں جن کا تعلق ہندوستان کے ماضی کی تاریخ سے ہے۔ ان تینوں عہد کی تخلیق تو ایک ایسے پیٹرن پر ہوتی ہے جسے ہم آسانی کے لیے پریوں کی کہانی کا پیٹرن کہہ سکتے ہیں لیکن صرف اس حد تک کہ ایک خوابناک فضا میں ناول کے تاریخی کردار سانس لیتے ہیں اور اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی شکست کے تجربے سے گزرتے ہیں۔ ورنہ یہ پیٹرن بنیادی طور پر حقیقی زندگی کے تجربے سے برآمد ہوتا ہے جسے ہم برت نہیں سکتے تو کم از کم محسوس ضرور کر سکتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے سبھی ناولوں میں تاریخی فضا ملتی ہے تو کیا ان ناولوں کی کشش محض تاریخی واقعیت کا نتیجہ ہے یا اس نقطۂ نظر میں پوشیدہ ہے، جسے وہ اپنے کرداروں کے ذریعے یا از خود مختلف سماجی یا تاریخی رویّوں سے اخذ کرتی ہیں یا اس کی کشش کہیں اور ہے؟ ناول تاریخ کا بیان محض نہیں ہوتا اور نہ ہی نقطۂ نظر کی صداقت پیش کرنا فن کار کی ذمہ داری ہے۔ فکشن کا تعلق التباس سے ہے اور التباس پیدا کرنے کے لیے فن کار واقعات کی ترتیب اس انداز سے کرتا ہے کہ ناول کے سارے اجزا مل کر ایک وحدت بناتے ہیں۔ ایسی وحدت جس میں بظاہر مختلف النوع اجزا، مرئی یا غیر مرئی رشتوں میں منسلک اور پیوست ہوتے ہیں۔ جسے ہم "مواد کی تخیلی تشکیل کا نام" دے سکتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کی کامیابی دراصل اس بات میں ہے کہ وہ 'تاریخ'، ماحول اور حقیقی مشاہدے کو اس طرح پیش کرتی ہیں کہ تاریخ کی واقعیت بھی برقرار رہتی ہے۔ اور پورا بیان، فکشن کا تاثر بھی قائم رکھتا ہے۔

"آگ کا دریا" کے چار حصے ہیں جو ہندوستان کی تاریخ کے چار عہد کو پیش کرتے ہیں اور ہر عہد بجائے خود ایک مستقل وحدت کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ تکنیک کے لحاظ سے یہ ایک پیچیدہ ناول ہے۔ اس لیے کہ ایسی صورت میں فن کار کا پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ ان چاروں وحدتوں میں ایسا رشتہ تلاش کرے جو انہیں باہم مربوط و منسلک رکھے۔ دوسرے یہ کہ ان علاحدہ وحدتوں کے سارے اجزا بھی ایک دوسرے سے مربوط ہوں قرۃ العین حیدر نے اس پیچیدہ تکنیکی مسئلے کو خوب صورتی کے ساتھ حل کیا ہے جس کا تعلق وقت کے اس تصور سے ہے جو ناول کے آغاز میں ایلیٹ کے چند مصرعوں میں اُجاگر ہوا ہے۔

لوگ بدل جاتے ہیں۔ مسکراتے بھی ہیں، مگر کرب
موجود رہتا ہے۔ لاشوں میں خس و خاشاک کو اپنی
موجوں میں بہاتے ہوئے دریا کے مانند وقت
جو تباہ کن ہے قائم بھی رکھتا ہے۔

اس ناول میں قرۃ العین حیدر کا بنیادی مسئلہ بھی یہی ہے کہ معاشرہ بدلتا رہتا ہے۔ قدریں بدلتی رہتی ہیں، لیکن جو چیز مستقل ہے وہ کرب کا لمحہ ہے جو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کردار کے داخلی جذبات و احساسات، ذہنی کائنات اور معاشرتی قدروں کے درمیان تصادم پیدا ہوتا ہے۔ یہ تصادم جو فرد کے اپنے اندرون میں جنم لیتا ہے اور آہستہ آہستہ اسے موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے یا پھر ایک ایسی طاقت کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیتا ہے جس پر اس فرد کی دسترس نہیں ہوتی۔ جسے وقت یا تاریخی جبر یا قسمت کا نام دے سکتے ہیں۔ ناول کے پہلے حصے میں گوتم نیلمبر کی ذہنی اور جذباتی کشمکش اور پھر انجام دوسرے حصے میں کمال، تیسرے حصے میں چمپا بائی اور چوتھے حصے میں چمپا احمد کا انجام۔ دراصل کرب کا وہ تسلسل ہے جو دائمی ہے۔ مصنفہ نے جبریت کے اس تسلسل کو ہندوستان کی تاریخ کے چار عہد میں پیش کیا ہے اور اس طرح ناول کو افسانوی وحدت عطا کی ہے۔

پلاٹ کی تشکیل قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں غیر روایتی ہے۔ ابتدا، وسط اور انجام پلاٹ کی روایتی ترتیب کے مجرد نام ہیں۔ گرچہ اس طرح کا زمانی تسلسل قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں کبھی کہیں کہیں ملتا ہے۔ ان کے کردار چونکہ عمل (یعنی Action) سے زیادہ ذہنی تصورات اور محسوسات سے علاقہ رکھتے ہیں، اس لیے وہ بیک وقت تینوں زمانوں میں سفر کرتے ہیں۔ یعنی کردار کے شعور میں آکر تینوں زمانے ماضی، حال، مستقبل ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ کرداروں کی اس ذہنی زندگی کو پیش کرنے کے لیے وہ داخلی خود کلامی کا سہارا لیتی ہیں۔ فلیش بیک کی تکنیک استعمال کرتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے اس تکنیکی رویّہ کو لوگوں نے شعور کی رو کہا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے تقریباً سبھی اہم کردار بنیادی طور پر علامتی ہیں۔ علامتی ان معنوں میں کہ وہ کسی نہ کسی مخصوص تصوّر یا صورتِ حال کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کرداروں کے توسط سے فن کار کسی آفاقی حقیقت یا ویژن تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ کردار بجائے خود انفرادی اہمیت اختیار نہیں کرتے۔ اہمیت اس حقیقت یا ویژن کی ہے جس تک سارے کردار اپنے تجربات اور تصورات سے پہنچتے ہیں۔ اس

وژن تک پہنچنے کے لیے قرۃ العین نے جو فنی راہ تلاش کی اس کے بارے میں ورجینیا وولف پر لکھتے ہوئے اوربیک (Awrbeoh) نے اشارہ کیا ہے کہ ورجینیا وولف کرداروں کی پیش کش میں حقیقت کا کثیر شخصی تناظر کا سہارا لیتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے سلسلے میں بھی ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ان کے سبھی ناولوں میں یہ تکنیک ملتی ہے۔ بالخصوص ایسے مواقع پر جہاں ایک سے زیادہ کردار کسی خاص صورتِ حال پر تبصرہ کر رہے ہوتے ہیں

قرۃ العین حیدر کے بعض کرداروں کی ایسی انفرادی خصوصیات بھی ہوتی ہیں جو انہیں محض نمائندگی سے بلند کر کے قاری کے ذہن پر منفرد اثر ڈالتی ہیں۔ "آگ کا دریا" میں گوتم نیلمبر اردو ناول کی تاریخ کا وہ اکلوتا کردار ہے جو قدیم ہندوستان کی روح کو ہم پر عیاں کرتا ہے، اس لیے وہ محض نمائندہ کردار نہیں رہتا بلکہ اس کی ایک علاحدہ شناخت بھی بن جاتی ہے۔ اس طرح کے کرداروں میں نسوانی کردار زیادہ ہیں۔ "آگ کا دریا" کی چمپا جو ناول کے ہر عہد میں خالص ہندوستانی عورت کی نمائندگی کرتی ہے اور اپنی اس نمائندگی میں اپنی انفرادیت بھی قائم رکھتی ہے۔ "آخرِ شب کے ہمسفر" کی دیپالی اور "سیتا ہرن" کی سیتا میر چندانی اور "گردشِ رنگِ چمن" کے کئی نسوانی کردار اسی ذیل میں آتے ہیں۔ ان کے تمام نسوانی کردار المیہ کردار ہیں۔ تنہائی یا پھر ذہنی اور جسمانی جلاوطنی یا ہجرت جن کا مقدر رہی ہے۔

اس رجحان کی ایک عمدہ مثال ان کا نیا ناول "گردشِ رنگِ چمن" ہے۔ اس ناول میں مصنفہ نے تقریباً ۱۳۰ سال کے عرصے کو موضوع بنایا ہے۔ ۱۹۴۷ء ان کے بیشتر ناولوں کی طرح اس ناول میں بھی خطِ فاصل کا کام کرتا ہے۔ ۴۷ء سے قبل اور بعد کے دونوں زمانے بظاہر مختلف لیکن بہ باطن ایک جیسے انسانی رویوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ فیوڈل نظام میں انسانی قدروں کی پامالی اگر ۴۷ء سے قبل کا محور ہے تو قدروں کی شکست و ریخت کے ماحول میں خاصی طرح صرفیت کا میلان ۱۹۴۷ء کے بعد کا محور رہا ہے۔ عندلیب بانو، ۴۷ء سے قبل کی صورتِ حال کی نمائندگی کرتی ہے اور نواب شاد عرف وتن میاں سے ۴۷ء کے بعد کی نمائندگی ہوتی ہے — عندلیب کی اپنی بیٹی عنبرین کے وسیلے سے موجودہ معاشرے میں کھوئی ہوئی شناخت کے از سرِ نو حصول اور معاشرے میں خود کو قابلِ قبول بنانے کی کوشش ہے اور پھر ناکامی اس ناول کا خوف زدہ کر دینے والا المیہ باب ہے تو دوسری طرف نگار خانم اور اس کے ہاتھوں صرفیت مائل سوسائٹی میں آرٹ اور فن کی بے حرمتی دوسرا آنکھیں کھول دینے والا تجربہ ہے۔ قرۃ العین حیدر کا یہ ناول یقیناً جدید عہد کا رزمیہ ہے۔

قرۃ العین حیدر کے بعد خدیجہ مستور اہم خاتون اور ناول نگار کی حیثیت سے سامنے آئی ہیں۔ انہوں نے دو ناول لکھے آنگن اور زمین۔ آزادی کے بعد لکھے جانے والے ناولوں میں "آنگن" ایک اہم ناول ہے اس کی کہانی دوسری جنگِ عظیم، تحریکِ آزادی، برصغیر کی تقسیم اور تقسیم کے بعد تک کے زمانے پر محیط ہے۔ اس میں ایک متوسط الحال خاندان کی کہانی کے ذریعے اس پورے دور کو از سرِ نو تخلیق کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس ناول میں دو بھرپور اور بامعنی کردار ابھر کر سامنے آئے ہیں عالیہ اور چھمی۔ عالیہ اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ اس کردار کے اندر بجائے خود موضوع بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ وہ پورے اپنے خاندانی ماحول سے غیر مطمئن اور بےزار ہے۔ لیکن اس کے اندر بغاوت یا احتجاج کی قوت نہیں ہے۔ وہ جب بھی کوئی فیصلہ کرنا چاہتی ہے، تذبذب کے عالم میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ دراصل اس کی ذکی الحس طبیعت ہے۔ اس کی ذکی الحسی بالآخر اُسے تنہا کر دیتی ہے۔ یہی تنہائی اس کی شکست بھی ہے اور شاید اس کا آئیڈیل بھی — عالیہ بھی "میرے بھی صنم خانے" کی رخشندہ اور "آگ کا دریا" کے آخری دور کی چمپا کے ساتھ کھڑی نظر آتی ہے۔ یہ تینوں کردار ایک ہی عہد سے تعلق رکھتے ہیں اور ذہن و احساس اور حالات یا تقدیر کی سطح پر مماثلت رکھتے ہیں۔ 'آنگن' بھی عالیہ کی تنہائی کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔

اس ناول کا دوسرا اہم کردار چھمی کا ہے۔ چھمی کا کردار "ٹیڑھی لکیر" کی شمن کی طرح منفرد ہے۔ اس کی انفرادیت اس بات میں ہے کہ وہ عام گھریلو خواتین سے الگ اپنا ایک مخصوص مزاج رکھتی ہے۔ سمجھوتہ نہ کرنے والا مزاج، وہ سارے اقدام جو وہ اپنے اندر کی آواز کے مطابق کرتی ہے اُسے عام لڑکیوں سے منفرد بناتے ہیں اور وہ عالیہ کے سامنے ایک فعال کردار کے روپ میں سامنے آتی ہے۔

اسی دور میں جمیلہ ہاشمی کا نام بھی ایک جانا پہچانا نام ہے۔ ان کے پہلے ناول "تلاشِ بہاراں" (۱۹۶۱ء) کو کافی شہرت ملی۔ اس شہرت کی بنیادی وجہ یہ رہی کہ اسے 'آدم جی' ادبی انعام ملا تھا۔ لیکن فنی اعتبار سے یہ ناول کمزور سمجھا گیا۔ اور اُسے ادبی حلقوں میں زیادہ پذیرائی نہ مل سکی۔

ان کے دوسرے ناول اور ناولٹ تلاشِ بہاراں کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہیں۔ جن میں 'آتشِ رفتہ' اور 'روہی' کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے ماضی قریب میں دو ایسے ناول لکھے ہیں، جس میں انہوں نے دو تاریخی کرداروں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ پہلا "چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو" اور دوسرا "دشت سوس"

"چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو" ایران کی مشہور شاعرہ قرۃ العین طاہرہ کی زندگی کو پیش کرتا ہے۔ "دشت سوس" میں حسین ابن منصور حلاج کی زندگی

کو موضوع بنایا ہے۔ یہ دونوں ناول اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہیں اور جمیلہ ہاشمی کے اسلوب کی شعریت یہاں موضوع سے میل کھاتی نظر آتی ہے۔ یہاں ان کے بیان میں پختگی اور موضوع پر دسترس کا احساس ہوتا ہے۔

رضیہ فصیح احمد کو شہرت ان کے ناول "آبلہ پا" کے ذریعہ ملی۔ آبلہ پا بھی دراصل ایک کردار کا ناول ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار ایک لڑکی 'صبا' کا ہے۔ دوسرا اہم کردار اسد کا ہے۔ صبا سمجھدار اور حساس لڑکی ہے جب کہ اسد پیچیدہ شخصیت اور بری خصلتیں رکھنے والا انسان ہے۔ اس انسان کے ساتھ صبا کو کن حالات سے گزرنا پڑتا ہے — پوری کہانی اس عمل اور ردِ عمل کے ذریعے آگے بڑھتی ہے۔ آخر میں صبا ان حالات سے گزر کر ایسے فیصلے پر پہنچتی ہے جو بہرحال ایک مثبت مقام کی نشاندہی کرتا ہے۔

جیلانی بانو کے اب تک دو ناول شائع ہوئے ہیں۔ "ایوانِ غزل" (۱۹۷۶ء) اور "بارشِ سنگ"۔ ایوانِ غزل، ۱۹۴۷ء کے بعد لکھے جانے والے ان ناولوں اور کہانیوں کا تسلسل ہے، جن میں آزادی سے قبل ہندوستان میں موجود جاگیرداری نظام کے خلاف احتجاج کی آواز ہے۔ ساتھ ہی جیلانی بانو ملک میں ابھرنے والی ان نئی طاقتوں کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں۔ جو پرانے نظام کا تختہ الٹنے کے درپے تھیں۔

ناول کی پیش کش میں جیلانی بانو نے ایک علامتی فضا تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ناول کی ابتدا اور درمیان میں وقتاً فوقتاً ناول کے مرکزی کردار غزل اور صنفِ غزل کے درمیان مشابہت تلاش کی گئی ہے لیکن یہ پیش کش زیادہ بامعنی نہیں بن سکی۔ اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ جیلانی بانو نے اردو ناول کی "غزل" کی شکل میں ایک بہتر کردار عطا کیا ہے۔

بانو قدسیہ پاکستان کی مشہور مصنفہ ہیں۔ ان کا ناول "راجہ گدھ" ایک کامیاب اور معتبر تخلیق ہے۔ اس ناول پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے خود مصنفہ نے کہا ہے کہ اس ناول کا موضوع "رزق حلال وحرام" کا مسئلہ ہے۔ مصنفہ کی وضاحت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اخلاقی ناول ہے، جس کا مقصد بالواسطہ طور پر عوام کی توجہ رزق حلال کی طرف مبذول کرانا اور رزق حرام سے نفرت پیدا کرنا ہے کہ رزق حرام پر پلی ہوئی مخلوق روحانی اور اخلاقی دیوالیہ پن کا شکار ہوتی جا رہی ہے اور دیوانگی اس کا مقدر بن رہی ہے۔ اس بے راہ روی کا سبب مصنفہ کی نظر میں مغرب کی آزاد روی اور اس کا حرام وحلال کے تصور سے ناآشنا ہونا ہے، جس کی تقلید اہلِ مشرق تیزی سے کر رہے ہیں۔ اور نتیجہ میں مختلف ذہنی جذباتی ناآسودگیوں کا شکار ہو کر دیوانگی کے غار میں گرتے جا رہے ہیں۔

مصنفہ کی وضاحت سے قطع نظر اس ناول کو دوسرے انداز سے بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ ناول کا ارتقا، جس انداز سے ہوا ہے اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ناول کا محور قیوم کی ذات ہے جو زندگی کے سفر میں مختلف ذہنی اور جذباتی تجربات سے گزرتا ہے۔ ان سارے تجربات کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ناول ایک ایسے فرد کی داستان ہے جو مخصوص سماجی ماحول میں پورے سماج سے کٹا ہوا تنہا آدمی ہے۔ اس طرح اس ناول کا موضوع جدید مادّی معاشرے میں فرد کی تنہائی ہے۔ تنہائی کے اس تجربے میں ناول کے تمام اہم کردار۔ قیوم، سیمی، امتل اور سہیل شریک ہوتے ہیں۔ یہ کردار وجود کی معنویت کی تلاش میں کبھی تجربات سے گزرتے ہیں۔ اس نے ناول کو ایک المیاتی رُخ دیا ہے۔ ان سب کا انجام یہ ہے کہ ان کے ذہن وروح میں زندگی کی بے معنویت کا احساس اور موت سے ہم آغوشی کی خواہش جاگزیں ہو جاتی ہے۔

"راجہ گدھ" کو ہم پورے طور پر وجودی تجربے کا ناول نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس میں اس نقطۂ نظر کا واضح اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس ناول کا تقریباً ہر اہم کردار اپنے وجود کی پہنائیوں میں سرگرمِ سفر ہے اور انجام کار تنہائی، خودکشی، موت یا دیوانہ پن اس کا مقدر بنتا ہے۔ وجودی فلسفے کی رُو سے اگرچہ ہر فرد کا تجربہ خالص ذاتی تجربہ ہوتا ہے لیکن کوئی فرد اپنے گرد وپیش اور اپنے ماحول سے بے گانہ نہیں ہو سکتا اور ہر انسان کے اندر اظہار وعمل اور انتخاب کی آزادی کی ایک خواہش بھی ہوتی ہے۔ اور وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل سے دست بردار ہونا نہیں چاہتا۔ جب اس کی یہ خواہش خارجی عوامل، ماحول اور معاشرے سے متصادم ہوتی ہے تو نتیجے میں وجود کی شکست وریخت سامنے آتی ہے — جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس ناول کا محور قیوم کا کردار ہے۔ دوسرے کردار ثانوی ہیں اور قیوم کے کردار کو ابھارنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ البتہ اس ناول کا ایک نسائی کردار امتل قابلِ توجہ ہے۔ وہ ایک طوائف ہے۔ وہ عام طوائفوں سے الگ مزاج رکھتی ہے۔ امتل کی زندگی کی پوری جدوجہد اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس نے ایک بہتر زندگی گزارنے کا خواب دیکھا۔ اس کے لیے کوششیں بھی کیں لیکن ناکام رہی کیوں کہ اس کے لیے اسے اپنی آزادی سے دستبردار ہونا تھا۔ اس نے جس شخص سے شادی کی وہ اس کی زندگی کے ہر لمحے کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنا چاہتا تھا۔ امتل نے اپنی آزادی کا سودا نہیں کیا۔ اس کے مقابلے میں زندگی کے جنگل میں تنہا بھٹکنے کو ترجیح دی۔

خواتین ناول نگاری کے جائزے یا مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ابتدائی ناول نگاروں کی کوششوں کا محور خواتین کو سوسائٹی میں وہ

مقام دلانا رہا ہے جس سے وہ عام طور پر محروم رکھی گئی ہیں یا پھر male dominated معاشرے نے خواتین کو جن چند محدود دائروں میں قید کر رکھا تھا ان سے باہر نکالتا رہا ہے۔ ابتدائی خواتین ناول نگاروں نے اپنے مرکزی نسائی کرداروں کے واسطے سے اس سنگین صورت حال کا حل خواتین کی جدید تعلیم میں تلاش کیا ہے۔ ان کے خیال میں جدید تعلیم خواتین میں اچھے شہری ہونے کا شعور بیدار کر سکتی ہے۔

قرۃ العین حیدر اور بعد کی ناول نگاروں نے اس طرح کے سماجی اور معاشرتی مسئلہ سے علاقہ نہیں رکھا۔ حالانکہ ان کی تحریروں میں یہ بات موجود ہے کہ موجودہ معاشرے میں خواتین کے ساتھ کیا جانے والا برتاؤ غیر انسانی ہے۔ ان ناول نگاروں کے کردار تعلیم یافتہ ہیں۔ ان کے نسائی مرکزی کرداروں کا مسئلہ خود آگہی کو تشخص Identity اور آزادی کے لیے استعمال کرنا اور اس طرح اپنی شخصیت کے معنی تلاش کرنا ہے۔ ان کرداروں کی جدوجہد زندگی کو بامعنی بنانا ہے اور اس جدوجہد میں ایک نئی کشمکش سے گزرتی ہیں۔ یہ کشمکش قسمت اور انتخاب کی آزادی اور خود ارادیت کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ جس میں وہ اکثر شکست سے دوچار ہوتی ہیں۔ دیپالی سرکار جلاوطنی میں شادی کا سمجھوتہ کر کے شکست دکھاتی ہے تو عنبرین بیگ اعصابی مریضہ بن جاتی ہے اور 'آگ کا دریا' کی چمپا کا مقدر تنہائی اور گوشہ نشینی ٹھہرتا ہے۔ تقریباً اس نوع کا انجام "آنگن" کی عالیہ کا ہے۔

یہاں بس ایک سوال کیا جا سکتا ہے کہ آخران خواتین ناول نگاروں نے اپنے کرداروں کو ایک ایسا تشخص کیوں نہیں دلایا جو نسائی ہوتا۔ ایک آزاد خود مختار وجود جس میں نسائیت کی نفی یا نسائیت سے گریز نہیں ہوتا بلکہ اس کا اعتراف اور پھر وجود کا تخلیقی اظہار۔ غالباً یہ اس لیے بھی نہیں ہو سکا کہ ہماری ساری کوشش کا محور مردوں جیسا بننا یا ان کی برابری کرنا رہا ہے یا پھر مردوں سے انصاف اور قبولیت کا مطالبہ۔ جب کہ اصل مسئلہ مساوات یا انصاف کا مطالبہ نہیں بلکہ اپنے تشخص کی تلاش ہے۔ ایسا تشخص جس کی بنیاد نسائیت کی نفی پر نہ رکھی گئی ہو۔ اردو ناول کا ایک بڑا حصہ کمرشیل یا مقبولِ عام ناولوں پر بھی مشتمل ہے۔

خواتین نے اگر ایک طرف ادبی یا سنجیدہ ناول لکھ کر اردو فکشن کو وقار بخشا ہے تو دوسری طرف مقبولِ عام یا تفریحی ناول لکھ کر عوام کی دلچسپی کا سامان بھی مہیا کرتی رہی ہیں۔

بقیہ: تاریخی ناول

نہیں کہ تاریخی ناول کو متعارف کرانے میں ان ناولوں نے اچھا رول ادا کیا اور دھیرے دھیرے ناول مخالف طبقہ بھی اُسے پسند کرنے لگا اور یہ خوب خوب مقبول ہونے لگے۔ چنانچہ تاریخی ناولوں کی بے پناہ مقبولیت دیکھ کر لکھنے والوں کی ایک بھیڑ دوڑ پڑی۔ رئیس احمد جعفری، نسیم حجازی، صادق سردھنوی، مائل ملیح آبادی۔ ایم۔ اسلم، احسن فاروقی وغیرہ وغیرہ —— لیکن کیا یہ تمام ناول نگار باوجود اس کے کہ ناولوں کے انبار لگا گئے ادب میں بحیثیت تاریخی ناول نگار کوئی اہم مقام بنا پائے۔ کچھ فیصلہ تو وقت نے کر دیا ہے کچھ اور آگے کر دے گا۔ میرا خیال ہے کہ چند ناولوں کو چھوڑ کر زیادہ تر ناول ادبی نقطۂ نظر سے کم تاجرانہ نقطۂ نظر سے زیادہ لکھے گئے اور اسی وجہ سے یہ تمام ناول تجارت تو کر گئے، لیکن اُردو کے اچھے تاریخی ناولوں کی صف میں کھڑا ہونا ان کے لیے مشکل ہو رہا ہے۔

چھ سات صفحات میں محض تاریخی یا رومانی واقعات کو اوراق پر رقم کر دینا فن نہیں۔ تاریخی ناول تو وہ ہے جس میں روحِ عصر اُبھر کر سامنے آجائے۔ عزیز احمد کے دو ناولٹ "جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں" اور "خدنگ جستہ" باوجود مختصر ہونے کے ان ضخیم ناولوں کے مقابلے میں بہت کامیاب ہوئے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اردو میں شرر کے بعد کوئی ایسا ناول نگار نہیں ہے جو تاریخی ناول کی ان فنی نزاکتوں کو برت سکے، جس کے بغیر تاریخی ناول کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ سوائے عزیز احمد کے۔ ناولٹ یا ناولوں کی بھیڑ میں بڑی تلاش کے بعد دو ایک نام اور لیے جا سکتے ہیں۔ تاریخی ناولوں کا ایک دور تھا۔ جو رفتہ رفتہ اس عہد کے ساتھ ختم ہو گیا۔ سماج نے کروٹ لی تو ناول کی دنیا بدل گئی۔ انگریزوں کی رخصت، ہندوستان کی تقسیم اور جدید دور کے اقتصادی و معاشی ہنگاموں نے ناول کے لیے ایسے زبردست موضوعات فراہم کیے کہ تاریخ کی طرف کسی کا دھیان بھی نہ جا سکا۔ ایسی پُرپیچ فضا میں قاضی عبدالستار ہی ایسے ناول نگار ہیں جو حال کے اس طوفان میں تاریخ کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔ صلاح الدین ایوبی، داراشکوہ اور غالب اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ جو گزشتہ دس برس کے درمیان لکھے گئے۔

بیسویں صدی کی ان آخری دہائیوں میں تاریخی ناول برائے نام لکھے گئے۔ بڑی حد تک قاضی عبدالستار نے اور کسی حد تک عصمت چغتائی نے ایک قطرۂ خون لکھ کر اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ آج کا ماحول تاریخی ناول نگار پیدا کرنے کے حق میں ہے یا نہیں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ تنہا اُردو میں ہی نہیں بلکہ ہر ادب کے تاریخی ناول ایک خاص ضرورت، ماحول اور مزاج کی پیداوار رہے ہیں۔ ●●

یہ صبح زندہ رہے گی

جہلم میں ہمارے قیام کا انتظام پاکستان تمباکو کمپنی کے گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ ظاہر ہے یہ انتظام ملہوترہ کی وساطت سے ہی ہوا تھا۔ انتظام کی ذمہ داری صغیر احمد اخلاق پر تھی۔ جو پاکستان تمباکو کمپنی جہلم کے لینٹرن کلب کا ممبر تھا۔ امداد ہمدانی نے شام کا پروگرام خاصا ٹائٹ بنا رکھا تھا۔ اس لیے یہی سوچا کہ ہم تھوڑی دیر کے لیے گیسٹ ہاؤس چلے جائیں۔ ہاتھ منہ دھولیں، کپڑے بدلیں اور ذرا دیر کو آرام بھی کرلیں۔ میں صغیر احمد اخلاق کی گاڑی میں بیٹھ گیا اور امداد ہمدانی میری جگہ ہماری والی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گیسٹ ہاؤس شہر سے کچھ دوری پر تھا۔ کافی بڑا علاقہ تھا جس میں پاکستان تمباکو کمپنی کے کچھ افسر بھی رہتے تھے اور ان کا کلب بھی تھا۔ خاصی خوب صورت جگہ تھی۔ صغیر احمد نے بتایا کہ یہ سارا علاقہ تقسیم سے پہلے امپیریل تمباکو کمپنی کے پاس تھا اور بلڈنگیں بھی اسی زمانے کی بنی ہوئی تھیں۔ سڑکیں خوب صورت تھیں۔ لانز بہت اچھے تھے۔ درختوں کی بھرمار تھی۔ اور پھولوں نے فضا کو مہکا رکھا تھا۔ گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ صغیر احمد اخلاق بڑی دلچسپ شخصیت کا مالک تھا۔ وہ دہرہ دون میں پیدا ہوا تھا اور جب تقسیم کے بعد وہ پاکستان آیا تھا تو اُس کی عمر کوئی تیرہ چودہ برس کی تھی۔ وہ اب بھی دہرہ دون کی فضاؤں کو یاد کرتا تھا۔ صغیر احمد کا پیشہ تو تجارت تھا لیکن اُسے "اقوالِ زرّیں" جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ یہ ایک طرح سے اس کی ہابی تھی۔ گیسٹ ہاؤس پہنچنے تک اُس نے مجھے کئی بڑے آدمیوں اور پیغمبروں کے اقوال سُنائے۔ اس کے پاس ان جواہر پاروں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ وہ سُناتا رہا اور میں سُنتا رہا۔ بعد میں اُس نے یہ قیمتی اقوال مجھے لکھ کر دیے۔ کچھ اقوال جن سے میں متاثر ہوا۔ آپ بھی سُن لیجیے۔ ایسی چیزیں تو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچنی چاہئیں۔ کیوں کہ ان میں تو صدیوں کی ریاضت اور دانش کے پرتو ہوتے ہیں۔

فرمان : حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ :

اللہ تعالیٰ اُس شخص کو دوست رکھتا ہے جس میں دریا جیسی سخاوت، آفتاب جیسی شفقت اور زمین جیسی تواضع ہو۔

فرمان : خواجہ نظام الدین اولیاءؒ

اگر کوئی شخص تمہیں تکلیف دینے کے لیے تمہارے راستے میں کانٹے بچھا دے اور تم بھی اس کے بدلے میں اس کے راستے میں کانٹے بچھاؤ تو دنیا میں کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں۔

فرمان : حضرت علی ہجویری :

سارے مُلک کا بگاڑ ان تین گروہوں کے بگڑنے پر ہے :

حکمراں جب بے علم ہو

عالم جب بے عمل ہو

اور فقراء جب بے توکّل ہوں

ہرلِش چندانہ کا قول :

جہاں یقین کا سورج روشن ہو، وہاں مایوسیوں کا اندھیرا نہیں پہنچتا۔

ملہوترہ والی گاڑی گیسٹ ہاؤس میں پہلے پہنچ چکی تھی۔ ہماری گاڑی تھوڑی دیر کے بعد پہنچی۔ لیکن مجھے صغیر احمد اخلاق کے ساتھ گزرے ہوئے لمحے اچھے لگے۔ اس کے خیالات اور نظریات نے مجھے متاثر کیا۔ گیسٹ ہاؤس واقعی بہت اچھا تھا۔ گوپال اور میں ایک سوٹ میں تھے۔ ملہوترہ اور رنگی دوسرے سوٹ میں۔ ہاتھ منہ دھویا، چائے پی، کپڑے بدلے اور پھر نکل پڑے۔ امداد ہمدانی اور صغیر احمد نے سستانے کی مہلت نہ دی۔

یہ دونوں حضرات سب سے پہلے ہمیں تحصیل روڈ پر شاکر حسین رضوی کے مکان پر لے

گئے، جس کا تعلق انبالہ سے تھا۔

رضوی نے تو بڑا اہتمام کر رکھا تھا ہمارے لیے۔ اپنے کچھ دوست بھی بلا رکھے تھے۔ مکان بہت بڑا تھا۔ شاکر حسین رضوی نے بتایا کہ وہ مکان باہری لال چند ملہوترہ کا تھا جو تقسیم سے پہلے جہلم میں ٹمبر مرچنٹ تھے اور ان کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ گفتگو کے دوران یہ بھی معلوم ہوا کہ سونی پت (ہریانہ) میں ایٹلس سائیکل والے رائے بہادر جانکی داس لال چند ملہوترہ کے ہم زلف تھے۔ ہم لوگ چائے بھی پیتے رہے۔ اور باتیں بھی کرتے رہے۔ شاکر حسین نے بتایا کہ اس کے والد قائم حسین (علیگ) لالہ چرن داس کے انبالہ سٹی کے ناولٹی سینما میں پارٹنر ہوا کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ رضوی خاندان کا انبالہ سے گہرا تعلق تھا۔ اُس نے انبالہ کی کچھ اور مشہور شخصیتوں کا بھی ذکر کیا، جن میں پنڈت دھرم پرکاش پروپرائٹر راج پرفیومز: کلدیپ نگر، انبالہ چھاؤنی؛ پنڈت سادھو رام، ببیلی بازار' مہاویر جنرل اسٹورز انبالہ شہر؛ لالہ ٹیک چند صراف، صرافہ بازار انبالہ چھاؤنی؛ اور مسٹر ست دیو بھامبری، جنرل منیجر، ڈیلی ٹریبیون، چنڈی گڑھ کے نام شامل تھے۔ میں انبالہ سے تعلق رکھنے والے اشخاص سے واقف نہیں تھا، لیکن ملہوترہ انہیں جانتا تھا۔ میں البتہ ایس۔ ڈی۔ بھامبری کو ضرور جانتا تھا جو کچھ برس پہلے ہریانہ سرکار میں چیف سکریٹری تھے اور ریٹائرمینٹ سے پہلے استعفےٰ دے کر ٹریبیون گروپ آف پیپرز کو جوائن کر لیا تھا۔ بھامبری صاحب بہت باذوق آدمی ہیں اور اُن سے میری دوستی بھی ہے۔ رضوی نے کہا کہ میں جب چنڈی گڑھ واپس جاؤں تو بھامبری صاحب کو اس کا آداب پہنچا دوں۔ رضوی کی انبالہ سے اتنی گہری وابستگی کا اظہار ہم سب کو بہت اچھا لگا۔ اس کے دل میں انبالہ آنے اور اپنے پرانے رشتوں کو پھر سے مضبوط کرنے کی بے حد خواہش تھی۔ ہم نے رضوی سے درخواست کی کہ وہ انبالہ اور چنڈی گڑھ ضرور آئے اور ان سب کے لیے جنہیں وہ جانتا تھا محبت، خلوص اور بھائی چارے کا پیار بھرا پیغام لے کر آئے۔

"المرکز" میں ہمارا استقبالیہ تھا۔

اس سے پہلے ہمیں ڈاکٹر گلشن حقیق مرزا سے ملنا تھا جو اس سماجی و ثقافتی ادارے کی روحِ رواں تھی۔ اس کے مکان پر جانے سے پہلے امداد ہمدانی اور "المرکز" سے وابستہ کچھ دوستوں نے اس ادارے سے متعلق بڑی تفصیل سے بات کی۔ اس ادارے کی تشکیل ۱۹۶۲ء کے بعد ہوئی تھی اور اس کی داغ بیل ڈاکٹر محمد صدّیق مرزا نے ڈالی تھی۔ یہ ادارہ پچھلے پچیس سال سے ادبی، سماجی، ثقافتی اور مجلسی سرگرمیوں کا ایک مضبوط مرکز بن گیا ہے۔ ادارے کو صوبائی اور مرکزی حکومت سے سالانہ امداد بھی ملتی ہے اور ادارے کے ارکان لگ بھگ تیس چالیس ہزار سالانہ جمع کرتے ہیں اور اس رقم کو عوامی بہبود کے مختلف پروگراموں پر خرچ کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر گلشن حقیق مرزا سے مل کر احساس ہوا کہ میں ایک ایسی خاتون سے مل رہا تھا جس نے اپنے اوقات کو مختلف سرگرمیوں کی تکمیل میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ڈاکٹر مرزا کو جہلم شہر میں بڑی قدر اور احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے کام میں ان کے تین بیٹے بھی ان کی مدد کرتے ہیں۔ "المرکز" میں جانے سے پہلے امداد ہمدانی اور صغیر احمد اخلاق ہمیں عزیز لکھنوی کی آرٹ گیلری میں لے گئے۔ عزیز لکھنوی سے مل کر محسوس ہوا کہ میں واقعی ایک پُر خلوص اور کوالیفائڈ آرٹسٹ سے مل رہا تھا۔ عزیز لکھنوی پرانی دلی سے ہجرت کر کے لاہور آیا۔ کچھ عرصہ لاہور میں رہنے کے بعد جہلم آ گیا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اُس کی آرٹ گیلری کو موجودہ شکل و صورت تک پہنچنے میں کئی برس لگے تھے۔ یہ سب عزیز لکھنوی کی ریاضت اور محنت کا نتیجہ تھا کہ اس کی آرٹ گیلری کا شمار اعلیٰ ترین گیلریوں میں ہونے لگا تھا۔ اگر ہمیں "المرکز" میں جانے کی جلدی نہ ہوتی تو میں عزیز لکھنوی کی آرٹ گیلری میں اور بھی وقت گزارتا۔ عزیز لکھنوی کے فن اور شخصیت نے مجھے بھی بے حد متاثر کیا۔

"المرکز" میں ہم لوگ کافی دیر سے پہنچے۔ مہمان انتظار کر رہے تھے۔ جس خلوص اور صدق دلی سے مہمانوں نے ہمارا استقبال کیا اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ جہلم واقعی ادب و شعر کا گہوارہ تھا۔ ہمارے استقبال میں جو مختصر تقریریں کی گئیں ان میں تصنع نہیں تھا بلکہ گہرے جذبات کا اظہار تھا۔ اظہارِ تشکر کے طور پر جو ملہوترہ کو کہنا چاہیے تھا، اس نے کہا اور جہلم کے شہریوں اور ادیبوں کا جو تاثر میں نے لیا اس کا ذکر میں نے مختصر الفاظ میں کیا۔

شاعروں اور ادیبوں کی محفل ہو تو بنا مشاعرہ کے کیسے کام چل سکتا ہے۔ چنانچہ ایک مختصر شعری نشست بھی ہو گئی۔ صدارت ملک محمد نصیر نے کی اور نظامت کی ذمہ داری امداد ہمدانی نے سنبھالی۔ جو اشعار نوٹ کر سکا وہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ تمام دوستوں کے شعر نوٹ نہ کر سکا تھا۔

پہلا شاعر آصف تھا جس نے مشاعرے کا آغاز کرتے ہوئے کہا:

آئینے میں غبار دیکھا ہے
روح کو بے قرار دیکھا ہے

ڈاکٹر نور محمد کی غزل کا ایک شعر ہے:

انگاروں کی صورت لیں رنگیلی کیوں
شیریں شہد مگس اس کی زہریلی کیوں

رفعت یاسمین نے اچھے اشعار سنائے۔ ایک شعر سنیے:

کر رہا تھا جس گھڑی وہ مجھ سے پیمانِ وفا
جیب میں اس کی نئے چہروں کی تصویریں بھی تھیں

اس کے بعد ریاض انور نے اپنا کلام پیش کیا:

ٹھٹھرتے لمحوں کو اپنی حرارتیں دینا
اُداس گھڑیوں کو کل کی بشارتیں دینا

اور پھر مختار جاوید نے کہا :

عجیب ڈھنگ سے جاری ہے پرورش میری
کسی کے ہاتھ سے اپنا لہو پیا میں نے

عذرا آنار جو سیکورٹی اسٹاف میں کام کرتی ہے اشعار بھی اچھے کہتی ہے :

جب کوئی معصوم سی لڑکی دیکھوں تو میں ڈر جاتی ہوں
سونے کے پنجرے میں اس کو قید نہ کرلے کوئی ساحر

امداد ہمدانی نے مشاعرے کی نظامت کے دوران اپنی غزل بھی سُنائی۔ ایک شعر سُنیئے :

جہاں محسوس ہوگی پیاس پھوٹیں گے وہیں چشمے
ہمارے پاؤں کی ٹھوکر سے اُگلے گی زمیں چشمے

اس کے بعد اقبال کوثر کا نام پکارا گیا۔ اس نے کہا :

کسی نے گنگا کہا کہی اور کسی نے گنگا پانی
ہم کو تو لُس نے ڈوبا ہے جہلم تیرا پانی

تنویر سپرا تو ایک جانا پہچانا نام ہے۔ اس نے ایک بڑی پیاری غزل پیش کی۔ ایک ہی شعر نوٹ کر سکا۔

بیٹے کو سزا دے کے عجب حال ہوا ہے
دل پہروں مرا کرب کے دوزخ میں جلا ہے

راجہ محمد سفیر نے میاں محمد بخش کا پنجابی کا کلام سنایا۔ محمد بخش پیدا تو گجرات میں ہوا تھا، لیکن اس کا انتقال جہلم میں ہی ہوا تھا۔ ایک بند سُنیئے :

مسجد ڈھا دے مندر ڈھا دے
ڈھا دے جو کچھ ڈھیندا
اِک بندیاں دا دِل نہ ڈھائیں
رب دِلاں وِچ رہندا

مشاعرے کا اختتام بس اسی کلام پر ہو جانا چاہیے تھا۔ سننے والے بہت خوش تھے — محمد بخش نے آج کے تقاضوں کا کس خوب صورتی سے اظہار کیا تھا لیکن امداد ہمدانی نے مجھے بھی کچھ سُنانے کو کہا۔ سامعین کا بھی تو تقاضا تھا۔ ایک تازہ غزل کے کچھ اشعار میں نے بھی سنائے۔ وہ شعر آپ بھی سُن لیجیے۔

وہ مجھ پہ جتنا کرم تھا مرے خدا کا تھا
پھر اس کے بعد سہارا تری دُعا کا تھا
جسے میں نرم سی دستک سمجھ کے چونک گیا
وہ ایک جھونکا گزرتی ہوئی ہوا کا تھا

اس کے بعد مشاعرہ اور اس کے ساتھ ہی استقبالیہ جلسہ ختم ہوگیا۔ کچھ دیر مہمانوں سے گفتگو ہوتی رہی۔ سبھی ہمارے جہلم آنے پر خوش تھے اور ہمارے اس بیان سے بے حد مطمئن تھے کہ دونوں ملکوں کے ادیب، شاعر اور دانشور آرزومند ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کے حالات زیادہ سے زیادہ خوش گوار ہوں اور دونوں ملک ایک دوسرے کی ترقی اور خوشحالی کے خواہاں ہوں اور دو اچھے پڑوسیوں کی طرح امن و آشتی کے لیے جد و جہد کریں۔

پھر "المرکز" کی لائبریری کا انچارج آگیا اور اُس نے کہا کہ ہم ادارہ کی لائبریری بھی دیکھیں اور وِزٹرز بُک میں اپنے تاثرات بھی لکھیں۔

ہم نے "المرکز" کی ساری عمارت کا چکر لگایا پھر لائبریری کو بھی دیکھا پھر ملہوترہ نے، نیگی اور گوپال نے وِزٹرز بُک میں اپنے اپنے ریمارکس بھی لکھے۔ میں نے صرف دو ہی جملے لکھے۔

"ہم سب مل کر دونوں ملکوں کے لیے ایک حسین مستقبل کی تشکیل کریں
کتابیں اس کوشش میں بڑا اہم رول ادا کر سکتی ہیں"۔

اور ان کے نیچے اپنے دستخط کر دیے، اپنا پتہ لکھ دیا اور اس دن کی تاریخ ڈال دی۔ ۱۵ / نومبر ۱۹۸۸ء

پھر ہم سب کھانے کے لیے چلے گئے اور وہیں سے گیسٹ ہاؤس۔ جب ہم گیسٹ ہاؤس پہنچے تو آدھی رات ہونے کو تھی۔

امداد ہمدانی اور صغیر احمد اخلاق ہمیں گیسٹ ہاؤس تک چھوڑنے آئے اور جانے سے پہلے گیسٹ ہاؤس کے چوکیدار کو ہدایت کر گئے کہ صبح جلد ہی وہ بیڈ ٹی دینے کے بعد فوراً ہی ناشتے کا بھی انتظام کر دے کیوں کہ دن چڑھتے ہی ہمیں اسلام آباد کے لیے روانہ ہونا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میرا بھی پونچھ سے تعلق تھا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس کے کہنے کے مطابق اسے تو اس کا ایک "گرائیں" مل گیا تھا۔ اس نے اس رات اور اگلی صبح اپنے "گرائیں" کی بڑی خدمت کی۔

امداد ہمدانی اور صغیر احمد اخلاق ہمیں "خدا حافظ" کہہ کر اپنے ٹھکانوں کی طرف چلے گئے اور وعدہ کر گئے کہ اگلی صبح وہ سات بجے تک ریسٹ ہاؤس پہنچ جائیں گے۔ جانے سے پہلے صغیر احمد میری نوٹ بُک کے ایک خالی صفحہ پر یہ جملے لکھ کر چھوڑ گیا۔

نفرت سے بڑا دشمن کوئی نہیں
محبت سے بڑا دوست کوئی نہیں
احترام سے بڑا وصف کوئی نہیں
اخلاق سے بڑی طاقت کوئی نہیں

گیسٹ ہاؤس کا کمرہ بہت آراستہ، بستر صاف اور بے شکن، تکیے بڑے نرم اور کم روئی والے کمبل بڑے ملائم اور ہلکے شیڈ کے۔ ٹیبل لیمپ بہت نفیس، کھڑکیوں پر بڑے بڑے مہین پردے انگریز اپنے لیے اپنی مرضی کی فضا اور ماحول بنا لیتا تھا اور اس کا لُطف بھی اُٹھاتا تھا۔ لگا کہ رات بہت مزے میں گزرے گی۔ لیکن گھر والوں کے خرّاٹے بھی تو اِن دِنوں میرے مقدر کا ایک ضروری حصہ بن چکے تھے۔ چنانچہ لائٹ بجھا کر اور نرم ملائم کمبل اپنے گرد لپیٹ کر میں جاگتا رہا اور خاموش پڑا رہا۔ کمرے کے اندر بلند خراٹوں کی آواز اور باہر کسی گھنے درخت کی ٹہنیوں سے اُلٹی لٹکی ہوئی چمگادڑوں کا شور۔ مجھے ہنسی آگئی۔ کیسی عجیب مماثلت تھی اندر اور باہر کے ماحول میں۔ بستر سے اُٹھ کر جاتا بھی کہاں۔ بس کروٹیں بدلتا رہا اور صبح کا انتظار کرتا رہا۔ آخر بستر سے اُٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا کہ تیاری شروع

کروں۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔

پانچ بجے گیسٹ ہاؤس کا چوکیدار بڑے نفیس ٹی سیٹ میں بیڈ ٹی لے کر آ گیا۔ میں نے اپنے لیے چائے بنائی اور گوپال کو آواز دی۔ جب تک وہ جاگا میں چائے کی دو پیالیاں پی چکا تھا۔ سی لمحہ ملہوترہ میرے کمرے میں داخل ہوا۔

"بیڈ ٹی لے لی ذاکر صاحب؟"

"جی ہاں چائے بہت اچھی تھی — امپیریل ٹمباکو کمپنی والا کلچر ابھی تک قائم ہے۔"

"دیکھیے کب تک قائم رہتا ہے؟"

ملہوترہ کی آواز سن کر گوپال آنکھیں ملتا ہوا جاگ گیا۔

"تم تو جاگ گئے، لیکن نیگی ابھی سویا پڑا ہے۔ تم ہی جگاؤ اسے۔"

"میں جگاتا ہوں۔"

"میرے کہنے سے تو وہ نہیں جاگتا۔"

"آپ نے ہی تو بگاڑ رکھا ہے اسے ملہوترہ صاحب۔"

"اسے جگاؤ ورنہ ہم تیار نہیں ہو سکیں گے پ تیار ہو جائیے ذاکر صاحب۔"

"جو حکم۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا اور ملہوترہ چلا گیا اور اس کے پیچھے پیچھے گوپال بھی چلا گیا۔

"میں واپس آ کر چائے پیتا ہوں۔"

وہ ذرا دیر میں واپس آیا۔ میں اپنی عادت کے مطابق بستر میں بیٹھے بیٹھے ہی شیو کرنے لگا۔

"جاگ گیا نیگی؟"

"کہاں جاگا ہے۔ میں نے اسے جگانے ی کوشش کی تو وہ گالیاں دینے لگا۔ ملہوترہ صاحب اتھ روم میں تھے۔"

گوپال اپنے لیے چائے بنانے لگا۔

"آپ کے لیے بھی بناؤں؟"

"ایک پیالی بنا دو۔ اچھی چائے ہے۔"

اس نے ایک پیالی میرے لیے بھی بنا دی۔

جن نے چہرے پر آفٹر شیو ملا اور پیالی اس کے ہاتھ سے لے لی۔

اسی لمحہ اکبر خاں داخل ہوا۔

"جناب ناشتہ لگا دوں؟"

"ابھی رک جاؤ اکبر خاں۔ ہمارا صاحب ابھی نہیں جاگا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"وہ تو جاگ گئے ہیں۔ تیار ہو رہے ہیں۔"

"ایک اور صاحب بھی ہیں۔" گوپال نے کہا۔

اکبر خاں چلا گیا تو میں نے کہا۔

"نیگی کبھی بھی ٹھیک سے بی ہیو نہیں کرتا۔"

"سارا قصور ملہوترہ صاحب کا ہے۔"

میں باتھ روم میں جا رہا تھا کہ ملہوترہ پھر آیا۔ نیگی ابھی تک نہیں جاگا۔ ملہوترہ بڑے غصے میں تھا۔

اکبر خاں نے ناشتہ لگا دیا تھا اور ملہوترہ، گوپال اور میں ناشتہ کرنے بیٹھ چکے تھے کہ امداد ہمدانی اور صغیر احمد اخلاق بھی آ گئے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ گوپال ان کے لیے چائے بنانے لگا۔

"میں ذرا نیگی کو دیکھوں۔ وہ ابھی تک جاگا کہ نہیں۔"

دوسرے کمرے سے نیگی کی اونچی آواز آ رہی تھی۔ بہت غصیلی آواز تھی اس کی۔ ہم لوگ ناشتہ کر رہے تھے کہ نیگی ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔

"جو میرے خلاف دوسروں کو بھڑکاتا ہے میں اسے دیکھ لوں گا۔ مجھے معلوم ہے وہ کون ہے۔"

سب حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"اچھا تم ناشتہ تو کر لو۔" گوپال نے کہا۔

"اسی کو کھلاؤ۔ جو مجھے گالیاں دیتا ہے۔"

"کون دیتا ہے تمہیں گالیاں؟" امداد ہمدانی نے پوچھا۔

"میں جانتا ہوں۔"

مجھے لگا کہ اشارہ میری طرف تھا — گوپال نے شاید کچھ اپنی طرف سے اضافہ کر کے میری کہی ہوئی بات اس تک پہنچا دی تھی۔ مجھے افسوس ہوا۔ نیگی بدستور بدسلوکی کرتا رہا لیکن نہ تو اسے ملہوترہ نے ٹوکا اور نہ گوپال نے ہی۔ البتہ امداد ہمدانی اور صغیر احمد اخلاق کو اس کا رویہ بہت برا لگا۔ میرے جی میں تو آیا کہ میں نیگی کو ڈانٹ دوں اور اسے خاموش رہنے کو کہوں۔ وہ شرافت کی حدوں سے باہر نکل رہا تھا، لیکن پھر مجھے وہ جملے یاد آ گئے جو پچھلی رات ہی صغیر احمد اخلاق میری نوٹ بک کے ایک صفحہ پر لکھ کر چھوڑ گیا تھا۔

نفرت سے بڑا دشمن کوئی نہیں
محبت سے بڑا دوست کوئی نہیں
احترام سے بڑا وصف کوئی نہیں
اخلاق سے بڑی طاقت کوئی نہیں

میں اخلاق کا مارا ہوا آدمی کرسی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور اپنا سامان سنبھالنے لگا۔ ڈرائیور ناشتہ کر چکا تھا اور اکبر خاں ہمارا سامان گاڑی میں رکھنے لگا تھا۔

جب میں گاڑی میں بیٹھنے لگا تو اکبر خاں نے کہا۔

"اچھا میرے گرائیں جی، خدا حافظ!"

میں نے مسکرا کر اس سے ہاتھ ملایا اور پھر گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ورنہ اگلی سیٹ پر گوپال ہی بیٹھا کرتا تھا۔

امداد ہمدانی اور صغیر احمد اخلاق نے کہا کہ وہ ٹھٹھا روپیں کو ہمارا انتظار کریں گے — جواب ملہوترہ نے ہی دیا۔ میں خاموش رہا۔ دراصل میرے من میں بڑی کڑواہٹ تھی لیکن اس کا اظہار کر کے میں اپنا وقت اور موڈ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

گاڑی اسٹارٹ ہوئی تو اکبر خاں نے ایک بار پھر سب کو سلام کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگ پاکستان ٹمباکو کمپنی کے خوبصورت علاقے سے باہر نکل کر مین سڑک پر آ گئے۔

[جاری ہے]

غزلیں

حفیظ میرٹھی

دل میں بسا تھا میرے جو دار و رسن کا حسن
الجھا سکا نہ زلفِ شکن در شکن کا حسن

آلودگی نے چھین لی پانی کی آب و تاب
صنعت کی نذر ہو گیا گنگ و جمن کا حسن

حرص و ہوس کی آگ یہاں تک پہنچ گئی
اہلِ وطن کی زد پہ ہے اب خود وطن کا حسن

نااہلیوں کے داغ لیے ہے روش روش
مالی نے خود تباہ کیا ہے چمن کا حسن

تجھ سے تو کچھ غرض نہیں ہاں دیکھتے ہیں ہم
کوچے میں تیرے بیٹھ کے اپنی تھکن کا حسن

تاثیر ناپ تول سے آگے کی بات ہے
پیمائشیں بتا نہ سکیں گی سخن کا حسن

احسان درد و غم کا مرے فکر و فن پہ ہے
نکھرا ہے درد و غم سے مرے فکر و فن کا حسن

سوز و گداز کی بھی ضرورت ہے اے حفیظ
کچھ رنگ و نور ہی سے نہیں انجمن کا حسن

بیزاریوں کا رنگ پذیرائیوں میں تھا
وہ پھر بھی بد مزہ نہ ہوا بے رخیوں میں تھا

جذبہ طلب کا کم نہ کسی دور میں ہوا
جو عسرتوں میں تھا وہی خوشحالیوں میں تھا

تیرا گماں ہوا نہ کسی اور پر کبھی
آہنگ ایک خاص تری دستکوں میں تھا

ہنستے تھے جگمگاتی ہوئی کشتیوں پہ وہ
جن کا جہاز آپ ہی غرقابیوں میں تھا

جب بحث چھڑ گئی تو وہ خاموش ہو گیا
اُس کا تمام علم تو الماریوں میں تھا

یوں بھی سنور گئی ہے غزل خود بخود کبھی
کچھ حسن تھا ردیف میں کچھ قافیوں میں تھا

روتے ہیں اہلِ فکر و نظر کیوں حفیظ کو
دانشوروں میں تھا نہ وہ نکتہ رسوں میں تھا۔

پی کر چین اگر آیا بھی کتنی دیر کو آئے گا
نشّہ اک آوارہ پنچھی چھلکے گا اُڑ جائے گا

منظر کی تکمیل نہ ہوگی تنہا مجھ سے فن کار
دُکھ کے گیت تو میں گا دوں گا آنسو کون بہائے گا

ایک سخی کو اپنا سمجھ کر عرضِ حال کی ٹھانی
بیری دل کہتا ہے پگلے کاسہ بھی چھن جائے "

میرا سمندر پار سفر پر جانا ایک قیامت۔
جیسے ہر چہرے پہ لکھا ہو میرے لیے کیا لائے "

جاتے جاتے پوچھ رہا ہے ان کے رکھوالوں سے حـ
کیوں جی! کیا ہم لوگوں سے میرٹھ خالی ہو جائے

۱۴۰ پورہ شیخ لال، میرٹھ ۲۵۰۰۰۲

غزلیں

مظفر حنفی

سیلابوں کو شہہ دینے میں، طوفاں کو اُکسانے میں
کتنے ہاتھ کی سازش ہے اک دیوار گرانے میں

فن کو مہکائے رکھتے ہیں زخمی دل کے تازہ پھول
ٹوٹی تختی کام آتی ہے نیّا پار لگانے میں

تُو نے بہتیرا سمجھایا، موتی کھال گرہ میں مال
اے دنیا کیسے آجاتے، ہم تیرے بہکانے میں

تتلی جیسے رنگ بکھیرو گھائل ہو کر کانٹوں سے
مکڑی بن کر کیوں اُلجھے ہو غم کے تانے بانے میں

بیزاری کے ہاتھ نہ مرنا، جینے کے سو حیلے ہیں
پیارے! سر میں وحشت ہو تو گرد بہت ویرانے میں

بجھتے بجھتے بھی ظالم نے اپنا سر جھٹکنے نہ دیا
پھول گئی ہے سانس ہوا کی ایک چراغ بجھانے میں

کھو یا جی کا چین مظفر اُن سے ترکِ تعلق پر
آ پہنچے گرداب کے منھ تک، دریا سے کترانے میں

دیپک قمر

سلونی شام کے آنگن میں جب دو وقت ملتے ہیں
جھلکتے ہم سے ان سایوں میں کچھ آدھے ادھورے ہیں

سمندر ہے ہمارے سامنے مغرور و خود سر سا
ہمیں اک پل بنا کر فاصلے سب پار کرنے ہیں

گزرنا ہے ہنستے ایک تیز کالے کی بستی سے
سبھی تلوار والے ہیں کمان و تیر والے ہیں

کھڑی ہیں ہاتھ جوڑے ساری خوشیاں اپسراؤں سی
سمادھی میں مگن دونوں جہاں ٹھکرا کے بیٹھے ہیں

اندھیروں سے اُجالوں تک، اُجالوں سے اندھیروں تک
سدا گردش ہی گردش ہے کہاں جانے وہ پہنچے ہیں

زمیں کے پھول چاندی اور سونے سے نہیں کھلتے
سدا محنت کی خوشبو سے سبھی آنچل مہکتے ہیں

وہی ہیں سانپ وِش کنیا کو ڈس کر پالنے والے
مری نگری کو رہ رہ کر وہ اب بھی زہر دیتے ہیں

ہر اک احساس کی پہچان خط و خال کھو بیٹھی
وہ اپنے آپ میں ڈوبے ہوئے گم صم سے رہتے ہیں

ہو زمیں قدموں تلے اور آسماں سر پہ بھی ہو
حد کے اندر ہو نظر پہ سوچ سے باہر بھی ہو

زندگی میں دُور تک صحرا ہو کچھ پروا نہیں
ایک نخلستان سا دل میں ترے منظر بھی ہو

فاصلے سارے محبت کے کٹیں یوں رات میں
چاند ہو اور ساتھ میں تاروں کا اک لشکر بھی ہو

بن کے بنجارے پھریں صدیوں کے آنگن میں سدا
دُور پربت میں ہزاروں سال کا اک گھر بھی ہو

ہم گزر جائیں گے درباروں کو بن دیکھے ہوئے
سر جھکانے کے لیے لیکن کسی کا در بھی ہو

اس طرح منقسم چلے غم اور خوشی کا رات دن
زہر کا ساغر بھی ہو، امرت بھری گاگر بھی ہو

ناؤ ہو، پتوار ہوں اور بادباں ہوں رفتار کے
جب کبھی طوفاں چلے ٹھہرا ہوا لنگر بھی ہو

پی۔ ۲/ سی آئی۔ٹی اسکیم VII ایم (A-2 یونی ورسٹی ٹیچرز کوارٹرز، کنکرگاچی) کلکتہ ۷۰۰۰۵۴

۱۸۵۔ آبادین، میرٹھ چھاؤنی (اتر پردیش) ۲۵۰۰۰۱

شرف عالم ذوقی

پربت

وہ چُپ چُپ کُرسی پر بیٹھے تھے۔ بالکل خالی ذہن سے بھی۔ میز پر کتابیں اِدھر اُدھر پسری تھیں۔ میز کے پاس ہی دائیں طرف کھڑکی کھلی تھی لیکن باہر کے نظاروں میں بھی اُن کے لیے کوئی کشش باقی نہیں تھی۔ جب کہ بغیر پلکیں جھپکائے نظریں باہر ہی رینگ رہی تھیں۔ اور وہ کسی مُردے کی طرح کرسی پر تھکے ہارے پڑے تھے۔ شاید کسی انہونی یا معجزے کے انتظار میں... کہ باہر کے بے کیف نظاروں میں اچانک جان پڑ جائے۔ کوئی ہلچل سی مچ جائے۔ کوئی خوشبو سی لہراتی ہوئی ان کے پور پور میں اُتر جائے۔ ایسے وقت میں بوڑھے وجود میں کون سا احساس ٹھاٹھیں مارے گا' سوچا نہیں جا سکتا۔

ایک بار رما آئی تھی کمرے میں۔ اُسے دیکھا۔ یوں ہی بے سُدھ سا پڑا ہوا... یا ادھ مُردہ سا۔ دیکھ کر ایک بار ٹھٹھکی تھی۔ پھر پوچھا تھا۔

"چائے پیو گے ؟"

اس نے ویسے ہی انجان بنے ہوئے اُسی انداز میں 'مُنڈی' ہلادی۔ جیسے اُسے احساس دلایا ہو کہ اس وقت اس کی موجودگی اُسے پسند نہیں ہے۔

"ایسے کیا بیٹھے بیٹھے سوچتے رہتے ہو۔ کچھ چلا پھرا بھی کرو۔ تازہ ہوا کھایا کرو۔"

رما اتنا کہہ کر جا چکی ہے۔

وہ پھر ویسے ہی ہیں۔ سُن سا چہرہ لیے۔ دماغ ایک دم سے خالی ہو رہا ہے۔ پُچکے جتنا بھی نہیں۔ اُس سے بھی خالی۔ جیسے کسی غبارے سے پوری پوری ہوا نکال دی گئی ہو۔

اچانک ایک 'ٹپ ٹپ' کی آواز ہوئی۔ آنکھیں تھوڑی ترچھی کیں۔ کمرے میں........ پلاسٹک کی گیند آئی تھی۔ ساتھ میں آیا تھا پلاسٹک کا ہی چھوٹا سا بلا سنبھالے رکی۔

"دادا، گیند کھیلو گے ؟"

اس نے پھر مُنڈی ہلادی۔

"کھیلو نا دادا۔"

اس بار اس نے ہاتھ اُٹھایا ہے مارنے کے لیے ــــ

"گِٹِس" رکی نے منھ بنا کر انگوٹھا دکھایا ہے اُسے۔ گیند غصّے میں ایک بار پھر زمین پر پٹکی۔ وہاں سے ہوتی ہوئی گیند اس کی میز کے پاس آکر ٹھہر گئی ہے.... ویسے ہی پڑے پڑے اُس نے رکی کو گیند اُٹھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ رکی پھر گیند لے کر چلا گیا ہے۔ جاتے جاتے کہہ گیا ہے۔

"تم سے نہیں بولوں گا دادا، تم گندے ہو....."

اُس نے لمبی سانس لی۔ 'ہونہہ'۔ پھر ویسے ہی کھڑکی سے باہر کے بے کیف نظاروں میں خود کو سمونے کی تیاری کرنے لگا۔

کھڑکی سے باہر بڑے بڑے مکانات کی قطار ہے۔ مکانات کی قطار سڑک کے اُس پار ہے۔ سڑک سے اس وقت ٹیکسی اور گاڑی کم گزرا کرتی ہے۔ دو بجے کا وقت یعنی لنچ آور..... اس وقت کم بھیڑ بھاڑ رہتی ہے۔ ٹیکسی اور گاڑیوں کے ہارن بھی کم ہی بجتے ہیں۔ اس لیے وہ کھڑکی کھول کر ذرا دیر باہر کے مناظر میں گم ہونے کا جُرم کر سکتا ہے۔ بعض دفعہ گاڑیوں کے ہارن اور شور اتنے گراں گزرتے ہیں کہ وہ کافی غصّے اور جوش سے کھڑکی کا شیشہ بند کر دیتا ہے۔ اتنے جوش سے کہ رما کے جُھرّی بھرے چہرے پر غصّے کی چھاپ دکھ جاتی ہے۔

"کام دھام نہ ہو تو شیشے پر غصہ اُتارتے ہوئے اچھا لگتا ہے۔ کھڑکی کے شیشے کو توڑ ڈالو گے کیا۔ یہ تمہیں کیا ہو جاتا ہے.....؟"

شام کے آٹھ بجے تک بڑا بھی آجاتا۔

معرفت انجم شاہ مارگ ٹریس روم نمبر ۱۱ جن پتھ نئی دہلی
۱۱۰۰۰۱

یوگندر ـــــ اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے وہ اس کی آواز کو محسوس کرتے ـــــ بابوجی کہاں ہیں۔ پھر رما کی آواز کانوں سے ٹکراتی ..... ہوں گے کہاں ... اپنے کمرے میں ... تم نے بابوجی کو میز پر چائے واۓ دی تھی۔ اب وہ من ہی من میں الو کا چہرہ پڑھ رہا ہے۔ یہاں سے صرف محسوس ہی تو کر سکتا ہے..... اور الو..... یوگندر کی موجودگی میں بھی اتنا دھیرے بولتی ہے کہ ....

اور کیا ... اس نے صفائی پیش کی ہوگی

یا کوئی نیا بہانہ بنایا ہوگا..... دیر ہوگئی۔ چائے لے کر گئی تو بابوجی سو ئے تھے۔ ہونہہ۔ یہاں کس کو اس کی فکر ہے۔ سب اپنی دنیا میں مست ہیں۔ بس لے دے کر یہ بڑکا ہی ہے جو ہر بار اس کی خیریت پوچھنے آجاتا ہے۔ اب وہ بڑکا کے خاص پد چاپ کے انتظار میں ہے، جو اس کے دروازے پر آکر ٹھہر گئی ہے۔

"بابوجی ... "

کرسی سے بیٹھے بیٹھے اس نے نظریں گھمائی ہیں مسکرایا بھی ہے۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا بابوجی؟"

اس کی منڈی ہاں میں ڈول گئی۔

"نیچے آئیے نا۔ ٹی وی ساتھ ساتھ بیٹھ کر دیکھتے ہیں۔"

"نہیں، تم لوگ دیکھو۔"

بس اتنا ہی تو کہہ پائے۔ یوگندر چلا گیا ہے۔ لیکن یوگندر کے لفظ اب تک ذہن میں بج رہے ہیں۔ ٹی وی ساتھ ساتھ..... اس لفظ میں اترنے کی کوشش کرتے ہیں وہ .... ساتھ ساتھ بیٹھنا کسے پسند نہیں۔ عمر کے ۶۲ ویں پڑاؤ پر پہنچ کر وہ تو خود بھی بچوں میں، بہوؤں میں، پوتی میں مل بیٹھنے کا احساس زیادہ سے زیادہ پال لینا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ احساس کب کتنی بار ٹوٹتا ہی جاتا ہے۔ ٹی وی ..... الگ الگ مناظر پر ٹکی نگاہیں۔ ساتھ بیٹھے ہوئے بھی الگ الگ ہونے کا احساس ... یہ احساس کہیں توڑتا ضرور ہے۔ کتنی ہی بار بچوں سے، پوتوں سے اور رما سے بات کرنے کی خواہش ہوتی ہے اُن کی۔ وہ کبھی کچھ بولنا چاہتے ہیں تو الگ الگ ٹی وی پر جمی نگاہیں انہیں ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیتی ہیں۔ اور وہ بے کار، بے وجہ اور بے معنی سی ہنسی اور قہقہوں کے بیچ سے اچانک اٹھ کر اپنے کمرے میں آجاتے ہیں۔

اور وہی کمرہ .... وہی میز۔

وہی آرام کرسی .... وہی کھڑکی۔ ... سب کچھ جامد..... ٹھہرا ہوا..... سارے منظر بے کیف۔

تب اچانک ویسے ہی کرسی میں دھنسے دھنسے وہ ایک ٹھنڈی سانس چھوڑتے ہیں۔ کمزور جھری بھرے ہاتھوں سے سر پر ادھر ادھر اُگے تھوڑے سے بالوں کے بیچ انگلیاں دوڑاتے ہیں۔ سر کھجلاتے ہیں.... ناک پر ٹکے ہوئے چشمے کو برابر کرتے ہیں۔ کچھ کچھ دھندلا نظر آتا ہے تو میز پر کسی کتاب کے بیچ پڑے چشمے کے کور کو برابر کرتے ہیں۔ کور ملتا ہے تو اس کے کپڑے سے چشمہ صاف کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اطمینان کر لینا چاہتے ہیں کہ چشمے پر جمی گرد صاف ہے۔ دیکھنے میں اب کوئی دقت نہیں ہے۔ کور کو پھر کسی موٹی کتاب کے بیچ پھنسا کر اب وہ قلم ڈھونڈ رہا ہے۔ ایک بار پھر کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ لیمپ جلا لیا ہے۔ ڈائری کے ورق کھل گئے ہیں۔ ایک لمحے کو آنکھیں پھر سوچ میں ڈوب گئی ہیں۔ کیا لکھیں اور کیا نہیں لکھیں۔ ٹھنڈی سانس چھوڑی ... ڈائری پر پہلے آج کی تاریخ لکھی۔ پھر نظریں دیوار گھڑی کی جانب اٹھائیں۔ وقت لکھا۔ ہاتھوں میں لرزش تھی .... لکھا۔

"کوئی بات .... کوئی بات .... آج بھی نہیں ہوئی۔ اس عمر میں کوئی انوکھی بات ہو ہی نہیں سکتی۔

پھر ٹھہرے پھر لکھا۔

"نو بج کر دس منٹ ہوئے ہیں۔ بچے بیٹھ کر ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔ جانے کیوں اب یہ سب کچھ میٹھا لگتا ہے مجھے۔ جھوٹ، فریب .... یہ رشتے ناطے .... سب کچھ ... "

پھر ایک ٹھنڈی سانس چھوڑی۔ جیسے سوچ رہے ہوں۔ یہ کیا لکھ رہے ہیں وہ ـــــ ـــــ یہ سب نہیں لکھنا چاہیے ڈائری ان سب باتوں کے لکھنے کے لیے نہیں بنی ہے۔ پھر وہ اپنے احساس کو کاغذ پر اتارنے کی بال پینٹ پر اتر آئے ہیں۔ پھر لکھ رہے ہیں۔

"یہ ہیں سب سے اچھی جگہ مجھے میری میز لگتی ہے۔ جہاں میری کرسی ہے اور جہاں سے میں نیلے آسمان کو جھانک لیتا ہوں۔ آسمان جیسی اونچی عمارتوں کے بیچ وہاں وہ بڑا سا بھماٹ درخت بھی ہے۔ پتہ نہیں کس چیز کا ہے پتے بڑے بڑے ہرے ہرے ہیں۔ ایک سمے میں اس شہر میں پھل پھول اور درخت لگانے کی مہم چلی تھی۔ شہر کو خوب صورت بنانے اور گندگی سے بچنے کی مہم ...

وہ پھر ٹھہرے۔ اس بار انہیں لگتا ہے جیسے وہ کوئی مضمون لکھ رہے ہوں۔ یا السو ٹالتو۔ وہ پھر بھی لکھتے جاتے ہیں۔

"پیڑ اچھے لگتے ہیں.... آسمان اچھا لگتا ہے.... اور اچھا لگتا ہے۔

انہیں دیر تک دیکھنا ..... دیکھتے رہنا تمام رشتے میٹھا ہیں۔

اور جھوٹ .... اس لیے کبھی کبھی مجھے لگتا ہے قدرت ہی سب کچھ ہے۔ قدرتی مناظر مجھے اپنی طرف کھینچتے ہیں، اپنی طرف بلاتے ہیں:

انہیں یہ سب لکھنا اچھا نہیں لگ رہا، اس لیے ڈائری بند کر کے اُلجھے اُلجھے سے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اب وہ کھڑکی کے سامنے ہیں اور نیلے آسمان کو تک رہے ہیں۔

سوچنے لگتے ہیں وہ... کیا ان کا اب تک کا اپنا سفر ختم ہو گیا۔ خاندان، در خاندان بیٹے اور پوتے پوتیوں والے ہو جانے کے بعد کیا اُن کی اپنی ذمہ داری ختم ہو گئی۔ نِٹھلے اور بے کار بنا دیے گئے ہیں وہ۔ بچے بھی اُن سے بات کرنے کا ایک ہی مطلب جانتے ہیں — بوجھی کو تھوڑی دیر کے لیے بہلا دینا۔ اور کیا؟ اپنے قیمتی لمحوں کا یوں بے کار میں خرچ کر دیا جانا بھلا کسے پسند ہو گا۔ تو کیا وہ بھی ان سب سے اُکتا چکے ہیں — یعنی اگر میرے بچے ان سے اُکتا گئے ہیں تو کیا وہ بھی — اور اس کے بعد — اس عمر میں — کیا ایسی اُکتاہٹ سے کسی دوسری طرح کے ایڈونچر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی اگر دوسری طرح سے کہا جائے تو وہ کسی بھی طرح کے خوبصورت احساسوں والے سلسلے سے باہر نکل آئے ہیں۔

اُنہیں خوف محسوس ہوا۔ اگر ایسا ہے تو یہ احساس اُنہیں توڑ دے گا...... ختم کر دے گا..... اس لیے کہ سب سے ضروری چیز ہے اپنے آپ کو زندہ رکھنا یا زندہ رہنے کے تصور کو جگائے رکھنا۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔

اُنہیں احساس ہوا وہ سو رہے ہیں۔ اور صحیح معنوں میں وہ زندگی کے خوبصورت احساسوں والے سلسلے سے پوری طرح دُور نکل آئے ہیں۔

اچانک اُن کی ایک ٹھنڈی سانس نکل گئی.... س.... سِکس (

اندر کچھ کھلبلی سی مچی۔ بوڑھے جسم میں ٹھہرے خون میں کہیں بہاؤ پیدا ہوا۔ انہیں احساس ہوا۔ اندر اب بھی تازہ خون موجود ہے۔ جو احساس کی تازگی کے ساتھ مچل سکتا ہے۔ اندر طوفان اُٹھا سکتا ہے۔ آہستہ سے اپنے کھردرے ہاتھوں سے اپنے جسم کو اسپرش کیا تو کہیں اُبھرے تناؤ کی کشتی بھی چل پڑی۔ چہرے پر ایک کھنچاؤ پیدا ہوا — نہیں..... وہ پوتے پوتیوں والے ہیں۔ اور ان کی پتنی ایک احساس سے کٹی، ایک بیمار چڑچڑی سی عورت، جو اُن کے ناکارہ ہو گئے وجود کا مذاق تو اُڑا سکتی ہے، اُنہیں سُکھ کا خمار نہیں دے سکتی..... پھر..... ؟ اب اپنی اس زندگی کو وہ کیا نام دیں — انہیں لگتا ہے قدرت کے چلائے گئے قانون کی بس اُنہوں نے بھی چُپ چاپ پیروی کر ڈالی ہے — پتنی کو، بچوں کے سُکھ اور بچوں کو اپنے اپنے خاندان کے سُکھ میں بانٹ کر وہ اپنے اب تک کے فرض سے آزاد ہو گئے ہیں۔ اس لیے اب اگر ان کے پاس کچھ تازہ سانسیں باقی ہیں تو ایک نئی زندگی کا تصور پھر اُن کے پاس بچ جاتا ہے اور وہ جیسے چاہیں اس تصور کا استعمال کر سکتے ہیں — اب خوش تھے وہ اس لیے کرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔ ٹھنڈے دماغ سے دھیرے دھیرے پرانی یادوں کو نوچتے رہے۔ شام میں پڑوس کی لڑکی ودیا آئی تھی۔ ودیا ابھی پڑھ رہی تھی۔ پورے گھر میں ودیا کا من اکیلے اُن کے پاس ہی لگتا تھا۔ سانولی سی عمر کے بیسویں پڑاؤ پر کھڑی ودیا کو وہ اتنے غور سے دیکھتے رہے کہ ودیا پریشان ہو گئی۔

"بات کیا ہے انکل؟"

"پُنر جنم کی بات سوچ رہا تھا۔ آواگون کے اس عقیدے کو میں تو نہیں مانتا۔ لیکن سوچتا ہوں ایک جیون میں بھی تو کئی کئی جنموں کے سلسلے کی بات ہو سکتی ہے۔"

"کیا؟ میں سمجھی نہیں انکل۔" ودیا چونکی۔

لمحے بھر وہ ودیا کو دیکھتے رہے۔ کرسی سے اچانک اُٹھ کھڑے ہوئے۔ لگا جیسے کمرے میں اتنا حبس ہو کہ سانس لینا دوبھر ہو۔ لفظ جوڑے۔ پھر بولنا شروع کیا۔

"ودیا، فرض کیا ہوتا ہے اور فرض سے مکتی؟"

"انکل آپ پہیلیاں کیوں بُجھا رہے ہیں؟" ودیا پریشان ہو گئی۔

"نہیں۔" وہ دوبارہ کرسی پر جم گئے "پہیلی نہیں ودیا۔ سچ۔ یعنی حقیقت.... اب میری طرف دیکھو.... سوچو.... میں کتابیں پڑھتا ہوں۔ خوش ہوتا ہوں تو گھنٹوں بچوں سے کھیلتا رہتا ہوں۔ اب بھی میرے اندر کا خون گرم ہے — جوش بھی مارتا ہے۔ پھر — میں پوتے پوتیوں والا ہوں..... تو اتنا کچھ کرنے کے بعد — کیا میں اسی جیون میں کیا میں اپنے لیے ایک دوسرا جیون نہیں چُن سکتا۔"

"یعنی آپ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں انکل؟" ودیا حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"نہیں — تم پھر بھی نہیں سمجھیں — شادی کی بات تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ مجھے لگتا ہے سب مجھ سے کٹ گئے ہیں۔ اس لیے کہ سب کے پاس اپنی اپنی اور نئی نئی باتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ جہاں تک پتنی کی بات ہے وہ اتنا تھک گئی ہے یا اوب گئی ہے کہ اُداسین ہو گئی ہے۔ سو اس کے پاس جیون یا کسی بھی طرح کے خوبصورت احساس کے نام پر کچھ نہیں بچا۔ سوائے پوتے پوتیوں میں جیون کاٹ لینے بھر کے۔۔۔ بچوں کے پاس اپنے الگ راستے اور مسائل ہیں۔ میری باتیں وہ سمجھ نہیں سکتے۔ اب رہ جاتا ہوں میں جسے وہ ایک بُڈھا اور ناکارہ سمجھنے کی بھول کرتے ہیں جب کہ ایسا ہے نہیں۔ ہے اس کے بالکل اُلٹا۔ تو تم ہی بتاؤ ودیا۔ اس جنم میں مجھے، باقی جنموں کو مدھر بنانے کے لیے کیا کچھ دینا، نہیں کرنا چاہیے؟"

ودیا لمحے بھر پھر اُن کی طرف دیکھتی رہی۔

پھر بولی "انکل، میں پھر بھی کچھ نہیں سمجھی۔ ابھی تم پریشان لگتے ہو انکل۔ میں بعد میں پھر آ جاؤں گی۔"

ودیا کے جانے کے بعد بڑکا کا لڑکا آیا تھا۔

دلی ___ ہاتھ میں پلاسٹک کی بال تھامے۔ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ کر اُنہوں نے بال چھین لی۔

"جاؤ نہیں دیتا۔"

"کیوں نہیں دیتے؟"

"نہیں دیتا۔ اس لیے کہ بال اب میری ہوگئی ہے۔"

"گندے ___ دادا گندے۔"

رکی چیخیں مارتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ ہچکیاں مار کر روتا ہوا۔ اگلے ہی پل وہ رما کے ساتھ لوٹ آیا تھا۔

"بچے کی بال کیوں چھین لی؟"

"بس اچھا لگا۔"

"بڑھاپے میں اتنا بچپنا اچھا نہیں لگتا۔"

رما کے اس جملے میں اچانک ہی غصے میں بال رکی کی طرف اچھال دیتے ہیں وہ ___ لے جا کمبخت..... دفان ہو..... رما آنکھیں دکھاتی ہوئی غصے میں لوٹ گئی۔ سوچتے ہیں وہ یہ سب کیا تھا۔ اُن کا بچپنا..... رکی کا بچھڑ بچھڑ کر رونا اور رما کا آنکھیں دکھانا ___ کیا یہ سب ایک دوسرے سے ایک دوسرے کو جوڑنے کی علامتیں ہیں۔ یا انجانے طور پر وہ رشتوں کے بندھن سے کٹ ہی نہیں سکتے ___ رما تو مشین کا ایک بے کار کل پرزہ بن گئی اور بچوں کی دیا پر اپنا جیون کاٹے جا رہی ہے ___ کوئی مقصد نہیں رہ گیا ہے اس کے پاس ___ اور ___ بڑکا کے خاندان ہی میں کتنی عزت ہے اس کی..... سب تو جیسے ایک رسم نبھا رہے ہوں۔ بزرگی کی عقیدت بھر رسم۔ اس سے زیادہ نہیں۔ برداشت نہیں ہوتا اُن سے۔ اُسے لگتا ہے انسان نے تبدیلی کا مطلب اب تک نہیں کھوجا۔ یا اُن کی اپنی تہذیب ابھی اتنی مہذب نہیں ہوئی۔

انہیں لگتا ہے۔ سچ بھاگتے بھاگتے کہیں چھپ گیا ہے یا سچ ہی جیون کا حصہ ہے اور جیون کو مدھر بنائے رکھنے کا وہ راستہ تلاش کرتے رہے ہوں۔

آج کل نئی دہلی

اور اچانک جیسے راستہ مل گیا۔ اُن کے ہاتھ میں کدال اور پھاوڑا آ گیا۔ باہر کی کچھ زمین خالی پڑی تھی ___

ہاتھ میں کدال لے کر دیر تک مٹی کریدتے رہے۔ ایک بار رکی کا بھی آیا تھا۔ رما بھی آئی تھی۔ رکی بلالے کر آیا تھا۔ پھر تو جیدکر وہ بھی اُن کے ساتھ کام میں لگ گیا ___ نہیں آئی تھیں۔ اُسے کام میں لگا دیکھ کر لوٹ گئی تھیں۔ وہ جانتے ہیں اندر باتیں چل رہی ہوں گی۔ بابوجی کو نیا شوق چرایا ہے۔ بڑ کالے کہا ہوگا ___ کرنے دو نا..... جی کو بہلانے کو اب وہ کوئی بھی سامان کریں۔ اتنی عمر ہوگئی۔ اس عمر میں سب سے مشکل کام ہوتا ہے جی کو بہلانا۔

پہلے دن ہی وہ فی کام کیا۔ مٹی کو ڈری برابر کی۔ پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ زمین نم ہوگئی تو پھر اپنے کمرے میں آ گئے۔ سوچنے لگے کل کچھ پھولوں کے بیج لے آئیں گے۔ پھول لگائیں گے ___ باغیچہ لگائیں گے اور کتابیں پڑھیں گے۔ خالی وقت میں رکی سے باتیں کریں گے۔ اب کافی کام ہیں اُن کے پاس.....

اُس رات وہ ذہنی طور پر خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہے تھے۔ دیر تک سیاہ آسمان کو تاکتے رہے۔ پھر کرسی پر بیٹھ گئے۔ میز سے وہی پرانی ڈائری اُٹھالی اور لکھنے لگے۔

ایک طرف وہ ہیں۔

سوکھے بنجر سے.....

اپنی پریشانیوں پر بکھر بکھر جانے والے

اور ایک طرف قدرت ہے...

وہ آگے نہیں لکھ سکے..... دراصل اب اُنہیں نیند آ رہی تھی۔ ●●

بقیہ: اونچی ڈال کا آم

کیسے سکتا ہے؟"

"کیا مطلب ہے تیرا؟" مادھو نے حیران ہو کر پوچھا۔ چھلو بولی: "مالکن تو ایک دن جی ساب سے دور نہیں رہتی۔ اسی لیے پہلے ان کے گڈو ہوئی اور اب لڑکا ہونے والا ہے....."

"بے وقوف کی بے وقوف ہی رہی تو۔ ابھی تک تجھے چڑھتے اترتے کا پتہ چلا نہیں چلا۔ بچی روز روز ساتھ رہنے سے ہی کچھ پیدا ہوتا ہے۔ یہ تجھے کس نے بتایا۔"

چھلو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دھیرے دھیرے سسکنے لگی اور بولی "تم نہیں جانتے میرے دل میں کتنی چاہ ہے بچے کی۔ جب تمہارے ساتھ جینے لگی تھی تو تمہاری ماں نے اندر والے بسارے میں لے جا کر میری چوٹی پکڑ لی تھی اور جاتے ہو کیا کہا تھا؟ بولی تھی کہ اگر تو بچے والی ہو کر نہیں آئی تو پھر اس گھر میں پیر نہیں ڈالنے دوں گی اور اپنے بیٹے کی شادی کہیں اور کرا دوں گی۔"

مادھو ہنسنے لگا اس کی ہنسی رُک نہیں رہی تھی۔ ہنستے ہنستے یہ بھی کوشش کر رہا تھا کہ ہنسی کی آواز دُور نہیں جائے اس کے اتنا ہنسنے کی وجہ سے چھلو چڑ گئی " مجھے کیا۔ میں رس جا کر کہہ دوں گی کہ تیرا بیٹا ہی سات دن میں ایک بار ملتا ہے اس میں میرا کیا قصور؟"

مادھو کی ہنسی پھر سے چھوٹ پڑی۔ ہنستے ہنستے اُس نے چھلو کو باہیں بڑھا کر اپنی طرف کھینچ لیا اور پھر اُسے اتنا پیار کیا کہ چھلو سب کچھ بھول گئی۔ چھلو کے سو جانے کے بعد بھی مادھو کو نیند نہیں آئی! اندھیرے میں اُسے چھلو کا معصوم چہرہ دکھائی دے رہا تھا اور اس پر اُسے اور بھی پیار آ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ ماں تو چھلو کی کہی بات ہی سچ ہو کہ بچہ نہیں ہوتا اس سے کہ میں روز روز نہیں آتا۔ لیکن بچہ ہو جانے کے بعد ہم نے رہنا کہاں ہے۔ اس شہر میں تو اتنے پیسوں میں ایک جھونپڑی بھی نہیں ملتی جتنی میری پورے مہینے کی تنخواہ ہے۔ اگر بچہ ہو بھی گیا تو پھر سے گاؤں ہی جینا پڑے گا اور چھلو گاؤں چلی گئی تو میں یہاں کیسے رہوں گا اس کے بغیر۔ اُدھر چھلو سوتے میں ایک سپنا دیکھ رہی تھی۔ درخت کی سب سے اونچی ڈال پر ایک آم پک گیا ہے پیلا۔ پیلا ___ تھل تھلا ___ وہ مادھو کے کندھے پر پیر ٹکائے کھڑی اُچک رہی ہے۔ لیکن ہاتھ آم تک نہیں پہنچ رہا اور آم اوپر اور اوپر ہوتا جا رہا ہے۔

موتی نندی

بنگلہ کہانی :

اندھیرے سے اندھیرے تک

بھی اُتار دوں ؟"

" اور تھوڑا آگے اگر . . . " گھبراتی ہوئی آواز میں پرتل نے کہا۔

" اس اندھیری گلی میں گڈھے وڈھے میں گاڑی گر جائے تو اور ایک جھنجھٹ میں پڑ جاؤں گا۔ پتلے راستے میں گاڑی گھمانا بھی مشکل ہے۔ یہاں سے اُتر کر جا نہیں سکتا کیا؟ کتنا ہے؟"

" کچھ زیادہ نہیں۔ بس تھوڑا سا ۔"

جس راستے پر ابھی پرتل کو جانا تھا اس طرف دیکھتے ہوئے وہ بولا۔ راستہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ دونوں طرف مختلف قسم کے کچے پکے مکانات بنے ہوئے تھے۔ دائیں طرف مڑتے ہی ایک تالاب ہے۔ اس کے بعد ایک اور موڑ۔ اس کے بعد ہی پالو دا کا مکان ہے۔ پالو اس کا خالہ زاد بھائی ہے۔

پرتل نے گھڑی دیکھی۔ دس بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔

گاڑی کا دروازہ کھول کر احتیاط سے بایاں پاؤں زمین پر رکھا۔

" آہ " سسکاری کی آواز سُن کر ڈرائیور نے بے چین نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

" کیا ہوا ؟ پیدل جا سکے گا تو ؟ "

دونوں پیروں پر تن کر کھڑا ہوا وہ پھر جھک کر کھڑکی کے اندر دیکھتے ہوئے بولا۔

" ٹھیک ہے سلیل دا۔ میں ٹھیک چلا جاؤں گا ۔"

" ہوشیاری سے دیکھ بھال کر جانا اور دو تین دن ایک دم باہر نہیں نکلنا۔ انجانا کوئی ملنے آئے تو بالکل نہیں ملنا اور سُن . . . . اخبار والے کوئی تمہاری یہ جگہ جانتے ہیں کیا؟"

" نہیں " پرتل نے لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ " بیچ بیچ میں بھیا کے گھر آتا ہوں، لیکن آج اتنی رات گئے مجھے دیکھ کر حیران رہ جائیں گے ۔"

" سُنا ہے کہ شاید چھ آدمی میدان میں مارے گئے۔ ہسپتال میں دو آدمیوں کی حالت سیریس ہے۔ لگتا ہے نہیں بچیں گے ۔"

" لیکن سلیل دا مجھے کیوں دوشی ٹھہرایا جا رہا ہے ؟ میں نے کیا کیا؟ پاؤں میں چوٹ۔ لنگڑا رہا ہوں۔ آشو دا کو تین چار بار کہا مجھے بٹھاؤ ۔ مجھ سے کھڑا نہیں رہا جا رہا۔ مگر اُنہوں نے اَن سُنا کر دیا ۔"

" وہ سب باتیں بعد میں ہوں گی۔ چھوڑ۔ موٹی سی بات یہ ہے کہ تُو ہی ابھی ٹارگیٹ ہے جیسے راڈ چلایا تھا۔ اگر کمر پر لگتا تو زندگی بھر کے لیے فٹ بال کھیلنا ختم ہو گیا ہوتا۔ تیری تو زندگی ہی برباد ہو گئی ہوتی ۔"

اس کے بعد سلیل دا نے موٹر کی چابی گھمائی۔ اور انجن کی گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ بولے ــــ

" بڑے کلب میں کھیلنے کا یہی ہیزرڈ ہے۔ جیتو تو سر پہ اُٹھا کر ناچیں گے۔ نہ جیتو تو جان کے دشمن ۔"

" مگر میں تو ؟ "

" میں تو کیا ؟ " سلیل دا کے لہجے کی دھمک اور انجن کی گھڑگھڑاہٹ کی آواز نے اُسے گھڑی بھر کو نیم مردہ کر دیا۔ مبہوت سا اُس نے اندر دیکھا۔ ایک گورا چہرہ اور گنج پڑتے ہوئے سر کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔

" بارہ گز دُور رکھی گیند کو جو گول میں نہ ڈال سکے اس کو فرسٹ ڈویژن میں کھیلنا نہیں چاہیے۔ او . . . . او . . . . او کے گڈ نائٹ " سلیل دا کلچ دباتے دباتے منمناتے ہوئے بولے۔

" سؤر کا بچہ ۔"

پرتل نے یہ سُن لیا۔ کچھ نہ بولا۔ موٹر کی لال روشنی جب تک نظر آتی رہی، دیکھتا رہا۔ سائیڈ

۲۔ بدھان شِشُو سرانی اسکائی لائن فلیٹ نمبر ۵۔۴۔ کلکتہ ۷۰۰۰۵۴

کرتے ہوئے مال بھرے ٹرک کلکتہ کی طرف جارہے ہیں۔ لگ بھگ پچاس گز دوری پر ایک بس آکر رُکی۔ دو آدمی اُترے وہ کچھ دُور چل کر ایک راستے پر مڑ گئے۔ اس نے اس راستے کی طرف دیکھا جدھر اُسے ابھی جانا تھا۔ راستہ ایک اندھیری سُرنگ کے مانند نظر آرہا تھا۔

"کچھ ٹھیک نہیں۔ ہوسکتا ہے اُدھر بھی وہ گھات لگائے بیٹھے ہوں۔ کوئی بھروسہ نہیں۔" سلیل دا نے راستہ میں کہا تھا: "کیا جانے سپورٹروں کو کیا ہوتا جارہا ہے۔ ایں۔ انگلش ہولی گینزم یہاں بھی آگئی ہے۔ بہار کے گال اور جبڑے پر گیارہ ٹانکے لگے ہیں۔ وہ تو مر ہی گیا ہوتا اگر ذرا اوپر لگتا۔ مترا کی پیٹھ پر بڑا سا ڈھیلا لگا۔ کم کردو ذرا پیسے کا لالچ کم کردو تم لوگ' سمجھا۔ ڈیڑھ دو لاکھ لوگے اور شاٹ مارو گے گول کے باہر سپورٹرز چھوڑ دیں گے کیا؟"

پرتل بے جان بُت بنا بیٹھا سنتا رہا۔ کہنا چاہتا تھا کہ ڈیڑھ لاکھ دو لاکھ مجھے نہیں ملتا ہے۔ لیکن میدان میں جو حادثہ ہوا اسے سوچ کر وہ اپنے دفاع میں کچھ بولنے کا حوصلہ نہ کرپایا۔

بائیں پاؤں کو گھسیٹتے ہوئے کسی طرح اُس نے سڑک پار کی۔ ذرا دُور کے بعد راستہ ڈھلوان تھا۔ سلیل دا اُسے بہ سہولت [illegible] پہنچا سکتے تھے۔ لیکن آدمی کتنی جلدی بدل جاتا ہے پھر بھی وہ جو گاڑی سے اُسے یہاں تک پہنچا گئے، پرتل کے نزدیک وہ بھی شُکر کی بات تھی۔ پاؤں زخمی، ایسے میں ٹرین پر چڑھنا اور پھر اُتر کر رکشے پر چڑھ کر گھر پہنچنا آج ممکن نہ تھا..... اور پھر راستہ میں کہیں نہ کہیں وہ گھات لگائے بیٹھے ہوں گے ہی۔ راڈ اگر ہاتھ سے پھسل نہ گیا ہوتا تو ——! پرتل ڈھلوان راستہ طے کرکے چوکس سا کھڑا ہوگیا۔

میدان سے پولیس کی گاڑی میں واپسی پر گاڑی پر اینٹ اور بوتلیں پھینکی گئی تھیں۔

گاڑی کے اندر بیٹھے ہوئے کھڑکی کے باہر اس نے دھوئیں کے بادل دیکھے تھے۔ ٹیئر گیس۔ بعد میں سننے میں آیا کہ تین موٹر اور کئی ایک اسکوٹر کو جلا دیا گیا تھا۔

اُس لڑکے کی شکل کچھ جانی پہچانی سی تھی۔ وہ اشوک اور بہار بیس پچیس روز پہلے ساگر سے کھانا کھا کر نکلے۔ ٹیکسی ڈھونڈ رہے تھے کہ اچانک نہ جانے کہاں سے وہ لڑکا ان کے پاس آیا۔ بھاگ دوڑ کرکے کسی طرح ان کے لیے ایک ٹیکسی کا انتظام کردیا تھا اُس نے۔ جب وہ ٹیکسی میں بیٹھنے لگے تو لڑکے نے عقیدت اور لاج کے ملے جلے لہجے میں کہا تھا۔ "اپنی تصویروں پر آپ لوگ آٹوگراف دیں گے؟"

راڈ اسی کے ہاتھ میں تھا۔

وہ چوکس نظروں سے آگے دیکھتے ہوئے پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر آگے بڑھنے لگا۔ کچھ بھی نظر نہیں آرہا ہے۔ بایاں پاؤں ایک اینٹ پر پڑا 'اوئی'، اس کے منھ سے ایک کراہ نکل گئی۔ پھر اپنی ہی کراہ سے سہم کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ خوف اور تکلیف سے کنپٹیاں تمتما گئیں۔ قمیض پسینے سے بھیگ کر اس کے پیٹ اور پیٹھ سے چپک گیا تھا۔ پیشانی سے بہہ کر پسینہ ٹھوڑی تک آگیا تھا۔ اس نے رومال سے منھ پونچھا۔ پتہ نہیں آج کتنی ڈگری ہے، کل تو گرمی ایک سو دو ڈگری تھی۔

چھ آدمی شاید میدان ہی میں مارے گئے یہ بات اُس نے چار پانچ بار سُنی تھی۔ مشتعل ہجوم کے بیچ سے کسی طرح بچ بچا کر ٹینٹ کے اندر گھسایا گیا تھا انہیں اور ٹینٹ کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ چپ چاپ بیٹھے رہیں۔ کھڑکی سے بھی باہر کوئی نہ دیکھنا۔ اس وقت سوپرکاش نے دبی دبی آواز میں کہا تھا۔ جو گرمی ہے انہیں نہایا تو مر جائیں گے۔ وہ اُٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا تھا۔ پرتل کے پاؤں میں تب پٹی باندھی جارہی تھی۔ سوپرکاش سارے بدن میں پاؤڈر مَلتا ہوا اس کے پاس آیا۔ جھک کر پٹی پر ہاتھ رکھ کر بولا: "سلیل دا کے ساتھ جاکر آج ہی ایکسرے کروا لو۔ اسے کل پر مت ٹالنا۔"

"جاؤں گا کیسے باہر جو ہو رہا ہے.....؟"

"یہ سب ذرا دیر میں ٹھیک ہو جائے گا۔ آہ! نہا کر کچھ سکون ملا ہے۔"

"کیا کہتے ہیں..... کہ چھ آدمی مر گئے ہیں۔"

"کھیل دیکھنے کے لیے آتے کیوں ہیں؟"

اسی وقت مینیجنگ کمیٹی کے پنچانن دا نے افسوس زدہ لہجے میں پرتل سے کہا: "تجھے بڑا کیا تھا تب' بول تو؟ ٹائی بریکر کا آخری شاٹ اسی کو دیا جاتا ہے جو خوب اسٹرانگ نرو والا آدمی ہو۔ سبھی جانتے ہیں کہ تو اور سوپرکاش دونوں بڑے اسٹرانگ نرو کے مالک ہیں۔ تو نے جب گیند بٹھایا تب ہم لوگوں کو یقین ہوگیا تھا کہ ہم لوگ فائنل میں پہنچ گئے۔ اور فائنل میں جے سی ٹی کو تو آسانی سے مار لیتے۔"

پرتل سر جھکائے پٹی بندھے پاؤں کو آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ سوپرکاش کے بدن پر لگے پاؤڈر کی خوشبو اب بھی ہواؤں میں تھی۔ یہ خوشبو اُسے بہت اچھی لگی۔ یاسمین؟ گلاب؟ یا لیونڈر۔ کون سی خوشبو ہے۔ اُس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

کوئی ایک تھا جو جذبات بھرے لہجے میں آنکھوں دیکھی بیان کر رہا تھا۔ کس نے کہا چھ آدمی؟ اور زیادہ ہوں گے۔ پولیس نے جب گیلری میں لوگوں کو دوڑایا تھا تب میں نے ہی اپنی آنکھوں سے دیکھا چھ سات آدمی گر گئے تھے اور لوگ ان پر چڑھ چڑھ کر بھاگ رہے تھے۔ اُدھر لکڑی والی گیلری ٹوٹی تھی۔ اس میں کیا پتہ کتنے لوگ دب کے مرے۔ اس..... خالی اگر آخری کک سے گول ہو جاتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔"

گھروں میں کہیں کہیں بتی جل رہی تھی۔ راستے

کی طرف دیکھنے لگی کھڑکیاں سی نظر آرہی ہیں۔ پرتل نے کھڑکی سے گھر کے اندر دیکھا۔ لگتا ہے گھر کے لوگ چھت پر چٹائی بچھا کر لیٹے ہیں۔ یہ ہے۔ لیکن کوئی آدمی، آدم ذات ہے آس پاس یہ یقین ہونا اس کے لیے اس وقت ضروری تھا۔ اس وقت اگر کوئی اچانک اس پر حملہ کر دے، تو ایسے میں اگر کچھ لوگ آس پاس ہوں جو اُسے بچانے کے لیے آجائیں یا اپنے گھر سے کھڑکی، چھت ہی سے چیخ پکار کریں تب بھی کم سے کم جان بچائی جا سکتی ہے۔

لیکن اس کے لیے چیخنا ہوگا، شور مچانا ہوگا۔

کیا کہہ کر وہ شور مچائے گا؟

ایسی حالت میں پڑ جانے پر آدمی کیسے کیا کرتا ہے۔ وہ یاد کرنے لگا۔ کوئی ایسی صورت حال جس میں کسی کو اس نے کبھی اس طرح چیخ مچاتے دیکھا ہو۔ سوچنے اور یاد کرنے کی کوشش کرتے کرتے اسی اُدھیڑ بُن میں اُس کا پاؤں ایک چھوٹے سے گڑھے میں پڑ گیا۔ درد کی ایک تیز لہر اس کے پاؤں سے اُٹھی اور دماغ کی نسوں کو جھنجھناتی ہوئی سی گزر گئی۔

اسکول میں بچے زخمی ہو جانے پر تو سر پر اٹھا کر ہسپتال تک پہنچا دیتے۔ پرتل آپ ہی آپ بڑبڑایا بایاں پاؤں اُٹھا کر دائیں پاؤں پر کھڑا رہا۔ تقریباً آدھے منٹ تک ——— راستہ اندھیرا تھا پھر بھی اُسے درخت کا مبہم سا سایہ، دیوار حتیٰ کہ تالاب کے پانی تک کا احساس ہو رہا تھا۔ ویسے راستہ ان دیکھا تو نہ تھا۔ پالو دا کے گھر کے لیے بھی وہ کوئی اجنبی نہ تھا۔ البتہ چار سال پہلے جب وہ چھوٹے کلب میں کھیلتا تھا تب اچانک اُسے اپنے گھر میں پاکر پالو دا اتنے ہی خوش ہوتے، کہنا مشکل ہے۔

بائیں طرف ایک باغیچے کی دیوار کھینچی ہوئی تھی۔ دائیں طرف ایک تالاب۔ پرتل کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ گیند کو کک اسپاٹ پر رکھ کر جب وہ کک مارنے کے لیے پیچھے ہٹا تھا تو جیسے سارا میدان گھڑی بھر کو ترنہ ہو گیا تھا تب سی طرح بہت زور زور سے دل دھڑک رہا تھا۔

ران زیب چھ ہے۔ کوئی ایک آواز ہے، پرندے کے ہلنے کی، پرندے کے پر پھڑپھڑانے کی۔ بچے کے رونے کی آواز۔ کتے کی بھونک، ریڈیو یا ٹی وی سے اُٹھنے والے کسی گانے کی کوئی آواز، مینڈک کی ٹرٹر۔ برتن لے کرنے کی آواز، اپنی جھنگ اپنی جھنک ...

پرتل ایک بار پھر پسینے میں شرابور ہو گیا۔ کچھ تو ایسا ہو جس سے پتہ چلے کہ اس کے پاس کوئی کچھ ہے۔

سامنے کچھ لہرایا۔ کوئی یا شاید کچھ لوگ سامنے سے آ رہے ہیں۔ پرتل ٹھٹھک گیا۔ ابھی اگر دیوار سے لگ جائے تو وہ لوگ اُسے دیکھ نہیں پائیں گے قدموں کی آہٹ اور باتیں کرنے کی آواز اب تک آرہی تھی۔ وہ سانس روک کر دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا خیریت گزری کہ اس کے کپڑے سفید نہیں تھے۔

ایک آدمی اور اُس کے ساتھ ایک بچہ پرتل کے سامنے سے گزر گئے۔ ان سے ڈر رہا تھا۔ یہ سوچ کر وہ خود ہی سے جھینپ گیا ٹھیک اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے آدمی نے بچے کو دھمکاتے ہوئے کہا تھا۔ "یہ لفراطی کرنے کے لیے تجھے کس نے کہا تھا کہ سر پر پانی ڈال لے۔ بخار اور بڑھ جاتا تب تو ———"

پرتل پھر راستے کے اوپر آگیا۔ ان لوگوں نے اگر اُسے دیکھ لیا ہوتا تو پھر کیا ہوتا۔ اندھیرے میں کسی کو دیوار سے چپکا ہوا دیکھ کر اور اُسے بھوت پریت سمجھ کر رام رام کرتے ہوئے تیز تیز قدموں سے بڑھ جاتے۔ پرتل کو ہنسی آگئی۔ ایسی حالت میں اگر وہ نکل کر بولتا "کس کو بخار ہے یہاں میں رہیں؟ سمجھاں۔ ڈاکٹر کو بلانے جا رہا ہیں؟" کہہ کر اپنی طرف آنے کا اشارہ کرتا تو کتنا مزہ آتا۔

اپنی ہنسی پر قابو کرتے کرتے اچانک ایک اور خیال من میں آیا، لیکن اس وقت اور اس جگہ پر کوئی بھوت کھڑا رہ سکتا ہے۔ آدمی اگر ذرا ہمت والا ہوتا تو کھڑا ہو کر بولتا "کون؟ کون ہے وہاں؟" ۔ وہ کہتا "میں"

"میں تو سبھی ہیں۔ اس طرح یہاں اتنی رات میں کیوں کھڑے ہو۔ گھر کہاں ہے؟ بتاؤ!

پکار کر اس طرف لوگوں کو اکٹھا کروں گا ... پرتل گھڑی بھر کو بجھ گیا۔ اگر سب کچھ اس طرح ہوا ہوتا تو کیا ہوتا؟ گھر سے کوئی آدمی نکلتا یا محلے کے کچھ اور لوگ جمع ہو گئے ہوتے تو ایسے میں وہ اپنا نام بتا کر باعزت طریقے سے بچ نکلتا۔ اس کا نام کوئی نہ کوئی تو ضرور جانتا ہوگا۔ لونڈے لپاڑے ہوں تو اُسے پہچان ہی لیں گے۔ اس کے علاوہ پالو دا کو تو یہاں کے لوگ جانتے ہی ہیں۔ لیکن اگر کوئی پوچھ بیٹھتا۔ "مگر اتنی رات گئے اس طرح اندھیرے میں چھپ کر کیوں؟"

تالاب سے نکال کر کنارے رکھے ہوئے 'پانا' کی سوندھی ہریالی کی بو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ پرتل نے بند کھڑکی کے دروازے کے نائے ٹینڈٹ کے اندر پسینہ کا بھبکا اور سوپر کاش کے پاؤڈر کی خوشبو کو یاد کرنے کی کوشش کی۔

سوال یہ ہے کہ یہاں اندھیرے میں چھپ کر کیوں؟ تب کیا جواب دے گا؟ سوپر کاش کے پاؤڈر سے اُٹھنے والی خوشبو کس چیز کی تھی۔ لیونڈر معنی کیا ہوتا ہے؟ یہ کیا کسی پھول کا نام ہے ——— کہہ رہا تھا "آتے کیوں ہیں کھیل دیکھنے کے لیے"۔ کہتے ہیں سوپر کاش بھی بہت اسٹرانگ نروکا مالک ہے۔ ٹائی بریکر میں اُس نے مِس نہیں کیا۔ دائیں پوسٹ کے نیچے کی طرف اس نے گیند کو ڈالنا چاہا تھا۔ پرتل نے سر ہلایا۔ حالانکہ کہتے ہیں کہ وہ بھی بہت اسٹرانگ نروکا مالک ہے! وہ لوگ کچھ بھی نہیں جانتے ہیں۔

جانے کس چیز کی آواز ہوئی۔

وہ ٹھٹھک گیا۔ پیڑ کے پیچھے سے جیسے کچھ کھڑکھڑانے کی آواز ہوئی۔ پرتل ایک بار پھر پسینے میں نہا گیا۔ اگر اُن میں کوئی ہوا؟ تب چیخ پکار کر لوگوں کو بلاؤں گا۔ کیا کہہ کر پکاروں گا

"لوگو مجھے بچاؤ۔ لوگو مجھے مرنے سے بچاؤ"۔ پڑوس والے جنار دن کاکا کی بہو کی چیخ پکار کی آواز ان کے کچن سے آرہی تھی۔ آج بیس برس بعد بھی پرتل کے کانوں میں وہ آواز گونج رہی تھی۔ تو کیا اس وقت وہ اسی طرح کی آواز

رُکا کر بچ جائے گا؟"

کھڑکھڑاہٹ اب بند ہو گئی تھی۔ کھپریل کی چھت والے چھوٹے سے گھر کی آڑ میں گھنا درخت چُپ چاپ کھڑا تھا۔ برگد ہے شاید۔ گھر میں بتی جل رہی ہے۔ ہاتھ کی انگلیوں کی کپکپاہٹ اب بھی ختم نہیں ہوئی۔

لیکن اتنی دور تک اتنی رات گئے اس کا پیچھا کرتے ہوئے کیا وہ لوگ یہاں تک آسکیں گے؟ چھ آدمی میدان ہی میں مر گئے۔ دو کی حالت سیریس ہے۔ لگتا ہے نہیں بچیں گے۔ لیکن اُسے مار کر کیا فائدہ ہوگا؟ کیا اس سے ہارا ہوا میچ اب جیتا جا سکتا ہے۔ یقیناً وہ لوگ اب اس جنونی کیفیت سے نکل آئے ہوں گے۔ اُسے بھی اب اس خوف کی کیفیت سے نکل آنا ہوگا۔

..... اگر آتا ہے تو آئے۔ میں ڈروں گا نہیں۔ لڑوں گا، گھونسا چلاؤں گا۔ اس زخمی پاؤں کو سامنے والے کے پیٹ پر زور سے ماروں گا۔ راڈ، لاٹھی، زنجیر، اُسترا جو جی میں آئے چلائیں۔ لیٹ جاؤں گا زمین پہ چلاتے رہیں۔ لیکن ایک نہ ایک کو تو پکڑ ہی لوں گا۔ آنکھوں میں اُنگلیاں ڈال کر دیدے پھوڑ دوں گا—— دونوں ہاتھوں سے گلا دبا دوں گا۔ مرنے سے پہلے کم سے کم ایک لاش ضرور گرا دوں گا۔

پرتل کے بدن کے سارے اعضا آپ ہی آپ تن گئے۔ اُسے اپنے اندر ایک زبردست قوّت کا احساس ہوا۔ اس کی اُنگلیاں مستعد سی مُڑی رہیں۔ قدرے جُھک کر اُس نے دونوں طرف تیزی سے نگاہیں دوڑائیں۔ اندھیرا—— اور اندھیرا۔ پیچھے سے کوئی کیا! چونک کر وہ پیچھے مڑا۔ کوئی نہیں۔ "آؤ سالے آؤ۔ مرنا چاہتے ہو تو آؤ۔"

چاروں طرف پھیلے ہوئے اندھیرے میں اس کے منھ سے دبی دبی نکلی ہوئی آواز مدغم ہو گئی۔

"میاؤں!"

اندھیرے میں کہیں سے اچانک ایک سفید لوٹیل کی مانند ایک بلّی کا بچہ اس کے سامنے آگیا۔ اتنے اندھیرے میں بھی اس جانور کو پہچاننے میں پرتل کو دشواری نہیں ہوئی۔

"میاؤں" خوف اور رحم کی ملی جلی آواز۔

پرتل ہانپنے لگا۔ خوف کی کیفیت سے نکل کر اب سنبھلنے میں اُسے دقّت ہو رہی تھی۔ بلّی کے بچے نے آدمی کو دیکھ کر کچھ حوصلہ پایا تھا تو ٹھہر گیا تھا۔

"آ.... آ....!" بہت دیر بعد کسی ذی روح سے بات کرنے کا موقع اُسے ملا تھا۔ اس نے منھ کو گول کر کے 'پُچ' 'پُچ' کی آواز نکالی۔ بلّی کے بچے نے جواب میں ایک بار پھر اُسی طرح 'میاؤں' کیا۔ آگے جُھک کر اس نے بلّی کے بچے کو گود میں اُٹھا لیا۔ آپ ہی آپ اس کا دل خوشی سے بھر آیا۔

کچھ دیر تک گود میں خاموش رہنے کے بعد بلّی کے بچے نے نکلنے کے لیے کسمسانا شروع کر دیا۔ پرتل نے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں کی گرفت اور بڑھا دی۔ "اے اے کیا ہو رہا ہے۔" کہتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ اب بلّی کے بچے کے منھ سے خوف کی نہیں، بے چینی اور غصّہ کی میاؤں نکلنے لگی۔ لیکن پرتل نے اُسے چھوڑا نہیں۔ اس سے بات کرتے ہوئے وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔

پالو دا کے گھر میں بتی جل رہی ہے۔ دو منزلہ مکان میں اوپر نیچے بتی جل رہی تھی، صدر دروازہ کی بھی بتی جل رہی تھی۔ پرتل کو یہ دیکھ کر تھوڑی حیرانی ہوئی۔ صدر دروازہ بھی کھلا تھا۔ بات کیا ہے پورا علاقہ سو رہا ہے ور پالو دا کے مکان میں بتی جل رہی ہے۔ اس نے بلّی کے بچے کو راستے میں چھوڑ دیا۔ ادھر اُدھر دیکھ کر بلّی کے بچے نے اس طرف دوڑ لگائی جدھر سے اُسے لایا گیا تھا۔ پرتل دونوں ہاتھ جھاڑتا ہوا پالو دا کے مکان میں داخل ہوا۔

صدر دروازہ میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف اوپری منزل کو جانے والی سیڑھی اور سامنے کرایہ دار کے گھر کا دروازہ۔ پرتل کے قدموں کی آواز یا گلے کی کھنکار سنتے ہی سامنے دروازے کے پٹ کھُلے۔ ایک کم عمر عورت نے جھانک کر دیکھا جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ پرتل اس کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ اس کے باوجود اس نے بے قراری سے پوچھا:

"کچھ خبر ملی بھائی؟"

"کون سی خبر؟"

عورت افسردہ ہو گئی۔

"آپ کیا ان کے ساتھ کلکتہ گئے تھے؟"

"نہیں تو۔ میں ویسے کلکتہ ہی سے آ رہا ہوں۔ پالو دا کے پاس آیا ہوں۔" سیڑھی کی طرف اشارہ کر کے بولتے بولتے پرتل نے دیکھا کہ سیڑھی کے اوپری سرے پر کھڑی بو دی (بھابی) ہاتھ ہلا کر اشارے سے اُسے جلدی سے اوپر آنے کے لیے کہہ رہی تھی۔

عورت کے پریشان اور ملول چہرے پر ایک نظر ڈال کر پرتل سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بو دی نے ہونٹوں سے اُنگلی لگا کر اُسے منھ بند رکھنے کا اشارہ کیا۔

سیڑھی چڑھتے ہی بھابی اُسے کھینچ کر ایک طرف لے گئی۔ "آج ہی تم یہاں آگئے۔ جانتے ہو۔ کیا حادثہ ہوا ہے۔ نیچے کی کرایہ دار یعنی ان کے سوامی کو آفس کے کسی آدمی نے آج میچ کا ٹکٹ دیا تھا اور وہ ابھی تک لوٹ کر گھر نہیں آئے۔ صبح دفتر گئے۔ وہیں سے میچ دیکھنے جانا تھا۔ اور میچ دیکھ کر گھر آنا تھا۔"

"ہو سکتا ہے، دیکھو کسی کے گھر چلے گئے ہوں....!"

"نہیں، نہیں آج ان کے جلدی لوٹنے کی بات تھی۔ رات سات اور آٹھ کے درمیان

فریج کی ڈیلیوری ہونی تھی۔ اس وقت وہ گھر پر ہی ہوں گے کہہ کر گئے تھے۔"

"فریج دے گیا ہے؟"

"ہاں . . . میدان میں سُنا ہے بہت گول مال ہوا ہے۔ بہت لوگ مارے گئے ہیں — تم نے تو سب کچھ دیکھا ہوگا۔ کیا ہوا تھا۔ بولو نا؟"

پرتل کے سینے میں برف جمنا شروع ہوگئی۔ اُس نے رومال سے منہ پونچھا۔ پھر پسینہ سر سے پاؤں تک اُسے بھگو گیا۔

"ہاں میں نے بھی سُنا ہے۔ شاید چھ آدمی مارے گئے۔ گیلری کے اندر بھیڑ بھگدڑ میں کیا ہوا۔ میدان سے دیکھنا تو ممکن نہیں ہے نا۔ ہاں مگر یہ ہوشائے کس گیلری میں تھے۔ کتنے والا ٹکٹ تھا؟"

"وہ تو مجھے نہیں معلوم۔ وہ بینک میں نوکری کرتے ہیں۔ کسی پارٹی نے ٹکٹ دیا تھا۔ کھیل کود دیکھنے کے کچھ زیادہ شوقین نہیں ہیں۔ ٹکٹ ایسے ہی مل گیا اس لیے چلے گئے۔"

اب پرتل کو اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ اُس نے یہاں آکر غلطی کی ہے۔ بہت بھیانک غلطی کی ہے یہاں آکر۔ بھابی کی اگلی بات سے اُسے اور بھی زیادہ احساس ہوا اپنی بھول کا۔ "تمہارے بھیا ٹی وی پر میچ دیکھ رہے تھے۔ اور بھی کئی لوگ تھے محلّے کے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہنگامہ تمہاری وجہ سے ہوا۔"

"یہ کیا۔ میری وجہ سے کیوں؟"

"وہ مجھے نہیں معلوم۔ تمہارے بھیا نے بھی مجھ سے یہی کہا۔ 'بچّو نے اگر ٹھیک سے کِک مارا ہوتا'۔ مگر ان لوگوں کے سامنے ایسا نہیں کہا تھا۔"

"بالو دا کہاں ہیں؟"

"کلکتہ گئے ہیں اُن کا پتہ چلانے کے لیے۔ ساتھ میں پڑوس والے پرکاش بابو گئے ہیں۔ وہ بھی بینک میں نوکری کرتے ہیں اور محلّہ کا ایک لڑکا ہے نرمل وہ بھی گیا ہے۔ بندنا کا تو کوئی بھی نہیں ہے دور بھاگ کرنے والا۔ میاں بیوی اور ایک چھوٹا سا بچہ بس۔ ایک بھائی دُرگا پور میں ہے اور ایک بھائی . . . . وہ بھی کہیں دُور میں ہے۔ سسرال ڈائمنڈ ہاربر کے کسی گاؤں میں ہے مگر اُن کے یہاں آنا جانا نہیں ہے۔ بے چاری کتنی مصیبت میں پڑ گئی ہے۔"

بھابی لگاتار بولتے بولتے اچانک چُپ ہوگئی۔ چودہ پندرہ برس کی کمسن ملازمہ کھڑی ان کی بات سُن رہی تھی۔

"کیا ہوا رے کچھ کہنا ہے؟"

"میں سونے جارہی ہوں۔"

"ہاں ہاں جاکر سو جا۔ اب تجھے جاگ کر کیا کرنا ہے۔ جا۔"

پاؤں کی تکلیف کی وجہ سے اب پرتل کے لیے کھڑا رہنا مشکل تھا۔ وہ گھسٹتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"پاؤں میں کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔ تھوڑا لگ گیا ہے۔ لیکن مجھے کیوں قصوروار ٹھہرایا جارہا ہے۔ کھیل میں گول ہوتا ہے اور نہیں بھی۔ دنیا میں ہر جگہ ایسا ہوتا ہے اور ہو رہا ہے۔"

"لوگ مگر یہ سمجھتے نہیں ہیں نا۔"

"جہنم میں جائیں لوگ۔"

"کچھ کھاؤ گے نا؟"

"نہیں۔"

"تم اندر والے کمرے میں سو جاؤ۔ چارپائی بچھا دیتی ہوں۔ مچھر دانی بھی لگا دیتی ہوں۔ مگر پنکھا نہیں ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ پاؤں میں اگر تکلیف نہ ہوتی تو میں ابھی پیدل ہی کلکتہ چلا جاتا۔"

"پنکھا . . . . ! اچھا دیکھتی ہوں۔ تب تک کمرہ میں چل کر بیٹھو۔"

بھابی کچھ گھبرائی گھبرائی سی تھی۔ پرتل وجہ سمجھ کر بھی سیدھے سیدھے کچھ پوچھنے سے گھبرا رہا تھا۔ اس لیے کچھ گھما کر پوچھا۔

"مجھے پہچانتی ہے کیا؟"

"کون پہچانتی ہے؟"

"نیچے والی کرایہ دار!"

"ششدھر بابو یعنی ان کے شوہر جو آج کھیل دیکھنے گئے تھے۔ اُنہوں نے تمہیں دیکھا ہے۔ تم سے ملنے کے بڑے خواہشمند تھے۔ بندنا نے البتہ تمہیں کبھی نہیں دیکھا ہے۔ یہ میں جانتی ہوں۔"

"بوُدی تمہارے یہاں آس پاس کے لوگ مجھے پہچانتے نہیں ہیں؟"

"پہچانتے نہیں ہیں! ارے محلّے کا ہر لڑکا تمہیں پہچانتا ہے۔ تمہیں یہاں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں۔"

بھابی کے چہرے پر تردد کی لہر صاف نظر آئی۔ پرتل کی پیشانی پر پسینے پھوٹ نکلے۔ جس اندھیرے سے ہوکر وہ ڈرا سہما یہاں تک آیا تھا نہیں اسے اب اچھا لگا۔ اُس نے بھگوان کا شکر ادا کیا کہ اُسے راستے میں کوئی نہیں ملا سوائے بلّی کے بچّے کے۔"

"بستر بچھائے دے رہی ہوں۔ سو جاؤ۔ میں نیچے جارہی ہوں۔ بے چاری اکیلی ہے۔ رو رو کر بُرا حال کر رکھا تھا۔"

بستر بچھا کر بھابی کمرے سے نکل گئی۔ پرتل بے معنی نظروں سے کمرے کو دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد بھابی ہاتھ میں ایک ٹیبل فین لٹکائے کمرے میں آئیں۔ پرتل نے سر اُٹھا کر دبی دبی آواز میں کہا۔ "بوُدی میں یہاں ہوں۔ یہ کسی کو نہیں بتانا۔"

"پگلے یہ کوئی کہنے کی بات ہے۔ ششدھر بابو کے بارے میں ابھی تک کوئی خبر نہیں ہے۔ طبیعت بہت گھبرا رہی ہے۔ بس بھگوان سے یہی پرارتھنا کر رہی ہوں کہ وہ لوگ اچھی خبر لے کر لوٹیں۔ تمہارے بھیا کی طبیعت ادھر کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ پھر بھی وہ حوصلہ کرکے نکلے ہیں۔ کہنے لگے میرے بھائی کی ایک غلطی سے ایک گھر تباہ ہوگیا۔' یہ طعنہ ہمیشہ سُننا

پڑے گا۔ اب اگر میں گھر میں بیٹھا رہوں تو یہ اور خراب بات ہے۔ میں نے بھی کہا کہ تمہارا جانا فرض ہے۔"

بھابی نے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔

برتل کو لگا جیسے باہر سے زنجیر لگا دی گئی ہے —— مچھر دانی کے اندر سے سارا کمرہ اسے ملگجے اندھیرے کی دھند میں لپٹا ہوا نظر آیا۔ ٹیبل فین کی ہوا سے مچھر دانی کی دیوار کانپ رہی تھی۔

پسینے سے بستر بھیگا جا رہا تھا۔ یقیناً تکیہ بھی بھیگ جائے گا۔ اس نے بانو دا کی لنگی پہن رکھی تھی۔ رومال پتلون کی جیب ہی میں رہ گیا تھا۔

دن میں جو کچھ ہوا اس کو ذہن سے نکالنے کی جتنی وہ کوشش کرتا، اتنی ہی ایک مبہم سی شبیہہ اس کے تصور میں گھومنے لگتی۔ یہ مبہم سی شبیہہ سشندھر کی تھی۔ آنکھ، ناک، بال، ہونٹ، گال کچھ بھی نہیں بس جیسے کسی کالے کپڑے پر تھوڑی سی سفیدی پُتی ہوئی ہو۔ آہستہ آہستہ یہ بے چہرہ نقش سوپرکاش کے چہرے میں مدغم ہو گیا۔ پاؤڈر کی خوشبو جیسے سارے کمرے میں پھیل گئی۔ ایک بار اسے لگا جیسے کوئی کہہ رہا ہے "آتے کیوں ہیں کھیل دیکھنے!"

واہ! یہ لوگ کھیل دیکھنے نہ آئیں تو پھر کھیلیں گے کس کے لیے۔ وہ اگر خوشی سے پاگل نہ ہوں۔ سر پر بٹھا کر ناچیں نہیں تو پھر کھیلنے کی ضرورت کیا ہے۔ ہم کیا صرف پیسے کے لیے کھیلتے ہیں؟"

اس وقت اسے سب کچھ بے حقیقت سا معلوم ہو رہا تھا۔ اتنا ہی بے حقیقت جتنا اس کے ذہن میں تیرتا مبہم سا چہرہ۔ اسے لگ رہا تھا سچ کچھ نہیں ہے۔ کسی کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اس وقت وہ اپنے آپ میں تنہا ہے۔ ایک بھرے پُرے گھر میں تنہا۔ باہر بھی کچھ ٹھیک نہیں۔ کیا جانے کب کون سی آفت ٹوٹ پڑے۔ ایسا کیوں ہے کہ سب اسی کو مجرم سمجھیں۔

تنی ہوئی مچھر دانی کے سارے ڈور جیسے ایک ساتھ ٹوٹ جائیں ایسے ہی تھکان اس پر چھا گئی اور اسے نیند آ گئی۔

نیند میں اسے پتنگوں کے اُڑنے جیسی ایک آواز کا احساس ہو رہا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی اسے اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ یہ آواز ٹیبل فین کی تھی۔ اس نے سوچا بھابی یہ پنکھا کہاں سے جوگاڑ کر لائی۔ کیا نیچے والے کرایہ دار کے یہاں سے ہی مانگ لائی۔ ہو سکتا ہے سشندھر بابو ہی اسے روز چلا کر سوتے ہوں۔ سشندھر بابو آج رات تو نہیں آئیں گے۔ بیوی بھی نہیں سوئے گی شاید اسی لیے بھابی یہ پنکھا مانگ سکی۔

سرہانے کھڑکی کے نچلے دونوں پٹ بند تھے۔ بھابی نے اس احتیاط کے مارے اسے بند کر دیا تھا کہ باہر سے کسی کو کمرے میں کچھ دکھائی نہ دے۔

پرتل اٹھ کر بیٹھ گیا۔ باتھ روم۔ دروازہ ہلکے سے کھینچتے ہی کھل گیا۔ جھانک کر دیکھا، دالان میں کوئی نہیں تھا۔ سارے گھر میں کہیں کسی چیز کی موجودگی، کسی آواز کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔ بھابی کو پکارنا چاہا مگر رک گیا۔

باتھ روم میں داخل ہونے سے پہلے کچن کی طرف مڑ کر دیکھا۔ ملازمہ جھکی ہانڈی صاف کر رہی تھی۔ تازہ اخبار ٹیبل پر تہہ کیا پڑا تھا جیسے کسی نے اسے چھوا تک نہ ہو۔ اخبار کی طرف بڑھا پھر اچانک رک گیا۔ اسے لگا جیسے وہ سانپ کے بل میں انگلی ڈالنے جا رہا ہے۔

"گھر کے سب لوگ گئے کہاں؟ بانو دا واپس آئے۔" ملازمہ سینکی ہوئی ڈبل روٹی اور آملیٹ لے کر آئی تو اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"کاکا کھور بیلا آئے تھے۔ نیچے والی بوڑی اور بچے کو لے کر اسی وقت کلکتہ چلے گئے۔ کاکی بھی ساتھ میں گئی ہیں۔"

"کچھ کہہ رہے تھے؟ یعنی سشندھر بابو کے بارے میں کچھ ——" پرتل سانس روکے ملازمہ کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"کیا پتہ؟ مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا۔"

"رونے دھونے کی آواز سنی تم نے؟"

"میں تو تب سے اوپر ہی ہوں۔ کوئی رونے دھونے کی آواز تو سنی نہیں۔"

"کاکا نے آ کر تمہاری کاکی سے کیا کہا؟"

"کاکا نیچے ان کے گھر میں تھے، اوپر آئے ہی نہیں۔ کاکی بھی نیچے چلی گئیں۔ جاتے وقت مجھے کہہ گئیں کہ کھانا پکا لوں اور کہہ گئیں کہ آپ کے پیر میں چوٹ ہے، اس لیے آپ چلیں پھریں نہیں۔"

اس کا مطلب ہے کہ برآمدہ یا کھڑکی کے پاس نہ جاؤں تاکہ لوگ مجھے دیکھ نہ سکیں۔ پرتل نے اپنے پٹی بندھے پاؤں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ یہ سب لے جاؤ۔ میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔"

"کچھ نہیں کھائیں گے؟" لڑکی نے بے بسی سے پرتل کی طرف دیکھا۔

"بھوک لگے گی تو مانگ لوں گا۔"

پرتل سارا دن شام تک سویا رہا۔ کیا ہوا، جاننے کا کوئی اُپائے نہیں تھا۔ گھر میں سوائے اس لڑکی کے اور کوئی تو نہیں نظر آیا پرتل کو۔ شام کے وقت وہ آ کر برآمدہ میں کھڑا ہوا البتہ بتی نہیں جلائی۔ راستے سے اکا دکا لوگ گزر رہے تھے۔ بغل والے مکان کا دالان، کچن، بیڈ روم سب صاف نظر آ رہا تھا۔ سارا گھر سنسان۔ سامنے والے مکان کی دوسری منزل کی کھڑکیاں وغیرہ بند تھیں۔ گھر کے لوگ شاید کہیں باہر نکلے ہیں۔ کل کھڑکیاں کھلی تھیں۔ نچلی منزل کی ایک کھڑکی کھلی تھی۔ پردہ پڑا تھا۔ مگر ذرا سا کھلا تھا جس سے اندر نظر آ رہا تھا۔ ایک چارپائی اور اس سے نیچے جھولتے تین جوڑے پاؤں۔ لگتا ہے ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔ پرتل کو یاد آیا کہ بانو دا کے گھر میں بھی

ڈی دی ہے۔ کل سب نے کھیل دیکھا تھا۔

پرتل نے فیصلہ کیا کہ اب اُسے یہاں سے چلنا چاہیے۔ اور ذرا اندھیرا ہو۔ اُس نے کپڑے تبدیل کیے۔ کچھ دیر تک دالان میں بے مقصد ٹہلتا رہا۔ پھر کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ اُسے بہت کمزوری کا احساس ہو رہا تھا۔ دھیرے دھیرے پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔ اچانک وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ ایک موٹر گاڑی جیسے دروازے کے سامنے آکر رُکی۔ وہ برآمدے میں جانا چاہتا تھا، مگر نہ جا سکا۔

دہاڑتی ہوئی رونے کی ایک آواز جیسے اس کے کانوں میں پڑی۔ کمرے کا دروازہ بند ہونے کے باوجود خوف سے پرتل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب وہ کیا کرے۔ یہ رونے کی آواز ہے یا کچھ اور؟ وہ کھڑکی کے قریب آکر کان لگا کر سُننے کی کوشش کرنے لگا نیچے کی آوازوں کو۔ کچھ پتہ تو چلے۔

ششدھر کیا مارا گیا؟ میدان میں جو حادثہ ہوا اس میں؟ گاڑی کے حادثے میں بھی تو مر سکتا ہے۔ ایسا ہو تب بھی کم سے کم وہ تو بچ جائے۔

کہاں! رونے جیسی کوئی آواز تو نہیں آ رہی۔ دروازے کے اُس پار باتیں کرنے کی آواز سُن کر پرتل دبے پاؤں دروازے کے قریب آیا۔

"بلبل ہمارے پاس سوئے گا۔ تُو جلدی سے اُس کے لیے تکیہ لے آ۔ اور سُن کاکا کو جاکر کہہ دے کہ ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ سیدھے اُوپر آئیں۔"

بھابی کی آواز۔ وہ لوگ کیا ششدھر کو ساتھ لے کر لوٹے ہیں۔ زخمی ہوا ہے اس لیے ڈاکٹر؟ پھر یہ دہاڑنے رونے کی آواز..... اس کے سمجھنے میں کچھ غلطی ہوئی؟ لگتا ہے نیچے بہت سارے لوگ ہیں۔ پرتل کے خیالوں کی رو بار بار اندیشوں کی جکڑ میں آ جاتی۔ سب کچھ ٹھیک ہوتے ہوتے اچانک جیسے تحس نحس ہو جاتا۔ اس بے یقینی اور گھٹن کی کیفیت سے نکل کر اپنے مانوس ماحول میں خود کو شامل کر دینے کے لیے وہ اندھے کی طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

کیا اُن لوگوں نے بھلا دیا کہ وہ یہاں ہے۔ اس گھر میں وہ کل بائیس گھنٹے سے ایک قیدی کی طرح بند پڑا ہے اور اس بیچ کسی نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

اچانک پرتل کو غصہ آگیا۔ بات کیا ہے؟ ارے یہ ششدھر کا بچہ مر بھی گیا ہے تو اس کے لیے مجھے کیوں کوئی مجرم ٹھہرائے گا۔ جیسے میں نے اپنے ہاتھوں سے یہ خون کیا ہے۔ اس بدسلوکی کا مطلب کیا ہے۔ سوریہ کاش نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ لوگ کھیل دیکھنے جاتے کیوں ہیں۔

دروازہ کب کھلا۔ پرتل کو پتہ ہی نہ چلا۔ مثلث کی طرح روشنی کا ایک ٹکڑا دالان سے کمرے کے فرش پر آکر بیٹھ گیا۔ اس مثلث پر ایک سایہ پڑتا دیکھ کر وہ چونک اُٹھا۔

"تجھے ایک آدمی ڈھونڈنے آیا ہے بچو۔"

"کون؟ کیوں؟"

پرتل کے سارے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ پھُسپھُسا کر خوف میں ڈوبی ہوئی آواز میں پھر بولا۔ "کیوں پالو دا، میں نے کیا کیا ہے؟"

"کہہ رہا ہے کہ تیرے کلب سے آیا ہے۔ تجھے لے کر آج ہی ڈاکٹر کے پاس جائے گا۔ سُنا ہے تیرے پاؤں میں بڑی گہری چوٹ لگی ہے۔"

سر سے پاؤں تک پسینہ پھوٹ رہا ہے۔ پیشانی سے قطرے بہہ کر ٹھوڑی تک آ رہے ہیں۔ رومال سے اس نے جلدی آنکھوں کو پونچھا۔ پالو دا کی بغل سے گزرتا ہوا وہ نیچے اُتر آیا۔ صدر دروازہ کی بتی بجھی ہوئی تھی۔ کرایہ دار کا دروازہ بند۔ اس نے مُڑ کر نہیں دیکھا۔

"ارے گبّو، کیا خیر ہے؟"

"سلیل دا نے بھیجا ہے۔ وہ بڑے راستے پر گاڑی میں بیٹھے ہیں۔ پاؤں کیسا ہے؟ فیڈریشن کپ سے پہلے پاؤں ٹھیک کر لینا ہوگا۔ فِٹ ہونا چاہیے ایک دم۔"

گبّو کے کاندھے کا سہارا لیے وہ پھر اسی اندھیرے راستے پر مڑ لیا۔ مرتے سوکھے تنے والے ایک پیڑ کے پاس ٹھٹھک کر کیا جانے کیا تلاش کیا اس نے۔ منہ گول کرکے 'پیچ پیچ' کی آواز منہ سے نکالنے کے بعد گردن ہلا کر آپ ہی آپ بولا۔ "اندھیرے میں سفید چیز نظر آتی ہے، لیکن بس ایک بار ہی۔"

(بنگلہ سے ترجمہ)

بقیہ: ملاحظات

اور ان کے ردِعمل کو سن کر اس ذریعہ ابلاغ کی اہمیت سمجھ لی ہے۔

(سارا اسٹوارٹ)

●

پچھلے دنوں دہلی اردو اکادمی اور ہریانہ اردو اکادمی نے مشترکہ اہتمام میں' اردو ناول کے موضوع پر سورج کنڈ (واقع ہریانہ) میں ایک کل ہند سمی نار کا انعقاد کیا تھا۔ اردو دنیا کی یہی دو اکادمیاں سب سے زیادہ فعال ہیں اور مفید اور مؤثر خدمات انجام دے رہی ہیں یہی ملک کی پہلی دو اکادمیاں ہیں جنہوں نے ادبی کاموں کو باہمی اشتراک سے بڑھاوا دینے میں پہل کی۔ ایک نئی طرح ڈالی اور مثال قائم کی۔ اس کے لیے دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری سید شریف الحسن نقوی صاحب اور ہریانہ اردو اکادمی کے سکریٹری جناب کشمیری لال ذاکر اردو دنیا کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

مذکورہ سمی نار کے مقالات و مباحث گہرے غور و فکر کا نتیجہ تھے۔ ان سے اردو ناول کے ماضی و حال پر نظر کرنے اور مستقبل میں جھانکنے کے اچھے مواقع فراہم ہوئے۔ ادبی حلقوں میں ان کی گونج ابھی باقی ہے۔ ممکن یہ بہتر نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوں۔

زیر نظر شمارے میں خصوصی گوشے کے تینوں مقالات مذکورہ سمی نار میں پڑھے گئے تھے۔ یہ مقالات دہلی اردو اکادمی اور ہریانہ اردو اکادمی کے شکریہ کے ساتھ شائع کیے جا رہے ہیں۔ ●●

اونچی ڈال کا آم

جلدی اتنی پڑی تھی کہ ساگ چیرتے چیرتے ہاتھ میں چیرا لگنے کی بھی چھلو نے چنتا نہیں کی۔ مالکن کو جگانے کا وقت ہو گیا تھا۔ اور اُس نے جاگتے ہی چائے چڑھانے کے لیے کہنا تھا۔ اور پھر گُڈّی کو دودھ بھی پلانا تھا۔ اس لیے اس کے جاگنے سے پہلے وہ بہت سارا کام پورا کر لینا چاہتی تھی۔

"کیا چھلو، تجھے ابھی سبزی کاٹنے کے لیے کس نے کہا؟" مالکن کو اچانک ہی رسوئی میں دیکھ کر وہ سکتے میں آ گئی۔ ایک ہاتھ میں ساگ کی گٹھی اور ایک ہاتھ میں چھری پکڑے ہوئے وہ مالکن کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ "اچھا اب سمجھی میں" کہتے ہوئے مالکن ہنس دی آج تیرا گاہک آنے والا ہے، اس لیے اتنی جلدی کر رہی ہے۔"

چھلو نے گردن نیچی کر لی۔ "اچھا اُٹھ پہلے میرے لیے چائے بنا کر لے آ۔" مالکن مسکراتے ہوئے باہر چلی گئی۔ لیکن چھلو کے ہاتھ ویسے کے ویسے رُکے رہے۔ گردن بھی اونچی نہیں ہو سکی۔ گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے اُس نے آنکھیں میچ لیں۔ سوچنے لگی۔ کتنی بے شرم ہے مالکن۔ تھوڑی بھی جھجک نہیں۔ کیسے کہہ دیتی ہے گاہک۔"

جلتی ہوئی دیا سلائی دکھاتے ہی گیس آگ کا گولہ بن گئی۔ تھوڑا پیچھے نہ ہٹتی تو جل ہی مرتی۔ اس سے کئی بار ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ ایک سال ہو گیا۔ اُسے گیس جلاتے، لیکن جلانے کا ڈھنگ اُسے اب بھی نہیں آیا۔ تیلی جلا کر اُسے گیس کھولنی نہیں آتی ہمیشہ گیس کھول کر تیلی جلاتی ہے۔ کئی بار مالکن نے کہا ہے کہ ایک روز وہ اپنی لٹیں جلا بیٹھے گی۔ "میں کیا کروں جلتی ہیں تو جل جائیں" وہ جھنجھلا اُٹھتی "یہ گیس چیز ہی ایسی ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ اس کے ساتھ بھی سر پیٹنا پڑے گا۔"

گیس دھیمی کی۔ چھوٹے پتیلے میں پانی ڈال کے اس کے اوپر رکھ دیا اور خود اس دن کو یاد کرنے لگی جب اس کے منھ سے اچانک ہی نکل گیا تھا "گاہک" اور اس میں شک بھی کیا ہے۔ اس کی زندگی کا گاہک ہی تو ہے مادھو۔ پورے سات دنوں کے بعد ملنے آتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اُس نے سنیچر سے پہلے نہیں آنا ہے وہ پھر بھی ہر روز مادھو کے انتظار میں رہتی ہے۔ جب وہ گاؤں میں رہتی تھی تب مادھو سال میں ایک بار آتا تھا۔ پندرہ بیس دن کے لیے۔ دیکھا جائے تو ہمیشہ تڑپایا ہی ہے اُس نے اسے۔

شادی کے کچھ دنوں بعد مادھو اُسے چھوڑ کر شہر چلا آیا تھا۔ وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ ساس کی خدمت کے لیے۔ ایک سال بنا کسی ہلچل کے بیت گیا۔ سال بھر بعد مادھو گھر آیا تو چھلو کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ اس کے لیے مادھو اچھے اچھے کپڑے لایا تھا۔ ساس کو پسند نہیں آئے تھے۔ لیکن اُس نے بڑے شوق سے پہن کر سارے گاؤں کو دکھائے تھے۔ پندرہ بیس دن کے بعد مادھو پھر سے چلا گیا۔ سال کے بعد زندگی کچھ پیار بھرے دن لے کر آئی اور پھر اپنے پیچھے کچھ یادیں اک درد، اک کسک چھوڑ کر چلی جاتی۔ سات سال ایسے ہی گزر گئے۔ سات سال بعد مادھو نے اُسے شہر لے جانے کا فیصلہ کیا۔ ساس نے بہت ساری اڑچنیں ڈالیں۔ لیکن مادھو نے ایک نہیں مانی۔ اُسے ساتھ لے کر چل دیا۔ دو دن اور دو رات گاڑی میں بیٹھنا پڑا۔ اس سے پہلے کبھی اُس نے ریل گاڑی نہیں دیکھی تھی۔ بیچاری

بی۔ ۳۵۔ سروالم ہاؤسنگ سوسائٹی، ارلا برج، اندھیری بمبئی ۵۸ ۔۔۔ ۴۰۰

نے کچھ بھی نہیں جانا سمجھا تھا۔ اسٹیشن پر اُترے تو مادھو نے بتایا اس شہر میں ساٹھ لاکھ لوگ رہتے ہیں۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آیا تھا کہ ساٹھ لاکھ کتنے ہوتے ہیں۔ لیکن اسٹیشن سے گھر تک آتے آتے اس نے اتنے لوگ دیکھے کہ گھبرا کر اُس نے مادھو کا بازو پکڑ لیا۔

اس گھر میں آ کر وہ جدھر دیکھتی حیران ہو کر اُدھر ہی دیکھتی رہ جاتی۔ ایسے گھر اُس نے پہلے کہاں دیکھے تھے۔ یہ بات بھی مادھو نے اُسے یہاں آ کر بتائی کہ اُسے اس گھر میں نوکرانی کا کام کرنا ہوگا۔ پہلے تو بڑا عجیب سا لگا۔ پھر اُس نے سوچا سا س کی چاکری سے یہ نوکری بُری نہیں۔ یہاں مادھو بھی تو ساتھ ہے۔

لیکن جب مادھو نے بتایا کہ وہ ہفتے میں ایک روز ہی اُسے ملا کرے گا تو اس کا دل گھٹنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں چھا گئیں۔ مادھو نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا "گھبراؤ نہیں۔ یہ بڑے بھلے لوگ ہیں۔ اپنی طرف کے ہیں۔ مجھے نو سال ہو گئے ہیں ان کے پاس کام کرتے۔ بہت بڑی دُکان ہے ان کی جہاں میں کام کرتا ہوں۔ منھ اندھیرے اُٹھ کر دُکان کی صفائی کرنی پڑتی ہے۔ اسی لیے مجھے وہاں سونا پڑتا ہے۔ اتوار کو دُکان بند ہوتی ہے اور میں ہر سنیچر کی شام کو یہاں آجایا کروں گا۔

اُسے بڑی حیرانی ہوئی۔ جیسے یہ کوئی اور ہی جہاں تھا، جہاں خاوند اپنی بیوی کو کسی دوسرے کے پاس نوکر رکھ دیتا ہے اور آپ سات روز کے بعد آ کر ایک روز اُسے مل جاتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مادھو اُسے اپنے پاس لا کر اس سے دُور ہو گیا تھا یا دُور ہو کر اس کے پاس آ گیا تھا۔

گھر میں کُل ملا کر تین لوگ تھے۔ مالک، مالکن اور چھ برس کی گڈی۔ ان کا کھانا پینا رہنا بیٹھنا دیکھ کر پہلے تو وہ حیران ہوتی رہی۔ ہر چیز کو ہاتھ لگا کر دیکھنے کا من کرتا۔ دھیرے دھیرے ہر چیز کی عادی ہونے لگی۔ مالکن نے بڑے سلیقے سے اُسے صفائی کرنا اور روٹی پکانا سکھایا۔ نئے نئے کام میں مصروف ہو کر اس نے اپنے آپ کو بھلانے کی بھی کوشش کی۔

ہر سنیچر کی رات کو جب گھر کے لوگ کھا پی کر کچھ دیر بعد اپنے گھر کی بتیاں بجھا دیتے ہیں، تب وہ بھی رسوئی کا کام کاج سمیٹ کر غسل خانے کے پیچھے کی خالی جگہ پر اپنی چٹائی بچھا لیتی ہے۔ باہر کا لیمپ بجھا کر مادھو ہلکے ہلکے قدموں سے اُس کے پاس آ جاتا ہے۔ ہر بار اُس کے آغوش میں جانے سے پہلے ہی اُس کا سانس گھٹنے لگتا ہے۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مادھو اُسے سات سال کے بعد ملا ہے۔

ہر بار مادھو اس کے لیے کھانے کو کچھ نہ کچھ ضرور لاتا ہے۔ کبھی برفی، کبھی جلیبی، کبھی کھٹائی ——— اندھیرے میں وہ اُسے اپنے ہاتھوں سے کھلاتا ہے۔ کبھی کبھی اس کا دل بھی کرتا ہے کہ وہ بھی مادھو کو کچھ کھلائے۔ لیکن جب بھی وہ اس کے منھ میں کچھ ڈالتی ہے، مادھو جھٹ ہی دانتوں میں اس کی اُنگلی دبا لیتا ہے۔ وہ سسک اُٹھتی ہے اور پھر ساری ساری رات نہ مادھو کی ہاتھا پائی رُکتی ہیں اور نہ اُس کی سسکیاں۔

آج سنیچر ہے مالکن کو بھی اس بات کا پتہ ہے۔ اس کی اپنی ہی بے عقلی سے ایک روز مالکن کو پتہ لگ گیا تھا کہ آج کے دن اُسے کتنی جلدی رہتی ہے۔

کوئی دو مہینے پہلے کی بات ہے اس سنیچر کو مادھو دوپہر ہی کو آ گیا تھا۔ اُسے اچانک آیا دیکھ کر وہ اتنی خوش ہوئی کہ اُسے اپنی کچھ سُدھ ہی نہیں رہی۔ منھ پر بے ساختہ آئی ہنسی سے انجان وہ مالکن کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ مالکن گڈی کو پڑھا رہی تھی۔ چھٹکے چہرے پر کھیلتی ہنسی دیکھ کر پوچھ بیٹھی "کیا بات ہے؟"

"گاہک آیا ہے۔" اس نے انجانے ہی کہہ دیا تھا۔

"کیا؟" مالکن نے پوچھا تھا۔

مالکن کے کیا کا جواب چھلو نہیں دے سکی لیکن اس وقت مادھو کو دیکھ کر مالکن مادھو کا مطلب سمجھ گئی ——— 'بے شرم کہیں کی۔' کہہ کر وہ بھی ہنس دی۔ اس دن کے بعد سے مالکن جب بھی اس کے ساتھ مادھو کے بارے میں کوئی بات کرتی ہے تو اس کے نام کی جگہ گاہک ہی بولتی ہے۔ بے شرم نہ ہو تو۔

چائے بن گئی۔ چھوٹی ٹرے میں پیالی رکھ کر اس نے ٹرے ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دی۔ مالکن نے ایک گھونٹ پی کر کہا "گڈی باہر کھیل رہی ہے اُسے کچن میں بلا کر دودھ پلا دے۔" وہ مُڑی لیکن پھر رُک گئی۔ "چاول بھی چُن دوں؟" "ہاں چُن دے۔ آٹا بھی گوندھ دے اور دال بھی چڑھا دے۔ بتیوں والے اسٹوو پر۔ جا جلدی کر۔ آج تیرا گاہک آنے والا ہے نہ؟ جا جلدی کر..... پھٹا پھٹ..... پھٹا پھٹ... پھٹا پھٹ....."

منھ پھر سُرخ ہو گیا اُس کا۔ جھٹ لوٹ کر رسوئی میں آ گئی اور منھ چھپا لیا۔ 'میں بھی اتنی جلد باز ہوں!' وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اتنی جلد بازی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ چاولوں کے بارے میں پوچھا ہی کیوں؟ روز ہی تو مالکن بتا دیتی ہے کہ کس وقت کیا چڑھانا ہے۔ میں کتنی اوچھی ہو جاتی ہوں۔ چھی! خراب بات۔"

اس کی نظر نیچے پڑی تو دیکھا کھڑکی کے راستے اندر گھس آیا دھوپ کا ایک پیلا سا ٹکڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جھنجھلا کر اُس نے اس پر پیر رکھ دیا۔ لیکن دھوپ کا ٹکڑا اُس کے پیر پر جا چڑھا۔ پیر آگے بڑھایا تو وہ شلوار پر گھٹنوں تک آ پہنچا اور پھر قمیص پر۔ پریشان ہو کر وہ پچھلے دروازے سے باہر آ گئی، گڈی کو بلانے کے لیے۔

باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔ آم کے درخت میں سے پتّوں کی چھ۔۔۔۔ اے۔۔۔۔ لے۔۔۔ چھ۔۔۔ ا۔۔ ا۔۔۔۔ چھاں سُنائی دے رہی تھی۔ ڈالیاں کبھی ادھر تو کبھی اُدھر جھک رہی تھیں۔ چار پانچ کوے باغیچے کی منڈیر پر بیٹھے کائیں۔۔۔۔ ں ں۔۔۔۔ کائیں۔۔۔۔ ں ں کا شور مچا رہے تھے۔ روز شام کے وقت ان درختوں کے نیچے کھڑے ہو کر چھلو کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کا گاؤں اس مہانگر سے زیادہ دُور نہیں۔

"چھلو! او چھلو!!" گڈّی کی پکار نے اسے جھنجھوڑا اور وہ اپنی سوچ میں سے نکل آئی۔ دیکھا تو گڈّی بازو پکڑ کر کہہ رہی تھی "مجھے وہ آم اُتار دے۔"

چھلو نے اوپر دیکھا۔ درخت کی سب سے اونچی ڈال پر ایک آم پک چکا تھا۔ پیلا پیلا۔ گڈّی اسے اُتار دینے کے لیے کہہ رہی تھی۔ "میں اتنی اوپر کیسے چڑھ سکتی ہوں گڈّی؟"

"نہیں۔ مجھے وہ آم اُتار دے۔" لڑکی منہ بنا کر بیٹھ گئی۔ چھلو کو معلوم تھا کہ گڈّی بڑی ضدّی ہے۔ آسانی سے ماننے والی نہیں۔ اس نے اُسے اُٹھا کر اپنے کندھے پر بیٹھا لیا اور بولی۔ "لے تُو خود ہی اُتار لے۔"

اس کے کندھے پر پیر رکھ کر گڈّی کھڑی ہو گئی۔ "لیکن آم تو بہت اوپر تھا۔ اس کا ہاتھ وہاں کیسے پہنچتا؟

"بس اُتار لیا آم؟" چھلو نے ہنستے ہوئے کہا۔ "چل آ، دُودھ پی۔" گڈّی چیختی مچلتی رہی "آم لینا ہے۔ آم لینا ہے۔" اور چھلو اُسے اسی طرح اپنے کندھے پر اُٹھائے اُٹھائے رسوئی میں لے آئی۔

صاحب، مالکن اور گڈّی تینوں جنے روٹی کھا رہے تھے ـــــ چھلو گرم گرم پھلکے بنا کر ان کی پلیٹ میں رکھتی جا رہی تھی۔ جلدی جلدی کام کرتے ہوئے اس کی نظریں بار بار اندھیرے میں مادھو کو تلاش کر رہی تھیں۔ لیکن مادھو کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔ وہ آ گیا ہوا ہے۔ چھلو کو معلوم ہے۔ یہ بھی وہ جانتی ہے کہ تھوڑی دیر کے بعد وہ اور مادھو اکٹھے روٹی کھا رہے ہوں گے۔ لیکن سب کچھ پتہ ہوتے ہوئے بھی اس سے صبر نہیں ہو رہا۔ جلد بازی میں وہ جس طرح کام کر رہی ہے۔ اگر مالکن کا ڈر نہ ہوتا تو اُس نے نہ جانے کتنی کپ پلیٹیں توڑ دی ہوتیں۔

مادھو باہر رسوئی کی کھڑکی کے نیچے دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ پھلکے بنانے کی آواز اور چھلو کی چوڑیوں کی چھن چھن اُس کے کانوں کے راستے من کی گہرائیوں میں اُتر رہی تھی ـــ اسے روٹی کی بھوک نہیں تھی۔ چھلو کے پاس جانے کی جلدی تھی۔ جو اتنی پاس ہو کر بھی اس سے اتنی دُور تھی۔ وہ کئی بار سوچتا۔ وہ دن کب آئے گا جب اُن کا اپنا ایک گھر ہوگا۔ جہاں وہ روز کام پر سے لوٹنے کے بعد چھلو کے پاس بیٹھ سکے گا۔ چھلو روز اس کے لیے روٹی بنائے گی اور وہ کھائے گا۔

گڈّی روٹی کھا کر اُٹھی تو سیدھی ٹی وی کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔ صاحب اور مالکن کار میں بیٹھ کر بازار پان کھانے کے لیے جانے لگے۔ جاتے جاتے مالکن نے آواز دی۔ "چھلو، تم لوگ بھی روٹی کھا لینا۔ ہم ابھی آتے ہیں۔"

برآمدے میں کھڑے ہو کر اُس نے مادھو کو آنے کا اشارہ کیا۔ مادھو پچھلے دروازے سے اندر آیا اور زمین پر ہی بیٹھ گیا۔ چھلو نے پلیٹیں سامنے رکھیں۔ "اتنی روٹیاں؟" مادھو حیران ہوا۔

"تم کھاؤ۔ بچا ہوا مجھے ہی کھانا ہے۔"

مادھو کھانے لگا۔ چھلو کو ہمیشہ اس بات کی حیرانی ہوتی ہے کہ مادھو گاؤں جا کر اپنے گھر کتنا کھاتا تھا اور یہاں اُسے اتنا بھی زیادہ لگتا ہے۔

"تُو بھی تو کھا۔"

"میں بعد میں کھا لوں گی اسی پلیٹ میں۔"

وہ مادھو کو روٹی کھاتے دیکھتی جا رہی تھی اس پر سے نظریں ہٹانے کا اس کا من ہی نہیں ہو رہا تھا۔ مادھو نے اچانک ہی اُسے دیکھا اور منہ میں نوالہ ڈالتے ڈالتے رُک گیا۔

چھلو کی آنکھوں میں اُسے وہ کچھ نظر آیا جس کی خاطر اُسے سارا ہفتہ بھوکا پیاسا رہنا پڑتا ہے۔ چھلو مسکرا کر بولی۔ "کیا دیکھ رہے ہو۔ روٹی کھاؤ۔"

"لے تُو بھی کھا لے۔" کہتے ہوئے مادھو نے ہاتھ کا نوالہ اُس کے منہ میں ڈالا۔

جب تک چھلو نے کھانا کھانے کے بعد رسوئی کا کام ختم کیا تب تک صاحب اور مالکن بھی پان کھا کر لوٹ آئے تھے اور اپنے بیڈ روم میں تھے۔ دروازے بند کر کے چھلو نے رسوئی کی لائٹ بجھا دی اور غسل خانے کے پیچھے آ کر اپنا بستر ڈالنے لگی۔ ابھی چٹائی اچھی طرح بچھا بھی نہیں پائی تھی کہ اچانک ہی مادھو نے دیوار پر لگا سوئچ بند کر دیا۔ اندھیرا ہو گیا اور وہ کہتی ہی رہ گئی۔ "بچھونا تو ڈال لینے دو۔"

دیر کے بعد مادھو کی گود میں سر رکھے ہوئے وہ بولی۔ "ایک بات کہوں؟" "کیا؟"

"مالکن کو پھر کچھ ہونے والا ہے۔" "تجھے کس نے بتایا؟" "آپ ہی بتا رہی تھی بے شرم کی طرح۔" "کیا کہہ رہی تھی؟" "کہہ رہی تھی کہ اگر لڑکا ہوا تو وہ مجھے چار ساڑیاں دے گی۔"

"اچھا، ساڑی پہن کر تو تُو پوری شہرن بن جائے گی۔" کچھ دیر تک دونوں چُپ رہے۔

وہ پھر بولی۔ "تم کو سُن کر خوشی نہیں ہوئی؟"

"ہوئی کیوں نہیں۔ صاب بڑا بھلا لوگ ہے۔ اتنی جائداد کا مالک ہے۔ لڑکا تو ہونا ہی چاہیے۔ لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ ہمیں کب کچھ ہونا ہے....؟"

مادھو کی بات سُن کر وہ تھوڑا پیچھے ہٹ گئی۔ مادھو حیران ہوا۔ "کیا ہو گیا ہے تجھے؟" چھلو بالکل اس کے قریب ہو گئی اور اس کی چھاتی پر سر رکھتے ہوئے بولی، "تم ہر روز گھر نہیں آ سکتے؟"

"کیوں؟" "گاؤں میں تم سال کے بعد آتے تھے۔ یہاں سات دنوں میں ایک بار۔ میرے کچھ ہو بھی

بقیہ ص ۳۵



نام کتاب : حرفِ برہنہ (دہر ما ...)
مصنف : پروفیسر عنوان چشتی
قیمت : ۱۰۰ روپے
ناشر رابطہ : مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

"حرفِ برہنہ" پروفیسر عنوان چشتی کے چند چھوٹے بڑے ادبی تبصروں اور بعض تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے، جو پچھلے دس سال کے عرصے میں لکھے گئے ہیں۔ اس کتاب کا نام یاد دلاتا ہے شمشیرِ برہنہ کی۔ ہر چند 'حرف' کی کاٹ شمشیر سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے۔ یہ کلمۂ حق کہنے سے پیدا ہوتی ہے، جس کے لیے بڑی جرأت اور حد درجہ حزم و احتیاط کی ضرورت ہے۔ مصنف نے اپنے دیباچے میں سچ کہا ہے۔ "تنقید تلوار کی دھار پر چلنے کا فن ہے"۔

اس معیار پر عنوان چشتی صاحب کے ان مضامین کو پرکھا جائے تو عمومی صداقت یہی نکلتی ہے کہ وہ اپنی اس کوشش میں حتی الامکان کامیاب ہوئے ہیں۔ چوں کہ کلمۂ حق کہنے کے ساتھ وہ تنقید میں ایک متوازن نقطۂ نظر کے بھی قائل ہیں اور ادب کے "احتجاجی قبیلے" اور "جمالیاتی قافلے" کے (دونوں تراکیب انہیں کی خود ساختہ ہیں) اختلافات اور پس منظر سے بخوبی واقف ہیں۔ "قبیلہ" اور "قافلہ" سے بہتر ان اختلافات کو ظاہر کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہوسکتے۔

اس نقطۂ نظر سے ان کا سب سے اچھا مضمون اخترالایمان کے مجموعۂ کلام 'سروسامان' پر ہے۔ میرا خیال ہے اخترالایمان کی شاعری کے بارے میں اس سے بہتر "حرفِ برہنہ" اور کہیں مشکل سے ملے گا۔ "حرفِ برہنہ" کی کاٹ اگر پیشِ نظر ہو تو بشیر بدر کے مجموعے "آمد" پر ان کا تبصرہ دیکھا جاسکتا ہے۔ جس میں بشیر بدر کی "دودھیا جذبوں" کی شاعری اور "سستی رومانیت" کی بھرپور خبر لی گئی ہے۔ ساتھ ساتھ شاعر کی عروضی غلطیوں اور فنی خامیوں کی تفصیل بھی دی ہے

دراصل علم عروض و بیان عنوان چشتی صاحب کا خاص میدان ہے اور چونکہ اس میدان کے شیر اب کم ہی رہ گئے ہیں۔ اس لیے وہ جدید شاعروں کا اپنے حملوں سے ابتر حال کرسکتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی واقفیت فتنہ و فسا تک مسلّم ہے۔ اس کے ثبوت میں صغیرالنسا بیگم کی معروف تصنیف "غالب کا عروضی تجزیہ" پر ان کے مشاہدات دیکھے جاسکتے ہیں۔

فنِ عروض کے سلسلے میں ان کا اندازِ فکر روایتی ہے۔ لیکن اب وقت آگیا ہے کہ اس کے بارے میں اجتہادی نقطۂ نظر سے سوچا جاتے۔ مثلاً ہندی کے الفاظ ہوں یا اردو فارسی کے تمام مصوتے (حروفِ علت) اپنی صوتیاتی کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے یکساں صوتی قدر کے حامل ہیں۔ ایسے حروف کے 'دبنے' یا "سقوط" کے مسئلے میں پرانے امتیازات کو قائم رکھنا کہاں تک جائز ہے۔ اسی طرح بحور اور ان کے زحافات کے چکروں سے باہر آنے کی ضرورت ہے۔ دراصل اردو کے عروض کو از سرِ نو صوتیاتی نقطۂ نظر سے مدون کرنے کی ضرورت ہے۔

زبان و بیان کی جانب سے جدید شعرا کے یہاں جو چشم پوشی (میرے خیال میں عجزِ بیان) ملتی ہے۔ اس کا تذکرہ بھی ان تبصروں میں ملتا ہے جو بیشتر صحیح خطوط پر ہے۔ 'کھاد' کا تلفظ فاع کے بجائے فعلن پر کرنا اخترالایمان کے یہاں ملتا ہو یا فیض کے یہاں غلط ہے۔ البتہ عنوان چشتی صاحب نے اپنے تبصروں کے لیے شعرا کے انتخاب میں زیادہ احتیاط نہیں برتی ہے۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جان کر ایک کمزور رہوار کا انتخاب کرتے ہیں تاکہ اس پر اپنی فنی واقفیت کے تازیانے لگا سکیں۔ یہ انصاف سے بعید ہے۔ ع

"وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا"

بعض مختصر تبصرے بہت زیادہ مختصر ہیں۔ مثلاً ساجدہ زیدی کے مجموعۂ کلام "آتشِ سیّال" پر تبصرہ کرتے وقت ایک شعر بھی نذرِ ناظرین نہیں کیا گیا ہے۔ ایسے 'ادبی نوٹس' کو یا تو مفصل بنانا چاہیے یا مجموعۂ مضامین سے نکال دینا چاہیے۔ شعر میں الفاظ کی بھرتی کا گلہ کیا جاسکتا ہے۔ تو ایسے مجموعوں میں بھرتی کے مضامین کی شکایت بھی بجا ہے۔

"حرفِ برہنہ" کے مطالعے سے اس کے مصنف کی دو صلاحیتیں مسلّم ہوتی ہیں۔ ان کا علم عروض، زبان و بیان سے گہرا شغف اور درک دوسرے نہایت عمدہ ادبی نثر لکھنے کی مہارت۔ یہ اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ اگر وہ اپنی ادبی تحریروں اور تبصروں کا احتیاط کے ساتھ انتخاب شائع کریں تو وہ خاصے کی چیز ہوگی۔

(مسعود حسین خاں)

نام کتاب : بازدید
مصنف : مخمور سعیدی
قیمت : ۶۰ روپے
ناشر : ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولہ مارکیٹ
دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ہمارے شاعر دوستوں میں شاید ہی کسی نے اتنے رسالوں، اشاعتی اداروں سے خود کو متعلق رکھا ہوا اور ہم عصر شعری مجموعوں پر اتنے دیباچے لکھے ہوں جتنے مخمور سعیدی نے۔ مخمور میں شعر کہنے اور نثر لکھنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ مجھے اب بھی احساس ہے کہ انہیں اگر تحریک کے ذریعے فروغ دیے جانے والے ادبی رجحانات اور رویوں سے "آزادی" کی کوئی اور متبادل راہ مل جاتی تو انہیں اپنی شخصیت کے داخلی امکانات کو روشن تر کرنے کا ایک لمبا عرصہ مل جاتا۔ مخمور کے پاس ادب کے آہنگ کا ایک بامعنی عرفان ہے۔ نئے پرانے اسالیب سے یہی قریبی آشنائی مخمور کو ادب کے دونوں چہروں کو اپنی نظر سے دیکھنے اور انہیں اپنی ہتھیلیوں میں لے کر اپنے انفاس میں تحلیل کرنے کا ہنر سکھاتی ہے۔ شاعر کے بارے میں یہ عام تاثر ہے کہ وہ کوتاہ قلم ہوتا ہے یعنی شعر کہہ لینے کے بعد نہ صرف یہ کہ وہ اپنے اندرونی ہیجان سے رہائی پا لیتا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ اس نے شعر کہہ کر خیال کے اظہار کا قرض بھی ادا کر دیا ہے۔ مخمور ان شاعروں میں ہیں جو شعر کہہ کر بھی مطمئن نہیں ہوتے۔ اظہار خیال کے لیے نثر کو بھی للچائی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ مجھے ان کی اس للچاہٹ میں ساقی فاروقی کی نیت کا سا کھراپن نظر آیا جو تنقید کی صورت میں لکھی جانے والی نثر کو کلیشے سے آزاد کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مخمور سعیدی کی نئی کتاب 'بازدید' کے مضامین کو پڑھتے وقت نہیں ملتا لیکن ایک بات جو ساقی اور مخمور میں مشترک ہے وہ یہ ہے کہ دونوں نے اپنے تخلیقی تجربے کے حوالے سے دوسروں کے تخلیقی تجربوں کی تہہ تک پہنچنے کی امکان بھر کوشش کی ہے۔

"بازدید" کے بیشتر مضامین ان لوگوں کے بارے میں ہیں جن سے مخمور یا تو متاثر ہوئے ہیں یا جن سے وہ قریب رہے ہیں۔ یہ مضامین قرب کی کہانی سے شروع ہوتے ہیں۔ تعلقات اور روابط کی بنتی بگڑتی ہوئی صورتوں کی نشان دہی کرتے ہوئے شخصیتوں کے ادبی قد و قامت پر کھل کر رائے زنی کرتے ہیں۔ مخمور سوچ اور فکر کے مختلف دھاروں سے اپنے پڑھنے والوں کو واقف کرانے میں کسی تخیل یا بازی گری سے کام نہیں لیتے۔ اُن کی باتیں اور دلائل دھوپ کے جسم پر چمکتے ہوئے بارش کے قطروں کی طرح منظر کو دل کش بنا دیتے ہیں۔ وہ قاری کو مطمئن کیے بغیر آگے نہیں بڑھتے۔ صنفِ غزل کے بارے میں وہ اپنی بات اس طرح پہنچاتے ہیں،

"غزل بہت آسان صنفِ سخن ہے محض غزل کہنے کی رسم پوری کرنی ہو تو چند قافیے کاغذ پر لکھ لیجیے۔ مضمون وہ خود سجھا دیں گے ردیف مضمون کی بندش کا طریقہ سمجھا دے گی، لیکن اگر غزل ذمہ داری سے کہی جائے، اُسے ذاتی تجربے اور اظہار کا ذریعہ بنایا جائے تو اس سے زیادہ صبر آزما کوئی دوسری صنفِ سخن نہیں۔ رسمی غزل کہنے والے کے مقابلے میں ایک ذمہ دار غزل گو شاعر کے لیے یہی سہولتیں مشکلات کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ کیوں کہ اسے تو اپنی بات اپنے لہجے میں کہنی ہے اور اس طرح کہنی ہے کہ اس کی آواز الگ پہچانی جائے۔"

مخمور خواہ جوش کی شاعری کی بات کر رہے ہوں یا جگر، بسمل سعیدی، مشفق خواجہ یا ساحر لدھیانوی کی وہ نقاد سے زیادہ ایک تخلیق کار کی حیثیت سے ان کے ساتھ اپنی شعر فہمی اور سخن شناسی کا رشتہ جوڑتے ہیں۔ مخمور کے ان مضامین میں جنہیں اُنہوں نے خود بھی 'تاثراتی' کہا ہے' ان کی اس سوچ کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ کہ ہر لکھنے والا اپنے ادبی ماضی یا عصر کی قدآور شخصیتوں کے لہجے کو غور سے سننے اور ان لہجوں کی حلاوتوں کو اپنی آواز کا حصہ بنانے کی شعوری یا غیر شعوری کوشش کرتا ہے۔ لیکن پھر اُس طرف اپنا سفر بھی جاری رکھتا ہے۔ جہاں پہنچ کر اُس کے پاس صرف اپنی آواز کا فطری حسن ہی ایک مؤثر حربے کی صورت میں جہاں دری کے لیے باقی رہ جاتا ہے۔ جگر کی غزل نے حسن و عشق کے ہجر و وصل کو اپنے تجربے کا حصہ بنایا۔ اس کو مخمور نے اس طرح سمیٹا ہے۔

"اپنے عہد کی غزل کو جگر کی یہ بڑی دین یہ ہے کہ انہوں نے غزل کے بدنام محبوب کو روایتی ابتذال کی دلدل سے نکال کر اس کے انسانی شرف کو بحال کیا"

جوش، جگر، بسمل سعیدی، ساحر لدھیانوی، مشفق خواجہ اور گوپال متل کے بارے میں مخمور کے مضامین میں افسانویت اور خاکہ نگاری کے عنصر کے ساتھ ساتھ وہ تنقیدی آگہی بھی ہے جو پیشہ ورانہ تنقید کے حصار سے باہر کھلی فضا میں سانس لینے کا احساس دلاتی ہے۔ ان مضامین کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ مخمور اپنے عہد کی سچائیوں اور ان سچائیوں کو جھوٹ ثابت کرنے والے معاشرے اور انسان کو بہت قریب سے جانتے ہیں۔ اپنے عصر کے ظاہر و باطن سے اتنی قریبی اور گہری واقفیت صرف ایک تخلیق کار کے قلم سے ہی ممکن ہے کہ وہ خیال اور جذبے کے اظہار اور اس کی رسائی کے لیے شعر اور نثر دونوں زمینوں میں نئی روایتوں کی فصل اُگانے کا دُکھ جھیلتا ہے۔ "بازدید" اسی دُکھ جھیلنے کو اپنے پڑھنے والے پر منکشف کرتی ہے۔ زبیر رضوی

مکتوبات

اضافہ :

مضمون "ایک مردم خیز خطہ : ردولی" کی اشاعت کا شکریہ۔ لیکن اس میں مجھ سے دو غلطیاں ہوگئیں۔ جن کے لیے آپ سے اور قارئین سے معذرت خواہ ہوں۔

صفحہ ۱۴ پر چودھری خلیل احمد کی مسجد کے قطعۂ تاریخ کا ذکر ہے۔ جسے میں نے صفی لکھنوی کے نام سے لکھا ہے۔ یہ تاریخ عزیز الدین عزیز نے لکھی تھی۔

دوسرے بعض اہم ناموں کا ذکر مجھ سے رہ گیا۔ یوں تو تمام ناموں کا احاطہ بہت مشکل ہے، لیکن جلدی میں بعض ایسے نام ذہن سے نکل گئے جن کے بغیر مضمون تشنہ ہے۔ ردولی کی اہم شخصیتوں میں پروانہ ردولوی کا نام ہے جو ایک اچھے شاعر اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور اردو صحافت میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ عارف محمود اچھے افسانہ نگار اور کان پور انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری ہیں — محمد شعیب نعمانی کے افسانے ہند و پاک کے رسائل میں برابر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اور ڈاکٹر سید محفوظ حسن بنڈا ایک ہندی اور سنسکرت کے اچھے عالم ہیں۔ ہندی میں شعر کہتے ہیں۔ انہوں نے ہندی میں مرثیے لکھنے شروع کیے ہیں، ڈاکٹر نگیندر نے جس کی بہت تعریف کی ہے۔ ابھی انہیں ہندی کا ایک اہم ایوارڈ بھی ملا ہے۔ مشہور صحافی اور سابق ممبر پارلیمنٹ انصار ہروانی کا تعلق بھی ردولی سے ہے۔ چودھری محمود سہیل ردولی کی سماجی زندگی کی ایک اہم شخصیت ہیں۔ اسلامیہ ہائی اسکول اور ردولی پبلک لائبریری کے قیام میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ وہ تعلیمی اور تہذیبی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

ردولی کے لوگوں نے ہر شعبۂ زندگی میں نمایاں کام انجام دیے ہیں۔ میں نے ان حضرات کا ذکر عمداً نہیں کیا ہے جو ترکِ وطن کر گئے۔ لیکن مجھے احساس ہے کہ میں ان تمام لوگوں کا ذکر نہیں کر سکا۔ اس لیے بھی کہ مضمون پھر صرف ایک فہرست بن جاتا۔

صفحہ ۱۵ پر ملائی کی برفی چھپا ہے۔ اسے ملائی کی برف پڑھا جائے۔

شارب ردولوی، دہلی

مستقل تحقیق :

"آج کل" جنوری ۱۹۹۰ء کا شمارہ دیکھا۔ منظور احمد نظر دھنگ کے سلسلے میں اتنا مفصل اور سیر حاصل مضمون پہلی بار نظر سے گزرا۔ مضمون کیا ہے، ایک مستقل تحقیق کا درجہ رکھتا ہے۔

کشمیری لال ذاکر کا سفرنامہ خاصے کی چیز ہے۔ دیگر توجہ کھینچنے والی چیزوں میں رتن سنگھ، شوکت حیات اور انیس رفیع کی کہانیاں اور رف۔ س۔ اعجاز کی غزل پسند آئی۔ "شاعر" کے اقبال نمبر پر تبصرہ عمدہ اور جامع ہے۔ مکتوبات میں منظر امام کا 'غلطی ہائے مضامین' پڑھ کر قاضی عبدالودود اور ان کے افسانوں پر شہزاد منظر کے مضمون کو نئے سرے سے پڑھنے کا تجسس پیدا ہوا۔

شاہد جمیل، ٹکاری، گیا

فنکارانہ انداز :

ماہِ فروری ۱۹۹۰ء کا "آج کل" پڑھا۔ ظفر پیامی کو کس طرح مرحوم کہا جائے کہ وہ اپنے لافانی مقصد و پیغام کے ساتھ امر ہیں۔ اپنی نگارشات، ناول، کہانیوں میں ہم لوگوں کے درمیان اپنی عصری آگہی کے پس منظر میں ہمارے انسانی ضمیر کو بڑے ہی فن کارانہ انداز سے جگاتے نظر آتے ہیں۔

شرون کمار ورما کی کہانی "موڑ" ایک اچھی نفسیاتی کہانی ہے۔ وقت کا چکر پرانی اور نئی قدروں کو ایک نہ ایک دن ایسے موڑ پر لا کھڑا کرتا ہے، جہاں دونوں کے درمیان کچھ نہ کچھ سمجھوتے کے بغیر آگے مشکل ہے۔

شہزاد معصومی، پٹنہ

سفید رنگ :

مارچ ۱۹۹۰ء کے شمارہ میں جناب شمیم حنفی کا مقالہ "اردو ادب آزادی کے بعد" پڑھ کر تشنگی کا احساس ہوا۔

ظہیر احمد صدیقی صاحب کا "اخلاقی اقدار اور اردو ادب" کافی تجزیاتی مقالہ ہے۔ علی امام نقوی صاحب کا افسانہ "نمکی" نے متاثر کیا البتہ اس افسانہ میں کچھ ایسے جملے شامل ہیں جن سے پھکڑپن کی بو آتی ہے۔ حمید سہروردی صاحب نے اپنی کہانی "نہ دھرتی نہ بادل" میں "سفید رنگ" کی ترکیب استعمال کی ہے، جسے صحیح ثابت کرنے کے لیے خود ان کے پاس بھی کوئی جواز نہ ہوگا۔

ارشد لکھنوی، نئی دہلی

اردو کا مقبول عام مصور ماہ نامہ

آج کل

نئی دہلی

مہمان مدیر
راج نرائن راز

سب ایڈیٹر
خورشید اکرم

جلد: ۴۸ شمارہ: ۱۱

جون ۱۹۹۰ء جیٹھ ۱۹۱۲ساکا شک سمت

قیمت: دو روپے فون: ۳۸۷۰۶۹

سرورق: تزئین: آر۔کے۔ ٹنڈن

اندرون ملک نے رسالانہ: ۲۰ روپے
دو سال کے لیے: ۳۶ روپے
تین سال کے لیے: ۴۸ روپے

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر آج کل (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

بزنس منیجر: جسونت سنگھ فون: ۳۸۷۹۸۳
اسسٹنٹ بزنس منیجر: شکنتلا

ترسیل زر کا پتہ:
بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن
پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترتیب

چھوٹی صنعتیں اور روزگار

عوام کو روزگار مہیا کرنا ہر مہذب معاشرے کا اوّلین فرض ہے جس کے بغیر کوئی ملک یا معاشرہ اپنے وجود کو صحیح حالت میں قائم نہیں رکھ سکتا۔ اسی اصول کو مدّ نظر رکھتے ہوئے قومی مورچہ سرکار نے اپنے انتخابی منشور کے مطابق ملک میں روزگار کی فراہمی کی جانب مناسب توجہ دی ہے بلکہ کام کے حق کو بنیادی حقوق میں شامل کرنے کا بھی اعلان کیا ہے۔

نئی سرکار کا پہلا بجٹ پیش کرتے ہوئے وزیر خزانہ شری مدھو ڈنڈوتے نے کہا کہ ہماری اوّلین ترجیح روزگار ہے۔ انہوں نے بتایا کہ گزشتہ دس برسوں میں ہماری معیشت میں لگ بھگ پانچ فی صد سالانہ کی شرح سے ترقی ہوئی ہے، لیکن قومی سیمپل سروے کی رپورٹ کے مطابق جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ بے روزگار افراد کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مستقل طور پر بے روزگار افراد کی تعداد ۱۹۸۳ء میں ۸۰ لاکھ تھی۔ جو ۸۸-۱۹۸۷ء میں بڑھ کر ایک کروڑ ۲۰ لاکھ ہوگئی۔ ان کے علاوہ بہت بڑی تعداد اُن لوگوں کی ہے جو سال میں کچھ دنوں کے لیے ہی یا جزوی وقت یا اپنی صلاحیت سے کم قیمت کا روزگار حاصل کر پاتے ہیں۔ ان لوگوں کی آمدنی کم از کم معیارِ زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے بھی کافی نہیں ہوتی۔ وزیر خزانہ نے کہا کہ "اُن کی حکومت کا یہ اعتقاد ہے کہ ملک کے ہر شخص کا حق ہے کہ اُسے ایسا پیداواری اور منافع بخش کام ملے جس سے وہ باوقار زندگی بسر کر سکے۔"

وزیر خزانہ نے کہا کہ قومی مورچہ سرکار جلد ہی روزگار کی ضمانت کی ایک اسکیم رائج کرے گی، لیکن ملک کے تمام حصّوں میں ایسی اسکیم کو شروع کرنے کے لیے بھاری اخراجات کی ضرورت ہوگی۔ جس کے لیے فی الحال حکومت کے پاس ضروری مالی وسیلے نہیں ہیں تاہم روزگار کی ضمانت کی اسکیم کا آغاز اُن علاقوں میں کیا جا رہا

آج کل نئی دہلی

اجازت وشکریہ

میرے لیے یہ خوشی کا مقام ہے کہ میں اکتوبر ۱۹۸۹ء میں عرصۂ ملازمت کی تکمیل پر "آج کل" کے چیف ایڈیٹر کے عہدے سے وظیفہ یاب ہو کر سبکدوش ہوا۔ میری خوش قسمتی کہ اس کے بعد بھی آج کل سے میرا رسمی تعلق بنا رہا اور مہمان مدیر کی حیثیت سے مجھے "آج کل کی خدمت کا موقع ملا۔ جون ۱۹۹۰ء کے زیرِ نظر شمارے کے ساتھ اس تعلق کی تکمیل ہوئی۔ اور میں اپنے پڑھنے اور لکھنے والوں سے رسمی طور پر اجازت لیتے ہوئے رخصت ہو رہا ہوں۔

"آج کل" سے میری حالیہ وابستگی کی مدت لگ بھگ دس برس رہی۔ یوں تو سرکاری اور رسمی وابستگی پچھلے بیس برسوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ میں پہلی بار ستمبر ۱۹۶۸ء میں "آج کل" کا اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوا تھا۔ اس عرصہ میں میں نے استعداد بھر "آج کل" کی خدمت کی۔ اُسے مزید مفید رسالہ بنانے کی کوشش کی۔ جمیل مظہری، حسرت موہانی، مولانا آزاد، سہیل عظیم آبادی، خواجہ احمد عباس اور بیرانند سچدانند واتسائن اگئے جیسی اہم شخصیات اور اردو صحافت، جدید ہندی کہانی، پنجابی کہانی، سندھی ادب جیسے اہم موضوعات پر خاص نمبر شائع کیے۔ آج کل کے عام شماروں کو اور ان خاص نمبروں کو اردو کے ادبی حلقوں میں جو پذیرائی حاصل ہوئی، وہی ان مساعی کا بہترین انعام تھا۔ اس پورے عرصے میں "آج کل" کو ملک اور بیرونی اردو دنیا کے ممتاز معتدد قلم کاروں کا تعاون حاصل رہا۔ آج کل کا معیار اور مزاج انہیں کے مزاج و معیار کا آئینہ دار رہا۔ اس پورے عرصے میں میری یہ خواہش اور کوشش بھی رہی کہ نئے قلمکاروں کی تخلیقات زیادہ سے زیادہ تعداد میں "آج کل" میں شائع ہوں "آج کل" کے توسط سے اُنہیں اردو دنیا سے روشناس کرایا جائے کہ وہی کل کے مصنف اور شاعر ہیں۔ اس طرح "آج کل" گزرے ہوئے کل، آج اور آنے والے کل کے قلمکاروں پرانے اور نئے کے امتزاج کا حامل بنا۔ بعض حلقوں اور دوستوں کو یقیناً شکایات بھی رہیں۔ اس کا سبب میری ناقص دانست میں آج کل کے صفحات کی کم دامانی رہی۔ مجھے احساس ہے کہ میں آج کل کو اُن کی توقعات کے مطابق نہیں بنا پایا۔ دنیا کا کام کسی نے تمام نہیں کیا۔ ایسے میں یہ اُمید کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتا ہوں کہ میرے بعد اس رسالے کی ادارت کا بار سنبھالنے والے اس کام کو بخوبی انجام دے پائیں گے۔ تاہم اس سے انکار مشکل ہوگا کہ "آج کل" اُردو کا اور ملک کا اہم رسالہ ہے۔ لکھنے اور پڑھنے والوں نے اسے ہمیشہ اعتبار کی نظروں سے دیکھا ہے اور میری ممکنہ حوصلہ افزائی کی ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ وہ آئندہ بھی "آج کل" کو معاونت اور مشوروں سے نوازتے رہیں گے۔ میں مکرر شکریے کے ساتھ آج کل کے لکھنے اور پڑھنے والوں سے رخصت لیتا ہوں۔

راج نرائن راز

ہے، جہاں اکثر لوگوں کو خشک سالی اور فصلوں کی ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

زراعت ہمارے ملک کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ملک کے ستر فی صد عوام کی روٹی روزی کا انحصار زراعت اور اس سے وابستہ پیشوں پر ہے۔ لیکن زراعت اب بھی ایک غیر یقینی ذریعۂ معاش ہے جس کی کامیابی کا بہت حد تک انحصار موسمی حالات پر ہوتا ہے اور جس سے کروڑوں افراد کو مستقل طور پر نہیں بلکہ جزوی طور پر ہی روزگار حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے مصنوعات سازی یعنی صنعت کا شعبہ کھیتی مزدوروں اور غیر زرعی ہنرمندوں کو روزگار مہیا کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

مشینی صنعت کاری:

ہمارے ملک میں دیہی اور چھوٹی حرفتیں ہمیشہ ملکی معیشت کا ایک نہایت اہم حصہ رہی ہیں۔ اور دیہات میں بسنے والے لوگوں کی گزر بسر کا ذریعہ بنتی آئی ہیں، لیکن غیر ملکی حکومت اور اس کے ساتھ مشینوں کی آمد نے اس معاشی نظام کو چوپٹ کر کے رکھ دیا۔ مشینوں سے صنعتیں لگانے کا عمل کچھ سرمایہ داروں اور خصوصی مفادات کے ہاتھوں میں مرکوز ہو گیا جن کا مقصد کم از کم سرمائے اور کم از کم افرادی قوت سے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنا تھا۔ ان صنعتوں نے ان شعبوں پر چھاپہ مارا جو کروڑوں افراد کو روزگار مہیا کرتی تھیں اور عوامی کھپت کی ضروری اشیاء تیار کرتی تھیں نتیجہ یہ ہوا کہ دیہات اور قصبات اجڑ گئے۔ بڑے بڑے شہر اور صنعتی بستیاں بسنے لگیں۔ جہاں دیہات کے اکثر مزدور ناگفتہ بہ زندگی بسر کرنے کے لیے مجبور ہو گئے۔

آزادی کے بعد بھی چالیس برس ہم ایسی صنعتوں کی ترقی پر زور دیتے رہے ہیں جنہیں بنیادی صنعتوں کا نام دیا گیا ہے جن پر بھاری سرمایہ خرچ آتا ہے اور جنہیں قائم کرنے میں بہت وقت صرف ہوتا ہے۔ ان صنعتوں میں جدید تکنیک اور تکنالوجی کے بڑھتے ہوئے استعمال سے زیادہ پیداواریت پر توجہ دی جاتی ہے لیکن افرادی قوت کی بجائے زیادہ سے زیادہ کام مشینوں سے لیا جاتا ہے۔

حکومت نے ۱۹۵۶ء میں ملک کے لیے جو صنعتی پالیسی مرتب کی اس میں بے شک روزگار کی فراہمی کے لیے چھوٹی اور دیہی صنعتوں کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے اور اس جانب قدم اٹھائے گئے ہیں۔ لیکن زیادہ تر زور بڑے اور درمیانہ درجے کے کارخانے لگانے پر دیا گیا ۔۔۔ حالانکہ اس ملک کی جہاں افرادی قوت کی بہتات ہے، ایسی صنعتوں کی ضرورت ہے جن پر بہت کم سرمایہ خرچ ہو جن کے لیے خام مال دیہات سے ہی حاصل ہو سکے اور جہاں سے لوگوں کو فی الفور روزگار کا وسیلہ حاصل ہو سکے۔ اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے صنعتی پالیسی میں موزوں تبدیلیاں کی گئی ہیں اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں و دیہی حرفتوں کی ترقی کے لیے بہت سی سہولیات مہیا کی جا رہی ہیں۔ بہت سی اشیاء کی تیاری ان صنعتوں کے لیے مخصوص کر دی گئی ہے۔ اگرچہ ان صنعتوں کے لیے مخصوص اشیاء کی تعداد اس وقت ۸۳۶ ہے لیکن ان چھوٹے کارخانوں میں جن میں سے ۹۰ فی صدی کا بنیادی سرمایہ دو لاکھ روپیہ یا اس سے کم ہے قریب پانچ ہزار اقسام کا مال تیار ہوتا ہے۔ ان میں کام کرنے والے کاریگروں اور ہنرمندوں کو تکنیکی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ آلات بھی مہیا کیے جاتے ہیں۔ پیداوار پر کوئی پیداواری محصول نہیں لیا جاتا۔ اور مالی وسیلے بھی کافی بڑی تعداد میں مہیا کیے جاتے ہیں۔

اس حوصلہ افزائی کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا ہے اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں نے ہر لحاظ سے ترقی کی ہے۔ اگرچہ ۳۵ لاکھ روپے تک کی صنعتوں کا شمار چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں ہوتا ہے۔ لیکن اس شعبے کی ۹۵ فیصد صنعتوں کا سرمایہ دو تین لاکھ روپے سے زیادہ نہیں ہے۔ ۱۹۶۱ء میں ملک میں چھوٹی صنعتوں کی تعداد ۳۸ ہزار تھی، لیکن اس وقت یہ تعداد بڑھ کر ۱۴ لاکھ کے قریب ہو چکی ہے۔ ان صنعتوں کی مجموعی پیداوار کی مالیت کا اندازہ ۴۶ ہزار ۵۰۰ کروڑ روپے ہے جو کہ ملک کی مجموعی پیداوار کے ۳۸ فی صد حصے کے برابر ہے۔ ان صنعتوں میں اس وقت قریب ڈیڑھ کروڑ روپے کا پورے وقت اور بہت سے لوگوں کو جزوی وقت کا روزگار حاصل ہو رہا ہے۔ یہ صنعتیں عوام کی بہت سی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ بڑی بڑی صنعتوں کے لیے درکار بہت سا خام مال بھی مہیا کر رہی ہیں۔

برآمدات:

چھوٹی صنعتیں زرِ مبادلہ کی بچت اور زرِ مبادلہ کی آمدنی میں بھی بہت بڑا کردار ادا کر رہی ہیں۔ ۸۸-۱۹۸۷ء میں ۴ ہزار ۳۵ کروڑ روپے کی مالیت کا چھوٹی صنعتوں کا تیار کردہ مال ملک سے برآمد کیا گیا جو کہ ملک کی کل برآمدات کے ۲۹ فی صد حصے کے برابر تھا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ چھوٹی صنعتوں کے تیار کردہ مال کی برآمد میں ہر برس ۲۵ فی صد کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اس شعبے کی تیار کردہ مصنوعات میں جو ملک سے برآمد کی جا رہی ہیں صرف روایتی اشیاء ہی شامل نہیں بلکہ ان میں چمڑے کی تیار مصنوعات، ڈبہ بند مچھلی اور خوراک، اونی اور بُنے ہوئے کپڑے، کھیلوں کا سامان، تیار یعنی سِلے سلائے کپڑے، بنیادی کیمیات، آرائشی سامان اور انجینئری صنعتوں کا سامان بھی شامل ہے۔

کھادی اور دیہی صنعتیں:

روزگار کی فراہمی کی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے دیہات میں کھادی اور چھوٹی صنعتوں کے لیے مخصوص

کی تعداد میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اب تک ۲۶ صنعتیں دیہات کے لیے مخصوص تھیں۔ لیکن ۱۹۸۸-۸۹ء میں ان میں مزید ۳۴ صنعتوں کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ جن میں انجینیرنگ اور الیکٹرانک صنعتیں بھی شامل ہیں۔

روزگار:

ملک میں نئی صنعتی پالیسی کے منصوبے مرتب کرنے والوں نے اندازہ لگایا ہے کہ جہاں تک عوام کو روزگار کی فراہمی کا تعلق ہے۔ چھوٹے پیمانے کی اور دیہی صنعتیں ہی اس مہیب مسئلے کو حل کر سکتی ہیں۔ جہاں بڑی صنعتوں میں سرمایہ کاری سے ایک شخص کو روزگار مہیا کیا جا سکتا ہے، وہاں اتنے ہی سرمائے سے چھوٹی صنعتیں نو افراد کو روزگار مہیا کر سکتی ہیں۔ یہ اندازہ بھی لگایا گیا ہے کہ جہاں ملک کی مجموعی آمدنی اور پیداوار میں بڑی صنعتوں کا حصہ ۲۵ فی صد ہے، وہاں مجموعی روزگار میں ان کا حصہ صرف ۱۲ فی صد ہے۔

چنانچہ کچھ روز پہلے مرکزی وزیر صنعت شری اجیت سنگھ نے اپنی وزارت کی مشاورتی کمیٹی کے اجلاس میں بتایا کہ قومی مورچہ سرکار نے روزگار کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے ملک میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی حقیقی ترقی اور حوصلہ افزائی کا فیصلہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگرچہ صنعتی شعبے میں نمایاں ترقی ہوئی ہے، لیکن وہاں اس کے مطابق روزگار مہیا نہیں ہو سکا۔ اور اس خامی کو چھوٹے پیمانے کی اور دیہی صنعتوں کی حوصلہ افزائی سے ہی پورا کیا جا سکتا ہے۔

لہٰذا یہ قدرتی امر تھا کہ نئی سرکار نے سب سے زیادہ توجہ چھوٹی صنعتوں پر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس شعبے سے زیادہ روزگار پیدا کرنے اور صنعتوں کو ملک کی متوازن ترقی کے لیے دور دور کے علاقوں میں پھیلانے کے دونوں مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس سے غریبی کو کم کرنے اور آمدنی میں فرق کو کم کرنے میں بھی مدد مل سکتی ہے نیز معیارِ زندگی کو بھی بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ چھوٹی صنعتوں کا شعبہ ایک ایسا وسیلہ ہے، جہاں کام شروع کرنے میں بہت کم وقت لگتا ہے اور انہیں دیہی اور نیم قصباتی علاقوں میں لگایا جا سکتا ہے، جہاں بہت زیادہ بنیادی ضروریات بھی درکار نہیں ہوتیں۔ ان صنعتوں کے ذریعے چھوٹی بچتوں کی رقوم بھی کار آمد طریقے سے استعمال کی جا سکتی ہیں۔

جدید کاری:

لیکن چھوٹے پیمانوں کی صنعتوں کی ترقی کے عمل کو جدید کاری کے بغیر جاری رکھنا بھی آسان نہیں ہے۔ ایسا کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ صنعتیں دیگر صنعتوں کے مقابلے میں کم نرخوں پر معیاری مال مہیا کر سکیں۔

مراعات اور سہولیات:

روزگار کی فراہمی اور پیداوار میں اضافے کے دوہرے فائدوں کو حاصل کرنے کی غرض سے حکومت نے چھوٹی اور دیہی صنعتوں کو بڑی صنعتوں کے مقابلے میں کئی ایک مراعات اور سہولیات مہیا کرنے کا فیصلہ بھی کیا ہے۔ گزشتہ حکومت نے یکم اکتوبر ۱۹۸۸ء سے چھوٹی صنعتوں میں سرمایہ میں مالی مدد کی اسکیم ختم کر دی تھی، لیکن نئی حکومت نے یہ اسکیم بحال کر دی ہے، لیکن اب اس اسکیم کا اطلاق صرف ملک کے دیہی اور پسماندہ علاقوں میں لگائی جانے والی صنعتوں پر ہی ہوگا۔

چھوٹی صنعتوں کا سب سے بڑا مسئلہ موزوں مالی وسیلوں کی کمی ہے۔ حکومت نے ان صنعتوں کو بروقت قرضے دلانے کی جانب بھی قدم اٹھایا ہے۔ چھوٹی صنعتوں کی ترقی کا ایک فنڈ قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے، جس سے اس مسئلے کو حل کرنے میں بہت مدد ملے گی۔ سٹیٹ فنانشل کارپوریشن میں ایک "سنگل ونڈو" اسکیم شروع کی گئی ہے، جہاں سے چھوٹے پیمانے کی صنعت کاروں کو تمام مالی سہولیات صرف ایک ہی جگہ پر حاصل ہو جایا کریں گی۔

۲ر اپریل ۱۹۹۰ء سے بھارت کی چھوٹی صنعتوں کے ترقیاتی بنک نے بھی کام شروع کر دیا ہے چونکہ یہ بنک صرف چھوٹی اور بہت ہی چھوٹی صنعتوں کی قرضہ یا پھر سے سرمایہ کاری کی ضروریات پوری کرے گا۔ اس لیے چھوٹے پیمانے کی موجودہ صنعتوں کی بنیاد پختہ کرنے میں بہت مدد مل سکے گی۔

حکومت نے ایک کمیٹی بھی قائم کر دی ہے جو یہ دیکھے گی کہ بڑی صنعتیں وہ اشیاء تیار نہ کریں جو چھوٹی صنعتوں کے لیے مخصوص کی گئی ہیں۔ شیڈولڈ بینکوں سے بھی کہا گیا ہے کہ وہ چالیس فی صد قرضے کی رقوم ان صنعتوں کے لیے مخصوص کریں۔ یہ کمیٹی بنکوں کی طرف سے ان ہدایات کی خلاف ورزی کو روکنے کی جانب بھی توجہ دے گی۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں پر سرمایہ کاری کی موجودہ زیادہ سے زیادہ حد ۳۵ لاکھ روپیے ہے۔ ان میں سے ۹۵ فی صد صنعتوں کا سرمایہ ۵ لاکھ روپے سے زیادہ نہیں ہے۔ بعض مفادات چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ سرمائے کی حد بڑھا دی جائے تاکہ وہ حکومت کی طرف سے پیش کی جانے والی سہولیات سے فائدہ اٹھا سکیں لیکن حکومت نے اس تجویز کو منظور نہیں کیا۔

وزیرِ خزانہ شری مدھو ڈنڈوتے نے بجٹ پیش کرتے ہوئے حکومت کے اس ارادے کا اعادہ کیا کہ حکومت بڑی، چھوٹی اور دیہی تینوں صنعتوں کی یکساں اور ہم آہنگ ترقی کی جانب توجہ دے گی اور بڑی صنعتوں کی بالادستی سے چھوٹی صنعتوں کو پورا پورا تحفظ دے گی۔ وزیرِ خزانہ نے کہا کہ ہم لوگوں کو صنعتوں کو صنعتوں میں نہیں لے جانا چاہتے۔ بلکہ صنعتوں کو لوگوں کے پاس لے جانا چاہتے ہیں تاکہ معاشرے میں وہ

خرابیاں اور عدم توازن پیدا نہ ہو، جو آج ملک میں دکھائی دے رہا ہے۔

وزیر خزانہ نے اعلان کیا کہ بڑی صنعتوں سے چھوٹی صنعتوں کو بلوں کی ادائیگی میں جو مشکلات پیش آتی ہیں، وہ ختم کی جا رہی ہیں۔ دیہات اور قصبوں میں خواتین کو چھوٹی صنعتوں کے لگانے میں اپنی گرہ سے سرمایہ لگانے کی جو دقت پیش آتی ہے اس پر بھی مناسب توجہ دی جا رہی ہے۔

سرکاری مالیاتی کارپوریشن کی سنگل ونڈو اسکیم سے سرمایہ کی فراہمی کے لیے نئی صنعتیں لگانے والوں کے پراجیکٹوں کی موجودہ مالی حد پانچ لاکھ روپے ہے جسے بڑھا کر اب دس لاکھ روپے کر دیا گیا ہے، جس سے بہت سے نئے صنعت کار یہ مالی امداد حاصل کر سکیں گے۔

بھارت کی چھوٹی صنعتوں کے ترقیاتی بنک کا منظور شدہ بنیادی سرمایہ ۲۵۰ کروڑ روپیہ ہے۔ لیکن وہ اس سرمایہ کو ایک ہزار کروڑ روپے تک بڑھا سکتا ہے۔ دیہات میں زرعی پیداوار پر مبنی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کے چھوٹی صنعتوں اور زرعی و دیہی صنعتوں کا ایک نیا محکمہ قائم کر دیا گیا ہے۔ اس سے چھوٹے پیمانے کی اور دیہی صنعتوں کو امداد دینے کے موجودہ نظام کو بہت تقویت ملے گی۔

دیہی و کھادی صنعتیں:

چونکہ دیہی و کھادی کی صنعتیں ہماری معیشت کا ایک اہم حصہ ہیں اور اس شعبے میں کئی اقسام کے ہنرمند کام کرتے ہیں۔ اس لیے اس شعبے کی متواتر ترقی کے لیے مناسب توجہ کی ضرورت ہے۔ ان صنعتوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ایک الگ بورڈ کام کر رہا ہے۔ ان کوششوں سے کاریگروں کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے ہنرمندوں کو اپنے لیے روزگار حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بازار میں ضروری اشیاء کی فراہمی کا سلسلہ بھی قائم رہتا ہے۔ اس شعبے سے ملک کی روایتی حرفتوں اور فنی وراثت کی ترقی میں بھی مدد ملتی ہے۔

اور اگر دیکھا جائے تو دیہی اور چھوٹی گھریلو صنعتیں ہی ہمارے لوگوں اور خاص طور پر دور دراز کے پہاڑی علاقوں میں رہنے والے غریب عوام کی ترقی اور خوشحالی کی واحد امید ہیں۔ اگر انہیں روزگار مل جائے تو شہروں اور قصبوں کی جانب ناپسندیدہ نقلِ مکانی کا سلسلہ بھی رک سکتا ہے۔

حکومت نے صنعتوں کے اس شعبے کے لیے جو پالیسی مرتب کی ہے اس میں زیادہ توجہ ہنرمندوں اور کاریگروں کو بہتر آلات اور بہتر تربیت مہیا کرے۔ ان کی ٹکنالوجی میں اضافہ کرنے، انہیں خام مال فراہم کرنے اور تیار مال کی فروخت میں مدد دینے پر زور دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک مارکیٹنگ کارپوریشن قائم کرنے کی بھی تجویز ہے۔ جو کل ہند بنیادوں پر کام کرے گی۔ یہ کارپوریشن کاریگروں سے مال خریدتے بڑے شہروں اور قصبوں میں فروخت کرے گی اور ملک کے باہر بھی بھیجے گی۔

چھوٹے کارخانوں کا ناقابلِ عمل ہونا

بڑے کارخانوں کو یہ سہولت حاصل ہے کہ حسب مختلف وجوہات یا فرسودگی کے سبب وہ قابلِ عمل نہیں رہتے تو اُن کے مالک انہیں تالہ لگا کر حکومت کے حوالے کر جاتے ہیں۔ حکومت نے کارکنوں کو روزگار مہیا کرنے کے لیے ایسے کارخانوں کو پھر سے چالو کرنے کی ذمہ داری ایک بورڈ کے ذریعے سنبھال رکھی ہے، لیکن چھوٹی صنعتوں کو ایسی کسی امداد کی سہولت حاصل نہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ملک میں قریب دو لاکھ چھوٹے کارخانے بیک یا ناقابلِ عمل ہیں، جہاں کارکنوں کے روزگار کو خطرہ ہے۔ وزیرِ صنعت نے کہا ہے کہ حکومت ایسی پالیسی مرتب کر رہی ہے جس سے ان کارخانوں کو پھر سے کارآمد بنایا جا سکے۔

نئی صنعتی پالیسی:

چھوٹی صنعتوں میں روزگار کے وسیع امکانات کے پیشِ نظر ملک کی نئی صنعتی پالیسی میں جن کا اعلان مرکزی وزیرِ صنعت شری اجیت سنگھ نے ۳۱ رمئی ۱۹۹۰ء کو لوک سبھا میں کیا، چھوٹی صنعتوں کے فروغ کے لیے مزید سہولیات دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

۱۹۸۵ء میں چھوٹی صنعتوں میں سرمایہ کاری کی زیادہ سے زیادہ حد ۳۵ لاکھ روپے مقرر کی گئی تھی، جسے نئی پالیسی میں بڑھا کر ۶۰ لاکھ روپے کر دیا گیا ہے اور ذیلی صنعتوں کے لیے سرمائے کی زیادہ سے زیادہ حد ۴۵ لاکھ روپے سے بڑھا کر ۷۵ لاکھ روپے کر دی گئی ہے۔ برآمدات میں چھوٹی صنعتوں کے کردار کو مزید نمایاں کرنے کے لیے ایسی صنعتوں کے سرمائے کو جو قیام کے تیسرے برس میں اپنی کل پیداوار کا ۳۰ فی صد حصہ برآمد کریں، بڑھا کر پلانٹ اور مشینوں کے لیے ۷۵ لاکھ روپے کر دی گئی ہے۔

حکومت دیہات میں چھوٹی صنعتیں لگانے کے لیے ایسے مقامات کی نشان دہی بھی کرے گی جہاں بجلی دستیاب ہو اور جو صنعت کار وہاں جا کر کام شروع کریں گے، انہیں چھوٹے اور بہت چھوٹے صنعتی ادارے قائم کرنے کے لیے درکار ہر قسم کی ضروریات بھی مہیا کی جائیں گی۔

چھوٹی صنعتوں کی ایک شکایت یہ ہے کہ انہیں کئی قسم کے رجسٹر رکھنے ہوتے ہیں اور سرکاری محکموں کو گوشوارے بھیجنے پڑتے ہیں۔ یہ دفتری پابندیاں اور سرکاری کنٹرول بھی ختم کر دیے جائیں گے۔ ضابطہ عمل بھی آسان کر دیا جائے گا جس سے کاغذی کارروائی کم ہو جائے۔

دیہات میں کام کرنے والے ہنرمند:

بقیہ ۶۶ پر

شمیم حنفی

آنکھ ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر

(ویدنیرؔ، گوگی سروج پال)

ہمارے عہد کے ایک ممتاز مفکّر نے کہا تھا کہ انسان چونکہ طبعاً سہل پسند ہے، ادائے مطالب کی خاطر اس نے جس وسیلے کا استعمال سب سے زیادہ کیا ہے، وہ زبان ہے۔ لفظ اور زبان کی حرمت اپنی جگہ، مگر یہ حقیقت بھی مسلّم ہے انسانی تجربات، واردات، احساسات اور جذبات کے اظہار کی بہت سی صورتیں لفظ اور زبان سے زیادہ موثر ہوتی ہیں۔ موسیقی آہنگ اور اصوات سے ترتیب پاتی ہے، مصوری رنگوں اور لکیروں سے۔ رقص کی زبان اشارات اور جسمانی حرکات و سکنات ہیں۔ سنگتراشی پتھر کی زبان ہے اور تو اور، اسی زمانے کے ایک ممتاز ادیب اور دانشور اس حد تک گئے کہ خاموشی کو گویائی سے زیادہ مؤثر ذریعۂ اظہار قرار دے بیٹھے۔

ویسے ایک بات ہمیں یاد رکھنی چاہیے، ہماری قدیم تہذیبی روایت نے نہ صرف یہ کہ جمالیات کے موضوع پر انسانی تاریخ کی پہلی دستاویز سے دنیا کو روشناس کرایا۔ (بھرت منی کی ناٹیہ شاستر) ہمارے بزرگوں نے رنگوں، لکیروں، اشاروں کی بنیاد پر انسانی جذبات اور انسانی ردِّ عمل کی مختلف صورتوں کے مفاہیم بھی متعین کیے۔ انسان بہرحال، جذبات کی پوٹ ہے۔ اس کے تمام رویّے، افعال، مشاغل، سرگرمیاں، تجربے کسی نہ کسی جذبے کی وساطت سے ہی اپنی شناخت قائم کرتے ہیں۔ سچی بصیرت بھی جذبے اور آگہی کی یک جائی سے ہی وجود میں آتی ہے۔ اس لیے ہمارے پرکھوں نے جذبے کو شعور سے الگ نہیں کیا۔ ہماری، بلکہ پورے مشرق کی فکر کا ایک پہلو جو اُسے مغربی فکر کے اسالیب سے ممیز کرتا ہے یہ ہے کہ مغرب کے برعکس مشرقی اسالیبِ فکر حقیقت کے تصوّر کو ایک ایسا وسیع تناظر مہیا کرتے ہیں جو انسانی تجربات کی بلندی اور پستی کا احاطہ ایک سی آمادگی کے ساتھ کرتا ہے۔ حقیقت کا پست ترین درجہ بھی اعلیٰ ترین حقیقت کا ہی ایک حصّہ ہے۔ اسی لیے ہماری فکری روایت، ہماری ثقافتی روایت، مغربیوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ کشادہ قلب رہی ہے۔ وہ ہر تجربے کو قبول کرتی ہے۔ انسانی وجود کی کلّیت کو سمجھنے کے لیے خیر کے ساتھ ساتھ شر کے ادراک کو بھی ضروری سمجھتی ہے۔ ہمارے تخلیقی تصورات میں، ہمارے وجدان میں اور ہماری اخلاقیات میں اگر ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد تجربوں کو ایک سی سطح پر برتنے کی طاقت نہ ہوتی تو ہماری ادبی اور ثقافتی روایت امتناعات سے اس حد تک آزاد بھی نہ ہوتی۔ سنجیدہ اور مضحک، متین اور شوخ، بلند اور پست جذبات، محرومی اور کامرانی، افسردگی اور نشاط کی کیفیتیں ہمارے نظامِ احساس میں ایک ساتھ صف آرا ہوتی ہیں۔ مجرد اور مجسّم، یہاں تک کہ حساس اور غیر حساس یا بے جان اور جان دار ہمارے لیے یکساں معنویت رکھتے ہیں۔

حقیقت کے تصوّر ہی کی بنیاد پر کسی تہذیب یا روایت کے بنیادی مرکز و محور کا پتہ چلتا ہے۔ یہ تصورِ حقیقت اپنی ذات پر، اپنے معاشرے پر، اپنی دنیا اور زمانے پر ایک تبصرے (Statement) کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

اس تمہید کا مقصد یہ وضاحت ہے کہ ویدنیرؔ اور گوگی سروج پال دونوں کے فن کی نمایاں ترین جہت انسانی ہستی کائنات اور معاشرے

بی۔ ۱۱۴۔ ذاکر باغ، اوکھلا روڈ، نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰

پر تبصرہ کرتا ہے۔ بقول ایلیٹ کچھ نہ کہنے کے طریقے دل چسپ نہیں ہوتے۔ اظہار کی کوئی بھی شکل لسانی ہو یا صوری یا صوتی اس وقت تک معنی خیز نہیں بنتی جب تک کہ اُس کے پیچھے فکر کا کوئی زاویہ چُھپا ہوا نہ ہو۔ اس زاویہ کی ایک منطق ہوتی ہے، تعقل نظام ہوتا ہے اور یہ منطق یا نظام تخلیقیت کی نفی نہیں کرتا۔ ویدنیّر اور گوگی سروج پال دونوں کا تخلیقی سفر خاصا پُر پیچ اور طویل رہا ہے۔ دونوں نے مختلف ادوار میں رنگوں اور لکیروں اور ہیئتوں اور شکلوں کے مختلف اسالیب سے مدد لی ہے۔ دونوں حقیقت کے اُس تصور میں یقین رکھتے ہیں جو کثرتوں میں وحدت کی اور تضادات میں یک رنگی کی تلاش کرتا ہے۔ دونوں کے وجدان میں اتنی لچک اور فکر میں اتنی وسعت ہے کہ سچائی کے ہر رُوپ کو وہ ایک ہی بڑی سچائی کے عنصر ترکیبی کے طور پر دیکھتے ہیں اور ہر چند کہ دونوں کی ترجیحات اور ایقانات ایک واضح سمت رکھتے ہیں۔ مگر دونوں نے اظہار کی جو راہ اپنائی ہے وہ بہت دو ٹوک اور غیر مبہم نہیں ہے۔ اسی لیے نہ دونوں کے یہاں گرد و پیش کی حقیقتوں کے واسطے سے کبھی ایک نیا اسطور کا ظہور ہوا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دونوں کے یہاں حقیقت اور اسطور کا فرق مٹ گیا ہے۔ دونوں کی تخلیقیت میں ایک روشن وابستگی کے باوجود علامتیت، غنائیت اور شعریت کے عناصر کا عمل دخل بھی نمایاں ہے۔ دونوں کے سماجی ادراک اور تخلیقی و جمالیاتی ادراک میں کسی قسم کے ٹکراؤ کی صورتیں پیدا نہیں ہوتیں۔ دونوں کی وابستگی اپنی ذات سے بھی ہے اور اپنی کائنات سے بھی۔ دونوں کی انفرادیت اُن کی اجتماعیت کے حوالے سے منظم اور متشکل ہوتی ہے۔ ہر سچے فن کار کی طرح ویدنیّر اور گوگی سروج پال کی تخلیقی ہنرمندی ایک واضح اخلاقی بُعد بھی رکھتی ہے۔ اس طرح ان کی بصیرتیں بھی نہ تو صرف روایتی ہیں، نہ صرف جدید۔ ان کے پس پشت ان کی روایت ہے اور سامنے ان کا اپنا عہد۔ اپنی روایت اور اپنے عہد دونوں سے ویدنیّر اور گوگی سروج پال نے یکساں طور پر کسب فیض کیا ہے۔ فیضان کے سرچشمے محدود ہوں تو بڑے سے بڑا فن کار بھی بہت جلد ایک طرح کی تخلیقی تھکن کا شکار ہو جاتا ہے۔ ویدنیّر اور گوگی سروج پال دونوں کا یہ امتیاز بھی قابلِ قدر ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو دہرانے کے بجائے ہمیشہ احساس و اظہار کے نئے جہانوں کی جستجو میں خود کو مصروف رکھا ہے۔

ویدنیّر مصور ہیں اور مجسمہ ساز بھی۔ اُن کی بصیرت کا اظہار سب سے زیادہ انسانی چہروں کی تشکیل اور تخلیقی تعبیر کے دائرے میں ہوا ہے۔ اُنہوں نے پچھلے کئی برسوں سے اپنی توجہ بالعموم پورٹریٹس (Portraits) پر (ان دنوں سیلف پورٹریٹ پر) مرکوز رکھی ہے۔ ستھائی بھاؤ (स्थाई भाव) کے عنوان سے حال میں انہوں نے سیلف پورٹریٹ کے دائرے میں آنے والی جو تصویریں بنائی ہیں یا مجسمے ڈھالے ہیں، اُن کا بنیادی عنصر یہ تصور ہے کہ چہرہ صرف وہ نہیں ہوتا جو نظر آتا ہے۔ ایک چہرے میں کئی چہرے چھپے ہوتے ہیں۔ ہندوستانی روایت کے مطابق اپنے چہرے کی شناخت بھی دراصل اپنے بیرونی خدوخال سے زیادہ اپنی باطنی کیفیات، تاثرات اور رویّوں پر منحصر ہوتی ہے۔ اسی لیے ہمارے پرانے وقتوں کے مصور جب کسی درخت کی تصویر بنانے کا ارادہ کرتے تھے تو ان سے مطالبہ یہ کیا جاتا تھا کہ پہلے وہ اس درخت کو مختلف موسموں سے گزرتے ہوئے دیکھیں۔ مختلف رنگوں میں اس کا مشاہدہ کریں۔ بہار و خزاں کی کیفیات اور ماحول کی تبدیلی کے اثرات کی روشنی میں اس درخت کا جائزہ لیں۔ اس کے بعد اپنے بصری حافظے کی مدد سے درخت کی تخلیقی تشکیل کریں۔ اس طرح ایک درخت کو دیکھنا اور متشکل کرنا ایک طویل اور پر پیچ تجربے سے گزرنے اور اس کی وساطت سے وقت کے ایک پورے سلسلے کو اپنی گرفت میں لینے کے مترادف تھا۔ ویدنیّر کسی چہرے کی جو شکل متعین کرتے ہیں وہ اس کے چہرے کی خارجی حقیقت کی عکاسی سے زیادہ، دراصل اس چہرے میں چھپے ہوئے کسی اور چہرے کی تلاش اور دریافت کا پتہ دیتا ہے۔

اس ضمن میں ایک اور نقطۂ نظر جو ویدنیّر کی تشبیہوں اور تصویروں پر اثر انداز ہوا ہے، یہ ہے کہ گرد و پیش کی حقیقتیں اور حالات انسانی چہرے کو چاہے جس حد تک مسخ کر دیں بطور انسان اس کی پہچان باقی رہے گی یعنی یہ کہ انسانی شبیہوں پر اخراج بشریت (Dehumanization) کے عناصر کی مکمل گرفت ممکن ہی نہیں۔ ہر انسانی چہرہ بدترین حالات میں بھی اور انتشار و ابتری کے شدید ترین تجربے سے گزرنے کے بعد بھی اپنی انسانیت کے تحفظ پر قادر ہوتا ہے۔ چنانچہ انسانی شبیہوں کے معاملے میں اچھی اور بُری، مکروہ اور پُرکشش کی تفریق کوئی معنی نہیں رکھتی اور ہر شبیہہ اپنی جگہ ایک وسیع تر اکائی یا ایک کلیت، ایک ناقابلِ تقسیم حقیقت کا حصہ ہوتی ہے۔ سوروپ (स्वरूप) ایک ہوتا ہے۔ اس کے روپ ہزار بلکہ بے شمار ہو سکتے ہیں۔ ہر روپ کی تفہیم اور تلاش ہمیں اس سوروپ (स्वरूप) کو سمجھنے اور پہچاننے کا ایک نیا زاویہ عطا کرتی ہے۔ ہر شبیہہ ایک نئی آگہی، ایک نئی بصیرت، ایک نئی جذباتی واردات کا علامیہ ہوتی ہے۔ اپنے خدوخال اور اپنے چہرے کی ظاہری بناوٹ کے واسطے سے اپنی ہر شبیہہ کی تعمیر اور صورت گری

دراصل اپنے باطن کی کائنات میں ایک لمبے سفر سے عبارت ہوتی ہے۔

ودیہرا کا تخلیقی سفر ۱۹۵۵ء میں دہلی کے کالج آف آرٹ سے فنسل ڈپلومہ کی حصولیابی کے بعد شروع ہوا۔ ان کی تصویروں اور مجسموں کی نمائش اب تک ہند اور بیرونِ ہند کے کئی شہروں میں ہو چکی ہے۔ اوساکا، بوڈاپسٹ، لندن، الجزائر، فرینکفرٹ، بغداد، لاہور اور اسلام آباد کی مختلف گیلریوں میں آرٹ کے قدردان ودیہرا کے کام سے متعارف ہو چکے ہیں۔

ودیہرا کی حیثیت ایک ممتاز ڈیزائنر کی بھی ہے۔ کتابوں سے لے کر پویلین (Pavilion). ڈیزائن کرنے تک ودیہرا نے اس میدان میں بھی نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں۔ ٹریڈ فیئر اتھارٹی آف انڈیا کے ڈیزائن ڈویژن کے چیف کی حیثیت سے ودیہرا ملک اور بیرونِ ملک کی بہت سی نمائشوں کا خاکہ ترتیب دے چکے ہیں۔ وہ ڈیپارٹمنٹ آف کلچر کے سینئر فیلو بھی رہ چکے ہیں۔ اُن کی تحریک پر انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز نے اپنے تمام دعوت ناموں کی پشت پر معاصر ہندوستانی مصوروں کی ڈرائنگز پرنٹ کرنے کی تجویز منظور کی تھی۔ اس طرح ودیہرا نے بصری فنون کی ترویج و ترقی کے بعض مؤثر وسائل کی مدد سے بھی ہمارے زمانے اور معاشرے میں فن کا شعور عام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس شعور کو معمول طریقے کے چھوٹے سے دائرے یا آرٹ گیلریز کی محدود دنیا سے نکال کر عام انسانوں تک پہنچانا بھی ودیہرا کے مجموعی، فنی اور تخلیقی مقاصد کے سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔

گوگی سروج پال کی مصوری میڈیم کے تنوع اور مختلف ادوار میں اظہار کے مختلف اسالیب اختیار کرنے کے باوجود اپنے بنیادی سروکار کے لحاظ سے یک موضوعی ہے۔ یہ موضوع ہے تاریخ کی مختلف منزلوں میں اور ہماری معاشرتی زندگی میں عورت ہونے کا تجربہ۔ اس تجربے کو Feminism کے میلانات یا نسوانی حقوق کی تحریکات سے کوئی علاقہ نہیں۔ یہ تجربہ اس کائنات کے مجموعی نظام میں اپنی بساط اور قدر و قیمت کی تفہیم اور اسی مرکزی حوالے کی روشنی میں عورت کے عمومی مرتبے اور صورتِ حال کی تفہیم سے عبارت ہے۔

برسوں پہلے گوگی سروج پال کی تصاویر کے بارے میں لکھتے وقت مجھے خیال آیا تھا کہ عام زندگی میں خاصی دولتک اور باتونی ہوتے ہوئے بھی اپنی تصویروں میں یہ مصورہ بہت چپ چپ سی اور پُراسرار دکھائی دیتی ہے۔ یہ تاثر آج بھی قائم ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ گوگی کے لیے مصوری ایک انتہائی شخصی سرگرمی ہونے کے باوجود ایک سنجیدہ اجتماعی سروکار کی ترجمانی بھی ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ ایک بہت منفرد اور لائق توجہ پہلو یہ ہے کہ گوگی کی تصویریں انسانی معاشرے میں عورت کی صورتِ حال پر ایک سوچے سمجھے ردِ عمل کی نمائندگی کے باوجود اور اپنی واضح سماجی معنویت کے باوصف ایک طرح کی مذہبیت کے احساس سے مملو نظر آتی ہیں۔ عام عورتوں کے چہرے پر بھی دھیان کی اور گم شدگی کی ایک کیفیت، ایک نیم متصوفانہ فضا ایک دبیز سرّیت، اُنہیں ایک جہانِ معنی کے طور پر سامنے لاتی ہے۔

یہ چہرے گوگی کی تصویروں میں اُن کی تخلیقیت کے مختلف مدارج کے ساتھ، مختلف حسّی اور ذہنی واردات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ کبھی یہ چہرے راہباؤں کی ملال آمیز متانت اور لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں۔ کبھی زندگی کے تماشے میں پوری طرح شریک، حیرت اور معصومیت کی ملی جلی کیفیتوں کے ساتھ اس تماشے کی دید کا۔ ایک نیم فلسفیانہ اداسی سیدھی سادی گھریلو قسم کی نسائی شبیہوں میں بھی نمایاں نظر آتی ہے۔

گوگی کی تصویروں کا ایک اور اثر انگیز عنصر ان سے جھانکتا ہوا خاموش اضطراب ہے۔ دراصل یہی خاموش اضطراب کو ایک مبہم افسردگی کا راستہ دکھاتی ہے۔ بڑے کینوس کی تصویریں جن میں ایک ساتھ بہت سے چہروں کا احاطہ کیا گیا ہو ان میں بھی ایک دوسرے سے ہم آہنگی کے باوجود ہر شبیہہ اپنی مقسوم تنہائی اور اپنی انفرادیت کا تاثر برقرار رکھتی ہے۔

علاوہ ازیں گوگی کی تصویروں کا ایک وصف جو پہلی ہی نظر میں دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ان کی ''iniature-like وسعت اور نزاکت ہے۔ گوگی کی اچینگز، ووڈکٹس، لیتھوگرافس یا آبی، روغنی، گواش رنگوں کی تصاویر اور ڈرائنگز ——— ان سب میں کوئی لکیر، رنگ کی کوئی لہر، حتیٰ کہ کوئی بھی نقطہ قابو سے باہر نہیں ہوتا۔ فارم کا ضبط و نظم اور اس فارم کی تشکیل پر وسائل اظہار یا اسالیب کی گرفت ہمیشہ مضبوط رہتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ رنگوں کی زبان میں ہم کوئی نظم سن رہے ہیں یا کسی "سُر کی چھایا" میں ہیں۔

گوگی سروج پال نے اپنی تصویروں کی پہلی نمائش ۱۹۶۵ء میں کی تھی۔ پچھلے پچیس برسوں میں گوگی کی تخلیقیت اپنے مراحل کے اختلاف اور رنگارنگی کے باوجود آج بھی زرخیز اور توانا ہے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں سے قطع نظر دنیا کے کئی ملکوں — عراق، یوگوسلاویہ، انگلستان، سوئٹزرلینڈ، کیوبا، فرانس، جنوبی کوریا، یونائیٹڈ اسٹیٹس، روس، مغربی جرمنی، کنیڈا، پاکستان اور بنگلہ دیش ——— میں گوگی کی نمائشیں ہو چکی ہیں۔ [بقیہ ص۲۱ پر]

عبداللطیف اعظمی

مولانا حسرت موہانی اور آزادیِ کامل

مولانا حسرت موہانی (۱۸۸۰ء - ۱۹۵۱ء) تحریکِ آزادی کے اہم رہ نماؤں میں سے تھے اور ان کی بعض انفرادی اور شخصی خصوصیات کی وجہ سے ان کو ایک بلند اور ممتاز مقام حاصل تھا۔ اس دور کے چوٹی کے قومی رہ نما مثلاً مہاتما گاندھی، مولانا آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو ڈاکٹر راجندر پرشاد اور سردار پٹیل وغیرہ، ان کے طریق کار اور بعض انتہا پسند خیالات سے اختلاف کے باوجود، ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔

مولانا موہانی کی سیاسی خدمات کے سلسلے میں ان کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس زمانے میں آزادیٔ کامل کی تجویز پیش کی، جب عام طور پر اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر افسوس کہ ان کے سوانح نگاروں نے ان کے اس اہم کارنامے کو یا تو بالکل نظر انداز کر دیا ہے یا لکھا ہے تو بہت ہی سرسری طور پر۔ اس کے علاوہ بعض حضرات نے خواہ مخواہ کے لیے گاندھی جی اور کانگریس کو مطعون کرنے کی ناروا کوشش کی ہے۔ مولانا کے سوانح نگاروں اور مضمون نگاروں میں کچھ ایسے "معصوم" حضرات بھی موجود ہیں، جن کو پوری تفصیل کے ساتھ علم نہیں کہ مولانا نے کانگریس کے علاوہ اسی زمانے میں، خلافت کانفرنس اور مسلم لیگ کے اجلاس میں بھی یہ تجویز پیش کی تھی اور ان میں بھی اس تجویز کا وہی حشر ہوا تھا جو کانگریس کے اجلاس میں ہوا۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ مسلم لیگ کے صدر خود مولانا حسرت تھے۔ اس لیے انصاف کا تقاضا تھا کہ اس مسئلے پر لکھتے وقت ان کا بھی ذکر کیا جاتا، مگر بیشتر حضرات نے یا تو ناواقفیت کی وجہ سے یا محض تعصب میں ان کا ذکر نہیں کیا۔ چونکہ ان کی تفصیلات کافی دلچسپ اور بہت اہم ہیں، اس لیے انھیں پوری تفصیل کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مولانا موہانی کو آزادیٔ کامل کا تصور بہت عزیز تھا اور ملک کی آزادی کے لیے اس کے مطالبے کو بہت ضروری سمجھتے تھے۔ اس لیے احمد آباد کے زیرِ تذکرہ اجلاس کانگریس منعقدہ ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۲۱ء سے پہلے بھی، اجلاس کانگریس منعقدہ امرتسر بتاریخ اواخر دسمبر ۱۹۱۹ء کی تقریر میں "مکمل سلف گورنمنٹ" کے نام سے اور کانگریس پراونشل کانفرنس منعقدہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۲۱ء کے خطبۂ صدارت میں حریت کامل کے نام سے اپنا یہ خیال پیش فرما چکے تھے مگر تجویز کی صورت میں انھوں نے پہلی مرتبہ دسمبر ۱۹۲۱ء میں احمد آباد کی تینوں پارٹیوں کے اجلاس میں پوری شدت کے ساتھ پیش کیا تھا۔ ان اجلاسوں میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا اور جو صورتِ حال پیش آئی، تحریکِ آزادی کی تاریخ میں ان کی بے حد اہمیت ہے۔ اسی لیے اس مضمون میں ان تجاویز کے بارے میں تفصیلات پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

دسمبر ۱۹۲۱ء میں خلافت، کانگریس اور مسلم لیگ، تینوں پارٹیوں کے سالانہ اجلاس ایک ساتھ مگر مختلف تاریخوں میں احمد آباد میں منعقد ہوئے تھے۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ اجلاس آل انڈیا خلافت کانفرنس بہ صدارت حکیم اجمل خاں صاحب بتاریخ ۲۶ دسمبر ۱۹۲۱ء

۲۔ اجلاس آل انڈیا کانگریس، بہ صدارت حکیم اجمل خاں صاحب بتاریخ ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۲۱ء

۳۔ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ، بہ صدارت مولانا حسرت موہانی صاحب بتاریخ ۳۰ و ۳۱ دسمبر ۱۹۲۱ء[1]

۴۳۹- ذاکر نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

اجلاسِ خلافت کانفرنس :

حسب پروگرام ۲۶ دسمبر کی صبح کو مسلم لیگ کے پنڈال میں حکیم صاحب کی صدارت میں خلافت کانفرنس کا اجلاس شروع ہوا، جس میں ضروری کارروائیوں کے بعد مولانا آزاد سبحانی نے مولانا حسرت موہانی کی تائید سے حسب ذیل تجویز سبجیکٹ کمیٹی میں پیش کی جو عرفِ عام میں آزادیٔ کامل کے نام سے مشہور ہے :

"چونکہ برٹش گورنمنٹ کی مبہم پالیسی اور مسلسل رویئے کی وجہ سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ برطانوی امپیریلزم جزیرۃ العرب اور دنیائے اسلام کو غیر مسلموں کے اثر و اقتدار سے پورے طور پر آزاد رہنے دے گی اور اس کا مطلب یہ ہے کہ خلافت اس درجے میں محفوظ و مامون نہ ہو سکے گی۔ جس میں شریعتِ اسلام اس کے تحفظ کی متقاضی ہے لہٰذا خلافت کی مستقل حفاظت اور ہندوستان کی خوش حالی حاصل کرنے کیلئے نہایت ضروری ہے کہ برطانوی امپیریلزم کو تباہ کرنے کی کوشش کی جائے یہ (خلافت) کانفرنس اس رائے پر قائم ہے کہ اس کوشش کو عمل میں لانے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ مسلمان دیگر باشندگانِ ہندوستان کی شرکت میں ہندوستان کو کامل طور سے آزاد کرائیں اور اس کانفرنس کی رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کی رائے سوراج کی بابت وہی ہے جو مکمل آزادی کی مراد ہے اور کانفرنس امید کرتی ہے کہ دیگر باشندگانِ ہند بھی اس نقطۂ نظر پر قائم ہوں گے۔" ؎

سبجیکٹ کمیٹی میں یہ تجویز کثرتِ رائے سے منظور ہوگئی، مگر صدرِ اجلاس حکیم اجمل خاں صاحب نے اپنی رولنگ کے ذریعے اس کو خلافِ ضابطہ (آؤٹ آف آرڈر) قرار دے کر کھلے اجلاس میں پیش کرنے کی اجازت نہیں دی۔ انہوں نے اس کی وجہ بتلاتے ہوئے فرمایا کہ دراصل یہ خلافت کانفرنس کے مقصد (کریڈ) میں بنیادی تبدیلی ہے۔ جس کے لیے کم سے کم دو تہائی اکثریت کی ضرورت ہے اور چونکہ اس تجویز کے حق میں دو تہائی ووٹ نہیں آئے ہیں۔ اس لیے کھلے اجلاس میں اسے پیش نہیں کیا جاسکتا۔ ؎

حکیم اجمل خاں صاحب کے ممتاز سوانح نگار قاضی عبدالغفار صاحب نے اس سلسلے میں لکھا ہے :

"حسرت موہانی نے خلافت کانفرنس کے کھلے اجلاس میں یہ قرارداد پیش کی تو بہت کشمکش پیدا ہوئی — سبجیکٹ کمیٹی میں یہ تجویز کثرتِ رائے سے منظور کرلی گئی تھی، لیکن حکیم صاحب نہیں چاہتے تھے کہ جو تجویز کانگریس نے منظور نہیں کی وہ خلافت کانفرنس میں منظور کرلی جائے۔ چنانچہ خلافت کانفرنس کے کھلے اجلاس میں جب یہ تجویز آئی تو انہوں نے صدارتی اختیارات سے کام لے کر اس کو پیش ہونے کی اجازت نہیں دی۔ ان کے اس طرزِ عمل پر ملک کے بہت سے گوشوں خصوصاً مسلمانوں کے انتہاپسند حلقوں میں بہت اعتراض کیے گئے۔ ہر طرف یہ سوال کیا جارہا تھا کہ کیا اجمل خاں اعتدال پسندوں میں شامل ہوگئے؟ کیا ان کی انتہاپسندی اعتدال سے بدل گئی۔ خلافت کانفرنس میں اس تجویز کی ناکامی کے ذمہ دار وہی قرار دیے گئے اور عرصے تک اخباروں میں یہ بحث جاری رہی۔" ؎

مذکورہ بالا اقتباس کے سلسلے میں مجھے دو باتیں عرض کرنی ہیں :

پہلی یہ کہ قاضی صاحب مرحوم کی یہ بات صحیح نہیں ہے کہ: "حکیم صاحب نہیں چاہتے تھے کہ جو تجویز کانگریس نے منظور نہیں کی وہ خلافت کانفرنس میں منظور کرلی جائے"۔ کیوں کہ آزادیٔ کامل کی تجویز کانگریس کے اجلاس میں اس کے بعد پیش ہوئی تھی۔ دوسری بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ جن اخبارات یا اشخاص نے حکیم صاحب کے اس فیصلے پر اعتراض کیا تھا ان کے سامنے حکیم صاحب کی مکمل رولنگ نہیں تھی۔ اخبارات میں بالعموم صرف اسی قدر شائع ہوا تھا کہ آزادیٔ کامل کی یہ تجویز سبجیکٹ کمیٹی میں منظور ہوگئی تھی۔ مگر حکیم صاحب نے اپنے صدارتی اختیارات سے کام لے کر اسے کھلے اجلاس میں پیش کرنے سے روک دیا۔ جب سب سے پہلے یہ رولنگ میری نظر سے گزری تو مجھے سخت تعجب ہوا کہ حکیم صاحب جیسے معقول اور غیر جذباتی شخص نے ایسا کیوں کیا۔ مگر جب میں نے تحقیق کی تو اس کی اصل وجہ معلوم ہوئی اور وہ یہی ہے کہ موجود مندوبین کی دو تہائی تعداد کی حمایت اسے حاصل نہیں تھی۔ اس ایپی سوڈ کا دلچسپ پہلو ایک اور ہے۔ جب حکیم صاحب نے اس تجویز کو کھلے اجلاس میں پیش کرنے کی اجازت نہیں دی تو مولانا حسرت موہانی نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ یہ واقعہ اجلاس کے بالکل آخر میں پیش آیا تھا اور غالباً رات کے گیارہ بجے تھے۔ حکیم صاحب نے تو رولنگ دینے کے بعد جلسے کے اختتام

کا اعلان کر دیا، مگر مولانا موہانی نے اعلان کیا کہ مندوبین رُک جائیں۔ اس تجویز پر غور و بحث کے بعد فیصلہ کیا جائے گا۔ چنانچہ کچھ مندوبین جو اس تجویز کے حق میں تھے رُک گئے اور بعد میں اعلان کیا گیا کہ یہ تجویز منظور کر لی گئی۔ اس واقعہ کو بعض لوگوں نے اس طرح بیان کیا ہے کہ حکیم صاحب کی اس رولنگ کے بعد ان پر اتنے شدید اعتراضات کیے گئے کہ وہ اجلاس چھوڑ کر چلے گئے۔ چنانچہ پاکستان کے ایک فاضل مصنف بام فورڈ کے حوالے سے لکھتے ہیں :

"دہلی کے اجمل خاں نے خلافت کانفرنس کی صدارت کی، جب کہ سابقہ سزا یافتہ فضل الحسن حسرت موہانی مسلم لیگ کے صدر رہے۔ اوّل الذکر کی سبجیکٹ کمیٹی نے بیرونی اقتدار کے بغیر آزادی کی قرارداد منظور کر لی۔ جب کہ خلافت کے کھلے اجلاس میں اسی قرارداد کو صدر نے خلاف ضابطہ قرار دے دیا۔ جس پر اتنی سخت تنقید کی گئی کہ حکیم اجمل خاں پنڈال چھوڑ کر چلے گئے۔" ۵

ظاہر ہے جب صدرِ جلسہ نے باضابطہ طور پر اجلاس برخاست کر دیا تو اس کے بعد جو بھی کار روائی کی جائے گی وہ قاعدے اور ضابطے کے مطابق صحیح نہیں ہوگی۔ مگر کراچی کے ایک دانشور پروفیسر شفقت رضوی صاحب لکھتے ہیں :

"مزید اطلاعات کی عدم دستیابی کی صورت میں یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حکیم اجمل خاں کے پنڈال چھوڑ کر چلے جانے سے جلسہ ملتوی ہو گیا۔ جب دوبارہ اس کا انعقاد ہوا تو تجویز پیش ہوئی اور منظور کر لی گئی۔ مولانا کی تقریر سے بھی یہی وضاحت ہوتی ہے۔ اس طرح آزادیٔ کامل کی قرارداد سب سے پہلے منظور کرنے کا اعزاز خلافت کانفرنس کو حاصل ہوا۔" ۶

قاضی محمد عدیل عباسی صاحب مرحوم تحریکِ خلافت کے اہم لوگوں میں سے تھے، نیز سہ روزہ مدینہ (بجنور) اور روزنامہ زمیندار (لاہور) کی ادارت کے فرائض بھی انجام دے چکے ہیں اور مولانا حسرت موہانی کے قابلِ اعتماد دوستوں اور ساتھیوں میں سے تھے۔ انہوں نے اجلاس کانگریس منعقدہ احمد آباد میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ خلافت کانفرنس اور کانگریس کے انہیں زیرِ بحث جلسوں کے سلسلے میں انہوں نے لکھا ہے،

"مولانا حسرت موہانی چونکہ میرے اوپر بہت مہربان تھے، میں اُن کے ساتھ ہر جگہ چلا جاتا تھا اور کوئی نہیں روکتا تھا۔" ۷

انہوں نے اپنی کتاب "تحریکِ خلافت" میں خلافت کانفرنس کے اجلاس کے دوبارہ انعقاد اور آزادیٔ کامل کے ریزولیوشن کی منظوری کے بارے میں اشارہ تک نہیں کیا ہے۔ نیز سہ روزہ مدینہ (بجنور) اور اردو کے دوسرے اخبارات میں بھی یہ خبر میری نظر سے نہیں گزری۔ اس لیے میرا اپنا خیال ہے کہ یہ بات محض افسانہ ہے۔

اجلاس کانگریس :

خلافت کانفرنس کے بعد ۲۷، ۲۸ دسمبر ۲۱ء کو کانگریس کا ۳۶واں اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت کے لیے مشہور قومی رہنما سی۔ آر۔ داس منتخب کیے گئے تھے، مگر چند روز پیشتر ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس لیے ان کی جگہ پر حکیم اجمل خاں صاحب کو منتخب کیا گیا۔ چنانچہ اس دو روزہ اجلاس کی حکیم صاحب نے صدارت کی۔

سبجیکٹ کمیٹی میں آزادیٔ کامل کے بارے میں مولانا حسرت موہانی نے اپنا مشہور ریزولیوشن پیش کیا۔ جس کی تائید بمبئی کرانیکل کے مسٹر وینکٹے رمن نے کی۔ ان کے علاوہ سوامی کمار ننا تھ (بنگال)، یعقوب علی خاں (یو۔ پی) اور یو۔ پی۔ الور (آندھرا پردیش) نے اس کی حمایت میں تقریریں کیں۔ اور مہاتما گاندھی جی نے پوری شدت سے اس کی مخالفت کی۔ بالآخر یہ ریزولیوشن سبجیکٹ کمیٹی میں نامنظور ہو گیا، مگر کھلے اجلاس میں پیش کرنے کی اجازت دیدی گئی، لیکن وہاں بھی بھاری اکثریت سے نامنظور ہو گیا۔ اس ریزولیوشن کو پیش کرتے ہوئے مولانا حسرت نے اور اس کی مخالفت میں گاندھی جی نے جو تقریر کی تھی، ان دونوں کے خلاصے ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

مولانا حسرت نے فرمایا: "میں اس وقت آپ کے روبرو جس ریزولیوشن کو پیش کروں گا، وہ بہت درجہ اہم ہے۔ اس لیے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اس کو معمولی ریزولیوشن کی طرح قبول نہ کیجیے گا۔ بلکہ نہایت غور و خوض کے ساتھ رائے قائم کیجیے گا۔" اس کے بعد فرمایا "اب میں ریزولیوشن پیش کرتا ہوں۔ سوراج سے ہمارا مطلب کامل آزادی کا ہے۔ میں اس ریزولیوشن کو پیش کرنے سے قبل آپ لوگوں سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ ایک سال قبل کی طرف نظر دوڑائیے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب ناگپور کانگریس میں یہ ریزولیوشن پیش کیا گیا تھا اور "سوراج" کا لفظ داخل کیا گیا تھا تو کہہ دیا گیا تھا کہ ہم یہ لفظ مبہم شکل میں اس لیے رکھتے ہیں کہ لوگوں کو موقع رہے کہ جو معنی چاہیں قرار دے سکیں۔ جو لوگ "سوراج" کے معنی 'وِدِن دی برٹش ایمپائر' Within the British Empire

پیتے میں تو بھی فیصلہ ہمارے موافق ہو جائے گا، پھر ہم باہر جانے کی کوشش نہ کریں گے۔ لیکن اگر فیصلہ موافق نہ ہوا ہم "وِدھ آؤٹ" Without کی خواہش کریں گے۔ وہ شرط پوری نہیں ہوئی۔ جب ایک سال کے اندر خلافت اور پنجاب کے مظالم کے مسئلے طے نہیں ہوتے تو کیا وجہ ہے کہ ہم اپنے قول کے مطابق آج ایک سال کے بعد یہ نہ کہہ دیں کہ سوراج کے معنی کامل آزادی اور کمپلیٹ ان ڈی پنڈنس Complete Independence کے ہیں...... اگر اس وقت آپ آزادی کا اعلان نہیں کر سکتے تو کم از کم اتنا تو ضرور کیجیے کہ اپنے نصب العین کو تو صاف کر دیجیے اور کہہ دیجیے کہ اگر اس وقت ہم اپنی آزادی کا اعلان نہیں کرتے، اگرچہ میری رائے میں یہی ہونا چاہیے تو کم از کم یہ ضرور ہے کہ ہم اپنے نصب العین کو واضح اور صاف کر دیں۔" ۸

مولانا حسرت موہانی کی اس تجویز کے بارے میں اس زمانے میں جو رپورٹ "مدینہ" میں شائع ہوئی تھی بہتر ہو گا اگر اسے بھی یہاں پیش کر دیا جائے۔ ملاحظہ ہو: "مولانا حسرت موہانی نے عقیدۂ کانگریس کے متعلق ترمیم پیش کی جس میں حصولِ سوراج ہر ممکن کوشش سے تجویز کیا گیا تھا۔ نیز "باامن و جائز" کی بجائے مناسب کا لفظ بھی تجویز کیا گیا تھا۔ اس تجویز نے چونکہ نمایاں تائید حاصل نہیں کی۔ اس لیے محرک موصوف نے اپنی ترمیم کو واپس لے لیا۔"

مولانا حسرت موہانی کی دوسری ترمیم متعلقہ اعلان سوراج بغیر حکومتِ برطانیہ زبردست بحث و مباحثہ کا باعث ثابت ہوئی جس پر فصاحت و بلاغت کے دریا رواں ہو گئے۔ مولانا حسرت موہانی نے بتایا کہ سوراج کی تعریف ان کے نزدیک حریتِ کامل کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ حقیقی اور سچی نجات برٹش امپیریل ازم برطانوی شہنشاہیت کو ختم کیے بغیر ممکن نہیں، کیوں کہ سالِ ماسبق نے صاف اور بیّن طور پر ثابت کر دیا ہے کہ مظالم پنجاب اور خلافت کے متعلق برطانوی گورنمنٹ کی وساطت سے ہرگز انصاف نہیں ہو سکتا۔ مزید برآں یہ کہ جب تک برٹش امپیریلزم کا وجود باقی ہے۔ وہ اپنے بدمنصوبے گانٹھتا رہے گا۔"

مولانا حسرت موہانی کی تائید میں درجن بھر ممبران تھے، جنہوں نے اگرچہ زیادہ زور اور جوش کے ساتھ تقریریں کیں۔ اس کی مخالفت میں بھی اسی جوش و خروش کے ساتھ تقریریں کی گئیں۔ مگر کثرتِ رائے سے یہ ترمیم رد ہو گئی۔" ۹

کانگریس کے ڈیلی گیٹ اور مولانا حسرت موہانی کے بے تکلف دوست اور ساتھی قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم کے تاثرات بھی اگر یہاں پیش کر دیے جائیں تو صحیح صورتِ حال کو سمجھنے اور صحیح رویّہ قائم کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔ وہ لکھتے ہیں: "...... مولانا حسرت موہانی نے سوراجیہ کی جگہ آزادیِ کامل بیرونِ حکومتِ برطانیہ اور ذریعۂ قول و فعل و خیال میں عدم تشدد" کی جگہ "ہر ممکن ذریعے سے" رکھنے کی ترمیم پیش کی۔ مولانا حسرت موہانی نے "آزادیٔ کامل" کے لیے ایک مدلل اور پُرجوش تقریر کی اور یہ بھی کہا کہ "اگر کانگریس کا نصب العین آزادیِ کامل بیرونِ حکومتِ برطانیہ منظور نہیں ہوتا، تو میں کانگریس سے مستعفی ہو جاؤں گا۔ مگر دوسری سانس میں ہنس کر کہا: "اگرچہ میں مستعفی نہیں ہوں گا۔" گاندھی جی نے کہا کہ: "ایسے شخص کو استعفیٰ دے ہی دینا چاہیے۔" حسرت کی تقریر کے ختم ہونے کے بعد گاندھی جی نے جو تقریر کی، وہ مجھے اب تک یاد ہے:۔

"اگر مولانا آزادیٔ کامل کے لیے آگے بڑھیں گے
تو میں ان سے پیچھے نہیں رہوں گا مگر اس کے لیے
طاقت کی ضرورت ہے۔ میں تو آگرے کے قلعے پر
کانگریس کا جھنڈا گاڑ سکتا ہوں، اگرچہ وہاں ہٹلر
جیسا پاگل گورنر ہے، لیکن ایسا کرنے کے لیے طاقت
چاہیے۔ میں کوئی ایسی بات نہیں کہنا چاہتا جس
کو میں نہ کر سکوں۔ یا جس کے کرنے کے لیے میرے پاس
طاقت نہ ہو۔"

قاضی عدیل عباسی صاحب نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے مزید لکھا: "سبجیکٹ کمیٹی میں مولانا حسرت کی ترمیم نامنظور ہو گئی۔ دوسرے دن مولانا حسرت موہانی نے قیامت مچا دی۔ برابر چھوٹے چھوٹے جلسوں میں پُرشور تقریریں کرتے تھے کہ مسلمان خیالِ عدم تشدد رکھے گا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جہاد کا خیال ترک کر دے گا اور اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ گاندھی جی مسلمانوں کو جین مذہب کا پیرو بنانا چاہتے تھے۔ ...... میں نے مولانا حسرت موہانی سے کہا کہ "آپ آج ہی آزادیِ کامل پر کیوں زور دیتے ہیں؟ گاندھی جی تو ٹھیک کہتے ہیں کہ کہنے سے کیا حاصل؟ کر دکھانا ہے اور جب قوم میں طاقت ہو گی تو وہ آزادیِ کامل کا نعرہ دیں گے۔" مولانا حسرت نے کہا کہ: "تم سمجھتے نہیں ہو، گاندھی جی گوکھلے کے شاگرد ہیں جو پکے ماڈریٹ تھے۔ یہ قوم کو ابھاریں گے اور پھر ڈومینین اسٹیٹس (نوآبادیاتی طرز) پر راضی ہو جائیں گے۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ اس پر آج ہی پابندی عاید کر دی جائے۔ مولانا حسرت کا یہ مغالطہ آخر عمر تک دُور نہیں ہوا اور وہ مسلم لیگ میں بھی اسی لیے بعدہٗ شامل ہوئے کہ جناح اور گاندھی کو مل کر ڈومینین اسٹیٹس پر صلح کرنے سے باز رکھ سکیں۔ جیسا کہ خود انہوں نے مجھ سے کہا۔ مولانا حسرت کا شبہ کس قدر غلط تھا، وقت نے ثابت کر دیا۔" ۱۰

اجلاس لیگ :

آل انڈیا مسلم لیگ کا چودھواں دو روزہ اجلاس ۳۰ دسمبر کو مولانا حسرت موہانی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مولانا نے اپنا تحریری خطبہ پڑھا، جس میں وقت کے اور اہم مسائل کے علاوہ آزادیٔ کامل پر بہت زور دیا گیا تھا۔ ایک جگہ "کانگریس کریڈ اور لیگ کے مقصد میں لازمی فرق" کے ذیلی عنوان کے تحت انہوں نے فرمایا تھا:

"یہ بات سب کو معلوم ہے کہ کانگریس کریڈ میں سوراج کا لفظ دانستہ طور پر مبہم چھوڑ دیا گیا ہے۔ جس کا منشا یہ ہے کہ اگر مسائل خلافت و پنجاب کا تصفیہ ہماری مرضی کے موافق ہو گیا تو سوراج زیرِ سایہ برطانیہ ہی کو کافی سمجھیں گے، ورنہ آزادیٔ کامل کا مطالبہ کریں گے لیکن حضرات! مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ آزادیٔ کامل کا مطالبہ کیا جائے۔ بلکہ یہ بھی لازمی ہے کہ اس آزادی کی شکل بھی متعین کر دی جائے جو میرے نزدیک صرف ایک ہو سکتی ہے، یعنی جمہوریۂ ہند یا انڈین ری پبلک بہ شکل یونائیٹڈ اسٹیٹس آف انڈیا۔

علاوہ ازیں کانگریس کریڈ میں ذرائع حصولِ سوراج کے متعلق "جائز" کے ساتھ "پُر امن" کی بھی جو شرط لگائی گئی ہے، وہ بھی مسلمانوں کے فطری اور مذہبی جذبات کے خلاف ہے۔ اس لیے جائز و پُر امن کے بجائے مسلم لیگ کے عقیدۂ سیاسی میں ہر ممکن و مناسب ذریعۂ نجات کے استعمال کی اجازت ہونی چاہیے۔"

آگے چل کر "جائز و پُر امن کے بجائے ممکن و مناسب" کے ذیلی عنوان کے تحت مولانا مزید وضاحت فرماتے ہیں:

"اصلی مقصدِ تحریر یہ تھا کہ مسلم لیگ کے مقصدِ اوّل میں سوراج کی توضیح "آزادیٔ کامل بصورتِ جمہوریۂ ہند" کے ساتھ ہونا چاہیے۔ ورنہ فریقِ ثالث کی موجودگی میں زیرِ سایہ برطانیہ کی نسبت اندیشہ ہے کہ بجائے مفید ثابت ہونے کے مضر نہ ثابت ہو۔ دوسری ترمیم یہ ہے: "یہی ضروری ہے کہ حصولِ آزادی کے ذرائع میں کچھ اور وسعت اور لچک پیدا کی جائے اور صرف جائز اور پُر امن کی بجائے جملہ ممکن و مناسب ذرائع کے استعمال کی اجازت دے دی جائے۔"

اس کے بعد "نان کوآپریشن یا حکومتِ متوازی" کے ذیلی عنوان کے تحت فرماتے ہیں:

"حضرات! ایک نظامِ حکومت کے بجائے دوسرا نظام قائم کرنے کی صرف دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ موجودہ نظام کو بزورِ شمشیر دفعتاً برباد کر کے اس کی جگہ دوسرا نظام قائم کر دیا جائے جیسا کہ اس وقت دنیا میں ہوتا رہا ہے۔ دوسری شکل یہ کہ موجودہ نظامِ حکومت سے قطع تعلق کر کے اس کے برابر یا اس سے بہتر ایک دوسرا متوازی نظامِ قومی جاری کر دیا جائے اور اس کو یہاں تک ترقی دی جائے کہ پہلا نظام فنا ہو جائے اور نظامِ ثانی اس کے بجائے ہو جائے۔۔" [۱۱]

پروفیسر سید شفقت رضوی (کراچی) کے بقول: "۱۹۲۱ء کے اجلاس مسلم لیگ کے صدر مولانا حسرت موہانی تھے۔ اس لیے انہوں نے لیگ کی سبجیکٹ کمیٹی میں آزادیٔ کامل کی قرارداد خود نہیں پیش کی بلکہ مولانا آزاد سبحانی سے پیش کروائی۔" موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ: "اس کی تائید مولوی فضل الرحمٰن نے کی، جب کہ (سر) رضا علی نے مخالفت کی۔" [۱۲]

ریزولیوشن کا متن حسبِ ذیل ہے:

"حکومتِ برطانیہ مسلسل و متواتر کوششوں کے باوجود اسلامی دنیا اور جزیرۃ العرب کو غیر مسلم اقتدار سے تحفظ فراہم کرنے اور مسلمانوں کے مذہبی تقاضوں کے مطابق خلافت کی بقا کی ضمانت دینے میں ناکام رہی ہے۔ اس لیے ان مقاصد کے حصول اور ہندوستان کی خوشحالی و ترقی کے لیے برطانوی امپیریلزم کا خاتمہ ضروری ہے۔ اس کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے کہ مسلمان دیگر اقوامِ ہند کے اشتراک سے کامل آزادی کی جدوجہد کریں۔ اس بنیاد پر سوراج کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور پُر خلوص طریقے سے اُمید کی جاتی ہے کہ دیگر اقوام بھی اسی نقطۂ نظر کو اپنائیں گے۔" [۱۳]

اس ریزولیوشن کے بارے میں سہ روزہ مدینہ کی حسب ذیل رپورٹ ملاحظہ ہو:

"لیگ کے عقیدے میں تغیر و تبدل کے متعلق مولانا آزاد سبحانی کا ریزولیوشن دو گھنٹے کے گرم مباحثے کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کی سبجیکٹ کمیٹی کے جلسے میں ۳۶ رایوں کی مخالفت اور ۲۳ رایوں کی موافقت سے نامنظور ہو گیا۔ لیگ کے عقیدے میں تغیر کی غایت یہ تھی کہ برطانوی امپیریلزم کو تباہ و برباد کر کے ہندوستان کی کل دیگر اقوام کی امداد سے کامل آزادی حاصل کی جائے۔ اس ریزولیوشن کی تائید مولوی عبدالماجد بدایونی، داؤد غزنوی امرتسری اور دیگر حضرات نے کی اور مخالفین میں حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، سید رضا علی اور سید ظہور احمد الہ آبادی شامل تھے۔ باوجودیکہ آزادی کے ریزولیوشن کو سبجیکٹ کمیٹی نے نامنظور کر دیا ہے لیکن وہ مباحثے کے لیے مسلم لیگ کے کھلے اجلاس میں پیش کیا جائے گا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ریزولیوشن بالکل وہی ہے جو خلافت کانفرنس کی سبجیکٹ کمیٹی میں پاس ہو گیا تھا۔ لیکن حکیم اجمل خاں نے خلافِ قاعدہ قرار دے کر اُسے کھلے اجلاس میں پیش کرنے سے روک دیا۔ لیگ کے بعض ممبران نے اس پر اعتراض کیا کہ سبجیکٹ کمیٹی نامنظور کر چکی ہے اس لیے کھلے اجلاس میں اسے پیش کرنا خلافِ قاعدہ ہے۔ اس کے جواب میں مولانا حسرت موہانی (صدر اجلاس) نے فرمایا کہ: "وہ جس ریزولیوشن کو چاہیں مباحثے کی اجازت دے سکتے ہیں تاکہ ایک اہم مسئلے کے متعلق اظہار رائے ہو سکے۔" ۱۴

یہ کتنی عجیب اور دلچسپ بات ہے کہ جب اجلاس کانگریس کی سبجیکٹ کمیٹی میں ایک ریزولیوشن کثرتِ رائے سے منظور ہو جاتا ہے تو صدر جلسہ حکیم اجمل خاں صاحب اس بنا پر اسے کھلے اجلاس میں پیش کرنے کی اجازت نہیں دیتے کہ حسبِ قاعدہ اس کے حق میں دو تہائی رائیں نہیں تھیں۔ صدر جلسہ کی اس رولنگ کے خلاف مولانا حسرت موہانی شدید احتجاج کرتے ہیں۔ لیکن جب یہی ریزولیوشن اجلاس مسلم لیگ کی سبجیکٹ کمیٹی میں نامنظور ہو جاتا ہے تو یہی مولانا حسرت موہانی مسلمہ قاعدے کے خلاف کھلے اجلاس میں پیش کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ جب ان کے اس فیصلے کے خلاف اعتراض کیا جاتا ہے تو فرماتے ہیں کہ "وہ جس ریزولیوشن کو چاہیں، مباحثے کے لیے پیش کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں۔"

یہ ہے مولانا حسرت موہانی کے مشہور ریزولیوشن: "آزادی کامل" کی مکمل کہانی، جس کو ہم نے بسط و تفصیل کے ساتھ انتہائی معروضی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ماہنامہ آج کل (نئی دہلی) حسرت نمبر بابت مئی ۱۹۸۵ء، مضمون عبداللطیف اعظمی، صفحہ ۷، کالم ۲۔

۲۔ سہ روزہ مدینہ (بجنور) مورخہ یکم جنوری ۱۹۲۲ء صفحہ ۳

۳۔ India in India in 1921-22, Internal Politics (Vol.1 Appendices, P-131)

۴۔ قاضی عبدالغفار: حیاتِ اجمل (مطبوعہ دہلی) صفحہ ۳۶۲

۵۔ مولانا حسرت موہانی ـــــ مجاہدِ آزادی کامل (مؤلفہ: پروفیسر سید شفقت رضوی) مطبوعہ کراچی، صفحات: ۵۹ - ۶۰

۶۔ ایضاً صفحہ ۶۰

۷۔ قاضی محمد عدیل عباسی: تحریکِ خلافت (مطبوعہ نئی دہلی ۱۹۷۸ء) صفحہ ۲۳۸

۸۔ اوراقِ گم گشتہ (مرتبہ: سید رئیس احمد جعفری ندوی) مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء صفحات: ۱۲۹ - ۱۳۰

۹۔ سہ روزہ مدینہ، حوالہ سابق

۱۰۔ قاضی عدیل عباسی، حوالہ سابق، صفحات: ۲۳۸ - ۲۳۹

۱۱۔ مولانا حسرت موہانی: انتخاب خطباتِ حسرت موہانی (مرتبہ: مفتی محمد رضا انصاری) مطبوعہ: لکھنؤ، ۱۹۸۸، صفحات: ۸۱ اور ۸۴

۱۲۔ پروفیسر سید شفقت رضوی، حوالہ سابق، صفحات: ۸۷-۸۸

۱۳۔ ایضاً، صفحہ ۸۷، بحوالہ: فاؤنڈیشن آف پاکستان (مرتبہ: سید شریف الدین پیرزادہ) مطبوعہ: کراچی: ۱۹۲۹ء صفحہ ۵۶

۱۴۔ سہ روزہ مدینہ ۵ جنوری ۱۹۲۲ء صفحہ ۳

مظہر امام

مولانا ملیح آبادی اور مولانا آزاد

مولانا ملیح آبادی کو ذاتی طور سے جاننے کا مجھے اتنا موقع نہ ملا کہ میں اُن کی شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات تفصیل کے ساتھ پیش کر سکوں۔ جن دنوں میں میٹرک کا طالب علم تھا، کبھی کبھی روزنامہ "ہند" دیکھنے کا موقع ملتا رہتا تھا۔ یہ اُن دنوں اہم قوم پرست اخباروں میں شامل تھا۔ اس کے بانی اور ایڈیٹر ملیح آبادی تھے۔ ان کے اداریوں سے ان کے صحافیانہ وقار کا رعب مجھ پر پڑ چکا تھا اور اس رعب کا اثر زائل کرنے کے لیے میں اکثر اپنے آپ سے پوچھتا رہتا تھا۔ "وہ، یہ کیا، صرف ملیح آبادی ؟"

ملیح آباد سے اس وقت میری واقفیت صرف دو ہی وجہوں سے تھی ـــــ ایک تو سفیدے آم کے باعث اور دوسرے جوش کے سبب۔ اس وقت تک وہاں کے آموں کا مزہ چکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ پھر خود میرا علاقہ آموں کے لیے دُور دُور تک شہرت رکھتا ہے۔ جب سے میں نے پریم چند کے افسانے میں دربھنگا کے آموں کا تذکرہ پڑھا تھا، دیگر علاقوں کے آم میری نظر میں ہیچ ہو گئے تھے۔ پریم چند بنارس میں رہ کر اپنے قریب کے ملیح آباد یا لکھنؤ کے آموں کا نہیں بلکہ دربھنگا کے آموں کا ذکر کریں تو ایک لڑکے کے ذہن میں جس کی زندگی تمام تر اسی چھوٹے سے شہر میں گزری ہو، اس طرح عصبیت کا پیدا ہونا کچھ غیر فطری بھی نہیں۔ آموں کے معاملے میں ملیح آباد کو دربھنگے کا حریف بنتے دیکھنا مجھے کب منظور ہوتا۔ وہ تو ملیح آباد کی خوش قسمتی تھی کہ وہاں جوش پیدا ہوئے، جن کا کلام مجھے اس زمانے میں اُردو کے تمام شاعروں سے زیادہ پسند تھا ـــــ اقبال سے بھی زیادہ۔ غالب سے اُس وقت خاص دل چسپی پیدا نہیں ہوئی تھی اور میر بہت معمولی معلوم ہوتے تھے۔ یہ میری اسکول کی طالب علمی کے آخری دنوں کا ذکر ہے۔ جب میری عمر پورے چودہ سال بھی نہیں ہوئی تھی۔

روزنامہ "ہند" میں ملیح آبادی کی کتابوں کے اشتہارات اکثر دیکھا رہتا تھا لیکن پتہ نہیں کس تعصب کا نتیجہ تھا کہ کلکتہ سے چھپی ہوئی کتاب پڑھنے کی طرف رغبت نہیں ہوتی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہاں کی جو مطبوعات میری نظر سے گزری تھیں وہ عموماً اخباری کاغذ پر چھپی ہوئی اور کتابت و طباعت کی خوش سلیقگی اور نفاست سے محروم تھیں۔ یوں بھی مولانا کی بیشتر کتابیں مذہبی فلسفے یا تاریخ سے متعلق تھیں، جن سے اُن دنوں میری کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ میرا بچپن کٹر مذہبی ماحول میں گزرا ہے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا والد کو پوری طرح صوم و صلوٰۃ کا پابند اور قرآن و حدیث کا باقاعدہ مطالعہ کرتے دیکھا۔ اُن کے پاس مختلف احادیث اور مذہبی کتب کا ایک بڑا ذخیرہ تھا، جو ہمیں ورثے میں ملا۔ میں ابھی بچپن کی سرحد عبور نہیں کر پایا تھا کہ والد چند ماہ کی علالت کے بعد بغیر کچھ کہے سُنے ہم سے رخصت ہو گئے۔ ان کی غیر متوقع اور اچانک عدم موجودگی نے میرے ناپختہ ذہن پر گہرا اثر ڈالا۔ مایوسی، دل شکستگی اور عدم تحفظ کے احساس نے ایک عرصے کے لیے مذہب سے بے تعلقی اور خدا سے ایک نوع کی بیزاری پیدا کر دی۔ مختصر یہ کہ اپنے والد کے چھوڑے ہوئے ورثے کو بڑے احترام سے محفوظ رکھنے کے باوجود میں ان کے مطالعے کی جانب اپنے آپ کو راغب نہ کر سکا۔ پھر مولانا ملیح آبادی کی مذہبی کتابوں کو بطورِ خاص حاصل کر کے پڑھنے کی سعادت کس طرح نصیب ہوتی!

امیر منزل قلعہ گھاٹ، دربھنگہ ۸۴۶۰۰۴

میٹرک کا امتحان دینے کے بعد میں خالی خالی سا تھا کہ اپنے ایک ہم وطن (بلکہ "ہم محلّہ") عطاءالرحمٰن سے اتفاقیہ طور پر ملاقات ہو گئی جو اپنے والد جناب ذاکر حسین ذاکر کے ساتھ کلکتہ میں رہا کرتے تھے۔ ذاکر صاحب ہندوستان گراموفون ریکارڈ کمپنی سے وابستہ تھے اور اس کمپنی کے علاوہ نیو تھیٹرز اور دوسرے فلم سازوں کے لیے گانے لکھا کرتے تھے۔ عطاءالرحمٰن اپنے ساتھ کلکتہ سے کچھ کتابیں بھی لائے تھے۔ یہی میری اور ان کی دوستی کی بنیاد بنیں۔ انہیں کتابوں میں ملیح آبادی کے ترجمے کیے ہوئے افسانوں کا مجموعہ "ترکی افسانے" بھی تھا۔ میں نے اسے بڑے چاؤ اور اشتیاق سے پڑھا۔ اس کے بعد سے ملیح آبادی کی تحریروں اور ان کی شخصیت میں دل چسپی بڑھی۔ کلکتہ کا کوئی واقف کار ملتا تو اس سے ملیح آبادی کے بارے میں ضرور پوچھتا۔ ان کی بذلہ سنجی اور کتّے پالنے کے شوق سے لے کر اُن کے آتش بارا داریوں، ان کی بے باکی اور بے خوفی، اُن کے قتل کی سازش، ان کے اشتراکی رجحانات وغیرہ کی بابت مُختلف ذرائع سے خبریں ملتی رہتی تھیں۔ ایسے شخص سے ملنے اور اس سے اکتساب فیض کرنے کی خواہش روز بروز بڑھتی گئی۔ لیکن افسوس کہ جب ۱۹۵۱ء کے اواخر میں میرے لیے کلکتہ میں مستقل قیام کی صورت نکلی تو ملیح آبادی دہلی میں تھے۔ البتہ ان کا ذکر کلکتے کے ہوٹلوں، اخباروں کے دفتروں اور دوستوں کی محفلوں میں برابر ہوتا رہتا تھا۔

ملیح آبادی سے مجھے پہلی دفعہ ۱۹۵۴ء یا ۱۹۵۵ء میں نیاز کا شرف حاصل ہوا۔ اس وقت وہ کینسر کا شکار ہو چکے تھے اور بمبئی میں علاج کے بعد بہ ظاہر شفایاب ہو کر لوٹے تھے۔ پرویز شاہدی ان کی مزاج پرسی کے لیے دفتر آزاد ہند گئے تو مجھے بھی ساتھ لیتے گئے۔ ملیح آبادی ایک چارپائی پر بیٹھے تھے۔ حلق کے اوپری حصّے پر جلے کا نشان تھا جو کینسر کے علاج کا پتہ دیتا تھا۔ میں نے پہلے انہیں دیکھا نہیں تھا، اس لیے قبل کی صحت سے ان کی موجودہ صحت کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا ویسے وہ اچھے خاصے تندرست معلوم ہوتے تھے۔ مجھے پتہ تھا کہ ان کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہے۔ لیکن وہ چالیس پینتالیس سے زیادہ کے نہ معلوم ہوتے تھے۔ سننے میں آیا کہ وہ اپنی عمر ستر اسّی سے کم نہیں بتلاتے۔ مولانا ملیح آبادی سے میرا تعارف ضرور ہوا لیکن مجھ سے ان کی کوئی خاص بات چیت نہیں ہوئی۔ پرویز صاحب سے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں جن میں سے صرف ایک بات یاد رہ گئی ہے۔ پرویز شاہدی نے اُن سے شاید منصور کی بابت اپنے علم کی تائید چاہی تھی کہ وہ مسلمان نہیں بلکہ مجوسی تھا اور مولانا ملیح آبادی نے جواب اثبات میں دیا تھا۔ کلکتہ پہنچنے کے ساتھ ہی مولانا کے بارے میں اتنی ساری باتیں سُن چکا تھا کہ انہیں "روایتی مولانا" نہ پاکر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ عام طور پر مولاناؤں کے متعلق میرا تصور یہ ہے کہ وہ بلند قامت اور لحیم شحیم ہوتے ہیں۔ مولانا آزاد سبحانی نے مجھے نصف مایوس کیا تھا کیوں کہ وہ بلند قامت نہ تھے البتہ لحیم شحیم تھے۔ مولانا ملیح آبادی دونوں اعتبار سے مایوس کُن ثابت ہوئے اور اس وقت مجھے پتہ چلا کہ وہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے بجائے صرف محض "ملیح آبادی" کیوں ہیں! شاید ان کے قد و قامت کے لحاظ سے اتنے بڑے نام کا جامہ انہیں زیب نہ دیتا تھا۔

مولانا موصوف سے دوسری اور آخری دفعہ ۱۹۵۸ء میں ملنے کا موقع ملا۔ آپ مولانا آزاد کی وفات کے بعد دل شکستہ اور دلّی سے دل برداشتہ ہو کر کلکتہ واپس آ گئے تھے اور اپنے صاحب زادے احمد سعید ملیح آبادی مدیر آزاد ہند کے ساتھ مقیم تھے۔ میں سید میر محمود طرزی صاحب سے ملنے ان کے پریس گیا تو مولانا ملیح آبادی وہاں تشریف فرما تھے۔ میں نے انہیں سلام کیا۔ ان کی خیریت دریافت کی اور ان کے دہلی چھوڑ دینے کے بابت ان سے گفتگو کرتا رہا۔ مولانا ہر بات کا جواب بڑی محبت، نرمی اور سنجیدگی لیکن اختصار کے ساتھ دیتے رہے۔ طرزی صاحب نے مولانا سے مخاطب ہو کر حسبِ معمول مبالغے کے ساتھ میری تعریف کی تو مولانا نے فرمایا:

"میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ کا کلام یوم آزاد والے کُل ہند مشاعرے میں سُن چکا ہوں۔ آپ کی تحریریں رسالوں میں بھی پڑھی ہیں۔ ماشاءاللہ آپ بہت طباع ہیں۔ اب تو آپ نوجوانوں سے ہی مستقبل کی اُمیدیں وابستہ ہیں۔"

یہ کہنا مشکل ہے کہ مولانا نے واقعی میری تحریریں پڑھی تھیں یا محض میرا دل رکھنے کو کہہ دیا تھا۔ میں نے مولانا کی خدمت میں اپنی شادی سے متعلق لکھی ہوئی تہنیتی نظموں کا مجموعہ "شاخِ حنا" پیش کیا۔ جو انہیں دنوں تاج پریس کلکتہ کی جانب سے شائع کیا گیا۔ مولانا نے بڑے اخلاق اور انکسار کے ساتھ میرا شکریہ ادا کیا۔ کتابچے کو الٹ پلٹ کر سرسری طور سے کچھ چیزیں دیکھیں اور فرمایا۔ آپ کا یہ تحفہ بہت گراں قدر ہے۔ میں اسے اطمینان سے پڑھ کر اپنی رائے دوں گا۔ جہاں تک مجھے علم ہے مولانا کو شعر و شاعری سے کچھ زیادہ دل چسپی نہ تھی۔ اپنے رسالے "ماہ نامہ سوغات" دہلی میں جمیل مظہری کی طویل نظم "فریاد" شائع کرتے ہوئے مولانا ملیح آبادی نے اپنی طرف سے جو نوٹ دیا تھا، اس میں بھی اس امر کا اعتراف موجود ہے۔ علی جواد زیدی کا بیان ہے کہ مولانا اردو اور فارسی کے اشعار کو موزوں بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔ لیکن مولانا نے جس انداز سے "شاخِ حنا" کی پذیرائی کی اور جن الفاظ میں اُنہوں نے میری تحریروں کو سراہا، اس سے

ان کی بڑائی کے نقوش میرے لوحِ دل پر مرتسم ہو گئے۔ ان دونوں ملاقاتوں میں مولانا ملیح آبادی نے اپنی کسی حرکت یا اندازِ گفتگو سے اپنی برتری اور عالمانہ شان کا سکہ بٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ میں اُن کی اس ادا سے خاص طور پر متاثر ہوا۔ مجھے کب معلوم تھا کہ یہ ان سے میری آخری ملاقات ہوگی۔ کچھ ہی دنوں بعد مجھے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے سلسلے میں کلکتہ کو خیرباد کہہ کر کٹک آنا پڑا۔ ۱۹۵۹ء کے اوائل میں اردو کانفرنس اور ہندو پاک مشاعرے میں شرکت کی غرض سے کلکتہ جانے کا اتفاق ہوا تو ملیح آبادی کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ اپنے مکان کے زینے سے اترتے ہوئے پھسل کر گر پڑے۔ کئی ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور اب وہ صاحبِ فراش ہیں۔ کٹک واپس آیا تو اطلاع ملی کہ کینسر کے علاج کے لیے اُنہیں پھر بمبئی لے جایا گیا ہے۔ وہیں سے ۲۴ جون ۱۹۵۹ء کو اُن کے انتقال کی خبر بھی آئی۔ ایک اعلیٰ صفات ہستی کی موت سے زیادہ اپنی خود غرضی کی بنا پر مجھے اس بات کا غم رہا کہ اُنہیں مزید قریب سے دیکھنے، ان سے استفادہ کرتے اور ان کی شخصیت کی رنگا رنگی کو جذب کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ کاش مولانا اس قدر جلد ہم سے رخصت نہ ہوتے اور مجھے اچانک کلکتہ نہ چھوڑنا پڑتا۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی تصنیفات، تالیفات اور تراجم کی تعداد درجنوں تک پہنچتی ہے۔ انہوں نے امام ابن تیمیہ کی بعض اہم کتابوں کو بھی عام فہم اور دل پذیر انداز میں اردو میں منتقل کرکے عوام اور خواص دونوں میں مقبول بنایا۔ مولانا ملیح آبادی کو عربی زبان پر غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔ اور ان کی عربی دانی پر خود اہلِ عرب رشک کرتے تھے۔ شاید یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہو کہ ان کی ادارت میں شائع ہونے والے عربی ہفتہ وار اخبار الجامعہ نے ارضِ بیت اللہ کو انگریزوں سے آزاد کرانے اور شاہ سعود عبدالعزیز کی حکومت قائم کرانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ پھر مولانا آزاد کی ایما پر ملیح آبادی نے عربی جریدہ "ثقافۃ الہندیہ" کی زمامِ ادارت سنبھالی۔ یہ رسالہ اُن دنوں حکومتِ ہند کی وزارتِ تعلیم کی جانب سے شائع ہوتا تھا۔ اب انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز وزارتِ خارجہ حکومتِ ہند کے زیرِ اہتمام چھپتا ہے۔ ان دونوں رسائل نے عرب ممالک میں بڑی ہردلعزیزی حاصل کی اور ایک بلند پایہ صحافی کی حیثیت سے مولانا ملیح آبادی کو ہندوستان سے باہر بھی سر آنکھوں پر بٹھایا گیا۔

۱۹۱۸ء میں عبدالرزاق ملیح آبادی قاہرہ اور قسطنطنیہ سے تحصیلِ علم کے بعد ہندوستان واپس آئے۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں رانچی کی نظر بندی سے مولانا آزاد کی رہائی ہوئی۔ ان ہی دنوں ملیح آبادی کو مولانا آزاد سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا آزاد کی جوہر شناس نگاہوں نے دیکھ لیا کہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی قدیم وجدید پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ عربی زبان پر قدرت اور قلم میں صلابت ہے۔ ۱۹۲۱ء میں جب "مدرسہ جامع مسجد عربی" کا افتتاح ہوا تو مولانا آزاد نے ملیح آبادی کو کلکتہ بلا لیا اور مؤخرالذکر ہی کی محنت اور کوشش سے مدرسہ قائم ہوا۔ پھر جب مولانا آزاد نے کلکتہ سے ہی ستمبر ۱۹۲۱ء میں ہفتہ وار "پیغام" کا اجرا کیا تو اس کی ادارت و اشاعت کی ذمہ داری عبدالرزاق ملیح آبادی کو سونپ دی۔ اس وقت سے مولانا آزاد کا تعلق ملیح آبادی سے تا عمر قائم رہا۔ آزادی کے بعد جب مولانا آزاد حکومتِ ہند میں وزیرِ تعلیم ہوئے تو انہوں نے ملیح آبادی کو دہلی بلوا لیا۔

حیرت ہوتی ہے کہ مولانا آزاد سے عمر بھر کی رفاقت اور عملی زندگی میں ان سے کافی حد تک اثر پذیر ہونے کے باوجود ملیح آبادی نے مولانا آزاد کی طرزِ انشا سے کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ ملیح آبادی کی نثر مجھے غالب اور حالی کی سادہ، سلیس اور رواں نثر سے قریب نظر آتی ہے۔ مولانا آزاد کی نثر نے ہر چند اردو کے بعض ادیبوں پر گہرا اثر ڈالا اور ان کے اسلوبِ تحریر کو پڑھے لکھے طبقے میں اچھی خاصی مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مولانا آزاد کا اندازِ نگارش اردو زبان کے حق میں کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں ہوا۔ اس اسلوب نے بالواسطہ روزمرہ اور بول چال کی زبان سے اردو نثر کو دور رکھنے کی کوشش کی اور اس کی وجہ سے اردو زبان کی عوامی مقبولیت پر دوررس منفی اثرات مرتب ہوئے۔ مولانا آزاد کا اسلوب منفرد اور سحر آفریں سہی لیکن اس کا حلقۂ اثر محدود ہے۔ مولانا آزاد کی نثر کے بارے میں ڈاکٹر عبدالحق اور محمد حسن عسکری نے بھی ایسی ہی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ملیح آبادی کی نثر نے اردو زبان کی زیادہ خدمت کی ہے۔ ان کی نثر میں نہ تو شاعرانہ آرائش ہے اور نہ الفاظ کا طمطراق۔ ظاہری شان و شوکت سے پُر مرصع اور مسجع عبارت ان کے یہاں شاذ ہی ملے گی۔ وہ اپنے خیالات و محسوسات کو سادگی کے ساتھ اس طرح بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں، جس سے ان کے استدلال کا زور واضح بھی ہو اور اثر آفریں بھی۔ خود ملیح آبادی کا بیان ہے:

"زبان کا کمال یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ سادہ
اور مضمون و مفہوم کے اعتبار سے تھوڑے سے
الفاظ میں بہت سے مضمون کو سموئے ہوئے ہو
اس نقطۂ نظر کو میں نے اردو کے بارے میں بڑی
محنت اور کاوش سے حاصل کیا ہے۔"

اسی محنت اور کاوش کے باعث مولانا ملیح آبادی صحافت کے میدان میں اس قدر کامیاب رہے۔ ملیح آبادی کی زبان غالب اور حالی کی نثر کی روایت کی امین ہے۔ یا پھر اس کا مقابلہ ملیح آبادی کے معاصرین

مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر عبدالحق کی نثر سے کیا جا سکتا ہے۔ ویسے کبھی کبھی اس کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ ان کی زبان بے رنگ اور بے اثر ہو گئی ہے۔ اُن کے آخری دَور کی تحریروں میں مجھے یہ عیب کہیں کہیں نظر آیا، جو ممکن ہے عمر کے تقاضے سے ہو یا پھر بسیار نویسی کے باعث۔ "ذکرِ آزاد" میں ملیح آبادی نے مولانا آزاد کی زندگی کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ بریلی میں جمعیتہ العلماء کا اجلاس منعقد ہونے والا تھا اور مولانا آزاد کو اس کی صدارت کرنی تھی۔ بریلی میں مولانا احمد رضا خاں کے معتقدین کا زور تھا۔ جو انگریزی حکومت کے حامی و طرف دار تھے۔ مولانا آزاد بریلی پہنچے تو انہیں بتایا گیا کہ اس جلسے میں ان کی شرکت مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ خون خرابے کا اندیشہ ہے۔ مولانا آزاد اس طرح کی باتوں سے کب خوف کھاتے۔ جلسے میں پہنچے اور مسندِ صدارت پر بیٹھ گئے۔ وہاں اکثریت رضاخانیوں کی تھی اور بہتوں کے ہاتھوں میں بقول ملیح آبادی "ننگے قصابی چھُرے چمک رہے تھے"۔ اس جماعت کے ترجمان مولانا سلیمان اشرف تھے جو بڑے وجیہ انسان اور اعلیٰ پائے کے خطیب تھے۔ مولانا سلیمان اشرف کی تقریر کے دَوران مولانا آزاد جوابی جملے کے لیے بے تاب رہے اور جب بولنے کھڑے ہوئے تو یہ الفاظ ملیح آبادی:

"سمندر میں طوفان پر طوفان آنا شروع ہو گئے۔
آتش فشاں پھٹنے لگے۔ زلزلوں نے زمین کو
الٹ پلٹ ڈالا، ستارے ششدر رہ گئے۔
چاند بھی انسانی طلاقتِ لسانی پر مبہوت ہو کر
رہ گیا۔"

مولانا ملیح آبادی کے یہ جملے اُن کے عام رنگِ تحریر سے میل نہیں کھاتے۔ ہر چند کہ ان میں سمندر، طوفان، آتش فشاں، زلزلہ جیسے پُرشکوہ اور ستارے، چاند جیسے رومان پرور الفاظ کا استعمال ہوا ہے، لیکن یہ جملے اس جذباتی شدت کی بازآفرینی سے قاصر ہیں جو ملیح آبادی قارئین تک منتقل کرنا چاہتے ہیں۔

"ذکرِ آزاد" میں "الہلال" کے دَورِ ثانی کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا ملیح آبادی نے لکھا ہے کہ اس میں "انسانیت موت کے دروازے پر" کے عنوان سے جتنے مضامین شائع ہوئے وہ اُن کے ہی لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن چونکہ مضامین کے ساتھ مصنف کا نام درج نہیں تھا اس لیے لوگوں نے انہیں مولانا آزاد سے منسوب کر کے، ان مضامین کا مجموعہ ان کے نام سے شائع کر دیا۔ "الہلال" اور "البلاغ" کے بعض اور مضامین کی بابت بھی اس طرح کے دعوے کچھ دوسرے گوشوں سے ہوئے ہیں۔ "انسانیت موت کے دروازے پر" کے عنوان سے جو مضامین چھپے ہیں، اُن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ طرزِ نگارش مولانا آزاد کے اسلوب سے مختلف ہے۔ ان میں مولانا آزاد کے رنگِ انشاء کی جھلکیاں نہیں ملتیں۔ ان مضامین میں تاریخی حقائق بہت ہی سادگی سے افسانوی انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ مولانا ملیح آبادی کا عمومی رنگِ تحریر یہی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"دورانِ علالت میں قریش کی ایک جماعت عیادت کو آئی۔ امیر معاویہ نے حاضرین کے سامنے دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ ان لفظوں میں کھینچا:
"دنیا، آہ دنیا، بس اس کے سوا کچھ نہیں، جسے ہم اچھی طرح دیکھ چکے ہیں اور جس کا خوب خوب تجربہ حاصل کر چکے ہیں۔ خدا کی قسم! ہم اپنی جوانی کے عالم میں دنیا کی بہار کی طرف دوڑے اور اس کے سب مزے پوری طرح لوٹے۔ مگر ہم نے دیکھ لیا کہ دنیا نے جلد پلٹا کھایا اور بالکل کایا پلٹ کر دی۔ ایک ایک کر کے تمام گرہیں کھول ڈالیں۔ پھر کیا ہوا؟ دنیا نے ہم سے بے وفائی کی ہماری جوانی چھین لی۔ ہمیں بوڑھا بنا دیا۔ آہ! یہ دنیا کتنی خراب جگہ ہے، یہ دنیا کیسا خراب مقام ہے!
اے لوگو! میں اس کھیتی کی بال ہوں جو کٹ چکی ہے۔ مجھے تم پر حکومت ملی تھی۔ میرے بعد جتنے حاکم آئیں گے، مجھ سے بُرے ہوں گے ٹھیک اسی طرح جس طرح اگلے حاکم مجھ سے اچھے تھے!"

کیا یہ مولانا آزاد کی تحریر ہو سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ تعجب ہے کہ جب مولانا آزاد کے نام سے یہ کتاب اُن کی زندگی میں شائع ہوئی تو انہوں نے اس کی تصنیف سے انکار کیوں نہیں کیا۔ "مقالاتِ الہلال" اور "مضامینِ البلاغ" بھی اُن کی زندگی میں ہی کتابی صورت میں شائع ہوئے تھے۔ انہوں نے اس بات کی وضاحت کیوں نہ کر دی کہ فلاں فلاں مضامین اُن کے نہیں ہیں۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا کہ اُن کتابوں کی اشاعت سے مولانا آزاد واقف ہی نہ ہوئے ہوں۔ بلکہ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ یہ کتابیں ان کی اجازت اور مرضی سے شائع ہوئی ہوں گی۔ یہ تو ممکن ہے کہ مولانا آزاد اپنی کتابوں کی رائلٹی اپنے ذاتی مصرف میں نہ لانا چاہتے ہوں لیکن یقیناً وہ اسے پبلشر کی جیب میں نہ جانے دینا چاہتے ہوں گے۔ جب کہ یہ رقم قومی کاموں میں صرف ہو سکتی تھی۔

اگر "انسانیت موت کے دروازے پر" اور "الہلال" اور "البلاغ" کے بعض مضامین، جو مولانا آزاد کے نام سے منسوب ہیں، اُن کے نہیں ہیں تو یہ امر حیرت ہی نہیں، افسوس کا بھی ہے کہ انہوں نے اس کی تردید نہیں کی اور غلط فہمی پھیلنے کا موقع دیا۔ مولانا آزاد کی عظمت اپنی جگہ، لیکن میں یہ سوچتا ہوں، کہیں یہ اُن کے کردار کی ایک کمزوری تو نہیں تھی کہ وہ دوسروں کے کارناموں کا کریڈٹ بھی خود لینا چاہتے تھے۔ میرے اس قیاس کی تصدیق قاضی عبدالودود کے اُن خیالات سے بھی ہوتی ہے جو وہ عموماً دورانِ گفتگو ظاہر کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے کئی بار مجھ سے کہا کہ مولانا آزاد کو اپنی پُرتصنع نمائش اور اپنی بڑائی ظاہر کرنے کا بہت شوق تھا اور اس کے لیے وہ غلط گوئی اور مبالغہ سے کام لیتے تھے۔ کوئی ان سے ملنے آتا تو فرانسیسی یا جرمن کی کوئی کتاب ہاتھ میں لے کر بیٹھ جاتے۔ حالانکہ وہ ان زبانوں سے واقف نہ تھے۔ قاضی صاحب کا یہ بیان بھی ہے کہ مولانا آزاد اپنے آپ کو ان کتابوں کا مصنف بھی بتاتے تھے جو کبھی لکھی ہی نہیں گئیں۔ بس ذہن میں ایک موضوع آیا کتاب کا ایک عنوان مقرر کر لیا اور اپنی تصنیف قرار دے دیا۔ اور اس کا اعلان اپنی تحریروں اور اپنے اخبارات کے اشتہارات میں کر دیا۔ کلیم الدین احمد نے بھی لکھا ہے کہ قاضی عبدالودود، مولانا آزاد کی "صریح غلطیوں اور غلط بیانیوں" پر سخت ردعمل کا اظہار کرتے تھے۔

مولانا آزاد کی وفات کے فوراً بعد ملیح آبادی کی تالیف :
"آزاد کی کہانی، خود آزاد کی زبانی" شائع ہوئی۔ اس کتاب کی بابت مختلف طرح کی رائیں سننے میں آئیں۔ کچھ لوگوں نے اس شک و شبہ کا اظہار کیا کہ یہ کتاب من گھڑت ہے اور ملیح آبادی نے طلب زر کے لیے مولانا آزاد سے منسوب کر دی ہے۔ اس شک کے دو خاص اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ یہ سوانح عمری سینتیس سال کے بعد مولانا آزاد کے وفات پاتے ہی منظرِ عام پر آئی۔ دوسرے یہ کہ اس میں مولانا آزاد کے مذہبی عقائد کی بابت کچھ ایسی باتیں ہیں جو ایک عالم دین کے شایانِ شان نہیں معلوم ہوتیں اور ان سے امام الہند کی عظمت پر حرف آتا ہے اس طرح کے شبہ کا اظہار مولانا حفظ الرحمن نے بھی بالواسطہ کیا ہے۔
اس کتاب کو پڑھ کر مجھ پر جو تاثر قائم ہوا وہ یہ تھا کہ یہ زبان مولانا آزاد کی نہیں ہو سکتی۔ اس نوع کی سادہ اور سلیس زبان تو ملیح آبادی ہی لکھ سکتے ہیں، لیکن زبان کی بابت مولانا ملیح آبادی نے کتاب کی ابتدا میں وضاحت کر دی ہے کہ یہ سوانح مولانا آزاد کی لکھوائی ہوئی ہے اور تحریر ملیح آبادی کی ہے۔ ۱۹۲۲ء میں جب مولانا آزاد اور ملیح آبادی علی پور جیل کلکتہ میں قید تھے تو اول الذکر موخرالذکر کو اپنی زندگی کے حالات بتاتے جاتے جنہیں ملیح آبادی ہر رات قلمبند کر لیتے۔ یوں بھی مولانا آزاد عام بول چال میں ایسی آراستہ زبان نہ استعمال کرتے تھے جو ان کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ یہ کتاب ممکن تھا کہ مولانا آزاد کی زندگی ہی میں شائع ہو جاتی، لیکن موصوف چاہتے تھے کہ وہ بعد کے حالات بھی اپنی سوانح عمری میں شامل کر دیں۔ اس کے علاوہ مولانا آزاد اس پر نظرِ ثانی بھی کرنا چاہتے تھے، لیکن ان کی روزافزوں مصروفیات نے اس کا موقع نہ دیا اور وہ اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ یہی سبب ہے کہ یہ کتاب اتنے عرصے تک مسودے کی صورت میں پڑی رہی۔
میں سمجھتا ہوں کہ اگر ملیح آبادی اس مسودے کو ترتیب دے کر شائع نہ کرتے تو مولانا آزاد کی زندگی کے بہت سے واقعات منظر عام پر نہ آ سکتے، اور اس طرح ایک بڑی شخصیت کی زندگی کے بعض اہم گوشے ہمیشہ کے لیے نگاہوں سے اوجھل رہ جاتے۔

جہاں تک مذہبی عقائد کا سوال ہے، یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ مولانا آزاد الحاد و افکار کے دور سے گزرے ہیں۔ اس کا اندازہ 'تذکرہ' کے ان صفحات سے بھی ہو جاتا ہے، جن میں مولانا آزاد نے اپنی ابتدائی زندگی کے احوال بیان کیے ہیں۔ ہر چند یہ تحریر غیر معمولی طور پر استعاروں اور کنایوں کے پردے میں ہے، لیکن مولانا کی بعض ذاتی کمزوریوں سے پردہ اُٹھاتی ہے۔ یہ اعتراف مولانا آزاد کا مقصد تھا۔ مجھے ذاتی طور پر ملیح آبادی کی کتاب میں ایک جملہ بھی ایسا نظر نہ آیا، جس سے آزاد کے کردار کی کوئی لغزش ظاہر ہوتی ہو۔

ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے عصر جدید بک ایجنسی کلکتہ سے ۱۹۲۳ء میں شائع شدہ شائق احمد عثمانی کی کتاب "امام الاسرار مولانا ابوالکلام آزاد" کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے :

> "مولانا آزاد پر سب سے پہلی کتاب اس کے ابتدائی صفحات "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" کے خلاصے پر مشتمل ہیں۔ اس کے بعد ۱۹۲۳ء تک کے حالات ہیں۔ اس میں ہندوستان کے سیاسی مسائل کی نسبت وہ مکمل تحریر بھی ہے، جو انہوں نے ۱۹۲۲ء میں علی پور جیل میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کو ان کے سوالات کے جواب میں لکھ دی تھی۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ "ذکرِ آزاد" میں مولانا کی تحریر ناقص ہے۔"

خیر یہ ایک غیر متعلق سی بات ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ "آزاد کی کہانی، ملیح آبادی کی زبانی" ہے خود آزاد کی زبانی نہیں

پھر بھی کتاب کی اہمیت گھٹتی نہیں ہے۔ کیوں کہ کتاب میں جو حقائق بیان کیے ہیں۔ اُن کی صداقت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ اگر مولانا ملیح آبادی کے بیانات پر شبہ کیا جا سکتا ہے، جنہیں مولانا آزاد سے ۳۸ سال کی رفاقت کا شرف حاصل تھا تو پھر دوسرا کون سا شخص ہے جس پر مولانا آزاد کے باب میں اعتماد کیا جا سکے !

مولانا ملیح آبادی کی صداقت پرستی اور دیانت داری کی گواہی بہت پہلے خود مولانا آزاد بہت پہلے دے چکے ہیں۔ مولانا آزاد نے مولانا ملیح آبادی کی گرفتاری پر اپنے ہفتہ وار اخبار پیغام کی اشاعت ۲ دسمبر ۲۱ء میں ایک نوٹ لکھا تھا۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

"کل چار بجے جب میں بمبئی میل سے کلکتہ پہنچا۔
اور متوقع تھا کہ حسبِ معمول مولوی عبدالرزاق
صاحب سے ملاقات ہوگی تو ان کی جگہ اُن کی
گرفتاری کی خبر نے میرا استقبال کیا۔ وہ اسٹیشن پر
ملتے تو میرے دل میں اُن کی محبت بڑھتی جو گزشتہ
دو سال سے برابر بڑھتی رہی ہے مگر وہ نہ ملے
اور جیل خانے چلے گئے۔ اس طرح اُنہوں نے صرف
اپنی محبت ہی نہیں بلکہ اپنی عزت کے لیے بھی میرے
دل سے تقاضہ کیا۔ اب میں ان سے صرف محبت
ہی نہیں کرتا بلکہ ان کی عزت بھی کرتا ہوں"!

اسی نوٹ میں آگے چل کر مولانا آزاد کا ارشاد ہے:

"دو سال ہوئے جب یہ (ملیح آبادی) مجھ سے
ملے اور میں نے ان میں بہترین قابلیتِ علم و عمل
نمایاں پائی۔ یہ ملک کے اُن مخصوص اہلِ علم
نوجوانوں میں ہیں جن کی غیر معمولی قابلیتوں سے
بہترین اُمیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ اُنہوں
نے خدمتِ خلق و دعوت کی راہ میں مجھ سے جو
رشتۂ رفاقت و اخوت جوڑا تھا وہ روز بروز قوی
ہوتا گیا اور ایک سچے رفیق اور بھائی کی طرح
ان کی صداقت میرے دل کو جذب کرتی رہی"!

جب مولانا آزاد ہی مولانا ملیح آبادی کی صداقت پسندی اور حق گوئی کی شہادت دے چکے ہیں تو پھر مجھے یا آپ کو اس میں شک کرنے کا کیا حق ہے؟ یہ دو رفیقوں کا معاملہ ہے۔ ہم تو مولانا آزاد کے بیان کی روشنی میں منظر انصاری کے اس شعر کی ہم نوائی کرتے ہیں:

مری آنکھوں نے کیا کھویا ترے جلوؤں نے کیا پایا
حسابِ دوستاں دل ہی میں رہ جائے تو اچھا ہے

—

بقیہ: مکتوبات

غازی میاں کا میلا صرف سہسرام ہی میں جلیٹھ کے پہلے اتوار کو لگتا تھا۔ لمبے لمبے بانسوں میں رنگ برنگ کے کپڑے لہراتے تھے۔ کچھ بانسوں میں لمبے لمبے بال لٹکے ہوتے جسے بچّے داڑھی والے باراتی کہتے تھے۔ اس موقع پر عورتیں آنکھوں کی صحت کے لیے منت مانتی تھیں اور "انکھیا" (آٹے کی گول گول ٹکیا میں آنکھ جیسا نقشہ بنا کر شکر یا گڑ میں اوقات کے مطابق پکایا کرتی تھیں۔ یہاں کی تعزیہ داری بھی کسی دوسرے شہر میں نہیں دیکھی۔ روشنی کا اہتمام اور مرثیہ خوانی غضب ہوتی تھی۔ حیرت ہے کہ کہاں ردولی اور کہاں سہسرام، مگر کافی مماثلت ہے۔

ایس۔ سلطانہ، بنگلور

اُڑا ہوا رنگ:

فروری کا "آج کل" بھی حسبِ روایت معیاری ہے، لیکن ہر افسانے پر تھکن اور بڑھاپے کا احساس ہوتا ہے۔ شاید اس لیے کہ اب اردو پڑھنے اور اردو میں لکھنے والوں کا حلقہ زیادہ تر پچاس پچپن سے اوپر کا ہے۔ نئی نسل بہت کم دلچسپی لے رہی ہے۔ تب اُمنگ، ترنگ، تازگی، توانائی، جوش و خروش کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔

کیا یہ زبان اب ایک اُڑا ہوا رنگ بن کر ملک کے کینوس پر رہ جائے گی۔؟

کیا ہمارے پاس اس کا جواب، جواز اور حل ہے۔؟

شفیقہ فرحت، بھوپال

محمد نعمان خاں

بھوپال کا پہلا اُردو تذکرہ

"تذکرۂ فرح بخش"

ہندوستان کے سب سے وسیع و عریض صوبہ مدھیہ پردیش کی راجدھانی بھوپال، کو آزادیٔ ہند سے قبل ایک ایسی مسلم ریاست کی حیثیت حاصل تھی جو اپنے مخصوص سیاسی وقار، قدرتی حسن، تہذیبی انفرادیت اور علم پروری و ادب نوازی کے باعث شمالی ہند کی مسلم ریاستوں کی تہذیب و تمدن کی نمائندگی کرتی تھی۔ بھوپال کی ادبی خدمات تقریباً دو صدی کے طویل عرصہ پر محیط ہیں۔ لیکن اسے باقاعدہ طور پر ادبی گہوارے کی حیثیت قیامِ ریاست کے بعد حاصل ہوئی اور ریاست کی ترقی اور استحکام کے ساتھ ساتھ علمی ادبی کاموں کی ترقی اور ترویج و اشاعت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوتا گیا۔

بھوپال میں دیگر ادبی اصناف کے ساتھ ساتھ تذکرہ نگاری پر بھی توجہ صرف کی گئی، چنانچہ یہاں ۱۸۷۱ء سے ۱۸۹۰ء کے دوران ۴ تذکرے شائع ہوئے۔ بھوپال کا پہلا مطبوعہ دستیاب تذکرہ "تذکرہ فرح بخش" ہے، جسے بھوپال کے معروف شاعر و ادیب یار محمد خاں شوکت (تلمیذِ غالب) نے صرف ایک ہی رات میں تحریر کیا تھا۔ اس کے اختصار کے سبب بعض حضرات نے اسے تذکرہ کے بجائے بیاض یا مجموعۂ کلام سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن یہ بات اس وجہ سے درست نہیں ہے کہ سوائے اختصار کے تذکرہ نگاری کی ساری خصوصیات اس میں موجود ہیں۔

تذکرے زبان و ادب کی تاریخ اور ارتقا میں نہایت معاون و مفید ثابت ہونے کے علاوہ اردو تنقید کے نقشِ اوّلیں کی حیثیت بھی رکھتے ہیں اور ان کی تہذیبی و عمرانی حیثیات سے بھی انکار ممکن نہیں ہے! تذکرہ فرح بخش" مختصر ہونے کے باوجود بڑی حد تک مذکورہ خصوصیات کا حامل ہے۔

"تذکرہ فرح بخش" کے مصنف یار محمد خاں شوکت کا شمار بھوپال میں اپنے عہد کے نامور شعراء و ادباء میں ہوتا ہے۔ وہ ۱۶ر جولائی ۱۸۲۴ء مطابق ۲۷ صفر ۱۲۳۹ھ میں پیدا ہوئے۔ نواب فوجدار محمد خاں برادرِ حقیقی نواب گوہر قدسیہ بیگم کے بیٹے تھے۔ اس رشتے سے نواب یار محمد خاں شوکت نواب شاہجہاں بیگم کے ماموں اور نواب سلطان جہاں بیگم کے نانا تھے اور ان کا تعلق بانیٔ ریاست بھوپال سردار دوست محمد خاں کی پانچویں پشت سے تھا۔ شاہی خاندان کے چشم و چراغ ہونے کے سبب ان کی پرورش اور تربیت انتہائی ناز و نعم کے ساتھ ہوئی۔ انہوں نے کم سنی ہی میں اپنے عہد کے اربابِ کمال سے کمالاتِ سیف و قلم میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ وہ تذکرہ فرح بخش میں اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"نیاز مند درگاہ حضرت سبحان کمترین بندگانِ
خالق نار و جنت یار محمد خاں متخلص بہ شوکت شروع
سنِ تمیز سے علوم و فنون کا بدل راغب ہے۔
ہمیشہ اربابِ کمال کی خدمت میں نہایت شوق
سے کسب کمالات سیف و قلم کا طالب ہے"[۱]

نواب یار محمد خاں شوکت کے معمولات و مشاغل کے سلسلے میں ارشد تھانوی "بھوپال کی فضائے شعری" میں رقم طراز ہیں کہ:

"۱۸۵۰ء سے نواب صاحب کے مشاعروں میں

شعبۂ اردو سیفیہ آرٹس، کامرس، لاء کالج، احمد آباد، بھوپال (مدھیہ پردیش)

شریک ہوتا رہا ہوں۔ مجھے ان کو بہت قریب
سے دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ آپ نہایت قدیم
معاشرت اور وضع کے امیر تھے۔ آپ کا شمار
بھوپال کے بلند پایہ جاگیرداروں میں ہوتا تھا۔
جس وقت پہلی بار ان کو دیکھا ان کی عمر ۷۰ سال
کی تھی، مگر یہ معمولات جو ابتدائی عمر میں تھے وہی
آخر تک قائم رہے۔ ان کا معمول تھا کہ صبح
۱۱ بجے سے دو بجے تک اور شام کو ۷ بجے سے
۱۲ بجے تک اپنے دیوان خانے میں بیٹھتے تھے، جہاں
بھوپال کے شعراء، علماء اور مختلف علوم کے
ماہرین جمع ہوتے تھے۔ نواب صاحب مصیبت زدہ
شرفاء اور مفلس اہلِ جوہر کی امداد اور سرپرستی
کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے نہ معلوم کتنے لوگ
ان کی ذات سے وابستہ تھے۔ ان میں ایک امیرالامراء
نواب سید ذوالفقار علی خاں بہادر وزیر
بادشاہ دہلی کے نواسے محمد تقی خاں عرف نواب بھی
تھے جو ہنگامۂ غدر کے بعد بھاگ کر بھوپال آگئے
تھے۔" ۷

نواب یار محمد خاں شوکت کے اساتذہ میں مشہور عالم و فاضل مولوی سید عبداللہ (پنجاب) منشی احمد علی احمدؔ، میر اکبر علی خاں، سکندر محمد خاں، مولانا محمد عباس رفعت شروانی اور مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کے نام شامل ہیں۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی، "اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ" میں لکھتے ہیں کہ شوکت کو ان کے والد فوجدار محمد خاں نے مرزا غالبؔ سے ملایا تھا، لیکن پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے مطابق:

"سکندر جہاں بیگم صاحبہ ۱۸۶۶ء میں لارڈ
صاحب سے ملنے کی غرض سے آگرہ گئی تھیں۔
یار محمد خاں شوکت بھی ان کے ساتھ تھے۔
۲۳ نومبر ۱۸۶۶ء کو یہ قافلہ سیر کے لیے ریل
گاڑی سے دہلی پہنچا۔ غالباً اسی سفر میں یار محمد خاں
شوکت کو مرزا غالب سے ملنے کا موقع ملا۔
مرزا غالبؔ نے انہیں اپنا شاگرد بنا لیا اور
ان کا تخلص شوکت تجویز کیا۔ لیکن ساتھ ساتھ
یہ بھی کہا کہ آپ میرے شاگرد ہوئے۔ لیکن یہاں
زیادہ قیام ممکن نہیں اس لیے بھوپال میں اپنا
کلام مولانا عباس رفعت کو دکھانے کے بعد یہاں
بھیجا کیجیے۔"

چنانچہ شوکت نے اپنے استاد مرزا غالبؔ کی بات پر عمل کیا اور "گلدستۂ نرگس" اور چند غزلیں مولانا عباس رفعت کو دکھانے کے بعد مرزا کی خدمت میں بھیجیں جن پر مرزا نے حسبِ ضرورت اصلاح دی۔" ۸

یار محمد خاں شوکت نے اپنے استاد مرزا غالبؔ کا ذکر "تذکرۂ فرح بخش" میں اس طرح کیا ہے:۔

" فردوسیِ رزم خسروِ بزم کلیم کلام نظامی نظام
جناب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسداللہ خاں
المتخلص بہ غالبؔ دہلوی علیہ الرحمتہ مشاہیر
بلغائے نامی سے تھے۔ تعریف و توصیف ان کی
بیان سے مستغنی ہے اور دیوانِ اردو اور کلیاتِ
فارسی جناب ممدوح مشہور آفاق ہیں۔" ۹

نواب یار محمد خاں شوکت کو عنفوانِ شباب ہی سے شعر و سخن اور تصنیف و تالیف سے دلچسپی تھی۔ انہیں اردو زبان سے بھی خصوصی لگاؤ تھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تمام تصانیف اردو زبان میں ہیں۔ وہ نظم و نثر دونوں میں یکساں قدرت رکھتے تھے۔ لیکن نظم کے مقابلے نثری تصانیف کی تعداد زیادہ ہے۔ ان کی تصانیف کے متعلق حافظ ممتاز علی حافظ "تذکرہ آثار الشعراء" میں لکھتے ہیں:

" میاں صاحب بڑے ذہین اور متین ہیں اور ہر
فن میں ان کی بہت کتابیں تالیف ہیں۔ روز و
شب تصنیف و تالیف کا چرچا رہتا ہے۔
فارسی اور اردو خوب لکھتے ہیں۔ میرے پاس
نواب شوکت کی حسب ذیل کتابیں موجود ہیں:

۱۔ دیوانِ شوکت اردو ۲۔ گلدستۂ نرگس
۳۔ تذکرہ فرح بخش ۴۔ مراسلات شوکت
۵۔ چار باغ شوکت ۶۔ شہنشاہ نامہ شوکت
۷۔ انشائے نور چشم ۸۔ ہفت خوان شوکت
۹۔ ترانۂ دین شوکت ۱۰۔ باز نامہ
۱۱۔ فرس نامہ ۱۲۔ فیل نامہ "

شعر و سخن اور تصنیف و تالیف کے مشاغل کے علاوہ نواب یار محمد خاں شوکت ان تمام اوصاف اور کمالات سے متصف تھے، جو اس زمانے کے شرفاء اور رئیسوں میں عام تھے۔ وہ فنِ طب، خوش نویسی، شکار،

شہسواری اور سپہ گری میں مہارت رکھتے تھے۔ رقص و سرود کے دلدادہ تھے اور خوش لباسی اور لذیذ کھانوں کے بھی شوقین تھے، لیکن ان کا سب سے محبوب مشغلہ شعر و ادب ہی تھا۔ ۱۸ اگست ۱۹۱۲ء کو بھوپال میں ان کا انتقال ہوا اور یہیں مدفون ہوئے۔

تذکرۂ فرح بخش :

یہ تذکرہ ۲۷ ذی الحجہ ۱۲۸۸ھ میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا۔ اسّی صفحات پر مشتمل یہ مختصر تذکرہ صرف ایک رات میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے اس کا حجم بہت کم ہے۔ اس کا سائز ۲۰×۲۶/۸ ہے جس کے ہر صفحہ پر جلی حروف میں صرف سات سطریں ہیں۔ تذکرہ کے سرورق پہ دائرہ کے اندر "تذکرۂ فرح بخش" لکھا ہے۔ اس کے نیچے ۱۲۸۸ھ درج ہے اور نام کے ارد گرد دائرے میں درج ذیل عبارت لکھی ہے :

"از تالیفات بلبل شاخسار شیریں مقال، قمری
سروِ جوئبار نازک خیالی، صدر نشین شعرا ر
بلند فطرت جناب یار محمد خاں بہادر متخلص بہ
شوکت، گلدستۂ ازہار و مضامیں میں سراپا
نقش یعنی تذکرۂ فرح بخش۔"

یہ تذکرہ چار ابواب میں منقسم ہے۔ ہر باب کا نام گلشن ہے۔ پہلے گلشن میں اُن نو شعرا کا ذکر اور نمونۂ کلام شامل ہے جو تادمِ تحریر "بیت الکمال" بلدۂ بھوپال میں مقیم تھے۔ دوسرے گلشن میں بھوپال میں مدفون چھ متوفی شعرا کا تذکرہ ہے۔ تیسرے گلشن میں اُن پانچ شعرا کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں جو بھوپال میں ملازم رہ چکے تھے۔ چوتھے گلشن میں ہندوستان کے پانچ مشاہیر شعرا کے حالات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس طرح اس مختصر تذکرے میں کُل ۲۵ شعرا کے حالاتِ زندگی اور ان کا انتخابِ کلام شامل ہے۔ ابتدا میں نواب شاہجہاں بیگم تاجور و شیریں فرمانروائے ریاست بھوپال، مولوی محمد جمال الدین خاں گمنام وزیر اعظم اور مدار المہام ریاست بھوپال اور نواب صدیق حسن خاں توفیق شوہر نواب شاہجہاں بیگم کے ذکر کے بعد درج ذیل شعرائے کلام کا تذکرہ اور نمونۂ کلام شامل ہے :- ۱۔ سیّد عزیز حسین عزیز ۲۔ محبّل کشور ۳۔ محمد عسکری ۴۔ محمد عباس رفعت ۵۔ یار محمد خاں شوکت ۶۔ نواب جہانگیر محمد خاں دولہ ۷۔ غلام ضامن کرم ۸۔ حبیب احمد دولت ۹۔ عبد الواحد مسکین ۱۰۔ امداد علی امداد ۱۱۔ سیّد حسین شاہ واصف ۱۲۔ یمین الدین احمد ۱۳۔ عبد العلی تونگر ۱۴۔ کنج بہاری لال خلّت ۱۵۔ نجف علی ۱۶۔ سید واصل علی ۱۷۔ منشی عبد العزیز ۱۸۔ مرزا غالب ۱۹۔ واکر صاحب ۲۰۔ سیّد شریف حسن ۲۱۔ احمد حسن عرشی ۲۲۔ مرزا دبیر لکھنوی۔

تذکرہ فرح بخش کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے :

"فرح بخش دل ہائے ارباب ایمان حمد الٰہی ہے۔
نشاط افزائے قلوب اصحاب ایقان نعت رسالت
پناہی ہے۔"

"تذکرہ فرح بخش" کے سببِ تصنیف پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مصنف (یار محمد خاں شوکت) رقم طراز ہے کہ :

"بعد ازیں بندۂ درگاہ رب العزت یار محمد خاں
شوکت گزارش کرتا ہے مدعائے دل نگارش
کرتا ہے۔ مجھ کو عنفوانِ شباب سے شعر و سخن کا
شوق ہے۔ اقسام و انواعِ کلامِ موزوں سے دل
کو نہایت ذوق ہے۔ پانزدہم ماہ شعبان ۱۲۸۷ھ
بطریق سیر باغِ فرح بخش میں میرا گزر ہوا ملاحظۂ
سبزۂ زار دلکشا و مشاہدۂ آبشار فرحت افزا
سے طبیعت میں راحت کا اثر ہوا بسکہ دل
شاد ہوا یکایک شعر میر یاد ہوا۔

میر نہیں پیر تم کاہلی اللہ رے
نامِ خدا ہو جواں کچھ تو کیا چاہیے

اس شعر کو مکرّر پڑھتا ہوا سرِ شام وارد کاشانہ ہوا۔ بے اختیار دل مائل اشعار عاشقانہ ہوا۔ قرینِ مسرت میں نے کاغذ اور قلم دان طلب کیا۔ بیاض سے اشعار بعض شعرای نازک خیال حال کو منتخب کیا۔ ایک شب میں یہ تذکرہ تحریر ہوا۔ صفحہ کاغذ رشکِ گلشن کشمیر ہوا۔ فرح بخش اس رسالے کا نام ہوا۔" ۱۳

"تذکرہ فرح بخش" کی عبارت قافیہ دار ہے۔ جس کے مطالعہ سے اس مخصوص طرزِ تحریر کا اندازہ ہوتا ہے جو اس وقت رائج تھی۔ اور جس میں فارسی الفاظ کا استعمال بکثرت کیا جاتا تھا۔ بطور نمونہ تذکرہ فرح بخش کے حصۂ آخر کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے :

"خاتمۃ الطبع حمد اوس باغبان حقیقی کو کہ جس
نے حدیقۂ عالم کو گلہائے الوان سے آراستہ
فرمایا اور نعت اوس گلشن آرای تحقیق کو جس
نے گلدستہ بندی ریاحین ہدایت سے خارستانِ
جہل کو گلستان بنایا۔" ۱۴

"تذکرۂ فرح بخش" میں شامل، بھوپال کے معروف شعرا کے چند

اشعار پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ اس زمانے کے شعراء کا طرزِ کلام اور انداز فکر کا اندازہ لگایا جا سکے ؎

خالق ہے خدای محمود شام ہمارا — مشہور ادمی نے یہ کیا نام ہمارا
دنیا میں بڑا شور رہے شکر سخنی کا — شیریں جو تخلص میں ہوا نام ہمارا
(نواب شاہجہاں بیگم شیریں)

میں ہوں اور ہو وہ پری دریا و ساغر چاندنی
یوں ہمیں تختِ سلیماں سے ہے بہتر چاندنی
چھٹ گئی مہتاب روی بدر پر گمنام صاف
دیکھیے کو بام پر آیا جو دلبر چاندنی
(منشی محمد جمال الدین خاں گمنام مدار المہام
ریاست بھوپال)

کچھ نہیں نام خدا پروای سیم و زر نہیں
خاک کوی یار کیا اکسیر سے بہتر نہیں
(منشی جوگل کشور)

روئے زیبائے تو نجم سحری — والۂ حسن تو صد حور و پری

نغمۂ چنگ و رباب و دف نے — بن ترے مرثیہ خوانی سمجھا
(محمد عباس رفعت شروانی)

مست ہر شخص اپنے رنگ میں ہے — شیخ تسبیح رند بنگ میں ہے
وہ بھی کچھ کم نہیں ہے ہر سمت سے — نشۂ زر کی جو ترنگ میں ہے
نہیں جاتی کدورت خاطر — حیف آئینہ اپنا زنگ میں ہے
خوب کہتے ہو شعراے شوکت — طرز تازہ تمہارے ڈھنگ میں ہے
(نواب یار محمد خاں شوکت)

سوزِ دروں سے آہ نہ گھٹ گھٹ جلا کرو
دولہ کبھی تو سانس بھی ٹھنڈی بھرا کرو

دام میں پھر زلفِ پیچاں کے پھنسایا آپ نے
آہ کیا روزِ سیہ ہم کو دکھایا آپ نے
(نواب جہانگیر محمد خاں دولہ)

تو کجا می نگری حالِ پریشاں حالاں
ورنہ سودائی زلفت لشرے نیست کہ نیست
(منشی کنج بہاری لال غلت)

"تذکرہ فرح بخش" کے آخر میں منشی گوبند پرشاد فضا کا درج ذیل قطعۂ تاریخ تحریر ہے : ؎

طبع شد رنگین کتاب شوکتِ والا تبار
ہست پاکیزہ کلامِ شاعرانِ خوش بیان
بہر سال انطباعش چوں فضا فکرے نمود
در سنِ ہجری رقم کردہ فرح بخش زمان
۱۲۸۸ ھ

بلاشبہ "تذکرۂ فرح بخش" مختصر ہے، اس لیے شاعر کے حالات اور اندازِ کلام سے بخوبی واقفیت حاصل نہیں ہوتی اور نہ ہی کلام کی قدر و قیمت اور شاعر کے مقام و مرتبے کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ کیوں کہ بھوپال کا پہلا مطبوعہ اردو تذکرہ ہے، اس وجہ سے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

حواشی

۱۔ تذکرہ فرح بخش ص : ۲۸
۲۔ بحوالہ "اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ"، از : سلیم حامد رضوی ص ۲۰۵
۳۔ "بھوپال اور غالب" ص : ۳۵
۴۔ تذکرہ فرح بخش ص : ٦٦
۵۔ ریاست بھوپال کی بیشتر قدیم کتابوں میں بھوپال کے ساتھ "دارالاقبال" لکھا ہوا ملتا ہے۔ لیکن تذکرہ فرح بخش سے پہلی بار یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کے ساتھ "بیت الکمال" کا لفظ بھی استعمال ہوتا تھا۔
٦۔ تذکرہ فرح بخش ص : ۲ تا ۵
۷۔ " " " ص : ۷۸

کشمیری لال ذاکر

پندرھویں قسط

یہ صبح زندہ رہے گی

جب ہماری گاڑی اسلام آباد کی حدوں میں داخل ہوئی تو طبیعت خوش ہو گئی۔

کیا بانکا شہر تھا۔ چنڈی گڑھ نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ جوں جوں ڑی اسلام آباد کے شہر کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے یہ احساس ہوتا جا رہا تھا کہ اسلام آباد اور چنڈی گڑھ دونوں شہروں کا تاریخی پس منظر ایک ہی ہے۔ دونوں شہر نئے آباد ہوئے تھے۔ دونوں کے تعمیر کے ڈیزائن اور انداز ایک دم ماڈرن تھے۔ دونوں شہروں کی اپنی آبائی آبادی کوئی نہیں تھی۔ باہر سے آئے ہوئے لوگوں نے ہی انہیں آباد کیا تھا۔ دونوں شہر سرکاری لوگوں کے شہر تھے۔ لیکن دونوں شہروں میں اتنی مطابقت کے باوجود ایک فرق بھی تھا، وہ تھا ان کا جغرافیائی ماحول۔ اسلام آباد مرگلا کی پہاڑیوں سے تین طرف سے گھرا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے یہ شہر زیادہ جاذب نظر اور دل کش نظر آتا تھا۔ چنڈی گڑھ میں یہ کمی تھی۔ میں کار کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا اور سڑک کے دونوں طرف کے نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسلام آباد کا یہ میرا پہلا سفر تھا۔

لیکن ایک بات جس کی طرف میں نے چنڈی گڑھ کے بارے میں لکھے اپنے تازہ ناول "میرا شہر ادھورا سا" میں اشارہ کیا تھا، وہ اسلام آباد پر صادق آتی تھی۔ اس الٹرا ماڈرن شہر کا بھی جسم بڑا دل کش اور خوب صورت تھا۔ لیکن چنڈی گڑھ کی طرح یہاں بھی صرف پیارا اور نکھرا ہوا بدن تھا۔ اس میں آتما نہیں تھی اور آتما کے بنا تو وجود کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ مختلف سڑکوں سے گزرتی ہوئی جب ہماری گاڑی مکان ۸۔ اسٹریٹ ۴۲ — ۱/ ۸/ الف کے گیٹ کے اندر داخل ہوئی تو دوپہر ہو رہی تھی۔ مختار علی خاں پرتو روہیلہ اپنے چہرے پر دوستی اور محبت کا نور بکھرائے جب ہمارے خیر مقدم کو باہر نکلا تو مجھے لگا کہ میں ایک بھرپور شخصیت سے مل رہا تھا۔ پرتو روہیلہ سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ مگر میں اسے پہلی ملاقات ہی تصور کرتا ہوں۔ حالانکہ دو برس پہلے انڈو پاک مشاعرے میں اس سے مل چکا تھا۔ جب وہ اپنی بیگم کے ساتھ مشاعرہ میں شرکت کے لیے انبالہ آیا تھا۔ وہ ایک رسمی سی مختصر ملاقات تھی۔ اس سے اگلے روز ہم نے پاکستان سے آئے سبھی شاعر دوستوں کو چنڈی گڑھ میں ان کے اعزاز میں منعقد کئے جانے والے ایک مشاعرہ میں مدعو کر رکھا تھا۔ لیکن پرتو روہیلہ اس میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔ کیوں کہ اسے دہلی جانا تھا۔ بہرحال اس مختصر سی ملاقات کا تاثر بہت اچھا تھا اور اس کے بارے میں ملہوترہ سے بعد میں ملاقات بھی ہوتی رہی تھی۔

گھر میں صرف تین افراد تھے۔

پرتو روہیلہ، اس کی بیگم اور ان کا بیٹا علی۔

بیگم روہیلہ کے بارے میں مجھے ملہوترہ نے بتایا کہ وہ صوبہ سرحد کے سابق وزیر اعلیٰ عبدالقیوم صاحب کی پوتی تھی۔ اس کا لہجہ بھی سرحدی لہجہ تھا۔ پرتو روہیلہ کا وطن بریلی ہے۔ بریلی کے جیالوں نے جنگِ آزادی میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ آزادی کی تڑپ پرتو روہیلہ کے ہاں بھی موجود ہے۔ شاید اسی لیے وہ آزادیٔ گفتار کا عاشق ہے۔ لگتا تھا نیگی کی علی سے پہلے سے ہی دوستی تھی۔ کیوں کہ کھانے کے بعد ہی علی، نیگی کو اور گرپال کو گھمانے لے گیا۔ اور ملہوترہ اور میں پرتو روہیلہ سے گپ شپ کرتے رہے۔ گفتگو کا موضوع انتخابات ہی تھا۔ ۱۶ نومبر ہی کا دن تھا وہ۔ ووٹ ڈالے جا رہے تھے۔ کہیں کوئی ہنگامہ نہیں تھا۔ بڑے

ملوں کی فضا تھی۔ نظر یہی آتا تھا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کی طرف لوگوں کا رجحان زیادہ تھا۔ اسی دن (۱۶ر نومبر ۱۹۸۸ء) کے روزنامہ "جنگ" کے پہلے صفحہ پر محمد علی جناح کی اہلِ پاکستان کے لیے ایک ہدایت کا اقتباس چھپا تھا۔ جانے یہ ہدایت کب کی تھی۔

"مسلمانوں کو میرا مشورہ یہ ہے کہ
لیڈروں کے انتخاب میں وہ ہمیشہ
احتیاط کریں۔ آدھی جنگ تو
لیڈروں کے صحیح انتخاب ہی سے
فتح ہو جاتی ہے۔ . . ."

کتنی سچی بات کہی تھی قائدِ اعظم نے۔

اسی دن قومی اسمبلی کی ۲۰۷ مسلم اور ۱۰ غیر مسلم نشستوں کے لیے انتخابات ہو رہے تھے۔ فیض آباد اور سوات کے حلقوں سے کھڑے دو اُمیدواروں کی موت کے بعد اب صرف ۲۰۵ سیٹیں رہ گئی تھیں۔ اس کا فیصلہ تو اب صرف عوام ہی کو کرنا تھا کہ کیا واقعی وہ اپنے لیڈروں کے انتخاب میں احتیاط برت رہے تھے اور کیا جب بھی کسی ملک میں انتخابات ہوتے ہیں لوگ اپنے لیڈروں کا صحیح انتخاب کرتے ہیں؟

یہ ایک بہت بڑا سوال ہے، جس کا جواب صرف عوام ہی کے پاس ہے اور دنیا کی تاریخ اس کی گواہ ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عوام اب اپنی ذمہ داری کی اہمیت کو سمجھنے لگے ہیں۔ اب وہ رائے دیتے وقت کسی حد تک اس بات کا خیال کرنے لگے ہیں کہ کون سا اُمیدوار ان کے ووٹ کا مستحق ہے۔

علی، تیگی اور گوپال جلدی واپس آگئے۔ ان کے آنے پر ملہوترہ نے کہا۔

"گوپال تمہیں یاد نہیں تھا کہ پولیس اسٹیشن پر آمد کی اطلاع دینی ضروری ہے۔"

"پولیس اسٹیشن قریب ہی ہے۔ میں ٹیلی فون کر دیتا ہوں۔ آپ جائیے۔ پرتو روہیلہ نے بات کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔

گوپال اور میں مرگلا پولیس اسٹیشن گئے۔ وہاں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی۔ پولیس والوں نے ہمیں جلدی فارغ کر دیا۔ اس کے بعد گوپال اور میں اس علاقے کے چھوٹے سے بازار میں گھومتے رہے۔ اور پھر واپس آ گئے۔

گھر واپس آئے تو بیگم روہیلہ نے بڑی پُر تکلّف قسم کی چائے پلائی۔ پھر پرتو روہیلہ اور میں اُس پروجیکٹ کے بارے میں تفصیل سے باتیں کرتے رہے جو میرے پیشِ نظر تھا اور جس کے لیے میں پاکستان آیا تھا۔ پرتو روہیلہ نے مجھے بڑے مفید مشورے دیے۔ اُس نے میری فہرست کے ایک ایک نام کو دیکھا اور اپنی رائے دی۔ یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ اس پروجیکٹ کی تکمیل میں مجھے پورا تعاون دے گا۔ اس نے سعادت سعید کی تعریف کی اور کہا کہ وہ اس پروجیکٹ کا ابتدائی کام اچھی طرح کرے گا۔

"اسلام آباد کے ادیبوں اور شاعروں سے کیسے ملا جا سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"انتخابات کی وجہ سے سرکاری دفتر بند ہیں۔ اس لیے دفتروں سے وابستہ شاعر اور ادیب تو مل نہیں سکیں گے۔ کچھ کی تو شاید الیکشن ڈیوٹی بھی ہو۔"

"تو کیسے کیا جائے؟"

"میں زیادہ سے زیادہ دوستوں سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کرتا ہوں۔ کل شام ہمیں بلا لیتا ہوں سب کو۔ آپ کے نام پر تو سبھی آ جائیں گے۔"

"کیا کہا جا سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ مجھ پر چھوڑیے۔ کوشش کروں گا کہ کرنل شفیق الرحمٰن اور سلطان رشک بھی راولپنڈی سے آ جائیں۔"

"میں شفیق الرحمان کا فین ہوں۔ انہیں ضرور کانٹیکٹ کیجیے۔

"انشاء اللہ سبھی سے رابطہ قائم کرتا ہوں۔"

جب یہ رسمی باتیں ہو چکیں تو میں نے پرتو روہیلہ سے کچھ سنانے کو کہا۔ اس نے ٹال مٹول کرنے کی کوشش تو کی، لیکن پھر مان گیا۔ اس کے کچھ اشعار تو واقعی بہت اچھے تھے۔ آپ بھی سن لیجیے۔ لیکن پرتو روہیلہ کو دوہے کہنے پر بڑی دسترس حاصل ہے۔ دوہوں کا رنگ رُوپ بھی ملاحظہ کیجیے۔

پھر سفر در پیش ہے پرتو کھُلے دریاؤں کا
ساحلوں پر دُور ہوتی بستیاں رہ جائیں گی

غم اٹھایا ہے ترے پیار میں کتنا کتنا
سانحہ جان پہ گزرا ہے تو کیسا کیسا
وقت کی شام پہ بھیگا ہوا کپڑا ہوں میں
جس سے ٹپکے ہے مری جان کا قطرہ قطرہ

اہلِ سخن میں اپنا پرتو نام رہے گا عرصے تک
ایک غزل کی خاطر ہم نے جیتی بازی ہاری ہے

اشعار پڑھ لیے اب ذرا دوہے بھی پڑھیے:

جیون ایک کنواں ہے جس میں گر کے بس ستائے
دُکھ کی ناگن اس میں لوٹے اس کی مٹی چاٹے

وہ دن میں نا دیکھوں اُس دن مجھ کو رام اُٹھا لے
میرے گھر کے کتّے کو ہمسایہ روٹی ڈالے

تیری پریت نے من میں میرے ایسے گھاؤ بنائے
دھیرے دھیرے لکڑی کو جیسے دیمک کھائے

من کا بالک گھبراوے ہے کیسے ہاتھ بڑھائے
مکھن کے پیڑے پر بیٹھا بھونرا موج اُڑائے

گوری تیرا جوبن من میں ایسی جوت جگائے
پھول کنول پہ تتلی بیٹھی دھوپ میں پر پھیلائے

پرتو روہیلہ کا بیٹا علی انتخابات کے بارے میں بڑا جذباتی تھا۔ وہ تو شام سے ہی ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھ گیا تھا اور انتخابات پر تبصرے کر رہا تھا۔ کچھ دیر تو ہم سب اس کے ساتھ بیٹھے رہے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے عوام ملک کی تاریخ کا جو باب اب لکھنے جا رہے تھے، اس میں ہم بھی شریک تھے۔ کیوں کہ یہ ایک ایسا باب تھا، جس کا آغاز عوام کو جمہوری حق دینے سے شروع کیا جانے والا تھا۔ اس باب میں کہیں یہ بھی لکھا جانے والا تھا کہ پاکستان کے عوام اپنے پڑوسی ملک ہندوستان سے دوستی کے رشتے کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ اسی میں دونوں ملکوں کے حسین مستقبل کے نقوش پنہاں تھے۔

رات سونے سے پہلے یہ طے ہوا کہ پرتو روہیلہ اگلے دن صبح سویرے ادیب، شاعر اور نقاد دوستوں سے رابطہ کرے گا اور ہم لوگ جہاں چاہیں دوپہر تک گھوم پھر لیں۔ شام کی محفل کے بعد سارے مہمان کھانا کھا کر ہی جائیں گے۔ لگتا تھا بیگم روہیلہ آنے والی شام کو یادگار بنانا چاہتی تھیں۔

علی شاید بہت جلدی جاگ گیا تھا۔ اور ٹیلی ویژن پر انتخابات کے بارے میں دی جانے والی اطلاعات کو سنتا اور انہیں نوٹ کرتا رہا تھا۔ کیوں کہ جب ہم لوگ جاگے اس وقت تک اس کے پاس بہت سی اطلاعات جمع ہو چکی تھیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کا پلڑا بھاری نظر آتا تھا۔ پرتو روہیلہ صبح سے ٹیلی فون گھمائے جا رہا تھا۔ اور دوستوں سے شام کی محفل کے بارے میں رابطہ قائم کرنے میں لگا تھا۔

ملہوترہ ناشتے کے بعد ہندوستان کے ہائی کمشنر ایس۔ کے۔ سنگھ صاحب سے ملنے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ نیگی بھی اس کے ساتھ رہے گا۔

یہ طے ہوا کہ گوپال اور میں راولپنڈی ہو آئیں۔ وہاں رائل ہوٹل میں امداد ہمدانی گیارہ بجے ہمیں ملنے آ رہا تھا۔

راولپنڈی اسلام آباد سے اتنا قریب ہے کہ دونوں شہروں کی حدیں کب اور کہاں ایک دوسرے میں تحلیل ہو جاتی ہیں اس کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

راولپنڈی کے اُن علاقوں میں کچھ دیر گھومتا رہا، تقسیم سے پہلے جن علاقوں سے میرا تعلق رہا تھا۔ میرا چھوٹا بھائی پرکاش جن دنوں چک لالہ میں سروس کرتا تھا، تو وہ پنڈی ہی میں رہا کرتا تھا۔ ایک بار میں اور ہری سنگھ ہردیش ایک شادی کے سلسلے میں جموں سے پنڈی آئے تھے اور یہاں سے ٹیکسلا گئے تھے۔ اُن دنوں میں نے ٹیکسلا کے کھنڈرات پہلی بار دیکھے تھے۔ بہت دنوں تک اُس صدیوں پرانے شہر اور اس کی تہذیب و تمدن کا تاثر رہا تھا میرے ذہن پر اور میں نے واپس جموں آکر "فردوس" کے لیے ٹیکسلا پر ایک مضمون بھی لکھا تھا۔ "فردوس" بزم ادب جموں کا ادبی ماہنامہ تھا، جسے ایڈٹ کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی تھی۔ "فردوس" کو ان دنوں بہت سے نامور شاعروں اور ادیبوں کا قلمی تعاون حاصل تھا، جن میں جعفر علی خاں اثر لکھنوی، امین حزیں سیالکوٹی، اثر صہبائی، روش صدیقی، احسان دانش، قمر جلال آبادی، محمد عمر، نرسنگھ داس نرگس، لالہ ملک راج صراف، حفیظ جالندھری کے نام مجھے یاد ہیں۔

"بزم ادب" کے زیر اہتمام اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے، جن میں ہندوستان کے مختلف شہروں سے شعرا تشریف لاتے تھے اور سننے والوں کو اپنے کلام سے محظوظ کرتے تھے۔ ان دنوں جموں سے لاہور تک نندہ بس سروس کی بسیں چلتی تھیں اور ہم لوگ اکثر ان بسوں سے لاہور جایا کرتے تھے۔

میں جب راولپنڈی کے کچھ علاقوں میں گھوم رہا تھا تو مجھے لگ رہا تھا کہ کئی چہرے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر میرا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے تھے اور مجھ سے ہم کلام ہوتے تھے۔ مجھے دعائیں دیتے تھے اور پوچھتے تھے کہ اب اس طرف میں کب آؤں گا؟

"پھر کب آئیں گے اِدھر؟" میں پنجابی محلے میں اُس گھر کے سامنے کھڑا تھا، جہاں میرے بہنوئی رائے زادہ سوہن لال بالی رہا کرتے تھے۔

کون کر رہا تھا مجھ سے یہ سوال۔ شاید یہ سوال اس گھر کی بڑی سی ڈیوڑھی نے کیا تھا، جو بند تھی اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اتنے سالوں میں۔ وہ ان دنوں اکثر بند ہی رہا کرتی تھی اور میری بہن اس وقت اس ڈیوڑھی کو کھولتی تھی جب کوئی اس کی سانکل بجاتا تھا — ان دنوں کال بیل کا رواج نہیں تھا۔ صرف سانکلیں ہی بجائی جاتی تھیں ڈیوڑھیوں پر۔ شاید آج بھی اس گھر میں میری کوئی اور بہن اپنے بچوں سمیت رہ رہی تھی۔ اور اپنے شوہر کے باہر جانے کے بعد ڈیوڑھی بند کر لیتی تھی۔ میں ڈیوڑھی کے اس سوال پر چونک پڑا تھا۔

"جب آپ بلائیں گی۔" میں نے جواب دیا تھا۔

"کس سے بات کر رہے ہیں ذاکر صاحب؟" گوپال نے پوچھا تھا۔

"بند ڈیوڑھی سے۔ یہ کرب ہم کلامی ہے۔ تم نہیں سمجھو گے۔"

"شاید نہیں۔" گوپال نے کہا تھا۔

اور میرے جی میں آیا کہ ایک بار بند ڈیوڑھی کی زنجیر بجا کر دیکھوں۔ شاید کوئی ڈیوڑھی کھول دے۔ لیکن گوپال میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے آگے دھکیل لے گیا۔ میں نے ایک بار حسرت بھری نظروں سے بند ڈیوڑھی کو دیکھا۔

اور پھر دھیرے دھیرے مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔ چند ہی قدم اُٹھائے تھے کہ بند ڈیوڑھی میرا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ بڑی شفقت اور نرمی سے بولی۔

"اب بڑے ہو گئے ہو۔ پرانی باتیں یاد نہیں رہیں ؟"

"پرانے غموں میں جب نئے غم شامل ہو جاتے ہیں تو کچھ نہ کچھ تو بھول ہی جاتا ہے۔"

"میں ایک واقعہ یاد کرا رہی ہوں۔"

"کون سا واقعہ ؟"

"آپ کی بیٹی کا۔ کیا نام ہے اس کا ؟"

"کملیش !"

"نہیں۔ پیار سے اس کی دادی اُسے کچھ اور کہتی تھی۔"

"بھولاں۔" میں نے کہا۔

"ہاں، اب یاد آیا۔"

"آپ کے بھائی کا نام کیا ہے جو یہاں اپنی بہن کے پاس رہتا تھا ؟"

"پرکاش !"

"ہاں۔ کہاں ہے وہ ان دنوں ؟"

"دہلی میں کام کرتا ہے۔ اب تو پوتوں دوہتیوں والا ہو گیا ہے۔"

میری بات سن کر بند ڈیوڑھی مسکرائی۔

"وہ ایک بار اپنی ماں اور آپ کی بیٹی بھولاں کو ساتھ لے کر آیا تھا کچھ دنوں کے لیے۔ یاد آگیا وہ واقعہ ؟"

"یاد آگیا۔ بھولاں تو اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ ابھی تو اس نے اسکول جانا بھی شروع نہیں کیا تھا۔ اب تو یونیورسٹی میں پڑھاتی ہے۔ بہت سی کتابیں لکھ ڈالی ہیں اُس نے۔"

"آپ نے اُسے بھی بگاڑ دیا ہے ؟"

"نہیں وہ بگاڑنے والی کتابیں نہیں لکھتی۔ نہ شعر لکھتی ہے نہ کہانیاں لکھتی ہے۔"

"تو کیا لکھتی ہے ؟"

"تاریخ کی کتابیں۔"

"واپس جا کر اس سے کہنا وہ اس ڈیوڑھی کی بھی تاریخ لکھے۔ جس کی دہلیز پر کھڑے ہو کر وہ روز کھلونے بیچنے والوں کو پکارا کرتی تھی۔"

"ضرور کہوں گا۔"

اور پھر بند ڈیوڑھی سڑک کے ایک طرف کھڑی ہو گئی اور میں اس واقعے کو یاد کرنے لگا جس کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔

پرکاش، میرا بھائی، ماں کو کچھ دنوں کے لیے جموں سے راولپنڈی لے آیا تھا۔ اس کی نئی نئی سروس لگی تھی اور گھر سے پہلی بار باہر گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ اُداس ہو گیا تھا۔ میری بیٹی کو ماں پیار سے بھولاں کہتی تھی اور وہ بھی اپنی دادی سے کسی بھی سمے الگ نہیں ہوتی تھی بلکہ رات کو بھی دادی کے پاس ہی سوتی تھی۔ جب ماں پرکاش کے ساتھ راولپنڈی جانے کو تیار ہوئی تو بھولاں نے بھی ساتھ جانے کی ضد کی۔ اس پر نہ ماں کو اعتراض تھا نہ پرکاش کو۔ جب میں ان سب کو ٹرین پر چڑھا کر آیا تو میں ایک دم اُداس ہو گیا۔ ان دنوں جموں توی سے رات کو ٹرین چلا کرتی تھی جو سیدھی راولپنڈی جاتی تھی۔ تقسیم کے بعد ٹرین تو بند ہو گئی لیکن جموں توی کا اسٹیشن اب بھی موجود ہے۔

اور پھر یہ ہوا کہ میری بیٹی بہت سخت بیمار ہو گئی اور ماں اور پرکاش ہسپتال ہی سے جڑ کر رہ گئے۔ کوئی ایک ماہ کی طویل کوششوں کے بعد ڈاکٹروں نے میری بیٹی کو بچا لیا تھا۔ ورنہ اس کا زندہ رہنا معجزے سے کم نہیں تھا۔ جب کوئی چھ ماہ کے بعد پرکاش ماں کو اور میری بیٹی کو چھوڑنے آیا تو اس نے یہ ساری کہانی سنائی۔ ورنہ مجھے تو اس نے اس کے بارے میں ایک سطر بھی نہ لکھی تھی کبھی۔

میری بیٹی کملیش آج بھی میرے بھائی کا بڑا احترام کرتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ پرکاش راولپنڈی کے اس مکان میں اسپتال سے اس کے لیے نئی زندگی لے کر آیا تھا۔ وہ اپنے چچا کو ایک نئی زندگی کی علامت سمجھتی ہے۔

جب مجھے یہ واقعہ یاد آگیا تو بند ڈیوڑھی سڑک سے ایک بار چل کر پھر میرے قریب آگئی اور بولی۔

"اپنی بیٹی کو میری طرف سے بہت دعائیں دیجیے گا۔ واپس جا کر۔"

"ضرور دوں گا۔" میں نے مسکرا کر کہا اور بند ڈیوڑھی تیز قدم اُٹھائے پھر اپنی جگہ پر چلی گئی اور کسی سائکل کے بجنے کا انتظار کرنے لگی۔

گوپال سے راستے میں میری کوئی بات نہیں ہوئی۔ جب ہم رائل ہوٹل پہنچے تو امداد ہمدانی چائے پی رہا تھا۔ ہم نے بھی اپنے لیے چائے منگوائی اور ٹی وی کا پروگرام دیکھنے لگے۔ پروگرام کے بیچ میں رک رک کر انتخابات کی خبریں بھی سنائی جا رہی تھیں۔ انتخابات کے تجزیے سے تو یہی اندازہ لگ رہا تھا کہ پاکستان پیپلز پارٹی بہت سے حلقوں میں آگے تھی۔

پروگرام میں ایک عوامی فن کار تانگے میں بیٹھا گا رہا تھا۔

وسّا دیں لاہور دا ہووے تے بھاویں جھنگ دا
تانگے والا خیر منگدا

کتنی خوبصورت بات کہی تھی اس عوامی فن کار نے۔ مجھے اب اس کا نام یاد نہیں۔ لیکن جو پیغام وہ دے رہا تھا وہ مجھے بخوبی یاد ہے۔ فن کار تو سب کی خیر ہی مانگتا ہے۔ سب کے لیے خدا کی برکتیں چاہتا ہے اور ہر در کے لیے تحفظ اور بقا کی آرزو کرتا ہے۔ ہم چائے پی رہے تھے کہ طاہرہ اور نسگی بھی آگئے۔

اور پھر ہم بازار کی طرف نکل گئے شاپنگ کے لیے۔ میں نے اپنے لیے ایک جیکٹ خریدی۔ ایسی ہی جیکٹ علی کے پاس بھی تھی اور مجھے وہ بہت پیاری لگی تھی۔ لنچ تک ہم اسلام آباد واپس آگئے۔

[جاری ہے]

مسدود راہیں

ساجدہ زیدی

چلیں — کوئی سمت ایسی ڈھونڈیں
کہ جس کے گہرے گھنے اندھیروں میں
کھو کبھی جائیں......
تو چشم بینا سے دیکھ پائیں

قدم بڑھائیں —
تو گوشہ در گوشہ،
کنج در کنج.....
ایسی مدہوش کُن نئی رہگذاریں آئیں
جو ہر قدم کو سفر بتائیں

جہاں اندھیروں کی کوکھ سے
آفتاب کی خیرہ کُن شعاعیں
زمیں کے چہرے،
زماں کے اسرار سے،
وہ پردے سبھی ہٹائیں
جنہوں نے ذہن و دل و نظر کی
تمام لرزش کو —
کم سوادی کے،
کم نگاہی کے،
سرد مہری کے،
تنگ و تاریک زنداں خانوں میں کھو دیا ہے -

چلیں کوئی سمت ایسی ڈھونڈیں....
جہاں — اگر چشمِ شوق وا ہو.....
تو سب مناظر — تمام ماحول
بہ شکل آئینہ
پرتوِ حسن و آشتی عکس نورِ حق ہوں —

تمام مسدود راستے وا کریں،
تمازتِ جسم و جاں کی،
چلیں کوئی سمت ایسی ڈھونڈیں...
جو سب فصیلوں کو توڑ دے،
جس سے ایسی راہیں ہزار نکلیں،
جہاں پہ نیرنگیٔ عمل — مشعلِ نظر ہو،
خلوصِ جاں زادِ راہ ہو
رمزِ خودگری جادۂ سفر ہو
یہ سمت شاید یہیں کہیں ہے
کہ دل کے گوشوں سے
ایک بے باک روشنی چھن کے آ رہی ہے

گلبرگ، دودپور، سول لائنز، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ (یوپی)

غزلیں

مخمور سعیدی

سجائے ہیں مہ و خورشید، صبح و شام اُس نے
مرے لیے ہی کیا ہے یہ اہتمام اُس نے

یہ کس کو سونپ رکھا ہے سب انتظام اُس نے
یہ کائنات تو لکھ دی تھی میرے نام اُس نے

مجھی کو لفظ و دلیعت کیے، زباں بخشی
مجھی سے توڑ لیا رشتۂ کلام اُس نے

بہت دنوں میں خود اپنے کو میں نے پہچانا
بہت دنوں میں لیا آج میرا نام اُس نے

فسانہ گو تھا مگر کس قدر تھا عجلت میں
بس ایک لفظ میں کی داستاں تمام اُس نے

اسی خیال میں آگے نکل گیا مجھ سے
سمجھ لیا تھا بہت مجھ کو تیز گام اُس نے

وہ مے کشی جو مری زندگی تھی اے مخمورؔ
رکھا ہے مجھ کو ہمیشہ ہی تلخ کام اُس نے

طرب کی اجنبی راہوں سے آخر لوٹ آئے ہیں
دلِ مانوسِ غم! ہم تیری خاطر لوٹ آئے ہیں

بچھڑ کر ترے قافلے تنہائیوں کے دیدہ و دل میں
پھر اپنے آشیانوں میں یہ طائر لوٹ آئے ہیں

ابھی تو جگمگاتی منزلیں تھیں منتظر ان کی
اندھیرے راستوں پر کیوں مسافر لوٹ آئے ہیں

نظر جن سے بچا کر پھر گزر جانا پڑے شاید
نظر کے سامنے یہ کیا مناظر لوٹ آئے ہیں

وہیں اب بھی ترا پتا پاؤ گے، ہم کو جہاں ڈھونڈو گے
ہم اپنی قتل گاہوں سے بظاہر لوٹ آئے ہیں

عبث خیمے لگائے تھے سُلگتے ریگ زاروں میں
ٹھہر سکنے پہ تھے کب لوگ قادر، لوٹ آئے ہیں

ہمارے شہر پھر مخمورؔ جنگل بنتے جاتے ہیں
بدل کر بھیس پھر چنگیز و نادر لوٹ آئے ہیں

چاند بھی، پھول بھی، ستارا بھی
ایسا اِک خواب تھا ہمارا بھی

شبنم و گُل کا استعارا بھی
مگر اُس کا بدن شرارا بھی

اُس سے کہنا تو تھا، جو کہہ نہ سکے
اُس سے ملنا تو تھا دوبارا بھی!

تم، کہ مقروض لمحے لمحے کے
کسی لمحے کا قرض اُتارا بھی؟

بہہ گئے راستے کے شور میں ہم
اُس نے رک کر ہمیں پکارا بھی

گُل کرو انتظار کی شمعیں
بجھ گیا صبح کا ستارا بھی

تھی عجب قیدِ جسم و جاں مخمورؔ
ناگوارا بھی، کچھ گوارا بھی

C-10، ڈی ڈی اے فلیٹس، ماتا سندری روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

غزلیں





ظفر گورکھپوری

روشنی ، پرچھائیں ، پیکر آخری
دیکھ لوں جی بھر کے منظر آخری

میں ہوا کے جھکڑوں کے درمیاں
اور تن پہ ایک چادر آخری

ضرب اک ٹھہرے ہوئے پانی پہ اور
جاتے جاتے پھینک کنکر آخری

دونوں مجرم آئینے کے سامنے
پہلا پتھر ہو کہ پتھر آخری

ٹوٹتی اک دن لہو کی خامشی
دیکھ لیتے ہم بھی محشر آخری

یہ بھی ٹوٹا تو کہاں جائیں گے ہم
اک تصور ہی تو ہے گھر آخری

دل مسلسل زخم چاہے ہے ظفر
اور اس کے پاس پتھر آخری

خرابہ جاں کا روشن تھا بہت ، برنائی کس کی تھی
نہیں معلوم مجھ میں انجمن آرائی کس کی تھی

میں اپنے آپ کو یوں دیکھ پاتا کب یہ ممکن تھا؟
یہ سچ ہے آنکھ میری تھی مگر بینائی کس کی تھی

سروں کی بھیڑ پر تو راستوں کے نام لکھے تھے
گلی کے موڑ پر بیٹھی ہوئی تنہائی کس کی تھی

مجھے کانٹوں پہ ساری عمر چلنے میں مزہ آیا
نہیں معلوم میرے پاؤں میں پسپائی کس کی تھی

کسی اک موڑ پر منظر کو ششدر ہونا تھا ویسے بھی
سوال اس کا ہے پس منظر میں وہ انگڑائی کس کی تھی

جہاں اپنے کو بھی پہچاننا دشوار ہو جائے
وہاں تک آگیا میں حوصلہ افزائی کس کی تھی

ظفر مہ جرد تو کوئی نہیں تھا قریۂ جاں میں
تو پھر کانوں میں جو ہر رات آہٹ آئی کس کی تھی؟

اقبال مجیدی

وہ جو شبِ فراق کے مارے تھے ڈر گئے
ہم آفتابِ صبح تھے نکلے ابھر گئے

کیا چیز تھا اے ذوقِ تجلی ترا جمال
ہم ظلمتِ حیات سے ہنس کر گزر گئے

زندانیوں کے خون کا چھڑکاؤ تو نہیں
دیوار و در پہ نقش یہ کیسے ابھر گئے

کس حوصلے سے آئینہ رکھا تھا سامنے
کیا آگیا خیال کہ چہرے اتر گئے

پیچ و خمِ حیات کا مشکل ہے سامنا
گیسو ترے نہیں کہ جو الجھے سنور گئے

کون آگیا تجلیٔ گردوں لیے ہوئے
جیسے زمیں پہ چاند ستارے اتر گئے

پھر پیش رفت کوئی مجیدی نہ کر سکا
دنیا ٹھہر گئی ہے جہاں ہم ٹھہر گئے

اے/۳۰۲ - فلوریڈا ۱- شاستری نگر، اندھیری (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۵۸
آر-۲۷۳ سیکٹر ۱۴ بی، شادمان ٹاؤن، نارتھ کراچی (پاکستان)

غزلیں



مبارک شمیم

یہ حرف حرف غلط ہے کہ دشت جاں تک ہے
سفر ابھی ہمیں در پیش لامکاں تک ہے

ملال گریۂ گُل ہے نہ صرف خوشبو کو
اُداس اُس کے بکھرنے پہ خود خزاں تک ہے

وہی ہوائیں اُکھڑنے کو پھر مچلتی ہیں
کہ جن ہواؤں میں مجبور بادباں تک ہے

تجھے تو ہے یہی زیبا جو تو ہے عرش نشیں
ہمارا نقشِ کفِ پا ابھی لامکاں تک ہے

تمہاری ہم سفری ہو تو بے خودی میں شمیم
چلے چلیں گے حدِ زندگی جہاں تک ہے

محلہ احمد پورہ، شاہ جہاں پور ۲۴۲۰۰۱ (یو۔پی)

سبطین اخگر

ہوں لیکن ہونے کا مطلب کچھ بھی نہیں
تُو جو نہیں تو دنیا میں اب کچھ بھی نہیں

آدھی عُمر اِسی اُمّید پہ کاٹی ہے
صبح اگر ہو جائے تو شب کچھ بھی نہیں

تم نے کہا اور میں نے سُنا، اُس نے جانا
آنکھ سے ہو اقرار تو پھر لب کچھ بھی نہیں

جو مجھے سوجا دو گر کو پہچانے
کھیل نظر کا ہے اور کرتب کچھ بھی نہیں

گھر باہر، جنگل آنگن سب ایک سا ہے
عشق کے ماروں کو حسنِ گرڈھب کچھ بھی نہیں

تم نے کیا پایا شبِ تقسیم سرحد پار میں
ہم نے در پیدا کیا اِک آہنی دیوار میں

اس سے مِلنا اور بچھڑ جانا اگرچہ اتفاق
تجربے سب زندگی کے ہو گئے اک بار میں

اب نہ وہ خوشبو تری آمد میں پھولوں کی طرح
تیرے جانے کی چبھن بھی اب کہاں ہے خار میں

جستجو اُس کو بھی تھی اس لمحۂ تکمیل کی
بے غرض ہم بھی نہ تھے اس کارِ ناہنجار میں

شاعری اِک عزمِ لاحاصل، جنونِ لاصلہ
حمد کیجے یا کہ رہیے شاہ کے دربار میں

محلہ قاضی سہسوان، بدایوں (یوپی)

م ۔ ک ۔ مہتاب

لگتا نہیں ہے دل مرا

اُس نے کان میں آلۂ سماعت کا بٹن اور جیب میں اُس کی بیٹری ڈال رکھی ہوئی ہے ۔ اس کے باوجود اُسے ٹھیک طرح سُنائی نہیں دیتا ۔ کیوں کہ اُسے وہم ہے کہ اُس کے کان ابھی ٹھیک ہیں اور اُس نے یہ آلۂ سماعت تو محض اپنی سماعت کی قوت میں اضافہ کرنے کے لیے لگا رکھا ہے ۔ اسی لیے وہ جیب میں رکھی ڈبیہ کے سیل تبدیل نہیں کرتا جو دن بدن کمزور ہوتے چلے جا رہے تھے ۔

میں نے اُس کا نام ماسٹر بولا (پنجابی میں لفظ بولا بہرہ کے لیے استعمال ہوتا ہے) رکھا ہوا ہے ۔ حالانکہ اُس کا اصل نام ماسٹر پال تھا ۔ لیکن اُسے ماسٹر پال کہلانا بھی پسند نہیں ہے ۔ وہ اپنے آپ کو پروفیسر پال کہلانا چاہتا تھا ۔ وہ تیس برس اسکول ماسٹر رہا تھا اور ایک برس کسی کالج میں لیکچرر ۔ لیکن اُسے اس ایک برس کی ملازمت تیس برس کی اسکول کی ملازمت کی نسبت کہیں زیادہ باعثِ فخر تھی ۔ جو شان پروفیسری کی ہو سکتی ہے وہ ایک غریب اسکول ماسٹر کی کہاں ۔ اسی لیے اگر اُسے ماسٹر پال کہہ کر پکارو تو وہ اُنگلی ہلا کر کہہ دیتا تھا ۔ "نہیں نہیں پروفیسر پال ۔" لہٰذا اس کی دلداری کے لیے اُسے پروفیسر پال کہہ کر ہی پکارنا پڑتا تھا ۔

ماسٹر بولا کے ساتھ میری پہلی ملاقات ان دنوں ہوئی تھی ۔ جب ہم دونوں شہر کی ایک ہی کالونی میں مکان بنوا رہے تھے ۔ آدمی وہ بہت نیک ، نیت اور بھلا مانس تھا ۔ اور مشورے بھی بہت بیش قیمت دیتا تھا لیکن اس کے ساتھ مغزپچی بہت کرنی پڑتی تھی ۔ کیوں کہ وہ ایک ہی بات کو بار بار سنتا تھا ۔

ماسٹر بولا کی اپنے مکان کے ٹھیکیدار سے نہیں بنتی تھی ۔ سردار ٹھیکیدار کو جو خود بھی ایک اچھا معمار اور کاریگر تھا پینے کی عادت تھی ۔ اور ماسٹر پال کو یہ وہم تھا کہ شراب پی کر کام کرنے والے مستری کا بنایا ہوا مکان مقدس یا پوتر نہیں ہو سکتا ۔ اس لیے وہ ہمیشہ اسی لٹوہ میں رہتا تھا کہ کہیں سرجن سنگھ نے پی تو نہیں رکھی ۔ میں نے کئی بار سرجن سنگھ سے کہا تھا کہ کیوں وہ اس بوڑھے کو تنگ کرتا ہے ۔ اگر وہ پی کر کام پر نہ آئے تو اس کا کیا بگڑ جائے گا ۔ لیکن سرجن سنگھ کا کہنا تھا کہ ماسٹر بولا تو پاگل ہے ۔ اگر اُسے اس کڑاکے کی سردی میں کام کرنا پڑے تو نانی یاد آ جائے ۔ دو گھونٹ لگائے بنا ہاتھ ہی نہیں کھلتے ۔ سردار کہہ رہا تھا کہ اس کو پاگل کو کہیں مکان کے پاس شراب کی بوتل کا ڈھکن پڑا مل گیا اور یہ آ کر کہنے لگا ۔ "آج کام بند کر دو ۔ تم نے پی رکھی ہے اس کا ثبوت بوتل کا ڈھکن ہے جو آج کا ہی کھلا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ آپ ہی بتائیے ایسے شخص کے ساتھ کیسے نباہ ہو سکتا ہے ۔"

میں ٹھیکیدار کی بات پر بہت ہنسا ۔ پھر بھی سرجن سنگھ سے کہا کہ ماسٹر بولا بہت نیک ، پرہیزگار اور سیدھا آدمی ہے اس کے دل کو دُکھانے کا گناہ کیوں کرتا ہے ۔ اس کے باوجود مالک مکان اور ٹھیکیدار کا چھوٹا موٹا تنازعہ جاری ہی رہتا تھا ۔

ایک دن ماسٹر پال میرے پاس آیا اور کہنے لگا ۔

"گوپال جی ، آج آپ میرے ساتھ مکان پر چلیے ۔ مستری نے آنا ہے ۔"

"وہاں میں کیا کروں گا ۔ لین دین کا کوئی جھگڑا ہے تو خود ہی نپٹ لو ۔"

"نہیں گوپال جی ! بات یہ ہے کہ سرجن سنگھ بات بات میں مجھے ماں بہن کی غلیظ گالیاں دیتا ہے ۔ آپ وہ سب گالیاں نوٹ کرتے رہنا ۔

۱/۷۸ اے ، پشچم وہار ، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۳

اور بعد میں مجھے بتا دینا۔ جب اگلی بار وہ پیسے لینے آئے گا تو یہ سب گالیاں میں اُسے پڑھ کر سُنا دوں گا اور اس کی خوب چمڑی اُدھیڑوں گا۔ ایک تو میرا مکان ناپاک کر رہا ہے اور دوسرے یہ سمجھ کر کہ مجھے سُنائی نہیں دیتا گالیاں بکتا ہے۔"

میں ماسٹر لوبلا کے ساتھ اُس کے مکان پر گیا۔ لیکن بات چیت شروع ہونے سے پہلے ہی سرجن سنگھ کو بتا دیا کہ میں کس کام سے آیا ہوں۔ سرجن سنگھ نے پی رکھی تھی، لیکن اُس نے بات چیت کے دوران زبان کو گانٹھ لگائے رکھی۔

میں نے ماسٹر پال کو وہ کاغذ دیا جس پہ ماں بہن کی صرف تین گالیاں تھیں۔

"نہیں نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یا تو آپ نے پہلے ہی سرجن سنگھ کو بتا دیا ہے یا اس سے کوئی رشوت لے لی ہے۔"

ماسٹر پال کے شک کرنے پر میں بہت ہنسا۔ لیکن اُسے سمجھانا بہت ہی مشکل تھا۔ دھن کا پکا اور لوہے کی چھڑ کی مانند سیدھا جو جھک نہیں سکتی تھی۔

مکان کی تعمیر کے بعد وہ لوگ ہمارے پڑوس میں ہی آ کر رہنے لگے۔ اُسے جھک جھکا کرنا آتا ہی نہیں تھا۔ اس لیے اس کی نہ اپنی بیوی سے بنتی تھی نہ تینوں لڑکوں سے۔ اُس نے مجھے اپنے گھریلو جھگڑوں میں ثالث بنا رکھا تھا جس سے کبھی کوئی جھگڑا ہو جائے وہ مجھے بلا کر لے جاتا تھا۔ ماسٹر پال کے ساتھ اتنی اونچی آواز میں بات کرنا پڑتی تھی کہ میرے افرادِ خانہ اُکتا گئے تھے کہ میں نے گھر میں کیا شور مچا رکھا ہے۔ لیکن وہ ایک شریف آدمی تھا، جس کا میں معمولی معمولی باتوں کے لیے دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بڑی اُمید کے ساتھ میرے پاس آتا تھا، اس لیے اس کی شکایات سننی ہی پڑتی تھیں۔ وہ ایک ریٹائرڈ شخص تھا وقت کی کوئی پابندی نہیں تھی، لیکن اُس کے آ جانے سے مجھے کئی بار دفتر جانے میں دیر ہو جاتی تھی۔ پھر بھی میں اُس کی پوری بات سُن کر ہی جاتا تھا۔ کیوں کہ دن بھر اس کی باتیں یاد کر کے اور دوسرے لوگوں کو سُنا کر مجھے بہت مزہ آتا تھا۔

ایک دن صبح سویرے ماسٹر لوبلا آیا اور کہنے لگا۔

"گوپال جی، میری بیوی گھر چھوڑ کر جا رہی ہے۔ آپ چل کر اُسے سمجھائیے کہ وہ یہ کیا کر رہی ہے۔ گھر تباہ ہو جائے گا۔"

یہ ہماری واقفیت کا ایک نیا پہلو تھا۔ کسی کے گھر کے معاملات میں دخل دینا کہاں کی شرافت ہے، لیکن مجھے اس کے ساتھ جانا ہی پڑا۔ وہاں جا کر میں نے دیکھا کہ گھر کا کوئی شخص بھی ماسٹر پال کے ساتھ نہیں تھا۔ نہ بیوی اُس کی بات سنتی تھی اور نہ تینوں بیٹے۔ بیوی کے گھر سے جانے کا سبب یہ تھا کہ ماسٹر پال کو جو تعمیر مکان کے بعد تنگ دستی محسوس کر رہا تھا۔ یہ شک تھا کہ اس کی بیوی ساوتری گھر کے اخراجات میں سے کچھ پیسہ بچا کر اپنے بھائی کے بچوں کو بھیجا کرتی ہے اور بات بات میں اپنے بیٹوں کی طرفداری کرتی ہے۔ اُسے مخبوط الحواس سمجھتی ہے۔ بیٹوں کو ماسٹر پال سے یہ شکایت تھی کہ وہ ہر بات میں اُن کی والدہ کی بے عزتی کرتا تھا۔ غلیظ گالیاں دیتا تھا۔ یہاں تک کہ اُسے پیٹنے پر بھی تل جاتا تھا۔ وہ اپنی والدہ کی اتنی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا اُنھوں نے والدہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ بے شک اپنے بھائی کے پاس چلی جائے۔

وہ سب قریب دو گھنٹے ایک دوسرے کے خلاف بولتے رہے اور ماضی کے تمام گندے کپڑے بکھیر کر میرا وقت خراب کرتے رہے۔ تب کہیں جا کر یہ قضیہ ختم ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ ساوتری اچھی بھلی، نیک اور پارسا قسم کی عورت تھی۔ لیکن ماسٹر ہی لڑاکا اور جھگڑالو قسم کا آدمی تھا۔ اُسے یہ خدشہ رہتا تھا کہ کہیں ماں اور بیٹے مل کر اس کے خلاف کوئی سازش نہ کر رہے ہوں۔ وہ اُن کے کہنے پر کسی کاغذ پر دستخط بھی نہیں کرتا تھا۔ تاکہ وہ اس سے اس کی مرضی کے خلاف کوئی وصیت نہ لکھوا لیں۔ اُسے یہ بھی ڈر رہتا تھا کہ چونکہ اُسے اونچا سُنائی دیتا تھا، اس لیے گھر کے لوگ آہستہ آہستہ باتیں کر کے اُس کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے اُس نے حکم دے رکھا تھا کہ اُس کی موجودگی میں وہ اونچی آواز میں بات کریں۔

ایسا نہیں تھا کہ ماسٹر پال کنجوس تھا ہر مہمان کی اچھی خاطر مدارات کرتا تھا اور بچّے جو چیز چاہیں لا بھی دیتا تھا۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ تمام اخراجات وہ خود کرے۔ وہ کسی قسم کی فضول خرچی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اگر رات کی کچھ روٹیاں بچ جائیں تو وہ چاہتا تھا کہ پہلے انھیں ختم کیا جائے اور اس کے بعد کھانا بنایا جائے۔ اسی بات پر روز اس کی اپنی بیوی سے کھٹ پٹ ہو جاتی تھی۔ کئی بار ساوتری ماسٹر پال کی شکایت لے کر میرے پاس بھی آئی تھی۔

"بھائی صاحب، آپ ہی بتائیے ایسے آدمی کے ساتھ زندگی کیسے بسر ہو سکتی ہے؟"

"جہاں اتنے برس برداشت کرتی رہی ہیں تو کچھ دیر اور برداشت کریں۔ ویسے ماسٹر پال کوئی بُرا آدمی نہیں ہے۔"

"خاک برداشت کر لوں۔" ساوتری جل کر بولی۔ "پہلے بچے چھوٹے تھے تو سب کچھ برداشت کر لیتی تھی۔ اب وہ بڑے ہو گئے ہیں ہر روز ان کی موجودگی میں یہ بے عزتی برداشت نہیں ہوتی۔ میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔"

"کوئی بات نہیں۔ جب لڑکے کی شادی کر لو گے، بہو گھر میں آ جائے گی تو ماسٹر پال خود بخود ہی ایسی باتوں سے گریز کرنے لگے گا۔"

"ان کے ہوتے ہوئے کون اپنی لڑکی اس

دوزخ میں بھیجے گا۔ یہ تینوں بچے کنوارے ہی رہیں گے۔"

میں نے دیکھا کہ اب مجھے زیادہ وقت اپنے گھر کے کام کرنے کی بجائے پال کے گھر کے جھگڑے نپٹانے میں صرف کرنا پڑتا تھا۔ میں نے اُن کے ہاں آنا جانا بہت کم کر دیا۔ پھر ایک دن پتہ چلا کہ ساوتری بچوں کو چھوڑ کر اپنے بھائی کے پاس یوں چلی گئی ہے۔ ماسٹر پال نے گھر کا دروازہ اور کچن کھلا رکھنے کے لیے بڑے لڑکے کی شادی کر دی۔ بہو آ گئی لیکن ماسٹر نے گھر کی نمبرداری نہیں چھوڑی۔ وہ دن بھر گھر کے کام کاج میں مصروف رہتا۔

شاید اُس نے اسکول ماسٹری کے دوران اپنی طبیعت کا خاصہ بنا لیا تھا کہ وہ یہ چاہتا تھا کہ گھریلو زندگی بھی اسکول کی کلاس کی مانند چلے۔ کوئی اس کی بات کو نہ کاٹے۔ وہ صبح شام گھر کے سب افراد کی حاضری لگائے اور اُسے ان کے دن بھر کے پروگرام کا علم ہو۔ نیز گھر کی ایک ایک پائی کا حساب اُس کی اُنگلیوں پر رہے۔

ماسٹر پال ایک دن زینے سے گر گیا کمر میں سخت چوٹ آئی۔ بستر پر دراز ہو گیا پر لیکن زبان بند نہیں ہوئی۔ بیٹے جا کر ماں کو لے آئے۔ میں ماسٹر پال کی مزاج پرسی کے لیے گیا تو ساوتری کو دیکھ کر پوچھا۔

"بہن جی کب آئی ہیں!"

ماسٹر پال ہاتھ کے اشارے سے آہستہ سے بولا:

"میں نے آنے کے لیے بالکل نہیں کہا اپنے آپ ذلیل ہو کر آئی ہے۔ یہاں جیسا بہشت اور کہاں مل سکتا ہے؟"

میں زیرِ لب ہنستا رہا۔ اگر یہ بہشت ہے تو نہ جانے دوزخ کسے کہتے ہیں۔

اب ماسٹر پال چھڑی کے سہارے چلنے لگا۔ اس کے باوجود وہ اپنی پینشن لینے خود جاتا تھا۔ اور بینک میں حساب کتاب بھی اپنے ہاتھ ہی سے کرتا تھا۔ ایسا جھکی آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بچوں کی شکایتیں سنتا سنتا میں تنگ آ گیا تھا۔ ایک دن اس کا بیٹا آیا اور کہنے لگا۔

"پتا جی بہت بیمار ہیں۔ بینک گئے تھے۔ چکر آیا۔ سیڑھیوں سے گر گئے۔ سر اور سینے میں بہت چوٹیں لگی ہیں۔ کچھ لوگ اٹھا کر گھر چھوڑ گئے ہیں۔ بینک سے روپیہ نکلوایا تھا نہ جانے کتنا تھا۔ اب وہ ہم سے جھگڑا کر رہے ہیں کہ ہم نے اُن کی جیب سے پیسے نکال لیے ہیں۔ آپ چل کر انہیں سمجھائیں۔"

میں ماسٹر پال کی مزاج پرسی کے لیے گیا۔ واقعی انہیں سخت چوٹیں لگی تھیں۔ سر اور بازو بندھے ہوئے تھے۔ میں اُن کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ مجھ سے کہنے لگے۔

"گوپال جی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرا وقت اب پورا ہو گیا ہے۔ آپ یہ خیال رکھیں کہ میرے بیٹے میرے کریا کرم کا جو کارڈ چھپوائیں اس پر میرا پورا نام "پروفیسر جوگندر پال" لکھوائیں ماسٹر نہیں۔ آخری رسومات بھی سناتن دھرم کے پنڈتوں سے ادا نہ کرائیں۔ ورنہ پنڈتوں کے ہاتھوں لوٹے جائیں گے۔"

میں ماسٹر پال کو دلاسا دے کر لوٹ آیا، لیکن اُس کی ناک کی زردی کہہ رہی تھی کہ ماسٹر پال زیادہ دیر کا مہمان نہیں۔"

پروفیسر پال کو ہم سے جدا ہوئے دو ماہ بیت چکے ہیں۔ ویسے تو ایک زحمت تھی جس سے نجات ملی۔ لیکن میں جس وقت بھی قلم اُٹھا کر لکھنے پڑھنے بیٹھتا ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے باہر ماسٹر پال دروازہ کھٹکھٹا رہا ہو اور پھر وہ کوئی شکایت لے کر میرا مغز چاٹنے آ گیا ہو۔

وہ جیسا بھی تھا، میری ذہنی تفریح کا سبب بن گیا تھا۔ کسی چیز کا وجود بھی اس دنیا میں بے کار نہیں ہے۔ صرف اُسے ٹھیک زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ہر شخص کا ایک کردار ہے جسے وہ نبھاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم اُسے کس ڈھنگ سے دیکھتے ہیں۔

ماسٹر پال رخصت ہو چکا ہے۔ لکھتے لکھتے میرا قلم رُک جاتا ہے اور میں اُس کی باتیں یاد کر کے ہنستا رہتا ہوں۔ اس کا وجود ہی نہیں، اس کی یاد بھی مسرت کا باعث تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ ماسٹر پال جا چکا ہے۔ اور لگتا نہیں ہے دل مرا۔ آنکھیں گیلی گیلی سی ہو جاتی ہیں۔ ●●

تیج بہادر

جہلم کے سینے پر

چار گھنٹے ـــــ کتنے طویل تھے یہ چار گھنٹے ...... زندگی کے کٹھن چار برسوں سے بھی زیادہ طویل اور رزاق ان چار گھنٹوں میں خوف سے کانپتا ہی رہا۔ تھرتھراتا ہی رہا۔

اُس نے زوتی سے کئی دفعہ پوچھا پر زوتی ہر بار انکار میں سر ہلاتی رہی۔ اُس کی چھاتی پر پتھر چٹکتی رہی۔

زوتی کشتی کے پچھلے سرے پر مسکراتی ہی رہی۔ رزاق کو چڑ سی ہونے لگی اس مسکراہٹ سے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ مسکراہٹ نہیں، دھوکا ہے، فریب ہے۔ اوہ...... ان چار گھنٹوں میں اس نے کیا کچھ نہ سوچنا چاہا...... سمجھنا چاہا...... پر کیا...... اُسے معلوم نہ تھا وہ صرف خوف کی...... خوشی کی لہروں میں ڈوبتا رہا۔ ابھرتا رہا۔

زوتی شاید غلط سمجھ رہی تھی۔ اس کو خود غرض تصور کر رہی تھی۔ آخر وہ کبھی تو بیوقت شہر جا رہا تھا۔ پر وہ زوتی کو کیسے بتاتا۔ کیوں کر سمجھاتا کہ اُسے ڈر ہے...... خوف ہے...... اس کی نگاہیں مٹیالے رواں پانی سے اُٹھ کر زوتی کی جانب بار بار مُڑتی رہیں۔ بہت سکون ملتا تھا اُس کو جب زوتی چپو سے کھیلتے ہوئے اس کی طرف شرمیلی نگاہوں سے دیکھتی اور نگاہوں میں تھوڑی سی حیا...... تھوڑا سا غرور جھلک اُٹھتا۔ پھر بھی اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ زوتی اس سے کچھ چھپا رہی ہے۔ مسکراہٹ کی آڑ میں ...... آنسوؤں کا...... آہوں کا گلا دبا رہی ہے۔ محسوس ہوتے ہی اُس کا ذہنی انتشار بڑھ سا جاتا تھا اور کندھے سے لگا ڈانڈ اور زور سے کندھے میں چبھنے لگتا۔

سامنے پُل صاف نظر آ رہا تھا۔ دیو ہیکل لاش کی طرح پھیلا پُل۔ موت کی پرچھائیاں نیچے بہتے ہوئے پانی کے تیز دھاروں پر ڈال رہا تھا۔ جیسے رواں زندگی پر بندھ باندھ رہا ہو۔ لیکن پانی بہتا جا رہا تھا اور بہتے ہوئے پانی کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ جھاگ سطح پر چکر کھا کھا کر چھوٹے چھوٹے بھنوروں میں ڈوب کر اُبھر رہا تھا۔

پانی کا شور رزاق کے کانوں میں سرگوشی کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور کھنچ گیا۔ آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی جیسے سرگوشی اُسے آنے والے خطروں سے آگاہ کرنے لگی۔ کشتیوں کے تختوں کے ٹوٹنے کی آواز کا پتہ دینے لگی اور وہ جھنجھلا کر کوسنے لگا۔

"آگ لگ جائے اس دریا کو...... کبھی اُتار پہ ہے تو کبھی چڑھاؤ پر ...... میں تو......"

وہ رُک گیا۔ شاید زوتی کراہ رہی تھی یا شاید کشتی پانی کے دباؤ سے کراہنے لگی تھی...... اس کے کان دھوکا تو نہیں کھا گئے ...... وہ اپنے خوف پر قابو پانے کے لیے زوتی کو تکنے لگا۔ زوتی کھڑی چپو لیے پانی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

زوتی بظاہر پانی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پر اس کی آنکھیں کچھ نہ دیکھ پاتی تھیں۔ وقتی درد کی لہر نے اس کی نگاہوں کو دھندلا دیا تھا۔ وہ بے حس کھڑی...... اینٹھ سی گئی۔ ٹانگیں اکڑ رہی تھیں۔ ہونٹ دانتوں تلے پھڑپھڑا رہے تھے اور انگلیوں کی گرفت چپو پر سخت ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے درد پر قابو پانے کی ناکام کوشش کی۔ پیٹ پر جیسے کوئی تول تول کے مکے مار رہا تھا۔ سانس گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ غیر ارادی طور پر اس کے ہونٹ ڈھیلے پڑ گئے۔ ہلکی چیخ دانتوں میں سے پھسل سی گئی اور وہ گھبرا کر رزاق کو دیکھنے لگی۔ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کو رزاق ڈانڈ پر جھکا ٹیڑھا میڑھا دکھائی دیا اور زوتی کے چہرے سے جیسے بھاری بوجھ سرک گیا۔

معرفت سوشیل کول، ۳۴۸ سیکٹر ۱۶ اے، فرید آباد ۱۲۱۰۰۶

رزاق اگر چیخ سُن پاتا .... تو شاید ڈانڈ پھینک کر اس کی طرف لپکتا .... اور کشتی بے قابو ہو کر کنارے سے ٹکرا جاتی۔ اسی لیے تو زونی تکلیف کے باوجود چپو تھامے رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے زور زور سے دبائے .... اتنا دبائے .... اتنا دبائے کہ کمر سے چپک جائے .... پر کیسے ....؟ وہ چپو تو نہیں چھوڑ سکتی تھی .... پتوار بغیر کشتی کنارے کیسے لگتی۔؟

زونی کو چپو پکڑے دریا کو گھورتے دیکھ کر رزاق کی ڈھارس ذرا بندھ گئی۔ پھر بھی سینے پر بوجھ بڑھتا جا رہا تھا جیسے ساری کشتی کا وزن اس کے سینے پر لہرا رہا تھا۔ دُکھ سے بوجھل اُس کا ذہن بھٹک گیا۔ کل اور آج کے دن میں کتنا فرق تھا۔ کل بھی زونی مسکرا رہی تھی۔ پر اس مسکراہٹ میں کیسی اُمید تھی ..... کتنی خوشی تھی ..... اور آج .... آج وہ سمجھنا نہ چاہتا تھا ..... سوچنا نہ چاہتا تھا .... پھر بھی اس پر واضح تھا کہ آج زونی کی مسکراہٹ آنسوؤں میں نہائی ہوئی ہے۔ دبی چیخوں کا پردہ بنی ہوئی ہے —— اس لیے وہ دل ہی دل میں نادم ہوا کہ کیوں شہر کی طرف روانہ ہوا .... کیوں نہ زونی کو آرام کا موقع دیا .... پر کل .... کل تو اور بات تھی۔

کل دریا میں پانی زیادہ نہ تھا۔ سفر کا پہلا دن تھا، اس لیے کھُردُرا لکڑی کا ڈانڈ نرم محسوس ہو رہا تھا اور کندھے پر ڈانڈ کا دباؤ ہلکی تھپکی۔ پانی نیلگوں تھا۔ زونی کی نیلی آنکھوں سے کتنا مشابہ ..... جیسے زونی کی نیلی آنکھوں کی پرچھائیں سارے دریا پر چھائی ہوئی تھی اور لہریں نیلگوں پانی پر سورج کی شعاعوں سے چاندی کی گوٹا کناری بُننے میں معروف تھیں۔

اور کشتی دریا کی ہلکی تھپکیاں سہتی ہوئی بڑھتی جا رہی تھی۔ لہروں کی چپ چپ کی میٹھی آواز کسی نوزائیدہ بچّے کے دودھ چوستے پر کا گمان ہوتا تھا۔ وہ بجری سے بھری کشتی اکیلے چلا رہا تھا اور زونی پچھلے سرے پر کھڑے چپو سے پتوار کا کام لے رہی تھی۔ ہوا کے گرم جھونکے زونی کے بالوں سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ ہلکے سرخ گالوں سے بال ہٹاتے وقت زونی کتنی بھلی لگتی تھی۔ کبھی کبھی وہ لہروں کی لَے سے لَے ملاتے ہوئے گنگنا بھی اُٹھتی تھی۔ زونی کی باتیں .... حرکتیں .... قہقہے سنسناتے جا رہے تھے اور اُسے محسوس ہوا تھا کہ زونی کی طبیعت خراب ہونے والی ہے۔ زونی کی باتیں ..... حرکتیں اُسے پریشان کرنے لگیں۔ آخر گاؤں کی بوڑھی دایہ کا اندازہ بھی غلط ثابت ہوا تھا اور زونی کا پیٹ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ڈھیلے ڈھالے پیرہن کے باوجود اُبھار نمایاں تھا لیکن زونی اس کی فکر سے بے نیاز چپو تھامے خاموش کھیتوں کو تک رہی تھی۔ کھیتوں سے پرے دُور نیلے پہاڑوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ رزاق کو محسوس ہوا جیسے یہ پہاڑ اُس کے اردگرد گھیرا ڈالے کھڑے ہیں۔ ہیبت دیوزادوں کی طرح خاموشی سے اس کی بربادی کے منتظر ہیں —— خاموشی اس کے کانوں پہ بوجھ بن کر چھانے لگی اور اس کے دل میں شدّت سے خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ شہر جلدی پہنچ جائے .....

رزاق شہر کسی حالت میں نہ آتا۔ گر ٹھیکیدار کو بجری کی بڑی ضرورت تھی۔ پر اُسے آنا پڑا۔ چاول ختم ہونے لگے تھے۔ پیسہ کوئی پاس تھا نہیں۔ اور دن گزرتے جا رہے تھے۔ ایسے میں اسے کچھ نہیں سوجھا، سوائے شہر آنے کے۔ اُس نے سوچا کہ شہر پہنچ کر ٹھیکے دار سے پیسے بھی لے لوں گا اور کسی ڈاکٹر سے زونی کا ملاحظہ بھی کراؤں گا۔ شہر میں خیراتی دواخانے بھی تھے اور دوچار روپے خرچ بھی ہو جاتے تو .... اور اُس نے زونی سے پوچھا تھا۔

”کیا خیال ہے تمہارا .... ؟“ شہر چلیں ؟“

”ہاں ہاں ..... دیکھو چاول بھی ختم ہو رہے ہیں ....“ وہاں ٹھیکے دار سے کچھ روپے تو ملیں گے۔“ زونی نے پیٹ چھپاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”تمہاری حالت غیر یقینی ہے“ پتوار پکڑ سکے گی۔“ وہ خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

”میں اچھی بھلی تو ہوں“ زونی نے جواب دیا تھا۔ لیکن اس کی تسلی نہ ہوئی تھی۔ وہ جانا تو چاہتا تھا، پر ڈر تھا کہیں زونی کو راستے میں تکلیف نہ ہو۔ اس اُمید پر کہ زونی شاید انکار کر دے، وہ کہنے لگا۔ ”دو دن لگیں گے شہر پہنچنے میں اور مزدور بھی نہیں لے سکوں گا کرائے پر۔ کشتی اکیلے ہی لے جانی پڑے گی۔“

”میں دو دن میں مر نہیں جاؤں گی۔“

زونی غصّے سے بولی۔ وہ چاہتی تھی کہ رزاق کسی طور شہر چلا جائے۔ کیوں کہ چاول ختم ہو رہے تھے اور اُمید بر آنے پر برادری کے دو چار آدمیوں کو بلانا ضروری تھا۔ اُس کی اپنی دوچار سہیلیاں بھی تو منتظر تھیں۔

اور رزاق نے بالآخر کشتی کا رُخ شہر کی طرف پھیر ہی دیا۔

پُل نزدیک آ رہا تھا اور کشتی کے ہچکولوں میں تیزی آ رہی تھی۔ بجری کے وزن سے کشتی بہت بھاری ہو گئی تھی اور کشتی کو چالو رکھنے کے لیے رزاق کو بہت زور لگانا پڑ رہا تھا۔ بازوؤں اور گردن کی رگیں بُری طرح اُبھر آئی تھیں۔ اپنا پورا زور لگاتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ پُل کے پار اُسے کشتی ضرور روکنی چاہیے۔ زونی بیچاری لگاتار چار گھنٹے چپو تھامے کھڑی رہی ہے اور کل بھی دن بھر کھڑی رہی۔

کل بھی دن بھر زونی چپو تھامے کھڑی رہی تھی۔ دن کو زیادہ تکلیف نہ ہوئی تھی پر رات کو..... اوہ اگر رزاق کو گمان بھی ہوتا تو وہ کسی حالت میں اپنا سفر جاری نہ رکھتا۔ دن بھر کی تکان سے ادھ موا ہو کر وہ گہری نیند سو چکا تھا، اس لیے وہ زونی کی آہیں نہ سن سکا...... کراہنا نہ سن سکا —— زونی کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے۔ درد کی شدت سے مجبور ہو کر اس نے کئی بار سر پٹک دیا تھا۔ کئی بار مونہہ میں کپڑا ٹھونسا تھا۔ بغیر ملاح کی کشتی کی طرح، جو تند و تیز طوفان میں گھری ہو وہ رات بھر درد کے تھپیڑے کھاتی رہی، ڈوبتی رہی، ابھرتی رہی۔ پر اس نے رزاق کو جگایا نہیں...... وہ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ خود بھی تو نہیں جانتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے..... کیا ہوگا.....؟

اور صبح جاگتے ہی جب رزاق کی نظر زونی کے چہرے پر پڑی تو وہ بھونچکا سا رہ گیا تھا۔ ایک رات کے وقفے میں ہی زونی کتنی بدل گئی تھی۔ چہرہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا —— آنکھوں کے گرد کالے حلقے نمودار ہو گئے تھے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ زونی کو اس حالت میں پا کر وہ شرمندہ سا ہو گیا تھا اور ہکلاتے ہوئے پوچھ بیٹھا تھا —— "تم کتنی سپید نظر آ رہی ہو ——" پر زونی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ "نہیں تو...... وہم ہے تمہارا....."

اور وہ اٹھ کر چائے بنانے لگی تھی۔

زونی کی مسکراہٹ اسے فریب نہ دے سکی۔ مسکراہٹ میں کچھ مردنی تھی.... کچھ روکھا پن تھا...... وہ کہہ نہیں سکتا تھا کہ مردنی کیا ہے، روکھا پن کیا ہے۔ پر کچھ ضرور تھا۔ اس باس کی طرح جو حد سے زیادہ پکے ہوئے پھل میں پیدا ہوتی ہے یا اس بو کی طرح جو بہت دیر تک پانی میں ڈوبی کشتی میں پیدا ہوتی ہے۔ زونی اور وہ —— دونوں کے لیے یہ تجربہ نیا تھا۔ پہلا..... اس لیے وہ دونوں حیران تھے..... پریشان تھے..... وہ جانتے نہ تھے کہ آنے والے واقعات کا کس طرح سامنا کریں......

ایک دم ہی تو سب کچھ ہو گیا تھا۔ انہوں نے کبھی نہ سوچا تھا کہ حالات ایسا پلٹا کھائیں گے۔ انہیں پیٹ کے دھندوں سے فرصت ہی کب ملی تھی۔ یہ چیزیں سوچنے کے لیے.... سمجھنے کے لیے..... اور اب..... کچھ خوف تھا..... کچھ خوشی تھی.....

رزاق سے اب سہا نہ جاتا تھا۔ ان چار گھنٹوں میں اس نے بہت دفعہ زونی کی طرف دیکھنا چاہا..... بارہا دلاسا دینا چاہا..... تاکہ آنے والی اذیت کو کم کرنے میں مدد دے،..... لیکن کوشش کے باوجود پلکیں نہ اٹھتی تھیں..... زبان کہنے سے قاصر تھی..... کہتے ہی کوئی خوفناک خیال اس کے حلق میں اٹک سا جاتا تھا..... اور زونی......

درد کی لہر جب کبھی اٹھتی تھی وہ بے بس سی ہو جاتی تھی۔ اسے محسوس ہوتا جیسے کوئی اس کے پیٹ کو چیر رہا ہے۔ کند چھری سے ہلکے ہلکے —— اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگتا۔ پل کے شہتیر رینگتے نظر آتے اور ابلت مٹیالا پانی سے تیزی سے بدن کو جھلسانے لگتا۔ عجیب درد تھا، یہ زخم دکھائی نہیں پڑ رہا تھا پھر بھی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور تلخی کے باوجود اسے کچھ روحانی خوشی سی محسوس ہو رہی تھی۔ چھاتیوں میں کسک سی پیدا ہو رہی تھی — بہت دن پہلے اس نے یہ کسک محسوس کی تھی اور اس نے کئی بار چھاتیوں کو ٹٹولا بھی تھا..... کچھ بھی تو نہیں تھا، صرف پیٹ کے ساتھ ساتھ وہ بھی ابھر رہی تھیں۔ پیٹ پر تناؤ آگیا تھا۔ کتنا بھدا لگ رہا تھا.....!

چار گھنٹے برداشت کرتے کرتے رزاق پگھلا سا گیا اور اب ڈانڈ کے سہارے جھکا۔ وہ خدا کو کوسنے لگا۔ وہ حیران تھا کہ خدا نے صرف عورت ہی کو درد سہنے کے لیے کیوں پیدا کیا ہے .... جب قصور دونوں کا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ صرف الجھے ہوئے خیالات کا ایک ریلا سا تھا۔ یکایک وہ ٹھٹھک گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ زونی بہت درد محسوس کر رہی ہے۔ اسے یقین نہ تھا یہ خیال شاید یوں ہی آگیا۔ پر زونی کے چہرے پر درد کا کچھ اثر ضرور تھا۔ زونی کے ہونٹوں کا کھچاؤ...... چپو پر انگلیوں کی گرفت کتنی سختی سے چپکی تھیں۔ انگلیاں چپو سے...... جیسے لکڑی میں گھس جانا چاہتی ہیں۔ رزاق سے رہا نہ گیا۔ وہ پوچھ بیٹھا —— "زونی ٹھیک تو ہو.....؟" زونی صرف سر ہلا سکی

پانی کا شور گرج میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جھاگ سطح پر چکر کھاتے کھاتے کشتی کے کناروں کا سہارا لینے لگا تھا اور کشتی پانی کو ہولے ہولے چیرتی ہوئی کراہ رہی تھی۔ وہ زونی کے پاس جانا چاہتا تھا۔ زونی کو سہارا دینا چاہتا تھا...... پر کیسے.....؟" وہ ڈانڈ تو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ کشتی ڈانڈ کے سہارے ہی تو بہاؤ کے آگے بڑھ رہی تھی۔ اور بہاؤ پورے زور سے موڑ کے اونچے کنارے سے ٹکرا رہا تھا۔ کنارے کی مٹی کھل کھل کر مٹیالے پانی میں گہری لکیریں پیدا کر رہی تھی۔ موڑ سے چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں چمگادڑوں کی طرح چمٹی ہوئی تھیں۔

معاً اسے خیال آیا کیوں نہ کشتی کو بہاؤ پر چھوڑ کر کہیں نیچے روک لے..... پر کہاں.....؟ بہت دور تک تو دریا کے کنارے عموداً کھڑے تھے۔ پانی کی سطح سے کچھ دو فٹ اوپر تک مٹی بہاؤ کے زور سے کھرچ کھرچ کر بہہ گئی تھی اور اوپر والی سطح پانی پر مونڈوں کی

صورت میں باہر اُبھر آئی تھی۔ اوپر والی سطح کے سائے خوف ناک طریقے پر دریا پر تھرتھرا رہے تھے ــــ مونڈوں سے درختوں کی جڑیں سہیا نسی کی رسیوں کی طرح لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ اگر دُور تک کشتی کو بہنے دے تو بعد میں کشتی پر قابو پانا دشوار تھا۔ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اتنی بھاری کشتی ایک دفعہ بے قابو ہو جائے تو گولی کی طرح کنارے سے ٹکرا جائے گی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی، لیکن زونی کو مدد کی ضرورت تھی۔ . . . سہارے کی ضرورت تھی۔ وہ پیلی پڑتی جا رہی تھی۔ چہرے پر خوف ناک لکیریں پھیلتی جا رہی تھیں۔ آنکھیں بُری طرح پھیل رہی تھیں . . . . رزاق اور کچھ نہ دیکھ سکا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے ساری دنیا اس کی بربادی کی منتظر بیٹھی ہے . . . . یہ اونچے کنارے، جن کی طرف دیکھ کر ذہن میں خواہ مخواہ ڈراؤنے خیالات رینگنے لگتے ہیں . . . . یہ مٹیالا پانی . . . . جیسے کوئی لمبی لاش بہی جا رہی ہے۔ . . . . یہ بجری سے بھری کشتی اور کندھے سے لگا ڈانڈ جس نے اُس کے ہاتھوں میں چھالے ڈال دیے تھے۔ وہ مزید برداشت نہ کر سکا۔ اس کے بدن میں سوئیاں سی چبھنے لگیں اور سمٹی سمٹائی قمیض کے باوجود اُسے کندھے پر ڈانڈ کی چبھن بُری طرح محسوس ہوئی۔

درد کے جھٹکے زونی کو کبھی دوہرا کر رہے تھے اور کبھی ڈانڈ کی طرح سیدھا . . . . وہ کانپ رہی تھی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا اور پُل ابھی دُور تھا۔ چند ہی گز . . . . لیکن پھر بھی کتنا دُور . . . . درد کی شدت کے باوجود اُس نے چپو کو اور زور سے تھاما . . . . پر کب تک . . . . ؟ ابھی اس کے حواس باختہ نہیں ہوئے تھے۔ ابھی اس کی انگلیوں کی سکت ختم نہیں ہوئی تھی۔

" وہ کشتی کیوں نہیں بڑھاتا کمینہ' بے درد! میں مر رہی ہوں! اوہ!" اس کی زبان تالو سے لگنے لگی۔ ہونٹ مرجھا گئے۔ حلق تیزی سے سوکھ رہا تھا . . . . لیکن تر کیسے کرے؟ . . . . چپو پر جھکے جھکے اُس نے آنکھیں زبردستی کھول لیں۔ . . . . سامنے مٹیالا پانی . . . . ناچتا اُچھلتا پانی کتنی تیزی سے بہا جا رہا تھا۔ صرف کچھ فٹ کے فاصلے پر . . . . ہنستا کھیلتا پانی بہا جا رہا تھا ہاتھ ذرا سا بڑھانا تھا، ذرا سا جھکنا تھا . . . . اور سوکھا حلق . . . . وہ کیسے جھکے؟ کیوں کر ہاتھ بڑھائے؟ . . . . وہ جانتی تھی کہ ایک دفعہ اُٹھ کر وہ پھر نہ جھک سکے گی۔ اور چپو تھامے رکھنا تھا . . . . چپو تھامے رکھنا تھا ــــ" اوہ وہ کشتی کیوں نہیں بڑھاتا! وہ کشتی کیوں نہیں بڑھ . . . . " زونی کراہنے لگی۔

زونی کو چپو پر دُہرا ہوتے دیکھ کر رزاق کے پاؤں تلے بجری پھسلنے لگی۔ اُسے گمان بھی نہ تھا کہ زونی یکایک اتنی سخت اذیت میں مبتلا ہو گئی۔ خوف کے زیرِ اثر اس نے زونی کو جگانا چاہا . . . . جھنجھوڑنا چاہا پر آواز حلق میں ہی گھٹ کے رہ گئی۔ اُسے محسوس ہوا کہ کوئی ہتھوڑوں سے اُس کا بھیجہ کوٹ رہا ہے ــ بدن میں گانٹھیں پڑ رہی ہیں۔ تلوؤں میں بجری کے چھوٹے چھوٹے دانے نہیں بلکہ نشتر چبھ رہے ہیں۔ اس کا دماغ سُن ہو گیا ہے۔ بیوقوفوں کی طرح اُسے خیال آیا۔" زونی کہتی ہے لڑکا ہوگا۔ . . . . میں کہتا ہوں لڑکی . . . . مجھے یقین ہے کہ لڑکی ہوگی۔ خوب صورت سی پیاری لڑکی! جس کے بال زونی جیسے۔ لاحول ولاقوۃ ــ آگ لگ جائے بالوں کو۔" وہ دفعتاً اپنی سراسیمگی پر پریشان ہو گیا اور غصے میں آ کر بڑبڑانے لگا ــــ " میں باؤلا تو نہیں . . . . زونی میری خاطر . . . . کشتی کی خاطر اتنی تکلیف سہہ رہی ہے اور میں ہوں کہ . . . . " اس نے زونی کا پھر جائزہ لیا۔ وہ برداشت نہ کر سکا۔ ذہنی اور جسمانی کشمکش میں اس کا بدن ٹوٹتا جا رہا تھا۔ وہ نجات پانا چاہتا تھا صرف ایک سے . . . . چند لمحوں کے واسطے . . . . مگر کیسے . . . . ؟ اُس نے سہا تھا۔ زونی کے ساتھ ساتھ تکلیف برداشت کرنا ہی تھی۔ پر اُسے جلدی کرنی چاہیے . . . . زونی شاید اور نہ سہہ سکے . . . . اور پُل تو ابھی دور ہے۔ ایک تیز چوٹ کی طرح پُل اور کشتی کا فاصلہ اُس پر واضح ہو گیا اور اُس کے چہرے پر پھوٹتے پسینے میں آنسوؤں کی نمی بھی جذب ہونے لگی۔

رزاق اپنے کندھے کا درد بھول گیا۔ اب وہ لکڑی کی طرح سخت . . . . کھُردرا . . . . ڈانڈ کا ایک حصہ بن گیا اور کوئی نامعلوم طاقت اُس پر بے انتہا زور صرف کرنے لگی۔ کشتی کی حرکت میں نئی تیزی آ گئی۔ پانی اور کشتی کے ٹکراؤ کی گونج اور اونچی ہو گئی۔

کتنی پھرتی آ گئی تھی اُس کے تھکے ہوئے جسم میں . . . . جیسے پانی کے بہاؤ کا سارا زور اس میں سما گیا ہو اور ڈانڈ کتنی تیزی سے پانی میں ڈوبتا جا رہا تھا جیسے یہ ڈوبتا ہی جائے گا۔ . . . . جیسے اس دریا کی تہہ نہیں . . . . لیکن نہیں . . . . آخر ڈانڈ تہہ سے ٹکرا ہی گیا اور کشتی جھٹکے سے پانی کا مقابلہ کرنے لگی۔ اُس نے زونی کی طرف دیکھا صرف ایک لمحے کے لیے . . . . ایک لمحہ بھی کتنا لمبا ہوتا ہے! اُس نے آنکھیں زور سے میچ لیں۔ اُسے معلوم تھا وہ بزدل بنتا جا رہا ہے، لیکن اس وقت وہ جان بوجھ کر بزدل بننا چاہتا تھا۔ افوہ . . . . کس قدر خوف ناک . . . . کس قدر ڈراونا تھا یہ ایک لمحہ . . . . ! موت کی ساری طاقتیں لیے یہ ایک لمحہ اُس کے بدن کو چیرتا جا رہا تھا۔ وہ عمر بھر اس لمحہ کو نہ بھول سکے گا۔ راتوں کو کشتی کے تختوں پر وہ ڈراونے خواب دیکھا کرے گا ــــ زونی درد کے مارے دُہری ہوئی جا رہی ہے . . . . چپو پر پھسلتے پھسلتے وہ ناؤ کے کنارے سے آ لگی۔ چپو اُنگلیوں سے پھسل رہا ہے اور کشتی پتوار بغیر

ٹیڑھی ہو رہی ہے۔ پانی کی تیزی میں کشتی تنکے کی طرح چکر کھاتی ہوئی سامنے موڑ کے کالے اونچے کنارے کی طرف بڑھی جا رہی ہے..... تیزی سے بڑھی جا رہی ہے..... اتنی تیزی سے..... اتنی تیزی سے.....

اُس کے سر میں چکر سا آگیا۔ بدن اکڑا ہوا..... پٹھے تنے ہوئے..... سر اٹھا ہوا۔ آنکھیں بند۔ وہ آنے والے جھٹکے کا انتظار کرنے لگا۔ کندھے پر بدستور دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ بے انتہا دباؤ۔ جیسے کوئی کیل ٹھونک رہا ہو۔ لیکن کشتی بڑھتی جا رہی تھی..... لحظہ بہ لحظہ آگے بڑھتی جا رہی تھی..... کشتی پُل کے نیچے پہنچ گئی تھی۔ پُل اور کشتی کا درمیانی فاصلہ یقیناً کم ہوتا جا رہا تھا۔ اب پُل کا سایہ بھی کشتی کو چھونے لگا..... کشتی پر بڑھنے لگا۔ بہتے پانی کا شور دہاڑ میں منتقل ہو رہا تھا اور رزاق اپنے جوان جسم کا سارا زور..... سارا انجور ڈانڈ پر صرف کرنے لگا۔ کشتی تیز ہچکولے کھاتی ہوئی پُل کے نیچے آگئی اور سامنے کچھ گز کے فاصلے پر ایک اور ٹھہری کشتی کا سرا..... وہ مدد کے لیے کیوں نہیں پکار رہا ہے۔ ..... کیوں نہیں چلا رہا ہے؟ پر کیا فائدہ...؟ دوسری کشتی میں تو کوئی نہیں تھا۔ صرف لکڑی کے بڑے بڑے شہتیر..... کاٹھ کے پتلے جو ہل تو نہیں سکتے تھے، لیکن دیکھ سکتے تھے۔ اس کی بربادی کے منتظر تھے۔ خاموش اژدہوں کی طرح غائبانہ اُس کی بے کسی کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ کاش وہ سرا ہاتھ آئے۔ صرف ایک دفعہ اُس کی اُنگلیاں اس دوسری کشتی کے سرے میں کھُب جائیں..... اُس کا گلا بُری طرح سے خشک ہو گیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے گلے میں کانٹے اُگ آئے ہوں اور ان میں سے خون بہہ رہا ہو! نمکین خون!..... اُس نے بائیں ہاتھ سے مونہہ پونچھا..... ہونٹ دانتوں تلے آکر کٹ گیا تھا اور تھوڑا سا لال نمکین خون ٹھُڈی پر بہہ آیا تھا۔

زونی کشتی کے کنارے پر بے بس دوہری پڑی تھی۔ وہ کچھ نہیں جانتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ کیوں ہو رہا ہے؟ صرف پیٹ کے نچلے حصے میں آگ سی دہک رہی ہے جو اسے بُری طرح جلائے جا رہی تھی۔ وہ چپو سے سہارا لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے دماغ میں یہ خیال بُری طرح سے سرایت کر گیا کہ یہ چپو ہی اُسے اس اذیت سے نجات دلا سکتا ہے۔ اُس کی اُنگلیاں چپو میں گھُس جانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ لیکن یہ آگ یہ تپش کیوں نہیں کم ہوتی؟ اوہ........ یہ لال لال شعلے..... خوف ناک دہکتے انگارے..... اُس کے چاروں طرف پھیلتے جا رہے تھے۔ وہ چیخنے لگی ٹانگیں بے دردی سے پٹکنے لگی..... کالے دھوئیں سے اُس کا دم گھُٹ رہا تھا...... سینہ چیر رہے تھے یہ کڑوے گھونٹ اور دھواں بڑھتا جا رہا تھا — پھیلتا جا رہا تھا۔ رزاق کو اب کچھ بھی سوجھ نہیں رہا تھا۔ اس کا سارا زور..... ساری تڑپ ڈانڈ پر صرف ہوئی جا رہی تھی۔ وہ صرف دیکھ رہا تھا۔ سمجھے بغیر دیکھ رہا تھا۔

زونی بے حس کشتی کے کنارے دوہری پڑی ہے۔ آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر بجری میں جذب ہو رہے ہیں۔ کبھی کبھی ہلکی گلابی لہریں چہرے پر پرچھائیاں سی ڈال جاتیں۔ اور پھر وہی سپیدی..... ہونٹوں کے کنارے پھڑک رہے تھے۔ شاید کراہ رہی ہے، لیکن پانی کی گرج آواز کا سنائی دینے سے پہلے ہی دم گھونٹ دیتی تھی۔ رزاق کا سر دوسری کشتی کی طرف مڑا۔ بس پاس ہی تو تھی کشتی..... اس کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا۔ کاش زونی چپو تھامے رہے۔ اس کے تھکے ذہن میں یہ آواز بار بار ٹکرا اٹھی ”کاش زونی چپو تھامے رہے!“

پانی کی گرج کانوں میں گونج پیدا کر رہی تھی اور وہ جھنجھلا اٹھا۔ دل کی دھک دھک ہی کیا کم پریشان کر رہی تھی۔ اُس نے کانوں کو بند کرنا چاہا پر ہاتھ ڈانڈ سے چمٹے پڑے تھے۔ اور ڈانڈ تیز بہاؤ میں کانپ رہا تھا۔ اُس نے چلانا چاہا تاکہ پانی کی گرج کو اپنی آواز میں گُم کر سکے۔ پانی کا شور اُس کا مونہہ چڑا رہا تھا۔ اس کی بربادی پر قہقہے لگا رہا تھا۔

”زونی چپو نہ چھوڑنا..... زونی“ وہ پوری شدت سے چلایا۔ جیسے پانی کی تیزی کو للکار رہا ہو، لیکن آواز حلق سے باہر نہ نکلنے پائی۔ کچھ ہو گیا تھا اسے..... اور وہ محسوس بھی کر رہا تھا۔ وہ چاروں طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ نگاہوں کو زخمی کرنے والی نوکیلی چٹانوں سے بھرپور پہاڑ..... سسکتی آہوں کی طرح گرد کے مرغولوں سے ڈھکی ہوئی سنسان سڑک..... اس کی بربادی کی پرچھائیاں اوڑھے ہوئے خاموش کھیت..... خوف ناک درندوں کی طرح تاک لگائے ہوئے یہ اُونچے کنارے..... کچھ بھی تو نہیں تھا..... صرف مٹیالے رنگ کا رواں سیال..... مٹیالا گہرا پانی..... برف کی طرح گہرا اور زرد..... اس کی آنکھیں بھی مٹیالی ہوئی جا رہی تھیں اور پیر بجری پر پھسلتے جا رہے تھے۔

کوئی چیز گہرے پانی میں چمکی..... چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کی چمکتی سطح..... زندگی کی جھلکیاں..... اُس نے زونی کی طرف دیکھا۔

زونی مجسم زندگی تھی۔ اس کا سارا بدن پانی سے باہر پھینکی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ ٹانگیں کشتی کے کناروں سے ٹکرا رہی تھیں سر بجری پر زور زور سے ہل رہا تھا۔ چیخیں دریا کی گونج کو دباتے ہوئے فضا میں منڈلا رہی تھیں

رزاق کو محسوس ہوا کہ یہ چیونٹیاں نہیں منڈلا رہی ہیں۔ گدھ منڈلا رہے ہیں۔ چپچپا زونی کی کانپتی انگلیوں سے پھسلا جا رہا ہے۔ دھیرے دھیرے پھسلا جا رہا ہے۔

گھبرا کر اس نے مُڑ کر دوسری کشتی کی طرف دیکھا۔ دوسری کشتی کا سرا بالکل نزدیک آگیا تھا۔ کسی نامعلوم قوت کے زیرِ اثر۔ وہ لپکا۔ اس کی تھکی انگلیاں دوسری کشتی کے سرے سے ٹکرا گئیں اور پھسلنے لگیں۔ انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔ دوسری کشتی کے سرے پر ناخن لکڑی چھیلتے جا رہے تھے اور اس کا بدن کھینچتا جا رہا تھا۔ اسے بے انتہا ٹھنڈ محسوس ہوئی ..... نوکیلی۔ جو دل میں تیز چاقو کی طرح اُترتی جا رہی تھی۔ بدن پر کیڑے رینگتے محسوس ہوئے۔ دفعتاً اُس کے ہاتھ ٹھہر گئے۔ ٹانگوں میں جھٹکا سا محسوس ہوا۔

چشم زدن میں اُس نے دونوں کشتیوں کے سروں کو باندھ دیا۔

رزاق مڑا اور مُڑا ہی رہا.....

زونی کا بے حس سر کشتی کے ہچکولوں سے بجری پر دھیرے دھیرے ہل رہا تھا۔ بایاں ہاتھ کشتی کے کنارے سے چمٹا ہوا تھا اور داہنے ہاتھ کی مُٹھی میں گول گول بجری بھی بھینچی ہوئی تھی۔ ٹانگیں بُری طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ چہرے پر آنسو کے ننھے ننھے قطرے دھوپ میں تاروں کی طرح چمک رہے تھے اور جیسے دُور ..... مُردہ کالے سانپ کی طرح بہہ رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اُس کا دماغ جیسے ماؤف ہوگیا۔ صرف سر میں درد بڑھتا جا رہا تھا اور وہ بیوقوفوں کی طرح کھڑا منہ کھولے زونی کو دیکھ رہا ہے۔

دفعتاً اُس نے پھریری لی۔ زونی شاید انگلیاں ہلا رہی تھی۔ سر میں درد، شام کے اندھیرے کی طرح گہرا ہوگیا۔ تیزی سے گہرا ہونے لگا اور وہ اپنے آپ سے بھاگنے کے لیے اندھا دُھند بجری پر بھاگتا ہوا زونی کے پاس پہنچا۔

زونی کے حلق سے عجیب سی آوازیں آرہی تھیں۔ جیسے جھنجھنا بج رہا ہو۔ اور اس کے تضاد سے پانی کا شور اونچا ہوتا ہوا سنائی دیا۔ جیسے اپنی ناکامی پر نالہ و شیون کر رہا ہو۔ اور پیرن کے نیچے کچھ ہل جُل رہا تھا۔ بغیر ہچکچاہٹ کے اُس نے پیرن کا دامن ہٹایا۔

زونی کی سفید رانیں خون میں نہائی ہوئی تھیں۔ لال لال خون ..... جس میں سے دُھواں سا اُٹھ رہا تھا۔ کشتی کے تختوں پر بہتے ہوئے بجری کے بڑھتے ڈھیر میں گُم ہو رہا تھا۔ اور ٹانگوں کے بیچ ایک ننھی سی جان متحرک تھی۔ رزاق کو کچھ خوشی محسوس نہ ہوئی۔ یہی تو سب تکلیف..... فکر..... ڈر..... کی جڑ تھا۔ پھر بھی وہ اس گوشت کے لوتھڑے کی حرکات دیکھنے میں منہمک ہوگیا۔ ننھی ننھی ٹانگیں ہوا میں پٹپٹا رہی تھیں اور ننھے ننھے بازو زونی کی ٹانگوں کو دھکیلنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

کراہنے کی آواز سُن کر اس نے زونی کی طرف نگاہیں پھیریں۔ کتنا سپید تھا زونی کا چہرہ ..... برف سے بھی زیادہ سپید..... زونی کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھُل رہی تھیں۔ ہونٹ دھیرے دھیرے پھڑپھڑا اُٹھے۔ اُس نے زونی کے مونہہ کے قریب کان لگائے وہ کہہ رہی تھی۔

" جلدی کرو نال کاٹ کر کپڑے سے باندھ دو...... جلدی ..... " اور وہ بے سُدھ ہوگئی۔ گھبرا کے اُس نے لرزتے ہاتھوں سے قمیص کو پھاڑ ڈالا۔ نال کو کاٹتے ہوئے بچہ زور سے چیخ پڑا اور وہ ڈر سا گیا۔ اُس نے زونی کی طرف دیکھا۔ زونی کا چہرہ درد کی شدت کا آئینہ بنا ہوا تھا۔ اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے وہ خون میں لتھڑے ہوئے سرے کو قمیص کے ٹکڑے سے کس کر باندھنے لگا۔ ●●

بقیہ : آنکھ ہو تو....

اور کئی اہم قومی اور بین الاقوامی اعزازات مل چکے ہیں۔

اپنے ایک نقاد کے لفظوں میں :
" عورت گورگی کا ایک مستقل موضوع رہی ہے۔ گورکی کی رفاقت میں عورت نے ایک مثالی حوصلہ مندی کے ساتھ سفر کیا ہے۔ یہ قصہ ہے معاصر ہندوستان کی عورت کا جو اپنے ماضی کی نم مٹی سے ظہور کرتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ زندگی کی نئی منزلوں کو سر کرتے ہوئے اپنی توانائیوں میں بتدریج اضافہ کرتی جاتی ہے۔" ●

وجاہت علی سندیلوی

بدلتے پیمانے



لوگ کہتے ہیں کہ زندگی کے طور طریقے بدل گئے ہیں۔ ضرور بدل گئے ہوں گے اور برابر بدل ہی رہے ہوں گے اور چونکہ اُن کی تبدیلی ہم سے پوچھ کر نہیں کی جاتی لہٰذا ہم اکثر اس سے بے خبر بھی رہتے ہیں۔ دنیا میں نہیں معلوم کتنی چیزیں اور کتنی باتیں روز بدلتی رہتی ہیں۔ اور ان کے متعلق ہماری کوئی مرضی اور خوشی نہیں پوچھی جاتی۔ اور پھر پوچھی بھی کیوں جائے؟ آخر ہم بقلم خود ہیں بھی کیا؟ نہ ودھائک، نہ کوئی لٹھ مار دادا، نہ کپتان پولیس نہ بس کنڈکٹر نہ لیکھ پال نہ کسی نیتا کے چمچے بقول شخصے نہ خال میں نہ خال کے اونٹوں میں۔

ہم بے چارے کسی کا کیا بنا یا لگاڑ سکتے ہیں۔ ہم تو ایک عام شہری ہیں جو اپنی بعض مجبوریوں اور معذوریوں کے باعث نیک اور شریف بنے پر قانع ہیں۔ اور اپنی عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ ؏

تم بھی چلو اُدھر کو زمانہ جدھر چلے

یہ مجبوریاں اور معذوریاں کیا ہیں اب ہم انہیں کیا گنوائیں۔ بہت سے تلخ تجربوں کے تذکرے جن میں کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں۔ تماشا کتاب کی کیوں سمع خراشی کریں۔ اس کارِ خیر کے لیے ہمارے پاس دوسرے اور زیادہ موثر حربے موجود ہیں۔ ہم یہاں اپنے ایک دوست کا مقولہ پیش کر دینے پر اکتفا کر رہے ہیں اور ہمیں اُمید ہے کہ یہ عقلمند را اشارہ کافی است، والی غلط فہمی اس موقع پر کسی کھوٹے سکّے کی طرح ضرور چل جائے گی۔

ہمارے یہ دوست جو پستہ قد بھی تھے اور موٹے بھی، بہت زیادہ خوش اخلاق واقع ہوئے تھے۔ وہ اپنے ہاتھوں کی پہنچ تک والے ہر شخص سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے۔ اور دوسروں کی باتوں پر ضرورت سے زیادہ بلا ضرورت ہنستے اور قہقہے لگاتے۔ ایک روز میں نے اُن کی اس خوش اخلاقی کا ذکر چھیڑ دیا۔ آبدیدہ ہو کر سسکیوں کے درمیان بولے۔ "میاں قدرت نے میرے ساتھ بڑی بے رحمی کا مذاق کیا ہے۔ میرا قد اور جسم دیکھو! نہ مار سکتا ہوں نہ بھاگ سکتا ہوں۔ خوش اخلاق نہ بنوں تو کیا آپ کے جیسے سرکش محلّے میں اپنی شامت بلواؤں؟" پھر تھوڑی دیر کے بعد اپنے اوپر کچھ قابو پاتے ہوئے بولے۔ "آپ کے سر کی قسم اگر میں بھی آپ کی طرح لمبا اور سڈول ہوتا تو جن ناہنجاروں سے آج خواہ مخواہ پنجہ ملاتا ہوں، اُن کو کان پکڑ کر اپنے سامنے سے ہٹا دیتا اور اگر ذرا سی چیں چپڑ کرتے تو گھونسے مار مار کر ان کا کچومر نکال دیتا۔"

بھیڑ بھیڑیے کی نہیں، بھیڑیا بھیڑ کی کھال پہنے تھا۔ ؏ جس کو قطرہ نہ سمجھتے وہ سمندر نکلا۔

ہمارے دوست قدرت اللہ ہم کو اکثر کیا بارہا نصیحت بلکہ وصیت کرتے رہتے ہیں کہ "برخوردار! شریر اور پاجی سے نہیں، ہمیشہ نیک اور شریف نظر آنے والے آدمی سے ہوشیار اور چوکنا رہو۔ بوفورس کی دہانہ پھاڑے توپ سے اتنا خوف نہ کھاؤ جتنا کہ اُس گھاس کے ڈھیر سے جس کے اندر بم چھپے ہونے کا امکان ہو۔" اور پھر اپنے اس نو دریافت نظریے کی توضیح اور تشریح میں وہ طرح طرح سے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے — "میاں! شریر اور پاجی تو وہی ہے جو وہ دکھائی دیتا ہے یعنی شریر اور پاجی۔ بجلی کے کھمبے کی تختی کی طرح۔ اس کے ماتھے پر دُور سے چشمِ بصیرت پڑھ لیتی ہے! خطرہ، ہوشیار! وہ تو ایک کھلے ہوئے مرکھنے بیل کی طرح ہے۔

نصرت منزل سندیلہ (یوپی)

سب جانتے ہیں کہ جو اُس کے پاس جائے گا وہ اس کو سینگ مار دے گا۔ اب اگر اس کے باوجود آپ اپنی حماقت سے اُس کی زد میں آجاتے ہیں تو خدا لگتی کہیے گا کہ قصور جس کا ہے یا خود آپ کا؟ دیکھیے جو میں عرض کر رہا ہوں ہے چچا غالب فرما گئے ہیں۔

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

قدرت اللہ ایک روز شام کو مذکورہ بالا قسم کی گفتگو کر گئے تھے۔ دوسرے روز سویرے آئے تو اُنہوں نے اپنے اسی راگ کو ایک دوسرے ساز پر بالکل نئے انداز سے چھیڑ دیا۔" برخوردار! شریر اور پاجی تو ایک کھلی کتاب ہوتا ہے۔ جیسے تم ہو اور ہاں! ہاں! ہم بھی ہیں، یعنی جو اندر ہیں وہی باہر ہیں، لیکن ظاہر میں دکھائی دینے والا نیک اور شریف آدمی ایک طرح سے اپنے چہرے پر نقاب ڈالے ہوتا ہے۔ وہ ہوتا کچھ اور ہے دکھائی کچھ اور دیتا ہے اور آپ کو کیا خبر کہ وہ اندر سے ہے کیا؟ اور اُس کی حقیقی شکل کتنی بھیانک اور مکروہ ہے اور خوب کان کھول کر سن لیجیے کہ ایک مغربی دانشور کا مقولہ ہے "ایک اُجلے فرشتے کے ساتھ جنت جانے سے بہتر ہے کہ آپ کسی جانے پہچانے شیطان کے ساتھ جہنم چلے جائیں۔"

ہم نے ایک سماجی مسئلے کو ایک روحانی مسئلہ بنتے دیکھا تو بڑی سعادت مندی سے عرض کیا: "اسی لیے تو ہم نے اس مہم کے لیے آپ کا ہاتھ پکڑا ہے۔"

خود نہ کچھ سمجھے نہ سمجھنے کی کوشش کی اور بدستور ہماری عاقبت سنوارنے کی کوشش میں منہمک رہے۔ اُن کا اصرار تھا کہ دیکھنے میں جو شخص شریف اور نیک نظر آئے اُسے ہمیشہ مشتبہ نظروں سے دیکھو۔ اُسے شبہ کا فائدہ کبھی نہ دو اور باقاعدہ سراغ رساں بن کر پتہ لگاؤ کہ وہ کیوں اپنے آپ کو نیک اور شریف ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ اس کی کہاں کور دبی ہے اور اس کے کردار کے کن کن گوشوں پر پانی مرتا ہے اور پھر قدرت اللہ اپنے محبوب اور مرغوب مشغلے کردار کشی پر اتر آئے۔ اُنہوں نے محلّے بھر کے جانے مانے لوگوں کے کرداروں کا پوسٹ مارٹم کرنا شروع کر دیا جو کئی نشستوں میں مختلف عنوانوں سے جاری رہا اور ہم اور دوسرے حاضرین نہ صرف خاموشی سے سنتے رہے بلکہ ڈرتے رہے کہ دیکھیں ہماری باری کب آتی ہے اور رانا لڈی کے ہاتھوں کی اس بندوق کا رُخ ہماری طرف کب پھر جاتا ہے۔ کیوں کہ بدقسمتی سے ہم لوگ کم از کم خود تو اپنے آپ کو نیک اور شریف ہی سمجھتے۔

قدرت اللہ یوں تو رسمی طور سے اچھے خاصے پڑھے لکھے آدمی تھے یعنی یونی ورسٹی کی کئی ڈگریاں فریم کی ہوئی اُن کے کمرے میں آویزاں تھیں، مگر شاید اس وجہ سے کہ وہ کسی بھی نوعیت سے سوچ لینے کے شدید مخالف تھے۔ لہٰذا اُنہوں نے مجبوراً طوعاً و کرہاً جو کچھ کورس کی کتابوں میں پڑھا تھا، اُس میں اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں کبھی کسی اضافے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ عموماً ہر بات کو ایک رُخ سے دیکھنے کی کوشش کرتے۔ اُن کی ذہنی لُغت میں کالا اور گورے کے علاوہ چتکبرے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود اُن کی ہر بات سبحان تیری قدرت۔ ہلدی، مرچ، ادرک قسم کی نہیں ہوا کرتی اور خواہ حُسنِ اتفاق ہی کیوں نہ ہو، اُس میں کبھی کبھی مغز اور روزن بھی نکل آتا۔ ع

ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

قدرت اللہ کی وہ باتیں جو جذبات کی رَو میں وہ ایک دم سے بک جاتے ـــــ ہمارے لیے تیز بارش کا چھینٹا ثابت ہوتیں۔ یعنی آیا اور بہہ گیا اور تھوڑی سی کیچڑ چھوڑ گیا، لیکن جو باتیں وہ رفتہ رفتہ اور اُٹھتے بیٹھتے بارہا کہتے۔ کبھی براہِ راست اور کبھی اشارتاً و کنایتاً وہ ہمارے ذہن پر وہی کام کرتیں جو شبنم، پھول اور پتیوں پر رنگ و بو پیدا کرنے کے لیے کرتی ہے ؎

ذرا سی بوند شبنم کی کہاں بیکار ہے ساقی
امینِ رنگ و بو ہے، رونقِ گلزار ہے ساقی

اُن کی باتیں تو ہم بھول جاتے، لیکن کچھ عرصے کے بعد بہت تعجب سے ان کے تاثرات غیر شعوری طور سے اپنے دل و دماغ میں اُبھرتے محسوس کرتے۔

ع: چمن شاداب ہے شبنم نہیں ہے

اُنہوں نے نیک اور شریف آدمیوں کے خلاف جو ایک طرح کا ہلا بول رکھا تھا، اُس نے ہمیں بھی خواہ مخواہی یا چور کی داڑھی میں تنکا کے مصداق بڑا خود حساس بنا دیا تھا۔ ہم نے اپنی نیکی اور شرافت کا ذرا تنقیدی جائزہ لیا تو ہم پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ ہمارے ایک بھلے آدمی دکھائی پڑنے کی کوشش میں ہماری نیک نفسی سے کہیں زیادہ ہماری بزدلی، دنیا سازی اور ابن الوقتی کا ہاتھ ہے۔ ورنہ ہمارے جیسے بظاہر نستعلیق انسان میں بھی شرارت اور پاجی پن کے جراثیم کی کوئی کمی نہیں ہے ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ ہماری جلد پر رینگتے نظر نہیں آتے بلکہ اُن کی کئی تہوں کے نیچے سوتے، مگر موقع کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

قدرت اللہ آٹھ دس روز کے لیے اپنے آم کے باغوں کی فصلیں بیچنے اپنے گاؤں چلے گئے تھے۔ لوٹ کر آئے تو بہت کچھ دائرۂ اعتدال میں نظر آئے۔ ایک روز سویرے حسبِ معمول میرے سامنے بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ دفعتاً مجھ سے پوچھ بیٹھے۔ "تم نے جوش ملیح آبادی صاحب کی "یادوں کی برات" میں ان کے معاشقے پڑھے ہیں؟"

○ کیا یہ سوال آج کے اخبار کی کسی خبر سے

متعلق ہے؟" میں نے جھنجھلا کر پوچھا۔

قہقہہ لگاتے ہوئے بولے "خوب آیا حال معلوم ہوا تم نے پڑھے ہیں اور مزے لے لے کر پڑھے ہیں اور شاید سبھی مقامات پر سوائے اُس مقام کے جہاں جوش صاحب رسّے سے باندھ کر کنوئیں میں ڈول کی طرح لٹکائے گئے تھے۔ تمہارے دل میں اس تمنا نے بھی انگڑائی لی ہوگی کہ کاش کہ وہاں موقع واردات پر جوش صاحب کے بجائے تم ہوتے۔"

جب آپ اتنے بڑے غیب داں واقع ہوئے ہیں کہ میرے بتائے بغیر میرے دل کی ہر تمنا سے آپ واقف ہیں تو پھر کسی سوال جواب کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔" میں نے کچھ تیکھے لہجے میں کہا۔

میری بات سے کوئی تاثر لیے بغیر قدرت اللہ نے بڑے جوش سے کہا۔ "میاں اگر ایک شخص اپنی آپ بیتی لکھ رہا ہے تو اس میں اُس کو اپنے معاشقوں کے ذکر کرنے کا پورا حق ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا۔ (سامنے رکھی ہوئی میز پر گھونسہ مار کے) "کہ یہ حق نہیں بلکہ فرض ہے ایک طرف تو آپ بیتی میں سچ اور سوائے سچ کے کچھ نہیں کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور جب کھرا سچ پیش کیا جاتا ہے تو عریانیت کے بہانے اُس کی بخیہ اُدھیڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔"

پنڈت گرجا شنکر دیکھپت جو اس درمیان آ گئے تھے بولے "میاں قدرت اللہ، جوش صاحب اپنی جنسی فتوحات بیان کرنے پر اتنے موردِ الزام نہیں ٹھہرائے گئے جتنا کہ اس پر کہ اُنہوں نے اس سلسلے میں مبالغہ آرائی بہت کی۔"

قدرت اللہ کچھ لمحے پنڈت جی کو مسکراتے ہوئے تاکتے رہے پھر ہنستے ہوئے بولے "مبالغہ آرائی کا ثبوت آپ کی جیب میں ہے پنڈت جی؟ مبالغہ آرائی کا الزام بھی رشک و حسد کی ایک بگڑی ہوئی تصویر ہے۔ اچھا صاحب، مان لیا کہ جوش نے جھوٹ بولا۔ کیوں؟ اپنی آپ بیتی کو دلچسپ بنانے کے لیے۔ نیک اور پارسا لوگوں کو منہ چڑانے کے لیے۔ اپنی قوتِ مردانگی کا ڈھنڈورا پیٹنے کے لیے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اُس نے کہیں آپ سے اپنے نیک اور شریف ہونے کے سرٹیفکیٹ لینے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اس کے جھوٹ میں دل آزاری۔ اس کی سچی میں مکاری اور اس کی شوخیوں میں ریاکاری کا کوئی ادنیٰ سا بھی شائبہ نہیں ملے گا۔"

"نہیں ملے گا تو ہماری بلا سے لیکن آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں جو سراپا

مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

کی تفسیر بنے ہوئے ہیں۔" پنڈت جی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"جو کہنا چاہتا ہوں اس کے سننے کی تاب ہو تو سنیے۔" قدرت اللہ اپنی کرسی پر اکڑ کر بیٹھ گئے۔ "کل رات ایک ثقہ بزرگ کی خودنوشت پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ان کا ہر کام خدا کے فضل سے ہوتا تھا۔ اسکول گئے تو باجی اور بدمعاش لڑکوں اور ساتھیوں سے سابقہ پڑا۔ لیکن خدا کے فضل سے اُن کے دامنِ عصمت پر گندگی کی ایک چھینٹ نہ آئی۔ کالج پہنچے تو شیطان کے ورغلانے سے بدعقیدہ ہو گئے۔ لیکن پھر خدا کے فضل سے راہِ راست پر آ گئے اور اس طرح توبہ اور استغفار کی راکھ سے اپنے جذباتِ ایمانی اور وارداتِ روحانی کو چمکا کر پیش کرنے کے بہت سے مواقع ہاتھ آ گئے۔ اور پھر حالات کی مجبوری سے بے چارے کو دوسری شادی کرنا پڑی۔ شرعی مہر پر۔ چند مہینے عدل کے ساتھ دونوں بیویوں کے ساتھ فرائضِ زوجیت ادا کرنے کے بعد خدا کے فضل سے دوسری بیوی کو بڑے شرعی انداز میں طلاق دے دی۔ یعنی جب وہ میکے گئی ہوئی تھیں تو بذریعہ ڈاک طلاق نامہ اور بذریعہ منی آرڈر مہر اور عدت کے دنوں کا نان نفقہ پائی پائی کا حساب کر کے بھیج دیا۔ اپنے آپ کو نیک اور شریف ظاہر کرنے کے لیے بے چارے کو سخن سازی کے کیسے کیسے ہفت خواں طے کرنا پڑے، جن کے سامنے جوش کے معاشقے کسی بچے کی معصوم شرارتیں معلوم ہوتی ہیں۔"

قدرت اللہ ابھی کچھ اور کہنے والے تھے کہ پنڈت جی یہ کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے — "میاں قدرت اللہ! تم لکڑی کی تختیوں پر لکھوا لاؤ۔ "ہم نیک اور شریف نہیں ہیں۔" اور ہم لوگ اُنہیں اپنے گھروں کے دروازوں پر لٹکا لیں گے۔"

●●

وفیات

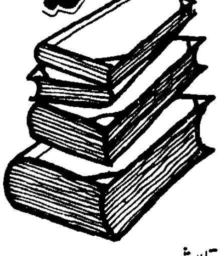
۱۰ اپریل ۱۹۹۰ء کی رات کو وہ ہوا جس کا دھڑکا سب کو تھا، مگر یقین کسی کو نہ تھا۔ دانشور، عالم، ماہرِ اسلامیات اور شرافت و نیک نفسی کے پیکر پروفیسر مشیر الحق کشمیری دہشت گردوں کے ہاتھوں اغوا کے بعد قتل کر دیے گئے۔ صدمہ اُن کی موت کا، غصہ اُن کے قتل کا اور ماتم اُن لوگوں کی عقل کا ہے جو موت کو زندگی کا بدل سمجھتے ہیں۔

ادارہ ان کی موت پر سوگوار ہے اور ان تمام لوگوں کے غم میں برابر کا شریک ہے جو ان کی موت سے غمگین ہیں۔

۲۰۔ اپریل کو اردو کے مشہور کہانی کار، ادیب اور محقق ڈاکٹر برج پریمی مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ وہ ۵۵ برس کے تھے۔

ڈاکٹر برج پریمی چھ کتابوں کے مصنف تھے ان دنوں وہ کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ادارہ مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت کرتا ہے۔

نئی کتابیں



نام کتاب : تلاش

شاعر : خالد سہیل

ناشر : اردو انٹرنیشنل پبلشرز، ۱۲۹۶۔ بلور اسٹریٹ (ویسٹ) ٹورنٹو، کینیڈا

قیمت : دس ڈالر

ڈاکٹر خالد سہیل اردو کے جواں سال اور جواں فکر شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ اس شعری مجموعے میں غزلیں ہیں، نظمیں ہیں، آزاد نظمیں اور قطعات بھی۔ لیکن انہیں ہیئتی تقسیم کے بجائے فکر کی تازہ کاری اور وسعت اظہار کی جدت، زبان کے ایک نئے انداز اور منفرد اسلوب کے پیش نظر دیکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔ خالد سہیل کی خصوصیت ان کی فکر کی تازگی اور اظہار کا نیا پن ہے۔ ان کے یہاں ہر لمحہ قاری ایک نئے تجربے سے دوچار ہوتا ہے۔ ان کے اشعار پڑھتے وقت ان کے اندر تازگی اور توانائی کا جو احساس ہوتا ہے۔ وہ اردو شاعری میں عام نہیں ہے۔

خالد کے ذوقِ سفر نے انہیں نئے افق سے آشنا کیا اور نئے افق سے پھوٹنے والی شفق نے ان کی شاعری کو نئے نئے رنگ عطا کئے' اس لیے ان کی شاعری میں اتنی طرح کے رنگ نظر آتے ہیں کہ نگاہیں حیرت زدہ رہ جاتی ہیں۔

خالد سہیل نے "تلاش" کے پہلے حصے کا عنوان "چلو غزل کی نئی اک زباں تلاش کریں" رکھا ہے اور انہوں نے اس کی زبان کے تلاش کرنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے بلکہ اپنی شاعری میں برتا بھی ہے۔ خالد سہیل کی غزل ہی میں نہیں بلکہ ان کی پوری شاعری میں اس نئی زبان کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ زبان ان کے استعاروں، پیکروں اور تشبیہوں میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اس زبان کی خصوصیت اس کی سادگی ہے۔ خالد سہیل کی یہ ایک خوبی ہے کہ وہ فکر اور تجربے کو زبان پر عائد نہیں کرتے۔ بلکہ اسے زبان کے سہارے چھوڑ دیتے ہیں۔ زبان جس طرح کا قالب مناسب سمجھتی ہے دے دیتی ہے۔ اسی لیے ان کے کلام کو پڑھتے وقت ایک اپنائیت اور زندگی سے اس کی قربت کا احساس ہوتا ہے۔ خالد سہیل نے کہا ہے کہ ؎

مرے قلم کی خموشی یہ کہہ رہی ہے سہیل
کچھ اپنے دل پہ گزرتی تو شاعری کرتے

خالد سہیل کے لیے شاعری صرف تخیل آرائی اور ہجر و وصال کے خیالی قصے نہیں ہیں۔ وہ ان کے لیے زندگی کے حادثات اور واقعات سے عبارت ہے۔ وہ انہیں روز کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور محرومیوں کو الفاظ کا جامہ دے دیتے ہیں

ہر نئے زخم سے معیار بدلتا ہے سہیل
قربتوں کو نئے انداز سے پرکھا ہم نے

بہت یقین تھا جن پہ سراب ہوا معلوم
سنی سنائی یہ سب راویوں کی باتیں ہیں

نکلنا چاہیں تو ہم لڑکھڑا کے جاتے ہیں
یہ کیا عذاب ہے کن دائروں میں اترے ہیں

سائل زیست کے دروازے پر کب سے کھڑا یہ دیکھ رہا ہے
بہرے کو اک گیت کا تحفہ اندھے کو اک پھول ملا ہے

خالد سہیل ماہر نفسیات ہیں اس لیے ان کی نگاہیں جذبے کی اس تہہ تک پہنچ جاتی ہیں، جہاں عام نگاہوں کے لیے دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ وہ بہت سی چیزوں میں لاشعور کی تہوں کو تلاش کر لیتے ہیں یا ان کی نگاہ بعض مسائل میں ایسے گوشے نکال لیتی ہے جو دوسروں کی نگاہوں میں نہیں آتے۔

خالد سہیل کی شاعری میں عورت بہت اہم جگہ رکھتی ہے۔ یوں تو دنیا کی تمام شاعری کے بیشتر حصے کی بنیاد عورت ہے۔ لیکن خالد سہیل کے یہاں اس کی نوعیت دوسری ہے۔ وہ صرف معشوقہ یا دوست نہیں ہے بلکہ وہ ان کی ذات کی شناخت ہے اور اس کی کوئی ایک شکل نہیں ہے۔ وہ طرح طرح سے ان کی شاعری میں نظر آتی ہے۔

مدتوں بعد ترے رشتے سے خود کو جانا
تجھ کو پایا تو مری خود سے ملاقات ہوئی

تکمیل اور عورت سے رشتہ نظموں میں بھی عورت کی یہی نرم و نازک تصویر نظر آتی ہے۔ لیکن 'تلاش' کا وہ حصہ جس کا عنوان 'یہ مرا جسم ہے یہ مری زندگی' عورت کے بالکل دوسرے تجربے سے ہم دوچار ہو جاتے ہیں۔ اور میرے خیال میں اردو شاعری میں یہ محسوسات اور تجربات کہیں اور نہیں ملتے۔ اس حصے میں خاص طور پر 'خون کے آنسو' 'سرخ دائرہ' 'ماں بننے سے پہلے اور بعد' تسلی اور Lesbian ایسی نظمیں ہیں جو اپنے موضوع اور اظہار و بیان کے اعتبار سے بالکل منفرد ہیں۔ "روح کے زخم" کے تحت کچھ قطعات اور نظمیں ایک اور نئے تجربے کو پیش کرتی ہیں۔ ان قطعات اور نظموں میں بعض ذہنی مریضوں کے محسوسات اور کیفیات خالد سہیل نے گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے۔ وہ ڈاکٹر ہیں اور ایسے مریضوں کی ذہنی گرہوں سے بخوبی واقف ہیں۔ اس لیے انہیں ان کے مطالعے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی اور وہ اسے بڑی خوب صورتی کے ساتھ کاغذ پر منتقل کر دیتے ہیں۔ انہیں ہر روز نئے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اور وہ اس کے ذہن میں اتر کر کوئی نہ کوئی چیز تلاش کر لیتے ہیں۔ اس ذوق جستجو نے ان کی شاعری میں ایسا نیاپن شگفتگی اور تازگی پیدا کی ہے جو اردو شاعری میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔

(شارب ردولوی)

نام کتاب : نوائے سرور
شاعر : سید محمد سرور
قیمت : ۲۰ روپے
ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

سید محمد سرور صاحب ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اس سے پہلے ان کا ایک مجموعہ "ارمغانِ کیرالا" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ وہ کیرالا کے ایک ممتاز اور منفرد شاعر ہیں۔ ان کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کے مجموعہ پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا عبدالماجد دریاآبادی، محوی صدیقی لکھنوی، ڈاکٹر صفدر آہ سے لے کر جدید شاعر و نقاد ڈاکٹر شمیم حنفی و مخمور سعیدی کی آرا موجود ہیں۔ جن میں ان حضرات نے سرور صاحب کی شاعری، ان کی زبان اور فکر کی تعریف کی ہے۔

سرور صاحب کی حیثیت کیرالہ میں "بابائے اردو" کی ہے۔ انہوں نے اردو درس و تدریس بلکہ اردو تبلیغ کا کام کیا ہے اور آج بھی اسی انہماک سے وہ اس کام میں معروف ہیں۔ کیرالا میں جو بھی اردو والا نظر آئے وہ کسی نہ کسی طرح ان کا شاگرد ضرور ہوگا۔

سرور صاحب کے کلام پر علامہ اقبال کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ ان کی نظمیں اسی طرح کے موضوعات پر ہیں اور بیشتر غزلیں مسلسل غزلیں ہیں۔ سرور صاحب کی مادری زبان ملیالم ہے۔ لیکن انہیں عربی، فارسی اور اردو پر قدرت حاصل ہے۔ ان کی شاعری سے یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ ان کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ وہ اہلِ زبان کی طرح اردو لکھتے اور شعر کہتے ہیں اور انہیں اس کے اظہار پر پوری قدرت ہے۔

ثاقب ردولوی

نام کتاب : پیکرِ خیال
شاعر : سعد حسین سعد صدیقی
ملنے کا پتہ : پیراماؤنٹ ایجوکیشن بورڈ حیدرآباد
قیمت : ۲۵ روپے

"پیکرِ خیال" جناب شیخ سعد حسین سعد صدیقی کے منظوم ترجموں اور نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ دیباچے میں پروفیسر ڈاکٹر سیدہ جعفر، شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے بجا طور پر فرمایا ہے: "شعری تخلیق کو دوسری زبان میں اس کے بنیادی اور ضمنی تاثرات کے ساتھ منتقل کرنا ایک مہارت طلب کام ہے اور اس سے وہی مترجم عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جنہیں دونوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل ہو۔" البتہ جب وہ یہ فرماتی ہیں کہ سعد حسین سعد نے "عربی اور انگریزی سے اردو میں جو منظوم ترجمے کیے وہ اس اعتبار سے قابلِ قدر ہیں کہ ان میں اصل کے حقیقی خدوخال مسخ نہیں ہوئے بلکہ پوری طرح موجود رہتی ہیں۔ رابرٹ فراسٹ وغیرہ کی نظموں کے ترجمے بے حد پُراثر ہیں اور ان میں اصل کا لطف پیدا ہو گیا ہے"، تو سخن در این است۔

خطۂ حیدرآباد اس لحاظ سے بہت غنیمت ہے کہ وہاں اب بھی اردو کلچر پایا جاتا ہے اور علم و ادب کو لبرل تعلیم اور تہذیب و تربیت کا جزو لاینفک سمجھا جاتا ہے۔ سعد صاحب ماشاءاللہ ایک آئی اے ایس افسر ہیں اور شوقیہ طور پر انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کر لیتے ہیں۔ لیکن اس شوق کو سنجیدگی کا درجہ دینا زیادتی ہوگی۔ پروفیسر یوسف سرمست شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے رابرٹ فراسٹ کی مشہور نظم کے آخری بند (جو پنڈت نہرو کو بہت عزیز تھا) کے ترجموں میں سعد کے ترجمے کو سلام مچھلی شہری، نسیم قادری، ریورنڈ ہبنس، میر یٰسین علی کے ترجموں سے افضل مانا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بہترین ترجمے کی ساری خوبیاں اس میں موجود ہیں۔" لیکن ان کا یہ جملہ بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے:-
"سعد میرے بچپن کے دوست ہیں۔"
بہرحال فراسٹ کا بند ہے:

The woods are lovely dark and deep
But I have promises to keep
And miles to go before I sleep
And miles to go before I sleep

اس کا ترجمہ سعد صاحب نے یوں کیا ہے:

ان گھنے جنگلوں کے سائے تو خوبصورت ہیں دل
لبھاتے ہیں
ان کے جنت بھرے نظاروں میں لوگ اپنے کو
بھول جاتے ہیں
ان سے پیارے ہیں مجھ کو پیماں کچھ، کوئی صورت
جنہیں نبھانا ہے
نیند آنے سے پہلے مجھ کو تو، سینکڑوں میل چل کے
جانا ہے

فراسٹ جنگل کو دلکش، گھنا اور پُراسرار کہتا ہے۔ مترجم جنگل کے سائے کو دلکش بتاتا ہے۔ جب کہ نظم کے اوّلین بند واضح کرتے ہیں کہ شام کا وقت ہے اور برفباری ہو رہی ہے لہٰذا سائے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ پھر پُراسرار کا مفہوم غائب ہے اور اس کی جگہ دوسرا مصرع محض بھرتی کا لگا دیا گیا ہے۔ تیسرے مصرع میں جنگل اور پیمان کا تقابل ہے جو اصل نظم میں نہیں۔ مزید برآں "پیماں کچھ" اور "کوئی صورت" غیر شاعرانہ ٹکڑے ہیں۔ یوں بھی "کوئی صورت" کی جگہ "کسی صورت" ہونا چاہیے۔ چوتھے مصرعے میں شاعر سونے کا ذکر کرتا ہے اور مترجم "نیند آنے" کا۔ اس طرح "میلوں" کی جگہ "سینکڑوں میل" اور گھوڑے پر سوار آدمی کے لیے "چل کے جانا" محلِ نظر ہے۔ کم از کم راقم کی رائے میں یہ ترجمہ نہ تو صحیح ہے اور نہ شاعرانہ۔

مہدی عباس حسینی

نام کتاب : بدلتے موسم کی آہٹ
شاعر : اشہر ہاشمی
قیمت : ۲۲ روپے
ملنے کا پتہ : رائٹرز سرکل ہوڑہ، ۹ سری ناتھ پورل لین ہوڑہ ۱۱۱۰۱

ناآسودگی اور بے اطمینانی عصری شاعری کا غالب ترین محرک بھی ہے اور موضوع بھی۔ لیکن حالات کا وہ جبر جو اس ناآسودگی اور بے اطمینانی کا سبب بنتا ہے اپنی مختلف تراکیب کے ساتھ ہر شاعر میں ردِ عمل کی منفرد صورتیں پیدا کرتا ہے۔ غم، غصہ یا احتجاج کے اظہار کے ان گنت انداز ممکن ہیں۔ کوئی طنز و تضحیک کا سہارا لیتا ہے۔ تو کوئی برہمی اور اشتعال سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ اور کوئی دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ جبر کے اس موسم کے بدلنے کے خواب بھی دیکھتا ہے بلکہ شاید عالمِ خیال میں اس کی آہٹ بھی سنتا ہے۔

"بدلتے موسم کی آہٹ" مغربی بنگال کے نوجوان شاعر اشہر ہاشمی کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے اس لحاظ سے قابلِ قدر ہے کہ اس میں شاعر کے فکری رویوں کے خدوخال بخوبی نمایاں ہیں۔ یہ اس لیے ممکن ہو سکا کہ اشہر نے فیشن یا دوسروں کی نقالی میں کچھ نہیں کہا ہے نہ ہی نئے پن کی لایعنی جستجو میں بھٹکے ہیں۔ جو کچھ اور جس طرح محسوس کیا یا سوچا اُسے عصری لب و لہجہ میں بیان کر دیا۔

"بدلتے موسم کی آہٹ" کا موسم حاضر خزاں ہے جسے ہم خزاں کے روایتی تصور کی توسیع کہہ سکتے ہیں۔ خزاں اور اس کے تلازمات اشہر کی شاعری میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ پیاسی زمین، خشک پتے، دھول، گرد، دھندلاہٹ اور ویرانی اشہر کے کینوس کے نمایاں نقوش ہیں۔

کب نہ تھی ایک پیلی دری چار سو
پھول پتوں پہ جبر خزاں کب نہ تھا
اس کی یاد کا مجنوں نکا بھی
اوڑھے ہوئے ہے گہری دھول۔

خزاں رسیدہ اُمنگوں کے درمیاں رہنا
نصیب شوق میں لکھا ہے نیم جاں رہنا

خزاں اور اس کے تلازمات کا یہ تواتر خود کو دوہرانے کا عمل نہیں بلکہ مقصود اس ماحول کی نشاندہی ہے جس میں شاعر جینے پر مجبور ہے۔

اشہر کی ایک ادا جو متوجہ کرتی ہے یہ ہے کہ انہوں نے کسی بھی ناگوار صورتِ حال کے لیے کسی دوسرے کو قصوروار ٹھہرایا ہے اور نہ اس کا کوئی حل پیش کیا ہے۔ ان کا لب و لہجہ انقلابی ہے نہ مجذوبانہ اور نہ فلسفیانہ۔ موسم کے بدلنے کی آہٹ وہ ضرور سنتے ہیں، لیکن آنے والے موسم کی کسی انوکھی رنگینی کا تذکرہ نہیں کرتے۔ اس کے برعکس بیتے موسموں (خزاں سے پہلے کی بہار) کی یاد اُن کو اکثر آتی ہے۔ اور شاید وہ اسی پر قانع بھی ہیں۔

گاؤں، گلابی جاڑے، لڑکے، ناؤ، ندی اور دھوپ
ماہ و سال میں اس اک دن کو جینا جانتے ہم

اشہر کے بانکپن اور کج کلاہی کے انداز بھی نرالے ہیں۔ مثلاً انہیں بارش میں بھیگنے پر اعتراض نہیں بلکہ وہ اس سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں بشرطیکہ ہاتھ میں چھتری نہ ہونے کی مجبوری نہ ہو۔

کبھی ہلکی ہلکی سی بارش بھگونے کو آئے مجھے بھی
میں کچھ اس تکلف سے بھیگوں کہ جیسے میں بھیگا ہوں

پہلے دن بارش میں بھیگا کیسی محرومی کے ساتھ
بھیگنے کی آرزو تھی ہاتھ میں چھتری نہ تھی

تعلق کی ناپائیداری اور تجدیدِ تعلق کی آرزو کے ساتھ اشہر کے یہاں تعلق کا ترک نہیں بلکہ تعطل ہے۔

اک تعطل کی فضا سر پہ افق تا بہ اُفق
تم سے جا ملنے کی سب بند سبیلیں یا ہیں

خط سے کبوتر اب بیگانہ رہتا ہے
ٹیلی فون کے تار پہ بیٹھا رہتا ہے

ملو آواز کی لہروں پہ شاید
"بزر" بجتے ہی چونکتا ہوا ہوں

ابھی تک اشہر کے چند نمایاں شعری رویوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور محولہ بالا اشعار ان کی شاعری کی پوری نمائندگی نہیں کرتے۔ مجموعے میں اچھے اشعار کی کمی نہیں۔ مثلاً:

شاید اب اس کے بعد خزانے پہ ہاتھ ہو
اب تک تو آگے کتنے ہی دروازے آئے ہیں

ساتویں در کے بعد بھی اشہر
اک نہ اک در کا مرحلہ موجود

زبان و بیان کے سلسلے میں اشہر کی شاعری کو ارتقا کے مراحل طے کرنے ابھی باقی ہیں۔ محض جذبہ و احساس کافی نہیں۔ اس کے لیے سخت ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ مجموعی طور پر "بدلتے موسم کی آہٹ" اس اعتبار سے قابلِ توجہ ہے کہ یہ ایک نوجوان شاعر کی پہلی کتاب ہے۔

محمد اعظم

بقیہ : ملاحظات

اور کاریگروں کو مزید امداد دینے کے لیے انہیں کم شرح سود کے قرضے دلائے جائیں گے اور اُن کے تیار کردہ مال کی فروخت کے لیے مرکزی اور ریاستی سطح پر اہتمام کیا جائے گا۔

زراعت پر مبنی صنعتوں کے فروغ کے لیے اُن منصوبوں کی خاص طور پر حوصلہ افزائی کی جائے گی جو کسانوں کے اشتراک سے قائم کیے جائیں۔ مالیاتی ادارے ایسے کارخانوں کو قرضے دینے کے کام کو ترجیح دیں گے۔ بینک بھی دیگر صنعتوں کے مقابلے میں ان صنعتوں کو زیادہ ترجیح دیں گے۔

ملک فردوس

مکتوبات

اضافہ

مارچ ۱۹۹۰ء کے آج کل میں ردولی سے متعلق مضمون میں شارب ردولوی سے سہواً ایک ایسے شاعر کا نام اور ذکر قلمبند ہونے سے رہ گیا ہے جو تقسیمِ وطن سے پہلے خاصی شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکے تھے، وہ ہیں: واقف صدیقی ردولوی۔ جن کا وطن ردولی تھا، لیکن اُن کی زندگی کا بڑا حصہ بھوپال میں گزرا۔ میرے قریبی شناساؤں میں تھے ان کی اہلیہ سعیدہ بانو ہاشمیہ مولوی عبدالرزاق کانپوری مرحوم (مصنف البرامکہ) کی نواسی تھیں۔ جو خود بھی مشہور افسانہ نگار تھیں۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مولوی عبدالرزاق کانپوری مرحوم تقسیمِ وطن سے پہلے تک بھوپال ہی میں قیام پذیر تھے۔

واقف صدیقی ردولوی دہلی سے نکلنے والے متعدد ادبی رسائل کے مدیر بھی رہے۔ بٹوارے کے بعد ان کی کوئی خبر آج تک نہیں۔ اسی طرح سعیدہ بانو ہاشمیہ کی بھی کوئی تحریر عرصے سے نظر سے نہیں گزری۔

واقف صدیقی کا ایک مقطع ذہن میں محفوظ ہے:

حضرتِ واقف کی صورت دیکھیے
آپ بھی ہیں مدح خوانِ میکدہ

عشرت قادری، بھوپال

سُنی سُنائی:

"آج کل" (مارچ ۱۹۹۰ء) میں ردولی پر جناب شارب ردولوی کا مضمون پڑھا۔ شارب صاحب نے سُنی سُنائی باتوں پر اپنے مضمون کا ڈھانچہ تیار کیا ہے۔ شاید انہیں نہیں معلوم کہ ترقی پسند مصنفین کی پہلی کل ہند کانفرنس کے لیے جس کی صدارت سورگیہ منشی پریم چند نے کی تھی جو مجلسِ استقبالیہ بنائی گئی تھی، اس کے صدر چودھری محمد علی ردولوی تھے۔ انھوں نے کانفرنس کے اخراجات کے لیے ایک سو روپے بھی دیے تھے۔

شارب صاحب نے پنڈت ہزاری لال کو مجاہدِ آزادی لکھا ہے۔ حالانکہ وہ کبھی مجاہدِ آزادی ان معنوں میں نہ تھے کہ دیش کی آزادی کے لیے کوئی قربانی دی ہوتی یا کبھی جیل گئے ہوتے یا کبھی سزا کاٹی ہوتی۔ ہاں آزادی کے بعد وہ ضرور سامنے آئے تھے۔ مگر ردولی کے سب سے بڑے مجاہدِ آزادی قاضی حبیب الحق نے جو آچاریہ نریندر دیو، ڈاکٹر لوہیا اور جواہر لال نہرو کے ہم عصر تھے۔ پنڈت ہزاری لال کی طرح کے لوگوں کے راتوں رات مجاہدِ آزادی بننے کے بعد کانگریس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔

پروانہ ردولوی، دہلی

عِلمی گناہ:

جناب شارب ردولوی کا مضمون: "ایک مردم خیز خطہ: ردولی (مارچ ۱۹۹۰ء) معلوماتی ہونے کے باوجود اپنا تاثر چھوڑنے میں ناکام رہا۔

میجر جنرل (سبکدوش) ایس. ایم جینس (پی وی ایس ایم) مضمون میں جگہ نہیں پا سکے جنہوں نے بنگلہ دیش کی جنگ میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اسی طرح مشہور مجاہدِ آزادی پارلمان اور صحافی انصار ہاروانی، صفیہ اختر، حبیب الحق قاضی اور پروانہ ردولوی کے نام مضمون میں شامل نہ کر کے شارب صاحب نے علمی گناہ کا ارتکاب کیا ہے اور پنڈت ہزاری لال کو مجاہدِ آزادی کی صف میں کھڑا کر کے موصوف نے نئی سیاسی تاریخ لکھنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

جناب مطیر کا اصل شعر یوں ہے:

اور ہوں گے جو طلب کرتے ہیں ثروت تجھ سے
لا زمانے کی مجھے بے سروسامانی دے

رفعت عزمی، ردولی

مماثلت:

شارب ردولوی صاحب کا مضمون: ردولی: ایک مردم خیز خطہ میرے اس خط کا محرک بنا ہے۔ ہمارے شہر سہسرام میں بھی ردولی جیسے ہی رسم و رواج ہیں۔

بقیہ صفحہ ۲ پر

اردو کا مقبولِ عام معتبر ماہنامہ

آج کل

نئی دہلی

سب ایڈیٹر
خورشید اکرم

جلد : ۴۸ شمارہ : ۱۲

جولائی ۱۹۹۰ء اساڑھ۔ساون شک سمت ۱۹۱۲

قیمت : دو روپے فون : ۳۸۷۰۶۹

سرورق : ایم۔ایم۔ملک

اندرونِ ملک زرِ سالانہ : ۲۰ روپے
دو سال کے لیے : ۳۶ روپے
تین سال کے لیے : ۴۸ روپے

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :
ایڈیٹر: آج کل (اُردو)
پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

بزنس منیجر: جسونت سنگھ
ڈپٹی ڈائریکٹر (پروڈکشن) وائی۔کے۔ ملہوترہ
اسسٹنٹ بزنس منیجر: شکنتلا

ترسیلِ زر کا پتہ :
بزنس منیجر
پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترتیب

صنعتی ترقی

سالویں پنجسالہ منصوبے کے دَوران صنعتی ترقی کے میدان میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس منصوبے کے پہلے چار سالوں میں صنعتی پیداوار اپنے مقررہ نشانے سے زیادہ ہوئی ہے۔ اس مدت کے دَوران بحیثیت مجموعی صنعت کی اوسط ترقی ۸٫۵ فیصد رہی۔ جب کہ سازو سامان تیار کرنے کے سیکٹر میں یہ اوسط ترقی ۹ فیصد رہی۔ سازو سامان تیار کرنے کے سیکٹر میں مختلف صنعتی گروپوں میں پیداواری کامیابی مقررہ نشانوں سے زیادہ رہی ہے۔ غیر الیکٹریکل مشینری، الیکٹریکل مشینری، غیر فلزاتی معدنی اشیاء، کیمیاوی اشیاء، چمڑا، فر اور ربر والی اشیاء اور متفرق قسم کی اشیاء تیار کرنے والی اور دھاتوں سے اشیاء تیار کرنے والی صنعتی پیداوار نشانے سے زیادہ رہی ہے بنیادی طور پر دھاتیں استعمال کرنے والی صنعت میں پیداواری کامیابی مقررہ نشانے سے ذرا کم ہے۔ کچھ صنعتیں ایسی ہیں، جن میں مقررہ نشانوں کے مطابق پیداوار نہیں ہوئی ہے۔ غذائی اشیاء، مشروبات اور تمباکو، ٹیکسٹائل اشیاء (ملبوسات اور مختلف اقسام کا کپڑا، چوب اور چوبی اشیاء ٹرانسپورٹ میں استعمال کیا جانے والا سازو سامان تیار کرنے والی صنعتوں میں مقررہ نشانوں کے مقابلے میں پیداوار کم ہوئی ہے۔

سال ۹۰-۱۹۸۹ء ساتویں منصوبے میں ایک نئے موڑ کا حامل سال کی اہمیت رکھتا ہے۔ نومبر ۱۹۸۹ء تک اصل کامیابی اور مالیاتی سال کے آخر تک متوقع کارکردگی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سازو سامان تیار کرنے والے سیکٹر میں اور بحیثیت مجموعی صنعتوں کے سیکٹر میں پیداواری کامیابی مقررہ نشانے تک ہو جائے گی۔ ویسے سال ۹۰-۱۹۸۹ء کے دوران صنعتی سیکٹر میں کارکردگی کی رفتار دھیمی ہوئی ہے۔ مرکزی اعداد و شمار کی تنظیم سے صنعتی پیداوار سے متعلق جو اعداد و شمار دستیاب ہوئے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپریل ۱۹۸۹ء کے دوران مجموعی طور پر صنعتی ترقی کی شرح ۵٫۲ فیصد رہی جب کہ پیداوار کے لحاظ سے سازو سامان تیار کرنے والے سیکٹر میں ۳٫۵ فیصد، کانکنی میں ۱۸٫۵ فیصد بجلی میں ۱۲٫۱ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ اس مدت کے دوران شرح ترقی ۵٫۲ فیصد رہی۔ سال ۸۹-۱۹۸۸ء میں یہی شرح ترقی بڑی متاثر کن ۸٫۸ فیصد رہی۔ جب کہ سازو سامان تیار کرنے والے سیکٹر میں ترقی کی شرح ۸٫۹ فیصد، کانکنی میں ۷٫۹ فیصد، بجلی میں ۹٫۶ فیصد رہی۔ صنعتی پیداوار کے اعداد و شمار کے مطابق الیکٹریکل مشنری، ٹیکسٹائل اشیاء، مشروبات، تمباکو والی اشیاء تیار کرنے والی صنعتوں کی ترقی کی شرح دس فیصد سے زیادہ رہی ہے۔ جوٹ تیار کرنے والوں، غذائی اشیاء، چوب و چوبی اشیاء اور بیسک میٹل والی صنعتوں میں ترقی کی رفتار منفی رہی ہے۔ غیر فلزاتی، معدنی اشیاء تیار کرنے والی صنعتوں کی شرح ترقی ۱٫۱ فیصد سے لے کر دیگر سازو سامان تیار کرنے والی صنعتوں کی شرح ترقی ۹٫۱ فیصد تک رہی۔ بجلی، کوئلہ، قابل فروخت اسپات، خام پٹرولیم، پٹرولیم، ریفائنری پروڈکٹس اور سیمنٹ پر مشتمل بنیادی ڈھانچہ والی صنعتوں کی مخلوط ترقی اپریل تا جنوری ۹۰-۱۹۸۹ء میں ۶٫۶ فیصد رہی ہے۔

صنعتی ترقی کے لیے اقدامات :

معیشت کی بدلتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے پالیسی میں بھی ترمیم کی گئی ہے۔ صنعتی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے، سرمایہ کاری میں آزادی فراہم کرنے اور صنعتی استعداد بڑھانے اور مقابلہ کرنے کی قوت میں اضافہ کرنے ٹکنالوجی کو بہتر بنانے، صلاحیت کا بھرپور استعمال کرنے اور برآمدات میں تیزی لانے کے مقاصد کو مدِنظر رکھتے ہوئے صنعتی پالیسی میں وقتاً فوقتاً تبدیلی کی جاتی رہی ہے۔

دور مواصلات سے متعلق سازو سامان کمیونی کیشن، ٹرمینل ایکوپمنٹ، مائیکرو پروسیسر پر مبنی صنعتی کنٹرول سے متعلق انسٹرومینٹیشن سسٹم اور کمپیوٹر پیری پھیرلس Peripherals جن میں کئی بورڈ اور مانیٹر شامل نہیں ہیں، پہلے لازمی طور پر لائسنس لینے کی فہرست میں شامل تھے اب مذکورہ فہرست سے خارج کر دیے گئے ہیں۔ اور اس طرح لائسنس سے مستثنیٰ ہو گئے۔ تمام کپڑا

بُننے والے ان یونٹوں کو بھی لائسنس لینے کی شرط سے بھی مستثنیٰ کر دیا گیا ہے جن میں ۵۰ سے کم افراد کام کرتے ہیں۔

صنعتوں کی ۳۱ زمروں کو جو تجارتی سرگرمی کی اجارہ داریوں کو محدود رکھنے کے قانون (MRTP) اور غیر ملکی زرِ مبادلے کو باضابطہ بنائے رکھنے کے قانون (الیف۔ای۔آر۔اے) کے تحت نہیں آتے ہیں۔ لائسنس کی شرط سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح ۲۷ مخصوص صنعتوں کو جو ایم۔آر۔ٹی۔پی اور فیرا (الیف۔ای۔آر۔اے) کے تحت آتی ہیں، لائسنس کی شرط سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ یہ رعایت ان پر لاگو ہوگی جنہوں نے ۸۹-۱۹۸۸ء تک مخصوص کیے گئے پس ماندہ علاقوں میں صنعتی یونٹ لگائے ہیں۔

کم سے کم اقتصادی سطح حاصل کرنے سے متعلق اسکیم ( ) سال ۸۷-۱۹۸۶ء میں شروع کی گئی تھی۔ یہ اسکیم ۹۰-۱۹۸۹ کے دوران مزید ۲۴ صنعتوں میں شروع کی گئی ہے۔ اس اسکیم کے تحت فائدہ اٹھانے والی صنعتوں کی کل تعداد اب ۱۰۸ ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ سال ۹۰-۱۹۸۹ء کے دوران ۱۸ صنعتوں کی کم سے کم اقتصادی صلاحیتوں میں اضافہ کیا گیا ہے۔

چھوٹے پیمانے کے سیکٹر میں تحقیق و ترقی کے کاموں اور آلودگی کو قابو میں رکھنے کے اقدامات کی حوصلہ افزائی کے لیے تحقیق و ترقی اور آلودگی کی روک تھام کے آلات کی لاگت کو پلانٹ اور مشینری کی موجودہ حد کے تخمینہ سے نکال دیا گیا ہے۔ چھوٹے پیمانے کے سیکٹر کے تحت آنے والے آئٹموں کی فہرست پر نظر ثانی کی گئی ہے۔ اس میں سے کچھ آئٹم نکال دیے گئے ہیں اور کچھ نئے آئٹموں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اس فہرست میں کل آئٹموں کی تعداد بڑھ کر ۸۳۶ ہوگئی ہے۔ ساتویں پنجسالہ منصوبے کے دوران چینی تیار کرنے سے متعلق لائسنس دینے کی پالیسی میں بھی نرمی برتی گئی ہے۔ زرعی تحقیق کی بھارتی کونسل کی منظوری سے صنعتی طور پر پسماندہ علاقوں میں چینی کی فیکٹریاں لگانے کے لیے بھی سہولیات فراہم کی گئی ہیں۔ یہ رعایت اس شرط پر دی گئی ہے کہ چینی تیار کرنے کی فیکٹریوں کی صلاحیت پانچ سال میں ۱۷۵۰ ٹی سی ڈی سے بڑھ کر ۲۵۰۰ ٹی سی ڈی ہو جائے گی۔

چھوٹے پیمانے کا سیکٹر:

گزشتہ سالوں میں چھوٹے پیمانے کے سیکٹر کی کارکردگی متاثر کن رہی ہے۔ خیال یہ تھا کہ پیداوار اور روزگار فراہمی کے میدان میں جو نشانے مقرر کیے گئے ہیں وہ پورے نہیں ہوں گے، لیکن ساتویں منصوبے کے آخر (۹۰-۱۹۸۹ء) میں مقررہ نشانوں کے مقابلے میں زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ الیکٹرانکس صنعتوں میں قابلِ ذکر کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ کل پیداوار میں ان کا ۳۸ فی صد حصہ ہے۔ اس سیکٹر سے سال ۸۸-۱۹۸۷ء کے دوران ۴۵۳۵ کروڑ روپے مالیت کا سامان برآمد کیا گیا ہے جب کہ سال ۸۷-۱۹۸۶ء کے دوران ۳۶۱۷ کروڑ روپے کی برآمدات عمل میں آئی تھی۔ اس طرح برآمدات میں ۲۵ فی صد اضافہ ہوا۔ سال ۸۸-۱۹۸۷ء کے دوران کل برآمدات میں اس سیکٹر کا ۲۸.۸ فیصد حصہ ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ سال ۸۷-۱۹۸۶ء کے دوران چھوٹے پیمانے کے سیکٹر سے ہونے والی کل برآمدات کا ۹۰ فیصد حصہ غیر روایتی آئٹموں پر مشتمل ہے۔

غیر روایتی اشیاء کی برآمدات میں تیار چمڑا، چرمی اشیاء، سمندری پیداوار، ڈبہ بند خوراک، گرم پوشاکیں، بُنی ہوئی اشیاء، کھیل کود کے سامان، سلے سلائے کپڑے، بیسک کیمیکل اشیاء، فارماکیوٹیکل اشیاء، کاز میٹک اشیاء، انجینئر کا سامان شامل ہے۔

حکومت کی یہ پالیسی ہے کہ اس سیکٹر کو دی جانے والی مالی امداد میں برابر اضافہ کیا جائے۔ حکومت نے اس سیکٹر کے لیے ادارہ جاتی قرضہ کی ضروریات کو تسلیم کرتے ہوئے اسے ترجیحی سیکٹر میں شامل کر لیا ہے تاکہ تجارتی بینکوں سے قرض دستیاب ہو سکے۔ یہ بینک ترجیحی سیکٹروں کو جو قرض مہیا کرتے ہیں، وہ ان کی طرف سے دیے جانے والے کل قرضوں کا ۴۰ فیصد حصہ ہوتا ہے۔ حکومت نے اس سیکٹر کی ترقی اور فروغ کے لیے متعدد اقدامات اٹھائے ہیں — حکومت نے چھوٹی صنعتوں کی ترقی سے متعلق ایک بینک (ایس۔آئی۔ڈی۔بی۔آئی) قائم کیا ہے۔ اس کا صدر دفتر لکھنؤ میں ہوگا۔ چھوٹی صنعتوں کے اس ترقیاتی بنک کا مجاز سرمایہ ۲۵۰ کروڑ روپے ہوگا۔ آگے چل کر یہ رقم ۱۰۰۰ کروڑ روپے ہو جائے گی۔ اس بینک میں دو طرح کے فنڈ ہوں گے۔ ایک فنڈ ترقیاتی امدادی فنڈ ہوگا اور دوسرا عام فنڈ ہوگا — بھارتی صنعتی ترقیاتی بینک کے پاس چھوٹی صنعتوں کے ترقیاتی فنڈ اور نیشنل ایکوئٹی فنڈ ہیں۔ وہ چھوٹی صنعتوں کے اس ترقیاتی بینک کو منتقل کر دیے جائیں گے۔ چھوٹے گاؤں اور زرعی پیداوار پر مبنی صنعتوں کو فروغ دینے کے لیے حکومت نے چھوٹے پیمانے کی اور زرعی و دیہی صنعتوں کے لیے ایک نیا محکمہ قائم کیا ہے۔

کھادی و گرام ادیوگ ایکٹ کے تحت دیہی صنعتوں کے دائرہ کو اور وسیع کیا گیا ہے۔ سال ۸۹-۱۹۸۸ء کے دوران موجودہ ۲۶ دیہی صنعتوں کی فہرست میں ۴ نئی دیہی صنعتوں کو شامل کیا گیا ہے۔ ان نئی دیہی صنعتوں میں انجینئرنگ اور الیکٹرانک کے آئٹم شامل ہیں۔

اہم دیہی صنعتوں میں پولی وستر تیار

کرنے کی صنعت ایک بڑی ہی اہم صنعت ہے۔ سال ۸۹ - ۱۹۸۸ء میں اس کی شروعات بڑے ہی شاندار ڈھنگ سے کی گئی۔

تحقیق و ترقی کی کوششوں کو بڑھاوا دینے کے لیے سائنسی و صنعتی تحقیق کی کونسل کا اشتراک تعاون حاصل کیا جا رہا ہے تاکہ کیمیاوی کھادی اور دیہی صنعتوں کے لیے ٹیکنالوجیوں کو فروغ دیا جا سکے۔

جولائی ۱۹۸۹ء میں وزرائے صنعت کی ایک کل ہند کانفرنس ہوئی تھی۔ اس میں دیہی علاقوں میں صنعتی فروغ کے بارے میں حکمتِ عملی پر غور کیا گیا۔ اس میٹنگ میں کچھ اہم فیصلے کیے گئے۔ یہ طے کیا گیا کہ آٹھویں منصوبے میں صنعتی فروغ اور دیہی روزگار کے لیے ہم نے جو حکمتِ عملی تیار کی ہے اس کا اہم جزو دیہی صنعتی فروغ ہونا چاہیے۔ اُمید ہے کہ اس حکمتِ عملی کے تحت مستفید ہونے والے گاؤوں کی تعداد دو لاکھ سے بڑھ کر ۳٫۵ لاکھ ہو جائے گی۔ کھادی و گرام ادیوگ کی فہرست میں جن صنعتوں کو شامل کیا گیا ہے، ان کی ترقی و فروغ کے لیے آٹھویں منصوبے کے دوران ہر ریاستی بجٹ میں بھی کافی گنجائش رکھی جائے گی۔ اس کے علاوہ ریاستی حکومتیں کھادی و دیہی صنعتوں کے بورڈوں کو مضبوط بنانے کے لیے موثر اقدامات کریں گی۔

پسماندہ علاقوں کو صنعتی طور پر ترقی یافتہ بنانے کے لیے سارے ملک میں ۱۰۰ ترقیاتی مرکز قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ان مراکز کو ملک میں دستیاب بہترین قسم کی بنیادی ڈھانچے والی سہولیات سے مزین کرنے کی تجویز ہے۔ ان میں بجلی، پانی، دور مواصلات اور بینکنگ کی سہولیات شامل ہیں۔ پہلے مرحلے میں ۶۱ ترقیاتی مراکز قائم کئے جائیں گے۔ ہر ترقیاتی مرکز کی تعمیر و تشکیل پر ۲۵ تا ۳۰ کروڑ روپے صرف کیے جائیں گے۔ لیکن اب ۷۰ ترقیاتی مراکز قائم کئے جا رہے ہیں۔

ترقیاتی مراکز کہاں کہاں قائم کیے جائیں ان مقامات کے انتخاب کے لیے مختلف ریاستی حکومتوں سے موصول ہونے والی تجاویز کا بغور جائزہ لینے کے لیے صنعتوں کی ترقی سے متعلق محکمے میں ایک بین وزارتی کمیٹی قائم کی گئی ہے۔ اب تک پچاس ترقیاتی مراکز کے لیے مقامات کا انتخاب کر لیا گیا ہے۔ امید ہے کہ اس اسکیم پر تیزی سے عملدرآمد ہوگا۔

تھوک قیمتوں کا عدد اشاریہ تیار کرنے کے طریقہ کار پر نظر ثانی کی گئی ہے۔ اب جولائی ۱۹۸۹ء سے ۸۲ - ۱۹۸۱ء کی قیمتوں کی بنیاد پر تھوک قیمتوں کا عدد اشاریہ تیار کرنے کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے! اس سے قبل ۷۱ - ۱۹۷۰ء کی قیمتوں کی بنیاد پر تھوک قیمتوں کا عدد اشاریہ مرتب کیا جا رہا تھا۔ اب نئے سلسلے کا دائرہ اجناس منڈیوں اور قیمتوں کے گوشوں کی شکل میں اور وسیع کر دیا گیا ہے۔ عدد اشاریہ کے پرانے سلسلے میں ۳۶۰ اشیا شامل تھیں، جب کہ نئے سلسلے میں ۴۴۷ اشیاء شامل ہیں۔ تھوک قیمتوں کے اس نئے عدد اشاریہ کی تیاری میں ملک میں بدلتی ہوئی اقتصادی صورتِ حال کو ملحوظِ خاطر رکھا جاتا ہے۔

●●

وَفیات

اردو کے مشہور مصنف اور صحافی اندر جیت لال کا ۵ جون ۱۹۹۰ء کو دہلی میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا۔ وہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو کوہ مری (ضلع راولپنڈی، پاکستان) میں پیدا ہوئے تھے۔

انہوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز روزنامہ "پرتاپ" نئی دہلی سے کیا۔ بعد میں وہ روزنامہ "بندے ماترم" نئی دہلی سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۸۶ء تک انڈین کاؤنسل فار ایگریکلچرل ریسرچ نئی دہلی میں انگریزی کے ایڈیٹر رہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ ہمہ وقت تصنیف و تالیف کے کام میں لگے رہتے تھے۔ انہوں نے معلوماتی سائنس، عمرانیات، ادب، فنونِ لطیفہ، طنز و مزاح اور صحافت پر کتابیں اور مضامین لکھے۔ وہ اردو، ہندی، انگریزی، پنجابی چاروں زبانوں میں لکھتے تھے۔ ترجمے سے بھی شغف تھا۔ اردو میں بیس کتابیں چھپیں۔

متعدد تصنیفات پر انہیں انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔

پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔

بزرگ افسانہ نگار اور ادیب کوثر چاندپوری کا ۱۳ جون ۱۹۹۰ء کو دہلی میں انتقال ہو گیا۔

ان کی پیدائش چاندپور ضلع بجنور یو پی میں ہوئی تھی۔ بعد میں وہ ترکِ سکونت کر کے بھوپال چلے گئے تھے۔ عمر کا ایک بڑا حصہ بھوپال میں گزارا۔ پھر بھوپال کو خیرباد کہہ کر دہلی چلے آئے۔ یہاں آ کر وہ ہمدرد سے وابستہ ہو گئے اور آخر دم تک اس سے وابستہ رہے۔ کوثر چاندپوری پیشے سے طبیب تھے۔

وہ نہایت زود نویس افسانہ نگار تھے۔ ان کے افسانے ہند و پاک کے تمام رسائل میں شائع ہوئے۔ تصنیف و تالیف کے معاملے میں وہ اب بھی تازہ دم تھے۔ انہوں نے تقریباً ۱۵۰ کتابیں تصنیف کیں جن میں ناول، افسانہ، سفرنامے، تحقیق، تنقید اور دیگر اصناف شامل ہیں۔

پسماندگان میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔

ادارہ مرحومین کے لیے دعائے مغفرت اور لواحقین کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔

آمین

●●

محمود انصاری

کمپیوٹر کے ذریعے کتابت

موجودہ دَور کمپیوٹر کا دَور ہے۔ وہ کون سا کام ہے جو کمپیوٹر کے ذریعے نہیں کیا جا رہا ہے۔ چند برسوں سے طباعت کے میدان میں بھی کمپیوٹر کا استعمال عام ہو چکا ہے۔ بیرونی ممالک میں ہی نہیں، ہندوستان میں بھی مختلف زبانوں کی طباعت کے لیے کمپیوٹر کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ اردو کی یہ بدقسمتی تھی کہ اس کے خطِ نستعلیق کے لیے کمپیوٹر کا استعمال ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ فارسی اور عربی زبانیں خطِ نسخ اختیار کر کے اولاً ہاتھ کی ٹائپ کمپوزنگ اور بعد ازاں مونو ٹائپ، لائینو ٹائپ اور فوٹو ٹائپ سٹنگ رائج کر لینے کے بعد کمپیوٹر کے ذریعے کمپوزنگ کے مرحلے تک پہنچ چکی تھیں۔ چینی اور جاپانی زبانوں تک نے اوپر سے نیچے لکھے جانے کے باوجود طباعت کے جدید ترین طریقوں کو اختیار کر لیا تھا، لیکن اردو کے خطِ نستعلیق کے لیے سافٹ ویئر کی تیاری میں وہی مشکلات درپیش تھیں۔ جن کی وجہ سے برسہا برس کی تحقیقات کے باوجود خطِ نستعلیق کا ٹائپ مروج نہیں ہو سکا تھا۔ یہ تذکرہ غیر ضروری نہ ہوگا کہ سابق ریاست حیدرآباد کے مرحوم نظام ہفتم میر عثمان علی خاں نے خطِ نستعلیق کے ٹائپ کی تیاری کے لیے تقریباً ساٹھ ستر سال قبل ایک خصوصی کمیٹی تشکیل کی تھی۔ جس نے ایسا ٹائپ تو تیار کر لیا تھا، لیکن بعد ازاں یہ اعتراف بھی کر لیا گیا کہ اس ٹائپ کو تجارتی اعتبار پر رائج کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے اس سلسلے میں مزید پیش رفت نہیں ہو سکی۔ پہلا مسئلہ یہ تھا کہ جہاں دنیا کی ہر زبان کا ہر ہر لفظ علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے اور لفظ بنانے کے لیے یہ حروف یکے بعد دیگرے تحریر کیے جاتے ہیں وہاں اردو میں حروف ایک دوسرے سے جوڑے جاتے ہیں۔ اور دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اردو میں حروف کی شکلیں تبدیل ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی حرف ابتدا میں آتا ہے تو اس کی شکل کچھ ہوتی ہے، درمیان میں آتا ہے تو اس کی شکل کچھ اور ہوتی ہے اور آخر میں آتا ہے تو اس کی شکل کچھ پھر مختلف ہوتی ہے۔ انسان تو اپنے دماغ کے استعمال سے لفظ کے لحاظ سے مناسب حرف لکھ سکتا ہے، لیکن مشین سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ مقام کے لحاظ سے صحیح شکل میں حرف تحریر کرے۔ کمپیوٹر بھی محض ایک مشین ہے، جس کی میموری (MEMORY) یعنی یادداشت میں آپ جو کچھ محفوظ کر دیں، اسے اپنی ضرورت پر بٹن دبا کر حاصل کر سکتے ہیں۔ کمپیوٹر کے رائج ہونے پر اردو والوں نے بھی یہ ریسرچ شروع کر دی کہ آیا ایسی کوئی صورت ہو سکتی ہے کہ کمپیوٹر کی یادداشت میں کمپیوٹر کے حروف مختلف شکلوں میں داخل کر دینے کے بعد ضرورت پر صحیح تحریر حاصل کی جا سکے۔ علیحدہ علیحدہ حروف کے تجربات میں ناکامی پر لندن میں ایک کمپنی نے "نوری نستعلیق" کے نام سے ایک نئی تکنیک دریافت کی جس کے تحت کمپیوٹر کی یادداشت میں علیحدہ علیحدہ حروف داخل کرنے کے بجائے اردو لغت میں موجود تمام الفاظ ایک اچھے خوش نویس سے کتابت کروا کے داخل کر دیے جائیں اور ضرورت پر وہی الفاظ بٹن دبا کر حاصل کر لیے جائیں۔ ساتھ آٹھ سال قبل کراچی کے روزنامہ "جنگ" نے یہ کمپیوٹر نصب کروایا تو سارے پاکستان کے اخبارات کے منتظمین نے اس خدشے سے ہڑتال کر دی کہ اگر یہ طریقۂ کار چل پڑا تو تمام کاتبین بے روزگار ہو جائیں گے۔ حکومت کو یہ یقین دہانی کرنی پڑی کہ مستقبل میں کسی اخبار کو ایسا کمپیوٹر نصب کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس کے باوجود اخبار "جنگ" کے بعض دوسرے شہروں کے ایڈیشنوں کے علاوہ روزنامہ "نوائے وقت" نے بھی اسی قسم کا کمپیوٹر نصب کروالیا جس کے نتیجہ

ایڈیٹر روزنامہ "منصف" حیدرآباد

میں ان اخبارات کی طباعت انتہائی دلکش ہوگئی اور خفی ترین خط کے استعمال سے مواد میں بھی کافی اضافہ ہوگیا۔ صرف چند برسوں بعد ہندوستان کے کثیر الاشاعت اردو روزنامہ "ہند سماچار" جالندھر نے بھی یہ کمپیوٹر نصب کروالیا۔ حالیہ عرصہ میں نئی دہلی میں حکومت ہند کی ترقی اردو بیورو کے لیے بھی اسی قسم کا کمپیوٹر خریدا گیا ہے۔ اس کے باوجود اگر اس قسم کے کمپیوٹر عام نہیں ہو سکتے تو اس کی بنیادی وجہ اس کی لاگت ہے، جو پچاس لاکھ تا ایک کروڑ روپے بتائی جاتی ہے۔ اس لاگت میں قابل لحاظ کمی اس لیے ممکن نظر نہیں آتی تھی کہ کمپیوٹر میں ڈکشنری کے تمام الفاظ محفوظ کرنے کے لیے کافی بڑی یادداشت ضروری تھی۔ اور اتنی بڑی یادداشت کے لیے کافی بڑا کمپیوٹر درکار تھا۔ اس سسٹم میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی ایسا لفظ چھاپنا ہے جو اس ڈکشنری میں موجود نہیں ہے یا اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں موجود نہیں ہے تو وہ خط نسخ میں چھپتا ہے۔ مثلاً جارج بش یا گوربا چوف یا کوئی بھی غیر اردو نام البتہ ایسے نام جو ہمارے اخبارات میں روزانہ استعمال ہوتے ہیں، انہیں بھی اضافہ شدہ یادداشت میں محفوظ کر لیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر چھ آٹھ صفحات پر مشتمل ایک اخبار میں سو، دو سو جگہ محض بعض ناموں کے لیے خط نسخ استعمال بھی کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ــــ قارئین دوسری خوبیوں کے مدِّ نظر اس سقم کو برداشت کر لیں گے ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ یہ سسٹم درآمد کرنا پڑتا ہے جس کے لیے اجازت ملنا کوئی آسان بات نہیں۔ کویت کے ایک انگریزی اخبار "عرب ٹائمز" میں روزانہ چار صفحات اردو میں شائع ہوتے ہیں۔ اس نے بھی یہ سسٹم اختیار کر لیا اور غالباً اب یہ صوری اعتبار سے ہندوستان یا پاکستان کے کسی بھی دوسرے اخبار سے بہتر ہے۔ اس طرح اردو میں کمپیوٹر کے ذریعے کتابت کا طریقۂ کار شروع تو ہوگیا لیکن عام نہیں ہو سکا۔ ان دو چار اخبارات کے بعد شاید ہی کوئی اور اخبار ایسا رہ گیا تھا، جو اس قدر گراں سسٹم خرید سکے۔ البتہ اس دوران میں دنیا کے مختلف ممالک میں اردو کے نستعلیق سافٹ ویئر کی تیاری کی کوشش مسلسل جاری رہی۔ امریکہ، کناڈا، برطانیہ، جرمنی، پاکستان اور سعودی عرب کے علاوہ خود ہندوستان میں حیدرآباد، بمبئی، پونہ اور دہلی میں بھی کمپیوٹر انجنیئر اس کوشش میں لگے رہے کہ کوئی ایسا آسان سسٹم دریافت کیا جا سکے جو اردو کے بیشتر اخبارات اور رسائل کی طباعت کے لیے رائج ہو سکے۔ ایسی پہلی کامیاب کوشش کا مظاہرہ حیدرآباد میں ایک نوجوان کمپیوٹر انجنیئر اشہر فرحان نے ایک پاکستانی کمپیوٹر انجنیئر انعام صاحب کے اشتراک سے کیا جو اس قدر کامیاب رہا کہ صرف چند ہفتوں بعد حیدرآباد ہی کے دو سرکردہ روزناموں "منصف" اور "سیاست" میں اسی سافٹ ویئر کے ذریعے کتابت شروع ہوگئی۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق بنگلور میں ایک نیا روزنامہ "سالار" کے نام سے اپنی اشاعت کا آغاز بھی اسی سسٹم کے ذریعۂ کتابت سے کر رہا ہے۔ بمبئی کے روزنامہ اردو ٹائمز نے بھی اس کمپیوٹر کی تنصیب کا آرڈر دے دیا ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق بمبئی کے شام نامہ "ہندوستان" کے مدیر سرفراز صاحب خود ایک اردو نستعلیق سافٹ ویئر "دلکش" کے نام سے تیار کر رہے ہیں۔ جو عنقریب ان ہی کے اخبار میں استعمال کی جائے گی۔ لاہور (پاکستان) کی ایک کمپنی نے بھی اپنے اردو نستعلیق سافٹ ویئر "شاہکار" کا دہلی میں مظاہرہ کیا تھا، جو نوری نستعلیق کی طرح لغت کے الفاظ پر مشتمل ہے، لیکن صرف منتخب الفاظ ہی اس کی یادداشت میں محفوظ ہیں اور اگر ان الفاظ کے باہر کے الفاظ چھاپنے ہوں تو وہ خطِ نسخ میں شائع ہوں گے۔ غالباً یہ سسٹم ابھی تجرباتی مرحلے سے گزر رہا ہے۔ یہ سارے سسٹم امریکہ کی مشہور کمپیوٹر ساز کمپنی "انٹرنیشنل بزنس مشینز" (آئی بی ایم) یا اس کمپنی کی طرز کے کمپیوٹر پر کام کرتے ہیں۔ اسی دوران امریکہ ہی کی دوسری مشہور کمپیوٹر ساز کمپنی "ایپل" کے لیے بھی خطِ نستعلیق کے سافٹ ویئر کراچی اور نئی دہلی میں تیار کیے گئے ہیں۔ جن کے استعمال کے لیے اس کمپنی کا مقبول ترین کمپیوٹر "میکنٹوش" استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ کمپیوٹر دراصل خاص طور سے اخبار کی طباعت کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ اور اس کی مدد سے اخبار کے صفحے کو بھی کمپیوٹر اسکرین پر تیار کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسری زبانوں کی طرح سٹنگ اور ڈسپلے کو بہتر بنانے میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ نئی دہلی کی کمپنی کا خط فی الوقت دلکش نہیں ہے۔ لیکن وہ اب ملک کے ممتاز خطاط جناب خلیق ٹونکی سے مشاورت کر رہے ہیں، جس کے بعد یقیناً خط دلکش ہو جائے گا۔ اب جن اخبارات میں کمپیوٹر کے ذریعے کتابت کا طریقۂ کار رائج ہو چکا ہے، ان کا تجربہ یہ ہے کہ اس طریقۂ کار سے اچھے خوش نویسوں یا کاتبین کی قلت کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ کتابت میں یکسانیت پیدا ہو گئی ہے، زیادہ مواد شائع ہو رہا ہے، کام تیزی سے ہو رہا ہے اور مصارف بھی قدرے کم ہو رہے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا کمپیوٹر کے ذریعے کتابت کے رائج ہونے سے کاتبین بے روزگار ہو جائیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ کیونکہ موجودہ کاتبین ہی کو کمپیوٹر پر کتابت سکھائی جا رہی ہے۔ اس طریقۂ کار کے رائج ہونے کے بعد بھی خطاطی اور خوش نویسی بحیثیت فن باقی رہیں گے۔ حیدرآباد کے سسٹم کی یہ خصوصیت ہے کہ انہوں نے اس کے "کی بورڈ" (Key Board) کے لیے انگریزی کا کی بورڈ اختیار کر لیا ہے۔ جس میں حرف "ام" (M) کی جگہ "م" "این" (N)

(بقیہ ص ۲۹ پر)

خلیق احمد نظامی

عبدالرّحیم خان خاناں

عبدالرحیم خان خاناں کے نام کے ساتھ ہندوستان کی تاریخ کے اُن حیات آفریں لمحات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، جن میں ہماری مشترکہ تہذیب کی بہترین قدروں کی آبیاری ہوئی تھی۔ فیضی نے اکبری دور کے ہندوستان کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں جو جلوۂ صد رنگ نظر آتا تھا وہ ایسا تھا جیسے موسمِ بہار میں کوئی مور مست ہو کر باغ میں ناچ رہا ہو ؎

ہندوستانِ دورش مستانہ جلوہ دارد
چوں موسمِ بہاراں طاؤس بوستانی

اس جلوہ کے پیچھے ہندوستان کی تہذیبی قدروں کا وہ اجتماع تھا، جن میں انسانیت، انسان دوستی، بلند حوصلگی، عزم اور دیانت نے رنگ بھرے تھے۔ گجرات میں خان خاناں کے دربار سے راجہ لوکارن منسلک تھے، ان کے بیٹے منوہر نے اتحاد و یگانگت کے متعلق ایک شعر کہا تھا، جس سے بہتر شعر اس موضوع پر اس عہد کے لٹریچر میں نظر سے نہیں گزرا — کہتے ہیں کہ یگانگت و یک جہتی کا سبق آنکھ سے لینا چاہیے کہ دونوں آنکھیں جدا جدا ہیں، لیکن دیکھتی ایک ہیں

یگانہ بودن و یکتا شدن ز چشم آموز
ہر دو چشم جدا، و جدائی نگرند

ہندوستان نے اتحاد و یگانگت کے اس سبق کو پڑھ پڑھ کر بھلایا ہے اور بھلا بھلا کر پڑھا ہے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس کی تقدیر کا نوشتہ اسی میں مضمر ہے۔ ہماری تہذیبی قدروں اور علمی روایات کا قافلہ جن راہوں سے گزرا تھا اُن ہی پر چل کر ہمیں اپنی منزلِ مقصود کا پتہ مل سکتا ہے۔ تاریخ قوموں کا حافظہ ہے۔ یہ بگڑ جائے تو مستقبل کی حیثیت ایک خوابِ پریشاں سے زیادہ نہیں۔ ہندوستان کی تاریخ آج بھی پکار رہی ہے۔ ع

اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

سلطنتِ مغلیہ نے اپنے ۲۳۱ سالہ دورِ اقتدار میں تہذیب و تمدن، علم و ادب، شعر و سخن، تہذیب و شہامت، سیرت و کردار کے جو چند بہترین نمونے پیش کیے ہیں، ان میں عبدالرحیم خان خاناں کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ بقول مولانا شبلی: "اس کے تاجِ فخر پر صاحب السیف والقلم کا طرّہ زیب دیتا تھا۔" اس کی شجاعت اور عزمِ جہانگیری کی داستانیں قندھار سے لے کر دکن تک اور گجرات سے بنگال تک گونجتی رہی تھیں۔ اس کی شعر و ادب کی محفلوں نے مرزا سلطان حسین بالقیرا اور امیر علی شیر کی محفلوں کی یاد تازہ کر دی تھی، اس کی سخاوت اور دریا دلی نے حاتم کی فیاضیوں کو بھلا دیا تھا۔ اس کی شخصیت کو سمجھنے اور اس کے کردار کا جائزہ لینے کے لیے اس عہد کی روح پر نظر ہونی چاہیے۔ وہ اپنے زمانے کے ذہنی ماحول کی پیداوار بھی تھا اور اس کا آفریدگار بھی۔

(۱) عبدالرحیم خان خاناں نے جس دور میں آنکھ کھولی تھی اس کا سماجی اور مذہبی ماحول مسلمان بزرگوں اور ہندو سنتوں کی اُن کوششوں کا مرہونِ منت تھا جو اُنہوں نے گزشتہ صدی میں کی تھیں۔ گرو نانک، کبیر، دادو، دھنا وغیرہ کے مذہبی زمزموں سے فضا اب تک گونج رہی تھی۔ اُنہوں نے جس طرح انسانی مساوات کو اپنی جہت و سعی کا مرکزی نقطہ بنا کر سماجی امتیازات کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی اور مذہبی تعلیم کا دروازہ ہر کس و ناکس کے لیے کھولا تھا۔ وہ ایک زبردست سماجی

نظامی ولا، سر سید نگر، علی گڑھ (یو پی)

انقلاب کی بشارت دے رہا تھا۔ صوفیا نے اس تحریک کو انسانیت کی خدمت سمجھ کر آگے بڑھایا۔ ان سنت بزرگوں اور اس دور کے صوفیا میں گہرا سماجی اور فکری ارتباط تھا۔ بھگتی لٹریچر کے لسانی مطالعہ Semantic Study سے صوفیا کے اثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔ گرو گرنتھ اور دادو پنتھی اور نرنجن پنتھی لٹریچر میں ہندو اور مسلمان دونوں بزرگوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اکبر نے دادو، ہری داس، ملوک داس، وغیرہ سے ملاقاتیں کی تھیں۔ جانوروں کی قربانی روکنے کے احکام اکبر نے دادو کے اشارے پر نافذ کیے تھے۔ پشتی مارگ وشنو ازم کے اکابر مغل بادشاہوں اور امراء سے کافی قربت رکھتے تھے۔ سندر داس کو عبدالرحیم خان خاناں نے بڑی عزت کا منصب دیا تھا۔ دادو کا ایک مسلمان چیلا رجب علی خاں تھا جس کا نام رجب داس ہو گیا تھا۔ وہ عرصہ تک راجہ بھگوان داس اور راجہ مان سنگھ کی ملازمت میں رہا تھا۔ اس کی سربنگی اس عہد کی ذہنی آب و ہوا کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

خان خاناں پر کبیر کا اثر غالب تھا۔ اُن کے بہت سے دوہے کبیر کے دوہوں کی صدائے بازگشت ہیں۔ مثلاً کبیر کہتے ہیں ؎

بڑا ہوا تو کیا ہوا جیسے پیڑ کھجور
پنچھی کو چھایا نہیں پھل لاگیں اَت دُور

عبدالرحیم خان خاناں کا شعر ہے ؎

ہوے نہ جا کی چھانہہ ڈھگ پھل رحیم اَت دُور
باڑھے سوبن کاج ہی جیسے تار کھجور

کبیر کا شعر ہے ؎

ہردے بھیتر دوں لگی دھواں نہ پرگٹ ہوئے
جا کے لاگی سو لکھے کی جن لائی سوئے

خان خاناں لکھتا ہے: ؎

اَنتر داد لگ رہی دُھواں نہ پرگٹ سوئے
کے جیسا جانے آپنو جا سر بیتی ہوئے

خان خاناں نے کرشن جی کی تعریف بھی بڑے جذبے سے کی ہے۔ لکھتے ہیں ——

تیں رحیم من آپنو کینو چار چکور
نس باسر لاگیو رہے کرشن چندر کی اور

مذہبی فکر کے یہ دھارے جن کو صوفیوں اور سنتوں نے جنم دیا تھا خان خاناں کی فکر و عمل کا جزو بن گئے تھے۔

ضروری سمجھتا تھا۔ اسی طرح اتحادِ قومی کی وہ بنیادیں استوار ہو سکتی تھیں جن پر اکبر نے اپنے سیاسی نظام کا ڈھانچہ بنایا تھا۔ اس سمت میں پہلا قدم امیر خسرو نے اٹھایا تھا۔ اُنہوں نے قدیم ہندوستان کے تمام علمی کارناموں کو نہ صرف اپنی تاریخی شخصیت کا جزو بنا کر پیش کیا تھا۔ اکبر نے سنگھاسن بتیسی، مہابھارت، رامائن، لیلاوتی، اتھربان، ہری بانس وغیرہ کے فارسی ترجمے کروا کر قدیم ہندوستان کی فکر کو ملک کے علمی حلقوں ہی میں نہیں بلکہ عوام تک پہنچنے کی راہیں ہموار کر دیں —— اکبر کی اس کوشش نے اُس عہد کے زبان و ادب پر گہرا اثر ڈالا۔ ہندی زبان میں غیر معمولی دلچسپی کا جو اظہار اس دور میں ہوا وہ اکبر کی اس کوشش کا نتیجہ تھا۔

اکبر کو ہندی زبان سے بڑی دلچسپی تھی اور اس زبان میں اشعار بھی کہتا تھا۔ ابوالفضل کا بیان ہے :

"و طبع الہام پذیر آنحضرت بگفتن نظم ہندی و فارسی بنہایت موافق افتادہ" (اکبر نامہ)	شہنشاہ کی طبع الہام پذیر ہندی اور فارسی اشعار کہنے سے انتہائی مناسبت رکھتی ہے۔

اس کے کچھ ہندی اشعار تذکروں میں بھی ملتے ہیں۔[1] اکبر کے زمانہ میں شہزادوں میں بھی ہندی کا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ بعض شہزادے اس میں شاعری بھی کرنے لگے تھے۔ دانیال کے متعلق جہانگیر لکھتا ہے :

"بہ نغمۂ ہندی مائل بود، گاہے بہ زبان اہلِ ہند و بہ اصطلاح ایشاں شعرے می گفت، بد نہ بودے"	نغمۂ ہندی کی طرف رغبت تھی۔ بعض اوقات ہندوستانیوں کی زبان میں اور ان کی اصطلاح میں شعر بھی کہتا تھا، جو بُرے نہیں ہوتے تھے۔

اس "بد نہ بودے" میں بہت بڑا سرٹیفکیٹ ہے یہ جہانگیر کا عملی ذوق ہی دے سکتا تھا۔

بیرم خاں کے متعلق ذخیرۃ الخوانین میں لکھا ہے کہ وہ ہندی میں بھی شعر کہتا تھا (ج ا ص ۶۰) اس کا بیٹا عبدالرحیم اپنے عہد کی ان روایات کا بہترین نمائندہ تھا۔ اس کو ہندوؤں کے علوم پر کافی دستگاہ تھی اور ہندی زبان پر بھی پورا عبور تھا۔ جہانگیر اس کی ہندی علوم پر نظر کا اس طرح ذکر کرتا ہے:

"از اقسام دانش عقلی و نقلی حتیٰ علوم ہندی بہرہ وافر داشت"	مختلف علوم عقلی اور نقلی حتیٰ کہ علوم ہندی سے کافی واقفیت رکھتا تھا۔

(۲) اکبر ہندوستان کے قدیم علمی سرمائے سے واقفیت کو عام کرنا

[1] ڈاکٹر سرلا پرشاد اگروال نے ان اشعار کو "اکبری دربار کے ہندی کوی" میں جمع کر دیا ہے

مآثرِ رحیمی میں لکھا ہے کہ زبان ہندی میں اس کو یدِ بیضا حاصل تھا۔ ہندی زبان و ادب میں اس نے اپنا مقام اس وقت پیدا کیا تھا جب سورداس اور تلسی داس اپنا سکہ جما چکے تھے۔ اس کو تلسی داس سے بہت محبت تھی۔ ہندی شاعری کے بعض نئے اوزان، نئی طرحیں، نئے اسالیب اور نئے مضامین اس کی جدت پسند طبیعت نے ایجاد کیے۔ ماہرینِ زبان کا کہنا ہے کہ بَرَاوا وزن (Bareva) تلسی داس نے اس ہی سے لیا تھا اور اسی وزن میں براوا رامائن (Bareva Ramayan) لکھی تھی۔ اس کی ہندی تصانیف کے نام بھی معاصر تذکروں میں ملتے ہیں رحیم سدھا (Rahim Sudha) اور رحیم وتاس Rahim Vitas شائع ہو چکے ہیں لیکن اس کا پورا ہندی کلام اب تک علمی دنیا کے سامنے نہیں آیا۔ وہ ہندی میں رحیمن تخلص کرتا تھا۔ اس کے ہندی اشعار 'عربی' سنسکرت اور فارسی الفاظ سے بوجھل نہیں ہیں۔ سیدھی اور صاف زبان ہے، جس میں پریم اور محبت کا رس گھلا ہوا ہے۔ اس احساس اور اسلوب کی جڑیں اس کے سماجی شعور میں دُور تک چلی گئی تھیں۔ بعض دوہوں میں ہندوستان کے دیہات کی بولی اور جذبات کی عکاسی بھی نظر آتی ہے۔

ہندی شعراء کی سرپرستی میں بھی خان خاناں نے بڑی سیر چشمی اور فیاضی کا ثبوت دیا۔ ہندی کا مشہور شاعر گنگا اس کے دربار سے وابستہ تھا۔ ایک چھ مصرعوں کی نظم پر خان خاناں نے اس کو ۳۶ لاکھ روپے انعام دیا تھا۔

ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ خان خاناں کے پاس ہندی کے مخطوطات کا بھی اچھا ذخیرہ تھا۔ اس کی وفات کے بعد کتب خانہ میں ایک ایسا ہندی مخطوطہ ملا جو طلائی کام اور جواہر سے مرصع تھا اور جس کی قیمت ۵۰ ہزار روپے قرار پائی تھی۔ (ذخیرۃ الخوانین: ج ۱ ص ۶۰)

(۳) ہندوستان کی تاریخ میں شاید ایسا دور کبھی نہیں آیا جب مقامی اور بین الاقوامی زبانوں میں دستگاہ اس طرح اور اس پیمانہ پر حاصل کی گئی ہو جیسی دورِ اکبری میں قوموں کی وسعتِ نظر اور علمی جستجو کی سب سے بڑی علامت عالمی زبانوں سے دلچسپی ہے۔ اس سے فکر و نظر کے دروازے کھلتے ہیں اور آفاقی نظر پیدا ہوتی ہے۔ عبدالرحیم خان خاناں اس لسانی آفاقیت کی بہترین مثال تھا۔ وہ عربی، سنسکرت ہندی، ترکی سے تو واقف تھا ہی بلکہ بہت سی یوروپین زبانوں پر بھی عبور حاصل کر لیا تھا۔ فرید بھکری کا بیان ہے:

"و در ہر زبان کہ در عالم رائج است ماہر بود، حرف میزد" (ذخیرۃ الخوانین) | اور ہر اس زبان کا جو دنیا میں بولی جاتی ہے ماہر تھا اور اس میں گفتگو کر سکتا تھا۔

یہ بیان مبالغہ آمیز ہو سکتا ہے لیکن اس زمانے کے حالات کے پیشِ نظر انگریزی، پرتگالی، اطالوی زبانوں سے اس کی واقفیت بعید از قیاس نہیں۔ ایک زمانے میں فارسی اور ہندی کے علاوہ سندھی میں بھی اس کے اشعار مشہور تھے (ذخیرۃ الخوانین)

امیر خسرو کا خیال تھا کہ ہندوستان کے بسنے والے دنیا کی ہر زبان بول سکتے ہیں لیکن اور ملکوں کے باشندوں میں یہ صلاحیت نہیں ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خان خاناں ہندوستان کی ان لسانی صلاحیتوں کا بہترین مظہر تھا۔ زبان دانی کی ایسی مثال شاید ہی دیکھنے میں آئے۔

(۴) خان خاناں کی علمی دلچسپیوں کا شہرہ ہندوستان کی سرحدیں عبور کر گیا تھا۔ اس کی علم دوستی نے علماء اور شعراء کے ساتھ وہی عمل کیا جو مقناطیس لوہے کے ساتھ کرتا ہے۔ اکبر کے دربار کے بعض عالم 'شاعر' طبیب اسی کی سرپرستی سے یا مدد سے اکبر کے دربار میں پہنچے تھے اور اسی کی سخاوت کا شہرہ سن کر ہندوستان آئے تھے۔ ایران کے ایک شاعر رسمی قلندر نے ایران ہی سے اس کی شان میں قصائد لکھ کر بھیجے اور ان شاعروں کا ذکر کیا جن کو اس کی سرپرستی نے شہرت و مقبولیت عطا کی تھی۔ ایران کے ایک اور شاعر کوثری نے ایک قصیدہ بھیجا تھا جس میں لکھا تھا ؎

چو قطرہ جانب عمان فرستم
متاعِ خود بہ ہندوستاں فرستم
کہ نبود در سخن دانان دوراں
خریدارِ سخن جز خان خاناں

ایک اور شاعر لکھتا ہے ؎

ہند است و وجود خان خاناں
چوں خانۂ کعبہ در بیاباں

فرید بھکری کا بیان ہے کہ اس کی تعریف میں ہندی اور فارسی اشعار کی کتابیں لکھی گئی تھیں۔

" در مدح او در اشعار فارسی و ہندوی کتب تصنیف کردہ اند" (ذخیرۃ الخوانین ج ۱ ص ۶۲)

افسوس کی بات ہے کہ یہ سارا لٹریچر اب ضائع ہو چکا ہے اور ہم یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس کے شاعرانہ کمالات کو معاصرین نے کس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔ عبدالباقی نہاوندی اور فرید بھکری کا بیان ہے کہ "تربیت فضلا و علماء" میں خان خاناں بہت ممتاز

تھا اور اس کا دربار ایرانی شاہوں کے درباروں کی یاد تازہ کرتا تھا:

"اجماع فضلاء و شعراء در عہد او بمثل جمع آمدن
شعراء در عہد مرزا سلطان حسین بالقیرا و امیر علی
شیر بود۔" (ذخیرۃ الخوانین: ج ۱ ص ۹۲)

حکیم علی گیلانی جس کو اکبر نے "جالینوس زماں" کا خطاب دیا تھا خان خاناں ہی کے توسط سے اکبر کے دربار میں پہنچا تھا۔ ایک دوسرا حاذق طبیب حکیم روح اللہ مدتوں خان خاناں کے دامن دولت سے وابستہ رہا۔ بعد کو جہانگیر نے اپنے اطباء کے زمرہ میں شامل کرلیا۔ مرزا محمد قاسم گیلانی، ملا خیرالدین، شیخ علم اللہ، میر ندکی سمرقندی اس کے دربار میں تھے۔ صاحب مآثر رحیمی نے اس کے ۱۰۷ درباری شعراء کا ذکر کیا ہے۔

علم و فضل کی اس غیر معمولی دلربائی کے ساتھ ساتھ اللہ نے حسن بھی غضب کا دیا تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ "جوانی میں باہر نکلتا تو رستے کے لوگ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ مصور اس کی تصویریں اتارتے تھے امراء اپنے مکانوں اور دیوان خانوں کو سجاتے تھے۔ بادشاہ بھی اپنے دربار اور مجلس کا سنگھار سمجھتے تھے۔"

(۵) ہندوستان میں فارسی زبان اور ادب کی ترویج میں خان خاناں کا جو حصہ ہے وہ کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ دورِ اکبری کے بہت سے صفِ اوّل کے شعراء جن میں عرفی، نظیری، فزعی، شکیبی، حیاتی، شوقی وغیرہ شامل ہیں۔ مدتوں اس کے دربار سے وابستہ رہے تھے۔ اس کا فارسی زبان کا ذوق بے مثال تھا۔ نثر و نظم دونوں پر یکساں قدرت تھی — تزکِ بابری کو اس نے فارسی میں منتقل کیا۔ اس کا ایک شعر جذباتِ عشق و محبت کا کتنا جان دار ترجمان ہے۔ کہتا ہے:

بکیش صدق و صفا حرفِ عہد بیکار ست
نگاہ اہلِ محبت تمام سوگند است

(جہاں صدق و صفا ہو وہاں عہد و پیمان کی ضرورت
نہیں۔ اہلِ محبت کی نگاہ خود ایک سوگند ہے)

غالباً اسی شعر سے متاثر ہوکر اقبال نے کہا تھا ؎

یک نگاہ، یک خندۂ دزدیدہ، یک تابندہ اشک
بہر پیمان محبت نیست سوگند دگر

(۶) خان خاناں کتابوں کا عاشق تھا۔ اس کا کتب خانہ بعض اعتبار سے بے مثال تھا۔ ایک بار اس نے جہانگیر کو "یوسف زلیخا" کا ایک نسخہ جو مصور تھا اور میر علی کے ہاتھ کا آبِ زر سے لکھا ہوا تھا بھیجا تو جہانگیر نے خوش ہوکر تزک میں اس کا ذکر کیا۔ برہان پور میں ایک دن اس نے ۷۰۰ کتابیں وہاں کے علماء کی نذر کی تھیں (ذخیرۃ الخوانین)

معاصر تاریخیں خان خاناں کی دریا دلی کے واقعات سے جن کی نظیر ملنی دشوار ہے، بھری ہوئی ہیں۔ آزاد نے صحیح لکھا ہے کہ خان خاناں کے ہاتھ روپیہ کے دشمن تھے۔ اس کے انتقال کے بعد جہانگیر نے اس کی بیٹی جانان بیگم سے پوچھا کہ مرحوم نے کتنی متاع وقف کی ہے؟ اس نے جواب دیا: ۷۵ لاکھ روپے کے قریب۔ (ذخیرۃ الخوانین)

(۷) مذہبی فکر کے اعتبار سے اکبر کے دربار میں دو مختلف خیال کے امراء موجود تھے۔ دونوں دل سے اکبر کے جاں نثار تھے، لیکن اکبر کی مذہبی قیادت پر بنیادی اختلاف رکھتے تھے۔ ایک طرف ابوالفضل، قاسم کاہی، شریف آملی، بیربل وغیرہ تھے۔ دوسری طرف راجہ بھگوان داس، راجہ مان سنگھ، عبدالرحیم خان خاناں، ٹوڈرمل وغیرہ تھے۔ دونوں اکبر کی ان تمام کوششوں سے متفق تھے، جو وہ ایک ایسے وسیع معاشرے کو وجود میں لانے کی کر رہا تھا جو تمام مذہبی اختلافات سے بالاتر ہو، دونوں کو اکبر کی ان مساعی سے بھی اتفاق تھا، جو ہندوستان کے قدیم، علمی اور ثقافتی سرمایہ کو عام کرنے کے لیے کی جارہی تھیں۔ وہ سب اس سرمایہ کو اپنے تاریخی وجود کا ایک جزو سمجھتے تھے۔ اختلاف کا پہلو یہ تھا کہ ابوالفضل اور بیربل وغیرہ نے اکبر کو مذہبی رہنمائی کی مسند پر بٹھا کر جس طرح پیغمبری کا چولا پہنانے کی کوشش کی تھی، وہ ان کو منظور نہ تھی۔ عبدالرحیم خان خاناں اور راجہ مان سنگھ اپنے مذہبی تشخص کو اکبر کے مذہبی تجربوں کی نذر کرنے کو تیار نہ تھے۔ مان سنگھ کو جب دینِ الٰہی میں داخل ہونے کی دعوت دی گئی تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ اسلام اور ہندو مذہب کو تو جانتا ہے، لیکن اس نئے مذہب سے آشنا نہیں۔ اس کا عقیدہ تھا کہ ہر مذہب کو اپنے طرز پر عبادت کی پوری آزادی ہونی چاہیے۔ اور پوری وسعتِ قلب کے ساتھ دوسروں کے مذہبی شعار کا احترام کرنا چاہیے — لیکن بادشاہ کا نئے مذاہب پیدا کرنا یا مذہبی قیادت کے خواب دیکھنا، سیاست کو مذہب کے حریم قدس میں لے جانا ہے۔ اس مکتبِ فکر کے لوگوں کا خیال تھا کہ نہ سیاست کو مذہب میں داخل کیا جائے نہ مذہب کو سیاست میں دخل اندازی کی اجازت ہو۔ دونوں اپنی راہیں علیحدہ رکھیں اور اپنے اپنے طرز پر انسانی فلاح و بہبود کی کوششیں کرتے رہیں۔ دربار سے باہر حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ جن کی تحریک کی نوعیت کو اکثر غلط سمجھا گیا ہے۔ یہی کہتے تھے کہ:

مسلمانان بر دین خود باشند	مسلمان اپنے دین پر رہیں اور
و کافران بر کیش خود، آیہ	غیر مسلم اپنے مذہب پر۔
لکم دینکم و لی دین بیان	قرآن کی یہ آیت :
ایں معنی است	" تمہارے لیے تمہارا
	اور میرے لیے میرا دین۔"
	اس طرز کی آئینہ دار ہے۔

یہ طرز فکر تنگ نظری کا نہیں بلکہ انتہائی وسیع المشربی کا آئینہ دار تھا۔ اقبال نے ایک جگہ لکھا ہے کہ حقیقی وسیع المشربی حقیقتاً اس شخص کے فکر و عمل کا نتیجہ ہے جو اپنے مذہب پر پوری مضبوطی کے ساتھ قائم رہتے ہوئے، دوسرے طرز ہائے فکر کے پسندیدہ پہلوؤں کی کھلے دل سے تعریف کر سکے۔ وہ امیر خسرو کے اس شعر کو اس رواداری کا بہترین نمونہ سمجھتے تھے ؎

اے کہ زبت طعنہ بہ ہندو بری
ہم ز وے آموز پرستش گری

خان خاناں کے زمانہ کی شاعری میں وسیع النظری اور وسیع المشربی کے ایسے نمونے بہت ملتے ہیں۔ خان خاناں کے دربار کا شاعر نظیری لکھتا ہے ؎

گر عکس روئے خویش در آئینہ دیدۂ
توحید شیخ و شرک برہمن بجا شناس

نامی کہتا ہے ؎

در مذہب ما جملہ یکساں می باش
در دائرۂ کفر یا ایمان می باش
ایں است طریق عشق جانانۂ ما
زنار بگردن و مسلماں می باش

یا جیسا عرفی نے لکھا ہے ؎

چناں بہ نیک و بد عرفی بسر کن کز پس مردن
مسلمانت بزمزم شوید و ہندو بسوزاند

خان خاناں کا خیال تھا کہ سب مذاہب کی علیحدہ حیثیت برقرار رکھتے ہوئے اتحاد و یگانگت کا ماحول پیدا کیا جائے۔ اس میں اور راجہ مان سنگھ میں قدیم مراسم اور بنیادی اتحاد فکر تھا۔ ذخیرۃ الخوانین میں لکھا ہے کہ بیرم خاں کی شہادت کے بعد میر ابوالفتح اور راجہ مان سنگھ نے عبدالرحیم خان خاناں کی تربیت کی تھی۔ راجہ مان سنگھ کی وسیع المشربی ضرب المثل تھی۔ فرید بھکری کا بیان ہے کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتا تھا اور اس نے لاہور میں ایک عالی شان مسجد بنوائی تھی۔

مسلمانان و ہنود در مدارا یکساں بود
در لاہور پرستش و آو مسجد عالی بنا کردہ
کہ تا حال قائم است

اس نے اپنی فوج میں مسلمانوں کو نماز باجماعت اور ہندوؤں کو اپنے طرز پر پوجا کی پوری سہولتیں فراہم کی تھیں۔

عبدالرحیم خان خاناں کا مسلک بھی یہی تھا۔ وہ حقیقی یک جہتی اور یگانگت کی نفاست مذاہب کی آزادی میں دیکھتا تھا نہ کہ سیاسی اقتدار کے سایہ میں ایک مشترکہ مذہب کی ایجاد میں سارے مذاہب خدا تک پہنچنے کی مختلف راہیں ہیں، اُن کی منزلِ مقصود ایک ہے، لیکن ان مختلف راہوں کو ختم کر کے ایک نہیں بنایا جا سکتا۔

ابوالفضل دوسرے مکتبِ خیال سے تعلق رکھتا تھا اور بادشاہ کو پیغمبری کے اوصاف سے متصف کرتا رہتا تھا اور اس کے ہر عمل کو مذہبی رنگ میں پیش کرتا تھا۔ لیکن ایک وقت آیا جب ابوالفضل کا ضمیر خود اس سے بغاوت کرنے لگا اور درباری خوشامد اور دریوزہ گری سے اس کی طبیعت ابا کرنے لگی۔ اس نے عبدالرحیم خان خاناں کو ایک خط لکھا جس میں اپنے دل کی بے چینی کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے اور لکھا ہے کہ میں اللہ کے بندہ سے درہم و دینار کا بندہ بن چکا ہوں۔ اور پچھلے بارہ سال میں تو میری عجیب کیفیت ہو گئی ہے کہ نہ قدرت شکیب ہے نہ قوت گریز، نہ طاقت پرہیز (انشائے ابوالفضل ج ۱ ص ۱۰۲)۔ اس خط میں ایک خوشامدانہ فطرت کا جس نے اکبر کو مذہبی قیادت کے میدان میں لے جا کھڑا کیا تھا، اعتراف شکست ہے۔

(۸) عبدالرحیم خان خاناں کی سیاسی زندگی مغل تاریخ کا اہم باب ہے۔ قندھار، بلوچستان، سندھ، گجرات، دکن اور دوسرے علاقوں میں اس نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے اور سلطنت مغلیہ کی توسیع اور استحکام کے لیے جو شاندار خدمات انجام دیں، اُن کو تاریخ کبھی بھلا نہ سکے گی۔ جب وہ مظفر گجراتی کو شکست دے کر آگرہ پہنچا تو اکبر نے خوش ہو کر خان خاناں کا خطاب دیا۔ دریائے سابرمتی کے کنارے اس نے گجرات کی فتح کی یادگار میں "باغ فتح" بنوایا تھا۔ جس کی جہانگیر نے بہت تعریف کی ہے۔ اُس نے مختلف اوقات میں جہانگیر کو جو تحائف بھیجے ہیں اُن کی تفصیل خود اس نے تزک میں دی ہے۔ ایک بار اُس نے ایک ایسا گھوڑا جہانگیر کو بھیجا جس کی ایال زمین سے لگتی تھی۔ جہانگیر اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ خود جہانگیر

نے اس کو شاہی اصطبل کا سب سے عمدہ گھوڑا، جو شاہ عباس نے اس کو بھیجا تھا عنایت فرمایا۔ تمغے کے پر ٹوپی میں لگانے کی اس کے خاندان کے علاوہ کسی کو اجازت نہ تھی۔

خانِ خاناں کی سیاسی زندگی کا ایک اہم پہلو اس کا نظام اطلاعات تھا۔ شاید یہ اس دَور کا مضبوط ترین ذریعۂ ابلاغ تھا۔ اس کے وکیل محمود خاں اور راوتم چند کے علاوہ متعدد اور خبر رساں ذرائع تھے، جو اس کو برابر دربار اور دار السلطنت کی خبریں بھیجتے رہتے تھے۔ دربار کی خبروں کے علاوہ عدالت خانہ، چبوترہ، کچہری سے بھی اس کے نمائندے خبریں بھیجتے تھے۔ گذریوں، کوچوں اور بازاروں کے واقعات واقعہ نویس اس کو لکھتے تھے بلکہ عوام میں جو افواہیں گردش کرتی رہتی تھیں اُن سے بھی اس کو باخبر رکھا جاتا تھا۔ ان سب اطلاعات کو وہ شام کے وقت خود پڑھتا تھا اور آگ میں ڈالتا جاتا تھا۔

"بوقت شام ہمہ را خود مطالعہ کردہ
در آتش می سوخت"۔ (ذخیرۃ الخوانین)

(۹) خانِ خاناں کے حالاتِ زندگی کو سمجھنے کے لیے اُن رشتوں پر بھی نظر ہونی چاہیے جو شاہی خاندان اور امراء سے اس کے قائم ہو گئے تھے اور ان رشتوں سے اس کی بہت سی مشکلات پیدا ہوئی تھیں۔ اطلاعات حاصل کرنے کے لیے یہ اہتمام اور مہمات جنگ کے سلسلے میں بے بنیاد الزام اسی کی پیداوار تھے۔ میوات کے با اثر زمیں دار جمال خاں کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک کی شادی ہمایوں سے اور دوسری کی بیرم خاں سے ہوئی تھی۔ خان اعظم کوکہ کی بہن ماہ بانو اس کے حرم میں تھی اور اس کی لڑکی کی شادی شہزادہ دانیال سے ہوئی تھی۔

اولاد کے معاملہ میں خان خاناں بہت بدقسمت تھا۔ اس کے تین بیٹے امراللہ، شاہ نواز خاں، رحمٰن داد خاں عین جوانی میں ختم ہو گئے۔ رحمٰن داد خاں کی وفات پر جہانگیر نے لکھا: "نہایت سعادت مند جوان تھا۔ اس کی موت سے مجھے بہت دُکھ ہوا۔ جب میری یہ حالت ہے تو اس کے شکستہ دل اور بوڑھے باپ کے دل پر کیا گزری ہوگی"۔ (تزک) داراب خاں اور اس کے بیٹے عبداللہ خاں کو بغاوت کے الزام میں قتل کیا گیا تھا۔ اس کی بیٹی جاناں بیگم کا نکاح خود اکبر نے دانیال سے پڑھایا تھا۔ وہ کتابوں کی بڑی شوقین تھی اور شعر بھی کہتی تھی۔ دوسری بیٹی کی شادی میر جمال الدین انجو صاحب فرہنگ جہانگیری کے بیٹے میر امیر الدین سے ہوئی تھی۔ اس کا بھی جوانی میں انتقال ہو گیا۔

(۱۰) امراء اور شہزادوں نے خان خاناں پر بغاوت کا الزام لگایا تھا۔ اس پر ملک عنبر سے خفیہ تعلقات رکھنے کا بھی الزام تھا۔ جہانگیر نے انتہائی غصہ میں اس کی سرکشی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس نے ۷۰ سال کی عمر میں بغاوت سے اپنا منھ کالا کیا۔ جب تک اس دَور کی سیاست شہزادوں اور امراء کی سازشی کارروائیوں، ملک کی عام سیاسی فضا اور دکن میں استحکام طاقت کی دشواریوں کا مکمل نقشہ سامنے نہ ہو، خان خاناں کو مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مراسلات اور خطوط کا ایک قدیم نسخہ مولانا محمد حسین آزاد کو ملا تھا جس میں اس کا ایک خط اپنے بیٹے ایرج کے نام بھی تھا۔ اس میں عبدالرحیم خان خاناں نے "رفیقان منافق" کا درد بھرے انداز میں ذکر کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بعد کو جہانگیر نے اس کی تمام لغزشوں کو معاف کر کے پھر وہی مقام دے دیا تھا، اس الزام کی تائید نہیں کرتی کہ وہ باغی ہو گیا تھا۔ غالباً امراء اور شہزادوں سے مہمات کے سلسلے میں طریقۂ کار پر اختلاف نے اس کو برہم کر دیا تھا۔ فرید بھکری نے اس کی ایک برائی کی طرف اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ کہا کرتا تھا۔

"در لباس دوستی دشمنی با دشمن باید کرد"

معلوم نہیں یہ Machiavellian اصول کب اور کن حالات میں خان خاناں نے بیان کیا تھا۔ لیکن اس کی زندگی کی تفسیر اس کے گرد نہیں کی جا سکتی۔ جہانگیر نے برہان پور سے واپسی پر اس کی جو کیفیت تھی وہ اس طرح بیان کی ہے:

"جوشِ مسرت کی وجہ سے جو اس میں اُمنڈ رہا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میری قدم بوسی کے لیے سر کے بل آگے بڑھے یا پاؤں سے۔ وفورِ شوق میں اس نے بے اختیار ہو کر اپنے آپ کو میرے قدموں میں ڈال دیا۔ میں نے بھی اس کے سر کو نہایت شفقت اور محبت سے اُٹھایا اور لطف و محبت سے بغلگیر ہو کر اس کے منھ کو بوسہ دیا"۔

خانِ خاناں نے ۱۶۲۷ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس کی آخری علالت کا کچھ حال ذخیرۃ الخوانین میں ملتا ہے۔ نور جہاں نے اس کے علاج کے لیے حاذق طبیب مقرر کیے تھے۔ ایک پنڈت طبیب نے فرید بھکری کو بتایا کہ آخری وقت میں اس کے سارے جسم پر بے چینی کی کیفیت طاری تھی۔ بھکری نے پنڈت سے پوچھا کہ نواب تو انسان کامل تھے، ان کو یہ بے چینی کیوں تھی۔ جواب دیا کہ یہ مفارقت روح و بدن کے سبب تھی:

"مدت پنجاہ سال ابجد خان خانانی

(بقیہ ص ۳۲ پر)

کالی داس گپتا رضا

۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک مشاعرہ[1]

(دھلی کا ایک یادگار مشاعرہ)

(دہلی کی آخری شمع)

یہ مشہور و مقبول مضمون مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم دہلوی[2] کے قلم سے ہے۔ اس کی تصنیف کی تحریک کیوں کر ہوئی۔ یہ مصنف ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

"پرانے قدیم کاغذات میں مجھ کو حکیم مومن خاں مومن دہلوی کی ایک قلمی تصویر ملی۔ تصویر کا ملنا تھا کہ یہ خیال پیدا ہوا کہ تو بھی محمد حسین آزاد مرحوم کے 'نیرنگِ خیال' کی محفلِ شعرا کی طرح ایک مشاعرہ قائم کر..... چلتی پھرتی تصویریں دکھا.....

لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مختلف زمانوں کے شاعروں کو کس طرح ایک جگہ جمع کروں۔ اس عقدہ کو امیر اللہ تسلیم مرحوم کے اس شعر نے حل کر دیا ؎

جوانی سے زیادہ وقتِ پیری جوش ہوتا ہے
بھڑکتا ہے چراغِ صبح جب خاموش ہوتا ہے

..... دل میں یہ بات جم گئی کہ دہلی کے آخری دَور کا نقشہ کھینچ دیا جائے.....

..... ادھر تو آزاد مرحوم کے نیرنگِ خیال نے دل میں مشاعرہ کا خیال ڈالا، اُدھر کریم الدین مغفور کی کتاب 'طبقات الشعرائے ہند' کے طبقۂ چہارم نے رجب ۱۲۶۱ھ کے ایک مشاعرے کا پتا دیا۔ اب کیا تھا، دونوں کو ملا کر ایک مضمون پیدا کر لیا.....''

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"(میں یعنی مرزا فرحت) اس زمانے کا بھی مرزا صاحب بن سکتا تھا۔ مگر میرے دل نے گوارا نہیں کیا کہ کریم الدین مرحوم کی کامیابی کا سہرا اپنے سر باندھوں اور ایک شخص کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دوں جس نے اس مشاعرے میں بہت بڑا حصہ لیا تھا۔"

۴۳-اے۔ جل درشن، فورتھ فلور، نیپین سی روڈ، بمبئی

[1] میں یہ مضمون مکمل کر چکا تھا کہ اسی مشاعرہ کی بابت ۱۹۸۶ء کی چھپی ہوئی 'اردو اکادمی' دہلی کی ایک جلد دستیاب ہوئی۔ یہ ڈاکٹر صلاح الدین کی مرتبہ ہے۔ اس کے مقدمے میں اس مشاعرے سے متعلق کئی کوائف زیرِ بحث لائے گئے ہیں، لہٰذا میں نے انہیں اپنے مضمون سے خارج کر دیا ہے۔ اب اس میں بیشتر وہی باتیں ہیں جو اس اشاعت یا اس مشاعرے سے متعلق کسی اور اشاعت میں میری نظر سے نہیں گزریں۔

[2] ستمبر ۱۸۸۳ء تا ۲۷ اپریل ۱۹۴۷ء

[3] مضامین فرحت مطبوعہ عبدالحق اکیڈیمی حیدرآباد (سرورق پھٹ جانے کی وجہ سے سالِ طبع وغیرہ ندارد قیاساً ۱۹۴۴ء حصہ اوّل) مضمون رسالہ اردو کے لیے لکھا گیا تھا۔

آپ نے اور مقام پر لکھا ہے[1]:

"جن صاحبوں نے یہ مضمون پڑھا ہے، وہ واقف ہیں کہ میں نے اس مضمون کو مولوی کریم الدین صاحب مؤلف 'طبقات شعرائے ہند' سے منسوب کرکے یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ مشاعرہ انہی کے مکان پر نواب زین العابدین خاں (عارف) کی مدد سے ہوا تھا...."

احسان الحق اختر لکھتے ہیں[2]:

"یہ مشاعرہ کہیں سچ مچ منعقد نہیں ہوا تھا۔ اس کی حقیقت ایک افسانے کی سی ہے . . . . ."

مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں صاف دکھائی دیتا ہے کہ یہ مضمون مشاعرے کی حد تک نرا افسانہ نہیں ہے۔ کچھ حقیقت بھی ہے۔ یہ کہ اس کا اوّل کوئی کیریکٹر (شاعر) من گھڑت نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ 'طبقات شعرائے ہند' مؤلفہ کریم الدین میں رجب ۱۲۶۱ھ میں محفلِ مشاعرہ برپا ہونے کی تفصیل موجود ہے۔ افسانہ یہ ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے بیان کردہ ۶۰ سے زائد شاعروں[3] میں سے صرف ۱۷ شاعر اُن میں سے ہیں جنہوں نے مولوی کریم الدین کے مشاعرے (مشاعروں کی تفصیل آگے آئے گی) میں حصہ لیا تھا۔ بقیہ تمام شاعر مرزا فرحت نے اپنی طرف سے شامل کر لیے۔ اسی بات نے اور مرزا فرحت کے قلم کی فطری رنگ آمیزی نے اسے افسانہ بنا دیا ہے۔ آئیے اصل مشاعرے اور اس کے کوائف سے آپ کو روشناس کرا دیں۔ "طبقات شعرائے ہند" کے صفحہ ۴۰۱/۴۰۰ پر عارف کے ترجمے میں کریم الدین لکھتے ہیں:

"جن ایام میں کہ میرے چھاپہ خانہ میں مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ یہی (یعنی زین العابدین خاں عارف) شاعر میرِ مجلس اور رئیسِ مشاعرہ مقرر تھا۔

...... واضح ہو کہ یہ مشاعرہ میرے مکان پر چودھویں (بارہویں۔ تفصیل آگے آئے گی) تاریخ ماہ رجب ۱۲۶۱ھ میں شروع ہوا۔ اسی سال میں درمیان ماہ ذیقعدہ کے بسبب بد دیانتی اور نا اتفاقی شرکا کے، جو مطبع کے شریکوں نے مجھ سے کی تھی اور میرا مال دبا کر غصب کرکے مجھ کو بے قبضہ کر دیا تھا۔ موقوف ہوا۔ جب تک وہ مطبع میرے پاس رہا، مشاعرہ پندرھویں روز چھپا کیا۔ تیرھویں ماہ شوال تک چھپا، ہر مہینے تین دو پرچے نکلا کرتے تھے . . . . . ."

صہبائی کے ترجمے میں حدائق البلاغت کی طباعتِ دوم کے بارے میں درج ہے:

"۱۸۴۴ء میں میرے اہتمام سے بھی مطبع رفاہِ عام، واقع حوض قاضی میں چھپا. . . . . ."

شہرت کے ترجمے سے یہ خبر ملتی ہے:

"(شہرت نے) مدت تک اپنے مکان پر مشاعرہ کیا۔ اس کے مکان سے موقوف ہو کر میرے مکان پر جاری ہوا تھا۔ یہ مشاعرہ ۱۲۶۱ھ میں ان کے مکان پر ہوا کرتا تھا. . . . ."

رسا کے حال میں ہے:

"مشاعرہ قاضی کے حوض پر مبارک النساء بیگم کے مکان میں جو میرے پاس کرایہ کو تھا، ہوا کرتا تھا. . . . . (لال) قلعہ میں اور اس مکان میں قریب تین ہزار قدم کے فاصلہ تھا۔"

حیا کے حال میں رقم طراز ہیں

"اٹھائیسویں شعبان ۱۲۶۱ھ کو وہ میرے مشاعرے میں قاضی کے حوض پر تشریف لائے۔"

مندرجہ بالا پانچ اقتباسات سے جو تفصیل مہیا ہوتی ہے وہ تسلسل کے ساتھ اس طرح لکھی جا سکتی ہے اور اسے ہر طرح سے درجۂ استناد حاصل ہے۔ کیونکہ یہ خود صاحبِ تذکرہ اور بانیٔ مشاعرہ کے بیانات پر مبنی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

مولوی کریم الدین ۱۸۴۴ء میں مطبع رفاہِ عام واقع حوض قاضی (شہر دہلی) میں حصہ دار تھے۔ اس زمانے میں مرزا حاجی بیگ شہرت شاگردِ رشید جنابِ مفتی محمد صدر الدین خاں آزردہ اپنے مکان پر مشاعرہ

---

[1] مضامین فرحت حصہ دوم مطبوعہ عبدالحق اکیڈمی۔ نومبر ۱۹۴۴ء ص ۱۷۹
[2] "دلی کا ایک یادگار مشاعرہ یا دلی کی آخری شمع" مطبوعہ لاہور مارچ ۱۹۶۸ء ص ۴۷
[3] فرحت نے جو "۱۴ رجب ۱۲۶۱ھ میں شعراء کی نشست کا نقشہ" دیا ہے۔ اس میں صرف ۵۹ شاعروں کو بٹھایا۔ شاہ ظفر اور ولی عہد (دادا تخلص) کا کلام پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ عبدالرحمٰن ہمشیرہ اور حافظ ویران (شاگرد ذوق) کا موجود ہونا بھی بتایا ہے۔ مجروح کے خط کا بھی ذکر ہے۔

کیا کرتے تھے، جو مدت سے جاری تھا، جب وہ موقوف ہوا تو وہ محفلِ مشاعرہ ۱۲ رجب (۱۴ رجب درست نہیں۔ تفصیل آگے آئے گی) ۱۲۶۱ھ (مطابق ۱۸ جولائی ۱۸۴۸ء بروز جمعہ) سے مولوی کریم الدین کے مکان پر منعقد ہونے لگی۔ ہر مشاعرے کے مستقل میرِ مجلس اور میرِ مشاعرہ زین العابدین خاں عارف مقرر تھے۔ قاضی کے حوض پر واقع یہ مکان مبارک النساء بیگم کی ملکیت تھا اور کریم الدین اس میں کرایہ پر رہتے تھے۔ لال قلعہ اور اس مکان میں تقریباً تین ہزار قدم کا فاصلہ تھا۔ یہ مشاعرہ بائیس شوال (۱۲ شوال درست نہیں) تک جاری رہا۔ مشاعرہ مہینے میں دو بار ہوتا تھا اور اگلے روز تفصیل پرچۂ مشاعرہ میں شائع کر دی جاتی تھی۔ مطبع شریکوں کی بد دیانتی کی وجہ سے ذیقعد کے مہینے میں مولوی صاحب کے ہاتھ سے چھن گیا اور مشاعرہ موقوف ہو گیا۔ مشاعرہ کا حال آخری بار تیئیسویں شوال (تیرھویں شوال درست نہیں) کو چھپا۔

ان معلومات کی بنا پر رجب، شعبان، رمضان اور شوال کے چار مہینوں میں آٹھ مشاعروں کا انعقاد ہونا چاہیے تھا، مگر یقینی طور پر صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ پانچ مشاعرے ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک چھوٹا مشاعرہ بھی ہوا تھا جس کے قافیہ و ردیف "چار بھی نہیں، دشوار بھی نہیں" تھے مگر چونکہ اس طرح میں صرف دو ہی شاعروں کا کلام ملتا ہے اور تاریخ مشاعرہ کی نشاندہی بھی دستیاب نہیں، اس لیے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مشاعرے کی غزلیں ہیں یا غیر طرحی۔ اگر ہیں تو مشاعرہ رجب یا رمضان کے مہینے کا دوسرا مشاعرہ ہوگا۔

رجب میں دو مشاعرے نہیں ہوئے کیوں کہ کریم الدین ۲۸ رجب کو اپنے گھر کے مشاعرے کے بجائے کسی اور کے مشاعرہ منعقدہ لال کنواں میں موجود تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس مشاعرے میں مصرع طرح وہی تھا جو ڈیڑھ ماہ بعد ۱۲ رمضان کو کریم الدین کے گھر پر ہونے والے مشاعرے کے لیے مقرر تھا۔ شیر محمد خاں طالب کے ترجمے میں لکھتے ہیں کہ طالب نے ۲۸ ویں رجب ۱۲۶۱ھ کو دہلی میں لال کنویں پر مشاعرے میں آکر غزل مجھ کو سنائی۔ جس کے یہ چند شعر لکھتا ہوں۔ ان اشعار کا ردیف و قافیہ "نظر اپنا سا، جگر اپنا سا" ہے۔

شعبان کے مہینے میں دو مشاعرے ۱۲ اور ۲۸ تاریخ کو ہوئے۔ مگر رمضان میں پھر ایک ہی مشاعرہ ۱۲ تاریخ کو ہوا — رمضان المبارک کے مصروف مہینے میں مشاعرے کا التزام دو دفعہ نہ ہو سکا ہوگا۔ ایک مشاعرہ شوال میں ہوا۔ تاریخ ۱۲ بھی لکھی ہے اور ۲۲ بھی۔ میرا خیال ہے کہ صحیح تاریخ ۲۲ رہی ہوگی۔ کیوں کہ شہرت کے ترجمے میں لکھا ہے کہ "بائیسویں ماہِ شوال روز یکشنبہ ۱۲۶۱ھ کو یہ شعر انہوں نے میرے مکان پر مشاعرے میں پڑھے تھے۔" ایک دن کے فرق کے ساتھ یکشنبہ ۲۲ شوال ہی کو پڑتا ہے۔ ۱۲ شوال کو چہار شنبہ ہے جو شنبہ یا یکشنبہ سے کوسوں دور ہے۔

یہ پانچوں (یا چھیوں) مشاعرے طرحی تھے۔ تفصیل ملاحظہ فرمائیے:

مشاعرہ ۱۲ رجب ۱۲۶۱ھ (۱۸ جولائی ۱۸۴۵ء)
طرح کا قافیہ اور ردیف — آہ تھی، چاہ تھی

" ۱۲ شعبان (۱۶ اگست ۱۸۴۵ء)
طرح کا قافیہ اور ردیف — اثر نہیں، گذر نہیں

" ۲۸ شعبان (۱ ستمبر ۱۸۴۵ء)
طرح کا قافیہ اور ردیف — قضا کا، دعا کا

" ۱۲ رمضان (۱۵ ستمبر ۱۸۴۵ء)
طرح کا قافیہ اور ردیف — گھر اپنا سا، در اپنا سا

" ۲۲ شوال (۲۵ اکتوبر ۱۸۴۵ء)
طرح کا قافیہ اور ردیف — آہ کی، تباہ کی

(..؟ تاریخ ؟ ؟ ؟
طرح کا قافیہ اور ردیف ؟ — چار بھی نہیں، یار بھی نہیں

طبقات شعرائے ہند کے اندراجات کے مطابق ان مشاعروں میں کُل ۴۴ شاعروں نے حصہ لیا۔ میرا خیال ہے تقریباً ۲۰ شاعر ایسے ہوں گے جو ہر مشاعرے میں شامل ہوئے ہوں گے۔ بیشتر بہ نفس نفیس اور کمتر بذریعہ ڈاک۔ باقی بے قاعدہ طور پر شاملِ مشاعرہ ہوتے رہے ہوں گے۔

کریم الدین نے شروع میں اور اس کے بعد دو ایک بار پھر مشاعرے کا آغاز ۱۴ رجب کو لکھا ہے۔ پہلے مشاعرے میں طرح کے ردیف و قافیہ یقیناً "آہ تھی، چاہ تھی" تھے۔ چنانچہ اوپر کے بیان کردہ دو تین مقامات کو چھوڑ کر جہاں کہیں (اور یہ بہت جگہ ہے) کریم الدین نے اس ردیف و قافیہ میں غزل اور مشاعرے کا ذکر کیا ہے۔ تاریخ ۱۲ رجب ہی لکھی ہے۔ یوں بھی وہ ہر مہینے کی ۱۲ تاریخ ہی مہینے کا پہلا مشاعرہ کیا کرتے تھے۔ شوال تک وہ حصہ داروں کے جھگڑوں میں اُلجھ چکے ہوں گے۔ اسی لیے آخری مشاعرہ ۲۲ تاریخ کو ہوا۔ اب آپ مشاعروں کا حال خود کریم الدین کی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔ پہلے مولوی کریم الدین (۱۸۲۱ء تا ۱۸۷۹ء) کا حال خود ان کی زبانی سنیں۔ بعد ازاں شاعروں کے ترجموں سے لطف اندوز ہوں:

کریم الدّین

مولف تذکرہ ہٰذا نام بندہ کا کریم الدین اور والد بزرگوار شیخ

سراج الدین ساکن پانی پت جو شاہجہاں آباد سے چالیس کوس پر شمال کی جانب بمائل بمغرب واقع ہے۔ مجھ کمترین کے جدِ بزرگوار بلی بھیت جو گنگا پار ہے، وہاں کی پیدائش رکھتے تھے۔ اُنہوں نے اکثر بلادکی سیاحی کی۔ پانی پت میں آکر مقیم ہوئے چونکہ بادشاہی جاگیر کی آمدنی رکھتے تھے، وجہ معیشت سے بے فکر تھے۔ ملکوں کی سیاحی کرتے رہتے تھے، جب میری قبلہ گاہ سراج الدین پانی پت میں پیدا ہوئے۔ اُنہوں نے بھی اقامت پانی پت میں اختیار کی۔ نادر شاہ کے وقت میں ہمارا بہت اسباب اور مال لُٹ کر برباد ہو گیا تھا۔ اس وقت سے پھر اسلوب گھر کا درست نہ ہوا۔ دادا صاحب نے شوق زہد و تقویٰ کا کر کے مسجد نشینی اختیار کی۔ جن ایام میں ایک صاحب جو کہ اول ایک انگریز واسطے بندوبست ملک مفتوحہ ہندوستان کے آکر انتظام جاگیرات کا کر گیا وارد پانی پت ہوا۔ سب ملکیوں نے فرمانِ بادشاہی دکھا کر ملکیں واگزاشت کر دیں۔ میرے دادا کو جب بلایا وہ بسبب ورع اور تقویٰ اور بسبب اس کے کہ وہ بے پرواہ تھے اور ایک یہ بھی تھا کہ کچھ جنون بھی ان کو ہو گیا تھا۔ لیک صاحب کے پاس نہ گئے۔ اُس نے جاگیر مذکور ضبط کی۔ اُن ایام میں قبلہ گاہ میرے کچھ ہوش نہ رکھتے تھے، جب وہ ضبط ہو گئی۔ کوئی صورت آمدنی اور خرچ کی متصور نہ ہوئی جو کچھ زیور یا اسباب گھر میں تھا، وہ بیچ کر کھایا کیے اور دادا صاحب نے مسجد میں بیٹھ کر توکل اختیار کیا۔ قبلہ گاہ صاحب کو بھی کتب صوفیہ پڑھ کر مسجد نشینی کی تعلیم کی۔ چنانچہ بعد اُن کے انتقال کے میرے قبلہ بھی مسجد نشین رہے۔ ساکنین پانی پت اُن کی خدمت خرچ کے موافق کر دیتے تھے۔ وہ مسجد میں نماز پڑھا دیا کرتے تھے یا چند لڑکوں کو تعلیم کر کے اپنا گزارہ اس کی آمدنی سے کرتے تھے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا اور سنِ تمیز کو پہنچا، اول میں نے فارسی کی چار کتابیں پڑھ کر کتابیں عربی کی پڑھنی شروع کیں۔ علم صرف و نحو پانی پت میں پڑھ کر شاہجہان آباد میں آیا۔ اس جا پھر کر صرف و نحو معانی و منطق اور فلسفہ اور طب اور فقہ اور اصول اور کچھ حدیث تحصیل اُن ایام میں اپنے ہاتھ سے کتابت کرتا اور اس کی مزدوری پر گزران کرتا تھا۔ یہاں تک کہ درمیان سنہ ۱۸۱۲ء کے جناب مستطاب طاسین صاحب نفٹننٹ گورنر بہادر نے بندوبست مدرسہ دہلی کا بخوبی کیا اور نئے طالب علم تلاش کر کے اُس میں واسطے تحصیل کے رکھے گئے۔ چنانچہ میں بھی اٹھارہ برس کی عمر میں اس میں داخل ہوا۔ میری تنخواہ سولہ روپے ہوئی۔ اس جا میں نے علم منطق اور فلسفہ۔ اور ہندسہ۔ اور حساب اور ہیئۃ اور پیمایش اور مناظر اور مرایا۔ اور جبر و مقابلہ۔ اور کتب تاریخ۔ اور علم ادب عربی زبان میں اور علم فقہ پڑھا۔ بعد ازاں جب کتب انگریزی کا ترجمہ اُردو زبان میں سوسائٹی اردو نے کروا کے چھپوا کر مشہور کرنا شروع کیا۔ میں نے بھی ہر ایک کتاب کو جو ترجمہ انگریزی سے اردو میں ہوئے بشوق تمام پڑھے اور آج کے دن تک یہ التزام کر رکھا کہ جو ترجمہ سوسائٹی کرواتی ہے میں بالضرور اس کو تمام پڑھ کر لیتا ہوں۔ بعد ازاں بوتراس صاحب پرنسپل مدرسہ دہلی کے حکم سے قوانین دیوانی اور فوجداری اور اصول قوانین۔ اور پولیٹکل اکونومی یعنی سیاست مدنی اور علم ریاضی انگریزی یہ سب تحصیل کیا۔ بعد فراغت اس تحصیل کے اسی شہر میں میں نے اپنا نکاح کیا اور اس جا رہنا اختیار کیا اور ایک چھاپہ خانہ واسطے چھپوانے ترجموں کے بنایا۔ میرا یہ ارادہ تھا کہ اکثر فنون کی کتابیں جو مشکل ہیں ان کو ترجمہ کر کے اور بہت حل ان کا حتی الوسع کر کے اسی مطبع میں چھپوایا کروں۔ اور اگر مجھ کو کچھ نفع نہ ہو تو مجھ کو کچھ مضائقہ نہیں۔ عوام ہندوستانیوں کو جو علوم سے بے بہرہ ہیں سستی قیمت پر وہ کتابیں بیچ کر علوم اور کتب غیر مشہور کو مشہور کروں۔ مگر اس ارادے کو توڑنے والے بھی مہیا ہو گئے۔ یعنی دو چار چالاکوں نے اس مطبع میں میرے شریک ہو کر مجھ سے فریب کر کے وہ مطبع مجھ سے چھین لیا۔ ہر چند کہ میں نے یہی سوچ لیا تھا کہ اگر میں وہ دعویٰ کروں گا، حاکم بے شک میرا انصاف کرے گا، لیکن بسبب واقع ہونے چند صدمات کے اب تک وہ ارادہ پورا نہ ہوا۔ لاچار صبر کیا۔ اتفاقات عجیبہ سے انہیں ایام میں یہ ہوا کہ بسبب قدر دانی اور سخاوتی کے ڈاکٹر اسپنجر صاحب پرنسپل مدرسہ دہلی نے جو کہ سکریٹری سوسائٹی اُردو کے ہیں باوجود اس کے کہ وہ میری اس حالت تنگ سے باخبر نہ تھے عنایت فرما کر مجھ کو کام ترجمہ کرنے کا دیا۔ میں نے بموجب حکم ڈاکٹر صاحب ممدوح کے کئی کتابیں ترجمہ کیں۔ جن کا حال مفصل لکھتا ہوں۔ اور شوق اشعار اردو کہنے کا مجھ کو مطلق نہیں ہے بلکہ شعر کہنا میں بُرا جانتا ہوں کیوں کہ اہل علم کا یہ پیشہ نہیں ہے۔ وہ لوگ جو معیشت سے فارغ البال ہیں اپنے دل بہلانے اور حسرت نکالنے کا اُنہوں نے یہ طور اختیار کر لیا ہے۔

تالیفات سے میری یہ کتابیں ہیں :

تعلیم النساء :

یہ کتاب اردو میں آٹھ تعلیموں پر مشتمل ہے : تعلیم اوّل خدا اور رسول کی شناخت میں۔ تعلیم دوم فرائض مذہبی اور اسلام کی حقیقت کے بیان میں۔ تعلیم سوم مسائل حیض اور نفاس کے بیان میں۔ تعلیم چہارم نسخہ جات مجرب اور تدابیر حفظ صحت بدن کے میں۔ تعلیم پنجم رسوم باطلہ کے رد اور شرک کے بیان میں۔ تعلیم ششم حقوق عورت پر شوہر کے اور شوہر پر عورت کے بیان میں۔ تعلیم ہفتم۔ بندوبست خانگی اور انتظام خانہ

اور نوکروں سے ہوشیاری اور اموال کی دیانت داری میں تعلیم ہشتم ۔ دلائل عقلی اور نقلی رد متعہ اور رد زنا اور چلبلی ـــ اور اغلام اور غیر محرم مرد سے ہم کلام ہونے میں ۔

گلستانِ ہند :

گلشن اول میں لطائف و ظرائف ۔ گلشنِ دوم میں حکایاتِ عجیبہ اور قصص غریبہ ۔ گلشن سوم میں نقلیاتِ ہندی ۔ گلشنِ چہارم میں ضرب الامثالِ ہند ۔ گلشنِ پنجم میں عشق کے فسانے ۔ گلشنِ ششم میں عورتوں کے چلتر کا بیان ۔ گلشنِ ہفتم میں علم اخلاق کی باتیں اور پند دل پسند اور نصایح حکمار کی ۔ گلشنِ ہشتم میں اشعارِ منتخبہ قابلِ یاد داشت اور حفظ کرنے کے ۔ اردو زبان میں یہ کتاب بہت اچھی تیار ہوئی ہے ۔

تذکرہ شعرائے ہند :

یہ کتاب جو تالیف کی گئی ۔ بموجب حکم ڈاکٹر اسپنجر صاحب پرنسپل مدرسہ دہلی کے ۔

گلدستہ نازنینان :

یہ مجموعہ اشعار اساتذہ اردو گو مشہور ہندوستان کا ہے ۔ میں نے جمع کرکے اور شعر منتخب کرکے ۱۲۶۱ھ میں چھپوایا ہے ۔ اس نے بہت جائے اشتہار پایا ہے ۔

عجالتہ العلالہ :

یہ ایک رسالہ عروض کا زبان اردو میں ، میں نے تالیف کیا ہے ۔ اور ۱۲۶۱ھ میں چھپوا کر مشہور کیا ۔ اس رسالہ کو بہت خواہش سے اکثر شعرا نے لیا ہے ۔

رسالہ فرائض :

یہ ایک رسالہ علم فرائض کا زبانِ اردو میں بہت مختصر باین خیال کہ ہر ایک ہندوستانی بھائی کو علم میراث ہو جاوے ۔ کیوں کہ اکثر جھگڑے ورثے کے عدالتوں میں ہوتے ہیں اور ہندوستانی اپنے حقوق سے واقفیت نہیں رکھتے ۔ ۵۰۰ جلد ۱۲۶۱ھ میں چھپوا کر مشہور کیں ۔

روض الاجرام :

یہ ایک کتاب میں نے علم ریاضی کی بدیں تفصیل تالیف کی ہے کہ اس کے اول فن حساب ۔ اور پھر فن پیمائش ۔ پھر الجبرا پھر ہیئت پھر جغرافیہ سب کا بیان مستوعب اس میں لکھا گیا ہے اور مختصر ہے ۔

فرائد الدہر :

یہ ایک تذکرہ زبان عربی میں شعرا عرب کا میں نے لکھا ہے ۔ اس کو تیرہ صدیوں پہ مرتب کیا ہے ۔ ہر ایک صدی کے شاعر کو اس صدی میں لکھا ہے جس میں وہ مرا ۔ اور ہر ایک شاعر کا حال مع حال پیدائش اور نسب اور ماجرا اور تاریخ وفات کے لکھا ہے ۔ کسی کی تاریخ نہیں چھوڑی ۔ یہ بہت بڑا تیار ہوا ہے ۔

تذکرۃ النسا :

یہ ایک تذکرہ عورتوں کا میں نے لکھا ہے ۔ اس میں یہ التزام کیا ہے کہ جو عورت نامور کسی فن میں ہوئی یا آنکہ وہ ملکہ کہلائی یا آنکہ اس نے سلطنت مستقلہ کی عرب میں یا فارس میں یا ہندوستان میں یا یورپ میں یا تمام ایشیا میں کسی جائے یا افریقہ میں ہوئی ہے ۔ میں نے حتی المقدور نہیں چھوڑی اس میں فقط عورتوں کا ہی تذکرہ ہے ۔ کسی مرد کا حال نہیں ہے ۔ اب تک وہ معرض تالیف میں ہے تیار نہیں ہوا ۔ اردو زبان میں لکھا ہے ۔

ترجمہ ابوالفدا :

یہ ایک تاریخ ابوالفدا اسمٰعیل بادشاہ ملک حمایت کی تصنیف سے عربی زبان میں ۔ تھی ۔ بموجب حکم ڈاکٹر اسپنجر صاحب کے زبان اردو میں میں نے اس کا ترجمہ ۱۲۶۳ھ کے اس طرح پر تیار کیا کہ اصل میں اس کتاب کی چھ جلدیں نہیں ، پانچ جلدوں کا بدین تفصیل کہ اول اور دوسری اور چوتھی اور پانچویں اور چھٹی کا میں نے ترجمہ کیا ۔ تیسری کا بسبب جلدی کے مولوی محمد امیر سی صاحب بہادر نے کروایا ہے بعد چھپنے کے اس کو دو جلدوں میں منقسم کیا ہے ۔ تین جلدیں اصلی ۔ اصل کے اول جلد میں ۔ اور تین جلدیں اصل کے دوسری جلد میں ۔ درمیانی ۱۲۶۳ھ کے وہ چھپ گئے ہیں ۔ اس تاریخ میں حال ابتدا دنیا سے سنہ ۷۲۹ تک کا لکھا گیا ہے ۔ اردو میں میں نے اس کا ترجمہ کیا ہے ۔

تاریخ شعرائے عرب :

یہ ایک تاریخ شعرائے عرب کی مرتب تیرہ صدیوں پہ اسی تذکرہ مولفہ اپنی سے جس کا نام فرائد الدہر رکھا ہے ، اردو زبان میں بموجب حکم سکریٹری

سوسائٹی کے میں نے اردو میں ترجمہ کر کے ۱۲۶۳ھ میں چھپوایا ہے۔ بالفعل کہ ۱۸۴۷ء میں وہ چھپ کر تیار ہو گیا۔

محط الجمعیٰ :

یہ ایک کتاب عربی زبان میں میں نے تالیف کی ہے۔ اس میں وہ نکات جو قابل یاد رکھنے کے اور وہ قصے جو حلّ مطالب میں کام آتے ہیں یا آنکہ کسی ضرب المثل کو وہ قصہ بنیاد ہے اور حکایات عجیب و غریب کے اس میں لکھے ہی ہیں۔

ترجمہ کتاب ڈاکٹری :

یہ ایک ترجمہ زبانِ اردو میں عربی سے میں نے کیا ہے۔ اصل میں وہ ترجمہ عربی بموجب حکم والی مصر محمد علی شاہ کے فرنچ زبان سے تیار ہو کے ۱۲۵۰ھ میں چھپا تھا۔ میں نے اس کو اردو میں درمیان کوہستان یعنے کوہِ منصوری پر جا کر ترجمہ ۱۸۴۷ء میں کیا۔ پیدائش میری ماہ عید الفطر ۱۲۳۷ ہجری مطابق ۱۸۲۱ء بتاریخ یکم روز عید بوقت صبح بلدہ پانی پت میں افغانوں کے محلے میں متصل مسجد لشکر خاں کے ہوئی۔ اب میری عمر ۲۶ برس کے درمیان ۱۸۴۷ء کے ہے۔

عارف

۴۰۰/۳۹۹

تخلص، نام نواب زین العابدین خاں خواہرزادہ نواب اسداللہ خان مرزا نوشہ غالب کے ابتدا میں نصیر سے شعر کہنا سیکھا۔ اس کے ہی طور پر ایک دیوان بھی لکھا تھا۔ مگر بعد آتے نواب اسداللہ خان مذکور کے اکبرآباد سے نصیر سے اصلاح لینی چھوڑ کر اُن کی خدمت میں رہنا شروع کیا۔ انہوں نے اپنے ڈھنگ پر اُن کو کتب فارسی کی تعلیم کے اور اصلاح شعر کی بھی دی۔ چنانچہ بہت دنوں کے بعد ایک دیوان .... انہوں نے فراہم کیا اس میں قصاید اور مقطعات اور غزلیں اور مدحیں اور ترجیع بند اور مخمس اور مسدس اور معشر وغیرہ بہت موجود ہیں۔ میں نے بھی وہ دیوان دیکھا ہے۔ اس کو کلیات کہنا چاہیے۔ حقیقت میں یہ شاعر بڑے رتبہ کا ذی قدر قابل اور لائق تحسین اور آفرین کے ہے۔ فارسی میں بڑی دست قدرت اور فن شعر میں کمال مہارت رکھتا ہے۔ جن ایام میں کہ میرے چھاپہ خانہ میں مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ یہی شاعر میر مجلس اور میر مشاعرہ مقرر تھا۔ اور اس کے اشعار میں نے گلدستۂ نازنیناں میں بھی مندرج کیے ہیں۔ اب ان ایام میں بسبب حدّتِ ذہن اور تیزیٔ فکر سخن کے سوکھ کر مثل کانٹے کے ہو گیا ہے۔ بہت دُبلا پتلا سا قد ہے۔ داڑھی بھر کر نہیں نکلی۔ تھوڑی ہی پر کچھ بال ہیں۔ خلق اس کا بہت اچھا۔ اگر کوئی اس سے ملاقات کرے بہت حظ اُٹھائے۔ فی البدیہہ کہنے کا بھی ذوق ہے۔ ضرب المثلیں اپنے اشعار مقطعات میں خوب لکھتا ہے۔ تاریخ کہنے میں بہت اچھی قدرت ہے۔ مادہ بہت اچھا نکالتا ہے۔ چنانچہ میری کتاب "گلدستۂ نازنیناں" کے اتمام پر دو تاریخ اُس نے لکھے ہیں ایک اردو اور دوسرے فارسی۔ ایک مصرع اردو سے کیا۔ اچھی تاریخ نکالی ہے وہ یہ ہے ؎

کہو گلدستۂ گلزارِ جنت۔ اس مصرع سے اُسی کتاب کے اتمام تالیف کے تاریخ نکلتی ہے۔ اور اس کا جوہر سخن دریافت ہوتا ہے۔ غرضیکہ شعر کہنے میں وہ قدرت اُس نے پائی ہے کہ کوئی غزل بجز ساٹھ یا اسّی شعر کے پر مضامین رنگا رنگ نہیں کہتا اور سب اچھے مضمون نئے انداز سے پروتے ہیں۔ نواب ضیاء الدین خان بہادر سے کمال ارتباط اور صحبت اس کو رہتی ہے چونکہ دونوں صاحب وجہ معیشت سے فار[illegible] اور نواب زادہ ہیں باہم شعر و سخن کا چرچا اور صحبت رکھتے ہیں۔ اس سال [illegible] کہ ۱۲۶۳ھ میں عمر اس کی قریب تیس برس کے ہے۔ یہ اشعار شاعر مذکور کے ہیں جو مشاعرے میں میرے مکان پر پڑھے تھے۔ واضح ہو کر یہ مشاعرہ میرے مکان پر چودھویں تاریخ ماہ رجب ۱۲۶۱ھ میں شروع ہوا اسے رواں سال میں درمیان ماہ ذیقعد کے بسبب بد دیانتی اور نااتفاقی شرکا کے جو مطبع کے شریکوں نے مجھ سے کی تھی اور میرا مال دبا کر غصب کر کے مجھ کو بے قبضہ کر دیا تھا، موقوف ہوا۔ جب تک وہ مطبع میرے پاس رہا۔ مشاعرہ پندھویں روز چھپا کیا۔ تیرھویں ماہ شوال تک چھپا۔ ہر مہینے میں دو پرچے نکلا کرتے تھے۔ اس میں ہر ایک شاعر کا حال مع اشعار لکھنے کا ارادہ تھا تاکہ پچھلوں کے واسطے ایک تذکرۂ ہند تیار ہو جائے۔ مگر میرے شرکا نے جو حایل تھے اس امر کے مانع آ کر روک دیا۔ اس میں یہ شعر اس شاعر مذکور کے لکھتا ہوں: ؎

اب وہ نہیں ہے شہر میں سقوں کا۔ روزگار
وہ دن گئے کہ شعلہ فشاں میری آہ تھی
وہ بات اب کہاں لبِ شیریں میں آپ کے
ہے رنگ جب ہمیں لہو کی چاہ تھی
ہو پیرہن میں میرے گریباں خدا کی شان
کھو دی وہ ضعف نے جو مجھے دستگاہ تھی
لب سے لگا کے اپنے بجا وے وہ نے اگر
پھر کہو سے اُس کو کون کہ یہ نیشکر نہیں
بے التفاتیوں کا تری شکوہ کیا کریں
اپنے ہی جب کہ نالۂ دل میں اثر نہیں
اوروں کو ہو تو ہو ہمیں مرنے سے ڈر نہیں
خطرے تھے ہم ہی جلتے ہیں گر نامہ بر نہیں

اُٹھتا قدم جو آگے کو اب راہبر نہیں
پیچھے تو چھوڑ آئے کہیں اس کا گھر نہیں

جائے پیدائش اور وطن اُن کا شاہ جہاں آباد ۔ لڑکپن سے یہیں آج تک رہے ۔ کہیں کا سفر نہیں کیا ۔ مکان اُن کا لال کنوئیں کے پاس ایک پرانے مدرسہ میں ہے جو کہ مقام بنام مدرسہ مشہور ہے ۔ وہاں رہتے ہیں فارسی شعر بہت اچھا کہتے ہیں ۔ علم اور عقل اور مروّت اور اہلیت اور شرافت اور محبت سے گویا اس کا خمیر ہے ۔ مدت ہوئی اب ان سے میری ملاقات نہیں ہوئی

شاکر

۱۲ رجب ۱۲۶۱ھ

ایک شخص ہے دہلی میں رہتا ہے ۔ پیشہ عطاری کا کرتا ہے ۔۔۔ عبدالرحمٰن خاں احسان کا شاگرد ہے ۔ میں نے اُس کو ہر مشاعرے میں جو میرے مکان پر ہوتا تھا، دیکھا ہے ۔ عمر اس کی بالفعل قریب پچیس برس کے ہوگی ۔ بارہویں تاریخ ماہ رجب کو ۱۲۶۱ھ کو میرے مکان میں آکر اُس نے درمیانِ مشاعرہ کے یہ شعر پڑھے ؎

تجھ بن یہ رات کو مری حالت تباہ تھی
فریاد ہے زباں پر اور لب پہ آہ تھی

خسرو کو عشق میں ہوس عز و جاہ تھی
یہاں سینہ کوبی سینہ زنی اور آہ تھی

جائیے جور و جفا مجھ پہ ہمیشہ کیجیے
پر نہ یاں سے کہیں جانے کا ارادہ کیجیے

دل تو کہتا ہے کہ خط ہی اُسے لکھا کیجیے
پر نہ تقدیر میں لکھا ہو تو پھر کیا کیجیے

اے مسیحا تری آنکھوں کا ہے بیمار یہ دل
ایسے بیمار کو لازم ہے کہ اچھا کیجیے

موزون

۱۲ رجب ۱۲۶۱ھ

مرزا قادر بخش صاحب تخلص موزون ایک بادشاہ زادہ ہے ۔ دہلی کے قلعہ میں رہتے ہیں ۔ ان کو شعر کہنے کا بہت شوق ہے ۔ بارہویں رجب ۱۲۶۱ھ میں میرے مکان پر تشریف لاکر رونق بخش مشاعرہ ہوکر یہ شعر انہوں نے پڑھے تھے ۔ قد اُن کا لمبا ہے ۔ دو گیسو بالوں کے دونوں طرف چھوڑے رہتے ہیں ۔ اکثر بازار و کوچہ میں بھی میں نے اُن کو دیکھا ہے ۔ عبدالرحمٰن احسان سے اصلاح لیتے ہیں ۔ یہ شعر اُن کے ہیں : ؎

شب میرے بیمار ہجر سو نگاہ تھی | دیکھوں تمہارا اُس کی نظر سوئے راہ تھی

تجھ بن شب گزشتہ یہ حالت تباہ تھی | میں جاں بلب تھا لب پہ مرے آہ آہ تھی
میں توبہ شراب کو اے شیخ توڑتا | پر محتسب کی دل شکنی بھی گناہ تھی
نظروں سے کیوں گرائے متاعِ دلِ حزیں | اس پر تو مدتوں سے تمہاری نگاہ تھی

قناعت

ہر مشاعرے (۱۲۶۱ھ) میں شامل

مرزا منجھلے صاحب تخلص قناعت نام مرزا نصیر الدین عرف مرزا منجھلے خاندان تیمور سے ہیں ۔ اُنہوں نے ایک کتاب بطور گلستانِ سعدی شیرازی کے اردو زبان میں تصنیف کر کے میرے پاس واسطے مندرج کروانے اشتہار اُس کے روانہ کی ہے ۔ میں نے وہ دیکھی ، اچھی لکھی ہے ۔ وہ عبدالرحمٰن احسان کے شاگرد ہیں ۔ شعر اچھا کہتے ہیں ۔ میرے مکان پر مشاعرے میں تشریف لائے تھے ۔ درمیان ۱۲۶۱ھ کے ۔ انہوں نے ہر دفعہ مشاعرے میں آکر اپنی غزلیں پڑھیں ۔ شعر بہت اچھا کہتے ہیں ۔ اُن کے یہ اشعار ہیں : ؎

قطعہ

مجنوں کے ساتھ دشت میں لڑکوں کی فوج تھی
جاتی سواری اپنی بھی با عز و جاہ تھی
تھے آہ و نالہ رنج و الم ہمرہ رکاب
میرے بھی ساتھ ساتھ ، جناب سیاہ تھی

قطعہ

اک ہاتھ تالی بجتی ہے کب تندخو سمجھ | بنتی تھی جب کہ دونوں کو یکساں چاہ تھی
گر مجھ کو چین قرار نہ تھا تم کو تم بغیر | میری بھی یاد آپ کو شام و پگاہ تھی

ہر مشاعرے میں شامل مگر یہ ۱۲ شعبان ۱۲۶۱ھ کو پڑھی تھی ۔

وفا

حیدر علی نام اور وفا تخلص ۔ یہ شخص ایک مرثیہ خواں ہے ۔ شاہ جہاں آباد میں رہتا ہے ۔ ماہِ محرم میں مرثیہ خوانی کرتا ہے ۔ ذہن رسا رکھتا ہے ۔ طبیعت اچھی ہے شعر کہتا ہے ۔ ہر مشاعرے میں میرے مکان پر آیا کرتا تھا ۔ عمر اس کی قریب پچیس برس قد لمبا ، ڈیل ڈول اچھا ۔ ظریف اور حاضر جواب بدیہہ گو ہے ۔ شوخ مزاج معلوم ہوتا ہے ۔ بارہویں تاریخ ماہ شعبان ۱۲۶۱ھ کو اس نے یہ غزل مجھ کو سنائی ۔ میں نے درج مشاعرہ کر کے چھپوا دی ۔ یہ چند شعر اس کے ہیں ؎

جس کے بغیر زندگی آتی نظر نہیں | افسوس ہے کہ اس کو ہماری خبر نہیں
آیا بتنگ ہوں مدد اے روز بازپرس | میرے شبِ فراق کی ہوتی سحر نہیں
اے موت تو ہی ہجر میں آجا خدا کو مان | اس بے وفا کے آگے بھلا مجھ کو کر نہیں
گھبرا کے وصل میں یہ کہا اس نے ناز سے | سرکاؤں زلف چہرے سے ہوتی سحر نہیں

(بقیہ صفحہ ۲۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

انور پاشا

ہند و پاک میں اُردو ناول

ناول کو عہدِ جدید کا رزمیہ کہا جاتا ہے۔ عہدِ جدید کی انسانی زندگی جس پیچ و خم، شکست و ریخت، تعمیر و تخریب اور کشمکش اور آویزش سے دوچار ہوئی۔ اس کے اظہار کا وسیلہ بننے کی صلاحیت جتنی ناول میں ہے اتنی کسی دوسری صنف میں نہیں۔ کسی قوم اور ملک کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کی تصویر کشی جس حد تک ناول کے ذریعے ممکن ہے، اتنی شاید ہی کسی دوسری صنف کے ذریعے ممکن ہو۔ ناول 'معاشرہ' فرد اور ذات کے اندرونی تضاد و تصادم اور اس میں کارفرما ظاہری و باطنی محرکات اور عوامل و عناصر کو بھی اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ یہ کسی قوم اور معاشرے کی فکری اور نظریاتی فضا کا اظہار یہ بھی ہوتا ہے۔

اردو میں ناول نگاری کی تاریخ ایک صدی سے زیادہ عمر نہیں رکھتی لیکن اس کم عمری کے باوجود اس نے اردو ادب میں اپنا ایک وقیع مقام بنالیا ہے۔ اور اس کی مقبولیت بھی دوسری اصناف سے کم نہیں۔ نذیر احمد سے لے کر جدید ناول نگاروں تک اس میں فنی اور فکری دونوں ہی اعتبار سے ارتقاء کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد اردو ناول نگاری ایک نئے موڑ سے روشناس ہوئی۔ طویل جد و جہد کے بعد برِ صغیر انگریزوں کے استحصالی شکنجے سے آزاد ہوا۔ لیکن یہ آزادی تقسیم کا المیہ بھی ساتھ لے کر آئی۔ تقسیم کے جلو میں قتل و غارت گری اور خوں ریزی بھی ہوئی۔ بڑی تعداد میں دونوں ملکوں میں آبادی کا تبادلہ ہوا۔ ان حالات و واقعات نے دونوں ملکوں کے عوام کو براہِ راست اور بالواسطہ طور پر شدت سے متاثر کیا، دونوں ملکوں کے ادیب و فن کار بھی ذاتی طور پر ان سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے تقسیم اور تقسیم سے پیدا شدہ حالات و واقعات کو اپنی تحریروں میں سمیٹنے کی کوشش کی۔ تقسیم کے بعد دونوں ملکوں میں سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی و ثقافتی سطح پر کچھ تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان تبدیلیوں کے اثرات ادب پر بھی مرتب ہوئے۔ اردو ناول نگاری بھی ان سے متاثر ہوئی اور دونوں ملکوں کے ناول میں موضوعات و مسائل، فکر و فن اور رجحانات و نظریات کی سطح پر کچھ مماثلتوں کے باوجود خاصا فرق اور تضاد بھی نمایاں ہو کر سامنے آیا۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۰ء تک کا دور ہند و پاک میں تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی سطح پر جہاں شکست و ریخت کے بعد تعمیر و تشکیل کا دور رہا ہے وہیں نفسیاتی سطح پر ماضی کے احتساب اور اس سے پیدا شدہ نسٹلجیاتی کرب کے اظہار و اقرار کا دور بھی رہا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب برِ صغیر دو ملکوں میں منقسم ہو چکا تھا۔ تقسیم کے نتیجے میں ایک نئی مملکت پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اس نئی مملکت کے وجود کا جواز چوں کہ تہذیبی و ثقافتی علیحدگی اور اختلاف کو قرار دیا گیا تھا۔ اس لیے دونوں ملکوں کے اردو ادیبوں اور دانشوروں کو اپنی تہذیبی جڑوں کی تلاش اور ثقافتی شناخت کے تعین کی فکر لاحق ہوئی۔ اس تہذیبی و ثقافتی تعین کے لیے انہوں نے ماضی کی تہوں تک پہنچنے کی کوشش کی اور عہدِ قدیم سے لے کر عہدِ جدید تک تہذیب و ثقافت کے جن متعدد دھاروں نے برِ صغیر کی تہذیبی فضا کو تشکیل دیا تھا، ان کی نشاندہی اور ان کی تلاش و جستجو کی جانب توجہ کی۔ ہند و پاک کے ناول نگاروں کی ایک قابلِ لحاظ تعداد نے ماضی کی مشترکہ تہذیبی و ثقافتی اقدار کو نگاہِ تحسین سے دیکھا اور تقسیم کو اس مشترکہ وراثت پر شدید حملہ تصور کیا۔ ہند و پاک کے

BE/2D ڈی ڈی اے فلیٹس، منیرکا، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷

بیشتر ناول نگاروں نے ذہنی اور جذباتی سطح پر ماضی اور اس ماضی کی تہذیبی قدروں کو جس طرح دیکھا اور پیش کیا ہے اس سے اس میں ایک نوسٹلجیائی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کیفیت کی گونج ہند و پاک کے ناول نگاروں کے یہاں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔

ہندوستانی ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر کے یہاں ماضی کی صدائے بازگشت کا رنگ زیادہ گہرا ہے۔ ان کے اوّلین ناول "میرے بھی صنم خانے" سے لے کر "کارِ جہاں دراز ہے" تک یہ رنگ نہ صرف تکرار کے ساتھ برقرار رہتا ہے بلکہ مزید گہرا ہوتا گیا ہے۔ وہ تہذیبی تشخص کی تلاش میں ڈھائی ہزار سال کی تاریخی تہوں تک پہنچتی ہیں — انہوں نے ماضی کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ برصغیر میں تہذیب کی مختلف پرتوں، عہد بہ عہد اور نسل بہ نسل زوال و ارتقا کی مکمل تصویر اپنے ناول "آگ کا دریا" میں پیش کی ہے۔ ہندوستان کی تہذیبی فضا کی یہی جھلک کچھ زمانی و مکانی فرق کے ساتھ قاضی عبدالستار، جیلانی بانو اور حیات اللہ انصاری کے یہاں بھی موجود ہے۔ عصمت چغتائی کا ناول "ایک قطرۂ خون" بھی ماضی میں پناہ ڈھونڈنے کا ہی اشاریہ ہے۔

پاکستانی ناول نگاروں کے یہاں تہذیبی جڑوں کی تلاش کا اظہار زیادہ شدت کے ساتھ ہوا ہے۔ تقسیم کے بعد پاکستانی معاشرے کی ایک بڑی آبادی احساسِ بے دخلی، ہجرت کے تجربے اور رنا مالنوسی ناسازگار حالات سے دوچار تھی۔ وہ اپنی جڑوں سے کٹ چکی تھی اور نیا تہذیبی پس منظر دریافت کرنے کی فکر میں غلطاں تھی۔ ان کا ماضی کھو چکا تھا، لیکن ان کی جڑیں اسی ماضی میں پیوست تھیں۔ لہٰذا ان جڑوں کی تلاش و جستجو اور ان کی از سر نو دریافت کا عمل وہاں کے ناول نگاروں کے یہاں شدت سے اُبھر کے آیا۔ ان کے ناولوں میں تہذیبی و ثقافتی سطح پر نوسٹلجیا کا رنگ غالب ہے۔ جمیلہ ہاشمی، عبداللہ حسین، خدیجہ مستور، انتظار حسین سبھی ماضی کی گرفت میں ہیں۔ گو عبداللہ حسین، خدیجہ مستور اور جمیلہ ہاشمی کا ماضی زیادہ گہرا نہیں ہے۔ لیکن ایک واضح رجحان کے طور پر ضرور موجود ہے۔ انتظار حسین کے یہاں ماضی وسیلہ بنتا ہے موجودہ سیاسی و نفسیاتی مسائل کے اظہار کا۔ وہ اپنے عہد کے کرب یا حسیت کو ماضی کے حوالے سے پہچانتے اور دکھاتے ہیں۔ ان کا تاریخی شعور ہجرت کے تجربے تک محدود ہے اور ہجرت کا کرب اور گمشدہ تہذیبی رشتوں کی یاد ان کے یہاں ایک کسک بن کر اُبھرتی ہے۔ وقت کی بالادستی کا احساس و اظہار بھی ہند و پاک کے ناول نگاروں کے یہاں ماضی سے جذباتی وابستگی کی علامت کے طور پر ہی ہوا ہے۔ مذہب کی جانب بڑھتا رجحان اور مواد و اسلوب میں مذہبی استعارے، تشبیہات، اساطیر اور تلمیحات کا استعمال بھی ماضی پرستی کی ہی ایک شکل ہے۔

دونوں ملکوں کے ناول نگاروں کے یہاں حال سے ناآسودگی کا اظہار بھی ماضی کی جانب مراجعت کی شکل میں ہوا ہے جسے خاموش فراریت پر بھی موقوف کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ تلخ حقائق اور بدلتے ہوئے حالات و مسائل کو انگیز کرنے کی ان میں ہمت نہیں ہے اور نہ ہی عصری سماجی انقلاب میں وہ اپنی کوئی شرکت محسوس کرتے ہیں۔ اس عہد کے پاکستانی ناول نگاروں میں بعض کے یہاں تو عصری حالات و مسائل کی عکاسی ملتی ہے، لیکن ہندوستانی ناول نگاروں میں کرشن چندر کے ناول "جب کھیت جاگے" اور کسی حد تک "ایوانِ غزل" کو چھوڑ کر عصری حسیت کا پرتو دوسروں کے یہاں کمیاب ہے۔

ہند و پاک کے اس عہد کے ناولوں میں موضوعات و مسائل کی سطح پر ماضی کی گرفت حاوی ہے۔ تحریکِ آزادی کے بعد تقسیم ملک اور تقسیم ملک سے پیدا شدہ حالات و مسائل نے جو ہیجانی حالات پیدا کیے اس نے ایک مدت تک ناول نگاروں کے ذہنوں کو اپنی گرفت میں رکھا۔ تقسیم ملک کے نتیجے میں برصغیر ہند و پاک کی زندگی جغرافیائی، سیاسی، مذہبی، تہذیبی، نفسیاتی اور لسانی اعتبار سے متاثر ہوئی۔ انفرادی اور اجتماعی رشتوں کے نئے پہلو ظاہر ہوئے۔ فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت نے وقتی اور دیرپا جسمانی، ذہنی، سیاسی اور معاشرتی اثرات قائم کیے۔ ان ہی اثرات کا نتیجہ ہے کہ اس عہد کے دونوں ملکوں میں شاذ و نادر ہی ایسا ناول ملتا ہے جس میں ان موضوعات و مسائل کو کلیدی حیثیت حاصل نہیں۔ اس عہد میں لکھے گئے دونوں ملکوں کے بیشتر ناول تقسیم سے قبل کے ماضی بعید و قریب سے شروع ہو کر تقسیم اور ہجرت پر آکر ختم ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان میں قرۃ العین حیدر کے ناول "میرے بھی صنم خانے"، "سفینۂ غمِ دل"، "آگ کا دریا" اور "کارِ جہاں دراز ہے"، حیات اللہ انصاری کا "لہو کے پھول"، خواجہ احمد عباس کا ناول "انقلاب" اور پاکستانی ناولوں میں خدیجہ مستور کا ناول "آنگن"، عبداللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں"، جمیلہ ہاشمی کا ناول "تلاشِ بہاراں" اور انتظار حسین کا ناول "چاند گہن" اسی زمرے کے ناول ہیں۔

ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے ناول نگاروں نے تقسیم کو غیر فطری تصور کیا اور فسادات، خوں ریزی اور بہیمیت کو مذہب اور فرقوں سے بالاتر ہو کر خالص انسانی نقطۂ نظر سے دیکھا اور ان کی مذمت کرتے ہوئے انسان دوستی پر مبنی روشن انداز کی حمایت کی ہے۔ "لہو کے پھول"، "اداس نسلیں"، "آگ کا دریا"، "میرے بھی صنم خانے"، "آخرِ شب

کے ہمسفر" "آنگن" "غدار" "اور انسان مر گیا" "شب گزیدہ" "چاند گہن" "تلاشِ بہاراں" اور "انقلاب" میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

موضوعات و مسائل کی سطح پر تحریکِ آزادی، تقسیم ملک، فسادات اور مہاجرین کے مسائل کے علاوہ دیہی کسانوں اور نچلے طبقے کی زندگی، عورتوں کی سماجی حیثیت اور ان کے مسائل کو بھی دونوں ملکوں کے ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستانی ناولوں میں کرشن چندر کا ناول جب کھیت جاگے، حیات اللہ انصاری کا ناول "لہو کے پھول" راجندر سنگھ بیدی کا ناول "ایک چادر میلی سی" اور پاکستانی ناولوں میں عبداللہ حسین کا "اداس نسلیں" اس ضمن میں قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن "جب کھیت جاگے" اور "ایک چادر میلی سی" کو چھوڑ کر اس عہد کے دوسرے ناولوں میں کسان اور نچلے طبقے کے مسائل کو مرکزی حیثیت حاصل نہیں۔ قاضی عبدالستار کے ناول "شب گزیدہ" اور "شکست کی آواز" میں گو فضا دیہی ہے، لیکن خو بو شہریوں جیسی ہے۔ قاضی عبدالستار کے ان ناولوں میں طبقۂ اشرافیہ کو ہی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ پاکستانی ناولوں میں عبداللہ حسین کے ناول 'اداس نسلیں' کے علاوہ دوسروں کے یہاں دیہی زندگی اور کسانوں کے مسائل کی عکاسی عنقا ہے۔ "اداس نسلیں" میں بھی تہذیبی و معاشرتی فضا طبقۂ اشرافیہ کے گرد گردش کرتی ہے۔

اس طرح مجموعی طور پر اس عہد کے دونوں ملکوں کے ناولوں کا دائرہ اعلیٰ اور متوسط طبقے اور شہری معاشرت کے وسائل اور ان کی زندگی کی ترجمانی تک ہی محدود ہے۔ دوسرے طبقے کے کرداروں کی ترجمانی اگر ہوتی بھی ہے تو ان کی حیثیت ضمنی ہوتی ہے۔ ہندوستانی ناولوں میں "جب کھیت جاگے" اور "ایک چادر میلی سی" دو ایسے ناول ہیں، جن کے کردار محنت کش اور سماج کے نچلے طبقے کی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان ناولوں میں انہیں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ پاکستانی ناول نگاروں کے یہاں تو "خدا کی بستی" اور "خونِ جگر ہونے تک" کو چھوڑ کر دوسرے ناول سماج کے محنت کش اور کسان مزدور طبقے کے کرداروں سے عاری ہیں۔

لیکن موضوعات و مسائل کے تنوع کے اعتبار سے پاکستانی ناولوں کا کینوس زیادہ وسیع اور عمیق ہے۔ انہوں نے نفسیاتی ناول کے زمرے میں بھی اضافہ کیا اور قحطِ بنگال کو بھی اپنے موضوع میں شامل کیا۔ ممتاز مفتی کا ناول "علی پور کا ایلی" اور فضل احمد کریم فضلی کا ناول "خونِ جگر ہونے تک" اس ضمن میں قابلِ ذکر ہیں۔ پاکستانی ناول نگاروں نے کسی حد تک پاکستان کے عصری مسائل اور وہاں کی عصری زندگی کے حقائق کو بھی اپنے ناولوں میں سمیٹنے کی سعی کی ہے۔ شوکت صدیقی کا ناول "خدا کی بستی" انتظار حسین کا ناول "بستی"، رضیہ فصیح احمد کا ناول "انتظار موسم گل" اور "آبلہ پا" میں پاکستان کے نو آباد معاشرہ اس معاشرے کی تباہ حالی، اقدار کا فقدان، اخلاقی خلا، نفسیاتی کشمکش، ذہنی تشنج، سیاسی انتشار، افراتفری، ناآسودگی اور محرومی کو محیط کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جب کہ ہندوستانی ناول نگاروں کے یہاں ماقبل تقسیم اور تقسیم ملک کے وقت کے حالات و واقعات ہی اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے ناول ہندوستان کے ہمعصر مسائل اور عصری زندگی کے حقائق کی ترجمانی سے عاری ہیں۔ ہندوستانی سماج کے نو بہ نو مسائل، طبقاتی آویزش اور سیاسی و معاشی تغیر و تبدیلی ان کے ناولوں میں جگہ نہیں پا سکی ہیں۔

چوں کہ اس عہد کے دونوں ملکوں کے بیشتر ناولوں کی فضا غیر منقسم ہندوستان کی تہذیبی و معاشرتی فضا ہے۔ اس لیے ان کے ناول کے کردار بھی اسی ماحول اور معاشرت کے پروردہ ہیں۔ اور اسی لیے ناولوں کے کرداروں کی ذہنی اور جذباتی کیفیت بھی کافی حد تک مماثل ہے۔

چونکہ پاکستانی ناول نگاروں نے کسی حد تک اپنے گرد و پیش کی زندگی، اپنے عصر اور اپنے مسائل سے جھوجھنے کی کوشش کی ہے، اس لیے ہندوستانی اور پاکستانی ناولوں میں کردار نگاری کی سطح پر ایک اہم فرق یہ بھی ہے کہ ہندوستانی ناولوں کے برعکس وہاں کے بعض ناولوں کے کردار ہمعصر پاکستانی معاشرہ اور اس معاشرے کی زندگی اور اس کے مسائل کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ "خدا کی بستی" "بستی" "آبلہ پا" اور "انتظارِ موسمِ گل" کے کردار اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہیں۔ اس عہد کے دونوں ملکوں کے ناولوں میں عورتوں کے کردار کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ہندوستانی ناولوں میں "ایک چادر میلی سی" "میرے بھی صنم خانے" "آگ کا دریا" "آخرِ شب کے ہمسفر" "ایوانِ غزل" اور پاکستانی ناولوں میں "تلاشِ بہاراں" "آنگن" "آبلہ پا" اور "انتظار موسمِ گل" میں عورتوں کے کردار کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ دونوں ملکوں کے ناولوں میں بیشتر کردار خارج سے داخل کی جانب سفر کرتے ہیں۔ بیشتر ناول نگاروں نے کرداروں کی انفرادی نفسیات اور داخلی احساسات کو کرید کر ان کے دلوں کے نہاں خانوں تک قارئین کو پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ تہذیبی انتشار، اقدار کے بحران، اجنبیت اور جلاوطنی، مبہم اور غیر مبہم خوف، تشکیک اور تذبذب اور اندرونی شکست و ریخت نے انسان کی داخلی اور خارجی زندگی کو جس طرح متاثر کیا ہے اس کی ترجمانی ان ناولوں کے کرداروں کے ذریعے کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان ناولوں کے کرداروں کے ذریعے کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ماضی میں گم، داخلیت پسند اور تنہائی و اجنبیت کے شکار کردار ایک پوری نسل کی ذہنی اور جذباتی زندگی کی علامت ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود اس عہد کے ہند و پاک کے ناول نگار اردو ناول

کو ایسے کردار دینے سے قاصر رہے جو ابن الوقت، خوجی، امراؤ جان ادا، ہوری اور شمن جیسے کرداروں کے مقابلے میں پیش کیے جاسکیں۔ پھر بھی نعیم (اداس نسلیں) گوتم نیلمبر، ہری تنکر، کمال، چمپا (آگ کا دریا) عالیہ، چھمی، بڑے چچا (آنگن) ایلی (علی پور کا ایلی) اور رانو (ایک چادر میلی سی) وغیرہ کرداروں سے ہند و پاک کے اردو ناول کی کردار نگاری ایک حد تک وقیع ضرور ہوئی ہے۔

تقسیم اور اس کے بعد کے حالات نے زندگی کی بہت ساری کھردری حقیقتوں کو بے نقاب کیا۔ زندگی کا یہ کھردرا پن موضوع کے علاوہ دونوں ملکوں کے ناولوں کی تکنیک اور اسلوب کے کھردرے پن کی شکل میں بھی ظاہر ہوا۔ زندگی کے انتشار کے احساس نے پلاٹ سے بھی لکھنے والوں کی دلچسپی کم کردی۔ ناولوں کی تکنیک میں بھی زندگی کا بکھراؤ اور بے ترتیبی منعکس ہونے لگی۔ اب کہانی پن پر پہلے جیسا زور نہیں رہا۔ تاثرات اور داخلی احساسات کی بے ترتیب تصویروں کو پیش کرنے کا رویّہ عام ہونے لگا۔ داخلی تصورات اور انسان کے باطنی کرب اور زندگی کی بے سمتی کا اظہار بھی ناولوں میں ہوا۔ اور اسی مناسبت سے تکنیک بھی اختیار کی گئی۔ شعور کی رو اور فلیش بیک کی تکنیک نے پلاٹ میں نظم و ضبط اور ترتیب و توازن کی روایتی پابندیوں کو ختم کیا۔ زمانی تسلسل بھی مجروح ہوا۔ دونوں ملکوں میں پلاٹ کی تنظیم و ترتیب سے آزاد ناول بھی لکھے گئے۔

ہندوستانی ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر کے یہاں اس تجربے کی آنچ زیادہ تیز ہے، انہوں نے جدید تکنیک کو بروئے کار لاتے ہوئے برصغیر کی تاریخ و تہذیب، انسانی عظمتوں، اس کے ابدی کرب اور جہدِ مسلسل کو اپنے ناولوں میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستان کے دوسرے ناول نگاروں کے یہاں بھی پلاٹ اور تکنیک کے تجربے کا شعور موجود ہے لیکن ان کا یہ شعور روایت سے یکسر انحراف کی بجائے روایت اور جدّت کی آمیزش سے عبارت ہے۔ قاضی عبدالستار، حیات اللہ انصاری، جیلانی بانو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور کرشن چندر کے ناول اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب کہ پاکستانی ناول نگاروں کے یہاں پلاٹ اور تکنیک کی سطح پر تجربے اور نئی جہتوں کی تلاش کا عمل ہندوستانی ناول نگاروں کے مقابلے زیادہ شدید اور وسیع ہے۔ انہوں نے آزاد تلازمۂ خیال، شعور کی رو، فلیش بیک اور تحلیلِ نفسی کی تکنیک کے ذریعے پلاٹ کو روایتی حدود سے نکال کر زمانی و مکانی وسعتوں سے ہمکنار کیا۔ انتظار حسین کا ناول "بستی" عبداللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" جمیلہ ہاشمی کا ناول "تلاشِ بہاراں" ڈاکٹر احسن فاروقی کا ناول "سنگم" خدیجہ مستور کا "آنگن" اور ممتاز مفتی کا "علی پور کا ایلی" اس سمت میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ اسلوب کی سطح پر بھی پاکستانی ناولوں میں اساطیری، دیومالائی اور مذہبی استعارے اور تشبیہات کا عنصر نمایاں ہے۔

اس طرح ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۰ء کے درمیان لکھے گئے دونوں ملکوں کے نمائندہ ناولوں کے اس مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کمیت و کیفیت اور مواد و تکنیک دونوں ہی اعتبار سے ہندوستانی ناولوں کے مقابلے پاکستانی ناولوں میں زیادہ تنوع وسعت اور گہرائی ہے۔ ہندوستانی ناولوں کے زمرے میں سے اگر قرۃ العین حیدر کے ناولوں کو خارج کردیں تو کم مائیگی کا احساس اور شدید ہو جاتا ہے۔ گرچہ عصری زندگی کے مسائل اور جدید ذہن کی ترجمانی کے اعتبار سے دونوں ممالک کے ناول تہی دامن ہیں۔ پھر بھی پاکستان میں ۱۹۸۰ء کے بعد قابلِ لحاظ تعداد میں ایسے ناول لکھے گئے جن سے پاکستانی ناول نگاری کا دامن قدرے وسیع ہوا ہے۔ جب کہ ہندوستان میں اردو ناول نگاری تا ہنوز توجہ کی طالب ہے۔ ●●

بقیہ: عبدالرحیم خان خاناں

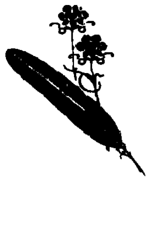
کردہ حالا در مفارقت روح و بدن فی الجملہ بدن
مضطرب گرد دیدہ است"

ضرورت ہے کہ خان خاناں کے ادبی رجحانات، مذہبی احساسات، علمی فضائل، شعر و ادب سے دلچسپی، سیاسی خدمات پر سیر حاصل گفتگو کی جائے۔ اس کی سیرت و کردار کے ایک ایک پہلو کو روشنی میں لایا جائے۔ اور اس کے فارسی اور ہندی کلام کے مجموعے شائع کیے جائیں۔ اور معاصرین سے اس کی خط و کتابت کے مستند مجموعے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا جائے۔

عبدالرحیم خان خاناں کا یہ ہندی شعر ہر ہندوستانی کے دل پر نقش کرا دینا چاہیے ؎

رحیمن دھاگا پریم کا مت توڑو چٹکائے
ٹوٹے سے پن نہ ملے، ملے گانٹھ پڑ جائے

یعنی پریم کا دھاگا نہیں ٹوٹنے دینا چاہیے۔ ٹوٹ جاتا ہے تو پھر دونوں سرے مشکل سے ملتے ہیں۔ مل بھی جائیں تو گانٹھ پڑ جاتی ہے۔



کشمیری لال ذاکر

سولہویں قسط

یہ صبح زندہ رہے گی

اُس روز کی شام واقعی بہت حسین ثابت ہوئی۔

پرلو روہیلہ نے سبھی جانے پہچانے ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور ادب نواز دوستوں کو جمع کر لیا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق تو یہ سب میری وجہ سے ہوا تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس محفل کو کامیاب بنانے کے لیے اس نے پورا دن صرف کر دیا تھا۔ میرے لیے یہ شام ایک کبھی نہ بھلائی جاسکنے والی شام تھی۔ پاکستان کے اس علاقے کے چوٹی کے ادیب، شاعر اور نقاد اس محفل میں موجود تھے۔ ممتاز مفتی، کرنل شفیق الرحمٰن، ڈاکٹر جمیل جالبی، منیر شیخ منشا یاد، شوکت واسطی، شمشاد نازلی، فرزانہ واسطی، خالد اقبال یاسر، سلطان رشک، رشید محمد، اختر جمال اور اس کے شوہر احسن علی خان ضیا جالندھری اور اس کی بیگم، راجہ اکرام اعظم، اس کی بہن زہرہ اعظم، عذرا اصغر، شمیم حیدر، ابن الحسن، شبنم شکیل، (عابد علی عابد کی صاحبزادی) بیگم سرفراز اقبال اور صاحبِ خانہ پرلو روہیلہ اور اس کی بیگم۔ جب ان دوستوں نے اپنی کتابیں بھی مجھے پیش کیں تو میں نہال ہی تو ہو گیا۔

ممتاز مفتی اس زمانے میں، جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا، میرا محبوب افسانہ نگار تھا۔ ان دنوں وہ درس و تدریس کا کام کرتا تھا۔ اور بہت ہی پیارے نفسیاتی افسانے لکھتا تھا۔ فرائڈ سے بہت متاثر تھا وہ ان دنوں۔ "آن کہی" کے افسانے میں نے انہیں دنوں پڑھے تھے اور تقسیم سے پہلے "چُپ" اور "گہما گہمی" کے افسانے بھی پڑھ چکا تھا لیکن ممتاز مفتی سے میری ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس روز جب میں پہلی بار ممتاز مفتی سے ملا تو اس کے کھُلے انداز سے ایسا لگا کہ ہم اپنی اپنی تخلیقات کے حوالے سے ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ انتظار حسین نے ممتاز مفتی کے افسانوں کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ بالکل سچ ہے:

"ممتاز مفتی باہر کے آدمی کو چھوڑ کر اندر کا آدمی باہر لاتے ہیں۔"

لیکن منشا یاد نے اپنی بات کہہ کر اس سچائی کو ایک نئی سمت دے دی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اب ممتاز مفتی اپنے فن میں اس مقام پر ہے کہ جب چاہے وہ اندر کے آدمی کو باہر لائے اور جب چاہے باہر کے آدمی کو اندر لے جائے۔

جب میں ۸۴ برس کے اس چاق و چوبند اور جاگے ہوئے آدمی سے ملا تو عورت کے بارے میں کہی اس کی بات ایک دم یاد آگئی۔

"مجھے کنواری لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کسی مٹیارکی ایک متفنی نظر پہ دوشیزگی، نوخیزی، معصومیت اور الہڑپن تج دینے کو تیار رہوں۔ مجھے بدمعاش عورت سے عشق ہے"۔

بڑا فعال ہے ممتاز مفتی۔ بڑی زندگی اور توانائی ہے اس میں۔ خدا کرے کہ وہ بہت برس اور جیے۔ اور اردو ادب کے سرمائے میں اور بھی قابلِ قدر اضافے کرے۔

میں پاکستان سے واپسی پر اس کا ضخیم ناول "علی پور کا ایلی" لے آیا تھا۔ آج کل وہی ناول پڑھ رہا ہوں۔

میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں کرنل شفیق الرحمٰن ایک کریز بن گیا تھا۔ پڑھنے والوں کے لیے "کرنیں"، "حماقتیں"، "مزید حماقتیں" چھپ چکی تھیں۔ اس نے اردو کے قاری کو ایک نئے اسلوب کے مزاج سے آشنا کرایا تھا۔ شوخ رنگوں والا ادب۔ اس کی تحریریں پڑھ کر دل میں گدگدی ہوا کرتی تھی۔ مجھے یاد ہے "مزید حماقتیں" کے پیش لفظ میں اس نے لکھا تھا:

"یہ دستور رہے کہ کتاب خواہ کہیں
بھی لکھی گئی ہو۔ مصنف اگر ایک
مرتبہ بھی ولایت گیا ہے تو دیباچہ
ضرور لندن کا لکھا ہوا ہوگا۔"
ان دنوں میں لندن میں ہوں۔
اس لیے مجبور ہوں کہ اس روایت
کو قائم رکھوں۔
ویسے میں کوئی خاص بات نہیں
کہنا چاہتا، سوائے اس کے کہ
یہ دیباچہ ہے، جسے میں نے لندن
میں لکھا ہے۔"

سچ بتائیے یہ سطور پڑھ کر آپ کے دل میں گدگدی نہیں ہونے لگی کیا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ اکادمی ادبیات پاکستان کا چیئرمین رہ چکا تھا۔ اسی زمانے میں ۱۹۸۵ء میں پانچویں کل پاکستان اہل قلم کانفرنس ہوئی تھی، جس کے مقالات کتابی شکل میں چھپ چکے تھے — اور میں انہیں دیکھ بھی چکا تھا۔ کتاب کا مرتب خالد اقبال یاسر تھا۔ مقالات بہت سلیقے سے چھاپے گئے تھے۔

گفتگو کے دوران شفیق الرحمٰن نے بتایا کہ اس کا ہریانہ میں ضلع روہتک کے قصبہ کلانور سے تعلق تھا۔ اس نے وہاں کے کچھ لوگوں کے نام بھی بتائے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ شفیق الرحمٰن میرا "وطنی" بھی تھا۔ وہ مجھے ملنے راولپنڈی سے آیا تھا اور واپس جاتے ہی اس نے مجھے اپنی کتابوں کا پورا سیٹ ہر کتاب پر میرا نام لکھ کر اپنے آدمی کے ہاتھ بھجوایا۔ شفیق الرحمٰن کے اس خلوص اور محبت سے میں بے حد متاثر ہوا تھا۔

ایک اور شخص جس سے ملنے کی مجھے بڑی تمنا تھی وہ تھا ڈاکٹر جمیل جالبی — ایک بڑی ہی پہلو دار شخصیت کا مالک۔ کراچی یونیورسٹی کا وائس چانسلر اور اس کے بعد مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد کا صدر — پیدائش علی گڑھ کی اور بی۔ اے تک کی تعلیم میرٹھ کالج میرٹھ کی۔ تقسیم کے بعد کراچی چلا گیا اور آگے کی ساری تعلیم سندھ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ لگا جیسے میں ایک بڑے عالم سے گفتگو کر رہا تھا۔ وہ جتنا بڑا عالم ہے، اس میں اتنی ہی زیادہ انکساری بھی ہے۔ اچھا ہوا کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے بارے میں مرتب کی ہوئی ایک کتاب بھی مجھے عنایت کر دی۔ کتاب کو نسیم فاطمہ نے ترتیب دیا تھا جو کراچی یونیورسٹی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہے۔

لیکن ایک شخص جو پاکستان کے سفارت خانے میں رہ کر دہلی اور چنڈی گڑھ کو ایک دوسرے سے جوڑنے کی ہی کوشش میں لگا رہا تھا، اس سے ملاقات کی تو کیفیت ہی دوسری تھی — وہ شخص تھا منیر شیخ۔ ایک اچھا افسانہ نگار جو اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں لکھتا ہے۔ ہم لوگوں نے اس کے اعزاز میں ایک محفل کا اہتمام کیا تھا چنڈی گڑھ میں۔ اس نے دونوں ملکوں کے آپسی تعلقات کو زیادہ سے زیادہ خوش گوار بنانے کی بھی بات کی تھی اور اپنی ایک خوب صورت کہانی بھی سنائی تھی۔ بہت دنوں تک اس کہانی کا تاثر رہا تھا میرے دماغ پر۔ جب تک منیر شیخ دہلی میں رہا اس سے ملنے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکل ہی آتی تھی۔ دہلی سے جانے کے بعد یہ اس سے پہلی ملاقات تھی۔ شمید یہ ملاقات کا یہ لمحہ بہت خوب صورت تھا۔

منشا یاد کی کہانیاں بھی پڑھتا رہتا ہوں۔ اس سے بھی پہلی ملاقات ہو رہی تھی۔ اسلام آباد میں۔ اس نے اپنے افسانوں کا مجموعہ "ماس اور مٹی" مجھے دیا تو اور بھی اچھا لگا۔ دیباچے کے طور پر جو چند سطریں اس نے لکھی تھیں ان میں سے آخری سطر بہت پیاری تھی:

"آخر میں شاباش ان بہادروں
کو جنہوں نے ہر حال میں زندگی کا
سفر جاری رکھا اور اس رب
کا جس کا ذکر اوپر آیا ہے، لاکھ لاکھ
شکر ادا کیا۔"

"ماس اور مٹی" کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا تھا:

"ماس اور مٹی" جیسا افسانوں کا
مجموعہ کہیں برسوں بعد منظر عام پر
آتا ہے اور بعض اوقات تو پوری
دہائی کا اہم ادبی واقعہ قرار پاتا ہے"

اس محفل کا ایک خوب صورت پہلو وہ شعری نشست تھی، جس میں سب شاعر دوستوں نے اپنا بہت ہی اچھا کلام پیش کیا اور جی بھر کر داد حاصل کی۔ دھیرے دھیرے یہ محفل ایک مختصر سے مشاعرے میں ڈھل گئی اور سبھی دوست پیارے پیارے شعروں کا لطف اٹھاتے رہے۔

اور اس کے بعد محفل کا وہ دور شروع ہوا جس کی صدارت بیگم روہیلہ نے کی۔ یعنی کھانے کی محفل۔ ایک اچھے ادبی اجتماع کے بعد اگر پُر وقار عشائیہ بھی ہو جائے تو سمجھیے کہ کہانی کا بھرپور کلائمکس سامنے آ گیا۔ بس یہی ہوا اس محفل کے بعد۔ مجھے افسوس رہا کہ بیگم سرفراز اقبال کھانے میں شریک نہ ہو سکیں۔ اور سب سے اجازت لے کر چلی گئیں۔ سرفراز اقبال ان دنوں فیض کی شخصیت پر ایک کتاب لکھ رہی تھیں۔ دوستوں کا یہ خیال تھا کہ اس کتاب کے چھپنے پر اچھی خاصی کانٹروورسی کا آغاز ہو جائے گا۔ کھانا ختم ہونے کو تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی پر تو روہیلہ ٹیلی فون سننے چلا گیا۔ پل بھر بعد لوٹ آیا اور کہا کہ میرا ٹیلی فون تھا۔ کس کا ٹیلی فون تھا یہ اس نے نہیں بتایا۔

ٹیلی فون کا رسیور اُٹھایا تو معلوم ہوا بیگم سرفراز اقبال بول رہی تھی۔ اس نے پہلے اچانک چلے جانے پر افسوس کا اظہار کیا اور پوچھا کہ کیا اگلی صبح اس سے ملاقات ہو سکتی تھی۔ میں نے معذوری کا اظہار کیا۔ کیوں کہ ہم لوگ تو صبح سویرے نکلنا چاہتے تھے۔ بہرحال اُس نے وعدہ کیا کہ کتاب چھپتے ہی اس کی ایک کاپی مجھے بھیجے گی۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کو خداحافظ کہا اور گفتگو ختم ہو گئی۔ اب تو گفتگو کا آغاز جب ہی ہوگا جب سرفراز اقبال مجھے اپنی کتاب بھیجے گی۔ لیکن اس کے بات کرنے کے انداز سے لگا کہ وہ ایک نہایت مہذّب خاتون تھی۔ لیکن بڑی جراَت مند بھی تھی۔ جبھی تو وہ فیض پر ایک نئے انداز سے کتاب لکھ رہی تھی۔

کھانے کے بعد ایک ایک کر کے مہمان رخصت ہو گئے۔ اور میرے دل میں اپنی خوبصورت قربتوں کا گہرا احساس چھوڑ گئے۔ میں نے پرتو روہیلہ کا جی بھر کر شکریہ ادا کیا، جس نے ایک ہی شام میں اتنے سارے دوستوں سے ملاقات کرادی تھی۔ بیگم روہیلہ کے تو ہم سب احسان مند تھے کہ اُس نے محفل کے آخری دَور کی صدارت کے فرائض نہایت خوش اسلوبی اور وقار سے سرانجام دیے تھے۔ کچھ دیر تک علی کے ساتھ بیٹھ کر ہم ٹیلی ویژن پر انتخابات کی خبریں سنتے رہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی اپنی پوزیشن مضبوط کرتی جا رہی تھی۔ ٹیلی ویژن کے اسٹوڈیو میں انتخابات پر تبصرہ کرنے والی ٹیم کے افراد میں طارق عزیز، مہتاب چنّا، خوش بخت اور مستنصر حسین تارڑ تھے۔ علی نے سب کا مختصراً تعارف کرایا۔ جو بڑا دلچسپ تھا۔ خاص طور پر مہتاب چنّا کے بارے میں جو ایک دلیر لڑکی تھی۔ مستنصر حسین تارڑ کا تعارف اس کی کتاب "پرندے" سے ہو چکا تھا، جو مجھے خالد اقبال یاسر نے دی تھی۔ یہ کتاب تارڑ کے دو ناولٹ ہیں جن کا آغاز ان سطور سے ہوتا ہے:

" ایک گدھ نے دوسرے سے
کہا۔ "نیچے دیکھ۔"
دوسرے گدھ نے پر پھیلائے
"نیچے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک
بندہ ہے، اُجاڑ بیابان ہے اور
ایک ٹنڈ منڈ درخت۔ بس کھانے
والی تو کوئی چیز نہیں۔"
"بندہ ہی تو کھانے والی چیز ہے
احمق۔" پہلے گدھ کے پروں کا سناٹا
لوہے کے ایک بٹے کی مانند آسمان
کے ایک چُپ چاپ شیشے پر گرا
اور اسے چکنا چور کر گیا۔"

سونے سے پہلے پرتو روہیلہ شب بخیر کہنے آیا تھا۔ ہم سب سے باری باری ہاتھ ملا کر وہ اوپر کی منزل پر اپنے بیڈ روم میں سونے چلا گیا۔

ہم سب تو سونے کی تیاری کر رہے تھے لیکن علی ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھا بڑے انہماک سے انتخابات کے نتیجے کاپی پر نوٹ کر رہا تھا۔ جانے کس سمے سوئے گا وہ۔

مجھے لگا پاکستان کی نئی نسل بڑی بیدار اور ہوش مند تھی۔ پاکستان اس نسل کے ہاتھ میں یقیناً محفوظ رہے گا اور یہ نسل اپنے پڑوسی ملک ہندوستان سے اپنے رشتوں کو ضرور مضبوط کرے گی۔

آدھی رات گزر چکی تھی۔

نئی صبح کا آغاز ہو گیا تھا۔

چنڈی گڑھ کی طرح اسلام آباد میں بھی ۱۵ نومبر کے بعد صبحیں اور شامیں خنک ہو جاتی ہیں۔ آج کی صبح بھی کافی خنک تھی۔

پرتو روہیلہ کا نوکر چائے لے کر آیا تھا۔ ابھی میں چائے پیالی میں ڈال ہی رہا تھا کہ پرتو روہیلہ بھی آ گیا۔

"کہیے، رات آرام سے گزری؟" اُس نے پوچھا۔

"پاکستان آنے کے بعد میری ایک بھی رات آرام سے نہیں گزری۔ پرتو صاحب۔"

"کیوں؟"

"یہ حضرت جن کا نام گوپال شرما ہے۔ تمام رات نیند کی چھت پر خرّاٹوں کے بڑے بڑے پتھر پھینکتے رہتے ہیں۔"

"میں سمجھ گیا۔"

گوپال بے چارا خاموشی سے چائے پیتا رہا اور پرتو روہیلہ اور میں ہنستے رہے۔

"اس بار تو آئیے گا نا ننھیال؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے تو سب کچھ اللہ پر چھوڑ رکھا ہے۔ جو اُسے منظور۔"

کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر وہ ملحقہ کمرے میں چلا گیا اور گوپال نے اور میں نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔

ہم نے ہلکا سا ناشتہ لے کر سامان گاڑی میں رکھوا دیا۔ پرتو روہیلہ اور بیگم روہیلہ سے اجازت لی۔ علی شاید رات دیر تک جاگتا رہا تھا، اس لیے سو رہا تھا اُس وقت۔ جب ہم پرتو روہیلہ کی کوٹھی سے نکلے تو آٹھ بج رہے تھے۔ اسلام آباد کی کھلی سڑکوں پر ابھی ٹریفک شروع نہیں ہوا تھا۔ بس اِکّا دُکّا کاریں ہی آ جا رہی تھیں۔

راولپنڈی کی طرف سے ہو کر جانے کا فیصلہ ہوا تھا۔ سلطان رشک نے کل رات تقاضا کیا تھا کہ ہم اُسے ضرور مل کر جائیں۔

سلطان رشک کے گھر پر دستک دی تو وہ ابھی جاگا ہی تھا۔ کچھ دیر اس کے ساتھ گزاری۔ چائے کی پیالی بھی پی اور "نیرنگِ خیال" کے کچھ شمارے بھی اس سے لیے۔ بس

یوں ہی "نیرنگِ خیال" کے ایک شمارے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ "نیرنگِ خیال" کی پیشانی پر حکیم محمد یوسف حسن کا نام رسالے کے بانی کی حیثیت سے موجود تھا۔ میری ادبی زندگی کے آغاز میں حکیم یوسف حسن نے بھی میری رہنمائی کی تھی۔ اس زمانے میں لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنے والوں میں حکیم یوسف حسن پیش پیش تھے۔ ملہوترہ اور سلطان رشک باتیں کرتے رہے۔ اور میں نیرنگِ خیال کے صفحے الٹتا پلٹتا رہا۔ سید نسیم نقی کے مضمون "گوجر خاں کے شعراء" پر نظر پڑی۔ مضمون نگار نے پوٹھوہار کے اس مرکزی شہر کے شعراء کا تذکرہ کیا تھا۔ پہلے شاعر کا نام تھا۔ اختر امام رضوی جس کے تعارف کے بعد مضمون نگار نے اس کے دو ایک شعر بھی درج کر رکھے تھے۔ پہلا شعر پڑھ کر طبیعت خوش ہو گئی:

بھوک لوٹی گئی ہے اب کے برس
دانت اُگ آئے ہیں زمینوں میں

ایک شعر یہ بھی درج تھا مقالے میں:

میں ہر اک حال میں تھا گردشِ دوراں کا امیں
جس نے دنیا نہیں دیکھی مرا چہرہ دیکھا

راولپنڈی سے نکلتے نکلتے ساڑھے نو ہو گئے تھے۔ طے یہ ہوا کہ جہلم میں تھوڑی دیر کے لیے رکیں گے۔ کیوں کہ امداد ہمدانی نے کہا تھا کہ وہ ریلوے روڈ پر واقع ایک ہوٹل میں ہمارا انتظار کرے گا اور اس کے ساتھ جہلم کے کچھ اور دوست بھی ہوں گے۔ امداد ہمدانی اتنا پر خلوص اور بے نیاز آدمی ہے کہ اس کی بات ٹالی نہیں جا سکتی تھی۔ دراصل یہ ہوٹل عطا محمد ٹمبر مرچنٹ کا تھا، جو ملہوترہ کا دوست ہوا کرتا تھا اور جسے اب اس کا لڑکا چلا رہا تھا۔

بس جہلم میں ہمارا پروگرام گڑبڑ ہو گیا اور ہم اپنے شیڈول کے مطابق سفر جاری نہ رکھ سکے۔

جب ہم لاہور پہنچے تو شام کے سات بج رہے تھے۔

میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ اور سارا بدن تھکاوٹ سے چور تھا۔

میاں ریاض بہت فکر مند تھے۔

"بہت دیر کر دی ہے۔ ملہوترہ صاحب!"

"میاں صاحب، جہلم میں بہت وقت لگ گیا۔ سارا پروگرام خراب ہو گیا ہے!"

میاں صاحب نے ایک نوکر کو پانی لانے کے لیے اور دوسرے کو چائے کا انتظام کرنے کو کہا۔

"آپ کو تو سرور بھٹی کے یہاں جانا ہے ذاکر صاحب!" ملہوترہ نے کہا۔

"اب کہیں نہیں جاؤں گا! گھر سے نکلنے کی ہمت نہیں!"

"لیکن آپ نے تو وعدہ کر رکھا ہے بھٹی سے!"

"وعدہ توڑنا پڑے گا!"

جب میں نے ملہوترہ کو جواب دیا تو مجھے لگا جیسے معاہدے کا وہ کاغذ جس پر آدھی رات کے وقت قتیل شفائی، حسن رضوی اور دلدار پرویز بھٹی کی موجودگی میں میرے دستخط ہوئے تھے۔ میرے سامنے پھڑپھڑا رہا تھا۔ جیسے مجھے اپنے وعدے کی یاد دلا رہا ہو اور اس بات کی تلقین کر رہا ہو کہ شریف لوگ اپنے وعدے نہیں توڑتے۔

ہم لوگ چائے پی رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میاں صاحب نے ٹیلی فون اٹینڈ کیا۔

"تمہارا ٹیلی فون ہے ذاکر صاحب!"

میں نے ریسیور اٹھایا۔ سرور بھٹی بول رہا تھا۔

"آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ گاڑی بھجواؤں یا آپ خود آ جائیں گے؟"

"سرور صاحب، میری حالت اس وقت بہت خراب ہے۔ میں آ نہیں سکوں گا۔ معافی چاہتا ہوں!"

"مہمان تو بس پہنچنے ہی والے ہیں۔ آپ کا آنا ضروری ہے!"

"مجھ پر یقین کیجیے کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں! سفر نے مار کر رکھ دیا ہے۔"

"آپ کا آنا بے حد ضروری ہے ذاکر صاحب!"

سرور بھٹی لگاتار اصرار کیے جا رہا تھا۔ اور میں معافی پہ معافی مانگے جا رہا تھا۔ میری طبیعت واقعی ٹھیک نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ سرور بھٹی تو ناراض ہو گا ہی۔ اس کے ساتھ قتیل، حسن رضوی اور دلدار بھٹی بھی ناراض ہو جائیں گے۔ ملہوترہ نے میری مدد کی اور سرور بھٹی کو یقین دلایا کہ میں اس وقت واقعی کہیں جانے کے قابل نہ تھا۔ آخر وہ مان گیا۔ لیکن مجھے اگلی صبح تک خطا کا احساس کچوکے دیتا رہا۔ دوست کتنے فراخ دل ہوتے ہیں۔ اس خیال سے مجھے بڑی تقویت ملی۔

چائے پی چکنے کے بعد میں بستر پر پڑ گیا اور پھر اس وقت اٹھا، جب سب لوگ کھانے کی میز پر بیٹھ چکے تھے۔ آرام کرنے سے طبیعت قدرے سنبھل گئی تھی۔ میں نے کھانے میں سب کا ساتھ دیا اور گفتگو میں بھی برابر کا حصہ لیا۔

کھانے کے بعد ملہوترہ تو سو گیا۔ لیکن علی اور رضا مجھے، نیلگی اور گوپال کو لبرٹی مارکیٹ پان کھلانے کے لیے لے گئے۔ واپس آ کر ہم سب لوگ ڈرائنگ روم میں جمع ہو گئے اور آدھی رات تک گپ شپ چلتی رہی۔ علی، رضا، صائمہ، اور ریزین سبھی شریک تھے۔ پھر میں نے اپنی کتابیں چاروں کو پیش کیں اور وہ لوگ خوشی سے کھل اٹھے۔ جب ہم سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں گئے تو دراصل اگلی صبح کا آغاز ہو چکا تھا۔

ایسی صبحیں جن کا طلوع رات بھر جاگتے رہنے اور دوستوں اور عزیزوں سے مسلسل گفتگو

کرتے رہنے کے بعد ہوتا ہے، بڑی مبارک اور برکت والی صبحیں ہوتی ہیں۔ ایسی صبحوں کے اُجالوں میں ہی نئے رشتوں کے پھول کھلتے ہیں اور نئی محبتیں شبنم میں نہاتی ہیں۔

آج پاکستان کے دورے کا ہمارا آخری دن تھا۔

کل ہم لاہور کو خدا حافظ کہہ کر ہندوستان روانہ ہو جائیں گے۔ اور ایک بار پھر اُن سڑکوں سے گزریں گے، جن سے پندرہ روز پہلے گزر کر لاہور کی سیماؤں میں داخل ہوئے تھے۔ ان درختوں کی سرگوشیوں کو دوبارہ سنوں گا، جن سرگوشیوں کو میں نے پندرہ روز پہلے سُنا تھا، جس محبت اور شفقت سے میرے وطن نے میرا استقبال کیا تھا دو ہفتے پہلے، اب وہ اسی پیار اور مہربانی سے مجھے خدا حافظ بھی کہے گا کل صبح۔ اور میری جھولی میں حسین یادوں کے وہ تمام پھول ڈال دے گا جو میرے دوست اور ساتھی اور مداح اور عزیز پاکستان میں مختلف موقعوں پر مجھے پیش کرتے رہے تھے اور جن کے رنگ اور جن کی خوشبوئیں میرے ذہن و دل میں اُس وقت بسی ہوئی تھیں یادوں کی یہی خوشبوئیں انسان کی میراث ہیں۔ اور جب وہ اپنی اس میراث کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تقسیم کر دیتا ہے تو انسان کی میراث اور وسیع ہو جاتی ہے اور اس طرح اس کے حصہ داروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

انسانی تاریخ کی بھی اتنی ہی کہانی ہے۔ محبت اور امن کے پھول چُننا اور انہیں ہر جگہ تقسیم کرتے رہنا۔

یہی کہانی دراصل ان سب تہذیبوں کی داستان ہے جو اب زیرِ زمین دفن ہیں، لیکن انسان کو جن کی عظمت پر ناز ہے۔

آؤ۔ ہم اس طویل داستان میں کچھ اور کڑیاں جوڑیں۔ کچھ اور کرداروں کا اضافہ کریں۔ کچھ اور پھول کھلائیں، کچھ اور خوشبوئیں تقسیم کریں کہ قلم کاروں کے ذمے۔ یہ ایک بہت بڑا فریضہ ہے۔

آج مجھے کچھ ایسے دوستوں سے ملنا تھا جن سے اب تک ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔

سعادت سعید کے گھر ٹیلی فون کیا۔ وہ اب الیکشن ڈیوٹی سے فارغ ہو چکا تھا اور تمام دن میرے ساتھ رہ سکتا تھا۔

میرے پاس صرف آج کا ہی دن تھا۔ اُن دوستوں سے ملنے کا جنہیں میں اب تک نہیں مل سکا تھا۔ شام کو مجھے منیر نیازی کے گھر وقت سے پہنچانے اور پھر واپس گلبرگ لانے کی ذمہ داری نیاز حسین لکھویرا کی تھی اور یہ ذمہ داری اُسے خود منیر نیازی نے ہی سونپ رکھی تھی۔ اس سلسلے میں صبح ٹیلی فون پر طے بھی ہو چکا تھا۔

"آپ کا کیا پروگرام رہے گا، ذاکر صاحب؟" ملہوترہ نے پوچھا۔

"تھوڑی دیر میں سعادت سعید آجائے گا۔ میں اس کے ساتھ کچھ اور دوستوں سے مل لوں گا۔"

"نیکی اور گوپال بازار جانا چاہتے ہیں۔"

"تو آپ میرے ساتھ رہیے۔ انہیں گھومنے پھرنے دیجیے۔" لگا کہ وہ دونوں ملہوترہ کے بغیر نہیں جانا چاہتے تھے۔ چنانچہ یہ فیصلہ ہوا کہ وہ تینوں آزادی سے گھومیں پھریں اور میں سعادت سعید کے ساتھ چلا جاؤں۔"

"تو کہاں ملنا ہوگا ہم سب کا؟" ملہوترہ نے پوچھا۔

"اب تو رات کو ہی ملنا ہو سکے گا۔ شام کو مجھے منیر نیازی کے گھر جانا ہے۔ دیر سے لوٹوں گا۔"

"تو آپ اپنی پیکنگ کب کریں گے۔ آپ کا سارا سامان تو بکھرا پڑا ہے۔"

"رات کو کروں گا۔ گوپال کی مدد لوں گا۔"

"میں خود ہی ساری پیکنگ کر دوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔" گوپال نے میرا حوصلہ مضبوط کر دیا۔

اس نے اتنے روز میرے ساتھ رہ کر یہ تو محسوس کر ہی لیا تھا کہ میری شخصیت میں کتنا بکھراؤ ہے۔ کہیں کوئی ترتیب نہیں۔ میرے مقابلے میں اس کی اور ملہوترہ کی شخصیت میں کتنا ڈسپلن تھا۔ میرے اس بکھراؤ والے مزاج نے میرے لیے اکثر اُلجھنیں پیدا کی ہیں لیکن بگڑے ہوئے مزاج کہاں سُدھرتے ہیں۔

سعادت سعید آگیا تھا۔

میاں ریاض بہت دیر پہلے آفس جا چکے تھے۔ علی اور رضا دونوں بھائی تیار ہو رہے تھے۔ وہ آفس جائیں گے تو میاں ریاض گھر آجائیں گے۔ وہ دوپہر تک گھر آجایا کرتے تھے۔

میں جب سعادت سعید کے ساتھ گھر سے باہر نکلنے لگا تو علی باہر آگیا۔

"آپ رات کا کھانا بھی ہمارے ساتھ نہیں کھائیں گے ذاکر صاحب؟"

"منیر نیازی کا مہمان ہوں آج۔"

"واپسی پر تو محفل جمے گی؟"

"ضرور جمے گی حضور!"

علی خوش ہو گیا اور اُس نے بڑے پیار سے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ سعادت سعید نے بھی اس سے ہاتھ ملایا۔ پھر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم کھلی سڑک پر آگئے۔

"کہاں چلیں پہلے؟" سعادت نے پوچھا۔

"بشریٰ رحمٰن کے ہاں چلو۔ اس کے ناول ہندوستان کے ایک خاص طبقے میں بہت مقبول ہیں۔ پہلے اُسی سے مل لیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم جس راستے سے نکلیں گے وہاں میرے ایک کولیگ کا گھر پڑتا ہے۔ اسے بھی "ہیلو" کرتے چلیں گے۔"

سعادت سعید نے جس شخص کے گھر کے سامنے گاڑی روکی اس کا نام اجمل نیازی ہے۔ اجمل نیازی کے گھر ہم زیادہ دیر نہیں رُکے۔ اس کا تعارف کراتے ہوئے سعادت نے کہا۔

"نیازی نے ایک سفرنامہ لکھا ہے "مندر میں محراب" کے عنوان سے۔"

"عنوان تو بہت خوب صورت ہے۔"

"اس کے چھپتے ہی تنازعہ شروع ہوگیا جواب تک چل رہا ہے۔" نیازی نے کہا۔

"میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو آدمی یا کتاب متنازعہ ہوجائے، لوگ اس کا نوٹس لینے لگتے ہیں۔ ہر روز کتنی کتابیں چھپتی ہیں۔ لوگوں کو ان کے عنوان تک معلوم نہیں ہوتے۔ ایسی کتابیں لکھنے کا یا زندگی گزارنے کا کیا فائدہ کہ کوئی توجہ ہی نہ دے۔"

"نیازی کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ کتاب چھپتے ہی مشہور ہوگیا۔ ہم لکھتے رہتے ہیں کوئی توجہ ہی نہیں دیتا۔" سعادت بولا۔

"توجہ حاصل کرنے کے دو ہی طریقے ہیں۔"

"فرمائیے۔" اجمل نیازی نے کہا۔

"یا تو کوئی بدنام سی کتاب لکھیں یا پھر نقادوں کے کسی گروہ کو ساتھ ملا لیجیے۔"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔" نیازی اور سعادت دونوں نے بھرپور قہقہہ لگایا۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ کے پاس وقت نہیں، اس لیے طویل گفتگو ممکن نہیں۔" نیازی نے بڑے خلوص سے کہا۔

"مجھے بھی افسوس ہے۔ اتنے تھوڑے دنوں میں تو لوگوں سے ٹھیک طرح سے ملاقات بھی نہیں کی جاسکتی۔ طویل گفتگو کہاں ممکن ہے۔ کاش اجمل نیازی کے ساتھ کچھ اور وقت گزار سکتا۔"

"اچھا ہوتا اگر ہم بشریٰ رحمٰن سے ٹیلی فون پر ملاقات کا وقت طے کر لیتے۔ جب ہم اس کے گھر پہنچے تو وہ کچھ ہی دیر پہلے کہیں جاچکی تھی۔ وہ کب لوٹے گی؟ اس کے ملازم کو معلوم نہیں تھا۔ بشریٰ رحمٰن نے اپنے خوب صورت گھر کا نام "وطن دوست" رکھا تھا۔ اچھا گھر۔ خوبصورت نام، مہذب اور پیارے مکین۔ یہ سب باتیں ایک ہی جگہ کہاں ملتی ہیں۔ مجھے بشریٰ رحمٰن سے نہ مل سکنے کا افسوس رہا۔ دراصل وہ دن ان لوگوں سے ملاقات کرنے کے لیے غلط تھا، جن کی گہری سیاسی وابستگیاں بھی ہوں۔ اس دن تو انتخابات کے نتائج مکمل ہونے والے تھے اور ایسے لوگ اپنے گھر میں چپ چاپ پڑے کیسے رہ سکتے تھے۔ بشریٰ رحمان تو سیاسی طور پر بھی برسرِ اقتدار حکومت سے جڑی ہوئی تھی۔ تقریباً ایک سال پہلے ایک ہندوستانی ادیب کا پاکستان کا سفرنامہ چھپا تھا۔ جس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ادیب نے کہا تھا کہ اس سفرنامہ میں پاکستان کا ذکر کم اور بشریٰ رحمٰن کا ذکر زیادہ تھا۔ بس میں یہی جاننا چاہتا تھا کہ ہندوستانی ادیب نے اپنے سفرنامے میں اس پاکستانی ادیبہ کا اتنا زیادہ ذکر کیوں کیا تھا۔

سعادت سعید نے بتایا کہ وہاں سے محمد طفیل کے بیٹے جاوید طفیل کا گھر نزدیک تھا۔ اس لیے اس سے ملا جاسکتا تھا۔ چنانچہ ہم لوگ جاوید طفیل کے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ جاوید طفیل بھی گھر پر نہیں تھا۔ اس کے لڑکے پرویز نے بتایا کہ جاوید طفیل تھوڑی ہی دیر پہلے کہیں گیا تھا۔ "نقوش" سے میری بڑی پرانی دوستی تھی۔ محمد طفیل نے مجھے "نقوش" میں بہت چھاپا تھا۔ بلکہ میرے بہت اچھے افسانے پہلی بار "نقوش" ہی میں چھپے تھے۔ ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے میں نے "محمد نقوش" کے عنوان سے محمد طفیل پر ایک مضمون بھی لکھا تھا۔

ایک مایوسی اور:
جاوید طفیل سے بھی ملاقات نہ ہوسکی۔

"چھوڑو یار، اب ہم کسی ادیب سے نہیں ملتے۔ چلو کسی ریستوراں میں بیٹھتے ہیں۔ وہیں سے تم مجھے لکھویرا کے یہاں چھوڑ دینا۔" میں نے سعادت سعید سے کہا۔

"لیکن ایک شخص سے تو میں نے ملاقات طے کر رکھی ہے۔" سعادت نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"کس سے؟"

"انیس ناگی سے۔ وہ تو آپ کا مداح بھی ہے۔"

"اس سے تو میں بھی ملنا چاہوں گا۔"

"اس کے ہاں چلتے ہیں۔ وہیں چائے پئیں گے۔"

"آل رائٹ۔"

[جاری ہے]

بقیہ: کمپیوٹر کے ذریعے کتابت

"ن" اور اسی طرح صوتیات کے لحاظ سے تمام حروف ہیں۔ اس طرح کمپیوٹر آپریشن کوئی بھی عام آدمی صرف دس بارہ دن کی مشق سے سیکھ سکتا ہے۔ البتہ رفتار بڑھانے کے لیے کچھ وقت ضرور لگتا ہے۔ اگر ہندوستان کی سافٹ ویئر بنانے والی تمام کمپنیاں کوئی ایک ہی "کی بورڈ" اختیار کریں تو اس سے کلیدی تختے میں یکسانیت آسکتی ہے۔ امکان یہ ہے کہ اگلے دو سال کے اندر ملک کے تقریباً تمام اہم روزنامے اور اہم رسائل اس طریقۂ کتابت کو یقیناً استعمال کریں گے۔

کمپیوٹر کی تنصیب کے لیے فی الوقت لگ بھگ کام کی نوعیت اور کمیت کے لحاظ سے ۴ تا ۱۰ لاکھ روپے کی سرمایہ کاری درکار ہے، جو مختلف بینکوں اور مالیاتی اداروں سے بطور قرض حاصل کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ تمام بینک کمپیوٹر کو ترجیحی بنیادوں پر قرضے جاری کرتے ہیں۔ اخبارات اور رسائل صرف "جاب ورک" کی آمدنی سے یہ قرضے ادا کرسکتے ہیں۔ بہرحال یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ہندوستان کی اردو صحافت بھی بالآخر کمپیوٹر کے دور میں داخل ہو رہی ہے۔ ●●

عزیز قیسی

رباعیات

خوابیدہ سمندر پہ جھکے تھے بادل
آئینے پہ آ آ کے رُکے تھے بادل
اِک موجِ صبا اُڑا گئی گیسو
رخسار و رنہ چوم چکے تھے بادل

آنکھوں پہ پڑا وقت۔ تو ٹل جائے گا
پھونکے سے یہ تِنکا تو نکل جائے گا
لیکن یہ ترا قرب یہ سانسیں تری گرم
لگتا ہے بدن میرا پگھل جائے گا

شکوے گلے آنسوؤں میں ڈھلتے دیکھے
تارے کئی پلکوں پہ پگھلتے دیکھے
الفاظ کو ــــ شعروں میں بدلتے دیکھا
پانی میں کئی چراغ جلتے دیکھے

انوار رضوی

قطعات

بزم تیرہ، چراغ کشتہ ہے
روشنی پردہ ہائے دود میں ہے
چھوٹ کر تُو جُدا نہیں مجھ سے
تیری ہستی مرے وجود میں ہے

فاصلے، دوریاں ہیں زنجیریں
ہے تخیل کو پھر بھی آزادی
میرے خوابوں میں روز آتی ہے
میرے ظلمت کدے کی شہزادی

مدتوں دونوں ساتھ ساتھ رہے
بھیڑ میں نکلے کھو گئے اک بار
اب ملے ہیں تو اجنبی بن کر
بھیڑ چہرے نگل گئی انوار

تشنگی تشنگی چہار طرف
لذتِ تشنگی سے خالی ہوں
تشنگی میں وجود ہو تحلیل
میں ابھی تک یونہی سوالی ہوں

مندمل ہو گئیں خراشیں سب
دل میں اِک گہرا گھاؤ اب بھی ہے
ایسا لگتا ہے تم نہیں بھولیں
تم کو مجھ سے لگاؤ اب بھی ہے

اک نئی بات ہو گئی کل رات
کھل گئی آنکھ سو رہا تھا میں
تب سے اب تک ہوں اس تعجب میں
نیند میں کیسے رو رہا تھا میں

گزرے لمحے کی یاں کیسے قیمت
ہست کا شور بود تنہا ہے
آج میرے لیے ہے بے معنی
مٹ گیا سب وجود تنہا ہے

ان کی تعبیر کب ملی مجھ کو
ہائے وہ خواب مدتوں جو پلے
تیرگی میں درخت تنہا ہے
شام کے ساتھ ساتھ سائے ڈھلے

لوگ کہتے ہیں خوب مہکے ہیں
مرے تخئیل سے کِھلے جو پھول
میرے ہر اک خیال میں رخشاں
میری جلتی ہوئی چِتا کی دھول

دیکھنے سے پتہ نہیں چلتا
کتنے ناسُور پلتے رہتے ہیں
ہوش کیا ہو خیالِ فردا کا
ناگ ماضی کے ڈستے رہتے ہیں

B-26 قمات چیمبرز، پانڈیالین، جوہو تارا، بمبئی ۴۰۰۰۴۹
C-28 - پاکٹ A-10، کالکاجی ایکسٹینشن، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹



غزلیں

شجاع خاور

اب قہر بھی میرے خدا کا دیکھیے
بس ہونے والا ہے دھماکہ دیکھیے

کرنا تھا ہم کو دوستوں پر تبصرہ
اور لکھ گئے اپنا ہی خاکہ دیکھیے

کیسا غضب ڈھایا مری تشبیہ نے
بس ان دنوں چلتا صبا کا دیکھیے

مضمون تو ہیں ہی ہمارے زوردار
اسلوب بھی ہے کس بلا کا دیکھیے

بے نام سی کر دی ہماری شخصیت
کیا وار ہے اس کی وفا کا دیکھیے

موسم بدل جاتے ہیں خود ہی خود شجاع
بس بیٹھے بیٹھے رخ ہوا کا دیکھیے

سب جو کرتے ہیں اب وہی کیجے
یعنی چپ چاپ زندگی کیجے

چارہ گر کچھ نہیں بتائے گا
درد کہتا ہے جو وہی کیجے

اب تو حالت یہاں تک آ پہنچی
اس کے بندوں کی بندگی کیجے

آئے دن خامشی نہیں اچھی!
یہ تماشا کبھی کبھی کیجے!

شخصیت کا مزار پکا ہے
زندگی بھر مجاوری کیجے

پھر مزا دے گی یہ بہار ابھی
پہلے تھوڑی سی آذری کیجے

مر کے بھی دیکھا جائے دو اک دن
کب تک ایسے ہی زندگی کیجے

سامعین اٹھ کے جا رہے ہیں شجاع
رائج الوقت شاعری کیجے

سب خواب پورے ہو گئے دل بھر گیا میاں
اس زندگی کے واسطے میں مر گیا میاں

نور اندرونِ ذات سے لینے گیا تو تھا
تاریکی اس قدر تھی کہ خود ڈر گیا میاں

ہوش و حواس دوستی کرتے پھریں تو کیا
میں دشمنوں کے بیچ میں پی کر گیا میاں

اگلی صفوں میں امن پسندی کا شور ہے
تنہا جہاد دیکھیے لشکر گیا میاں

اب یا تو محتسب کو بھی باغی کروں گا میں
یا پھر مرے بھی ہاتھ سے ساغر گیا میاں

باقی حساب چھوڑیے، ویسے تو ہر طرح
یہ سال پچھلے سال سے بہتر گیا میاں

تسکینِ آرزو ہے کہ ہے حشرِ آرزو
قطرے بچے ہوئے ہیں سمندر گیا میاں

سمجھوتہ کر لیا ہے شہنشاہِ وقت سے
اچھا ہے روز روز کا چکر گیا میاں

پھر ہو رہے ہیں چیں بہ جبیں دوست، دیکھنا
کیا پھر خیال شعر سے باہر گیا میاں؟

۴۔ آفیسرز فلیٹس
پولیس اسٹیشن، مندر مارگ،
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱



غزلیں

شین کاف نظام

پاؤں میں دُور کا سفر چمکے
رات بستی میں جب کھنڈر چمکے

گر دُعا ہے تو پھر اثر چمکے
شاخ پر ایک تو ثمر چمکے

ایک آسیب ہے ہر اک گھر میں
ایک ہی چہرہ در بہ در چمکے

ظلمتوں کی زمین پر دیکھیں
کب کہاں نور کا نگر چمکے

ان چمکتے ہوئے اندھیروں میں
ایک تو حرفِ معتبر چمکے

روشنی ہو تو روح تک لرزے
اور اندھیرے میں ایک ڈر چمکے

ساحلوں کی شفق آنکھوں میں
دھوپ کپڑے اُتار کر چمکے

میں اوراقِ حیرانی میں
اک سایہ گدلے پانی میں

مشکل آئی آسانی میں
ہیں سارے منظر پانی میں

ڈھونڈیں کیا ہونے کا مطلب
اب آیاتِ امکانی میں

صبح ازل سے میں بیٹھا ہوں
اِک بے نام پریشانی میں

کون بتائے کیا کیسا ہے
ہے سب کچھ بہتے پانی میں

پانی میں پانی ہوتا ہے
پیاس نہیں ہوتی پانی میں

میں اس کے دل میں رہتا تھا
اب تو ہوں بس پیشانی میں

جھیل کے جزیرے لکھ
ہیں سبھی اکیلے لکھ

قربتوں کے قصے لکھ
ریت ریت چہرے لکھ

پانیوں کے سینے پر
خواب کے خزینے لکھ

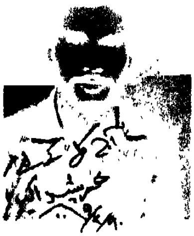
دُھوپ اور اُجالوں کو
آنکھ اور اندھیرے لکھ

شام کی صلیبوں پر
سوچتے سویرے لکھ

اپنی اُنگلیوں سے اب
نام دوسروں کے لکھ

ایک اور خط ان کو
عید کے بہانے لکھ

ککوں کی گلی، جودھپور، راجستھان



غزلیں



شارق کیفی

ذرا بھی بدلی نہیں جو بھی اس کی عادت تھی
مِلا، تو آج بھی لہجے میں اجنبیت تھی

وہ بات، سوچ کے میں جس کو مدتوں جیتا
بچھڑتے وقت بتانے کی کیا ضرورت تھی

کہیں یہ چوک رہے ہیں یہ آئینے شاید؟
نہیں تو عکس میں اب تک تری شباہت تھی!

پتہ نہیں، یہ تمنائے قرب کب جاگی؟
مجھے تو صرف اسے سوچنے کی عادت تھی!

خموشیوں نے پریشاں کیا تو ہوگا مگر!
پکارنے کی یہی صرف ایک صورت تھی

یہ اس کی شکل سے کیوں میرے خدوخال ابھرے
اسے بھی فکر بہت تھی، مجھے بھی حیرت تھی

نہیں یہ سب مری دل لگی ہے
کوئی تصویر بھی کیا بولتی ہے

اسے اب قہقہوں میں دفن کر دو
یہ خاموشی بہت کچھ جانتی ہے!

اسی سے زخم کا اندازہ کر لو!
یہ حالت تو زمانے بعد کی ہے!

جھجکتا ہوں اسے الزام دیتے
کوئی امید اب بھی ٹوکتی ہے!

کبھی ماضی کا آئینہ بھی دیکھو
اندھیروں کی بھی اپنی روشنی ہے!

خدا کو رات دن خوش کرنے والو
خلا کے اس طرف بھی زندگی ہے

مکان نمبر ۱۳۲، محلہ گڑھی، بریلی ۲۴۳۰۰۱

خورشید اکبر

ہم اپنے سر کے نیچے آس کا تکیہ نہیں رکھتے
ان آنکھوں کے کٹوروں میں کبھی شکوہ نہیں رکھتے

غریبی جھانکتی ہے تہہ بہ تہہ پیوند سے باہر
مگر ہم جیب پر احسان کا بخیہ نہیں رکھتے

جھلس جاتے ہیں پکنے سے ہی پہلے خواب کے غلّے
ہم اپنے تھال میں تعبیر کا لقمہ نہیں رکھتے

ہماری یہ عبادت حاکمِ اعلیٰ کو ڈستی ہے
کہ ہم خود سر جبیں سے باندھ کر سجدہ نہیں رکھتے

ثبوتِ بے گناہی میں خدا کو پیش کرتے ہیں
فرشتوں سے کہو ہم سامنے قبلہ نہیں رکھتے

دریچے سے دریچے کا بھی رشتہ کاروباری ہے
ہمارے شہر والے گھر میں دروازہ نہیں رکھتے

ضرورت کے اپاہج پاؤں میں قلت کی بیڑی ہے
رکی ہے سانس اور ہم نوٹ کا پہیہ نہیں رکھتے

پی۔ایچ۔ای۔ڈی ٹیکنیکل سیکریٹریٹ، پٹنہ ۱۵

غزلیں



پرکاش تیواری

روشنی کا مہکتا پھول لگے
دشتِ تیرہ میں وہ رسول لگے

زندگی کا سفر فضول لگے
اپنی پرچھائیں بھی ببول لگے

درد ہی زیست کا اصول لگے
ہر کوئی وقت سے ملول لگے

منظرِ باغ تھا اُداس بہت
پیڑ، پنچھی سبھی ملول لگے

جان آجائے اس کی خوشبو سے
وہ تو پورا کا کوئی پھول لگے

شور کیسا ہے دل کے آنگن میں
اجنبی درد کا نزول لگے

خار کی طرح وہ چبھا پرکاش
دیکھنے میں جو شخص پھول لگے

۲۱۵۹۔ لودھی روڈ کمپلیکس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۳

فیروز اختر

شام سے ہے پیکارِ شب
کہاں گئے بیزارِ شب

موسم کی سفّاکی سے
پھیل گیا آزارِ شب

ہم خود ہی مصلوب ہوئے
ڈھونا پڑا تھا دارِ شب

شب کے تارے گنتے ہیں
ہیں جتنے بیکارِ شب

درد کا قصّہ لکھتے ہیں
ہم جیسے بیدارِ شب

سورج سُرخ ہوا فیروز
یہ بھی ہے آثارِ شب

۱/۱۱۔ مدار تلہ لین، پیلخانہ، ہوڑہ ۱

ارون سنگھ مخمورؔ

کوئی جی سے گزر گیا ہوگا
وقت دیوانہ کر گیا ہوگا

گھر سے نکلا جو ڈھونڈنے مجھکو
کب پلٹ کر وہ گھر گیا ہوگا

تھک کے دل جستجوئے منزل میں
نقشِ پا سا ٹھہر گیا ہوگا

جو ڈراتا رہا زمانے کو
ایک دن خود سے ڈر گیا ہوگا

کونپلیں پیار کی نکل آئیں
رنگ دل کا نکھر گیا ہوگا

آج پھر وہ اُداس آیا ہے
آج پھر اپنے گھر گیا ہوگا

کھویا کھویا ہے آج کل مخمورؔ
کوئی دل میں اُتر گیا ہوگا

دینا بنک سیکنڈ فلور، سیکنڈ پستہ لین، کولابہ بمبئی ۵

شفیع مشہدی

بھُٹّوں کی فصل



رحمت علی ماموں ایک مجرم کی طرح سر جھکائے پلنگ پر بیٹھے تھے اور سامنے تخت پر بیٹھی بیگم صاحبہ غصّے میں لال پیلی ہو رہی تھیں۔ پورے تین مہینے پہلے رحمت علی ماموں کالی گائے لے کر میلے میں بھیجے گئے تھے کہ اسے بیچ کے دوسری اچھی گائے خرید لائیں۔ ضرورت کے لیے پچاس روپے بھی دیے گئے تھے، مگر گائے ماموں اور وہ پچاس روپے تین مہینوں تک لاپتہ۔ اور اب سر جھکائے رحمت علی ماموں خالی ہاتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ بیگم صاحبہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ اس گائے کا حشر بھی اسی گھوڑے کی طرح ہوا ہے جو دو سال پہلے رحمت علی ماموں کو بیچنے کو دیا گیا تھا۔ ماموں کی یہ پُرانی عادت تھی۔ پچھلی بار وہ چھ مہینے غائب رہے تھے۔ اس بار تو وہ خیر سے تین ماہ بعد ہی واپس آگئے تھے۔ مگر خالی ہاتھ۔

"میں پوچھتی ہوں گائے کیا ہوئی ماموں؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟" بڑی بیگم کی آواز تیز تھی اور خفگی سے بھری ہوئی تھی۔

"اب کیا بتائیں بیٹا۔ ہماری قسمت ہی خراب ہے۔" ماموں نے دبی زبان سے کہا۔

"قسمت تو ہماری خراب تھی جو تمہیں گائے بیچنے کو دی۔ کہہ دو کہ گھوڑے کی طرح گائے بھی بھاگ گئی۔ یہی کہو گے نا۔" بیگم صاحبہ پھر غرّائیں۔

"نہیں۔ ہم جھوٹ بول کر عاقبت کیوں خراب کریں بیٹیا۔"

"جھوٹ بول کر۔ ارے تو کبھی سچ بھی بولا ہے۔ اچھا بتاؤ گائے بیچ دی تو اس کے روپے کہاں ہیں؟"

"گائے ہم نے سلیم پور کے ہنر سے بیچی تھی۔ روپے بعد میں دینے کو کہا تھا۔"

"تو دئے کیوں نہیں؟" بیگم نے پوچھا۔

"اب کہتا ہے کہ تین دن کے بعد گائے مرگئی تو روپے نہیں دیں گے۔" ماموں نے دبے لہجے میں کہا۔

"پھر جھوٹ۔ اور وہ بھی سفید۔" بیگم صاحبہ برس پڑیں۔

"ارے اللہ قسم!" ماموں قسم کھانے والے ہی تھے کہ بیگم صاحبہ نے روک دیا۔ "خبردار جو جھوٹی قسم کھائی۔ تمہیں شرم نہیں آتی ماموں۔ اپنوں کو بے وقوف بنائے ہوئے۔"

"قسم ہے مخدوم صاحب کی ..." ماموں نے پھر دوسری قسم کھانی چاہی اور بیگم نے پھر ٹوکا۔

"ہائیں ہائیں۔ ارے تم مخدوم کی اولاد میں سے ہو پھر بھی مخدوم صاحب کی قسم کھانے سے نہیں ڈرتے ... کچھ تو ڈرو عذابِ الٰہی سے۔" بیگم صاحبہ نے زچ ہو کر کہا۔

"ارے اب اس سے بڑا عذاب اور کیا ہوگا کہ اولاد سے گالیاں سُن رہے ہیں۔ تمہیں گود کھلایا ہے اور آج ہم سے ہی ..." ماموں ڈرامائی انداز میں روتی آواز بنا کر بولے۔ "عزت بڑی بُری چیز ہے۔ ہم تمہارے روپے دے دیں گے۔" ماموں نے آزمودہ نسخہ پھر آزمایا مگر وار خالی گیا۔

"کہاں سے دوگے روپے؟ بال بچوں کو دو وقت کھانا تو کھلا نہیں سکتے۔ چلے ہیں روپے واپس کرنے۔" بیگم نے ملامت کے انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم زمین بیچ دیں گے۔" ماموں نے پھر تیر چلایا۔

"زمین بیچ دیں گے۔ کس کی زمین۔ پھر ہماری ہی کوئی زمین بیچ دوگے۔ تمہارے پاس کہاں سے آئی زمین۔ گاؤں کی حویلی تمہیں اماں نے دی تھی۔ سو تم نے بیچ ڈالی۔ باپ دادا کا

سی۔۲۱۰۔ نیو آفیسرز ہوسٹل، بیلی روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۱

نام رُسوا کیا۔ حویلی کے آنگن میں جیسے بھٹے اُگا رہا ہے۔" بیگم صاحبہ کی آواز میں درد بھی تھا اور طنز بھی۔

"پیٹ میں کانٹے اُگیں گے تو حویلی کے آنگن میں بھٹّے تو اُگتا ہی ہے بیٹیا۔" ماموں نے فلسفیانہ انداز میں کہا

دوسرے تخت پر بیٹھے حقّہ پیتے بڑے صاحب ہنس پڑے۔ وہ کافی دیر سے ماموں بھانجی کی لڑائی دیکھ رہے تھے اور چاندی کی مہنال منھ میں لگائے زیرِ لب مسکرا رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ایسے واقعات تو تقریباً ہر سال ہی ہوتے ہیں۔ مگر نہ ماموں اپنی خصلت چھوڑیں گے اور نہ بیگم صاحبہ اپنے ماموں کو چھوڑیں گی — وہ ہنستے ہوئے کہنے لگے۔

"بھئی بیگم، اب ختم بھی کرو اس قصّے کو۔ ماموں نے کس قدر خوب صورت جملہ کہا ہے کہ جب پیٹ میں کانٹے اُگیں گے تو حویلی کے آنگن میں بھٹّے ہی اُگے گا۔ واہ، واہ، واہ۔ جی خوش ہو گیا۔"

بیگم صاحبہ تنک کر بولیں: "آپ تو چپ ہی رہیے۔ آپ کی وجہ سے ہی ماموں کی عادت بگڑی ہے۔"

"لو بھئی، یہ خوب رہی۔ ماموں تمہارے اور الزام مجھ پر۔" بڑے صاحب ہنستے ہوئے بولے "تین ماہ کے بعد ماموں آئے ہیں۔ کچھ چائے وائے منگواؤ۔ یہ کیا گائے کا قصّہ لے کر بیٹھ گئیں — دوسری گائے آجائے گی۔ میں نے سجاتی کو کہہ دیا ہے۔ دو چار دنوں میں لے آئے گا۔"

"گائے تو آجائے گی۔ مگر یہ ماموں ہمیں بار بار دھوکا کیوں دیتے ہیں۔ ضرورت ہو تو روپے مانگ لیں۔ اور ہم دیتے بھی رہتے ہیں۔ مگر یہ بات ہمیں بالکل پسند نہیں۔ آج گائے بیچ دی۔ کل گھوڑا بیچ دیا . . . . . کبھی زمین بیچ دی۔ کبھی ہارمونیم بیچ دیا۔ اسی لیے تو ان کو برکت نہیں ملتی۔"

ماموں کو بڑے صاحب کی حمایت ملی تو ان کا انداز بدل گیا اور وہ روتی آواز میں کہنے لگے۔ "ہائے ہائے باجی، تم کہاں چلی گئیں۔ تم ہوتیں تو ہمیں یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ یوں ذلیل ہونا نہ پڑتا۔" وہ باضابطہ رونے لگے یہ گویا نسخۂ کیمیا تھا۔

ماموں کی مرحومہ باجی یعنی بیگم کی اماں کا ذکر آیا تو ماحول ہی بدل گیا۔ بیگم بھی آبدیدہ ہو گئیں۔ اور ماموں کو سمجھانے لگیں۔ "ارے بس بھی کرو۔ کیوں روتے ہو۔ کیوں ان کی روح کو تکلیف دیتے ہو۔ جاؤ۔ ہاتھ منھ دھو لو۔ شبراتن ناشتہ لا رہی ہے۔ کچھ کھا لو۔ پھر چائے منگواتی ہوں۔"

بیگم کی آواز میں بے پناہ ہمدردی تھی غصّہ کافور ہو چکا تھا۔ "تم کتنے دُبلے ہو گئے ہو ماموں۔ ممانی تمہارا کچھ بھی خیال نہیں رکھتی ہیں۔ اس طرح کب تک جیو گے۔ اپنا خیال رکھو۔"

"ہاں بیٹیا، اب موت ہی آئے تو زندگی سے چھٹکارا ملے۔" ماموں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"اللہ نہ کرے۔ ایسی بُری باتیں زبان سے مت نکالو۔ جاؤ ہاتھ منھ دھو لو۔ ناشتہ آگیا ہے۔"

ماموں نے جی بھر کر ناشتہ کیا۔ چائے پی۔ بڑے صاحب کا حقّہ پیا اور ایسا لگا جیسے چند منٹ پہلے جو باتیں ہوئی تھیں وہ حقّے کی دھوئیں کی طرح ہوا میں تحلیل ہو گئیں۔

رحمت علی ماموں، بیگم صاحبہ کی ماں کے سوتیلے بھائی تھے۔ پرانے زمیں داروں کا یہ پسندیدہ شوق تھا کہ گھر میں بیگم کے ہوتے ہوئے ایک دو عورتوں سے نکاح پڑھوا کر گھر میں رکھ لیتے تھے، لیکن انہیں بیوی کا درجہ کبھی نہیں ملتا تھا اور نہ ان کی اولاد کو برابری کا حق تھا۔ یہ نسل بھی ساتھ ساتھ چلتی رہتی تھی۔ شہنشاہ نانا بڑے مزے میں اس کی تشریح کرتے ہوئے کہتے تھے۔ "بھئی زمیں داروں کے یہاں ہر طرح کی فصل آتی ہے۔ چاول، گیہوں، جوار، باجرہ، مکئی۔ اب مکئی یعنی کھیتوں کو گیہوں چاول کا درجہ تو نہیں دیا جا سکتا۔" رحمت علی ماموں بھی اسی فصل کے پیداوار تھے۔ لیکن تھے بلا کے ذہین اور ہُنرمند۔ ہر فن مولا بھی تھے۔ مخدوم صاحب کی درگاہ پہ فاتحہ پڑھتے اور بقرعید میں بکرا ذبح کرنے سے لے کر شادی میں کھانا پکانے اور کسی کی موت ہو جائے تو غسّال کا کام کرنے تک کو تیار رہتے۔ کوئی کام ان کی دسترس سے باہر نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خوشی ہو یا غم، شادی ہو یا چہارم، میلہ ہو یا عرس، ماموں ہر جگہ موجود رہتے۔ ان کے بغیر کسی کا کام نہیں چل سکتا تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ کس سے ان کا کیا رشتہ تھا۔ مگر بوڑھے جوان، بچے سب ہی انہیں ماموں کہتے تھے اور وہ سب سے یکساں شفقت سے پیش آتے تھے۔ مگر بیگم صاحبہ تو ان کی بہن کی بیٹی تھیں۔ اس لیے ان کے گھر کو وہ اپنا ہی گھر سمجھتے تھے۔ رشتے میں تو وہ ہم لوگوں کے نانا ہوتے تھے۔ مگر ہم بچے بھی انہیں ماموں ہی کہتے تھے۔ گاؤں میں عرس کے موقع پر وہ درگاہ کے سامنے بسکٹ اور چائے کی دوکان لگاتے تھے۔

اور وہ دو چار دن ہماری زندگی کے خوبصورت ترین دن ہوتے تھے۔ ہمیں اپنی دوکان پر بیٹھے کباب بسکٹ کھاتے دیکھ کر ان کی نظروں میں عجیب سی فاتحانہ چمک پیدا ہوتی تھی۔ اور وہ بڑی محبت سے اصرار کر کے کھلاتے جاتے تھے اور ہر آنے والے سے کہتے جاتے "لڑکن سب شہر سے آئے ہیں۔ ہمارے ناتی ہیں۔" ایسا کہتے ہوئے انہیں بڑے فخر کا احساس ہوتا تھا۔ وہ گاہکوں سے کہتے "جانتے نہیں ہو تم ہمارے داماد کو۔

ارے، وہی نواب منزل والے بڑے صاحب۔ انہیں بڑے صاحب کے بیٹے ہیں۔ ہماری بھانجی کے بیٹے ہیں یہ لوگ۔" پھر وہ ہم لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کہتے۔ "اور کباب کھائیے بیٹا۔ اور کھائیے شہر میں یہ نہیں ملے گا۔ ہم لوگ ماموں سے بے پناہ محبت کرتے تھے، اس لیے اس دن گائے کے معاملے کو لے کر اماں بی جب ماموں کو ڈانٹ رہی تھیں تو ہمیں اچھا نہیں لگا تھا۔ آخر کیوں دی تھی گائے بیچنے کو۔ اس سے پہلے بھی تو وہ گھوڑا تانگہ اور نہ جانے کتنی زمینیں بیچ چکے تھے اور نہ جانے کتنی فصلیں کھا چکے تھے، مگر اس بار اماں کے غصے کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ اب ماموں ان کو مزید بیوقوف نہیں بنا سکیں گے اور وہ قسم بھی کھا چکی تھیں کہ اب ماموں کو کبھی کوئی چیز نہیں دی جائے گی۔"

کچھ ہی دنوں بعد ہم فٹ بال میچ دیکھ کر گھر لوٹے تو بیگم صاحبہ پردے کے پاس کھڑی تھیں اور باہر کے کمرے سے بابو رامیشور لال گماشتہ بول رہے تھے۔

"حضور، غضب ہو گیا۔ پچھلے مہینے آپ ہی کے حکم سے ہم نے گاؤں کے گودام میں دو سو من دھان رکھوایا تھا کہ بھاؤ بڑھنے پر بیچا جائے گا۔"

"ہاں وہ تو ہم نے ہی رکھنے کو کہا تھا۔ تو کیا ہوا۔" اماں کی آواز میں حیرت تھی۔

"حضور، وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ رحمت علی نے سو من دھان بیچ دیا اور روپیہ کھا گئے۔"

بیگم صاحبہ نے پیچھے مڑ کر قہر آلود نگاہوں سے ماموں کو دیکھا جو دور آنگن میں سر جھکائے کھڑے تھے۔

"حضور، بیگم صاحبہ! ہم نے کتنی بار کہا ہے کہ ایسے بے ایمان آدمی پر بھروسہ نہ کریں۔" گماشتہ جی کی آواز میں زور تھا۔

"گماشتہ جی، زبان سنبھال کر بات کیجیے۔ رحمت علی ہمارے ماموں ہیں۔" بیگم صاحبہ کی آواز کافی تیز تھی۔

"نہیں حضور، میرا مطلب یہ نہیں تھا... ہمارا مطلب..." گماشتہ جی کی آواز لڑکھڑا گئی۔

"ٹھیک ہے۔ آپ جائیے۔ سو من دھان کی قیمت ہمارے حساب میں لکھ دیجیے گا۔"

بیگم صاحبہ نے سرد لہجے میں کہا اور آنگن کی طرف بڑھ گئیں۔ جہاں ماموں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ آج ماموں کی خیر نظر نہیں آتی تھی۔ گائے بیچے جانے کے بعد ماموں کی جو درگت ہوئی تھی اس سے یہی اندازہ تھا، بلکہ یقین تھا کہ بیگم صاحبہ اب ماموں کو گھر میں رہنے نہیں دیں گی۔

نحیف ولاغر ماموں آنگن میں ایک سوکھے کانٹے کی طرح بیٹھے تھے اور بیگم صاحبہ پیچھے کھڑی انہیں غور سے دیکھ رہی تھیں۔ ماموں، شبراتن اور بچے دم سادھے بیگم صاحبہ کی بوچھار کے منتظر تھے۔

"منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھا لو ماموں۔" بیگم کی آواز میں بے پناہ شفقت تھی۔ پھر وہ قریب جا کر آہستہ سے بولیں۔ "ہم نے تو وہاں دو سو من دھان رکھوائے تھے۔ تم نے صرف..." ... بیگم صاحبہ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ان کے لبوں پر ایک پُراسرار سی مسکراہٹ پھیل گئی اور ایسا لگا جیسے آنگن میں شگوفوں کی فصل لہلہانے لگی ہو۔

یش سروج



یہ نہیں

جب گھر میں بنٹی آیا تھا تو نینا کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ خوشی تو اس کے پاپا ممی کو بھی بہت ہوئی تھی، لیکن اس کی خوشی کا تو جیسے کوئی اور چھور ہی نہیں تھا۔ اسے بنٹی نام نینا نے ہی دیا تھا۔ نام کرن تو بعد میں اس کے پہلے برتھ ڈے پر ہوا تھا۔ اس کے برتھ ڈے سے ٹھیک ڈھائی مہینے پہلے نینا کا چوتھا برتھ ڈے منایا گیا تھا۔ بیج بنٹی کے پہلے برتھ ڈے پر ہی پڑا تھا۔ کونپل بہت بعد میں پھوٹی تھی۔ جب بیج پڑا تھا تب نینا کو یہ معلوم ہی نہیں ہوا تھا کہ اس کے دل کی نرم ملائم گیلی مٹی میں کوئی بیج انجانے میں پڑ گیا تھا۔ اس کا احساس اُسے بعد میں کونپل پھوٹنے پر ہی ہوا تھا۔ اور کونپل بھی کیسی پھوٹی تھی، صرف انکور ہی نہیں، ایک پوری کی پوری بیل ہی پھوٹ پڑی تھی۔ زہر کی بیل — زہر کی یہ بیل اس کے اندر ہی اندر بڑھتی پھیلتی رہی تھی اور پھر اچانک ہی سانپ کے پھن کی طرح مٹی کی پرتوں کے نیچے سے اُگ آئی تھی۔

بنٹی کا پہلا برتھ ڈے بڑی دھوم دھام سے منایا گیا تھا۔ ان کے ایم آئی جی فلیٹ کا ڈرائنگ روم اونچے نیچے لہجے کی مردانہ زنانہ آوازوں، نوعمر لڑکے لڑکیوں کی ظاہر لیکن رازدارانہ سرگوشیوں، بچوں کی کلکاریوں اور شرارتوں، مسکراہٹ ہنسی اور قہقہوں، موسیقی کے اونچے نیچے سُروں اور رنگ برنگی پوشاکوں سے پورا کا پورا ابھر گیا تھا۔ نینا سنڈریلا بنی ہوئی تھی۔ اس کی ممی مسز ماتھر نئی نویلی دلہن جیسی سجی سنوری مہمانوں کا سواگت کرتی، ان کی مہمان داری میں لگی تھی۔ کسی ساڑی ایمپوریم کے شوکیس میں سجی کھڑی مورت کی طرح لگ رہی تھی۔ مسز ماتھر جیتی جاگتی چلتی پھرتی مورت جیسی۔ اس کے پاپا مسٹر ماتھر فلمی ہیرو لگ رہے تھے۔ ایک دم اسمارٹ۔ شوٹنگ شرٹنگ کے ماڈل جیسے۔

کتنا بڑا کیک لایا گیا تھا۔ پورے سینٹر ٹیبل میں چاروں طرف بس مشکل سے ایک ایک انچ جگہ ہی چھوٹی تھی۔ باقی پوری کی پوری جگہ کیک پسرا پڑا تھا۔ سمندری جہاز کے ڈیزائن کا کیک تھا۔ ذرا فاصلے سے دیکھنے پر سچ مچ کا جہاز لگتا تھا۔ یہی جہاز تو تھا جس نے نینا کے من کی شانت جھیل میں پہلے پہل لہروں کے دائرے بنائے تھے۔ لیکن نینا نے تب کنکر کی آواز کب سُنی تھی۔ اس نے جھیل کی سطح پر دائروں کا بننا کب دیکھا تھا۔ یہ تو سب بعد کی بہت بعد کی باتیں ہیں۔ اس دن تو اس نے کیک دیکھ کر اتنا ہی کہا تھا: "ممی اتنا بڑا کیک!" اور پھر تالیاں بجاتی اُچھلتی کودتی باہر چلی گئی تھی۔ اپنی سہیلیوں کو بلانے اور انہیں کیک دکھانے کے لئے۔

اس کی سہیلی رینا نے کیک دیکھ کر کہا تھا۔ "نِنّی، تیرے برتھ ڈے پر تو، تیرے پاپا انجن لائے تھے۔ اِتّا سا۔ اور پھر اس نے انجن کی لمبائی اور اونچائی دکھانے کے لیے اپنی ننھی ہتھیلیوں کو دائیں بائیں اوپر نیچے ہوا میں نچایا تھا اور انجن کو اس کے اصلی سائز سے بہت چھوٹا کر دیا تھا۔ اس پر نینا نے اپنا احتجاج ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا۔ "رِنی اتّا سا کیوں اتنا بڑا تو تھا اور پھر اس نے انجن کا جو سائز بتایا تھا اس سے بنٹی کا جہاز بونا ہوتے ہوتے بس بال بال ہی بچا تھا اور یہی اتّا سا اس کے من میں کانٹے کی طرح گڑ گیا تھا۔ لیکن تب اس نے کانٹے کا چُبھنا کہاں محسوس کیا تھا۔ اس کی چُبھن تو بہت بعد میں جاگی تھی۔

انکھوا پھوٹا تھا تب چبھن جاگی تھی تب جب بنٹی کے لیے واکر آیا تھا۔ نہیں شاید انکھوا تب نہیں پھوٹا تھا، چبھن تب نہیں جاگی تھی تب

سندھو ولا، ۵۴۴۔ گرو انگد نگر (ویسٹ) دہلی ۱۱۰۰۹۲

شاید بیچ پڑنے کا، پھانس گڑنے کا احساس ہوا تھا۔ پاپا جب بنٹی کے لیے واکر لائے تھے تو وہ پہلے تو خوش ہوئی تھی اور پھر اچانک ہی اُسے یاد آیا تھا بلکہ اس نے یاد کیا تھا کہ اس کے لیے تو واکر نہیں لایا گیا تھا۔ ہاں اس کے لیے ایک بے رنگ لکڑی کا تنپہیا ریڑھا لایا گیا تھا جو اب اسٹور میں پڑا تھا، دوسرے بے کار سامان کے ساتھ۔ لنگڑی حالت میں۔ اس کا آگے کا پہیہ نہیں رہ گیا تھا۔ چولیں بھی ڈھیلی ہو چکی تھیں۔ میرے لیے واکر کیوں نہیں لائے تھے پاپا ممی۔ اس نے سوچا تھا اور پھر پاپا ممی کی ہنسی کی پھوار میں اس کی سوچ کی مٹی بھیگ کر گھل گئی تھی۔ بنٹی واکر میں بیٹھا، اپنے ننھے پیروں سے فرش چھوتا، دھیرے دھیرے پھسلتا چل رہا تھا۔ اور ممی پاپا اُسے پہلے ڈگ بھرتے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے اور پھر نینا بھی سب کچھ بھول کر بنٹی کے کھیل میں کھو گئی تھی۔ ذہنی طور پر خود بنٹی کی جگہ واکر میں بیٹھی فرش پر پھسلنے لگی تھی، لیکن ریشم کا دھاگا اُلجھ گیا تھا۔

اور پھر چھوٹی چھوٹی باتیں بھی نینا کو بہت بڑی بڑی لگنے لگیں۔ دیکھنے سننے میں غیر اہم باتیں بھی نینا کو بڑی اہم لگنے لگی تھیں کیوں کہ دھاگا اُلجھ چکا تھا یا شاید اُلجھا تھا اُس دن۔ جب بنٹی کے لیے گھر میں سائیکل آئی تھی۔ اُس نے کتنا کہا تھا ممی پاپا سے اُسے سائیکل لے دینے کو۔ لیکن اس کے لیے سائیکل نہیں آئی تھی اور بنٹی کے ایک بار کہہ دینے پر ہی اُسے سائیکل لے دی گئی تھی۔ جب پاپا اور بنٹی بازار سے سائیکل کے ساتھ لوٹے تھے تب نینا ریشم کے دھاگے سے اپنی گڑیا کے لیے کوئی چیز بنا رہی تھی۔ سائیکل کی گھنٹی کی آواز سے وہ چونکی تھی۔ بنٹی نے اپنی دیدی کو حیرت میں ڈالنے کے لیے سائیکل اس کے ایک دم قریب لا کر سائیکل کی گھنٹی بجائی تھی۔ اور نینا نے جب گھنٹی کی آواز پر مُڑ کر دیکھا تھا تو نہ جانے کیسے اس کے ہاتھ میں پکڑا ریشم کا دھاگا اُلجھ گیا تھا اور پھر اس کے لاکھ سلجھانے پر بھی نہیں سلجھا تھا۔ آخر کار اُسے دھاگا توڑنا ہی پڑا تھا۔ اور گانٹھ لگانی پڑی تھی۔

نینا کے من کا دھاگا ایک بار جو اُلجھا تو پھر اُلجھتا ہی چلا گیا۔ من میں کسی غیر مرئی ہاتھ نے دھاگا توڑ کر گانٹھ اُس دن لگائی تھی جس دن کیڈبری چاکلیٹ کو لے کر نینا کے من کے دودھ کٹورے میں کسی نے تھوڑی سی کھٹائی ڈال دی تھی اور دودھ پھٹ گیا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ صبح ممی نے نینا اور بنٹی دونوں کو ایک ایک چاکلیٹ دیا تھا۔ بنٹی نے اپنا چاکلیٹ اسکول میں ہی کھا لیا تھا۔ لیکن نینا کا چاکلیٹ اس کے اسکول بیگ میں ہی پڑا رہ گیا تھا۔ جب دونوں اپنا ہوم ورک کرنے بیٹھے تھے تب نینا کو بیگ سے اپنی کتابیں کاپیاں نکالتے ہوئے وہ چاکلیٹ مل گیا تھا۔ نینا جانتی تھی کہ بنٹی کو چاکلیٹ بہت پسند ہے۔ اس لیے اس نے ریپر کھول کر خود چاکلیٹ کھانے سے پہلے اس کا ایک ٹکڑا بنٹی کو کھانے کے لیے دے دیا تھا۔ لیکن بنٹی پورا چاکلیٹ لینا چاہتا تھا۔ پہلے تو اس نے خوشامد کی اور پھر شکایت کا ہتھیار اپنایا۔ "ممی، مجھے دیدی چاکلیٹ نہیں دیتی۔ اس نے چلّا کر کہا "دیدے بنٹی"۔ دوسرے کمرے سے ماں کی حکم دیتی آواز آئی۔ نینا جھلّا اٹھی — ممی، اپنا کھا کر میرا مانگ رہا ہے۔ نینا نے دلیل پیش کی۔ کوئی بات نہیں، دے دے، تیرا چھوٹا بھائی ہے۔ ممی کا جواب تھا۔

نینا نے غصّے میں باقی کا سارا چاکلیٹ بھی بنٹی کی طرف پھینک دیا۔ بنٹی نے دیدی کے ردِ عمل کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اور مزے سے چاکلیٹ کھانے لگا۔ اس کے چاکلیٹ کھانے کے انداز میں شرارت اور جیت کے احساس کا پٹ تھا۔ نینا اندر ہی اندر کٹ کر رہ گئی۔ گانٹھ اس دن پڑی تھی۔

نینا بہت اداس ہو گئی۔ اس واقعے کے بعد اس کا من پڑھنے کو نہیں ہوا۔ وہ گم صُم بیٹھی خالی خالی آنکھوں سے نہ جانے کدھر کیا دیکھتی رہی اور اس کے من میں نہ جانے کیسی اُٹھا پٹک ہوتی رہی۔ "یہی ہوتا ہے"۔ وہ سوچ رہی تھی ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کے کانوں میں کوئی کہہ رہا تھا، ممی اور پاپا دونوں کا ہی رویّہ بنٹی ہی کی طرف ہمیشہ جانب دارانہ رہتا ہے۔ اسے ہمیشہ کھانے کے لیے کسی بھی چیز کا زیادہ حصّہ دیا جاتا ہے۔ کپڑے بھی اس کے زیادہ بنتے ہیں۔ اس کی ہر فرمائش فوراً پوری کر دی جاتی ہے — اس کے برتھ ڈے پر کیک بھی بڑا لایا جاتا ہے بنٹی کے برتھ ڈے پر صرف اسکے لیے نئی پوشاک لائی جاتی ہے جب کہ تمہارے برتھ ڈے پر تمہاری پوشاک کے ساتھ ساتھ بنٹی کے لیے بھی نئے نئے کپڑے خریدے جاتے ہیں۔ ممی کو جب شاپنگ کے لیے جانا ہوتا ہے تو ہمیشہ بنٹی ہی ان کے ساتھ جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں، ممی جاتے جاتے دو چار چھوٹے موٹے کام بھی کرنے کے لیے کہہ جاتی ہیں۔ تم سے۔ بازار میں بنٹی سوفٹی، ٹوٹی فروٹی، فروٹ جوس اور نہ جانے کیا کیا کھاتا پیتا ہے۔ لوٹنے پر مانا کہ ممی تمہیں اپنے ہاتھوں سے چاکلیٹ دیتی ہیں۔ لیکن تب بھی تو بنٹی کا چاکلیٹ پہلے سے ہی اس کی جیب میں ہوتا ہے۔ یاد نہیں کیا ایک دن تم نے بنٹی کا کھلونا لے لیا تھا تو کیسا ہنگامہ ہو گیا تھا۔ بنٹی کے چلّانے پر کہ پاپا، دیدی میرا کھلونا نہیں دیتی۔ پاپا اور ممی دونوں کا ہی ایک ساتھ حکم ملا تھا: نینا، کھلونے دے دو اور تمہارے ضد پکڑ لینے پر پاپا نے خود آ کر تمہارے ہاتھ سے کھلونا چھین کر بنٹی کو دیا تھا۔ تب اُنھوں نے تمہیں آہستہ سے ایک چانٹا بھی مارا تھا اور بنٹی کو گود میں اٹھا کر پیار کیا تھا — کوئی سینما ہال میں پکچر شروع ہونے سے پہلے دکھائی جانے والی سلائڈوں کی طرح اس کے سامنے

ایک ایک گزرا واقعہ پیش کر رہا تھا۔ یہ سلسلہ نہ جانے کتنی دیر چلتا کہ ممی کی کہیں بہت دور سے آتی آواز سے نینا اپنے حال میں لوٹ آئی۔ ممی کے لہجے میں غصّے کا پٹ تھا۔ شاید وہ دو تین بار پکار چکی تھیں۔ ممی کہہ رہی تھیں "اری او بہری، سنتی نہیں۔ ذرا اپنا پین بنٹی کو دے دے۔ اس کے پین کی نب ٹوٹ گئی ہے۔"

بنٹی نے پین نینا سے نہیں مانگا تھا۔ سیدھا ممی کے پاس چلا گیا تھا۔ اپنی شکایت لے کر۔ اور اب ممی کی پھٹکار کے ساتھ ہی لوٹ آیا تھا۔ نینا نے خاموشی سے اپنا پین اس کی طرف سرکا دیا۔ چاکلیٹ کا پھٹا ریپر اب بھی اس کے سامنے پڑا ہوا پنکھے کی ہوا سے ایسے پھڑ پھڑا رہا تھا جیسے نینا نے ایک دن اپنے اسکول میں گھونسلے سے گرے چڑیا کے بچے کو اپنے پنکھ پھڑ پھڑاتے دیکھا تھا۔

.... اور پھر اس کے من کے گھونسلے سے نہ جانے کس جذبے کی گوریا کا بچّہ کہیں اس کے اندر بہت گہرے میں گرا تھا اور اپنے پنکھ پھڑ پھڑاتا زخمی پڑا تڑپتا رہا تھا۔ اس کی تکلیف نینا کو بھیانک پہیلی کاٹتی رہی تھی اور پھر نینا اپنے درد کے ساتھ سب سے الگ تھلگ رہ گئی۔ اس کے ننھے من میں ایسا خلا بھر گیا کہ اسے اپنے آس پاس کی دنیا خالی خالی سی لگنے لگی۔ بظاہر کچھ بھی بدلا نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی سب کچھ ایک دم بدل گیا تھا اور شاید اسی موڑ سے نینا اور بنٹی ایک دوسرے سے دور ہٹ گئے تھے۔ شاید وہ دور نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ نینا کا بنٹی کے ساتھ جو خلوص کے رشتے کا نِکا تھا، اسے کسی غیر مرئی ہاتھ نے چٹکا کر توڑ دیا تھا۔

آج نینا کے اسکول میں سالانہ اجلاس تھا۔ آج بنٹی کے اسکول میں بھی سالانہ اجلاس تھا۔ ممی بنٹی کے ساتھ اس کے اسکول گئی تھیں نینا اکیلی گئی تھی۔ پاپا نہ تو بنٹی کے اسکول ہی گئے تھے اور نہ ہی نینا کے اسکول جا سکتے تھے۔ حالانکہ، انہوں نے نینا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ٹھیک وقت پر اس کے اسکول پہنچ جائیں گے۔ نینا کو پاپا کا نہ آنا بُرا تو لگا تھا۔ لیکن اس نے پاپا کی مصروفیت کو ہی ان کی غیر حاضری کا سبب جان کر خود کو تسلّی دی تھی۔ لیکن نہ چاہنے پر بھی یہ سوال بار بار اس کے من میں اُٹھتا رہا کہ بنٹی کے اسکول میں تو ایسا کچھ بھی اہم نہیں تھا جس کی وجہ سے ممی کا وہاں جانا ضروری ہوتا تو پھر کیوں ممی نے بنٹی کے اسکول جانا ہی بہتر خیال کیا؟ بنٹی پانچویں میں پرموٹ ہوا تھا، جب کہ نینا نے آٹھویں میں اپنے اسکول میں ٹاپ کیا تھا۔ آج نینا کو انعام سے نوازا گیا تھا۔ جب اسے انعام کے طور پر ایک ہاتھ اونچا چم چم چمکتا چاندی کا کپ دیا گیا تھا تو اجلاس میں موجود سبھی لوگ تالیاں بجا رہے تھے اور نینا کے من کے ریگستان میں جگنا دڑا اپنے منحوس پر پھڑ پھڑا رہے تھے۔

وہ جب گھر پہنچی تب ڈرائنگ روم میں بنٹی، پاپا اور ممی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کو دیکھتے ہی سب کے چہرے کھل اُٹھے۔ بنٹی تو اپنی خوشی کو چھپائے ہی نہیں رہ سکا۔ وہ نینا کو دیکھتے ہی چلّا اُٹھا: "دیدی آگئی، دیدی آگئی۔" ممی اور پاپا نے پُر اشتیاق نظروں سے ایک ساتھ دیکھتے ہوئے سوال اُچھالا "کیا انعام ملا۔ ہماری بیٹی کو؟" نینا اپنے کپ کو اپنی پیٹھ کے پیچھے چھپائے تھی۔

جب سب نے نینا سے اپنا انعام دکھانے کے لیے بار بار کہا تو اس نے ڈرتے ڈرتے اپنا کپ انہیں دکھایا اور ساتھ ہی اس کے من میں کبھی پڑے بیج سے اچانک پھوٹ پڑی بیل نے اس کی عمر کے پودے کو پوری طرح چھا لیا اور اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "پاپا، ممی.... میں یہ بنٹی کو نہیں دوں گی۔"

پاپا اور ممی حیرت سے نینا کو دیکھتے رہ گئے۔

بنٹی بڑی للچائی نظروں سے کپ کو دیکھ رہا تھا۔ ●●

انیس امروہوی



چچا شوق

چچا شوق کب دریافت ہوئے اور ان کو دریافت کرنے کا سہرا کس کولمبس کے سر ہے؟ یہ درد سر ہم نے کبھی مول نہیں لیا۔ حتیٰ کہ بے مول بھی نہیں لیا۔ ہم نے جب شعور سنبھالا تو انہیں مارکیٹ میں ہی دیکھا اور مارکیٹ میں ان کی قیمت بھی دیکھی۔ ہم سے تعارف سے پہلے وہ صرف چچا نہیں تھے۔ اب یہ عالم ہے کہ ان کے بزرگ بھی انہیں چچا شوق کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ اُن سے ہماری پہلی ملاقات بڑے عجیب حالات میں ہوئی تھی۔ ان دنوں ہم چار پانچ نوجوانوں کی ٹولی کسی نئے "جبر ملت" کی تلاش میں رہتی تھی۔ اس سلسلے کی ہماری کئی دریافتیں آج بھی لوگوں کو فیض پہنچا رہی ہیں۔ اُن ہی دنوں ہم لوگوں کی نظرِ انتخاب چچا شوق پر پڑی اور جلد ہی ہم لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ موصوف کافی کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ پھر کیا تھا۔ چچا شوق کے ستارے کچھ دنوں کے لیے گردش میں ضرور آئے۔ مگر وہ خود کیوں کہ کافی پر جیٹ انسان ہیں، اس لیے اُنہوں نے جلد ہی ایک مناسب راستہ نکال لیا۔ چنانچہ ہمارے محترم نجمی صاحب کے ذریعے "سیس فائر" قائم ہو گیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے، ہم دونوں فریق "سیس فائر" کے معاہدہ پر قائم و دائم ہیں۔ اور ہمارے درمیان اب کوئی مسئلہ کشمیر نہیں ہے۔

باقاعدہ ملاقات سے پہلے ہم اُن کے بارے میں صرف اسی حد تک جانتے تھے کہ یہ حضرت بھی اردو کے بہت بڑے شاعر ہیں (کہ اردو میں کوئی چھوٹا شاعر ہوتا ہی نہیں ہے)۔ کئی ملاقاتوں کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ موصوف کبھی کبھی اچھے شعر بھی نکال لیتے ہیں۔ چچا شوق کا پورا نام بھلا بھلا سا ہی کچھ ہے مگر شوق تخلص فرماتے ہیں۔ حالانکہ شوق ان کو کسی چیز کا نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اس کا بھی نہیں جس کے لیے وہ یہ تخلص فرماتے ہیں۔ بلکہ شاعری بھی ضرورتاً کیا کرتے ہیں۔

چچا شوق کے حلیے میں ایسی کوئی خاص بات نہیں جو یہاں بیان نہ کی جا سکے۔ دبلا پتلا جسم جسے وہ دیوآنند کی طرح ہمیشہ بہت سے کپڑوں میں چھپائے رہتے ہیں۔ رنگ کسی زمانے میں گورا رہا ہو تو رہا ہو۔ مگر جب سے اُنہوں نے سرخ انقلاب والی ایک سیاسی پارٹی جوائن کی ہے، سرخی مائل گندمی ہو گیا ہے۔ قد، قدِ آدم کے برابر ہے۔ کوئی اونچ نیچ ان کے قد میں نہیں ہے۔ آنکھوں میں ویسے تو کوئی خاص بات نہیں ہے، مگر موقع محل دیکھ کر زمانہ شناسی پیدا کر لیتے ہیں۔ جب سے سر کے بال گرنے لگے، اُنہوں نے مغربی لباس ترک کر دیا اور کرتے پائجامے یا قمیص پائجامے میں آ گئے ہیں۔ البتہ سردیوں میں گرم کپڑوں کا پائجامہ اس ڈھنگ سے پہنتے ہیں کہ پتلون کا گمان گزرتا ہے۔ پاکستان کا پہلا سفر کرنے سے پہلے کالی شیروانی ہی پہنتے تھے۔ مگر بعد میں کبھی کبھی سفید شیروانی بھی پہننے لگے ہیں۔ وِگ کے نیچے پیشانی کافی سے بھی زیادہ کشادہ ہے۔ گھر کے باہر اور گھر کے اندر بھی اُن کا ساتھی ایک چرمی بیگ ہے جو ہمیشہ اُن کے دائیں ہاتھ میں رہتا ہے۔ اُس کا رنگ ہمارے ہوش سے پہلے کچھ بھی رہا ہو، لیکن اب کوئی رنگ نہیں۔ وہ اُن کے ہاتھ سے اُسی وقت جدا ہوتا ہے جب وہ نہانے کے لیے باتھ روم جاتے ہیں۔ چچا شوق کے اس بیگ کی کئی مرتبہ تلاشی لی گئی، پھر بھی کوئی ناقابلِ اعتراض چیز اُس میں دیکھنے کو نہیں ملی۔ حالانکہ ہر چیز پر کسی نہ کسی کو کوئی نہ کوئی اعتراض

۱۰۰۸۔ کلیان واس دہلی ۱۱۰۰۹۱

ضرور رہتا ہے) یہ بیگ چچا شوق کی شخصیت کا ایسا لازمی جزو بن گیا ہے کہ اس کے بغیر کسی بیوہ کے شوہر معلوم ہوتے ہیں۔ اس بیگ میں روزمرہ کام آنے والی انواع واقسام کی لاتعداد چیزیں ہر وقت موجود رہتی ہیں۔

ایک رات چچا شوق کسی محفل میں تشریف فرما تھے جیسے ہی بجلی کا بریک ڈاؤن ہوا تو انہوں نے صاحبِ خانہ سے پہلے ہی اپنے چرمی بیگ سے موم بتی نکالی اور روشن کر دی۔ حاضرین محفل حیران رہ گئے اور تب کسی نے بے ساختہ کہا ؎

میں اپنے بیگ میں شمع لیے پھرتا ہوں یونہی
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

درحقیقت چچا شوق کیا ہیں؟ اس بات کا انکشاف شاید خود ان پر بھی ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ پھر ہم جیسے تو ملاقاتیے اگر ان کی شخصیت کو سمجھنے سے قاصر ہیں تو اُن سے یا آپ سے شرمندگی کیسی۔ موصوف بہ یک وقت شہر کی ایک سیاسی پارٹی کے سرگرم کارکن ہیں۔ بیڑی مزدور یونین سے لے کر کئی فلاحی، ثقافتی اور ادبی انجمنوں کے نائب صدر، سکریٹری، جوائنٹ سکریٹری اور پروپیگنڈہ سکریٹری اور وغیرہ وغیرہ ہیں۔ خازن کسی انجمن کے نہیں ہیں۔ اس حقیقت میں شاید انجمن کے اراکین کی دوراندیشی کو دخل ہے۔ شاعر ہیں اور مشاعروں سے دور بھاگتے ہیں۔ اسی لیے ابھی تک کوئی "ہِٹ غزل" نہیں کہہ پائے ہیں۔ ان کی شاعری سہروں اور سہاگوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ غزلیات کا سرمایہ صرف چند غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ بھی اگر انہوں نے کسی صنف پر طبع آزمائی کی ہے تو وہ ان کے علاوہ خدا کو زیادہ معلوم ہوگا۔ ایک بیوی کے اکلوتے شوہر اور تین بچوں کے باپ ہیں۔ اور ان لوگوں سے بھی موصوف کی ملاقات مصروفیت کی بنا پر شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔

ادبی اور سیاسی انجمنوں کی سکریٹری شپ ہی ایک ایسا میدان ہے، جس میں وہ خوش اسلوبی کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔ اُن کی خوش اسلوبی کا یہ عالم ہے کہ اب تک کئی مُردہ انجمنوں میں مسیحائی کے ہاتھ دکھا چکے ہیں۔ کئی ادبی نشست گاہوں میں مستقل طور پر موجود رہتے ہیں اور ایسی جگہوں پر اُن کے محبوب مشغلے صرف دو ہی ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ اُن کی موجودگی میں کسی دوسرے کو بولنے کا موقع کم سے کم ملے۔ بلکہ نہ ملے۔ دوسرا مشغلہ یہ کہ اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ حقے کی نے کسی دوسرے شخص کے ہاتھ میں زیادہ دیر نہ رہے ___ اور ہم نے متعدد بار دیکھا ہے کہ یہ دونوں ہی کام چچا شوق بحسن و خوبی انجام دیتے ہیں۔ اور اس طرح انجام دیتے ہیں کہ حاضرین کو کبھی ان سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی ہے۔

چچا شوق کو بظاہر تو کوئی کام نہیں ہے اس پر بھی شہر اور قوم کی اتنی ذمہ داریاں اُن پر ہیں کہ تفکرات میں اُن کی وگ کے بال تک سفید ہو گئے ہیں۔ ہم نے انہیں کامریڈ رضوی کے ساتھ مارکس کے نظریے کی حمایت کرتے بھی دیکھا ہے اور بابا صاحب کی درگاہ کے سالانہ عرس میں ڈھولک کی تھاپ پر ساتوں آسمان کی سیر کرتے بھی دیکھا ہے۔ اُن کے اشعار میں کمیونزم کی روایتی نعرے بازی بھی از خود آجاتی ہے۔ اور بابا صاحب کی خانقاہ کی دیواروں پر بھی تصوف کے جام میں لبریز اُن کے اشعار دیکھنے کو ملے۔ گویا ایک نیام میں دو تلوار والا محاورہ چچا شوق سے ملاقات کے پہلے ہماری سمجھ سے بھی باہر تھا۔ فوٹو کھنچوانا چچا شوق کی پیدائشی کمزوری ہے محفل کسی سوگ کی ہو یا کسی خوشی کا جشن کیا مجال کہ چچا شوق کبھی آؤٹ آف فوکس ہو جائیں اکثر تصویروں میں انہیں ہمیشہ دولہا کے شانہ بشانہ اور جنازے میں میت کے قریب ہی پایا گیا۔

یوں تو چچا شوق کم عمری ہی میں "فارغ البال" ہو چلے تھے۔ مگر ایک بار جب وہ چھ ماہ کی مدت والی کراچی کی تیرتھ یاترا سے واپس آئے تو بہت سے لوگوں نے ان کو پہچاننے سے ہی انکار کر دیا کیونکہ وہ وہاں سے نہایت عمدہ قسم کی وگ لگا کر آئے تھے اور نقلی بالوں سے اصلی عمر کو چھپائے ہوئے تھے۔ ایک طرح سے انہوں نے وگ کی مدد سے اپنی عمر کو پیچھے کی طرف دوڑایا تھا۔

کراچی کا ایک دلچسپ واقعہ انہوں نے بڑے مزے لے لے کر سنایا۔ ایک بار جمعہ کی نماز ادا کرنے گئے، جو وہ اکثر کیا کرتے ہیں۔ مسجد میں چچا شوق کو ننگے سر دیکھ کر کچھ لوگوں نے ٹوکا۔ کیوں کہ اُن دنوں پاکستان میں جماعت اسلامی کے زیر اثر سرکار تھی اور ہر شخص تو مسلم نظر آتا تھا۔ اس لیے بھی ننگے سر والے کو ٹوکنا ایمان ہی کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔ چچا شوق کو جب ٹوکا گیا تو انہوں نے کہا کہ وہ ٹوپی پہنے ہوئے ہیں۔ بات طول پکڑ گئی۔ ادھر چچا شوق بضد کہ وہ ٹوپی پہنے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف لوگ اڑے ہوئے کہ وہ ننگے سر ہیں۔ چچا شوق کو بضد دیکھ کر لوگوں نے اندازہ لگایا کہ وہ خبطی ٹائپ قسم کے آدمی ہیں لہٰذا اسی بات کو لے کر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اب چچا شوق کو خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں لوگ ان کو پاگل نہ سمجھ لیں۔ انہوں نے فوراً اپنی وگ اتار کر لوگوں کو دکھا دی اور بڑی معصومیت کے ساتھ بتایا کہ وہ ٹوپی کا کام بھی وگ سے ہی نکال لیتے ہیں۔ مگر بعد میں انہوں نے باقاعدہ طور سے وگ کے اوپر ٹوپی بھی پہننا شروع کر دی اور اب وہ شاید دنیا کے واحد انسان ہیں جو وگ پر ٹوپی بھی پہنتے ہیں۔

چچا شوق میں ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کبھی کسی کی بُری بات کا کبھی بُرا نہیں مانتے ۔ اس بات کا ہمیں بھی ذاتی تجربہ ہے۔ اور خود اُن کا بھی اس سلسلے میں یہی خیال ہے۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ لگے ہاتھوں آپ بھی سن لیجیے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب چچا شوق غیور صاحب کے ساتھ دن رات اپنے ہی شہر کی سیاحت میں مصروف رہتے تھے اور غیور صاحب تازے تازے ریٹائر ہوئے تھے ۔ایک دن حکیم صاحب کے مکان پر ایک ادبی نشست کے بعد غیور صاحب اپنی چھڑی وہاں بھول کر چل دیے ۔ہم نے اُن کی چھڑی اُٹھائی اور بیچ راستے میں ان کو چھڑی دیتے ہوئے کہا "لیجیے غیور صاحب، آپ چچا شوق کو وہاں بھول آئے تھے ۔" غیور صاحب کہ خود طنز نگار تھے ۔ یہ سن کر مسکرائے ۔ اس واقعے کا علم جب چچا شوق کو ہوا تو وہ قہقہہ مار کر ہنسے ۔ پھر اپنی خوشی کو دوبالا کرنے کے لیے ہمیں شاباشی دی۔

ہمیں چچا شوق کے مکان پر ایک بار حاضری دینے کا شرف حاصل ہوا تو ان سے پہلے اُن کے کتے نے ہمارا استقبال کیا اور نہ صرف مزاج پُرسی کی بلکہ ہمارے مزاج بہتر ہونے کے بارے میں اپنی ناراضگی کا بھی اظہار کیا۔ہم نے چچا شوق سے کتا پالنے کی وجہ دریافت کی تو بڑے اطمینان سے فرمایا ـــــ "یہ دافعِ زحمت ہے، اسی لیے پالا ہے ۔" ہم نے تعجب کا اظہار کیا تو مزید وضاحت میں فرمایا ـــــ "زحمت ہمارے محلہ کا نامی گرامی چور ہے ۔"

چچا شوق کو ذمہ داریاں اوڑھنے کی عادت سی ہے ۔ حالانکہ اس معاملے میں بہت جگہ اُن کے حصے میں صرف بدنامی اور بُرائی ہی آتی ہے ۔ یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ کوئی ذمہ داری قبول کرتے ہیں تو پوری دیانت داری اور مخلصانہ طور پر اس کو نبھانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ یہ بات الگ ہے کہ خدا کی طرف سے ہی کوئی کام اُن کے ذریعے نہ ہونا لکھا ہو تو اس حد تک تو وہ بھی خدا کے قائل ہیں کہ کوئی کام خدا کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا ۔

O O

۱۔ مسودے صاف ستھرے اور خوشخط لکھ کر بھیجیں ۔
۲۔ غیر طلبیدہ تخلیقات کی واپسی کے لیے مناسب سائز کا ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ ارسال فرمائیں۔



نام کتاب : ناٹ آؤٹ
مصنف : ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی
قیمت : بیس روپے
ملنے کا پتہ : ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی
نزد دیپک چوک ، متصل ہارون چال
اکولہ ۴۴۴۰۰۱ (مہاراشٹر)

"ناٹ آؤٹ" ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی کے مضامین کا تیسرا مجموعہ ہے ۔ اس مختصر سی کتاب میں ان کی طرزِ تحریر کے کئی نمونے شامل ہیں ۔ مزاحیہ مضامین اور انشائیوں کے علاوہ ایک خاکہ بھی ہے اور ایک سفرنامہ بھی ۔ البتہ ان کا مخصوص رنگ مزاحیہ مضامین اور انشائیوں ہی میں جھلکتا ہے ۔

شیخ رحمٰن کی مزاح نگاری کی جو خوبی فوراً متاثر کرتی ہے ، وہ ان کی انفرادیت ہے ۔ انہوں نے اپنی راہ خود تلاش کی ہے ۔ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں ، سراسر ان کا اپنا ہے ۔ انہیں تو شاید نئی راہ تلاش کرنے میں دشواری ہوتی ہو ، لیکن ہم اس بات سے خوش ہوتے ہیں کہ اچھا ایک راستہ اور بھی ہے ، مسرت کی منزل تک پہنچنے کا ۔

شیخ رحمٰن کے مزاح کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اس کی تشکیل میں اچھل کود سے کام نہیں لیتے ۔ اپنی بات کو سیدھے سادے انداز میں اس طرح کہہ دیتے ہیں کہ مسکراہٹ قاری کے چہرے پر اپنے آپ پھیل جاتی ہے :

"ناپ لے کر غلط سینا کمال ہی تو ہے ۔"

"باقی سب کچھ تو ٹھیک تھا بس کھیر ٹیڑھی تھی ۔"

اس طرح کے کئی جملے آپ کو اس مجموعے میں مل جائیں گے ۔

ایک کمی جو اس کتاب میں کھٹکتی ہے ، وہ دلی کا سفرنامہ ہے ۔ سفرنامہ وہی دلچسپ ہوتا ہے جس میں قاری بھی شریک ہو سکے اور وہ دیکھے ہوئے مقامات کو بھی اس طرح دیکھے کہ اسے لگے کہ ہائے اُس نے ان جگہوں کو اس طرح کیوں نہ دیکھا ۔ لیکن شیخ صاحب نے تو کچھ اس طرح سے لکھ دیا ہے جیسے روزنامچہ لکھ رہے ہوں ۔

شیخ رحمٰن کا مزاح کے میدان میں داخلہ ایک خوش آئند قدم ہے ۔ اس کتاب سے احساس ہوتا ہے کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ہیں ۔ قارئین کو ان کی حرکتوں پر نظر رکھنی چاہیے ۔ وہ یقیناً اپنے لیے مزاح میں ایک منفرد مقام بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں ۔

کتاب کی شکل وصورت معیاری ہے اور بیس روپے میں ہرگز مہنگی نہیں لگتی ۔

دلیپ سنگھ

نام کتاب : سورج مکھی (افسانے)
مصنف : شام بارک پوری
ناشر : کلچرل اکیڈمی (مرکز) بنگلہ دیش
قیمت : ۳۰ روپے
ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، نئی دہلی ۲۵

شام بارک پوری کی کہانیاں بعض اچھی ہوتی ہیں بعض بہت اچھی بعض بری ۔ یہ بات شام کے ساتھ ہی نہیں ، ہر فن کار اور خصوصاً زود نویس فن کار کے یہاں ہوتی ہے ۔

"سورج مکھی" کے افسانوں سے بھی یہ افسانہ جڑا ہوا ہے ۔ لیکن افسانہ نگار نے ہر افسانے کے ساتھ بلکہ پہلے کسی بڑے یا چھوٹے ناقد کی رائے بطور "سند" لگا دی ہے تاکہ افسانہ پڑھنے سے پہلے آپ افسانہ نگار کی فن کاری پر ایمان لے آئیں ۔ کیوں کہ ادب کے رسول اس کی یکتائی عظمت اور بڑائی کی شہادت دے رہے ہیں لیکن ادب کا قاری بھی کافر ہو سکتا ہے تمام شہادتوں کا منکر ہو کر براہِ راست فن کار سے واقف ہونے کی کوشش کر سکتا ہے ۔

شام بارک پوری فن قصہ گوئی سے واقف ہیں عموماً ان کی کہانیاں مختصر ہوتی ہیں لیکن سماج کے کسی بڑے اہم مسئلے کو اپنے دامن میں سموئے رہتی ہیں ۔ وہ سلیس اور سادہ نثر میں واقعے کے بیان کا ہنر جانتے ہیں ۔ انسان کی ناقدری ' محرومی اور استحصال کے ساتھ سائنسی فتوحات اور در ربانیت کے تحت بدلتی ہوئی بلکہ بگڑتی ہوئی دنیا سے کوئی نہ کوئی واقعہ چن کر قاری تک پہنچا دیتے ہیں ۔ یہ سارا عمل اس لیے ہے کہ شام کے دردمند دل میں انسان دوستی کا بے پناہ جذبہ ہے ۔ وہ قدیم تہذیبوں اور اقدار کی پامالی کو

چھپی نگاہ سے نہیں دیکھتے اور نہ ہی وہ ان توہمات کے پجاری ہیں۔ بلکہ ایک اعتدال کی راہ اور انسانیت کی ڈگر پر پوری انسانی برادری کو لے جانا چاہتے ہیں۔ جہاں انسان، انسان کے سُکھ دُکھ میں برابر کا شریک ہو۔

افسانہ "روبوٹ" اگر سائنسی فتوحات کا المیہ ہے تو "دریگون نئی تہذیب کے "انڈے ہیں گندے" کی وضاحت کرتا ہے۔ "نقطے کا سفر" "آواز کا ماتم" "گگن کی چیخ" وغیرہ عالمی صورتِ حال کا استاریہ ہیں۔

مجموعی طور پر اٹھارہ افسانوں پر مشتمل یہ افسانوی مجموعہ قابلِ مطالعہ ہے۔

ارتضیٰ کریم

نام کتاب : آتے جاتے موسموں کا سچ (افسانے)
مصنف : ہرچرن چاولہ
ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۳۱۰۸۔ گلی عزیزالدین وکیل، کوچہ پنڈت لال کنواں دہلی ۱۱۰۰۰۶
قیمت : ۴۰ روپے

ہرچرن چاولہ کا افسانوی مجموعہ "آتے جاتے موسموں کا سچ"، صرف آتے جاتے موسموں کا سچ ہی نہیں، بلکہ اس سے تو روز چڑھتے اور ڈوبتے سورج کی سچائیاں اور اٹل حقیقتیں بھی سامنے آتی ہیں۔ اس نے لمحہ لمحہ وقت کی نبضیں ٹٹول ٹٹول کر اپنے نوکِ قلم سے دنیا بھر کی مختلف تہذیبوں اور رہ برید معاشرے کے چہرے بے نقاب کیے ہیں۔ اس مجموعے میں اکیس افسانے شامل ہیں جو نہ صرف ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ بلکہ مغرب کی تیزی سے بدلتی ہوئی تہذیبی اقدار پر بھی کئی پہلوؤں سے روشنی ڈالتے ہیں۔

ہرچرن چاولہ نے غریب الوطنی کی قیمت پر زندگی کا تجربہ حاصل کیا ہے۔ اس کا عکس ان کی بعض کہانیوں میں بہت واضح ہے۔ "جانے دو" ہرچرن چاولہ کی مہاجرانہ زندگی کے پہلے سانحے کی نشاندہی کرتا ہے جس میں ہندوستان کا رشتہ یورپ کی دیگر مملکتوں کے ساتھ نہایت خوبصورتی سے جوڑا گیا ہے۔ "اتصالی نقطے کا موڑ" بھی ایک غریب الوطن کردار کی اپنے وطن میں اپنے گھر کے درودیوار سے والہانہ محبت کی داستان ہے۔ جہاں اسے اپنے گھر کی اینٹیں بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

"گھوڑے کا کرب" ہرچرن چاولہ کی بہترین کہانیوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں نسلی امتیاز کی تشریح نہایت خوب صورت علامتی انداز میں کی گئی ہے۔ جس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔ اس کہانی کو بلغاریہ کے بین الاقوامی ٹرولاتن کلاس ایوارڈ کے پہلے انعام کا حق دار ٹھہرایا گیا ہے۔ ہرچرن چاولہ کی فنی کاوشوں کے طفیل اردو زبان کے اس واحد افسانے کو یہ اعلیٰ مقام حاصل ہوا ہے۔

"گنگا کو واپسی" "لاحاصل کا دُکھ" "رات کا سورج" "مدوجزر" "زمین" "سوچ نگر آباد ہے" اور "واپسی" بھی تارکینِ وطن اور پیچھے اپنے ملک میں رہ رہے ان کے لواحقین کے مسائل سے متعلق ہیں۔ ان کہانیوں سے نہ صرف مغربی تہذیب کے مثبت اور منفی پہلو روشن ہوتے ہیں بلکہ اس روشنی میں وطن چھوڑ کر آئے ہوئے لوگوں کی بدلی ہوئی ہیئتیں بھی صاف دکھائی دیتی ہیں۔ "دوسرا رُخ" الیکشن کے موضوع پر ایک مختصر سا افسانہ ہے۔ مگر کوئی تاثر نہیں چھوڑتا۔ "آتے جاتے موسموں کا سچ" ایک اچھی کہانی ہے اور کردار نگاری کی ایک خوب صورت مثال ہے۔ اس مجموعے میں ہرچرن چاولہ نے اور بھی کئی تجربے کیے ہیں۔ "بیچ کی بات" "پوری بات کی ادھوری کہانی" اور "بولوگی نہیں" صرف سنوگی رادھیکے" مونولاگ میں لکھی ہوئی پُراثر کہانیاں ہیں۔ جنسی مسائل کا ذکر اس کتاب کی بہت سی کہانیوں میں پوری بے باکی ...... سے کیا گیا ہے۔

کہانی "توازن" سے اس افسانوی مجموعہ کا فنی معیار غیر متوازن ہو گیا۔ یہ کہانی ایک بازاری قسم کی کہاوت پر مبنی ہے جو نچلے طبقے کے لوگوں میں زبان زدِ عام ہے۔ ہرچرن چاولہ نے اسے مغربیت کا رنگ دے کر سنوارنے کی کوشش ضرور کی ہے، مگر بات بنی نہیں۔

نام کتاب : اپنی اپنی زنجیر
مصنف : ستیہ پال آنند
قیمت : ۵۰ روپے
ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ ۹۔ گولا مارکیٹ دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ستیہ پال آنند کی زیرِ نظر کتاب "اپنی اپنی زنجیر" اُن کی بالغ نظری کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ اپنے افسانوں میں آنند نے ایک جہاندیدہ شخص کی طرح زندگی کے مختلف پہلوؤں کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا ہے اور عالمانہ فراست کے ساتھ ان کی تجزیاتی تصویر کشی کی ہے۔ اس مجموعے کی تمام کہانیوں کی وضع، تراش، ٹریٹمنٹ، طرزِ نگارش اور اسلوب اس بات کے شاہد ہیں کہ ستیہ پال آنند واقعہ نگاری اور قصہ گوئی کا سہارا بہت کم لیتے ہیں۔ اُن کی بیشتر کہانیاں Charecter Oriented ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ معاشرے کے ان کرداروں کا انتخاب کیا ہے، جنہیں وقت اور زمانہ دونوں نظرانداز کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر آنند ان کرداروں کو ایسی فن کارانہ چابک دستی سے قاری کے سامنے لاتے ہیں کہ اُن کی ذات کی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ اور آخر ان کی یہ ہنگی سماج پر کالا دھبہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ آنند کی کہانی کے کرداروں کا رویہ معاشرتی انسانوں جیسا نہیں ہوتا بلکہ فطری انسانوں جیسا ہوتا ہے جن کی ہیئت معاشرے کے اثرات سے پیدا ہونے والی تبدیلیوں

کے کالس بگڑتی اور سلگتی رہتی ہے۔

"کیڑو" "لال بادشاہ" "من بہادر" اور "سوبھے ناتھ" نچلے طبقے کے ایسے مجبور کرداروں کی کہانیاں ہیں جو ہر طرف سے ناسازگار حالات کا شکار رہنے کے باوجود اندر سے زندہ سلامت اور مضبوط ہیں۔ آنند نے بڑی چابکدستی سے ان کچلے ہوئے کرداروں کے مثبت پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ "سانپ اور سانپ" میں بھی مختلف جبلتوں کے شکار ڈھیر سارے کرداروں کو ایک سلگتے ہوئے ماحول میں ایسی خوبصورتی سے سمویا ہے کہ کہانی فنی لحاظ سے کمال تک پہنچ گئی ہے۔ "زندگی، موت اور بڑھیا" ایک منفرد کردار کی کہانی ہے جس میں ایک عمر رسیدہ بیمار بڑھیا انتہائی تکلیف دہ اور ذلت آمیز ماحول میں رہ کر بھی جینے کی خواہش سے چمٹی ہوئی ہے۔ اور اپنی موت کے بارے میں کسی کے منہ سے ایک لفظ بھی سن کر سیخ پا ہو جاتی ہے اور گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دیتی ہے۔ "خلیج اور پُل" درس و تدریس کی دنیا میں ایک ایسے پیچیدہ مسئلے کی کہانی ہے جو نظامِ تعلیم کے شروع ہونے کے دن سے ہی درس گاہوں میں اپنے قدم جمائے کھڑا ہے۔ "ملنگ اور کمبل" کا مرکزی کردار بھی "کیڑو"، لال بادشاہ اور من بہادر جیسا ستم رسیدہ کردار ہے، مگر اُن سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اُس نے حالات کے سامنے سپر ڈال دی۔ "پنجاب اور بنگال" کے ہاتھ صوبائی تعصبات کی نفی اور فوجیوں کی بلند کرداری کی مظہر ہے۔ "اپنی اپنی زنجیر" مغربی ممالک کے غلط رویّوں کی ایک خوفناک تصویر پیش کرتی ہے اور تارکینِ وطن کی بے بسیوں کا نقشہ کھینچتی ہے۔

کتاب دیدہ زیب گٹ اپ کے ساتھ خوبصورت چھپی ہوئی ہے۔

ھیرانند سوز

نام کتاب : عکس (افسانے)
مصنف : نگار عظیم
قیمت : ۲۵ روپے
تقسیم کار : مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

"عکس" نگار عظیم کے ۲۰ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے جو ملک کے بیشتر رسائل میں شائع ہو کر ایک حلقے میں دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اس مجموعہ کی ابتدا میں ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر مسعود ہاشمی اور راج نرائن راز کی آرا بطور پیش لفظ شامل ہیں۔ گرد پوش پر عظیم صدیقی صاحب کی رائے کے علاوہ قارئین کے خطوں کے وہ اقتباسات بھی درج ہیں جو افسانوں کی اشاعت پر مختلف لوگوں نے اظہارِ خیال کے طور پر افسانہ نگار کو ارسال کیے تھے۔

اس مجموعے کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ کہانی کے شروع میں ہر کہانی کی تفہیم کو ایک تصویر کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔ بعض افسانے بے حد دلچسپ ہیں۔ مختصر الفاظ میں لکھے گئے ہیں اور کھُردُرے پن سے پاک، مرمریں سلوں پر ترشی ہوئی تصویروں کی مانند ہیں۔ جن سے افسانہ نگار کی فنی چابکدستی اور زبان پر قدرت کا پتہ چلتا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے اُنہوں نے معاشرے کی عام خامیوں اور اس کے بگاڑ پر درد مند دل کے ساتھ قلم اُٹھایا ہے۔ مجموعے کی پہلی کہانی "مرد" ہے، جو انسان کے جنسی اور نفسیاتی مسئلہ پر لکھی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ مردانگی درجنوں لڑکیوں سے عشق لڑانے اور ان کی زندگیاں برباد کرنے میں نہیں ہے۔ ایک اور کہانی "فرق" میں بھی اس طرح کی نفسیاتی پیچیدگی ہے۔ ایک شادی شدہ لڑکی ایک نوجوان لڑکے کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر کشش میں جنسی جذبہ ہی شامل ہو۔ وہ لڑکی اس نوجوان میں اپنے پیارے بیٹے ٹما ٹما کا عکس دیکھتی ہے۔ یہ محبت کا مقدس رشتہ ہے۔ فرق صرف سمجھنے کا ہے۔

"اللہ میاں" میں کٹھ مُلّائی تعلیم کے منفی اثرات کو اُبھارا گیا ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ علمی روشنی کے اس زمانے میں اندھی تقلید مذہبی اور اخلاقی اقدار کی روح کو مجروح کر دیتی ہے۔ ان کے علاوہ "عکس" "بدلے کا سہاگ" "ریڈ لائٹ" "بابا" اور "روشنی" وغیرہ نہایت دل کش اور جامع افسانے ہیں۔ نگار صاحبہ کا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے معیوب اور انسانیت سوز جذبات کو افسانوں کے تانے بانے پر غالب نہیں آنے دیا بلکہ باوزن اور آئیڈیل مزاج کی عکاسی کی بھرپور تائید کی۔ "مرد" میں اشرف علی خاں "فرق" میں واحد متکلم اور "بابا" ثمینہ، پاکیزہ جذبوں کے نمائندہ ہیں جو افسانہ نگار کی ذہنی روش اور آفاقی فکر کا پتہ دیتے ہیں۔ غرض نگار عظیم صاحبہ کے یہ افسانے روزانہ زندگی کے مذہبی، اخلاقی، عمرانی، سیاسی اور اقتصادی مسائل کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ جو اُن کے ذاتی تجربات اور تیز تر مشاہدات کے غمّاز ہیں۔ ان کے افسانوں میں فکر کی تازگی ایک گونہ صفت ہے جو ان کے افسانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ ان کے یہاں آزادیٔ فکر اور جرأتِ اظہار کے ساتھ ساتھ مشرقی اقدار کی پختگی ہے اور ایسا لگتا ہے ان کے یہاں سب کچھ اپنا ہے۔ اپنا ادب، اپنی زندگی، اپنی خوشی، اپنا غم، اپنا تجربہ، اپنی تہذیب، اپنے مسائل اور اپنا فکر و تدبر جسے ہر شخص اپنا ہی خیال کرے اور یہ کسی مضبوط تخلیقی گرفت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

توقیر احمد خاں

نام کتاب : چشم براہ
مصنف : عتیق الہ آبادی
قیمت : ۳۵ روپے
ملنے کا پتہ : انجمن تہذیب نو، پبلی کیشنز ڈویژن
۲۷۲ - چک الہ آباد

ساتویں دہائی کے شروع میں اردو شاعری نے ایک اور کروٹ لی اور تجریدیت نے کھلبلی بدلی۔ ابن انشاء، ناصر کاظمی اور خلیل الرحمٰن اعظمی جیسے شاعر اپنا رنگ جمانے میں کسی حد تک کامیاب ہوئے اور سہل پسندی کی شناخت قائم ہوئی۔

ستر کے بعد بہت سے نوجوان شعرا نے شاعری میں آسان تجربے کیے۔ اُن میں صابر ظفر وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے مگر اب اُس سے بھی آسان شاعری کا رواج چل پڑا تھا اور عتیق الہ آبادی جیسے فن کار پیدا ہوئے۔ سہل پسندی عتیق الہ آبادی کی خصوصیت ہے۔ اُن کی شاعری عام تجربوں کا مکسچر ہے جس کو سمجھنے کے لیے قاری کو بہت زیادہ ذہنی کسرت نہیں کرنا پڑتی۔ حالانکہ وہ کہیں کہیں نرگسیت کا شکار نظر آتے ہیں۔ مگر میں تو اسے ان کا بھولا پن ہی کہوں گا۔ نتیجے میں لاشعور کی اس منزل نے اُن سے بہت سے خوب صورت شعر کہلوا دیے ہیں۔ ؎

ہمارے نام کے چرچے بہت ہیں
حقیقت یہ ہے ہم اچھے بہت ہیں

آنکھوں سے اُنگلیوں کو تہ ایسے ہٹائیے
میں کون ہوں یہ بوجھ کے پہلے بتائیے

مذکورہ بالا شعروں میں کرامرے قطع نظر سچائی اور بغیر سوچے ہوئے دل کی بات زبان پر آجانے کی کیفیت صاف دکھائی دیتی ہے —— عتیق کی شاعری میں موجودہ دور میں زندگی کے اُلجھاؤ اور ان کی بے ساختہ ادائیگی بھلی لگتی ہے۔ زمانے کا کرب اور اس کی شکایتیں شعری سانچے میں ڈھالنے کی ایک کامیاب کوشش کا نام 'چشم براہ' ہے۔

پھر آج اختلاف کی دیوار اُٹھ گئی
پائی تھی کچھ نجات ابھی کل کی بات ہے

بہرکیف عتیق کے زیر مطالعہ مجموعہ کلام میں اچھی غزلیں شامل ہیں۔ پھر بھی یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ تمام شاعری ہی خوبصورت ہے۔ اُن کے یہاں رومانیت اور انقلابیت کا امتزاج بھی ہے اور دونوں میں اختلاف بھی۔

ہم لوگ ہی وارث ہیں شہنشاہ ظفر کے
ہم لوگ یہاں رہ کے عبادت بھی کریں گے

سبطین اختر

نام کتاب : جدید اردو شاعری اور خلیل الرحمٰن اعظمی
مصنف : مظہر احمد
ملنے کا پتہ : شبانہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ - محلہ قبرستان ترکمان گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶
قیمت : ۵۰ روپے

اردو ادب میں خلیل الرحمٰن اعظمی کا نام نہایت ادب و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ وہ ابتدائی دور کی ترقی پسند تحریک کے سرگرم کارکنوں میں سے تھے اور جدیدیت کے بانی بھی۔ وہ بیک وقت بلند مرتبہ شاعر، نقاد اور نثر نگار تھے۔ اُنہوں نے ترقی پسند تحریک سے منحرف ہونے کے بعد جدیدیت کی داغ بیل ڈالی۔ اور پھر اس سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت دونوں کے عروج و زوال سے اُن کا گہرا تعلق رہا۔ ان کی شعری صلاحیتوں کو جدید اردو شاعری کا منبع مانا جاتا ہے۔ ان کی شاعری پر وجودیت اور نظریہ فرائڈ کے اثرات نیز ان کی بے راہ رو زندگی جو پاگل پن کی حدوں تک جا پہنچی اس کا مفصل بیان کتاب میں ملتا ہے اور بحیثیت غزل گو اور نظم گو اور جدید اردو شاعری میں ان کا مقام وغیرہ موضوعات پر اس کتاب میں مدلل بحث کی گئی ہے۔ مصنف کی ان کی شاعری پر میر کے اثرات کو مدلل انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ جدید تر غزل نظم کے پیشرو شاعر کے روپ میں بھی ان کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا باب "ترقی پسند ادب اور جدیدیت" بعض اہم نکات کی نشاندہی کرتا ہے اور کئی غلط فہمیوں کا ازالہ کرتا ہے۔

مظہر احمد نے علمی انداز میں بحث کرتے ہوئے ان تمام محرکات کو قلم بند کیا ہے۔ جو اس سے قبل اس موضوع پر کمیاب ہیں۔ شاعر کے ذہنی رویّہ کو اس کی شاعری کے پس منظر میں جانچا پرکھا گیا ہے جو حاصل کتاب ہے۔

سہیل وحید

بقیہ : مکتوبات

ادا کیا ہے۔ وہ کسی طرح مردوں سے کم نہیں ہے۔ اُمید ہے آئندہ بھی 'آج کل' میں ایسے مضامین کو جگہ ضرور ملے گی۔

ڈاکٹر سید مہدی رضا زیدی' اناؤ۔

سطحی :

"آج کل" میں جہاں آپ نے اردو ناول پر خصوصی گوشہ دے کر اردو اساتذہ، طلبا اور عام قارئین کے لیے دل چسپی کا سامان پیدا کیا اور مظفر حنفی کی غزلوں سے جریدے کا وقار بڑھایا وہیں آپ نے "پربت" جیسا سطحی افسانہ شائع کر کے قارئین کا وقت اور آج کل کے قیمتی صفحات ضائع کیے۔

احسان تابش، گیا۔

مکتوبات

نفسیاتی :

اُردو رسالوں میں 'آج کل' قابلِ تعریف ہے۔ جس میں ادب کے ہر فکر و نظریہ کے فن کاروں کو برابر کا موقع دیا جاتا ہے۔ اپریل کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ بیشتر مشمولات معیاری ہیں۔ افسانوں میں پیغام آفاقی کا افسانہ "پیتل کی بالٹی" ایک مکمل نفسیاتی افسانہ ہے، جو ایک عورت کی نفسیات پر لکھا گیا ہے۔ افسانہ میں بیوی جو چاہتی ہے اس وقت اس کو شوہر کی جانب سے پورا نہیں کیا جاتا ہے۔ جس سے اُس میں غم و غصہ پیدا ہوتا ہے۔ مگر آفاقی نے غصہ کو اتنا آگے بڑھا دیا کہ بیوی شوہر پر دانت بھی گاڑ دیتی ہے۔ غیر عقلی لگتا ہے۔ افسانہ بیانیہ ہے، مگر کہانی پن سے عاری لگتا ہے۔ ویسے افسانہ گہرا تاثر نہیں چھوڑ سکا ــــ Treatment بھی اتنا ٹھیک نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے بعض چیزیں عمداً لا کر ٹھونسی گئی ہیں۔ جیسے رمیش کا گھر آنا اور محظوظ ہونا ــــ انہماک سے سننا ٹھیک تھا، مگر جا ؤ وا انہماک سے سُننا کیا معنی؟

امجد جاوید، گلبرگہ

بلاضرورت :

مئی ۱۹۹۰ء کے آج کل کی اشاعت میں محترمہ نیلم فرزانہ کا مضمون "خواتین ناول نگار" نظر سے گزرا۔

افسوس کہ محترمہ نے اپنے مضمون میں مندرجہ ذیل خواتین ناول نگاروں کا سرے سے ذکر نہیں کیا۔

اے۔ آر۔ خاتون جن کے کئی ناول شائع ہو چکے ہیں اور ان کی صاحب زادی بنت اے۔ آر۔ خاتون کا اور نہ زبیدہ خاتون' نہ عفت موہانی' نا ہاجرہ نازلی کا نہ سرور جہاں اور نہ ہاجرہ سرور کا۔

اس کے علاوہ بیگم صالحہ عابد حسین، بیگم رفیعہ منظور الامین کے نام بھی رہ گئے۔

"شوکت آرا بیگم" کی مصنفہ مسز عباس طیب جی نہیں ہیں بلکہ اس ناول کی مصنفہ بیگم شیدا علی عباس کاکوروی ہیں گو ناول پر مصنفہ کا نام صرف خاتون شائع ہوا ہے۔ اس طرح رسالہ 'عصمت' کی ایڈیٹر بیگم رازق الخیری کا نام بھی اس فہرست سے غائب ہے۔

مضمون نگار صاحبہ نے بلاضرورت یہ کہہ کر اسلامی معاشرے پر چوٹ کی ہے کہ صدیوں پہلے کے معاشرے نے عورتوں کی قسمت میں تاریکی لکھ دی تھی۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، نئی دہلی

واضح تصویر :

"آج کل" (مئی ۱۹۹۰ء) میں سید محمد عقیل رضوی کا مضمون : "آگ کا دریا۔ ایک حصے کا تاریخی اور تہذیبی مطالعہ" علی احمد فاطمی کا "تاریخی ناول" اور نیلم فرزانہ کا مقالہ "خواتین ناول نگار" ایسے مضامین ہیں جو نہ صرف بہت سی مشترک باتوں پر روشنی ڈالتے ہیں بلکہ ایک دوسرے مضامین میں اٹھائے گئے سوالات کا جواب بھی پیش کر دیتے ہیں۔ جس سے قاری کے سامنے موضوع اور عہد کی ایک واضح تصویر سامنے آجاتی ہے۔

قیصر اقبال، لکھنیاں

تعارفی خاکہ :

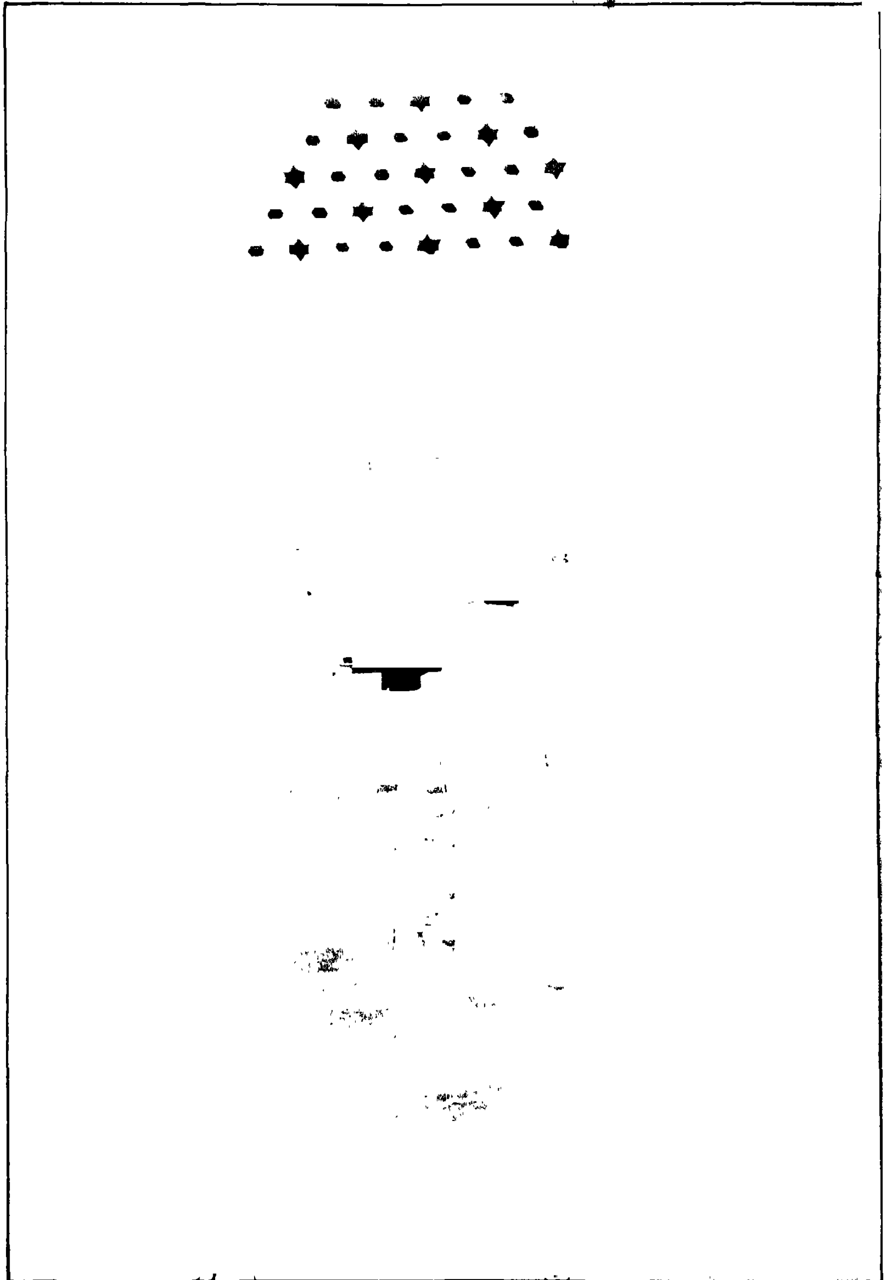
"آج کل" (مئی ۱۹۹۰ء) کا شمارہ دیکھا۔ کہانیاں "اندھیرے سے اندھیرے تک" اور "اونچی ڈال کا آم" بہت پسند آئیں۔ محترمہ نیلم فرزانہ کا مقالہ "خواتین ناول نگار" اور جناب علی احمد فاطمی کا مقالہ "تاریخی ناول" بڑا معلوماتی اور تفصیلی ہے۔ حفیظ میرٹھی کی غزلیں اپنی مثال آپ ہیں اور مظفر حنفی کا مطلع کتنا سچا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے اس ایک شعر میں ساری داستان سمو دی ہے۔ موجودہ شمارے میں کتابوں پر کیے گئے تبصرے "تبصرہ" کم اور تعارفی خاکہ زیادہ لگتے ہیں۔

محمد حامد، دربھنگہ

پایۂ تحقیق :

"آج کل" (مئی ۱۹۹۰ء) کا شمارہ دیکھا۔ نیلم فرزانہ کا مضمون "خواتین ناول نگار" مفصل اور تحقیقی مضمون ہے۔ اس میں یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی ہے کہ ناول نگاری میں خواتین نے جو رول (بقیہ ۸۴ پر)

R.N. 948/57 (Delhi Post) NDPSO New Delhi
Vol. 48 No. 12 Rs. 2/- Ajkal (Urdu) July 1990



تصویر: آپل